خدابخش لائبریری جرنل

پٹنہ

۴۰

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۲۳۴۴۳/۷۷

قیمت فی پرچہ : ۱۵ روپے
سالانہ : ۶۰ روپے (ہند)
: ۱۲ ڈالر (ای
: ۲۴ ڈالر (دیگ

۱۹۸۷ء

چالیسواں شمارہ

فہرست

محبوب حسین نے اردو حصہ پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ سے اور انگریزی حصہ لبرٹی آرٹ پریس د
خدا بخش لائبریری سے شائع کیا

ایڈیٹر: عابد رضا

کیمیائے سعادت

نسخۂ بانکی پور

خود نوشتِ غزالی ہونے کے داعیے پر تحقیق اور انتقاد

ابوسعاد جلیلی
(کراچی)

کتاب خانہ خدا بخش میں محفوظ ایک قدیم مخطوطہ "کیمیائے سعادت" کے سرورق پر مندرج عہدِ عالمگیری

ی یہ تحریر کیٹلاگ میں خصوصیت سے منقول ہوئی ہے[1] :

"از مردمِ ثقات ہم چو میرزا محمد زاہد مرحوم صدر کابل[2] و مولوی عبد الحکیم و میاں محمد فاضل

مرحوم گجراتی مسموع شدہ کہ خطِ قدیم ایں کتاب شریف و نسخۂ لطیف خطِ امام الہمام

قدوۃ العارفین اسود السالکین امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ است و چند جزوِ اوّل و چہار

ورقِ آخر بخطِ کاتب است"۔

امام غزالی (۴۵۰ تا ۵۰۵ھ / مطابق ۱۰۵۸ تا ۱۱۱۱ء) سی برگزیدہ شخصیت کے خاص حوالے سے

ی مدت سے یہ فرض کیا جاتا رہا ہے کہ یہ نسخہ امام کے خطِ مبارک کی یادگار ہے۔ اس مناسبت سے[3] غزالی سے منسوب

راق کی خالصۃً فنی تنقیح ان کے عہد کی فارسی تحریر یعنی املا اور طرزِ خط کو معیار بنا کر کرنے کی کاوش کی گئی ہے

ر اس ادعا کی حقیقت و اصلیت آشکار ہو سکے۔ "کیمیائے سعادت" جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے ضخیم تر عربی

اب "احیاء العلوم الدین" کے مطالب و مندرجات کی فارسی تلخیص ہے جو غزالی نے جامعہ نظامیہ بغداد کے

سربراہ کا عہدہ ترک کرنے کے بعد طویل سفر سے مراجعت پر ۴۹۰ / ۵۰۰ھ کے درمیان تصنیف کی۔ ان

ن کے دستِ خاص کے کسی مخطوطے کو ۴۹۰ ہجری کے اگلے پندرہ برسوں کا لکھا ہوا ہونا چاہیے اور ایسے کسی

---

[1] مولوی عبد المقتدر خاں: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے عربی فارسی مخطوطات کا کیٹلاگ ملاحظہ ہو جلد ۱۶ صـ۲

[2] میرزا محمد زاہد عہدِ اورنگ زیب کے مشہور عالم گزرے ہیں۔ تذکروں کی رو سے یہ منقولات کے علاوہ بالا اور دیگر متعلقہ ادبیات۔ معقولات کے معروف اسکالر ہوئے ہیں۔ [3] پروفیسر جلال ہمائی: "غزالی نامہ" تہران ۱۳۱۸ھ / صـ۲۲ جن کا خیال ہے سبک شناسی ملک الشعراء بہار اور مصحح "کیمیائے سعادت" استاد احمد آرام ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی ایک گزشتہ تحریر "معارف" مئی ۲۰۰۰ء کیمیائے سعادت کا ادبی مقام و مرتبہ" صـ۳۵۲

مفروضہ نسخے کو معاصر غزالی فارسی رسم خط کی اساس پر ہی پرکھا جا سکتا ہے۔

ہم نے اس تعلق سے پٹنہ ہی میں مقیم دو بزرگ علماء کو اس قدیم مخطوطے کا مقابلہ دکھا کر بنفس نفیس فرمانے کی زحمت دینے کے علاوہ دیگر ہم عصر افاضل کے ملاحظے میں اس قلمی نسخے کی مختصر مائکرو فلم اور چند تصویریں گزران کر اُن کی آرائے گرامی سے بھی استفاضے کی حقیر مساعی کی ہیں۔ عہد موجود کے ان "مردم ثقات" کے نہایت فاضلانہ افادات میں احتمال و تشکیک کی کسی نوع کی گنجائش نہیں ہے اور خالصتاً علمی اور فنی نوعیت کے دلائل و براہین پر مبنی ان کے فرمودات سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تمام اکابر کی خدمات اقدس میں ہدیۂ تشکرات و تکریمات نذر ہے کہ اُن کے سرچشمۂ فضل و کمال نے ایک بے مایہ و بے بضاعت سے طالب علم اور ذرۂ بے مقدار و خزف ریزہ سے سائل کی تشنگی دور کی ہے اور "مسلم الثبوت انداز" میں زیر نظر اشکال کے حل کے لیے رہبری کی زحمات ان صاحب الرائے بزرگوں نے گوارا فرمائی ہیں۔ راقم الحروف کی انتہائی بدقسمتی کہ اس کو فیضیاب فرمانے والے ان علمائے عصر کے من جملہ چند بزرگانِ کار کی رحلت کے سانحات اندریں اثنا رونما ہو چکے ہیں اور بایں وجہ کافی عرصہ بعد اس حقیر کاوش کا ماحصل پیش کرتے ہوئے ان سب نفوسِ قدسی سے محرومی کا احساس آج افزوں تر ہو رہا ہے

اعلی اللہ مقامہم اجمعین۔

معاصر غزالی خط و املا پر انحصار

مخطوطات کی قدامت کا تعین املائی خصوصیات کی بنا پر ہی نہیں ہو جاتا ہے بلکہ دیگر کئی امور و نکات کو بھی پیش نگہ رکھنا ناگزیر ہوتا ہے۔ استاذالاساتذہ[1] ڈاکٹر محمد نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کی رُو سے "کسی مرتب فہرست کے بیان پر تنقید کرنے سے پہلے خود ناقد کو بعینہٖ اس نسخے کا مطالعہ کرنا چاہیے اس کے بعد رائے قائم کرنی چاہیے[2]۔ اس طرح اس کے ساتھ بہت سارے دیگر اہم پہلو رہیں گے جن کے بغیر تحقیقی مطالعہ تشنۂ تکمیل ہوگا اور پروفیسر نظام الدین کے ہی ایک اور فرمان کے الفاظ میں "تا وقتیکہ اصل نسخہ نہ دیکھا جائے

---

[1] خاکسار کے معلم اول اور دانشمند و فقیہ ڈاکٹر محمد عبد المنان علیہ رحمۃ سابق ریڈر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ نیز حیدرآباد کے متعدد افاضل مثلاً پروفیسر نذیری سید کلیم اللہ حسینی و غلام دستگیر رشید نیز سید مبارز الدین رفعت صاحبان اور ڈاکٹر رضیہ اکبر حسن، ڈاکٹر شریف النساء بیگم ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب مرحوم و مغفور کے نہایت درجہ عزیز و ارشد شاگرد رہ چکے ہیں۔

[2] ڈاکٹر نظام الدین: مکرمت نامہ مورخہ ۱-۸-۱۹۶۲ء

اور اس کے متن کاغذ، سیاہی، رسم الخط وغیرہ کی جانچ نہ کی جائے[1] اس کا عہد بالکل صحیح صحیح دریافت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ پروفیسر اے جے آربری کا معروف علمیہ کے فرمودات کی بھی روشنی میں یہی لوازم براہ راست زیر مطالعہ و تحقیق رہنے چاہئیں:

I have found that for a reasonable reliable judgement in such matters it is necessary to see the manuscript itself; a photograph, however good, can not reproduce the precise quality and state of the paper and the ink, which are often essential features in determining the dates of medieval manuscripts.[2]

پروفیسر آربری نے مزید صراحت کرتے ہوئے بالاصرار فرمایا:[3]

I think it is impossible to assign even an approximate date to a persian M.S. in the medieval Naskh Hand unless one can handle the MS and examine its paper and ink.

استاد احمد آتش نے تقریباً انھی گوشوں پر سوچ بچار کی تاکید فرمائی:[4]

______ In order to give the final answer, one has to take the ink with which it is written and the kind of paper used, into consideration.

پروفیسر مجتبیٰ مینوی نے مخطوطے کی تحریر کے علاوہ دیگر نکات کی اہمیت ظاہر فرماتے ہوئے تحریر کیا:

If other particulars of the original, such as paper

---

١ ڈاکٹر نظام الدین: مکتوب مورخہ ١١-٧-١٩٦٣ء   ٢ پروفیسر آربری: والا نامہ ٦-٢-١٩٦٣ء

٣ پروفیسر آربری: مکتوب مورخہ ٩-٣-١٩٦٣ء

٤ پروفیسر احمد آتش، سربراہ شرقیات انسٹیٹیوٹ استانبول یونیورسٹی: نوازش نامہ مورخہ ٢٦-١-١٩٦٣

and ink, are observed, I may date differently[1]

تاہم ان فنی فرو‌دیات اور لوازم کی مسلّم قدر و قیمت کے باوجود اس نسخے کا حصول یا اس کا سفر پٹنہ دونوں عملاً ناممکن تھے۔ حسنِ اتفاق بلکہ اس عاجز از منصوبے کی غایت درجہ خوش بختی کہ کتاب خانۂ بانکی پور کے بیش قیمت علمی خزاین قاضی عبدالودود علیہ رحمۃ اور پروفیسر سید حسن جیسے گرامی قدر و گرامی منزلت بزرگوں کی دسترس میں تھے اور دونوں ذی مرتبت علما نے خصوصیت سے اس نسخہ "کیمیائے سعادت" کا معاینہ و مقابلہ کرنے کی تکلیف گوارا فرما کر فاضلانہ رائیں عطا کیں۔ مخطوطے کی تصاویر گزراننے پر تذکرہ اور دیگر افاضل نے جو ملاحظات سپردِ قلم فرمائے قلمی نسخوں سے متعلقہ تاریخی حقایق کی روشنی میں نہ صرف فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ خاکسار کا ایقان ہے کہ مخطوطات سے ظاہر ہونے والی فارسی املا کی ارتقائی کیفیات کے شواہد نیز قلمی نسخوں سے تقابل و تجزیہ پر مبنی و منحصر افاداتِ عالیہ اس علمی و فنی بحث کو ایک نتیجہ خیز نکتے تک پہنچانے میں بھرپور طور پر نمایاں نمایندگی کرتے ہیں۔ غزالی کے ہم عصر اور مابعد کے بھی قرنوں فارسی رسم خط کی چند نمایاں خصوصیات بے حد توجہ طلب ہیں:

۱۔ اس کا ایک بہت زیادہ معروف اور اہم عنصر تھا دالِ مہملہ اور ذالِ معجمہ کا فرق و امتیاز جس کی ممکنہ تفصیلات کی جمع آوری کی کاوش آیندہ صفحات میں کی گئی ہے۔

۲۔ حرفِ بیان و علّت "کہ" (چنداں کہ، زیرا کہ، شخصی کہ) کا املا بجائے ہائے مختفی کے یائے معروف کے ساتھ بصورت 'کی' تھا؛ ساتویں صدی ہجری کے آخر کے نسخوں میں 'کی' کے پہلو بہ پہلو 'کہ' کی شکل بھی عیاں ہوئی اور ازاں بعد یہی شکل جاری ہو گئی۔

۳۔ اسی طرح 'چہ' ان دنوں 'چی' لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس طرز میں 'کہ' کی طرح ہائے مختفی کی یائے معروف سے تبدیلی کے علاوہ فارسی 'چ' بھی عربی 'ج' سے لکھا ہوا ہے۔ اس دوسرے رجحان یعنی فارسی آوازوں کو عربی ابجد میں ہی محدود کر دینے کے تحت چند دیگر ایرانی اصوات بھی آتی ہیں جن پر آگے عرض کیا جا رہا ہے۔

۴۔ 'کہ' اور 'چہ' پر ختم ہونے والے کلمات "آنکہ" اور "آنچہ" میں ہائے مختفی کے بغیر اس کے سابقے کو پورا پورا یوں لکھا جاتا تھا: 'آنک'، 'بلک'، 'چنانک'، نیز 'آنچ'، 'چنانچ'، 'چندانچ'۔

۵۔ الف پر مختتم الفاظ کی اضافت ہمزہ سے ظاہر کی جاتی تھی جیسے فی الوقت مروجہ طرز پر

---

[1] پروفیسر مجتبیٰ مینوی، تہران یونیورسٹی: نامۂ مبارک مورخہ ۲-۳-۱۹۶۵ء

"علمائے اسلام کی یادیں"، علمائے اسلام"، نامہ ہائے دانشوراں"، جہیز یا جہاز"، لشکر یا رجال، رسالہ ہائے جدید۔

اس تحقیق سے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اضافتوں کے لیے فارسی رسوم الخط میں چار طریقے رائج رہے ہیں:

(الف) مذکورہ طرز کتابت قدیم ترین تھا اور آٹھویں صدی ہجری تک بھی آج کل کے طریقے یعنی مرقومہ ذیل تحریر کے ساتھ اس کا وجود رہا:

(ب) رائج الوقت املا یائے معروف کے ساتھ ہے جیسے دریا کا زخار اور عصائے چوبیں، یہ ساتویں صدی ہجری کے ربع آخر کے مخطوطات سے ملتا ہے؛

(ج) تیسرا انداز تھا الف پر مد کا اضافہ جس کا مثالی نمونہ ہے: دریاۓ ٹغیر۔

(د) چوتھا قاعدہ الف کے تحت ہمزہ نیز یائے معروف اور مذکورہ تینوں میں سے کسی کے بھی اضافے کے بغیر سیدھا سادہ لکھا ہوا کرتا تھا۔ جیسے انتہا مراحل اور البقا یہ جو فارسی جدید میں انتہائے مراحل وغیرہ ہیں۔

محولہ بالا دو طریقوں ج اور د کا عمل دخل بڑا محدود تھا اور کم ہی زیر استعمال رہے۔ اب باقی ماندہ قاعدوں کی تفصیل پیش ہے۔

۶۔ زیر مطالعہ صدیوں میں الف پر مد بھی نہیں ملتا مثلاً آن/ان، آوازہ/اوازہ، نیا آفرید/نیافرید۔ الف ممدودہ ساتویں صدی کے آخر کا اضافہ ہے۔

۷۔ سابقۂ اضافت "بہ" کو علحدہ نہیں بلکہ ملا کر لکھتے تھے جیسے بہ دست کی جگہ بدست، بہ روز/بروز۔

۸۔ یائے معروف پر مختتم الفاظ کی "ی" پر ہمزہ کا اضافہ (گوی/گوئی، جدای/جدائی) ساتویں صدی کے بعد کے مخطوطات سے ظاہر ہونا شروع ہوا۔

۹۔ ایسے الفاظ کو دو یا پر ختم کرنے کا رواج البتہ عہد غزالی میں تھا یعنی خوی/خویی اور اس میں کی پہلی ی کبھی بلا نقطہ بھی تحریر ہوتی تھی۔

۱۰۔ الف زائد پر ہمزہ (فضائل، قائم) نہیں لکھا جاتا تھا نیز مختصری کہیں بکثرت اور کہیں عموماً بغیر نقطوں کے لکھی جاتی تھی۔

۱۱۔ آذا اور داؤن جیسے الفاظ کو ہمزہ فاعلی غائبت کے بنا ہی یوں کتابت کیا جاتا تھا: اند،

ازیں، از ایشاں۔

مزید برآں ذیل کے املائی خصائص پر عربی رسم خط کی اثر اندازی قابلِ ملاحظہ ہے جو پانچویں / چھٹی صدیوں کے فارسی نسخوں میں علانیہ ظاہر ہوتی ہے:

۱۲۔ چند الفاظ میں ت کے لیے طا، مؤلفہ لکھنا جیسے تلخ / طلخ۔ علامہ قزوینی نے المعجم کے ایک مخطوطے کے حوالے سے لکھا ہے:

"درکتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم لمحمد بن قیس الرّازی
نسخهٔ قدیمی (بدون تاریخ) موزهٔ بریطانیهٔ نیز دو سه
مورد (ص ۵۶، ۱۲۹، ۲۱۷، ۲۵۲) از طبع بروت وراقم سطور کلمهٔ
تلخ را "طلخ" با طاء مؤلفه نوشته است و ظاهراً این طرز
املا از اثر غلبهٔ نفوذ عرب بوده است مانند کلمات صد
و شصت و طپانچه و غلطیدن و نحو ذلک" [1]

۱۳۔ اوپر کے قاعدہ ۵ میں مذکورہ الف پر مختتم الفاظ کی اضافتوں میں سے ہمزہ (علمائے دین، لشکرہائے ایراں بھی عربی سے مستعار تھا۔ ایسے کلموں پر ہمزہ کے اضافے سے جمع کے کچھ صیغے وضع کیے گئے نیز چند تراکیب بھی اختراع کی گئیں۔ مکتوبی ہمزہ بہر طور اپنا وجود آج بھی برقرار رکھے ہوئے ہے۔

۱۴۔ پانچویں اور چھٹی صدیوں میں کیا خاصا بعد بھی کاف فارسی یعنی گ نہیں لکھا جاتا تھا اور دو مرکشی والا موجودہ روپ کافی آگے ایجاد ہوا۔

۱۵۔ علاوہ ازیں چ، پ اور ژ کی ایرانی آوازوں کو بھی سکہ بند اصول کے بطور عربی حروف ج، ب، ز سے ظاہر کرنے پر قناعت کی جاتی تھی۔ یہ بھی رائج الوقت روپ بہت بعد میں فارسی لکھائی میں اضافہ کیے گئے۔ فی الجملہ ذالِ معجمہ اور دالِ مہملہ کے مکتوبی فرق کے بعد معاصر ایرانی خط و املا میں فارسی کی اپنی منفرد و مخصوص ایسی سب اصوات کے لیے عربی لکھائی کے روپوں پر انحصار و اکتفا دوسری بہت بڑی خصوصیت ہے۔

---

[1] میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی: مقدمہ مصحح "تاریخ جہاں گشای جوینی": ج ۱ ص ـــ مقدمہ حاشیہ [illegible]

درج کردہ اطلاعات کے بنیادی ذرایع و مآخذ کی وضاحت حاشیے میں مندرج ہے [ھ]

ذال معجمہ اور دال مہملہ کے مباحث

قدیم فارسی خط میں ذال معجمہ (اعجام: نقطہ لگانا) اور دال مہملہ کا فرق ایک اہم اور خاص جزو رہا ہے اور پانچویں / چھٹی صدی ہجری سے منسوب کسی فارسی مخطوطے میں اس کی عدم موجودگی نسبت کے دعوے کی صحت کو مشتبہ امر بنا دیتی ہے۔

ذال معجمہ سے مراد کسی فارسی لفظ میں شامل دال کا وہ حرف ہے،

۱) جس پر اس کے سابقے کے طور پر کوئی متحرک حرف صحیح ہونے کی بنا پر نقطہ ڈالتے تھے: بلد/ بلذ

[ھ] مآخذ: (ا) براؤن اور قزوینی کی مشمولہ قدیم فارسی تصانیف کے مقدمے جو قزوینی نے تحریر کیے خصوصاً جوینی کی تاریخ جہاں کشا کا مقدمۂ قزوینی۔ (ب) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا مقالہ "ذال معجمہ فارسی میں" مطبوعہ "ارمغان علمی پروفیسر محمد شفیع" لاہور ۱۹۵۵۔ (ج) ڈاکٹر نذیر احمد کا مقالہ مشمولہ "نقوش" مارچ ۱۹۶۳۔ (د) پروفیسر سید عبداللہ کا مقالہ مندرجہ "نذر رحمٰن" لاہور۔

موقف: ان تمام عالی مرتبت معاصرین کے مکاتیب گرامی جنھیں اس مخطوطے پر فاضلانہ اظہار تاثر کے لیے زحمت دی گئی، ان علمی مکتوبات سے اقتباس کردہ اجزا آیندہ صفحات کی زینت ہیں۔

حطی: بہت سے پرانے قلمی نسخوں کی تصویریں اور عکسی نقول جو (ا) براؤن اور قزوینی کے مرتبہ ایڈیشنوں میں (ب) ڈاکٹر برکے کے مصور مجموعۂ مخطوطات عربی و فارسی مخزونہ انڈیا آفس میں۔ (ج) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے "نذر رحمٰن" والے مقالے کے ساتھ۔ (د) "کیمیاے سعادت" کے احمد آرام ایڈیشن میں شریک اشاعت کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں:

(ھ) ایران کے کتاب خانہ مجلس شوریٰ ملی تہران میں "کیمیاے سعادت" کے قدیم ترین محفوظ نسخے مورخہ ۵۹۶ھ کا عکس بھی جو احمد آرام ایڈیشن کے ناشر آقاے [illegible] نے مرحمت کیں۔ "کیمیاے سعادت" کے مخطوطات کا مقام کی فہرستوں میں یہ سب سے متعاقب واقع ہوا ہے۔ کتاب کے سب سے اولین دو نسخے CHESTER BEATTY ذخیرے اور پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہیں جو علی الترتیب پروفیسر آربری اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی مرحوم کی اشاعات کے مطابق [illegible] ھ کے کتابت کیے ہوئے ہیں۔

ند/آمذ، جُدا/جذا، باشد/باشذ۔

ب) یا جو اپنے ماقبل حرف علّت ہونے کے باعث نقطے سے لکھی جاتی تھی: اُفتاد/افتاذ، داوند/داذند، بود/بوذ، کودک/کوذک۔

دال مہملا اصطلاحاً وہ ہے جس کے سابق ساکن حرف صحیح ہونے سے اُس کو بغیر نقطے کے لکھا جاتا ہے:
گرداب، مُرد، پسند، مُردہ۔

معجمہ و مہملہ کے مابین فرق کے ضمن میں علامہ قزوینی کی تشریح دیکھیے:[1]

ذال معجمۂ فارسی در کلمات فارسی در دو موضع است: (۱) هرگاه ماقبل آن متحرک باشد چون آمذ و باشذ و بذ و موبذ و زمرّذ و نحوها که بلا استثنا ذال معجمه است، (۲) هرگاه ماقبل آن یکی از حروف علت باشد چون افتاذ و باذ و نباذ و آباذ و استاذ و بوذ و نموذ و بیذ و کشیذ و رفتیذ و گفتیذ و نحوها که نیز بلا استثنا ذال معجمه است، ـــــ امّا دال فارسی فقط در یک موضع است و آن وقتی است که ماقبل آن ساکن و از حروف صحیح باشد چون مَردُ و کَردُ و آوَردُ و دُزدُ و مُزدُ و پسندُ و کمندُ و غیر ذلک که بلا استثنا دال مهمله است۔

مہملہ اور معجمہ کے سلسلے میں ایرانی تحریر میں ذال کی آواز والے حرف کی ازمنۂ قدیم سے موجودگی کے تعلق سے چند بنیادی نکات کا اعادہ ضروری ہے۔ متعلقہ ایرانی اور بعد کے عرصے کی بھی علمی تحقیقات کا خلاصہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے گراں مایہ و گراں قدر الفاظ میں:[2]

---

[1] قزوینی: دیباچہ جہاں کشا ص۔ مع حاشیہ ملا [2] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی: "ذال معجمہ فارسی میں" مطبوعہ "ارمغانِ علمی مولوی محمد شفیع" لاہور ۱۹۵۵ ص ۱۵۵/۱۵۶۔ بعد کی تحقیق و تدقیق کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر شوکت سبزواری: "ذال معجمہ فارسی میں" در "غالب: فکر و فن" کراچی ۱۹۶۹ اور نیز سید قدرت نقوی: "غالب اور ذال معجمہ" در "صحیفہ" لاہور "غالب نمبر" جنوری ۱۹۶۹۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحقیقات فائقہ سے کم ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

"'ذ' قدیم ترزبان میں 'ت' تھی جو بعد کی زبان میں 'ذ' ہو گئی لیکن پہلوی میں کتابت اور تلفظ کے اختلاف کے باعث یہ دریافت کرنا مشکل تھا کہ 'ت' کی تحریں 'ذ' میں کب ہوئی۔ مزید تحقیق سے یہ مشکل یوں حل ہوئی۔

(الف) سریانی ادب میں ایران کا ذکر اکثر آیا ہے جس میں ایرانی الفاظ اور اسمائے علم بھی ملتے ہیں۔ تیسری صدی عیسوی کے اوائل کی سریانی تحریروں میں ان لفظوں یا ناموں میں حرفِ علت کے بعد بھی 'ت' ہی ملتی ہے۔ چوتھی صدی کی بعض سریانی تحریروں میں ایسی 'ت' کی جگہ 'د' پائی جاتی ہے مگر پانچویں صدی اور اس کے بعد کی سریانی میں تواتر کے ساتھ 'د' ہی ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ چوتھی صدی میں ایران کی زبان میں اس 'ت' کا تلفظ تبدیل ہونا شروع ہو گیا تھا اور پانچویں صدی میں یہ تبدیلی تکمیل کو پہنچ گئی تھی۔

(ب) سریانی حروفِ تہجی میں 'ذ' کے لیے الگ حرف نہیں بلکہ 'د' سے 'ذ' کا بھی کام نکلتا ہے اس طرح کہ جب 'ذ' سے پہلے کوئی حرف علت ممدود یا تغیر واقع ہو تو اس 'د' کا تلفظ 'ذ' ہوتا ہے۔ جس طرح فارسی میں اُسی طرح سریانی میں 'ذ' سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا۔

(ج) اسلامی دور میں تقریباً ۷۰۰ ہجری تک 'ذ' فارسی زبان میں برقرار رہا اور بعض لفظوں میں ابتک ہے اس لیے وہ 'ذ' تبدیل ہو کر 'د' نہیں ہوئی جیسے آذر، پذیرفتن، گذشتن وغیرہ۔ باقی لفظوں میں رفتہ رفتہ 'ذ' کی جگہ 'د' نے لی اور بعض چند لفظوں آذر وغیرہ پر اس دوسری تحویل کا اثر نہیں ہوا وہ مستثنیٰ قرار پائے۔

ان تین مقدموں سے ثابت ہے کہ چوتھی صدی عیسوی سے لیکر تیرھویں صدی عیسوی تک فارسی زبان میں 'ذ' پوری طرح متکلم رہی۔ اور بعض لفظوں میں اب تک ہے، گو تلفظ کی جہت سے 'ذ' ان چند لفظوں میں 'ز' کے مماثل ہو گئی ہے۔"

---

[1] کسی فارسی لفظ کے ذال سے آغاز کے مسئلے پر پروفیسر جالنس کی رائے دیکھئے کہ "یہ مشکل سے زبان فارسی میں ایک دو لفظ ذ سے شروع ہوتا ہے" (لغت فارسی و عربی و انگریزی ص ۵۹۵) جو مولوی سلیم جعفر کے بقول یہ ہیں: "ذکر (ایک قسم کا آفتاب) اور نخود شش (ذرلیق) جالنس و جعفر اور قوسین کے حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو: سلیم جعفر "فارسی میں ذال معجمہ" نیا دور کراچی شمارہ ۷۵ صفحہ ۳۶/۳۰

اس کے بعد پہلوی اور اوستائی رسوم خط میں 'ذ' کی آواز کے رد بدل پر ڈاکٹر صاحب نے لکھا:

"۱۸۹۰ء میں مانی کے مذہب سے متعلق ایک ذخیرہ قلمی کتابوں کے اجزا اور منتشر اوراق کا چینی ترکستان کے ایک مقام ترفان / تورفان نام میں برآمد ہوا جو بیشتر سریانی حرفوں اور فارسی زبان میں ہے۔ اس میں مانی اور اس کے پیرووں کی تصنیفیں ہیں جن کا زیادہ حصہ تیسری صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے اور جس سے ساسانی عہد کی زبان میں 'ذ' کا وجود پوری طرح ثابت ہے۔

یورپ کے محققوں نے اوستا اور پہلوی زبانوں کی کتابوں کے متن اور شرحیں پچھلے زمانے میں شائع کی ہیں جن سے ایران کی پرانی زبانوں کے متعلق یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ

(الف) قدیم 'ت' لفظ کے شروع میں اب تک اپنے حال پر قائم ہے چنانچہ ترش، تُند، تیز وغیرہ لفظوں کی پرانی صورتوں میں بھی پہلا حرف 'ت' ہی تھا۔

(ب) لیکن 'ت' اگر حرف علت ممدود الف یا واو یا یا کا یا حرف علت مقصور زبر یا زیر یا پیش کے بعد واقع ہوتی تھی تو درمیانی دور کی زبان میں وہ 'ت' بدل کر 'ذ' ہو گئی تھی۔ چنانچہ قدیم زبان میں 'وات' تھا ہوا کے معنی پر، درمیانی دور کی زبان میں 'واذ' (پہلوی کتابت 'وات' مگر تلفظ 'واذ') اور فارسی اسلامی میں 'باذ / باد' اسی طرح 'بوت' سے 'بوذ / بود' وغیرہ۔

ج قدیم 'ذ' درمیانی اور اسلامی دور میں کہیں 'ہ' ہو گئی ہے جیسے اوستا 'سپاذ' میں ساکن ذ مفتوح سے 'سپاہ' اور کہیں 'ی' جیسے اوستا 'مذ' م مفتوح ذ مضموم سے 'مَی' بمعنی شراب۔ یہ 'ی' آگے چل کر کہیں ساقط بھی ہو گئی ہے جیسے اوستا 'پاذ' ذ مفتوح سے 'پای' اور پھر 'پا'۔"[1]

یہ امر تاریخی حقائق و شواہد کی بنا پر مسلم الثبوت بھی ہے اور متفق علیہ بھی کہ استیلائے عرب کے بعد ایران کی اپنی زبان موسومہ پہلوی المعروف بہ فارسی قدیم کا مخصوص اور باستانی رسم خط بالکلیہ متروک ہوا اور عربی کا مروجہ املا اس زبان کی اپنی تحریر کے لیے نافذ یا جاری یا اختیار کیا گیا جس میں پہلوی کی منفرد اصوات گویا عجمی یا غیر عربی آوازوں کے اظہار کے لیے ان الفاظ اور طریق سے تکمیل یا پر ہی انحصار کیا گیا اور اس کی

---

[1] ڈاکٹر صدیقی حوالۂ گزشتہ ص ۱۸۶/۱۸۷۔

ضروری تفصیلات عرض کی جا چکی ہیں۔ دوسری جانب ذال کے خاص عوامل سے یہ بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ذال ایرانی الاصل ہے اور ایک طویل زمانے سے موجود رہا اور اس کو بھی فارسی ماننے میں کوئی امر موجب اشتباہ نہیں ہے۔ عین اسی تناظر میں یہ امر بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ عربی بولنے والوں نے جن فارسی الفاظ کو عربی میں اپناتے ہوئے بوقتِ تحریر دال پر نقطہ اضافہ کر دیا خود ایران والے بھی اپنی زبان کے اس نئے اور عربی سے ماخوذ رسم خط میں اپنے یہاں الفاظ کو اس نئی معرب شکل میں بعینہٖ قبول کرنے لگے۔ اس صورتحال پر علامہ قزوینی کی تحقیق اور رائے یہ ہے کہ:

"تلفظ ایشان بذال چگونه بوده (شبیه بذال عربی یا زای عربی یا صوت مخصوص دیگری) درست معلوم نیست ولی ظاهراً شبیه اشیا بوده است بذال عربی بدلائل عدیده که خوض در آن از حوصلهٔ این دیباچه بیرون است از جمله آنکه جمیع این نوع کلمات را که مشتمل بر ذال فارسی بوده از قدیم در کلمات عرب داخل شده عرب ذال معجمهٔ فارسی را دائماً و در جمیع موارد بذال معجمهٔ عربی تعریب یا تعبیر کرده است مانند استاذ و باذام و ذرت و بلسند و جبذ و شوذر (چادر) و شاذروان و غیرها در اسما اجناس، و بغداذ و بغاذ و قباذ، و خرداذبه و غیرها در اسما اعلام، و اگر نه آن بودی که ایرانیان این حرف را مثل ذال معجمه عربی یا شبیه بآن تلفظ میکرده اند نه بدال مهمله که تلفظ کنونی ایران است این تعریب بذال معجمه دلیلی نداشتی چه خود دال مهمله بر زبان عرب ثقیل نیست و در کلام عرب بی شمار است و علت مخصوص دیگری نیز تصور نمیتوان کرد برای اینکه عرب دائماً و در جمیع مواقع دال مهمله را بذال معجمه تعریب نماید۔"[1]

پروفیسر براؤن نے قزوینی کے اس خیال کو پورا پورا تسلیم کیا اور "تاریخ جہاں کشا" کے انگریزی مقدمے میں اس سلسلے کی تحقیق پر کامل غور و فکر کے بعد صاد کیا۔

ذالِ معجمہ پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا تحریر خاصا محققانہ ہے:

"یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ذ، عربی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں اور ثبت بھی ہو

---

[1] قزوینی: دیباچہ جوینی ص نط/ل

نہیں۔ سریانی اور یونانی اور قدیم ایرانی زبانوں میں یہ دونوں آوازیں موجود تھیں اور ظاہر ہے کہ جو لفظ ان زبانوں سے آئے ہیں ان میں یہی حرف ملتے ہیں۔ اس لیے یہ خیال صحیح نہیں کہ مثلاً فارسی لفظ 'استاد' میں 'د' [بے نقطے دال] تھی عربوں نے تعرف کر کے اُسے [نقطے دالی] 'ذ' بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے ایرانیوں سے یہ لفظ سنا تو اسی میں 'ذ' ہی سنی اور اسی طرح سے ادا کیا۔ خود ایرانیوں کی زبان میں بعد کو 'ذ' کی 'د' ہو گئی اور عربوں کے ہاں لفظ کی وہ صورت قائم رہی جو انھوں نے پہلے ایرانیوں سے سنا تھا۔[1]

معجمہ کے اختیار اور ترک پر تحقیق و انتقاد

اب سوال یہ ہے کہ معجمہ اور مہملہ کا یہ دستور کتنا عرصہ جاری رہا نیز یہ فرق و امتیاز کس زمانے میں ترک ہونا شروع ہوا اور بالآخر کتنی مدت بعد یا کب ختم کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے یہ صراحت کرتے ہوئے کہ چھٹی صدی ہجری میں یہ قاعدہ ٹوٹنے لگا تھا یہ دو نتائج اخذ کیے:

"(۱) اسلامی دور کے اوائل میں ایران کی زبان میں "ذال" موجود تھی اور پانچویں صدی ہجری تک بولنے اور لکھنے میں آتی تھی۔

(۲) چھٹی صدی سے 'ذ' کی جگہ 'د' بولنے کا رواج ہو چلا اور کچھ مدت بعد خاص کر عوام کو دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔"[2]

ہمارا دائرۂ کار چونکہ اصلاً تحریر و املا میں ذالِ معجمہ کی موجودگی اور رفتہ رفتہ بتدریج معدومیت پر محدود و مرتکز ہے اس لیے ثانی الذکر نکتے کے خاص حوالے سے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ کم از کم چھٹی صدی ہجری کے املا اور خط میں نقطہ دار ذال کا وجود ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جو بحث تمحیص سے واقعتہً بے نیاز ہے۔ البتہ ایک بے نظیر مخطوطے کا حوالہ چندے بہ تقاضائے احتیاط اور چندے بر سبیل تذکرہ ڈاکٹر محمد نظام الدین کے مکتوبِ مبارک سے پیش ہے جس میں پروفیسر محمود ع نے اس علمی انکشاف سے راقم کو مستفید فرمایا:

"کل ہی کتب خانۂ آصفیہ میں 'جوامع الکلم' نسخہ آصفیہ ۲۶۹ [illegible] ابوالفتح ناصر بن ابی

---

[1] ڈاکٹر صدیقی بحوالۂ ماسبق ص ۱۵۲ [2] ایضاً ص ۱۵۳

جعفری احمد الحفاظ اصفہانی کی خود نوشتہ تحریر اور فارسی ترجمہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جو سنہ ۵۲۰ ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں کوذک، بوذ، رسیذ، امیذ کو ذال سے اور درود، داشتن وغیرہ کو دال سے لکھا ہے جو عین وسط صدی ششم کا اصلی رسم الخط سمجھا جا سکتا ہے۔ کاغذ وغیرہ سب چھٹی صدی ہجری کا ہے اور یہ نسخہ قابل ہے۔[1] تاریخی آثار و شواہد کی رُو سے چھٹی صدی ہجری کے بعد آگے بھی دال اور ذال الگ الگ لکھے جاتے تھے اور ساتویں صدی سے یہ امتیاز اٹھنے لگا تھا۔ اس خصوص میں سب سے پرانی روایت غزالی سے قریباً سو برس بعد "المعجم فی معاییر اشعار العجم" مصنفہ نزد ۶۳۰ھ کی ہے جس کے مطابق ایران میں چند مقامات پر یا علاقوں میں یہ دستور ساتویں صدی ہجری کے شروع میں غیر موجود تھا:

"در زبانِ اہل غزنین و بلخ و ماوراء النہر ذال معجم نیست و جملہ دالات مہملہ در لفظ آرند چنانکہ گفتہ اند:

اندر دو چو بینی مرا بدار سے | پیش رخ رخشندہ دست عدا
چون رنگ شراب از پیالہ گردد | رنگ رفت از پشت لست پیدا"[2]

صاف واضح ہے کہ ساتویں صدی کے ربع اوّل تک یہ طریقہ چند علاقے[3] ایران میں یا تو غیر متعارف رہا یا پھر متروک ہوا اور دونوں ہی امکانات ان وقتوں کے کئی خطی نسخوں سے ثابت ہوتے ہیں۔[4] استاد آربری نے راتم کے استفسار پر ۱۵ جون ۱۹۵۷ء کو ترکِ ذال کا زمانہ بتاتے ہوئے ارشاد کیا:

——— There is no doubt that the statement on the ذالِ معجم which is made in the کتاب المعجم is amply confirmed by the evidence of existing manuscripts. I have myself noticed that the

---

۱۔ پروفیسر نظام الدین: گرامی نامہ مورخہ ۱۱-۷-۱۹۶۲ء ۲۔ شمس رازی: کتاب المعجم ایڈیشن قزوینی صـ ۱۹۲-۱۹۱ بحوالہ مقدمہ جہانگشا صـ فط ۳۔ قزوینی کا کہنا ہے کہ اسی بیان سے ثابت ہے کہ ان علاقوں میں یہ قاعدہ رائج ہی نہیں ہوا، یہ ایک علیحدہ بحث ہے جو آگے اس پر عرض کیا گیا ہے۔ ۴۔ علامہ قزوینی کا فرمانا ہے کہ: "از حدود قرن ششم ہجری ببعد ظاہراً کاتبان نا معلوم تدریجاً این تمیز از میان برداشتہ شدہ" قزوینی نے المعجم کی روایت سے پہلے اور [illegible] ہو۔

change in orthographical convention took place during the seventh century A.H."[1]

اسکالر ممدوح نے اپنے بالتصویر اور بے مثال تذکرۂ مخطوطات سے چند حوالے بھی کرسٹ نامے بدرج فرمائے ہیں جن کی مزید وضاحت کے لیے حواشی ذیل ملاحظہ کیے جائیں:

"For instance, in my "Specimens of Arabic and Persian Paleography[2] Plate 25[3] shows a Ms. dated 523 A.H. which has the ذال معجمہ ; whereas plate 30 shows a Ms (of part of the same work) dated 720, which does not show this feature. Plate 26[4] (dated 636) but not in Plate 27[5] (dated 697)."

ان تینوں مثالوں کے بعد پروفیسر آربری نے اس تاثر کا اظہار فرمایا کہ:

"I think there is overwhelming evidence that the change occurred CA. 650 A.H."

---

[1] پروفیسر آربری کا مکتوب مورخہ ۱۲-۶-۶۲ [2] انڈیا آفس کے کتب خانے میں محفوظ نسخوں کا مصور تذکرہ لندن ۱۹۳۹

[3] AL-SURABADI (FL. 460/1068): TAFSIR AL-QURAN FOL. 75 B ← RABI II 523/MARCH-APRIL 1129 اس پلیٹ ۲۵ میں صرف ذال معجمہ ہی نہیں قدیم فارسی مخطوطات کے بہت سے نمایاں عناصر موجود ہیں چنانچہ فاضل صاحب تذکرہ کے بقول:

"——— The orthography exhibits all the archaic characteristics of old persian manuscripts."

[4] سنائی کی شعری حدیقہ اور یہ بھی قدیم طرز کے عمدہ نسخ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ [5] رومی کا فرزند سلطان ولد کا "ابتدا نامہ" قونیہ ۶۹۷ / دو صدیوں کے اتصال کے وقت کی کتابت کی تبدیلی پذیر خصوصیات کا واضح ... من جملہ ذال معجمہ کی عدم موجودگی صاف طور پر ہے۔

اغلب یہ ہے کہ ترتیب ۱۰۳۲ھ کے لگ بھگ [illegible] ہمت کی گئی [illegible] زیادہ قرین قیاس
[illegible] ہے جو ہمارے پاس ایک [illegible] اس ترتیب کے آخر [illegible] پہلے [illegible]
[illegible] اور [illegible] کی طرح [illegible] [illegible] زیر [illegible] ہی تو [illegible] ہر [illegible]
اور اس [illegible] کے بعد [illegible] ہو گیا۔ قیاس کیا جا سکتا
ہے کہ ترتیب ذیل کے [illegible] اشاعت اور تکمیل [illegible] اور [illegible] ہوگا اور [illegible] قبولیت
کا وسیع دائرہ [illegible] وقت [illegible] کے [illegible] تھے کہ اس رجحان
نے فروغ پایا ہوگا۔

[illegible] نے یہ [illegible] کی ترتیب [illegible] اور [illegible] کی کتابت [illegible] اور [illegible] پر
ہو گئی تھی اور اسی [illegible] نامعلوم وجوہ سے [illegible] گیا

"[illegible] دیوان [illegible] کہ در متن [illegible] بدان شعرا [illegible] تا قرن ہشتم
[illegible] ہشتم ہجری [illegible] تا [illegible] گذشتہ [illegible]
[illegible] و قبل از قرن ہشتم [illegible]
[illegible] شعرا [illegible] از [illegible] قرن ہشتم ہجری
[illegible] از [illegible] دیوان [illegible] بر [illegible] ہجری [illegible]
[illegible] شدہ است"[1]

ہمارے سامنے کلیات سعادت [illegible] کے [illegible] ایک نسخے [illegible] ۱۰۳۴ھ کے عکس[2] میں [illegible]
قدیم [illegible] ہے کہ [illegible] ۱۰۳۳ھ کے [illegible] "دیوان [illegible]" [illegible] میں [illegible] مستعمل
[illegible] ہے۔ [illegible] کے [illegible] ایک نسخہ [illegible][3] [illegible] کی کتابت [illegible] ہے۔

---

[1] [illegible]
[illegible] ۔ [2] [illegible] ۔ [3] [illegible]
[illegible] کلیات سعادت [illegible]
[illegible] ۔ [illegible] ۔

لیکن "خلاق نامہ" مورخہ ۶۶۲ھ (تحقیق ص۱۳) اور ۶۶۱ھ کے قرآن مترجم (تحقیق ص۱) کے مخطوطات میں یہ شامل املا نہیں ہے۔ ایک اور اچھوتا نمونہ نظامی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کا ۷ویں صدی (؟) والا نسخہ (تحقیق ص۱۱) ہے جس میں کہیں ذالِ معجمہ کی پابندی کی گئی ہے اور کہیں اس کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ شاید یہ ان وقتوں کا تحریر کردہ ہے جب مہملہ/معجمہ والا دستور ٹوٹنے لگا تھا کیوں کہ اس کی کتابت ۸ویں صدی کے شروع کے نسخے سے ہی خاصی مماثلت رکھتی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر کربری نے نشان دہی فرمائی۔ حدیقۂ سنائی کے ۶۳۲ھ والے مخطوطے (پلیٹ ص۲۶) میں نقطہ دار اور ۶۹۰ھ کے "ابتدا نامہ" سلطان ولد (پلیٹ ص۲۷) میں بغیر نقطہ کتابت ہوئی ہے۔

الغرض، ۸ویں صدی کے شروع سے یہ امر مشاہدے میں آتا ہے کہ اس عرصے کے نسخوں میں املائی اصولوں میں اختلاف رونما ہونے لگا تھا جس میں معجمہ/مہملہ کا بتدریج کم ہوتا ہوا فرق علانیہ ظاہر ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ اختلافات نمایاں ہونے لگے اور سو برس آگے پتہ چلا کہ کتابت کی دوسری بڑی خصوصیات کے جلو میں دال/ذال کا امتیاز ترک کرنے کا رجحان اس انتشار میں پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ ۸ویں صدی میں یہ فرق مٹنا شروع ہوا جیسا کہ علامہ قزوینی کا خیال ہے۔

پروفیسر نذیر احمد نے دو مخطوطات کی املائی خصوصیتوں کی اساس پر اس فرق کے خاتمے کو کافی سے زیادہ متعاقب زمانے تک طول دیدیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے خاکسار کو اپنی ایک بیش بہا علمی دریافت سے مستفیض کرتے ہوئے تحریر فرمایا:[1]

"میرے پیشِ نظر دو قدیم نسخوں کے عکس ہیں ایک ۷۰۰ھ کا مکتوبہ اور دوسرا ۶۶۸ھ کا مکتوبہ ہے۔ دونوں کی املائی خصوصیات بڑی قابلِ توجہ ہیں۔ دونوں میں دال اور ذال کا فرق بالکل نمایاں ہے، آید کہیں نہیں ہر جگہ آیذ ہی ہے۔ اسی طرح حرفِ بیان اور کافِ استفہام 'کہ' ہر جگہ بشکل 'کی' ہے اور اس میں کسی قسم کا استثنا نہیں۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کم از کم اواخر ساتویں صدی ہجری کے املا میں 'کہ' کو جگہ نہیں ملی تھی اور دال و ذال کا امتیاز بالکل باقی تھا۔ باے فارسی، جیم فارسی اور زاے فارسی کا امتیاز ایک حد تک کر دیا گیا تھا۔ 'ی' بطور علامتِ اضافت کم استعمال ہوتی، اس کے بجاے ہمزہ کا چلن زیادہ تھا۔ مثلاً"

۱۔ پروفیسر نذیر احمد صدر نشین شعبۂ ادبیات فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، گرامی نامہ مورخہ ۲۷-۱۱-۱۹۶۲

چھٹی صدی کے بجائے جیز یا دال کی شکل ملتی ہے :

یعنی انھی شواہد سے تفصیلی استفادے کے ساتھ بعد کے ایک مقالہ نالا میں پروفیسر صاحب ممدوح نے اسی تاثر کا اعادہ فرمایا کہ "دال اور ذال کا یہ فرق نویں صدی کے آخر تک برتا جاتا رہا، گو اس پر عمل درآمد کی سختی نویں صدی کی ابتدا سے کچھ کم ہونے لگی تھی"[1]

اس بارۂ خاص میں عرض یہ ہے کہ المعجم کی روایت بقول پروفیسر آربری اس کی معاصر کتابت کی متعدد مثالیں کی بنا پر تاریخی سند کی حیثیت رکھتی ہے، یعنے یہ کہ ابتدائی ۷ ویں صدی تک ہی دال اور ذال کا فرق برخاست ہونے لگا تھا۔ قبل ازیں مذکورہ چند مخطوطات کی تصاویر سے بغور استفادے پر ہم کو اس کلیے کو تسلیم کرنے میں تامل محسوس ہو رہا ہے کہ ۷ ویں صدی کے اخیر کے املا میں معجمہ / مہملہ کا امتیاز بہمہ وجوہ باقی تھا۔ دیگر پختہ اور موثق شہادتوں کی موجودگی میں یہ بھی باور نہیں آتا کہ یہ طریقہ آیندہ چند صدیوں تک رائج رہا تھا کہ ۹ ویں صدی میں اختتام پذیر ہوا۔

یہاں ہم بطور احتیاط کچھ مزید نمونوں کے نام لیں گے مثلاً "کیمیاے سعادت" کے احمد آرام ایڈیشن کا ۸ ویں صدی کا نسخہ جس میں مطبوعہ نوٹ کے مطابق ذال معجمہ لکھا ہی نہیں گیا اور یہی بات اس کے ہم عصر مخطوطات میں پائی جاتی ہے۔ جیسے آربری پلیٹ نمبر ۱ مورخہ ۳۰، صوائد سید عبداللہ تحفے نمبر ۱۲ مورخہ ۵۹، حرز جہاں کشا کے متاخر نسخے۔ عہد غزالی یعنے ۵ ویں صدی کی کتابت کی اور بہت سی خاصیتیں بھی جو اندریں اثنا رفتہ رفتہ مفقود بلکہ معدوم ہو چکی تھیں آٹھویں صدی کے املا میں شاذ و نادر ہی باریاب ہوں گی۔

زیر مطالعہ نسخۂ بانکی پور پر نتیجہ خیز گفتگو کے نقطۂ نگاہ سے اور جاریہ بحث کے تسلسل میں یہ سوال بھی مساوی طور پر اہم ہے کہ ذال معجمہ اور دال مہملہ کے امتیاز کا باقاعدہ اور بالکلیہ خاتمہ آخر کس صدی یا اس کے کس ربع یا نصف حصے میں قرار دینا قرینِ حقیقت ہوگا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی راے میں بھی "یہ آٹھویں صدی ہجری کا ہی زمانہ تھا جب یہ تفریق یا ضابطہ ختم ہوگیا۔ لکھے پڑھے لوگ دونوں حرفوں میں تمیز کرتے رہے مگر عوام کی بولی میں "ذ" کی جگہ "د" کا استعمال بڑھتا گیا یہاں تک کہ آٹھویں صدی کے ختم ہونے تک "د" نے "ذ" کو پوری طرح بے دخل کر دیا۔"[2]

---

[1] ڈاکٹر نذیر احمد: مقالہ "نقوش" مارچ ۱۹۶۳ بعنوان "تحقیق و تصحیح متن کے مسائل" ص ۱۴۰

[2] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی: مقالہ "ارمغان علمی" ص ۱۵۱

گزشتہ صفحات سے عیاں ہے کہ یہ مقابلۂ طوالت تک سمجھی جاتی ہے جو کہ نسخۂ [illegible]
دیوان ہی مختصر ہے کو محفوظ نہیں رہا ہے۔ کتاب [illegible] کی روشنی میں [illegible]
دیوان کا [illegible] ہو کر اور [illegible] [illegible] میں [illegible] ہو گیا تھا۔ [illegible]
اور کا ایسا مخطوطہ شاذ و نادر ہی ملتا ہے جس میں کاتب نے [illegible] [illegible]
بہر حال نسخے کی دیگر قدیم خصوصیات کے علاوہ [illegible] [illegible] [illegible]
باعث شدہ شدہ اس کے ساتھ طریقے [illegible] کا منظر ہو گئے۔ [illegible] کے کاتب کے [illegible]
لازم ہیں جنہیں علم [illegible] نہیں ہو گئے بلکہ اس میں [illegible] [illegible] [illegible] تبدیلیں
کی اشاعت اور مقبولیت میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
اتفاقات ختم ہوئے۔ اس کا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
طرح کے [illegible] اس وقت تک پورا [illegible] سے باہر ہو چکے تھے۔

مخدومی پروفیسر حمید احمد صاحب قبلہ صدر نشین شعبۂ ادبیات [illegible] مسلم یونیورسٹی کے اس تحقیق
[illegible] [illegible] کا سہرا ہے جنہوں نے سب سے پہلے اس [illegible] [illegible] [illegible] بلکہ
اپنے [illegible] مبارک میں [illegible] کیا۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح نے تحریر فرمایا: "[illegible] [illegible] [illegible]
معاصر کی تحریر [illegible] میں آتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہو گیا
ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔ [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] کے نسخوں سے اس [illegible] ثابت نہیں ہوتا ہے۔ [illegible]
موصوف نے [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible] فرمائے: [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

---

۱ ڈاکٹر [illegible] [illegible] ۲ ڈاکٹر [illegible] [illegible]
۳ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] سے جی لوہا تک ہے۔ آخری شہر [illegible] سعد سلمان [illegible] شناسنامہ
[illegible] شد

مقالہ اقتباس سے [illegible] بر تصحیح ثبت [illegible] کا [illegible]
[illegible] المعجم سنہ [illegible]
[illegible] پیش کیا جا چکا ہے۔

[illegible] المعجم کے [illegible] تحقیق و تصحیح کے سلسلے میں [illegible]
[illegible] کا اصل فارسی [illegible] چنانچہ [illegible] گزشتہ [illegible]
[illegible] قرار دیے ہوئے ہیں۔ [illegible] فارسی [illegible]
[illegible] جیسے [illegible] ایرانی زبان [illegible]
[illegible] ہے۔

[illegible] ابتدا [illegible] سے متعلق [illegible] میں [illegible]
[illegible] اشارہ کیا ہے کہ علامہ [illegible] کتاب المعجم کے بیان کردہ شہروں میں اس [illegible] اشاعت کے
[illegible] قدیم ترین مخطوطے مورخہ [illegible] کو [illegible]
[illegible] ایرانی علاقوں میں [illegible] اور یہ کہ صاحب المعجم نے [illegible]
[illegible] سے [illegible]

"[illegible] سنہ [illegible] فارسی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]"

۱۔ ڈاکٹر نذیر احمد: [illegible] حاشیہ ۲

ذال ہای معجمۂ فارسی را مانند کنون دال مہملہ میخوانند و می نوشتند و مؤید این احتمال یعنی این کہ انجام ذال فارسی در آن عصر در جمیع نواحی فارسی زبان تعمیم نداشتہ آنست کہ شمس الدین محمد ابن قیس الرازی در کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم کہ در حدود سنہ ۶۳۰ھ تالیف شدہ گوید ـــــ الخ" (منقول گزشتہ روایت)[۴]

دراصل علامہ قزوینی نے ذال اور دال کے قاعدے کے ترک پر مجوزہ ملاحظات میں کوئی بحث نہیں فرمائی بلکہ رازی کے قول کا یہ مطلب اخذ فرما لیا۔ مصنف المعجم کا منشا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بقول قزوینی ان مقامات میں دال/ذال والا اصول پہنچا ہی نہیں لیکن دوسری طرف کتاب کے ہم عصر کئی ایک خطی نسخوں میں یہ پورے التزام سے برتا ہی نہیں گیا۔ اس لیے اغلب تو یہی ہے کہ صاحب المعجم کا مطلب اس فرق کے رائج الوقت املا کے ختم ہوتے جانے سے تھا نہ کہ ان علاقوں میں سرے سے پائے ہی نہ جانے سے۔ ۷ویں صدی ہجری کے پہلے پہل سے لے کر آخر تک کے نسخوں میں اس امتیاز کے تدریجاً کم ہوتے جانے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سب علاقوں میں یہ طرز پھیلا ہوا تھا۔ کتابت کی دوسری خصوصیتیں باور کراتی ہیں کہ عربی سے مستعار اس رسم خط کے مشترک عناصر میں تدریج افزوں تر ہونے والی تبدیلیاں تھوڑے بہت زمانی فرق کے ساتھ ملک گیر اشاعت پا رہی تھیں اور اس میں چنداں تعجب کا محل نہیں۔ چنانچہ مثلاً ذال معجمہ اور دال مہملہ کے امتیاز نیز اس کے ترک کے بھی رجحانات بیک وقت زمانی فصل کے بھی حامل تھے اور مکانی فرق کے بھی۔

دونوں میں سے کسی ایک فرق کو صرف نظر کر دینے یا کسی ایک پر بحث و نظر کا کلیۃً دارومدار رکھنے کے ہی نتیجے میں اشکال پیدا ہوتا ہے جو اتفاق بہت کم اور بڑی حد تک نظریاتی ہوا کرتا ہے۔ زمانی فصل اور مکانی فرق کے امکانات و اثرات کو ذہن نشین رکھا جائے تو ایک واضح نتیجے تک پہنچنا بالکل آسان اور قرین حقیقت ہو جاتا ہے۔ اصل میں کسی ایک کی نظر اندازی لازمی نتیجہ ہے اس عدم اعتنا کا جو قدیم مصنفین کی مکانی وابستگیوں کی دریافت و تدقیق کے تئیں ہمارے تحقیقاتی مزاج و منہاج کا لاطائل عرصے سے خاصہ رہا ہے۔ شخصیات اور تصانیف کے زمانہ ہائے وجود و تخلیق کے تعین کی طرح ایسے خالصتہً تکنیکی امور کی حد تک مکانی تعین ایک ناگزیر امر ہے جس پر عدم توجہی کے سبب اس نوع کے فنی پہلوؤں میں بحث و نگاہ کا انحصار اور ارتکاز لازماً

---

۴ قزوینی: دیباچۂ جوینی صفحہ یح / فط

زبانی توجہات پر ہوجاتا ہے اور یہیں سے نظری اور تشخیصی اشکال کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس مقطع میں آ پڑی ہے سخن گستر انہ بات قسم کے جملۂ معترضہ کے بعد راقم اپنی حقیر تلاش و تدقیق کے نفس موضوع یعنے "کیمیائے سعادت" کے مخطوطۂ بانکی پور کی حقیقت و اصلیت کے تعین کی طرف رجوع کرتا ہے۔

معاصر افاضل کے مکاتیب گرامی

غزالی کے قریب ترین زمانے یعنے ۵ ویں / چھٹی صدیوں میں فارسی املا کے جو نمایاں اور اہم عناصر ہیں وہ زیر مطالعہ نسخۂ خدا بخش میں سرے سے مفقود بلکہ معدوم ہیں۔ ذال اور دال کی رعایتی تفریق ہی نہیں قریب قریب ساری ایسی خصوصیات اس میں بالکلیہ غیر موجود ہیں جو چند متعاقب صدیوں تک رائج ہیں۔ نتیجۃً پورے اعتماد سے عرض کیا جاسکتا ہے کہ اس مخطوطے کو عہد غزالی کے خط اور املا سے مطلقاً کوئی نسبت نہیں ہے۔ خاکسار کا یہ بھی اندازہ ہے کہ فارسی رسم خط کی روایتی خصوصیتوں کی عدم موجودگی اور تبدیل شدہ املا کے اثرات کی رو سے اس قلمی نسخے کو ۹ ویں صدی سے زیادہ قدیم نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اس خصوص میں بین الاقوامی سطح پر محترم و معزز علمائے ایرانیات کے گراں مایہ و گراں قدر مکرمت ناموں سے استفادہ و استشہاد کی احتیاج یقینیؔ ہے جن سے راقم نے اکتساب ہنر کی سعادت حاصل کی ہے۔ ان لائق صد عز و اکرام افاضل کی توجہ فرمائی اور طالب علم نوازی کا فیضان بذریعہ بنا عام کرتے ہوئے احقر العباد تمام گرامی قدر و گرامی مرتبت معاصرین کے تئیں سپاس و امتنان کا تہ دمانہ بصد عجز و نیاز پیش کرتا ہے۔

اولاً دوران مطالعہ پٹنہ میں ہی قیام فرما دو نامور و بزرگ اسکالروں کے افادات نذر ہیں:۔ یعنے عالی جناب قاضی عبدالودود صاحب اور محترم المقام پروفیسر سید حسن صاحب ناظم اعلیٰ ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی کہ دونوں حضرات نے "کیمیائے سعادت" کے متعلقہ نسخے کو بطور خاص ایک سے زائد بار ملاحظہ فرمایا اور دیگر قدیم مخطوطات سے اس کے تقابلی تجزیے کی زحمت بھی فرمائی۔

مرحوم و مغفور قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے ایک نامۂ نوازشات میں یہ ارشاد کرتے ہوئے کہ "کیمیائے سعادت کے اس نسخے کو جس کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے میں نے پھر دیکھا" تحریر فرمایا کہ "ایک امر اس کے طور کو تقویت پہنچاتا ہے کہ کتاب اس عہد کی لکھی ہوئی ہے۔ اور وہ یہ کہ پد، چوں شاد، خود وغیرہ الفاظ اس میں بالالتزام یا مقطع ہیں حالانکہ عہد غزالی میں بلکہ اس کے آگے تک بھی ذال نقطہ دار لکھے جاتے تھے"۔[۱]

دوسرے مکتوب میں آپ نے مطلع فرمایا: "میں نے کیمیائے سعادت کے اس نسخے کو دوبارہ دیکھا۔ کاغذ کے بارے میں مجھے اتنا علم نہیں رکھتا کہ یہ کہہ سکوں کس زمانے کا ہے۔ لیکن اس میں باد، بود، شد، شاد وغیرہ کے قبیل کے الفاظ میں دال پر نقطہ نہیں اور غزالی کے زمانے میں دال نہیں ذال سمجھتے تھے اور جیسا قزوینی کا خیال ہے تلفظ بظاہر تلفظ میں اسی طرح کرتے تھے۔[2] احتیاطاً مزید معاینہ و مقابلہ کی گزارش پر قاضی عبدالودود نے اسے غیر ضروری قرار دیا: "کیمیائے سعادت کے نسخے چند کو بہت زمانہ ہوا میں نے دیکھا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ باور کرانے کی کہ اس کی کتابت خود غزالی کی تھی کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔ آپ کا پہلا خط آنے کے بعد میں نے جا بجا سے پھر دیکھا اور اسی نتیجے پر پہنچا۔ تیسری بار دیکھنے کی مجھے کچھ ضرورت نظر نہیں آتی۔"[3]

پروفیسر سید حسن صاحب نے گہری نظر سے ملاحظہ و نسخ کر کے اس کی تفصیل بیان فرمائی: "کیمیائے سعادت کے مذکورہ نسخے کے بارے میں میرے لائق دوست ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے بھی پہلے سے دریافت کیا تھا۔ ان ہی کی فرمائش پر میں نے اس مخطوطے کو غور سے دیکھا اور جو بات میری سمجھ میں آئی اس سے ان کو مطلع کیا۔ آپ کو بھی اطلاع دیتا ہوں کہ یہ مخطوطہ اس کے مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے کیوں کہ اس کا انداز تحریر اس امر کی شہادت نہیں دیتا۔ یہ مخطوطہ میرے خیال کے مطابق نویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ اگر خود مولف کے دست مبارک کا لکھا ہوتا تو اس کا انداز جدا گانہ ہوتا۔ سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس میں ذال فارسی کا کہیں وجود نہیں۔ اگر مخطوطہ قدیم ہوتا تو یہ بات لازمی ہوتی۔ میں نے ساتویں صدی ہجری کے ایک مخطوطے سے اس کا مقابلہ کر کے دیکھا تو یہ فرق نمایاں ہو گیا۔ نویں صدی ہجری کے مخطوطے سے بھی مقابلہ کیا تو مشابہت نظر آئی۔"[4] راقم کا التماس تھا کہ صرف ایک بار اور اس نسخے پر نگاہ فرماتے لیکن آپ کا ارشاد تھا کہ دو مرتبہ بڑی خصوصیت سے آپ نے اس کو ملاحظہ فرمایا تھا: "نسخہ کیمیائے سعادت کے بارے میں میں نے جو کچھ پہلے آپ کو لکھا ہے وہ خاصی محنت اور غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ اس سلسلے میں دوبارہ اس نسخے کو دیکھنے اور معاملے پر غور کرنے کی ضرورت ہوگی۔ آپ سے پہلے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے دریافت کیا تھا، ان کو بھی یہی جواب دیا تھا پھر آپ نے دریافت کیا تو

---

[1] خط مورخہ ۲۳-۴-۶۲ [2] مورخہ ۱۱-۷-۶۲۔ فاضل محقق نے غالب اور ذال عجمی کی بحث میں مقالہ کا ایک خط میں حوالہ دیا تھا لیکن تلاش بسیار کے باوجود حاصل نہ ہو سکا۔ البتہ بعد میں ایک اور تحقیقی تحریر نظر افروز ہوئی ملاحظہ ہو "حافظ اور ذال فارسی" در "نقوش" لاہور دسمبر ۱۹۶۶ء۔ [3] پروفیسر سید حسن کا گرامی نامہ مورخہ ۱۰-۳-۱۹۶۳

پھر نسخہ کو توجہ سے دیکھ کر جواب دیا۔[1]

اور اب ہندوستان سے لیکر انگلستان تک کے اکابر ماہرینِ فن کے ملاحظات کے اہم اجزا اقتباس کیے جاتے ہیں جن کی خدماتِ اقدس میں مخطوطے کی نقل اور تصاویر حاضر کرکے ان کے فرموداتِ عالیہ کو مشعلِ راہ بنایا گیا۔ ان بزرگ علماء و فضلاء میں اساتذۂ جامعات کے علاوہ ایران و ترکی کے افاضل اور فارسی مخطوطات کے پارکھ مستشرق حضرات شامل ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اس مخطوطے پر ۵۰۰ھ اور ۶۶۸ھ نیز ۸۵۸ھ کے نسخوں کی روشنی میں پائے گئے فارسی کتابت کے ارتقا پذیر عناصر کے حوالے سے یہ تبصرہ فرمایا: "ان میں سے ایک بھی خصوصیت کیمیائے سعادت، نسخۂ بانکی پور میں موجود نہیں ہے۔ نسخۂ بانکی پور دسویں صدی کے اواسط سے لیکر گیارھویں صدی کے اوائل کے درمیان کا ہوگا، اس سے قبل کا نہیں ہو سکتا۔ اگر بہت کھینچ تان کی جائے تو اوائل نویں صدی تک لایا جا سکتا ہے"[2]۔ ازاں بعد اپنے مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے مخطوطۂ بانکی پور کے تذکرے کے ساتھ یہ تاثر سپردِ قلم فرمایا: "یہ نسخہ اوائل یازدہم ہجری یا اواخر دہم ہجری سے قبل کا نہیں ہو سکتا، اس بنا پر کہ اس میں دال و ذال کا وہ فرق جو قدیم نسخوں کا املائی خاصہ تھا ایک جگہ بھی برقرار نہیں رکھا جا سکا ہے۔ یہی حال دوسری قدیم املائی خصوصیات کا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو پانچویں صدی ہجری یعنے امام غزالی کی حیات کا سمجھنا حقیقت کے سراسر خلاف ہے"[3]۔

پروفیسر اے جے آربری موصوف علیہ نے از رہِ لطف و عنایت مفصل طور پر تنقید کرتے ہوئے وثوق اور قطعیت سے فرمایا:

My impression is that the attribution of parts of the Ms. to Ghazali himself is Mistakun. The type of Naskh was current to as late as the 8/14th. century. In a Persian Ms of the 6/12th. century one would expect to find کہ to be written as کی and زیرا کہ as زیراکی, also چہ written as چ. In addition one would expect the old "post-

---

[1] خط مورخہ ۲۶-۷-۶۲ء [2] ڈاکٹر نذیر احمد: خط مورخہ ۲۶-۱۱-۶۲ [3] ڈاکٹر نذیر احمد مقالہ محولۂ گزشتہ ص۲

vocalic": to be shown invariably. e.g. وانذ for واند and داذند for داذند. In the pages of the Bankipore Ms. this does not appear. So in my opinion the older part of this Ms. was written not earlier than CA 650/1252. The change in orthography is generally thought to have taken place during the 7/13 th. century." [1]

راقم کے استفسار پر فاضل مستشرق نے اپنے عکسی تذکرہ نسخ سے مزید تصریحات کے علاوہ ایک اور مخطوطے کے حوالے سے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: [2]

"In the examples produced in my specimens, you will notice that post-vocalic DHAL (یعنی: ذالِ معجمہ) is not present regularly in 27 dated 697 A.H., 29 dated 728 and 30 dated 730. In the Chester Beatty Persian Ms 301, the first Folio is a later supply. The main part of that MS regularly observes post-vocalic DHAL; in the first folio this feature is absent. The first folio also contains a notice of Waqf dated 712 A.H., which proves that this folio is atleast as old as that.

In view of the fore-going evidences, and the like, I would not be willing at the present time to estimate the date of the Bankipore Ms more precisely than later than 650 A.H."

---

[1] پروفیسر آربری: خط مورخہ ۲۵-۳-۶۳ء   [2] خط مورخہ ۹-۴-۶۳ء

عالی جناب میر مرتضیٰ رضوی صاحب قبلہ سربراہ شعبۂ مطبوعات و مخطوطات مشرقی برٹش میوزیم نے نسخے کی تصویروں پر یہ اظہار تاثر فرمایا:[1]

To my mind it looks as if it is more likely to be of the VIII / XIV th century. I doubt whether it could be as early as the beginning of the XII th century, judging by the writing. My assessment of the date would be XIV th century.

خاکسار کے اصرار پر فاضل ہنر شناس نے اپنی تفصیلی رائے سے ایک اور بار سرفراز فرمایا:[2]

There is no reliable means of ascertaining the date of an early persian manuscript within a century. The earliest known Persian Ms. at Vienna dated 1056 A.D. is in a hand like kufic. The next earliest in date 1085 at Oxford looks quite modern, but a copy of the TARJUMĀH AL-BALAGHAH at Istanbul dated 1114 looks even more archaic than the Oxford Ms.

One cannot be more precise. All that I can say is that the Ms is at least as early as the XIV th century. This view is based on my fifteen years' experience in dealing with persian Mss. Beyond this I am not prepared to go.

One can however state whether a manuscript has been written before A.H. 900 because during the 9th / 15th

---

[1] G. Meredith Owens: Letter dated N.I.63;4 [2] مورخہ ۱۵-۷-۶۳

century there were considerable changes in orthography. (See BAHAR' SABK-SHINASI," III PP. 307-9).

عالی درجات پروفیسر احمد آتش صاحب ناظم اعلیٰ ادارۂ شرقیات جامعہ استانبول کے دقیق و موقر اظہارات کی رو سے نسخۂ بانکی پور کے اوّلین اوراق کا قلم نویں اور دسویں صدی کے خط شیراز کے متداول طرز کتابت سے مطابقت رکھتا ہے جب کہ:

Thinking about the part attributed to Imam's own handwriting I must say that this part really belongs to an earlier period. Such a writing, from the view point of form may belong at the earliest to H. 7th. century. But as we know, in this century the letter D following a vowel is written as. D. However, I think I have seen manuscripts definitely belonging to the 7th. century in which there were no. Ds. Therefore this part of the manuscript may belong to the 7th century. But I think it is totally impossible to name an earlier date because both the Arabic and Persian manuscripts from AL-GHAZALI's time E.G. AL-ABNIYA & TARJUMĀN AL-BALAGHA have completely different types of writing. It is possible to see this in the works that Arberry and munaccid have published. For these reasons the attribution that part of the said manuscript is in Imam's handwriting seems impossible to me. The handwriting looks more like that of a calligraphist than of a scholar.[1]

---

[1] پروفیسر احمد آتش: مکتوب نامہ مورخہ ۲۶-۲-۶۴

گرامی منزلت استاد مجتبیٰ مینوی رئیس قسمتِ فنون دانشگاہِ تہران کا بھی فرمودہ باعتبار نتائج بندان مختلف نہیں ہے:[1]

——— Pages 61 and 62 can not possibly be the han writing of AL-GHAZALI. They are penned, most probably by a professional calligrapher and copyist of the 8th century of Hijra i.e. some two hundred years after the death of the Imam. This is merely from the style of writing I can observe in the photographs.

محترم و معظم مستشرق پروفیسر جی ایم وِکنس صاحب سابق صدر شعبۂ اسلامی مطالعات جامعہ ٹارنٹو کا یہ تاثر رہا ہے کہ چند امور کی بنا پر غزالی کے خود نوشت نسخے کا اتنا طویل عرصہ باقی رہ جانا ایک مشتبہ امر ہے۔ ہم دانشگاہ مذکور کے اسی شعبہ کے استاذ اور ایک اور ثقہ و معتبر مستشرق گرامی قدر ڈاکٹر راجر ایم سیوری صاحب (حالیہ متعینہ ٹرینٹی کالج ٹارنٹو) کے احسان گزار ہیں کہ ڈاکٹر سیوری صاحب قبلہ نے پروفیسر جی ایم وکنس کی رائے عالی سے مستفیض فرمایا۔ پروفیسر سیوری صاحب نے اپنے نامۂ لطف و کرم میں یہ ارشاد کیا:[2]

Professor Wickens is inclined to doubt that the manuscript is an autograph of the author. He says that it is commonly accepted that AL-GHAZALI dictated virtually every thing.

ڈاکٹر آر ایم سیوری کے بقول مستشرق ممدوح پروفیسر وکنس کا تاثر رہا ہے کہ:

KIMIYA-YI SA'ADAT is a very popular work, and it is axiomatic that popular works do not survive — precisely because they are popular and consequently fall to pieces quickly as the result of much handling.

---

[1] پروفیسر مجتبیٰ مینوی: نامۂ عنایت مورخہ ۶-۳-۱۹۶۵ء [2] پروفیسر آر ایم سیوری: نوازش نامہ مورخہ ۱۸-۳-۱۹۶۳ء

an obvious example is the "GULISTĀN" of SA'DI, of which no early MSS exist.

اس کے بعد جب چند اوراق کی تصویریں پروفیسر وکنس کے ملاحظات کے لیے ارسال کی گئیں تو فاضل موصوف نے حتمی شاہدے کے طور پر صرف اسی فرمودے پر اکتفا کیا [1]

I regret that I feel unable to add any thing to earlier comments I have made.

امید کی جا سکتی ہے کہ عہدِ حاضر کے مردم ثقات کے ماہرانہ تبصرے ان صاحب الرائے علماء کی جانب خاص سے مخطوطہ بانکی پور کی حقیقت و اصلیت کو مستقلاً طے کرنے کے لیے کافی و شافی ثابت ہو سکیں گے۔

۵۰

[1] Professor G.M. Wickens: Letter dated 3.11.1969

نسخہ خدابخش کے بارے میں

خدابخش لائبریری میں کیمیائے سعادت کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ پاکیزہ خط نستعلیق میں یہ خوبصورت مطلا و مذہب نسخہ غالباً اس کتاب کا قدیم ترین نسخہ ہے۔ نسخہ پر تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ لیکن نسخے کے اوراق ۶۱-۹۵، ۱۰۵-۱۰۶ اور ۱۲۱-۲۶۸ کی کتابت قدیم خط نسخ میں ہے اور یہ خود امام غزالی (مصنف کتاب) کی خودنوشت تحریر میں ہے۔ نوٹ اس طرح ہے:

"از مردم ثقات مثل میرزا محمد زاہد مرحوم صدر کابل و مولوی عبدالحکیم و میران محمد فاضل مرحوم گجراتی مسموع شدہ کہ خط قدیم این کتاب شریف و نسخہ لطیف خط امام الہمام قدوۃ العارفین اسوۃ السالکین امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ است و چند جزو اول و چہار ورق آخر خط کاتب است۔"

لیکن اس نوٹ کے کاتب کا نام مذکور نہیں۔ آغاز و اختتام دونوں جگہ جہاں یہ نوٹ درج ہے اسکی داہنی جانب قابل خاں عالمگیری کی ایک مہر ہے جس کے اوپر "مالکہ و قابضہ" لکھا ہے جس کا خط نوٹ کے خط سے ملتا جلتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر قابل خاں عالمگیری ہی کی ہے۔ چنانچہ متعین طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نسخہ امام غزالی کی خود نوشت ہے۔

اس نوٹ کے نیچے چار مزید نوٹ درج ہیں، پہلا نوٹ "بکیس عطاء اللہ" کا ہے:

"کیمیائے سعادت بخط قدیم نسخہ صحیح چند جزو اول و وسط و آخر بخط جدید بے لوح و جدول بکیس عطاء اللہ نائب قابل خان داروغہ کتابخانہ کاغذ داغدار غرہ شہر صفر سنہ ۳ جلوس والا تحویل محمد باقر شود"۔

دوسرا نوٹ اس طرح ہے:

"بتاریخ ہفتم شہر محرم الحرام سن ۵ از وجوہ محمد باقر متوفی تحویل محافظ خان عرف محمد منصور شد"۔

تیسرا نوٹ اس طرح ہے:

"سیم محرم ۲۳ راز دجوہ محافظ خاں تحویل محمد حافظ شد"۔

پھر چوتھا اور آخری نوٹ اس طرح ہے:

"ذیقعدہ سن ۳۰ راز دجوہ محمد حافظ (تحویل) محمد احفوظ خاں شد"

اس کے علاوہ مزید دو نوٹ اور تھے جو کاٹ کر مٹا دیے گئے ہیں۔

کتاب جیسا کہ معلوم ہے 'احیاء العلوم' کا اختصار ہے جس کی نشاندہی مصنف نے دیباچہ میں کردی ہے۔ دیباچہ مندرجہ ذیل چار عنوانوں پر مشتمل ہے:۔

۱۔ عنوان اوّل آنست کہ حقیقت خود را بشناسد۔

۲۔ عنوان دوم آنست کہ حق تعالیٰ را بشناسد۔

۳۔ عنوان سیوم آنست کہ حقیقت دنیا را بشناسد۔

۴۔ عنوان چہارم آنست کہ حقیقت آخرت را بشناسد۔

متن کتاب بھی چار 'رکن' پر منقسم ہے۔ پہلے دو 'رکن' میں دنیاوی زندگی اور آخری دو 'رکن' میں روحانی زندگی پر بحث کی گئی ہے۔

سلیم الدین احمد
(اسسٹنٹ لائبریرین، خدابخش لائبریری)

دا بخش لائبریری کے مخطوطات پر اہم مہریں

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن
اسسٹنٹ لائبریرین، خدا بخش لائبریری

خدابخش لائبریری اپنی نادر قلمی کتابوں اور خوش خط و مصور نسخوں کی وجہ سے علمی دنیا میں اہم مقام رکھتی ہے۔ ان کتابوں پر جا بجا مختلف بادشاہوں، نوابوں اور اہل علم کی مہریں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ایک طرف ان بادشاہوں اور اہل علم کی ملکیت ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف ان کی وسعت نظر اور علمی ذوق کی نشاندہی ہوتی ہے۔

خدابخش لائبریری میں فارسی زبان کے تقریباً ساڑھے چار سو ایسے قلمی نسخے موجود ہیں جن پر اہم شخصیات کی مہریں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ عربی زبان کے تقریباً چار سو ایسے قلمی نسخے ملتے ہیں جن کے شروع یا آخر میں تاریخی اور اہم اشخاص کی مہریں پائی جاتی ہیں۔

مندرجہ ذیل سطور میں چند بادشاہان/ارباب علم اور امراء مخطوطات کے نام تحریر کیے جا رہے ہیں جن پر ان کی مہریں ثبت ہیں اور جن کی وجہ سے ان کتابوں کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔

نام بادشاہان/امراء	نام کتاب
محمد قطب شاہ (۱۰۳۵-۱۰۲۰ھ)	رسالہ ادعیہ کتاب نمبر ۲۰۰۹ (فارسی)
" "	جہانگیر نامہ " ۱۱۳ "
محمد قلی قطب شاہ	انوار العقول، کتاب نمبر ۱۰۴۹ (عربی)
جہانگیر (۱۰۳۷-۱۰۱۴)	دیوان شاہی، کتاب نمبر ۴۵۴ (فارسی)
" "	دیوان حافظ کتاب نمبر ۲۱۸ (فارسی)
عنایت خان شاہجہانی عبد الرشید دیلمی (شاہجہاں کے دربار کے امیر)	خمسہ نظامی " ۱۲۸۸ " دیوان حیدر کوچ " ۴۵ " دیوان کمال " عجائب المخلوقات (عربی)

نام بادشاہان وامراء	نام کتاب
عبدالرشید دیلمی (شاہجہاں کے دربار کا امیر)	احیاء علوم الدین، کتاب نمبر ۱۲۶۳ (عربی)
عبداللہ قطب شاہ (۱۰۸۵-۱۰۳۵ھ)	دیوان اثیر، کتاب نمبر ۳۰۵ (فارسی)
" "	جہانگیر نامہ " ۱۱۳ (")
منعم خان خاناں، میمنت خان، خواجہ سہیل وغیرہ	دیوان مرزا کامران، کتاب نمبر ۳۴۰ (")
شہزادہ پرویز برادر بزرگ شاہجہاں بادشاہ	حدیقۃ الحقیقۃ، کتاب نمبر ۲۹۷ (")
شاہجہاں بادشاہ (۱۰۶۸-۱۰۳۷ھ)	وفیات الاعیان، کتاب نمبر ۲۲۸۸ (عربی)
" "	تذکرہ خوش نویساں، کتاب نمبر ۱۰۸۵ (فارسی)
" "	التبیان فی البیان، کتاب نمبر ۱۶۲۴ (عربی)
" "	دیوان حافظ، کتاب نمبر ۳۱۸ (فارسی)
اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی (۱۱۱۸-۱۰۶۸ھ)	بحر الحقائق والمعانی کتاب نمبر ۲۰۰ (عربی)
" " "	تذکرہ خوش نویساں " ۱۰۸۵ (فارسی)
" " "	مصادر " ۷۹۸ (")
" " "	مثنوی مولانا روم " ۲۵۲۲ (")
" " "	شرح سفر السعادۃ " (")
" " "	التبیان فی البیان " ۱۶۲۴ (عربی)
شہزادہ محمد سلطان (اورنگ زیب کا سب سے بڑا لڑکا) (۱۰۸۷ھ)	مجمع بحار الانوار " ۱۴۰۱ (")
" " "	جہانگیر نامہ " ۱۱۳ (فارسی)
فضائل خان (اورنگ زیب کے دربار کا امیر)	قمع النفوس " ۲۶۶۲ (عربی)
" " "	عین العلم وزین الحلم " ۱۳۵۳ (")
قابل خان (اورنگ زیب کے کتبخانہ کا لائبریرین)	طہارۃ القلوب والخضوع کتاب نمبر ۱۴۲۲ (عربی)
" " "	مواہب علیہ " ۱۱۵۱ (فارسی)
سیادت خان امیر دربار عالمگیر بادشاہ	المحصول فی اصول الفقہ " ۲۶۰۵ (عربی)

نام بادشاہان/امراء	نام کتاب			
حکیم شفیع خاں (ملازم اورنگ زیب بادشاہ)	استطرف من کل مستظرف	کتاب نمبر	١٨٣٥	(عربی)
محمد شاہ بادشاہ غازی (١١٦١ - ١١٣١ھ)	معارج الفہم	کتاب نمبر	١٢٦١	(")
" "	مثنوی رومی	"	٢٣٩٧	(فارسی)
" "	کلیات کلیم	"	٢٣٧٨	(")
" "	شاہنامہ ج ٢	"	٣٧٨٨	(")
" "	دیوان قاسم انوار	"	٢٣٩٦	(")
" "	الروضۃ البہیہ	"	٣٢٢٣	(عربی)
سلطان محمد سلیمان صفوی موسوی (١١٣٠ھ)	قرآن مجید	"	٥	(عربی)
زیب الدولہ مرید خاں (١١٧٠ھ)	قرآن مجید	"	٦	(")
قادر علی خاں بہادر منور جنگ	رسالہ منظومہ در اصول حدیث	"	٢٣٩٦	(اردو)
محمد فرخ سیر	تیسیر البیان	"	٢٣٨	(عربی)
تفضل حسین خاں (نواب فرخ آباد)	فتوح الغیب	"	٢٦٧٨	(")
خان فیروز جنگ بہادر فدوی محمد شاہ بادشاہ	کلیات اہلی شیرازی	"	١٨٦٠	(فارسی)
رانی سروپ چند بندۂ محمد شاہ بادشاہ	نگارستان	"	٢٠٣٧	(")
محمد شاہ عالم بادشاہ غازی (١٢٢١ - ١١٧٣ھ)	کلیات آملی	"	٢٤٤٧	(")
" " "	مصحف شریف	"		(عربی)
" " "	المحیط الرضوی	"	٣٢٠١	(")
سلطان مرزا محمد ضیاء الدین بخت بہادر ولی عہد شاہ عالم بادشاہ	قرآن مجید	"	٣١٧١	(")
محمد حسن نبیرۂ شاہ عالم	تفسیر القرآن	"	٣٤٦٧	(")
مومن علی خاں ..... (خانہ زاد محمد فرخ سیر بادشاہ	انوار عرفان	"	٣٧٢٨	(فارسی)
مرزا خرم بخت	دہ مجلس نامہ	"	٣٧٩	(")
مرزا محمد بلند بخت بہادر	کلیات اسیر	"	٢٣٧٧	(")

نام بادشاہان / امراء	نام کتاب		
مرزا رضی الدین بن مرزا محمد معظم علی بن مرزا جہاں دار شاہ ولی عہد محمد بہادر شاہ	دستور العمل سلاطین ہند	کتاب نمبر ۱۷۳	(فارسی)
" "	ترجمہ عبارات عربیہ تحفۂ اثنا عشریہ		(")
" "	مختصر المعانی	کتاب نمبر ۱۲۶۴	(عربی)
خواجہ خلیل خان (ملازم احمد شاہ بادشاہ غازی)	حاشیہ علی تفسیر البیضاوی	کتاب نمبر ۱۳۰۱	(عربی)
میر خلف زادہ بہادر شاہ بادشاہ غازی	انتخاب از منتخب، حدیقہ	" ۲۹۴	(فارسی)
صف شکن خان (۱۲۵۰ھ)	کتاب التیسیر	" ۱۰۷	(عربی)
بہادر شاہ ظفر	رسالہ المکاشفات	" ۳۶۵۴	(فارسی)
شاہی کتب خانہ شاہ رخ بہادر (۸۵۰ھ)	المفصل شرح المحصل	" ۱۲۶۳	(عربی)
محسن الدولہ منصور علی خان نصرت جنگ بہادر	زہرۃ العولو	" ۳۸۹۳	(فارسی)
" " "	لوامع الاسرار	" ۲۲۵۸	(عربی)
سیف الدولہ نجف قلی خان	القرآن	" ۷	(")
واجد علی شاہ (۱۲۷۳ - ۱۲۶۳ھ)	بہجۃ المباہج	" ۴۲۹	(فارسی)
" "	تسہیل العروض	" ۲۵۵۱	(عربی)
" "	البدور السافرہ	" ۱۴۰۰	(")
" "	دیوان الحکاک	" ۲۵۴۴	(")
" "	فتوح الغیب	" ۱۳۵۲	(")
" "	مقارنۃ الشعر	" ۲۴۷۵	(")
" "	الجواہر النضید فی شرح التجرید	" ۲۲۴۰	(")
" "	حاشیۃ الفواکہ الجنیہ	" ۲۱۱۳	(")
" "	حاشیۃ علی الکشاف	" ۱۳۵۶	(")
" "	دیوان الخنساء	" ۱۸۰۱	(")

بادشاہان / امراء	نام کتاب		
واجد علی شاہ (۱۲۶۳-۱۲۷۲ھ)	اختیارات بدیعی	کتاب نمبر ۹۵۰	(فارسی)
" "	سفینۃ العلم	" ۱۷۸۷	(عربی)
" "	شرح اللباب	" ۲۱۰۶	(")
" "	حاشیۃ الشروانی	" ۱۳۹۵	(")
" "	کلیات حسین	کتاب نمبر ۶۷۱	(فارسی)
" "	ادب الکاتب	" ۱۶۸۱	(عربی)
سلیمان جاہ (نصیرالدین حیدر ۱۲۴۳-۱۲۵۳ھ)	الجواہر النضید فی شرح التجرید	" ۲۲۴۰	(")
"	حاشیۃ الفوائد الجنبیہ	" ۲۱۱۳	(")
"	حاشیۃ علی الکشاف	" ۱۳۵۲	(")
"	دیوان المختار	" ۱۸۰۱	(")
"	اختیارات بدیعی	" ۹۵۰	(")
"	سفینۃ العلم	" ۱۷۸۷	(")
"	شرح اللباب	" ۲۱۰۶	(")
"	منتخب السلوک لمعرفۃ دول الملوک	" ۲۲۲۳	(")
"	ادب الکاتب	" ۱۶۸۱	(")
امجد علی شاہ	معاہد التنصیص فی شرح شواہد التلخیص	" ۱۶۷۳	(")
"	منتخب السلوک لمعرفۃ دول الملوک	" ۲۲۲۳	(")
"	حاشیۃ الشروانی	" ۱۳۹۵	(")
"	کلیات حسین	" ۶۷۱	(فارسی)
"	بیاض	" ۳۷۸۹	(")
"	دعاء گنج العرش	" ۲۵۳۰	(عربی)
"	الحاشیہ علی المطول	" ۱۶۳۹	(")
"	الاطول	" ۱۶۳۱	(")

بادشاہان/امراء	نام کتاب	
ظفر حسین بن سلیمان جاہ	کتاب الناسخ والمنسوخ	" ۳۴۱ (عربی)
" "	فتوح الغیب	" ۲۰۳ (")
" "	رحلۃ الحبشہ	" ۲۸۸۶ (")
" "	تذکرہ خواص الامہ	کتاب نمبر ۲۲۹۳ (عربی)
" "	شرح الملخص	" ۲۸۳۶ (")
" "	الحاشیہ علی المحاکمات	" ۱۸۸۵ (")
" "	ادب الکاتب	" ۱۶۸۱ (")
" "	ربیع الابرار	" ۱۸۵۰ (")
" "	الحاشیہ علی حاشیہ مرزا جان	" ۱۸۸۶ (")
" "	الاصول	" ۱۶۲۱ (")
" "	عقول عشرہ	" ۸۸۹ (فارسی)
" "	قرابادین کافی	" ۹۹۹ (")
محمود الدولہ منشی محمد صفدر علی خان بہادر (۱۸۶۰ء)	المنتخب فی الاصول	" ۷۶۷ (عربی)
" "	منار الاصول	" ۷۶۴ (")
" "	نور الانوار	" ۷۷۴ (")
" "	حلیۃ المحلی	" ۸۷۴ (")
" "	کتاب المقنع	" ۱۷۵ (")
" "	مشکوۃ المصابیح	" ۲۹۹۸ (")
" "	مقامات حریری	" ۱۴۴۴ (")
" "	تہذیب المنطق	" ۱۹۳۰ (")
" "	شرح حکمۃ العین	" ۱۸۹۷ (")

نام بادشاہان / امراء	نام کتاب	کتاب نمبر	زبان
محمود الدولہ منشی محمد صفدر علی خاں بہادر (۲۰)	کتاب الاغانی	کتاب نمبر ۲۴۷۲	(عربی)
" "	بحر المدر	" ۲۰۹	(")
" "	شرح الکافیہ	" ۱۵۶۸	(")
" "	باہر البرہان	" ۲۷۸۸	(")
" "	الحاشیہ علی حاشیۃ المطول	کتاب نمبر ۱۶۴۷	(عربی)
نواب سید ولایت علی خاں (پٹنہ سٹی)	رسالہ فی وفاۃ النبی	" ۲۹۲۶	(")
" "	شرح القسطاس	" ۱۹۹۹	(")
" "	الکشکول	" ۱۸۲۸	(")
" "	کنز العرفان فی فقہ القرآن	" ۳۱	(")
" "	اصلاح العمل	" ۸۸۷	(")
" "	البیان فی کشف لغت القرآن	" ۲۱۳	(")
" "	کنز اللغات	" ۷۹۱	(فارسی)
" "	نصاب الصبیان	" ۸۰۸	(")
" "	نفائس الفنون	" ۸۱۵	(")
" "	فوائد آصفیہ	" ۱۳۱۰	(")
" "	قوت لایموت	" ۱۲۱۶	(")
" "	کال بہائی	" ۱۳۱۳	(")
" "	تحفہ	" ۱۲۶۸	(")
" "	نور النجاۃ	" ۱۳۰۲	(")
" "	ہدایت المضلین	" ۱۳۰۹	(")
" "	ثمر المؤمنین	" ۱۳۱۸	")
" "	ترجمہ احقاق الحق	" ۱۳۲۲	")

شاہان/امراء	نام کتاب		
سید ولایت علی خان (پٹنہ سٹی)	نزہۃ الاثنا عشریہ	کتاب نمبر ۱۳۳۳	(فارسی)
" "	سبیل النجات	" ۱۲۶۸	(")
" "	شرح نہج البلاغۃ	" ۱۸۱۲	(عربی)
" "	الکواکب الدریہ	" ۱۸۳۰	(")
	مشکوٰۃ المصابیح	کتاب نمبر ۶۲۶	(فارسی)
" "	کتاب من لا یحضرہ الفقیہ	" ۳۱۷۳	(")
" "	العشرۃ الکاملہ	" ۳۲۲۹	(عربی)
" "	زبدۃ البیان فی تفسیر آیات الاحکام	" ۲۳۱	(")
" "	عجائب المقدور فی نوائب ...	" ۲۲۴۰	(")
" "	ذخیرہ خوارزم شاہی	" ۹۷۹	(فارسی)
" "	فرہنگ جہانگیری	" ۷۸۴	(")
" "	رسالہ ... خط	" ۱۰۶۶	(")
" "	تحفۃ ...	" ۹۵۸	(")
" "	ریاض الادویہ	" ۹۸۰	(")
" "	خلاصۃ التجارب	" ۹۶۸	(")
" "	رسالہ ...	" ۸۰۷	(")
" "	تحفۂ سلطانی	" ۸۶۹	(")
" "	ریاض المنشآت	" ۸۵۶	(")
" "	رسائل طغرا	" ۸۴۶	(")
" "	مجمع الصنادید	" ۸۲۰	(")
" "	مجمع الصنائع	" ۸۳۳	(")
" "	جمع مختصر	" ۸۲۳	(")

نام بادشاہان/امراء	نام کتاب			
نواب سید ولایت علی خاں (پٹنہ سیٹی)	مواہب علیہ	کتاب نمبر	۱۱۵۴	(تاریخ)
〃 〃	اخلاق محسنی	〃	۹۰۷	(〃)
〃 〃	شرح دیوان علی	〃	۹۲۲	(〃)
〃 〃	شرح قصیدہ حمیریہ	〃	۹۱۸	(〃)
	دیوان ابن یمین		۱۸۰۵	(فارسی)
〃 〃	دیوان مغربی	〃	۱۸۵۲	(〃)
〃	دیوان آصفی	〃	۱۸۴۸	(〃)
〃 〃	دیوان ثنائی	〃	۱۸۴۹	(〃)
〃 〃	دیوان نظیری	〃	۱۹۲۳	(〃)
〃 〃	دیوان اشرف	〃	۱۸۹۲	(〃)
〃 〃	دیوان اثر	〃	۱۸۹۱	(〃)
〃 〃	زاد المسافرین	〃	۱۸۱۱	(〃)
〃 〃	خسرو و شیریں	〃	۱۸۰۱	(〃)
〃 〃	خمسۂ نظامی	〃	۱۸۰۴	(〃)
〃 〃	خلاصۂ شاہنامہ	〃	۱۸۱۹	(〃)
〃 〃	گلستان رحمت	〃	۱۷۷۲	(〃)
〃 〃	روضۃ الشہدا	〃	۱۷۵۶	(〃)
〃 〃	زبدۃ التواریخ	〃	۱۷۵۱	(〃)
〃 〃	تاریخ طبری	〃	۱۷۲	(〃)
〃 〃	صولت غضنفری	〃	۱۳۳۴	(〃)
〃 〃	خلاصۃ المنہج	〃	۱۱۳۴	(〃)
〃 〃	تفسیر دلیل الرحمٰن	〃	۱۱۳۰	(〃)

نام بادشاہان/امراء	نام کتاب		
نواب سید ولایت علی خاں (پٹنہ سیٹی)	ترجمہ قطب شاہی	کتاب نمبر ۱۲۰۱	(فارسی)
" "	شرح کافی	" ۱۲۲۸	(")
" "	مرشد العوام	" ۱۲۶۴	(")
" "	آداب حج	" ۱۲۴۰	(")
" "	حدیقۃ المتقین	کتاب نمبر ۱۲۵۰	(فارسی)
" "	جامع عباسی	" ۱۲۷۵	(")
" "	اظہار الحق	" ۱۲۸۹	(")
" "	فوز النجاۃ	" ۱۳۱۱	(")
" "	رد الخوارج	" ۱۲۴۸	(")
" "	عین الحیات	" ۱۳۰۸	(")
" "	رسالہ حنفیہ	" ۱۳۰۰	(")
" "	معتمد الشیعہ	" ۱۳۱۷	(")
" "	حل العقائد	" ۱۲۹۱	(")
" "	اعتقادات	" ۱۲۹۰	(")
" "	رسالہ یوحنا	" ۱۳۰۴	(")
" "	دیوان فقیر	" ۱۹۱۲	(")
" "	درکنون	" ۱۸۹۰	(")
" "	دیوان حسن	" ۱۹۰۲	(")
" "	کلیات نقی	" ۱۹۳۸	(")
" "	دیوان قتیل	" ۱۹۱۴	(")
" "	تاریخ محمدی	" ۷۹	(")
" "	تاریخ عالم آرا عباسی	" ۷۴	(")

نام بادشاہان/امراء	نام کتاب		
نواب سید ولایت علی خاں (پٹنہ سٹی)	کتاب المعجم	کتاب نمبر ۶۷۹	(فارسی)
"	ریاض الشہادۃ	" ۵۷	(")
"	سیر المتاخرین	" ۳۳۷۱	(")
"	تحفۂ سامی	" ۳۳۷۰	(")
"	مجموعہ ادعیہ	کتاب نمبر ۱۷۳۷	(فارسی)
"	رسالہ اسطرلاب	" ۱۷۳۵	(")
"	تعدیل	" ۱۷۳۹	(")
"	المستبصرین	" ۱۷۳۱	(عربی)
"	سراج وہاج	" ۱۶۹۴	(فارسی)
"	رسالہ مالیخولیا	کتاب نمبر ۱۶۸۲	(")
"	خطبۃ البیان	" ۱۵۶۳	(")
"	وقائع حیدرآباد	" ۲۳۲۹	(")
"	احکام غالب ومغلوب	" ۲۳۲۳	(")
"	ہفت بند کاشی	" ۲۳۱۱	(")
"	رسالہ در روش ہفتاد و دو فرقہ	" ۲۲۸۴	(")
"	ادعیہ زیارت	" ۲۱۵۳	(")
"	برق خاطف	" ۲۰۶۴	(")
"	احیاء السنۃ	" ۲۰۶۶	(")
"	دستور العمل	" ۲۰۲۴	(")
"	تبصرۃ العوام	" ۱۴۵۶	(")
"	مطلوب الزائرین	" ۱۴۳۷	(")
"	نخبۃ الدعوات	" ۱۴۴۴	(")

نام بادشاہان/امراء		نام کتاب		
واسپتسید ولایت علی خاں (پٹنہ سیٹی)		زاد المعاد	کتاب نمبر ۱۴۲۸	(فارسی)
"	"	مفاتیح الغیب	" ۱۴۳۸	(")
"	"	ترجمہ مفتاح الفلاح	" ۱۴۳۹	(")
"	"	ربیع الاسابیع	" ۱۴۲۲	(")
"	"	مصباح العابدین	کتاب نمبر ۱۴۳۳	(فارسی)
"	"	آداب عباسی	" ۱۴۴۱	(")
"	"	صفوۃ الصفا	" ۲۰۱	(")
"	"	خلاصۃ الکلام	" ۲۲۲	(")
"	"	معدن الجواہر	" ۹۴۱	(")
"	"	منہج الیقین	" ۹۴۵	(")
"	"	ابواب الجنان	" ۸۹۹	(")
"	"	مرآۃ الاحوال جہان نما	" ۲۷۵	(")
"	"	تاریخ محتشم	" ۱۵۶	(")
"	"	تاریخ شاہ شجاعی	" ۱۲۴	(")
"	"	آثار شاہجہانی	" ۱۱۲	(")
"	"	عجائب البلدان	" ۲۶۶۴	(")
"	"	ترجمہ (احیا عمارت)	" ۲۸۴۰	(")
"	"	تذکرۃ الائمہ	" ۲۷۶۱	(")
"	"	مجالس المؤمنین	" ۲۴۹	(")
"	"	القرآن	" ۱۱۴۵، ۱۱۶۲ " ۱۲۰۵، ۱۲۰۳ " ۱۱۸۸، ۱۱۸۷ " ۱۱۷۴	(") (")

نام بادشاہان/امراء	نام کتاب	کتاب نمبر	
نواب سید خورشید خاں (پٹنہ سیٹی)[1]	کشف الریب والمین	کتاب نمبر ۳۲۴۰	(عربی)
"	نجم الہدیٰ	" ۱۹۵۰	(فارسی)

ارباب علم

عبداللطیف (شاہجہانی دور کے ایک اسکالر)	مناہج العقول	" ۷۶۶	(عربی)
حسین بن عبداللہ العید روس	تجرید الکشاف	" ۲۲۰	(عربی)
سید محمد عباس الموسوی	حاشیہ علی تفسیر بیضاوی	" ۲۶۸	(")
عبدالباقی بن ولی اللہ العلوی مرید غوث العیدروس	البیان فی شرح مورد الظمآن	" ۱۲۸۵	(")
حکیم الملک علوی خاں	جواہر اللغۃ	کتاب نمبر ۲۸۰۳	(عربی)
آزاد بلگرامی	سفینۂ خوش گو	" ۱۲۵	(فارسی)
قاضی محمد شریعت اللہ خاں	الوسیلہ الی کشف العقیدہ	" ۱۲۸۱	(عربی)
سید محمد بن سید دلدار علی	تیسیر المطالب السنیہ	" ۲۲۳۹	(")
حکیم مسیح الدولہ علی حسن خاں	تحفۃ الکرام باخبار البلد الحرام	" ۲۳۰۶	(")
" "	الحاشیہ علی المطول	" ۱۶۴۲	(")
محمد غوث ملا قاضی بلدۂ فرخ آباد	فوائد المصلی	" ۱۲۲۹	(فارسی)
اسد اللہ خاں غالب	صفت کائنات	" ۸۸۱	(")
" "	سفینۃ العلم	" ۱۴۸۷	(عربی)
حسین بن محسن الانصاری	اتحاف الاکابر	" ۳۰۷۷	(")
" "	منتخب الاسانید	" ۳۲۰۶	(")
" "	الامم لایقاظ الہمم	" ۳۲۰۲	(")
" "	اسناد المسلسلات	" ۳۱۹۶	(")

[1] ان کی مزید جستجو کے لئے نواب ولایت علی خاں کی اولاد کا ذکر کتابوں (ترجمہ اثنا عشریہ - ۱۲۲۳ اور سبیل النجات - ۱۲۵۸) کے بعد کی تمام کتابوں کو ملاحظہ فرمائیے۔

ارباب علم	نام کتاب			
ا۔ السید محمد نذیر حسین بہاری ثم دہلوی	الاجازہ	کتاب نمبر	۳۱۹۶	(فارسی)
〃 〃	قطف الثمر	〃	۳۲۰۲	(〃)
〃 〃	سنن النسائی	〃	۳۱۱۹	(عربی)
〃 〃	قطف الثمر	〃	۳۰۷۷	(〃)
〃 〃	اوائل کتب حدیث	〃	۳۲۰۲	(〃)
〃 〃	الاجازہ	〃	۳۲۴۵	(〃)
〃 〃	الارشاد الی مہمات علم الاسناد	〃	۳۲۰۲	(〃)
〃 〃	الاجازہ	〃	۳۱۹۶	(〃)
〃 〃	الامم لایقاظ الہمم	〃	۳۰۷۷	(〃)
۲۔ ابو شمس الحق ڈیانوی	اجزاء مصنف ابن ابی شیبہ	کتاب نمبر	۳۱۱۲	(عربی)
〃 〃	عزیزۃ السنن والآثار	〃	۳۳۰۴	(〃)
〃 〃	معلم السنن	〃	۳۲۲۱	(〃)
〃 〃	الکشف الحثیث عمن رمی بوضع الحدیث	〃	۳۱۷۸	(〃)
〃 〃	کتاب الاختیارات العلمیہ	〃	۳۱۴۹	(〃)
〃 〃	فتح القدیر (ج ۳)	〃	۳۱۷۰	(〃)
〃 〃	شرح عمدۃ الاحکام	〃	۳۱۱۷	(〃)
〃 〃	الجامع الصحیح	〃	۳۱۷۱	(〃)
〃 〃	تیسیر الوصول الی جامع الاصول	〃	۳۱۱۶	(〃)
〃 〃	التہذیب لسنن ابی داؤد	〃	۳۰۹۹	(〃)
〃 〃	التمہید شرح الموطا	〃	۳۱۴۲	(〃)
〃 〃	تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف	〃	۳۱۰۶	(〃)
〃 〃	الاجازہ	〃	۳۲۰۶	(〃)

نام ارباب علم	نام کتاب			
〃 〃	فتح القدیر	کتاب نمبر	۳۲۳۹	(عربی)
〃 〃	القول المحقق	〃	۳۱۷۰	(〃)
〃 〃	المغنی عن حمل الاسفار	〃	۳۲۵۴	(〃)
〃 〃	الموطا	〃	۳۲۳۸	(〃)
〃 〃	نخبۃ الفکر	〃	۳۲۳۸	(〃)
〃 〃	الفقہ الاکبر	〃	۳۲۳۸	(〃)
حکیم سید مظاہر احمد (پٹنہ)	حاشیہ علی الکشاف	〃	۳۶۱۸	(〃)
〃 〃	کتاب ما رواہ الاساطین فی عدم المجیٔ الی السلاطین	〃	۳۴۲۴	(〃)
〃 〃	شرح مسلم الثبوت	〃	۳۱۰۵	(〃)
〃 〃	حاشیۃ السیالکوتی علی تفسیر البیضاوی	〃	۳۷۳۸	(〃)
〃 〃	زبدۃ التفاسیر	〃	۳۶۱۷	(〃)

○

فی الحال یہاں ان مہروں کی محض [illegible] علم کو اس سلسلے میں اس کتاب خانہ کی ثروتمندی کا اندازہ ہو سکے اور وہ اپنی ریسرچ کے سلسلے میں اس مواد سے استفادہ کر سکیں۔ ان مہروں کی اصل کے عکس پر مشتمل ایک مجموعہ لائبریری کی طرف سے زیر ترتیب ہے جو جلد ہی شائع ہوگا۔

●●

محبوب اقبال (ریسرچ فیلو)
شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی

خلیلؔ ۔ تلامذۂ آتشؔ میں ایک اہم نام

آتشؔ کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے ان میں اہم نام نسیمؔ، شوقؔ، صباؔ، رندؔ، خلیلؔ، شرفؔ، حزیںؔ، صفدرؔ، سالکؔ، شیداؔ اور یاسؔ کے ہیں ۔ یہاں موضوع سخن آتشؔ کے ایک شاگرد خلیلؔ کے حال اور کلام کا سرسری جائزہ ہے ۔ آتشؔ کے بہت سے شاگردوں میں خود بھی مسلم الثبوت استاد ثابت ہوئے ۔

خلیلؔ کا پورا نام میر دوست علی تھا ۔ انکے والد سید جمال علی تھے ۔ اودھ کے ایک تعلقہ بارہا کے قصبہ بڈولی کے باشندہ تھے لیکن لکھنؤ میں زندگی گزاری واجد علی شاہ کے دربار میں نظامت اور جگر شاری کے عہدہ پر فائز تھے ۔ زندگی نہایت عیش و عشرت سے بسر کرتے تھے ۔ آتشؔ سے بیحد قریب تھے اور اکثر سلوک کرتے تھے ۔ بقول جلال الدین احمد جعفری خلیلؔ نے ہی آتشؔ کے انتقال پر کفن دفن کا انتظام کیا تھا ۔ خلیلؔ کی زندگی کے اکثر حالات پردۂ خفا میں ہیں ۔ فارسی اور اردو کے تذکرہ نگاروں نے مختصراً حالات بیان کئے ہیں لیکن سالِ پیدائش اور سالِ وفات کا ذکر کہیں نہیں ملتا ہے ۔ تاریخ وفات کے متعلق ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اپنی مختصر کتاب "تاریخ ادب اردو" میں خلیلؔ کو متوفی ۱۸۶۰ء لکھا ہے لیکن ۱۸۶۱ء میں سید محسن علی نے جب تذکرہ "سراپا سخن" مرتب کیا تو اس میں خلیلؔ کے متعلق یہ اطلاع دی:

"میر دوست علی خلیلؔ ولد سید جمال علی باشندہ قصبہ بڈولی متعلقہ بارہا مقیم لکھنؤ صاحب دیوان شاگرد رشید خواجہ حیدر علی آتشؔ" ص ۱۷۷،

یہ تذکرہ ۱۸۶۱ء میں شایع ہوا ۔ اگر ۱۸۶۰ء میں خلیلؔ کی وفات ہوگئی ہوتی تو صاحب تذکرہ مرحوم ضرور لکھتے یا پھر ذکر انتقال کرتے ۔ خلیلؔ کے دوست عبدالغفور نساخؔ نے بھی اپنے تذکرہ میں خلیلؔ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :۔

" خلیلؔ تخلص میر دوست علی ولد سید جمال علی باشندہ قصبہ بڈولی متعلقہ بارہا، شاگرد

رشید آتش رفیق نادر مرزا نیشاپوری، بیشتر لکھنؤ میں رہتے ہیں"۔ (ص ۱۵۱)
یہ تذکرہ ۱۸۷۴ء میں طبع ہوا تھا۔ گویا ۱۸۷۴ء تک خلیل زندہ تھے۔ ۱۸۸۰ء میں فارسی کے دو تذکرے منظر عام پر آئے، پہلا تذکرہ سید علی حسن خاں کا ہے جس کے مطابق :۔

"خلیل میر دوست علی بن سید جان علی ساکن قصبۂ بڈھولی از خواجہ آتش اکتساب سخن کردہ دیوانے دارد" (ص ۴۵)۔

دوسرا تذکرہ سید نور الحسن خاں کا ہے۔ جس کے مطابق

"خلیل میر دوست علی خلف سید جان علی از رفقار مرزا نادر نیشاپوری بیشتر در لکھنؤ بود با خواجہ آتش نسبت تلمذ داشت دیوانے از وست" (ص ۳۰)

ان بیانات سے بھی خلیل کی وفات کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ خلیل کی وفات ۱۸۸۱ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیان ہوئی ہوگی۔

خلیل نے واجد علی شاہ کی کلکتہ منتقلی کے بعد ایک بار کلکتہ کا سفر کیا تھا۔ سال سفر میں بھی اختلاف رائے ہے۔ کیفی چریاکوٹی لکھتے ہیں ۱۲۷۲ھ اور عبد الغفور نساخ اور ان کی تائید میں لالہ سری رام ۱۲۷۹ھ۔ نساخ کا بیان اہم ہے کیوں کہ ایک تو وہ خلیل کے دوستوں میں تھے جس کا دعویٰ انھوں نے خود کیا ہے اور دوسرے یہ کہ نساخ بھی غالباً اس وقت کلکتہ میں تھے جب خلیل کلکتہ پہنچے تھے۔ کیوں کہ جملے پر غور کریں نساخ کہتے ہیں :۔

"۱۲۷۹ھ میں کلکتہ آئے تھے" (سخن شعرا ص ۱۵۱)

اس سے ایک بات تو واضح ہو گئی کہ خلیل نے ۱۲۷۹ھ میں ہی سفر کلکتہ کیا تھا ۱۲۷۲ھ میں نہیں۔ لیکن مدت قیام کا علم نہیں ہو سکا۔

خلیل کا ایک قلمی دیوان خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہے۔ دیوان خاصا ضخیم ہے۔ اس میں ایک سو سات (۱۰۷) اوراق ہیں لیکن دیوان ناقص ہے۔ نہ صرف اول و آخر کے اوراق غائب ہیں بلکہ درمیان سے بھی کچھ اوراق غائب ہیں۔ غزلیں ردیف وار ہیں۔ کل ایک سو ستتر (۱۷۷) غزلیں ہیں انکی تفصیل ردیف وار یوں ہے :۔

ردیف الف - ۴۷، ب - ۵، ت - ۳، ج - ۲، خ - ۱، ر - ۹، س - ۱، ش - ۱، ع - ۱، ق - ۲، ک - ۱، م - ۲، ن - ۴۲، و - ۱۲، ہ - ۳، ی - ۴۵ = ۱۷۷ (ایک سو ستتر)

دیوان میں ۱۲۲ غزلیں ہیں، کہیں کہیں حاشیہ پر بھی اشعار ہیں بعض جگہ مصرع کے بغل میں تصحیح شدہ مصرع باریک خط میں ملتا ہے۔ کہیں پر حروف کو مٹایا گیا ہے اور کہیں الفاظ کی ترتیب میں رد و بدل کیا گیا ہے دیوان کے درمیان کہیں بھی کاتب کا نام، دستخط یا کسی طرح کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ مقام، تاریخ کتابت یا آغاز و انجام کا بھی پتا نہیں چلتا۔ غزل کے مقطعوں سے صرف شاعر کے تخلص کا پتا چلتا ہے اور استاد یعنی آتش کا ذکر ہے۔ دیوان کے دو تین اور نسخوں کا بھی علم ہوا ہے۔ ایک لکھنؤ کی کسی لائبریری میں ہے اور دوسرا امیٹھی میں!

خلیل کے کلام کی خصوصیات کا ایک اندازہ قائم کرنے کے لیے دیوان خلیل سے کچھ انتخاب پیش ہے:

بڑا حاصل زندگانی یہ ہے
اگر نیک نامی لیے مر گئے

ہاتھ پورا نہ پڑا زخم لگانے اے جہد
قتل کرنا بھی نہ تجھ کو مرے جلاد آیا

کٹتی نہیں ہیں مجرم الفت کی بیڑیاں
جو مر گیا وہ قید سے آزاد ہو گیا

مرے دل میں اگر آپ آئیے گا
داغ کی طرح سے رہ جائیے گا

ہاتھ جوڑوں بھی تو ٹھہریں گے نہ آپ
نبض کی طرح چلے جائیے گا

میں مر گیا وہ گھر کو گیا صبح وصل شب
نقارہ مرے کوچ کا نوبت تھی سحر کی

بحر کرم ہے جوش میں رب غفور کا
حیلہ ہی چاہتا ہے وہ عذر قصور کا

آنسو بھرے ہیں آنکھ میں گرتے نہیں مگر
آخر چھلک چھلک کے یہ پیالہ نہ رہ گیا

عیب چھپتا نہیں دنیا میں حسینوں کا خلیل
شمع کا چور کبھی بزم میں پنہاں نہ ہوا

ملئے گا ہاتھ جب دن زائل شباب ہوگا
رنگ حنا نہیں جو پھر دستیاب ہوگا

کہہ کے فغاں سینے سے دل چل دیا
بول کے بلبل یہ کدھر اڑ گیا

اس لیے پوجتے ہیں یہ بت کو
کافروں کو خدا نہیں ملتا

وصف روئے یار میں تقریر کی حاجت نہیں
مصحف رخسار کو تفسیر کی حاجت نہیں

راز دل کیا کہوں کاندھے پہ فرشتے ہیں سوار
کہیں موقع نہیں ملتا ہے مجھے تنہائی کا

خط تقدیر کا شکوہ ہے عبث
اس نوشتے کا ہے کیا رہے جواب

منتظر ہیں فصل گل آئے کہیں پھر اے جنوں
ہم گریباں چاک ہیں اور دامن کہسار ہیں

وہ رشک ماہ جو منہ سے لگائے شراب
فلک ہو شیشہ نظر آئے آفتاب شراب

خلیل ساقی کوثر کے عشق میں ہے یقیں — کریگی داخل فردوس بے حساب شراب

جب سے دیکھا ہے تجلی جمال یار کو — روز و شب رہتے ہیں ششدر آفتاب و ماہتاب

حسن ذاتی کو نہیں آرائش ظاہر خلیل — کب ہوئی محتاج زیور آفتاب و ماہتاب

ریگ ہو جاتے ہیں پتھر سر پٹکنے سے مرے — کوہ کو دم بھر میں کر دیتا ہے صحرا اضطراب

بے خبر مجھ سے ہے وہ آفت جاں آج کی رات — سو رہا ہے اسے اثر آہ کہاں آج کی رات

عالم خواب ہے سامان وصال اے گردوں — میں کہاں یار کہاں اور کہاں آج کی رات

سرکشی کثرت نعمت سے کریں کیوں نہ حریص — نفس پر زور ہوا انساں جو غذا کھائے بہت

اور بیمار ہوئے یار کے گھر جانے سے — ہم شفا خانے سے بھی روگ لگا لائے بہت

قبر میں ایک نے پوچھی نہ مری بات خلیل — نام کو شہر خموشاں میں تھے ہمسائے بہت

حیرت ہوئی جلوہ ساقی کو دیکھ کر — منھ تک نہ آیا ہاتھ میں پیمانہ رہ گیا

جمال حور کا مٹی کی مورتوں کو دیا — کمال صنعت پروردگار دیکھ چکے

محبت مرض ہے محبت دوا ہے — محبت اجل ہے محبت شفا ہے

شرافت ہے حسن عمل سے خلیل — جبیں پر کہاں شیخ و سید لکھا ہے

عشق اپنا اثر آخر کو یہ دکھلاتا ہے — پہلے غم کھاتے تھے ہم اب ہمیں غم کھاتا ہے

لاکھ پردوں میں ہوں پھر چھپتے نہیں — جتنے ہیں چاہت کے تیور پیار کے

دل پہ بے یار کچھ عجب گزری — کیا کہوں کس طرح سے شب گزری

یہ بھی معلوم وصل میں نہ ہوا — کب ہوئی صبح رات کب گزری

خدا کو بھول گئے لوگ فکر روزی میں — خیال رزق ہے رزاق کا خیال نہیں

ناز سے منھ کو جو زلفوں میں چھپا لیتے ہو — جی سے بھایا ہے یہ انداز تمہارا مجھ کو

ہر طرح مل رہے گا پس مرگ اے خلیل — دس گز کفن گزی کا زمیں تین چار ہاتھ

وہ رنگ ہے تیرا کہ ترے رنگ کے آگے — جس رنگ کو دیکھا ہے وہ پھیکا نظر آیا

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا مجھ کو — اٹھیے، گھر جائیے، دم لے چکے ستا چکے بہت

رونے پہ باندھے جو مری چشم تر کمر — کیسی زمیں فلک پہ ہو پانی کمر کمر

نہ کر تصور بتوں کا دل میں محل توبہ ہے کچھ حیا کر
خلیل کعبے میں بت پرستی خدا خدا کر خدا خدا کر
بسر کی عصیاں میں عمر ساری بتوں سے در پردہ دل لگا کر
الٰہی توبہ الٰہی توبہ گناہ کیے ہیں چھپا چھپا کر !!!

رہتا ہے عجیب حال ہر دم ___ صوفی کی خانقاہ دل ہے

ترک دنیا خوب ہے حرص و ہوا اچھی نہیں ___ ہر کس و ناکس کے آگے التجا اچھی نہیں

دوست دشمن ڈرتے ہیں ایذا کوئی دیتا نہیں ___ خاکساری آدمی کو قلعہ ہے فولاد کا

کثرت میں تجھے دیدۂ وحدت سے جو دیکھا ___ تو ارض و سما میں مجھے یکتا نظر آیا

نفاق و بغض و حسد سے نہیں کوئی خالی ___ پھر اس میں صاحب دیں ہو خواہ دنیا دار

منصور کو ذلیل انا الحق نے کر دیا ___ کم ظرف کس شراب میں کیا بہک گیا

تنگ اس قدر آیا ہوں کہ پتھر کو اٹھا دوں ___ لیکن نہ اٹھاؤں میں جو تو ناز تمھارا

رہی خلیل یہ نفرت ہمیں تصنع سے ___ کیا نہ نظم کبھی قافیہ بناوٹ کا !

شاگرد ہو آتش کے خلیل جگر افگار ___ ہاں اون میں بہت ملتا ہے انداز تمھارا

ڈر دم نظم رہے کیوں نہ خلیل آتش کا ___ ہے نیستاں میں ابھی شیر نیستاں بیٹھا

شاعر ہوں خلیل تخلص ہے کعبہ تک ہند سے جانتے ہیں ___ کیوں ننگ ہے تجھ کو ملنے میں اے بت میں بھی گمنام نہیں

خلیل کے یہاں کئی ایک مسلسل غزلیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے:

دل مجھ سے منحرف ہے کچھ انقلاب ہوگا ___ جس گھر میں پھوٹ ہوگی وہ گھر خراب ہوگا

کچھ غزلیں ایسی ہیں جن میں مسلسل کئی مطلعے ہیں مثلاً:-

چلے وہ تو میں نقش پا ہو گیا ___ رہی چشم وا دم فنا ہو گیا
وہ بت رام ہو کر خفا ہو گیا ___ الٰہی یہ کیا ماجرا ہو گیا
دم آہوں سے آخر فنا ہو گیا ___ یہ طائر ہوا سے ہوا ہو گیا
کمر تک وہ گیسو رسا ہو گیا ___ یہ بڑھ بڑھ کے سانپ اژدہا ہو گیا
چھٹے رنج سے دم فنا ہو گیا ___ گرفتار بلبل رہا ہو گیا

بیان ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات

مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت	:	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۲۔ وقفہ اشاعت	:	سہ ماہی
۳-۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام	:	محبوب حسین
قومیت	:	ہندستانی
پتا	:	رمنا روڈ، پٹنہ-۴
۵۔ ایڈیٹر کا نام	:	عابد رضا بیدار
قومیت	:	ہندستانی
پتا	:	ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۶۔ ملکیت	:	خدا بخش لائبریری، پٹنہ-۴

میں محبوب حسین اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے ساتھ درست

دستخط پبلشر : محبوب حسین

۲۸ر فروری ۱۹۸۷ء

پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی ، پٹنہ

(مسلسل)

تصحیح و اضافہ

مسامحات مرآۃ العلوم (جلد سوم)

(۱۴۸) صفحہ ۲۱۷ نمبر کتاب ۲۴۶۱ - نام کتاب "انیس الغربا" فہرست نگار نے مصنف کا نام نہیں لکھا۔ اس کے نام میں اختلاف ہے۔ کسی نے نور الدین لکھا ہے اور کسی نے عبدالصمد بن افضل محمد۔ مگر اتفاق اس پہ ہے کہ یہ کتاب نور قطب عالم (م ۸۱۸ ھ / ۱۴۱۵ء) بن علاء الدین پنڈوی (بنگال) کی ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے اور مصنف کا نام قطب عالم ہی ہے۔ پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں اس کے گیارہ مخطوطے ملتے ہیں۔

(۱۴۹) صفحہ ۲۱۷ نمبر کتاب ۲۴۷۲ - نام کتاب "اشارات حامدی"۔ مصنف کا نام کمال برہان الدین نہیں بلکہ صرف کمال الدین حامد ہے۔ اس کی تصنیف کا سال خود مصنف نے ۱۰۳۹ھ بتایا ہے۔ اس کی کتابت ۱۱۹۷ھ میں ہوئی۔ اس کا پروگریس نمبر فہرست میں ۴۷۹۵ ہے مگر اس کا نمبر ۴۷۰۵ ہونا چاہیے۔ کراچی کے انجمن ترقی اُردو کے نسخے میں مصنف کا نام حامد اللہ شاہ پسر لعل شہباز قلندر ملتا ہے اور کراچی میوزیم کے نسخہ میں مصنف کا نام حامد الفقیر بن اکمل البرہان حامد ہے۔

(۱۵۰) صفحہ ۲۱۷ نمبر کتاب ۲۵۰۳، ۲۵۷۶ - نام کتاب "الہامات قدسی"۔ یہ دونوں کتابیں ایک ہی مصنف کی ہیں اور کاتب بھی ایک ہی ہے۔ مگر نہ مصنف کا نام ہے نہ کاتب کا۔ کوئی ترقیمہ بھی نہیں جس سے کتاب کا نام صحیح طور پر ظاہر ہوتا۔ یہ دونوں کتابیں دراصل ایک ہی ہیں جو دو جلدوں میں مجلد ہو گئی ہیں اور ان کے اوراق خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اجزا میں ترتیب باقی نہیں۔ اس کے مختلف ابواب ہیں جو عرفہ کے عنوان سے ہیں۔ اس کا ابتدائی حصہ جس کو عرفہ اول کہا جا سکتا تھا وہ کسی میں نہیں۔ اگر وہ ہوتا تو شاید مصنف اور کتاب کا نام ظاہر ہوتا۔ چونکہ اکثر مقامات پر الہامات قدسی کے عنوان سے اشعار ملتے ہیں اسی بنا پر غالباً فہرست نگار نے اس کا نام "الہامات قدسی" رکھ دیا۔ عجب نہیں کہ اس کا نام "عرفات" کی نسبت سے کچھ اور ہو۔ اس کا فیصلہ سردست مشکل ہے۔ فہرست میں کتابت کا سال پہلی جلد کا ۱۰۷۹

اور دوسری جلد کا ۱۰۸۰ھ بتایا ہے۔ حالانکہ ہر عرفہ (حصہ) کا سنہ کتابت مختلف ہے جو ۱۰۷۲ھ

تا ۱۰۸۱ھ کو محیط ہے۔

(۲۵۱) صفحہ ۲۱۸ نمبر کتاب ۲۵۷۹ - نام کتاب چہل ناموس، مصنف کا نام فیاض بخش لکھا ہے جو فیاض بخشی ہونا چاہیئے

تھا۔ مزید براں اس کتابت کی شمولیت تصوف کے فن کے ساتھ کیسے روا رکھی گئی؟ یہ سرے سے

تصوف کی کتاب ہی نہیں۔ اس کو فن انشا یا ادب میں ہونا چاہیے تھا۔

(۲۵۲) صفحہ ۲۱۸ نمبر کتاب ۲۷۶۳، نام کتاب 'توسل المرید علی المراد' ہے۔ فہرست میں کاتب کا نام نہیں۔ اس کتاب

کے صفحہ ۶ (ب) پر پوری تفصیل ملتی ہے کہ کاتب کا نام اکرم علی ہے۔

(۲۵۳) صفحہ ۲۱۸ نمبر کتاب ۲۹۹۲، نام کتاب 'بحر الانوار' کتابت کی تاریخ ترقیمہ میں ۱۱۰۱ھ ہے۔ فہرست میں

۱۲۱۲ھ غلط ہے۔ اس جلد میں دو نسخے پائے جاتے ہیں جو علی الترتیب (۱) رسالہ غوثیہ اور (۲)

بحر المعانی ہیں، مگر فہرست میں ترتیب اُلٹی ہو گئی ہے۔

رسالہ غوثیہ دراصل حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی تصنیف ہے جس کی یہ شرح ہے۔

اصل کتاب یہی ہے۔ اوراق ۳۲ نہیں بلکہ ۳۱ ہیں۔ یہ رسالہ ناقص الآخر ہے۔ کیفیت کے خانہ میں

اس کا اندراج ہونا چاہیے تھا۔ کاتب اور سنہ کتابت کا تعین قیاساً کیا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ

دونوں کتابوں کا کاتب ایک ہی ہے۔ کتابت کا سنہ ۱۲۱۲ھ غلط ہے۔ ۱۱۰۱ھ ہونا چاہیئے۔

(۲۵۴) صفحہ ۲۱۸ نمبر کتاب ۲۳۹۵، نام کتاب 'بحر المعانی'۔ یہ کتاب اریبلہ (OBLIQUE) بخط منحنی لکھی ہوئی

ہے۔ فہرست نگار نے مصنف کا نام مکمل نہیں لکھا۔ کتاب کے ابتدائی ورق پر مصنف کا پورا نام اس طرح لکھا ہے:

"محمد بن نصیر الدین جعفری المکی الحسینی خلیفہ سلطان نصیر الدین چراغ دہلی" اوراق ۷۳ کی بجائے ۸۳ ہیں۔

کاتب کا نام خیر اللہ ہے، جو اپنے کو غلام حبیب اللہ قنوجی لکھتا ہے۔ فہرست نگار کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

(۲۵۵) صفحہ ۲۱۸ نمبر کتاب ۳۰۲۶، نام کتاب 'تعلیمات تصوف امام غزالی' کتاب کا نام فہرست نگار نے قیاساً تجویز

کر کے لکھ دیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا ورق غائب ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ صحیح نام کیا ہے۔ آخری

اوراق بھی غائب ہیں جن کی تعداد نہیں بتائی جا سکتی۔ فہرست میں کتاب کے اوراق کی تعداد ۲۳۴ بتائی

ہے، جو شاید سہواً لکھی ہوگی۔ موجودہ صورت میں اوراق کی تعداد کل ۱۹۰ ہے۔ ۴۴ اوراق مختلف جگہوں

سے غائب ہیں۔

(۲۵۶) صفحہ ۲۱۸ نمبر کتاب ۳۲۹۹ نام کتاب (منتخب از) حدیقۃ الشیعہ۔ یہ کتاب دراصل عقائد سے متعلق ہے نہ کہ تصوف سے۔ فہرست میں نہ تو مصنف کا نام ہے اور نہ کاتب کا۔ کیفیت کے خانہ میں اطلاع دی ہے کہ (حدیقۃ الشیعہ تالیف اردبیلی۔ عقائد صوفیا)۔ منزوی جلد دوم (پاکستان) میں یہ اطلاع ہے کہ مصنف ملا احمد بن محمد اردبیلی سے یہ کتاب غلط طور پر منسوب ہو گئی ہے۔ دراصل اس کا مصنف معز الدین محمد اردستانی ہے۔ اس کی ایک اور تصنیف بھی ہے جس کا نام "کاشف الحق" ہے اور اسی کتاب میں کسی نے بعد میں کچھ اضافہ کر کے ایک رسالہ شامل کر دیا جس کا موضوع رد صوفیان ہے اور نام اس رسالہ کا حدیقۃ الشیعہ رکھ دیا ہے۔ اور مصنف کا نام مقدس اردبیلی بتایا ہے۔ بہر حال یہ کتاب عقاید کی ہے۔ تصوف سے براہ راست اس کا تعلق نہیں۔

(۲۵۷) صفحہ ۲۲۰ نمبر کتاب ۳۰۶۷ ۔ نام کتاب رسالہ تحقیق عالم مثالی"۔ فہرست میں کاتب کا نام محمد دائم صدیقی ہے۔ صدیقی کی جگہ پر رشیدی سمجھئے۔

(۲۵۸) صفحہ ۲۲۰ نمبر کتاب ۳۷۱۷ نام کتاب رسالہ حوض الحیات۔ فہرست میں مصنف اور کاتب کا نام نہیں۔ یہ کتاب ناقص الآخر ہے۔ متن کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصوف کی کتاب نہیں بلکہ علم جوگ (یوگا) پر ہے۔ اصل کتاب عربی زبان میں تھی۔ اس کا فارسی ترجمہ مع اشکال مختلفہ ایک ہندو نے کیا ہے۔ جس کا نام معلوم نہیں۔ دراصل یہ کتاب امرت کنڈ (جوگ) کا ترجمہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ ہمدرد انسٹی ٹیوٹ دہلی میں موجود ہے۔

(۲۵۹) صفحہ ۲۲۱ نمبر کتاب ۳۴۷۳ ۔ اس کا ایکسیشن نمبر فہرست میں ۴۰، ۵۹ غلط لکھا ہے۔ صحیح نمبر ۴۰ ۵۷ ہے۔ فہرست میں اس مجلد میں ۴ کتابوں کا ذکر کیا ہے:-

(۱) رسالہ نصیحت و تبصرہ۔ مصنف خواجہ نظام الدین کبریٰ۔
(۲) رسالہ اجوبہ۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری
(۳) فوائد المکی ۔ ایضاً ایضاً
(۴) ارشاد السالکین ایضاً ایضاً

حالانکہ اس میں متعدد رسالے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) رسالہ نصیحت از حضرت نجیب الدین فردوسی بہ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (تعداد اوراق [illegible])

(۲) اسرار عقائد صوفیہ۔ (مصنف ناشناس) (۳) نقل از رسالہ تبصرہ خواجہ نجم الدین کبریٰ

(۴) اجوبہ زاہدیہ۔ مکتوبات حضرت مخدوم شرف الدین بنام یکے از مریدان۔

(۵) فوائد رکنی۔ حضرت مخدوم شرف الدین احمد (۶) رسالہ کلید در بیان اقسام اذکار از ایضاً

(۷) رسالہ ارشاد السالکین ایضاً (۸) رسالہ اخص الخواص۔ مصنف حضرت حسین نوشہ توحید بلخی

(۹) رسالہ اسرار صوفیہ (مطابق ۲) دوبارہ (۱۰) رسالہ تبصرہ (مطابق ۳) دوبارہ

چونکہ اکثر رسالے ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اس کا نام محمد عزت ہے اس لئے گمان ہے کہ سب کا کاتب ایک ہی ہے صرف ۹ و ۱۰ کی کتابت کسی دوسرے کی ہے۔ رسالہ اجوبہ کے ترقیمہ میں سال کتابت ۱۱۸۸ فصلی لکھا ہے۔ اس لئے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ سب کی کتابت اسی سنہ کے لگ بھگ ہوئی ہے اور اسکی کتابت بارہویں صدی سمجھنا چاہیئے۔ فہرست نگار نے تیرہویں صدی غلط تجویز کی ہے۔ جلد ساز نے اکثر رسالوں کے اوراق الٹ پلٹ مجلد کر دیئے ہیں۔ اس لئے فہرست میں جو اوراق کی تعداد ہے وہ غلط ہو گئی ہے۔

(۲۶۰) صفحہ ۲۲۲ نمبر کتاب ۳۵۲۲، نام کتاب "رسالہ عشقیہ" فہرست میں مصنف کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس رسالہ کا ایک دوسرا نام بھی ہے "خیالات العشاق"۔ پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں اس کے بکثرت نسخے ملتے ہیں۔ جن کا تعارف جناب منزوی کی فہرست جلد ۳ میں پایا جاتا ہے۔ وہ اس کتاب کے مصنف کا نام قاضی القضاۃ ہمدانی بتاتے ہیں۔ "خیالات عشاق" (؟) کا ایک نسخہ کتبخانہ مشرقیہ میں بھی موجود ہے اور خان بہادر عبد المقتدر کے مرتب کردہ فہرست جلد ۱۶ (صفحہ ۴۶-۴۸) میں اس کا تعارف ملتا ہے۔ اس نسخہ کے ترقیمہ میں جو عبارت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مصنف قاضی القضاۃ ہمدانی ہیں مگر خان بہادر مذکور اس انتساب سے اس لئے اختلاف کرتے ہیں کہ متن کتاب میں بہتیرے شعرا کے اشعار کے ساتھ سعدی اور حافظ کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں اور قاضی القضاۃ مذکور کی وفات ان دونوں حضرات سے بہت قبل ہو چکی تھی۔ اس لئے یہ اس کتاب کے مصنف نہیں ہو سکتے (وفات قاضی القضاۃ ۵۲۵ھ؛ وفات سعدی ۶۹۱ھ؛ وفات حافظ ۷۹۱ھ)۔

پاکستانی فہرست' مرتبہ جناب منزوی' جلد سوم میں "خیالات العشاق" کا مصنف قاضی حمیدالدین ناگوری قرار دیا گیا ہے۔ مگر میرے خیال میں جناب منزوی سے بھی چوک ہوئی۔ وہ مصنف کے انتساب میں یہ فراموش کر گئے کہ قاضی ناگوری کا عہد کیا ہے۔ قاضی مذکور کی وفات ۶۰۵ھ میں ہوئی۔ ان کا زمانہ بھی سعدی اور حافظ سے قبل کا ہے۔ الغرض یہ دونوں مصنفین ساقط الاعتبار ٹھہرے' تو اب سوال اس کا ہے کہ آخر اس کتاب کا مصنف ہے کون ؟

خان بہادر نے یہ سراغ لگایا ہے کہ ایک شاعر مسعود بک کے اشعار بھی اس کتاب میں پائے جاتے ہیں مگر محض اس بنا پر مسعود کو اس کا مصنف قرار دینا تو محتاج سند ہے۔ اس بات کا بھی انکشاف ہوا کہ مسعود بک نے ایک کتاب بنام "تمہیدات" جناب عین القضاۃ کے تتبع میں اسی نام سے لکھی تھی۔ اور دونوں کے نام میں بعد میں اشتباہ پیدا ہوا۔ خیالات العشاق کے ایک صفحہ پر یہ مندرج ہے کہ اس کتاب کا نام "خیالات العشاق" مصنفہ قاضی القضاۃ ہمدانی ہے۔ یقین ہے ہمدانی اور مسعود بک کے ناموں میں اشتباہ ہو گیا۔ اصل کتاب مسعود بک کی تصنیف ہے جو ہمدانی کے تتبع میں لکھی گئی۔ یہ تو واضح ہے کہ دونوں مصنفوں نے تقریباً ایک ہی موضوع پر قلم فرسائی کی ہے۔ کاتبوں نے غلطی سے مسعود بک کے نام کے بجائے ہمدانی کا نام لکھ دیا۔

مسعود بک کا نام پاکستانی فہرست میں مسعود بیگ بتایا گیا ہے' یہ غلط ہے' اس کا صحیح نام مسعود بک ہی ہے۔ بک ایک مقام کا نام ہے۔ اس سے اس کا انتساب ہے۔ یہیں اس کا وطن تھا اور اس کی ایک اور کتاب بنام "مراۃ العارفین" بھی ہے جس کے کئی نسخے خدابخش لائبریری میں موجود ہیں۔ (دیکھئے' جلد سوم مراۃ العلوم صفحہ ۲۲۵)' اس کی اور بھی تصنیفیں ملتی ہیں۔

مسعود بک کا پورا نام احمد بن محمد تخشی بخاری ہے۔ خطاب شیر خاں۔ تخلص مسعود۔ فیروز شاہ بادشاہ ہند کے رشتہ داروں میں تھا اور والی بخارا تھا۔ تصوف کے اشتداد نے سلوک سے جذب کی طرف مائل کیا اور اس کی زبان سے ایسے کلمات سنے گئے جو علمائے ظاہر کی نظر میں قابل گردن زدنی تھے اسی لئے ان کے فتویٰ پر مسعود کو جام شہادت پینا پڑا۔ یہ واقعہ ۸۰۰ھ یا ۸۳۶ھ کا ہے۔

مختصر یہ کہ' رسالہ عشقیہ' خیالات عشاق' یا خیالات العشاق" کے نام سے تو موسوم ہے ہی' ایک اور نام سے بھی فہرست پاکستان میں مندرج ہے جس کا عنوان ہے "رسالہ بہمات بہجات"

(منزدی جلد سوم ص۱۵۱۹)۔ اس رسالے کے چند اوراق انڈیا آفس لائبریری میں بھی ملتے ہیں جسے ایتھے نے غلطی سے حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰ منیریؒ سے منسوب کر دیا ہے، اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہاں پر یہ بات بھی بیان کر دینے کی ہے کہ فہرست نگار مرآۃ العلوم جلد سوم نے صفحہ ۲۱۷ پر ایک کتاب 'انیس العشاق' کو ایتھے کی غلط فہمی کی بنا پر 'خیالات عشاق' اور اس کو حضرت مخدوم مذکور کے ساتھ منسوب کر دیا۔ یہ انتساب سر دست غلط ہے۔ انیس العشاق سرے سے تصوف کی کتاب ہی نہیں۔

یہ تو اوپر بیان ہو چکا کہ خیالات عشاق (رسالہ عشق) کے مختلف نام ہیں: ایک الگ نام سے بھی یہ کتاب موسوم ہے، یعنی "رمز مخفی" یا "رمز خفی"۔۔۔ اور یہ بھی مختلف مصنف سے منسوب ہے، یعنی قاضی القضاۃ ہمدانی؛ قاضی حمید الدین ناگوری (مرید شیخ شہاب الدین سہروردی)، اور شیخ حمید الدین ناگوری (خلیفہ حضرت معین الدین چشتیؒ) وغیرہ یہ سارے انتسابات غلط ہیں۔

ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسالہ عشقیہ کا مصنف مسعود بک ہے۔

نوٹ: فہرست میں یہ اطلاع بھی ضروری تھی کہ اس کتاب کے ساتھ ایک دوسری کتاب بنام 'نزہت الارواح' بھی مجلد ہے۔

(۳۶۲) صفحہ ۲۲۲ نمبر کتاب ۳۶۹۹ - نام کتاب 'ترجمہ رسالہ غوثیہ' فہرست نگار نے مصنف کا نام شیخ عبد القادر جیلانیؒ لکھا ہے۔ حضرت جیلانی مذکور کی کتاب تو عربی زبان میں ہے۔ یہ دراصل اس کا تشریحی ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا مؤلف ولی بن ملوک شاہ صدیقی القادری ہے۔ اس کے ایک نسخہ کا اندراج فہرست میں صفحہ ۲۱۸ پر ہو چکا ہے جس کا نمبر ۲۹۹۲ ہے۔ اس کی اطلاع کیفیت کے خانہ میں ہونی چاہیے تھی۔ کتابت کی تاریخ بھی فہرست میں غلط ہے۔ ۱۲۵۹ھ کے بجائے ۱۲۶۱ھ ہونا چاہیے۔ خط نستعلیق تو نہیں مگر تعلیق کہا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک اور نسخہ بھی ہے جس کا نمبر ۱۳۶۵ ہے (مرآۃ العلوم جلد اوّل ص۲۲۳)۔ کیفیت کے کالم میں یہ اطلاع بھی ضروری تھی کہ اس مجلد میں دو اور کتابیں منسلک ہو گئی ہیں اور ان کے نام یہ ہیں:

(۱) بحر الواصلین (کتاب نمبر ۳۶۹۸) (۲) اخلاق العارفین (کتاب نمبر ۳۷۰۰)۔

(۳۶۳) صفحہ ۲۲۳ - نمبر کتاب ۲۲۲۴، نام کتاب 'شرح عوارف المعارف' موسوم بہ مصباح الہدایۃ و مفتاح الکفایۃ یہ دراصل شرح نہیں بلکہ عوارف المعارف (عربی) کا ترجمہ بزبان فارسی ہے۔ ترقیمہ میں اس کو ترجمہ بتایا

گیا ہے۔ تاریخ کتابت گرچہ حاشیہ پر ترجمہ کے بعد ۱۲۰۳ھ لکھا ہے لیکن یہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ غالباً اسی لیے فہرست نگار نے اس کی کتابت تیرہویں صدی بتائی ہے مگر اسکی وضاحت ضروری تھی قرین قیاس یہ ہے کہ یہ کتاب جس نسخہ سے نقل ہوئی اس کا سنہ کتابت ۱۲۰۳ھ ہوگا۔

(۲۶۳) صفحہ ۲۲۴ نمبر کتاب ۳۷۲۵۔ نام کتاب 'لطائف اشرفی' یہ کتاب بڑے ناقص طور پر مجلد ہوئی ہے۔ نہ ابتدائی جزء ہے نہ انتہا معلوم ۔ اوراق پر جو نمبرات لکھے ہوئے ہیں ان کی ابتدا (۲۲۱) سے ہوتی ہے اور انتہا (۶۵۶) پر۔ اس شمار سے ۴۳۶ اوراق کی کل تعداد ہونی چاہیئے۔ مگر دراصل ۳۱۶ ہے اس کے علاوہ اوراق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر جگہ کسی دوسری کتاب کے اوراق بھی اس میں شامل ہوگئے ہیں۔ مزید یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اوراق کی شیرازہ بندی بھی بڑی بے احتیاطی سے ہوئی ہے۔ اوراق الٹ پلٹ بندھ گئے ہیں۔ کتاب بھی بہت مرمت طلب ہے۔ یہ سب اطلاعات فہرست سے غیر حاضر ہیں۔

(۲۶۴) صفحہ ۲۲۴ نمبر کتاب ۳۹۸۷۔ نام کتاب 'لطائف المعانی'۔ فہرست میں تعداد اوراق ۲۵ ــــــــ بتائی گئی ہے۔ صحیح تعداد صرف ۱۲ ہے۔ منزوی جلد سوم (پاکستان) میں اس کا نام لطف المعانی لکھا ہے۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ منزوی میں اس کو مخدوم شرف الدین بہاری سے بھی منسوب کیا گیا ہے۔ فہرست نگار نے کتاب کے مصنف کا نام صحیح بتایا ہے۔ مخدوم بہاری اس کے مصنف نہیں۔

(۲۶۵) صفحہ ۲۲۵ نمبر کتاب ۴۰۱۳۔ نام کتاب 'لوائح جامی'۔ کاتب کا نام تو فہرست نگار نے صحیح لکھا ہے مگر اس کے باپ کا نام چھوڑ دیا ہے۔ باپ کا نام قاضی محمد ہے۔ ترقیمے میں ہے کہ اس کی کتابت (۱۵۶) میں ہوئی جو یقینی نا قابل قبول ہے۔ چونکہ یہ کتاب خط نسخ میں ہے (مگر فہرست نگار نے نستعلیق بتایا ہے) اور قدیم ہے اس لیے گمان یہ ہے کہ شاید (۱۱۵۶) ہوگا۔ فہرست نگار نے کتابت کا تخمینہ تیرہویں صدی بتایا ہے۔ یہ بعید از قیاس ہے۔ فہرست میں یہ اطلاع ہے کہ مہر صفحہ آخر پر ہے حالانکہ صفحہ اول (ب) پر ہے۔ فہرست میں یہ اطلاع بھی ہونی چاہیئے تھی کہ اس کتاب کے ساتھ حسب ذیل کتابیں اور بھی مجلد ہیں:-

(۱) مخزن اسرار نظامی (۲) قصہ قاضی و دزد (۳) قصہ تمیم انصاری (۴) تولد نامہ حضرت رسالت پناہ (۵) جنگ نامہ امیر المومنین حسن و حسین۔

(۲۶۶) صفحہ ۲۲۵ نمبر کتاب ۲۵۶۶ - نام کتاب "مصباح الہدایت"، یہ اسی کتاب کا دوسرا نسخہ ہے جو فہرست کے صفحہ ۲۲۳ پر درج ہو چکا ہے - اس کے دونوں نسخے بھی اسی کتب خانہ میں ہیں (کتاب نمبر ۱۳۶۱ مراۃ العلوم جلد اوّل) فہرست نگار نے کتاب نمبر ۱۳۴۳ اور ۲۵۶۶ کو دو الگ الگ تصانیف سمجھ کر ان کا علاحدہ علاحدہ اندراج کیا، مصنف کا نام بھی مختلف بتا دیا - یعنی پہلے نسخہ کا مصنف عزیز الدین بن علی الکاشانی اور دوسرے نسخہ کا مصنف محمود علی کاشانی، حالانکہ دونوں تصنیف ایک ہی ہیں - فہرست میں نسخہ بالا کے اوراق کی تعداد ۲۱۹ بتائی ہے حالانکہ صحیح تعداد ۲۹۳ ہے۔

(۲۶۷) صفحہ ۲۲۵ - نمبر کتاب ۱۳۹۴ - نام کتاب "مراۃ العارفین" - اس نسخہ کا صفحہ اوّل غائب ہے جس کی اطلاع فہرست میں نہیں - فہرست میں اوراق کی تعداد ۱۵۰ بتائی گئی ہے مگر موجودہ نسخہ صرف (۹۲) اوراق پر مشتمل ہے - تعجب ہے کہ اوراق کی تعداد میں اتنا اختلاف کیوں ہوا -

(۲۶۸) صفحہ ۲۲۷ - نمبر کتاب ۲۶۰۰ - نام کتاب "منہاج العابدین" - فہرست نگار نے اس کو اصلی کتاب منہاج العابدین سمجھا حالانکہ یہ اس کا فارسی ترجمہ ہے - مترجم کا نام بھی نہیں لکھا - اصل کتاب امام غزالی کی ہے - اس کا مترجم شیخ یوسف بڈھہ ہے

(۲۶۹) صفحہ ۲۲۷ - نمبر کتاب ۳۰۷۶ - نام کتاب "منہاج العابدین" - فہرست نگار نے صحیح اطلاع دی ہے کہ یہ ترجمہ ہے اور اس کے مترجم شیخ یوسف بڈھہ ہیں - فہرست انگریزی جلد ۱۶ - کتاب نمبر ۱۲۷۹ میں اس کی پوری صراحت ملتی ہے - تعجب ہے کہ فہرست نگار نے ماقبل کتاب نمبر ۲۶۰۰ کو غلط طور پر اصل کتاب سمجھا حالانکہ یہ دونوں کتابیں ایک ہیں۔

خدا بخش جرنل ۲۸ صفحہ ۱۳۹ پر تسامحات کے سلسلہ میں اس کتاب کے متعلق یہ اطلاع درج ہے کہ:-

"یہ ترجمہ نہیں بلکہ امام غزالی کی تصنیف منہاج العابدین کا اصل متن ہے - مصنف کے خانے میں کاتب کا نام درج ہو گیا ہے - حاشیہ پر ملوک شاہ کی کتاب مناقب غوثیہ تحریر ہے جس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔"

تسامح کی یہ گرفت ناقابل قبول ہے - زیر بحث کتاب امام غزالی کی اصل کتاب کا متن نہیں بلکہ یہ بھی اول الذکر کتاب (۲۶۰۰) کی طرح ترجمہ ہے اور شیخ یوسف بڈھہ کاتب نہیں بلکہ خود مترجم ہیں - فہرست میں نام صحیح درج ہے - رہا حاشیہ پر "مناقب غوثیہ" کا اندراج تو یہ مناقب غوثیہ نہیں بلکہ رسالہ غوثیہ مصنفہ شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی شرح ہے - اس کے شارح ولی بن ملوک شاہ ہیں اس کے متعدد نسخے پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں ہیں (منزوی کا جلد ۳ صفحہ ۱۷۱۸، خدا بخش فہرست جلد ۱۶ میں نمبر ۱۳۵ پر تفصیل دیکھئے -

جناب فرخ جلالی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی ایک یادگار

چندا بائی کی تحریر میں صد پند لقمان

حیدرآباد (دکن) کی مشہور شاعرہ چندا بائی مہلقا کے ہاتھ کا لکھا "صد پند لقمان" کا ایک مخطوطہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے جو نستعلیق خط میں ۱۲۲۷ ہجری کا تحریر کردہ ہے۔ ترقیمہ میں نواب سکندر جاہ کے نام کے علاوہ مہاراجہ چندو لال شاداں (پیشکار اعلیٰ) اور نواب منیر الملک جد نواب سالار جنگ میر تراب علی کا ذکر بھی ہے۔ اس کے پہلے صفحے کا عکس درج ذیل ہے:۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

این صد پند دلپسند سودمند است

که لقمان حکیم پسر خود را وصیت

کرده و فرموده که هر سخنان را این

ترقیمے کی عبارت یہ ہے:

کتبہ کنیزہ اہل بیت علیہم السلام
حیدر ابی بی المخاطب بالقابہ
بنت سید ابی بی المخاطب
راجکنور بائی بتاریخ دویم ماہ
رجب سنہ ۱۲۳۴ الہجری در بلدہ
فرخندہ بنیاد حیدرآباد در ریاست
نواب بندگان حضرت قدر قدرت

شکوہ قدر حشمت نواب سکندر
جاہ بہادر مد ظلہ العالی و در نواب
نواب صاحب بلند اقتدار نواب
منیر الملک بہادر مد ظلہ و مہاراجہ
صاحب عظیم الشان رکن السلطنت
راجہ چندو لعل بہادر مد اللہ
ظلہ تحریر یافت

تبصرۂ
کتب

مطبوعات جدیدہ

مشاہدے: وزیر پانی پتی۔ ادبی میلہ پبلیکیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۲۳۸۲ صدر کراچی ۳ — ۱۲۸ صفحات

وزیر پانی پتی کی کتاب "مشاہدے" کے بارے میں مختصر ترین بات جو کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ یہ ایک فکر انگیز کتاب ہے جس میں جرأت مندانہ تنقید کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ کتاب میں شامل مضامین کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) علامہ نیاز فتحپوری (۲) حسن عسکری کے "تجزیے" کا اختتامیہ (۳) "اردو شاعری کا مزاج" میری نظر میں (۴) ممتاز شیریں کا تنقیدی شعور (۵) لبیب تحمدی اعوان کی شاعری (۶) اقدس صدیقی کے تنقیدی زاویے (۷) عرش صدیقی کی غزل گوئی (۸) نگاہ اور نقطے پر ایک نظر (۹) شکیل احمد ضیا کی غزل کا ایک خاص پہلو (۱۰) پورا شاعر ادھوری زندگی (۱۱) سراج الدین ظفر اپنی شاعری کے آئینے میں (۱۲) رئیس فروغ کے ایک ناقد تنقید کی روشنی میں (۱۳) اردو شاعری میں انسان دوستی کی مثال (۱۴) کیف انصاری کی غزل (۱۵) مسعود میکش — شخص و شاعر (۱۶) پرویز پرویم کا ایک سرگرم ذکیل (۱۷) اقبال۔ اقبال ہے۔

کتاب کا دیباچہ پروفیسر عتیق احمد نے لکھا ہے "کچھ رسمی کچھ غیر رسمی باتیں"۔ وزیر کی رائیں اکثر روایت شکن اور خاصی تند و تیز ہیں کچھ اقتباسات دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے

● اردو شعراء میں جوش ملیح آبادی کے علاوہ انسان دوستی کا تصور بہت کم ملتا ہے، لیکن اسلامی انسانیت اور اشتراکی انسانیت کا پرچار کرنے والے حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں اور انسانی انسانیت کا کوئی نقیب نظر نہیں آتا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان میں بسیط انسانیت کے نغمہ گروں کو خود دائرہ انسانیت ہی سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔ جوش جیسے انسان دوست اور محبِ انسانیت شاعر کو جو صلہ دیا گیا ہے وہ "ساقی" کے "اصلی جوش نمبر" سے ظاہر ہے اور یہی نہیں بلکہ انگریزی زبان میں جوش کی مکمل سوانح عمری

(The Life and Works of Josh Malihabadi)

کے مسودے کو ناشر کے یہاں سے غائب کرانے اور کتاب کے مؤلف پر تخویف و ترغیب کے تمام حربے آزمانے کا دستاویزی ریکارڈ بھی کتب و جرائد میں محفوظ ہے۔ اس تمام شر کی بنیاد اس مفروضے پر تھی کہ کسی وجہ سے فیلڈ مارشل ایوب خان

جوشؔ سے ناراض تھے ۔ (ص ۱۰۷)

● مرزا بیدلؔ نے نظریۂ ارتقاء کے مفکر چارلس ڈارون سے بھی ڈیڑھ سو سال پیشتر کا زمانہ پایا ہے جنھوں نے آدمی کا مورثِ اعلیٰ بندر کو قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے :-

ع شنیدہ ام کہ آدم بوزنہ بود

اور انقلابی کمیونزم کی ترغیبات خواجہ حیدر علی آتشؔ کے یہاں واضح طور پر نظر آتی ہیں، جو کارل مارکس سے سو برس پہلے دنیا میں تشریف لائے تھے ۔ فرماتے ہیں :

منعم بوذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں (ص ۱۲۶)

● یہاں مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ سید الاحرار مولانا حسرت موہانی اقبالؔ سے بڑے آدمی، اور [illegible] کردار، مؤمن اور حریت پسند رہنما تھے ۔ یہاں میں ان جہلا کے افکارِ ناہنجار سے بحث نہیں چاہتا، جو علاقہ پرستانہ مذہبیت کی بنیاد پر اقبالؔ کو فوق البشر قرار دیتے ہیں ۔ (ص ۱۲۷)

● پروفیسر ریاض صدیقی کی یہ کتاب اقبالؔ کی تنقیص ہرگز نہیں، بلکہ یہ اقبالؔ کے ان نادان دوستوں اور [illegible] ہوشیار قسم کے "دیوانوں" پر تنقید ہے، جو اپنے بے سروپا ستائشی مضامین کے ذریعے خود کو نمایاں اور اقبالؔ کو منہا کرنے کے عمل میں مصروف ہیں ۔ (ص ۱۲۸)

رسائل، ۸۲ء۔

درسیاتِ اردو کا سالنامہ ایینول آف اردو اسٹڈیز شکاگو، ایڈیٹر چودھری محمد نعیم (سی ایم نعیم) ۱۳۰ صفحات۔ ۱۹۸۲ء زبان انگریزی۔

مشمولات: جرأت کا ایک شہر آشوب مع ترجمہ انگریزی • اس شہر آشوب کے بارے میں چند باتیں (شمس الرحمٰن فاروقی) ساقی فاروقی کی چھ نظمیں: انگریزی ترجمہ میں • ساقی فاروقی کے بارے میں (فاروق حسن) ساقی کی نظم 'خالی بورے میں زخمی بلا' اس کے چار انگریزی تراجم (چودھری محمد نعیم، رافع حبیب، فاروق حسن، عالمگیر ہاشمی) • اختر جمال کا ایک افسانہ (مترجم احمد علی) • غلام عباس کا ایک افسانہ (مترجم نعیم) مشاعرہ: ایک مقالہ (حبیب الرحمٰن) • غالب ہمارا ہم عصر (عالم خوندمیری۔ مترجم محمد عمر میمن): اصلاً مضمون 'شب خون' شمارہ ۷۰ میں چھپا۔ • مفصلات، دہلی میں مارچ ۱۸۶۸ء میں شائع شدہ ایک اہم مضمون 'غالب کی حمایت میں' برہان قاطع کے قضیے کے ذیل میں، نعیم اور محمد صادق کے نوٹ کے ساتھ (اسلام آباد کے دی مسلم سے منقول) • ن م راشد کا ایک ایسے جب وہ نذر محمد کے نام سے ۱۹۲۶ء میں لکھتے تھے (یہ عطیہ میں ان کے داماد فاروق حسن کا جو خود بھی اچھے شاعر ہیں) • کتابوں پر تبصرے، شمس الرحمٰن فاروقی کی انگریزی کتاب جسٹس زبیری کی 'خوش رہو اہل وطن' ہم گل کی اقبال پر کتاب مع منتخبات اقبال (از شمس) (باد رنگ) • استار رسالے (از فاروقی) ان جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے ان سب کے نام • خبریں اردو مرکز لندن کے بارے میں ایک نوٹ (اراکین، آئی ایچ آئی یوسفی و الطاف گوہر اور افتخار عارف) • ڈاتی سے لندن کے شاعروں کی افادیت پر ایک نوٹ اور نقل • بارہ جلدوں والی پاک اردو لغت مکمل ہو گئی • صلاح الدین محمود کی نظم تجارت میں منسر ہو گئی اور انگریزی کی پوری شائع ہونے کی اجازت مل گئی (جنگ، ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء): نظم کا عنوان ہے 'غیب کا قاصد': رسالے میں پوری نظم آ بھی گئی ہے۔ آغاز کا مصرع دلچسپ ہے 'پانی میرا دوست' جو ہندوستان کی ایک غزل کا بھی مصرع کا ٹکڑا ہے! • احمد فراز سابق ریذیڈنٹ ڈائریکٹر پاکستان نیشنل سنٹر اپریل ۸۲ء میں معتوب ہوئے اور جون میں وہ اور حبیب خان، تیس دن کے لیے کراچی بدر ہوئے۔ • احمد فراز کی تازہ کتاب 'بے آواز گلی کوچے میں' لندن سے نکلی ہے۔

• زاہد ڈار کا دوسرا مجموعہ "محبت اور بیزاری کی نظمیں" لاہور سے ۱۹۸۲ء میں نکلا تھا اس کے ناشر نے اس میں سے آدھا صفحہ کاٹ کے نکال دیا۔ اس میں جو نظم تھی وہ نقل کی گئی ہے • تعزیت: جوش م ۲۲-۲-۸۲ء۔ فراق م ۳ مارچ ۸۲ء، احسان دانش م ۱۹۸۲ء، حفیظ جالندھری م ۱۹۸۲ء۔ خدیجہ مستور م ۲۶ جولائی ۸۲ء۔ غلام عباس م یکم نومبر ۸۲ء۔ اور ظہور نظر، پیر محمد حسام الدین راشدی، راز مراد آبادی، کپل کرشن اشک، زبیدہ خاتون • محمود دعا زبیر اور حسن عباس رضا 'خیابان' چھاپنے کے جرم میں گرفتار (لاہور) (جرم: فحش لٹریچر کی اشاعت)۔ [خیابان راولپنڈی کے تین پرچے نکلے ہیں] • احتساب 'لاہور (ایڈیٹر عبداللہ ملک)

• اردو انٹرنیشنل ٹورنٹو کا سہ ماہی پرچہ، ایڈیٹر: اشفاق حسین اور حسن عابد جعفری: نیا دور (کولمبس اوہیو: ایڈیٹر سہیل جالبی) کے بعد بہترین پرچہ • اردو دنیا شکاگو ۶۔۷ پرچوں کے بعد بند ہو گیا ہے • ڈاکٹر داؤد ایم زبیری نے شمال امریکا میں اردو کا پہلا ناول لکھا ہے • بازگشت اردو شعرا کا انتخاب (از قریشی- مقدمہ از فیض) • خالد حسن فاروق حسن کا مرتبہ انگریزی میں اردو افسانوں کا مجموعہ چھپا

اقبالیات جو اقبال ریویو کا نیا لباس ہے اور اس طرح اس کی اشاعت کو ۲۷ برس ہو گئے اپنی نئی سج دھج میں زیادہ بہتر پرچہ بن کے سامنے آیا ہے۔ پورا پرچہ اقبال کے لیے وقف ہے اور مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہے:۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن اور علامہ اقبال (پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم)، داغ کے اثرات اقبال پر (پروفیسر جگن ناتھ آزاد)، انفرادی تہذیب اقبال کی نظر میں (ڈاکٹر ظفر حسن ملک)، خودی (حکیم احمد شجاع پاشا مرحوم)، علامہ اقبال خطوط کے آئینے میں (ڈاکٹر جمیل جالبی)، اقبال ایران کی درسی کتب میں (ڈاکٹر محمد ریاض)، کلام اقبال میں تذکرہ حیوانات (ڈاکٹر اکبر حسین قریشی)، عقل و وجدان: اسلامی نقطہ نظر سے باہمی تعلق (سید حسین نصر ترجمہ احمد جاوید)، اقبال پر ایک یادگار عالمی اجتماع: حیدرآباد اجتماع (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

علاوہ ازیں تبصرہ کتب میں ذیل میں ان ہی کے سلسلے سے دو کتابوں پر بہت تفصیلی تبصرہ بھی قابل ذکر ہے ایک 'مظلوم اقبال' پر جو ان ہی کے بھتیجے کی تصنیف ہے دوسرا 'اقبال کا تصور اجتہاد' جو خالد مسعود کی تصنیف ہے۔

تحائف موصولہ

ادارۂ ایران پاکستان کی چند مطبوعات

• **نسایم گلشن** (شرح گلشن راز) از: شاہ داعی الی اللہ شیرازی (م ۸۷۰ھ) مرتبہ: محمد نذیر رانجھا

ص: ۵۲ + ۳۷۶ = ۴۲۸، طباعت: مارچ ۱۹۸۳ء۔

شیخ محمود شبستری کی منظوم تصنیف۔ متن سے قبل مرتب محمد نذیر رانجھا کی چالیس صفحے پر پھیلی ہوئی پیشگفتار کے تحت مصنف کی سوانح عمری اور ان کی ۸۰ تالیفات کا تعارف پھر متن ہے اور آخر میں چند اشاریے۔

• **اخلاق عالم آرا** از: محسن فانی کشمیری (م ۱۰۸۱ھ) مرتبہ: خ۔ جاویدی ص ۲۵۰

طباعت: ۱۹۸۲، قیمت: ۶۰ روپیے

متن سے قبل خ۔ جاویدی (مرتب) مصنف کے حالات زندگی اور کتاب کی افادیت و اہمیت پر گفتگو

متن کے مشتملات:

فن اول: در بیان تہذیب الاخلاق، فن دوم: در تدبیر منزل کہ آنرا حکمت منزلی نیز خوانند

فن سیوم: در سیاست مدن۔

ہر فن کے ذیلی ابواب ہیں اور پھر ہر باب مختلف فصلوں پر منقسم ہے۔ مثلاً فن اول تین باب پر مشتمل ہے۔

باب اول: در بیان فضایل و متعلقات آن، باب دوم: در ترتیب اکتساب فضایل و حفظ صحت نفس، باب سیوم: در معالجۂ امراض نفسانی و مدافعۂ علل روحانی

اس طرح "فن دوم" دو باب پر مشتمل ہے۔

باب اول: در سبب احتیاج بمنزل و معرفت ارکان آن، باب دوم: در تدبیر یعنی از این ارکان دربیان احکام آن۔

اور فن سیوم "بھی دو باب پر مشتمل ہے۔

باب اول: در سبب احتیاج به تمدن و شرح احوال و اقسام آن، باب دوم: در تدبیر ملک و آداب ملوک و معاشرت۔

خاتمہ: چند مفید نصیحتوں پر۔

• **احوال و آثار میرزا اسد اللہ خاں غالب** از: محمد علی فرجار، ص ۲۵۰، طباعت ۷۷ء، مطبع مکتبہ جدید پریس لاہور، قیمت ۳۵ روپیہ۔

پیش لفظ از ڈاکٹر جعفر محجوب۔ "مقدمۂ مؤلف" از محمد علی فرجار ہندوستان میں فارسی زبان و ادب روایت اندامی کی تاریخ اور ایک سرسری نظر اور غالب کے فن پر مختصر گفتگو

مشمولات: ایران و ہند کے تمدن کے باہمی ارتباط، غیر منقسم ہندوستان کے مختلف گوشوں میں فارسی زبان کا رواج، مرزا غالب کی سوانح حیات (از ولادت تا وفات)، غالب کی مختلف منظوم/منثور تصانیف، مثلاً "مہر نیم روز" اور "پنج آہنگ" وغیرہ کا جائزہ، "بعض نکتہ ہای دربارہ نویسندگی غالب" کے زیر عنوان غالب کی نثری و شعری خصوصیات پر بحث۔ آخر میں بطور نمونۂ کلام، غالب کی غزل، قصیدہ، رباعی اور قطعہ وغیرہ سے ایک انتخاب

• **تذکرۂ ریاض العارفین** بخش اول و دوم (آفتاب رائے لکھنوی)، ص ۵۲۲ + ۳۸۱ = ۹۰۳ طباعت بخش اول ۷۶ء، طباعت بخش دوم ۱۹۸۲ء، مطبع: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، قیمت ۶۰ ۱۲۰ روپیہ

یہ کتاب فارسی شعرا کا ایک ضخیم تذکرہ ہے جس میں مؤلف نے حروف تہجی کا التزام رکھا ہے۔ بخش اول "ا" تا "ظ" سے شروع ہونے والے ناموں پر مشتمل ہے جبکہ بخش دوم "ع" تا "ی" سے شروع ہونے والے ناموں کا احاطہ کرتا ہے مجموعی طور پر ۱۵۰۵ شعرا کا تذکرہ ہے۔

بخش اول میں "سخن ہائے گفتنی" کے زیر عنوان تذکرہ کے مصحح اور مقدمہ نگار سید حسام الدین راشدی کا ایک مقالہ ہے جس میں مؤلف کتاب "آفتاب رائے" کے مختصر تعارف کے ساتھ انھوں نے اس کتاب کی کیفیت کو بھی واضح کیا ہے۔

بخش دوم میں "پیش گفتار" کے عنوان سے سید عارف نوشاہی کا ایک مبسوط مقالہ ہے جس میں انھوں "ریاض العارفین" کے بعض اسقام کو اجاگر کرنے کے علاوہ مؤلف کتاب آفتاب رائے لکھنوی کے خاندانی پس منظر کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد "ریاض العارفین" کے مصحح پیر حسام الدین راشدی کے علمی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان ۲۴ کتابوں کا ذکر کیا ہے جنھیں راشدی صاحب نے اپنی تصحیح و مقدمہ کے ساتھ شایع کیا ہے آخر میں انھوں نے مشفق خواجہ کا بطور خاص شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے سب سے پہلے "ریاض العارفین" کے

خطی نسخے کا پتہ لگایا ہے۔

• **فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان** (جلد اول) از: احمد منزوی، ص ۹۴۹، طباعت ۱۹۸۳، قیمت ۱۲۰ روپیہ

جیسا کہ نام کتاب سے ظاہر ہے، یہ کتاب فارسی زبان کے اُن قلمی نسخوں کے تذکرے پر مشتمل ہے، جو پاکستان کے مختلف گوشوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب دس حصوں پر محتوی ہے جو بالترتیب اس طرح ہیں:-

بخش یکم: تفسیر، بخش دوم: تجوید، بخش سوم: دربارۂ قرآن، فہرست مؤلفان علوم قرآنی، بخش چہارم: ریاضی، بخش پنجم: ستارہ شناسی، بخش ششم: علوم غریبہ، فہرست مؤلف علوم ریاضی وغریبہ، بخش ہفتم: طبیعات، بخش ہشتم: ترازشکی، بخش نہم: کیمیا، بخش دہم: چند دانش۔

کتاب کا آغاز "سخنی مدیر" سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد مؤلف کتاب احمد منزوی کا "پیشگفتار" ہے جس میں انھوں نے اس کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے اپنے اس کام کو کس طرح انجام دیا ہے۔

• **احوال و آثار و اشعار۔ میر سید علی ہمدانی** (با شش رسالہ از وی) از: ڈاکٹر محمد ریاض، سنہ طباعت: ۱۹۸۵ء، صفحات: ۵۸۵۔

مشتملات: باب اوّل، شرح احوال میر سید علی ہمدانی۔ باب دوم، آثار میر سید علی ہمدانی، باب سوم، رسالہ نوریہ، مقدمہ و تعلیقات آن۔ باب چہارم، مشارب الاذواق (شرح سید ہمدانی بر قصیدۂ میمیۂ ابن فارض)۔ باب پنجم، مرادات دیوان حافظ و توضیح اصطلاحات آن از سید ہمدانی۔ باب ششم، چہل و یک غزل از سید ہمدانی۔ باب ہفتم، رسالہ درویشیہ، باب ہشتم، السبعین فی فضائل امیر المومنین۔ باب نہم، رسالہ ذکریہ۔

• **تذکرہ علمائے امامیہ پاکستان** از سید حسین عارف نقوی، سنہ طباعت ۱۹۸۴ء، صفحات: ۳۶۴

• **صیدیہ** بخش دیباچہ و اطعمہ و اشربہ از شرح فارسی شرائع محقق۔ از: سعد الدین ہروی، بہ تصحیح: محمد سرفراز ظفر، سنہ طباعت: ۱۹۸۴ء، صفحات: ۲۵۶۔

مشتملات: فصل اوّل۔ دربیان دلایل بر جواز صید، فصل دوم۔ در شرائط صید کردن، فصل سوم۔ (صید با باز و چرغ و مانند آن)۔ فصل چہارم۔ (صید با سگ و یوز و مانند آن)، فصل

پنجم - در مسایل تیر انداختن، فصل هفتم - (شکاری که ملک کسی میگردد و احکام آن)، فصل هشتم - در بیان ذبح کردن و کشتن، فصل نهم - در بیان آنچه حلال است و حرام است از جانوران، فصل دهم - (مذهب امام شافعی در شکار با جانوران در غان)، فصل یازدهم - در بیان باز ماندهٔ طعام و آب، فصل دوازدهم - (در بیان بول و انگندهٔ جانوران درغان)، **خاتمه** - در بیان نامها و حکمها و خاصیت های جانوران و غرایب حکایت ایشان -

• **منشور فریدون بیگ گرجی** - مقدمه و تصحیح : دکتر سید مهدی غروی - سنه طباعت : ۱۹۸۴ء، صفحات : ۴۸ -

مشتملات :- (۱) مقدمه (۲) اصول مهمهٔ مطروحه در این منشور (۳) بررسی و تحلیل منشور فریدون بیگ (۴) بررسی نام های یاد شده در منشور (۵) متن کتاب (۶) واقعهٔ نوشت (۷) اشعار فریدون بیگ (۸) نمونه ای از انواع خط طغرا

• (۱) **جهادنامه** - مولف مجهول قرن هفتم هجری

(۲) **طلسم نامهٔ اکبر** - (ترجمه جهاد الاکبر منسوب امام غزالی) سنه طباعت : ۱۹۸۴ء، صفحات : ۷۹

مشتملات : (۱) مقدمه (۲) جهادنامه (۳) طلسم نامهٔ اکبر (۳) فهرست احادیث (۴) فهرست اقوال عربی (۵) فهرست اشعار فارسی (۶) فهرست اعلام اشخاص و فرشتگان -

• **کتاب شناسی اقبال** - از دکتر محمد ریاض، سنه طباعت : ۱۹۸۶ء، صفحات : ۳۰۹

مشتملات : (۱) زندگی نامهٔ اقبال (۲) باب اوّل : کتاب شناسی اقبال در زبان اردو - مجله های ویژهٔ اقبال شناسی در هند و پاکستان - کتاب شناسی اقبال در زبان انگلیسی - مقالات مربوط به اقبال در زبان انگلیسی - کتاب شناسی اقبال در زبان فارسی - کتاب شناسی اقبال در زبان های دیگر - شماره های مخصوص مجلات دربارهٔ اقبال - رساله های فوق لیسانس و دکتری دربارهٔ اقبال - (۳) باب دوم - آثار اقبال - الف - آثار منظوم - ب - آثار منثور اقبال (۴) باب سوم - شرح های کلام منظوم اقبال - (۵) باب چهارم - ترجمه های آثار اقبال به اردو، انگلیسی، فارسی، المانی و ایتالیایی، پنجابی، بلوچی، بنگالی و ترکی (۶) ضمیمه - [illegible] آثار مربوط به اقبال شناسی، فهرست نام کسان، کتاب [illegible] و مقاله ها، INDEX، مستدرکات و اضافات و اصلاحات -

••

ETY.	H. Namık Orkun, *Eski Türk Yazıtları*, TDK., İstanbul 1938.
Fer.	Mevlevi Feruz ul-Din, *Feruz ul-Lugat, Feruzsons* Ltd., Lahore 1975.
Hüm.	Gülbeden, *Hümayunname*, TTK, Ankara 1944.
KB.	Reşid Rahmeti Arat, *Kutadgu Bilig* (Index), Türk Kültürünü Araştırma Enstitüsü, İstanbul, 1979.
KS.	Prof. K.K. Yuhdin, *Kırgız Sözlüğü*, TDK, Ankara 1945.
MT.	Modern Turkish or Turkish of Turkey.
Old Urdu.	Dr. Jemil Jalbi, *Kadim Urdu ki Lughat*, Merkezi Urdu Board, Lahore 1973.
Per.	Persian.
Rad.	Radloff, *Versuch eines Wörterbuches der Türk-Dialecte*, 1960.
Stein.	F. Steingass, *Persian-English Dictionary*, Librarie Du Liban, Beirut 1317.
Sami.	Ş. Sami, *Kamus-i Türki*, 1317.
Eanglax.	M. Mahdi Xan, *Sanglax*, comp. by G. Clauson, Luzac anc Co., Ltd., London 1960.
ŞS.	Şeyh Süleyman, *Lugat-i Çağatay ve Türki-yi Osmani* İstanbul 1298 h.
TL..	Hüseyin Kazim Kadri, *Türk Lûgatı*, Maarif Vekaleti, İstanbul 1927.
TS.	*Türkçe Sözlük*, TDK, Ankara 1969.
Tur.	Turkish.
Urd.	Urdu (the language).
UYG.	A. Caferoğlu, *Eski Uygur Türkçesi Sözlüğü*, TDK, İstanbul 1868.
Vekayi.	Reşid Rahmeti Arat, *Vekayi Babur'un Hatıratı*, TTK Ankara 1943.
Yeni Tar.	Cem Dilçin, *Yeni Tarama Sözlüğü*, TDK, Ankara 1983.

gin. There are still a number of words that require further study because either they have been changed totally, for example : 'kuch' (کچ) from «küçük or kiçik = 'small' or they have been invented in India; for instance, 'Achar' = an appetizer, from the Turkish verb 'açmak' = to open, thus metph. an appetizer (literally 'an appetite openner').

We have tried briefly to throw light upon some possible similarities between Turkish and Urdu. Further detailed study is yet required specially in the field of literature and linguistics.

ABBREVIATIONS

An.	Muhammed Padishah Shad, *Ferheng-i Anandraj*, Kutuphane-yi Hayyam, Tehran.
Ar.	Arabic.
As.	Mevlevi Seyyid Ahmed Dehlevi, *Ferheng-i Asfiye*, Taraki Urdu Board, Dehli (first published in 1896, new edition 1974).
AŞN.	Agah Sırrı Levend, *Ali Şir Nevai*, TTK., Ankara 1965.
Bayur.	Hikmet Bayur, *Hindistan Tarihi*, TTK., Ankara 1946.
Cl.	Sir G. Clauson, *An Etymological Dictionary of Pre-Thirteenth Century Turkish*, Oxford 1972.
Doerfer.	Prof. G. Doerfer, *Türkische und Mongolische Elemente im Neupersischen* I, 1963; II, 1965; III, 1967; 1975 Wiesbaden.
DS.	*Derleme Sözlüğü*, TDK (Board of Turkish), Ankara 1963.
DT.	Mahmud of Kashgar, comp. by Besim Atalay, *Divanü Lugat-it-Türk*, (finished in 1077 A.D.), TDK., Ankara 1940.
DT.	Dizin. Besim Atalay, *Divanü Lugat-it-Türk Dizini* (Index), TDK, Ankara 1943.

یوروش (yurush) 1 - to attack enemies 2 - the act of attacking enemies (As. IV, 787).	«an assault, attack, storm» (Stein. 1537) : «to attack» (Rad., III, 603); yürüyüş : «to walk, practice of walking» (TS., 817 from the verb 'yürümek' = to walk or metph. to attack enemies).
یوز (yuz) 1 - One hundred 2 - Tiger also 'yüzbaşı' = rank of captain. (Fer., 1271).	yüz : «a hundred» (DT. Dizin, 827) and (Cl. 983). «a small panther or ounce specially used in hunting deer» (Stein, 1537) and (Sanglax., 343r).

In addition to the above vocabulary there are quite a number of words formed with the Turkish suffix - ci (چی) by attaching to the Persian and Arabic nouns, adjectives or even adverbs. The suffix denotes persons who are professionally or habitually concerned with or devoted to the object, person or quality denoted by the basic word. For example, topçu (gunner); hazançi (treasurer); afimçi (one who is edicted to opium etc.).

Bavurçu (باورچی) = As. shows that the word is formed from Per + Tur. 'Baver' = trust + - ci e.i. One who can be trusted thus metaphorically «A cook». Stein. says «An officer who attends to a great man's table and whose duty is to taste his master's food, a cook» (p. 153). Radloff gives as «a relative or friend» (Rad., I, 82).

Darugha (داروغه) : Both As. and Fer. show it as a Per. word (see As. II, 221 and Fer., 552) «a director, police officer and a guard». However, Prof. Fuad Köprülü (see Turkish Encyclopedia of Islam, III, 1774) gives the meaning as, «a policeman, a little clerk, superintendent of police or a representative of a Mongolian Khan». The word can be either of Mongolian or of Turkish origin.

Consequently, the Arabic and Persian elements in Urdu are more dominant than the Turkish ones because the Turkish immigrants adapted Persian as an official language. The author of Asfiye gives the number of the Turkish words as 105, of Arabic as 7584 and of Persian as 6041 and of English as 500 (see ibid, vol. IV, 794). Our list above covers around 118 words of Turkish ori-

یراق (yarak)
1 - A weapon 2 - Tools for war (Fer., 1268). «saz-u yarak» (M. İqbal, Zarb-i kelim, Ghulam and Ali and Sons, Lahore 1966 p. 24).

yarak : «weapon» (ETY., IV, 133); «weapon like gun, sword etc.» (ŞS. 303); «A tool, weapon metph. penis» (TS., 789).

یزک (yezek)
1 - Night watchman 2 - Guards for protecting soldiers 3 - reconnaissance troop (As. IV, 782).

yezek : «Vanguard troop» (DT. Dizin, 778); «advance guard» (Cl. 986); Not used in the MT.

یسال (yasal)
Soldiers on guard or guards of soldiers (Fer. 12693.

yasal : «line, a row, a row, to stand in a row» (ŞS., 303 and Deorfer II, 1791); «wing of an army» Stein., 1531).

یساول (yasavul)
1 - Messanger 2 - Royal messanger 3 - police (Fer., 1269)

yasavul : «Otto. Hist. official charged with the arangement of state processions, guard» (Red. 1245); «protector, guard» (Yeni Tar. p. 237).

یلغار (yalgar)
1 - To attack enemies 2 - A speedy horse (As. IV, 786).

elgar : forwards» (UYG., 92); «to run, acceleration» (DS. V, 1713); «to run or attack towards enemies» (An., VII. 4684) and (Deorfer., I, 70).

یال (yal)
1 - Neck 2 - A horse's mane (As. IV, 780).

yal : «a horse's mane, hence the place where mane grows» (Cl. 916); «horse's mane» (DT. Dizin, 821); in MT it is used as 'Yele' (TS., 797).

كورنش (kurnesh)
1 - To salute by bending 2 - Bending 3 - Bending due to respect (Fer., 925).

görmüş : «to see a king or to be seen by a king, e.i. to access him» (Bayur, II, 416); from 'körüş' = «meeting face to face, look, sight, eyesight, appearance etc. (Cl. 747); «görünüş» = apperance of a thing (TS., 299).

نوکر (nokar)
A servant (As. IV, 617 shows as Per.).

nöker : «servant, orphan» (ŞS., 283); «clerk, servant, comrade» (Rad. III, 695) It can be a loan word from Mongolian (see Cl. 774), however it is not used in MT.

وشاق (vushak)
1 - Slave 2 - Servant 3 - A Turkish slave or a young boy (As. IV, 649).

uşak : (uvşak) «cmall, little» (DT. Dizin, 700); «a small child, a small object» (Cl. uvşak p. 16); «child, boy servant» (TS, 757).

هراول (haravul)
1 - A gun- man 2 - Vanguard keeping watch on enemy (Fer., 855 and 1245).

karavul : «A sentinel, watchman» (Sanglax., 271 v); «A sentinel, spy, guard, the vanguard; a game keeper, hunter» (Stein., 962); «watchman, guard, vanguard» (Hüm., 19; ŞS., 287).

یابو (yabu)
A small horse (Fer., 1266)

yabu : «an horse, house for carrying load» (ŞS., 289); yabağı (yabağa, çabağı) : «colt, newly born horse» (Cl. 874); «useless horse» (Rad., III, 284). Not used in the MT.

یاغ (yagh)
Oil (Fer., 1267).

yağ : «grease, fat or oil» (Cl. 895) and (DT. III, 159).

يرغه (yarga)
A trotting horse. (Fa., 1268).

yorıga : «a horse that ambles or goes at a jog trot» (Cl. 964) and (DT. Dizin, 802).

کلچه (kulche)
A kind of bread baked in oven (Fer., 908 gives it as Urdu).

külçe : «a kind of round small bread. a bun» also used in the expression 'cheeks like külçe' (ŞS., 254); külço : «a small Özbek bread» (KS. 535); külçe : «A bun or bread made of maze or wheat without yeast in a tray or on a sheet iron» (DS., VIII, 3033).

کوتوال (kotval)
1 - Chief of police station 2 - Guard of a citadel (Fer., 923 gives as Per.).

kötavul (Kütval) : «warden of a citadel or castle» (ŞS., 256): «Guard, a military rank» (Rad. II, 1481). Not used in MT.

کوچ (kuch)
1-Migration or parting 2-Leaving a place 3-To transfer (Fer., gives as Per., 924; As. as Tur).

köç : «migration» (DT. Dizin, 354); Loan word in Per. (Doerfer, III, 1660); «migration» (UYG. 113 and TS., 'göç').

کوچك (kuçek)
A small child, small (As. III, 584; Fer., 924 both give as Per.).

kiçig : «small, little, young» (UYG. 109); «puppy, a small child» (ŞS., 257) for other details see Cl. 697-98. «small» (TS. 486).

کوکلتاش (kokultash)
A foster brother of a king (Fer., 926).

kökültaş : «foster brother» (Abuşka., 361); from 'kökül' = a nurse and-daş, a suffix for showing noun association.

کوکه (koka)
1 - Foster brother 2 - Child of a foster mother (Fer., 926 gives as Per. As. 593 gives as Tur.).

köke : «a woman's breast, foster brother, a short form of 'kökültaş» (Hüm., 20); «kökül or koka» = milk nurse (ŞS., 260).

قمچی (kamchi)
1 - A whip 2 - a stick 3 - flexible branch of a tree (Free., 862).

kamçı : «a whip» (UYG., 162; DT. Dizin 257).

قنات (kanat)
Side curtains or sheets of a tent (Fer., 862).

kanat : «A covering of a large tent» (KS., 396) for other details see Bayur. II, 424 and Cl. «the fly of a tent» p. 635.

قور (kur)
1 - Weapon 2 - A ribbon or sash for the edges of cloth (Fer., 863) also 'kurcu' and 'kurbeyi' (see Vekayi., 625).

kur : «belt, a sash or girdle, to sit in a circular form on the occasion of wedding, weapon forbidden thing, trap and armoury» (ŞS. 233); not used in MT.

قورمه (korma)
Fried meat (Fer., 863 and As., 401).

kavurma : «fried meat» (DT. Dizin. 390); «aspoon, wooden spoon» (ŞS., 234); «to bake and roast (Cl. 612, 'kuğur-'); «to fry something» (TS., 242).

قویماق (koymak)
A special bread made with onion, butter and white of egg (Fer., 864).

kuymak : «a kind of bun baked with butter or oil, oily bread in layers» (ŞS., 242); «a kind of omlet with egg, flour and cheese» (DS., VIII, 3020).

قیمه (kiyma)
Minced meat, chopped meat (As. III, 410 shown as Ar.).

kıyma : «minced meat» (DT. Dizin., 325) «chopped beaten or minced meat» (ŞS., 249) also see Doerfer III, 1608 and Cl. 677. From the verb 'kıymak' = to chop.

قیچی (kenchi)
1 - Scissors 2 - An iron fence arround a house (Fer., 866).

kayçı : «sciccors, beams of a roof» (Stein 999), kayıçı = «scissors» (DS. VIII, 2700 Not commonly used in MT.

قزاق (kazak) 1 - One who waylay on the road 2 - Cossack, the Cossacks (Fer., 856).	kazak : «adventurer, independent, rover» (Rad., II, 364); «Fighting horse-men who have a different class in Russia and Iran, A Turkish clan living in Central Asia, a man who has full control over his wife» (TS., 428).
قشلاق (kishlak) Winter quarters of [illegible]ngs (Fer., 857 gives as [illegible]r.).	kışlak : «winter [illegible]» (DT. Dizin. 323) and Cl. 6[illegible], [illegible] place where a tribe dealing with cattle growing come to stay during winter from normal pasture.
قشون (kushun) 1-A troop of soldiers 2-Camping site of an army (Fer., 857).	koşun : «soldiers, army, group of people, «([illegible]. 237); [illegible] soldiers army he[illegible] «army, h[illegible] of [illegible]ple» (TS., [illegible]).
قلانچ ، قلاچ (kulanch) or (kulach) 1 - A distance between two hands. 2 - A measure for cloth 3 - Springing or jumping of a horse, dear or rabbit (As. III, 393).	kulaç : «the distance between the finger tips of two outstretched arms» (Cl. 618; DT. Dizin, 375). Same in the MT.
قلپاق (kalpak) A kind of high cap (Fer., 860).	kalpak : «a pointed cap, a cap» (KS,. 391, Rad., 268); «a cap made of fur or of cloth like fur» (TS., 400).
قلی (kuli) 1 - Slave 2 - porter (Fer., 862 also gives the plural from 'kullar' = The royal body-guards.	kul : «slave» (DT. Dizin, 375). The form 'kuli' is not used in the MT.

قاق (kak)

Dry meat, metaph. a very thin person (Fer., 849).

kak : «a dry thing or an object, dry fruit such as plum or apricot» (DT. Dizin., 251); «a place dried up by son or fire where water may accumulate» (ŞS. 200). Not used in MT.

قاقم (kakum)

Ermine fur, or an animal like ermine (Fer. shows it as Tur., 849).

kakum : «ermine, lynx, bobcat, or any kind of animal for fur» (ŞS., 221) but Sami and TS gives it as Arabic.

قتی (kuti)

1 - A small box 2 - a small grape box (As. III, 372 and Fer., 85 gives it as Tur.).

kuti : «small covered container, a small box» (Cl. 596 and Doerfer, III 1569); Sami and TS gives it as a Greek word.

قدغن (kadghan)

1 - Great care 2 - Warning 3 - Information 4 - Respect shown to a king (Fer., 853; As., III, 374).

kadagan : «forbidden, break, cessation from work» (ŞS. 227 and Doerfer I, 270) Sanglax p. 268r where قداغان and قدارغان are shown as the same words mean «warning».

قراول (karavul)

See here 'haravul'.

قرق (kurk)

1 - Prevention 2 - to forbid 3 - to stop from (Fer., 885; Old Urdu, 165).

koruk : «guarding, a meadow or pasture that is protected from grazing for the sake of the cattle of the Sultan's overseers» (Cl. 652).

قرمساق (kuramsak)

1 - One who offers his wife to others, pimp 2 - Unwise person. (As, III, 381).

kurumsak : «pimp, whore» (ŞS 234); Sanglax gives the similar meanings for detail see ibid p. 286r.

2 - Headquarters, the centre of army (Hazinetü'l Lugat, I, 4 and As. III, 318).

595) not used in MT. It is probably Persianized form of 'kol' = a small group of soldiers (TS., and Doerfer. I, 307).

قاآن (ka'an)
1 - A great justice 2 - A wise king 3 - A generous king (Fer. 847).

See 'hakan'

قاب (kab)
1 - A large cup 2 - A large plate 3 - A round large tray (Fer., 847, As. III. 359).

kap : cup, sack, bale, envelope or amion (DT. Dizin, 262); for other details see Cl. 582 'kabak'.

قابو (kabu)
1 - chance 2 - control 3 - ambush 4 - revenge 5 - ruler (emir) (As. gives as Tur. III, 363; Fer., gives as Per., 847).

kapu : «chance, aim» (ŞS., 212); «goal, reason, source, opposite» (TL. III, (653). Not used in MT.

قابوجی (kabuji)
1 - A door keeper 2 - used for belittling someone, «mean, egoist, opportunist, unthankful» (As. III, 361).

kapucu «from 'kapı' = door (Cl. 583); «A person who keeps door» (TS., 407); kapğuci : «snatcher, one who snatches cattle» (DT., II, 50); kapçı : «hunter, snatcher, usurpation» (ŞS., 213); to grasp or seize with hands, teeth etc». (Cl. 580).

کاش ، قش (kash)
Slice of fruit, piece (As. III, 362).

kaş : «eyebrow» hence metph. «the edge or side of a thing» (Cl. 669). «side of a thing» (DT. Dizin 276). Not. used in MT as 'Slice'.

قاز (kaz)
A goose (As. III, 362).

kaz : «goose» (DT. Dizin., 287); (TS., same, 427). For other details see Cl. 679.

ساچق (sachak)
Presents sent to bride's house by bridegroom one day before wedding called «henna night» (Fer., 693).

saçuğ : «money and goods sent from the bridegroom's house to the bride's house on the occasion of a wedding» (Cl., 796) ; «jewels, money and food distributed on festive occasions» (Cl. 796) ; «dress and suit» (ŞS 178 not used in MT).

سراغ (suragh)
1 - Sign 2 - Traces 3 - Search 4 - foot prints 5 - hints or traces (Fer., 722).

surag or sorak : «asking, information, news, investigation, test» (ŞS. 188) ; in Türkmen dialect 'surag, or sorak = «inquiry, news, questioning» (Cl. 848).

سرمه (surma)
Collyrium (Fer., 725 gives as Per.).

sürme : «antimony, collyrium», «something rubbed (on the eyebrows)» (Cl. 852 and TS. 685 from the verb 'sürmek' = to rub).

سوغات (soghat)
Present, gift (Fer., 747).

savgat or soğat : «a present, gift» (Abuşka, 290, 273) ; «Present, gift, mercy» (Yeni Tar. 182).

طغرا (tughra)
1 - Mark 2 - Imperial signature 3 - A ring with stamp (Fer., 795).

tugrağ : «tuğra and tura : a royal sign manual, the seal and signature of a king» (Cl. 471, DT., I, 462).

طوی (tuy)
1 - An embroidered ribbon esp. used on the occasion of wedding (As., III, 253; I, 640).

toy : «wedding ceremony» (ŞS. 17) not used in MT.

غول (ghul)
1 - A group of people, crowd

gul : «lined up soldiers, the special group of Khan's soldiers» (TL, III,

خاقان (khakan)
1 - A big king, emperor 2 - A title of the Chinese and Turkish kings (Fer., 531).

hakan or kağan : «an independent ruler of a tribe or people» (Cl. 611); «sultan, emperor» (TS.); «descendant of a royal family» (Rad, II,

خان (khan)
1 - Chief 2 - Head 3 - A title given to Afghan tribes (Fer. 532; As. 178, Fer. shows as Tur., As. as Per.).

Han (xan) : «It was synonym of 'Kağan' but later it was used for a subordinate ruler, the Turks' supreme ruler, emperor» (Cl. 630); «a title given to the descendants of Afrasyab» (DT. Dizin, 212). «King, a ruler of a nation, head of a household, ruler» (ŞS. 166); «a title given to a subordinate ruler who is independent or affiliated to an emperor, a title adapted by the Ottoman kings» (TS., 322).

داغ (dagh)
1 - Spot, sign 2 - impression made by hot iron 2 - Wound 3 - worry 4 - to stain the character of somebody (As. II, 222 gives as Per).

dağı : «brand made with hot iron on horses or cattle, act of such marking» (DT., III, 153); «burn, scald, sign, mark made with hot iron» (ŞS., 168). «brand with hot iron or metal, such impression made for medical treatment» (TS., 178).

دادا (dada)
1 - Grand father 2 - Master 3 - Elder brother 4 - An old man (Fer. 552, Hindi).

dada : «grandfather, grand parents, mother's father» (ŞS., 168); 'father' (Oğuz., DT., III, 221); «Grandfather» (Cl. 451; Deorfer III, 1179); «uncle» (Rad, III, 1640).

دلمه (dulma)
Dish prepared by stuffing mince meat in eggplant or carrot (As. II, 264).

dolma : «any king of food prepared by stuffing rice or other objects» (TS., 214). From the verb 'doldurmak' = to stuff.

چقماق (chakmak)
1 - Flint 2 - Flintlock used in guns (Fer., 487).

çakmak : «any means for burning fire» (DT. Dizin, 132). «a lighter, steel for triking on a flint» (DT. I, 469) Same in MT.

چقر (chukar)
Water pool (Fer., 484).

çukur : «a hallow, pit» (çakör : Uyg. 60); «a pit» (TS. 175).

چکن (chikin)
Handicraft, an embroidered piece of cloth. (As., 11 113).

çıkın : «embroidered piece of cloth» (An. II, 1446). «Shawl usually embroidered» (Sami, 514); «gold emroidery» (Cl. 416).

چقندر (chukundar)
Red beat (As. 11, III).

cükündür (çukundur, çükündürük) «beat, carrot or cabbage» (DT., III, 1307).

چمچه (chamcha)
1 - A spoon, an object used for drinking soup or syrup. 2 - ladle (Fer., 92 and As., II, 119).

çömçe : «ladle, scoop» (Cl. 422). «a large wooden spoon or ladle» (DT. Dizin 158); «a large carved wooden cup for drinking water» and «a large wooden spoon» (DS. III, 1266, 1284).

چوماق (chomak)
A stick, club (Mir Aman, Bagh u Bahar, 1976 p. 251).

çomak : «stick, baton» (DT., Dizin 157); «a stick» (TS., 173).

چیچک (chechek)
Smallpox (As., II, 150) shown as Per.).

çeçek (çiçek) : «flower, hence metph. «a skin eruption especially 'smallpox' (Cl. 400); «smallpox» (Doerfer III, 1073).

خاتون (khatun)
1 - Wife, woman 2 - daughter of a lord 3 - lady 4 - daughter of an 'emir' (As., II, 173).

katun : «woman, lady» (DT. Dizin., 281, 602); «lady, queen (Uyg. 171) in MT 'hatun' (TS., 330).

(As. II, 92).

cal or mental, e.g., to strike fire, to bite, sting, to slander, decry, betray» (Cl. 405) Not used in MT.

چاقو (chaku)
A small knife. knife (As. II, 92).

çaku : «knife» (Rad., IV, 1834) «a foldable pocket knife» (TS., 148).

چاوش (chavush)
1 - A guard who has a club in his hand 2 - A leader (Fer., 473).

çavuş : «sergeant, guard; a person who keeps the soldier's line in order during war and protects them from torture» (DT. Dizin, p. 139). In MT it means only 'sergeant'.

چپقلش (chapkalish)
1-A sword 2-Turmoil 3-Crowd (As. 11, 98).

çapkalış : «turmoil, crowd, mass, a group of people» (ŞS. 159); from the verb' çapmak' = to hurry up, to raid, plunder, to strike with a sword, to wound, to sever with a single blow» (Cl. 394); «turmoil» (Rad., III, 2153) not used in MT.

چتر (chatr)
A large umbrella used for kings (As., II, 100 word is given as Urd).

çadır or çatır : «loan word ultimately derived from sanskrit 'chatra' 'a royal umbrella» (Cl. 403); «a tent, a curtain for bed» (Rad., III, 1898). «a tent, a room, a large room» (TS., 147).

چق (chik)
A curtain made of reeds (As. 11, 111,

çık : «a reed curtain» (Cl. 404); «a mat made of reeds» (DT. III, 1206).

چقاچاق (chakachak)
Sounds produced by the clashes of swords (Fer., 487).

çakaçak : «a sound produced by the claches of metalic things» (Yeni Tar 49).

تمن (tumen) 1 - Ten thousand 2 - A group of soldiers 3 - Team of soldiers in hundred each. 4 - Golden coin (Fer., 346 and As. 1, 626).	tümen : «large in number» ('tümen tümen' DT. Dizin 670); «ten thousand» and «an in definitely large number» (Cl. 507); 1 - a large heap 2 - division 3 - ten thousand soldiers» (TS., 749).
توپ (top) 1 - Gun, cannon 2 - A fat man (Fer., 353). 'Topçu' and 'tophane' also exist in Urdu.	top : «a cannon» (see 'topık' DT., Dizin 640) : «things somewhat round in shape, cannon» (TS. 738).
توشك (toshak) Cotton mattress (As. 1, 638).	töşrek : «mattress» (DT. Dizin 647); «mattress, bed, a pillow» (ŞS., 119); For its Turkish origin see Cl., 563 and Doerfer II, 967.
توره (tura) 1 - Islamic tradition, Islamic law 2 - Royal order 3 - Division or section 4 - Food distributed a few days before a nuptial day 5 - pride, richness 6 - rank (Fer., 354, As., I, 636).	töre or törü : «a traditional law» (Cl. 53) «order, ordinance, tradition» (DT. Dizin, 647) also see Vekayi. 657; «Tradition or customs of a group of people» (TS. 742).
جغرات (joghrat) Coagulated or curdled milk, yogurt» (Old Urd. 93).	yoğurt : «Yogurt, coagulated curdled milk» (Cl. 905 and TS., 808).
چادر (chadir) 1 - Red cover, sheet 2 - A cover on tomb (As. II, 88).	see «Çatr».
چاق (chak) 1 - Strong, healthy 2 - Active	çak : «exactly, precisely» (Cl. 404); «action of a violent character, physi-

بگ (beg)

1 - Master, a prince or commander. 2 - A title given to the Turks of India (Mughals) (As. I, 467).

beg : «a prince, the head of a clan, husband, a married man» (DT. Dizin 78). «chief of a clan, a man, husband (Uyg. 37 and Cl. 322). «A rich man, a noble or head of a kingdom, Mr.» (TS., 100).

بگم (begum)

A lady (Fer., 215).

bige or bigim : «a lady» (AŞN, II, 236) Not used in MT. Female of 'beg'.

پاشا (pasha)

Title given to the Turkish chiefs, governor, lord, chief of army (Fer., 233).

Probably a short from of 'baş' = head and 'ağa' = master i.e. 'head master' «a title given to hingh rank officer or clerks at the Ottoman time now it means 'a general' (TS., 948).

تتق (tutuk)

Curtain, tent (Fer., 309).

tutuk : «overcast sky, tongue-tied ; paralysed, closed» (Cl. 453); «curtain, veil, a lady's veil, covelred and closed» (Yeni Tar., 215).

تزك (tuzuk)

1 - Order 2 - law 3 - principle 4 - police regulations 5 - grandour 6 - The diary of a king (Fer., 324).

tuzuk : «well arranged, proper, appropriate, right, good and marvellous» (ŞS., 119); Tüzük : «ordinance» in MT., see Vekayi, 659.

تمغه تمغا (tamga)

1 - A stamp on gold or silver 2 - royal seal 3 - sign 4 - impression burnt on animal's back 5 - trade mark 6 - title-deed 7 - gold or silver medal given as present 8 - coin 9 - receipt of tax 10 - stamp of a degree (Fer., 346, As., I 626).

tamga : «the stamp of a king or an emperor» (DT. Dizin., 567); «impression burnt on animals, stamp etc. (Cl. 505); damga : «a tool for stamping a paper, a mark made by burning or heatening up a stamp» (TS. 182).

بخشی (bakhshi) بقشی (bakshi)
1 - A person who distributes the salaries of soldiers 2 - Commander, general (Fer., 171).

bahşi : «Music player, singer lover» (ŞS., 74) ; «a secretary» (AŞN., IV, IV, 278) ; «secretary, clark that deals with accounting, a doctor» (Vekayi, 585).

بقچه (bukcha) بغچه (bugça)
Anything wrapped in a piece of cloth. (As. 1, 399).

boğ : «baggage, saddle-bag» (DT. Dizin 98) ; «a square wrapper for a bundle» (TS., bohça p. 114).

بکاول (bekavul)
Cook, a rank (Fer., 187 gives it as Per.).

bekavul : «Head of the council of state, chief taster at the Sultan's court» (ŞS. 75) ; «one who supervises the royal kitchen, a group of soldiers that serve meals during feasts» (Vekayi., 590). Not used in MT.

بلاق (bulak)
1 - A nazal ornament 2 - A nazal ornament with bead placed by babies' mother as a protection against death (As. I, 408).

bulak : «water fountain, a nazal ring worn by women» (An. I, 754 and Cl. gives only «the spring of water» (ibid, 336).

بوز (boz)
Horse, specially white horse (Old Urd. 50).

boz : «white of horses, mules and asses» (Cl. 389) ; «white horse, red horse, grey horse» (DS. II, 750).

بہادر (bahadur)
1 - A young man 2 - A strong man 3 - Courageous, brave 4 - A title used for the governmental officers. 5 - Something precious like pearls (As. I, 425).

bahatur : «a Hunnish proper name, picked warrior» (Cl. 313, bağatur) ; «A person who is renowned for being successful in wars» (TS., 90).

1, 215).

successfully against enemy» (Red., I, 1853); «hare, morsel» (DT. I, 62 and Cl. 153). Not in use in MT.

انا (anna)
Nurse of a child, nurse who gives a suck to a child (As. truely states that it is from the word «ana» p. 233).

ana : «mother» (Uyg. 14); a woman who has a baby or an animal that has a baby» (TS., 38).

اولما (oyulma)
To pluck skin by softening it in hot water; to cook intestine by stuffing mince meat in it (As. 1, 312).

yolma : from the verb 'yolmak' = to pluck, to put a skin in hot water for the process of plucking (DT. III, 64); Cl. gives as 'yulmak' (p. 918); «to pluck by pulling» (TS., 810).

اياغ (ayagh)
A cup, goblet (Fer., 135).

ayak : «goblet» (Uyg., 27); «a cup, goblet, wine glass» (ŞS., 54); «pot, goblet, cup» (DT. Dizin., 53).

ايبك (aybek)
1 - A slave 2 - messenger 3 - beloved, idol (Fer., 135).

aybek: «ay» = moon + «bek» = big, therefore «aybek» = a big moon (see also An., I, 514); «servant or messenger» (An. I, 514) No more used in MT.

ايلچى (elchi)
1 - Ambassador 2 - Messenger (As., 1, 334).

elçi : «ambassador, representative of a government in foreign countries» (l. 129 and ŞS. 58).

باجى (baji)
1 - Sister 2 - Elderly woman 3 - Woman who has become mother at an early age (As., 1, 346).

bacı : «elder sister, sister» (ŞS. 67 and DS. II, 457).

آکا (aka)

1 - Elder brother, friend 2 - A word for addressing «my friend, O, my friend» (As. 1, 89).

aka : «elder brother» (Uyg. 9); «mother and father, elders» (Rad., I, 676); «father, elder brother» (DS., 1135).

آل (al)

A root from which red colour is obtained, red colour (As. 1, 208).

al : «red colour» (DT. III, 162) and (Cl., 120). Also used in MT.

الاغ (ulagh)

1 - A post horse 2 - A donkey used for carrying load 3 - a small boat (Fer., 106).

ulag : «chain, line, connection» (Uyg., 264); «an animal for carrying goods, source of water, or a small boat» (ŞS., 38); «any horse which an express horse rider takes by order of an emir (i.e. beg) and rides until he finds another (Cl. 136 DT., I, 122).

آلتمغا (altamgha)

1 - Red seal (fig. a signed royal order); 2 - A title-deed; land certificate issued by a king for the land estate presented by him (As., 1, 209).

al + tamga : «A piece of land presented by a king» (for detail see Bayur, II, 442).

الغارون (algarun)

Too much, in excessive amount (according to As. it is compound noun i.e. 'elgar' (Tur.) + -un (Arabic suffix for plural, (As., 1 215).

In MT. it does not exist. The form in use was «yelgar» in old Turkish.

الش (ulush)

Remnant of meal, remnant of meal of a rich man. (As.

ülüş : «remnant of melal», «remnant of meal of a Khakan presented to a person who handles swords or fights

اوجاغ (ucag)
Stove, hearth (Fer., 67).

«stove» (oçak DT., I, 67).

اچا (acha)
1 - Father or grand father 2 - Old servant, aged nurse of children (As. 1, 119).

aça : «mother, old woman» (ŞS. 5); «a word that indicates any member of relatives» (ETY., IV, 3) «elder sister» (eçe, DT., I, 85).

اردو (urdu)
1 - Army, an army camp 2 - A name of the language spoken in Pakistan and India. It was also called 'urdu-yi mualla'. The most efficient form is of Delhi and Lucknow (As. 1, 143).

ordu : «The city where the royal camp or Khan is found» DT. I, 124); «The palace or a place where the royality is found» (Cl., 203 and Uyg., 142); «a place where the army settles, the tent of an emperor (Khan (Rad. I, 1072); «The whole of the army of a government» (TS., 903).

ارمغان (armaghan)
«A gift, a new object, a rare thing» (As., 1 148 gives as Per.).

armağan : «a gift brought from a journey, a gift» (DT. I, 140 and Cl., 232).

آش (ash)
1 - Soup 2 - Dish with plenty of water in it (Fer., 21).

aş : «food, feast given on the occasion of festival of sacrifice, animal to be sacrifised» (Uyg., 23); «food, rice (pilav)» (ŞS., 13); «cooked food» (TS., 54).

اشلق (ushluk)
Slander, backbiting (Fer., 3; As. 1, 175).

uşak : «backbiting, slander, slanderer» (DT. I, 123 and Cl., 16). Does not exist in MT.

آغا (agha)
1 - Master, owner 2 - elder brother 3 - husband 4 - judge and a gentleman. (Fer. 22 and 24).

ağa : «elder brother» (Uyg. 6); from the verb 'ağmak' = to rise from some-where; to climb up (Cl. 77); «a title given to a person who is respected by people and has influence» (TS., I, 16).

Turkish words and its meanings in Urdu	*Meanings in Turkish*
آپا (āpa) Elder sister, sister (As., I, 98)	apa : «sister, elder sister (Uyg. 18; ŞS., 3; DT., I, 87; Rad., I 612)» aba, apa : »sister, elder sister, mother» (DS. I, 1).
اتا (ata) 1 - Father 2 - respect worthy old man (Fer., 61).	ata : «father» (Uyg., 24); «nick name title, father» (DT. Diz., 47); «any of the grand parents» (TS., 57).
اتاق (utak) Tent, house (Fer., 61 the word is shown as Per.).	otağ : «tent» (KB., 347; DT. III, 208) «big and decorated tent» (TS., 575).
اتالیق (atalik) 1 - Master 2 - Teacher of culture, trainer (As. 1 103).	atalık : «God father, a man who is trusted by a king and regarded as father, a rank in Turkistan, a person whose duty is to listen to the complaints of people and thus advise the king about it (ŞS., 4; Rad. I, 458). Not used in MT.
اتکہ (atga) Husband of child's nurse (Fer. 63).	ataka : «same as'atalık', a rank in the Central Asia» (ŞS. 4); «an uncle who trains» (Rad. I, 842); composed of the words : 'ata' = father and 'eke' = elder brother. For other details see Vekayi, 579.
آتو، آتون (atun or) (atu) Lady teacher, a lady who teaches reading and writing (As. 1, 108).	katun : «lady» (DT, I, 138); «wife of a religious man» (Rad, I, 463); «wife of a king, head wife» (atun and khatun, TL, I, 25).

a) **Syntactic similarities :**

I — O ekmeği yedi (Tur.) 1 2 3	
II — Us ne ruti khayi (Ur.) 1 2 3	He ate bread (Eng.) 1 3 2
III — O nan khurd (Per.) 1 2 3	

Persian, Turkish and Urdu have the same sentence structure i.e Subject + object + verb.

b) Possesive and adjectival constructions :

I — Kızın gözleri (Tur.) 1 2	
II — Larki ki ankhen (Ur.) 1 2	The eyes of a girl (Eng.) 2 1
III — Cheshmi dukhtar (Per.) 2 1	

and;

I — Güzel kız. (Tur.) 1 2	A beautiful girl (Eng.)
II — Khubsuret larki (Ur.) 1 2	1 2
III — Dukhtar-i ziba (Per.) 2 1	

Following is the list of the Turkish words that managed to live on in Urdu. Some diachronical details have been given to prove the origin of the words while semantic differences have also been given :

Türki men Farsi men behri revan hey wo[25]
«If he is a wise teacher of Rekhta,
He is also a perfect teacher of Arabic
He is like a flying cloud of English and Sanskrit
In Turkish and Persian he is like a flowing river».

Why one has to be like a flowing river in Turkish? is the question to be studied further. The Indian Turks did not only influence the Urdu language but they also played an outstanding role in the improvement of its literature. The Turkish scholars who migrated to India during the 17th and 18th centuries were not small in number. Their Indianised ancestors such as: Mirza Bedil (1720-1644); Mir Taki Mir (1713-1724); Khuvaja Mir Derd (1720-1784); Mirza Muhammed Refi Sevda (1713-1780); Inshaullah Khan Insha (died in 1817); Saadet Yar Khan Rangeen (1756-1835) and the king of Modern Urdu poetry Asadullah Khan Ghalib (1797-1869) perhaps did not know Turkish well, yet they had Turkish minds that reflected in the Urdu poetry. Last Timurid kings Muhammed Shah, Alemgir-i Sani, Shah Alem Sani[26] and Bahadur Shah Zafer tried their hands successfully on the Urdu poetry.

As far the language itself is concerned, there are some grammatical similarities between Turkish and Urdu[27] that, however, require further scientific study. To draw our reader's attention towards the subject we give a summary of these similarities and then pass on to the Turkish words that entered Urdu either directly or via Persian. Some words that are not of Turkish origin but are given as Turkish[28] have been deleted from the list.

Despite the fact that Urdu belongs to the Indo-European group and Turkish to the Ural-Altaic, some similarities are seen as follows :

25 See Mevlevi Seyyid Ahmed Dehlevi, *Hazinetü'l-lugat*, Bhopal 1886 A.D., p. 523.

26 See Dr. Jemil Jalbi, ibid, p. 21.

27 For details vide Prof. Dr. Halide Dolu's article «Some Similarities in the Turkish and Urdu Languages», University of Peshawar Magazine, 1974.

28 For example see the words enlisted by Dr. Akmel Ayyubi in his article «Urdu ke Turki Anasir», *Aks-i Jamil*, Islamiye University Aligarh 1984, p. 17-18. Some such words are 'Paycha, sodagari, nagha, nakab, sipahi, shalvar etc.

the Indian and Indianised Turkish scholars left Persian aside and embraced their self produced language. Thus, Shahjihan's period can be called 'the Dawn of the Modern Urdu' spoken by more than four million people of Pakistan and India.

4 — *From Shahjihan to the 19th century and onwards* : Many Turkish tribes along with their traditions immersed in the deep sea of the huge population of India at the time of Aurang Zeyb and his Indianised ancestors. Today, their traces are found under such titles as : 'Mirza', 'Beg', 'Türki Banjara', 'Ghori', 'Khoja', 'Joja', 'Chaghatay', 'Khilji'. The word 'Turk' was used for the Muslim and many Indians called their beloveds 'Turkova'[22]. In the southern part of India they call Urdu 'Turki Mata (the Turkish words)». The Turkish language once taught at the Indian schools disappeared, for ever, after the English invasion. The deeply rooted Persian also faded away. The English tried to change the name of Urdu into 'Hindustani' and attempted to replace Turkish and Persian with English. As Urdu was based on the strong Islamic ground, it was not easy for the English to unroot it.

Some documents are found at Indian libraries to prove that Turkish went side by side at schools India[23]. For example a large Turkish - Persian Dictionary containing 1183 foliae was composed by Muhammed Taki Beg son of Kavam al-Din Beg Türkmen in 1727 and numerous Nisab-ı Türkies (The Turkish course books) were scribed in versified form for young students, a copy of which is found at the Punjab University Library[24]. In Hazinetü'l Lughat of Rani of Bhopal, a dictionary of Urdu with Persian, Turkish, Arabic, English and Sanskrit equivalents written in the year 1886 we come across this verse :

Ger Rekhta zuban ka hey ustad-ı hoshmand
Amuz gar-i kamil-i Tazi zuban hey wo
English men Sanskrit men abr-i mutir hey

22 Vide preface of Asfiye p. 19.

23 Kindly see my article for some Turkish MSS at the Indian Libraries «Hindistan Kütüphanelerindeki Bazı Türkçe Yazma Eserler» Türk Kültürü Araştırmaları, Ankara Üniversitesi Basımevi, Ankara 1985, p. 479-499.

24 Punjab University Library, Lahore No. 6 APİ II.

Shah's (1555-1605) racial as well as religious intermixing policy is not devoid of interest. He fully realised that it was not possible for the Turkish races to return to Central Asia. India had become their homeland. So, Ekber tried to find a common language and joint religion to attain homogenity. In religion, he was not successful at all, but the common language 'Rekhta' flourished a great deal. At the time of Jihangir (1605-1627), Ghuwasi wrote his Tutiname[17] in the mixed language.

When Shah Jihan moved his capital from Agra to Delhi, the new capital was called 'Shahjihan Abad' and the army centre 'Urdu-yı Mualla'[18] = 'the royal camp or court, the court language'. The shopping centres were called 'Urdu Bazar'[19]. It is from the 'Urdu Bazar' or 'Urdu-yı Mualla' that the short form 'Urdu'[20] comes. It shows clearly that Urdu was born by the mixing of Turkish and Indian soldiers who came in close contact at the army shopping centres and used each other's languages for trade.

Like his ancestors Shahjihan took great interest in the improvement of the new language. He appointed secretaries (Delal) who would note down the words spoken at the markets (Urdu Bazars) The position became customary later[21]. Finally, Urdu took a literary shape and began to spread as the lingua franca of India. In accordance with the statement of the Pakistani scholar Dr. Melik Hasan the first poet who used the word 'Urdu' for the language is Murad Shah Lahori (1789 A.D.) and following him is Mushafi (1790 A.D). However, the name Urdu was used earlier than the 18th century. It shows that Urdu improved under the supervision of Turkish Sultans of India. Soon after the English invasion in 1857

17 The work had been translated from Sanskrit into Persian by Ziya al-Din Bakhshi Bedayuni and into Urdu by Kadri, into Turkish by Abdullah Sabri (see Hamid Hasan Kadri, *Destan-ı Tarikh-i Urdu*, Agra 1938, p. 45-47).

18 Vide Mir Amin Dehlevi, *Bagh u Bahar* (preface), Urdu Bazar Lahore 1975, (first published in 1775) p. 10.

19 For the meaning of the word «Urdu» see here the list of the Turkish words.

20 See Urdu Lughat, vol. I, Preface p. II, Taraki Urdu Board, Karachi 1977.

21 Asfiye, I, p. 21 22- See Melek Hasan, *Tarikh-i Edeb-i Urdu*, University Book Agency, Lahore 1979, p. 33.

In 1311 A.D. Ala al-Din Khilji (Kalach in Turkish) and in 1325 A.D. Muhammed Tuğluk conquered the southern part of India upon which the Turko-Indian army took the newly growing language with them. Many Turkish kings ruled in the Southern part of India and they gave importance to Turkish, although Persian dominated as a literary language. It was at the time of Kutub Shahs, the Turkoman tribes, that Urdu started to take literary shape. Kuli Kutub Shah (1581-1611) wrote the first great divan of Urdu[12]. A Turkish-Persian dictionary containing 1183 foliae written by Muhammed Taki Beg son of Kuvam al-din Beg Karakoyunlu (Türkmen)in 1727 is an evidence of our statement[13].

3 — *From Babur to Shahjihan* : After Babur, Urdu started to develop further under the name «Rekhta»[14]. He revived and encouraged the tradition of mixing Hindi with Persian and Turkish by uttering the following verse :

«Muchku na huva kuyi heves-i manik u muti
Fakr ehliga bes bulgusudur pani ve ruti»
(I have no great desires for diamonds or pearls; but for a mystic bread and water suffices)[15].

Babur's sons Kamuran and Humayun wrote poems in Turkish while their vezir Bayram Khan and his son Abdurrahim Khan-ı Khanan played an active part in mixing Turkish elements with Hindi. As a result, cultural as well as literary amalgamation reached its climax.

At the time of Humayun, migration of Turkish tribes increased and new comers used more Turkish vocabulary in their Persian works[16], a large part of which transfered later to Urdu. Ekber

12 Muhammed Kuli Kutub Shah, *Kulliyat-ı Kuli Kutub Shah*, composed by Dr. Muhyuddin Kadri Zor, İbrahimiye Mission Press, Haydarabab 1940

13 MS at the Oriental Manuscript Library and Research Institute Tarnaka Haydarabad No. 89.

14 «Rekhta» is a Persian word that means 'poured out from the mouth as it comes» actually it was a name given to the mixed Perso-Turkish music of India.

15 For the verse vide Denison Ross, *Divan-i Babur Padishah*, journal of the Asiatic Society of Bengal, Calcutta 1910, p. 21.

16 For a list of such scholars see M.A. Ghani, *A History of Persian Language and Literature at the Mughal Cohurt*, Part I, Allahabad 1929, p. 149.

that Khusrau Dehlevi was the one who laid the foundation of Urdu[9].

After Khusrau it became customary to mix Hindi (Barj Bhasha) with Persian. Turkish came in either directly or via Persian by means of the Turkish immigrants. At this period many Muslim and even Hindu scholars and saints used Hindi mixed with Persian vocabulary to address the public. However, the proper Urdu was yet to appear much later at the Timurid era.

As no fixed date can be given for the birth of any language so is the case with Urdu. Some estimates can be made under the light of historical facts. The early seeds of the language were sowed in the Western part of India where Pakistan exists today as discussed in details by Mr. Mahmud Shirani[10]. His assumptions seem to be true because when we travel from Delhi to Afghanistan the Turkish effects on language and culture become more and more visible. Turkish foods i.e. 'kebab', 'kavurma' 'pilav', 'açar (appetizer)', 'dolma (stuffed vegetables); dresses: 'şalvar', 'şal'; weapons: 'top', 'topçu', 'tüfek', 'tamança', military terms: 'haravel (karakol)', 'tümen', titles: 'beg', 'han khan)', 'uluhan (the great khan)', 'kutlu han (an auspicious khan);, relations: 'anne', 'bacı', 'apa' etc; marital customs such as 'henna night'; riding of bridegroom on horse-back draw our particular attention and we all of a sudden find ourselves in a Turkish atmosphere. Same is the case with Punjabi. In Punjabi many Turkish words are used in daily conversation the most striking ones are: 'baji' = sister; 'apaji' = an elder sister; 'jiji' or 'çiçi' = sweet things. Pashto has more Turkish words than Punjabi[11].

Delhi, however, remained as a cradle of the new born baby, Urdu and many saints, specially of Chestiye sect such as : Mu'in ud-din Cheshti (1143-1235 A.D.), Baba Ferid Sheker Ganj (1186-1265 A.D.) wrote mystic verses in the language. Non-muslim saints like Kebir (died 1450 A.D.) and the great leader of Sikhs Baba Guru Nanak (1469-1539) used a lot of Persian words in their poems.

9 See my article «Emir Husrev-i Dehlevi'nin Urduca'nın Doguşundaki Rolü» (Amir Khusrau Role in the Birth of Urdu), *Edebiyat Dergisi*, S.Ü. Fen Ed. Fak., 1983 p. 21-32.

10 See his book *'Punjab men Urdu'*, Nasim Book Depot, Lucknow 1981.

11 A seperate article is being written on the subject.

ten times more. When Chengiz Khan invaded Central Asia, the number of Turkish immigrants increased in Iran, Turkey and India. Sultan Shems al-Din Iltutmush (1210-1236) showed great sympathy towards the newcomers and helped them to form colonies near Delhi and Lahore. The migration continued for centuries to come and revived after Babur's conquest.

From Mahmud of Ghazni until Babur, Persian grew fast as a literary language and like the Ottoman Sultans of Turkey, Indian Sultans also wrote poems in Persian. Many scholars and poets used Turanian Persian, so called by Blochmann[5], to please their rulers. There can be seen similarities between the Indian and Turkish Persian which was looked down upon by the proper Iranian native speakers[6]. It is probably due to this reason that the Ottomans turned towards the Ottoman Turkish and Indians towards Urdu. The Turko-Indian Persian literature coming from the same root is more realistic and close to nature. Although, this literature ultimately got mixed up with the Indian elements and ended up with highly ornamental 'Indian Poetical Style (Sabk-i Hindi)'[7] that also influenced the great Turkish mystic poet Sheikh Ghalib (1757-1799). Impressions of free thinking as well as realistic ideas are found in the poetry of Asadullah Khan Ghalib who came from a Turkish family.

Turkish, despite its being a royal language was taught at schools and we find 'Nisab-i Türki' of Khusrau as everlasting memory of those days[8]. Since we fail to find the Hindi Divan of Sa'ad bin Salman (Died 1121 A.D.) it will not be incorrect to say

5 H. Blochmann, *The Prosody of the Persians*, Philo Press, Amsterdam 1970 p. XVI.

6 The reason why Iranians disliked the Indian Persian is discussed in details by Prof. Jemil Jalbi (see his book *Tarikh-i Edeb-i Urdu*, Majlis-i Tarakki-yi Edeb, Lahore 1982, vol. II, p. 22).

7 For further information see Jan Rypka, *History of Iranian Literature*, D. Reidel Publishing Co., 1968, p. 295-297 and 713-717.

8 An early mention of such a work is made in the MS No. 18 found at the Khuda Bakhsh Library Patna fl. No. 2b and a copy of the work is available at the Penjab University library A pi 11 No. 6.

شهرت ترکی هم از آن شد بیقین　　کاعلی شه ترك بر آمد بزمین
شد سخنش خاصگیانرا چو زر　　عامه گرفت و بجهان گشت سمر
هند همین مانده دارد بسخن　　هندوی بود در ایام کهن
غوزی و ترکی آمد شانرا بدهان　　پارسی بود بدیدار نهان

«Surely Turkish got its fame because the Turkish king appeared on the earth first. The favourite friends of the king learnt his words (language) while from them the public picked it and like the moonlight spread all over the world. So it happened in India. There was Hindi here in the old days. Ghuzi (the Oğuz dialect) and Turkish came to their mouths (they started speaking it). Persian was yet out of sight»[3].

Here Khusrau refers to the early Turkish rulers Mahmud of Ghazni, his dynasty, Ghories, Kutub al-Din Aybek, Shems al-Din Iltutmush, Ghiyas al-Din Balaban and Khiljies who recruited a large number of Central Asian Turks that migrated to India specially at the time of Mongolian onslaught.

When Turks embraced Islam, Samarkand, Bukhara, Khorasan and Transoxania became the centres of Islamic new culture. Arabic was taught for religious purposes while Persian became the lingua franca of the Turkish and Afghan tribes. Immigrant Turks brought this culture along with their own to India which has become a part and parcel of the present Indian civilisation. Turkish being from an entirely different family i.e. from the Ural-Altaic group, remained peculiar and difficult for the natives of India who welcomed Persian which was much closer to their own Aryan culture and languages. However, Turkish continued its importance as a private language of the royalities until the English invasion.

[illegible] number of Turkish immigrants never decreased since the [illegible] Mahmud of Ghazni and his descendants. As reported by [illegible][4], there were 4000 Turkish soldiers at the court of Mahm[illegible] the number of the soldiers at large can be assumed as [illegible]

3 Amir Khusrau Dehlevi, *Nuh Sıpihr*, Hekimoğlu Ali Paşa (Hkm.) No 661, folia 139a.

4 Minhaj Saraj, *Tabakat-i Nasri*, Merkezi Urdu Board Lahore 1975, p. 413.

Dr. Erkan Turkmen
Associate Professor of Oriental Languages
Seljuk University, Turkey

THE TURKISH ELEMENTS IN URDU

The Turkish lingual and literary influence on the Subcontinent of India can be divided into the following four major parts :

1 — Pre-Islamic Period

2 — From Mahmud of Ghazni to Babur

3 — From Babur to Shahjihan

4 — From Shahjihan to the 19th century and onwards.

1 — *Pre-Islamic Period* : It cannot be denied that there had been a close contact between the ruling Turkish tribes such as Kushans and the White Huns who got mixed up with the local communities of India. Uigurs having accepted Budhism were influenced by the Sanskrit religious literature. Today, we find countless words of Sanskrit origin in the Uiguric vocabulary[1]. Similarly, some Turkish words are found in Sanskrit[2]. Since a few written texts of these periods come down to us, it is difficult to say precisely what Turkish elements affected the local Indian languages of that time.

2 — *From Mahmud of Ghazni to Babur* : As pointed out by Amir Khusrau Dehlevi (1253-1325 A.D.) the great Persian poet of Turkish origin, Turkish came first to the Subcontinent of India. In his 'Nuh Sipihr' he says :

1 For example see A. Caferoğlu, *Eski Uygur Türkçesi Sözlüğü* (The Old Uiguric-Turkish Dictionary), Türk Dil Kurumu (Board of Turkish), Ankara 1968.

2 For some words see Prof. Dr. Abidin İtil's article «Türkçe-Sanskrit Arasında Linguistik Paralelller», *Doğu Dilleri*, Dil ve Tarih Coğrafya Fakültesi, Ankara 1970, I, No. p. 139-150.

The organisation and the system of administration of these libraries must have been influenced by those of the medieval libraries of the Islamic countries, just as the system of the working of the modern British hospital has been very largely influenced by that of the medieval Islamic hospitals.

But it is strange that no reference is made in any of the books on libraries, in general, to any of the medieval Islamic libraries. The earliest treatment of the subject by a European writer is found in the thesis submitted by an Italian girl student, Olga Pinto, in Italian language which was translated into English by F. Krenkow and was published in the Islamic Culture (pp-210-243) in 1929.

It is the duty of the young Muslim scholars to make known to the modern world, the achievement of their fore-fathers.

those days, when al-Haḍramí, a great scholar and passionate lover of books, bade for a rare manuscript in which he was highly interested, another bidder who was a rich man, made a higher offer far beyond the means of al-Haḍramí and secured the book, Al-Hadramí then tried to discuss with the purchaser the subject-matter of the book. The purchaser told him that he was completely ignorant of its content and subject matter, but he purchased it because its size and binding would help him in filling a gap in his book-shelf.

In these circumstances it is not surprising that book-trade flourished greately in the Islamic dominions during the middle ages. In Baghdad there were one hundred book-shops during the third century of Hijri era[34], Cordova also served as a good market for books. The same must have been the case with many other important Muslim towns also. Some of the book-sellers made a large fortune out of their trade. And some scholars also, like yáqút, worked as agents for procuring books (Dallālul Kutub).

Many of the libraries mentioned above, however, were public libraries. Several of the private and personal libraries also, as we have seen, were open to scholars and students, in general, who were provided with all the facilities to use them. Some of them lent books to scholars without taking any security for them. Yáqút says that he borrowed two hundred books from the libraries at Marw without depositing any security for them.

Almost every important town in Islamic dominion had one or more public libraries, during the middle ages when the whole of Europe did not possess a single public library. The oldest European public library is the Bibliotheque Nationale of Paris which was developed during the 16th century out of the royal library of Louis the XI who had founded it after his return from the East where he was highly impressed by its libraries. The library of the British Museum was established during the 17th century and that of Berlin and Vienna assumed public character probably after the library of the British Museum.

34. Islamic Culture Vol, III, p. 214.

them was an expert in his own profession. Most of the books in his library were either antographs of their authors, or were copied by illustrious calligraphers[31].

Over and above the regular independent libraries and those attached to Madrasas, or some of the mosques and Khanqahs, there were also several academies and clubs in which, in addition to the materials for enjoyment of the members there were kept large number of books. A club of this type in Damascus of the Umayyad period has been already mentioned. There had also developed several others of them during the Abbasid period. One of them was founded by Ṣâbur b. Ardsher in the Karkh quarter of Baghdad, in the year 381, and was furnished with a choice library as well as materials for the musical entertainments of the members and the visitors. The value of the library may be judged form the fact that it had hundred copies of the Qura'n written by the Banu Muqla, and 10400 volumes on various subjects. Most of these volumes were either autographs of their authors or were such as had been in the possession of famous men. It was a rendevous for literary men and was visited by notable men like Abu'l-'Ala al. Ma'arrí who met several distinguished persons there, and admired it in poetry as well as in prose. A similar academy was founded at a later period, by Sharíf al-Raḍí who met in it his admirers, and provided it with facilities for literary persuits[32] The keepers of the academies were called custodians and not librarians. Their members, according to Nicholson, "enjoyed pretty much the same privileges as belong to the Fellows of an Oxford or Cambridge Colleges.[33]

The establishment of so many libraries either independently or as parts of the Madrasas and mosques, in spite of high prices of books, shows the great interest in them, not only of their founders, but also of the general public. As a matter of fact during the middle ages, it was a fashion among the Muslims of high ranks to keep a library with beautifully bound book even if they knew nothing about their contents. This is illustrated by the fact that at an auction of books in Cordova, which was not uncommon during

31. Ibid vol. 19, pp. 329-347.
32. Margoliouth's Introduction to the Letters of Abul-Ala, pp. III-XXIV.
33. *A Literary History* of the Arabs p. 267.

(3) The third important library of the middle ages was that of the Fatimids of Egypt. The first three Fatimid rulers were highly educated and extremely intrested in arts and sciences. This cultural interest was shared by several of their succesors also. They had founded several colleges and established among others, a large state-library which was housed in their palace but was open to public who was provided with all possible help to make the best use of the books which it contained. It is difficult to fix the number of the books it contained, for the various authorities give different numbers But there is no doubt that it contained, several hundred thousands of them, on all the various arts and sciences, for 120 thousands of them was given away by Ṣalaḥuddín to his secretary as a gift. and a large number of them was auctioned twice a week for a whole year[29].

(4) Another important library was that of Tripolis in Africa. Here Qáḍí Abu Ṭálib b. 'Ammár had established himself as master of the place, and founded an academy in which his son Fakhru'l-Mulk also took keen interest. This academy was considered to be one of the wonders of the world. It had a rich library. The Banu 'Ammár had bestowed great care upon it. Like al-Ḥakam of the Cordova, they had agents in all the of Islamic world, in order to procure books for them. They had accumulated three million books in it and employed 180 copyists, thirty of whom worked day and night. All of them were well-paid. Scholars and students from all parts of the Islamic world visited and used it[30].

(5) Muslim India did not lag behind the other parts of the Islamic world, in its interest in books and libraries. Most of the rulers belonging to the different dynasties as well as their governors and the independent and semi-independent chiefs of the various provinces were educated men and possessed their own libraries. Many of them have been described by different scholars. Khan Khanan, for example, built up an excellent library at Ahmedabad when he was its governor. In it he employed numerous translators, paper-makers, calligraphers rubricators, gilders, painters, copyists, cutters, book-binders, and librarians and their assistants. Each of

---

29. Islamic Culture vol III. p. 230
30. Islamic Culture vol. 3. p. 236.

There were so many large libraries in the various parts of Islamic dominions during the Muslim rule, that it will take several volumes to describe all of them in detail. I will, therefore, give some details of about half a dozen of the most important of them, from different countries :

(1) The pride of place must be given to the library of the Abbasid Caliphs of Baghdad. It was founded by Manṣúr, organised by Hárún al-Rashid as a part of the Baitu'l-Ḥikmat, and further improved by his illustrious son al-Mámún. In it were collected together all the Greek works which were acquired by Hárún at the conquest of Asia Minor as well as those which were collected by the commission which was sent by al-Ma'mun to Byzantium to get the Greek scientific works. The books translated from different languages into Arabic as well as those independently written in it before or during the Abbasid period also must have been added to it. There must have been attached to it a large number of scholars, calligraphers, book binders, and supervisors. It must have been far more richer than the library of the Daru'l 'Ilm founded by Sabúr b. Ardshir, in the Karkh quarter which had hundred thousand volumes some of which were copied by most celebrated calligrphers.

(2) Similar to this library was that of al-Ḥakam the illustrious Umayyad ruler of Spain. "He had collected such a large number of books," says Ibn Khaldun, "as were never collected by any king before him".* There were four hundred thousand volumes in his library. Their catalogue consists of 44 volumes, each of which consisted of twenty leaves in which were written only the names of the books. Al-Ḥakam had sent his agents in every direction in order to purchase manuscripts. He sent one thousand Dinars to Abúl-Fāraj of Isfahan and obtained his first copy. Similarly he sent money to Abu Bakr al-Abḥarí and other reputed authors also in order to get the first copy of their works. He had read all the books in his library and annotated most of them. He had collected in his palace, master calligraphers and expert book-binders. During his reign Cordova became a good market for books.

* Ibn Khaldun vol, 4, p. 146

Companion of a king. He was introduced to al-Mutawakkil by Fatḥ b. Kháqán, continued to be a great favourite of all the Caliphs from al-Mutawakkil to al-Mu'tamid, and was respected by all of them. Each of them bestowed upon him large gifts. He became very rich during the later period of his life, had a nice estate with a big palace, in the vicinity of Baghdad. In it he had a rich library which contained books on all subjects. People from various places came and stayed there, consulted the books, and all their expenses were defrayed by 'Alí b. Yaḥya himself. Abu-Ma'shar the well-known Astronomer while going from Khurasan for the pilgrimage of Mecca, visited this library, and having realised its value gave up the idea of pilgrimage, stayed there for a long time, and learnt Astronomy thoroughly which he did not know when he came there[24].

During the Muslim rule, not only the Caliphs and kings and their courtiers in all the Islamic dominions possessed big or small libraries, but many of the Muslim scholars also possessed their own libraries. Muhammad b. Ḥazm of Spain who was a poor teacher, had gathered a good library, partly by purchasing them and partly by personally copying them. Many scholars visited and made use of it[25]. Abu Mutarif Futays b. Sulayman the judge, accumulated a rich library, which was sold after his death for 40,000 Dinars[26]. Shaykh Mubarak, (d 1001) the father of Faydi, had in his personal library, according to his own statement, about thirty thousand volumes before entering the court of Akbar. Most of these books were autographs of their anthors and five hundred of them were copied by Mulla Mubarak himself[27]. His son Fayḍi had four thousand and six hundred books in his personal library. Many other libraries belonging to the Indian kings of the different dynasties, and the governors of the various provinces and their courtiers and the Muslim scholars are mentioned by S. Abu Zafar Nadwi in his articles on the subject[28].

---

24. Irshadu'l-Arib, vol V. pp. 459-476
25. *Takmila*, by Ibn Abbar, No. 312.
26. *Kitabus-Sila*, by Ibn Bashkual. pp. 3, 4-5.
27. Introduction to the Ms, of Mulla Mubarak's Tafsir, which is preserved in the library of the late Sayyed Taqi of Lucknow.
28. Islamic Culture vol. 19, pp. 329-347.

originated earlier than the state libraries. During the life time of the Prophet, Abu Hurayra, 'Amr b al-'Aṣ, Anas and some others, had their collections of the Traditions of Islam. After them 'Urwa b. Zubayr, Imám Zuhrí and several other followers had large collections of materials concerning the Traditions and the life of the Prophet. After them many scholars like Ibn Isháq, Waqidi, Ibn Sa'd and others collected good personal libraries. During this very period, different scholars possessed large materials on Arabic poetry, Arabic linguistics, Arabic vocabulary etc.

This keen interest among the scholars, for books and libraries continued for many centuries.

Abu'l-Wafa b. Salama a well-to-do scholar of Hamadán possessed a rich library consisting mainly of early Arabic poetry. It is out of this library that Abu-Tammám (807-846), selected his anthology of early Arabic poetry which showed that the art of poetry was successfully cultivated among all ranks of the early Arabian Society, and proves his better taste for poetry than his own poems. Like Abu'l-Wafá, 'Ali b. Yaḥya the Astronomer also possessed a rich library in a village near Baghdad. Fatḥ b. Kháqán (d. 247/A.D.) the descendant of a royal family and bosom friend of the Caliph al-Mutawakkil also had a nice big library, like which no one ever saw. It was built up for him by Ali b. Yaḥya the Astronomer, and was visited by the scholars of Basra and Kufa. He was himself an extremely intelligent and literary man, highly social, well-behaved, sincere, kindly and generous towards all those who met him[22]. He had great love for books and always carried one with himself, and read it whenever he got an opportunity[23].

He built up a rich library for himself also, at a later stage of his life. He was a man of short stature and ugly appearance but possessed the highest qualities of head and heart. He was well-read in Arabic literature and Arabian sciences. He had ready wit and possessed all the qualities which are necessary for the pleasant

22. *Irshad*, vol VI pp. 116-19.
23. Ibid. p. 56.

"The rooms set apart for the books had, along the walls, shelves which did not surpass the height of a man so that it was not necessary to use dangerous ladders, to reach the books on the top-shelves. The scaffolds were all furnished with shutters, some on hinges, while others were let down from the top, and with locks. These locked shelves though not very commodious for the distribution of the books had the advantage that they preserved the rich and beautiful bindings from dust and sun-light.

"The books were placed on the book-shelves divided in sections so as to form little heaps. The names of the authors and the titles were written on the backs of the books. The arrangement was according to the subject ; and to facilitate the search for a book required, the content of each of section of a book-shelf was written upon a piece of paper which was attached to the shelf outside. These papers also indicated of works which were incomplete or defective[20]."

Almost simultaneously with the Buwayhid chief, the Samanid Amir Núḥ b. Manṣúr established a large library at Bukhara which was visited by Avicenna who writes that it consisted of many rooms. "Each room was full of books arranged in cases, row upon row. Books on Arabic literature and poetry were kept in one room, those on law and jurisprudance in another. Thus to every particular science was alloted a particular room. I went through the catalogue of the books of the ancient (Greek) authors and searched from it the books which I needed. I found in it books of which many people never heard the name even, and also never saw before or after. So I read these books and benefited by them and realised the position of every author in his field of science."[21]

These were the state libraries of the Muslim rulers. It has been already seen that they originated during the early Umayyad period. Many others of the later period will be described and discussed later. But over and above them there were also many other collections of books which were gathered by individual scholars and lovers of them during the various periods. They

---

20. *Ahsanut-Taqasim* vol. 1, p. 449.
21. *Tabaqatu'l-Atibba* vol. *II*, p. 4.

ages there was no Muslim town worth the name which prossessed no library. Ibn Jubayr the traveller has remarked in his *Travels* that the glory of Islam consisted in its hospitals and colleges. And every college must have a library. Every Muslim town must have mosques also, and to a mosque was generally attached a madrasa to which the scholars generally endowed their books. Most of the libraries in Turkey were endowed to mosques.

Many of these libraries were well organised and well-equipped A graphic description of the library founded by Aḍdu'd-Daula at Shiraz and of its building is left by al-Maqdisi in his *Ahsanu't-Taqasim* and has been translated into English by F. Krenkow.

F. Krenkow has translated an article by Dr. Olga Pinto from Italian into English. She has quoted the relevant passage from the *Aḥsanu't-Taqâsim*. It says : "Aḍdu'd-Daula, the Buwayhid, (949-982) founded in Shiraz a residence which had not its equal in East or West. No ignorant person entered it, but was enchanted, nor any learned person, but his imagination was filled with delights and perfumes of paradise. He made it intersected with water courses. The buildings were crowned with domes and surrounded by gardens and parks ; lakes were excavated, and every kind of comfort that could be thought of, was provided. I have heard the servants say that there were in it 360 rooms and pavilions, in each of which he resided one day of the year ; some were on the ground floor and some above. The library constituted a gallery by itself. There was a superintendent, a librarian and an inspector chosen from the most trustworthy of the country. There is no book written up to this time in whatever branch of science, but the prince has acquired a copy of it. The library consists of one long vaulted room connected to which are store-rooms. The prince has made along the large room and the store-chambers, scaffolding about the height of a man, three yards wide, of decorated wood, which have shelves from top to bottom ; the books are arranged on the shelves and for every branch of learning there are separate scaffolds. There are also catalogues in which the titles of all the books are entered. Only persons of standing are admitted to the library. I myself inspected this library down-stairs and up-stairs, when all was still in order. I observed in each room carpets and curtains. I also saw the ventilation chamber, to which the water is carried by pipes which surround it on every side in circulation.

taniously, Arabic linguistics and vocabularies also began to be developed at Kufa and Basra. All this presupposes the existence of small personal libraries at these places.

With the advent of the Abbasids, the libraries also, like other cultural institutions, developed very highly, on account of the keen interest of the Abbasid Caliphs in the acqusition of books and their preservation. Some of them laid it down as a condition for the establishment of peace with a Byzantine emperor, that he should make over to the Caliph the Greek Mss , and sent a deputation to Byzantine towns to acquire and collect scientific works. To Abdu'l-Rahman III of Spain was a most welcome gift, an illustrated copy of the *Kitábu'l-Ḥashā'ish* of Dioscorides.[15] This keen cultural interest of the Caliphs was shared by their ministers and governors as well as by the semi-independent rulers of the various Islamic dominions.

It is, therefore, not surprising that during the middle ages, there existed several well-equipped and well-managed libraries in good many Muslim towns. In Baghdad, during the 13th century, there were more than thirty-six libraries. In most of the towns in Syria, like Aleppo, Tripolis, Antioch also there were big libraries. The library of Aleppo, possessed 20,000 volumes[16]. In the towns of Andalusia there were seventy libraries[17]. At Marw there were ten libraries from which Yáqút borrowed 200 books without giving any security. Many Iranian towns also had large libraries[18]. Ar-Ray's library had its catalogue in ten volumes. At Shiraz was the well-organised library founded by the Buwayhid chief Aḍdu'd-Daula which will be described in detail later. At Bukhara was the large well-equipped library which was established by the Samanid ruler Núḥ b. Manṣúr in which were found books which were not found anywhere else[19]. As a matter of fact during the middle

15. *Tabaqatu'l Atibba*

16. *Letters of Abu'l-Ala* Ed. Margoliouth, Intr. p. xvi.

17. *Islamic Culture*. vol. *VIII* p. 115.

18. Irshad vol. *II*, p. 35. ; M'ujam u'l-Udaba vol. IV. p. 11.

19. *Tabaqatu'l-Atibba*; vol. 2. p. 4,

He was the son of one of the attendants at the gate of the Audience Hall of the Caliph. He was, therefore, generally known as Ibnu'l-Bawwáb. Like Ibn Muqla, he possessed good knowledge of Arabic literature and of its various branches, but was especially devoted to the art of calligraphy. He learnt it at the feet of almost all the pen-men of his time and ultimately excelled all his contemporaries in this art. He improved and carried the Naskh script to perfection so that his method is followed by the various calligraphers of the script till the present day. His house was always crowded by the students as well as masters of calligraphy, all of whom accepted his superiority in the art. He died between 413/1022 and 423/1034. His style and method of writing was followed for more than two hundred years[12].

After him flourished numerous master Calligraphers in different parts of Islamic dominions. The most important of them was Jamaluddin Yáqút Musta'ṣimi who died in 698/1298[13].

The progress of the various arts, to which reference has been made, helped in the production and preservation of books and in making their collection and libraries popular among the Muslims

The begining of Islamic libraries, however, must be traced back to the personal collections of the various parts of the Qura'n and of the Tradition of the prophet, by some of his associates. These small personal collections of some of the Companions must have grown larger in volume on account of the activities of the next generation in search of the materials on the life and character of their narrators. Soon after it Khalid, the grand son of Mu'aviya, got greatly interested in al-Chemy. collected together the Greek works on it, from Egypt, and got them translated into Arabic. Almost about the same time was translated from Greek into Arabic a medical book also, by a personal physician of Ḥajjáj b. Yúsuf, the then governor of Kufa. Soon after it we learn of the royal library of 'Umar b. 'Abd al-Aziz (d. 720) as well as of a literary club which was furnished with books as also with the game of chess[14]. Simul-

---

12. *Ibn Khallikan*, English Translation vol. *II*, p. 282-283

13. *Tadhkira-i-Khush-Nawisan*, Ed. H. Husain, Asiatic Society, 1910, p.

14. See M.Z. Ṣiddiqi, Studies in Arabic and Persian Medical literature. Calcutta University, 1959, pp. 15-16.

It was, therefore, called Naskh or Naskhi. He laid down detailed rules governing it, for the guidance of those who wanted to learn it. He became famous as a pen-man throughout the Islamic world and people from every part of it, crowded round him to learn this art. His house was always crowded by the students and the learned people, to all of whom he was always extremely courteous and generous.

All this was done by him in spite of the fact that he was very often busy with the various administrative duties also. He served as a governor of a province or as the minister of the Abbasid Caliphs. But he had to pay very dearly for his qualities of head and heart and for his popularity. His properties were confiscated, his right hand was cut and he was imprisoned more than once. But in spite of it, he made beautiful copies of the Qura'n with his left hand and also by fastening pen to his right hand. At the end he was put to death while he was in prison in the year 328/948. "It was strange", says al-Fakhri, "that he Ibn Muqla[10] became a minister three times, was externed three times and was buried three times. He was buried in the house of the Caliph just after he was killed there This happened shortly after his hand was cut. Then his relatives wanted that his dead body should be made over to them. It was exhumed and made over to them and they buried it. Afterwards his wife wanted his dead-body, exhumed it and buried it in her house"[11].

The next great pen-man of the Abbasid period was Abu'l-Ḥasan 'Alī b. Hilál, generally known as Ibnu'l-Bawwáb.

The Naskh script was followed throughout the Islamic world for more than a century after which Ibnu'l Bawwáb who introduced many improvements in the script originated by Ibn Muqla, made it more regular and simple and introduced in it greater grace and beauty. He also further explained the rules laid down by Ibn Muqla.

---

10. Ibn Khallikán, English Tr. vol., 3, pp. 266-271 ; al-Fakhri ed, Ahlwart. pp. 318-321 ; Khat wa Khatatan, Ali Rahgiri, Tehran 1346, pp. 57-65.

11. *al-Fakhri*, pp. 318-321.

Ḥadīth of Abu 'Ubayd. It is preserved in the Leiden library and is dated. 243/857 They produced inks of different colours out of different substances They developed book-binding into a veritable art, bound the books in valuable leather of different colours, adorned and ornamented them with silver and gold, and supplied them with nice covers in order to protect them from dust and dirt.[8] They used all these arts for the production & preservation of books. They founded numerous libraries some of which supplied the students and the scholars with the necessary materials for copying books peacefully and comfortably.

For some time just, before the rise of Islam, the Kufi script was used by such of the Arabs as knew this art. The first four Caliphs and a few other eminent associates of the Prophet had excelled in it It continued to be followed by the Muslims till the end of the Umayyad period. The last great scribe of this period was Abdu'l-Ḥamid b. Yahya, b. Sa'id who was a Syrian slave converted to Islam, had mastery of Kufi script and introduced several useful innovations in it. He became the chief scribe of Marwán II and was killed with him[9].

With the advent of the Abbasids, like other branches of culture, Calligraphy also improved by leaps and bounds. The first important calligraphers of the period were Ishaq b. Hammad and his brother Ḍaḥhák. They secured mastery of Kufi script and introduced several improvements in it.

But the first important pen-man of this period was Abu 'Alī' Md b. Ḥusain b. 'Alī. generally known as Ibn Muqla. He was born in 272/886 acquired excellence in literature and the various religious sciences in vogue during his time. But the special field of culture in which he secured lasting reputation was Calligraphy. Having realised the difficulties of the Kufi script he invented several other scripts like Muḥaqqaq, Rayhani, Thulth, Tauqi', Riqá, and Naskh. The last of them assumed great popularity and replaced the Kufi and every other script which was in vogue at that time.

8. Ibid.
9. Sahifa-i Khush Nawisan, p. 23

horse, and the best companion at all times, is the book." Muhallab said to his sons : "Whenever you stand in the market, then stand either before the shop of the weapons, or before those of the books."[3] "For the Arabs," writes an Italian Orientalist, "Every book commencing from the great book, the Qura'n, represented a whole world in itself, for them more than for any other people of antiquity, it was the only and inexhaustible fountain for the inner life."[4] Fatḥ b. Kháqán, the general, Jáḥiẓ the scholar and Ismá'il b. Isḥáq the judge, had great love for books.[5] The first of them always carried a book with himself and read it even in the lavatory. The second died because the heaps of books which he kept round himself fell on him when he was old and ill. And the third was always found reading a book. Ṣáḥib Ismá'il b. 'Abbád always carried numerous books with himself whenever he went out of his state, and refused to accept the ministry offered to him by the Samanids, because he could not carry his large library with him.[6]

Most of the Arab rulers of the different dynasties of the early period and most of the Muslim kings of different dynasties of the various Islamic dominions took keen interest in the collection and preservation of books on different subjects. They developed several arts which helped in the production of books and in adorning and preserving them.

They developed calligraphy into a veritable art and used it not only for writing books but also in order to decorate and adorn architectural monuments. They learnt the art of paper making from the Chinese and established its factories in several important towns like Samarqand, Baghdad, Cairo, Shatiba and other places. From several of these and other places, paper was exported to different parts of Europe for several ceturies[7]. The earliest Arabic manuscript written on paper, received by us, is the *Gharibu'l-*

---

3. *al-Fakhri*, Egyptian edition pp. 3-5.
4. Islamic Culture vol. *III*, p. 211.
5. *Irshad*, vol. *VI*. pp 117. ; 56.
6. Ibid vol. II p 315.
7. *The Medieval Library* by James W. Thomson, pp. 631-33.

THE Library constitutes an important cultural institution which originated and highly developed in the various parts of Islamic dominions, without any foreign influence. Its origin has been traced back to the ancient period when Ashurbanipal (689-630, B.C) assembled at Ninevah, a large number of cuneiform texts, which are now in the British Museum. In Greece, in Rome and in certain other parts of Europe also there existed some personal or private libraries during the ancient period. But they had lost their importance and were reduced to insignificance during the middle ages, and none of them were public libraries.

The Arabs were generally completely ignorant of reading and writing. Many of their distinguished poets did not know how to read or write. One of them, Tarafa, lost his life on account of his ignorance. Another of them Dhu'r-Rumma knew how to write but wanted to conceal it from the people, because it was considered by them to be a defect. As a matter of fact there were no words for the writing materials, in their otherwise rich language.

But under the influence of Islam, its Caliphs and governors and kings, they became lovers and preservers of books. The Prophet encourged and popularised the art of writing in various ways and paid tributes to those who sought, and served knowledge. 'Umar the second Caliph, had made the teaching of writing and reading compulsory[1].

Perhaps the slogan of the burning of Alexanderian Library may be raised against him. But it has been proved to be a mere myth started 500 years after the conquest of Egypt by the Arabs[2]. In Iran also there did not exist any library at the time of Islamic Conquest according to the statement of Hamza, Isfahani.

Mutanabbi, however has said, in his Qasida in praise of Kāfur : "The most honourable seat in this world is the saddle of a

---

1. Al-Faruq, 1898, part II P. 105.
2. See Buttler's *Conquest of Egypt by the Arabs*, chap. *XXV*.

Lecture—III

ISLAMIC LIBRARIES

he was very strict in his ideas and criticised bluntly many of the important muslim authors like al-Ash'ari, Abu Ḥanifa, Imâm Mâlik and others. He was, therefore, disliked by the muslims in general. He was externed from several provinces, and most of his writings were burnt. Very few of his books have come down to us, one of them being his valuable and original work on the comparative religion al-Fisal-fil-Milal. It is in five volumes.

About 80 years after it Shahristâni wrote his book on the subject. His full name was Abúl Fatḥ Muḥammad b. Abdu'l-Karím. He was born at Shahristan in Khurasan in 1086 A D, was educated in Islamic sciences and philosophy at Nishapur and other places and performed pilgrimage in 1116 A.D. While returning from Mecca he stopped at Baghdad for three years and completed his education. After that he returned to his native place and devoted himself entirely to teaching and writing. His most celebrated book deals with religious and philosophical sects. H. A. R. Gibb remarks about it that there are few works in Arabic literature that reflect more credit on medieval Mohammadan scholarship. Like the work of Ibn Ḥazm, this book also contains the accounts of the Muslim sects as well as of the Jewish schools and Christain churches as well as of the Indian religious philosophies. Like Ibn Ḥazm he was also strictly orthodox. "He presents," says Gibb "the arguments and views of even the most heretical schools with remarkable fairness, only occassionally interposing incisive comments at the end of some peculiarly obnoxious or hair-splitting doctrine".

From what I have just discussed it is obvious that the Arabic writers not only considerably improved the sciences which they had received from their predecessors, but also laid the foundations of several important branches of knowledge.

But the proper and exact valuation of Islamic Studies in its various branches, depends on the critical study of this huge literature, a large part of which still remains unexplored and unnoticed, in the private and public libraries in the East as well as in the West. In our country itself there are many important and extremely valuable and some also unique Arabic Persian books, in private possession or public libraries, which are entirely unknown to the scholarly world.

of the ancient period believed in the unity of God and their conception of Him was similar to that of the Jews. The statement of some of the Chinese scholars also shows that the ancient Chinese also believe in the unity of God.

From what has been said above on the basis of the Qur'an, it will appear that it laid down the foundation for the comparative study of religion.

Before the advent of Islam the believers in different religions were almost always at loggerhead with one another. Islam established amity and peace between them. It laid down that in matters of religion there is no room for compulsion. The peoples professing different faiths, therefore, lived together, under the Muslims, peacefully. They held religious discussion among themselves, the reference to some of which is found in Ḥadíth works. Some of the treatises written by the Christians in this connection are mentioned by Dr. Mingana in the introduction to his English translation of the *Kitáb'ud-Din-wad-Daula* (the Book of the Religion and the Empire) But the earliest book written in the defence of Islam against Christianity and Judaism is the above mentioned *Kitab'ud-Din-wad-Daula* which was written by 'Alí b. Rabban al-Tabari, in 855 A.D. at Baghdad. Several other books also were written on the subject. Ibn Ḥazm has written in the introduction to his book mentioned above, that there were several books written on the subject by different writers. Shahristáni also has written in the preface to his book that he had read the treatises of believers of different religions about them, and he wanted to put together their contents so that it might serve as a guide to its readers.

Ibn Ḥazm whose full name was Abu Muḥammad 'Alí Ibn Ḥazm, was born at Cordova in an influential family in 994 A. D. He was endowed with extraordinary ability. He acquired excellence in all the Islamic sciences at an early age, was appointed as a minister, and was accepted as the leader of the Záhiriya sect. But he was more interested in the scientific activities than in political career. He soon, gave up the post of the minister and devoted himself fully to the cultural activities. He was very often subjected to trials and tortures. But he is accepted as the most prolific muslim writer. He wrote 400 books in 80,000 pages. But

One of the important branches of literature, however, was that of Comparative Religion. "Surprising though it may seem, it is in Arabic that we find the first work on this subject" Says H.A.R. Gibb. He has mentioned in this connection the *Kitabu'l-Milal-wa'n-nihal* and the *Al-Fisal-fil-milal* of al-Shahristani and of Ibn Ḥazm respectively.

But the fact is that it is the Qura'n which laid down the foundation for the comparative study of religions. When it was revealed there were living in Arabia peoples professing several religions. Among them there were idol worshippers, Jews, Christians, Sabians, and Zoroastrians. The Qura'n refers to some of the beliefs and practices of each of them which differed widely from one another. But the Qura'n affirmed that they were due to misconceptions of the people professing them or the misunderstanding and misrepresentation of what was actually preached by their prophets.

The idol-worshippers held that their idols have influence on God, that the angels were His daughters and some of them held that after death, one has no more life nor will he have to account for his deeds in this world. The Jews believed that Moses was the first and last prophet, they made changes in the Old Testament, and disbelieved some of the prophets. Some of them considered Uzayr to be the son of God attributed great evils to Hazrat Maryam the mother of Jesus. The Christians believed that there were three Gods and Jesus was God's son ; they also introduced changes in the New Testament.

These and several other beliefs and practices of the above three groups af the Arabs are mentioned in the Qura'n. But it has not mentioned the beliefs and pratices of the Ṣabian and the Zoroastrians. But Ibn Ḥazm and Shahristáni have discussed in details their beliefs and practices.

According to the Qura'n all the prophets of every period belonging to different nations preached the unity of God, life after death and responsibility of the man for all his deeds and that all the prophets were true and God-sent. Sir W. Budge, who is a great authority on ancient Egypt, is of the opinion that the Egyptians

of the Nine Greatest Islands of the World : Arabia, Madagascar, Sumatra, Java, Formosa, Ceylon, Zanzibar, Bahrayn and Sokotra ; (xi) Monsoons and Navigation ; (xii) The Red Sea, Its Islands and Reefs.

The other works of Ibnu'l-Mâjid also show his mastery of Nautical Science and his thorough experience of the navigation in the Red-sea, the Indian Ocean as well as in the Chinese waters His works serve as dependable mine of information regarding Nautical Science and its history.

More important than the discovery of a few technical principles, however, is the application of the inductive and objective methods to the scientific enquires instead of merely specultive principles, which had been the main drawback of the ancient scientific works. In this connection the services of the Arabic writers is of immense value.

"The Savants of the school of Baghdad", says Sedillot, "passing from the known to the unknown gave an exact account of the natural phenomena, so that the effects might be connected with their causes. They never accepted but what was demonstrated by experience. Such were the principles enunciated and followed by these masters. The Arabs of the 9th century had been in possession of this productive principle, which long after them, in the hands of the moderns, led to important discoveries".[8]

There is no doubt, that the utility of the positive inductive method was emphasised by the Arabic writers. Avicenna in his *al-Shifa* questioned the validity of deductive form of reasoning and raised the same objection against it as has been raised by the British Logician J. Stuart Mill. But Avicenna was too much influenced by the Greek thought to reject it altogether. We find, however, that three out of the four well known Inductive Methods are described with precision in the most popular book on Logic, the Sullamul-'Ulum of Muhibbulla of Bihar. These methods are also largely used in the Arabic works on Law and Jurisprudence especially in the Chapter on Qiyas or legal reasoning.

---

8. L. A. Sedillot, Histoire Des Arabes, vol. II, p. 12

treatises on Nautical Science. This shows that Arabic literature on the subject had already developed considerably. But unfortunately it is entirely lost.

Ibn'l Majid pays compliments to all his predecessors in the field, for what they attained. But he says that all of the earlier works are out of date now in the 15th century. All that was of any utility in them has been included in his own works. "Whatever I have written" he says, "is based on actual experience. There is nothing in it which is not verified by experience." He claims that every page of his book is more exact and useful than all that was written before.

The Paris manuscript of the work of Ibnu'l-Májid consists of two parts : Nos 2292 and 2559. One of them consists of 19 treatises and the other of 13 booklets. They have been edited and commented upon by Gabriel Farrand in three volumes. Some of these books are in poetry and some of them are in prose. The most important of them is *al-Ḥa'wiya* (The Inclusive). It is a short treatise on the principles of Nautical Science. It contains large amount of materials on the subject. It deals with (i) the signs indicating the nearness of the shore ; (ii) the mansions of the moon ; (iii) the wind : (iv) the chronology ; the law of the wind. They are followed by the description of the sea-routes– the routes to coasts of Arabia, to Western India, to Bengal upto Java, to Formosa and to China ; the distances from Arabian coasts to those of Western India, the latitudes of the ports of Indian Ocean. The discussion of these subjects shows a thorough practical knowledge to the countries referred to.

Another important book of Ibnu'l -Májid included in the Mss. mentioned above, is *Kitábu'l-Fawa'id.* (The book of Utility). It is dated 1490 A.D. and according to the editor, is the maturest of the author's works. It is divided into 12 chapters. They deal with ; (i) The Origin of Navigation and the Magnetic Needle ; (ii) The Qualities and the Knowledge which the Pilots Must Possess ; (iii) Lunar Phases ; (iv) Points of the compass ; (v) The Geographer and Astronomers the Predecessors ; (vi) Sea-Routes ; (vii) Astronomical Observations ; (viii) Steering of Ships ; (ix) Description of Coasts and of Three Group of Pilots ; (x) Description

through which they passed is abundantly shown by the several books and treatises on these subjects by Shihábuddin Aḥmed b. al-Májid of Najd in central Arabia, and by Sulaymán al-Mahri, which are preserved in *Bibliotheque Nationale* of Paris and were published by M.M Gabriel Farrand and Gaudefroy. These works are of great importance not only by themselves but also because they yielded permanent influence on the later development of Nautical Science.

The father and grand father of Ibnu'l-Májid were great captains and masters of Nautical Science. They left certain treatises on the subject. Ibnu'l-Májid describes them as "lions of the sea" and admires them a good deal. He says "My grand-father navigated the ships on the Red Sea through its routes to the coastal towns leading to Mecca and knew these routes precisely and in detail No one equalled him in this respect. My father inherited the nautical knowledge of my grand father. I renewed their experience during the last forty years and made the necessary corrections in the scientific works of these two great Captains. I have put down the results (of my experience) and laid down principles and facts which are not to be found together anywhere else. They may be found scattered in different works".[6]

It appears that they had great reputation among the Arab sailers for several generations. According to Richard F. Burton who visited Aden in 1854, "the Arab mariners of this period regarded Shaykh Májid as a saint and inventor of compass. They recited his *Fatiha* before entering into deep sea".[7]

The Arab sailers had produced several treatises on Nautical Science particularly during the 10th century. But unfortunately all of them are lost. But Ibnu'l-Májid refers to them with appreciation. He says that in the 10th century there lived three celebrated mariners : (1) Muḥammad b. Shaddán, (2) Sahl b. Abán and (3) Layth b. Kahlán. They composed in prose, a guide for the sea. Ibn Májid has criticised this treatise but he says that they found out new and nearer sea-routes from Siráf to Khurasan. He has also mentioned several other captains who composed

---

Kitabu'l Fawaid, Paris Ms. No : 2292, ff 78a-b.

Richard F. Burton, First Foot steps in East Africa. vol, I p. 2-3

rich in detail and in parts it is very poetic. Yáqút first gives the description of the towns and of the province in alphabetical order, and then adds the biographical notices of their illustrious personages. The book contains many beautiful rhetoric passages. One of them is in the notice of the Valley of Bewa'n. But the poetic character of such passages do not affect the quality of precision of the book. "It is this quality" says Carra De Vaun, "which does the greatest honour to the culture of Islam."

The Arabs made not only great progress in Descriptive Geography, but also corrected many of the mistakes of Ptolemy and others in the theoritical part of Geographical science. They found out correct longitudes and latitudes of many places, and performed very delicate observations in order to find out the correct measurement of the arc of the meridian.

They were also masters of Nautical Geography and science. They had thorough knowledge of the Red-Sea and of its western and Eastern coasts and of ports, of the Persian Gulf, of the Indian Ocean and of the Indo-Chinese Archipelago, piloted ships along their ancient routs for several centuries and made valuable contribution to Nautical Sciences. It was an Arab captain, Májid b. Al-Májid of Najd in central Arabia, who showed a map of the entire Indian littoral to Vasco De Gama and personally piloted the portuguese ship from Malindi to Calicut. It was he who made known to the Portuguese the direct sea-route from African port to India.

As a matter of fact during the middle ages several of the Arabian coastal towns like Basra, Oman, Sihr, Aden, Masqat etc. served as important ports.

The Arabian ships sailed under the direction of experienced Arab Captains of established reputation having strong keen sense of duty towards their passengers, who consisted of officers, merchants, sailers and other classes of people of different nationalities. The merchandise and provisions which they carried were of immense value.

This perfect mastery of the various branches of Nautical Sciences and of their knowledge of the various sea-routes and ports

Turkistan and the Indus as well as of those visited by their authors. They describe the important towns of the various countries and their physical features and climate, their natural and industrial products, the cultivated and waste land as well as various particulars with regard to their inhabitants.

The earliest Muslim geographer was the Persian Ibn Khurdazbih. His grand father who was a Zoroastrian had accepted Islam, and his father was for sometime governor of Tabaristan. He himself was appointed as a postmaster in the province of Jibal. He wrote a good book on the Roads and the Countries. In it he has described the postal stations and the taxation in each province.

He was followed by many other geographers belonging to the eastern and western parts of the Muslim world. But the greatest of them Yáqût b. Abdalla. He was Greek by birth, was taken as a captive in his childhood, and sold at Baghdad to a merchant who dealt among other things in books also. He got him carefully educated in all the sciences in vogue at that time, associated him in his business and sent him out on long journeys in connection with his work. He visited various distant places some of which served as important business-centre between India and Europe. Before the death of his master he secured his freedom, and obtained his livelihood by copying and selling manuscripts. He wanted to settle down at Marw which was then an important centre of Islamic culture. He was highly impressed by the sweet benevolence and attractive manners of its inhabitants and was particularly charmed by its several libraries of which he speaks in most impressive terms. But having encountered the Mangols in 1219, he fled on account of their fear, from place to place "naked as he would be raised on the day of judgement" and at last he died at Mausil in 626 A. H. detailed account of interesting adventurous life is given by Ibn Khallikan in his charming valuable biographical dictionary.

Among the several important books left by him is his great Geographical Dictionary, the *M'ujamu'l-Buldán*. It is described by Mr. Le Strange as "a storehouse of geographical information the value of which it is impossible to over-estimate". It is extremely

subject and whose monographs on Khálid Yazíd and Ja'far al-Sádiq, show his great ability for acute scientific criticism, has paid high tribute to Abu Bakr Zakariya al-Razi, in his article on Razi's *Kitábu Sirri l-Asrár* (The book of the secret of secrets). He says that the book supplies the missing link between the ancient alchemy and modern Chemistry. It is a complete systematic first class text-book on old Chemistry. The author has divided the book in several Discourses dealing with substances instruments and processes. In this book, instead of theologico-mystical speculation, experiment and chemical technique is given the greatest importance. In it the author shows his great enthusiasm for experiment and complete confidence in final result. This is a feature which is entirely wanting in the earlier literature on the subject.

Al-Razi's works on medicine also, however, show the same objective approach of the subject. His *Magnum Opus* on this subject, al-Ḥáwi, has a particular section in which he describes 25 of his cases with all clinical details This is extremely rare in the earlier medical literature.

In the branch of Opthalmology, however, Dr. Julius Hirshburg in his Gescht der Opthalmology dealing with that under the Arabs has brought to light the independent achievement of the Arabic writers in this field. As a matter of fact every branch of science and literature in Arabic on which thorough sympathetic research has been done, has shown that a good deal of independent additions have been made to the subject by the Arabic authors.

The same is the case with the geographical literature of the Arabs, according to V. V. Barthold "it is the most valuable monument of Musalmán culture of the 9th and the 10th century." Some of their historians like al-Ya'qúbí and al-Mas'údi, and all their geographers have handed down valuable information which are wanting in the earlier works on the subject. The earliest maps and astronomical calculations, which were made under the guidance of al-Ma'mún in the 10th century as well as the researches of Abu Zayd al-Balkhi were endorsed by al-Istakhri and were confirmed by the later writers.

The Arabic geographical works, however, contain the description of all the countries of the Muslim world from Spain to

identified by Stephen, the earlier translator. They sat together with Nicholas and discussed with him the doubtful plants and identified them with the help of the Greek Monk. Only a few (12 or so) of them remained unidentified".[5]

The same keen effort after scientific truth and exactitude characterises the independent technical scientific Arabic literature also. It began to develop from the end of the 8th century of the Chiristian era when al-Rashid according to the suggestion of Yaḥya, the Bermakid, got astronomical instruments prepared by able expert artisans and sent out Yaḥya b. Abi Manṣúr and other Astronomers to make scientific observation of the celestial phenomena and test the theories of the Greek writers on the subject. They produced as the result of their experience the table known as *al-Zijul Musta'mal* i. e. the Verified Tables. Sind b. Ali made other similar observations in 832 and 833 A.D. Again al-Ma'mún sent out a group of Astronomers in order to measure the degree of the Meridian. They went to the North just upto the point where the altitude of the pole varied by sixty minutes and discovered the value of the terrestrial degree. After this a very large number of observations were made by various scholars, at different places. Banu Musa, Moḥammad b. Jábir, al-Battáni, the results of whose observations have been published by Nallino, Abul-Wafá of Buzján, Ibn Yúnus of Egypt, al-Zarqáli of Spain, and Naṣiru'd-Dín al-Ṭúsi, are only a few of the Arabic writers on the subject who introduced great improvements in the Greek theories in the field of Astronomy, Mathematics and Geography, on the basis of their own observation of Natural Phenomena. Sedillot and Nallino have done important researches in these branches of Arabic literature. But it is the French Mathematician and Arabist M. Sedillot, however, to whom we are greatly indebted for his wide and penetrating study of them. He has summarised the results of his continuous, long, patient, hard work in his Histoire des Arabs in which he has pointed out their definite discoveries in these sciences, the credit for many of which has been wrongly given to the modern European scholars.

In the field of Chemistry, Professor Julius Ruska of Heidelburg University, who has done admirable work on the history of the

5. C. Elgood, Medical History of Persia, pp. 113-15

in some form or other i.e. he has followed a principle which a modern translator also may follow if his aim be a translation faithful to the sense. It is more than a purely literal translation and presupposes familiarity with the nature of the subject." "On the whole," continues Dr. Simon, "the Arab has thoroughly succeeded in his object."[4]

The colophon of the Ms. on the basis of which Dr. Simon edited the Arabic text, shows that the translator had used three copies of the Greek text together with one copy of the earlier Syriac translation of it. This shows the great care and caution taken by the Arabic translator in connection with his work. The same high tribute has been paid to the Arabic translators by other competent authorities on the subject also. Professor E. G. Browne, for example, who had made a careful study of the subject, pays high tribute to the Arabic translators in his Lectures on Arabian Medicine, whereas he finds serious faults with the Latin translations of Arabic Medical Works done in the last century.

An interesting example of the efforts of the Arabic scholars for scientific exactitude is supplied by the history of the translation of the great work of Dioscorides on plants. The work had been translated into Arabic at first at Baghdad by Stephen, as Ibn Abi Uṣaybia relates on the authority of Ibn Juljul. But this translation was very defective for many of the plants mentioned in the book could not be identified by the translator ; he just borrowed and utilised their Greek names without making any effort to identify them. When a copy of it was brought to Spain it could not be fully utilised either by the botanists or by the physicians. In 337 A.H./948 A.D. Romanus, the emperor of Constantinople, sent to 'Ābdur-Raḥmán III (al-Nasir) of Spain, rich presents in which was included an illustrated copy of the book of the great Greek botanist. 'Abdur Raḥmán wrote to the Roman emperor requesting him to send to him some one well-versed in Greek language who might instruct the Amir's employees in that language. A monk named Nicholas was sent to Spain in the year 340 A.H./951 A.D., a council of eminent physicians and botanists of Spain was appointed to decipher and identify the plants which could not be

4. Anatomic des Galen, vol. 1, Int. p. 45.

But in spite of the technical knowledge of the translators, the Arabic translations of the Greek works rendered in the early Abbasid period have been criticised by the later Arabian authors themselves, besause of the wrong system adopted by these translators. "John the son of Betriq and Naima of Emessa," remarks Bahaud-Din in his *Kashkul*, "took into account every word of the original text and replaced it by its Arabic equivalent." "This was not," he continues, "a sound method, for firstly Arabic equivalents could not be found for all Greek expressions and therefore a large number of Greek words had to be used by them in the translations, and secondly because of the great difference in the grammatical construction of sentences in the two languages. Over and above all this the idiomatic and metaphorical expressions which are so largely used in every language, could not be properly translated according to this method".[3]

This system of translation was, therefore, soon overhauled. and many of the early translations were either revised or translated afresh.

The important translators of the new school were Hunayn b. Ishaq for medical books, certain members of his family for Mathematical works, and al-Farabi for philosophical works. They revised many of the early translations and translated many other works form Greek and Syriac languages into Arabic, which were not translated before them.

They have been credited by all the modern competent critical scholars with great care and caution in their difficult literary task. Dr. Max Simon, who has published the Arabic translation of Galen's Anatomy, books 9-15, and compared them with their original Greek text, such parts of it as were now extant, makes the following remark on the merit of the translation by Ḥubaysh, the nephew of Ḥunayn b. Ishaq :

"He has endeavoured to translate all that is essential in the text. Of course he has dealt with the conjunctions freely, very freely, indeed. At any rate he has taken the trouble to convey all the component parts of a sentence including the Grammatical ones

3. Kashkul, Bulaq, 1288 A.H., p. 191.

appreciation of the attainment of the past ages, whereas the stress laid on the observation of the natural phenomena and the repeated reference to past peoples and their sufferings on account of their evil deeds gave a lead to the method of study based on facts and not on mere fantasy and speculation. Great efforts for correctness and exactitude, however, is particularly displayed in Tradition literature.

It is in connection with these studies that several other branches of Arabic literature originated and developed. Biography, History, Law, Jurisprudence, Lexicography etc. all originated and developed in the beginning in connection with study of the Quran and the Tradition. But the most important branches of literature which originated and developed in this connection are the sciences of "formal" and "material" historical criticism which are known as *Ilmur-Riwayāt* and *Ilmud Dirayat*. These sciences lay down the methods and rules which should be observed in handing down and in recording and preserving the historical reports. These Arabian sciences, I think, are unique in the literature of the world. But unfortunately they have not received that attention from the modern Arabists, and critical scholars which they so richly deserve.

The same care and caution which characterised the theological literature in Arabic was also shown with regard to the works on exact sciences. This branch of Islamic studies originated in the Umayyad period. But it took a definite methodical form under the early Abbasids, Since the very early part of the Abbasid period it appears to have been the rule that the translation of the works on technical and exact sciences from Greek, Sanskrit and other languages should be taken up only by such scholars as might be well-versed in their subject matter. We find for example that the Greek and Indian Medical works were translated into Arabic by scholars like Bitriq (?), by his son Yahya, by Stephen, and by the experts in Indian systems of Medicine respectively. Similarly the Mathematical works were translated into Arabic by Mathematicians like al-Fazari and Thabit b. Qurra. The translation of a work done even by a competent translator of recognised merit, if he was not a specialist in the subject matter of the book, was revised and corrected by a specialist. A book on Mathematics translated by Ḥunayn b. Isḥāq, for example, was revised by Thabit b. Qurra.

literature. The Arab told his chief plainly, "If you act discreetly as a chief should, you will lord over us, but if you are a prey to pride, go and be proud." "The Arabian Ode", says Layall, "sets forth before us a series of pictures, drawn with confident skill and first hand knowledge, of the life its maker lived, of the objects among which he moved, of his horse, his camel, the wild creature of the wilderness, and of the landscape in the midst of which his life and theirs was set; but all, however loosely they seem to be bound together, are subordinate to one dominant idea which is the poets unfolding of himself, his admirations and his hates, his freedom and the prowess and the freedom of his spirit[1]. "It is a poetry", remarks Nöldeke, "which makes it, its main business to depict life and nature as they are, with little addition of phantasy".[2]

These features of Arabic literature, however, are found in its Islamic theological branches also. The Quran and the Traditions abundantly show them. The boldness of numerous principles clearly and repeatedly preached in them must be recognised even by the superficial students of the Book as well as of the Tradition. Let us think of the life led by the people of Arabia and its adjacent countries, under the Persians and the Romans, and of their social, political and spiritual ideals, and then ponder over the preachings of the Quran and the Traditions: that man occupies the highest position in the universe, and every thing else including the forces of nature has been created for his sake, and he should not bow down before any of them but should try to harness and control them; that man is created for service (of God); that all men have one common origin; that they are all equal and no nation or individual has any inherent superiority over another; that man is essentially good and all his evils are due to bad association and improper guidance; that the ideal pious life is not that of devotion in lonely quarters cut off from human society, but that of purity within human society etc. These are only a few of the bold revolutionary principles which have been repeatedly, clearly and unequivocally preached in the Quran and the Traditions. The respectful recognition of all the true previous prophets, the acceptance of their principal teachings as well as those of the earlier books and other similar statements contained in the Quran show the sympathetic

---

Charles James Layall, Ancient Arabian Poetry, xviii

Noldeke, cit. Layall. op. cit, p. xviii

It is a peculiar phenomenon of the history of the nations that an ignorant people ill-equipped with war materials and without any resources, whose sacred book and leader condemned aggression in the strongest terms, was forced by circumstances to measure sword with two most powerful states of the time, simultaneously, and defeated each of them. They entirely neuteralised one of them and secured the possession of some of the most prosperous provinces of the other.

These were the Arabs of the 7th century. They not only conquered several countries and continents in a short time, but also acquired from the conquered peoples, their arts and sciences and soon excelled in them, tested their correctness, introduced considerable improvement in them, and spread them far and wide. The sciences and the arts thus produced by the United efforts of the Arabs and the non-Arabs and the Muslims and the non-Muslims, in the garb of Arabic language and under the supreme guidance of the Arab Caliphs and governors and the Muslim noblemen, are known as Islamic studies.

These studies represent the minds and cultures not only of the Arabs, but of all the thinking people of the medieval period. The striking features of this vast and varied literature is: (1) the boldness of conception and their straight-forward, clear and exact expression. (2) a sympathetic approach and assimilation of the cultural attainments of the previous nations and their critical appreciation, (3) a sincere attempt for a critical study of the natural phenomena and (4) the application of the inductive method to them for the sake of their scientific interpretation.

Most of these peculiarities of Arabic literature can be abundantly illustrated by the pre-Islamic poetry itself and may be easily discerned by those who may take the trouble of perusing "*The Ancient Arabian Poetry*" of Sir Ch. Layall or the English translation of the *Mufaḍḍaliyát* by the same great Arabist. The Arab character of expressing his mind boldly, fearlessly and clearly has been recognised by all those who have made a study of Arabic

Lecture—II

SECULAR SCIENCES

at-Du'afa' wa'l-Matrukin and after them a large number of biographers used it in their works[1].

But it is not correct to say that the European scholars began to use the alphabetical method long after the Arabs[2], for it has been shown that in the *Corpus Glossary* which is believed to have been written about 725 A.D. and has over 2,000 entries, alphabetical order has heen observed upto two initial letters[3]; and in a glossary of the 10th century (British Museum, 3376) the alphabetical arrangement has been carried as far as the third letter[4]. It cannot be said with certainty, whether the Arabs or the Europeans were the first to use the alphabetical arrangement in their vocabularies and lexicographical works. But there is no doubt that Haywood has rightly remarked that "the truth is that in lexicography—as in many other fields—the Arabs occupy a central position both in time and space, between the ancient world and the modern, between the East and the West"[5].

The influence of Arabic *linguistics* and *lexicograyhy* on Hebrew and Syrian linguistics and lexicography cannot,however, be doubted. The earliest Hebrew lexicographer, Sa'diya b. Yusuf (892-942 A.D.), who was the founder of the scientific activities in Judaism, wrote in the introduction to his dictionary that the works of the Arabic authors served him models for his book. "It is significant", says Haywood, "that the terminology of Hebrew grammar—even to the vowel names—is to a great extent borrowed from Arabic." In Syriac grammar and lexicography also there are unmistakable signs of indebtedness to Arabic grammar and lexicography[6].

Like the linguistics and the lexicography many other branches of Arabic literature, like history, geography, scholastic philosophy etc. originated and developed out of the study of the Qur'an and the Traditions.

---

1. *The Sunsan* of al-Tirmidhi 'ed. by Ahmad Muhammad Shakir, Cairo, 1938, p. 47-58.
2. Ibid, p.p. 44 46.
3. *A survey of English Dictionaries*, London, 1933 p.p. 89.
4. The Romans Lectures, Oxford, 1900, p. 12.
5. Arabic Lexicography, p. 2
6. Ibid, p. 121.

adds "the alphabetical method was used by some vocabulary writers as well as lexicographers, like Ibn Durayd (d. 321/934), before al-Harawi and al-Isfahani. But they used it only partially. The earliest lexicography in which alphabetical order was used in its entirity, is the *Asas al-balagha* of *al-Zamakhshari*[1] (b 538/1144)."

Arabic *linguistics* and *lexicography*, as has been already remarked, originated and developed in connexion with the Islamic religion and its original sources. All the important philologists have emphazised the religious importance of the subject. Ibn Manzur has remarked that around the lexicography revolve the commandments of the Qur'an and of the Hadith[2]. Al-Suyuti has said that lexicography is a part of religion[3]. He has applied in his *al-Muzhir* the whole method and technique of the Tradition of lexicography.

The Arabs, however, gave serious consideration to the application of the alphabetical method to the lexicography and vocabulary in the early period of the history of Islamic culture. Khalil b Ahmad (d. 175/791) discussed the importance of the alphabetical method in the introduction to his *Kitab al-'Ayn* But he changed the order of the Arabic alphabets on account of philological considerations. After him, Abu Bakr Muhammad b. al-Hasn b. Durayd discussed the matter further. He confessed the greatness of Khalil as a lexicographer, but he discarded his theory, introduced certain other changes in the order of the alphabets and compiled his *al-Jamhara*, mainly on the basis of the alphabetical order of the radical letters in the words. Al-Zamakhshari also composed his *Asas al-Balagha* entirely on the basis of the commonly accepted order of the radical letters.

Among the compilers of the vocabularies, Abu Bakr Muhammad of Herat, Abu Musa Muhammad b. Abu Bakr of Isfahan and Majd al-Din Mubarak b. al-Athir used alphabetical method in their works. In fact, the alphabetical method had been in use among the Arabic writers since the 9th century. Imam Bukhari (d 256/873) used it in a part of his Sahih. It was also used in the *Kitab al-Du'afa al-Saghir*, as well as in the *Kitab*

1. Ibid, p. 101.
2. Lisanul-Arab, Introduction.
3. al-Muzhir, vol. II, p. 157.

In *al-Nihaya,* which is in four volumes, he arranged abou four thousand and fifty rare expressions found in the Tradition. He put the letters of increase under the letter of the roots to whic they are added, as it has been explained by him at the end of th introduction to the book.[1]

Al-Nihaya is the most important, most useful and most popula vocabulary of the Traditions. Ibn Manzur, who has criticised it i the introduction to his *Lisan al-'Arab,* has also admired it, sayin that its author illustrated excellently the rare expressions containe in the Qur'an and the Hadith and surpassed all the limits in thi respect. J A. Haywood has remarked : "All in all, *al-Nihaya* is most efficient book within its limited scope'.[2]

Simultaneously with the works mentioned above, as well a after them, were composed a large number of books on the *ghari al-hadith.* But the works mentioned above form the landmarks i the history of its development. It is on the one or the other o them that the general plan as well as a large part of the contents o the later works on the *gharib al-Hadith* are based. They influence the Arabic lexicographical works in general, in their plans as wel as in the arrangement of the roots of the words according to thei subject matters, followed by Ibn Sida in his *al-Mukhassas* at a muc later date. Similarly, the alphabetical arrangement of the roots o the words was first introduced by Abu Bakr Muhammad b. 'Uma (d. 330/941)in his *gharib al-Qur'*an[3], and was followed by Ahmad b Muhammad al-Harawi in his vocabulary of the Qur'an and th Hadith and was thoroughly utilised by al-Raghib al-Isfahani (d. 501 1108) in his vocabulary of the Qur'an before being consistentl taken over by the Arabic lexicographers[4]. "It is perhaps significan that almost all the dictionaries so arranged were restricted t religious vocabularies. The system did not, then, affect the mai stream of Arabic lexicography"[5], says Haywood. "Of course," h

1. *al-Nihaya*, vol. 1, p. 9
2. *Arabic Lexicography*. p. 108
3. Brockelman, geschichte der Arabiche literature Vol. I, p. 119.
4. Arabic Lexicography, p.p. 102-103.
5. Ibid p. 103.

critical knowledge of the genuinness and of the defects of the Traditions. He wrote books on all these subjects. These books were well-known at al–Mausil and other places.

He was born at al-Jazira in 544/1149. He studied the various branches of Arabic literature with the reputed masters of them, at various centres of learning and settled down in 565 A.H. at al-Mausil where, at first, he delivered lectures on Islamic subjects. Afterwards he was appointed to responsible posts at al-Jazira by the Zanji chiefs and Sultans. During the reign of Nur-al-Din Arsalan Shah I, he rose to an important position in the Zanji-Sultanate. The Sultan frequently visited him at his residence and consulted him about important affairs of the state. He offered him, several times, the post of the minister of the state. But he always refused it in spite of protests by his father and brother. Indeed, once he was actually appointed as a minister. But when he came to know of it, he wept bitterly. The Sultan having come to know of his grief, went to his residence, excused him from the post and consoled him. About the end of his life he became invalid and was unable to move about. It was during this period that he composed most of his books. He endowed his house and all his properties for the mystics. He died in 606/1210[1].

He was a versatile writer. He wrote several books not only on Islamic subjects but also on arithmetic. His important books are *Jami' al-usul li Ahadith al-rasul* and *al-Nihaya fi gharib al-Hadith wa'l-Athar*.

In the *Jami' al Usul*, which is in ten volumes, he collected the Traditions contained in the six canonical works, in the alphabetical order of their subject matter, explained the rare expressions found in them, gave critical accounts of their transmitters and pointed out all that was necessary in connexion with the particular Traditions. Yaqut has remarked that "he was obsolutely certain that on Hadith no book like it was ever written nor shall it be ever written"[2].

---

1. *Irshad-al-Arib*, vol. VI, p. p. 238-9 ; Wafayatul *A'yan*, the article on Abul-Sa'adat al-Mubarak.
2 *Irshad al-Arib*, vol. VI. p. 241

occuring in the Qur'an and the Hadith, out of the works of the previous writers. He added to them many more by his own investigation, and arranged them in alphabetical order. This book is more comprehensive and easier to consult than all the previous vocabularies. Therefore, it became more popular than all the previous works on the subject.

Al-Fa'iq of al-Zamakhshari also lost its position after it. For al-Zamakhshari had arranged the whole or part of the Traditions alphabetically and explained all the rare expressions in them, under the root of one of them. Many of them were, therefore, included under entirely different roots. In fact, the arrangement of the various roots of words in *al-Fa'iq* is extremely confusing[1].

Al-Harawi had also, however, missed a large number of such of the rare expressions as were found in the Qur'an and the Traditions as needed explanation. Abu Musa Muhammad b. Abu Bakr of Isfahan (d. 581/1185) compiled, therefore, a supplement to the book of al-Harawi. These two books supplied a very large part of the needs of the students of the Qur'an and the Hadith. But they did not include many of the rare expressions used in the Sahih of al-Bukhari and of Muslim and many of those in other important Hadith-collections.

Abu'l-Sa'adat Majd al-Din al-Mubarak b. al-Athir, therefore, extracted the vocabulary of the Traditions only out of the works of Harawi and al-Isfahani, made considerable additions to them by his own study of the various important collections of the Traditions, explained them on the lines of his two main sources, and compiled them in his book *al-Nihaya fi Gharib al-Hadith wa'l-Athar*. In its introduction, he gave a short critical account of all the important previous works on the subject. It is on this book that the above remarks are mainly based.

Al-Mubarak b. al-Athir was an excellent scholar. He combined the wide knowledge of Arabic literature and linguistics with that of the Qur'an, the Traditions and Islamic law. He was well-versed in the biographies and the character of the Traditionists. He possessed

1. Haywood, op. cit pp. 105-6

This was realized by Abu Sulayman Ahmed al-Khattabi (319-388/931-998). He put together such of the Traditions as were missed by both Abu 'Ubayd and Ibn Qutayba, and commented on the rare expressions in them, according to their plan and standard. In the introduction to his book, he praised the work of his two predecessors and remarked, like Ibn Qutayba, that for a long time he had held that after their works, there was no need for any other vocabulary of the Traditions. But by the actual study of the Traditions he found that both of his predecessors had missed a large number of such of them as needed explanation. He compiled therefore, a supplement to their works according to their plan and standard. But, unlike Ibn Qutayba, he confessed that there still remained Traditions which he could not explain, and hoped that they might be collected and explained by some one who might be favoured by God with the ability to do so[1].

The book of Abu 'Ubayd and its two supplements were recognized as standard vocabularies of the Traditions and were depended upon by the Traditionists for centuries in spite of the fact that several authoritative linguists and Traditionists after them, like al-Mubarrad and Ibrahim al-Harbi and others, compiled after it, many small or big vocabularies of the Traditions. This was because most of them added little to what was collected by their predecessors and some of them were too voluminous to be easily available.

Abu 'Ubayd and his followers, however, had collected the texts of such Traditions as contained unusual expressions, gave their complete Isnads and explained, under each Tradition, such words as were generally unknown, without following any system in arranging their materials. They also did not mention the sources of the Traditions quoted by them. None of these vocabularies, therefore, could be utilized without due care and deep and thorough study

These defects were realized by Abu 'Ubayd Ahmad b. Muhammad of Herat (d. 401/1010). He left out, therefore, the texts as well as the Isnads of the Traditions while compiling his *Kitab al-Gharibayn* and collected and explained the rare expressions

---

1. Ibid. vol I p. 6.

able to justify some of his statements[1] The traditions related by Abu 'Ubayd are included in the Sahih of al-Bukhari and in the *Sunan* of Abu Da'ud and al-Tirmidhi.

M. J. de Goeje, in his learned article on the *Gharib al-Hadith*, says that Abu 'Ubayd's memory was as good as that of any Arab narrator which was a matter of wonder. "Of his knowledge of Arabic grammer", writes de Goeje, "he could not be a judge But as a grammarian he followed the school of Kufa" "The *Gharib al-Hadith*", the only book of Abu 'Ubayd which he had read he adds, "certainly showed his exactitude as well as his learning; but it did not show his originality[2]." Shaikh Kurd 'Ali says that the *Kitab al-amwal* shows Abu Ubayd's wisdom, his deep insight into the subject as well as his wide knowledge of it[3].

The *Gharib al-Hadith* of Abu 'Ubayd, however, did not deal with the whole of the wide range of its subject. Abu Abdullah Muslim b. *Qutayba* (213-276/828-889), therefore, wrote a large supplement to Abu 'Ubayd's work in which he followed his general plan and explained a large number of such traditions as were missed by him Ibn Qutayba wrote in the introduction to his book that for a long time he was under the impression that Abu 'Ubayd's work completely satisfied the requirements of the Traditionists But its deeper critical study convinced him that he had missed a large number of the Traditions. He therefore, compiled its supplement in which he explained such Traditions as were missed by Abu 'Ubayd, on the lines adopted by him He explained the Traditions more thoroughly and supported his interpretations by a larger number of authorities than his predecessor, and pointed out many of his mistakes. He also wrote an independent treatise on them. But he himself also committed many mistakes[4] He expected however, that after these two books, there would be no more room for further investigation on the subject. But actually he had also missed a large number of such Traditions as needed explanation[5].

1. *Irshadul-Arib*, vol. VI, p. 163
2. Z. D. M. G. vol XVIII. p. 785.
3. *Kunuzul-Ajdad*, p. 70
4. *Fathul-Mughith*, p. 349
5. *al-Nihaya*, vol. I, p. 5.

the best book on Islamic Law of taxation. It is a mine of information concerning the Islamic system of taxation on various kinds of commodities and shows Abu 'Ubayd's wide and deep knowledge of the subject[1].

He based all his works on some earlier books which he greatly enlarged and improved upon. He based his *al-Gharib* al-*Musannaf* on the work of a Hashimite author, and his *Gharib al-Hadith* and *Gharib al-Qur'an* on the works of Ma'mar. In his *Ma'ni'l Qur'an,* he brought together what was compiled by Ma'mar, Qutrubi and others and added to them their Isnads and a good deal of the results of his own researches.

Ishaq b. *Rahuya* (Rahawaih) observed : "Abu 'Ubayd was a greater scholar than Ahmad b. Hanbal and al-Shafi'I. Hilal b. al-'Ala of al-Raqqa is said to have remarked : "God showed his greatest kindness to us, through four scholar : (i) through al-Shafi'i, who laid down the foundation of Islamic law on the basis of the traditions of the Prophet ; (ii) through Ahmad. b. Hanbal, who held out till the end against the cruelty of al-Ma'mun ; (iii) through Yahya b. Ma'in, who protected the traditions of the Prophet against forgery ; and (iv) through Abu 'Ubayd, who explained the difficult expressions in the Traditions and without whom people would have committed mistakes with regard to them". His command over all the branches of Islamic literature has been generally acknowledged. His zeal for literary work cannot be denied. He divided his nights in three parts In the first part he offered prayer, in the second part he slept and in the third part be did literary work. His piety and truthfulness have been admired by all those who have written about him. He was neither vain nor irritable. When he was told that he had committed more than hundred and twenty mistakes in *al-Gharib al-Musannaf,* he calmly replied that it was not such in a book in which ten thousand errors were explained, and added that perhaps if he and the critic discussed these mistakes together, he might be

1. Kurd Ali's, *Kunuzul-Ajdad*, p. 70.

appointed him as a judge in Tarsus. He held this post for eighteen years. After this he attached himself to 'Abdullah b. Tahir, the governor of Khurasan, who recognized his scholarly attainments and encouraged him in his literary activities He gave him handsome rewards and a large permanent pension, for the books which he composed and presented to him, Once 'Abdullah was asked by his friend. Abu Dulaf, an eminent general and *amir* and also a scholar of some merit, to send Abu 'Ubayd to his newly-founded town, al-Karaj, to keep his company for two months[1] ; Abu 'Ubayd went to Abu Dulaf who enjoyed his company very much and offered him thirty thousand dirhams at the time of his departure. But Abu 'Ubayd refused it, saying that he lived in the company of a man who had made him free from the need of any help from any other quarter. When he returned to 'Abdullah' he granted him thirty thousand dinars Abu 'Ubayd accepted the gift and said : "O Prince, you have already made me so rich by your munificence, that with this money I would purchase weapons and horses and send them to the border area, so that you might get rich reward from God " In 214/829 Abu 'Ubayd went to Mecca to perform *hajj*, and stayed there till he died at Mecca, or at Madina, in 223-224/837-838[2].

He composed more than twenty books and treatises, Ibn al-Nadim has mentioned twenty of them, and I. A. 'Arshi has mentioned twenty-five of them[3] in his introduction to the *Kitab al-Ajnas*[4] All his books are valuable. But perhaps the most valuable of them is *al-Gharib al-Musannaf*, to which he attached great importance[5] It was probably his earliest work. According to al-Zubaydi, it contained Abu 'Ubayd's comments on seventeen thousand nine hundred and seventy unusual Arabic expressions[6].

His *Kitab-al-Amwal*, according to Ibrahim al-Harbi (198-285/831-898), is the weakest of his works.[7] But according to others it is

1. *Mu'jamul-Buldan*, vol. iv, p. 249
2. *Irshad-al-Arib*. vol. vi, p p. 162-6 ; Tarikhu Baghdad, vol xii, p.p, 403-16
3. *al-Fihrist*, p. 71.
4. pp. 8-18
5. *Irshadul-Atib*, vol. vi, p 166.
6. Ibid. pp 164-65.
7. *Tarikhu Baghdad*, vol xii p. 413, *Tahdhibut Tahdhib*, vol. viii, p. 316.

Almost simultaneously with Ma'mar and al-Naḍr, al-Asma'i and some other linguists also compiled small vocabularies of the Hadith. Each of them made some additions to the work of his predecessors and all of them, except Abu 'Adnan, quoted the complete texts of the Hadith, leaving out the Isnads, and explained, illustrated and commented upon the rare expression found in them. They included in their treatises the sayings of the 'companions' and of the 'followers' and commented upon the unusual expressions in them also.

Far more important and comprehensive than all the Hadith vocabularies mentioned above is the vocabulary compiled by Abu Ubayd Qasim b. Sallam who worked on it for forty years. He collected materials for it, from all the available sources, written as well as oral. In it he put together 526 traditions of the Prophet, added to them their Isnads, arranged them under the names of the Companions, who narrated them, like the collection of the Traditions called the Musnad, explained the rare expressions in them and illustrated them with the early Arabic poems, proverbs and idioms. He also included in his book the important sayings and remarks of about forty-seven 'Companions' and of more than forty 'Followers' and explained them like those in the Traditions. It is one of the most important works on Hadith-Vocabulary. For a long time it was utilized and relied upon by the Traditionists as well as the jurisconsults and the linguists[1].

He was the son of a Greek slave of an Azdite Arab of Herat, with whom his father worked as a porter. He was born between 154 and 160 A.H.[2] He received his education in Arabic linguistics, Hadith and Fiqh at Basra and Kufa. He lived at Baghdad for some time, where he worked as a mu'adhdhin in a mosque and as a teacher, and delivered lectures on some of his books[3], which were attended by many eminent Traditionists[4].

He was at first appointed by Harthama, the governor of Khurasan, as a tutor of his sons, and later on by Thabit b. Malik, the governor of Tarsus, to teach his son. Thabit also

1. *Tarikhu-Baghdad*, Vol. XII pp. 403-15; al-Nihaya Vol. I p. 2.
2. *al-Fihrist*, p. 78
3. *ZDMG* vol. XVIII, p. 782
4. *Mujamu'l Buldan* vol. IV p. 162 ;

better equipped in the art of discussion, but Ma'mar possessed more sarcastic humour and a sharper tongue than his rival and, therefore, was dreaded and avoided by him. It has been related that once the servant of one of Ma'mar's host dropped soup on his clothes. The host apologized for it, saying that he would replace his clothes by ten garments, But Ma'mar replied : "it did not matter, because the soup contained no grease".

He was the first author to compose a vocabulary of the Traditions. It was very short. But it served as a model for the works on the subject, for more than two centuries.[1] Ma'mar composed about two hundred other treatises on Arabic linguistics and the history of the Arab tribes and their battles. A list of some of his works is given by Ibn al-Nadim[2] and Yaqut.

Almost simultaneously with Ma'mar, another linguist of Basra school, Naḍr b Shumayl (d. 203-4/819-9) composed another vocabulary of the Traditions. Unlike Ma'mar, Naḍr was an Arab and belonged to the Banu Mazin branch of the tribe of Tamim. Some of the members of this tribe had settled down at Marw after its conquest by the Arabs and Nadr was brought there. He was taken out by his father to Basra[3]. Here he was brought up and educated. He also lived with the Bedouins in the desert for a long time. There he acquired mastery of the Asiatic language and poetry. He studied Traditions with the competent Traditionists of his time. At Basra he acquired good reputation as a master and teacher of these subjects. Among his students were reputed Traditionists like Yahya b. Ma'in and al-Madini.

Reduced to extreme poverty, Naḍr had to migrate from Basra to Marw, where he settled down. Here he became rich. But he always lived like a poor man.

He was respected by the scholars on account of his learning and unimpeachable character. When he was leaving Basra for Marw, three thousand scholars, including Traditionists, lawyers and linguists, came to bid him farewell.

---

1. *al-Nihaya*, vol. I, p. 4.
2. *al-Fihrist*, p.p. 53-54.
3 *Tadhkiratul Ḥuffaz*, article on al-Nadr.

al-Hadith wa'l-Athar. Haji Khalifa, after having summarized it, has described partly its later development also. All these treatises and books explain the rare expressions found[1] in the traditions of the Prophet of Islam as well as those in the remarks of his 'Companions' and the 'Followers' and illustrate them with the early Arabic poetry, proverbs and idioms.

The earliest of these treatises was compiled by Abu 'Ubaida Ma'mar b. al-Muthanna (d. 208/13/823-28). He descended from a Jewish family of Bajarwan, a small place in Armenia. His father, al-Muthanna, was converted to Islam and settled down at Basra. Here Ma'mar learnt Arabic linguistics and Islamic Traditions and became throughly conversant with these subjects as well as with the history and geneology of the Arabs. Al-Jahiz considered him to be the greatest master of all the branches of Arabic literature during his time. Ibn Qutaiba and al-Mubarrad held that Ma'mar excelled specially in the history and the genealogy of the Arabs. Among his eminent students were Abu Nuwas the poet, Qasim b. Sallam, the biographer, and Abu Hatim of Sijistan, the Traditionist In spite of the wide knowledge of Arabic poetry, Ma'mar, however, could not recite it correctly, nor could he read the Qur'an properly.

Faḍl b Rabi called Ma'mar from Basra to Baghdad, honoured and respected him, and asked him to recite some poems, and enjoyed and appreciated what was recited. Ibrahim b. Isma'il, the secretary to the minister, who was present, asked Ma'mar to explain the use of such expressions in the Qur'an the exact significance of which was not known to the Arabs, e.g., "ru'us al-shayatin" (the heads of the Satans). Ma'mar replied that the Qur'an had followed the usages of the Arab poets in this respect. Imra'u ul-Qays, for example, he said, referred to the tusks of the demons (anyab al-aghwal) in one of his poems

There was strong rivalry between Ma'mar and al-Asma'i. Both of them were great scholars. Each of them made distinct contribution to Arabic literature as is evident from the list of their books given by Ibn al-Nadim[2]. Al-Asma'i was more cultured and

1. Kashfal-zunun, Vol. p.p. 322-32.
2 *al-Fihrist*, Leipzig, 1871, p.p. 53-56.

grammer and vocabulary arose out of the study of Vedic literature. Among the Greeks, it was the study of the ancient epics which had quasi-religious importance, that led to the origin of linguistic studies[1]. Similarly, among the Arabs, it was the study of the Qur'an and the Hadith which led to the origin and early development of linguistic studies.

The earliest treatise on Arabic grammar by 'Ali, the fourth Caliph, or by his disciple Abu'l-Aswad al-Du'ali (d. 69/688), was composed in order to keep up the purity of the Qur'an and of the Arabic language. The personality and character of Abu'l-Aswad, as well as the circumstances which led him to the composition of the book, have been discussed by Haywood in detail[2]. As a matter of fact, the period in which the treatise is said to have been composed was the most suitable for such a work. The treatise was seen by Ibnu'l-Nadim[3], Ibn al-Zubaydi, (d. 379/989), al-Qifti[4] (d. 646/1248) and Ibn Khallikan[5].

About a century after the composition of the earliest treatise on Arabic grammar, al-Khalil b. Ahmad (d circa 170/786) wrote the Kitab al-'Ain, the earliest book on Arabic lexicography. Being an extremely religious and godly man, brought up and educated at Basra, an important centre of Islamic learning, and being well-versed in the Hadith, it cannot be doubted that al-Khalil's main object in composing the Kitab al-'Ain was to serve religious literature[6].

It was not long after the composition of the Kitab al-'Ain that treatises and books on *gharib al-Hadith* (vocubulary of the Tradition) began to be compiled. A short critical account of the origin and development of this branch of Arabic literature, till about the end of the 6th century of the Hijra, has been given by al-Mubarak b. al-Athir in the introduction to *al-Nihaya fi gharib*

---

1. Ibid., p. 2.
2. Ibid., pp. 11.17.
3. al-Fihrist, Discourse 11, Section 1.
4. Inba' al-ruwat 'ala anba' al-nuhat, vol. 1, p. 13.
5. The article on Abu'l-Aswad.
6. al-Khalil and his Kitab al-'Ain have been thoroughly discussed by Haywood, op. cit.

with unabated vigour, till the last century. Their magnitude ma be estimated from the fact that al-Bukhari's Tarikh contained th short biographies of more than 40000 Traditionists. And th *Tarikhu Dimashq* of Ibn 'Asakir, which contains the biographica notices of such Traditionists only as either lived in Damascus o visited it, extends to 80 large volumes, all of which are preserved in the Zahiriya Library and are being edited by Salahuddin al-Munajjid.

Ibn 'Asakir was born in a literary family and learnt the Quran by heart at an early age. He at first studied with his father and other eminent scholars in Damascus, travelled very widely in persuit of learning. sat at the feet of more that 1300 teachers of whom more than 80 were women. Finally he settled down at Damascus and devoted his life to the service of Traditions and the connected subjects.

The development of the biographical dictionaries of the Traditionists created similar interest among the devotees to other subjects also. Therefore, there were composed in Arabic, the biographical dictionaries of poets, of grammarians, of physicians, of saints, of jurists, and judges, of calligraphers, of lovers, of misers, of idiots and other classes of peoples. It has been, therefore, remarked that "the glory of Mohammadan literature is its literary biography". Margoliouth writes that the biographical literature of the Arabs is exceedingly rich.

The study of the Quran and the Hadith led to the origin of Arabic linguistics and lexicography also, just as it led to the origin and development of many other branches of Arabic literature. As a matter of fact, the interest in linguistics among most of the nations arose and developed out of their study of their religious or semi-religious literature.

Among the Chinese, the origin and early development of the linguistics was very largely due to the study of the Buddhist and Taoist texts. Their earliest extant dictionary was composed by Hsu Shen, in order to explain the expressions found in the important canonical treatises.[1] Among the Hindus, the keen interest in

---

1, John A. Haywood, Arabic Lexicography, Leiden, 1960, p. 6.

This method has been followed by the indexer of the verbal Traditions contained in the *Genuines* of al-Bukhari and Muslim, Muhammad Sharif b. Mustafa al-Tuqadi, a Traditionist belonging to modern Turkey, who completed his concordances in 1312 A.H. They were printed at Constantinople in 1313 His concordance of the Traditions contained in al-Bukhari's *Genuine* give the references to their commentaries by al-Qastalani, al-Asqalani, and al Ayni also. His concordance of the *Genuine* of Muslim give references to its commentaries by al-Nawawi also. Thus the preparation of these two concordances involved the study of more than thirty large volumes

This short account of the indices and concordances of Hadith-works, shows that the Arabs were the earliest people to prepare the indices of large books extending to several volumes on the basis of their manuscripts. But books on other subjects were never indexed by them till the begining of the 20th century, whereas the European writers made the scientific index of every book a necessary part of it, before the beginning of the present century.

An important and vast branch of Arabic literature which was originated and highly developed by the Arabs, independently of any foreign influence, consisted of biographies. It originated with the biography of the Prophet of Islam. The earliest scholars who collected material for it, according to Horowitz, lived before the beginning of the 2nd century of the Hijri era[1]. Some fragments of some of them are preserved in the library of Heidelberg in Germany. The necessity of the critical study of the Isnads in Traditions however led to the compilation of the collected biographies of their narrators, containing their short biography, a critical estimate of their characters as well as their chronology. According to Otto Loth, such works were in common use among the Traditionists in the second century[2]. According to Horowitz, the earliest work of this type was composed about the middle of the second century[3].

The biographical dictionaries of the narrators of Traditions, being begun in the middle of the second century, were continued

1. *Islamic Culture*, Vol I, pp. 550-558.
2. Z.D.M G xxiii, p. 600.
3 *Der Islam* vol. VIII, p 42,

But this book also, like the previous works on the subject, suffered from the mistakes of ommission as well as of commission. Some of them were realised by the author himself who wrote a supplement to it, in which he corrected his mistakes. But several other mistakes also were noted by some later Traditionists like al-Mughlatai, (683-762/1292-1361) Ibn Kathir (d. 774/1373) and others. Ibn Hajar al-'Asqalani collected all these errors and their corrections, added to them many more by his own researches, and published them with the title *Al-Nukat uz Ziraf 'ala'l-Atraf.*

The book of Al-Mizzi, however, in spite of its defects, was considered to be the best and most useful index of Hadith literature, for several centuries. Ibn Hajar himself described it as one of the most important works on the science of Traditions and that it was used in the West as well as in the East[1].

But the largest of the *Atraf* works was compiled by Abul Faḍl Muhammad b. 'Ali al-'Asqalani, generally known as Ibn Hajar. (773-852/1372-1449). He was born in Egypt, got the Qur'an by heart at the age of nine years, acquired excellence in Arabic literature and the Islamic sciences at an early age, delivered lectures on them for more than 40 years and also worked as a judge in Egypt for 20 years. He was liked and respected by all classes of people. He produced more than 140 books and treatises. Some of them consisted of several volumes. Three of his books consisted of the indices of such of the Hadith-works as were not indexed before him.

There were prepared several other indices of Hadith-works after the above-mentioned ones. The general method adopted by their compilers have been already described.

But this method itself had several defects which were noticed by 'Abdul-Ghani al-Nabulusi (1150-1143/1641-1730). He, therefore, introduced certain changes in it. There are also certain other *Atraf* works in which the extracts from the Traditions are arranged in alphabatical order and the names of the narrators are mentioned only incidentally.

---

1. al Nukatuz-Ziraf vol. I pp. 4-6

Traditions narrated by their earliest reporters, and of their different *Isnads*.

The earliest of the *Atraf* works relating to the two "Genuines" were compiled about the end of the 3rd/9th century by Abu Muhammad Khalaf b. Muhammad of Wasit. (d. 401/1011) and Abu Masud Ibrahim b. Muhammad of Damascus (d. 401/1010) independently of each other[1].

After them several competent Traditionist compiled many *Atraf* works. An important one among them is the *Tuhfatul-Ashraf bi Ma'rifa-til-Atraf*, by Abul-Hajjaj Yusuf b. Abdul-Rahman of Mizza, a village near Damascus. It consisted of the *Atraf* of the six cononical collections and of those of other small collections of the Traditions.

He was one of the most celebrated Traditionists of his time. All his contemporaries including his teachers, acknowledged his excellence in the Traditions. He had wide knowledge of their narrators, as it is shown by his book "*Tahdhibul-Kamal*[2]."

After having got the Qur'an by heart and learnt Arabic grammer and literature, he began the study of Hadith in 674/1275, acquirad its mastery as well as that of the various branches of Islamic Sciences, from one thousand of their masters, delivered lectures on them for fifty years and held the post of the professor in the Ashrafiyya College for twenty three years. Many celebrated doctors of Islamic sciences, like Al-Dhahabi and Ibn Taymiyya were among his students. He composed several books. But he had special interest in the *Atraf ul-Hadith*. He devoted to it a large part of his life and time. He studied all the previous works on the subject and, after twenty three years of labour, produced the *Tuhfatul-Ashraf*. In it he has prepared the *Atraf* of 1959 Traditions including the repeated ones, which are found in eleven Hadith-works the names of which he has mentioned in the introduction. He corrected the mistakes of his predecessors and added the results of his own study to their works. He has always made his own additions distinct, by adding a letter before them[3].

---

1. *Tarikhu-Baghdad* Vol. VIII, pp. 334-5; *Tariku Dimashq* vol. I, p. 262; *Tuhfatul-Ashraf*, by al Mizzi vol. I. p. 4,
2. *Al-Tabaqatu'l-Kubra* vol. VI, pp. 351,4
3. *Tuhfatul-Ashraf*. vol. I, pp. 3 4

The extensive development of Hadith-literature led the Arabs to create and develop the special branch of literature which is known as *Atraf ul-Hadith* and consists of the indices of several of the Hadith works some of which extend to more than a dozen of volumes.

Indexing is considered to be a modern art. The earliest index of a book in a European language consisted of the concordance of the Bible. It was compiled by Anthony of Padua (1195-1231). The first authentic concordance of it was prepared by cardinal Hugh (1263) who is said to have employed 500 brother Monks to assist him in its compilation. But the first complete concordance of the Bible was prepared by Alexander Cruden (1737) and his example was followed by other contemporary indexers. Thus in Europe the indexing of books was begun in the 13th century[1], and it was made a necessary part of every book in the 19th century.

But the Arabs began the indexing of the Hadith works about the end of the 9th century and continued it up to the end of 19th century. They were the earliest people to prepare the indices and the concordances of voluminous manuscripts of the collection of the Traditions. These works are technically known as *Atraf ul-Hadith.*

They consist of short extracts, or the description of the titles of the Traditions included in one or more collections of them, and give references to the books, chapters and parts of the book or books in which the complete text of the Tradition are found. The extracts are generally arranged in alphabetical order of the names of their earliest reporters which are arranged in different chapters according to their different categories. They do not attach any importance to the expressions used in the Traditions, nor to their subject matters.

Some of the *Atraf* works relate to the two "Genuines" of al-Bukhari and Muslim ; some of them relate to the four *Sunan* works ; some of them relate to all the Six Cononical collections, and one of them relate to certain parts of the two Genuines and their four important commentaries, which consist of more than thirty large volumes.

These works serve as the indices of the various versions of the

---

1. *Manual of practical Indexing*, A. L. Clarke, p. 20 ; *Index* and Indexing by Collison Robert 1959, p. 17.

The Hadith or the Traditions of the prophet of Islam, however, received a very keen attention of the Muslims since his life time. Some of them put down some of the Traditions during the very life time of the Prophet These treatises are known as *Sahifas*. Several of them are mentioned by some of the Traditionists and also by Goldziher among the modern Orientalists.

After the death of the Prophet, Muslims showed extraordinary activities in learning and in collecting them from their custodians who had settled down in the various parts of the far-flung Islamic empire.

They went from place to place in the different countries, met those who knew even a single tradition of one single sentence, learnt it from him and put it in black and white. Thus developed a movement, known in the history of the Traditions as "Talabul'l-Hadith" or search for the Traditions. Several of the Companions undertook long journeys in order to learn one single Tradition from him who had learnt it from the Prophet directly. Their examples were followed by those who came after them, some of whom boasted that they travelled round the world for the sake of knowledge From the middle of the 2nd century after the Hijra, it became customary among seekers of the Hadith to undertake long journey in order to gather the knowledge of the Traditions. "From one end of the Muslim world, to the other, from Andalusia to central Asia", says Goldziher, "wandered the arduous indefatigable seekers of Hadith and gathered Traditions from every place in order to relate them to their listeners The humble title of *al-Rahhal* (the great traveller) or *al-Jawwal* (the great wanderer) is seldom used for them in any other sense than what is generally understood by them. The title *Tawwafu'l-Aqalim* (the wanderer round the world) is no hyperbolical designation for the travellers among whom there were some who could boast to have travelled four times throughout the East and the West". "They travelled throughout these countries" adds the learned Orientalist, "not for the sake of seeing and gaining experience, but in order to meet the Traditionists at these places,to hear Traditions from them and to profit by each of them, just like the bird that sits on a tree in order to pick its leaves"[1].

---

1. Moh. Studies vol. II p. 177.

knowledge. The Qur'an, their sacred book, laid stress on the acquisition of knowledge. It said : "Are those who know and those who do not know, alike"—(xxxix, 9). It recommended that people should write down their contract (ii, 282). The prophet of Islam asked some of his associates, including some women, to learn the art of writing. He released such of the captives of the battle of Badr as taught the art of writing to ten Muslim boys.

As a matter of fact, under the guidance of Islam the Arabs as well as the non-Arab Muslims cultivated, encouraged and helped the scholars of different nationalities professing different religions, to cultivate and work for the advancement of the different branches of knowledge in which they were interested. The Jews, the Christians the Zoroastrians, the Greeks and the Indians, all were brought together in the courts of the Umayyads and the Abbassids and their governors, as well as in those of the Muslim rulers of the conquered countries. Everywhere they were supplied with all facilities to continue to serve the science of their choice.

The interest of the Arabs as well as of the non-Arab Muslims, was at first confined to the learning of the Qur'an and the Hadith i.e the Traditions of the Prophet of Islam The very word "Ilm" (knowledge) was used by them to indicate these subjects only. Their cultural activities also were confined to the learning of the Traditions of the Prophet of Islam from all the available sources and in writing them down in the form of books and treatises

It is therefore that the term 'Islamic Studies' has been used by some scholars to indicate the religious sciences of Islam only like the Qur'an, the Traditions of Islam, Islamic law, Jurisprudence etc. This narrow interpretation of the term "Islamic Studies" spread so widely that some Muslims held that the study of any science other than the Islamic religious subjects, is irreligious. But this is entirly wrong. As a matter of fact, every branch of knowledge which originated with Islam, or was developed under its protection, in any period, is included in the connotation of the term "Islamic Studies". I am personally of the opinion that just as the study of every thing created by God has been recommended by the Qur'an, so every branch of knowledge which is created and developed by the intellect of men, and which helps in the uplift of the human society and its members is included in the scope of Islamic Studies.

I

It is an interesting cultural phenomenon of great importance that the ignorant people of Arabia became the saviours of science and wisdom, and not only cultivated and preserved partly by themselves and partly through other peoples, but also made considerable additions to its various branches, spread it in the East and the West and kept up its glory and grandeur for more than a millennium.

The Arabs of the 6th century A.D. were generally an ignorant lot and were quarreling and fighting among themselves. One of their distinguished poets, Tarafa, lost his life because he did not know how to read. Another of them could save his life by getting a letter read by one of his friends. Another distinguished Arab poet who knew how to read and write, wanted to keep his knowledge secret, because it was considered by the Arabs to be a defect. Their language did not have any word for the writing materials. They borrowed the words for them like Qalam, Qirtas, Kaghaz and Hibr from other languages.

But within two or three centuries they developed calligraphy into a veritable art, and invented several styles of it. Not only their men but also their women excelled in it. They used it not merely for the purpose of writing but also for decorating architectural monuments. They borrowed the art of paper-making from the Chinese and established its factories in several places in the East as well as in the West, like Khurasan, Baghdad, Cairo, Cordava etc. From some of these places, paper was exported to certain parts of Europe also.

The advent of Islam revolutionised the character of the Arabs and developed among the contemporary Arabs great love for

Islamic Studies

Khuda Bakhsh Annual Lectures, 1970

Khuda Bakhsh Annual Lectures are delivered every year by some eminent scholar of Persian, Arabic or Islamic Studies. After the Inaugural Lecture of the series by Prof. A. A. A. Fyzee, in 1969, the second lecture was delivered in 1970 by **Dr. Muhammad Zubayr Siddiqi**.

Dr. Muhammad Zubayr Siddiqi (d. 1976), took his early education at Patna and Rampur (U.P.). After Matriculation from Calcutta University in 1914, he did his B. A. & M. A. (Persian) from Patna University; and got his Ph. D. from Cambridge in 1925. Appointed as Lecturer of Arabic in Lucknow University in 1926, he joined Calcutta University in 1929 as lecturer in Arabic and Persian Literature, became head of the Deptt. of Islamic Culture in 1940 and retired in 1962.

His works include :

(1) A critical edition of the Firdausu'l-Hikmah, by Ali b. Rabban al-Tabari ; (Berlin, 1928), (2) A critical edition of the Tarikh Nama-i-Herat, by Syed b. Muhammad b. Ya'qub al-Harawi (Calcutta, 1944), and (3) al-Siyru'l-Hathith (Hyderabad, 1948), (4) Studies in Arabic and Persian Medical Literature (Calcutta, 1959), (5) Hadith Literature : Its Origin, Development, Special Feature and Criticism (Calcutta, 1961), and, (6) Social position of women through the Ages (Calcutta, 1971).

Published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna, 1986 and English Matter Printed at New Asian Printers—29/7, Phears Lane, Calcutta-73.

Khuda Bakhsh Annual Lectures—4

ISLAMIC STUDIES

by

Dr. M. Zubayr Siddiqi

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY, PATNA

1986

CONTENTS

Printers : Liberty Art Press, New Delhi and Patna Litho Press, Patna

Publisher : Mahboob Husain for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 50109)

Editor : Dr A. R. Bedar

Annual subscription : Rs. 60.00 (Inland), 12-00 Dollars (Asian countries), 24 Dollars (other countries) Rs. 15-00 per copy

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

40

1987

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA

خدابخش لائبریری پٹنہ

جرنل

۴۱

۴۲

۴۳

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ۳۲۴۲۴/۷۷
{ کتالیسواں
سیالیسواں
نیتالیسواں } شمارہ ، ۱۹۸۷ء

قیمت فی پرچہ : ۱۵ رُپے
سالانہ : ۶۰ رُپے (ہند)
: ۱۲ ڈالر (ایشیا)
: ۲۴ " (دیگر ممالک)

فہرست مشتملات

گجرات کا ماہنامہ زبان منگرول : مکمل فائل کی عکسی اشاعت

قیمت : ۴۵ رُپے

محبوب حسین نے لبرٹی آرٹ پریس دھلی سے چھپوا کر خدابخش لائبریری سے شائع کیا

گجرات
کا
ماہنامہ زبان منگرول

۱۹۲۶ء ——— ۱۹۲۸ء

مکمّل فائل کی عکسی اشاعت

خدابخش لائبریری، پٹنہ
۱۹۸۷ء

پیشگفتار

پیشگفتار

کاٹھیاواڑ گجرات کے ایک تہذیبی مرکز' سابقاً ایک دیسی ریاست' منگرول کے ساٹھ سال پرانے ایک تاریخ ساز ماہنامہ 'زبان' کے تمام شماروں کی یکجا مکمل عکسی اشاعت پیش خدمت ہے۔

زبان کے پہلے شمارہ میں ایڈیٹر جناب عبدالرحمٰن خوشتر منگرولی نے اپنے 'افتتاحیہ' میں پرچہ کی نوعیت کے بارے میں مندرجہ ذیل پیراگراف لکھا تھا' جس سے اس کے کردار پر کافی روشنی پڑتی ہے:-

"زبان" جن خدمات کی ذمہ داری کا بار لیکر آیا ہے وہ اس کے آیندہ اوراق خود بتادیں گے زبان کا دعویٰ نہیں ہے لیکن وہ کوشش کریگا کہ ہندوستان کے اعلیٰ رسائل میں اس کا شمار ہو' اگر زبان کو عامیانہ خیالات کی جولانگاہ بنانا نہیں چاہتا تو اپنے بعض کرمفرما احباب کے مشورہ کے مطابق خالص علمی (جس میں ادبیات کی چاشنی نام کو نہ ہو) بنا کر بالکل خشک اور ٹھوس بھی بنانا نہیں چاہتا' البتہ ایسے ادبی مضامین سے جن میں صرف پرشکوہ اور شاندار الفاظ ہی الفاظ ہوتے ہیں اور جو معانی و مطالب سے معرا ہوتے ہیں اور جن میں غلط اور غیر مانوس ترکیبیں' لایعنی جملے' اور عریاں خیالات ہوتے ہیں زبان کو آلودہ نہ ہونے دوں گا' اگر اس کو "قبول عام" کا شرف دینے کے لیے ان تمام دلچسپیوں کا خیال رکھا جائے گا جس کا جواز اہل کتاب و اہل علم نے دے رکھا ہے اس میں (۱) مقالات (۲) ترجمات (۳) ادبیات (۴) اخبار علمیہ اور (۵) تنقید و تبصرہ کے مستقل عنوانات ہوا کریں گے جن کے ضمن میں (۱) علوم و فنون کے متعلق ہر قسم کے مضامین ہوں گے۔ (۲) عربی' انگریزی اور گجراتی کے اعلیٰ خیالات اردو میں منتقل کئے جائیں گے (۳) بہترین شاعرانہ خیالات "شعر منثور" اور مختصر اخلاقی و سبق آموز افسانے اور اخلاقی و نیچرل نظمیں اور تازہ غزلیات ہوا کریں گی۔ (۴) جدید علمی خبریں ہوں گی اور حیرت انگیز سائنس کے اختراعات سے آگاہ کیا جائے گا (۵) مطبوعات جدیدہ پر ناقدانہ اور منصفانہ رائے کا اظہار کیا جائے گا۔"

O

زبان کے ایڈیٹر (اور مالک)' جناب عبدالرحمٰن بن محمد محسن سلیمانی' متخلص بخوشتر کی ولادت ایک غریب لیکن غیور عرب خاندان میں یکم مارچ ۱۸۹۲ء کو ہوئی ان کے والد ریاست جوناگڑھ' دھوراجی وغیرہ میں نوابوں اور راجاؤں کے محل کے عرب افواج کے روایتی پاسبانی دستوں کے رکن تھے' ان کی عمر مشکل نو سال کی تھی جب ان کے والد نے بعارضہ دق انتقال کیا' یہ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم جوناگڑھ کے مہابت مدرسہ اور دھوراجی کے ایک غیر سرکاری اسکول میں ہوئی' والد کے انتقال کے بعد ریاست

منگرول کے صدر مقام منگرول کے مدرسۂ اسلامیہ اور گجراتی ہنڈر اسکول اور جوناگڑھ کے مہابت مدرسہ میں ہوئی۔

تعلیم تکمیل کرنے نہ پائے تھے کہ منگرول کے ایک متمول میمن گھرانے کی ایک معمر خاتون حج بیت اللہ کو جاتے ہوئے خوشتر صاحب کی والدہ کدر بانو کو اپنے ساتھ لے گئیں، چنانچہ ان کی والدہ نے انہیں بمبئی شہر میں کھڑک محلہ میں واقع اس زمانے کے مشہور و معروف زکریا احمد پٹیل کے یتیم خانے میں داخل کردیا، اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔

۱۹۱۳ء تک بمبئی میں قیام رہا، حج سے واپسی پر ان کی والدہ نے ان کی نسبت بمبئی میں مقیم منگرول کے ہی ایک باعزت خاندان کی بیوہ لڑکی مسماۃ زینب سے کردی اور وہ بمبئی سے اپنی والدہ کے ساتھ منگرول چلے آئے، کچھ دنوں کے بعد ان کی والدہ علیل ہو گئیں اور بمبئی کو واپسی کا ارادہ ترک کرکے منگرول کے مدرسۂ اسلامیہ میں پندرہ ۱۵ روپے کے مشاہرہ پر مدرسی کی ملازمت اختیار کی، اس کے ایک ہی ماہ کے اندر ان کی والدہ کا انتقال ہونے کے بعد وہ پھر بمبئی گئے جہاں ۱۹۱۴ء میں ان کا عقد زینب خاتون سے ہوا، دو ۲ بچوں کے بعد ۱۹۱۷ء ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔

بمبئی میں مختلف مقامات پر ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۱۸ء میں اپنے وطن منگرول واپس ہوئے اور ولی عہد ریاست شیخ محمد عبدالخالق صاحب کے دربار سے وابستہ ہوگئے، ولی عہد کے صاحبزادے ناصر میاں صاحب کے مصاحب کی حیثیت سے ۳۰ روپے ماہوار پر ان کا تقرر ہوا، تین سال کے بعد ۱۹۲۱ء میں ان کی دوسری شادی ولی عہد صاحب کے توسط سے ایک مقامی عرب خاندان کے شیخ حسن بن علی چاؤش کی صاحبزادی مسماۃ مریم بانو سے ہوئی۔ ان دوسری بیوی سے دو ۲ بیٹے اور دو ۲ بیٹیاں ہوئیں۔

ان کی اولاد میں ماشاء اللہ تین بیٹے اور ایک بیٹی زندہ ہیں۔

۱۹۲۸ء میں ان کا تقرر ریاست منگرول کے ریونیو سررشتہ دار کے اوّل کارکن (کارکن اول) کی حیثیت سے ہوا، اس سے دو ۲ سال قبل ۱۹۲۶ء میں انہوں نے منگرول سے ماہانہ رسالہ "زبان" کا اجرا کیا جو آگرہ پریس آگرہ میں چھپتا تھا۔ یہ رسالہ تقریباً دو سال جاری رہا لیکن مالی دشواریوں اور قدر دانوں کی کمی کے باعث اسے جاری نہ رکھ سکے اور اس کو بند کرنا پڑا۔

ملازمت میں ترقی کرتے ہوئے پہلے ریونیو اسسٹنٹ اور پھر شیخ محمد ناصر الدین میاں صاحب کے عہد میں ۱۹۴۳ء میں ریاست کے ریونیو کمشنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ریاست منگرول کے انڈین یونین میں ضم کئے جانے پر دیگر مسلم عہدیداروں کے ساتھ خوشتر صاحب کو بھی پنشن پر سبکدوش کیا گیا۔

ملازمت کے دوران خوشحالی سے زندگی بسر ہوتی رہی۔ شعر و شاعری کا ذوق شوق کہ جو بمبئی کی سکونت کے دوران پیدا ہوا اور پروان چڑھا تھا جیسا کہ آئندہ سطور سے ظاہر ہوگا منگرول کی فضا اور ماحول نہایت سازگار تھا۔

ملک کے بٹوارے کے بعد ان کے بڑے بیٹے ابا مختار تو کراچی منتقل ہوگئے، لیکن ابا محسن اور ابا خالد ہندوستان میں ہی رہے

ں وہ دونوں بھی کچھ سال بعد وہاں سے مشرقی پاکستان چلے گئے، بنگلہ دیش کی تشکیل کے بعد انہوں نے وہاں کی قومیت اختیار کرلی، جبکہ ڈھاکہ میں اینٹوں کے کارخانے کے مالک اور صاحب استطاعت ہیں، خوشتر صاحب کو مہنگائی بھتہ علاج معالجے کے الاؤنس وغیرہ کو ملاکر ۲۴۰ روپے وظیفہ ملتا ہے، نہایت کشادہ دست اور فراخدل اور مہمان نواز ہونے کی وجہ سے نیز کتب و رسائل کی خریداری کے پیش نظر اس قلیل رقم میں ان کی بسر اوقات ہوتا مشکل ہے لیکن ان کا سعادتمند لڑکا ابا خالد ان کی تمام ضروریات کو پوری کرتا ہے اور خوشتر صاحب کی زندگی اسی طرح خوشحالی اور آسودگی میں بسر ہو رہی ہے۔ ان کے بنگلہ دیشی دونوں بیٹوں کا اصرار ہے کہ وہ ان کے ساتھ ڈھاکہ میں بود و باش اختیار کریں لیکن ع کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر" کے بمصداق وہ اپنے وطن مالوف منگرول کو جہاں پوری زندگی نہایت نیک نامی اور ادبی فضا کے علاوہ مقامی اور بیرونی مشاہیر کی صحبت میں گزاری ہے، چھوڑنا نہیں چاہتے، ویسے وہ ڈھاکہ آتے جاتے رہے ہیں گو اب ضعف بصر اور جسمانی کمزوری کی وجہ سے سفر کرنا ترک کردیا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں کئی ماہ ڈھاکہ میں رہے اور قیام ڈھاکہ کے دوران میں ہی وہیں سے حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے ہیں۔ سعادتمند فرزند ابا خالد صاحب نے اپنی بیٹی رضیہ ماں کی شادی کی تقریب کے بہانے اگست ۱۹۸۵ء میں ایک بار پھر انھیں اپنے پاس بلالیا۔

یتیم خانے کے قیام اور تعلیم کے زمانے میں وہاں کے پرنسپل منشی محمد حسین صاحب تھے جو اپنی ادارت میں اردو مفید الاخبار نکالتے تھے۔ یہ یتیم خانے میں طبع اور وہیں سے شائع ہوتا تھا۔ اس وقت اردو فارسی کے استاد اپنے زمانے کے مشہور عالم ادیب اور شاعر حضرت تجمل حسین جلالپوری تھے، یتیم خانے کے اسکول کے بعد بمبئی میں ہی گولی محلے کے میونسپل اسکول میں بغرض مزید اردو تعلیم داخل ہوئے جہاں خوشتر صاحب کو ۱۹۰۸ء میں جناب محمد حسین مقبہ صاحب کے ہاتھوں "مجموعۂ سخن" کتاب بطور انعام ملی، اس اسکول میں ان دنوں صوبۂ بمبئی (حال صوبۂ کرناٹک) کے شہر بلگاؤں کے باشندے عبدالحق المتخلص بہ شائق بھی مدرس تھے۔ وہ اپنے طلبا کو اکثر اردو شعرا خصوصاً مصحفی اور انشا اور غالب و ذوق کے حالات بڑے دلچسپ انداز میں اور مزے لے کر سنایا کرتے تھے۔ چھٹی ہوجانے کے بعد کے اوقات میں بھی اسکول میں مزید کچھ وقت ایسے شاعرانہ ماحول میں گذرتا تھا۔ "مجموعۂ سخن" میں شعرائے متقدمین کا کلام اور مختصر حالات درج تھے۔ ان میں بڈیڈ کے رہنے والے خوشتر تخلص والے شاعر بھی شامل تھے جن کی رام اور سیتا پر کہی ہوئی نظم اس میں شامل تھی، خوشتر صاحب کو یہ تخلص پسند آگیا اور فن شاعری کی شد بد نہ ہونے کے باوجود اس تخلص کا اپنے لئے انتخاب کرلیا اور اپنے نام کے ساتھ خوشتر منگرولی لکھنے لگے۔

بمبئی کے ہی ناخدا محلے میں رام پور کے ایک ظہور الدین نامی حکیم صاحب مطب کیا کرتے تھے۔ خوشتر صاحب نے ان سے بھی کچھ فارسی سیکھی۔ بقول خود خوشتر صاحب کے "تعلیمی عہد سے خوشتر تخلص کا دم چھلہ لگا لینے کی وجہ سے مجھے مجھے خواہ مخواہ شاعر بننا پڑا" اسی لئے خوشتر صاحب اپنے آپ کو وہبی شاعر نہیں متشاعر کہتے ہیں، چنانچہ تخلص کو نباہنے کے لئے انہوں شعر گوئی کی طرف توجہ

دی اور اس طرح "اوٹ پٹانگ" شعر سے شعر کی مشق کا آغاز ہوا، ان دنوں بمبئی کے بھنڈی بازار کے فٹ پاتھ پر اقبال کا شکوہ اور جواب شکوہ، آغا حشر کشمیری کا سکرپٹ یورپ وغیرہ نفیس طباعت والے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ بکا کرتے تھے۔ خوشتر صاحب ان کو خرید کر مطالعہ کرتے۔ زکریا مسجد بمبئی کے مقابل واقع سبحانی لائبریری میں جا کر گھنٹوں اردو اخبارات اور رسالے پڑھا کرتے اس کے علاوہ بمبئی کی مشہور کریمی لائبریری واقع انجمن اسلام بوری بندر میں بھی کافی وقت کتب بینی میں صرف کرتے رہے، اس دوران فٹ پاتھ کے کتب فروش کے پاس سے "اصلاح سخن" نامی ایک مختصر رسالہ دستیاب ہوا جو لاہور سے حضرت وجاہت جھنجھانوی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، اس کے مستقل خریدار بن گئے اور ان سے اپنی پہلی غزل پر اصلاح لی جس کا مطلع یہ تھا:

خدا نے ان حسینوں کی عجب صورت بنائی ہے کہ جن کی بھولی بھولی شکل پر قربان خدائی ہے

اسی کے ساتھ ایک اور غزل بھی بغرض اصلاح بھیجی تھی جسے یہ لکھ کر واپس کر دیا گیا کہ طبیعت پر اور زور لگاؤ اس تجربے سے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ کسی مقامی استاد سے بالمشافہ مشورہ کرنا چاہئے تاکہ شعر کے محاسن و معایب کما حقہ سمجھ میں آسکیں، چنانچہ خوشتر صاحب نے اپنے ہم وطنی سلطان میاں المتخلص سلطان کے مشورے پر ان کے استاد حضرت تجمل حسین تجمل جلالپوری کے دامن تلمذ سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کر کے ۱۹۱۰ء میں حضرت الاستاذ تجمل جلالپوری کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا اور انہوں نے پہلی اصلاح کردہ غزل کی "تاج خوشتر" (۱۹۱۰ء) تاریخ کہی، خوشتر صاحب کی شاعری کا اس طرح باقاعدہ آغاز ہوا۔

منگرول میں ولی عہد ریاست شیخ محمد عبدالخالق صاحب کے دامن دولت سے ۱۹۱۸ء میں وابستہ ہو کر ان کے سایۂ عاطفت میں اپنے ادبی ذوق کو جاری رکھا۔ ان کی خدمت کے علاوہ وقت کا زیادہ حصہ کتب بینی میں صرف کرتے رہے جس سے ان کے علمی ذوق کو بڑی تقویت پہنچی، نتیجۃً ۱۹۲۶ء میں اردو زبان کا ایک ماہوار رسالہ "زبان" شائع کیا۔ یہ آگرہ میں جناب دلگیر کی وساطت سے آگرہ پریس میں چھپتا اور منگرول سے شائع ہوتا تھا، اس رسالے کے اجراء میں برصغیر کے مشہور اہل علم و دانشور جناب قاضی احمد اختر جونا گڑھی مرحوم کا بہت بڑا حصہ تھا۔ ان کی اعانت سے رسالہ اعلیٰ معیار پر نکلتا تھا، بدقسمتی سے رسالہ دو سال کے عرصے میں بند کرنا پڑا۔

ایک طرف طبیعت میں "تعشق" اور دوسری طرف اہل و عیال کے چکر کی وجہ سے باوجود اچھی خاصی ملازمت کے تنگدست رہے، ان دنوں منگرول کے ایک اور صاحب علم بڑے افسر جناب فصیح الحق عباسی بھی ان کی دستگیری کرتے رہتے تھے، رئیسوں کی سالگرہ کے موقعوں پر قصیدہ تہنیت پیش کرنے پر بھی چھوٹا موٹا انعام مل جاتا تھا۔ اس طرح گزر بسر ہوتی رہی، البتہ خوشتر صاحب کی زندگی کا یہ آخری دور ان کے نہایت نیک بخت اور سعادتمند بیٹے ابا خالد کی نگرانی سے فارغ البالی میں گذر رہا ہے۔ اپنی ۹۶ سالہ زندگی میں کسی جسمانی تکلیف یا بیماری سے دوچار نہیں ہوئے سوائے یہ کہ پچھلے دو سال سے بتقاضائے عمر ضعف بصر اور قوائے جسمانی کی کمزوری کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہیں، ماشاءاللہ حافظہ اب بھی قوی ہے اور منگرول اور بمبئی تک کی علمی اور ادبی فضا

یں معلومات کا بیش بہا خزانہ ان کے اس حافظے میں محفوظ ہے۔ ضرورت ہے کہ انکے ان معلومات کے خزانے کو قلمبند کیا جائے۔
منظوم کلام کے علاوہ خوشتر صاحب کا فی نثری سرمایہ بشمول ترجمہ کردہ مضامین اور افسانوں کے مالک ہیں۔
ی سے ان کی طباعت کی طرف انہوں نے زیادہ توجہ نہیں کی، نظموں کا ایک مختصر مجموعہ "حسن خیال" کے نام سے ان کے
ے محمد محسن اور عرب ابا خالد نے ۱۹۷۶ء میں ڈھاکہ سے شائع کیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں گجراتی زبان کے مشہور افسانہ نگار اور
بن دھوم کیتو کے چیدہ چیدہ خوشتر صاحب کے کئے ہوئے گجراتی سے اردو ترجموں کا مجموعہ بنام "خیالی تصویریں"
ت منگرول کے آخری رئیس اور مترجم کے ممدوح نے رقم کثیر خرچ کرکے کراچی سے شائع کرایا تھا جو ان کو شکایت
غلط سلط چھپا تھا، اس لئے وہ اسے دوبارہ اضافوں کے ساتھ تصحیح شدہ صورت میں چھپوانا چاہتے ہیں۔ غزلوں اور نظموں کا
ر دیوان بھی مرتب کیا ہے۔ لیکن طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ نثری ادبی مضامین 'طیور آوارہ' کے نام سے چھپ
ی 'حسن خیال' کا دوسرا ایڈیشن بھی اضافوں کے ساتھ ڈھاکے سے دسمبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا ہے۔ خوشتر صاحب کی
مات کے اعتراف میں گجرات اردو بورڈ (احمدآباد) نے آپکو ۲۹ نومبر ۸۶ء کی ایک تقریب میں ولی گجراتی ایوارڈ دیا ہے۔

خوشتر صاحب نے ہماری گزارش پر ہمیں ازراہِ کرم اپنا جو 'احوال واقعی' عنایت کیا
وپر درج ہوا۔ اب کچھ رسالہ 'زبان' کے بارے میں:

○

'زبان' کے پہلے شمارے میں سرورق پر عربی شعر مندرج تھا:۔

لَقَدْ وَجَدْتَ مَکَانَ الْقَوْلِ ذَا سَعَۃٍ   فَاِنْ وَجَدْتَ لِسَانًا قَائِلًا فَقُلْ

گلے شماروں میں بھی جاری رہا۔ اس شعر کے نیچے رسالہ کا نام ہوتا اور پھر یہ عبارت ہوتی تھی "کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی
دار رسالہ"۔ مقالات کے اوپر سرنامے کے طور سے کبھی کبھی یہ رباعی درج رہتی تھی (۲۵۰)

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی   کل جسم میں اک نطق مجسم ہے یہی
ہے عرش خدائے پاک، گر پاک ہے دل   صادق ہے زبان تو اسم اعظم ہے یہی

۱۹۲۰ء کے فروری میں یہ اعلان بھی کیا گیا (۳۹۳) کہ ابتک آگرہ اخبار آگرہ سے چھپتا تھا تاخیر ہوتی تھی اب یہاں سے چھپے گا۔
'زبان' کا مکمل فائل ہمیں خوشتر صاحب سے ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے توسل سے ملا اس کے لیے دونوں کا شکریہ ہم
واجب ہے

اس عکسی اشاعت میں پہلے پرچے کا سرورق دینا ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس کے بعد کا کوئی ٹائٹل نہیں دیا گیا سوائے دوسری جلد کے پہلے شمارہ کے جسیں مبین صاحب کے خط کی روشنی میں اس عربی شعر کو تصحیح کیساتھ چھاپا گیا جو اینک غلط چھپا تھا ساتھ ہی شاعر کا نام بھی اڑا دیا گیا۔ اس کے بعد تیسری جلد کے چوتھے شمارہ میں ٹائٹل کا ڈیزائن اور مضمون تبدیل ہو گیا، اس لیے اس کا عکس دینا بھی ضروری خیال کیا گیا۔

یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ: شمارہ ۳(۱) دراصل ۳(۱-۲) ہے یعنی جولائی اگست کا مشترک نمبر ہے، ادارہ کی جانب سے ایسا مذکور ہونے سے رہ گیا۔ اسی طرح ۳(۵) کو غلطی سے ۳(۴) لکھ دیا گیا تھا۔ ۳(۶) میں اداریہ میں مشتملات کے ذکر میں عشرت رحمانی کے مضمون متعلقۂ مومن دہلوی کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ مضمون واقعتہً نیت یا ارادہ ہی تک محدود رہا چھپا نہیں۔

ہر رسالہ کی الگ الگ فہرست مضامین صفحات ۲، ۵۱، ۹۹، ۱۴۷، ۱۹۵، ۲۴۳، ۲۹۵، ۳۴۵، ۳۹۵ (دو ماہ کا مشترک نمبر) ۴۹۱ (دو ماہ کا مشترک نمبر) ۵۸۵ (دو ماہ کا مشترک) ۷۱۵، ۷۶۳، ۸۱۱، ۸۵۹ پر موجود ہے۔ لیکن مضمون کے مقابل جو بارہ اشاعت کے صفحات نمبر دیے ہوئے ہیں وہ اب اندر تبدیل ہو گئے ہیں اور نئے نمبر مضمون کے مقابل دینے کے بجائے ایک جامع فہرست بنا دی گئی ہے۔ تاہم اصل فہرستوں کی ہیئت کو ہر رسالے کے ساتھ جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے تاکہ اور مجمل اندر بھی سامنے رہے (سوائے فہرست ۲(۶) کے جو اصلاً ہمارے نسخے میں محفوظ نہیں۔

ذیل میں 'زبان' کی تمام تحریروں کو دس بارہ موٹی موٹی قسموں میں تقسیم کر کے مرتّب کر دیا گیا ہے تاکہ ایک نظر میں اس مخصوص فن میں دلچسپی لینے والے کے سامنے ساری متعلقہ تحریریں یکجا آجائیں۔ اس میں نظم کے حصے میں چونکہ ہزار دو رسالے کی مانند یہاں بھی شعرائے کرام تعداد میں اچھے خاصے ہیں اس لیے انھیں ابجدی ترتیب میں کر دیا گیا ہے، اور اسی طرح ایڈیٹر کے نام خطوط لکھنے والوں کو بھی۔

اسلام و متعلقات

تمرہ

تاریخ ہند اسلامی

تاریخ و تنقید زبان و ادبیات اردو

میں شخصی واحد تیار کر رہا ہے (اداریہ/نوٹ) ۷۲۴ ● رسم الخط (تمکین الکاظمی) ۴۲۲ ● انداز (اسٹائل): (عابد علی عابد) ۴۲۵ ● میر انیس اور عون و محمد کا کردار (عبدالقادر سروری) ۵۱۶ ●

● اردو کے پیغام گو شاعر (محی الدین قادری زور) ۶۴۲ ۔ خاص کر اقبال کے بارے میں اہم حصہ: زندگی میں مضمون ص۶۰ تا ص۶۰۹ ● دار الاشتقاد کے انعقاد کی ضرورت (اداریہ) ۳۲۹ ● جوابِ استفسار عرضی از آزاد کاکوری در 'نیرنگ' رام پور (شاداب بلگرامی) ۲۱۲ ● نواب آصف الدولہ کا شکار اور میر و سودا (ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور بی اے پروفیسر جامعہ عثمانیہ) ۳۱۰ ● نفسیات اکبر (عابد علی عابد) ۳۶۵ ● خیابانِ خلیل (لسان الملک صاحبزادہ متین اللہ خاں واثق ٹونکی) ۔ والیٔ ٹونک اچھے شاعر ہیں لیکن مجموعے میں جو پوچ شعر ہیں یقیناً وہ ان کے نہیں کسی کے کہے ہیں اس لئے ہم اس حصہ پر تنقید کر رہے ہیں ۷۴۲، ۷۵۲، ۸۹۳، ۹۰۰ آخری قسط میں 'باقی' کا اشارہ ہے لیکن اس کے بعد 'زمان' نکلا ہی نہیں! ● دور قدیم و جدید کی شاعری پر ایک نظر (ولایت حسین خاں اثر رامپوری) ۵۴۰ ● دورِ حاضر کے شاعر (عشرت رحمانی المجیبی رامپوری ۵۳۹ ۔ عندلیب شادانی والے انداز میں: دورِ حاضرہ کے کچھ نامور شعرا کا کلام، ایڈیٹ دو سال کے اندر کے 'خورشید' اور 'جلوۂ یار' میرٹھ سے غریب سہارنپوری، افسر امروہوی، جان محمد انور تلمیذ مضطر خیر آبادی، شیام چرن بزم بریلوی، زخمی سیوتی، سالک رام سالک گرداری، قادر بخش شباب، نوح ناروی پر اعتراضات ۵۳۹ تا ـــــ ● اٹھارویں صدی کے افسانہ نگار (یعنی انگریزی افسانہ نگار ۔ ترجمہ (قیسی) ۷۸۹ ● سید مقبول حسین بہزاد کا ایک مراسلہ کہ اردو کی ایک کتاب فارسی جدید کے طرز پر شائع ہو رہی ہے ۔ ۷۰۱ ● دنیائے افسانہ پر ایک نظر (محمد محسن خاں متین حیدر آبادی) ۶۷۹

ناولٹ / طویل افسانہ

شہیدِ تغافل ('بالم') ۲۷۲، ۳۲۴، ۴۶۵، ۷۰۳ ● فلسفی دِل (مصنفہٗ اسٹیونسن مترجمہ احمد عبداللہ المسدوسی متعلم عثمانیہ): ۲۴ ورق کا طویل افسانہ یا ناولٹ ۵۵۱

مختصر افسانہ

● احساس گناہ کی قیمت (محمد صدیق مسلم مالی گاؤں) ۷۹۵، ۸۴۳ ● پہاڑی لڑکی (محمد شفیع کاشف اکبرآبادی) ۔ کیوپڈ اور سائکی کے بارے میں افسانہ ۶۸۳، ۵۵ ● شوالہ (محمد شفیع کاشف اکبرآبادی) ۸۱، ۲۰ ● مہرِ موہوم (اقبال ۶۱ اقبال) ۸۳۲ ● لازوال شاعر (شوکت تھانوی) ۶۹۵ ● انصاف اندھا ہو سکتا ہے لیکن روپیہ گونگا نہیں (قاضی نصیح الدین صدیقی متعلم بی اے عثمانیہ) ۔ انگریزی سے ترجمہ معلوم ہوتا ہے ۸۵۰ ● گنگا کی وادی میں (قیسی رامپوری) ۸۷۲ ● رقّا

، (محشر عابدی) [کسی انگریزی افسانہ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، باقی آئندہ لکھا ہے مگر اس کے بعد 'زبان' بند ہوگیا] ۹۰۲

ت

● منازلِ حیات (سیّد مطلب حسین عالی لکھنوی) ۴۴۱ ● شوہر کے نام (ہمشیرہ صاحبہ مطلب حسین عالی لکھنوی) ۶۹۹ ● ت [کردار پر ایڈیٹر ایٹیٹ] (مترجم محمود اسرائیلی) ۶۸ ● ہستی معصوم [عورت پر ایڈیٹر ایٹیٹ] محمود الرّب خاں ڈنگالی ۳۰ ایک خاتون دوست کی شادی پر — شادی ایک احمقانہ شجاعت ہے مرد کی، عورت کی بدترین تحقیر ہے جب کسی کی بی بی بنے (مس حجاب اسماعیل) ۱۳۲ ● ایک دوست کی شادی پر - اب آپ ایک مکمل انسان ہو گئے محمد یوسف قیصر) ۱۳۴ ● خاموشی (محمد محسن خاں متین حیدرآبادی) ۵۲۹ ● اطمینان قلب (سیّد عبداللہ معروف بہ سلطان سیّد سنگر دلی) ۵۳۴ ● زوال اور رد دایر (حافظ امام الدین امام اکبرآبادی) ۱۷۷ ● مصوّر فطرت (حافظ امام الدین امام اکبرآبادی) ۲۲۰

انشائیے

● محبّت (ساغر نظامی) ۸۶۸ ● اقوالِ زرّیں: — عورت کے بارے میں (امام اکبرآبادی) ● میری روح کا مستقبل (کیف مرادآبادی) ۸۵۷ ● حسن خیال (صادق الہ آبادی) ۸۰۲ ● مناظر قدرت (کوثر اکبرآبادی) ۲۲۲ ● قاصدِ امید (کوثر اکبرآبادی) ۲۱۱ ● چلمن کی جھلک (قاضی امانت علی تسکین بٹالوی) ۲۷۸

نکات ملا رموزی

● نکات ملا رموزی: اردو کیلئے مسلمانوں کی رواداری اور غیر مسلموں کی ناروا داری، مسلمان اخباروں نے سبھا، سوراج، ستیہ گرہ، سوامی، آشرم، مہاتما، گوؤرکھشا، شدھی، سنگٹھن کا استعمال شروع کر دیا ہے مگر اسکے برخلاف...... ۲۹۸ ● نکات ملا رموزی: اکبر حیدری نے کہا ہے کہ اردو میں تعلیم حاصل کریں، اردو والوں کی انگریزی پرستی کے سبب؛ یوپی میں ۱۹۱۳ء میں ہندی اخبار ۶ تھے اردو ۷۹، جب ۱۹۲۶ء میں ہندی ۲۲۶ ہیں اردو ۱۹۶: ۵۸۶

● نکات رموزی: کالجوں یونیورسٹیوں میں اردو کی حالت ۱۴۹ ● نکات رموزی: بسلسلہ 'زبان' ۱۸۰

نظم (نظم، غزل، رباعی، قطعہ، قصیدہ)

● اثر صہبائی رامپوری، ولایت حسین خاں: شباب رفتہ کی یاد میں ۷۷، ۳ غزل ۵۹۲، ۷۹۳، ۸۹۱ ● احمد ابراہیم و شعیب احمد چشتی نظامی (بمبئی)؛ غزل ۳۲۳ ● اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں: گوہر رشک ۸۹، کوئل سے ۱۳۱، شہر خموشاں ۸۰، کارفرمائی عشق ۴۷۵

وفیات مشاہیر

تذکرۂ مشاہیر

تصاویرِ مشاہیر

● ابوالکلام آزاد ۵۸۶ ● زور ۵۹۶ ● شیخ عبدالخالق ولیعہد منگرول ۵۹۵ ● میر علی نواز خاں ناز والیٔ خ
(دیانیوٹ سکریٹری رضا الحق عباسی کے ذریعہ) ۳۹۴ ● شیخ محمد جہانگیر میاں والیٔ منگرول ۳۰۴ ● غلام معین الدین خاں والیٔ ریاست ما
دکا ٹھیاواڑ۔ یہ سب تصاویر طباعت کی سہولت کے پیش نظر یکجا پیش کر دی گئی ہیں۔

تذکرۂ رسائل جن پر تبصرہ ہوا، یا 'زبان' پر جن کے تبصرے نقل ہوئے

● آفتاب (کلکتہ) ۲۹۰ ● آئینہ (کانپور) ۳۳۹ ● ادبستان (بمبئی) ۲۴۰ ● اقتباس (بمبئی) ۲۳۹ ● النا
(لکھنؤ) ۲۳۳ ● انقلاب: ایڈیٹر فتح چند شمیم دکنھیالال ثاقب لاہور ۴۹۰ ● پیمانہ (آگرہ) ۲۲۶، ۲۹۷ ● ثریا (آگر
اشتہار ۲۹۷ ● حرم (میلی بھیت) ۲۴۱ ● خیابان (لکھنؤ) ۲۸۹ ● دل (آگرہ) ۲۳۸ ● ریاست (دہلی ۴۶
● زمیندار (سنڈے ایڈیشن) (لاہور) ۳۴۶ ● سہیل (علی گڑھ) ۲۸۶ ● شمع (آگرہ) ۳۷۷، ۳۸۳ ● ظل السلا
۲۲۸، ۷۱۶ ● علی گڑھ میگزین ۴۸۶، ۷۰۶ ● قوس قزح (لاہور) ۲۴۴، ۲۸۹ ● کیف (اجمیر) ۲۴۰، ۶۰
● مرقع (لکھنؤ) ۲۴۳، ۴۸۹ ● معارف ۳۴۶ ● مفید عالم (دہلی) ۳۴۳ ● نظر (لکھنؤ) ۲۳۵ ● نگار (بھوپا
۲۳۴ ● نیرنگ (رام پور) ۲۲۷، ۳۶۷ اشتہار نمبر ۸۰۳ ● نیرنگ خیال (لاہور) ۴۸۹ ● ہمدرد (دہلی) ۴۶

تذکرۂ کتب (تبصرہ یا اشتہار)

● پس پردہ (مضامین) از آغا حیدر دہلوی ۸۰۸/۸۰۹ ● حیات انیس اور امجد علی اشہری کی دوسری کتابوں کا اشتہار ۳۳
● خطوط شبلی بنام عطیہ و زہرہ فیضی ۳۴۳ ● دنیائے افسانہ از سروری ۸۰۷/۸۰۸ ● روح تنقید از زور ۸۰۷
● عبرت کدہ (اکبر حیدری) افسانے ۱۱ ● فانی کے 'دیوان فانی' کا اشتہار۔ محمد شوکت علی خاں بی اے علیگ، شعر سے
آغاز 'کیوں؛ ہل حشر ہے کوئی نقاد سوز دل :: لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے' آگرہ اخبار آگرہ ۵۹۷ ● کتاب الح
والزیارۃ مولفہ مولوی منور الدین دہلوی تبصرہ از قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۳۸۶ ● کیفستان (ادب لطیف) ۸۱۰
● گلزار خلیل از خلیل ۲۸۶ ● مرآۃ محمدی: گجرات کی لکھی اسلامی تاریخ (از منشی غلام محمد) جنھوں نے جوناگڑھ کی تاریخ مرآۃ
مصطفیٰ آباد نام سے لکھی ہے ۲۸۵ ● مرقع عبرت یا ایک عیاش کی ڈائری۔ افسانہ ۸۰۹، ۸۱۰ ● تذکرۂ رمضان، ۱۶ ص کا
رسالہ (از مظہر احمد ادھمی)، لیلۃ القدر کے فضائل ۳۸۹

متفرقات

● حکمت عملی [اخلاقیات میں] (یٰسین محمد الجیلانی) ۵۸۷ ● قابلیت دماغی اور صحت جسمانی (مرزا شکور بیگ متعلم عثمانیہ

اخبار علمیہ / مترجمات

● شرق اردن کے آثار قدیمہ ۳۹۱ ● لاش کی حفاظت (مصر کی طرح اٹلی میں) ۳۹۱ ● ایک دمڑی والے ملک کی ۴۵ ہزار میں خرید ۲۹۱ ● سب سے چھوٹا برقی لیمپ ۲۹۲ ● علمی اصطلاحات ۴۸ ● باغ حیوانات عہد عباسی میں ۴۸-۴۹ ● عرب میں سونے کے دانتوں کا رواج ۱۰۰۰ھ سے قبل ۴۹ ● شمالی یورپ میں اسلامی سکّہ جات کی دریافت ۴۹ ● مستقبل کا اخبار: صرف واقعات کی چھوٹی چھوٹی تصاویر پر مشتمل ہوگا ۵۰ ● اسلامی جذبۂ خودداری ۵۰ ● فوٹوگرافی کا ارتقا: ایک سیکنڈ میں تین سو؛ تشخیص امراض بذریعہ تصاویر؛ حمّیٰ محرقہ کے جراثیم ۲۴۰ ● ایک عجیب گھڑی جو ہلاؤ کے چلے گی ۲۴۱ ● نباتات کی انسائیکلوپیڈیا ۲۶۹ ● یورپ کے شاہی درباروں کی اخلاقی حالت ۲۷۰ ● ارتقائے ارض کا قرآنی نظریہ اور موجودہ تحقیقاتِ طبقات الارض ۳۳۷ ● لذتِ الم ۳۳۸ ● ترجمہ قرآن مجید چینی زبان میں ــ محمد علی کے ترجمہ سے ترجمہ محی الدین کر رہے ہیں ۲۸۲ ● غیر صحیح اور مخرب اخلاق کتابیں نذر آتش ۲۸۳ ● لندن میں مذہب عیسوی پر مادیت و خود غرضی کا غلبہ؛ قدیم جغرافیہ کے محافظ: مسلمان (جاگرفیکل میگزین) ۲۸۴ ● ذاتوں کا امتیاز اور مساواتِ اسلامی ۲۸۵ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا جدید ایڈیشن ۲۸۵ ● مطبوعاتِ قدیمہ کی قدر و قیمت ۵۴۶ ● مغلوں کا محکمہ احتساب ۵۴۷ ● فلسطین کی جدید اثری تحقیقات ۵۴۹

اصل مضامین پڑھنے سے بھی پہلے محض ایک نظر میں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ **اسلام و متعلقات**، تاریخ ہند اسلامی کے علمی حصّے کے تحت جو کچھ بھی ہے اچھے لکھنے والوں کے قلم سے ہے اور آج بھی ان کی وہی اہمیت ہے۔ **ادبیات** اردو میں زیادہ تر کی تاریخی اہمیت ہی رہ گئی ہے لیکن عشرت رحمانی اور واثق ٹونکی کے تنقیدی مضامین آج بھی لطف دیتے ہیں افسانے اور ناولٹ، کہانی کے ارتقا کی خاموش کہانی سناتے ہیں، ان کی یہ اہمیت آج بھی باقی ہے کل بھی باقی رہے گی۔ یہی صورت انشائیے کی ہے۔ نکات رموزی میں اردو تحریک کے بارے میں عصری صورت حال سامنے آتی ہے۔ نظموں غزلوں میں اس وقت کے عام شاعرانہ ماحول کا ایک مجموعی نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ **مکتوبات** شخص متعلقہ کے تذکرہ و سوانح میں کچھ مددگار ہو سکتے ہیں۔ **تذکرۂ مشاہیر** کی عصری اہمیت ہے جو باقی رہنے والی چیز ہے یہ اور بات ہے کہ اس میں آزاد، اقبال اور میمن کے معمولی حوالوں کے سوا کوئی اہم چیز اتفاق ہی سے ملے تو ملے۔ **تذکرہ رسائل** سے ادبی رسائل کی تاریخ مرتب کرنے میں سہولت رہے گی۔ اسی طرح **تذکرۂ کتب** بھی کبھی کارآمد ہو سکتا ہے خاص کر ان کتابوں کے سلسلے میں جن کی محض علاقائی اشاعت تھی۔ **متفرقات** میں جامعہ ملیہ کے لیے اپیل خصوصی طور سے توجہ طلب ہے جس میں ایک ہی پلیٹ فارم پر متعدد مشاہیر جمع ہو گئے ہیں! جامعہ کچھ چیز ہی ایسی تھی، جبھی تو ۱۹۴۶ء میں بھی جب اس کی جُبلی ہوئی تب بھی جناح اور جواہر لال اور لیاقت علی خاں سب کے سب جامعہ کے پرچم تلے جمع ہو گئے تھے۔

اخبار علمیہ اور **مترجمات** کے ذیل میں جو ماخوذ اطلاعات یا دوسرے پرچوں سے مفید مختصرات ترجمہ کر کے دیے جاتے تھے، ان کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ ان میں آج بھی تازگی ہے، اور افادیت باقی ہے۔

اکیس

اڑتالیس صفحات کا یہ ماہانہ رسالہ عبدالرحمٰن خوشتر منگرولی کی ادارت میں جولائی ۱۹۲۶ء میں نکلا اور جون ۱۹۲۸ء ار
ے آخری پرچے کے بعد بند ہوگیا۔ کاٹھیاواڑ کا یہ اکلوتا پرچہ ادبی رسائل کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل تو ہے ہی، لیکن محض
ریخ سے آگے کی بھی چیز ہے۔ اس کے مشتملات میں ایک اچھا خاصا حصہ ایسا بھی ہے جو آج بھی علم و نظر دونوں میں اضافہ کرسکتا
ہے۔ 'زبان' نے 'معارف' کو اپنا ماڈل بنایا تھا اس کے بالواسطہ طور سے کئی اشارے ملتے ہیں۔ خود فہرست مضامین میں مشتملات
کو جس طرح کے عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاتا تھا اس سے، اور پھر 'مترجمات' یا 'اخبار علمیہ' سے اور رسائل و کتب پر تبصروں
سے بھی اس ماڈل کی طرف معاً خیال جاتا تھا۔ ایڈیٹر کے بنیادی طور سے ایک ادیب اور شاعر ہونے کے باعث نظمیں، غزلیں
اور افسانے جس تناسب سے اس میں شامل رہتے تھے وہ البتہ 'معارف' کی روش سے ہٹی ہوئی چیز تھی۔ اس طرح یہ اپنی طرز کا ایک
الگ پرچہ تھا جس میں، جیسا کہ اس کے سرورق پر لکھا رہتا تھا، علمی اور ادبی دونوں اقسام کی تحریریں شامل رہتی تھیں۔

نظموں/غزلوں کے بارے میں تو ایسی کوئی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن افسانوں کے بارے میں گجرات کے حوالے سے بھی،
اور اس صنف کے عمومی ارتقا کے ذیل میں بھی 'زبان' میں چھپے ہوئے افسانوں (ناولٹوں) کی تاریخ ساز نوعیت ہمیشہ باقی رہے گی۔
اس ذیل میں ایک قلمی نام والے مصنف 'بالم' کا طویل افسانہ یا ناولٹ "شہید تغافل" خصوصاً قابل ذکر ہے جو کئی قسطوں میں مکمل ہوا۔
ہمارے استفسار پر خوشتر صاحب نے بتایا کہ افسانہ نویسی کے لیے یہ انھیں کا قلمی نام تھا۔
یہ ناولٹ یا اسی طرح کا ایک آدھ افسانہ، ایسے یا انشائیہ شامل اشاعت رہنے کے باوجود ایڈیٹر 'زبان' کو
'معارف' کا ہم رنگ قرار دیتے ہوئے یہ شکایت کرتے رہے کہ عوام 'معارف' کے ہم رنگ کسی رسالے کو نہیں چاہتے (اداریہ ۶۴،۷)
ادبی رسائل کی کساد بازاری کا رونا دوسرے ہمعصر مثلاً حکیم یوسف حسن بھی روتے رہے (۸،۱۴) 'زبان' نے ایک سال پورا کرکے
۱۴۴ خریدار پیدا کرلیے تھے (۷،۲۲)۔ ادبی علمی پرچوں کے لیے خرید کر پڑھنے والوں کی خوش اعتنائی کا یہ تناسب ۱۹۸۶ء میں
بھی قائم ہے الا ماشاءاللہ!

'زبان' کی ایک دلچسپ تجویز جو ساٹھ سال قبل شائع ہونے کے باوجود آج بھی آج کی سی چیز لگتی ہے وہ ایک
مضمون "فضول اور بیہودہ لٹریچر کی اشاعت" ہے جس میں کہا گیا ہے ایک "دارالانتقاد" قائم کرکے ایسے لٹریچر کی اشاعت
روکی جائے یا انجمن ترقی اردو، دارالمصنفین اور انجمن اردوئے معلّٰی علیگڑھ مل کر یہ کام کریں، اور ان کی سند کے بعد ہی کتاب شائع ہوسکے (۳،۹۹

'زبان' کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس نے گجرات/کاٹھیاواڑ کے لکھنے والوں کو خصوصیت کے ساتھ علم و ادب کے میدان میں

روشناس کرایا، ان میں کچھ جو پہلے سے روشناس تھے ان سے خصوصی تحریریں حاصل کیں (بڑودہ کے سید نواب علی، جوناگڑھ کے احمد میاں اختر، راج کوٹ کے میمن عبدالعزیز)۔ کاٹھیاواڑ / گجرات کے ایک درجن کے قریب شعرا و ادبا آج زبان ہی کے ذریعہ تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔ (غلام علی کامل، محمد عمر عباس، اکبر علی، صدیق مسلم، سلطان میاں سید عبداللہ، محمد صدیقی، حکیم سید فضل علی شفا، محمد حسن ترمذی، محمد علی ترمذی، محمد اسماعیل ایرانانی وغیرہ اور خود خوشتر منگرولی)۔

اہم بات یہ ہے کہ ایڈیٹر نے توازن برقرار رکھا اور بیرون کاٹھیاواڑ کے لکھنے والے بھی اس میں معقول تناسب کے ساتھ شریک رہے۔ اُس وقت کے کئی نئے نام عشرت رحمانی المحبوبی رامپوری (جو بعد میں عشرت رحمانی کے نام سے جانے گئے)، عرشی نعمانی رامپوری (جو بعد میں امتیاز علی عرشی کے نام سے غالبیات میں سند کا درجہ مانے گئے)، بھوپال کے ملا رموزی، احمد آباد میں مقیم ابوظفر ندوی، حیدر آباد کے رباعی گو احمد حسین امجد، شاعر شوکت تھانوی، افسانہ نگار رئیسی رامپوری، یہ سب بعد میں بڑے نام بنے۔ دوسری جگہوں کی ترجمانی بھی خاصی تھی مگر شاید منگرول کے خود ریاست ہونے کے سبب دوسری دیسی ریاستوں کے لکھنے والے اچھی خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں: خیر پور، حیدر آباد، بھوپال، رامپور، ٹونک، جے پور اور خود منگرول، پرچے پر چھائے رہے۔ تاہم معیار سے کہیں سمجھوتا نہیں کیا گیا ہے۔

—— عابد رضا بیدار ••

فہرست مضامین

فہرست مضامین

اٹھائیس

تیس



خوشتر منگرولی



خوشتر منگرولی

۱۹۲۶ء میں

ایڈیٹر 'زمان' کی حیثیت سے



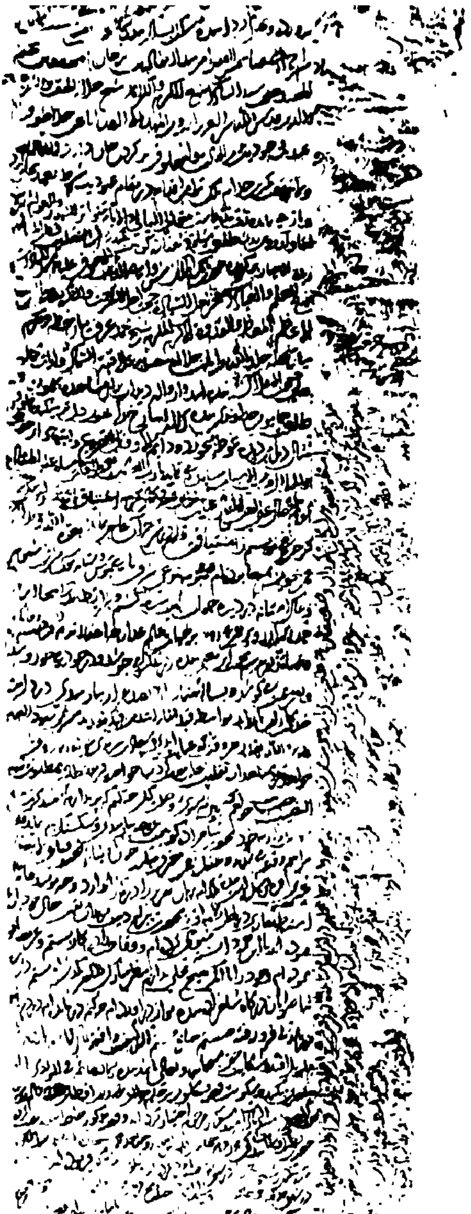
مولانا ابوالکلام صاحب آزاد دہلوی ایڈیٹر الہلال



عالیجناب شیخ عبدالخالق صاحب بہادر (المعروف لاسٹر نگری)

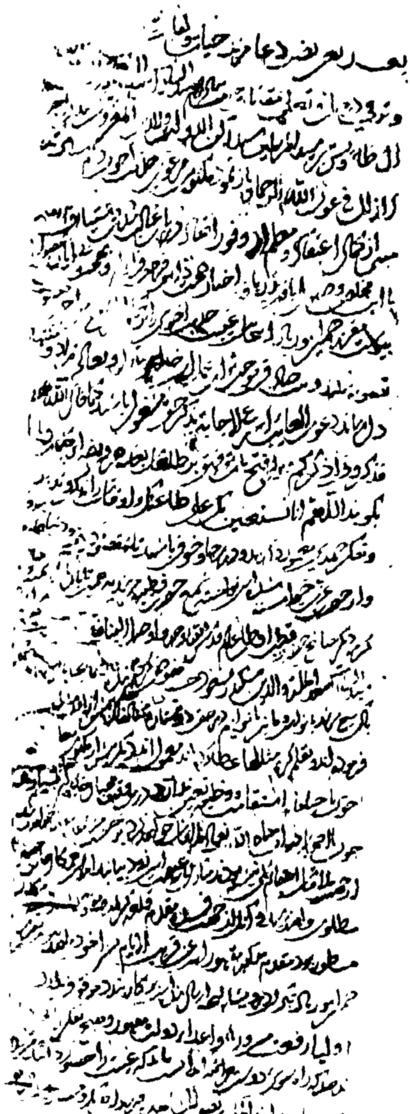


[illegible] محمد جہانگیر صاحب بہادر دام اقبالہٗ والئی ریاست منگرول



عکس تحریر حضرت سید رکن الدین صاحب

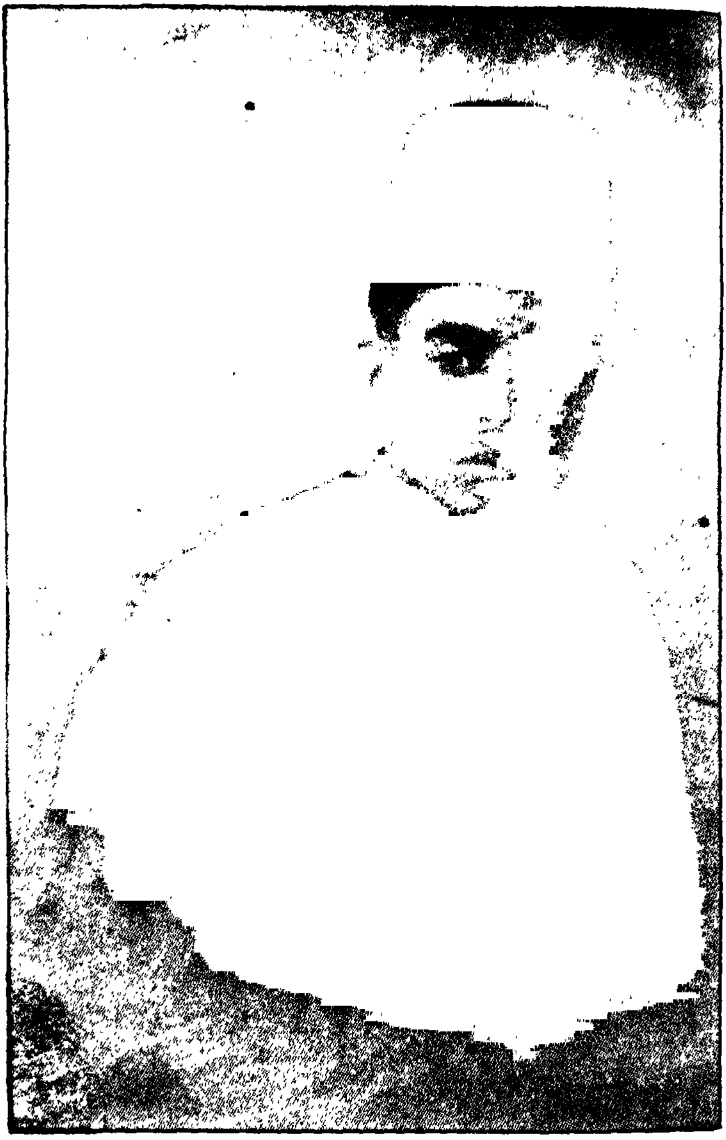
عرف سید راجو - رح -



جواب

عکس تحریر۔ حضرت شاہ عالم صاحب

قدس اللہ سرہ العزیز



جناب سید محی الدین صاحب زور قادری - ایم اے - (مصنف زح



اعلیٰ حضرت حکمران اعظم ہز ہائینس میر علی نواز خان بہادر
المعتصم بالله والی ریاست خیرپور (سندھ)



عالیجناب معلی القاب نواب غلام محی الدین خان صاحب دبیر
مالیر چیف آف مانا ودر

نمبر ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد وجدت مجال القول ذا سعۃ
فان وجدت لسانا قائلا فقل
(اعشیٰ)

زبان

کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

مرتبہ

عبدالرحمٰن خوشتر (منگرولی)

ششماہی (دو روپیہ) ۲؎

سالانہ (چار روپیہ) ۴؎

(نمونہ ۶؍)

زبان

سلد ا | فہرست مضامین ماہ جولائی ۱۹۲۶ء | نمبر ۱

	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
	صفحۂ ادارت	ایڈیٹر	۲
	افتتاحیہ	ایڈیٹر	۶
	مقالات		
	علم اور اسلام	مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اصلاحی [illegible]	۱۳
	فن تعلیم	محمد اسمٰعیل صاحب ابراہانی بی۔ اے جوناگڈھی	۱۴
۵	نوائے دگیر	مولانا سید نظام الدین شاہ صاحب دگیر اکبر آبادی	
		ایڈیٹر نقاد	۲۰
	مترجمات		
۶	سلطان محمود کی بہ تسمیہ سیگرڈ	قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی	۲۱
۷	لفظ مسیح کی اصلیت	ایضاً	۲۳
۸	جرمنی کی تعلیمی حالت	ایضاً	۲۴
۹	نظام تعلیم کی تجدید	ایضاً	۲۶
	ادبیات		
۱۰	شوالہ	محمد شفیع صاحب شفیع اکبر آبادی	۲۸
۱۱	ہستی معصوم	مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی	۳۳
۱۲	درس شہادت	مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی	۳۷

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۳	الفقر فخری	مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی	۳۹
۱۴	مسلک تسلیم	جناب محمود حسن صاحب محمود اسرائیلی	۴۰
۱۵	مشنری ہیں جو کبھی کبھی تجارت پیشہ ہوتے	پروفیسر نواب علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی بڑودہ کالج	۴۱
۱۶	سید القوم خادمہم	قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی	۴۲
۱۷	عقد بیوین	منشی غلام علی صاحب [illegible] جوناگڈھی	۴۳
۱۸	سلام	حکیم سید فضل علی صاحب مرحوم شفا بڑودوی	۴۴
۱۹	تاریخ اجراء رسالۂ زبان	قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی	۴۴
۲۰	غزلیات	ایڈیٹر و محمد یوسف صاحب ناظم لکھنوی	۴۵
	اخبار علمیہ		
۲۱	علمی اصطلاحات	قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی	۴۶
۲۲	باغ حیوانات	ایضاً	۴۷
۲۳	عرب میں سونے کے [illegible]	ایضاً	[illegible]
۲۴	شمال یورپ میں اسلامی سکے	ایضاً	[illegible]
۲۵	مستقبل کا اخبار	ایضاً	[illegible]
۲۶	اسلامی جذبۂ خودداری	ایضاً	[illegible]

صفحۂ ادارت

خلاق عالم نے جس ماہ میں (روز عاشورہ) عالم کون وفساد کو آفرینش کیا ہے، ہمارا رسالہ بھی اُسی ماہ سے عالم وجود میں آتا ہے، اس لئے اُمید ہے کہ آغاز ۱۳۴۵ھ کے ساتھ ساتھ اگر تاقیامت نہیں تو کم ازکم میری زندگی کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے بھی بھلے بُرے دن ضرور گذاردیگا بلکہ جب تک زبان دہن میں اور دل پہلو میں ہے یہ "**زبان**" جسم میں جان کی طرح میری حیات کا ایک جزو لاینفک ہو کر رہیگا۔

پندرہ بیس سال سے زاید عرصہ ہوا کہ ریاست جوناگڈھ نے ایک محکمۂ تاریخ قایم کیا تھا جس میں چند لایق اہل قلم جوناگڈھ کی تاریخ کے متعلق تحقیقات کر رہے تھے۔ ان اصحاب میں سے جناب منشی غلام محمد صاحب مرحوم (ساکن دلپاڈ گجرات) اعلیٰ تاریخی مذاق رکھنے والے اور مستثنیٰ قابلیت کے بزرگ وار تھے، انھوں نے آج سے بارہ سال قبل داعی اجل کو لبیک کہا اپنی حین حیات میں ریاست جوناگڈھ کی ایک ضخیم تاریخ بنام "مرآۃ مصطفیٰ آباد" مرتب کر چکے تھے جو ان کی وفات کے زمانہ سے لیکر اب تک غیر مطبوع حالت میں پڑی ہوئی تھی کتاب مذکور ملک سورٹھ کی مستند تاریخ ہے جس کے ضمن میں کاٹھیاواڑ کی تاریخ و جغرافیہ سے متعلق نادر تحقیقات کا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے۔[1]

ہمیں یہ سنکر بڑی مسرت ہوئی کہ مرحوم کے خلف الرشید شیخ غلام احمد صاحب (پرنسپل وکٹوریہ جوبلی مدرسہ پوربندر) کی تحریک سے ریاست جوناگڈھ نے اپنے خرچ سے اس کتاب کی اشاعت منظور فرمائی ہے جو بمبئی میں اعلیٰ پیمانہ پر طبع ہو رہی ہے اور عنقریب حلیۂ طبع سے آراستہ ہو کر نکلے گی۔

آجکل بعض ریاستیں ملک وقوم کی جو قابل تقلید خدمات انجام دے رہی ہیں اس بنا پر ہمیں ریاست جوناگڈھ سے جو ایک زبردست اسلامی ریاست ہے بہت کچھ توقعات رکھنی چاہیئے، اگر وہ سردست اپنے دفاتر کی زبان اُردو

---

[1] اس کے علاوہ مرآۃ محمدی (اردو) (۲) تاریخ گجرات (انگریزی) اور مرآۃ عالمگیری (گجراتی) چھپ چکی ہیں۔ جو مولوی غلام رسول اینڈ سنز تاجران کتب بھنڈی بازار بمبئی یا خلافت پریس ڈونگرے بمبئی سے مل سکتی ہے۔

سکتی تو کم از ایک دار التراجم یا دار التصانیف ہی کی بنیاد ڈال دے جس میں غیر زبانوں کی بہترین اور نادر تصانیف
ں ترجمہ کی جائیں اور ایسی کار آمد کتابیں چھپوائی جائیں جس سے ملک و قوم کو فائدہ ہو۔

یقین ہے کہ شہر یار سورٹھ عالی جناب نواب مہابت خانجی صاحب بہادر جہاں اور صدہا کاموں میں اپنی
ں و دریا دلی کا ثبوت دے رہے ہیں وہاں ہماری اس درخواست پر بھی توجہ فرمائیں گے۔ ساتھ
عالیجناب شیخ محمد بہائی صاحب وزیر ریاست سے بھی جو ایک پابند صوم و صلوٰۃ پکے مسلمان ہیں توقع ہے
بھی ایسے کارہائے نمایاں سے اپنی علم پروری اور ملکی و قومی ہمدردی کا ثبوت دیں گے۔

ہماری غفلت اور خود فراموشی اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ ہم اپنے ہاں کے کسی جوہر قابل کی قدر و قیمت
ے اس وقت تک بیخبر رہتے ہیں جب تک "باہر والے" اس کے نتائج دل و دماغ سے ہمیں آگاہ نہ کریں۔

کاٹھیاواڑ کے صدر مقام راجکوٹ کی خاک نے ایک ایسا باکمال عربی علم و ادب کا عالم پیدا کیا ہے جو اپنی
بی تحقیقات کے لحاظ سے اس وقت ہندوستان بلکہ ممالک اسلامیہ کے معدودے چند افراد میں شمار ہو سکتا
ہے۔ ہماری مراد اپنے محترم جناب مولانا مولوی میمن عبد العزیز صاحب سے ہے جو آجکل مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
میں عربی کے پروفیسر ہیں۔

ہمارے اس لائق "عزیز کاٹھیاواڑ" کا چرچا مصر کے بازار علم میں ہو رہا ہے چنانچہ وقتاً فوقتاً مصر کا مشہور
علمی رسالہ الزہرا ان کے مقالات شائع کرتا اور ان کے نتائج افکار سے ہمیں مطلع کرتا رہتا ہے۔

رمضان کے مجلہ الزاہرا میں ایڈیٹر صاحب محب الدین خطیب اطلاع دیتے ہیں کہ مولانائے موصوف
کی مندرجہ ذیل کتابیں ان کے مطبع سلفیہ میں زیر طبع ہیں۔

(۱) ابو العلاء وما الیہ (ابو العلاء المعری کے تنقیدی سوانح)

(۲) الغایت (معری کا وہ غیر مطبوعہ کلام جو اس کے دواوین میں نہیں پایا جاتا)

(۳) زیادات شعر المتنبی (متنبی کا غیر مطبوعہ کلام)

کتب ذیل ان کی تصحیح کے ساتھ چھپ رہی ہیں:۔

(۱) رسالہ "کلا" لابن فارس

(۲) ما تلحن فیہ العلوم للکسائی

(۳) رسالۂ ابن العربی الی الامام فخر الدین رازی

ہم علامہ موصوف کو ان کی ان ادبی فتوحات پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے بحیثیت ہموطن ہونے کے ان سے استدعا کرنے کا پورا استحقاق رکھتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کے ذریعہ اپنی علمی معلومات سے اپنے ہموطنوں کو بھی مستفید ہوتے رہیں تاکہ "نزدیکان بے بصر دور" کی طرح ان کے نتائج طبع سے محروم نہ رہیں۔

دوسری قابل فخر ہستی جس کو کوہ گرنار کی پر انقلاب تلہٹی نے پیدا کرکے کوہ سے بھی بلند آسمان علم و کمال پر مثل کوکب چمکایا وہ ہمارے دوست قاضی احمد میاں صاحب اختر (جوناگڑھی) ہیں جو دنیائے ادب میں خاص شہرت رکھتے ہیں اور جن کے نتائج افکار سے ہندوستان کے نامی اور چوٹی کے رسائل مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔

آپ ساعد اندلسی کی کتاب "طبقات الامم" کا اردو میں ترجمہ کر رہے تھے جو اب تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور عنقریب دارالمصنفین اعظم گڈھ کے سلسلہ تصانیف میں شائع ہوگا آپ کو اس ترجمہ میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ب میں جا بجا نہایت مفید اور پر از معلومات ذیلی حواشی بھی دیئے ہیں جن کے لئے ان کو متعدد مستند عربی کی ورق گردانی کرنی پڑی ہے اس ترجمہ کو اردو کے خزانہ میں ایک گراں بہا اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

* * * * * * * * *

ناانصافی ہوگی اگر ہم قاضی صاحب موصوف کی ان مساعی جمیلہ کا اعتراف نہ کریں جو انہوں نے ترتیب زبان خلق معقول مشورہ اور مضامین کی فراہمی وغیرہ میں کی ہیں ترجمات اور اخبار علمیہ کے عنوانات آپ نے اپنے مخصوص کر لئے ہیں اور بلا ناغہ ہر ماہ مستقل طور پر اس پر لکھنے کا ہم سے وعدہ فرمایا ہے یا یوں سمجھئے کہ جو کام مااس کا ذمہ لیکر ہمیں ایک زبردست ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے۔

بیجا نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں منگرول کی دو زبردست خاموش ہستیوں کا ذکر بھی کر دیا جائے ان میں سے ایک استاذی مولانا مولوی حکیم سید محمد حسن صاحب ترمذی ہیں جن کے علمی و ادبی مضامین آج سے دس ما پیشتر علمی رسائل میں نکلتے رہتے تھے نیز عربی کا ایک قلمی نسخہ اسباغ زایا (حصہ اول) جو کیمیا دی مو ت پر مشتمل ہے عرصہ ہوا پبلک کے فائدہ کے لئے اردو میں ترجمہ کرکے چھپوا دیا ہے۔

آپ عربی وفارسی علم وادب کے جید عالم ہیں عرصہ سے مضامین لکھنا چھوڑ دیا ہے تاہم "زبان" کے
مضمون عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے جس کے لئے ہم آپ کے بیحد ممنون ہیں۔

دوسری ہستی جناب سید محمد علی صاحب ترمذی پروفیسر بہاء الدین کالج جوناگڈھ کی ہے جن میں مبدء
ن نے استدلال وتحقیق کی اعلیٰ قابلیت ودیعت فرمائی ہے عربی فارسی میں بھی کامل دستگاہ ہے
بصف اس کے اتبک خاموش اور علمی دنیا سے الگ ہیں لیکن یقین ہے کہ وہ "زبان" کے لئے "قفل خموشی"
ڑدیں گے اور علمی دنیا کو اپنی وسیع معلومات سے مستفیض فرمائیں گے۔

رسالہ مرتب ہوکر مطبع میں جارہا تھا کہ ہمنے یہ نوید روح پرور سُنی کہ ہمارے اور "زبان" کے سب بڑے محسن
مادن جوان بخت وفیض رساں عالیجناب نواب محمد سرور علیخاں صاحب بہادر والئی ریاست کوروائی (سنٹرل انڈیا)
ل شادی کتخدائی دار الاقبال بھوپال کے موجودہ نوجوان فرمانروا ابد اقبال نواب محمد حمید اللہ خانصاحب دام
اقبالہٗ کی بڑی صاحبزادی صاحبہ سے بغیر کسی دھوم دھام کے حسب شرع شریف ہوگئی۔
ہمارے مسلمان رؤسا عموماً ایسی تقاریب کے موقعوں پر ناچ گانے اور فضول رسومات کی ادائیگی میں
کروڑوں روپئے برباد کرکے مقروض ہوجاتے ہیں انہیں اس کی تقلید کرنی چاہئے۔
اب ہم اپنے کرم گستر وکرمفرما نواب صاحب بہادر کی خدمت میں (دوہری) دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے
دست بدعا ہیں کہ خدائے "حسن وعشق" اس "پیکر محبت ومجسمہ اخلاص کو حیات جاوید عطا فرمائے اور ان میں باہمی
محبت واخلاص رہے۔ آمین!

"ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد"

یہ بھی ہمارے رسالہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس کا پہلا ہی نمبر اس تقریب سعید کی یادگار میں زیور طبع سے
آراستہ ہوکر دنیائے صحافت میں رونما ہوتا ہے۔

اڈیٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

زبان

ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

افتتاحیہ

زلافِ حمد و نعت اولیٰ ست بر خاکِ ادب خفتن
سجود میتواں کردن درود میتواں کردن

الحمد للہ کہ برسوں سے جو "خیالی معشوق" صرف دل و دماغ کے لئے، وجہ نشاط بنا ہوا تھا آج "دکا عا پیکر" میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر نہ صرف باصرہ نوازہی ہو رہا ہے بلکہ اپنی "حیات عملی" کا ثبوت بھی دے ر اگرچہ اس کی "جلوہ گاہ" ایک پُرشور مقام پر واقع ہوئی ہے لیکن اس کی یہ شوریت "نمک پاش" نہیں، "حسن" کو "حسن ملیح" بنانے والی ہے۔

آج رسالہ "زبان" کا اجرا، جہاں سے عمل میں آرہا ہے یہ وہ مقام ہے جس کو حضرت داغ دہلوی حضرت جلال لکھنوی حضرت تسلیم لکھنوی اور حضرت شمشاد لکھنوی فرنگی محلی وغیرہما ایسی مستند، اہل زبان، ا فخر روزگار ہستیوں نے اور دیگر نامی نامی فضلاء و کملاء نے گاہ گاہ اپنے قدوم فیض لزوم سے رشک گلزار

ے ایک عرصہ تک اہل منگرول مستفیض ہوتے رہے ہیں، اس لحاظ سے یہاں سے اُردو کے ایک ماہوار رسالہ
ی طرح بھی غیر موزوں نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ع

"آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند"

لیکن اب بھی یہاں ایک ایسی ہستی ہے جو کاٹھیاواڑ میں مغتنمات میں سے ہے اور جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں
ہمارے تاجدار منگرول عالی جناب نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب دام اقبالہٗ ہیں جن کو نہ صرف اُردو اور اس کے
سے گہری دلچسپی ہے بلکہ اُردو کے سچے حامی و معاون ہیں اسی طرح آپ کے خلف اکبر عالی جناب شیخ عبدالخالق صاحب
ولیعہد ریاست منگرول کو بھی اُردو سے ایک گونہ عشق ہے بدیں سبب یہاں نسبتاً اُردو کا زیادہ چرچا ہے تاہم ایک
بان" کے اُردو رسالہ کو کسی ایسے مقام سے شائع ہونا چاہئے تھا جو حقیقتاً "زبان اردو کا" مرکز و مسکن ہے۔ یا
کا اجرا دہیں سے مناسب ہو سکتا تھا جہاں سے اس (زبان اُردو) نے "اردوئے معلیٰ" اور "اُردوئے مطلا"
واجبی و حقیقی خطابات حاصل کئے اسی طرح عنان ادارت بھی انہیں کے ہاتھ میں ہونی چاہئے تھی جو "اہل زبان
ندان" ہونے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

برخلاف اس کے میں کاٹھیاواڑی نژاد ہوں اور زبان ایک ایسے گوشے سے اپنی آواز بلند کر رہی جہاں
ے یقینی یاس" ہے کہ اس کا "ہمنوا" اور "ہمزبان" اور اس کی صدا پر "لبیک" کہنے والا ایک بھی نہ نکلے گا۔
مقام (کاٹھیاواڑ) کی غیر موزونیت اور زمین کی شوریت کے علاوہ "اُردو سے بیگانہ وشی" اور "فقدان مذاق"
وایسی چیزیں ہیں کہ زبان تو کیا کسی ہونہار رسالہ کو کبھی پھولنے پھلنے اور پروان چڑھنے نہ دیں۔

جہاں اس قسم کے سیکڑوں ہلاکت آفریں اسباب اس کی زندگی خطرے میں ڈالنے والے ہیں وہاں ایک زبردست
سبب یہ بھی ہے کہ یہاں عوام کی زبان گجراتی اور بعض مسلمانوں کی "گجراتی آمیز اُردو" ہے، غالباً یہ کہنا غیر صحیح نہ ہوگا
کہ یہاں اُردو اور اس کے لٹریچر سے کسی کو (باستثنائے چند) مس تک نہیں ہے۔

"ہر قوم کے حالات و خیالات طرز تمدن و معاشرت کا آئینہ یا مکمل تاریخ اس کی زبان کا لٹریچر سمجھا جاتا ہے" دُ
کے کسی خطہ میں کوئی ایسی متمدن قوم نہیں ہے جس کو اپنی مذہبی، علمی، اور تاریخی روایات سے واقفیت حاصل کرنے
لئے کلیتہً "زبان غیر" کا محتاج ہونا پڑتا ہو، لیکن ہم اہل کاٹھیاواڑ اس کی "زندہ مثال" موجود ہیں جو نہ صرف
اپنے مذہب و تاریخ ہی سے کما حقہٗ واقف نہیں بلکہ اپنی مادری زبان (اُردو) سے بھی نا آشنائے
محض ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں کی ملکی دفتری اور تجارتی زبان گجراتی ہے اور اس کی تعلیم بچوں کے لئے ازبس
ردی ہے لیکن اُردو اسقدر بھی غیر ضروری نہیں ہے جسقدر سمجھی جاتی ہے بلکہ اب تو اس فقدان علم (فارسی و عربی)
زمانہ میں ہر مسلمان کو اُردو کا جاننا نہایت ضروری اور فرض ہے کیونکہ ہمارے اسلاف کے بیشتر علمی کارنامہ اُردو
منتقل ہوگئے ہیں اور روز بروز ہوتے جاتے ہیں کسقدر افسوس ہے کہ ہم اُردو اور دینی تعلیم کو صرف اُنہیں لوگوں
، لئے مخصوص سمجھتے ہیں جن کا خاندان مولوی قاضی، اور ملا ہوتا ہے اور جو وعظ و قضارت یا امامت کرکے
تب قایم کرکے اپنی گذر اوقات کرتے ہیں۔

اوّل تو یہاں کے مدارس کی اُردو تعلیم ہی ایسی ضعیف و ناکارہ ہوتی ہے کہ طلبا مدرسہ چھوڑتے وقت
کو بھی وہیں چھوڑ جاتے ہیں اور اگر اتفاق سے کسی بچہ کا اُردو کی طرف فطری میلان ہوتا ہے اور وہ اُس کو شوق
پڑھتا ہے تو اکثر والدین یہ کہہ کر کہ "کیا اُردو پڑھ کر مُلّا بننا ہے"۱ بلکہ مُلّا جی (اُستاد) سے بھی یہ کہہ کر کہ ہمارے بچہ
اُردو پڑھا پڑھا کر کیا اپنی طرح مُلّا بناؤ گے اور کھانے کمانے کے قابل نہ رہو گے" بچہ کو اُردو پڑھنے پڑھانے کی
ب سے بددل کردیتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اگر کسی کی زبان سے دانستہ یا اتفاقیہ کوئی صحیح لفظ ادا ہو جاتا ہے تو "بڑا ہندوستانی
ا ہے"، یا "ہندوستان اسی (آداب گفتگو) میں کھویا"، وغیرہ وغیرہ طعن آمیز فقروں سے اس کو شرمندہ
یندہ اُردو بولنے سے مانع آتے ہیں۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ جہاں کا یہ ماحول اور یہ "بدمذاقی" ہے وہاں کب اور کس طرح اُردو اور تہذیب کو
ا حاصل ہوگا؟

اُردو سے اسقدر بیگانہ وشی دیکھتے ہوئے اور ان تمام مایوس کن اسباب کے باوجود میں "اسی پر سوز اور
لی" سرزمین سے ایک اُردو رسالہ کو معرض وجود میں لارہا ہوں کن اسباب کی بنا پر؟ محض اپنے بعض
یا احباب کی حوصلہ افزا امراعات کی امید پر اور ابنائے ملک کی قدر دانی کے بھروسے پر! اگر ابنائے ملک نے
اس "ادنیٰ سعی" کی حوصلہ افزا داد دی تو انشاءاللہ بہت جلد میں اپنے اُن عزایم میں جن کا ذکر آگے
کامیاب ہو جاؤنگا اور "ہجوم ناامیدی" میری اس "سعی لاحاصل" کی لذت کو خاک میں نہ ملا سکیگی!

ا کے معنی نہایت حقیر سلئے جاتے ہیں حالانکہ مُلّا بننا کارے دارد ہے -۲

(اڈیٹر)

اشندگانِ جزیرہ نماے کاٹھیاواڑ اقتصادی ومالی حیثیت سے خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرگئے ہوں لیکن
نت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تہذیب وتمدن میں علی الخصوص علم وفضل میں توسب سے پیچھے ہیں۔

نمبر۱ کاٹھیاواڑ کا کل رقبہ زمین ۲۰۷۷۹ مربع میل ہے
نمبر۲ کاٹھیاواڑ کی کل آبادی (ہندو مسلمان اور جین وغیرہ) /۲۵،۳۸،۲۹۷
نمبر۳ کاٹھیاواڑ میں مسلمانوں (ذکور) کی آبادی /۱،۷۱،۱۰۲
نمبر۴ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان (ذکور) /۱۴،۰۴۵ اور (اناث) /۳۶۸۲
نمبر۵ انگریزی داں (ذکور) /۱۹۳۱ اور (اناث) صرف ۵۹
نمبر۶ غیر تعلیمیافتہ ذکور /۷۷،۷۰،۱،۹۱ - اور اناث /۱۶۷۷۸۰
نمبر۷ اور گجراتی بولنے والے /۲۳۹۲۷۹۴ ہیں

یہی وجہ ہے کہ یہاں سے گجراتی زبان میں اخبارات ورسائل بکثرت شائع ہوتے ہیں اور اردو کا ایک بھی
سالہ یا اخبار نہیں نکلتا۔

ان حالات کے ماتحت میں برسوں سے اس ضرورت کو محسوس کرتا تھا کہ کاٹھیاواڑ سے کسی ایسے اردو اخبار
سالہ کا اجرا کیا جائے جو ہمارے خیالات وجذبات کی صحیح ترجمانی کرنے والا ہو اور جس کا واحد مقصد ملک میں
ں اردو کا مذاق عام کرنا اور صحیح اردو کو رواج دینا ہو اور جو نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں ملک کو خواب
لت سے بیدار کرے قومی ضروریات سے آگاہ اور مذہبی احکامات سے خبردار کرے اور جو تاریخی روایات
ے واقف اور تمدنی واقتصادی نقائص کی طرف توجہ دلائے لیکن یا تو ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا ابھی
ں وقت نہیں آیا تھا یا کوئی صورت نہیں نکلتی تھی بہرکیف اب جبکہ اسکا وقت آگیا بجائے اس کے کہ مجھے خوش
ونا چاہئے میں اپنے تئیں "ملول وغمگین" پاتا ہوں! کیونکہ جو مطمع نظر میرا ہے وہ بہت ارفع واعلیٰ ہے چنانچہ

نمبر ۱. Kathiawar Directory part IV vol. I P. 96.
نمبر ۲ Census of India 1921 vol. VIII part II P. 4
نمبر ۳ 11 P. ,, ,, ,, ,, ,, ,, ,, ,,
نمبر ۴،۵و۶ 113 P. ,, ,, ,, ,, ,, ,, ,, ,,
نمبر ۷ 126 P. ,, ,, ,, ,, ,, ,, ,,

شاعت اُردو کی غرض سے طلبہ اور ایسے متوسط الحال طبقہ کے افراد میں جن کو اُردو سے دلچسپی ہے رسالہ کی مفت
یاں تقسیم کی جائیں، چھوٹے چھوٹے اخلاقی اور سبق آموز فسانے اور مذہبی رسالے پمفلٹ کی صورت میں عام طور پر مفت
تقسیم کرکے ملک میں اُردو کا مذاق عام کرنے کی کوشش کی جائے اس میں سے ایک خدمت بھی میں تنہا نہیں
ا کرسکتا۔

اس کے لئے ایک مستقل سرمایہ کی ضرورت ہے اور اگر ملک کے چند سربرآوردہ افراد اس طرف توجہ
مبذول فرمائیں تو کوئی بڑی بات بھی نہیں ہے صرف پانچ چھ ہزار روپے سالانہ کافی ہوسکتے ہیں۔
اس لئے ملک کے ان سربرآوردہ حضرات کی خدمت میں بصد ادب التماس ہے کہ وہ ابنائے ملک
کی بہبودی کی خاطر اس طرف ضرور توجہ فرمائیں اور اُردو تعلیم کے لئے بھی نہایت شد و مد سے سعی اور
یک مشترکہ سرمایہ سے غربا کو مفت اُردو تعلیم دلانے کا شعبہ قایم کریں اور اسی سرمایہ سے اُردو کی
شاعت بھی کی جائے۔

بحالت موجودہ جبکہ میں اپنے قلیل ذاتی سرمایہ سے بلا کسی خیال منفعت کے اسکا محرک ہوا ہوں اگر
"زبان" میں اغراض بالا کی تخصیص و رعایت کو مدنظر رکھوں تو رسالہ کی زندگی معلوم۔ اول تو ملک میں اتنے
اُردو پڑھنے والے ہی نہیں ہیں کہ رسالہ ان کی خریداری سے اپنے بار کا آپ متحمل ہوسکے اور اگر کچھ ہیں
بھی تو ان میں بیشتر مفلوک الحال اور ایسے غریب ہیں کہ اپنی قلیل آمدنی سے رسالہ کو نہیں خرید سکتے ان حالات
کی بنا پر مجھے اپنے رسالہ کے اغراض و مقاصد میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔
زبان اہل کاٹھیاواڑ ہی کے لئے محدود نہیں اس سے وہ تمام اُردو داں حضرات خواہ مشرقی ہند کے
ہوں یا جنوبی ہند کے بے دریغ متمتع ہوسکتے ہیں ہاں کاٹھیاواڑی نژاد ہونے کے لحاظ سے گاہے گاہے
وطن کی خدمات سے اغماض نہ کرونگا۔
دستور عام کے مطابق ہر ایڈیٹر اپنے رسالہ کے پہلے نمبر میں افتتاحیہ مضمون کے ذیل میں رسالہ کے
اغراض و مقاصد کی تشریح کردینا اپنا فرض اولین سمجھتا ہے لہٰذا میں بھی اس "بدعت حسنہ" کا ادا
کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔
اکثر رسائل اپنے افتتاحیہ میں لمبے چوڑے دعاوی لیکر عالم وجود میں آتے ہیں اور لوگوں کو اپنی
طفلانہ اداؤں سے لبھانے کی سعی کرتے ہیں مگر زبان اس قسم کی خوشامدوں سے بے نیاز ہے اور ہمیشہ

بے نیاز رہے گا۔

"زبان" کی خدمات کی ذمہ داری کا بار لیکر آیا ہے وہ اس کے آیندہ اوراق خود بتا دیں گے زبان کا دعویٰ نہیں ہے لیکن وہ کوشش کریگا کہ ہندوستان کے اعلیٰ رسائل میں اسکا شمار ہو۔ ہم اگر زبان کو عامیانہ خیالات کی جولانگاہ بنانا نہیں چاہتا تو اپنے بعض کرمفرما احباب کے مشورہ کے مطابق خالص علمی (جس میں ادبیات کی چاشنی نام کو نہو) بنا کر بالکل خشک اور ٹھوس بھی بنانا نہیں چاہتا البتہ ایسے ادبی مضامین سے جن میں صرف پرشکوہ اور شاندار الفاظ ہی الفاظ ہوتے ہیں اور جو معانی و مطالب سے معرا ہوتے ہیں اور جن میں غلط اور غیر مانوس ترکیبیں "لایعنی جملے" اور عریاں خیالات ہوتے ہیں زبان کو آلودہ نہ ہونے دونگا مگر اس کو "قبول عام" کا شرف دینے کے لئے ان تمام دلچسپیوں کا خیال رکھا جائیگا جس کا جواز اہل نقاب اہل علم نے دے رکھا ہے اس میں (۱) مقالات (۲) مترجمات (۳) ادبیات (۴) اخبار علمیہ اور (۵) تنقید و تبصرہ کے مستقل عنوانات ہوا کریں گے جن کی ضمن میں (۱) علوم و فنون کے متعلق ہر قسم کے مضامین ہوں گے۔ (۲) عربی انگریزی اور گجراتی کے اعلیٰ خیالات اردو میں منتقل کئے جائیں گے (۳) بہترین شاعرانہ خیالات "شعر منثور" اور مختصر اخلاقی و سبق آموز فسانے۔ اور اخلاقی و نیچرل نظمیں اور تازہ غزلیات ہوا کریں گی (۴) جدید علمی خبریں ہونگی اور حیرت انگیز سائنس کے اختراعات سے آگاہ کیا جائیگا (۵) مطبوعات جدیدہ پر ناقدانہ اور منصفانہ رائے کا اظہار کیا جائیگا۔

المجدان
عبدالرحمٰن خوشتر (منگرولی)
ایڈیٹر رسالہ "زبان"

اعلان

جن حضرات کی خدمت میں رسالہ زبان نمونتًا حاضر ہوا ہے وہ اپنی آیندہ خریداری و عدم خریداری کی اطلاع دفتر زبان میں اگست کی ۱۰ تاریخ تک روانہ فرمادیں ورنہ دوسرا نمبر قیمتًا وی۔ پی سے حاضر ہوگا وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہے۔

(منیجر)

مقالات

علم اور اسلام

از

پروفیسر موسیو رینان

(مترجمہ مولانا مولوی محمد اسمعیل صاحب اصلاحی "اعظمگڈہی)

ذیل کا گرانبہا مضمون مع ایک مختصر نوٹ کے ہم کو اپنے کرمفرما دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈہی کی وساطت سے ملا ہے جس کو شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے اُمید کرتے ہیں کہ قاضی صاحب موصوف حسب وعدہ بہت جلد اس کی دوسری شق بھی روانہ فرما کر مشکور فرمائینگے

(اڈیٹر

" فرانس کے مشہور فلسفی اور ماہر السنہ سیاطیقی موسیو رینان نے "اسلام اور علم" کے نام سے ایک لکچر پیرس کی سربون یونیورسٹی کے سامنے دیا تھا جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ "اسلام اور علم دو متضاد چیزیں ہیں" جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اسکا اُردو میں ترجمہ نہیں ہوا اور نہ اس کا جواب سوائے علامہ جمال الدین افغانی کے کسی نے دیا ہے۔ مصر کے ایک عالم یوسف علی ھندس نے رینان کے اس لکچر کا عربی میں ترجمہ کیا ہے جس کے شروع میں رینان کی مختصر سوانح عمری اور آخر میں بعنوانے "الحدید یفلح بالحدید" اس کے ہم مذہب ہمقوم، اور ہموطن موسیو سمر کے جواب کا بھی ترجمہ کرکے شامل کردیا ہے جو اس نے اصل فرانسیسی میں لکھا ہے۔ میری استدعا پر میرے دوست مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے اس کا ترجمہ کرنا شروع

کیا تھا لیکن ابھی وہ رینان کے سوانح اور لکچری کا ترجمہ کرنے پائے تھے کہ بعض ضروری کاموں کی وجہ سے اپنے وطن تشریف لے گئے۔ اب میں موسیو مسمر کے جواب کا ترجمہ کر رہا ہوں جو انشا اللہ آیندہ کسی اشاعت میں ہدیہ ناظرین ہوگا۔

اختر (جوناگڈہی)

پیدایش ۲۷ رفروری ۱۸۲۳ء کو شہر ٹریگویر ([illegible]) خاندان رینان میر متوسط الحال والدین کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچہ کی عمر ابھی پانچ برس کی بھی نہ پائی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور باپ نے ہنریٹ نامی ایک سترہ سالہ بہن کے سوا کوئی چیز لیا کے نہ چھوڑی۔

اسی بچہ کا نام ارنسٹ ہے جو آگے چلکر فرانس بلکہ یورپ کے معدودے چند مشاہیر علما ر... کیا گیا۔

تعلیم ارنسٹ کے لئے اکلیروس کے گرجا کے مدارس تمی کے علاوہ جو اس کے شہر میں جا تعلیم کی کوئی صورت نہ تھی چنانچہ پندرہ سال کی عمر میں اس نے ٹریگویر ([illegible] کے تمام خیراتی مدارس کی تعلیم ختم کرلی جس کے بعد وہ کلیۃ القدیس نقولہ میں داخل ہوگیا یہاں رینان کو آ (کائنات) ان کی ماہیت اور ان کے علل واسباب پر غور وفکر کرنیکا خیال پیدا ہوا اور اس نے کلمات سحر ابتدا کی جس کے ساتھ ہمارے علما اور فلاسفہ کو قدیم عشق ہے۔

فلسفہ کی تحصیل ۱۸۴۰ء میں مدرسہ آیسی ([illegible]) میں داخل ہوا۔ جہاں ا اور مالبرانچ کا فلسفہ پڑہنا شروع کیا پھر حکما رجرمنی مثلاً ہیگل اکانٹ اور فلسفہ کی تحصیل کی۔ اس زمانہ میں وہ اپنی بہن کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ :-

”فلسفہ حقایق اشیا پر بحث وتحیص کے لئے انسانی قوتوں کو ابھارتا ہے لیکن یہ ابھی صرف نصف صدی سے مروج ہے اور میری تمام توجہ علوم ریاضیات پر مرکوز ہے“

لیکن ہمارے اس نوجوان فلسفی نے اپنے شکوک کا حل ریاضیات میں نہیں بلکہ علم اللغات میر دوسان سولبیس کالج میں داخل ہوگیا۔ جو علم الالسنہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے مشہور ہے وہاں وہ ملک ق زبان یعنی عبرانی کی تحصیل میں مصروف ہوگیا اب رینان پوری ذہانت کے ساتھ مذہبی کتب کی حقیقت اور

پر غور و فکر کرنے لگا اور اس میں اسے علوم الیقینات یعنی منطق اور ریاضیات سے بڑی مدد ملی اس نے دیکھا کہ سفر نامہ اشعیار ([illegible]) کا دوسرا حصہ نہ صرف اسلوب بیان اور زبان کے لحاظ سے بلکہ تاریخی حیثیت بھی مختلف ہے اور سفر دانیال تو محض ایک قصہ گو کی حیثیت رکھتا ہے جو قدیم اور موضوع ہے۔

رینان کے نزدیک آسمانی کتب کا معیار صداقت یہ ہے کہ "کسی آسمانی اور الہامی کتاب میں اگر ایک غلطی بھی تسلیم کرلی جائے تو اس کے پورے حصہ پر فاسد کا حکم لگایا جائیگا"

مذہب اور فلسفہ کا موازنہ

فلسفہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد سان سولبیس کالج میں رینان ہمیشہ مذہب اور فلسفہ پر بحث کیا کرتا اور دونوں کا آپس میں موازنہ بھی کرتا تھا اور اسی زمانہ میں اس نے ابو العلا معری فلسفی کے اس خیال کی تردید کی:

کَمْ اُمَّۃٍ لَعِبَتْ بِھَا جُھَّالُھَا ــــ فَتَنَطَّعَتْ مِنْ قَبْلُ فِی تَعْذِیْبِھَا

کتنی امتیں (مذاہب) تھیں کہ انکے جاہل (امتوں) نے ان کو بازیچہ بنایا! ــــ اور پہلے ہی سے ان کے عذاب کی جستجو میں پڑ گئے

اَلْخَوْفُ یُلْجِئُھَا اِلٰی تَصْدِیْقِھَا ــــ وَالعَقْلُ یَحْمِلُھَا عَلٰی تَکْذِیْبِھَا

خوف ان (مذاہب) کی تصدیق پر مجبور کرتا ہے ــــ اور عقل ان کی تکذیب پر آمادہ کرتی ہے

وَجِبِلَّۃُ النَّاسِ الفَسَادُ فَظَلَّ مَنْ ــــ یَسْمُو بِحِکْمَتِہٖ اِلٰی تَھْذِیْبِھَا

انسانوں کی سرشت ہی میں فساد ہے پس وہ شخص محفوظ ہے جو ــــ اپنی عقلمندی سے (فطرت انسانی) کی تہذیب کی طرف متوجہ ہوا

جب اس کے خیالات کی اشاعت ہونے لگی تو اسے اکلیروس (گرجا) والوں کے ہاتھوں مطمئن ہو کر مسائل پر بحث کرنے کا موقع نہ ملتا تھا اس لئے وہ سان سولبیس کالج کو خیرباد کہہ کر استانسلس کالج میں آگیا۔ جہاں اسے آزادی اور اطمینان کے ساتھ اپنے خیالات اشاعت کی امید تھی اس لئے کہ یہ مدرسہ اکلیرکیہ یعنی گرجا کا نہ تھا لیکن چونکہ یہ کالج سلسلۂ مدارس اکلیروس کی آخری کڑی تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اظہار خیال میں اکلیروس کا بڑی حد تک پابند ہے لہذا یہاں بھی اسے پوری مسرت نصیب نہ ہوئی اس لئے وہ مذہبی زندگی

بالکل کنارہ کش ہوکر موسیو کروز یہ مدرسہ شبینہ (Night School) میں صدر مدرس

کے عہدہ پر مامور ہوگیا اور دن کا پورا وقت السنہ سامیہ وغیرہ کی تحصیل میں صرف کیا کرتا۔

ابراجیہ فی الفلسفہ کی ڈگری حاصل کرنا

۱۸۴۷ء میں اس نے پیرس اکاڈمی سے سند فضیلت حاصل کی اور اسے اپنی تالیف "تاریخ مقارنتہ اللغات اسامیہ" کے صلہ میں ابراجیہ فی الفلسفہ کی ڈگری ملی اور ۱۸۴۹ء میں فرانسیسی گورنمنٹ نے اسے اٹلی کی ایک علمی مہم پر بھیجا۔ خدمت مفوضہ کی تکمیل کے بعد رینان واپس آکر پیرس کی لائبریری میں ملازم ہوگیا اور اپنی بہن ہنریٹ کے ساتھ رہنے سہنے لگا۔ پروفیسر رینان اکثر مسائل پر غور وفکر کیا

اور "رسالۃ العالمین" (Revue des deux mondes) اور اخبار الدنیا (Débats) میں اپنے مسلسل مضامین مذہبی تاریخی اور اخلاقی شائع کراتا رہا۔ ۱۸۵۲ء میں اس نے اپنی کتاب ابن رشد اور اس کا فلسفہ شائع کی جس کے صلہ میں اسے ڈاکٹری کی ڈگری ملی اور یورپ میں اسکی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اسی وقت سے رینان کا شمار فرانس کے اکابر فلاسفہ میں ہونے لگا۔ ۱۸۵۷ء میں ماہر علوم السنہ کواطرمیر (Quatremère) کا انتقال ہوا تو السنہ سامیہ کی پروفیسری کا عہدہ خالی ہوا۔ اس زمانہ میں فرانس بھر میں رینان کے سوا ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا مگر فرانس کا کیتھولک گروہ رینان جیسے ملحد شخص کا ایک ایسے مذہبی عہدہ پر تقرر کسی طرح منظور نہیں کرسکتا تھا اور نہ کیا لیکن امپراطور فرانس رینان کے رسالے اور مضامین پڑھ کر اس کی بے نظیر قابلیت سے واقف ہوگئے اور اسے فلسطین کی مہم آثار قدیمہ پر بھیجنا چاہا۔ رینان نے بھی اس کو قبول کر لیا اور اپنی بہن ہنریٹ کو ساتھ لیکر روانہ ہوگیا یہ واقعہ ۱۸۶۰ء کے موسم گرما کا ہے۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۱ء کو مقام ایشطا میں اس کی بہن کا انتقال ہوگیا۔ مس ہنریٹ کی موت نے رینان سے ایک قوی الارادہ۔ نرم دل اور شفیق بہن چھین لی جو اس کے تمام اعمال زندگی میں بہترین معاون اور اس کی مربی تھی۔ بہن کی مفارقت نے اسے اسقدر نڈھال اور حواس باختہ کر دیا کہ رینان اس کا مرثیہ بھی نہ لکھ سکا اور جہاز پر سوار ہوکر وطن روانہ ہوگیا۔ جہاز میں اس کی حالت نہایت خراب تھی اکثر شدت تکلیف سے غشی اور بدحواسی طاری رہتی تھی۔ اگر سمندر کی فرحت زا ہوا اس کے قویٰ کو بحال اور تازہ کر کے کسیقدر اس کا غم غلط نہ کر دیتی تو قریب تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دہو بیٹھتا۔ فرانس پہنچنے پر وزیر تعلیمات نے فرنچ کالج میں السنہ سامیہ کی پروفیسری کے عہدہ پر اسے فائز کر دیا۔

...سنہ سامیہ کی پروفیسری

رینان نے جو اپنا پہلا لکچر دیا اس میں اس نے تصریح کی کہ (حضرت مسیح علیہ السلام خدا نہیں (ہیں) بلکہ وہ صرف ایک بے مثل انسان تھے اس زلزلہ خیز آواز نے کیتھولک گرجاؤں میں ہلچل ڈال دیا اور انہوں نے رائے عامہ (پبلک) کو اس کے خلاف اُبھارا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ رینان کے لکچروں سے ...ن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے چنانچہ اس کی زبان بندی کا حکم نافذ ہو گیا اور اس کے لکچر موقوف ...گئے۔

۲ رجون ۱۸۶۴ء کو پروفیسر رینان نے پیرس کے اخبارات میں پڑھا کہ اسی السنہ سامیہ کے عہدہ ...وفیسری سے پیرس پبلک لائبریری کی سکرٹیری شپ کے عہدہ پر منتقل کر دیا گیا ہے۔

پروفیسر مذکور نے اس جدید عہدہ کو قبول نہ کیا اور اس کے بعد سے بطور ایک مصنف کے صرف اپنے ...م کو ذریعۂ معاش بنا کر آزادانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ فرانس کی علمی مجالس (سوسائیٹیوں) نے رینان کے ...فضل و کمال کا اعتراف کیا اور ۱۸۷۹ء میں "المجمع العلمی الفرانساوی" نے اسے اپنا رکن منتخب کیا اور ساتھ ہی ...رانس کالج کا نگراں بھی مقرر کیا اور اس کے علم و فضل کے اعتراف میں اسے ایک تمغہ دیا اور اس نے اپنی ...بقیہ عمر ایک ممتاز اور بلند پایہ محسن علم کی حیثیت سے بسر کی جو غربا اور مساکین اور حاجتمندوں کے ساتھ نہایت ...ہمدردی اور رحمدلی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہو رہا تھا تو اس نے نہایت اطمینان او فارغ البالی ...کے ساتھ کہا کہ:-

> اس وقت میں اپنا فرض پورے طور پر ادا کر چکا ہوں اس لئے میری یہ موت مبارک اور مسعود موت ہے جبکہ یہ بالکل بدیہی حقیقت ہے کہ دنیا میں کسی چیز کو موت سے مفر نہیں ہے۔

(باقی دارد)

تبادلہ

جن معاصرین کرام کی خدمت میں زبان بطور تبادلہ حاضر ہوا ہے وہ براہ کرم اپنا اپنا رسالہ تبادلتہً روانہ فرما کر مشکور فرمائیں۔

(مینجر)

فن تعلیم

(از جناب محمد اسمٰعیل صاحب ایرانی۔ بی اے جوناگڑہی)

"ذیل کا فلسفیانہ مضمون اگرچہ کاٹھیاواڑ کی ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک اُردو تقریر کا ملخص ہے لیکن ہم اس کے ذریعہ مقرر کو کاٹھیاواڑ کے ایک جدید انشا پرداز کی حیثیت سے علمی دنیا میں روشناس کرانے کا فخر حاصل کرتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ صاحب مضمون ہمارے اس فخریہ دعوے کا ثبوت گاہ گاہ اپنی جنبش قلم سے دیتے رہیں گے"

ایڈیٹر

جاننا چاہیئے کہ نفس انسان تین حالتوں میں عمل کرتا ہے۔ انسان کو یا تو کسی چیز کا مطلق علم حاصل ہو سکتا ہے یا خوشگوار یا ناگوار اثر سے رنج و راحت کا احساس ہوتا ہے یا وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے پس نفس انسان میں وہ جوہر یا قوت ہے جو معلوم کرتی، محسوس کرتی یا ارادہ کرتی ہے ان تین قوتوں کو تعلّم، **احساس** اور **ارادت** کہتے ہیں۔ **تعلّم** سے نفس کو کسی چیز کا ادراک حاصل ہوتا ہے **قوتِ احساس** وہ قوت ہے جس کے ذریعہ سے رنج و راحت اور کسی قسم کی اور کیفیات نفس پر طاری ہوتی ہیں۔ **قوت ارادہ**۔ اس قوت سے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمارے ارادہ میں تحریک ہوتی ہے۔

یہ تینوں حالتیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوئی رہتی ہیں۔ چھوٹے بچوں میں قوت ارادت کم اور قوت احساس زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر بچوں کے احساس کو تحریک دیکر تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہیئے اس کے مختلف طریقے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں قوتوں کو **تربیت نفس** کہتے ہیں۔ اُن میں سے قوتِ تعلّم کا تعلق عقلی تعلیم کے ساتھ اور **احساس و ارادت** کا تعلق اخلاقی تعلیم کے ساتھ ہے۔

قوت تعلّم چار بڑی قوتوں پر مشتمل ہے۔

(۱) **قوتِ مدرکہ**۔

(۲) **قوتِ حافظہ**
(۳) **قوتِ متخیلہ**
(۴) **قوتِ عقل یا فیصلہ**

(۱) **قوت مدرکہ** وہ قوت ہے جس میں حواس کے ذریعہ سے باہر کی چیزوں کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ پانچ ہیں۔ (۱) **باصرہ** (۲) **شامہ** (۳) **ذائقہ** (۴) **سامعہ** (۵) **لامسہ** پانچ علم کے دروازے ہیں اور ان کو تربیت دینے کے مختلف طریقے ہیں۔

قوت باصرہ اور **لامسہ** نہایت ہی ضروری قوتیں ہیں۔ ان کی ترقی کے لئے بچوں کو الگ الگ قسم کے رنگ دکھا کر ان میں تمیز کرانی چاہئے اور مختلف چیزوں کا مشاہدہ کرا کے ان کی خاصیتوں کو معلوم کرانا چاہئے مثلاً کسی چیز کا قد اس کی شکل، رنگ حرکت وغیرہ۔ جاننا چاہئے کہ **کنڈر گارٹن** اور **اسباق الاشیا** جو بچوں کی تعلیم میں داخل ہیں ان سے دوسری قوتوں کے علاوہ بچوں کی **قوتِ مشاہدہ** اور **قوت لامسہ** کی ترقی مقصود ہے۔

(۲) **قوتِ حافظہ** وہ قوت ہے جو حاصل کئے ہوئے علم کو ذہن میں محفوظ رکھتی ہے اور ضرورت کے وقت اسکو پیش کرتی ہے۔ یہ قوت نہایت ہی ضروری ہے۔ حافظہ کے بغیر ہم کسی علم میں ترقی نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں کے مدرس بہت سی باتیں طوطے کی طرح بچہ کو رٹا دیتے ہیں جس سے اکثر مرتبہ بچہ کا دماغ بہت کمزور ہو جاتا ہے البتہ بچہ کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر بہت سی باتیں لفظ بہ لفظ ہی یاد کرانی چاہئیں مثلاً حساب کے پہاڑے قواعد کی تعریفیں اخلاقی نصیحتیں وغیرہ۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں جہاں ممکن ہو بچہ کو یہ باتیں سمجھا دینی چاہئیں اور جہاں ممکن نہ ہو وہاں ان کو یہ کہدینا کافی ہے کہ "تم بڑے ہوگے تب اس بات کو سمجھ لوگے"! تاکہ بچہ کے دل پر یہ نقش جما رہے کہ یہ بات میں نے فضول نہیں سیکھی یہ کام کی چیز ہے جس کی حقیقت مجھے آیندہ معلوم ہوگی۔

حافظہ کی ترقی کے لئے مضمون با ترتیب اور سلسلہ وار بیان کرنا چاہئے۔ بار بار سوالات کے ذریعہ سے تمام باتیں دوہرا دوہرا کر بچوں کے ذہن نشین کرانی چاہئیں اور ان میں **توجہ** قایم رکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے اور اس کے لئے مدرس کا طریقہ تعلیم دلچسپ اور برتاؤ ہمدردی والا ہونا چاہئے۔

(۳) **قوت متخیلہ** اس قوت کے ذریعہ سے نفس گذشتہ خیالات میں کمی بیشی کرکے اسی قسم کی یا بالکل

سی صورتیں اپنے ذہن میں پیدا کر لیتا ہے۔ تخیل کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) تخیل ترکیبی۔

(۲) تخیل اختراعی۔

تخیل ترکیبی وہ ہے جس کے ذریعہ سے جو چیزیں ہمنے دیکھی ہیں ان کا حافظہ کے ذریعہ سے تصور کرنا یا متعدد دیکھی ہوئی چیزوں پر سے ایسی صورتیں بنانا جن کا واقعی طور پر وجود بھی ہو۔ مثال کے طور پر ہمنے پہاڑ بھی دیکھا ہے اور آگ بھی دیکھی ہے لیکن ایسا پہاڑ نہیں دیکھا جس میں سے آگ نکلتی ہو جسکو کوہِ آتش فشاں یا جوالامکھی کہتے ہیں۔ اب ہم پہاڑ اور آگ کو ساتھ ملا کر ایک جلتے ہوئے پہاڑ کا تصور تخیل ترکیبی کی مدد سے کر سکتے ہیں۔

تخیل اختراعی سے ہم کو سروکار نہیں ہے کیونکہ یہ شاعروں یا افسانہ نگاروں کے کام کی چیز ہے۔ بچوں کی قوتِ تخیل کا مدّ ان کے کھلونوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ گڑیا کو جاندار سمجھکر وہ اس کو کھلاتے ہیں پلاتے ہیں اور محبت کرتے ہیں اور تخیل کے زور سے طرح طرح کے لطف حاصل کرتے ہیں۔ لکڑی کا گھوڑا بناتے ہیں اور بڑے شہسوار بن کر اس کو دوڑاتے ہیں گھانس کھلاتے ہیں پانی پلاتے ہیں ان کو ان باتوں سے بڑی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اکثر والدین خود بھی کبھی بچے تھے اور ایسے کھیل کیا کرتے تھے ان کو فراموش کر کے وہ بچوں کی ان حرکتوں کو فضول اور لغو سمجھتے اور ان پر خفا ہوتے ہیں۔ اس سے بچوں کو بڑا صدمہ پہنچتا ہے۔ اور ان کا تخیل خراب ہوتا ہے اس لئے اُن کو کھیلنے دینا چاہئے اور طرح طرح کے کھلونے دلوانے چاہئیں یہ فضول خرچی نہ ہوگی۔ البتہ بچوں کے اکثر کھلونوں کی نگرانی کرنا ضروری ہے۔

(۴) قوت عقل یا فیصلہ اسی قوت کی بدولت ہم کو دوسرے حیوانات پر شرف حاصل ہے۔ اس قوت کے ذریعہ سے ہم کسی دو خیالوں کا مقابلہ کر کے ان کی نسبت اپنی رائے قایم کر سکتے ہیں اور نتیجے نکال سکتے ہیں اس میں دو قوتیں شامل ہیں۔

(۱) قوت اوّل خیالات کا مقابلہ کر کے حکم لگانا جس کو قوت فیصلہ کہتے ہیں۔

(۲) قوت دوم۔ استدلال۔ اس کے ذریعہ سے دو حکموں پر سے ہم ایک نتیجہ نکال سکتے ہیں یہ عقل کی اعلیٰ قسم ہے اور اس کی تربیت بہت دیر سے ہوتی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس مختصر مضمون میں اُن تمام باتوں کو مثالوں کے ساتھ بوضاحت بیان

نہیں کرسکتا کیونکہ طوالت کا خوف مانع آتا ہے اور اس کے لئے میرے پاس کافی وقت بھی نہیں ہے۔ لہذا ان باتوں کی نسبت جو مدرسین زیادہ جاننا چاہتے ہیں ان کو اس فن کی کتابیں پڑھنا چاہئے۔

المختصر **قوتِ تعلم** کے ماتحت چار قوتیں جو ہم نے بیان کی ہیں ان کا تعلق **عقلی تربیت** کے ساتھ ساتھ ہے اور **تاثر** اور **ارادت** کا تعلق **اخلاقی تعلیم** کے ساتھ ہے۔ مدرسین کے لئے ان قویٰ کی تربیت کے اصولوں سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

نوائے دلگیر

(مولانا سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر اکبرآبادی)

مر گئے ہم گل چراغِ داغِ ہجراں ہوگیا
صبح سے پہلے ہی جل بجھنے کا ساماں ہوگیا

اے بہ حسرت دیکھنے والی دلِ برباد کی!
کچھ خبر ہے کب یہ اُجڑا کب یہ ویراں ہوگیا

اُف رے بیدردی! مرے زخموں کی حسرت دیکھ کر
مسکرا کر بولی "اب خالی نمکداں ہوگیا"

تیرے پیکاں کی بدل دیں جذبِ دل نے خواہشیں
میرا دشمن بن کے آیا میرا مہماں ہوگیا

بن گیا وجہ ندامت تیرا خونِ بے کسی!
مرنے والے! خنجرِ قاتل پشیماں ہوگیا

بڑھ گئی غربت میں ناکامی سے ہمت اور بھی
بے سروسامانیوں میں خوب ساماں ہوگیا

اب نہ وہ نالہ نہ وہ شیون نہ وہ فریاد ہے
کیا اسیرِ غم ترا مانوسِ زنداں ہوگیا

دیکھ لی نازک کلائی کرچکیں بس آپ قتل
آپ نے احساں کیا اور مجھ پہ احساں ہوگیا

آنیوالی! تو خدا بستہ ہی آتی شامِ وصل
تیری بے رنگی سے پھیکا رنگِ احساں ہوگیا

آپ کی زلفوں کو دیکھا میں نے سجادہ بدوش
آج سچا یہ مرا خوابِ پریشاں ہوگیا

میری چشمِ شوق میں سکتہ کا عالم دیکھ کر
اُن کی محفل کا ہر اک آئینہ حیراں ہوگیا

خامۂ قدرت نے لکھی جب کتابِ زندگی
دردِ میرے صفحۂ ہستی کا عنواں ہوگیا

مدتوں دلگیر اس دل پہ مجھے آیا ہے رشک
جو کسی کی یاد میں دم بھر پریشاں ہوگیا

مترجمات

سلطان محمود (۸۶۳ھ تا ۹۱۷ھ / ۱۴۵۹ء تا ۱۵۱۱ء)
کی
وجہ تسمیہ بیگڑھ

مراۃ سکندری کے مصنف نے سلطان محمود کے لقب بیگڑھ سے ملقب ہونے کی دو وجہیں بیان کی ہیں:-

(۱) سلطان نے جوناگڈھ اور چاپانیر کے دونوں قلعے فتح کئے تھے اس لئے اس کو "بے گڑھ"، (دو قلعوں والا) کہا گیا۔

(۲) گجرات میں بیگڑھ اس بیل کو کہتے ہیں جس کے سینگ کسی ہم آغوش ہونے والے آدمی کے کھلے ہوئے ہاتھوں سے مشابہ ہوتے ہیں، اور چونکہ محمود کی مونچھیں بھی اسی طرح کی تھیں اس لئے اسکو بیگڑھ کہا گیا۔

مصنف مذکور نے ان وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے کوئی فیصلہ کن رائے نہیں ظاہر کی، اس نے صرف "واللہ اعلم بالصواب" پر اپنے قول کو ختم کر دیا ہے۔ یہاں ہم بعض دلائل اس بات کے ثبوت میں پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آخری وجہ دراصل صحیح ہے، اور کہ وہ لفظ گجراتی (   ) ہے جس کے معنی اوپر کو اٹھے ہوئے سینگوں والے بیل کے ہیں۔ پہلی وجہ تسمیہ باوجود عام طور پر تسلیم کئے جانے کے ناقابل توجہ ہے:

۱- بولوگنا (Bologna) کا یورپین سیاح وارتھما (Varthema) جو [illegible] میں سلطان محمود کے عہد حکومت میں گجرات میں آیا تھا، لکھتا ہے:-

سلطان کی مونچھیں اس قدر لمبی ہیں کہ وہ ان کو سر پر اس طرح

باندھ لیتا ہے جس طرح ایک عورت اپنا جوڑا باندھتی ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان کی لمبی اور گھنی مونچھوں نے اس کی رعایا کو متعجب کر دیا اور انھوں نے اپنے ہاں کے بیلوں کے سینگوں کی تشبیہ میں اس کو ویگڑو (गडो) یا بیگڑہ کے نام سے مشہور کر دیا۔ جیسے اہل جرمنی نے "قیصری مونچھوں" کو۔

۲ - شہنشاہ جہانگیر ۱۶۱۷-۱۸ء میں - یعنی مرآۃ سکندری کی تصنیف سے صرف ۶ سال قبل - احمد آباد آیا تھا وہ اپنی تزک میں سرکھیج شریف اور سلطان محمود بیگڑہ کے مزار پر جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"بیگڑہ اہل گجرات کی زبان میں چڑھی ہوئی مونچھوں والے کو کہتے ہیں اور چونکہ سلطان محمود کی بھی اسی طرح کی مونچھیں تھیں لہٰذا لوگ اس کو بھی بیگڑہ کہتے ہیں۔"[۵۱]

یہاں اگرچہ جہانگیر نے اصل لفظ گجراتی (वेगडो) کا ذکر نہیں کیا جس سے لفظ "بیگرہ" بنا ہے تاہم یہ ظاہر ہے کہ ۱۶۱۷ء ایسے قریب العہد زمانہ میں لکھتے ہوئے جہانگیر اس دو قلعوں والے نظریہ سے قطعاً ناآشنا تھا کیونکہ اس نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

۳ - جو لوگ گجراتی زبان سے واقف ہیں وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ پہلی وجہ تسمیہ میں دو قلعوں کی فتح کا جو توہم قائم کر لیا گیا ہے وہ کسقدر کمزور اور ضعیف ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ لقب اصل گجراتی زبان کے لحاظ سے (वेगडो) (بے گڈھو) ہوتا نہ بیگڑہ۔

گجراتی لٹریچر میں کہیں بھی پہلے معنوں میں بیگڑہ کا استعمال نہیں پایا جاتا۔

لفظ (वेगडो) گجراتی زبان میں چڑھے ہوئے سینگوں والے بیل کے لئے اب بھی کاٹھیاواڑ کے کاشتکاروں میں مستعمل ہے۔ مسٹر اے۔ کے فاربس راس مالا[۵۲] کے ایک منظوم قصہ میں ایک بھیل کا ذکر کرتے ہیں جس کا نام "ویگڑو" تھا۔ وہ شعر جس میں اس بھیل کے ذو معنی نام پر مذاق کیا گیا ہے صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ لفظ "ویگڑو" عام زبان میں انہی معنوں میں مستعمل تھا[۵۳]۔ اسی لفظ (वेगडो) کے مقابلہ میں بھیلو (भीलो) بولا جاتا ہے جس کے معنی بغیر سینگ کا بیل" ہیں - یہ لفظ بھی

---

۵۱ تزک جہانگیری

۵۲ دیکھو فصل دوم باب پنجم

۵۳ دیکھو راس مالا (گجراتی اڈیشن) صفحہ ۶۱۳

(عب)رانی میں ان معنوں میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔[۵]
یہاں یہ بتانا غیر ضروری ہے کہ لفظ "دیگرو" فارسی میں آکر "بیکرہ" ہو گیا ہے۔
(رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی شعبہ بمبئی)

لفظ "مسیح" کی اصلیت

اصل میں یہ لفظ عبرانی میں "مشیح" سریانی میں "مشیحو" اور کلدانی میں "مشیحا" ہے جو لفظ "مشح" سے مشتق ہے، جس کے معنی "مسح" کے ہیں۔ علامہ احمد فارس الشدیاق اپنی کتاب الجاسوس علی القاموس (صفحہ ۴۹) میں لکھتے ہیں کہ یہودیوں میں یہ دستور تھا کہ جب اُن میں کوئی بادشاہ بنایا جاتا تو احبار یہود اس کے جسم کو تیل ملا کرتے تھے۔ اس لئے جب کوئی "مسح" کیا جاتا تو وہ اس کو "مسیح الرب" کہتے تھے، جو اُن کے ہاں بادشاہ کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔ جب اپنے انقراض مملکت کے بعد یہود مسیح (یعنی بادشاہ) کی آمد کے منتظر ہوتے جو اُن کو اس ذلت اور تباہی سے نجات دے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث برسالت ہوئے اور ان سے معجزات ظاہر ہوئے تو وہ ان پر ایمان لائے اور ان کو "مسیح ناجی" ماننے لگے۔ مگر انہوں نے جب آپ کو تارک الدنیا اور اُن کے فرشتوں کا ارضی نہیں بلکہ سماوی ہونا معلوم کیا تو کہنے لگے کہ آپ کا "مسح" الٰہی اور روحانی ہے مگر اس قول سے اُن لوگوں کی تشفی نہ ہوئی جو مجازی نہیں بلکہ حقیقی "دنیوی مسیح" کے منتظر تھے۔ چنانچہ اب تک یہود کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام دراصل مسیح نہ تھے۔ بادشاہ یا حاکم کو تیل ملنے کا رواج آج بھی حبش میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کے سلاطین سلیمان علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اب تک تورات کی بعض سنتوں مثلاً ختنہ، اباحت تسری وغیرہ پر ان کا عملدرآمد ہے۔

(الاسرار)

---

[۵] راس ، ۱۱ صفحہ ۲۲۶۔

جرمنی کی تعلیمی حالت

ولایت آدرنہ کے سابق محقق تعلیمات (مفتش المعارف) اور ترکی مدرستہ المعلمین کے پروفیسر کما[ل] جو گذشتہ ماہ میں جرمنی کی تعلیمی حالت کے معائنہ کے لئے بھیجے گئے تھے وہاں کی تعلیمی ترقیوں کی نسبت اطلا[ع] دیتے ہیں:-

"آجکل باشندگان جرمن کی تعداد چھ کروڑ تیس لاکھ ہے جن میں فیصدی ۹۸½ لکھے پڑھے لوگ پائے جاتے ہیں گویا فی ہزار مرد اور عورتوں میں صرف پندرہ اشخاص ایسے ہیں جو نوشت و خواند کی نعمت سے محروم ہیں۔

جرمن بچہ چھ برس کی عمر میں مدرسہ اولیہ (پرائمری اسکول) میں داخل کر دیا جاتا ہے اگر اس کے والدین اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ اس کو کالج کی اعلیٰ تعلیم دلا سکیں تو صرف مدرسہ اولیہ میں چار سال تک اس کو رہنا پڑتا ہے جہاں سے وہ سند حاصل کر کے مدرسہ ثانویہ میں داخل ہو سکتا ہے اور اگر بچوں کے والد[ین] صرف ابتدائی تعلیم دلانا چاہتے ہیں تو اس کو مدرسہ اولیہ میں آٹھ سال تک تعلیم دی جاتی ہے جس کے ...د منتہی ہو کر نکلتا ہے اس وقت اس کی عمر ۱۴ برس کی ہوتی ہے اب اس کو اختیار ہے کہ وہ اُن مدارس میں دا[خل] ہو جو مدارس (Beruf) یا (بیروت) کہلاتے ہیں یہاں چار سال کے بعد وہ سند پا کر نکلتا ہے اُس وقت اس کی عمر ۱۸ سال کی ہو جاتی ہے اس حالت میں وہ فینانس (Finanz) کے کسی شعبہ میں ملازم ہو جاتا ہے یا کسی تاجر کے دفتر میں کلرک ہوتا ہے یا اپنی حالت کے مطابق کوئی مستقل کا[م] شروع کر دیتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک جرمنی میں سرکاری مدارس کی تعداد ۵۲۷۷۹ تھی جن میں ۱۴۷۰۵۲ مدرسین ۴۹ ہزار استانیاں اور طلبہ ۸۸۹۸۳۲۰ (ذکور و اناث) ہیں معلمین کے لئے جو ہا[ئی] (غیر سرکاری) مدارس قائم ہیں اُن کی تعداد ۲۰۰ ہے جن میں ۵۸۰۰۰ طلبہ (ذکور و اناث)، ان کے علاوہ اور قسم کے مدارس بھی ہا[ل] ہیں جو اندھوں، بہروں اور گونگوں کے لئے بنائے گئے ہیں جن کی تعداد ۱۷۹ ہے اور انمیں ۱۲۵۰۰ طلبہ

ر رو اناث) تعلیم پاتے ہیں۔

جرمنی میں مدارس ثانویہ تین قسم کے ہیں:۔

قسم اول۔ ریئیال جمنیاز۔

قسم دوم۔ جمنیاز۔

قسم سوم۔ اپر ریئیال شولہ

یہ مدارس اُن اعلیٰ مدارس سے مختلف اور جداگانہ ہیں جن میں طلبہ بعد کو داخل ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی ب علم ہندسہ کے مدرسہ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اُس کو اپر ریئیال شولہ میں داخل ہونا پڑتا ہے کہ وہاں نعت اور علوم کے ریاضیات اور طبیعیات کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا جاتا ہے یہاں اجنبی زبانوں میں یسی اور انگریزی سکھائی جاتی ہے لاطینی زبان کے لئے اس میں کوئی انتظام نہیں ہے اگر کوئی طالبعلم ل تعلیم کے بعد ادبیات عقلیات اور الہیات میں مشغول ہونا چاہے تو اُسے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے ے بعد مدرسہ جمنیاز میں داخل ہونا پڑتا ہے جہاں ریاضیات اور طبیعیات کی طرف بہت کم توجہ کیجاتی ہے غیر زبانوں میں سے صرف فرانسیسی زبان سکھائی جاتی ہے اور خاص طور پر لاطینی اور قدیم یونانی بانوں کے سیکھنے کا انتظام بھی ہے مدارس ثانویہ کی مدت تعلیم ۹ سال ہے۔

جرمنی کی تعلیمی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہاں ۵۱۵ قسم جمنیاز کے مدارس ہیں جنمیں ۲۰۶۰ مدارس اور ۵۲۱۳۷ طلبہ (ذکور و اناث) ہیں ۳۲۱ مدارس ریئیال جمنیاز کے ہیں جن میں ۷۰۱۰ مدارس ہیں اور ۹۴۹۴۹ طلبہ (ذکور و اناث) ہیں اپر ریئیال شولہ نامی مدارس کی تعداد ۵۰۷ ہیں جن میں ۹۸۳۰ درسین اور ایک لاکھ چوراسی ہزار آٹھ سو ستائیس طلبہ (ذکور و اناث) ہیں۔

یہ نظام تعلیم ۱۹۱۱ء سے مدارس اولیہ وثانیہ میں بھی قائم ہے جبپر شخصی حکومت کے زمانے سے لیکر موجودہ عہد جمہوری تک انقلابات کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔

کمال بک موصوف کی جرمنی کے ایک نامور فاضل جون دوتی سے ملاقات ہوئی تو اس نے ترکی کو نصیحت کرتے ہوئے دوران گفتگو میں کہا:۔

"جرمنی لوگ جب اپنے نظامات میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں (خواہ وہ کیسی ہی معمولی کیوں نہ ہو) تو اسپر عرصہ دراز تک غور و خوض کرتے رہتے ہیں اور اپنے

میثۂ تعلیمات میں پورے تدبر اور مطالعہ طویل کے بعد کوئی ترمیم کرتے ہیں۔"

تعلیم قانونی سے ان کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایک ایسی نیک اخلاق جماعت پیدا ہو جو تمدنی، شخصی اور علمی حیثیت سے صاحب عقل و تدبیر ہو اس کو اپنے قوم و وطن کے ساتھ انس و محبت ہو اور دیگر اقوام کے ساتھ مصالحت کی روح اسمیں پیدا ہو۔

یہ آخری شق موجودہ عہد جمہوری کی پیداوار ہے۔

مذہبی تعلیم جرمنی میں جبری اور لازمی ہے الا یہ کہ یہ کہ طلبہ کے والدین اس سے اتفاق نہ کریں جرمنی میں ایک تعلیمی بورڈ قائم ہے جو جرمن کے تمام مدارس کا انتظام کرتا ہے اس کے ممبروں میں سربرآوردہ اساتذہ اور طلبہ کے نگراں اشخاص شامل ہیں اس مجلس انتظامیہ کی قرارداد کے مطابق تمام مدارس میں عمل درآمد ہوتا ہے۔

مدارس ابتدائیہ و ثانویہ میں سے امتحانات کا نظام بالکل موقوف کر دیا گیا ہے البتہ یہ اعلیٰ مدارس میں قائم ہے وہ بھی صرف اس حد تک کہ ان میں اساتذہ جو لکچر تیار کرتے ہیں انہیں میں امتحان لیا جاتا ہے جو عشرہ میں ایک مرتبہ تحریری صورت میں ہوا کرتا ہے سال کے آخر میں ان نتائج کا اوسط نکال کر اس پر طلبہ کے کلاسوں کی ترتیب رکھی جاتی ہے۔

فی الحال جرمنی میں ۲۳ یونیورسٹیاں ہیں جن کے اساتذہ کی تعداد ۴۲۵۶ ہے ان میں ۸۵۱۷ طلبہ اور ۱۴۴۰ طالبات ہیں ان کے علاوہ ۱۲۱۶۵ ایسے طلبہ اور ۳۲۸۰ طالبات ہیں جو صرف ان یونیورسٹی کے لکچروں میں شریک ہوتے ہیں علاوہ بریں جرمنی میں حسب ذیل مدارس قائم ہیں۔

۶ مدارس تجارت کے۔ ۱۱ مدارس صنعت و حرفت کے ۱۱ مدارس موسیقی کے ۱۲ مدارس فنون لطیفہ کے ۴ مدارس زراعتی ۴ مدارس جنگلات کے اور ۲ مدارس معدنیات کے ہیں۔

(الزہرا)

نظام تعلیم کی تجدید

مسٹر ایس۔ وی رامامورتی ایم۔ لے، آئی۔ سی۔ ایس نے اپریل کے رسالۂ بنک مین آف انڈیا

میں عنوانان مندرجہ بالا پر ایک فاضلانہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے جس میں وہ ہمکو بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں قلیل التعداد آدمیوں کی تعلیم کے اخراجات کا بار کثیر التعداد غیر تعلیمیافتہ اشخاص کے سر پڑ رہا ہے۔ مؤخرالذکر دیہات کے رہنے والے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو زیادہ تر ٹیکس ادا کرنے والے ہیں۔ وہ ہماری تعلیم کا بار اٹھاتے ہیں تو اس کے عوض میں انہیں کچھ بھی نفع نہیں پہونچتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

"آپ اپنی یونیورسٹیوں کو بند کر دیجئے پھر بھی آپ دیہاتی زندگی کو اُن سے غیر متاثر پائیں گے وہ کتابیں جو یہ دیہاتی پڑھتے یا سنتے ہیں وہ ہماری یونیورسٹیوں اور ان کے پیدا کردہ افراد کے دماغوں کی ممنون نہیں ہے، وہ اجتماعی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی جو یہ دیہات والے بسر کرتے ہیں ہماری یونیورسٹیوں کی تعلیم و تعلم سے کچھ بھی اثر پذیر نہیں ہوتی۔ پس اگر کسی ملک کی اعلیٰ تعلیم ایک قومی معاملہ ہے جس کا معاوضہ غریب دیہات والے ادا کر رہے ہیں تو یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ان سے ایک ایسے کام کا معاوضہ لیا جا رہا ہے جن سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔

مضمون نگار موصوف ہماری یونیورسٹیوں کی "پیداوار" سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"ہماری یونیورسٹیاں صحیح معنوں میں علم و فن کی تعلیم گاہوں کی بجائے صرف ذہنی "نقلی پن" کی درسگاہیں ہیں۔ ہمارے معلمین، ہمارے ڈاکٹر، ہمارے انجینیر اور وکلاء میں سے بہت تھوڑے ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں "ماہرِ فن" کہے جا سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نقل تو کر سکتے ہیں مگر خود اپنی طبیعت سے کچھ نہیں پیدا کر سکتے۔ ہمارے گریجویٹوں کی ایک تعداد کثیر گورنمنٹ کی ماتحتی کی ملازمتوں پر مٹی ہوئی ہے۔ ان کی تعداد روز افزوں ہے حالانکہ سرکاری ملازمتوں کے لئے ان کی ضرورت نہیں رہی، یہی وجہ ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد بے روزگار پھر رہی ہے۔ پس یہ جو ہم آئے دن گریجویٹوں کی تعداد کو بڑھا رہے ہیں تو تضیعِ مال و اوقات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

"اصل میں ہونا یہ چاہئے کہ جو شخص ماہرِ فن بننا چاہے اس کو یونیورسٹی کی تعلیم سے روک دیا جائے اور گریجویٹ کو ایک کلرک یا اس کے برابر فائل ہونے سے باز رکھا جائے۔"

ادبیات

شوالہ

(۱)

یوں تو ارض انتف کا ایک ذرہ بھی ایسا نہ تھا، جس میں الوہیت والہیت کی آئینہ بندی نہو، اور جس
اس مشہور تاریخی سرزمین کے قدیمی تقدس کا پتہ نہ چلتا ہو، مگر آذر کا قبیلہ اپنی سامریت اور دیویت کے لئے
دور دور مشہور تھا۔ اس قبیلہ میں دو بُت تھے۔ ذی روح اور متحرک۔
ایک کا نام زارہ تھا دوسرے کا نام ثمرہ یا ثمرد۔ ان کا مندر آذر کا وہ عظیم الشان محل تھا جو انتف کے
مندر کے دریا کے کنارے سبزہ زاروں سے گھرا ہوا تھا۔ مندر ایک پہاڑ پر واقع تھا جو کہ سبزہ سے
ڈھکا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبز گھاس کا ایک انبار لگا ہوا ہے یا پہاڑ خود مخمل بن کر رہ گیا ہے۔ پجاری
نہایت عقیدت کے ساتھ اس مندر میں صبح و شام جاتے، جہاں روحانی تزئین کے علاوہ جسمانی تفریح کے
سامان بھی نہایت وافر تھے۔ آذر، زارہ اور ثمرہ کا باپ مندر کی دیویوں اور دیوتاؤں کے مقدس استھان
پر جب دعا کرتا، اس کی دعاؤں کا مقصد صرف حصول حسن ہوتا تھا ــــــــ اس کی دعائیں قبول ہو چکی تھیں
یعنی مندر کی دیویوں نے اسے دو کنواریاں ایسی حسین دیدی تھیں کہ انتف کی پوری سرزمین ان کے جواب
مثال سے قطعاً خالی تھی۔ مگر آذر ہنوز اپنی دعاؤں کو ناکام سمجھتا تھا۔ وہ حسن چاہتا تھا۔ مگر ایسا جو اس کی آغوش
میں پریشان ہو سکے۔ وہ عورت ڈھونڈتا تھا، مگر ایسی جو دنیا کے تمام نظاروں سے اسے بے نیاز کر دے۔۔
ہاں زارہ اور ثمرہ کی ماں انتقال کر چکی تھی۔
آفتاب جب سورج طلوع ہونے کے بعد اپنے محل سے نکل کر شوالہ انتف میں چلا آتا تو اس کے بعد شو

ورتمام ماحول سے نگاہوں کی گرم کرنیں اس کے محل میں طلوع ہوتیں۔ اس کی لڑکیاں گھبرا جاتیں، اور گھر سے
کے لئے مجبور ہو جاتیں۔ اُنہیں محل کی بلند دیواروں میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نگاہیں چھن چھن کر ان کے
رخساروں پر جمی جاتی ہیں، وہ دیواروں کے پیچھے ہزاروں آنکھوں کو چشم براہ محسوس کرتی تھیں۔ ہاں تو
براجاتیں اور خدا جانے وہ کیا جذبہ تھا جو اُنہیں کھینچکر کبھی لب بام اور کبھی بیرون درلے آتا تھا۔
جس وقت آذر کی جبین نیاز، حُسن کی بڑی دیوی عنصرہ کے قدموں میں جھکی ہوئی اپنی عبودیت و عقیدت
ندل عنصرہ کی پیشانی پر چڑھا رہی تھی، عین اسوقت زارہ اور ثمرہ اپنے بام پر کھڑی ہوئی سواد انتف کی جنت
رفضاؤں کا رس اپنی سانسوں میں بھر رہی تھیں۔ اور اپنے ٹھنڈی عنبر بار سانسوں کو ہواؤں میں ملا کر
اؤں کو پیام مسرت پہونچا رہی تھیں۔ حسن پرست نوجوان شوالہ کے بہانے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے، ان
شیزہ دیویوں کی پرستش کر رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اون کی گداز نوجوانیوں میں، اُن کے اچھوتے
شباب میں، اور ان کے شہابی چہروں میں جذب ہو جائیں۔ مگر ہمسایہ نگاہوں کا خوف اُنہیں بار بار چوکنا کر دیتا
ا۔ اور وہ اپنے مسلسل نظارہ کو کبھی کبھی شوالہ کی عظیم المناظر عمارت دیکھنے میں صرف کر دیتے تھے۔
اُنہیں تماشائیوں میں ایک نوجوان تھا۔ ہرناق۔ جو سب سے زیادہ بے قرار، سب سے زیادہ بیچین۔
در سب سے مچلنے والی تمناؤں کو اپنے دل میں سنبھالے پھر رہا تھا۔ اُسے شوالہ کی حرمت کا مطلق خیال نہ تھا۔
ہ سراپا نظر اور یکسر نظارہ ہو کر صرف، زارہ اور ثمرہ کی شوالہ شکن دیویت میں کھویا ہوا تھا۔ آخر وہ پہاڑ سے
بلد جلد اُترا اور نشیب کی جھاڑیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔

(۲)

آذر کی نیازمندی، دیویوں اور دیوتاؤں کی بارگاہ میں کہاں تک مقبول نہ ہوتی، اس کا، اعتکاف اور
اسکا ہر سجدہ، محویت کا ایک بہترین مظاہرہ تھا۔ اُسے عنصرہ کے غیر متحرک قدموں میں جھکے جھکے نیند آگئی۔ وہ
عالم خیال میں ایک مجسم دیوی کے سامنے کھڑا تھا، جو اس سے کہہ رہی تھی۔
آذر۔ سر اُٹھا۔ گھر جا۔ اور اس شوالہ کے لئے ایک ایسا بُت بنا جس کا سر عنبر سارا کا ہو، جبین اور چہرہ صندل
کا ہو، گردن شیشہ کی ہو، سینہ بلور کا ہو، رانیں یاقوت سُرخ کی ہوں اور پاؤں زبرجد کے ہوں،، اس کی زلفیں
مشک سے بنا اور آنکھیں شراب سے، دل موسیقی سے اور زبان گلاب کی پتیوں سے۔ اسی طرح ترکیب دینے کے
بعد اسے دیویت کی ریشمی ردا میں چھپا کر لا، اور شوالہ میں ایک طرف کھڑا کر دے۔ میں اس میں جان ڈالونگی

اور پھر وہ تیری اور صرف تیری ہوگی۔ اگر اپنی دعا کا نتیجہ دیکھنا چاہتا ہے تو اٹھ اور میرے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو جا۔"

آذر کی آنکھ کھلی تو اُسکا سر بڑی دیوی کے قدموں پر بدستور جھکا ہوا تھا۔ وہ ایک لطیف کرب کے ساتھ اٹھا۔ مودب بیٹھا۔ اور دیوی کے چہرہ کو پُر معنی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اُسے اپنا خواب بالکل یاد تھا۔ وہ دیوانے کی طرح اُٹھا اِدھر اُدھر دیکھا اور شوالہ سے رخصت ہو کر اترا۔ اور اپنے محل میں پہونچکر خواب پر غور کرنے لگا

اس کا احساس تازہ تھا۔ اس کی آنکھیں بیدار تھیں! وہ سوچ رہا تھا کہ دیوی نے جس دیوی کی تصویر کھینچکر دی ہے اگر میں اُسے تیار کر سکا تو واقعی دنیا میں اس کا جواب نہ ہوگا۔ لیکن عنبر، صندل، شیشہ، بلور، یاقوت، مرجان، زبرجد، مشک، شراب۔ اتنی مقدار اتنی جلد کس طرح مہیا کر سکتا ہوں۔ اگر یہ چیزیں مہیا ہو جائیں تو کیا ان کی تیاری میرے ہاتھوں سے ممکن ہے۔ کیا میں ایسا بت واقعی تیار کر سکتا ہوں اور کیا پھر وہ ذی روح ہو کر میری تمناؤں کی آغوش کو مقدس بنا سکتا ہے؟

آذر ابھی اس خیال میں تھا کہ زارہ اس کے سامنے سے مچلتی ہوئی نکل گئی، اور ثمرہ بھی زارہ کے پیچھے بھاگتی نظر آئی۔ آذر اُٹھا۔ پوچھا کیا ہے کیوں بھاگ رہی ہو۔ زارہ نے اپنی برق پاش ہنسی کو روکتے ہوئے کہا "کچھ نہیں ثمرہ مجھے چھیڑ رہی تھی دیکھئے اب بھی چھیڑ رہی ہے۔"

آذر:۔ کیا ہے ثمرہ، اپنی چھوٹی بہن کو تم کیوں پریشان کر رہی ہو۔

ثمرہ:۔ ابا جان۔ ہرناق مشک مانگنے آیا تھا۔ میں نے کہا تھوڑے بال کاٹ کر دیدو۔ تو یہ ایسی بھاگیں کہ مجھے بھی اپنے ساتھ پریشان کر دیا۔

آذر۔ ہرناق۔ مشک۔ بال۔ اور زارہ!۔۔۔ ثمرہ میں نہیں سمجھا۔ مشک سے اور زارہ سے کیا تعلق ہے؟"

ثمرہ:۔ ابا جان آج مجھے نیا تجربہ ہوا ہے، جبکہ شوالے کا گھنٹہ زور زور سے بج رہا تھا۔ اور ہم دونوں سر جھکائے بڑی دیوی کی یاد میں کھڑے تھے۔ یکایک زارہ کے گیسو اڑے، مجھے اُن میں سے ایک خاص خوشبو اڑتی ہوئی محسوس ہوئی جو بالکل مشک کی سی تھی۔ پھر جو میں نے غور کیا تو زارہ کے بال واقعی مشک سے بنے ہوئے تھے"

زارہ:۔ دیکھئے یہ مجھے بنا رہی ہیں۔ میں ہرناق کو اپنے بال کیوں دیتی۔ وہ تو مشک مانگنے آیا تھا۔ ثمرہ ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتی ہیں۔"

آذر نے زارہ کو بغور دیکھا۔ اور اوس کی جسمانی ترکیب پر ایک گہری نظر ڈالی، اس نے معلوم کیا کہ ایک یوی
انے میں جن اجزا کی ضرورت ہے، وہ سب زارہ میں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں۔ وہ متحیر ہو گیا۔ اس سے
آذر نے زارہ کو اس نگاہ سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن اُسے اکثر اپنے گھر میں شراب، مشک، اور عنبر کی
بو آیا کرتی تھی تاریکی میں اکثر روشنی ہو جایا کرتی تھی۔ اور موسیقی کی نازک صداؤں سے اکثر اوسکی
وجد کرتی تھی۔ مگر وہ ان سب باتوں کو شوالہ کی بڑی دیوی کا تصرف سمجھا کرتا تھا۔ اور اسی لئے شوالہ
انگی پر اُسے ناز تھا۔ آج جب اُس نے یہ کیفیت اور عبرت اپنی حقیقی بیٹی زارہ میں دیکھی تو وہ حیران
اور کہنے لگا یہ مجسمہ تو بنا بنایا میرے گھر میں موجود ہے۔ مگر میرے کس کام کا۔ وہ کوئی اور آذر رہ
بت سے بغیر محنت اور تراشنے کے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اب میں کیا کروں، مجھے تو بُت بنانا
۔ میرے خواب کی تعبیر میرے سامنے موجود ہے ...... مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری تمناؤں میں
دری سی پیدا ہو چلی ہے .... ہرناق کیوں آیا تھا .... اُسے مشک کی ضرورت کیوں
کیا وہ بھی کوئی بُت بنانا چاہتا ہے جس کی بشارت دیوی نے دی ہو .... آذر بہت پریشان
ن کا دماغ اُلجھ رہا تھا۔ لڑکیاں اُس کے سامنے سے چلی گئی تھیں، مگر اُس نے زارہ کو پھر آواز
دہ آئی۔ کہا بیٹھ جاؤ۔ زارہ نے اپنی لچکدار گردن کو خم دیا اور بیٹھ گئی۔ اس کے باریک ریشمی لباس
س کا تمام جسم جھلک رہا تھا۔ اور آذر یقین کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ دیوی کی بشارت کا مجسمہ اُس کی
ارہ ہے۔

(۳)

کئی دن سے آذر شوالہ میں نہیں آیا۔ بڑی دیوی اُس سے ناراض ہے دیوتاؤں کو حکم دیدیا گیا ہے کہ
استھان کے لئے کوئی اور نیازمند تلاش کریں۔ جو آذر سے بہتر پجاری اور آذر سے بہتر کنواریاں
ہو۔ حکم کی تعمیل ہو جاتی مگر تمام انتف میں آذر کی کنواریوں سے زیادہ حسین لڑکیاں نہ مل سکیں۔ سارا
ران میں ایسی دو لڑکیاں ضرور تھیں مگر وہاں کے سب سے بڑے دیوتا نے ان کو انتف کے اہل
کی نذر کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سارا اور سمدان سے اگر یہ دونوں لڑکیاں انتف بھیجدی
ا تو یہاں ”صبح نہ ہو گی، اور اگر کرہ شمس کے روٹھے ہوئے دیووں کو منا بھی لیا تو سارا اور سمدان
ت اپنی رنگینیاں کھو دے گی۔ سارا میں دوپہر کی طرح شام گرم ہو گی اور سمدان میں رات کو کیس

ذرا بھی روشنی نظر نہ آسکے گی۔ نہ کوئی تارا آسمان پر طلوع ہو سکے گا۔

دیوی نے اپنے وقار خاموشی کو قائم رکھتے ہوئے زبان حال سے کہا میں آذر سے اس لاپرواہی غیر حاضری کا بدلا ضرور لونگی۔ اور اب وہ دیوی اُسے دی جائیگی جو اس سے زیادہ میرے قدموں پر سجدہ کر سکے گا۔

خادمان شوالہ نے دیوی کے غصے کی چنگاریاں محسوس کیں۔ اور ایک رات جبکہ شوالہ گھنٹے کی زبان جا اور پجاری کا سبزہ خواب میں تھا۔ ہرناق کو ارض انتقت سے اٹھا کر دیوی کے قدموں میں جھکا دیا۔ ہرناق کی آنکھ خواب آلودہ نہ تھیں اشک آلودہ تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر وہ تبخالے تازہ تھے جو دعاؤں کی گرمی سے ابھی پھپلے پھر نے تھے۔ وہ دیوی کے قدموں پر اپنا سر نیاز دیکھ کر اس یقین میں تھا کہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اور دیو اس کے اثرات قلب کو اپنی جاذب مگر سنگین نگاہوں سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یکایک ناقوس کی پرشو صدانے ہرناق کو چونکا دیا۔ اور اب وہ سمجھا کہ جسے خواب سمجھ رہا تھا وہ خواب نہ تھا بلکہ ایک بیدار کشش تھی جو اس کی خلوت سے کھینچ کر شوالے میں لے آئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنا سر اٹھائے اور اس ناگہانی انقلاب پر غور کرے مگر کسی نے اُسے مجبور کر دیا اور وہ کسمسا کر بدستور سجدہ میں پڑا رہ گیا۔

شوالہ کا گھنٹہ گونجا۔ اور صبح کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ آذر اپنی گھبراہٹ اپنے چہرہ پر لئے ہوئے کس طرف سے دوڑا ہوا آیا وہ چاہتا تھا کہ دیوی کے قدموں میں سر جھکا دے مگر اس نے اپنی جگہ ہرناق کو سجدہ میں پایا۔ اُسے غصہ آگیا۔ وہ ضبط نہ کر سکا۔ اور ہرناق کا پیراہن پیچھے سے کھینچکر اُسے وہاں سے دُور کرنا چاہا۔ مگر ہرناق نے دیوی کے آہنی پاؤں پکڑ لئے۔ پیراہن پھٹ گیا۔ اور آذر پیراہن کا ایک ٹکڑا لئے ہوئے دور جا پڑا۔ اس کا سر شوالہ کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اُسے چکر آگیا وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ہرناق ابھی تک سجدہ کر رہا تھا۔ اُجالا بڑھتا چلا جاتا تھا۔ اور شوالہ کے پجاری صندل اور لوبان لئے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ زبانوں پر دیویوں کا نام تھا۔ اور تیوروں سے عقیدت برس رہی تھی۔ ایک پجاری نے آذر کو فرش پر کرب میں پایا اس نے اٹھایا۔ اور کہا "کیا تم رات بھر شوالہ میں رہے ہو؟"

آذر "نہیں میں اس گنوار کو یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں جو سجدوں کے بہانے دیوی کے پاؤں کا صندل چرا رہا ہے۔ وہ قیمتی صندل جو میں نے یمن سے منگوایا تھا اور جس کی بھینٹ دیوی کے قدموں پر چڑھائی ہیں"

پجاری نے ہرناق کی طرف دیکھا۔ جو اب تک سجدہ میں تھا۔ اور جس کی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسو

گزین کی آبیاری کر چکے تھے ۔ وہ ہرناق کے پاس گیا ۔ اُسے آواز دی ۔ اور کہا "صبح ہو چکی ہے ۔ اُٹھو ۔ تم کون
ر دیوی کے استھان سے کیا چُرا رہے ہو" ہرناق چونکا ۔ اُس نے سر اُٹھایا ۔ دیوی کو ہاتھ جوڑ کر سلام کیا ۔
ۓاری نے کہا "شوالہ میں کوئی شخص چوری کرنے نہیں آتا ۔ اور اے پاکباز برہمن، میں تو چُرا کر منگوا دیا گیا
ں"

ری "یعنی"

اق "یعنی مجھے دیوی کی آلہانہ قوتیں سوتے سے یہاں اُٹھا لائی ہیں ۔ میں خود نہیں آیا ہوں"

ری "اچھا تمہارا معاملہ بڑے دیو کے سامنے پیش کیا جائے گا، تم اُٹھو اور ہمیں صبح کے مراسم پورے
نے دو"

ہرناق مجبوراً اُٹھا اور ایک گوشہ میں کھڑا ہو گیا ۔ آذر غصہ کی تیز نگاہیں ہرناق پر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا ۔
ی صبح کے مراسم ادا کرنے لگے ۔ دیوی کے معتقد آتے تھے اور سلام کر کے چلے جاتے تھے ۔ مگر ہرناق ہاتھ
ے اور آنکھیں بند کئے شوالے کے ایک کونے میں مجرمانہ حیثیت سے ابتک کھڑا ہوا تھا ۔ اور اُس کی محویت
رہی ہوئی تھی کہ شوالے میں یکایک آنے کا مسئلہ بھی اب اُسکے دماغ سے باہر تھا ۔

(باقی آئندہ)

محمد شفیع شفیع اکبرآبادی

ہستی معصوم

(جناب مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی)

عنوان کو پڑھ کر غالباً آپ کا خیال قدرتاً فرشتوں کی جانب منتقل ہو گیا ۔ لیکن نہیں ۔ میں یہاں کچھ اور ہی
چاہتا ہوں ۔ آجکل کا کارنامہ مادیات سے غرض رکھتا ہے اور مادی تحقیقات سے بالقصد آگے بڑھنا نہیں
ا ۔ اس لئے روحانیاتِ محض کا ذکر بیجا ہے ۔ جبکہ سرے سے عالم غیر کا وجود ہی معرض انکار میں
ے ۔

ہاں تو یہاں "ہستی معصوم" سے وہ لطیف ہستی مراد ہے ۔ جسے صحیح معنی میں چہرہ کائنات کا آب و

رنگ کہہ سکتے ہیں۔ شاعرانہ زبان میں ادب کی ساری لطافتیں ایک سانس میں آپ جمع کرلیں جب بھی جملہ ناتمام ہی رہے گا۔ اور کہنے والے کے لئے جو تھوڑا سا مذاق تنقید بھی رکھتا ہو نہیں معلوم کیا کچھ کہنا باقی رہجائے گا۔ اسکئے بیان کی سادگی سفارشی ہے۔ کھلے لفظوں میں کہدوں میری غرض "مخلوق نازک ترین" یعنی عورت سے ہے!

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا،
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

ممکن ہے کسی کو عورت کے معصوم ہونے میں کلام ہو۔ لیکن اسے کیا کیجئے۔ میں ہزاروں گناہوں کے ساتھ بھی اس چیز کو معصوم ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے خوش مذاقی سے (بدمذاقی کہنا خلاف تہذیب ہوگا) آپ میرا شیوہ نیازمندی نہ سمجھئے۔ محض تقاضائے فطرت اور عین منشا حسن ہے جو کچھ عرض کر رہا ہوں۔

معصومیت کے جو معنی آپ کے نزدیک ہیں وہ میں جانتا ہوں۔ اور گو افراط سنجیدگی میرے لئے بیجوڑ سی شے ہے۔ تاہم خیام کی طرح وعدہ فردا سے اسقدر بدگمان بھی نہیں ہوں، کہ آپ کو شکایت کا موقع ملے بات صرف اتنی ہے۔ آپ کا ہم خیال ہونے کے باوجود بھی جنس لطیف یعنی عورت میرے نزدیک نہایت نازک تخیلات کی صرف تصویر مرئی ہے۔ جس کے پُر شباب سینے میں وجدان روحانی۔ ایک وصف اضافی سے زاید حیثیت نہیں رکھتا۔ اس میں شک نہیں کہ تناسب اعضا یہاں یک لخت بے تعلق یا نا انداز نہیں کہا جا سکتا جس پر بوالہوسوں کے دندانِ آز ہمیشہ تیز ہی رہے۔ لیکن میں اپنے خیالات کی نشو و نما اس دنیا میں چاہتا ہوں جہاں شرعی دُرّے بے ضرورت۔ اور سنبل کے تازیانے نرم و نازک ہاتھوں میں حفظ اخلاق کے ضامن ہیں۔

عورت کی غایتِ زندگی ایک چاہنے والے کے دلمیں تھوڑی سی جگہ۔ یعنی محبت ہے۔ جس دنیا میں آپ اور ہم ہزار دل جا و بیجا خواہشوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں "وہ" صرف اسی کی طالب رہتی ہے۔ سلطنت کو ٹھکرا دیگی۔ اگر ایک سچے چاہنے والے پر اپنے آپ کو حکمراں نہ پائے۔ ایک نور کی ہیکل کو قدموں کے نیچے رکھکر غیورانہ مسل دے گی۔ اگر شائبہ خلوص سے معرا دیکھ لے۔ دل سے دل ملا ہو تو پس پردہ خوش سن لیجئے۔ ورنہ لاکھ آنکھوں پر بٹھائیے۔ وہ خاک جھونک کے چلدے تو سہی!

ایوانِ ناز میں برقی فانوس کی ضیاباری۔ اس کے لئے خاص مذاق کی چیز ہے۔ لیکن اظہار دلچسپی اسوقت جائز سمجھتی ہے جب تیز و شفاف روشنی کسی کی نگاہ اشتیاق کو حد فاصل پر روکے ہوئے تڑپا رہی

ہو۔ یہ نہیں تو دنیا بھر کی تاریکی وہ اپنی خلوت انس میں سمیٹ لینے کے لئے تیار ہے!

عورت چاہے جس حالت میں ہو۔ خلوص اس کی فطرت کا عنصر لازمی ہے۔ جس کے بے ساختہ گرمجوشانہ اظہار سے کسی وقت وہ عاری نہیں!

اس حقیقت سے آپ کا مغایرانہ انکار کس حد تک لائق تحسین ہے۔ اس کا فیصلہ میں ان طبائع پر چھوڑتا ہوں جو عورت کو اس کی تمام حسیات لطیف کے ساتھ حدود نسائیت کے اندر ہی دیکھنے کی عادی ہیں۔ میں صرف اسقدر گزارش کرونگا کہ مالوفانہ اعتراف کے مقابلہ میں جو ذوق صحیح اور احساس کامل کا نتیجہ ہے۔ کسی بھونڈے مذاق کے پھوہڑ پن کو کوئی نسبت ہی نہیں دیجا سکتی۔

چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

چہ جائیکہ دونوں کو ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی بے محل کوشش تک کیجائے۔

دیکھئے۔ یہ ایک شان معصومیت ہے۔ جس کی ہوا بھی آپ کو چھو نہیں گئی۔ یعنی عورت اپنے نشاط زندگی پر دوسرے کو قابو پاتے ہوئے دیکھکر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے اور کسی رقیبانہ جذبہ سے متاثر ہونا بالکل عار سمجھتی ہے۔

نقصانات کے تصادم سے (چاہے وہ کسی نوع کے ہوں) اپنے ضمیر میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتی ہاں ایسے میں ایک "مستقبل تصویر" ہمیشہ پیش نظر رکھنے پر مجبور ہے جو خلوت و جلوت میں اس کی تمام تر دلچسپیوں کو پورے توجہ کے ساتھ اپنے میں جذب کرسکے۔!

جبین نازنین ایک باریک سی ناتمام شکن اسی وقت نظر آسکتی ہے۔ جب چاہنے والے میں احساس کی کمی دیکھے۔ ورنہ زندگی کے ہر مرحلہ میں اس کا تبسم زیر لب ہزار سامان حیات کے برابر ہے۔ "وہ" اپنے چاہنے والے کی ہر آزمائش کے متعلق حوصلہ افزا خیالات رکھتی ہے اور اسی امر کی صلاحیت کہ نازک سے نازک محل پر بھی اپنی طرف سے آپ کو بدگمان نہ ہونے دے۔ شرط صرف اتنی ہے۔ اسے آپ آہستہ سے اپنے دل میں پیوست ہو جانے دیجئے۔ اور اس سے اطمینان رکھئے۔ وہ پھول کی طرح نازک شے ہے اسلئے کانٹا بنکر آپ کو خلش نہ پہونچائے گی!

جوانانہ خوش فعلیوں میں کبھی وہ آپ اپنی تماشائی بن جاتی ہے۔ اور جو کیف سرور اپنے حریف

نزاکت سے مل کر حاصل ہو سکتا ہے۔تمہارا پکر اپنے باطن میں پیدا کرلیتی ہے۔ وہ اپنے کو اپنا غیر سمجھ کر خطاب عتاب کرتی ہے۔کبھی خود روٹھ جاتی ہے تو کوئی اُسے منانے لگتا ہے کبھی پردے میں کے آگے مجرم نادم کی حیثیت سے ہاتھ جوڑتی ہے کبھی اپنے محسوس و مجسم ہاتھوں سے کسی پیکر موہوم کا احاطہ کرنا چاہتی ہے۔ اور کبھی تھک کر اپنے کو اُسکے آغوش محبت میں سونپ دیتی ہے۔!

غرض بیخود ہو کے بھی آپ سے باہر نہیں جانا چاہتی۔ اور اُسکے ارادے محض ارادے نہایت خوبصورتی سے افعال کا جامہ پہن لیتے ہیں۔

فطرتِ نسائیت کی یہ وہ مخصوص ادائیں ہیں جن سے دوسرے محروم رکھے گئے ہیں۔

آباد ہے یہ کوچہ دل ناتواں تلک

عصمت پر فلسفیانہ نکتہ سنجی ایک ایسے دماغ کے لئے جو علمی بحثوں سے لگاؤ رکھتا ہو خوش آئندہ شغلہ ہے التجا تو بیموقع ہو گی۔ ہاں اتنی آرزو ضرور ہے۔کاش کبھی وہ اسطرف متوجہ ہو اور میرے اس ادعا کو کہ نسائیت و عصمت مرادف الفاظ ہیں قریحۂ صالحہ سے جانچے اور اپنے ذوق علمی کا ثبوت دے۔

گو میرے قبل از وقت اظہار رائے کو آپ بے تکی شہنائی سے تشبیہ دیں گے۔ تاہم اس خیال سے کہ بند امید ناقابل تحمل ہو جائے اسکا اظہار معیوب نہیں۔ میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نامزد موضوع پر نقد و نظر کے بعد دفعتاً جو تصویر چشم تصور کے آگے آکر کھڑی ہو جائے گی وہ ایک عورت ہو گی۔

ہماری زندگی کے اُس دایرہ میں "عورت" قدم تک رکھنا نہیں چاہتی۔ جسے قدرت کی فیاضی نے صرف ہمارے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ لیکن نگاہ اسقدر گہری رکھتی ہے کہ دایرہ کا کوئی سا شعبہ مس ناکردہ نہیں رہ جاتا اور جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہماری اخلاقی قوتیں کبھی کبھی حرکت میں آجاتی ہیں ورنہ معاف رکھا جاؤں جمود ہماری فطرت کا عنصر لازمی ہے جس سے کم از کم اس دنیا میں ہم دست بردار نہیں ہو سکتے۔

حیاتِ نسوانی کا یہ پہلو اسکے اچھوتے پن کا آئینہ ہے ذرا طرز تصرف کی بلاغت کو دیکھئے گا کتنی مانوس بیگانہ وشی ہے۔ اس سے تو اچھا کہ فعل رہیں مگر افتراق ذوق کیسا تھ۔

اب بھی آپ اسے غیر معصوم ثابت کرنا چاہیں تو۔ ع

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

درسِ شہادت

(جناب مولوی محمود الرب صاحب خالدؔ بنگالی)

ناامیدی اب نہیں جینے کی مطلق آرزو   آج پھر زخموں سے دل کے بہ گیا سیروں لہو
تیرہ و تاریک ہے نظروں میں دُنیا چارسو   آرہا ہے یاد مجھ کو زیرِ خنجر اک گلو
آہ۔ ہفتم تک رہی لاش اس کی وقفِ التہاب
تشنگی پر جس کی ہے تسنیم و کوثر آب آب

مہرِ انور پردۂ ظلمات میں روپوش ہے   غرۂ ماہ محرم شعلہ درآغوش ہے
چشمِ عالم صورتِ بیمارگاں خاموش ہے   کربلا کی خاک سے یوں آسماں ہمدوش ہے
کارواں اسدم ہے اک مہمان دشتِ بیکسی
جس کے قدموں نے بڑھائی شان دشتِ بیکسی

داغِ عصیاں ثبتِ لوحِ خاوراں ہونیکو ہے   خضر کو رنجِ حیاتِ جاوداں ہونیکو ہے
حرمتِ دیں آہ نذرِ ناکساں ہونیکو ہے   شورِ ماتم تا حریمِ لامکاں ہونیکو ہے
جاگ اُٹھے فتنے۔ الٰہی سو نجائے کائنات
خوف ہی مجھ کو کہیں گم ہو نجائے کائنات

آہ کیونکر اس غمِ جانکاہ کا اظہار ہو   نیلگوں چوٹوں سے جسکی گنبدِ دوّار ہو
نیم کش ہو تیر تو کچھ طاقتِ گفتار ہو   کیا محل گفتگو سینہ سے جبدم پار ہو
طعنے دیتے ہیں مگر رشک کے تو لائی مجھے
چھوڑ جا اسدم نہ تواے تاب گویائی مجھے

تھا یہی منظور کیا تجھ کو قلم کارِ ازل   تھا اسی کے واسطے فطرت کا یہ طرزِ عمل
گر پڑا ہے ٹوٹ کر بزمِ امامت کا کنول   اے زمیں ہشیار ہو اے آسماں دیکھ اب سنبھل
شامتِ اعمال پھرتی ہے بگولے کی طرح

مرکز عالم کو جنبش ہے ہنڈولے کی طرح

چشمِ عبرت سے ذرا اے آسمانِ پیر دیکھ　　کون سقا کا نِ شامی کا ہے یہ نخچیر دیکھ
دشتِ غم میں بیکسئ عترتِ شبیر دیکھ　　اُف! گلوئے اصغرِ ناداں میں زخمِ تیر دیکھ

خونِ سبطِ مصطفیٰ کو کرچکی دُنیا ہو ر
"الحذر از دستِ عصیانِ امت الحذر"

خاک وخوں میں ہیں لبِ دریا جوانانِ حسینؑ　　دست عابد میں ہے خون آلودہ دامانِ حسینؑ
کچھ نہیں جز رنج و درد و کرب سامانِ حسینؑ　　سینکڑوں تیر جفا ہیں ہر یک جانِ حسینؑ

اہلبیتِ مصطفیٰ میں کفر کی غارت گری
اے مسلمانان فغاں از دورِ چرخِ چنبری

آہ جب پیاسے گلے پر شمر نے پھیری چھری　　آسماں تھرا گیا غم سے زمیں ہلنے لگی،
نعشِ اکبرؓ دیکھ کر جب آخری انگڑائی لی　　شدتِ غم سے نجف میں روحِ حیدرؓ کانپ اُٹھی

کچھ خبر اس کی تجھے او گردشِ ایام ہے
گنبدِ خضرا اے یثرب رعشہ براندام ہے

فطرت معصوم اس غم سے گریباں چاک ہے　　اُف زمانے کی روش بھی کسقدر بیباک ہے
مضطرب صدمہ سے روحِ سیدِ لولاک ہے　　فاطمی خوں سے زمینِ کربلا نمناک ہے

قدسیوں کا حال ماتم میں نہ کیونکر غیر ہو
خاک اُڑتی ہے مدینہ میں الٰہی خیر ہو

زیرِ تربت آہ اب راحت نہ پائیں گی بتولؓ　　سیّدِ عالم کو رو رو کر جگائیں گی بتولؓ
جب کھلے سر عرصۂ محشر میں جائیں گی بتولؓ　　اک قیامت پیش داور اور ڈھائیں گی بتولؓ

آہ جس دم بخشش امت کی ساعت آئیگی،
خونِ فرزندانِ بیکس فاطمہؓ دکھلائیگی،

الفقر فخری

کیا کریں فریاد جب رکھتے نہیں فریاد رس — دم بخود ہیں اپنے عالم میں اسیرانِ قفس
ساز و برگ کارواں ہے اور نہ آوازِ جرس — اپنا مسلک ہے فقط اللہ بس باقی ہوس

رات دن کرتے رہے ہیں نفس کی قربانیاں
فخر الفقر فخری ہیں ہمہ بے سامانیاں

جامہ استبرق و قاقم سے ہم کو کام کیا؟ — ساغر جمشید کیا؟ اور بادۂ گلفام کیا؟
داستانِ شکوہائے گردشِ ایام کیا؟ — راتدن یکساں ہیں ہم کو صبح کیا اور شام کیا

چشم عبرت میں ہمیشہ سے یہ دونوں رنگ ہیں
دل کے پردے اس نوا سے ساز ہم آہنگ ہیں

بے بقا ہے جب تو یہ انشا غلط دفتر غلط، — نظم سیار و ثوابت صورت محور غلط،
جلوۂ مہر مبین و تابشِ اختر غلط، — نقطہ نقطہ فردِ ہستی کا ہی سرتاسر غلط،

اس نمودِ بے بقا سے کسب عبرت کیجئے
عالم کثرت میں رہکر درس وحدت کیجئے

وہم باطل کار عقلِ تفرقہ پرداز ہے — دل پہ قبضہ ہو جسے وہ مایۂ صد ناز ہے
سازِ نیرنگِ جہاں بھی دیکھئے کیا ساز ہے — مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

نور پیدا ہو رہے ہیں ایک ہی تنویر سے
اتنی تصویریں کھچی ہیں ایک ہی تصویر سے

عیش فانی کا تصور لغو ہے بے ہودہ ہے — حبِ دنیا سے دلِ غم آشنا آسودہ ہے
ایک حصرِ فقر ہے وہ بھی غبار آلودہ ہے — صبر ایوبی ہمارا شیوۂ فرسودہ ہے

(نظیری)
درد دل را می کنم با ضبط پیوندے دگر
بر طبیب خود تغافل میزنم چندے دگر

ہم کو اُس سے کیا غرض ہو قصرِ گردوں کا جواب
نقش جبرِ لدوا للموت وابنو للخراب
ہم جہاں ہیں وہ زمیں ہے رو کشِ صد آفتاب
ذرہ ذرہ ہے ہماری خاک کا حکمت مآب
بارگاہِ حق میں حاضر ہیں ہمیشہ دل بکف
خاک کے پتلے ہیں ہم اور نوریوں پر ہے شرف

عزیزؔ (لکھنوی)

مسلک تسلیم

مطربہ خوش گلو کمسن و رنگین ادا
عربدہ جو، خوبرو، عشوہ گر و فتنہ زا
دستِ حنائی میں اک جامِ نگاری لئے
محفلِ رنداں میں کل یوں ہوئی نغمہ سرا
شورِ فغاں تابہ کے رنج و الم تا کجا
واقفِ رازِ جہاں کون ہوا آج تک
ساحلِ بحرِ بقا کس کو ملا آج تک
عارضِ مقصود کا بوسہ میسر کسے
محملِ اندیشہ تک اُٹھ نہ سکا آج تک
عقدۂ ہستی کو حل کس نے کیا آج تک
عالمِ افلاک کی دید ہوئی یا سِ خیز
باسے نظر سے کہیں ان کی تھی رفتار تیز
فرش سے ہی عرش تک گلکدۂ کائنات
اپنا کرہ اس میں ہے صورتِ گل شک بیز
جیسے ہو اک قطرہ میں عکسِ چمن جلوہ ریز
ذرۂ ناچیز کی ہوتی تو ہے کچھ نمود
اس سے کہیں کم ہے آہ، دہر میں اپنا وجود
بندۂ تسلیم بن اور ہو وقفِ سجود

محمود (اسرائیلی)

مٹنے کی نہیں ہے کبھی گجرات میں اردو

ہے گرچہ پھنسی ورطہ آفات میں اردو
مٹنے کی نہیں ہے کبھی گجرات میں اردو

ہ تیر کی ہے "آہ" "یہ غالب کا ہے" "نغمہ"
زندہ ہے ولی تیری مناجات میں اردو

زنار ہیں تسبیح کے دانے ہیں پروئے
ہے برزخ الفت صفت و ذات میں اردو

وم سے گجرات میں توحید کے شیدا
باقی رہی پیروں کی کرامات میں اردو

انے ہیں اسے مہد سے بے شبہ لحد تک
محدود ہے کب شعر و حکایات میں اردو

آنکھوں پہ پڑے "جہل و تعصب" کے ہیں پردے
مٹتی ہے "الکشن" کی خرافات میں اردو

کہدو یہ حریفوں سے یہ ہے نشۂ عرفاں
لائی ہے عجب رنگ خرابات میں اردو

ملت کا اگر درد ہے نواب دلوں میں
آئے گی سدا یاد ہر اک بات میں اردو

نواب علی
(از بڑودہ)

سیّد القوم خادمھم

شاہ ہاروں الرشید باصفا کے عہد میں / تھا بنی عباس میں جو سرورِ عالی مقام
قاضی یحییٰ بن اکثم عالم مشہور نے / ایک دن ایوانِ شاہی میں کیا آکر قیام
رات کو سوئے تو اُٹھے خواب سے پچھلے پہر / کیونکہ مارے پیاس کے وہ ہو رہے تھے تشنہ کام
چاہتے تھے اُٹھیں بستر سے وہ پانی کے لئے / اور بجھائیں تشنگی اپنی وہ جاکر بالمرام
پاؤں کی آہٹ جو اُٹھنے میں خلیفہ نے سُنی / سو رہا تھا جو قریب اُن کے وہیں آسودہ کام
جھٹ اُٹھا بستر سے اور ہو کر کھڑا کہنے لگا / "اس گھڑی کیا آپ پانی پیجئے گا اے امام"؟
روک کر اُن کو وہیں خود جاکے پانی لا دیا / جس سے اپنے دل میں شرمندہ ہوئے وہ نیکنام
معذرت کی اور بولے "یا امیر المومنین! / کیا نہ تھا حاضر یہاں پر آپکا کوئی غلام"؟
تب خلیفہ نے کہا "کیا میں سناؤں آپ کو / ہے جو ارشادِ جنابِ خاتم الرسل الکرام؟

جو مسلمانوں میں اپنی قوم کا سردار ہے
ہے وہ بیشک ان کا اک ادنیٰ سا خادم اور غلام

اختر (جوناگڈھی)

رباعی محمود

(در صنعت مقلوب)

الفاظ میں اک لطف نمایاں دیکھا / نالاں کو ہر اک طور سے نالاں دیکھا
اقبال سے لابقا ہی نکلا محمود، / نادان کو اُلٹا ہی تو نادان دیکھا

محمود اسرائیلی

عقد پروین

(حضرت حاتم اصمؒ کے حکیمانہ اقوال و نصائح)

اگر تو یار کوئی چاہتا ہے | تو ہے وہ ایک رب العالمیں بس
اگر ہمراہیوں کی ہے ضرورت | تو ساتھی ہیں کراماً کاتبیں بس
جو ہے عبرت کے نظارہ کی خواہش | تو اس دُنیا کو دیکھ اے ہمنشیں بس
کوئی مونس اگر تو چاہتا ہے | تو ہے واللہ قرآنِ مُبیں بس
اگر کچھ کام تجھ کو چاہئے تو | جُھکا حق کی عبادت میں جبیں بس
اگر ہے وعظ کی تجھ کو ضرورت | تو کوئی مرگ سے بڑھکر نہیں بس
سُنا تونے کہا جو کچھ کہ میں نے | نصیحت یہ اگر تجھ کو نہیں بس

تو پھر یہ آخری بھی بات سُن لے
کہ ہے تو دوزخی کر لے یقیں بس

کامل (جوناگڈہی)

سلام

(از جناب حکیم سید فضل علی صاحب مرحوم شفا بڑودوی)

ہی طبع زوروں پہ پیری میں عنفواں کیطرح | زمین شعر دکھاتی ہے آسماں کیطرح
پتا لحد کا نہیں خاکِ جسمِ جاں کیطرح | مکیں کا نام و نشاں مٹ گیا مکاں کیطرح
جگہ نہ اُلفتِ دُنیا کی تھی دلِ حُر میں | دلائے شاہ نے گھر کر لیا تھا جاں کیطرح
انہیں بھی کر دیا اُمت پہ شاہِ دیں نے نثار | کہ جنکو گود میں پالا تھا اپنی جاں کیطرح
بچایا کشتیٔ اُمت کو غرق ہونے سے | ردائے فاطمہؓ زہرا نے بادباں کیطرح

نہ بہکا جادۂ حق سے جو حر یہ باعث تھا
کہ ساتھ ساتھ تھی رحمت نگاہباں کیطرح

یہ داغ ماتم شبیرؑ دیکھنا اک دن
لحد میں دیگا ضیا مہر آسماں کی طرح،

بُرائی اور بھلائی سے متصف ہے یہی
محال کہنے ہے ممکن کیا زباں کیطرح

ہم تھی دولت اولاد و مال و زر لیکن
کسی نے نام نہ روشن کیا زباں کیطرح

ہمیں ہو مدت بہر سیام کا کیاؓ در
سروں پہ رحمت حق ہوگی سائباں کیطرح

بلائیں روضہ پہ حضرت جوآگئی سال شفا
پڑھوں سلام یہ ممبر پہ روضہ خواں کیطرح

تاریخ اجرائے رسالہ زبان

(از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈہی)

تعالی اللہ کہ شد دورِ فلک آخر بکام ما
بر آمد از پس مدت تمنائے دلِ اختر

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے او نمود اکنوں
کمربستہ باجرا ر رسالہ حضرتِ خوشتر

دعا دارم مُورا ایزد بقائے جاوداں بخشد
شود از جملہ اردو رسائل افضل و برتر

پئے تاریخ اجرائے رسالہ فکر می کردم،
سروشم داد ایں مژدہ "زبانِ دلکش و خوشتر"

۱۹ ۶ ۲۶

غزلیات

(خاکسار عبد الرحمٰن خوشتر منگرولی ایڈیٹر)

ایک دونوں کی جب نظر ہو گی　　دونوں جانب وہ کارگر ہو گی
کیا خبر تھی کہ اشک باری سے　　آتش عشق تیز تر ہو گی
قہر ٹوٹے گا جان دشمن پر　　لطف کی مجھ پہ جب نظر ہو گی
کیا یہ سمجھے ہو تم دعا کی طرح　　آہ بھی میری بے اثر ہو گی؟
آپ سے اور غیر کو الفت!　　ہو گی لیکن نہ اسقدر ہو گی
کیا ہمارے ہی باغ عالم میں　　شاخ امید بے ثمر ہو گی؟
دست الفت جو آپ کہدیں گے　　کم ذرا سوزش جگر ہو گی
غیر سے کام! غیر سے مطلب!　　جب نظر ہو گی یار پر ہو گی
جس سے تر ہو گی آستیں تیری　　وہ ہماری ہی چشم تر ہو گی
مجھ پہ اس شوخ کی نگاہ کرم　　نہیں ہوتی کبھی مگر ہو گی

رنج و آفت میں یونہی اے خوشتر
عمر کب تک تری بسر ہو گی

(از جناب محمد یوسف صاحب ناظم لکھنوی)

داغ جو آپکا دیا ہو گا،　　مشعل عشق کا دیا ہو گا
دل میں کیا درد کے سوا ہو گا　　درد بھی وہ کہ لا دوا ہو گا
ہے یہ کافی کہ وہ کہے اپنا　　حق خدمت تو کیا ادا ہو گا
ہم تمہارے نیاز مند سہی　　ناز بردار دوسرا ہو گا
وہ الست بربکم تو کہے　　ہر زباں پر بلا بلا ہو گا
ما عرفناک حق معرفتک　　وہ کہے گا جو آشنا ہو گا
بلبلیں کیوں خموش ہیں شاید　　آج ناظم غزل سرا ہو گا

اخبار علمیہ

علمی اصطلاحات

۱) دمشق کے مجمع علمی العربی نے آلۃ الکاتبہ (Typewriter) کے لئے لفظ "النّاسخۃ" ضع کیا ہے۔

۲) ابتک ہمارے ہاں (Botanical) کے لئے لفظ "نباتی" مستعمل ہے مگر پانچویں صدی ہجری یں ابن بیطار نامی اندلسی عالم نباتات نے اس کے لئے لفظ "شجّار" وضع کرلیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مفردات میں فظ قرصعنہ کے تحت میں لکھتے ہیں:-

"وکلّھا مشھورۃ عند الاطباء والشجّارین"

۳) مصر کے ایک عالم عارف بک النکدی نے تحقیق کیا ہے کہ امام ابن تیمیہ نے لفظ ھیئۃ الاجتماعیہ نہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جن معنوں میں آجکل مستعمل ہے۔

۴) ہمارے ہاں تھیوری کے لئے لفظ "نظریہ" مستعمل ہے۔ علامہ ابن خلدون نے نظریات کے لئے "انظار" لفظ استعمال کیا ہے۔

۵) مصریوں نے موٹر کار کے لئے "سیارۃ الکہربائیۃ" وضع کیا ہے۔ (الزہرار)

باغ حیوانات

عام خیال یہ ہے کہ باغ حیوانات (زُولاجیکل گارڈن) اہل یورپ کی ایجاد ہے، مگر تاریخی شہادت اس کو خلاف واقعہ قرار دیتی ہے۔ عربی تواریخ میں اس کے لئے لفظ "حیر الوحش" آیا ہے، اور سب سے پہلے عباسی خلیفہ المامون نے اس کو قایم کیا۔ اس نے یہ باغ حیوانات اپنی زوجہ بوران کے لئے بغداد میں نہر عیسٰی کے کنارے قصر ثریا سے

متصل تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد خلیفہ المقتدر باللہ نے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا۔
(ملاحظہ ہو تاریخ بغداد للخطیب (مقدمہ) ص۴۸ طبع پیرس)

(الزہرا)

عرب میں سونے کے دانتوں کا رواج

امام سیوطی بغیۃ الوعاۃ (ص۳۹۲) میں معاذ بن مسلم الہراء کے حالات میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دانتوں پر سونا چڑھایا تھا۔ یہ پہلے نحوی ہیں جنہوں نے علم التصریف وضع کیا۔ یہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

شمال یورپ میں اسلامی سکّہ جات

پروفیسر محمود بک سالم نے جمعیۃ الجغرافیۃ الخدیویہ کے سامنے ایک لکچر دیا جس میں انہوں نے بیان کیا:-

"ڈاکٹر جارج یاکوب کہتے ہیں کہ ۱۸۳۶ء میں انہوں نے جزیرہ آئیسلینڈ میں صوبہ بیرار کے ایک قصبہ میوڈال میں، اور گرین لینڈ میں قطب شمال کے قریب اسلامی سکہ جات دریافت کئے۔ مگر اب تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ اس منطقہ میں یہ اسلامی نقود کیسے منتقل ہو گئے۔"

"علاوہ ازیں شمال یورپ کے اکثر حصوں خصوصاً روس، جرمنی، سویڈن وغیرہ میں کئی سکے برآمد ہوئے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر ٹورنبرگ نے ۱۸۵۷ء میں سویڈن کے ان ۱۶۹ مقامات کے نام بتائے ہیں جہاں سے یہ نقود برآمد ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر ہانس ہلڈ براند نے ۱۸۷۳ء میں عربی نقرئی سکے جزیرۂ جوٹلینڈ۔ (عوتلاندہ) میں معلوم کئے جن کی تعداد ۱۳ ہزار سے زاید تھی۔

بلغاریہ، جرمن، نارمنڈی، انگلستان، اسکونیا وغیرہ میں ایسے نقود پائے گئے ہیں جن پر خوشخط کوفی حروف منقوش ہیں۔"

(الزہرا)

مستقبل کا اخبار

سر رابرٹ ڈونالڈ نے لندن کے سسیل ہوٹل میں روٹری کلب کے لنچ کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مستقبل کا اخبار صرف واقعات کی چھوٹی چھوٹی تصاویر پر مشتمل ہوگا۔

یہ تصاویر انہی مقامات سے جہاں سے کہ وہ لیجائے گی، براہ راست خریداروں کو بھیجدی جایا کرینگی۔

اسلامی جذبۂ خودداری

استاذ جبرتی اپنی تاریخ اسلام میں ۲۰ ربیع الاوّل ۱۲۱۳ھ کے حوادث میں رقمطراز ہیں:-

"بوناپارٹ کے امیرالافواج نے مشائخ مصر کو طلب کیا۔ جب وہ آکر اس کے سامنے کھڑے ہوگئے تو بوناپارٹ مجلس سے اُٹھ گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تین قسم کی رنگین چادریں تھیں۔ ہر چادر تین گز کی تھی۔ سفید، سُرخ اور سرمئی، ان میں سے ایک چادر اس نے شیخ شرقاوی کے کندھے پر رکھدی شیخ نے خفا ہو کر وہ چادر زمین پر گرا دی انکا مزاج برہم اور چہرہ کا رنگ متغیر ہوگیا۔ تو ترجمان نے عرض کی کہ یا حضرت مشائخ آپ ہمارے سپہ سالار صاحب کے دوست بنائے گئے ہیں اس لئے وہ اس طرح آپ کی تعظیم و تکریم کرنا چاہتا ہے۔ اس علامت سے آپ وہ امتیاز حاصل کرلیں گے کہ عوام اور فوجی لوگ آپکی تعظیم کریں گے اور اُن کے دل میں آپ کی وقعت بڑھجائیگی۔ ان بزرگوں نے جواب دیا:-

"مگر ہماری قدر و منزلت خدا کے ہاں اور ہمارے برادران اسلام کے نزدیک یقیناً خاک میں مل جائے گی۔!"

کیا موجودہ زمانہ کے حضرات مشائخ بھی ایسے ہی جذبۂ اسلامی و جوش مذہبی سے متاثر پائے جاتے ہیں؟

(الزہراء)

زبان

جلد ۱ | فہرست مضامین ماہ اگست سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر ۲

صفحۂ ادارت

رسالہ "زبان" صرف علمی خدمت کے خیال سے جاری کیا گیا ہے اسمیں کسی طرح کی ، منفعت کا شائبہ تک نہیں مگر اعلیٰ علمی مضامین کی بہم رسانی ایک ایسا دشوار گذار مرحلہ ہے جس سے ہر مدیر رسالہ کو دوچار ہونا پڑتا ہی ہمنے قلمی اعانت کے لئے بعض اہل قلم سے متعدد درخواستیں کی ہیں مگر انھوں نے ابتک "جنبش قلم" سے ہمکو ممنون نہیں فرمایا ہم ملک کے لائق اہل اور انشاپردازوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ خالص علمی تاریخی و ادبی مضامین ارسال فرمائیں جو حضرات معاوضہ مضامین دینا چاہیں گے ہم انکی خدمت میں معقول معاوضہ بھی پیش کرنے کو حاضر ہیں جو ذریعہ خط و کتابت طے ہو ہے۔

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعم را

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ موقر ہمعصر "معارف" (اعظم گڈھ) نے مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کا نوٹس لیا تھا اور ان غلط اور گستاخانہ تحریرات کی طرف اس کے مدون کو توجہ دلائی تھی جو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق کتاب مذ میں (عمداً یا سہواً) درج کردی گئی ہیں۔ حال میں ہمارے مکرم جناب سید نواب علی صاحب پروفیسر بڑودہ کالج نے انگ روزنامہ بمبئی کرانیکل میں ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے جسمیں انہوں نے ان غلط الزامات اور گستاخانہ الفاظ کی تردید کر ہوئے مدون انسائیکلوپیڈیا کے اس "عذر لنگ" کا کافی جواب دیا ہے جو اس نے امور متنازعہ فیہ کی نسبت پیش کیا یعنی کہ ان معلومات کا ماخذ مشہور دشمن اسلام مارگولیتھ کی تصنیف ہے۔

کسقدر شرم و افسوس کی بات ہے کہ خالص علمی تحریرات میں بھی ہمارے ہندو بھائی اس قسم کی ناشائستہ حرکتو باز نہیں آتے کیا یہی باتیں شیرازۂ قومیت و اتحاد کو محکم کرنے والی ہیں ؟

ہمیں یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی ہے کہ اعلیحضرت حضور نظام دکن (خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ) نے قلمروے آصفیہ میں انسائیکلوپیڈیا کے داخلہ کی ممانعت کردی ہے ہمیں امید ہے کہ اور مسلمان والیان ریاست حضور نظام کی تقلید میں اس قسم منافرت انگیز کتابوں کو اپنی حدود میں آنے سے باز رکھیں گے جو باشندگان ہند کے جذبات و احساسات کو ٹھیس لگا کر نفر

عدالت کی خلیج کو وسیع تر کر دینے والی ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اکثر حملے ہوس ملک گیری۔ بت شکنی اور لوٹ مار کی غرض سے معرض وجود میں آئے ہیں لیکن اس بات کی کبھی تحقیق نہیں کیجاتی کہ اصل اسباب کیا تھے اور کن وجوہ کی بنا پر مسلمان سلاطین کو ہندو راجاؤں پر فوج کشی کرنی پڑی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان کے ظلم و تشدد سے تنگ آئی ہوئی مسلمان رعایا کی فریاد پر ان مسلمان سلاطین کو انکی گوشمالی کرنی پڑی ہے۔

چنانچہ ہمیں اپنے دعوی کے ثبوت میں ایک مستند و معتبر تاریخی دستاویز پیش کرنی ہے جو فتح جوناگڈھ کے اصل سبب پر کافی روشنی ڈالتی ہے یہ ایک خط ہے جو منگرول کے ایک مشہور بزرگ حضرت سید رکن الدین المعروف بہ سید راجو صاحب نبیرہ حضرت سید[illegible] سکندر بن مسعود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیطرف سے انکے پیر و مرشد قطب الاقطاب حضرت شاہ عالم (ولادت ۸۱۷ھ وفات ۸۸۰ھ) قدس اللہ سرہ العزیز کے نام فارسی میں بخط عربی احمدآباد لکھا گیا ہے اسمیں انہوں نے راجہ را مانڈلیک حاکم سورٹھ (در کاٹھیاواڑ) کے مسلمانوں پر ظلم و تشدد کے حالات تحریر فرمائے ہیں اور عرض کی ہنے کہ اس طرف سلطان محمود (بیگڑہ) کی توجہ مبذول کرائی جائے تاکہ وہ حملہ آور ہوکر اسکے شر و فساد کا قلع و قمع کردیں اسی خط کی پشت پر حضرت شاہ عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب درج ہے جسمیں آپ نے کاتب کو اطمینان دلایا ہے۔ یہ مکتوب گرامی اس وقت یہاں (منگرول) کے سجادہ نشین سید محمد صاحب مدظلہ کے پاس موجود ہے جو حضرت سید سکندر بن مسعود (جہانیاں جہانگشت) کی اولاد میں سے ہیں۔ اس خط کے دونوں طرف کے فوٹو لئے گئے ہیں جو ہم انشاءاللہ کسی آیندہ اشاعت میں شائع کریں گے۔

زبان کے رفقائے کار میں سب سے زیادہ ہمارے شکریہ کے مستحق حضرت شاہ دستگیر صاحب ہیں جنہوں نے نہ صرف ہمیں طباعت کے ناقابل بیان مخمصات ہی سے سبکدوش کردیا ہے بلکہ "زبان" میں جو حسن ترتیب اور حسن اہتمام نظر آرہا ہے وہ سب آپ ہی کی بے لوث جگر کاوی و مخلصانہ سعی بلیغ کا نتیجہ ہے۔ جس کے لئے ہم شاہ صاحب کے نہایت ممنون و مشکور ہیں۔

اڈیٹر

زبان

ماہ اگست ۱۹۲۶ء

مقالات

علم اور اسلام

(مولینا مولوی محمد اسمعیل صاحب اصلاحی اعظم گڈہی)

یہاں تک تو موسیو رینان کے حالات زندگی تھے ۔ اب ہم اس کے فلسفہ اور خیالات پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں
پروفیسر رینان فرانسیسی مصنفین میں اپنی مخصوص فصاحت و بلاغت اور طلاقت کلام اور اہم مباحث و مضامین کے لحاظ سے جسے قوم نے ہاتھوں ہاتھ لیا ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اسی لئے اس کی تصنیفات ۔ تالیفات اور رسائل کا شمار فرانس کے کثیر الاشاعت اور ہر دلعزیز لٹریچر میں ہوا ۔ اور پبلک میں انہیں یہاں تک اعتبار حاصل ہوا کہ اس کی بعض کتابوں (مثلاً السیرۃ المسیحیہ) کے چودہ ایڈیشن تک کی نوبت آئی جس کا شمار فرانس کی اعلیٰ بلیغ کتابوں میں ہے ۔ اسکی کتاب "تذکار الصبا والعقولیہ" اور کتاب "تشقیقی" (ہنریٹ) بھی اسی قسم کی کتابیں ہیں ۔ جو چودہ چودہ مرتبہ چھپیں۔

پروفیسر رینان اپنے زمانے میں "مذہبیات" کا سب سے بڑا عالم تھا اور سامی السنہ، علوم، تاریخ، معتقدات اور اخلاق کی زبردست واقفیت کے ساتھ مذہبی مسائل پر نہایت آزادی کے ساتھ بحث کیا کرتا تھا ۔ جیسا کہ آیندہ اوراق میں نظر آئے گا۔

جب وہ کسی مسئلہ کی مدافعت کرتا جسے وہ اپنے ضمیر اور اذعان کے فیصلہ سے (تقلید یا آبائی عقیدے سے نہیں) ضروری سمجھتا تو اس کو اس خوبی سے انجام دیتا کہ علمائے یورپ میں معدودے چندہی لوگ ایسے ہیں جو اس درجہ کو پہنچ سکتے ہیں۔

رینان کی حالاتِ زندگی میں سب سے زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی تمام

زندگی گرجا کی چاردیواریوں اور حجروں میں بسر کی اور وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی مذہبی کتب اور اصول کا بہ نظر تنقید مطالعہ کیا اور وہ پہلا شخص ہے جس نے انجیل کی اصل زبانوں کو پڑھا اور اس میں دست گاہِ کامل پیدا کی باوجود ان تمام باتوں کے وہ پہلا شخص ہے جس نے دین مسیحی کو خیرباد کہا۔

میرے خیال میں رینان کے ارتداد کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مسیحی پادری فلسفہ کے مخالف تھے بلکہ بڑی اور اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے غیر مذاہب کی تعلیمات اور اصول سے واقفیت پیدا کی۔ اور پھر ان کا آپس میں موازنہ کیا ع

"وبضدھا تتمیز الاشیاء"

اور یہی اصول موازنہ ہے جسے حکمائے اسلام (فلاسفۂ اسلام) نے میزان قرار دی ہے اس لئے کہ انہوں نے مذہب اسلام کو تقلیداً یا ورثتاً قبول نہیں کیا تھا جیسا کہ بعض اُن لوگوں کا خیال ہے جنھوں نے فلاسفہ اسلام کی کتابیں نہیں دیکھی ہیں بلکہ انہوں نے اسلام کو اس صداقت کی وجہ سے قبول کیا تھا جو ان میں اسلام اور دیگر مذاہب میں موازنہ کرنے کے بعد نظر آئی تھی۔

خلاصہ یہ کہ پروفیسر رینان نے ایک مذہبی مصلح (رفارمر) کی طرح تجدید مسیحیت کے سلسلہ میں عظیم الشان خدمات انجام دیں اور قوم کو حقیقی مسیحیت کی دعوت دی جو اس کے خیال کے مطابق عقاید کے لحاظ سے توحید باری تعالےٰ بلا شرکت غیرے اور اعمال کے لحاظ سے صفائی باطن اور ہمدردی حق و انصاف پر مشتمل ہے۔

موسیو رینان نے قدیم مسیحی کتابوں کے بحث و تمحیص کرکے پرخچے اڑا دیے اور عقل و رایت کو حکم قرار دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے زبردست اور خالص اصولِ توحید کو تسلیم کرنا پڑا۔

اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں سب کو سرنگون ہو جانا پڑا ہے چاہے وہ اسلام کے فلاسفہ و متکلمین ہوں یا یورپ کے روشن خیال مسیحی مصنفین اور دہریے۔ لیکن اس بات کی دلیل کہ کائنات عالم کا کوئی رب اور خالق ہے یہ ہے کہ خود عقل انسانی کسی طرح یہ تسلیم نہیں کرتی کہ کائنات کی علت صرف مادہ ہو جو محض ایک جسم بیجان ہے یا متکلمین کے الفاظ میں یوں کہئے کہ بغیر مؤثر کے کسی اثر کا پایا جانا ناممکن ہے اور یہی تقاضائے عقل ہی ہے۔ رینان کی یہ ایک فلسفیانہ رائے ہے کہ کائنات اور انسان کی ترقی جس پر تمام مباحث فلسفہ کا مدار ہے۔ صرف عقلی اور داعی فلسفہ سے ناممکن ہے بلکہ یہ بات علوم حسیہ مثلاً ریاضیات۔ طبیعات۔ کیمیا۔ تاریخ اور علم الالسنہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اسلام کے متعلق رینان کی خاص رائے اس کے اس قول سے صاف ظاہر ہوتی ہے وہ کہتا ہے

کہ :-

"اپنی زندگی میں جب کبھی میں مسلمانوں کی مسجدوں میں داخل ہوا ہوں تو میں نے اپنے اندر اسلام کی طرف ایک خاص کشش محسوس کی بلکہ مجھے اپنے مسلمان نہ ہونے پر افسوس ہوا"

رینان اپنی کتاب ابن رشد اور اس کا فلسفہ کے صفحہ ۱۶۳ پر لکھتا ہے کہ :-

"ہمارے پاس ابن رشد کو ایک مخلص مسلمان نہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسلام کے متعلق جو کچھ تھوڑی بہت معلومات ہمیں حاصل ہیں ان کو اسلام کے خالص عقائد اور تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں اور خود اسلام ہی ان باتوں کو غیر معقول اور لغو قرار دیتا ہے ۔ اسلام کے عقائد تو نہایت صاف ستھرے اور صحیح خیالات کا مجموعہ ہیں"

جو شخص رینان اور امام غزالی رح کے حالات کا باہم مقابلہ کرے گا اسے نظر آئیگا کہ رینان یورپ کا غزالی تھا فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر نے مذہب کو چھوڑ کر تسکین قلب پائی اور موخر الذکر کو یونان کی پیچ در پیچ گتھیوں سے الگ ہو کر مذہب میں راہ حق ہاتھ آئی۔

موسیو رینان کا لکچر

موسیو رینان نے پیرس کے سربون کالج میں علمائے فرانس کے سامنے "اسلام اور علم" کے عنوان پر ایک بسیط لکچر دیا جس کا ملخص حسب ذیل ہے :-

آج میں آپ لوگوں کے سامنے ایک اہم اور دقیق علمی مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں جسکی تحقیق نہایت ضروری ہے اس لئے کہ مورخین کی سہل انکاری نے اس میں بہت کچھ غلط فہمی پیدا کر دی ہے پروفیسر مذکور اپنی تقریر کی ابتدا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :-

مورخین نے بلا سوچے سمجھے محض سہل انکاری سے کام لیکر بعض خاص خاص چیزوں کو خاص خاص اقوام سے منسوب کر دیا ہے جس سے اصل حقیقت پر بہت کچھ پردہ پڑ گیا ہے مثلاً انھوں نے یونانی رومی اور عرب سے ان اقوام کو تعبیر کیا ہے گویا وہ اپنے اصل حالات اور خصائص پر قایم ہیں ۔ انھوں نے اس کی بالکل پرواہ نہیں کی کہ امتدا

مانے ان کے حالات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنے قدیم اور گذشتہ حالات سے یکسر متبائن متغائر ہو گئی ہیں اور ملکی فتوحات مذہبی انقلابات اور دوسرے اہم واقعات و تصرفات جو نوع انسان کی تاریخ میں آئے ن پیش آیا کرتے ہیں اس عظیم الشان اور زبردست انقلاب کا باعث ہوتے ہیں۔

حالات کا اقتضاء ہے کہ ہم اس مسئلہ میں نہایت امعان نظر اور عمیق غور و فکر سے کام لیں مثال کے طور پر ہم اہل رانس زبان کے اعتبار سے رومی، تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے یونانی، اور مذہب کے اعتبار سے یہودی ہیں، ہ اور قوموں کا خاندانی اور نسلی امتیاز باوجود اپنی زبردست اہمیت اور اپنی اصل کی واقفیت کے مرور حوادث، امتداد زمانہ، اور انقلاب اقوام سے اثر پذیر ہوتا رہتا ہے، مثلاً یونانیوں کا تمدن، رومیوں اور جرمنوں کی فتوحات، عیسائیت اور اسلام کا ظہور زمانہ انتعاش علوم عہد فلسفۂ جدیدہ اور انقلاب فرانس اس قسم کے حوادث اور واقعات جب دنیا میں رونما ہوتے ہیں تو قوموں کے امتیازی خصوصیات اور ان کے ممتاز عادات و اطوار میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے بلکہ ان کی خصوصیتیں بڑی حد تک مٹ جاتی ہیں اور وہ آپس کی کثرت اختلاط اور میل جول سے تقریباً ایک ہی قوم بن جاتی ہیں اب ہم اسی قسم کی ایک تاریخی سہل انگاری پر کسی قدر تفصیل سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

آجکل عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ عربوں کے علوم، عربوں کے فنون، عربوں کا تمدن، عربوں کا فلسفہ، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کا تمدن وغیرہ وغیرہ اس سے ایک عالمگیر غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور بکثرت غلط خیالات کی اشاعت ہو گئی ہے جو شخص ہم اہل یورپ کے حالات سے تھوڑا بہت بھی واقف ہے اسے معلوم ہوگا کہ آجکل اسلامی ممالک اسلامی سلطنتیں کسقدر انحطاط اور تنزل کی حالت میں ہیں اور مختلف قومیں جنھوں نے اس دین کو قبول کیا کیسی جہالت اور تاریکی میں مبتلا ہیں۔

جس نے مشرقی افریقہ کا سفر کیا ہے اسے معلوم ہے کہ وہاں کے (مسلمان) لوگ کسقدر احمق اور بیوقوف ہوتے ہیں، مذہب ان کے دل و دماغ پر پردہ ڈال دیتا ہے اس لئے وہ جدید علوم و فنون سے بے بہرہ رہتے ہیں اول تو ان کے بچے ذہین اور سمجھدار ہوتے ہی بہت کم ہیں لیکن جب وہ دس بارہ برس کی عمر کو پہونچتے ہیں اور مذہبی عقائد سیکھ لیتے ہیں تو پھر سخت متعصب ہو جاتے ہیں اور ان کو اس میں اسقدر غلو ہو جاتا ہے کہ اپنے علاوہ سب کو وہ احمق سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہوتا ہے بس صرف وہی حق پر ہوتے ہیں اور اسلئے وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت اور مبارک سمجھتے ہیں در اصل یہی ان کے انحطاط اور تنزل کا باعث ہے

یہی تفاخر اور خودستائی مسلمانوں کی بدترین عادت ہے اور اسی لئے اُن کو اپنی عبادتوں میں بھی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جس سے وہ غیر مذاہب کو ذلیل اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور چونکہ "توکل علی اللہ" اُن کا عقیدہ ہے کہ خداوند تعالےٰ جس کو چاہے بغیر کوشش وسعی کے فضل و کمال عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بغیر محنت و مشقت کے ملک و سلطنت بخشتا ہے اس لئے وہ تعلیم اور صنعت وحرفت کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ علوم وفنون اور یورپ کی موجودہ ترقیات سے کوسوں دور ہیں اور مسلمانوں کے انہیں خصائل وعقاید نے جو مذہب نے ان میں پیدا کر دی ہیں، باوجود اُن کے مختلف الاقوام ہونے کے انہیں بالکل اندھا اور گمراہ کر رکھا ہے اس لئے کہ جب ایک بربری یا سوڈانی یا مراکشی یا افغانی مسلمان ہو جاتا ہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے ملک یا قوم کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے بلکہ اس کا انتساب اب صرف اس کے مذہب کی طرف ہوگا۔

لیکن ایرانی اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی قبل از اسلام کی قومی خصوصیات کو برقرار رکھا ہے اسی لئے ان کو مسلمان نہیں بلکہ شیعہ کہتے ہیں۔

اسلام کی موجودہ نازک حالت نے بعض لوگوں کو آمادہ کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے گذشتہ حالات کو پیش نظر رکھ کر ان کے اس انحطاط کا سبب مذہب کو نہیں بلکہ کسی خارجی شے کو قرار دیں (اسلام کی موجودہ نازک حالت کو دیکھ کر بعض لوگوں نے مسلمانوں کے اس انحطاط کا سبب ان کے مذہب کو نہیں بلکہ کسی خارجی شے کو قرار دیا ہے اور اس کی دلیل میں وہ مسلمانوں کے گذشتہ حالات کو پیش کرتے ہیں) اس لئے کہ اسلامی تمدن جو اس وقت روبہ تنزل ہے زمانہ قدیم میں ترقی کے اعلیٰ اور بلند مدارج پر پہونچا ہوا تھا اس میں علماء تھے فلاسفہ تھے اور ایک زمانے تک انہیں مسیحی یورپ پر حاکمانہ اُستادانہ اور معلمانہ شرف حاصل رہا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر پہلے تھا تو اب کیوں نہیں ہے یہی وہ سوال ہے جسے میں اپنا موضوع بحث بنانا چاہتا ہوں۔

کیا حقیقتاً علوم اسلامیہ کا کوئی وجود ہے یا کم سے کم یہ کہ اسلام نے انہیں قبول کیا اور اُن کی اشاعت کی اجازت دی؟ بیشک بعض وجوہ سے اس کا جواب اثبات میں صحیح ہے اس لئے کہ ۷۷۵ء سے لیکر تیرھویں صدی کے وسط تک پانسو برس کے زمانے میں اسلامی ممالک میں بڑے بڑے علماء، فضلاء اور ارباب فکر موجود تھے جو اہم علمی مسائل میں دوسروں کی رہنمائی کرتے تھے اور اسلامی ممالک کو مسیحی ممالک پر بہت کچھ بلندی و برتری حاصل تھی اس موقع پر غلط فہمی سے بچنے کے لئے ہمیں ذرا تشریح اور تفصیل سے کام لینا چاہئے اس کے لئے ہم کو مشرق کی عہد بہ عہد کی تاریخ کی نہایت احتیاط سے ورق گردانی کرنی ہوگی تاکہ ہم اس ترقی (وارتقاع) کے صحیح اسباب کا پتہ لگا سکیں

جو اسقدر مبدل بہ تنزل ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا قرونِ اول علوم اور فلسفہ سے بہت دور رہا (تھا) اس لئے کہ اسلام ان مذہب کے تنازعات دینی کا نتیجہ ہے جو قرون ماسبق میں پائے جاتے تھے اور لازمی طور پر عربوں نے اسلام قبول کرتے ہی ان تمام مختلف اعلیٰ اور بلند عقائد و خیالات (کو خیرباد کہدینے) سے الگ ہوئے جن میں سے بعض توحید الحق کے بھی قائل تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ تمام علوم عقلیہ سے بہ مراحل دور ہو گئے بیشک بہادران عرب جو اسلام کی رہنمائی میں ملک پر ملک فتح کرتے جاتے تھے اس وقت شجاعت اور بہادری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی قطعی طور پر ثابت ہے کہ وہ فلسفہ سے بہت ہی کم واقف تھے بعض مشرقی مصنفین مثلاً ابوالفرج[۵] نے عربوں کی طباعی اور ذہانت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن علوم پر عربوں کو فخر تھا وہ لغت۔ عروض۔ قیافہ اور انشا کے علوم تھے اور فلسفہ کی تو خدا نے ان میں اہلیت ہی نہیں پیدا کی۔

اور در اصل حقیقت بھی یہی ہے کہ عرب کے بدو جہاں زباندانی اور فصاحت میں تمام دنیا پر فوقیت رکھتے تھے وہاں اشیار کی حقایق و ماہیت پر غور و فکر کرنے میں سب سے پیچھے تھے، ایک متدین عرب حوادث عالم کے اسباب و علل پر بحث کرتے ہوئے صرف یہ کہہ کر اکتفا کرتا تھا کہ:۔

"اللہ تعالےٰ عالم کا پیدا کرنے والا ہے اور تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہ ہماری ہدایت کے لئے انبیار کو بھیجتا ہے جو ہمیں سیدھا رستہ بتاتے ہیں"

یہی وجہ ہے کہ جب تک اسلام صرف عربوں کے اندر رہا یعنی خلفار راشدین، اور بنی اُمیّہ کے زمانے میں مذہب کے باہر (خارج از مذہب) ایک بات بھی نہیں کہی جاتی تھی، اگرچہ (حضرت) عمرؓ نے کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا حکم نہیں دیا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔ لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ دنیا میں اسلام کے غالب ہوتے ہی انھوں نے ان تمام ممکن علمی وسائل و ذرائع کو تلف کر دیا جن سے مباحث علمیہ کا امکان تھا۔

۷۵۰ء میں جبکہ ایران نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بنی امیہ کے خلاف بنی عباس کی امداد کی اور اس طرح حکومت عباسیوں کے ہاتھ آئی تو تمام حالات میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہو گیا،

اور مرکز اسلام منتقل ہو کر دجلہ اور فرات کے مرغزاروں میں آیا جہاں مشرق کے قدیم ایرانی۔ ساسانی تمدن

[۵] ابوالفرج الملیطی ایک مسیحی مورخ ہے جو ۱۲۲۶ء میں ملاطیہ میں پیدا ہوا اس نے یونانی فارسی اور عربی کتابوں سے مدد لیکر سریانی زبان میں ایک تاریخ لکھی ہے عربی میں مختصر الدول کے نام سے اس کی تلخیص موجود ہے (مترجم)

کے باقیات الصالحات بہت کچھ محفوظ تھے، جو کسریٰ انوشیرواں کے زمانہ میں ترقی اور ارتفاع کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ ہوئے تھے صنعت و حرفت سالہا سال سے ترقی کر رہی تھی، اور انوشیرواں نے تو سنسکرت کی علمی کتابوں کا ترجمہ اور یونانی فلسفہ کی تعلیم عام کرکے اس بڑھتی ہوئی ترقی کو چار چاند لگا دیئے، اس زمانہ میں قسطنطنیہ کے بعد ایران، فلسفۂ یونان کا مرکز ہو رہا تھا،

(یہ ایران) اور اس کے گرد و نواح کے اکثر باشندے نسطورین عیسائی تھے، جن کو علم طب اور فلسفہ یونان میں کمال حاصل تھا، اور ان کے پادری اور پیشوا علم ہندسہ اور منطق کے ماہر تھے، فارسی کے اُن قصائد میں جنہیں رستم کے واقعات کو شہرت دی گئی ہے، تم دیکھوگے کہ جب انہیں کوئی پل بنانے کی ضرورت ہوتی تھی وہ "جاثلیک" سے دعا مانگتے تھے، اور لفظ "جاثلیک" ([illegible]) نسطورین عیسائیوں کے مذہبی پیشواؤں اور پادریوں کے لئے بولا جاتا تھا، لیکن جب یہاں اسلام آیا تو اس نے ایران کی ان روز افزوں ترقیوں کو ایک صدی تک بالکل روک دیا، مگر جب عباسیوں کا غلبہ اور ظہور ہوا تو لوگوں کو خیال ہوا کہ اب تمدن اکابرہ پھر بحال ہوجائیگا، اسلئے کہ ارباب حل و عقد جنہوں نے عباسیوں کو تخت و تورج کا مالک بنایا تھا وہی ایرانی تھے، یہی وجہ ہے کہ ابوالعباس اور خصوصاً منصور کی مجلسیں ان سے کبھی خالی نہیں ہوئی تھیں، سلطنت کے وزرا اور مشیر اور خلفا کے بچوں کے معلم و اتالیق خاندان برامکہ کے لوگ ہوتے تھے، یہ خاندان ایران کا قدیم خاندان ہے جس کی بنیاد صاحب کمال اور اہل علم آباؤ اجداد کے ہاتھوں پڑی تھی، یہ لوگ اپنے آبائی دین پر قائم رہے اور بہت سے اسلام لے آئے، وہ بھی بغیر کسی گہرے اعتقاد کے،

ان میں نسطورین عیسائی کو ضعیف المذہب خلفاء عباسیہ کے درباروں میں تقرب خاص حاصل تھا اور وہ ان کے اول درجہ کے شاہی اطبا میں داخل تھے، شہر حرّان سے جہاں قدیم یونانی علوم و فنون کے بہت کچھ آثار باقی تھے، علما و فضلا خصوصاً ماہرین فلکیات کی ایک کثیر جماعت نکلی جو کسی مذہبی عقائد کے پابند نہ تھے اور انہیں لوگوں نے شہر بغداد کی بنا ڈالی جو دولت عباسیہ کا دار الخلافہ تھا، اور جو درحقیقت ایک ایرانی سلطنت تھی، لیکن جس طرح مذہب اسلام سے کلیۃً الگ رہنا ان کے لئے ناممکن تھا، اسی طرح فاتحین کی عربی زبان کو فارسی کر دینا بھی آسان نہ تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ تمدن مخلوط ہوگیا اور نصاریٰ و مجوس سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے، اور عیسائیوں کو خصوصیت کے ساتھ نظم و نسق کے ذمہ دارانہ عہدے سپرد کئے جاتے تھے، یہاں تک کہ مشہور خلفا منصور، ہارون الرشید اور مامون الرشید کے اسلام میں لوگ

شک کرنے لگے، یہ لوگ حقیقۃً نہیں صرف ظاہر میں اپنے مذہب کے پابند تھے، اور ہر شے خصوصًا اجنبی اشیاء کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بڑے شایق تھے، چاہے وہ بت پرستوں اور ہندیوں کی ہوں یا ایرانیوں اور یونانیوں کی،

کبھی کبھی ان کے مذہبی علما اس معاملہ میں تعرض کرتے تو خلیفہ کو مجبورًا اپنے کافر اور ملحد احباب سے الگ رہنا پڑتا، لیکن جونہی اس مذہبی تعرض کا اثر زائل ہوا اور علما غافل ہو گئے، بس پھر فورًا ہی وہ ان لوگوں سے اختلاط اور میل جول شروع کر دیتے،

یہ بغداد کے عجیب و غریب زمانہ شباب کے تمدن کا ذکر ہے جس کا تصور عام لوگ قصہ الف لیلہ سے کر سکتے ہیں، وہ زمانہ ایسا تھا کہ ظاہر میں تو بیشک مذہبی معاملات پر تشدد تھا لیکن باطن میں کچھ نہیں تھا، اور بڑی آسایئاں حاصل تھیں اسی لئے اس وقت مختلف صنعتیں اور متعدد علوم لطیفہ عالم وجود میں آئے ارباب حکومت کی عام مذہبی سہل انکاریاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ فاسق اور فاجر تک کو عزت و رتبہ دیتے اور اپنا مقرب بناتے، حالانکہ ان کے مذہبی احکام کا اقتضا تھا کہ ایسے لوگوں کی تنبیہ اور سزا کی جائے،

انہیں خلفاء کے زمانے میں مذہبی معاملات میں عام طور پر تسامح اور چشم پوشی سے کام لیتے تھے، اور کبھی اپنی اس پالیسی پر افسوس بھی کرتے تھے، غرض کہ الحاد پھیلا اور متکلمین مذاہب، اور ادیان پر عقلًا بحث و مناظرہ کے لئے جلسے منعقد کرنے لگے،

یہاں میں اس قسم کے ایک جلسہ کے متعلق اندلس کے ایک متقی عالم کے بیان کا ملخص دیتا ہوں جس کا ترجمہ موسیو روزی نے کیا ہے:-

"حکیم قیروانی نے ایک اندلسی عالم سے جو بغداد سے واپس آئے تھے، پوچھا کہ کیا تم متکلمین کے جلسوں میں شریک ہوئے تھے؟ اندلسی عالم نے جواب دیا کہ ہاں میں صرف دو مرتبہ شریک ہوا تھا، لیکن پھر نہیں گیا، حکیم قیروانی نے کہا یہ کیوں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "پہلے پہل میں جس جلسہ میں شریک ہوا اس میں میں نے دیکھا کہ سنی اور معتزل مسلمانوں کے علاوہ ملاحدہ، مجوس، دہریئے، یہود، اور نصاریٰ سبھی بیٹھے ہوئے ہیں خلاصہ یہ کہ ہر قسم کے کفار کا وہاں ایک جم غفیر موجود تھا، اور جلسہ میں ہر فرقہ کا ایک پیشوا یا رئیس تھا جو اپنے مذہب کی نمایندگی کرتا تھا، اور جب کوئی رئیس جلسہ میں آتا تو تمام حاضرین اس کے احترام کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے اور جب تک اپنی جگہ پر وہ بیٹھ نہ جاتا سب کے سب کھڑے رہتے تھے جب حاضرین کی تعداد پوری ہو گئی تو ان میں سے ایک کافر اٹھا اور اس نے

پر مناظرہ شروع کی:-

"حضرات! ہم لوگ یہاں پر صرف عقلی مناظرہ کے لئے، جمع ہوئے ہیں اور آپ تمام حضرات کو اس کے شرائط بخوبی معلوم ہیں، اپس میں مسلمان بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کوئی ایسی دلیل نہ پیش کریں جو ان کی مذہبی کتاب یا اقوال نبی سے ماخوذ ہو، اس لئے کہ ہم ان کی مذہبی کتاب اور ان کے نبی کو نہیں مانتے پس ہمارا فرض ہے کہ ہم صرف عقلی دلائل پر اکتفا کریں"

"تمام حاضرین نے اس کی تائید کی اور اس کے ثبوت میں سب نے تالیاں بجائیں، یہ دیکھ کر دوبارہ شرکت کا میں نے ارادہ نہیں کیا، لیکن مجھ سے ایک مرتبہ اور شریک ہونے کے لئے، کہا گیا، میں گیا تو اس کو گذشتہ جلسہ سے بھی بدتر پایا"

مذہبی احکام کے بموجب اس موقت تعویق کے بعد شام کے مسیحی اطبا کے ذریعہ سے علوم وفلسفہ کی اشاعت ہونے لگی، اور یونانی فلسفہ کے وہ لوگ وارث ہوئے جو فلسفہ ارسطو، ریاضیات، طب اور ہیئت میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، اور انہیں لوگوں کو عباسی خلفا نے ارسطو، جالینوس، بطلیموس، اور اقلیدس وغیرہ کی تصنیفات و تالیفات کے ترجمہ پر لگایا، خلاصہ یہ کہ تمام یونانی علوم وفلسفہ کے ترجمہ کی خدمت انہیں لوگوں کے سپرد کی گئی۔

بعض باذاق اور پرجوش اشخاص مثلاً کندی نے اہم اور دقیق مسائل (جہاں انسانی ذہن وعقل کی رسائی بڑی مشکل سے ہوئی) پر بحث ومناظرہ شروع کردیا، انہیں لوگوں کو فلاسفہ کہا گیا، اور اس زمانے سے یہ یونانی الاصل لفظ ہر اس شخص کے لئے استعمال کیا جانے لگا جو مذہب اور دین کی مخالفت کرتا ہو اور ہر وہ شخص جس پر اس لقب "فیلسوف" کا اطلاق ہوتا تھا ہدف مطاعن اور قابل گردن زدنی سمجھا جانے لگا، جیسے قدیم زمانہ میں لفظ زندیق تھا اور موجودہ زمانے میں لفظ "فری میسن" ہے۔

درحقیقت انہیں فلاسفہ کے ذریعہ سے مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اسقدر ترویج اور اشاعت ہوئی "اخوان الصفا" کے نام سے فلاسفہ اسلام کی ایک باقاعدہ جمعیۃ قایم ہوگئی ان لوگوں نے فلسفہ میں نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی متعدد کتابیں لکھیں جو فلسفیانہ خیالات اور مبحث مسائل کے لحاظ سے بہترین کتابیں ہیں، ان میں سے دو اشخاص فارابی اور ابن سینا کا فضل وکمال نہایت بلند مدارج پر پہونچا ہوا تھا اور ان کو علوم فلسفہ میں ید طولیٰ حاصل تھا چنا

ن کا شمار چوٹی کے فلاسفہ میں ہے،

علم الفلک، اور علم الجبر کو خصوصیت کے ساتھ ایران میں ترقی ہوئی، علم الکیمیا، سے اگرچہ عام طور پر علانیہ دلچسپی اظہار نہیں کیا جاتا تھا مگر اس کے نتائج بھی عمل تقطیر اور بارود کی صورت میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے۔

مسلمانانِ اندلس نے اشاعت علوم اور ترقی تعلیم میں مشرقی مسلمانوں کی تمام تر تقلید کی تھی اُن کی اس علمی جدوجہد میں یہود بھی شریک تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارھویں صدی عیسوی میں ابن باجہ[۱]، ابن طفیل اور ابن رشد، جیسے اولوالعزم اور بلند مرتبہ فلاسفہ پیدا ہوئے جبکہ علم وفضل کی مثال (نظیر) قرونِ ماضیہ میں نہیں ملتی۔

یہی وہ فلسفہ ہے جس کو صرف اس لئے "فلسفہ عربیہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ وہ عربی زبان میں لکھا اور مدون کیا گیا، حالانکہ درحقیقت یہ فلسفہ تمام تر یونانی، ساسانی یا صرف یونانی فلسفہ کیوں کہ اس کے عناصر کلیتہً یونانیوں سے ماخوذ ہیں۔

اس زمانہ میں جو شخص یونانی علوم سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا تھا وہ بڑا فاضل مانا جاتا تھا اس لئے کہ اس زمانہ میں یونانی علوم وفلسفہ کا واحد مرکز تھا شام وعراق کی فضیلت یورپ پر صرف اس لئے مانی جا سکتی ہے کہ انہوں نے یونانی علوم وفنون کے تراجم میں پیش قدمی کی، اور اس کی یہی وجہ یہ تھی کہ اقلیدس، بطلیموس اور ارسطو کی کتابیں حران اور بغداد میں بآسانی مل سکتی تھیں اور پیرس میں وہ میسر نہ آتی تھیں۔

افسوس! صد افسوس!! کہ اہل قسطنطنیہ نے سخت بخل سے کام لیا۔ کاش وہ اُن علمی خزانوں کے معاملہ میں ہم سے بخل نہ کرتے جو ان کے پاس محفوظ چلے آتے ہیں، یا کم از کم یہ کہ آٹھویں یا نویں صدی کے ابتدا ہی میں ہمارے ہاں لسکاریس اور بیھاریوں جیسے لوگ پیدا ہو جاتے، تو ہمیں بارھویں صدی میں یونانی علوم وفلسفہ کے لئے بغداد، قرطبہ اور طلیطلہ کا دست نگر اور مرہون منت نہ ہونا پڑتا۔

لیکن فلسفہ تاریخ کا یہ ایک راز ہے کہ جب کسی قوم کے علوم ومعارف برباد اور انحطاط پذیر ہو جاتے ہیں، تو

---

[۱] ابن باجہ، یورپین مصنفین، الیمپیس ([redacted]) کہتے ہیں اندلس کا نامور فلسفی جس نے سب سے پہلے علوم نظریات میں تمیز پیدا کی گیارھویں صدی عیسویں کے اختتام پر سارا قوسہ میں پیدا ہوا اور ۱۱۳۸ء میں عین عالم شباب میں چالیس برس سی ہی کم عمری میں بمقام فاس وفات پائی دیگر فلاسفۂ اسلام کی طرح اُسے بھی علم طب میں کمال حاصل تھا فلکیات کا بھی بلند مرتبہ عالم تھا ایک کثیر جماعت نے اس سے شرف تلمذ حاصل کیا جلیل القدر اسلام فلسفی ابو بکر ابن طفیل صاحب کتاب حی ابن یقظان اس کے تلامذہ میں سے ہے یہ حی ابن یقظان ابن سینا کی حی بن یقظان نہیں ہے اسلئے کہ دونوں کا موضوع بحث جداگانہ ہے اگرچہ نام میں اشتراک ہوگیا ہے (مترجم)

دوسری قوم ان میں ترقی اور جلا دیتی ہے، اور یہی ان بدقسمت اور مقہور و معتوب فلاسفہ (اسلام) کی شہرت اور مقبولیت کا واحد سبب ہے اور ضعیف الایمان وضعیف العقائد حرانیوں کے فضل و کمال کا بھی یہی سبب تھا۔

ان میں عربی کتابوں کے تراجم نے جو یونانی سے لئے گئے تھے اہل یورپ کو یونانی علوم و فلسفہ سے روشناس کرایا اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے درحقیقت جس وقت عربوں کا آخری فلسفی ابن رشد مراکش میں بستر مرگ پر ہذیان و نسیان میں آخری سانس لے رہا تھا، یورپ اس وقت اکتساب علوم کی جد و جہد میں مصروف تھا، ابیلارد علوم عقلیہ پر بحث و مناظرہ کر رہا تھا، اور اس طرح یورپ نے وہ کچھ حاصل کر لیا جو اس کی ذہانت کے سوا تھا، اور اس نے بتدریج اس ترقی اور انقلاب کی ابتدا کی جس کا نتیجہ تھا کہ انسانی عقلوں سے تمام پردے ہٹا دیئے۔

پیرس میں جبل جنیفیف پر ایک دار التعلیم کی بنیاد رکھی گئی، اور ہمیں صرف ان اصلی کتابوں کی ضرورت تھی جو علوم قدیمہ کے حقیقی ماخذ و مرکز میں لکھی گئی تھیں اور یہ بات بادنیٰ ظاہر ہو جاتی ہے کہ اگر یہ کتابیں بجائے عربی تراجم کے براہ راست کتب خانہ قسطنطنیہ سے حاصل کی گئی ہوتیں، تو بدرجہا بہتر تھا خصوصاً ایسی حالت میں عربی زبان یونانی تخیلات اور افکار کی ادائیگی سے بالکل عاجز ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ کینسۂ روما اور کینسۂ قسطنطنیہ کے باہمی مذہبی اختلافات اور تنازعات نے اس کا موقع نہ دیا اس سلسلہ میں اس منافرت اور جذبات بغض و عناد کو بھی شامل کر لینا چاہئے جو ۱۰۲۰ء کی جنگ کے بعد آپس میں پیدا ہو گئے تھے بایں ہمہ اگر ہم فرض کریں کہ ان اصل کتابوں کا ملنا ممکن تھا پھر بھی تو ہمیں تین سو برس تک انتظار کرنا پڑتا تا کہ لیففر دی تابل اور ... جیسے یونانی زبان کے ماہر پیدا ہو جائیں جو اصل یونانی کتابوں کا ترجمہ کر سکیں۔

انہیں اسباب کی بنا پر ہمیں اسپین سے یونانی علوم لینے پڑے جو در اصل فلسفہ یونان کے محرف اور بالکل غلط ملط تراجم تھے جیسا کہ کتبخانۂ قسطنطنیہ کی اصل کتابوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

(باقی)

سیرت

(جناب محمود الحسن صاحب محمود امرایلی)

سیرت دنیا کی محرک طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے۔ پاکیزہ سیرت کا مجموعہ بلند ترین نوعیت انسانی کا
ۂ دار ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنی اعلیٰ صفات سے متصف نظر آتا ہے۔ صنعت پیشہ، دیانت دار،
ارادہ، باوضع اور بااصول لوگ غرض ہر شعبۂ حیات میں جو عدیم النظیر اور ذکی الحس ہستیاں ہوتی ہیں انہی
دم سے دنیا کو بالطبع عظمت انسانی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے ایسی ہستیوں پر اعتماد اور ان کی تقلید کرنا
قدرتی امر ہے کیونکہ محاسن دنیوی کے یہی ہستیاں علمبردار ہوتی ہیں اور اگر روئے عالم پر انکا مایۂ ناز وجود نہ ہو
خاکدان عالم قابل رہائش ہی نہ رہے ذہانت ہمیشہ خراج تحسین حاصل کرتی ہے مگر سیرت دلوں پہ تعظیم و تکریم کا
ستحقاق ہے اول الذکر دماغی قوت کی آوردہ ہے مگر آخر الذکر کا سرچشمہ دل ہے اور اگر ہم بنظر تعمق دیکھیں تو دل
حیات انسانی پر حکمراں نظر آئیگا۔ ذی علم ہستیوں کے مراتب قابلیت کے تناسب سے حلقہ احباب میں ہوا کرتے
مگر بااصول اشخاص کی عزت ان کی ضمیر کے لحاظ سے ہوتی ہے اول الذکر کی لوگ تعریف و توصیف کرتے
مگر آخر الذکر کی رہنمائی کو فخر سمجھا جاتا ہے بڑی ہستیاں ہمیشہ عدیم المثل ہستیاں ہوا کرتی ہیں کیونکہ بزرگی کا
نی نفسہٖ ایک معیار ہے فی الحقیقت دنیا میں اکثر لوگوں کی حیات مستعار اسقدر محدود ہوتی ہے کہ ان کی عظمت
ل کرنے کے مواقع بہت کم دستیاب ہوتے ہیں مگر ہر شخص اپنے فرائض ایمانداری عزت شرافت اور حسب
فت انجام دے سکتا ہے وہ عطیات ربانی کا جائز استعمال کر سکتا ہے اور ان کے برے مصرف سے گریز
رنے پہ قادر ہے وہ اپنی زندگی کو بہترین بنانے کی سعی کر سکتا ہے وہ ادنیٰ سے ادنیٰ معاملات کو بھی صداقت
مانت، ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے الغرض انسان اس دائرہ میں رہکر جو قدرت
ے اسے ودیعت فرمایا ہے اپنے فرائض منصبی کو بوجہ احسن پورا کر سکتا ہے۔

گو بادی النظر میں ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر فی الواقع فرائض کی انجام دہی تمام ان صفات
حسنہ کا مجموعہ ہے جن سے اعلیٰ ترین حیات انسانی اور سیرت مرکب ہے ممکن ہے کہ اسی میں دور از کار
باعث کا فقدان ہو مگر انسان عموماً شجاع نہیں ہوا کرتے اور اگرچہ ادائیگی فرائض کا احساس انسان

کو اعلیٰ صفات سے ہمکنار کر دیتا ہے مگر بایں ہمہ اس کو معمولی اور خانگی امور سے بھی روزانہ نہایت صبر و استقلال کے ساتھ سامنا کرنا پڑتا ہے حیات انسانی عام فرائض کے مجموعہ کا نام ہے اہم ترین نیکیاں وہ ہیں جن کا ہم کو روزانہ ساتھ پڑتا ہے کیونکہ انسان کے ذریعہ ہی سے ہماری پوری آزمائش ہوتی ہے اور وہی سب سے زیادہ دیرپا بھی ثابت ہوتی ہے وہ "ظنی" فضائل جن کی تکمیل سے معمولی دل و دماغ کا انسان عاجز ہے محض تحریص خطرات کا موجب ہوا کرتے ہیں برک کا مقولہ ہے کہ "جب تک انسانی ذہنیت کا مدار رستمانہ فضائل پر رہیگا یا تو اس میں خلاف فطرت انحطاط رونما ہونے لگے گا یا وہ فسق و فجور کا آماجگاہ بنجائے گی"۔

ڈاکٹر آبابٹ اسقف کنٹربری نے جب اپنے متوفی دوست مہتمم خزانہ ملکہ الزبیتھ کی سیرت کی تعریف کی تھی تو اس کو بہ حیثیت ایک اعلیٰ مدبر یا نازک خیال شاعر کے دنیا کے روبرو پیش نہیں کیا تھا بلکہ معمولی فرائض حیات کو مد نظر رکھتے ہوئے عام انسانوں کی طرح ان الفاظ میں محاسن بیان فرمائے تھے "میرے مرحوم دوست میں کسقدر عدیم المثل نیکیاں تھیں! ان سے زیادہ کون اپنی بیوی سے محبت، اپنی اولاد سے شفقت، اپنے دوستوں سے وفاداری، اور موانست، اپنے دشمن سے رواداری اور اعتدال پسندی اور اپنے اقوال کا پاس کرسکتا ہے"۔ دراصل انسان کی اصلی سیرت اور اس کے محاسن اس طرز عمل کو دیکھکر کافی ذہن نشین ہوسکتے ہیں جو وہ اپنے قریبی عزیزوں اور دوستوں سے کرتا ہے کیونکہ بہ حیثیت مصنف مقرر یا مدبر کے اس کی سیرت کے خد و خال اچھی طرح نمایاں نہیں ہوسکتے، اگرچہ عموماً فرائض سے وہ معاملات مراد ہوتے ہیں جن سے معمولی درجہ کے لوگوں کو اپنی حیات عمومی میں اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے تاہم اعلیٰ سے اعلیٰ سیرت کے نفوس کے لئے بھی خوئے ضبط و تحمل ان فرائض ہی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے نفوس علم و دولت یا اقتدار کے مایہ دار ہوں انکے بغیر بھی انسان کے دل میں استواری اور پاکیزہ جذبات کی افراط ہوسکتی ہے اور یہی نہیں بلکہ انہیں ایمانداری صداقت اور فرمانبرداری کے جوہر بھی ہوسکتے ہیں جو شخص اپنے فرائض کو کما حقہ انجام دینے کی کوشش کرتا ہے گویا اپنی خلقت کے اصلی منشار کی تکمیل میں سرگرم ہوتا ہے اور اپنی ذات میں ان اصول کو مرتب کرتا ہے جو اعلیٰ سیرت کے حامل ہوتے ہیں دنیا میں سینکڑوں ایسے انسان ہیں جن میں بجز اعلیٰ سیرت کے کوئی اور خوبی نہیں پھر بھی صرف اسی کی بدولت ایک خود مختار کی طرح اپنے ارادوں میں مستحکم و استوار نظر آتے ہیں۔

ذہانت سے پاک طینتی یا اعلیٰ سیرت کا کوئی تعلق ضروری نہیں ہے جارج ہربرٹ کا قول ہے کہ تھوڑی سی نیک زندگانی علمیت کے طوماروں سے کہیں افضل ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ علم کی اہمیت کم کر دی جائے

مود یہ ہے کہ علم کو نیکی کی راہ پر لگایا جائے بعض اوقات علمیت کمینہ اطوار میں آلودہ نظر آتی ہے اعلیٰ طبقہ کے
اس کے غلام بن جاتے ہیں اور ادنیٰ طبقوں میں اس سے مشیخت آجاتی ہے انسان صنعت و حرفت، علم
اور طبیعات وغیرہ میں کامل دسترس حاصل کرنے کے بعد بھی غریب اور جاہل کاشتکاروں کی طرح ایماندار
طبیعت حق گو اور فرض شناس بن سکتا ہے۔ پرتھیس ... اپنے دوست کو لکھا تھا کہ آپ مصر ہیں کہ میں
علم لوگوں کی عظمت کروں اس سے مجھے انکار نہیں مگر یاد رہے کہ خواہ آدمی کتنا ہی ذیعلم کیوں نہ ہو وسیع
ن، کشادہ دلی، انصاف پسندی، تجربات عالم، اطوار کی سنجیدگی جراءت آزمائی۔ خوش اسلوبی سے کام کرنے
ریقہ، صداقت، انس، ایمانداری اور فنافی المقصد ہوجانا ایسی صفات ہیں جن کا ان میں فقدان ہوتا ہے اور
کی تکمیل کے لئے ان کو اور ذی علم ہونا چاہئے۔

سر والٹر اسکاٹ جب تقریر کر رہے تھے تو سامعین میں سے ایک شخص نے اُن سے علمی تجر کو دیگر
مات سے افضل ثابت کرنے کی کوشش کی جس کے جواب میں فاضل مقرر نے جواب دیا کہ اگر تفضیلت
دلیل تمہارا یہی اصول ہوتا تو دُنیا کیسی حقیر شے بن جاتی!! میں نے اپنی عمر میں اعلیٰ ترین تصانیف کی ورق
ردانی کی ہے اور مجھے بمثل علما و فضلا سے شرف محبت بھی حاصل ہوچکا ہے مگر یقین جانئے کہ مشکلات و
صائب کے موقعوں پر جن بہادرانہ جذبات کا اظہار اور اپنے احباب اور ہمسایوں کے معاملات میں جن سادہ
صداقت آمیز خیالات کو میں نے غریب بے علم لوگوں کے لبوں سے سُنا ہے وہ اہل علم لوگوں میں دیکھے نہ
نے!! تعلیم قلب کے لئے جب تک ہم ایسا علم نہ حاصل کریں گے جس سے ہر شے چاندنی کی طرح درخشاں نظر
ئے ہم کو ہرگز اپنی ضروریات اور ان کی قدر و قیمت کا احساس اور عظمت آشکار نہ ہوسکے گی سیرت
کو اعلیٰ کرنے کے لئے دولت کی بہت ہی کم ضرورت ہے اس کے برعکس حقیقت یوں ہے کہ دولت سے
اکثر سیرت میں پستی اور خرابی واقع ہوجاتی ہے دولت اور ابتری عیش پسندی و بدکاری میں ایک خاص
رشتہ ہے ضعیف الارادہ افراد جن کو اپنی ذات یا اپنے جذبات پر قابو نہیں ہوتا دولت کے سبب حرص
کے پھندے میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور فی الحقیقت یہ دولت ہی ان کی اور ان کی وجہ سے دوسروں
کی ذات میں بُرائی پیدا کرنے کا سرچشمہ بنجاتی ہے اس کے برعکس کسی قدر مفلسی سے انسان کی سیرت
پر مفید اثرات مرتب ہوجاتے ہیں اگر انسان محض اپنی دستکاری کفایت شعاری اور دیانتداری پر پورے
طور پر کاربند ہو تو اس حالت میں بھی وہ حقیقی انسانیت کے اعلیٰ مدارج بہ آسانی طے کرسکتا ہے۔ مسٹر برن

اپنے باپ کے متعلق کہتا ہے کہ اُنھوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ "اولالعزمی دکھانا" اگرچہ میرے پاس ایک حبہ بھی نہ تھا۔ سچ ہے نیک اور جرأت آزما دل کے بغیر انسان کی قدر و قیمت ایک حبہ کے برابر بھی نہیں ہوتی۔

سیرت در اصل جائداد ہے مقبوضہ اشیا میں وہ سب سے پاکیزہ چیز ہے۔ عوام کی منفعت اور انسانی عزت کے لحاظ سے وہ ایک ریاست سے کم فائدہ بخش نہیں جو لوگ اس پر قابض ہوتے ہیں گو وہ بظاہر دنیوی مال و متاع سے کافی مستفید نہ ہوسکیں مگر دُنیا کی نگاہ میں ان کی کافی شہرت اور عزت ہوتی ہے اس میں کلام نہیں کہ زندگانی کے خصائل حسنہ زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ دستکاری نیکی اور سعادت کا رتبہ دُنیا میں سب سے اعلیٰ اور صرف وہی افراد یہاں صفِ اولین میں شامل ہوسکتے ہیں جو فی الحقیقت ہر لحاظ سے نیک ہیں۔ (ترجمہ)

نوائے دلگیر

(مولٰنا سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر اکبرآبادی)

دل کو اپنے پہلے ہم اتنا شکیبا دیکھتے
شوق سے پھر اُن کا حسن بے محابا دیکھتے

گر کے قدموں پر تمھارے جسنے آخر جان دی
تم ذرا اُس مرنے والے کا کلیجا دیکھتے

وصل کی شب تیرا ارمانوں سے کہتا تھا کوئی
سُرمگیں آنکھوں کا اُن کی آج نشا دیکھتے

اک جھلک نے جسکی کر ڈالا دو عالم کو خراب
چاہتا ہے جی کہ اک دن پھر وہ جلوا دیکھتے

دوش پر وہ عنبریں زلفوں کا سایہ ڈال کر
اپنے عاشق کا ذرا دُنیا سے اُٹھنا دیکھتے

اب کہاں ہے وہ دلِ مرحوم اے اہلِ نظر!
میری آنکھیں دیکھتے اور اُس کا مرنا دیکھتے

ہائے کیا دُنیا کی محفل میں کوئی پُرساں نہیں
عمر گذری ہے ہمیں اس دل کو تنہا دیکھتے

نشہ سے آنکھ میں، کچھ نیند، کچھ انگڑائیاں
پھر کسی کو بزم میں یوں جلوہ آرا دیکھتے

حسن کی تھی وہ فراوانی جہانِ حسن میں،
صرف دو آنکھوں سے اے دلگیر کیا کیا دیکھتے

مترجمات

بعض مشہور تاریخی مغالطات کی اصلاح

فلسفۂ تاریخ کے اس اصول کے مطابق کہ "جو واقعات جسقدر زیادہ شہرت پکڑ جاتے ہیں اسی قدر ان کی صحت زیادہ مشتبہ ہو جاتی ہے"۔ مندرجۂ ذیل واقعات شہرت کے منظرِ عام پر لائے گئے اور مسلمات میں داخل سمجھے گئے ہیں حالانکہ ان کی اصلیت کچھ اور ہے۔

(۱) یہ غلط ہے کہ جس وقت شہر روما جلایا جا رہا تھا اسوقت روما کا بادشاہ نیرو (Nero) [illegible] بڈل (ایک باجا) بجا رہا تھا، کیونکہ وہ تو اس وقت انطیوم میں اپنے محل کے اندر تھا جو روما سے پچاس میل دور ہے۔ پھر فڈل سولہویں صدی سے پہلے ایجاد نہیں ہوا تھا۔

(۲) یہ بھی غلط طور پر مشہور ہے کہ سراج الدولہ نے ۱۴۰ انگریزوں کو کلکتہ کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر کے مار ڈالا۔ ہندوستانیوں کے خلاف انگلستان میں اس کا کچھ ہی اثر ہوا ہو مگر یہ محض "مقدس اختراع" ہے!

(۳) یہ بھی غلط مشہور ہے کہ سر والٹر ریلے آلو اور تمباکو امریکہ سے انگلستان لایا تھا۔ اس لئے کہ سر جان ہاکنس تمباکو اور سر فرانسس ڈریک آلو لانے والے ہیں۔

(۴) اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جیمس واٹ نے اسٹیم انجن ایجاد کیا تھا۔ البتہ اس نے اسمیں کچھ اضافہ کیا مگر اصل میں ایڈورڈ سومرسیٹ (مارکوئس آف ورسسٹر) نے سنہ ۱۲۵۵ء میں اس کو ایجاد کیا تھا۔

(۵) اسی طرح مارکونی کا "تلغراف بے سیم" ([illegible]) ایجاد کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ کہنا چاہئے کہ مارکونی نے اس کو ترقی دی اور اس مطلب کے لئے اسکا استعمال بتایا لیکن اسکے اصل واضعین اور موجد ہرٹز ([illegible]) اور کلرک میکسول تھے۔

اسلام اور ڈینٹی

مجریطا (اندلس) کے ایک زبردست مستشرق اور عربی کے جید عالم پروفیسر آسین نے اٹلی کے نامور شاعر ڈینٹی کی مشہور کتاب ڈیوائن کامیڈی (Divine Comedy) کا مقابلہ اسلامی تصانیف سے کرکے بتایا ہے کہ ڈینٹی نے اپنی کتاب میں اسلامی خیالات سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، اسی پر اکتفا نہ کرکے پروفیسر موصوف نے امام ابن العربی رح کی تصانیف سے مثالیں پیش کی ہیں اور انکا مقابلہ ڈینٹی کی عبارت سے کرکے ثابت کردیا ہے کہ یہ مشابہت و مماثلت کوئی اتفاقی حیثیت نہیں رکھتی۔ حال میں پروفیسر سرٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ نے رسالہ "منارۃ" میں اس پر ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"انگریزی کی اُن تمام عظیم الشان اور معرکۃ الآرا کتابوں میں جو حال میں شائع ہوئی ہیں، ایک کتاب "اسلام اور ڈوائن کامیڈی" ہے جس کو اندلس کے ایک مشہور عربی داں عالم پروفیسر آسین نے (جو مجریطا کی یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں) اسپینی زبان میں تصنیف کیا ہے جب پہلے پہل یہ کتاب ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تو یورپ اور امریکہ کے علمی حلقوں خصوصًا کلام ڈینٹی (Dante) کے شیدائیوں میں ایک ہل چل مچگئی۔ مؤخر الذکر گروہ کے لئے تو یہ معلوم کرنا یقینًا ایک سخت اور ناقابل برداشت صدمہ تھا کہ کتاب "ڈوائن کامیڈی"، جو قرون وسطیٰ کے کلیسائے کاتھولیکیہ کے دینیات، فلسفہ اور علم الکائنات کی "دائرۃ المعارف" ہے۔ اپنی نمایاں خصوصیتوں میں اسلامی ماخذ کی رہین منت ہے! پروفیسر آسین نے اپنے اس جرات آمیز نظریہ کی تقویت و اثبات کے لئے زبردست شواہد پیش کئے ہیں اور عربی لٹریچر پر اپنے کامل عبور، خصوصًا صوفیائے اسلام میں سے ابن العربیؒ کی تصانیف سے . . . .

اپنی گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے ان مشہور اندلسی عالم و فلسفی کی تصانیف کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، جنھوں نے ڈینٹی کی ولادت سے صرف ۲۵ برس پہلے وفات پائی۔ پروفیسر آسین نے ہر دو مصنفین کے کلام میں بہت مشابہت کی کئی مثالیں پیش کرکے دونوں کے طرز بیان اور صوفیانہ استعارات و تشابیہ

کو بتلایا ہے جو اِن دونوں فلسفیوں کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سر آرنلڈ لکھتے ہیں:۔

"ڈینٹی کی مشہور نظم کا موضوع، جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، دوزخ، اعراف اور بہشت میں نشاۃ ثانیہ کا بیان ہے۔ پروفیسر آسین ڈینٹی کے بیان کا مقابلہ پیرا اسلام کے واقعہ معراج کے بیان سے کرتے ہیں جو عربی لٹریچر میں بہت اہم بابت کتاب ہے۔ بعض مسلمان مصنفین نے واقعات معراج کو بطور تاریخی واقعات کے لکھا ہے اور بعض مصنفین نے صوفیانہ رنگ میں اُن کا ذکر کرکے اعمال نیک کے ثواب اور گناہوں کے عذاب کے متعلق اُن کو اخلاقی تعلیم کا ذریعہ بنایا ہے۔ ہم اس وقت اُن جزئیات کو پیش نہیں کرنا چاہتے جن کو پروفیسر آسین نے فاضلانہ طور پر پیش کیا ہے کیونکہ یہ کتاب اب انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہے اور انگریزی داں اصحاب کے لئے سہل الحصول ہے۔ پروفیسر موصوف کی پیش کردہ متعدد مثالیں ایسی واضح اور مشابہ ہیں کہ ان کو اتفاقات میں نہیں شمار کیا جا سکتا۔ ضمناً یہ کتاب مذہب اسلام کے مطالعہ اور قرونِ وسطیٰ کے یورپ پر اسلامی اثرات پر بہت روشنی ڈالتی ہے۔"

کتاب سعد السعود

ایران کے ایک نامور عالم شیخ ابوعبداللہ زنجانی نے مصر کے نامور ادیب احمد تیمور پاشا کو ایک خط لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"مجھے کتاب "سعد السعود" دستیاب ہوئی ہے جس کو ۶۵۱ھ میں علی بن موسیٰ بن محمد الطاؤس نامی امامیہ کے ایک عالم نے تالیف کیا تھا اس کا موضوع یہ ہے کہ مؤلف نے صحف سماوی مثل قرآن، توراۃ، انجیل، صحف ادریس، اور قدماء کی چند تفاسیر فی سبیل اللہ وقف کردیں جو اگرچہ آج ہمارے پاس موجود نہیں ہیں تاہم ابن الندیم نے الفہرست میں ان کا ذکر کیا ہے۔ مؤلف نے انہی کتابوں سے عمدہ اور مفید انتخابات اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ ان منقولات میں سب سے زیادہ اہم ایک نسخہ انجیل کی آیات ہیں جن کے شروع میں لکھا ہے

"شرح انجیل جس کو مار لا مطران .... نے امیر المومنین المامون کے لئے اس سنہ میں تصنیف کیا جبکہ نسطوریہ نے یعاقبہ پر خروج کیا تھا اور خلیفہ نے اس کی اعانت کی تھی۔ سُریانی سے عربی میں دونوں زبانوں کے علماء کی موجودگی میں منتقل کیا گیا انجیل کا وہ نسخہ (سریانی) اصل نسخہ سے نقل کیا گیا تھا اور یہ نسخہ اس (سریانی) نسخہ سے نقل کیا گیا ہے"

اس انجیل کی آیات اور موجودہ انجیل کی آیات میں بھی فرق پایا جاتا ہے صحف ادریس کو مؤلف نے کوفے کے "مشہد الطاہر" کے وقف کی ایک کتاب سے نقل کیا ہے جس پر "سنین ادریس" لکھا ہوا تھا اس میں لکھا ہے کہ :۔

"بخط عیسیٰ محرر، سریانی سے عربی میں ابراہیم بن ہلال بن ابراہیم بن ہردن الصابی الکاتب نے نقل کیا"

ہردن غالباً زھردن کا مخفف ہے اور یہ صابی وہی مشہور و معروف مترجم اور انشا پرداز ہے بہر حال اس کتاب سے بہت سے علمی ادبی اور تاریخی معلومات حاصل ہوتے ہیں۔

(الزہرار)

ایک فرانسیسی کی تعریف اسلام

موسیو سرویر ([illegible]) ایک فرنچ مشنری مُصنّف ہے جو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ہر وقت زہر اُگلنے پر مستعد رہتا ہے۔ حال میں اس نے ایک کتاب "سائیکالوجی آف دی مُسلمان" کے نام سے لکھی ہے۔ مسٹر اے۔ کِن روس ([illegible]) انگریزی کے رسالہ "انگلش ریویو" میں اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"انگریز لوگ اسلامی ترقی کو ممکن خیال کرتے ہیں جبکہ موسیو سرویر اس کو نہیں تسلیم کرتے۔ ان کے نزدیک "مذہب اسلام۔ ایک وقتی مذہب ہے جو منجمد مُردہ اور ناقابل تغیر و ترمیم ہے۔"

اس کے خیال میں نصف تعلیمیافتہ مصریوں ہی نے اپنی قومیت کا زہر تمام عالم اسلامی میں افریقہ کے فرنچ مقبوضات تک پھیلا رکھا ہے۔"

مسٹر کِن روس موسیو مذکور کے ان نتائج پر چیلنج دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"کیا ایک مسلمان مصنف موسیو سرویر کے تتبع میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ عیسائی مذہب ایک خاص وقت کے لئے

ر دہ منجمد مُردہ اور ناقابل ترمیم ہے اور کیا وہ اسی کی دلیل جیبن کرابل پروشیا کو مثال میں نہیں پیش کرسکتا
ں نے نائرہ جنگ و جدال مشتعل کیا اور صلح کو اپنی فریب بازیوں سے اُڑا دیا؟ کیا وہ روم اور کلیسائے
و سپرز ([illegible]) میں اہل اسپین کی کارروائیوں، سنبٹ بارتھولمیو کی خونریزیوں، اور ملین
اولیائے مقتول" ([illegible]) اور اسی قسم کے چھوٹے بڑے
ے تعبیر نہیں کرسکتا؟ کیا وہ نی زمانہ فرانس اور اطلی کو نہیں پیش کرسکتا جنہوں نے یونانیوں اور آرمینیل
وں کے رحم پر چھوڑ رکھا ہے۔ یا اناطولیہ کے کاشتکاروں کو یونانیوں یا آرمینیوں کے رحم پر۔
"موسیو مذکور کے حق میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ وہ ان مسلمانوں سے خائف معلوم ہوتے ہیں جبکہ ہمیں
ے کوئی خوف نہیں ہے۔"

(انڈین ریویو)

ہنری فورڈ کی کامیابی کا راز

کوئی دس سال پیشتر، ہنری فورڈ نے اپنا یہ اصول قائم کیا تھا کہ اس نے اعلیٰ قسم کی مزدوری کی
ت بازار کے نرخ سے زیادہ دینا شروع کیا۔ اور اپنی مصنوعات کو مقابلہ کی قیمتوں کی محدود سطح سے
زیادہ سستا بیچنا شروع کیا۔ تجارتی دنیا پہلے تو اس کے اس فعل پر مضحکہ اُڑانے لگی۔ بعد میں اپنے
جہ کی اور آخرکار انہی اصولوں پر مقابلہ پر آمادہ ہوگئی مگر اس عرصہ میں فورڈ نے اچھی طرح ترقی کرلی تھی
س وقت سے وہ غالباً دنیا کا متمول ترین آدمی شمار کیا جانے لگا۔ اس کے یہی اصول آج بھی قائم
چنانچہ وہ کام کرنے والے مزدوروں کو سب سے زیادہ اُجرت یعنی ۶ ڈالر روزانہ دیتا ہے اور اپنی موٹر
کارخانہ میں کام کرنے والے اشخاص کو بازاری شرح اُجرت سے ڈیڑھ ڈالر زیادہ ادا کرتا ہے۔
اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صرف سالانہ ۳ فیصدی کام کرنے والے اس کے ہاں بدلتے ہیں جس سے
، اسباب اور وقت جو نئے کاریگروں کے تیار کرنے میں صرف ہوتا ہے بہت کچھ بچ جاتا ہے۔

(انڈین ریویو)

تفتیش جرائم

یہ بتانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت امداد جو سائنس پیش کر سکتا ہے، اسرار جرائم کے انکشاف میں استعمال کی گئی ہے علم الانسان، طب، کیمیا، طبیعیات، نفسیات، اور علم الانسان وغیرہ نے اس کام میں نمایاں حصہ لیا ہے سگار پینے کی پائپ پر دانتوں کے نشانات اور سگار کا وہ سرا جو منہ میں رکھا جاتا ہے اکا امتحان خون کے دھبوں کا کیمیاوی تجزیہ اور بالوں کا بڑے غور و خوض کے ساتھ معائنہ کیا جاتا ہے۔ لندن میں کسی مکان کی کھڑکی کے شیشہ پر انگلیوں کے نشانات کافی خیال کئے گئے تھے جنہوں نے مجرم سے اقبال جرم کرا لیا اس کی وجہ یہ تھی کہ "ماہر نشانات انگشت" نے یہ بتایا تھا کہ انگلیوں کی لکیروں اور ان کی خصوصیات میں ولادت سے لیکر وفات تک کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ اور لاکھوں قسم کے نشانات میں دو نشانات کبھی یکسار اور مشابہ نہیں پائے گئے۔ ایک سراغ رساں کسی مقدمہ کی تفتیش کر رہا تھا جو ایک گم شدہ بنک نوٹ سے متعلق تھا۔ جس کمرہ سے یہ نوٹ گم ہو گیا تھا وہاں اس کو ایک نیم کشیدہ چرٹ ہاتھ لگا۔ چونکہ اس کا سرا کٹا ہوا نہ تھا اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ کسی آدمی کا پیا ہوا نہیں ہے۔ اکثر اوقات جیب میں پڑی ہوئی گرد کے کیمیاوی اور دوربینی امتحانات عجیب غریب انکشافات کا سبب ہوا کرتے ہیں۔

کیسی چھوٹی اور معمولی چیز نے پروفیسر ویبسٹر کو پھانسی کی لکڑی پر لٹکوا دیا۔ پروفیسر مذکور موجودہ زمانہ کا ایک نامور سائنس داں تھا جو بہت بڑی قابلیت اور بلند رتبہ خصائل کا آدمی خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اس میں عیب یہ تھا کہ وہ بہت جلد باز اور عصبیت د الالانسان تھا۔ ایک روز اتفاقیہ طور پر روپیہ کے معاملہ میں اسکے پرانے رفیق ڈاکٹر پارکمین سے اس کی لڑائی ہو گئی۔ اس لڑائی میں ڈاکٹر پارکمین کی موت واقع ہو گئی۔ اگر پروفیسر ویبسٹر اقبال جرم کر لیتا تو غالباً وہ معمولی سزا پا کر چھوٹ جاتا مگر وہ بالکل خاموش رہا اور اس نے اپنے دوست کے اعضا کو نابید کرنے کے لئے سائنس کے تمام بہترین ذرائع استعمال کر ڈالے۔ اس نے اپنے معمل (لیبارٹری) میں مقتول کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے تمام اعضا، حتیٰ کہ ہڈیوں تک کو نیست و نابود کر ڈالا۔ اب وہ مطمئن ہو گیا کہ مقتول کا ایک بال بھی نہیں بچا ہے جو اس کے جرم کا راز فاش کر سکے۔ مگر وہ ایک چھوٹی سی چیز کو بالکل نظر انداز کر گیا۔ اس کی بھٹی (آتشدان) کی راکھ اور کوئلوں میں مصنوعی دانتوں کی ایک قطار کا کچھ حصہ پایا گیا جس کو دندان ساز نے پہچان کر بتا دیا کہ یہ فلاں آدمی کا ہے۔ یہ دانت ایک ایسی سخت دھات کے بنائے گئے تھے جس پر

ا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایک سائنس داں کے لئے ایسی معمولی چیز کا بھول جانا ایک معمولی بات تھی مگر انہی دانتوں اس پروفیسر کو دار پر کھنچوا دیا۔ اور قبل ازیں اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔

چند سال پہلے مسز لیٹگنٹ نامی ایک عورت شکاگو (امریکہ) سے یکایک غائب ہو گئی۔ اس کے اعزہ واقارب ں کے شوہر نے یہ کہہ کر اطمینان دلا دیا کہ وہ اپنے بعض احباب کی ملاقات کو کہیں گئی ہے۔ مگر شادی کی انگشتری جو اس کے شوہر نے اپنی دلہن کو کئی برسوں کے پہلے دی تھی، اس راز کو طشت از بام کر دیا۔ یہ خاموش اس شخص کے مکان کے احاطہ میں ایک ایسڈ (تیزاب) کے پیپے میں سے برآمد ہوئی۔ تفتیش ہونے لگی اور عرصہ میں یہ معلوم ہو گیا کہ اس شخص نے اپنی بیوی کو مار کر اس کے جسم کو ایسڈ میں تحلیل کر ڈالا تھا، مگر اس ش اور بے زبان مگر ناقابل استحالہ گواہ کو وہ بالکل بھول گیا۔ اور اسی دھات کے ایک ناچیز حلقہ نے اس سے س جرم کرایا۔

کچھ عرصہ پہلے نیویارک میں ایک یکہ و تنہا معمر آدمی مر گیا جس کا کوئی عزیز و قریب اس کے پاس دم واپسین نہ تھا۔ وہ بہت دولتمند آدمی تھا۔ اس کی حوائج زندگی کا دارومدار تمام تر اس کے گماشتہ پر تھا، اور کوئی ہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص اپنی طبعی موت نہیں مرا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر نے بھی جو اس کو دیکھنے آیا تھا کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا۔ ایک روز متوفی کے صراف کے ہاں ایک چیک آیا، جس کو اب تک اس کے مرنے کی خبر نہ ہوئی یہ چیک پہلی نظر میں بالکل صحیح اور درست معلوم ہوتا تھا۔ مگر بنک کے کلرک نے یہ معلوم کیا کہ دستخط کنندہ ے نام کے جزو اول کا ایک حرف لکھنا بھول گیا ہے جو کسی حالت میں غلط نہیں لکھا جا سکتا۔ وہ قلم جو اپنا نام نے کا عادی ہے کبھی "البرٹ" کی بجائے "ابرٹ" نہیں لکھ سکتا۔ یہ ایک معمولی غلطی تھی جو حالت بے پروائی سرزد ہو گئی تھی۔ مگر اس پر تفتیش شروع ہوئی۔ اور آخر کار متوفی کے وکیل (سولی سیٹر) کو اپنے ل کے قتل کا اقرار کرنا پڑا کہ اسی نے متوفی کو روپے کے لالچ سے مار ڈالا تھا۔

سنہ ۱۹۱۷ء کے آخر میں دوابرین نامی ایک شخص نے ایک عورت کو قتل کر کے مقتول کے سر اور ہاتھ ں کاٹ ڈالے تاکہ شناخت نہ ہو سکے۔ اس کام کے لئے اس نے طوفان ہوا کی ایک رات کو پسند تا کہ اس طوفان کے خوف سے مقتولہ کا لندن سے بھاگ جانا غیر ضروری امر معلوم نہ ہو۔ مگر اس کو مقتولہ کے ں کپڑے کا خیال نہ رہا (جو اس کے پاس رہ گیا تھا) اور جس پر دھوبی کی دکان کا نشان بنا ہوا تھا۔ آخر وہ گرفتار ر لیا گیا اور کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا۔

مشکوک ملزمین کے جرم اور بیگناہی کا اکثر ماہرین طب ہی کی شہادت پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے مقدمات میں انگلستان کے ایک بیرسٹر کا مقدمہ بہت عظیم الشان ہے اس جرم کی طرف غالباً کسی نے توجہ بھی نہ کی ہوتی اور واقع شدہ موت کو ناگہانی یا خودکشی خیال کر لیا جاتا۔ اگر ماہرین طب اس کا ثبوت بہم نہ پہونچاتے۔ اس مقدمہ میں سوال یہ درپیش تھا کہ آیا "متوفی قتل کیا گیا ہے یا اس نے خودکشی کر لی ہے؟" آرام کرسی پر پڑی ہوئی لاش کی ہیئت سے قتل کا انکار کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہدیا کہ یہ لاش اس جگہ مرنے کے کوئی ۶۰ یا ۷۰ گھنٹوں کے بعد رکھی گئی ہے۔ لاش اپنی موجودہ حالت میں سرد نہیں ہو جانی چاہئیے کیونکہ موت واقع ہونے کے ۲۴ گھنٹوں بعد وہ لاش سخت ہو گئی اور اس سختی کو دور کئے بغیر لاش کو حرکت نہیں دیجا سکتی۔ حالانکہ عضلات کو توڑے بغیر یہ ناممکن ہے۔ مگر عضلات نہیں ٹوٹے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کو سخت ہو جانے کے بعد حرکت دی گئی ہے جو موت واقع ہونیکے بعد ۶۰ یا ۷۰ گھنٹے تک وقوع میں نہیں آتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص نے لاش کو آرام کرسی میں رکھکر خودکشی کا خیال پیدا کرنا چاہا ہے۔ اس کی تائید اس نقش قدم سے بھی ہوئی جو وہاں خون آلود زمین پر اٹھا ہوا تھا۔ اس قدم کا نقش قدم مقتول کا نہیں ہو سکتا تھا اور کہ یہ نقش قدم خون بہنے سے دو گھنٹے بعد یا غالباً اس سے بھی زیادہ مدت کے بغیر نہیں اٹھ سکتا تھا پھر وہ اس تاریخ سے بہت پہلے کا معلوم ہوتا تھا جبکہ پولیس نے پہلی اطلاع ملنے پر اس مکان کا جائزہ لیا تھا۔ یہاں قاتلوں نے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے تجاویز سوچی تھیں جو بالکل بیکار گئیں اور آخر کار قاتلوں کا پتہ چلایا گیا وہ گرفتار ہوئے اور اپنی سزا کو پہونچ گئے۔

یہ مقولہ کہ "قتل ہمیشہ ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا" ہمیشہ صحیح نہیں ہوا کرتا۔ ابھی ایسے تاریک اور پرخطر اسرار باقی ہیں جن کا انکشاف نہیں ہوا، اور وہ غالباً کبھی ظاہر نہ ہوں گے مگر "یہ اعمال مخفی" عموماً چالاک اور تعلیمیافتہ آدمیوں کے نہیں ہوا کرتے عموماً غیظ و غضب سے مغلوب آدمی غیر ارادی قتل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا دیوانے اور مجنون آدمی ان افعال بلا مقصد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک بیوقوف آدمی اپنے جرائم بلا مقصد کو چھپانے میں غلطی کر سکتا ہے مگر ایک چالاک خونی اپنی ترکیبوں کو نہیں چھپا سکتا اور وہ ایک معمولی بات کو نظر انداز کر جاتا ہے جو آخر کار اس کو اپنے کرتوتوں کی سزا دلاتی ہے۔ وہ بھولی ہوئی معمولی چیز اس کے کرتوتوں کی شاہد اور اس کے جرم کا "اشتہار" بن جاتی ہے۔ بنی نوع انسان کی حفاظت کے لئے یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اکثر یہ حالت رونما ہوتی ہے۔

ادبیات

سونیٹ

(جناب محمد عمر صاحب (کھتری) عباسی بی۔ اے (جوناگڈھی) مقیم حال لندن)

"دس مع الدھر کیف دار" کے زرین اصول پر عمل پیرا ہونے والوں کی تعداد روز افزوں ترقی کر رہی ہ
نہ صرف لباس و طرزِ معاشرت میں سرایت کر گیا ہے بلکہ علم و ادب میں بھی داخل ہوتا جاتا ہے۔ اکثر شعرا اور
ون نگار حضرات نے آجکل ایسی روش اختیار کر لی ہے جو بعینہ انگریزی طرز و روش کا خاکہ یا کسی مغربی زبان
ہ ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ آجکل یہ طرزِ سخن اور پیرایہ بیان مقبول خاص و عام ہو رہا ہے اس سے ایک زبردست
دیہ ہوا ہے کہ ہماری پرانی شاعری جو گل و بلبل اور شمع و پروانہ اور وصل و ہجر کے لغو اور مبالغہ آمیز خیالات
بھری ہوئی تھی رفتہ رفتہ پاک ہوتی جاتی ہے اور بمصداق "کل جدید لذیذ" نیچرل شاعری جو مطبوع طبع
ص و عام ہو گئی ہے ہماری پرانی شاعری میں ایک نئی روح پھونک دینے کی باعث ہوئی ہے۔

اگر ہم خود کوئی اختراع و ایجاد نہیں کر سکتے تو کم از کم غیروں کے عمدہ اختراعات کی نقل تو کر سکتے ہیں لیکن
ں کی جائے تو ایسی کی جائے کہ اصل کا دہوکا ہو ترجمہ وہی بہترین سمجھا جاتا ہے خواہ وہ نظم میں ہو خواہ نثر میں
زبان کے قالب میں اس طرح ڈہال لیا جائے کہ طبعزاد معلوم ہو اور ترجمہ کا شبہ تک نہ گذرے۔

آج ہم ارباب سخن کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ "سونیٹ" جو ایک مغربی
ف نظم ہے اور جو کسی حد تک ایک خاص قسم کے خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے مخصوص قرار دیگئی ہ
ں کو اردو کے قالب میں ڈہالا جائے تو یہ ہمارا اردو شاعری میں ایک اضافہ ہوگا، ہم یہ درخواست کرتے ہوئے
مناً ان احباب سے جو انگریزی لٹریچر سے ناواقف ہیں سونیٹ کا تعارف کراتے ہیں۔

سونیٹ کی تعریف | سونیٹ ایک چودہ مصرعی نظم ہے جو ایک خاص وزن میں لکھی جاتی ہے چودہ مصرعے
قوافی کے لحاظ سے چار حصوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں دو۔ چار چار مصرعوں اور دو

تین تین کے ۔ اول ۔ چہارم ۔ پنجم ۔ اور ہشتم مصراع ہم قافیہ ۔ دوم ۔ سوم ۔ ششم ۔ ہفتم ۔ ہم قافیہ نہم دوازد ہم قافیہ ۔ دہم و سیزدہم ہم قافیہ اور یازدہم و چہاردہم ہم قافیہ ۔ مزید وضاحت کے لئے نقشہ ذیل ملاحظ

(مصراع) اول ۔ دوم ۔ سوم ۔ چہارم ۔ پنجم ۔ ششم ۔ ہفتم ۔ ہشتم ۔ نہم
(قافیہ) ا ۔ ب ۔ ب ۔ ا ۔ ا ۔ ب ۔ ب ۔ ا ۔ ج
(مثال) آب ۔ بر ۔ تر ۔ تاب ۔ باب ۔ پر ۔ شر ۔ خواب ۔ راز

(مصراع) دہم ۔ یازدہم ۔ دوازدہم ۔ سیزدہم ۔ چہاردہم
(قافیہ) د ۔ ؤ ۔ ج د ہ
(مثال) فصاحت ۔ مثال ۔ نیاز ۔ بلاغت مقال

کبھی کبھی اس میں فرق کیا جاتا ہے جو ہم آگے چل کر بتائیں گے ۔ مگر ہیں علاوہ وزن اور قوافی کے وجذبات کی بھی قید ہے یعنی ایک ہی موضوع کو اول سے آخر تک نباہتے ہیں اور اس میں روانی اور مناسبت ہوتی ہے کہ اول سے آخر تک چودہ مصرعے ایک ہی زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں اگر اس کو ایک چودہ مصر جملہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا آخری مصرع میں سارے مضمون کا لب لباب کوئی جامع مقولہ یا ضرب المثل مطلب اس خوبی سے لایا جاتا ہے کہ اگر اس آخری مصرع کو یاد رکھ لیں تو ساری سونیٹ کا مطلب یاد ہے عموماً سونیٹ کو عاشقانہ جذبات کا جامہ پہنایا جاتا ہے ۔ اگر اس موضوع خاص کے علاوہ اور موضو بھی اختیار کئے جائیں تو اس میں بخوبی ادا ہو سکتے ہیں اس طرح کی نظم کو ہم اپنی زبان میں "مسبع" کہہ سکتے ہیں میرے خیال میں یہی موزوں بھی ہے ۔

سونیٹ کی تاریخ پندرہویں صدی عیسوی میں اطالوی زبان میں اس کا رواج ہوا اور اس کی روانی اور لطافت نے اس میں روح پھونک دی ۔ سولھویں صدی عیسوی انگلستان کے شعراء نے اس میں کچھ تبدیلی کرکے جو انگریزی زبان کے لحاظ سے لازمی تھی اس طرح کی شروع کیں اور قوافی کی ترکیب میں بھی کچھ تبدیلی کی ۔ اس کا خیر مقدم کرنے والوں میں سپینسر اور سر فلپ تھے اس کے بعد شیکسپیر نے اس کو نشو و نما دی اس کی خامیاں دور کرکے نئی زینت بخشی اور قوافی کو

طرح پر رکھا:-

اول - دوم - سوم - چہارم - پنجم - ششم - ہفتم - ہشتم - نہم - دہم - یازدہم -
ا - ب - ا - ب - ج - د - ج - د - د - د - ہ

دوازدہم - سیزدہم - چاردہم -
و - ز - ز

اس نئے لباس نے اس کی زینت حسن کو دوبالا کردیا - اور اس دن سے شاعران انگلستان اسی طرح پر لکھتے رہے - مگر ملٹن کے زمانے میں پھر اس کو اپنی حالت پر رکھا گیا مگر اس نے ایک نئی بات پیدا کی کہ اس سے پہلے جو چار حصص میں سے ہر حصہ کے آخر میں وقف لایا جاتا تھا یعنی چار شعر کے بعد ختم ہوا - پھر چار کے بعد پھر تین کے بعد اور پھر تین کے بعد ملٹن نے اس رکاوٹ کو دور کردیا - گویا اول سے آخر تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی پہاڑ میں سے ایک ندی نکلی اور سیلاب کی طرح بہتی چلی گئی اور آخری سرے پر آکر سمندر سے ہم آغوش ہوگئی - اسی وجہ سے ملٹن کے سونیٹ پرشکوہ اور شاندار معلوم ہوتے ہیں جیسے اس کے دیگر اصناف سخن ہوا کرتے ہیں -

ملٹن کے بعد سونیٹ مدتوں جسم بیجان کی طرح پڑی رہی آخر ورڈز ورتھ نے اس کو اصلی قالب میں ڈھال کر اس میں از سر نو جان ڈالی - پھر روسیٹی اور مسز براؤننگ نے اسکو اور امتیاز بخشا فی الحال مسز براؤننگ کے سونیٹ سب سے زیادہ مروج اور پسندیدہ ہیں -

قوافی کے لحاظ سے اس میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں اس کا نقشہ حسب ذیل ہے -

(اطالوی) اب ب ا - اب ب ا - ج د ھ - ج د ھ

(شیکسپیر) اب اب - ج د ج د - ہ و ہ و - ز ز

(ملٹن) اب ب ا - اب ب ا - ج د ج - د ج د

سونیٹ کو اردو کا جامہ پہنانے سے پہلے کوئی وزن مقرر ہونا چاہئے انگریزی وزن جو اس کے لئے مخصوص ہے اگر اسکا تتبع انگریزی داں شعرائے اردو کرسکیں تو ایک ادبی مسئلہ طے ہوسکتا ہے اور ہم "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر عمل پیرا ہو کر انگریزی شاعری سے بخوبی مستفید ہوسکتے ہیں اور ہماری اردو شاعری اس سے بوجہ احسن استفادہ کرسکتی ہے بطور نمونہ ہم اپنے دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر

(جوناگڑہی) کا ایک سونیٹ جو انھوں نے میرے اصرار سے لکھا ہے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں امید کہ ناظرین زبان میں سے شعرا اس طرف توجہ فرمائیں گے اور سونیٹ لکھ کر ادب اُردو کو ممنون فرمائیں گے۔ وَھُوَ ھٰذَا:۔

شہر خموشاں

کیا ہی یہ شہر خموشاں دل شکن نظارہ ہے ا
کیسی عبرت خیز ہے یہ اس کی پُرغم خامشی ب
حسرت و بیچارگی ہے ہر طرف چھائی ہوئی ب
دیکھ کر جس کو دل مضطر بھی پارہ پارہ ہے ا
خاک کے تودے پڑے ہیں جا بجا کس شان سے ا
قبر ہے کوئی شکستہ اور کوئی اُجڑی ہوئی ب
سبزۂ خودرو کہیں ہے اور کہیں کائی جمی ب
ہیں پڑے سنگِ لحد بھی قالب بیجان سے ا

چھوٹ کر قیدِ مصیبت سے ہر اک آکر یہاں ج
سو رہا ہے فکرِ عیش و جاودانی چھوڑ کر د
ان کی تربت پر فقط سبزہ ہے تنہا سوگوار ھ

صرف اک شبنم ہے ان کے حال پر گریہ کناں ج
بیکسی چھائی ہوئی ہے خفتگانِ خاک پر د
آہ یہ شہرِ خموشاں بھی ہے کیا اُجڑا دیار۔ ھ

(اختر)

شوالہ

(محمد شفیع صاحب شفیع اکبر آبادی)

(بسلسلہ ماہ جولائی ۱۹۲۶ء)

(۴)

زارہ اور ثمرہ عالم خیال میں شوالہ کی دیویوں کی کیسی ہی معتقد کیوں نہ ہوں۔ مگر بظاہر وہ ان سے زیادہ مانوس نہ تھیں۔ مہینوں کی آخری تاریخوں میں جبکہ بڑی دیوی کا اشنان ہوتا تھا یہ دونوں بہنیں کچھ صندل لیکر شوالہ میں حاضر ہوتی تھیں۔ اور ان کی وجہ سے اس دن اس قدر ہجوم ہو جاتا تھا کہ مجبوراً انہیں بڑی دیوی کی پناہ لینی پڑتی تھی۔ اور پھر یہ اسوقت شوالہ سے باہر آتی تھیں جبکہ پجاریوں کے سوا کوئی شوالہ میں باقی نہ رہتا تھا۔ وہ عقیدت کی کمزور نہ تھیں مگر اُن کا جسم ضرور نازک تھا۔ وہ اگر گھر سے باہر آتیں تو انہیں لوگوں کی نگاہوں سے تصادم کا خوف رہتا تھا۔ اس لئے وہ بہت محفوظ محجوب اور بچکر نکلتی تھیں۔

آذر شوالہ سے لوٹا تو اُس کے مُنہ سے کف جاری تھا۔ اُس نے ثمرہ کو بُلایا اور کہا "دیکھو آیندہ ہرناق میرے محل کے دروازے پر نہ آنے پائے۔ ثمرہ نے نہایت متبسم لہجہ میں کہا "اگر یہ حکم آپ دربان کو دیتے تو زیادہ مناسب تھا" یہ کہکر وہ اُچھلتی کودتی ہنستی ہوئی ایک طرف روانہ ہو گئی۔

آذر نے زارہ کو آواز دی۔ زارہ آئی تو آذر نے کہا "زارہ میں نہیں چاہتا کہ تم ہرناق کی نگاہوں کے سامنے پھول برساؤ۔ اور بے حجاب چلی آؤ" زارہ نے نہایت خندہ پیشانی اور شگفتہ جبینی سے کہا "اگر آپ ہرناق کو یہاں آنے جانے سے روک دیتے تو یہ زیادہ مناسب تھا" اور وہ بھی بیٹھی بجاتی، اور نگاہوں سے بجلیاں گراتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

آذر ایک عجیب کشمکش میں تھا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ہرناق نے بڑی دیوی کو منالیا ہے اور بڑی دیوی اُسکی تمناؤں کو پورا کرنے میں ساعی ہے۔ اُسے قطعی شبہ تھا کہ ہرناق زارہ سے یا ثمرہ سے محبت کرتا ہے۔ اور ان دونوں میں سے ایک کے حاصل کرنے میں اس کا کامیاب ہو جانا یقینی ہے۔ اسکی فطرت، اسکی حسن پرستی، اور اس کا جذبہ عشق

ایک ایسے جذبہ سے بدلا ہوا نظر آتا تھا جو اُس کی نگاہوں میں کھٹک رہا تھا۔ جیسے وہ نکالنا چاہتا تھا۔ گر مقدور تھا۔ اُس
اپنی آنکھیں زور سے بند کرلیں۔ اس کے آنسو چمکدار گالوں پر بہنے لگے اور وہ عالم خیال میں بڑی دیوی کے قدموں پر جا
اُسے محسوس ہوا کہ بڑی دیوی ناراض ہے۔ اُس نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے ہیں اور وہ نہیں چاہتی کہ آذر کی پیشانی اور
اور ہونٹوں کو اپنے پاؤں کا ذرا سا صندل بھی عنایت کرے۔ اُس نے جوش عقیدت میں اپنا سر اور آگے بڑھایا لیکن
اور سمٹی۔ اور جب آذر نے تیسری مرتبہ پابوسی کی جرأت پوری قوت کے ساتھ کی تو دیوی کے ہاتھ سے وہ تیر اُس کے سر
گر پڑا جو جبروت و جلال کے مظاہرہ کے لئے اُس کے ہاتھ میں دیدیا گیا تھا اُسے اپنے سر میں ایک درد محسوس ہوا۔ وہ کرا
اور عالم خیال سے واپس آگیا اُس نے آنکھیں کھولدیں۔ اپنے صنم کدہ میں گیا جہاں اُس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کئی
بُت رکھے تھے۔ ان میں سے ایک نسائی بُت کی طرف بڑھا۔ برُش سے اُسے صاف کیا۔ مسالوں سے دھویا اور گرد
پر رکھکر سیدھا شوالہ کی طرف پہونچا۔ پہاڑ کی چڑھائی نے اُسے کمزور کردیا تھا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ شوالہ
کچھ دور ایک درخت کے سایہ میں ٹھہر گیا اور دم لیکر پھر چڑھا۔ شوالہ کے دروازہ کو زور سے کھولا اور بڑی دیوی
آنکھیں چُراتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ وہاں جاکر آذر نے اپنا بُت نصب کیا۔ اُس پر صندل لگایا۔ لوبان کی دُ
دی۔ اور اُس کے قدموں میں گر پڑا۔ وہ اپنے نئے بُت کا پرستار تھا۔ اب اُسے کوئی منع نہ کرسکتا تھا۔ اُ
بُت کے پاؤں پوری قوت سے پکڑ لئے اور اس قوت کے ساتھ سجدہ کیا کہ اُس کی پیشانی سے خون بہنے
مگر اُس نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔

(۵)

ہرناق بدستور کھڑا ہوا تھا۔ شام ہوئی پجاریوں نے شام کے مراسم ادا کئے۔ دیویوں کے پہلو میں گ
کے چراغ جلائے گئے۔ ناقوس کی آوازوں نے انھیں لوریاں دیں۔ گھنٹے کی سُریلی صداؤں نے پیام خوا
دیا۔ جب پجاری اپنے فرایض ادا کر چکے تو ہرناق، ایک دُور افتادہ پروانے کی طرح بڑی دیوی کے
پر جا پڑا۔ اُس نے سب چراغ بجھا دیئے اور دیوی کے سجدہ میں جھک گیا۔ یہ اُس کی آخری منزل تھی۔
عقیدت مندی اُسے اپنی آغوش میں لئے ہوئے دیوی کے سامنے کھڑی تھی۔

زارہ نے ثمرہ سے کہا " بہن اباجان بہت خفا ہیں۔ شاید ہرناق کا کوئی بُت شوالہ میں مقبول
ہے۔ چلو ذرا ہم بھی ہو آئیں۔ آج تو وہ بھی اپنا ایک بُت لے گئے ہیں "

دونوں ریشمی رداؤں میں ملفوف ہوئیں، اور پہاڑ پر چڑھ گئیں۔ بڑی دیر میں پہونچیں۔ بالائے

کی تازہ ہواؤں نے اُنہیں تازہ دم کر دیا۔ وہ چہلیں کرتی ہوئی شوالہ میں داخل ہو گئیں۔ بڑی دیوی کو سلام کرنے جھکتی تہیں کہ ہزناق کو سجدہ میں دیکھا۔ زارہ نے ثمرہ سے کہا "دیکھو ہزناق دیوی کو منا رہا ہے۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے" ثمرہ نے اِس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ عقید تمندانہ خم کے ساتھ ہرا بہرا بہرا اور ثمرہ نے زارہ سے کہا "چلو ذرا اپنے باپ کے بُت کو دیکھیں" وہ تمام شوالہ میں پہریں۔ دیوتاؤں نے اُنہیں محبت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور دیویوں نے خاموش نگاہوں سے اونکی پذیرائی کی۔ دوسری طرف اونہیں آذر نظر آیا۔ جو اپنے بتُ کے قدموں پر مجروح ومجبور پڑا تہا۔ ثمرہ نے آواز دی۔ زارہ نے منع کیا اور بہاگ کر کسی طرف غائب ہو گئی۔

آذر نے آواز پہچانی غصہ اور نفرت سے منہ پہیر کر دیکھا۔ ثمرہ نے کہا "زارہ بہی یہیں ہے" آذر ایک ہیبت ناک انگڑائی لیکر اٹہا۔ اپنے بت پر غایر نگاہ ڈالی اور پوچہا "ثمرہ۔ زارہ کہاں ہے؟" "وہ ابہی تو یہیں تہی ابہی بہاگ گئی ہے" ثمرہ نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ آذر بڑہا سب سے پہلے بڑی دیوی کے بُت کے پاس آیا۔ دیکھا ہزناق دیوی کے سجدوں میں بالکل ڈوبا ہوا ہے۔ اُس نے زارہ کو ہر طرف تلاش کیا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ثمرہ نے کہا "شاید وہ آپ کے ڈر سے نیچے اُتر گئی ہو گی"۔

آذر غصہ کی تیز آنکہیں چمکاتا ہوا شوالہ سے باہر نکلا۔ پہاڑ سے اُترا۔ گہر پہونچا تو معلوم ہوا کہ زارہ یہاں بہی نہیں ہے۔

آذر سخت پریشان تہا۔ دریا کے ساحل اور پہاڑ کی وادیاں آدہی رات تک چہانیں پہر شوالہ میں ڈہونڈا مگر زارہ کہیں نہ تہی۔

(۹)

شوالہ کے دروازے بند کر دیے گئے۔ نصف شب گذر چکی تہی۔ چاند پوری روشنی کے ساتہ پہاڑ کو سبزہ میں تارے بنا رہا تہا جہینگر خواب آور نغموں سے شوالہ کی بیداریوں کو آسودہ خواب کر رہے تہے چشموں میں پانی بہنے کی آوازیں سریع ہو گئی تہیں۔ دریا کی موجوں کا شور سماعت میں تموج پیدا کر رہا تہا۔ آذر اپنے محل میں کش مکش کے لیے جلد جلد کاٹ رہا تہا۔ ثمرہ اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تہی تمام گہر والے بار بار اُٹہتے تہے اور ہر آہٹ پر زارہ کے آنے کا اُنہیں یقین ہو جاتا تہا۔ آذر کا گمان ہزناق کی طرف ضرور تہا۔ مگر اُس نے دو تین بار شوالے کا چکر لگایا اور ہزناق کو ہر مرتبہ سجدہ ریز پایا۔ اس لئے آذر کا یہ گمان اس یقین سے بدل جاتا تہا کہ زارہ کو یا تو کوئی درندہ اٹہا کر لے گیا یا وہ ڈر کر پہاڑ کی دوسری جانب گر پڑی۔ جہاں عمیق غار و ل

میں ہمیشہ کے لئے اس کی قبر بن گئی ہوگی۔ بہر حال وہ بہت پریشان تھا۔ اور خصوصیت کے ساتھ اس کی
پریشانی یوں اور بھی زیادہ تھی کہ اس کی بیٹی دیوی کی بشارت اور اس کے خواب کی ایک زندہ تعبیر

(۷)

آدھی رات کے بعد شوالہ کے اندھیرے میں ہرناق کی فنادگی بڑھی۔ وہ رویا۔ بہت زیادہ رویا
اس نے دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"دیوی! اب تو رحم کر۔ میں صرف زارہ کو چاہتا ہوں۔ دنیا درکار نہیں، اس کے بدلے میں
تمام بت شوالہ کو دینے کے لئے تیار ہوں۔ دیوی تو نے مجھے گھر سے بلایا ہے، میں دو روز سے
پیاسا تیرے چرنوں میں پڑا ہوا تجھے سجدہ کر رہا ہوں، تیری قوت سے پہاڑ کمربستہ ہے، اور تیری
سے دریا سر پیٹ رہا ہے۔ تو اپنے تیرے آذر کا کام تمام کر، اور زارہ ——— آہ ——— زارہ کو
دیدے۔ جلد دیدے۔ کہ میں تیری پرستش کے بعد اس کی پرستش کر کے اپنی جبین و آغوش کو منہ
سے بسالوں۔ دیوی۔ اگر اب بھی تجھے اس میں عذر ہوگا، تو میں اپنا سر پھوڑ کر یہیں مر جاؤں گا۔ اور دنیا
شوالوں میں تو ہرناق کُش مشہور ہو جائے گی۔" ہرناق یہ کہہ کر رو دیا اور پھر سجدہ میں جھکا۔ وہ چاہتا تھا کہ
کے پاؤں پکڑ لے مگر اس کے ہاتھ میں ایک گداز اور نرم کلائی آگئی۔ اس نے شمع جلا دی اور سر اٹھا
دیکھا تو زارہ اپنی تمام خوبصورتیوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی ہے۔ دیوی کی مسرت اس
ہونٹوں میں مسکرا رہی ہے۔ اور زارہ کی نگاہوں سے رضامندی اور دلدہی کے پھول برس رہے ہیں

ہرناق تڑپ کر اٹھا۔ اس نے زارہ کو ہمکنار کر لیا۔ اور گھبرا کر پوچھا "زارہ۔ زارہ۔ تم کیسے
زارہ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا "جیسے تم آئے تھے!"

ہرناق پھر دیوی کے قدموں پہ جھک گیا۔ زارہ نے بھی سجدہ کیا اور عقیدت کے آنسو نذر کرنے
بعد دونوں شوالہ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔

شمع کے ناکمل اجالے میں، نہ معلوم ان کا ہاتھ کس چیز پر جا پڑا۔ ایک زد
دھماکا ہوا۔ اور یہ دونوں آذر کے محل میں ایسی جگہ جا کر گرے جہاں آذر کروٹیں لے
اپنی پریشانیوں کے مجسمے پامال کر رہا تھا۔ وہ اس شور کی آواز سے چونکا۔ آنکھیں کھو

زہرناک" زارہ کے قدموں میں سجدہ ریز تھا اور زارہ حسن کی ایک عدیم النظیر باوقار دیوی کی
طرح کھڑی مسکرا رہی تھی۔

تصحیح

زبان کے جولائی نمبر میں کتابت کی بعض افسوس ناک غلطیاں رہ گئی ہیں ناظرین درست فرمالیں۔

صفحہ ۲ آخری سطر میں توقعات رکھنی چاہئیں بنا لیجئے۔ صفحہ ۳ سطر ۵ بجائے "تکلہ کوہ" کے "قلہ کوہ" ہونا چاہئے۔ اور سطر ۹ "ساعد اندلسی" کی جگہ "صاعد اندلسی" درست کرلیجئے۔ افتتاحیہ کے شعر میں درودے اور سجودے، ہونا چاہئے۔ اضافت کسرہ غلط ہے۔

صفحہ ۷ سطر ۱۲ "زبان ایک ایسے گوشے سے" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۸ سطر ۱۰ "قابل نہ ہوگے" کی بجائے، قابل نہ رکھو گے۔ اسی صفحہ کی سترہویں سطر میں بجائے "پرنور" کے "پرشور" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۱۱ سطر دوسری "زبان کی خدمات کی بجائے" "زبان" جن خدمات کی ہونا چاہئے۔ اسی صفحہ کی آٹھویں سطر میں بجائے "اہل نقاب" کے صرف "لغات و اہل علم" ہونا چاہئے۔

ادبیات کے سلسلہ میں صفحہ ۳۳ کی بیسویں سطر میں "کارنامہ" کی جگہ "کارزانہ" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۴ کی سطر ۱۳ و ۱۴ میں "پایا انداز نہیں کہا جاسکتا" کی بجائے "دیا نظر انداز نہیں کیا جاسکتا" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۵ کی سطر ۱۴ میں "مستقبل تصویر" کی جگہ "مستقل تصویر" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۶ کی سطر ۹ میں "خوش آئندہ" کی بجائے "خوش آیند" سطر ۱۱ میں "الفاظ میں" کی جگہ "الفاظ ہیں" اور سطر ۲۰ میں "نغل رہیں" کی بجائے "مخل رہیں" بنا لیجئے۔ صفحہ ۳۷ کی سطر ۱۶ میں "کم ہو نہ جائے" کی جگہ "گم ہو نہ جائے" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۸ کی سطر ۴ میں "دینا ہور" کی بجائے "دُنیا ہور" ہونا چاہئے۔

نظم "مسلک تسلیم" کے آخری بند کا یہ شعر درج ہونے سے رہ گیا ہے ؎

تیری حقیقت ہی کیا اور ہے کیا اختیار
بندۂ الم کو مخل اس سے نہیں کی ہو

ایڈیٹر

لہو کی بُوند

جلوۂ رُخ کو میں رنگینیٔ بستاں نہ کہوں   پرتوِ حُسن کو آئینہ حیراں نہ کہوں
گردشِ چشم کو پیمانۂ رقصاں نہ کہوں   وسعتِ وحشتِ خاطر کو بیاباں نہ کہوں
لیلیٔ عشقِ جنوں آہوئے صحرائی ہوں
بزمِ قدرت کے کرشموں کا نہ شیدائی ہوں

بھر رہا ہے گلِ مقصود کو داماں میں کوئی   ایک گلگوں لئے بیٹھا ہے گریباں میں کوئی
لذت اندوزِ طربِ محفلِ خوباں میں کوئی   محوِ اندوہ و المِ فرقتِ جاناں میں کوئی
کوئی سرگرمِ فغاں ہے تو کوئی ہے دل شاد
لب پہ نغمہ ہے کسی کے تو کسی کے فریاد

تھا اسی فکر میں غلطاں کہ سرِ راہ گذر   مجھکو اک شاخ پہ آیا گلِ صد چاک نظر
جا بجا داغ تھے سرخی کے نمایاں جس پر   اور شبنم کے چمکتے تھے درخشاں گوہر
موجِ نکہت میں تھے گیسو کی طرح پیچ و تاب
اس کا ہر داغ تھا رعنائی میں گلشن کا جواب

منظر اک عالمِ عبرت کا دکھایا اس نے   دیدۂ شوق کو مبہوت بنایا اس نے
اپنا افسانۂ غم گو نہ سنایا اس نے   جنبشِ لب سے مگر اتنا تو بتایا اس نے
ساغرِ عیش نہ تصویرِ سبو کی ہوں میں"
صفحۂ دہر میں اک بوند لہو کی ہوں میں"

زیرِ اب تک نہوئی ہمتِ مردانہ مری   غیرتِ دل سے سبق لیتا ہے پروانہ مری
خاک کے ذرّوں سے لپٹا تھا کبھی دانہ مری   اس کے ہر پھول میں ہے نکہتِ مستانہ مری
رہا محفوظ یہ گلچیں کی جفا سے اب تک"
اس کی شاخیں نہ جھکیں دستِ صبا سے اب تک

کشتۂ تیغ جفا سے مری توقیر کو پوچھ ‏ ‏ رہروِ ملکِ عدم سے مری تنویر کو پوچھ
گردشِ چرخ سے جاکر مری تاثیر کو پوچھ ‏ ‏ بسمل خستہ جگر سے مری تفسیر کو پوچھ
شمع ملت کی مرے داغ میں تابانی دیکھ
میرے ذرات میں آئینِ جہانبانی دیکھ

محمود (اسرائیلی)

مناظرۂ نظم و نثر

ذیل کا دلچسپ مناظرہ پروفیسر نواب علی صاحب کا غیر مطبوعہ ہے جو ۱۹۰۲ء میں لکھا گیا تھا ہم کو جناب نظام الحق صاحب عباسی قیصرت (احمد آبادی) کی معرفت موصول ہوا ہے جس کو ہم شکریہ کے ساتھ درج رسالہ کرتے ہیں۔

پروفیسر صاحب موصوف کا نام دنیائے صحافت میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے آپ متعدد کتب کے مصنف ہیں اور عرصے سے بڑودہ کالج میں فارسی کے پروفیسر ہیں۔

(ایڈیٹر)

لطف شام اودھ اک روز اٹھانے نکلا ‏ ‏ لبِ جو ایک عجب میں نے تماشا دیکھا
دو جواں نور کے سانچے میں ڈھلے آئے نظر ‏ ‏ آسماں سے اتر آئے تھے فرشتے گویا
قد موزوں میں عجب ایک کے تھی رعنائی ‏ ‏ دوسرا نامِ خدا لولوئے منثور اتھا
حضرتِ نظم تھے اک دوسرے مولانا نثر ‏ ‏ نام ہر ایک کا تھا ٹوپیوں میں اُنکے کڑھا
بحث کرتے تھے کہ کس کو ہے فضیلت ہم میں ‏ ‏ کون ہے گرمیٔ ہنگامۂ بزم اعلیٰ
حضرتِ نظم لگے کہنے کہ ہم "موزوں" ہیں ‏ ‏ اسی باعث سے تو بھاری ہے ہمارا پلّا،
میری موزونی پہ آتی ہے طبیعت سب کی ‏ ‏ اور یہ مضموں ہے تمہارا کہ "میں آیا تھا"
بحث لفظی سے نہیں بحث ہے صاحب ہم کو ‏ ‏ ہم معانی و مطالب کے ہیں سچے شیدا

مثنوی دو جہاں معنوی صورت اپنی،
اللہ اللہ یہ ظرف اور دماغ اعلیٰ

میرے دریا سے ہوا کوئی جو سیراب اگر
تا ابد زندۂ جاوید بلاشبہ ہوا

جتنے ہیں ذاکر و مذکور مری محفل میں
ان کا رہتا ہے صدا بزم جہاں میں چرچا

سعدی و حافظ و جامی و نظامی ہیں کہاں
چار سو نام کا پر ان کے ہے بجتا ڈنکا

میں نے رستم کا کیا نام جہاں میں روشن
پہلواں تھا کوئی ورنہ کسی گوشہ میں پڑا

گردشِ چرخ سے ملتا نہ پتہ بھی لیکن
کوکبِ بخت زلیخا مرے دم سے چمکا

بزم میں میری غزل مطربِ عیش و عشرت
رزم میں میرا رجز جنگ جدل کا قرنا

میں نے جب ہومر و ملٹن کے لگایا سر سے
دُور کی سوجھی انہیں میرے میں ہوئی ایسی جلا

ڈینٹی میرا ہی شاگرد تھا جس نے بے مثل
جنت و دوزخ و اعراف کا نقشہ کھینچا

جلوۂ حسنِ معانی نظر آیا کیا خوب
میں نے اسٹیج پر جب شیکسپیر کو بھیجا

اور تو کیا کہوں تھا اپنا زمانہ بھی کبھی،
ہند و یوناں میں سمجھتے تھے مجھے جب دیوتا

جگھٹے رہتے تھے ہر وقت پریرویوں کے
اور میں ان میں کنہیا کی طرح پھرتا تھا

لوٹ میں نے ہی لیا صبر و قرارِ عاشق،
میں نے عالم میں محبت کی ہے دی آگ لگا

آنِ واحد میں مجازی کو حقیقی کردوں
بندۂ بت کو بنا دوں ہیں خدا کا بندا

آپ فرمائیے کس بات پہ ہے ناز جناب
کچھ فضائل تو بیاں کیجئے سنیں ہم بھی ذرا

جوش میں آکے لگے کہنے یہ مولانا نثر
چڑھ گئی آج زیادہ ہے جناب والا

گر سناؤں تمہیں تھوڑے سے فضائل اپنے
آپ کی ساری تعلی کو دکھا دوں نیچا

آپ کو ناز بہت اپنی ہے موزونی پر،
میرے مضموں کو بتاتے ہو کہ ہر وہ اکھڑا

رول دوں موتیوں کو میں ہوں وہ بحر ذخار
آپ ڈنڈی کی ترازو کی خبر لیجئے جا

میں تصنع سے معرا ہوں بہ رنگ خورشید
آپ پہنے ہوئے ہیں قوس و قزح کا جوڑا

میرے جلوے مسیحا نے جلائے مردے
آپ زندوں کو کریں زندۂ جاوید تو کیا

میں ہوں شفقی ارسطو قلم افلاطون،
فارابی کا بیاں نسخۂ ابن سینا۔

برک کی یاد میں وہ برق صفت تقریریں
یاد سسرو کی وہ اسحر بیانی کرنا

علم دیں میں نے جلایا وہ غزالی ہوں میں — نام قرآن میں ہے نکلا مرا قاضی بیضا
روم و ایراں مرے مطلوب کے گائے ترانے — تختِ قیصر ہے نہ اب باقی ہے تاجِ کسریٰ
دی اذاں مصر کے اہرام پہ چڑھ کر میں نے — گونج اٹھا سارا جہاں صل علےٰ صل علےٰ
طفل ہوں، یا ہوں جواں، پیر ہوں جتنے ہیں غرض — کلمہ پڑھتا ہے ہر اک بزمِ جہاں میں میرا
اور میں کچھ نہیں کہتا ہوں بس اک بات مری — اور سن لیجئے پھر آپ ہی سمجھیں جیسا،
للہ الحمد شرف مجھ کو ہوا یہ حاصل — مری آغوش میں قرآن ہے خدا نے رکھا

حضرت نظم یہ سن کر ہوئے کچھ سرخ مگر
میں نے جب رنگ یہ دیکھا تو وہیں بیچ میں جا

یوں کہا میں نے کہ تیوری پہ نہ بل آئے ذرا — ورنہ پھر بحث کا سچ پوچھئے کیا لطف رہا
خلط مبحث ہی تناقض کا سبب ہوتا ہے — افضلیت ہے الگ ذکر فضائل ہے جدا
سچ اگر پوچھئے دونوں کے دلائل ہیں قوی — ہے ہر اک تم میں سے آنکھوں کا ہماری تارا

نظم "دل"، آپ ہیں نثر آپ ہیں بے شبہ "دماغ"
دل ۔ دماغ آدمی کے ہیں یہ قوائے اعلیٰ

سید نواب علی (از بڑودہ)

گوہر اشک

سرد چلتی تھی ہوائیں اور اندھیری رات تھی — سو گئی تھیں برف کے بستر پہ کرنیں چاند کی
ہُو کا عالم، جاندار آتا نہ تھا کوئی نظر — ایک سناٹا سا تھا چھایا ہوا سب دہر پر،
ایسی خاموشی میں ایک نازک و ناز آفریں — گھر سے اپنے باہر آئی بادلِ اندوہگیں
شہر سے باہر چلی شہرِ خموشاں کی طرف — مدفنِ عاشق کو یعنی کوئے جاناں کی طرف
نازنین گلبدن آرامِ جاں کی قبر پر، — بیٹھ کر آنسو بہانے لگ گئی باچشمِ تر
برف کے مانند قطرہ اشک کا اک جم گیا — صبح کو سورج کی کرنوں نے اُسے چمکا دیا
اتفاقاً اک فرشتے کا ہوا اس پر گذر — دیکھ پایا اس نے وہ اشکِ درخشاں قبر کے اوپر
جھٹ اٹھا کر لے لیا اس نے وہ دُرِ بے بہا — اور وہ اس کے تاجِ سر کے واسطے زینت بنا

اے گلزمین ڈھاکہ

(مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی)

انوار رفتگان ہیں زیب جبین ڈھاکہ انجم نشان نہ کیوں ہو مہ نشین ڈھاکہ
آنکھوں میں کھب گیا ہے نقش حسین ڈھاکہ اُف دلنواز طرز ناز آفرین ڈھاکہ
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

ہر شان دل نشین ہے ہر آن دلربا ہے مغلیہ دور کا تو وہ نقش جانفزا ہے
ظاہر پہن ہین سے انداز اک جدا ہے پنہاں ادا ادا میں تہذیب ایشیا ہے
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

دشمن فلک سے اب بھی گرم ستیز ہے تو اس دور میں بھی کان اہل تمیز ہے تو
مشرق کے دایرے میں وہ ایک چیز ہی تو بنگالہ جسم ہے اور جان عزیز ہے تو
پورب کی جان تو ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

قسمت سے ہین فرزان تجھ میں چراغ کتنے گہوارہ گیر تیرے روشن دماغ کتنے
سرگشتگان ساقی ہیں باغ باغ کتنے معمور کتنے شیشے لبریز ایاغ کتنے
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

خاک وطن کا شیدا تجھکو نعیم جانے لطف دوام سجھے فیض عمیم جانے
نکہت کو جیسے گل کی باد نسیم جانے روحانیت کو تیری طبع سلیم جانے
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

کس کس کو کھینچ لائی جا کر ہوا چمن کی شمعوں کی روشنی سے زینت بڑھی لگن کی
گر قصے میں چھیڑ دیں تو رونق ہو انجمن کی وہ طرفہ داستانیں ہیں تیرے بانکپن کی
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

جو تیری غیر فانی توقیر جانتے ہیں اک مشت خاک کو بھی اکسیر جانتے ہیں

رنگین مزاج دلکش تصویر جانتے ہیں   یا خواب عنبریں کی تعبیر جانتے ہیں۔

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

کرتے ہیں ذکر جنکا اب ہم بڑی ہلی میں   ذرے ہیں جن کے روشن اس خاک صندلی میں
خوشبو بسی ہے جن کی ہر پھول ہر کلی میں   پھرتی ہیں انکی بو میں تیری گلی گلی میں

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

دوش صبا کی چادر یارب سرک نہ جائے   پھولوں میں سونیوالی ساحل پہ تھک نہ جائے
رندوں کی سرخوشی سے واعظ بہک نہ جائے   لہرا رہی ہو گنگا ساغر چھلک نہ جائے

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

سیلاب باغ دھرا چاک جگر کو سی لے   آ کر کنار گنگا پھر ایک جام پی لے
آنکھیں ہیں کچھ نشیلی منظر ہیں کچھ رنگیلے   عنابی انگلیوں میں دامن ہیں کتنے نیلے

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

ہیں لال لال سڑکیں یا کھل رہی ہے ہولی   ڈوبی ہوئی شفق میں یا ہے دھنک کی چولی
یہ گلرخوں کے جمگھٹ شکلیں یہ بھولی بھولی   ڈھاکہ تو شہر ہے یا مالن کی کوئی جھولی

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

ہیں شام میں یہاں کی شام اودھ کے جلوے   فطرت کے موقلم سے اترے ہیں خوب چہرے
کھنچتے ہیں دور سے دل سنتے ہیں جب فسانے   تیری لطافتوں کے تیری نزاکتوں کے

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

رعنا کی دلکشائی شیشے پہ آب صیقل   "یا نخلہ کہن سے پھوٹی ہے دُہری کونپل
ناقابل تحمل کیوں ہو نہ تازہ جدول   نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

محفل میں دوستوں کی کیا میں کبھی نہ ہونگا   ڈھاکہ کی شہرت کا انکار کب سہوں گا
سچی جو بات ہوگی کیوں بے کہے رہونگا   سو میں کہونگا خالدؔ میں لاکھ میں کہونگا

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

غزلیات

(از جناب محمد یوسف صاحب ناظم لکھنوی)

تجھے کس نے جانا کہ مانا نہیں ہے — تجھے کس نے مانا کہ جانا نہیں ہے
یہ دید اور وا دید کی داستاں میں — بجز ذکر دیروز و فردا نہیں ہے
سُنی ہم نے "دیدار" تعبیر جس کی — یہ وہ خواب ہے، جو کہ دیکھا نہیں ہے
محیط و محاط ایک کیوں کر بھلا ہو — کہ قطرہ حقیقت میں دریا نہیں ہے
سمجھتا ہے جو نحن اقرب کا مطلب — اسے ڈھونڈھنے دور جانا نہیں ہے
میری سادہ لوحی تجسس ہے اس کا — جسے ڈھونڈھنا ہی ہے پانا نہیں ہے

نہ کہہ کر انا الحق تماشا ہو ناظم
تجھے دیکھنا ہے دکھانا نہیں ہے

(خاکسار عبد الرحمٰن خوشتر سنگر دلی مدیر رسالہ ہذا)

حسینوں کے مرقع میں تری تصویر اچھی ہے — میں عاشق ہوں ترا کتنی مری تقدیر اچھی ہے
ادھر مضطر ہوا میں اور اُدھر وہ گھر سے چل نکلے — مری آہِ رسا میں آجکل تاثیر اچھی ہے
نزاکت سے نہ جب شمشیر اُٹھی دستِ نازک سے — تو جھنجھلا کر کہا کم بخت کی تقدیر اچھی ہے
مزے لیتا ہوں دیدِ گفتگو کے وقت تنہائی — مری ہمدم فراقِ یار میں تصویر اچھی ہے
بُرا میں ہوں مگر تم سے حسیں پر جاں دیتا ہوں — تم اچھے ہو مگر تم سے مری تقدیر اچھی ہے

ہمیشہ خوش جمالوں میں بسر ہوتی ہے اے خوشتر
مقدر کا دھنی تو ہے تری تقدیر اچھی ہے

منتخبات

مکتوب مہدی

تحصیل بارہ - ضلع الہ آباد
۰ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء

پیارے دلگیر

خط ملا، تھوڑی دیر کے لئے آپ کی پیدا کردہ حرارت میری رگوں میں بجلی کی رو دوڑا دیتی ہے
اس قدر بے کیف ہو رہا ہوں کہ آپ بادہ مست خلوص وہاں بیٹھ کر اندازہ نہیں کر سکتے۔
آشنائے سخن کو سابقہ بھی پڑا تو کس سے؟ ڈیڑھ سو برس کی بڑھیا یعنی قانون سے، جس کے چہرے کی
ں میرے دماغ میں گرہیں ڈالتی ہیں۔

ہبئی، اپریل تک ضبط کیجئے، آخری موقع (چانس) ہے۔ یا تخت یا تختہ! تحصیلداری کی ہوس نہیں، لیکن غیرت
س گوارا نہیں کرتی کہ کسی سے گھٹ کر رہوں، لاج آپڑی ہے، خدا بات رکھ لے، پھر میں آپ کا ہوں اور
تک باتیں بنانے کا تعلق ہے، نقاد میرا۔

بعض سرخیاں جو میں آپ کے لطف طبع کے لئے لکھ دیتا ہوں، یہ صرف اس لائق ہیں کہ شوخی تحریر کے لحاظ سے
بات نثر" کے تحت میں کبھی کبھی ان کو جگہ دیجئے۔ لیکن یہ چیزیں ایسی نہیں جو کسی ادبی رسالہ کے لئے نفسیات
، کے لحاظ سے مقصود بالذات ہوں، لیکن افسوس یہ ہے کہ تصنیفی عہد کا شبلی کے ساتھ خاتمہ ہو گیا!

موجودہ نسل قدیم لٹریچر بالکل نہیں جانتی، اور کتنی ہی روشن خیالی ہو بے گھر کی پونجی (ایکنیبلیٹی) کے کام نہیں
جس نوجوان گروہ کے ہاتھ میں قلم ہے، اسے زیادہ سے زیادہ "عیب پوش" سمجھئے، یعنی معلومات اور قابلیت کے
اسے ایک انچ بھی نہیں لیکن چاہتا ہے کہ ایک فٹ نہیں ایک گز سمجھا جائے۔ ایک آدھ مستثنیات لائق غیرت
ہوں تو ان سے کام نہیں چلتا۔

ماجد بی۔ اے کی دوسری کتاب فلسفۂ اجتماع آپ نے دیکھی؟ یہ البتہ ہونہار ہے .. .. اور
ون حکمائے ادب میں پیش پیش ہوگا اس لئے کہ اس میں گہرائی موجود ہے، نری باتیں بنانا نہیں جانتا۔

نیازؔ سے کیا فرمائش کروں، وہ صحیح مذاق تصنیف کی طرف نہیں آتے۔ "مہذ بین یعنی عباسی دور کے ارتقا ردا
پر لکھوائیے۔ بہتیرے سنجیدہ عنوان ہیں۔ لیکن لکھنے والے کہاں سے آئیں گے؟
میں یورپ کی مدد سے کام چلا سکتا ہوں لیکن پہلے بارؔو چھوڑائیے اور اکبر آباد کے کٹڑے میں حبوسے کی دُ
کھلوا دیجئے۔
لطیف صاحب سے (جن کا پتہ سمجھ میں نہ آیا، ڈھولی کھار۔ کیا چیز ہے؟ بار کا دروازہ اور بائے گس کی تیلیار
کہدیجئے گا جس قسم کا ٹھوس لٹریچر وہ چاہتے ہیں، مواد کی کمی نہیں، لیکن پہلے پائنر کا سا خوش سواد اور نشاط افز
اور پائین باغ پیدا کر دیجئے اور اسی کے قدر داں نہیں صرف پڑھنے والے دیجئے جو سر کھٹ نہیں زر کھٹ ہوں،
جو آپ چاہتے ہیں، نہ ہو تو میرا ذمہ!!
رہی چھم چھم (یا اُن کی کھٹ کھٹ) یہ جاتے ہوئے نشہ جوانی کا اترا ہوا خمار ہے جو کبھی کبھی "صحافی" کی
میں بے نقاب ہو جاتا ہے۔
میرے سب سے پہلے مضمون کا عنوان ان شاء اللہ "ادب الاساتذہ" ہوگا۔ نیازؔ اگر مہذ بین کو
سنبھال سکیں تو یہ عنوان دیجئے:۔

"کل جو گذر گئی۔ بے کار۔ جو آنے والی ہے غیر اختیاری ہے زندگی تو آج
صرف آج کا نام ہے!"

میں تم سبھوں کی بے غایت شاعری سے اسی لئے تو جلتا ہوں کہ کام کی بات آتی نہیں یا کرنی نہیں
اچھا خاصا انسان ہیولیٰ ہو کر رہ جاتا ہے۔
ہاں یہ آج کل آئے دن آپ کی "آنکھیں کیوں دُکھتی ہیں" کیا کسی نے "نمک کی چاٹ پر لگا یا ہے"
لطیف صاحب کو یہ چند سطریں دکھا دیجئے گا، ان کے خط کے ایک ضروری حصے کا جواب رہ گیا تھا۔ گو
نقادؔ کے لئے لکھتا ہوں، جواب باصواب پر آپ کو اطلاع دونگا۔

بہترین خواہشات کے ساتھ

ہمیشہ آپ کا

مہدی

(علیگڈھ میگزین)

اخبار علمیہ

دنیا کا سب سے بڑا مطبع

واشنگٹن (امریکہ) میں دنیا کا سب سے بڑا مطبع قائم ہے جس کی رفیع الشان ہفت منزلہ عمارت میں کام کرنے والوں
تعداد چار ہزار ہے۔ ایک سو چوالیس ٹائپ جاننے کی مشینیں اور ۳۲۵ مطبع ہیں۔ ایک خاص شعبہ ۱۵ ہزار محکمہ جات مال کے لئے
یشل کاغذات کی چھپائی کے واسطے مقرر ہے جو علاوہ ازیں تمام ریاست ہائے متحدہ کے آفیشل کاغذات چھاپتا ہے۔ اس مطبع
ں کارڈ چھاپنے کے لئے ایک علیحدہ شعبہ مقرر ہے جو ایک دن میں چالیس لاکھ کارڈ چھاپتا ہے ایک شعبہ صرف ٹکٹیں چھاپنے اور
ن کو رنگنے اور گوند چپکانے کے لئے مخصوص ہے مطبع کا ایک شفاخانہ بھی ہے جو وہاں کے کام کرنے والوں کے علاج معالجہ
غرض سے قائم کیا گیا ہے۔

(الزہراء)

کرۂ زمین کی عمر

ڈاکٹر ایف۔ آر۔ مولٹن نے جو شکاگو یونیورسٹی کے فلکیات کے پروفیسر ہیں حال میں اپنی ایک تقریر میں بیان کیا کہ زمین
ج سے تقریباً دس لاکھ ارب برس تک قائم رہے گی ان کی رائے ہے کہ زمین ایک چھوٹا سا بچہ ہے جس کی عمر طبیعی کا ابھی
رف بیس لاکھواں حصہ ختم ہوا ہے زمین سے جو معدنیات نکلتے ہیں خصوصاً ریڈیم ان سے اندازہ کیا جاتا ہے
ہ اس وقت زمین کی عمر صرف دو ارب سال کی ہوتی ہے۔ ستاروں کی تعداد، ان کا بُعد اور وہ جس تیزی
ے ایک دوسرے کے گرد گردش کرتے ہیں اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ دس لاکھ ارب سال کے بعد ایک
ت آئے گا جبکہ ستارے آپس میں اسقدر نزدیک ہو جائیں گے کہ ان میں باہم تصادم ہو جائے گا اور
ہ ایک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے کو فنا کر دیں گے۔ اسوقت کرۂ زمین بھی ان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکیگا۔ چنانچہ دس لاکھ
ب سال کے بعد زمین کا وجود بھی باقی نہ رہے گا۔

(موڈرن ریویو)

زبان خلق

ہم اس عنوان کے تحت قدردانانِ علم و ادب اور نقادانِ فن کی ان بیش بہا آراء کو مستقل طور پر درج کیا کریں گے جو زبان کے محاسن و معائب پر اپنے آزادانہ خیالات کا اظہار فرما کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔

ذیل میں ہم اپنے کرمفرما جناب تمرَوش صاحب لکھنوی کا مضمون "زبان کاٹھیاواڑ" شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے ہم ان کے لفظ لفظ سے اتفاق کرتے ہیں لیکن یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ابنائے ملک (اہل کاٹھیاواڑ) بھی اس ضرورت کو محسوس کریں جیسا کہ ہم نے اپنے پہلے نمبر کے افتتاحیہ میں گذارش کردی ہے۔ بہرکیف اگر اہل کاٹھیاواڑ نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور ہماری اس محنت کی داد دی تو ہم اپنی تمام خدمات اہل کاٹھیاواڑ کیلئے وقف کر دیں گے۔

ایڈیٹر

زبان کاٹھیاواڑ

(چند مشورے اگر مانے جائیں)

خوشتر صاحب کو یہ یقین دلانا جب میری طاقت سے باہر ہو گیا کہ آج کل میں ایسی حالت میں ہوں دماغی محنت کر ہی نہیں سکتا تو ناچار، چند سطریں ان کے لئے لکھنا ہی پڑیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ، اب تک سمجھ نہیں آتا، کہ لکھوں کیا۔ ایک ایسے خطے میں جہاں کی زبان گجراتی ہے، ایک اردو رسالے کے اجراء پر مبارکباد، بہ نہایت ہی معمولی بات ہے۔ چلئے وہ بھی دی جا چکی۔ رسالے کی کامیابی کی دعا کردوں، وہ تو ایک رسمی بات ہے۔ ہو چکی۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسی بات لکھی جائے، جو چاہے نئی نہ ہو، مگر مفید ضرور ہو۔

یہ رسالہ ایسے مقام سے جاری ہوا ہے، جہاں کے رہنے والے اگرچہ اردو نہیں جانتے مگر یہ بات تو تاہم ہوئی ہے، کہ انہیں اردو سیکھنے کا شوق بھی نہیں ہے۔ منگرول کی اسلامی ریاست نے مانا کہ، اردو کی ایسی خدمت نہیں کی، جو ذکر کے قابل ہو، لیکن اردو کے خادموں کی قدر تو ضرور ہی کی ہے۔ وہ اس طرح کہ فردوس مکان نواب صاحب کے زمانے میں لکھنؤ کے دو نامی شاعر جلال اور شمشاد اس ریاست کے ملازم تھے۔ میں

نا ہے، نواب صاحب مرحوم خود بھی شعر کہتے تھے اور یہ بھی سنا ہے کہ وہ مرثیہ بھی خوب پڑھتے تھے۔ خ
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
جانتا بھی ہوں، سنا بھی ہے، اور کہیں پڑھا بھی ہے کہ لکھنؤ کے یہ دونوں باکمال شاعر جن کا ذکر
بھی ہوا ہے، منگرول میں اپنی زندہ یادگاریں بھی چھوڑ گئے ہیں۔ دو صاحبوں کا ذکر تو میرے ایک دوست
یا تھا۔ اگر میری یادداشت میرے ساتھ بے وفائی نہیں کرتی، تو یاد پڑتا ہے کہ ایک صاحب کا تخلص
ن ہے اور دوسرے کوئی سید صاحب ہیں۔ میں ان صاحبوں سے واقف نہیں، مگر جلال مرحوم کا ہم وطن
، کی بنا پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں صاحبوں کو اس پرچے کو پوری مدد دینا چاہئے۔
میں یہ مشورہ دوں گا کہ اس پرچے کو خوشتر صاحب کاٹھیاواڑ کے اردو جاننے والوں کے لئے اور خاص
منگرول والوں کے لئے وقف کر دیں جہاں تک ہو سکے انہیں سے مضمون لیں، وہ چاہے نظم ہو، یا نثر، اور
ہے کے مضمون چھاپیں۔ کوئی ضرورت نہیں باہر والوں کے ایسے مضامین کی جن کا مقصد لکھنے والوں کے لئے
ت کی نمائش ہو اور بیچارے کاٹھیاواڑ والوں کو ان سے کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ کوئی مانے یا نہ مانے میں تو اپنے پھٹے پرانے لباس کو
ں کے مانگے تانگے کے خلعت سے بہتر سمجھتا ہوں" اور یہی شیراز کے ایک بڑے تجربہ کار کا کہنا ہے کہ ؎

کہن خرقۂ خویش پیراستن ۔۔۔ بہ از جامۂ عاریت خواستن

یعنی مانگے تانگے کے لباس سے اپنا پرانا دھرانا لبادہ اچھا ہے۔
خوشتر صاحب کو میں یہ بھی مشورہ دوں گا کہ اس رسالے کا بڑا حصہ نثر کے مضمونوں سے بھرا ہونا چاہئے اور لکھنے والے صرف منگرولی
یا واڑی ہونا چاہئے۔ وہ پھر چاہے جیسی زبان میں لکھے جائیں ایڈیٹر صاحب کا فرض ہے کہ ان کی زبان سدھار کر انہیں
ں۔ آپ پوچھیں گے آخر وہ لکھیں کیا؟ میں جواب دوں گا، لکھنے کو مضمون بہت، اور کچھ نہیں تو منگرول کا جغرافیہ ہی سہی۔ آپ
گے اس میں کیا دھرا ہے؟ میں کہوں گا سب کچھ ہے۔ اب سمجھ لیجئے آپ سید صاحب کے دفتر سے نکلتے ہیں اور سارے شہر کی
رتے ہیں بس جو آپ دیکھیں وہی لکھ دیں۔ یہاں کی چھوٹی گلیاں یہاں کے بڑے رستے۔ یہاں کی عالی شان عمارتیں، یہاں
ہ لئے کھنڈر۔ یہاں کے امیروں کے محل، یہاں کے غریبوں کے جھونپڑے، یہاں کے آباد مقام، یہاں کے ویران ٹھکانے
ں کے ہرے بھرے باغ یہاں کے اجاڑ جنگل، اس کے سوا آپ جو دیکھیں وہ لکھیں، میں نے تو منگرول دیکھا بھی نہیں میں کیا جانو
ہ ایسی کام کی چیز ہو جائے گی، جو منگرول کی ایک اچھی یادگار رہو گی۔
اس رسالے کی زبان اول سے آخر تک کم سے کم ایسی ہو، جیسی اس مضمون میں میں نے لکھی ہے۔ یعنی بالکل آسان

جیسے بچے بولتے جوان سب سمجھیں، تھوڑی بہت اُردو پڑھے ہوئے پڑھ لیں، اور اُردو نہ جاننے والے بھی پڑھوا کے سُن لیں۔ یاد رہے کہ اس کی زبان ہرگز ہرگز ایسی نہ ہو جیسے کاٹھیاواڑی مسلمان نہ سمجھ سکیں۔ کیا اچھا ہو، اگر اس پرچے میں یہ خصوصیت (خاص بات) پیدا ہو جائے کہ اس کے سب مضمون چاہے وہ نظم میں ہوں، یا نثر میں فارسی علمیت اور اضافت سے پاک ہوں۔ ایسا کرنا بہت مشکل تو نہیں ہے، اگر مہربانی کر کے میرے اس مضمون کو آپ پھر ایک مرتبہ پڑھ جائیے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑی سی کوشش میں ایسے مضمون لکھے جا سکتے ہیں۔

ہر کاٹھیاواڑی مسلمان کو چاہئے کہ اگر وہ اردو کی کچھ بھی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اس رسالے کو ضرور خریدے اور ایڈیٹر کا ہاتھ بٹائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہانگرول میں اس کو ۵-۶ سو خریدار مل جائیں تو یہ رسالہ بہت کچھ کام کر سکتا ہے۔ ہانگرول اور کاٹھیاواڑ کے اردو جاننے والوں کو چاہئے کہ اس میں برابر مضمون لکھا کریں۔ وہ دن بے شک بڑی خوشی کا ہوگا، کہ میں اسے اول سے آخر تک منگرولیوں ہی کے مضامین سے بھرا ہوا دیکھوں گا۔

مجھ جیسے اور لکھنے والے، جن سے ایڈیٹر صاحب نے قلمی مدد مانگی ہو، میں ان سے بھی یہی درخواست کروں گا کہ وہ جہاں تک ہو سکے، آسان زبان میں لکھنے کی کوشش کریں۔ مجھے حقیقت میں بالکل فرصت نہیں ہے ورنہ میں کوئی خاص مضمون لکھ بھیجتا، مگر پریشانیاں دور ہونے پر، وعدہ کرتا ہوں، کہ میں زبان کو بھولنے والا نہیں۔

سروش (لکھنوی)

مخدومی ایڈیٹر صاحب زبان! السلیم

زبان کا پہلا نمبر میری نظر سے گذرا، میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ کاٹھیاواڑ سے اُردو کا ایک ایسا دلفریب دیدہ زیب پرچہ آپ نے نکال کر ہماری زبان پر احسان کیا ہے۔ رسالہ کے حسن ترتیب سے آپ کے ذوق سلیم اور شوق ادب کا بخوبی پتہ چلتا ہے مختلف مستقل عنوانات قایم کر کے آپ نے رسالہ میں جو تنوّع پیدا کر دیا ہے وہ بہت دلکش ہے۔ مقالات میں "علم اور اسلام" والا مضمون پُر مغز اور کار آمد ہے، ادبیات میں "شوالہ" نہایت دلپذیر فسانہ ہے اور حضرت خالد کی "ہستی معصوم" تو اپنے فیر فانی لٹریچر کے لحاظ سے قطعی اس عالم کی چیز نہیں معلوم ہوتی!

اُن کی کس کس نازک خیالی کی داد دوں؟ حیران ہوں۔

میں آخر میں آپ کو اس پاکیزہ رسالہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

خادم ادب

سید انتظام الدین شاہ اکبر آبادی (مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

زبان

جلد ۱ — فہرست مضامین ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء — نمبر ۳

زبان خلق

اکثر حضرات ملا صاحب کو صرف "ملا موزی" اور گلابی اُردو کے موجد کی حیثیت سے پہچانتے ہیں لیکن ہم جس حیثیت سے پہچانتے ہیں اس بنا پر اس بات کے کبھی قائل نہیں ہو سکتے کہ ملا صاحب سوائے اپنے مخصوص رنگ کے سنجیدہ اور متین عبارت نہیں لکھ سکتے ہم اگر چاہیں تو آج ہی اُن سے اعلیٰ سے اعلیٰ مضمون لکھوا سکتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ کسی اشاعت میں اُن کا علمی مضمون قارئین "زبان" کی خدمت میں پیش بھی کرینگے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ دنیا ان کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے جس رنگ میں کہ وہ دنیائے صحافت میں مشہور ہوئے ہیں۔ اس لئے "زبان" میں بھی اُن کا اصلی ہیت میں آنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اگرچہ زبان ایسے علمی رسالہ میں ملا صاحب کے مطائبات کچھ ناموزوں سے معلوم ہونگے لیکن بفوائے الملح فی الکلام الملیح فی الطعام ناظرین کی ضیافت طبع کی خاطر ہر ماہ "نکات" کے زیر عنوان پیش کیا کرینگے۔

آپ کے نکات میں صرف دلبستگی تفنن طبع اور غم غلط کرنے ہی کا سامان نہ ہوگا بلکہ اس میں بعض ایسے نکتوں کا حل بھی ہوگا جسکو ارباب بست وکشاد بھی حل نہیں کر سکتے۔

ملا صاحب "زبان" میں مستقل طور پر مضمون بھیجنے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنے کرم نامہ میں ارقام فرماتے ہیں:۔

> آئندہ سے زبان میں "نکات" کے عنوان سے مستقل مضمون لکھا کروں گا اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اس کے تحت ہر مہینے علم وادب اور تمدن ومعاشرت کے ایسے اچھوتے اور بصیرت فروز نکتے بتلائے جائیں گے جو شاذ کی حیثیت رکھتے ہیں البتہ فرق یہ ہوگا کہ اس کی عبارت میں اس امر کی خاص پابندی کی جائیگی کہ دن بھر کی تھکن یا قدرتی خشکی اور بلغم کی کمی سے آپ کے چہرہ پر قحط اور فاقہ کشی کے جو تمیں آثار پیدا ہو جاتے ہیں اُن میں "نکات" کے ظرافت انگیز فقروں سے ایک تازگی اور تنگفتگی پیدا ہو جائے گی...... فن انشا کا یہ اصول رہا ہے کہ ہر تحریر و تقریر میں اتنی ظرافت ضرور ہو جس سے باوقار یا خشک سے خشک مولوی صاحب

تک کے دانت باہر نکل آئیں کیونکہ جن لوگوں کو دن رات کے چار اوپر بیس گھنٹوں میں ایک مرتبہ بھی ہنسی یا تبسم تک پسند نہیں اور جو ہر دم غصے اور خموشی کے تام نوٹ بنے رہتے ہیں سنا ہے کہ ان کے جنازے میں فرشتے بھی خوشی سے شریک نہیں ہوتے۔

یقین ہے کہ ناظرین زبان بھی ہمیں ایسی "متین ظرافت" کے اندراج کی اجازت دینگے۔

ایڈیٹر

اگر بدظنی اور بدگمانی میاں مجنوں اور مساۃ لیلیٰ بی تک ہی محدود رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا کہ اس کے پیدا ہو جانے سے طالب و مطلوب میں ایک "غیر خونریز جنگ" یا ایک "لطیف جھپک" پیدا ہو جاتی ہے بلکہ شعرائے اردو تو محبوب کی اُس بدگمانی کو طالب کے لئے معراج کا درجہ عطا فرمایا ہے جو اسے اپنے طالب سے اس طرح بد ہو جائے کہ وہ سمجھے کہ "اب میرا طالب کسی دوسرے کا طالب ہے"، لیکن خدا بچائے اور بصیغہ فوری بچائے اس بدگمانی سے جو ایک ایڈیٹر اور ایک مضمون نگار کے درمیان پیدا ہو جائے کیونکہ اس کا نتیجہ اکثر یہی دیکھا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر مارے غصہ کے ڈنلپ ٹائر کی طرح پھول جاتے ہیں اور خط و کتابت تک بند!

ٹھیک ایسی ہی بدگمانی میرے اور ایڈیٹر صاحب رسالہ "زبان" کے درمیان واقع ہو گئی اور ممدوح گرامی کی دعوت پر جو میں نے مضمون نہ بھیجا اس کی وجہ کچھ تو میری ذاتی مصروفیت تھی اور کچھ میرا مرض "کھواس"۔ یہ "کھواس"، بر وزن بکواس صحیح ہے اور جن لوگوں میں یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے اُن کے لئے شاید یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ وہ کھاتے پیتے۔ چلتے پھرتے۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ سوتے جاگتے بلکہ اونگھتے ہوئے بھی فی الفور ایک عدد مضمون کر سکتے ہیں گویا وہ مضمون نگار کیا اچھے خاصے "نولکشور پریس لکھنو" ہوتے ہیں کہ ڈھیر اڈھیر مضامین کے انبار تیار کر سکتے ہیں۔

جون ۱۹۲۶ء کی پندرھویں کو حضرت محترم مولینا خوشتر کا گرامی نامہ ملا کہ مضمون بھیجو رسالہ "زبان" جاری ہوتا ہے میں نے ارادہ کیا کہ جب رسالہ کا پہلا نمبر دیکھونگا تو اُس کی تمام حالت اور پالیسی کے اندازہ پر اُس پر مستقل سلسلہ مضمون شروع کر دونگا اگر اُسیوقت یہ لکھدیتا کہ "پہلا نمبر دیکھکر" تو شاید خوشتر صاحب اسکو میری ٹال بجتے اور ایک ایڈیٹر کے لئے مضمون نگار کی ٹال کسی "بہار آرزو" کے وعدہ فردا سے کسی طرح کم تکلیف

وہ نہیں ہوتی اگرچہ مجھ میں یہ دونوں نزاکتیں نہیں۔

البتہ میں نے یہ کیا اور اب سمجھا کہ بہت بُرا کیا کہ بس حبّ خموشی معنی دارد" کا ڈپازٹ پارسل پیکٹ بن گیا خوشتر بھی اور کس قدر معقول بچے کہ تلا رموزی "باغی" ہوگیا اور دنیائے صحافت میں مضمون نگار باغیوں کی سزا یہی ہی کہ انہیں نظربند نہیں تو "رسالہ بند" ضرور کردیا جائے یعنی کہ ان کے نام رسالہ بند کردیا جائے لہذا میں اُسوقت جبکہ "رسالہ زبان" کا پہلا نمبر اپنے ناظرین کو بھیجا جارہا تھا میں منہ کھولے اُس کا انتظار کررہا تھا مگر وہ نہ آیا اور آہ کہ نہ آیا۔

---

۱۶ اگست ریاست کوروائی کے علم دوست اور معارف گستر تاجدار اعلیٰ حضرت ہز ہائنس نواب محمد سرور علیخاں بہادر بالقابہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو رسالہ زبان کا پہلا نمبر باصرہ نواز ہوا پس ہم نے یہ پرچہ موصوف کے پرائیوٹ سیکرٹری صاحب کے بکس سے اس شرافت کے ساتھ چرایا کہ اُنہیں آج تک خبر نہیں۔ اور پھر بڑی گھبراہٹ کے ساتھ اس کو از الف تا ی پڑھ لیا۔ پڑھ کیا لیا اچھا خاصہ چاٹ لیا ! ! !

رسالہ "زبان" کا پہلا نمبر دیکھکر جو چیز میرے لئے سب سے زیادہ حیرت انگیز تھی وہ حضرت خوشتر کا عزم راسخ، استقلال اور حوصلہ عمل کہ انہوں نے ایک ایسی سرزمین سے جو انہیں کے الفاظ میں "زمین شور" ہے زبان اردو کی خدمت کے لئے رسالہ "زبان" کو قوت سے فعل میں لانے کی کامیاب کوشش کی اور یہ خوشتر صاحب اور محض خوشتر صاحب کے ذوق کی پختگی تھی کہ وہ رسالہ "زبان" کے اجرا میں اسی "پرشور" زمین سے کامیاب ہوئے جس پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

دوسری چیز رسالہ زبان کا رفیع تر معیار یا اُس کے مضامین کی بلند پائیگی ہے خوشتر صاحب نے رسالہ زبان کی ترتیب میں علو خیال اور متانت و سنجیدگی کو ملحوظ رکھا ہے وہ اُن کے اعلیٰ علمی ذوق کا ثبوت ہے۔
تیسری قابل احترام چیز اس کے وہ اُردو دان اہل قلم اور سرپرست اصحاب ہیں خصوصًا ہمایوں جاہ نواب میشخ محمد جہانگیر میاں صاحب بہادر والی ریاست منگرول اور نواب زادہ شیخ عبدالخالق صاحب بہادر ولیعہد

ل کی رسالہ زبان کے ساتھ خسروانہ توجہات ہیں یہ تو صحیح نہیں کہ ہمارے موجودہ دیسی والیان ملک میں
زی اور علم پروری کا قطعی نقدان ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسے علم نواز والیان ملک خاص ہیں جنکی دولت
مت علم و زبان کی دلچسپیوں اور ترقی کے لئے وقف ہے۔

فاضل مدیر رسالہ "زبان" نے اپنے مقالہ افتتاحی میں علاقہ کاٹھیاواڑ میں تعلیم کی عموماً اور اُردو زبان کی
ماجس کمی اور پستی کے اعداد و شمار پیش کئے ہیں ان کے دیکھنے سے اس امر کا تو افسوس نہیں ہوتا کہ اس علاقہ میں
زبان پست ہے، البتہ افسوس تو کاٹھیاواڑ کے اُن ذمہ دار افراد پر ہے۔ جن کی ذہنی حالت اب اس درجہ
ہو چکی ہے کہ باوصف ذمہ داری کے اُن میں احساس نہیں اور اگر احساس ہے تو قوت عمل ماؤف ہو چکی ہو
ن کاٹھیاواڑ کے علمی جمود و بے خبری اور ان کی غفلت و بے فکری کی اس سے زیادہ روشن مثال اور کیا
ی ہے کہ اُن کے علاقہ کا ایک ایسا شخص ایک رسالہ جاری کرتا ہے جو بہ اعتبار اُس کی عظیم الشان مالی ذمہ داریوں
ں کا ہرگز مستحق نہ تھا۔

لیکن جن کاٹھیاواڑی بھائیوں کو آج دولت، فراغت اور احساس کے خزانے حاصل ہیں کیا انہیں
رائض یاد ہیں؟ اگر یاد نہیں تو وہ اُٹھیں اور اپنے صوبہ کے ہر حصہ میں رسالہ "زبان" کی اشاعت کے لئے
اور ایجنسیاں قائم کریں قصبوں اور قریوں اور شہروں میں مدارس و کلب" اور انجمن قائم کریں کیا کاٹھیاواڑی
ئل کو معلوم ہے کہ آج سے صرف ایک سال ہی پہلے صوبہ بہار میں اردو زبان کی یہی حالت تھی لیکن اسی ایک
کے قلیل وقفہ میں پٹنہ سے ایک اردو اخبار جاری ہوا بلکہ وہاں ایک عظیم الشان "اُردو کانفرنس" بھی منعقد ہو چکی
ں اُردو کی متعدد انجمنیں قائم ہو چکیں اور محض پٹنہ و بہار کے چند ذی حوصلہ افراد کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج انگریزی
ت کی انتظامی کونسل تک یہ سوال پہونچ گیا ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ صوبہ بہار کی تمام
ری کارروائی اُردو زبان میں ہو۔

زبان:۔ صوبہ بہار کی عام حالت بہ لحاظ زبان چاہے جو کچھ ہو لیکن مبصرین سے مخفی نہیں کہ پٹنہ میں عرصہ دراز سے اردو کا چرچا ہو رہا ہے
بلکہ اس نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں خدا بخش کا مشہور و معروف کتبخانہ جس سے ہزاروں اہل علم سیراب ہو رہے ہیں اسکا

کیا اچھا ہو اگر صوبہ کاٹھیا واڑ میں زبان اُردو کی ترقی کے لیے رسالے، اخبار، کلب۔ انجمن کانفرنس اور مذاکرات علمیہ کا انعقاد عمل میں آئے اور تحریر و تقریر کے ذریعہ ترقی تعلیم اور ترقی اُردو پر زور دیا جائے کیا آپ حضرت خوشتر کے ہاتھوں کو مضبوط بنائیں گے کہ وہ ان امور میں آپ کی رہنمائی کریں بس اگر آپ کے چند ذی حوصلہ افراد آج کھڑے ہو جائیں تو منگرول ہی میں صوبہ کاٹھیا واڑ کی ایک مرکزی انجمن اور مرکزی اردو کانفرنس کا انعقاد و اجلاس ہو سکتا ہے جو بے انتہا مفید اور ضروری ہے۔

ملا رموزی

"ظل السلطان"
شاہجہاں آباد بھوپال

۱۵ راگست سنہ ۲۶ء

جناب کرم۔ السلام علیکم

والانامہ موصول ہوا۔ آپ کا رسالہ بھی دیکھا مضامین کی حیثیت سے نہایت بہتر رسالہ ہے اور میں خوش ہوں کہ آپ ایک ایسی جگہ رہکر زبان اردو کی خدمت کر رہے ہیں جہاں قدم قدم پر آپ کے لئے مشکلات ہیں۔ خدائے کریم آپ کو کامیاب کرے۔

اس رسالے کے ذریعہ سے سب سے نمایاں کام جو آپ نے کیا وہ وہاں کے قابل انشا پردازوں اور فاضل لوگوں کو ادب و انشا کے میدان میں لے آنے کا کیا اور ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

مجھے بہت خوشی ہوئی کہ مولنا اختر جونا گڈھی کے افادات سے اب بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملتا رہے گا آپ نے ان کو حجرہ سے باہر نکال ہی لیا۔ خوب کیا۔ یہ کاٹھیاواڑ کے شبلی ہیں اور ادب و انشا کی روح رواں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ ان سے کام لیں گے اور ملک کو ان کے ترشحات خامہ سے مستفیض فرمائیں گے۔

.... میں کوشش کرونگا کہ آپ کے رسالہ کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں گو اب فرصت بھی نہیں ملتی اور لکھنے سے جی بھی اکتا گیا ہے۔ کہیں لکھتا بھی نہیں۔ مگر آپ نے رسالہ ایک ایسے مقام سے شائع کیا ہے جہاں ضرورت ہے کہ اس کی امداد کیجائے اور جو امکان میں ہو کیا جائے، میرے امکان میں بس یہی ہے کہ آپ کو لکھ کر کچھ نہ کچھ بھیجتا رہوں اور انشا اللہ یہی کرتا رہونگا۔

خادم
سید محمد یوسف قیصر

صفحۂ ادارت

یقیناً یہ خبر خواص و عوام میں مسرت سے سنی جائیگی کہ ہمارے سرود دین پناہ معدلت گستر و رعایا پرور
اب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بہادر دام اقبالہ والی ریاست منگرول جو نہایت متشرع اور نیچے فدائی
ن متین ہیں کچھ عرصہ اپنے ذاتی اخراجات میں سے پس انداز کر کے ساڑھے چار لاکھ روپیہ کی ایسی گراں قدر رقم غربا ر
تعلیمی اخراجات کے لئے وقف کر دی ہے۔ جس میں سے ایک لاکھ روپیہ تو محض تعلیم نسواں میں صرف کیا جائیگا
تی رقم اُن غربا کی دینی و دنیوی تعلیم میں صرف کی جائیگی جو تعلیمی مصارف برداشت کرنے کے اہل نہیں ہوسکے چنانچہ
نگرول میں دار الاقامت کی عمارت بھی طیار کرائی گئی ہے جسمیں فی الحال کم و بیش پچاس طلبہ تعلیم پاتے ہیں ان کی رہائش
و خورد و نوش کا انتظام بھی وہیں ہوتا ہے۔

کاٹھیاوار بلکہ عالم اسلام میں نواب صاحب موصوف کی ذات ستودہ صفات مغتنمات میں سے ہے جس پر
ہیں فخر ہے اور بجا فخر ہے آپ دیگر کارہائے خیر (مذہبی و قومی) میں بھی نمایاں حصہ لیتے ہیں۔

کیا یہ ایثار و قربانی ان روسا کے لئے قابل تقلید و سبق آموز نہیں جو محض اپنے ذاتی مشاغل کی بنا پر اور
حمایت شوق کی خاطر لاکھوں روپیہ برباد کر دیتے ہیں؟ کیا ان سے احکم الحاکمین روز محشر ان کی ان فضول
خرچیوں بے اعتنائیوں اور حق تلفیوں کی بازپرس نہ کریگا؟ کریگا اور ضرور کریگا۔

اس رقم اوقاف کے لئے ہم اتنی عرض ضرور کرینگے کہ اس میں سے نصف رقم لگا کر ایک عربی درسگاہ کی
بنیاد ڈالی جائے اور جس میں عام مسلمانوں کو مستفیض ہونے کا موقع دیا جائے۔

اس درسگاہ کا تعلیمی معیار ایسے جدید اصول پر رکھا جائے کہ جب اس مدرسہ کا تعلیم یافتہ فارغ التحصیل
ہو کر نکلے تو وہ ایک روشن خیال جید عالم و فاضل بھی ہو اور علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کا ماہر انگریزی دان
و سائنس داں بھی ہو۔

اگر اس عرضداشت پر توجہ مبذول فرمائی جائے تو یہ اہم کام نہایت آسانی کے ساتھ طے ہو سکتا ہے۔

اس ماہ میں "علم اور اسلام" والا طویل مضمون ختم ہوتا ہے ہم خود اس قسم کے طول طویل مضامین بالاقساط درج کرنے سے پریشان ہوتے ہیں اور ناظرین بھی انتظار کی شدت سے تنگ آجاتے ہیں لیکن ایک ہی وقت میں اس ضروری اور گراں قدر مضمون کا شائع ہونا محال تھا اس لئے اسکو تین نمبروں میں شائع کرنا پڑا آیندہ کوشش کی جائے گی کہ ہر مضمون ایک ہی اشاعت میں ختم ہو جائے، اگرچہ اس نمبر میں بھی "ہندوستان اور انکی زبانیں،، والا مضمون بسبب طویل ہونے کے ادھورا درج کیا جاتا ہے لیکن دقت یہ تھی کہ اگر ہم اسکو اسی نمبر میں پورا شائع کر دیتے تو قارئین کرام کو علم اور اسلام والے مضمون کی تکمیل کے لئے ایک ماہ اور انتظار کرنا پڑتا۔

باوجود تصحیح اور پروف دیکھنے کے انتظام کے پچھلے نمبر میں بھی کتابت کی بعض اہم غلطیاں رہ گئی ہیں جس کے لیے ہم بیحد شرمندہ ہیں۔ اگر ہم آگرہ سے پروف منگائیں اور خود تصحیح کرکے بھیجیں تو دس بارہ روز کا عرصہ لگ جاتا ہے اول تو رسالہ وقت پر شائع نہیں ہوتا اس پر اگر ہم یہاں پروف منگائیں تو مزید تاخیر کا خوف ہے اس لئے آیندہ سے جدید انتظام کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ اب رسالہ بھی وقت پر قدر دانوں کی خدمت میں حاضر ہوا کرے گا۔

ہمارے پاس بہت سے ایسے مضمون (نظم و نثر) بغرض اندراج رسالہ آئے ہیں جو زبان کے معیار سے گرے ہوئے ہیں اگر ہم خوشنودی یا حوصلہ افزائی کو مد نظر رکھکر درج کرتے ہیں تو ہمارا رسالہ بھی بعض دیگر رسائل کی طرح عامیانہ اور مبتذل مضامین کا تختہ مشق بن جاتا ہے اور ثقات واہل علم کی نظروں سے گر جاتا ہے لہذا ایسے مضمون نگار حضرات کی خدمت میں بصد ادب التماس ہے کہ وہ اپنے خیالات کو وسیع اور اپنے مضامین کو اعلیٰ معیار علم و ادب پر لانے کی سعی فرمائیں۔ ساتھ ہی رسالہ کے معیار کو نظر انداز نہ فرمائیں۔

آہ مرحوم نظام الحق (عباسی)

کیا خبر تھی کہ ہم اگست نمبر میں جن کی وساطت سے پروفیسر سید نواب علی صاحب کی غیر مطبوعہ نظم (مناظرہ نظم و نثر) شایع کر رہے وہ اپنے عطیہ کو مطبوعہ کی صورت میں نہ دیکھ سکیں گے اور ہمیں دائمی مفارقت کا داغ دے جائیں گے مرحوم نے ۲۵ سال کی عمر میں ۱۵ ستمبر ۱۹۲۶

منگرول میں انتقال فرمایا۔

مرحوم کا وطن احمد آباد تھا لیکن سترہ اٹھارہ سال سے منگرول ہی میں ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے اور اس عرصہ میں برابر ملک وقوم کی خدمات انجام دیتے رہتے تھے۔

منگرول اور اہل منگرول سے ایسی انسیت ہوگئی تھی جیسی وطن اور یاران وطن سے ہوتی ہے منگرول والوں کی بہبودی و بہتری کے دل سے خواہاں رہتے تھے۔

مرحوم علاوہ منکسر المزاج اور نیک طبع ہونے کے سچے بہی خواہ و ہمدرد ملک وقوم بھی تھے۔ انجمن خدام کعبہ خلافت۔ اور ارتداد کے سکریٹری بھی تھے اور ایسے قومی کاموں میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے اور ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ اہل منگرول میں قومی اسپرٹ آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے جس کے لئے ہم ان کے ہمیشہ ممنون رہینگے

مرحوم کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی اردو اور گجراتی کے اچھے مضمون نگار تھے سیکڑوں کی تعداد میں آپ کے مضامین اخبارات میں چھپ چکے ہیں طبیعت کا شعر گوئی کی طرف بھی میلان تھا عبرت تخلص کرتے تھے اور شعر خوب کہتے تھے ہم انشاءاللہ کسی آئندہ اشاعت میں مرحوم کے کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین کریں گے

انجمن اسلام منگرول، مرحوم کی زندہ یادگار موجود ہے جس کی بنیاد مرحوم نے عرصہ ہوا غربا اور طلبہ کی خدمات انجام دینے کی غرض سے ڈالی تھی امید کہ کارپردازان انجمن اس یادگار کو قائم اور حوادث سے محفوظ رکھنے کی سعی کریں گے۔

لیکن افسوس کہ مرحوم کے بعد اب ہمیں منگرول میں کوئی ایسا لیڈر نظر نہیں آتا جو مرحوم کا نعم البدل ہو سکے گرچہ ایسے حضرات بہت ہیں جنکے دلوں میں مذہبی جوش اور قومی اسپرٹ موجود ہے، لیکن جب تک میدان عمل میں کر لوگوں کو اپنا ہم خیال وہمنوا نہ بنا سکیں اور ان کے دلوں میں قومی ہمدردی کا جذبہ نہ پیدا کر سکیں یہ اسپرٹ کس کام کی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء

مقالات

علم اور اسلام

(بسلسلۂ ماسبق)

(از جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اصلاحی)

گیارہویں صدی عیسوی میں قسطنطین افریقی پیدا ہوا جس نے مسلمانوں میں رہ کر تعلیم حاصل کی، اور اپنے زمانہ کا زبردست فاضل ہوا جربرٹ (Gerbert) کے متعلق تو بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ اس کی سیاحت بلاد اسلامیہ کے بارہ میں بہت کچھ شک و شبہہ کا اظہار کیا جاتا ہے ۱۱۳۰ء اور ۱۱۵۰ء کے درمیان قابل اور ماہر فن مترجمین کی ایک جماعت مطران ریمنڈ (Raymond Lull) کی سرکردگی میں طلیطلہ بھیجی گئی تاکہ وہ علوم عربیہ کا لاطینی میں ترجمہ کرلائیں اور تیرھویں صدی کے اوائل میں ارسطو کی تصنیفات عربی سے ترجمہ کرکے پیرس یونیورسٹی (l' université de Paris) میں داخل کردی گئیں اور اس طرح یورپ اس قعر جہالت سے نکلا جس میں وہ چار پانچ صدیوں پھنسا ہوا تھا چنانچہ اس تاریخ تک تو ہم مسلمانوں کے شاگرد تھے، پھر تیرھویں صدی کے وسط میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم ان کے ہم پلہ ہوگئے حتیٰ کہ ۱۲۷۵ء میں قریب قریب مسلمانوں کا یہ افسوسناک انحطاط و تنزل شروع ہوگیا جبکہ یورپ اپنی پوری جد و جہد اور مستعدی کے ساتھ علوم و فنون کے اکتساب اور ان کی ترویج اور اکتساب میں مصروف تھا۔ اور علمی مباحث میں ناقابل قیاس عظیم الشان اور حیرت انگیز

بیاں کرنے لگا۔

افسوس! اور صد افسوس! ان علوم و فنون پر جن میں ترقی اور پیش قدمی کی قابلیت اور استعداد نہ ہو، اور زمانۂ
ال میں اس کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہی وہ علوم عربیہ ہیں جو لاطینی یورپ میں تھوڑی سی زندگی بسر کرنے
کے بعد معدوم ہو گئے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ ابن رشد جو ہمارے ہاں (یورپ میں)
سطو کی طرح مشہور ہے اپنے مسلمان بھائیوں کے ہاں وہ بالکل غیر معروف اور نسیاً منسیاً ہے

۱۲۰۰ء سے لے کر آج تک کوئی عرب فلسفی پیدا نہیں ہوا اس لئے کہ فلسفہ، اگرچہ بالکل متروک و مطرود
ہیں ہوا لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ہاں محض مذہب اسلام کی وجہ سے معتوب اور مقہور رہا
ی وجہ ہے کہ اوائل ۱۲۰۰ء سے جبکہ علمائے اسلام کا پورا پورا غلبہ اور تسلط تھا ہم دیکھتے ہیں کہ بلاد اسلامیہ میں فلسفہ کا
لکل فقدان ہے یہاں تک کہ مورخین اور مصنفین اپنی کتابوں میں صرف بسبیل تذکرہ اس پر بحث کرتے ہوئے گزر
اتے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ فلسفہ کی کتابیں نادر الوجود اور معدوم ہوتی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے ہاں علم الفلک
تعریف صرف اس قدر جائز ہے جو نماز کے وقت سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے ضروری اور لابدی ہو۔

پھر اس کے بعد ترک آئے جن کو مسلمانوں پر غلبہ اور تسلط حاصل ہوا۔ انہوں نے بھی علوم اور فلسفہ کو مٹانے
ں پوری جد و جہد سے کام لیا۔ اور اسی زمانہ سے مسلمانوں میں علوم اور فلسفہ کا پورا پورا انحطاط اور فقدان ہوا۔ چنانچہ
ں وقت سے ممالک اسلامیہ میں مشکل سے کوئی صاحب فکر و رائے اور سمجھدار عالم ملے گا الا ماشاء اللہ مثلاً ابن خلدون
لاصہ یہ کہ اسلام نے علم اور فلسفہ کا پورا قلع قمع اور استیصال کر دیا۔

جو کچھ اب تک میں نے کہا حاشا و کلا اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں علوم عربیہ کی شان رفعت اور علو مرتبت
ں توہین اور تحقیر کروں۔ یوں تو علوم عربیہ کو انسانی علوم و معارف کی تاریخ میں ایک خاص اور اہم درجہ حاصل ہے۔
یرا منشاء صرف اس قدر ہے کہ بعض علوم مثلاً علم الفلک کو عربوں کی طرف منسوب کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے
ہ تو ایک کھلی ہوئی بے انصافی ہو گی اگر میں عربوں کی بالکل قدر نہ کروں اس لئے کہ ساتویں صدی بارہویں اور تیرھویں
مدی کے مابین کے حالات و واقعات پر نظر کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زمانہ "عربی زمانہ" تھا اور اس زمانہ میں
سلام جہاں کہیں گیا اس نے عقل انسانی کی ہمیشہ تربیت کی لیکن یہ علوم جن کو عام طور پر لوگ علوم عربیہ کہنے کے عادی
و گئے ہیں، کیا درحقیقت یہ عربی علوم ہیں یا نہیں، ہرگز نہیں! صرف زبان کے علاوہ عربوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے
ت یہ ہے کہ اسلامی فتوحات نے عربی زبان کو حجاز سے لے کر دور و دراز ممالک تک پھیلا دیا ہے۔ اس سے لوگوں کو

پیدا ہوگا ہو گیا کہ عربی زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تمامتر عربوں کے ذوق علمی اور رفعتِ تخیل کا نتیجہ ہے۔ جیسا اس سے قبل لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو چکی ہے کہ لاطینی زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب لاطینیوں کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ ہے۔
جس طرح البرٹس اعظم (albert = le-grand)، راجر بیکن[۵۱]، اور فرانسس بیکن[۵۲]، لاطینی نہیں ہیں باوجودیکہ انہوں نے لاطینی زبان میں کتابیں لکھی ہیں۔ اسی طرح ابن رشد ابن سینا اور البتانی بھی عرب نہیں ہیں۔
پس عربی علوم اور فلسفہ کو جزیرۃ العرب کی طرف منسوب کرنا ایسا ہی غلط ہے جیسا کہ مسیحی ادبیات کو زمانۂ انتعاش ہور (Renaissance) اور مسیحی علم الکلام (Scholastique) کو سولھویں صدی کے تمام اور سترھویں صدی کے بعض علوم و فنون کو شہر رومہ کی طرف اس وجہ سے منسوب کرنا کہ وہ لاطینی زبان میں ہیں۔
اگر ہم تحقیق سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُن تمام علماء اور فلاسفہ میں سے جن کے متعلق عرب ہونے کا دعوی کیا جاتا ہے، کوئی بھی سوائے الکندی[۵۳] کے کوئی بھی عربی النسل نہیں ہے نہ تو وہ نسب اور خاندان کے لحاظ سے عرب ہیں اور نہ خیالات و افکار کے اعتبار سے بلکہ یا تو وہ عجمی ہیں یا ماوراء النہری، اندلسی ہیں۔ یا بخاری، سمرقندی ہیں یا اشبیلی اور قرطبی! ان لوگوں نے اپنی کتابوں میں عربی زبان کو استعمال کیا حالانکہ عربی زبان ان کے خیالات اور مافی الضمیر کو ادا کرنے سے عاجز اور قاصر ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں کے علماء نے قرون متوسطہ میں لاطینی زبان کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا۔ اور اس کی تنگی و کم مائگی کی وجہ سے اس میں ردوبدل کیا۔ عربی زبان شعر اور فصاحت کی صلاحیت تو رکھتی ہے لیکن اس میں فلسفانہ (مابعد الطبیعیات) خیالات ادا کرنے کی استعداد اور قابلیت نہیں[۵۴] ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں عرب علماء اور فلاسفر کی فلسفیانہ تصانیف میں انشاپردازی کا رنگ کچھ اعلیٰ نظر نہیں آتا۔

۵۱ ارالجین بیکن (۱۲۱۴ء - ۱۲۹۴ء) یورپ کے مشاہیر علماء میں سے تھا۔ اس نے تمامتر عربوں سے تحصیل علوم کی تھی۔ فلسفہ، نجوم اور کیمیا میں اس کی تصانیف ہیں جو علماء اسلام کی خوشہ چینی کی رہین منت ہیں (مترجم)
۵۲ مشہور انگریزی عالم لارڈ بیکن ۱۵۶۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۲۶ء میں مرگیا۔ اس کی تصانیف انگریزی درسیات میں داخل اور عام طور پر متداول ہیں۔
۵۳ ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی مشہور عرب "فیلسوف" خلیفہ مامون کے زمانہ میں تھا۔ علوم طبیعہ اور فلسفہ میں اس کی چند تصنیفات ہیں۔
۵۴ یہ رینان اور اس کے ہم خیال مستشرقین کی کوتاہ بینی اور عربی زبان سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے مستشرقین کا دقیقہ (بقیہ صفحہ آئندہ)

گذشتہ تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جن علوم کو عربی کہا جاتا ہے وہ اصل میں عربی علوم ہی نہیں ہیں تو پھر سلامی کیا ہونگے؟ اور کہ اسلام نے حقائق اشیا سے بحث کی اجازت بھی دی ہے یا نہیں؟ کیونکہ جن لوگوں نے علوم و ارف کی اشاعت کی اور ان کو ترقی دی وہ مجوس، نصاریٰ، یہود، حرّانی، اسمٰعیلی اور منافق مسلمان تھے لیکن خالص سلمان اور مومن تو ان کو ہمیشہ بُرا بھلا کہتے رہے یہاں تک کہ علما نے مامون کی تکفیر کا صرف اسلئے فتویٰ دیا کہ اس نے سفۂ یونان کی تعلیم کی اجازت دی تھی۔ اور خود اس کے عہدِ حکومت میں جو مصیبتیں آئیں ان کو علما سے مامون کی غیر ہب کے ساتھ رواداری اور سہل انگاری سے منسوب کر دیا۔

کئی خلفا، نے اپنی رعایا کے خوف سے مجبور ہوکر، جن کے محرک بھی علما تھے فلسفہ اور فلکیات کی بکثرت کتابیں عام میں جلادیں۔ جو شخص اس زمانہ میں ان علوم کو حاصل کرتا تھا اسے زندیق اور کافر کہا جاتا تھا۔ اسکو سزا دی جاتی اسکا ان جلا دیا جاتا اور لبسا اوقات حکومت عوام کے اشتعال جذبات کو فرو کرنے کے لئے اُسے قتل کر دینے پر مجبور ہو جاتی۔ س سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذہب اسلام نے علوم وفنون کو ہمیشہ بُرا سمجھا ہے اور ان کے شائقین کو سزائیں دی ہیں۔ کہ ان کا نام ونشان تک مٹا دیا ہے اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کے دو دوروں میں امتیاز یا جائے:۔

(۱) بدورِ اسلام سے لے کر بارھویں صدی عیسوی کے آخر تک،

(۲) تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر اس وقت تک،

اسلام کے دور اول میں معتزلہ وغیرہ مختلف المذاہب جماعتوں کے باعث مذہبی تعصب اور ائمہ کے احکام پیروی کا جوش بہ نسبت دوسرے دور کے بہت کم تھا۔ اس لئے کہ اس دورِ ثانی میں اسلام پر تاتاری، بربری اور ی قومیں حکمراں تھیں، جن میں ذرا بھی عقل کا مادہ نہ تھا۔

یہ بات مشاہدہ کی جاسکتی ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مسلمانوں کا ایمان اور ان کا تعصب مذہبی سخت اور

یہ نوٹ صفحہ ۱۲: ایک گروہ اسکے بالکل خلاف رائے رکھتا ہے جس میں عربی زبان کے ماہرین اور علم اللسان کے جید عالم شریک ہیں۔ علم وفلسفہ کے لئے عربی زبان کی صلاحیت کا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ یورپ علمی اور فلسفی اصطلاحات کے لئے ی زبان کا ممنون احسان ہے۔ عربی زبان میں چار لاکھ سے زائد ایسے مادّے ہیں جو قابل تحویل اشتقاق ہیں برخلاف اس کے زی زبان کے پاس ۴۰ ہزار الفاظ اور فرانسیسی کے پاس پچاس ہزار الفاظ سے زائد نہیں ہیں جیسا کہ محققین لغات کا ل ہے۔

ضبط ہوتا گیا اس لئے کہ بالکل ابتدا میں جو عرب مسلمان ہوئے تھے ان کی تصدیق رسالت و نبوت بہت ہی کمزور تھی جب
اسلام کی ابتدائی دو صدیوں اور تیسری صدی میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد خالص مذہبی عقائد کی پابند
تمام دینی اور دنیوی امور میں عام ہوگئی۔ اور لوگوں کو اس پر عمل کرنیکے لئے مجبور کیا جانے لگا۔ اور عدم پابندی کی
میں دردناک اور قابل نفرت سزائیں دی جانے لگیں کہ اس کی نظیر سوائے مجلس المفتش [illegible]
کے اور کہیں نہیں مل سکتی جس کا کام یہ تھا کہ جو شخص عیسائیت کے خلاف کوئی عقیدہ رکھتا اُسے قتل کر دیا جاتا یا جا
تھا۔ اس قسم کے واقعات اسپین، اٹلی اور فرانس وغیرہ میں بکثرت رونما ہوئے۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ مذ
عقائد کی پابندی کے لئے جبر کرنا تمدنی آزادی کے لئے پیغام موت ہے۔ اور ہمارے زمانے میں یہ سوائے مما
اسلامیہ اور یورپ کے ماتحت ملکوں کے ہمیں کہیں نظر نہیں آتا جس کو دینی اور دنیوی امور میں ایک ساتھ اقتدا
ہے۔ لیکن یورپ کے ماتحت ملکوں کا حصہ بہت کم ہے۔ بخلاف مذہب اسلام کہ وہ دنیا کے ایک بڑے حصہ
حکمران ہے جو ہر قسم کی ترقی سے محروم ہے کیونکہ وہ آسمانی وحی اور عقائد پر مبنی ہے جیسا کہ تمام مسلمان بزعم خ
سمجھے ہوئے ہیں۔

فلاسفۂ یورپ اور شیدایان حریت جو مذہب اسلام کی مدافعت کرتے ہیں، فی الحقیقت وہ اسلام سے واق
نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں مذہب اسلام عبارت ہے ایک ایسے مذہب سے جو دینی اور دنیوی امور کا
اتم جامع ہے حالانکہ وہ صرف ایسے اصول و عقائد پر مبنی ہے جن پر بحث کرنے کی وہ اپنے پیروں کو مطلق اجازت
دیتا۔ مذہب اسلام عقائد کی ایک ایسی بوجھل زنجیر ہے جو نوع انسان کی قوت برداشت سے باہر ہے ہمیں تسلیم ہے
اوائل قرون متوسطہ میں (یعنی ابتدائے اسلام میں) مذہب اسلام نے فلسفہ کی مساعدت اور موافقت کی لیکن
جو کچھ تھا مجبوراً تھا۔ کیونکہ اہل اسلام کی آپس کی نا اتفاقی اور فلسفہ کے مزاحم اسباب کی عدم موجودگی کے سبب فا
کی روک کو بالکل روک دینا اسلام کی طاقت سے باہر تھا۔ اس لئے کہ تمام محکمہ جات نظم و نسق عیسائیوں کے قبضہ
تھے .... لیکن جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور ان کا مذہبی تعصب سخت ہو گیا تو علم و فلسفہ کو زوال اور
خوف و نفاق کا دور دورہ ہوا۔ پس اسلام جب تک ضعیف تھا حریت و عدل کا حامل تھا۔ لیکن جونہی وہ قوی ا
ہوا تو سراسر ظلم ہی ظلم تھا۔ ایسی حالت میں اس کو کوئی فضیلت نہیں دی جاسکتی کہ اس نے عدم استطاعت کی
میں علم و فلسفہ کی اجازت دی اسکی یہ فضیلت بعینہ ایسی ہے جیسے کہ ہمارے مذہبی پادریوں کو موجودہ علوم و فنو
فضیلت دیدی جائے حالانکہ یہ ترقی بالکل ان کے علی الرغم ہوئی ہے۔ کیونکہ مسیحی عقائد اسلام سے بھی زیادہ علو

فنون کے دشمن ہیں۔ لیکن اُن سے علم وفلسفہ کو اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا اسلام سے ممالک اسلامیہ میں۔ یورپ میں اور میں بھی ان مسیحی عقائد کو علم کے خلاف غلبہ حاصل نہیں ہوا سوائے اسپین کے کہ وہاں ایک ظالمانہ اور جاہلانہ طریقہ رائج تھا جس کی وجہ سے علوم تباہ وبرباد ہوئے۔ لیکن یہ شریف ممالک مسیحیت سے ضرور انتقام لیں گے اور ان میں علم کو کامیابی نصیب ہوگی اگر تمام مجلسِ تفتیش" لوگوں کے عقائد مذہبی کے لئے ہوتیں اور فلیپ ثانی اور پاپائے پی خامس کی کوششیں علم کے خلاف بارآور ہوتیں تو اسلام میں بھی وہ تمام باتیں پیدا ہو جاتیں جن کے پیدا ہونے کا امکان یورپ میں تھا۔

اگر کوئی شخص کسی امر میں نقصان پہونچانیکا قصد کرے اور اس میں ناکام رہے تو اس کی فضیلت یا تعریف نہیں تسلیم کی جاسکتی۔ دنیا میں جتنے مذاہب گذرے ہیں ان میں حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے کچھ مفید باتیں ضرور ہوتیں ہیں جو اس زمانہ میں حالتِ دنیا کی اصلاح کرتی ہیں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ جو باتیں مذہب کی مساعدت کے بغیر بلکہ اس کے اعلی الرغم پیدا ہو گئیں اس کے لئے بھی مذہب ہی کو مستحق فضیلت تسلیم کیا جائے۔ جبکہ قاتل مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا، اور نہ یہ مناسب ہے کہ ظالم کو مظلوم سے نفع اُٹھانے دیا جائے۔ باانیہمہ ہر وہ شخص جس کو اسلام سے تعلق ہو گیا ہو ان تمام ترقیوں کے لئے جو اسلام کے علی الرغم معرض وجود میں آئیں اسلام ہی کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہیں۔

ابن سینا، ابن زہر، اور ابن رشد کو اسلام سے وہی نسبت ہے جو گلیلیو[۱] (Galileo) کو رومن کیتھولک سے بیان کی جاتی ہے حالانکہ مسیحیت نے اس کے انکشافاتِ علمیہ میں کوئی مدد نہیں کی بلکہ الٹا اس کو نقصان پہونچایا ہے۔ اور میرے دل میں ایسے مذاہب کے خلاف کوئی معمولی اعتراض بھی پیدا نہیں ہوتا جنہوں نے بنی آدم کو ان مشکل مسائل پر بحث کرنے سے نجات دلادی اور جن پر خود آدم (علیہ السلام) نے اپنے مشاہدہ عالم اور اس کے مآل کار پر نظر کرتے وقت غور وفکر کیا تھا۔ مذہبِ اسلام کے احکام فی نفسہ بہت بلند رتبہ اور قابلِ احترام ہیں اور اپنی زندگی میں جب کبھی میں مسلمانوں کی مسجدوں میں داخل ہوا ہوں تو میں نے اپنے قلب کے اندر ایک کشش اور تاثیر محسوس کی ہے، بلکہ مجھے اپنے مسلمان نہ ہونے پر افسوس ہوا ہے۔ مگر بات صرف اتنی ہے کہ اس (اسلام) نے عقل انسانی کو بہت پیچھے کر دیا ہے اور اپنے حیرت انگیز اثر ونفوذ سے کام لے کر، جو دیگر مذاہب کو نصیب نہیں ہے اس نے عقل انسانی کو حقایق اشیاء میں غور وفکر کرنے سے بالکل روک دیا، یہاں تک کہ بعض ممالک کو جہاں اسلام

۱؎ فلکیات کا مشہور مسیحی عالم جو ۱۵۶۴ء میں اٹلی میں پیدا ہوا اور ۱۶۴۲ء میں انتقال کر گیا۔ زمین کے گھومنے کا نظریہ اسی نے ایجاد کیا تھا۔

پہیلا علمی نقطۂ نظر سے بالکل صفا چٹ میدان بنا کر رکھ دیا جہاں حقائق اشیاء سے بحث کرنا[1] جس سے عقل انسان وسیع ہوتی ہے، خواب و خیال سے بہت دور ہے۔ اس پر اتنا اور اضافہ کر لو کہ ان ممالک کے لوگوں کی عقلیں خود ہی قاصر ہوتی ہیں اس پر طرّہ یہ کہ وہ ہوتے ہیں مسلمان جن کی امتیازی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ علوم و فنون سے بغض رکھیں اس کو برا سمجھیں اور یہ اعتقاد رکھیں کہ بحث کرنا کفر ہے، اس سے عقل کم ہو جاتی ہے اور کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ کائنات عالم کا علم سیکھنا گویا خدا سے معارضہ کرنا ہے، اور علم تاریخ سے اگلے وقتوں کی گمراہیاں عود کر آتی ہیں کیونکہ وہ تمام تر ازمنۂ قبل از اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس سلسلہ میں مثال کے طور پر شیخ رفاعہ کا نام لیا جا سکتا ہے جو پیرس میں مدرسہ مصریہ کے مدتوں امام رہ چکے ہیں۔ پیرس سے واپسی پر شیخ صاحب موصوف نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں فرانسیسی قوم کے عجیب و غریب خیالات بیان کئے ہیں اس میں وہ بڑے شد و مد سے لکھتے ہیں کہ یورپ کے تمام علوم کفر ہیں خصوصاً ان کا عقیدہ "قدمِ عالَم" کے بارہ میں ہمیں شیخ صاحب کا یہ قول دیکھ کر مطلق تعجب نہیں ہوا کہ یہ اسلام کے مطابق ہے، اور اسلام جو نام ہے ایسے عقائد دینیہ الہامی کے مجموعہ کا جو حریتِ خیال اور حقائق اشیاء پر آزادی سے بحث کرنے کے کلیۃً منافی اور بسا اوقات مخالف ہیں۔

علوم کی غرض دین و مذہب کی نفی نہیں ہے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ حوادثِ کائنات کو قدرتِ الٰہی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ تجربات مافوق العقل اعتقاد رکھنے کے منافی ہیں۔ اور عقائد اسلام کی تو بنیاد ہی ایسے اعتقاد پر ہے۔ پس ایسی حالت میں اسلام کا علوم کے ساتھ بغض رکھنا اس کے اصول کے عین مطابق ہے، لیکن اس مطابقت نے خود اسلام کو بھی بہت سے نقصانات پہونچا لئے ہیں اور علوم کو تباہ کر کے تو اسلام نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے اور وہ آخر انتہائی قعرِ تنزل میں جا پڑا ہے،

جب انسان یہ اعتقاد رکھے گا کہ حقائق اشیاء پر بحث کرنا احکام خداوندی کے خلاف ہے تو اس کی عقل کند ہو جائے گی اور اس پر اوہام و شکوک کا غلبہ ہو گا چنانچہ ہم مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آخر بحث و مباحثہ میں کہہ دیتے ہیں "واللہ اعلم"[2]

[1] منطقی اصول پر حقائق اشیاء سے بحث کرنا اسلام کا اصل اصول ہے۔ قرآن مجید میں ہے: قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ اور اہل عرب نے قرآن مجید کی بدولت فلسفی بن گئے کہ اسلام کا ایک خاص اپنا فلسفہ ہے جس کے مبادیات سے اہل عرب یونانی فلسفہ اور اس کے متراجم سے روشناس ہونے کے پہلے ہی واقف ہو چکے تھے حتیٰ کہ علم منطق کے بعض اصول بھی انہوں نے وضع کئے تھے۔ ملاحظہ ہو ہماری کتاب "الاسلام ازاء العلم والفلسفۃ" باب مهد الفلسفۃ فی الاسلام۔ (مترجم)

[2] "واللہ اعلم" کہنے سے فلاسفہ کے طریقہ پر نفی بحث بطور شک و شبہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح کا کلمہ تواضع ہے جو بقولہ تعالیٰ (بقیہ نوٹ برصفحہ)

ں کی شہادت میں موسیو لیارڈ کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ جب موسیو موصوف موصل پہونچے تو انہوں نے موصل
کی آبادی، اس کی تجارت اور اس کے تاریخی حالات کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ ان امور کے متعلق
انہی شہر سے استفسار کیا تو اُن قاضی صاحب نے بذریعہ ترجمان حسب ذیل جواب دیا:۔
"میرے معزز اور پیارے دوست! آپ نے جن امور کے متعلق مجھ سے سوال کیا ہے وہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر
ہیں، باوجودیکہ میری پوری زندگی اسی شہر میں گذری ہے لیکن مجھے کبھی خیال بھی نہیں پیدا ہوا کہ یہاں کے مکانات اور
رہنے والوں کا شمار کروں، اور مال تجارت جس کو بعض لوگ اپنے خچروں پر لاد کر لاتے ہیں اور بعض اپنی گردنوں پر تو ان کا
کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا، اب رہے یہاں کے تاریخی حالات سو اس کا علم تو سوائے خدائے علیم و قدیر کے کسی کو بھی نہیں ہے
وہی بہتر جانتا ہے کہ اسلام کے پہلے یہاں کے گمراہ باشندوں کی تعداد کیا تھی اور اس کا جاننا ہمارے لئے بجائے
مفید ہونے کے مضر ہے۔

"محب من! آپ کو ان چیزوں سے بحث نہیں کرنی چاہیئے جو آپ کے لئے کچھ بھی مفید نہیں ہیں۔ آپ میرے
ہاں آئے ہیں اور اس سے ہم خوش ہوئے ہیں تو مناسب ہے کہ آپ اسی طرح خوش و خرم واپس بھی جائیں۔ کیونکہ جو کچھ
بھی آپ نے کہیں ان میں میرا کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ کہنے والا اور ہے اور سننے والا اور۔ آپ نے جیسا کہ
آپ کے ہم وطنوں کی عادت ہے، مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کی ہے یہاں تک کہ یہی سفر آپ کے لئے زاد راہ
بن گیا ہے، یعنے سفر کرنا آپ کے لئے بہت آسان ہو گیا ہے، لیکن ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم بحمد اللہ اسی جگہ پیدا
ہوئے اور یہاں سے دوسری جگہ جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ عزیز من! سنو کہ ایمان باللہ سے بڑھکر کوئی چیز نہیں ہے
ہماری دنیا کا پیدا کرنے والا ہے۔ تو کیا ہمارے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ اسکی مخلوقات اور کائنات سے بحث
کریں اور اس طرح اس کی برابری کرنے لگیں۔ دیکھو یہ ستارہ ہے جو اُس کے اور اس دُمدار ستارہ کے گرد گھومتا
ہے جس سے برسوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ پس اس کو پیدا کرنے والے ہی کے لئے چھوڑ دو کہ وہی اس کا متکفل ہے۔
اب اگر آپ مجھ سے کہیں کہ اے شخص میرے پاس سے ہٹ جا کیونکہ میں تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہوں، اور آپ
ان چیزوں کو دیکھیں جس کو حقیقت میں آپ نہیں دیکھتے اور اس کی وجہ سے آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ مجھ سے افضل
ہیں تو اے دوست یہ آپ ہی کو مبارک ہو، میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھ کو ان چیزوں کی بحث سے جن سے

(بقرہ منورہ ۱۶) وَمَا اُوْتِيتُم مِن العِلْمِ اِلَّا قَلِيلاً، استعمال کیا جاتا ہے علاوہ ازیں بہت کم تعداد ایسے متاخرین کی ہے جنہوں نے
اپنی کتابوں میں اس کو استعمال کیا ہے، ورنہ عربی کی علمی اور فلسفی تصانیف اس سے بالکل خالی ہیں۔ (مترجم)

میرا کچھ فائدہ نہیں ہے، نجات دیدی ہے۔ تم نے اُن چیزوں کو سیکھا ہے جو میرے نزدیک کچھ بھی اہم نہیں ہیں، اور اُن چیزوں کو دیکھا ہے، جو میرے نزدیک حقیر ہیں پس کیا کثرتِ علم سے تمھارے لئے زادِ راہ (سامانِ آخرت) مہیا ہو سکتا ہے؟ یا وسیع النظر ہونے سے تمھیں جنت کا راستہ مل سکتا ہے؟ پس اے دوست! اگر تم سعادت چاہتے ہو تو کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ، کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ اور اس طرح لوگوں کو خوف دل سے نکال دو، اور موت سے ڈرتے رہو جو تمھارے لئے مقرر ہو چکی ہے''۔

یہ قاضی صاحب اپنے طریق پر ایک بہت بڑے فلسفی ہیں لیکن ہم میں اور اُن میں فرق یہ ہے کہ ہم ان کے تمام جوابات کو محض ظرافت ہی سمجھتے ہیں اور اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ اس وقت ہم ان کے متعلق کیا کہہ رہے ہیں تو وہ بہت چراغ پا ہوں! ایسی ہی عقل کے لوگ اس قوم کو تباہ کر دیتے ہیں جس کی عقلیں بہت کچھ ترقی کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے خیالات سے جو علم اور عقلیت سے بالکل عاری ہی ہوتے ہیں دو باتیں پیدا ہوتی ہیں ایک تو نہایت ذلیل خرافات واوہام اور دوسرے اپنے عقیدہ کا تعصب۔ اور یہی دوسری چیز ہے جو بسا اوقات نہایت خراب نتائج پیدا کرتی ہے۔

مسلمانوں میں جو مشرقی مسلمان ہیں وہ خُرافات کی طرف مائل نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کے ہاں ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کی عقلوں پر ٹھیٹھ مذہبی عقائد کا بڑا تسلط ہے جو نوعِ انسانی کے ادائے فرائض کے لئے سدِ راہ ہے۔ اس لئے کہ اس زمین پر ہم جہل میں مبتلا اور اسی پر مطمئن رہنے کے لئے نہیں پیدا کئے گئے بلکہ اس لئے کہ باطل اور مضرت رساں عناصر کا مقابلہ کریں۔ علم ہر ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی) کی روح رواں ہے، اسی سے قوموں کی عقلیں علیٰ قدرِ مراتب فنِ حرب اور صنعت و حرفت میں ترقی کرتی ہیں۔ اور سی سے انسان قومی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ سکتا ہے لینی اس سے وہ اعتدال پیدا ہوتا ہے جو بقاءِ عالم کے لازمی ہے۔ علم ہی سے قوائے عقلی کی آبیاری ہوتی ہے۔ اگرچہ آج بھی ایشیا میں ایسے جاہل و وحشی پائے جاتے ہیں جیسے کہ ابتداً لشکرِ اسلام میں اور اس کے بعد بھی ہلاکو اور چنگیز خاں کے لشکر میں تھے، لیکن یورپی علوم نے اب اقوام یورپ کی ایسی کایا پلٹ کر دی ہے کہ اگر حضرت عمرؓ یا چنگیز خاں بھی ہوں تو افواجِ یورپ کے مقابلہ پر نہیں ٹھہر سکتے، بلکہ ان کو اپنے ''صحرا'' سے نکلنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ ان نو ایجاد آتشیں آلاتِ حرب کے سامنے ٹھہرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے تمھیں معلوم ہوگا کہ ابتدا میں ان آلات کی بہت مذمت کی جاتی تھی حالانکہ وہ اس وقت ہمیں بہت مدد دیتے اور ترقی کی اشاعت میں ہماری مساعدت کرتے ہیں۔ لیکن میری رائے میں تو علم ہی سچی نعمت ہے اور اسی کی بدولت آلات و اسلاحِ فتنہ و شر سے ہمیں بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے ایجاد ہوئے جو بسا اوقات اسی (علم) سے مُنتج ہوتے ہیں اور میری رائے یہ بھی ہے کہ علم صرف اُسی ترقی کی مساعدت

ناہے جو انسان کی حفاظت اور آزادی پر مبنی ہو۔

ہندوستان اور اُس کی زبانیں

از

سر جارج گریرسن۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای

(مترجمہ مولوی عبدالستار صاحب فاروقی)

اُن مختلف طریقہ ہائے زبان کے مشاہدہ کے لئے، جن کے ذریعہ سے بنی نوع انسان نے مسئلہ زبان کو حل
یا ہے، بحیثیت مجموعی دُنیا کا کوئی خطہ ہندوستان سے زیادہ مواقع پیش نہیں کرسکتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ خاص ہندوستان
ن زبانیں ۱۷۹ ہیں اور اگر اس میں برما کو شامل سمجھا جاوے تو ان کی تعداد ۱۹۰ تک پہونچتی ہے۔ ان زبانوں کا
لق اُن چھوٹے شعبوں کے علاوہ جو ابھی تحقیق طلب ہیں زبان کے اُن چار مُسلّمہ خاندان سے ہے جن کو علم اللسان
ں تبتی چینی (Tibeto-Chinese) دراویدی (Dravidian)
سٹروی (Austric) اور آرین (Aryan) کہتے ہیں۔ ہندوستان کو ان
سانی تعلقات کی بناپر ایک ایسے لسانی جنگشن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، جہاں سے مسافر بلا تبدیلی پلیٹ فارم
کے ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں منتقل ہوکر ہر سمت میں دنیا کے بعید ترین گوشہ تک پہونچ سکتا ہے۔ چنانچہ
سٹروی لائن کے ذریعہ ہم جنوب مشرق میں پنجاب سے ہندوستان کو طے کرتے ہوئے برما، انڈوچین، انڈونیشیا،
(Indo-nesia) ملانشیا (Melanesia) اور پولی نشیا (Poly-nesia)
سے گزر کر جنوبی امریکہ کے ساحل سے دور جزیرہ ایسٹر (Easter) تک جاسکتے ہیں، اور تبتی چینی کے ذریعہ ہم
شرق میں بالتستان (کشمیر) اور وہاں سے ہمالہ کی تلہٹیوں سے گزرتے ہوئے آسام، برما اور سیام کے راستہ
سے چین کو پہونچ سکتے ہیں؛ جبکہ آرین زبانیں ہمیں انڈویورپین کی بڑی شاخ سے ملاتی ہوئی تمام مغربی ایشیا کی وسعت
میں گھماکر یورپ میں اور وہاں سے اطلانتک پار امریکہ پہونچا سکتی ہیں۔ غرضکہ بلحاظ زبان ہندوستان کے تعلقات کی
وسعت تمام دنیا کو محیط ہے

زمانہ دراز سے ہندوستان میں جو زبانیں بولی جاتی رہی ہیں اُن کا تعلق آسٹروی خاندان سے تھا اور ہے؛

بلکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے ہندوستان کی قدیم ترین اور اصلی بھاکا آسٹروی خاندان ہی کی ایک قسم تھی جو آگے چل کر دو بڑے شعبوں آسٹرونیسین اور آسٹروایشیاٹک میں منقسم ہوگئی۔ ان میں سے اول الذکر ملک کے مرف ایک گوشہ میں برما کی انتہائی جنوبی سرحد پر ایک ساحلی خانہ بدوش قبیلہ کی زبان رہی ہے جو سالونز ([illegible]) کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں سے، جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے، وہ (آسٹرونیسین) بحرالکاہل ([illegible]) کے اس پار جزیرۂ ایسٹر تک، اور جنوب میں آسٹریلیا کو بیچ میں چھوڑتی ہوئی، نیوزیلینڈ تک پھونچتی ہے۔ انڈوچینی زبانیں آسٹروایشیاٹک شعبہ کی خاص نمائندہ ہیں جن سے اس وقت ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ علاوہ انڈوچین کے اسکی دوسری شاخیں برما، آسام، اور خلیج بنگال کے پار جزائر نکوبار میں ہوتی ہوئی وسط ہند میں پھیلی ہوئی ہیں، جہاں اس کو سنتالی اور دیگر مخلوط زبانوں کی شکل میں وہ پہاڑی جرگے مثل سنتال، منڈے، اور کرکو استعمال کرتے ہیں جن کے ناموں سے مشنری سوسائیٹیوں کے رسائل پڑھنے والے بخوبی واقف ہوں گے۔ ہندوستان کے لسانی معائنہ سے جو حال ہی میں اختتام کو پھونچا ہے، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس شعبہ کی زبانیں وادی گنگا کے ایک بڑے حصہ اور کوہ ہمالہ کے جنوبی رُخ میں براہِ راست پنجاب تک مروّج رہی ہیں۔ اس تمام وسیع رقبہ پر اگرچہ دوسری زبانیں بھی اب تک قابض ہیں جن کو وہاں بعد کو آباد ہونے والے لوگ بولا کرتے تھے، تاہم اصلی زبان کی بہت سی یادگاریں آسٹروایشیاٹک الفاظ اور محاورات کی صورت میں محفوظ ہیں۔ علاوہ بریں بہت قدیم زمانہ میں ان کا سراغ لگایا جا سکتا ہے جیساکہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ جب آرین لوگ شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کو اپنے اس نئے مسکن میں ایسی چیزوں سے سابقہ پڑا جن کے ناموں سے وہ پہلے قطعاً ناآشنا تھے۔ اس لئے وہ مجبور ہوئے کہ ان کو ان کے دیسی ناموں ہی سے یاد کریں۔ اسی طرح کئی دیسی نام انکی زبان پر چڑھ گئے اور یہی نام اب بطور اصلی زبان کی یادگار کے سنسکرت میں، جو آج سے دو ہزار سال پیشتر مُردہ ہو چکی ہے، باقی ہیں یہاں ہم مثالاً چند اشیا کے نام لکھتے ہیں جو آسٹروایشیاٹک نژاد ہیں، اور سنسکرت میں عام طور پر مستعمل ہیں:-

"پان۔ ردئی۔ روئی کا کپڑا۔ بانس کا تیر،" وغیرہ

یہ الفاظ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہونے سے پہلے محققین السنۂ ہند کے لئے باعثِ پریشانی تھے۔ ان الفاظ کی طرح بعض شہروں کے نام بھی باوجود آسٹروایشیاٹک نسل سے ہونے کے سنسکرت لٹریچر میں داخل ہوگئے ہیں۔ آرین قوم نے ان کو استعمال ہوتے دیکھا اور اختیار کرلیا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال اس قبیلہ کا نام ہے۔ جس کو ملایا والے۔ جن کی زبان آسٹرونیسین ہے، "کلنگ" کہتے ہیں۔ یہ لفظ دراصل ہندوستان کے مشرقی ساحل

کے سنسکرت نام "کلنگا" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ لفظ "کلنگا" اصل میں آسٹرو ایشیاٹک ہے۔ جس کو سنسکرت نے عاریتاً لے کر اپنا بنا لیا تھا۔ اب یہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ یورپین بھی اس کو استعمال کرنے لگے ہیں چنانچہ پلینی (Pliny) کی کتاب نیچرل ہسٹری (تاریخ طبیعی) میں یہ لفظ موجود ہے۔ یہ آسٹرو ایشیاٹک لفظ کی ایک عمدہ مثال ہے جس کو انڈو آرین نے اختیار کیا، اور جو بگڑی ہوئی صورت میں مجمع الجزائر ملایا کی آسٹرونیشین بھاشا میں دوبارہ نمودار ہوا۔ ویانا (Vienna) کے پادری اسکمڈت (Schmidt)، جو اس موضوع پر ہمارے لئے ایک بہت بڑی سند ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ اُن تمام آسٹروی زبانوں کی قدیم ترین شکل، جس کا سراغ لگایا جاسکتا ہے، خود ہندوستان میں ضرور مستعمل رہی ہوگی، اور یہاں سے یہ زبانیں آگے بڑھتی ہوئی بحرالکاہل کے پاس جزیرۂ ایسٹر اور نیوزیلینڈ تک پہونچ گئی ہونگی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس طویل سفر کے باعث ان میں اہم تبدیلیاں واقع ہوگئیں، مگر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اب بھی صاف طور پر ان کی قرابت قریبہ کا پتہ چلتا ہے۔ ہندوستان کی آسٹرو ایشیاٹک زبانوں میں قابلِ ذکر ایک تلنگ زبان ہے جو پہلے برما میں بولی جاتی تھی اور اب جنوبی حصۂ پیگو (Pegu) کی بولی ہے، اور دوسری آسام کی خاصی اس ضلع کی زبان ہے جس میں صوبہ کا صدر مقام شیلانگ واقع ہے۔

اگر ہم سنتالی زبان کو ان ہندوستانی آسٹرو ایشیاٹک زبانوں کی ایک اہم شاخ کے طور پر لیتے ہیں تو فوراً ہماری نظر اس کے نحوی قواعد کی ظاہری پیچیدگی میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے، حالانکہ وہ تمام تر باقاعدگی کا ایک عمدہ نمونہ ہے، اور اس لحاظ سے وہ اسی قدر آسان ہے جتنی کہ اسپرانٹو (Esperanto) اس زبان میں آسان ترین خیال کو ادا کرنے کا طریقہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ہر فعل پورے جملہ کی جزئیات پر مشتمل ہو مثلاً "دال" ایک فعل ہے جس کے معنی ہیں مارنا، پیٹنا۔ اب اگر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ:-

"میرے غلام کا لڑکا خود کو پٹنے کی اجازت دیتا ہے"۔ تو فعل دال کی یہ صورت ہوگی:-

"ڈالوچواکنتا اِتینائی" (Dalachoakantaenta aetinae) اس جملہ میں ہر کلمہ پر زور دیا جاتا ہے، ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ:-

"وہ شخص جس کا تعلق اُس سے ہے جو مجھ سے تعلق رکھتا ہے اپنے تئیں لوگوں کے ہاتھ سے مار کھلاتا رہے گا!"

ایک سنتالی فعل کی پوری گردان کے لئے اگر ایک معمولی گرامر کے چھ سو صفحات وقف ہو جائیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ مگر پھر بھی اس کے تمام اصول اور قواعد اس قدر آسان اور منطقی ترتیب پر ہیں کہ صرف چند

گتھیوں کی کوشش سے ہم ان پر حاوی ہو سکتے ہیں۔

آسٹروی زبان کے برعکس دراویدی زبانوں کے باہمی تعلقات اگر منقطع نہیں ہوگئے ہیں تو شکستہ ضرور ہیں۔ یہ زیادہ تر جنوبی ہند میں مروج ہیں۔ ان میں قابل ذکر اسنہ تامل، کانڑی، اور تلگو ہیں اور ان کے بولنے والے علی الترتیب ایک کرور اسی لاکھ۔ ایک کرور۔ اور دو کرور چالیس لاکھ ہیں۔ یہ زبانیں باقاعدہ اور اصول نحو کے ساتھ منضبط ہیں ان میں ہندوستان کے قدیم تمدن سے متعلق قیمتی لٹریچر پایا جاتا ہے۔ ان زبانوں کے علاوہ بہت چھوٹے چھوٹے قبائل کی خانگی بولیاں جو شمالی ہند بلکہ بلوچستان اور دریائے سندھ کے اوپر جانب مغرب پھیلے ہوئے ہیں، دراویدی ہیں، ان دراسی دیسی زبان کو برتنے والے مجموعی طور پر اب بھی جرمنی کی آبادی سے زیادہ یعنی چھ کرور چالیس لاکھ ہیں۔ ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اگلے وقتوں میں دراویدی بولنے والے قبائل مغربی ہند اور ہند پر قابض تھے مگر وہ کہاں سے آئے تھے اور مغربی ہند پر کس طرح قابض ہوئے، یہ ایسے سوالات ہیں جن پر اب تک محققین متفق الرائے نہیں ہوئے۔ ایک گروہ کا جس کے مؤیدین میں مسٹر (سلیٹر)[1] کا حال میں اضافہ ہوا ہے، یہ خیال ہے کہ آریوں کی طرح مگر ان سے بہت پہلے دراویدی بھی شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ اور یہ مسلم الثبوت امر ہے کہ جب آرین لوگ ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان دراویدیوں کو بہت متمدن میں پایا تھا، جو بڑے شہروں میں سکونت پذیر اور پنجاب پر قابض تھے، جہاں قابض ہونے سے پہلے ان کو سخت معرکہ آرائیاں کرنی پڑی تھیں۔ ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ زمانۂ قبل التاریخ میں آسٹریلیا دراویدی اہل ہندوستان آئے جبکہ ان ہر دو ممالک کے درمیان خشکی کے راستہ سے آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ نظریہ ابھی زیر بحث ہے اور اس کے متعلق کوئی ناطق فیصلہ دینا یقیناً قبل از وقت ہوگا اور اگرچہ ہم اس کے ثبوت میں کوئی بات اس قسم تعلقات کی نسبت پیش نہیں کر سکتے، تاہم بعض وجوہ مشترکہ کی بنا پر ہم اس نظریہ کو ناممکن بھی نہیں کہہ سکتے۔

(باقی)

---

[1] گلبرٹ سلیٹر ایم، اے، بی ایس سی سابق پروفیسر معاشیات مدراس یونیورسٹی اور مصنف "ہندوستانی تہذیب میں دراویدی عنصر" (مترجم)

کتاب الاغانی

اور

اَبُوالفَرَج اَصفہانی

(از قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

ہمارے دوست قاضی احمد میاں صاحب اختر کا یہ مضمون عرصہ ہوا رسالہ النصر (لکھنؤ) میں شائع ہو چکا ہے لیکن حال ہی میں ایک مضمون مصر کے عربی رسالہ الزہرا، میں اغانی اور اُس کے مصنف پر شائع ہوا ہے اس میں سے بعض معلومات مفیدہ کو اخذ کر کے بادنی تغیر قاضی صاحب موصوف نے ہمیں بغرض اشاعت ارسال فرمایا ہے جس کو ہم ذیل میں شائع کرتے ہیں۔" اڈیٹر"

عرب قدیم کے متعلق اسلامی مؤرخین کے لئے اشعار و امثال عرب ایک بہت بڑا ذریعہ معلومات کا ہوئے، چنانچہ اسلامی [مؤ]رخین یعقوبی، طبری، مسعودی، ابن اثیر، ابوالفداء، ابن خلدون وغیرہ نے علاوہ دیگر ذرائع معلومات کے زیادہ تر اسی [ذ]ریعہ سے عرب قدیم کا حال لکھا ہے، اس میں شک نہیں کہ اشعار عرب سے ایام عرب، ان کی لڑائیاں، اور اخلاق و عادات [کا ص]حیح اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ اشعار ایک مدت تک زبانی روایت ہوتے چلے آئے اس بنا پر انکا اکثر حصہ برباد ہو گیا، اگرچہ [اس]لام میں ابوعبیدہ اور اصمعی اشعار عرب کے سب سے بڑے راوی خیال کئے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں نے بھی جو سرمایہ [جم]ع کیا تھا اس کا اکثر و بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ تاہم عرب قدیم کے لوگوں کی تاریخ ان کے عادات و اطوار اور ان کی طرز [مع]اشرت کے متعلق لٹریری حیثیت سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ اب تک کتاب الاغانی، میں محفوظ ہے۔

کتاب مذکور اصل میں سو قسم کی اُن مختلف راگنیوں کے بیان پر مبنی ہے جن کو مغنیوں نے خلیفہ ہارون الرشید [ک]ے لئے اختیار کیا تھا اِن راگنیوں میں مصنف نے بھی کئے ایک راگنیوں کا اضافہ کیا ہے گویا یہ اُن تمام موسیقانہ [عر]بی اشعار کی تاریخ ہے جو مصنف کے زمانہ تک گائے گئے ہیں۔ ان اشعار کے بول اور ان کی دُھن بتانے کے [بع]د ان کے موجدین شعراء اور مغنیوں کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئیے، جیسا کہ اس کتاب کے [ن]ام سے ظاہر ہوتا ہے، کہ مصنف نے صرف اسی موضوع پر اکتفا کیا ہے، بلکہ اخبار و اشعار، اور انساب و ایام عرب کے

[۱] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۵۱.

علاوہ اُن تمام مغنیّوں اور شعراء کے حالات پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے جن کا کلام اس کتاب میں درج ہے، اور بعض جگہ تاریخ و دیگر علوم سے بھی بحث کی ہے۔ علاوہ بریں مغنیہ اور شاعرہ عورتوں، کنیزوں شراب ملانے والوں، اور گانیوالے حسین لڑکون کے حالات بھی اس کتاب میں مذکور ہیں۔ مختلف اوقات میں مختلف قسم کے لوگوں کے نوادر اور لطائف وظرائف بیان کئے ہیں۔ مشاہیر شعراء مثل ابو تمام، ابو نواس، بُحتری وغیرہ کے کلام کا اکثر حصہ جمع کر دیا ہے۔ بعض مستند احادیث وروایات، نحو ولغت، سیر ومغازی، طلب وبیطاری، اور ہیئت ونجوم سے متعلق کئی باتیں اس میں درج کی ہیں غرضکہ مصنف نے کوئی چیز رطب ویابس اُٹھا نہیں رکھی اور اس نے ہمارے لئے ایک ایسا موادفراہم کر دیا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اصفہانی نے کوئی واقعہ اغانی میں ایسا نہیں لکھا جسکی اسانید اور مختلف روایات کو نہ بیان کیا ہو۔ ان اسانید اور روایات مختلفہ سے متناقض اور مبالغہ آمیز روایات میں ہم تمیز کرکے صحیح اور غلط کو پہچان سکتے ہیں۔ کتاب الاغانی کا طرز تحریر بلیغ حشو وزوائد اور تعقید وتکلیف سے پاک ہے۔ بغداد کے بویہی حکمراں معز الدولہ کے وزیر ابو محمد المہلبی اس کتاب کی تعریف میں لکھتے ہیں:-

فهو للزاهد فكاهة، وللعالم مادة وزيادة وللكاتب والمتادب بضاعة وتجارة، وللبطل رحلة وشجاعة، وللمضطرب رياضة وصناعة وللملك طيبة ولذاذة"[1]	یہ کتاب ایک زاہد خشک کے لئے تفریح کا سامان، ایک عالم کے لئے معلومات کی کان، ایک انشاپرداز اور طالب ادب کا سرمایہ تجارت، ایک بہادر کے لئے سفر اور شجاعت، ایک مضطرب آدمی کے لئے ورزش وریاضت اور ایک فرماں روا کے لئے تفریح ولذت ہے

بلاشبہ عربی لٹریچر میں یہ ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ مشہور مورخ ابن خلدون اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

ولعمري انه ديوان العرب وجامع اشتات المحاسن التي سلفت لهم في كل فن من فنون الشعر والتاريخ والغناء وسائر الاحوال ولا يعدل به كتاب في ذالك فيما نعلمه وهو الغاية التي يسمو اليها الاديب ويقف عندها وانى له بها[2]	بجان عزیزم! یہ کتاب عربوں کا پورا دفتر یا رجسٹر ہے اور اُن تمام مختلف محاسن مثل شعر تاریخ اور موسیقی وغیرہ پر حاوی ہے جو انہوں نے زمانۂ قدیم میں حاصل کئے تھے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کوئی کتاب اس فن میں اس کی برابری نہیں کرسکتی۔ ایک ادیب کے لئے یہ غایت انی الباب ہے جہاں تک وہ پہونچ سکتا ہے اور جس کے بعد اس کو کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں

[1] دیکھو مقدمۂ اغانی۔ [2] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۵۱۔

ابن خلکان کی روایت مندرجہ ذیل سے اس کتاب کی اہمیت بخوبی ثابت ہوتی ہے :-

"کہا جاتا ہے کہ صاحب بن عباد[1] تیس اونٹ کتابوں کا بوجھ سفر میں ہر وقت مطالعہ کرنے کے لئے ساتھ رکھا کرتا تھا لیکن جب کتاب الاغانی اسے مل گئی تو اس نے صرف اسی ایک کتاب کو ساتھ رکھنے پر اکتفا کیا"[2]

غرض یہ نہ صرف موسیقی عرب کی ایک ڈکشنری ہے بلکہ اہل عرب کی شاعری، ان کی تاریخ، اور ادب کی ایک جامع انسائیکلوپیڈیا ہے۔

اس مشہور کتاب کا مصنف قاضی علی بن حسین بن محمد بن احمد بن ہیثم اُموی مشہور بہ ابو الفرج اصفہانی ہے۔ وہ ۲۸۴ھ مطابق ۸۹۷ء بمقام اصفہان پیدا ہوا۔ وہ عرب عربا قریش کی خاص نسل سے اور سلاطین اُمویہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد کے خاندان سے تھا۔ اس کا خاندان اگرچہ اصفہان میں مقیم تھا لیکن اس کا عنفوان شباب زیادہ تر بغدادی میں گذرا تھا جہاں وہ بطور ایک ادیب اور مصنف کے مشہور ہوا۔ وہاں اس نے تعلیم و تربیت پائی اور وہیں سکونت اختیار کی۔ وہ بنی امیہ کے خاندان سے ہونے کے باوجود مذہباً شیعہ تھا[3]۔ سکونتِ عراق اور قربِ فارس کی وجہ سے نیز عجمی اہل تشیع کے میل جول سے (جو بغداد آتے جاتے رہتے تھے) غالباً وہ مائل تشیع ہوا ہوگا۔

امیر سیف الدولہ حاکم شام کے دربار میں اس کی رسائی تھی اور امیر اسے انعام و اکرام سے سرفراز کیا کرتا تھا۔ اسی طرح بنی امیہ اندلس سے بھی پوشیدہ طور پر اس کی چند تصانیف کا صلہ ملا کرتا تھا جن کو وہ اندلس وقتاً فوقتاً بھیجا کرتا تھا۔

یاقوت حموی کا بیان ہے کہ ابو الفرج بہت کثیف اور میلا کچیلا رہا کرتا تھا۔ اور کبھی اپنے کپڑے نہیں دھلواتا تھا بلکہ جب تک وہ بوسیدہ ہو کر نہ پھٹ جاتے وہ ان کو اپنے جسم سے نہیں اُتارتا تھا[4]۔

اصفہانی ہجو گوئی میں بہت مشہور تھا۔ چنانچہ لوگ اس کی مذمت اور زبان تلخ سے بہت ڈرتے تھے۔ ابو عبداللہ البریدی کو جب عہدۂ وزارت تفویض ہوا تو اس نے ہجو لکھی جس کا مطلع یہ ہے :-

یا سماء اسقطی و یا ارض میدی	اے آسمان ٹوٹ پڑ اور اے زمین متزلزل ہو جا
قد تولی الوزارۃ ابن البریدی	ابن البریدی کو وزارت مل گئی ہے!

[1] بڑا عالم فاضل اور ادیب شخص مؤید الدولہ اور فخر الدولہ (بویہی) کا وزیر تھا۔ اس کا نام ابو القاسم اسمٰعیل بن ابی الحسن عباد بن عباس ہے۔ ۳۸۵ھ میں بمقام رے وفات پائی (ابن خلکان ج ۱ ص ۷۵ و ص ۷۶)

[2] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۴۳ [3] ایضاً

[4] ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب ج ۵ ص ۱۵۲۔ ص ۱۵۳

تغزل میں اس کے عمدہ اشعار ہیں جو یاقوت اور الفخری نے نقل کئے ہیں[۱]

کہتے ہیں کہ کتاب الاغانی کی تصنیف میں اس نے اپنی عمر کا ایک معتد بہ حصہ یعنے پچاس برس کردئے، اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ امیر سیف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے ایک ہزار دینار عطا کئے اور ساتھ ہی ایک ایسی معرکۃ الآرا کتاب کی تصنیف پر اس قدر قلیل رقم دینے پر معذرت خواہی کی[۲] حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ عضد الدولہ نے اس کتاب کا ایک نسخہ چار ہزار درم کو خریدا تھا جسے وہ سفر و حضر میں کسی وقت اپنے پاس سے جدا نہیں کرتا تھا[۳]

اُسی زمانہ میں اندلس میں امیر الحکم بن عبدالرحمٰن الناصر (المتوفی ۳۶۶ھ) بڑا علم دوست اور کتابیں جمع کرنے کا شائق تھا۔ اس کی یہ خاص کوشش تھی کہ جو نادر تصنیف ممالک مشرقیہ میں لکھی جائے بغداد سے پہلے اسپین آئے، اس کوشش میں وہ بہت سا مال و زر صرف کیا کرتا تھا جب اس کو یہ خبر پہونچی کہ ابو الفرج کتاب الاغانی تصنیف کرچکا ہے تو اس سے درخواست کی کہ یہ کتاب عراق (بغداد) پہونچنے سے پہلے اس کے پاس بھیجدی جائے! اور اس کے عوض میں الحکم نے ایک ہزار اشرفیاں بھیجیں[۴]

ابو الفرج نے چہارشنبہ ذی الحجہ ۳۵۶ھ مطابق ۹۶۷ء میں بمقام بغداد وفات پائی۔ مرنے سے چند روز قبل اس کے حواس معطل ہو گئے تھے[۵]

ابو الفرج کی تصانیف حسب ذیل ہیں جن کا ذکر ابن الندیم حاجی خلیفہ اور یاقوت نے کیا ہے:۔[۶]

۱ کتاب الاغانی الکبیر	۸ اخبار القیان
۲ کتاب مجرد الاغانی	۹ الممالیک الشعراء
۳ التعدیل والانتصاف فی اخبار القبائل وانسابہا	۱۰ ادباء الغرباء
۴۔ مقاتل الطالبیین (چھپ گئی ہے)	۱۱ اخبار جحظۃ البرمکی
۵ الاماء والشواعر	۱۲ کتاب اخبار الطفیلیین
۶ الدیارات	۱۳ کتاب مناجیب الخصیان
۷ دعوۃ التجار	۱۴ الاخبار والنوادر

[۱] ملاحظہ ہو اسکا کلام ارشاد الادیب ج ۵ ص ۱۵۲ ۔ ص ۱۵۳ ایضاً، نیز الفخری کی کتاب الآداب السلطانیہ ص ۳۸۷ ۔ ص ۳۸۸ میں۔
[۲] ابن خلکان ص ۳۴۴ ۔ [۳] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۲۶ ۔ [۴] نفح الطیب للمقری ج ۱ ص ۱۸۰ ۔
[۵] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳۵ ۔ [۶] کتاب الفہرست ص ۱۱۵، ارشاد الادیب ج ۵ ص ۱۵۱ ۔ ص ۱۵۲

کتاب الخارجین والخارات	۲۱ جمهرة النسب
کتاب فی النغم	۲۲ نسب المهالبہ
اعیان الفرس	۲۳ نسب بنی شیبان
الفرق والمعیار فی الاوغاد والاحرار (ہارون بن النجم کے لئے یہ رسالہ لکھا گیا تھا)	۲۴ نسب بنی عبد شمس
کتاب الدیانات	۲۵ نسب بنی تغلب
تحف الوسائد فی اخبار الولائد	۲۶ تفضیل ذی الحجۃ

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اصفہانی کی کوئی کتاب سوائے کتاب الاغانی اور مقاتل الطالبین کے اب تک طبع میں نہیں آئی۔ اور اس طویل فہرست میں سے شاید ہی چند رسائل یا ان کے متفرق اجزاء ممالک اسلامیہ کے کتب خانوں یا یورپ کی لائبریریوں میں مل سکیں۔ اگرچہ قرین قیاس تو یہی ہے کہ تاتاری سیلاب نے جہاں لاکھوں مخطوطات دجلہ فرات میں غرق کر دئے۔ وہاں ان کو بھی دریا برد کر دیا ہوگا۔ کیونکہ اس طویل عرصہ میں اس کی کسی تصنیف کی موجودگی کا پتہ نہیں چل سکا۔

یورپ میں سب سے اول جب فرانسیسیوں نے مصر پر چڑھائی کی اس وقت کتاب الاغانی کا قلمی نسخہ موسیو ریگ (M. Reig) کو دستیاب ہوا جو اب تک پیرس کی رائل لائبریری میں رکھا ہوا ہے[۵]

کتاب لاغانی سب سے پہلے قاہرہ کے مطبع بولاق میں ۱۲۸۵ھ میں ۲۰ جلدوں میں ناقص طبع ہوئی بعد ازاں مستشرق رُدولف برونو (R. E. Brunnow) نے ۱۳۰۶ھ میں اس کی اکیسویں جلد لیڈن سے شائع کی۔ اور پروفیسر جویدی (Guidi) اطالوی مستشرق نے بعض مستشرقین یورپ کی مدد سے اس کی چار حسب ذیل فہرستیں (انڈکسین) مرتب کیں:

(۱) اسماء شعراء (۲) قوافی اشعار مندرجہ کتاب (۳) رجال ونساء قبائل (۴) امکنہ وجبال ومیاہ۔
۱۳۱۸ھ میں یہ انڈکس لیڈن سے شائع ہوئی۔ پھر الحاج محمد الساسی نے اس کو مکرر چھاپ کر اغانی کے اکیسویں جلد کے ساتھ ملحق کر دیا۔ یہ انڈکس طبع مصریہ کے حوالۂ صفحات کے ساتھ استاد مفضال بک مسعود نے تیار کی تھی۔

بیروت کے ایک عیسائی پروفیسر انطون صالحانی نے رنات المثالث والمثانی کے نام سے دو لطیف

---

۵ روڈ گارڈن آف پرشیا از مس کا سٹیلو ص۹

جلدوں میں اغانی کی تلخیص تیار کی جو ء میں شائع ہوئی لہ

استاد شیخ محمد خضری مفتش المعارف مصر نے اغانی کی تہذیب مرتب کی ہے، یعنے تمام مکررات اور اسانید حذف کر کے، شعراء کے حالات ان کے قبائل کے لحاظ سے ترتیب دئے ہیں، اس تہذیب کو دارالکتب المصریہ نے شائع کیا ہے۔ اور طباعت کے تمام اخراجات کے لئے سید علی بک راتب نے دو ہزار پونڈ (مصری) عطا کئے ہیں۔

ابن منظور صاحب لسان العرب نے بھی اغانی کا اختصار کیا تھا جو مختصر الاغانی کے نام سے مشہور ہے۔ حال میں یہ کتاب محب الدین الخطیب (اڈیٹر الزہراء) کے مطبع سلفیہ میں سید محمد عمر الخشاب کتب فروش کے خرچ سے چھپ رہی ہے۔ یہ نسخہ بھی مکرر روایات، اسانید و اصطلاحات موسیقی سے خالی ہے اور اس میں شعراء کے حالات حروف معجم کی ترتیب پر رکھے گئے ہیں۔

غزل

(ابوالخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین (بٹالوی)

پھر کہہ رہی ہیں کلیاں ہنس ہنس کے بیکلی میں — اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں
جھڑتے ہیں پھول اُن کے منہ سے ہنسی ہنسی میں — کھلتے ہیں جس طرح سے غنچے شگفتگی میں
تابندہ ہو گیا ہے بندہ بھی بندگی میں — حسن ایاز چمکا ہے عشق غزنوی میں
ہمدم نہ کوئی مونس غمخوار ہے نہ محرم — بس مجھ سے بیکسی ہی لپٹی ہے دوستی میں
ہے حسن و عشق باہم اک دوسرے میں پنہاں — شکل ایاز روشن ہے شکل غزنوی میں
میری زبان کو کیا گوئی کی ضرورت — اظہارِ مدعا کا جذبہ ہے خامشی میں
دُنیا تو عیش میں ہے آباد ساری خلقت — میں ایک بس رہا ہوں دنیائے بیکسی میں
لینے دے لطفِ اُلفت اے ہوش وصل کی شب — ڈوبی ہوئی خودی ہے خود شوق بیخودی میں

اک سانس آنے والی اک سانس جانے والی
ہے راز زندگی کا بس یہ ہی آدمی میں

لہ الثقافۃ القنوع بما ہو مطبوع صفحہ ۱۲

مترجمات

ہندوستان اور جاپان

رسالہ ماڈرن ریویو بابت جولائی ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر جے۔ ٹی سنڈرلین ہندوستان اور جاپان کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جاپان جو کچھ عرصے کے پہلے بالکل گمنامی کی حالت میں تھا آجکل اس کا شمار ایشیا کی سربرآوردہ اقوام میں ہوتا ہے، اور وہ دنیا کی ایک ترقی یافتہ حکومت بن گیا ہے۔ ستر برس پہلے جبکہ کوموڈر پیری نے جاپان کا جمودِ غفلت دور کیا اور بیرونی ممالک سے اس کے تعلقات قائم کرنے کے لئے اس کے دروازے کھول دئے اس وقت وہ ایشیا میں غیر معروف سا تھا۔ جاپان تمام تر زراعتی ملک تھا، جس کے مصنوعات بہت تھوڑے اور اس کی خارجی تجارت بالکل محدود تھی۔ اس کے پاس لوہا یا کوئی دوسری فلزات نہ تھیں۔ کوئلہ بھی اس کے ہاں کچھ زیادہ نہ تھا۔ برخلاف اس کے لوہا، کوئلہ اور دیگر ضروری اشیاء ہندوستان میں بکثرت اور غیر مختتم تھیں۔ جاپان کی دولت ہندوستان کے مقابلہ میں (جو اسے برطانوی اقتدار سے قبل حاصل تھی) بہت معمولی تھی،،

تو پھر جاپان کی ترقی اور کامیابی کا راز کس چیز میں مضمر ہے؟ ڈاکٹر سنڈرلینڈ ہمیں بتاتے ہیں کہ جاپان گورنمنٹ نے جاپانیوں کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کے بالکل برعکس حکومت ہند نے ہندوستانیوں کے لئے کیا ہے۔ اس کو وہ بدفعات ذیل بیان کرتے ہیں:۔

"(۱) سب سے پہلے جاپان گورنمنٹ نے اپنی رعایا کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اس میں یہاں تک کوشش کی کہ تمام ملک میں کسی گھر میں کوئی شخص جاہل نہ رہنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا کی تمام اقوام کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ قوم ہے۔

بجائے اس کے ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے تعلیمی مطالبہ کا اس قدر انکار کیا کہ ایکسو ساٹھ (۱۶۰) برس کے بعد بھی ہندوستان کے لوگوں میں فی صدی نو آدمی جاہل اور بے پڑھے پائے جاتے ہیں۔

(۲) حکومت جاپان نے ابتدا ہی سے ہر قسم کی صنعت و حرفت کو اپنے ملک میں رائج کر دیا اور ہر قسم کی اشیاء

جلدوں میں اغانی کی تلخیص تیار کی جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی لہ

استاد شیخ محمد خضری مفتش المعارف مصر نے اغانی کی تہذیب مرتب کی ہے، یعنے تمام مکررات اور اسانید حذف کر کے شعراء کے حالات ان کے قبائل کے لحاظ سے ترتیب دئے ہیں، اس تہذیب کو دارالکتب المصریہ نے شائع کیا ہے۔ اور طباعت کے تمام اخراجات کے لئے سید علی بک راتب نے دو ہزار پونڈ (مصری) عطا کئے ہیں۔

ابن منظور صاحب لسان العرب نے بھی اغانی کا اختصار کیا تھا جو مختصر الاغانی کے نام سے مشہور ہے۔ حال میں یہ کتاب محب الدین الخطیب (اڈیٹر الزہراء) کے مطبع سلفیہ میں سید محمد عمر الخشاب کتب فروش کے خرچ سے چھپ رہی ہے۔ یہ نسخہ بھی مکرر روایات، اسانید و اصطلاحات موسیقی سے خالی ہے اور اس میں شعراء کے حالات حروف معجم کی ترتیب پر رکھے گئے ہیں۔

غزل

(ابوالخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین (بٹالوی)

بھر کہہ رہی ہیں کلیاں ہنس ہنس کے بیکلی میں
اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

جھڑتے ہیں پھول اُن کے منہ سے ہنسی ہنسی میں
کھلتے ہیں جس طرح سے غنچے شگفتگی میں

تابندہ ہو گیا ہے بندہ بھی بندگی میں
حسن ایاز چمکا ہے عشق غزنوی میں

ہمدم نہ کوئی مونس غمخوار ہے نہ محرم
بس مجھ سے بے کسی ہی لپٹی ہے دوستی میں

ہے حسن و عشق باہم اک دوسرے میں پنہاں
شکل ایاز روشن ہے شکل غزنوی میں

میری زبان کو کیا گویائی کی ضرورت
اظہارِ مدعا کا جذبہ ہے خامشی میں

دُنیا تو عیش میں ہے آباد ساری خلقت
میں ایک بس رہا ہوں دنیائے بیکسی میں

لینے دے لطفِ اُلفت اے ہوش وصل کی شب
ڈوبی ہوئی خودی ہے خود شوق بیخودی میں

اک سانس آنے والی اک سانس جانے والی
ہے راز زندگی کا بس یہ ہی آدمی میں

لہ الفنا بالمفتوح ج با ہر مطبوعہ مصر

مترجمات

ہندوستان اور جاپان

رسالہ ماڈرن ریویو بابت جولائی سنہ ۲۶ء میں ڈاکٹر جے۔ ٹی سنڈرلینڈ ہندوستان اور جاپان کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"جاپان جو کچھ عرصے کے پہلے بالکل گمنامی کی حالت میں تھا آجکل اس کا شمار ایشیا کی سر برآوردہ اقوام میں ہوتا ہے، اور وہ دنیا کی ایک ترقی یافتہ حکومت بن گیا ہے۔ ستر برس پہلے جبکہ کوموڈر پیری نے جاپان کا جمودِ غفلت دور کیا اور بیرونی ممالک سے اس کے تعلقات قائم کرنے کے لئے اس کے دروازے کھول دئے اس وقت وہ ایشیا میں غیر معروف سا تھا۔ جاپان تمام تر زراعتی ملک تھا، جس کے مصنوعات بہت تھوڑے اور اس کی خارجی تجارت بالکل محدود تھی۔ اس کے پاس لوہا یا کوئی دوسری فلزات نہ تھیں۔ کوئلہ بھی اس کے ہاں کچھ زیادہ نہ تھا۔ برخلاف اس کے لوہا، کوئلہ اور دیگر ضروری اشیاء ہندوستان میں بکثرت اور غیر مختتم تھیں۔ جاپان کی دولت ہندوستان کے مقابلہ میں (جو اسے برطانوی اقتدار سے قبل حاصل تھی) بہت معمولی تھی،،

تو پھر جاپان کی ترقی اور کامیابی کا راز کس چیز میں مضمر ہے؟ ڈاکٹر سنڈرلینڈ ہمیں بتاتے ہیں کہ جاپان گورنمنٹ نے جاپانیوں کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کے بالکل برعکس حکومت ہند نے ہندوستانیوں کے لئے کیا ہے۔ اس کو وہ بدفعات ذیل بیان کرتے ہیں:-

"(۱) سب سے پہلے جاپان گورنمنٹ نے اپنی رعایا کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اس میں یہاں تک کوشش کی کہ تمام ملک میں کسی گھر میں کوئی شخص جاہل نہ رہنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا کی تمام اقوام کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ قوم ہے۔

بجائے اس کے ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے تعلیمی مطالبہ کا اس قدر انکار کیا کہ ایکسو ساٹھ (۱۶۰) برس کے بعد بھی ہندوستان کے لوگوں میں فی صدی نو آدمی جاہل اور بے پڑھے پائے جاتے ہیں۔

(۲) حکومت جاپان نے ابتدا ہی سے ہر قسم کی صنعت و حرفت کو اپنے ملک میں رائج کر دیا اور ہر قسم کی اشیاء

اپنے ہاں بنانی شروع کر دیں حتیٰ کہ اس لحاظ سے اب وہ ایشیا کی ایک ترقی یافتہ قوم ہے۔

بجائے اس کے ہندوستان کی غیر ملکی حکومت نے اپنے تجارتی محصولات اور دوسرے طریقوں سے رفتہ ہندوستان کی مقامی پیداواروں اور ملکی مصنوعات کو انگلستانی مصنوعات کی بہبودی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا اور اس طرح ہندوستان کو ایک زبردست صنعتی قوم سے برطانیہ عظمیٰ کی مصنوعات کے لئے خام پیداواریں مہیا کرنے والے ملک میں تبدیل کر دیا۔

(۳) جاپان کی حکومت خود اختیاری نے شروع ہی سے ہر ممکن طریقہ سے خارجی تجارت اور جہاز سازی کو اپنے ہاں داخل کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فی الحال جاپان نہ صرف ایشیا میں بلکہ تمام دنیا میں بلحاظ تجارت اول درجہ رکھتا ہے۔

اس کے برخلاف ہندوستان کی برٹش گورنمنٹ نے اپنے برطانی تاجروں اور جہازران کمپنیوں کی سرپرستی کر کے عملی طور پر ہندوستان کی تجارت اور اس کی صنعت جہاز سازی کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ ہندوستان کی خارجی تجارت اب زیادہ تر برطانی ہی ہے۔ جو برطانیہ کے زیر اقتدار ہندوستان کی بجائے برطانیہ کے تمول میں اضافہ کر رہی ہے۔"

آخر میں ڈاکٹر سنڈرلینڈ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اپنی قومی حکومت کی باگ ہوتی جیسی کہ جاپانیوں کے ہاتھ میں ہے تو ہندوستان اپنی ملکی پیداواروں سے (جو ہر حال میں جاپان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں) اور اپنی غیر محدود فرد کاری کی بہم رسانی کے ذریعہ جاپان سے کہیں سے زیادہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہوتا۔

ہندوستان کی تعلیم کا دردناک انجام

مندرجہ بالا عنوان سے ایک مضمون مسٹر آلڈس ہکسلے کے قلم سے اخبار نیشن میں شائع ہوا ہے اگرچہ اس میں کچھ مبالغہ معلوم ہوتا ہے تاہم اس میں شک نہیں ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت نے انکی حالت کو ایک ناگفتہ بہ "ٹریجڈی" بنا دیا ہے جس سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ مضمون نگار لکھتا ہے:-

"کاشمیر میں تم ایک کلرک کو اپنے باورچی کی نصف تنخواہ پر ملازم رکھ سکتے ہو۔ کچھ کاشمیر ہی پر منحصر نہیں ہے

یہ ہندوستان بھر کی یہی حالت ہے۔ حال ہی میں ایک سرکس کا تماشا کرنے والی کمپنی لاہور میں آئی اور اس نے ایک دربان کے لئے پندرہ روپیہ کی تنخواہ کا اشتہار دیا۔ مجھ سے لوگوں نے بیان کیا کہ اس نوکری کے امیدواروں میں کوئی چالیس کے قریب گریجوئیٹوں کی عرضیاں بھی تھیں"۔

یونیورسٹیاں ایسے گریجوئیٹوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر رہی ہے جن کو کوئی کام نہیں ملتا۔ حکومت ان کی صرف ایک محدود تعداد کو ملازمتیں دے سکتی ہے، اور مغربی تعلیم پائے ہوئے لوگوں کے لئے گورنمنٹ کی ملازمت کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ایسے صنعتی تجارتی کاروبار کا ہندوستان میں خیر سے وجود ہی نہیں ہے جن کے لئے ہمارے ان مغربی نوجوان اپنے تئیں وقف کر دیتے ہیں اور کوئی ایسا سرمایہ ناممکن الحصول ہے جس کے ذریعہ اس قسم کا صنعتی کاروبار بڑے پیمانہ پر جاری کیا جا سکے۔ پھر عام تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں بطور خود اس قسم کا کام مختصر پیمانہ پر کرنے کی جرأت اور مادہ نہیں ہے ان کا نصب العین کوئی ایسا محفوظ عہدہ کلرکی ہے۔ جو ذمہ داریوں سے بالکل پاک ہو اور آخر میں تھوڑی سی پنشن! طوطے کی طرح رٹ کر حاصل کی ہوئی تعلیم ان کو کسی مصرف کا نہیں رکھتی۔ اور بدقسمتی سے ایسی پنشن والی محفوظ کلرکیوں کی تعداد بہت ہی محدود ہے غرضکہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی جماعت ہندوستان میں روز افزوں ترقی کر رہی ہے جو ایک مستقل گورنمنٹ کے لئے بڑی حد تک خطرناک ہے۔

موجودہ انگریزی مصنفین کی تصانیف کا معاوضہ

لندن کے مشہور روزنامہ گرافک میں انگریزی زبان کے موجودہ مصنفین کی بعض تصانیف کا معاوضہ بتایا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ انشاپردازوں اور مصنفوں کی یورپ میں کیسی کچھ قدر کی جاتی ہے۔ روزنامہ مذکور لکھتا ہے کہ:-

"مس ایتھل ایم ڈیل کا خیال کرو کہ اس کو اپنی تصانیف کے معاوضہ میں کیسی عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی ایسا مسز السکوتھ نے اپنی تزک (آپ بیتی) کے لئے تیرہ ہزار پونڈ اور مسٹر اے۔ ایم ہچنسن کو اس کے ایک ناول If Winter Comes کے عوض تیس ہزار پونڈ نہیں حاصل ہوئے؟ کچھ عرصہ ہوا ایک ناشر کتب کمپنی نے مسٹر لائڈ جارج کو تین لاکھ الفاظ کی ایک کتاب کے لئے نوے ہزار پونڈ پیش کئے۔ سر آرتھر کینن ڈائل نے بارہ افسانے

ئرجن میں اس نے شرلاک ہومز کو پھر زندہ کیا ہے، نو ہزار پونڈ وصول کئے۔ مسٹر چرچل کی علمی تصانیف کی آمدنی ایک
ت معقول رقم ہے اور یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ ان کو بعض خاص مضامین کے لئے ہر مضمون پر ۲۵۰ پونڈ کا صلہ
ا گیا"

کیا اس قسم کی فیاضانہ قدردانیوں کی امید ہندوستان میں بھی کبھی کی جاسکتی ہے؟ غریب مصنف کو مشکل سے
نا موقعہ ملتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی تصانیف کو چھپوا سکے تا بمعاوضہ چہ رسد! اس کے لئے اس غریب کو رُوسا
امرا کی خوشامد اور والیان ریاست کے درباروں میں جبہ سائی کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر بشرطِ "انتساب" صرف
ہوائی کے اخراجات ملجاتے ہیں۔

عربوں کا اکتشافِ امریکہ
کلمبس سے پہلے

یورپ کے بعض فضلا، عرصے سے اس بات کے مدعی ہیں کہ کلمبس سے پہلے مسلمان عربوں نے امریکہ کو دریافت
یا تھا سب سے پہلے ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" میں اس بات کا اعتراف کیا کہ کلمبس کو ابن رشد
کتاب پڑھکر اس کی تصانیف کے لاطینی متراجم عرصہ تک یورپ کی درس گاہوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ اکتشاف
ریکہ کا خیال پیدا ہوا پھر بیروت کے ایک عیسائی نوفل آفندی نے اپنی کتاب "صناجۃ الطرب" میں ملطبرون کے
رافیہ کے حوالہ سے لکھا کہ اندلس کے ایک عرب قبیلہ نے اطلانتک پار کا سفر کر کے چھٹی صدی میں دریافت کر لیا۔

حال میں اس کے متعلق ایک تازہ شہادت یورپ کے ایک محقق نے بہم پہونچائی ہے جو نہایت مستند اور
ابل تردید ہے۔ چار سال کا عرصہ ہوا ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لیوتیز۔ ([illegible] - [illegible]) نے
یقہ و اکتشاف امریکہ" کے نام سے ایک کتاب ۳ ضخیم جلدوں میں شایع کی ہے، اس کتاب میں مصنف نے امریکہ کے
ریوں ([illegible] - [illegible]) کی زبان میں عربی الفاظ کے وجود کا پتہ چلایا ہے۔

مصنف مذکور ۲۶ زبانوں کا ماہر ہے اور چند سال ہوئے اس نے امریکہ کے ہندیوں کی زبان سیکھنا شروع کیا
ہے تاکہ وہ اُن الفاظ کو دریافت کر سکے جن سے ان ہندیوں تک پہونچنے والی قوموں کا سراغ لگایا جاسکے چنانچہ اس
ن میں اُسے انگریزی، اسپینی، اور پرتگال الفاظ ملے اور ان سب سے قدیم تر عربی الفاظ تھے مصنف نے اپنی

کتاب کو شائع کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان عربی الفاظ کی تاریخ سنہ ۱۲۹۰ء تک پہونچتی ہے یعنے کولمبس کے امریکہ پہونچنے سے دو برس قبل۔

بعض محققین یہاں تک کہ گئے ہیں کہ ازد اور مایا کی آبادیاں خالص عربی تھیں یہ دونوں عربی نو آبادیاں ہیں جو امریکہ میں سنہ ۱۱۵۰ء کے درمیان قائم ہوئی تھیں۔ عربوں کی آبادی افریقہ میں نویں صدی عیسوی میں اپنے اوج کمال پر پہونچی ہوئی تھیں جہاں سے وہ جنوب کی طرف بڑھتی ہوئی منڈنگو تک مغربی افریقہ اور وہاں سے شواکان تک پہونچ گئی جو خلیج میکسیکو (Mexico) کے کنارے پر واقع ہے یہی دونوں مقام ہیں جہاں امریکہ کی زبان میں عربی الفاظ کے آثار پائے جاتے ہیں یہ وہ وہی الفاظ ہیں جو قدرتی طور پر فاتح کی زبان سے نکل کر مفتوح کی زبان میں (مثل طبی اور سیاسی الفاظ کے) باقی رہ جاتے ہیں جب عربوں کا تعلق امریکہ سے یک لخت منقطع ہوگیا تو ازد اور مایا کی آبادیاں بھی برباد ہوگئیں کہ وہ عربوں کے تجارتی تعلقات پر مبنی تھیں۔

سائنس کی حدود

یورپ کا مشہور سائنس داں ڈاکٹر ورنن کیلوگ رسالہ "ورلڈ آف ٹوڈے" میں لکھتا ہے کہ:۔

"سائنس نے میرے ضمیر کی شناخت سے متعلق مجھے کچھ بھی واقف نہیں کیا، اور مجھے نہیں بتایا کہ میں کس لئے گیت بناتا اور گاتا ہوں یا موسیقی کے خوشگوار ترانوں سے متاثر ہوتا ہوں ہوائے اس دلیل کے کہ میرے آبا و اجداد ایسا ہی کیا کرتے تھے چنانچہ میں نے بھی یہی باتیں ورثہ میں پائی ہیں۔ مگر میرے بیش روؤں کی نسبت بھی یہ معما ایسا ہی لاینحل رہ جاتا ہے۔

سائنس نے مجھے نہیں بتایا کہ میں اپنی چھوٹی بچی سے اس قدر شدت کے ساتھ کیوں محبت کرتا ہوں اور نہ یہ بتایا کہ میں شعر کس لئے کہتا ہوں (اگر میں کہ سکوں) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے میرے اس سوال کا جس کو میں بار بار پیش کر کے جواب کے لئے اصرار کرتا رہا ہوں کوئی جواب نہیں دیا۔ کہ مجھ میں ایک فانی روح ہے یا نہیں؟"

کیا خدا نے اپنے برگزیدہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے نہیں کہ دیا کہ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (قرآن مجید)

تیرہ سو برس کے بعد سائنس کی زبان سے اس عاجزی و بیچارگی کا اظہار مغربی سائنس کے فداکاروں کے لئے تازیانۂ عبرت سے کم نہیں ہے!

ادبیات

ایک دوست کی شادی پر

مبارکباد کا پہلا خط

یہ ادبی مضمون ہمیں جناب محمد یوسف صاحب قیصر مدیر ظل السلطان بھوپال کی جانب سے موصول ہوا ہے جس کی پہلی شق مسئلہ ازدواج پر تحقیر آمیز مغربی خیالات ایک ہندوستانی خاتون کی مترجمہ ہے دوسری شق خود جناب قیصر صاحب کی رہین منت ہے۔

قیصر صاحب نے جس خوبی و عمدگی سے اصل خط کے ساتھ دوسرا خط چسپاں کیا ہے وہ نہایت کامیاب اور اس قابل ہے کہ اس کی ضرور داد دی جائے لہٰذا ہم شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے قارئین "زبان" کے ذوق ادب سے بھی داد چاہتے ہیں۔

(اڈیٹر)

دوست!

اب تمھاری شادی ہو گئی ہے۔ جس وقت میں نے یہ الفاظ سنے میں ٹوکیو (جاپان) کے ایک خوبصورت ہوٹل میں بیٹھی ہوئی چاپی رہی تھی اس طرح جیسے جی گھبرا جانے کے بعد روح جسم سے علیحدہ کر لی جاتی ہے میں نے بھی چاء کی پیالی تشتری میں رکھدی۔

تمھیں یاد ہوگا، موسم بہار کی ایک لطیف شام کو دریائے نیل کے کنارے پر تم بجری کہانیاں پڑھ رہی تھیں اور میں تمھیں کسی ایک بات پر ستا رہی تھی اور تم ہنسے کھیل رہی تھی اور ہم دونوں شادی اور ازدواجی زندگی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، ہاں خیال کرو، اگر تمھیں وہ شام ذرا بھی یاد ہو؟ - !!

جب مجھے اس کا خیال ہوا، اور یقین بھی ہو گیا، کہ اب تم نے اپنے جذبہ خودداری، مستقل مزاجی، اور "

ٰاری اشاروں، کو فنا کر کے خاک میں ملا کیے ازدواجی زندگی میں قدم رکھا ہے (جس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے
ـ قسم کی نوکری قبول کر لی ہے) تو میرا لوہے کی مانند گرم دل، برف کی مانند سرد ہو کر پگھلنے لگا۔ تحلیل ہونے لگا!
خیر جو کچھ تم نے کیا، اپنے ہی لئے کیا ہے وہ اچھا کیا ہو یا برا کیا ہو مگر میں ...... جس کے متعلق تمھارا یہی یقین
ٰکہ ایک سچی دوست ہوں صرف یہی کہوں گی کہ خدا تمھیں نوازے اور امن دے اور جیسا میں نے موسم بہار
ٰاس خوبصورت شام کو دریائے نیل کے کنارے کنارے، شادی کو (اپنے خاص نقطۂ نظر سے) ایک قسم کا جرم اقرا
ٰخدا تمھیں صبر دے کہ جرم کی مرتکب بن کر تم ،، راہِ نجات ،، تلاش کرنے کی بیہودہ کوشش نہ کرو، اور نجات
ٰمل کرنے کی آرزو کو اس طرح بھول جاؤ، جیسے جانور عمر کی زیادتی سے اپنی حقیقی اولاد کو بھول جاتے ہیں۔
نے غلطی کی اور مبتلا ہو سکیں، جرم کیا اور مجرم بن گئیں، کوئی مضائقہ نہیں مگر اس کی کیا ضرورت تھی کہ تم مجھے
ٰاپنے اس جرم سے آگاہ کر دیں؟ مجرم فطرتاً اپنے جرم کی پوشیدگی چاہتا ہے، مگر شاید یہ سچ ہو کہ شادی کے بعد
ٰان احمق بن جاتا ہے اور تم لوگوں سے پوشیدگی کا مادّہ اس طرح مفقود ہو جاتا ہے جیسے کسی پودے کے سوکھ
نے کے بعد زمین پر اس کا کوئی نشان موجود نہیں ہوتا!!

آخر تم نے اپنے جرم سے مجھے آگاہ کر ہی دیا! ہاں مجھے ...... جو پچھلے چند دنوں سے ٹوکیو میں مطمئن زندگی
ٰر کر رہی تھی بے امن اور قدرے سراسیمہ کر دیا۔ میرا وہ نفس، جو گذشتہ چند مہینوں سے مطمئن تھا ایک طویل آہِ سرد
ٰمیں تبدیل ہو گیا۔

اگر حقیقتاً شادی امن، مسرّت، محبت، قدر دانی کا نام ہے تو میں پوچھتی ہوں۔ اس میں نجات اور امن کی کوئی شکل
ٰں نظر نہیں آتی، دوست! تم بُرا نہ مانو تو میں ضرور کہوں گی، ایک بات ضرور پوچھوں گی کہ جب مریض کے دو
ٰبیب ہوتے ہیں تو علاج کا نتیجہ موت ہوتا ہے پھر ازدواجی زندگی کے متعلق کیا رائے دیتی ہو جب دونوں کی زندگیاں
ٰ شادی جاتی ہیں تو نتیجہ کیا ہوتا ہے، وہی نا جو دو طبیب والے مریض کا ہوتا ہے، یہی، ناکامی، مایوسی، بے امنی،
ٰقدری، اور بے لطفی؟ آہ۔

زندگی میں سب سے زیادہ قابلِ غور مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ہم زندگی کیوں کر بسر کریں نہ یہ کہ محبت کیوں کریں۔
ٰکا خیال نہ کرو کہ محبت کس سے کی جائے میرا خیال ہے کہ وہ شخص جس نے نہ صرف اپنی غریب زندگی پر بلکہ تمھاری
ٰری حیات پر بھی ظلم توڑا اسے ذرا سوچے تو اسے بھی معلوم ہو جائے کہ اس نے حقیقتاً تم سے محبت کر کے شادی نہیں کی
ٰبلکہ اس نے تم سے محبت کر کے تمھاری تحقیر کی ہے اور تمھیں دنیا میں رسوا کر دیا جس کا نہ اب تمھیں احساس ہے

اور نہ تمھارے شخص کو، آئندہ تم نے ایک ایسے راستہ کو اپنے لئے پسند کیا ہے جس کی کوئی منزل مقصود نہیں اور تم اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاؤگی!! ـــ تم غریب ـــ!!

جب میں اپنے شادی شدہ دوستوں کی زندگی کا خیال کرتی ہوں تو نہ صرف میرا جسم بلکہ میرا دل، میرے حواس، میری سوچ سب لرز جاتے ہیں اور میں ایک صوفے پر گر پڑتی ہوں، پھر مجھے اُس وقت تک کسی قسم کی خبر نہیں ہوتی جب تک کہ میری خادمہ مجھے میری کی صبح ڈاک نہ لائے یا شام کے ملاقاتیوں کے متواتر کارڈ نہ دکھائے کہ وہ ملاقاتی کمرے میں میرا انتظار کر رہے ہیں!

دوست! دل چاہتا ہے کہ تم پر خوب خفا ہوں مگر خیال صرف اتنا ہے کہ تم زیادہ قابل رحم ہو اور میں اس ہستی کو زیادہ چھیڑنا نہیں چاہتی جسے کشمکش حیات سے آئندہ فرصت ملنے کی کوئی مشکل نظر نہ آئے۔

سچ کہنا اب تم کیسی ہو، زندگی کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے، تم نے تو کبھی مجھ سے اس شخص کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ تعارف کرایا جس نے تمھاری، ایک نامعلوم طور پر، ایک غیر احساس انداز میں تحقیر کی ہے

شادی ایک احمقانہ شجاعت ہے مردکی، اور عورت کی ایک پوشیدہ چال ہے کہ جب وہ مرد کا مضحکہ اڑانا چاہتی ہے تو اس سے شادی کر لیتی ہے مگر وہ ذرا غور کرے، اپنی آپ وہ کتنی تحقیر کرا لیتی ہے! کیوں کہ میرا پختہ یقین ہے کہ عورت کی بدترین تحقیر اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی کی بی بی بن جاتی ہے۔

لو دوست خدا تمھارا نگہبان رہے، تمھارے امن کے لئے میں دعا کروں گی اور مجھے اس کا بھولے سے بھی انتظار نہ ہوگا کہ تم نجات کا خوبصورت راستہ آئندہ ٹٹولتی نظر آؤگی، شرم ـــ!

مس حجاب اسمٰعیل،

(دی پاس (لین تھم)

دوسرا خط

مکرم دوست! آپ کا خط مجھے اسوقت موصول ہوا جبکہ میں پیرا کے ایک زرنگار ہوٹل میں اپنے احباب کی دلچسپ گفتگو میں شریک تھا، میں نے خط پڑھا اور پھر پڑھا اور بار بار پڑھا جس میں آپ نے مجھے اپنی شادی کا مژدہ سنایا ہے مجھے ایک تعجب انگیز مسرت ہوئی کہ میرے دوست نے اپنی غلطی کا احساس کر لیا گو یہ احساس کسی قدر تاخیر سے ہوا، اب آپ ایک مکمل انسان بن گئے، یعنی تکمیل انسانیت کے لئے عورت و مرد کی شخصیتوں کی باہمی امتزاج اور رفاقت کی ضرورت ہے اور آپ نے اس ضرورت کو پورا کر لیا، اور اب آپ ناکامی مایوسی، بے امنی کے خارزار سے نکل کر امن

مسرت، محبت، قدردانی کے اس سر سبز گلزار میں پہونچ گئے جہاں آپ اپنی زندگی کے حقیقی لطف سے لذت اندوز ہوں گے، بلکہ لذت اندوز ہو رہے ہیں کیونکہ آپ کے خط کے ایک لفظ میں شادمانی کی روح ہے، اور اس کی شاداب عبارت آپ کی شگفتگی طبیعت کی جاسوسی کر رہی ہے اب آپ بہیمیت اور بربریت کی اس تنگنائے سے جہاں مہیب اور خطرناک اسباب تھے نکل کر ایسے فردوس میں پہونچ گئے جو روحانی مسرتوں اور حقیقی شادمانیوں کا مرکز ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کو حاصل کر لیا مجھے یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ آپ کی رفیق زندگی نے ،، انکار شادی ،، کا جو معاہدہ اپنی ایک زندہ دل سہیلی سے دریائے نیل کے کنارے پر کیا تھا اور مشرقیت کی بہترین روح کو اوس دریا میں غرق کر دیا تھا۔ آج وہ معاہدہ ایک ،،پرزۂ کاغذ،، سے زیادہ حقیر ہو گیا۔ مغربی تہذیب نے جو ضیاعیان اون کے صاف و شفاف قلب پر کی تھیں وہ مشرقی روحانیت نے نقش باطل ثابت کر دیں اور حقیقت میں آپ سے زیادہ مبارکباد اور اگر سچ پوچھئے ہو تو قابل صد ہزار تحسین و تبریک آپ کی محترم خاتون ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا ثبوت اور اپنے وطن اور اپنے مذہب کی عزت کو قائم رکھا اور گو ان کی توبہ شکنی سے اون کی ایک فاضل سہیلی کو سخت افسوس ہوا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی توبہ شکنی میں ابدی راحت کا راز پنہاں ہے ؎

ٹوٹی ہے توبہ آج کسی مے پرست کی ‏ ‏ ‏ بجتی ہے گھر دیں فتح کے نوبت شکست کی

میں سمجھتا ہوں کہ مغربی تہذیب کے دست کرم نے آج مشرقی خواتین کو بھی اوس بزم ناز میں لا بٹھایا جہاں مادیت کی شمعیں ہر طرف روشن ہیں اور جہاں زندگی کا ہر لحظہ مصنوعی ملمع کاریوں میں گذرتا ہے مغربی عورت اپنے حدود نسائیت سے گذر کر اوس ہیبت ناک غار میں گرنے کے لئے تیار ہو گئی ہے جو اسی غیر مآل اندیشیوں کی ظلمات میں پوشیدہ ہے، اوس نے اپنے جنس کی سخت توہین اور تذلیل کی ہے اوس نے اپنے نوع کو تبدیل کرنے کی ناکامیاب کوشش کی، اور دیکھا جاتا ہے کہ ان اثرات نے مشرق کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی جد و جہد شروع کی ہے لیکن میں خوش ہوں کہ آپ کی اہلیہ مکرمہ جو مغربی لٹریچر سے بخوبی واقف ہیں وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے اس عزت کو برباد ہونے سے بچا لیا۔ اور اگر یہی خیال بکثرت اشاعت پذیر ہو گیا تو آپ دیکھیں گے کہ یورپ کی مجالس تہذیب میں ایک دن صف ماتم بچھی نظر آئے گی۔

عورت و مرد اپنے باہمی تعلقات کے لئے فطرتاً مجبور ہیں، اور یہی مجبوری ہے جس نے قبل اس کے کہ تمدن اور تہذیب کی بنیاد دنیا میں قایم ہو، ان تعلقات کو قائم کر دیا۔ ایسے حصۂ زمین کو فی الحال چھوڑ دیجئے جہاں تمدن اور تہذیب کے سورج کی کمزور سی کرن و شعاع بھی پرتو فگن ہے۔ ان طبقات حارہ اور باردہ پر نظر دوڑائیے۔ جواب تک

ہماری آپ کی تہذیب سے محروم ہیں اور جہاں ہماری آپ کی خودغرضی، دغابازی، جعل سازی، کذب، بطلان کا شائبہ تک نہیں ہے جن کی زندگی ابھی معصومانہ فضا میں ہے جن کی آبادی سادگی کی اصلی حالت پر ہے، وہاں بھی عورت و مرد ایک دوسرے کے شریک اور باہمی رفیق زندگی ہیں۔ شادی یا ایک عورت کے لئے ایک مرد اور ایک مرد کے لئے ایک عورت کا ہونا وہاں بھی پایا جاتا ہے اکثر جانوروں تک میں یہ احساس موجود ہے کہ وہ اپنے لئے ایک ایک رفیق زندگی تلاش کریں اور اوس کے ساتھ اپنی عمر گزار دیں، بہرحال عورت کے باہمی تعلقات ضرور ہوں گے اور جب تک اس کرہ ارض پر انسان کا آخری قدم بھی ہے اُن تعلقات کا رہنا یقینی ہے لیکن اکثر نوجوان دل و دماغ میں یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ شادی مرد کی "احمقانہ شجاعت" اور عورت کی ایک پوشیدہ چال ہے، اوس کی بنیاد حماقت اور خودغرضی پر ہے لیکن اگر آج اس حماقت کو بے نقاب کر دیا جائے اور عورت کی اس پوشیدہ چال کو پہچان جائے تو آپ دیکھیں گے کہ تمدن انسانی میں ایک ایسا زلزلہ پیدا ہو جائے گا جو ایک دن اس کی عمارت کو ڈھا دے گا۔ وہ زمانہ کس قدر مضحکہ انگیز نہ ہوگا جب کہ عورتوں کی تمام جنس مردوں سے بے نیاز ہو کر اپنی ایک دنیا الگ[1] قائم کر لے گی، جہاں اون کی "پوشیدہ چال" کا نام و نشان نہ ہوگا۔ اور مردوں کی کُل نوع عورتوں کی شرکت سے الگ ہو کر اپنی زندگی بسر کریں گے جہاں اون کی "احمقانہ شجاعت" بالکل بے اثر رہے گی، اوس وقت نظام کائنات اور انسانی آبادی اور اون کی تعداد پر موت کی نیند مسلط ہو جائے گی اور یہ دُنیا کے فنا ہونے کا ایک آخری نظارہ ہوگا۔

لیکن آپ ہنسیں گے کہ یہ خیالات میرے ہی دماغ کے افکار خصوص ہیں جو عورتیں کہ شادی کی مخالف ہیں اور جو مرد کہ اس سے انکار کرتے ہیں اُن کو ان حالات سے کوئی تعلق نہیں نہ اُن کا مدعا یہ ہے کہ عورت و مرد حالت تجرد میں زندگی گزاریں بلکہ اون کا مقصد یہ ہے کہ قدرت کی اُن حسین اور نازک بدن تیلیوں کو صرف ایک ہی پھول پر قناعت نہ کرنا چاہئے بلکہ دنیا کی فردوس میں ہر پھول اون کے واسطے اپنی آغوش تمنا کو کُھلا رکھے اور یہی حالت مردوں کی ہو۔

---

[1] امریکہ میں عورتوں نے اپنی ایک نوآبادی الگ قائم کی ہے جہاں مرد کا وجود تو درکنار اوس کا نام تک نہیں لیا جاتا تھا۔ کوئی نر جانور نہیں رکھا جاتا تھا تمام انتظام حکومت او متعلقات حکومت عورتوں ہی کے ہاتھ میں تھے مگر دو ایک برس کے بعد یہ احساس پیدا ہوا کہ مرد کی ضرورت فطرتاً ہے اور بغیر اوسکے قدوم میمنت لزوم کے انسانی فردوس دوزخ سے بدتر ہے، مجبور ہو کر چند مردوں کو وہاں آنے کی تکلیف دی گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ سوائے عورت کے اور انتظام حکومت اور کاروبار ریاست میں ہاتھ نہ لگائیں اور نہ دخل دیں ۱۲۔

خط بہت طویل ہوگیا اور آپ میری فضول تحریر کا غالباً مضحکہ اوڑائیں گے لیکن اس سے میری غرض ہے کہ اگر آپ
اسب سمجھیں تو اپنی اہلیہ معزمہ کی خدمت میں میرے خط کا یہ حصہ یا اوس کا اقتباس پیش کردیں میں اون کی عزت
تا ہوں آپ کے ساتھ شادی کرنی نہیں بلکہ اس معاہدہ کے شکست کی اون کو خلوص قلب سے مبارک باد دیتا ہوں
ں اون پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا ہوں کہ یہ ابدی راحت ہے اپنے معاہدہ کی شکست سے نظام کائنات کی شکست
بچالیا۔ اون کو معلوم ہوگا کہ اون کی زندگی اب شروع ہوئی ہے، مسرت کے اثرات اب اون کے دل و دماغ
و شاداب اور شگفتہ رکھیں گے۔ وہ دیکھیں گی کہ محبت اپنے حقیقی معنوں میں اون کا کیسا شاندار خیر
قدم کر رہی ہے عشق کی جلوہ آرائیاں اون کے لئے اب کس قدر پر کیف خمار آگین ہوں گی۔ اور آپ بھی معلوم کرینگے
دنیا میں امداد باہمی کا پہلا اصول اور اتحاد باہمی کا پہلا رکن یہی ہے، آپ نے اپنی اور اپنی بی بی کی دنیا کو روشن
دیا اور اپنے دل و دماغ پر قابو پالیا جو اب آپ کے لئے محبت اور خلوص کے خزانے پیش کرے گا اور آپ کی
دگی کو ہمیشہ تازہ اور سرسبز رکھے گا۔

اس خط کے ساتھ جو ہدایات ابپیش کئے جاتے ہیں اگرچہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ آپ اور آپ کی اہلیہ محترمہ کی
دل میں کوئی وقیع جگہ حاصل کرسکیں لیکن جب میرا خلوص قلب اور میری نیازمندی اس میں شامل کردی جائے تو میں
ین کرتا ہوں کہ آپ ان کو قبول فرماکر مجھے ممنون اور مسرور فرمائیں گے۔

قیصر از بھوپال

رباعیات امجد

(جناب سید احمد حسین صاحب امجد)

(بیکسی)

غم دیدہ پہ کون رحم فرماتا ہے،
اس تن کے سیہ خانے میں کون آتا ہے
لے، کیے بس اک دم ہے ہمدم اپنا
وہ بھی کبھی آتا ہے، کبھی جاتا ہے

(اعتبار حال)

آثار سے ظاہر ہے کہ میں بندہ ہوں
سرتابقدم حدوث کا پتلا ہوں،
کیا تھا کیا ہونگا، اس سے کیا حاصل
مجھکو تو یہ دیکھنا ہے میں اب کیا ہوں

امجد

تسلیم و رضا

(سر رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم کا ترجمہ)

طالب: شکوہ نہ کیا میں نے اے یار کبھی تجھ سے — لے لیتا ہوں ملتا ہے جو کچھ بخوشی تجھ سے
میں حرص سے مستغنی بندہ ہوں قناعت کا — وسعت سے نہیں واقف دامن میری حاجت کا

مطلوب: اے سائل نرگس تو اخلاق کا پتلا ہے — معلوم ہے سب مجھ کو جو کچھ ترا منشا ہے
ہے مانگ رہا مجھ سے دنیا کی ہر اک شے تو — دربار میں منعم کے اک طالب کل ہے تو

طالب: مل جائے اگر تجھ سے اک مجھ کو گلِ خنداں — آراستہ ہو جائے ایوانِ دل ویران

مطلوب: بخشش کا اگر میری تو آشنا ہے دلدادہ — کیا خارِ مغیلان بھی لینے کو ہے آمادہ؟

طالب: ہاں ان کو بھی میں اپنے سینہ میں جگہ دونگا — پُر لطف خلش اُن کی میں شوق سے سہ لونگا

مطلوب: اے سائل نرگس تو۔ اخلاق کا پتلا ہے — معلوم ہے سب مجھکو جو کچھ تیرا منشا ہے
ہے مانگ رہا مجھ سے دُنیا کی ہر اک شے تو — دربار میں منعم کے اک طالب کل ہے تو

طالب: صہبائے مسرت سے پیمانۂ دل بھر دے — صرف اک نظر میرے چہرے کی طرف کر دے
صدقہ میں ان آنکھوں کے میں دادِ وفا پاؤں — وہ موت مروں جس میں جینے کا مزا پاؤں

مطلوب: پُر لطف نگاہوں سے دنیا ہو اگر خالی — ہوں قہر بھری آنکھیں گر مائل پامالی

اُن کو بھی بصد ارماں لبیک کہوں گا میں — تیروں کی طرح دل میں چھبنے انھیں دونگا میں۔

معلوم ہے سب مجھکو جو کچھ تیرا انشا ہے — خود منھ سے نہیں کہتا کس شے کی تمنا ہے
ہے مانگ رہا مجھ سے دنیا کی ہر اک شے تو — دربار میں منعم کے اک طالب کل ہے تو

جناب منشی ایشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی

انقلاب

عبرت آموز ہے گل کاری ایواں جہاں — جس کا ہر نقش تغیر کا پتہ دیتا ہے
حیرت افزا ہے عجب شاہد فطرت کا طلسم — کہ جو انسان کو مبہوت بنا دیتا ہے
خاک صحرا سے نکلتا ہے ہوا کا جھوں کا — چرخ پہ ابر کا اک فرش بچھا دیتا ہے
جلوۂ برق وہ رکھتا ہے نہاں سینہ میں — موتی پیشانی عالم پہ گرا دیتا ہے
صحن بستاں میں نسیم سحری کا انداز — غنچہ کو خواب پریشاں سے جگا دیتا ہے
دیدۂ مہر جہاں تاب۔ مژہ سے اپنی — پردۂ شب رُخ گیتی سے اُٹھا دیتا ہے
دور باطل میں جو اُٹھتا ہے کوئی شیر خدا — نعرۂ حق سے وہ دُنیا کو ہلا دیتا ہے
آہ جانسوز سے ظلمت کدۂ عالم میں — جلوۂ برق جہانتاب دکھا دیتا ہے
زلف دوران میں وہ مشاطۂ فطرت بن کر — اک لڑی گوہر مقصد کی بڑھا دیتا ہے
اس کا ہر تار نفس باد تمنا بنکر — دل شگوفہ کی طرح سب کے کھلا دیتا ہے
صفحۂ دل پہ جو ہوں جور پرستی کے نقوش — صورت حرف غلط ان کو مٹا دیتا ہے

درد ملت کا جو آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو
رُخ گیتی پہ عجب غازہ چڑھا دیتا ہے

محمود اسرائیلی

جذبات سلیم

(از جناب وحید الدین صاحب سلیم پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

تجھ کو نہ دیکھ سکنے پہ قربان ہوں بنشین
تجھ کو نہ جان سکتے پہ صدقے ہوں دانشین

تیری نگاہِ شوخ کی تاثیر کیا کہوں
جسموں میں زلزلے ہیں تو روحوں میں لرزشین

چہرہ ہے زرد دیدۂ و دل عشق میں ہیں خون
یاد آئیں گی یہ حسن کی رنگیں نوازشین

پامال کرکے دی مجھے رحمت سے مخلصی
ہر نقشِ پا پہ تیرے ہوں رحمت کی بارشین

تیرے جمال کا ہے نگاہوں پہ یہ اثر
تاروں پہ ناچتی ہیں ستاروں کی تابشین

کیا دور ہے کہ زیر و زبر کرکے دہر کو
محشر بپا کریں تری پلکوں کی جنبشین

عذرِ خطا کریں بھی تو کیوں کر خطا شعار
سانسوں میں لرزشین ہیں زبانوں میں لغزشین

پھولوں کو رنگ و بو دیا گوہر کو آب و تاب
قدرت کی ہر محل پہ نرالی ہیں بخششین

دو چار گام پر کہیں تھک کے رہ نہ جائیں
تیری طلب میں دوڑتی پھرتی ہیں کوششیں

ہر حرف ایک شعلہ ہے ہر لفظ اک شرر
دل کے ورق پہ غم نے یہ کی ہیں نگارشیں

میدان حشر کیا کوئی دنگل ہے اے خدا
کرنی پڑیں جو مجھ کو عبادت کی ورزشیں!

آگے سے ہٹ تو اے خس و خاشاکِ عقل و ہوش
پنہاں ہیں میرے دل میں محبت کی سوزشیں

کشتی صبر الٹ گئی اے موجِ اضطراب
کب تک رہیں گی یہ تیرے طوفاں کی شورشیں؟

محور نہ علم کا ہوا گر ذات ذو الجلال
بے کار ہیں عقل کے پہیوں کی گردشیں،

لپٹے ہوئے یہ سب تھے غلاف سحاب میں
کھولی ہیں ارتقا نے ستاروں کی بندشین

کافی ہے ان کو برق تجلی کی اک لپک
پرواز پر ہیں اپنی ملائک کو نازشین،

لالہ کا کھیت ہے مرے دیوان کا ہر ورق
اللہ رے میرے خونِ جگر کی تراوشین

دل کے صنم کدہ میں دکھایا جو تو نے رخ
پندار کے بتوں مٹا دیں پرستشین

پھونکا ہے تیرے شوق نے کیا نغمۂ فریب
دل کی فضا میں ناچتی پھرتی ہیں خواہشین

مت کھا فریبِ باغِ جہاں کی بہار کا ہیں یہ سرابِ رنگ کی ساری نمائشیں
آہوئے دل کو میرے نہ تو کر سکا شکار اے شیرِ نفس دیکھ لیں اب تیری لغزشیں
آنکھیں حصارِ دل کے ہیں دو در کھلے ہوئے کیوں کر ہوں بند فوجِ تمنا کی یورشیں

میری نظر میں ہیچ ہے عالم کا التفات
بل بے تری نگاہِ تغافل کی پرسشیں

کویل سے

طائرِ زیبا ہے تو بے شک اے میری دلربا خیر مقدم دل سے اے کویل ترا کرتا ہوں میں
آم کی ڈالی پہ جب ہوتی ہے تو نغمہ سرا کان ہر دم خوشنوائی پر تری دھرتا ہوں میں

نیلگوں نہرِ رواں کے اُس کنارے جس گھڑی میں فقط ہوتا ہوں تنہا محوِ سیرِ بوستاں
چھائی ہوتی ہے فضا میں ایک پُرغم خامشی فرشِ سبزہ پر میں جا کر لیٹ جاتا ہوں وہاں

توڑتی ہیں قُفلِ خاموشی کو آوازیں تری قالبِ بیجاں میں گویا میرے پڑ جاتی ہے جاں
آہ اے فرقت زدہ تو درد و غم سے ہے بھری ایسی تنہائی میں ہے تو ہمنوائے عاشقاں

تری کو کو نالہ ہائے عاشقِ دلگیر ہیں تیرے نغموں سے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے کھنچا
آہ یہ نالے ترے ہر بار پُر تاثیر ہیں کیوں ہے اس آواز میں سوز و گداز اتنا بھلا

گونجتے ہیں تیری آوازوں سے دشت و کوہسار چھوڑ جاتی ہے ہوا میں تُو اشاراتِ غنا
جُھنڈ میں آموں کے جب آ بیٹھتی ہے بار بار کیا ہی وہ دلچسپ ہوتا ہے سماں اے دلربا

ہاں یوں ہی کُو کُو کئے جا طائرِ شیوا بیان مرحبا اے مرغِ خوش الحانِ ایامِ بہار!
کیوں نہ اختر مدح پیرا ہو ترا جانِ جہاں لے کے آئی ہے تو اپنے ساتھ پیغامِ بہار

(اختر جوناگڑھی)

اخبارِ علمیہ

عربی شعر کی قدامت

بلادِ یمن کے پُرانے کھنڈروں میں سے کسی ایک کھنڈر میں ایک عربی قصیدہ دستیاب ہوا ہے جو عادی خط میں منقوش ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ قصیدہ تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح کندہ ہوا ہے۔

وحدتِ لسانی وطن سامی میں

سنہ ۱۸۸۹ء میں تل العمارنہ میں مابین منیا واسیوط جو اثوری کتبات پائے گئے ہیں ان کو پڑھ کر پروفیسر سائلیس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مصر سے بنی اسرائیل کے خروج سے پہلے، مصر، شام اور عراق کے علماء اور اہل سیاست کی زبان اثوری تھی۔ گویا ازمنۂ قدیمہ میں تمام سامیوں کی ایک ہی زبان تھی۔

ایک عظیم الشان فلکی دوربین

اجرام سماوی کے معاینہ کے لئے دنیا کا سب سے زیادہ عظیم الشان اور قوی دوربین وہ ہے جو بمقام وکٹوریہ (برٹش کولمبیا) قائم کیا گیا ہے۔ اس کا وزن ۵۵ ٹن ہے۔ آج تک انسانی آنکھوں سے تقریباً ۵۰۰۰ ستارے دیکھے جا چکے ہیں۔ مگر اس جدید دوربین کے ذریعہ تیس کرور ستارے معلوم ہو چکے ہیں۔ اس دوربین کی نلکی اتنی بڑی ہے کہ اس میں سے ایک موٹر بآسانی گزر سکتا ہے۔ اس قدر عظیم الشان ہونے کے باوجود اس کے بالائی حصہ پر صرف ۵ پونڈ کا وزن اس کو متحرک کر دیتا ہے۔

اس کا شیشہ دنیا کے تمام دوربینوں سے بڑا ہے جس کا قطر چھ فٹ ہے۔ اور اس کے کنارے بارہ انچ موٹے ہیں۔ اس شیشہ کو صاف و شفاف بنانے اور اس کے مرکز میں ساڑھے دس انچ کا سوراخ کرنے میں کئی ماہ صرف ہوئے ہیں۔ اس شیشہ کا وزن ۲ ٹن ہے۔

امریکہ میں موٹروں کی لاگت

ریاست ہائے متحدہ کے محکمہ صنعت وحرفت کے موٹروں کی صنعت سے متعلق جو اعداد فراہم کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں دو کروڑ موٹروں کی تیاری پر ڈیڑھ ارب اسی کروڑ پونڈ سالانہ لاگت آتی ہے۔
امریکہ والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ روپیہ بیجا نہیں صرف ہوتا کیونکہ ملک کا بڑھا ہوا تجارتی کاروبار، دولت وثروت اور اسباب کی خریداری انہیں موٹروں کی بدولت ہے کہ انہی کے ذریعہ اسباب کے فوری حمل ونقل میں بڑی سہولت ہے۔

دنیا کا قدیم ترین درختِ گلاب

ہلڈیشیم (جرمنی) میں ایک درخت ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین گلاب کا پیڑ ہے جو کلیسائے پولش کے تمام مشرقی رخ پر چھایا ہوا ہے۔ کلیسائے مذکور کے دفتر میں ایک ہزار برس پہلے سے اسکی نشوونما اور حفاظت کے طریقوں سے متعلق حوالے پائے جاتے ہیں۔ اس درخت کی جڑیں کلیسائے مذکور کے نیچے کے مقبرہ تک نظر آتی ہیں۔

طاعون میں حفظ ماتقدم

ازمنہ قدیمہ میں لہسن کو جو غالباً مشرق سے ممالک مغربیہ میں پہونچا ہے کئی امراض میں بطور علاج استعمال کیا جاتا تھا۔ جالینوس اس کو دیہات والوں کا علاج کہتا ہے۔ حکیم براکلوس (مصنف اسباغرایا) طاعون سے محفوظ رہنے کے لئے اس کو بہترین علاج بتایا ہے۔ ایک اور نامور طبیب لہسن کو ناشتہ میں استعمال کرنے کی ہدایت دیہات والوں کو کرتا ہے کہ اگر وہ لہسن کی چند ڈلیاں روٹی اور مسکہ کے ساتھ استعمال کریں تو وہ تمام کام کرنیکے قابل ہوسکیں گے جن کے لئے قدرت نے ان کو وضع کیا ہے۔
کاٹھیاواڑ کے اکثر شہروں اور دیہات میں ہر سال موسم سرما میں لہسن کو مختلف غذاؤں کے ساتھ کھانے کا عام رواج ہے۔

دریائی گھونگھوں سے ریشم

برلن (جرمنی) کے دو مشہور ماہران سائنس ڈاکٹر پی او۔ ہرزوگ اور ڈاکٹر جی، کے نامک
کہ انھوں نے سبز و سُرخ ٹڈّوں، زنبوروں اور دریائی گھونگھوں کے سروں اور پنجوں سے مصنوعی ریشم
ان حشرات الارض میں ایک طرح کا لیسدار مادہ ہوتا ہے جس کو "جترن" (
اس کو باریک سوراخوں والے آلات میں سے نکال کر اس کی ڈوریاں بنالی جاتی ہیں۔ یہ ڈوری نہایت
اس کی بناوٹ اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ اس سے کپڑا بھی بُنا جاسکتا ہے۔

تصحیح

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۲	طلب منفعت	جلب منفعت	۱۱	۱۹	معزول	معتزلی
۳	۸	سنہ ۱۷ھ	سنہ ۸۱۷ھ	۱۳	۲	علم الجر	علم الجبر
۴	۹	سنہ ۸۷ھ	سنہ ۸۸۷ھ	۱۳	نوٹ	حر بن یقظان	حی بن یقظ
۸	۱۱و۱۲	زائد ہیں قومیں نہ ہونی چاہئیں		۲۴	۲	ہر وقت	ہر دہ
۹	۲	قرون اول	قرن اول	۲۶	۱۰	اس قدم کا نقش قدم	اس قسم کا ن
۱۰	۱	کری	کسریٰ	۲۸	۸	مگر ہیں	مگر اس پر
۱۰	۱۰	اکابرہ	اکاسرہ	۳	۱۴	قومیں ہیں جہانیاں جہانگشت کی	
۱۰	۱۶	عیسیٰ	عیسائیون			خلیفہ جہانیاں جہاں گشت	
۱۱	۱۶	موسیو روزی	موسیو دوزی	۳۸	۱۰	بجائے سٹیج پر کے اسٹیج پہ	

یا قادر

غزلیات

(جناب محمد شفیع صاحب شفیع اکبرآبادی)

آج برہم قلب کی آواز ہے — کیا یہ آوازِ شکستِ ساز ہے
بے سکون وہ محوِ خوابِ ناز ہے — میرا نالہ دور کی آواز ہے
مطربِ ناطق تری آواز ہے — تو سراپا اک نوائے ساز ہے
مائلِ پرواز پہلے تھا خیال — اب قفس خود مائلِ پرواز ہے
قابلِ عزت سہی دیر و حرم — تیری بزمِ ناز بزمِ ناز ہے
یوں سمجھئے وحدت و کثرت کا راز — ہیں صدائیں مختلف اک ساز ہے
کر نہ ظاہر میرا رازِ عاشقی — تو بھی تو آخر کسی کا راز ہے
دل کی دھڑکن سے جب آتی ہے صدا — میں سمجھتا ہوں تری آواز ہے
اک ادا ہے یہ تغافل بھی ترا — بے نیازی بھی تری اک ناز ہے
سحر ہیں پیکر میں دو آنکھیں تری — اور باقی ہے جو کچھ، اعجاز ہے
تو نہیں، اک راز ہے تخلیق کا — دل نہیں، پردہ سرائے راز ہے
میرے سجدوں کا نہیں ملتا مزاج — عرش ہے یا آستانِ ناز ہے
آہ سناٹا ہے پچھلی رات کا — یا کسی مایوس کی آواز ہے
کیا حقیقت منکشف ہو راز کی — اب حقیقت خود اسیرِ راز ہے

میرے دل پر داغ ہے جو اے شفیع
تازہ تصنیفِ نگاہِ ناز ہے

(عبدالرحمٰن خوشتر منگروی ایڈیٹر رسالہ ہذا)

کہا میں نے تو پھر اس کا مزا کیا
تمھیں کہدو ہے میرا مدعا کیا

کہیں کیا جب وہ ہم پر مہرباں تھا
اٹھائے زندگی کے لطف کیا کیا

ستاؤ مجھ کو جی بھر ستاؤ
نہ نکلے حوصلہ وہ حوصلہ کیا

تمھارا اک نظر بس دیکھ لینا
تمنا دل کی ہے اس کے سوا کیا

کہانی خواب کی تھی زندگانی
کہیں کیا آہ دیکھا کیا سنا کیا

ہے کیا کہنا نظر جس پر ہو تیری
تو پوچھے جس کو اس کا پوچھنا کیا

سناتے ہی رہے ہم قصۂ غم
وہ کہتے ہی رہے ہر بار کیا کیا؟

تمھیں ہم پیار سے گر دیکھتے ہیں
برائی اس میں ہے آخر بھلا کیا

میری غرض تمنا سن کے اس نے
کہا جھنجلا کے پھر کہئے کہا کیا؟

کیا گر ہم نے وصف زلف پیچاں
بگاڑا بندہ پرور آپ کا کیا؟

کہیں کیا عہد برنائی کی باتیں
نہیں معلوم وہ تھا خواب یا کیا

مجھے الفت ہے ان سے ان کو نفرت
نہیں کھلتا ہے آخر ماجرا کیا

کوئی اس بت پہ دے کر جان دیکھے
فنا کیا چیز ہے اور ہے بقا کیا

شب تنہائی تو کھیل کھیلئے کچھ
ہٹاؤ پردہ ہے شرم و حیا کیا

ہے عالم سوز کیوں ہر سمت منظر
فغاں کرتا ہے کوئی دل جلا کیا

تمنا ہے۔ نہ پوری ہو تمنا،
ہو پورا مدعا وہ مدعا کیا

جگر میں ٹیس کیوں اٹھتی ہے خوشتر
کوئی بھولا ہوا یاد آگیا کیا

زبان

جلد ١ | فہرست مضامین ماہ اکتوبر سنہ ١٩٢٦ء | نمبر ٤

زبان خلق

مشفقم جناب عبدالرحمٰن صاحب ۔ السلام علیکم
پ کا رسالہ زبان اور لفافہ ملے میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا مجھے افسوس ہے کہ میں
پ کے رسالہ زبان کی علمی مدد نہیں کرسکتا کیونکہ میں یکم ستمبر کو ولایت جارہا ہوں، بہرحال آپ کے رسالہ کے
طالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس کی تیاری میں کافی محنت سے کام لیا ہے اور امید ہے کہ ذرا سی
شش سے رسالہ ہندوستان کے اچھے ادبی رسالوں میں شمار ہونے لگے گا۔
موجودہ نمونہ یہ توقع دلاتا ہے کہ بہت جلد آپ نہایت اعلیٰ درجہ کا رسالہ پبلک کے سامنے پیش کرینگے

راقم خاکسار
محمد ناظم (پروفیسر ہسٹری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) از بمبئی

مکرم بندہ زاد لطفکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ
شاء اللہ بارک اللہ، بہت خوب رسالہ نکالا مگر افسوس کاٹھیاواڑ بہت نااہل ہے اگر حضرت شیخ صاحب
نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بالقابہ) یا ولیعہد صاحب (بہادر) کی امداد شامل حال رہی تو انشاء اللہ
سالہ چلے گا محض خریداروں کے بھروسے پر یہ ضروری کام نہیں چل سکتا ......
عنوان کا بیت یوں چاہئے

لقد وجدت مکان القول ذا سعۃ   فان وجدت لسانا قائلا فقل

اور یہ کہ یہ بیت متنبی کا ہے نہ کہ اعشیٰ کا۔
صفحہ ادارت پڑھکر بہت خجل ہوا میں ہرگز اتنا کام کا نہ تھا جتنا کہ آپنے جذبہ ہموطنی سے متاثر ہو کر ظاہر کیا ہے
ہرکیف آپکے حسن ظن کا مرہون احسان ہوں اور آپ کو اپنے بلند اور نیک ارادوں میں کامیابی بخشنے میں بہت غیر مطمئن
ون انشاء اللہ اکتوبر کے آخر تک شاید کوئی قلمی خدمت کرسکوں امید کہ آپ میرے ہجوم اشغال پر نظر کرکے معذور
ضرور فرمائیں گے۔ (مولینا) میمن **عبدالعزیز** (پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) از راجکوٹ

نکات

(از ضیاء الملک ملا رموزی جرنلسٹ فاضل الہیات)

کہتے ہیں کہ آجکل جو شخص ۔ پائنیر ۔ انگلش مین، اور بمبئی ٹائمز ۔ پڑھ سکے، دوستوں کو بجائے اُردو زبان
گریزی میں "مائی ڈیر" لکھ سکے، اور اُردو زبان میں آدھی سے زیادہ انگریزی ملا کر گفتگو کر سکے ۔ وہ "تعلیم یافتہ"
ام علوم اور زبانیں جاننے والے ۔ ابوجہل

اب سوال یہ ہے کہ اچھا اگر "تعلیم یافتہ" سے مراد صرف انگریزی دانی ہے تو ذرا ان انگریزی خوانوں اور دانوں
ل و فراست کا اندازہ کر لیجئے پتہ چل جائیگا کہ یہ ان کی "تعلیم یافتگی" کہاں تک "تعلیم یافتہ" بنانے کی صلاحیت
ں ہے ؟

مان لیجئے کہ عقل و فراست آج کل کے ۔ اسکولوں ۔ کالجوں ۔ اور یونیورسٹیوں سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ
توپچھ، دیوبندی وضع کے ۔ حجروں ۔ مکتبوں ۔ مدرسوں اور مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر اور ہل ہل کر پڑھنے ۔
ں، عربی اور دینی علوم کی تحصیل ہی سے پیدا ہوتی ہے، اس فقرے سے پیشانی پر بل ڈالکر تنتھنے تو پھلایئے
ں بلکہ سیدھی طرح سُن لیجئے کہ اگر عقل و تعلیم ۔ کا مقصد یہی ہے کہ آپ اپنی تمام قومی و مادری خصوصیات کو ترک
ے دوسری قوموں کی خصوصیات کو اختیار کر لیں، اور اپنی آبائی تہذیب و طرز معاشرت کی ہنسی اُڑائیں تو یہ
ے "تعلیم یافتہ" ہونے کا کوئی قابل تعریف ڈپلوما نہیں ۔ بلکہ آپ کے "نرے کندہ نا . . . . ہونے
عدالتی سند ہے ،

ہم نے تو آپ کو اسکولوں ۔ کالجوں، اور، یونیورسٹیوں میں اس لئے بھیجا تھا کہ آپ کے دماغ علوم جدیدہ
عالم آرا روشنی سے منور ہوں گے، اور اس روشنی کے صدقہ میں آپ "اصلاح و تخریب" کے فرق کو محسوس
رہم دقیانوسی کسانوں" کی اصلاح فرمائیں گے، ہماری زبان کو ترقی دیں گے ۔ ہمارے لباس سے محبت کرینگے،
ی رسم و رواج کو عروج دیں گے ۔ ہمارے مذہب کی خدمت و حفاظت کریں گے، کیونکہ یہی اور صرف یہی وہ
خصوصیتیں اور علامتیں ہیں قوموں کی جن کے بقاء و عروج سے قوم ۔ قوم کہلاتی ہے، لیکن ہمنے تو یہ دیکھا

کہ جب آپ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے "تعلیم یافتہ" ہو کر نکلے تو ہمارے وہ "ننھے میاں" اور ننھے میاں "ہی نہ رہے جو کالج جاتے وقت تھے، بلکہ جب آئے تو خاصے آئرلینڈ کے لاٹ پادری کا وہ خول پہنے آئے جس کے اندر نہ آپ کی۔ قومی زبان نظر آئی نہ آپ کا لباس، نہ آپ کا رسم و رواج دیکھا نہ مذہب کی توقیر و پابندی۔ پھر تعلیم یافتہ ہو کر اپنی قومی و مادری زبان۔ لباس۔ رسم و رواج کو ترک کر دینے والا ہی۔ تعلیم یافتہ۔ کہلائے جانے کا مستحق ہے؟ یا "انگریزی یافتہ"؟

اسکولوں۔ کالجوں۔ اور۔ یونیورسٹیوں۔ سے ہر سال نونہالانِ قوم کی جو کثیر تعداد "فارغ التحصیل" یا "تعلیم یافتہ" ہو کر نکلتی ہے اُس میں کتنے ہوتے ہیں جو "بین الاقوامی مسائل" کے معلم اور عقدہ کشا ہوتے ہیں کتنے ہوتے ہیں جو ملازمانی جہنم میں جھونک دیئے جاتے ہیں اور انسانیت کے جملہ فرایض کو بھول جاتے ہیں کتنے ہوتے ہیں جو غریب اور بے کس مسلمانوں کی اخلاقی، اجتماعی، دینی۔ اور ذہنی۔ اصلاح و ترقی پر اپنے۔ دماغ۔ وقت۔ اور۔ دولت کو صرف کرتے ہیں؟ کتنے ہوتے ہیں جو ناموس امت یعنی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی اعانت و سرپرستی فرماتے ہیں؟

یہ وہ سوالات ہیں جو کالجوں کے ہر بر خود غلط "تعلیم یافتہ" سے کیئے جانے کے قابل ہیں لیکن اگر آج یہ سوالات ہمارے انگریزی یافتہ طبقہ سے کر دیجئے تو جو جوابات ملیں گے وہ یہ ہوں گے؛
کالج سے نکل کر۔ ملازمت کرتے ہیں، بے کس اور مجبور مسلمانوں پر اکڑ کر حکومت کرتے ہیں شکار کھیلتے ہیں، موٹر خریدتے ہیں ٹینس، کرکٹ۔ اور ہاکی کھیلتے ہیں سی۔ آئی۔ ڈی بنکر اپنے قومی بھائیوں کو بٹے گھر۔ پہونچاتے ہیں، کوتوال اور سب انسپکٹر بنکر شریفوں کی عزت لیتے ہیں قومی لباس و زبان کو نفرت و ذلت سے دیکھتے ہیں کیئے کیا بڑا کرتے ہیں؟؟؟

خیال تھا کہ صحبت کا اثر لازمی ہوا کرتا ہے جو بچہ درجہ الف سے۔ ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی تک خالص علمی ماحول اور درس گاہ میں بھاڑ جھونکتا رہے اس کے اندر علمی مذاق پیدا ہی نہیں بلکہ طبع ثانی ہو کر رہے گا، لیکن ہمارے موجودہ "انگریزی یافتہ" حضرات میں جس قسم کا "علمی مذاق" پیدا ہوتا ہے اس کا نمونہ یہ ہے کہ فیشن ایبل

مکان کے ایک نظر فریب کمرے میں قیمتی الماریوں کے اندر انگریزی کی بے شمار کتابیں رکھی جاتی ہیں کیونکہ آجکل کتابوں سے آراستہ الماریاں - اور کوئی رنگین جاناز کمرہ میں رکھنا داخل فرنیچر ہے، لیکن کوئی پوچھے کہ کیوں حضوران - ملٹن اور شکسپیئر کی مطلا و مذہب کتابوں میں غریب مادری زبان اُردو کی کتنی قدیم و جدید کتابیں ہیں؟ تو بجائے معقول جواب کے انسلٹ کہہ کر بگڑ جائیں گے؛ پھر مصیبت پر مصیبت یہ ہے کہ ایسے ہی ڈپٹی کلکٹرانہ زندگی والی آخر عمر میں قوم کے لیڈر ہی نہیں - بلکہ "مولانا" بھی ہو جاتے ہیں، اب یہ تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت ہے یا "گھوڑ دوڑ" کا؟

کالجوں اور سکولوں میں - اُردو املا، لکھنے کی جگہ املا اور دینیات کے گھنٹہ میں - پانی پینے کے بہانے سے بھاگ جانے کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ہماری روزمرہ گفتگو میں آدھی سے زیادہ انگریزی داخل ہو رہی ہے، ہم اُردو خطوط میں بجائے مشفقی و مکرمی - لکھنے کے - مائی ڈیر - اور ڈیر سر - لکھنے کے عادی ہو رہے ہیں اور آج نول کشور پریس کی وہ "انشائے مادہورائے"، کوئی چھدام میں نہیں خریدتا جس میں مشرقی آداب و القاب لکھے گئے تھے، ہمیں اُردو اخبارات اور رسالوں سے محبت کی جگہ نفرت ہے، ان حالات کا اثر یہ ہے کہ ہماری ملکی و مادری زبان اُردو کا خاصہ مُسلفہ ہو رہا ہے اور ہم اس "انگریزیت" پر خوش ہی نہیں بلکہ مغرور بھی ہیں، یہ ہے غلام دماغی کی اُس آب و ہوا کا نتیجہ جس میں ہم روزانہ بلا امپ کے سانس لیتے ہیں۔

جمعیۃ الاقوام واقع جنیوا سوئزرلینڈ میں دوسری حکومتوں کی طرح مملکت ہند زیر سایہ برطانیہ کیطرف سے ہر سال ایک عدد نمایندہ جایا کرتا ہے، پچھلے سال لالہ لاجپت رائے جو ہندوستان میں ہندی زبان کو ملک کی مشترکہ زبان بنانے کے حامی اور اُردو زبان کے نیم ادیب ہیں اس مجلس میں مزدوران ہند کے نمایندہ بنکر گئے تو مجلس کے تمام شرقی و غربی نمایندوں نے دیکھا کہ لالہ جی اپنے ملک کا بنا ہوا کپڑا کھدر ڈانٹے ہوئے ہیں، لیکن جب آپ نے تقریر شروع کی تو وہ ان کی ملکی و مادری زبان میں نہیں تھی بلکہ - انگریزوں کی زبان تھی، اب پچھلے ستمبر میں پنجاب کے مایہ ناز فرزند اور اُردو زبان کے دیرینہ سرپرست خان بہادر شیخ عبد القادر بیرسٹرایٹ لا رسابق ایڈیٹر مخزن، وزیر تعلیمات جو اس مجلس میں گئے تو امید پیدا ہوئی کہ آپ کسی طرح بھی لالہ جی کی پیروی - اختیار نہ کریں گے اور اپنی پیاری مادری زبان ہی کو استعمال کریں گے؟ لیکن اغلب یہ ہے کہ جمیعۃ الاقوام

کے۔لال بنہ نمایندوں سے شیخ مرعوب ہوکر انگریزی ہی بول اُٹھیں گے، یہی حال ہمارے رہنمائے اعظم حاجی محمد علی و شوکت علی صاحب کا ۔موتمر مکہ ۔میں تھا کہ آپ نے موتمر میں بجائے اُردو کے انگریزی زبان میں تقریریں فرما ڈالیں، اور ایک حجازی نے ان انگریزی تقریروں کا ترجمہ عربی میں کرکے موتمر میں پیش کیا، کیا اگر مولانا محمد علی اُردو میں تقریر کرتے تو مولانا سید سلیمان علامہ کفایت اللہ علامہ عبدالحلیم پھلواری اور مولانا عرفان اس کا عربی ترجمہ موتمر میں پیش نہیں کرسکتے تھے؟ حالانکہ دُنیا کی ہر بین الاقوامی مجلس میں اُس کے نمایندوں کو سرکاری زبان نہ جاننے کی صورت میں اُن کی مادری زبان میں اظہار خیال کی اسی طرح اجازت ہوتی ہے جس طرح ہندوستان کے انگریزی ہائی کورٹس میں محررین کو اُردو، ہندی، بنگالی اور گجراتی۔ بولنے کی حاصل ہے، پھر ایسی صورت میں کہ ہندوستانیوں کے پاس اُن کی کوئی ملکی و مادری زبان تک نہو کیا ہم اونھیں حیوان مطلق۔ کہہ سکتے ہیں؟

---

۱۵ اگست ۱۹۲۶ء کو زیر صدارت ڈاکٹر عبداللطیف ۔ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد "آندھیرا ایجوکیشنل کانفرنس" کا اجلاس منعقد ہوا اس خالص علمی مجلس میں ڈاکٹر صاحب نے جو عالمانہ خطبہ ارشاد فرمایا وہ اپنی علمی خوش نیابیوں کے لحاظ سے ممتاز و مختص ہے اس خطبہ میں ڈاکٹر صاحب نے "آندھیرا یونیورسٹی" کے قانون پر جو بحث فرمائی اُس سے یہ معلوم ہوا کہ آندھیرا یونیورسٹی نے اپنے تمام انتہائی درجوں میں۔ اُردو زبان۔ کی تعلیم کو اس صوبہ کی دوسری زبانوں کے مقابل درجہ اور امتیاز عطا کیا ہے اور یہ قانون۔ مدراس لیجسلیٹو کونسل سے باقاعدہ پاس ہوچکا ہے اسی طرح میسور یونیورسٹی نے بھی اُردو زبان کو بطور ایک مستقل مضمون کے درجہ ایم۔ اے۔ کے امتحان کے لئے منظور کرلیا ہے اور میسور میں ایک مستقل اُردو کالج۔ کی تجویز زیر غور ہے لیکن ایک سات کروڑ مسلمانوں کی "مسلم یونیورسٹی" ہے جہاں سے اُردو کے گھنٹہ میں نہ فقط طلبہ ہی بھاگ جاتے ہیں بلکہ اُس کے ہاں اُردو پروفیسر اور اُردو ریڈر زنجیر تک کے پتہ نہیں (وہ سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم لکھنؤ، یعنی روایت کیا اسکو سید جالب دہلوی نے پنج اخبار ہمدم اپنی کے۔) اب اُردو زبان کے ساتھ ہمارے بچوں سے لیکر لیڈروں نمایندوں اساتذہ تک کا جب یہ سلوک ہو تو کہنا چاہیئے کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

صفحۂ ادارت

باوجود انتہائی سعی و کوشش کے رسالہ اپنے وقت پر نہیں نکل سکتا اس کا ہمیں سخت ملال ہے اگرچہ ہم فراہمی مضامین سے عہدہ برآ ہو کر ٹھیک وقت پر رسالہ مرتب کر کے مطبع کو بھیج دیتے ہیں پھر بھی اہل مطبع اپنی شان بے نیازی دکھائے بغیر نہیں رہتے۔

ہر چند یہ تعویق کہ ستمبر کا نمبر آخر نومبر میں شائع ہوا خریداروں کو بددل اور پریشان کرنے والا ہے لیکن ان سے زیادہ ہمیں اس امر کا احساس ہے اگرچہ مطبع کی دوری اور اہل مطبع کی بے پروائی کا علاج ہماری دسترس سے باہر ہے۔

انہی دشواریوں کو مدنظر رکھ کر اکتوبر و نومبر کا یہ مشترکہ نمبر دوچند ضخامت پر نکال کر تلافی مافات کرتے ہیں اگرچہ اردو جرائد کا یہ عیب خصوصی عیب ہے مگر مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے ساتھ ہی کوشش کریں گے (اگر پھر اہل مطبع نے شان بے نیازی سے کام نہ لیا) کہ دسمبر نمبر بھی اگر آخر دسمبر تک نہیں تو شروع جنوری تک قارئین کرام کی خدمت میں پہنچ جائے، اس طرح ممکن ہے ہم وقت کی پابندی کر سکیں ارادۃ اللہ غالب علی ارادۃ الناس۔

اگرچہ دنیائے صحافت میں ہمارا یہ پہلا قدم ہے مگر اس قلیل عرصہ میں ہمیں جن دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اور جو جو تجربات حاصل ہوئے ہیں ان کو ملحوظ رکھ کر ہم یہ کہنے پر آمادہ ہوئے ہیں کہ دنیا سے سچی ہمدردی اگر کلیۃً مفقود نہیں ہوئی تو نایاب ضرور ہو گئی ہے نمائشی ہمدردی اور ظاہری خیر خواہی روز بروز وسعت پذیر ہوتی جاتی ہے۔

ثبوت میں اگر ہم اپنے قیام ممبئی (دسمبر سنہ ۲۶ء) کے بعض اہم واقعات قلمبند کریں تو انسانی افعال و خصائل کا ایک عجیب و غریب دفتر اور علم النفس میں جدید مگر دلچسپ معلومات کا اضافہ ہو جائے مگر ہم ان واقعات کے اظہار سے قارئین "زبان" کی تضییع اوقات کرنا نہیں چاہتے اس لئے ان کو نظر انداز کر کے صرف اسی پر اکتفا کرتے

ہیں کہ

ہم نہ سمجھے تھے یہ ظاہر داریاں
تیری باتوں نے بڑا دھوکہ دیا

بمبئی سے لگ بھگ ایک سو ایسے خریداروں کے وی۔پی واپس آئے ہیں جنھوں نے ہمیں روبرو ویلو روانہ کرنے کی اجازت عطا فرمائی تھی، ان کی اس "ستم ظریفی" سے دفتر کو ناقابل برداشت نقصان اٹھانا پڑا ہے لہٰذا ان سے اگر وہ ان سطور کے دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں) التماس ہے کہ اس وقت اگر کسی سبب سے آپ رسالہ کی اعانت نہیں فرما سکے تو اب از رہِ کرم مبلغ چار روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر دفتر کے اس عظیم نقصان کی تلافی کر دیں۔

ہمیں گذشتہ نمبر ہی میں ان معاونین کرام کا جنھوں نے اپنے بیش بہا عطایا سے "زبان" کو نوازا ہے اور جنھوں نے رسالہ کی توسیع اشاعت میں ہمیں کافی مدد دی ہے شکریہ ادا کر دینا چاہئے تھا لیکن بعض ابتدائی مراحل کی انجام دہی کے سبب اب تک قاصر رہے امید کہ معاونین کرام معاف فرمائیں گے۔

معاونین کی فہرست میں تمام تر ایسے حضرات کے نام ہیں جنہیں اُردو سے بہت کم تعلق رہا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اُردو جانتے ہی نہیں ہیں تو حقیقت سے بعید نہ ہوگا اس کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کے دلوں میں قومی درد اور اپنے وطنی بھائیوں (اہل کاٹھیاواڑ) کی پستی کا احساس اور ملک میں اُردو کو عام رواج دینے کا خیال بدرجہ اتم موجود ہے۔

سب سے بڑی بات جس کا ہمیں فخریہ اظہار کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہمارے معاونین سب کے سب منگرول والے ہی ہیں اور منگرول کی حالت بھی مقابلتاً منگرول اور کاٹھیاواڑ کے دیگر اپنے ہمقوم بھائیوں سے کچھ زیادہ تسکین بخش نہیں ہے۔ لیکن محض قومی ہمدردی کی بنا پر اور اس خیال سے کہ اپنے وطن سے ایک اُردو رسالہ کا اجرا عمل میں آیا ہے رسالہ کی سرپرستی و معاونت فرماتے ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہمارے مخلص دوست جناب محمد خاں گلاب خاں صاحب (منگرولی) ٹیمبر مرچنٹ سنبل پور ہیں جنھوں نے ہمارے خیال کو عملی جامہ پہنانے میں سبقت فرمائی ہے صرف ہمارے عزم اجرائے رسالہ کا سن کر فوراً دو ذریعہ تار ڈیڑھ سو روپیہ روانہ فرما کر اپنی ہمدردی و علم دوستی کا ثبوت دیا اور آیندہ بھی بہت کچھ توقع دلائی ہے۔ اسی طرح مکرمی جناب سیمن اسحاق محمد (منگرولی) اینڈ کمپنی ٹیمبر مرچنٹ بمبئی نے ایک سو روپیہ مرحمت فرما کر ہماری حوصلہ افزائی اور آیندہ بھی اعانت کا وعدہ فرمایا اور ہمدرد ملک و قوم جناب سید واصل میاں صاحب (منگرولی) نے بھی کھمبات سے پچاس روپے روانہ فرما کر اپنی ملکی و قومی کا ثبوت دیا ہے جن کے ہم بیحد ممنون ہیں۔

جناب اے۔ ایس۔ ولی بار ایٹ لا (بمبئی) کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انھوں نے پچیس مرحمت فرمائے اگرچہ ہم کو آپ کے مشاغل علمی کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ قدردانی کی امید تھی۔

اس سلسلہ میں دس دس روپے کی رقم دینے والے چند قدردانوں کے اسمار کا اظہار کر دینا بھی غالباً بیجا نہ ہوگا۔ جناب محمد میاں صاحب، نجم الدین میاں صاحب (منگرولی) جناب سید مصطفےٰ میاں بعز میاں اور جناب سید عبداللہ میاں جعفر میاں۔

جن کاٹھیاواڑی حضرات نے باوجود متمول و مقدرت کے اب تک اپنے اس ملکی رسالہ کی اعانت نہیں فرمائی وہ توجہ فرمائیں کہ یہ رسالہ بغیر کسی سرمایہ کے محض آپ کی فیاضی کی امید پر جاری کیا گیا ہے اگر آپ نے اس کی اعانت میں کوتاہی اور عدم توجہی سے کام لیا تو رسالہ مالی مشکلات سے تنگ آکر بند ہو جائے گا تو اس کی تمام ذمہ داری آپ کے سر ہو گی۔ ہم نے ملک کے ایک گوشہ سے صدا بلند کی لیکن افسوس کہ چند اہل وطن کے سوا کسی نے سماعت نہ فرمائی۔

ہم نے اپنا فرض ادا کیا آپ اپنا فرض ادا کریں

رسالہ کا سالانہ خرچ بارہ سو روپیہ ہے اور ہمیں اب تک صرف سوا سو خریدار بہم پہنچے ہیں اسلئے ملک کے

متمول ذمہ دار افراد سے ہم اسکی اعانت کے طالب ہوئے ہیں اگر صرف تین سو خریدار ہم پہنچ جائیں تو ہمیں کسی اعانت کی ضرورت نہ رہے ہاں بارہ سو سے زاید رقم جمع ہو جانے پر ہم رسالہ کی ظاہری و معنوی خوبیوں میں اضافہ کر سکینگے۔

ہمنے گذشتہ اگست نمبر میں ملک کے نامور اہل قلم حضرات سے مضامین کی درخواست کرتے ہوئے معاوضہ دینے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ مالی حالت کے درست نہ ہونے پر ہم انکی خدمات سے آبتک محروم ہیں ان سے معذرت کرتے ہوئے نہایت ندامت سے ملتجی ہیں کہ رسالہ کے سنبھلنے تک قلمی اعانت سے ہاتھ بٹائیں رسالہ کی مالی حالت درست ہونے پر ہم اپنی بساط بھر آپ کی خدمات سے دریغ نہ کرینگے

یہ بات کسی سے بھی مخفی نہیں ہے کہ مخدومی خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ جہاں اسلام کی بہت کچھ ناقابل فراموش و لائق مدحیین خدمات انجام دے رہے ہیں وہاں اشاعت اُردو کے بھی سچے ہمدرد وہمدرد ہیں اور دل سے اس کی ترویج و تبلیغ کے خواہاں ہیں حال میں ہماری خوش نصیبی سے خواجہ صاحب موصوف بسلسلہ تبلیغ اور ہندی ترجمہ قرآن مجید کے چندہ کی فراہمی کی غرض سے کاٹھیاواڑ کے مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے ۱۰/ اکتوبر ۲۶ء کو منگرول میں بھی تشریف لائے تھے اس موقع پر مدیر رسالہ کو آپ کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہوا رسالہ دیکھکر بہت پسند فرمایا اتنا ہی نہیں بلکہ اشاعت اُردو کے خیال سے "زبان" کو خریداری کا بھی شرف بخشا اور اپنے دیگر ہمراہیوں کو بھی اس کی خریداری کی طرف توجہ دلائی اور کاٹھیاواڑ میں جہاں گئے اسی کا ذکر خیر فرمایا۔

کیا اب بھی اہل کاٹھیاواڑ کو اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس نہ ہوگا کہ ایک غیر کاٹھیاواڑی اور بھی ایسا شخص جس کی خدمت میں زبان سے بہتر ہندوستان کے کئی رسالہ ہدیتہً پیش ہوتے ہیں وہ "زبان" کی اس لئے نہیں کہ وہ زبان اردو کا ایک رسالہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک ایسے مقام سے نکلتا ہے جہاں اردو کو رواج دینے کی سخت ضرورت ہے مدد کرنا اپنا اور ہر اردو داں کا فرض سمجھتا ہے۔ یہ خواجہ صاحب ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جس کو اشاعت اُردو کی اہمیت کا احساس ہے زبان کی امکانی

ے دریغ نہ کرے گا۔

کس قدر افسوس ہے کہ چند دیسی ریاستوں میں جہاں سالہا سال سے تمام دفتری کارروائی اُردو میں
رتی تھی وہاں اب اس کی حریف ہندی زبان میں ہوتی ہے اور آئے دن جس سُرعت کے ساتھ اسکو
رتی ہو رہی اور جس سرگرمی سے ہمارے ہندو بھائی اس کو اوج کمال پر پہنچانے میں جدوجہد کر رہے
ں وہ محتاج بیان نہیں۔

کیا ہمنے بھی اپنی وطنی اور مادری زبان "اردو" کو وسعت دینے کی کوئی نمایاں اور عملی کارروائی کی ہے؟

ہمارے مخلص دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب اخترؔ جوناگڑہی اور مکرمی مولانا عبدالستار صاحب
روقی زبردست قلمی اعانت کے علاوہ زبان کی توسیع اشاعت میں بھی بڑی سرگرمی سے حصہ لے رہے
ں جس کے لئے ہم ان کے بیحد ممنون ہیں۔

اڈیٹر

التجا

طبع الم نواز دے ذوقِ فغاں طراز دے
یعنی دلِ فسردہ کو تابِ نفس گداز دے

سردہیں سارے ولولے آتشِ شوق پھونک کر
سوزِ دروں کو پھر مرے قوتِ شعلہ ساز دے

نقشِ عبودیت جو تھے اب ہیں وہ کچھ مٹے مٹے
شانِ فتادگی بڑھا، بیخودیِ نیاز دے

رنگِ بہارِ دہر کا نذرِ سموم ہو چکا،
موجِ نسیم کر رواں ذوقِ چمن طراز دے

درخورِ لطف گر نہیں رزمیؔ خستہ و حزیں
تیری نگاہِ قہر ہی عزت و امتیاز دے

رزمی بھوپالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

مقالات

زوجیتِ عامّہ

اور

قرآن مجید

(از قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی)

از منۂ قدیمہ میں جبکہ تمدّن بشری کی ابتدا تھی نباتات کے روابط و اسرار بہت کم دریافت ہوئے تھے۔ مثلاً یہ معلوم تھا کہ درختِ خرما میں جنسِ نر و مادہ ہوتی ہے، مگر اس بات کا علم نہیں تھا کہ تمام اقسام نباتات میں ذکور و اناث پائے جاتے ہیں۔ آج سے تیرہ سو برس پیشتر قرآن کریم نے اس نظریہ کو دنیا سے روشناس کرایا کہ "زوجیت عامّہ" یعنی جنسیتِ نر و مادہ تمام نباتات میں موجود ہے:-

وَاَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ (سورۂ حج) اور ہر جنس نباتات کو تر و تازہ اگاتا ہے،

مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (سورۂ رعد)	تمام میووں میں سے اس نے جوڑے بنائے ہیں۔

نباتات کے علاوہ بھی قرآن مجید ہمیں ایسی چیزوں میں جنسیت اور زوجیت کی خبر دیتا ہے جنکو ہم نہیں جانتے۔

سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ (سورۂ یٰس)	پاک ہے وہ (خدا) جس نے ہر اس چیز سے جوڑے پیدا کئے جنکو زمین اگاتی ہے اور انسانوں میں سے، اور ان (مخلوقات) میں سے جن کو وہ نہیں جانتے۔

بلکہ اس کا دعویٰ تو یہاں تک ہے کہ:-

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (الذاریات)	اور ہر چیز سے ہم نے جوڑا پیدا کیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو

باوجود ان روشن اور واضح تر بیانات کے لوگ اس نظریہ سے نا آشنا رہے۔ مگر جب علم الحیات اور علم نباتات نے ترقی کی زینہ پر قدم رکھا اور حکمائے اسلام تحقیقات علمیہ کی طرف متوجہ ہوئے تو نباتات میں جنسیت نر و مادہ کی حقیقت پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی چنانچہ آج اس بات کو زمانہ حال کے تمام نباتیین اور شجارین تسلیم کرتے ہیں اور علم اشکال الاعضار (morphology) کا ہر ایک ماہر جانتا ہے کہ پیش رستہ (Prothalium) پودوں میں اعضائے جنسیہ ہوتے ہیں جنکو اصطلاح میں تخم خانہ (archegonia) اور زر خانہ (Antheridia) کہتے ہیں اور یہ دونوں ہمصورت (Homosphorous) فرن[۵۱] کی قسم کے پودوں میں یکجا، اور مختلف قسم کے تخمدان والے (Heteresphorous) پودوں میں ذکور و اناث پیش رستہ میں پائے جاتے ہیں[۵۲]۔

---

۵۱ بے پھول جماعت کے چوبی درختوں کی قسمیں جن کے دستی ملائم ہوتے ہیں۔

۵۲ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ "بوٹنی"

لیکن جمادات اب تک اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ حال ہی میں روس کے ایک نامور سائنس داں مینوایلوف (Manuilofe) نے، جو انسانوں حیوانوں اور نباتات میں جنسیت کی تحقیق کر رہے تھے اس اہم نظریہ کا انکشاف کیا ہے کہ "جمادات میں بھی جنسیت پائی جاتی ہے!

ڈاکٹر مینوایلوف لینن گراڈ (روس) کی "انجمن معالجۂ نفسی" کے ایک سربرآوردہ رکن ہیں، اور حال میں انہوں نے اپنے تازہ انکشافات پر انجمن مذکور میں ایک تقریر کی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ تازہ اختبارات نے اُن پر یہ ثابت کر دیا کہ بلور (Crystal) کی دو خاص شکلوں ہشت پہلو اور مکعب میں جنسیت پائی جاتی ہے، چنانچہ اس نظریہ کی مزید توثیق و تصدیق کے لئے انہوں نے بالکل سائنٹفک طریقہ پر مختلف قسم کی گیارہ معدنیات کا تجربہ کیا، اور ہر تجربہ کا یہی نتیجہ برآمد ہوا[1]۔ اس طور پر جمادات میں جنسیت کے وجود کا یقینی ثبوت مل گیا۔

نباتات کی جنسیت کے نظریہ کو حکمائے اسلام نے تحقیق کیا اور جمادات کا مسئلہ محققین یورپ نے حل کیا۔ اس طرح مشرق و مغرب نے مل کر قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق کر دی؛ وَلِلّٰہِ درّ من قال:

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنه افهام الرجال

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نظریۂ علم و حکمت کو ایک اُمّی (فداہ ابی و اُمّی) نے کس طرح دنیا کے سامنے پیش کیا؟ لیکن کیا یہ بین ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ قرآن مجید مُنزّل من اللہ ہے جس کو پروردگار عالم نے اپنے برگزیدہ بندہ کے ذریعہ نازل فرمایا؟ اور کیا اس سے وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی اور اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی کی کامل تصدیق نہیں ہوتی؟

نگارِ من کہ بہ مکتب نرفت و خط نہ نوشت
بہ غمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرّس شد!

---

[1] رسالہ (Tilt. Bits) بابت ۱۶ جنوری ۱۹۳۶ء

ایران

زیر حکومت رضا خاں

از میجر ای۔ ڈبلیو پولسن نیومن

(مترجمہ جناب اکبر علی صاحب۔ بی۔ اے۔ ناظم تعلیمات ریاست منگرول)

ہماری استدعا پر جناب اکبر علی صاحب بی۔ اے (پٹیالوی)، ناظم تعلیمات ریاست منگرول نے زبان کے لئے انگریزی سے سلیس اردو میں ترجمہ کر کے عطا فرمایا ہے جس کے لئے ہم ان کے بیحد مشکور ہیں۔

موصوف کا نام اگرچہ دنیائے ادب میں نیا ہے لیکن اگر وہ اس علمی شغل کو جاری رکھیں تو یقین ہے کہ بہت جلد ایک اچھے انشا پرداز مشہور ہو جائیں۔ حال میں موصوف نے ہمارے سرپرست وآقا نواب صاحب منگرول بالقابہ (جنھیں مسلمانوں کی تعلیم کا بڑا خیال ہے خصوصاً چھوٹے چھوٹے بچوں کی ابتدائی تعلیم کو آسان بنانے کی فکر ہر وقت دامنگیر رہتی ہے) کی فرمائش سے اردو کا ابتدائی قاعدہ جدید اصول پر مرتب فرمایا ہے (جو عنقریب شائع ہو جائیگا) جس کو دیکھکر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آجتک اردو کے جتنے قاعدے لکھے گئے ہیں ان میں سے کسی کو بھی قبولیت کا شرف نہیں حاصل ہوا لیکن امید ہے کہ یہ قاعدہ سب سے بہتر ہونے کے لحاظ سے بہت جلد قبولیت کا شرف حاصل کرلے گا۔

اس قاعدہ میں سب سے بڑی خوبی علاوہ آسان اور سریع الفہم ہونے کی یہ ہے کہ بچہ بیک وقت اردو اور گجراتی دونوں زبانیں سمجھنے اور لکھنے لگ جاتا ہے اس لئے بچہ کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچ رہتا ہے۔ غرضکہ بمبئی پریسیڈنسی کیلئے یہ قاعدہ ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

اڈیٹر

مجموعاً اخباری بیانات کے جو اطلاعیں مختلف ذرائع سے موصول ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران

کی عام حالت کے بارہ میں بہت غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ ایران کی سرحدیں داخل ہونے سے پہلے مجھے کہا گیا تھا کہ ملک میں بالشویزم کا بہت زور ہے، سوویٹ گورنمنٹ ہی درحقیقت گورنمنٹ ایران ہے اور وہ بتدریج (سیاسی نہ سہی) اپنا اخلاقی اثر سرحد عراق اور خلیج فارس کی طرف بڑھا رہا ہے۔

خوش قسمتی سے میں بوثوق یہ بات بیان کرنے کے قابل ہوں کہ وہاں کی یہ حالت نہیں ہے اور مجھے اُمید ہے کہ میں اُن اصول کا کچھ خیال آپکو دلا سکونگا جن پر ایران آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہے۔

ملک ایران دراصل ایک سرسبز و شاداب زراعتی ملک ہے جس کے تمام اطراف میں میلوں تک وادیاں پھیلی ہوئی ہیں اور تمام ملک اگرچہ کوہستانی ہے لیکن اس کا ایک وسیع رقبہ قابل زراعت ہے۔ جملہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وہاں ریل گاڑیاں نہیں ہیں اور تمام تجارتی مال و اسباب کو سست رفتار قافلے ناہموار راستوں پر آرام و آہستگی سے لیجاتے ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں کے درمیان آمد و رفت بہت کم ہے۔ اگرچہ موٹر کے اجراء نے سفر میں بڑی سہولتیں پیدا کر دی ہیں جس سے آمد و رفت بڑھ گئی ہے، تاہم بعض اضلاع ایک دوسرے سے اس قدر الگ تھلگ ہیں کہ ایک حصہ میں قحط پڑ جاتا ہے دوسرے حصہ میں گیہوں پڑے سڑا کرتے ہیں۔

ایران میں ہر چیز کی رفتار نہایت سست ہے۔ مذہباً اکثر اہل ایران شیعہ فرقہ کے مسلمان ہیں علما و مجتہدین کی مذہبی جماعت کو اب بھی بڑا اقتدار حاصل ہے، اور بحیثیت مجموعی ملک میں اسلامی احساس بہت بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ تعلیم کی طرف سے اب تک بہت غفلت برتی گئی ہے۔ حال ہی میں مُلّاؤں اور غیر ملکی مشنریوں (مبلغین) نے اسے کلیتہً اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ فوج پہلے کم و بیش ناکارہ کی ایک بے قاعدہ جماعت سے زیادہ نہ تھی جو وردی پوش رہا کرتی تھی۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں "قرون وسطیٰ" کی سی فضا سرایت کئے ہوئے تھی، اور آمد و رفت کے ذرائع کی عدم موجودگی نے ترقی کے بڑھتے ہوئے قدم کو بہت روک رکھا تھا۔

اب ایران آہستہ آہستہ کروٹ بدلنے لگا ہے، اور بتدریج ارتقائی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ترقی ضرور ہو رہی ہے، اور گورنمنٹ کی عملی کارروائی اور آئین حکومت کے ماتحت قائم شدہ عام درس گاہوں کی بدولت تعلیمی حالت روبہ ترقی ہے، لوگ زیادہ روشن خیال ہوتے جا رہے ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس (جن میں جبریہ تعلیم دی جاتی ہے) کا تعلیمی نصاب وزیر تعلیمات کے ماتحت ہے۔ اور دور دراز صوبجات

تک میں مدارس قائم کردیئے ہیں۔ طہران میں فرانسیسی علوم کا ایک شعبۂ تعلیم قائم ہے جہاں طب، قانون اور سیاسیات کی سندیں عطا کی جاتی ہیں۔ با اینہمہ تعلیم کو جسقدر امداد ملنی چاہیئے اتنی نہیں ملتی، اور اگر ایرانی حکومت اشاعت تعلیم کے لئے مزید سرمایہ بہم پہنچائے تو بہت بہتر ہوگا۔

زبان فارسی کی تعلیم تمام مدارس میں لازمی ہے، قومی زبان اور قومی تاریخ کی تعلیم ہر جگہ دی جاتی ہے۔ فوج میں اصلاح کی گئی ہے اور امن عامہ کا انتظام اچھا ہے۔ بجٹ میں کچھ زائد رقم پس انداز کی جاتی ہے۔ جنگ کے بعد سے ایرانیوں کا قومی جذبہ بہت تیز ہو گیا ہے، اور معاشرتی اتحاد کے علاوہ، (جو ایرانی نسل کا امتیاز خصوصی ہے) قومی و سیاسی اتحاد کا خیال، فوج کے قیام، تعلیم اور موٹر کے اجراء سے مضبوط کیا جا رہا ہے حق بات یہ ہے کہ اہل ایران کے پاس اس وقت ایک ایسی بنیاد موجود ہے جس پر وہ ترقی کی ایک ٹھوس عمارت بتدریج قائم کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ کرلینا چاہیئے کہ یہ بنیاد غیر متزلزل ہے۔ ضرورت ہے کہ اس میں بہت احتیاط سے کام لیا جائے۔ کیونکہ وہ ابھی اتنی مضبوط نہیں ہے جو سخت صدمات کو (خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی) برداشت کرسکے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ اصطلاحات میں سب سے بڑی قوت متحرکہ رضا خاں پہلوی موجودہ شاہ ایران کی شخصیت ہے۔ جو پہلے وزیراعظم، وزیر جنگ اور کمانڈران چیف تھے۔ اگرچہ ان کے اصلی اختیارات ایک خود مختار حاکم کے برابر تھے تاہم انکو "مطلق العنان" کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ انکو اقتدار پہلے ہی سے حاصل ہو چکا تھا اور وہ مناسب آئینی حکومت کے ماتحت صاحب اختیار تھے۔ وہ اس بنائے عمارت کے "سنگ بنیاد" پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ اور انکی یہ طاقت تخت ایران پر جلوہ فرما ہونے سے بہت مستحکم ہوگئی ہے۔

فوجی جمعیت رضا خاں کی بہت بڑی مؤید تھی، اور فوجی طاقت بڑھانے کے لئے مجلس شوریٰ نے حال ہی میں ایک سخت فوجی قانون نافذ کیا ہے۔

طہران میں جن ایرانیوں سے میری ملاقات ہوئی ان کو یورپ میں تعلیم پانے، اور موجودہ سیاسی تدبر میں گہری دلچسپی لینے کی وجہ سے میں نے بہت روشن خیال پایا۔ امریکن کالج، اور ینگ پرشین سوسائٹی عام سطح خیال کو بلند کرنے میں بہت کوشاں ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آئینی تدبر کے عناصر اس وقت ملک میں سرایت کر رہے ہیں۔

اس وقت ایرانیوں کی اولوالعزمیوں کی نمایاں خصوصیت حصول "آزادی" ہے جو تمام ایرانی

حکمت عملی کا اصل الاصول ہے۔

قبل از جنگ ایران میں دو زبردست غیر ملکی اثرات تھے یعنی برطانیہ عظمیٰ اور روس۔ روسی اثر بہت زبردست تھا۔ ایرانی کاسک فوج کا دستہ (Cossack Brigade) جس کا کمانڈر روسی کرنیل تھا، اپنے منتخب روسی افسروں کے ساتھ طہران میں، دنیا کی سب سے بڑی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ ایک زبردست سفارتخانہ کے علاوہ ایک روسی بنک بھی تھا جس کا مالی اثر بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان ہر سہ ذرائع سے روسی رفتہ رفتہ اپنا اقتدار جمانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ہر صیغہ سہولت کی غرض سے سینٹ پیٹرسبرگ (پیٹروگراڈ) میں ایک علیحدہ وزارت کے ماتحت رکھا گیا تھا۔ جو مداخلت کے الزامات کی تردید کے لئے ایک ذریعہ تھا۔

برطانوی اثر جو زیادہ تر جنوب مغربی ایران تک محدود تھا، شمال میں روسی اثر کی کمی بیشی کی بدولت منتظم اور باقاعدہ ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ تک ان دو بڑی حکومتوں کا عملدر آمد پیش قدمی اور پسپائی کی دو رخی پالیسی پر تھا، اس کے بعد عدم مداخلت کا قانون بروئے کار آیا جس کی رو سے برطانیہ نے تسلیم کیا کہ وہ شمال میں اپنا اثر ڈالنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور روس اس بات پر رضامند ہوا کہ وہ جنوب میں عدم مداخلت کی حکمت عملی پر کاربند رہیگا۔ اس اثنا میں اہل ایران، طہران اور شمالی ایران پر روسیوں کے مسلسل تسلط سے بہت تنگ آ گئے تھے اور عدم مداخلت کا جو اقرار تھا وہ بالکل بے سود ثابت ہوا۔ روس اور انگلستان کے مابین ۱۹۰۷ء کے معاہدہ کا منشا بھی (جو اسی طریقہ کار پر مشتمل تھا) روس اور انگلستان کی طرح ایرانی معاملات کے بارہ میں بھی اتحاد کی پالیسی کو رواج دینا تھا۔ اس پر بھی کامیابی کے ساتھ عملدر آمد نہ ہو سکا، اور ایرانیوں نے مشترکہ انگریزی اور روسی حکمت عملی کو ناپسندیدگی سے دیکھا اور اس پر اعتماد نہ کیا۔

۱۹۱۴ء میں برطانیہ عظمیٰ اور روس آپس میں اتحادی بن گئے۔ اس لئے ایران نے درخواست کی کہ غیر جانبدار علاقہ سے روسی افواج ہٹا دی جائیں۔ لیکن یہ درخواست منظور نہ ہوئی یہانتک کہ روسی انقلاب رونما ہوا۔ اس وقت صرف برطانیہ ہی کا اقتدار ملک میں باقی رہ گیا تھا۔ لیکن اسیوقت انگریزی اور روسی اتحاد کو اپنے ملک میں دیکھ کر ایرانیوں کو یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ برطانوی اثر روسی

ے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔

دوسرا قدم وہ انگریزی ایرانی معاہدہ تھا جس نے محض ناکامیوں کی فہرست میں اضافہ کیا اور بالآخر
ن ۱۹۲۱ء میں منسوخ ہو گیا۔ ایران غیر ملکی مداخلت سے تنگ آ گیا ہے۔ وہ کامل آزادی اور
ی عدم مداخلت چاہتا ہے اور بالآخر اس کو ترقی دینے اس میں حب الوطنی کا جوش پیدا کرنے اور
ی قوی الکو حرکت میں لانے کے لئے اس کو ایک زبردست عالی دماغ مل گیا ہے۔ یہ عالی دماغ
ض فتنۂ بالشویزم کے مقابلہ میں ایران کا سب سے بڑا محافظ ہے۔

ایران جانے سے مجھے یقین ہو گیا کہ ملک میں بالشویزم کی تحریک دبتی جا رہی ہے اگرچہ روسی
ومت کے گماشتے اس بارہ میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھتے۔ تاہم میں وثوق کے ساتھ
ہ سکتا ہوں کہ ایرانی حکومت پر سوویٹ گورنمنٹ کا کچھ بھی اقتدار نہیں ہے اور بالشویزم کی بابت جیح
ر کا مطلب محض سوویٹ روس کی اس خونخوار پالیسی کو (جو کامل "عدم مداخلت" سے زیادہ کسی چیز کو
ت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی) مشتہر کر کے اس کی ہمت افزائی کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

ایران "سرخ پالیسی" سے متنفر ہے، صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ "سرخ" ہے بلکہ اس
ب سے بھی کہ وہ روسی ہے۔ اس پالیسی سے اس کی آزادی معرض خطر میں ہے ——— وہ
زادی، جو خود کو منوانے اور اپنے قیام و ثبات کے نصب العین سے برطانیہ کی ہمدردی کے ساتھ
سی بیرونی دباؤ کی زبردست محافظ ہے۔

اسلام کا شیعہ مذہب دراصل ایک ایرانی سیاسی تحریک تھی جس نے مذہبی فرقہ کی
ورت اختیار کر لی ہے۔ اور اس لئے ملک ایران روسی ہوسناکیوں کی نشوونما کے لئے مناسب
رزمین نہیں ہو سکتی۔ اہل تشیع کو مذہبی پابندی کا پورا احساس ہے جس کی نگہداشت ان کے ملا کرتے
ں۔ اس بارہ میں گورنمنٹ کی طرف سے ان ملاؤں کی ہمیشہ تائید ہوتی ہے۔ ایسے مذہب کے
لاف جس کی جمعیت کا دارومدار تمام تر قومیت پر ہو روسی حکمت عملی کامیاب نہیں ہو سکتی اور
وجودہ حالات کے اعتبار سے بہت کم امید ہے کہ سوویٹ پروپیگنڈا ایران میں بارآور ہو سکے۔ کیا
جب ہے کہ یہی پروپیگنڈا آگے چل کر قومی آزادی کی ترقی میں ایک مفید محرک ثابت ہو۔

روسی نقطۂ خیال سے ایران ہر طرح ایک اہم چیز ہے اور اگر وہ سوویٹ پروپیگنڈا کے سامنے

بر تسلیم خم کردے تو خلیج فارس اور عراق (بشرطیکہ برطانیہ میسوپوٹامیہ کو خالی کردے) سے لیکر شام اور بحیرہ روم تک راستہ صاف ہوجائے، ایران اس وقت روس اور برطانیہ عظمیٰ کے درمیان ایک بین بین کی حالت میں ہے۔ البتہ برطانیہ جنوب اور جنوب مغربی ایران کے جائز و مقررہ حقوق کی نگہداشت کا خواہشمند، اور تمام ایران کے ساتھ اپنے تجارتی تعلقات کو وسعت دینے کا اُمیدوار ہے۔ لیکن ایرانی معاملات میں وہ دست اندازی نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ اپنے معاملات کو سلجھانے میں ایران جس قدر ذمہ داری قبول کرے اتنا ہی برطانیہ کے مفید مطلب ہے۔ پس ایرانی سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کی طرف سے کبھی کوئی ناجائز دباؤ نہ ڈالا جائیگا۔ اسی طرح انہیں یقین ہے کہ ضرورت کے موقع پر برطانیہ بے غرضانہ مشورہ دینے کو تیار ہوگا۔

آزادانہ طریقوں سے ایران کی آئندہ ترقی اس کی مستقل مالی حالت اور اُس اقتصادی ترقی پر منحصر ہے جو انگلستان اور امریکہ کے مشترکہ اقتصادی اتحاد سے حاصل کی گئی ہو۔ زراعت کو ترقی دینا، آب پاشی اور آمد و رفت کے ذرائع بہم پہنچانا ملک کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہیں۔ افیون کی کاشت کے مسئلہ کو حل کرنا چاہئے اور بالآخر اس کی قائم مقام کاشت کو رواج دینا چاہئے۔ کیونکہ افیون کی پیداوار نہ صرف قوم کے لئے جسمانی حیثیت سے مضرت رساں ہے بلکہ اس کا استعمال تمام ترقی کا مانع ہے۔ اس کی مقدار اس کی قیمت کے مقابلہ میں کم ہے، اور افیون کی ایک قیمتی مقدار کا وزن اُٹھانے کے لئے ایک قلیل الجثہ گدھے کی پیٹھ کافی ہوتی ہے۔

افیون کی جگہ اور اجناس کی کاشت کو رواج دینے کے لئے آب پاشی اور آمد و رفت کے ذرائع مہیا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ جن سے کسی طرح سے ملک کو فائدہ پہونچنے کی امید ہے۔ اگرچہ زراعت کو ترقی دینے کے لئے ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ پیداوار معقول نہ ہو، اگر افیون استعمال کرنے والے ممالک جو اس کے استعمال کا انسداد کرنا چاہتے ہیں، اس کی جگہ اور فصلوں کی ابتدائی کاشت کے لئے کچھ مالی امداد دیں تو اس سے نہ صرف ان کو فائدہ ہوگا بلکہ وہ ایک وسیع پیمانہ پر ایران کی اقتصادی ترقی کا راستہ بھی صاف کردیں گے۔

ایران میں افیون کے انسداد کا مسئلہ چونکہ بین الاقوامی اہمیت رکھتا ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا گہرا اثر اُس ملک کی اقتصادی حالت پر پڑتا ہے جہاں وہ پیدا ہوتی ہے، اس لئے

مسئلہ افیون سے واقفیت حاصل کئے بغیر ایران کے اصلی اور صحیح خال وخط کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

منجملہ بائیس ۲۲ صوبجات کے ایران کے اٹھارہ ۱۸ صوبوں میں افیون پیدا ہوتی ہے، اور تقریبًا چار لاکھ مربع میل رقبہ میں (جو ملک مصر کے رقبہ سے زیادہ ہے) اس کی کاشت ہوتی ہے، علاقہ کاشت سے خارج صرف دو صوبجات ہیں جو خلیج فارس کے ساحل پر واقع ہیں، اور صوبجاتِ شمال مثلاً آذربائجان، گیلان، استرباد، خمسہ، اور کردستان ہیں۔ افیون کی تجارت پر کوئی ضابطہ قائم کرنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا ہے، کیونکہ افیون کی اقتصادی اہمیت اور اس کی تجارت میں کثیر منافع کا خیال اس کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ نیز تجارتی منفعت کے کثیر ذرائع کو کم کردینے، یا کسی خاص فرد کی آزادی میں مداخلت کرنے میں عام اور سیاسی مخالفت کا اندیشہ ہے۔

افیون کی تجارت ایران کے لئے اقتصادی حیثیت سے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ فی الواقع ایران کے متعدد صوبوں میں صرف یہی ایک فصل ہے جو کسی نہ کسی صورت میں کاشتکار کی محنت کا نقد معاوضہ دیتی ہے۔ اور کلاً یا جزاً لوگوں کی ایک کثیر تعداد کی گذر اوقات اسی کی کاشت اور تجارت پر منحصر ہے۔

اصفہان کی اسّی ہزار کی آبادی میں کم از کم پانچ ہزار آدمی ایسے پائے گئے ہیں جو اپنی آمدنی کا تمام یا ایک بڑا حصہ تجارتِ افیون کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ اور اگر انہیں سے ہر ایک فرد کے متعلقین کا اوسط تین آدمی فرض کرلیا جائے تو معلوم ہوجائیگا کہ تمام آبادی میں کم از کم پچیس فی صدی لوگ زیادہ تر اسی افیون کی پیداوار پر اوقات بسر کرتے ہیں؎۔

بدقسمتی سے ملک میں صنعت و حرفت کا وجود نہیں ہے، جو تجارتِ افیون کے انسداد یا اسمیں کمی واقع ہوجانے کی حالت میں اس مزدور پیشہ جماعت کو کسی کام پر لگاسکے۔ نہ ہی زمیندار یا کاشتکار موجودہ حالت میں سخت نقصان اُٹھائے بغیر افیون کی جگہ کسی اور چیز کی کاشت کرسکتے ہیں۔ اگر ان کے لئے فن زراعت کا کوئی ماہر اور افیون کی قائم مقام فصلیں بونے کے لئے کما حقہ سرمایہ بہم پہنچایا جائے ایسے لوگوں کی طرف سے جنھیں افیون کی پیداوار کو کم کرنے یا روکنے کا حق حاصل ہے، تب بھی لوگوں کو ان فصلوں سے کافی آمدنی مہیا کرنے کے لئے سالہا سال درکار ہوں گے، تاکہ ان نقصانات

؎ ان اعداد و شمار میں اصفہان و نواح اصفہان کے کاشتکاران افیون شامل نہیں ہیں۔ ۱۲

کی تلافی ہو سکے جو انسداد افیون کی وجہ سے پہنچیں گے۔

پھر بھی گورنمنٹ ایران نے بعض قوانین جاری کیے کہ صحیح طریقہ پر بہت کچھ اصلاح کر دی ہے مثلاً گورنمنٹ نے "شیرہ سوختہ" کے ٹھیکے کو رواج دیا ہے۔ حقوں میں افیون پینے کے بعد جو مواد بچ رہتا ہے اسی سے یہ شیرہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی خطرناک عرق ہے جو آجکل ایران میں استعمال ہو رہا ہے۔ چنگی کا محصول بڑھا دیا گیا ہے، اور ۱۹۱۱ء میں چند دفعات بھی مرتب کی گئی تھیں جو سات سال کے اندر "شیرہ" کے استعمال کی ممانعت پر مشتمل تھیں۔ پھر ساتویں سال کے بعد ایسے قوانین کا نفاذ بھی ہوا تھا جن کی رو سے ادویہ کے سوا افیون کے استعمال کی سخت ممانعت کی گئی تھی۔ اس ممانعت کو عمل میں لانے کے لئے چند قواعد بھی مرتب کئے گئے تھے جن سے شیرہ کے ٹھیکہ کو مزید تقویت ہو گئی نیز عرق افیون کو ایک جگہ جمع کرنے، اور گورنمنٹ کے گودام خانوں میں اس کو تیار کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ ملک میں افیون کے مقامی استعمال پر ضابطہ قائم ہو سکے۔

شیرہ کے تمام گودام خانے براہ راست گورنمنٹ کی نگرانی میں ہیں، اور ادویہ کے سوا ماست افیون (Morphine) کے استعمال کی ممانعت ہے۔ اس ممانعت پر عملدرآمد کے لئے سرحدوں پر سخت نگہداشت کی جاتی ہے۔ مارفین کی بڑی مقدار اور مارفین پینے کی نلکیاں ضبط کر لی گئی ہیں۔ لیکن جنگ عظیم کے سبب سے جبکہ برطانوی، روسی، اور ترکی افواج کے لئے ایران میدان جنگ بنا ہوا تھا، مرکزی حکومت کا اقتدار گھٹ گیا تھا، اس وجہ سے افیون سے متعلق قوانین کے اجراء میں ایک طرح کی خامی واقع ہو گئی۔

لیکن جب رضا خاں (موجودہ شاہ ایران) نے ۱۹۲۲ء میں محصولات کی تحصیل بلا واسطہ اپنے ہاتھ میں لے لی تو افیون کے گودام خانوں میں ایک وافر ذخیرہ افیون نظر آیا۔ پھر جب امریکن مالی کمیشن نے بھی تحصیل دسمبر ۱۹۲۲ء میں اپنے اختیار میں لی تو اس نے ذخیرہ افیون یکجا جمع کرنے کی تجویز یا ٹکیں کو بچانے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا اور ان صوبوں میں جہاں یہ اصول قائم ہو تھا سخت نگرانی ہونے لگی۔

افیون کی کاشت کو وسیع پیمانہ پر تقسیم کر دینے سے، چھوٹے چھوٹے قطعات زمین میں (جیسے کہ دو حرم، کے باغات میں نگرانی ناممکن ہے، منفعت بخش زراعت کے امکان سے، اور ایسی وجوہ سے

کہ بہترین پیداوار کے بہت رقبے اب گورنمنٹ کے قبضہ میں آنے لگے ہیں، افیون کی پیداوار پر باضا
نگرانی قائم کرنے کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ کھیلیان کے زمانہ میں افیون کے کھیتوں میں کثیر التعداد لوگوں
داخل ہو جانے سے افیون کے عرق کی نگہداشت بھی بہت مشکل ہو گئی ہے۔ فصل کے پکنے تک تو کاشتکار لوگ
کھیتوں میں رہتے ہیں لیکن پوست کو پکنے کے ساتھ ہی کٹر تج لینا ضروری ہے ورنہ عرق دستیاب نہیں
اس مطلب کے لئے کئی مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے جنہیں عموماً افیون یا عرقِ افیون یا کچھ عرق اور کچھ نق
معاوضہ دیا جاتا ہے۔

فصل تیار ہونے پر دوکاندار اور چھوٹے بیوپاری دیہات میں جاتے ہیں جنہوں نے سال بھر میں کاشتکار
کو مال ادھار دیا ہوتا ہے اور معاوضہ میں افیون کا عرق وصول کرتے ہیں اسی طرح تاجروں کو بھی یہی م
ملتا ہے۔ جونہی عرق کا ذخیرہ شروع ہوتا ہے، ہزارہا چھوٹی چھوٹی اشیاء فروخت کرنے والے اپنا سامان لیا
کے کھیتوں میں عرق کے عوض بیچتے پھرتے ہیں۔ درویش، نقشہ گو، فقیر، گویے، کھیل کرنے والے مدار
ان کھیتوں میں چکر لگاتے رہتے ہیں، جن کی ہتھیلیوں پر افیون کھرچنے کے چاقو پر چپکا ہوا حصہ بطور الغا
لگا دیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے حاصل کردہ افیون باہر سے آنے والے خریداروں کے ہاتھ بیچ دی جاتی ہے۔
ایسی حالت میں جبکہ فصل کے موقع پر ایک رقبہ میں تین سے پانچ ہزار باہر کے آدمی وہاں موجود ہوتے ہیں ج
سب کے پاس افیون کا عرق ہوتا ہے کُل فصل کی افیون یکجا جمع کرنے میں جو مشکلات پیش آ سکتی ہیں ان کا
اندازہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ اُن میں سے اکثر لوگوں کا گذران ہی سالانہ آمدنی کے بڑے حصہ پر ہوتا ہے، جیسے
فصل کے موقع پر حاصل کرتے ہیں، تو کامل طور پر ذخیرہ یکجا کرنے سے ان لوگوں کو کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑے
اگر زمینداروں اور کاشتکاروں سے اُن کا تمام عرق جمع ہونے کے ساتھ ہی گودام خانوں میں رکھوا لیا جائے
ان میں سے کم و بیش ہزارہا اوسط درجہ کے حقدار لوگوں کو اپنے پیشوں سے دست بردار ہونا پڑے گا مذکورہ
کاشتکاروں کے علاوہ افیون کے دلال کمیشن ایجنٹ اور تجار بھی ہیں جو ملک میں افیون کی خرید و فروخت
لئے تیار رہتے ہیں ان لوگوں اور ان کے عملوں کا گذران بہت کچھ اسی افیون کی تجارت پر منحصر ہے۔ ا
ان کی تعداد سیاسی لحاظ سے آبادی کا غالب حصہ بنی ہوئی ہے

سرحد کی وسعت کے سبب سے افیون کی بڑی مقدار ملک میں سے خفیہ طور پر باہر چلی جاتی ہے
لیکن اگر برآمد قطعاً بند کر دی جائے تو اس خفیہ نکاس میں اور اضافہ ہو جائے اور سا تھ منافع بھی بڑھ ج

اس ستلے جنگی کے محصول کی شرح احتیاط سے مقرر کرنی چاہیئے۔ پھر بھی عرق افیون اس کی سلائیوں اور ٹکیوں کی پیداوار کے مقام سے منزل مقصود تک لیجانے میں "طریق اجازت" (Permit System) کے اصول پر سخت نگرانی کیجاتی ہے۔

تجارت افیون پر ضابطہ قائم کرنے میں گورنمنٹ ایران کو کئی سیاسی اور خانگی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاجران افیون اور کاشتکاروں کی جماعتیں غالباً ایران میں سب سے زیادہ مالدار جماعتیں ہیں۔ اور آخرالذکر طبقہ میں کئی بارسوخ مقتدایان مذہب بھی شامل ہیں جن کے زیر اثر یا ملکیت میں اُن مقامات کا ایک معقول حصہ ہوتا ہے جو مذہبی غرض سے وقف کئے گئے ہیں۔ اس لئے افیون کی پیداوار، تیاری یا برآمد میں دخل دینے کی کوشش ان جماعتوں کی متحدہ مخالفت کا موجب بنجاتی ہے۔ تاوقتیکہ افیون کی تجارت سرمایہ اور مزدوری کے مقابلہ میں اسی قدر منفعت بخش ذرائع مہیا نہ کئے جائیں، گورنمنٹ کو انسداد کی ہر ایک تجویز میں سوداگروں اور تجارت پیشہ لوگوں کی (جن کا ملک کی منڈیوں میں بڑا رسوخ ہے) افیون کی کاشت والے صوبوں کے مذہبی ملاؤں کی جنہیں سیاسی مذہبی اقتدار حاصل ہے) اور زمینداروں کی (جو ایسے معاملات میں دہقانوں کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور جنہیں زمینداروں کی اکثریت والی پارلیمنٹ میں بسا اوقات قانون سازی میں دخل دینے کا حق حاصل ہوتا ہے) مخالفت کا سامنا کرنا پڑیگا۔ علاوہ ازیں دہقانوں کے معاملہ میں ان کے مقررہ رسم و رواج اور طریق عمل میں کوئی تبدیلی کرتے ہوئے گورنمنٹ کو اندیشہ رہے گا۔ اسی طرح افیون کی تجارت کے انسداد کے بعد امداد کے وعدوں کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ گذشتہ ایام میں ایرانیوں کو بڑی بے رحمی سے لوٹا گیا ہے اس لیے وہ اس قسم کے وعدوں کو خواہ وہ کسی کی جانب سے ہوں، مشتبہ نظروں سے دیکھنے میں حق بجانب ہیں۔

گورنمنٹ کے ضابطہ کو وسیع کرنے والے چند فوری تدابیر اختیار کیجاسکتی ہیں پھر بعد میں دیگر قوانین کا اجرا بھی عمل میں آسکتا ہے، بشرطیکہ پہلے تجارت افیون کی محنت اور سرمایہ کی جگہ، نیز گورنمنٹ کی آمدنی میں جو نقصانات ہونگے انکی تلافی کے لئے نئے ذرائع بہم پہنچائے جائیں۔ فوری تدابیر مثلاً افیون کی کاشت حمل ونقل تیاری مقامی کھپت اور برآمد پر سخت نگرانی اور ضابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے بلا اس کے کہ گورنمنٹ یا تجارت کے خانگی مفاد پر نامناسب مشکلات عائد کی جائیں۔

افیون کی جگہ اور چیزوں کی کاشت کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ افیون کا چھوٹا سا رقبہ بھی

بڑا منفعت بخش ہوتا ہے، حمل ونقل کے لئے اچھے راستوں اور ریلوں کی اسے ضرورت نہیں ہوتی۔ خرید فروخت کا طریقہ بھی سیدھا سادہ ہوتا ہے، اور افیون و عرق دونوں کی بڑی قیمت پر باہر سے ہمیشہ مانگ رہتی ہے۔ ایران کی دوسری فصل کی بہ نسبت فی ایکڑ کثیر معاوضہ دینے کے علاوہ افیون کو پانی کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر افیون کی فصل اکٹھی کر لینے کے بعد دوسری فصل اسی زمین میں لگائی جاسکتی ہے۔ لہٰذا قائم مقام فصلوں سے وہی مقررہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے کسانوں کو زیادہ رقبہ کی کاشت کرنے کے علاوہ پانی کا استعمال بھی زیادہ کرنا پڑے گا۔ نیز ان قائم مقام فصلوں کے لئے خرید وفروخت کا بازار بھی قائم کرنا ضروری ہوگا۔

افیون پیدا کرنے والے رقبے زیادہ تر انہی صوبوں میں واقع ہوئے ہیں جہاں اچھی سڑکیں نہیں ہیں، اور جہاں باربرداری گدھوں کے کاروانوں تک محدود ہے۔ اس طریقہ سے باربرداری کی لاگت وزنی اشیا کی برآمد کو، بمقابلہ اس کی قیمت کے، روک دیتی ہے۔ اسلئے قائم مقام فصلوں کی کاشت کے لئے کم قیمت پر زاید پانی مہیا کرنا، حمل ونقل کے اقتصادی (کم خرچ) ذرائع معلوم کرنا، اور زراعت سے متعلق ایسی فنی امداد حاصل کرنا ضروری ہے جن سے بحالت موجودہ جو کاشت ممکن ہو اس سے نسبتاً زیادہ ہونے لگے۔

ایران میں کاشت کے لئے افیون کی قائم مقام مناسب اجناس ریشم، تمباکو، روئی، چقندر، چار، سن، جوٹ، اور خشک میوہ جات ہیں۔ یہ قائم مقام فصلیں قدرتی طور پر صرف افیون پیدا کرنے والے قطعات تک محدود نہیں ہیں، اسلئے ان قطعات کا خیال مقدم ہونا چاہیئے، تاکہ افیون کی تجارت کے خانگی مفاد کی حفاظت ہوسکے۔ لیکن ایسے قطعات میں صرف قائم مقام فصلیں، اور کاشت کی وسعت گورنمنٹ کو اتنی کافی آمدنی نہیں دے سکیں جس سے کاشت افیون کی تخفیف کے باعث پیدا ہونے والے خسارہ کی تلافی ہو جائے۔ لہٰذا غیر افیونی رقبہ میں جدید یا مزید ذرائع آمدنی مہیا کرنے کے لئے زراعتی اسباب و وسائل کی اصلاح ضروری ہے۔

موجودہ حالات کے ماتحت ایران میں افیون سازی کے اس نازک و سیاسی تار و پود کو ایسے اقتصادی فتنہ، یعنی صنعت افیون کے انسداد سے، بکھیر دینا ابتداً ہلاکت آفریں ثابت ہوگا، تاوقتیکہ ابتدا تدابیر اختیار نہ کی جائیں، اور احتیاطاً سے تجویز کردہ طریقہ عمل میں نہ لایا جائے، بدگمان کسان اس سے کم

سی بات پر راضی نہ ہوں گے ۔ نیز فنی امداد اور مطلوبہ سرمایہ کا بھی اس موقع پر موجود ہونا ضروری ہے۔
ٹکنیکل (فنی) امداد یورپ بڑے بڑے ممالک، خصوصاً اٹلی سے، حاصل کی جاسکتی ہے، اور سڑکوں
کی درستی، ریلوں کی تیاری، آب پاشی، بیج خریدنے کے لئے قرض، اور زراعتی مشینوں کے لئے سرمایہ
ن ممالک سے آنا ضروری ہے جو افیون کے انسداد میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کم مقدار میں افیون پیدا
کرنے والے غریب ممالک سے اس تمام نقصان کو برداشت کرنے کی کس طرح توقع کی جاسکتی ہے جب کہ
کثرت استعمال کرنے والے مالدار ممالک (جو خاص نفع حاصل کرتے ہیں) امداد نہ کریں۔ امریکہ کو چاہئے کہ وہ ہر
چیز کے فوری انسداد کا شاعرانہ خیال ترک کردے کہ یہ کلیتہً ناقابل عمل ہے۔ مہمات امور میں طریقہ کار بتدریج
ہونا چاہئے اور موقت مشکلات کو نہایت احتیاط سے حل کرنا چاہئے۔
مسئلہ افیون کا مرض کی طرح علاج کرنا مناسب ہوگا، جس پر پوشیدہ جرات کے ساتھ حملہ کرنا بہتر ہوگا۔
تخمینہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۲۵ لاکھ پونڈ افیون کو قطعی نیست و نابود کرنے کے لئے درکار ہوں گے۔ چونکہ قائم مقام
فصلوں کو رواج دیکر ملک کو وسیع بنانے پر ایران کی اقتصادی ترقی کا بہت کچھ انحصار ہے۔ اس لئے
س طریقہ سے لگایا ہوا سرمایہ ملک کی بڑھی ہوئی مرفہ الحالی کے موقع پر وصول کیا جاسکتا ہے۔ اس مسئلہ کا غیر
حکومتوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے، بلکہ کسی خارجی حکومت کی مداخلت کو اہل ایران نہایت ناپسند کریں گے
س کے ساتھ ہی کوئی وجہ نہیں ہے کہ غیر ملکی حکومتیں ایک منظم اور باقاعدہ خانگی مہم کے لئے مالی امداد نہ دیں۔
اگر میں نے افیون کے مسئلہ کا طوالت کے ساتھ ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ایران کی موجودہ
حالت کا اس سے بہت گہرا تعلق ہے۔
یہ میرا پختہ خیال ہے کہ ایران کا مستقبل اس کی آزادی کی سیاسی ترقی پر منحصر ہے، جس میں کسی کی مداخلت
کا شائبہ تک نہ ہو۔ تاکہ ملک میں قومی اتحاد کی روح پھیل جائے۔ لیکن اس جذبہ اتحاد کو پیدا کرنے کے لئے ضرورت
ہے کہ آمد و رفت اور حمل و نقل کے لئے سریع السیر ذرائع مہیا کئے جائیں، صحیح اقتصادی مہم کے لئے جہاں ضرورت
ہو غیر ملکی آزمودہ کار ماہرین فن کی ہدایت حاصل کیجائے، زراعت کو ملک کی بنیادی صنعت سمجھ کر اسکو ترقی
دیجائے، اور افیون کی بجائے اسی کے برابر نفع والی فصل لگانے کے لئے بتدریج اور متواتر کوشش کیجائے
جو پوست افیون کے پوشیدہ خطرات سے مبرا ہو۔

ہندوستان اور اُس کی بانیں

(مترجمہ جناب مولوی عبدالستار صاحب رضا فاروقی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبتی چینی زبانوں کے بولنے والوں کا اصلی مسکن یانگ ٹسی کیانگ اور ہوانگ ہو کے بالائی میدانوں میں تھا جہاں سے ہجرت کرکے وہ ہر چہار طرف پھیل گئے تھے۔ اس ہجرت کا جہانتک ہندوستان سے تعلق ہے یہاں تین گروہ یکے بعد دیگرے دریائی میدانوں میں سے ہوتے ہوئے دریائے ایراوڈی اور سالوین کے نشیب میں برما اور برہم پترا سے آسام میں سالوین کے فراز سے تبت میں اُتر آئے ان میں سے ہر گروہ نے اپنے پیشروؤں کو نیچے کی طرف ڈھکیل کر یا تو ساحل مقامات تک پہونچا دیا، یا کوہستانی علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برما اور آسام کے قدیم ترین آسٹر دی۔ ایشیائی زبانوں کے بولنے والے یا تو بنگو کی آخری جنوبی سرحد کے ساحلی مقام میں پائے جاتے یا کوہستانی علاقوں میں منتشر تھے جہاں وہ حملہ آوروں کی زد سے محفوظ ہو گئے تھے۔

تبتی چینی شعبہ کی دو بڑی شاخیں سیامی چینی اور تبتی برمی زبانیں ہیں۔ ان میں سے جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اول الذکر صرف برما میں رائج ہے جہاں کے دس لاکھ باشندے اسکو استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ تشن قوم جسکی زبان سیامی اور اس کے ذریعہ چینی زبان سے بہت کچھ مخلوط ہوگئی ہے، یونان سے آکر یہاں آباد ہوگئی تھی، اور اب وہ ایک اہم قوم بنگئی ہے ہمارے نزدیک موخر الذکر یعنی تبتی برمی کی دو بولیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں جو تبت، برما اور آسام کے بڑے حصوں اور مشرقی بنگال میں مروج ہیں۔ تمام ملک تبت اور اسکی مغربی سمت میں کشمیر تک اس کے بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ اس کے جنوب میں کوہستان ہمالیہ واقع ہے اور اس سلسلۂ کوہ پر متعدد نو آبادکاروں نے تاخت و تاراج کرکے نیپال اور اس کے تمام جنوبی رُخ پر پنجاب تک قبضہ کر لیا ہے اگرچہ ہمیں اس قدیم ترین زمانہ کا علم نہیں ہے جبکہ ہندوستان پر پہلی مرتبہ حملہ آوری ہوئی تھی تاہم کئی صدیوں تک لوگ ہجرت کرکرکے یہاں آنے لگے تھے، اور ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ آسام میں ایک زبردست تبتی برمی حکومت قائم ہو چکی تھی، اور تیرھویں صدی عیسوی میں سیامی چینی قبیلۂ آہوم نے آسام کو فتح کر لیا تھا۔ اس وقت سے

ہی ایک حملہ آور یکے بعد دیگرے یہاں ہمیشہ آتے رہے۔ آخری حملہ قوم کچن نے کیا تھا جس کو انگریزوں کی
تح بالائی برہا نے ۱۸۵۶ء میں روک دیا تھا۔

تبتی چینی زبانیں مذکورہ بالا آسٹانی سے بالکل برعکس واقع ہوئی ہیں۔ ان کی لغت میں تمام تر الفاظ
احد الہجا ہیں، یا وہ ایسے قواعد اور حروف صوتی پر مبنی ہیں کہ بعض زبانوں میں تو ایسے واحد الہجا کلمات کی
عداد ۵۰۰ یا ۶۰۰ سے زیادہ ممکن ہی نہیں ہے۔ با ایںہمہ ان مفرد کلمات سے مرکب الفاظ بنانے کا ایسا
عجیب طریقہ ہے جس کے ذریعہ اسمائے ذات بآسانی ادا ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم برمی اور تبتی ان دو بڑی لٹریری زبانوں کو مستثنیٰ کر دیں تو تبتی برمی شعبہ کی تمام بولیاں کوہستانی
ضلاع تک محدود ہو جاتی ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ ایسے دشوار گذار ملک میں ہر قبیلہ اپنے ہمسایہ
بائل سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر ایک دوسرے قبائل آپس میں ملتے جلتے بھی ہیں تو جنگ جویانہ
ور پر کسی قطعۂ زمین پر بزور قوت سکونت پذیر ہونے کے خیال سے، یا اُجاڑ راستوں پر اپنے وحشیانہ جذبۂ
خونریزی کو فرد کرنے کے لئے، یا پھر دوسرے قبائل کے آدمیوں کو انسانی قربانی کے لئے پکڑے جانے کی
غرض سے۔ غرضکہ ان مختلف قبائل میں اختلاط اور میل جول کا وجود شاذونادر اور بہت مشکل سے ہوتا ہے
علاوہ بریں ایک ایسی واحد الہجا کلمات والی غیر مرتب زبان، جس کے الفاظ مختلف حالات و اسباب مثلاً
رمی اور سختی وغیرہ کے ماتحت بدل جایا کرتے ہیں، ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں
بھی موجود ہیں کہ چند افراد اپنے قبیلہ سے جدا ہو کر ایک دور دراز پہاڑی پر آباد ہو گئے اور ایک یا دو نسلیں
گذرنے کے بعد ہی ان دونوں کی زبانوں میں اسقدر تفاوت ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان
سمجھنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قبائل کی زبانیں مختلف بولیوں، اور بولیوں سے مختلف زبانوں
میں منقسم ہو جایا کرتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال تبتی برمی زبانوں کا رہا ہے جو تعداد میں تو ۱۲۰ ہیں مگر ان میں سے
تبتی اور برمی زبانوں کو چھوڑ کر ہر ایک زبان کے بولنے والوں کی تعداد کا اوسط صرف ۱۷۰۰۰ ہے جو بہت
مختصر ہے۔

ان زبانوں کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اسم اور فعل کا فرق سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ مثلاً
اگر ہم انگریزی میں یہ کہیں کہ "My hand is strong" (میرا ہاتھ مضبوط ہے) تو یہاں
لفظ "Hand" اسم ہوگا۔ اور اگر ہم یوں کہیں کہ "Hand me this"

(مجھے یہ دیدو) تو یہاں وہی لفظ فعل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں انگریزی میں بہت شاذ ہیں۔ لیکن تبتی برمی زبانوں کا یہ حال ہے کہ ان کا ہر لفظ اسم اور فعل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کو یہ کہنا ہے کہ "میں گیا" تو اسکو اس طرح کہیں گے کہ "میرا جانا ختم ہوا"، جس میں جانا اور ختم دونوں مستقل لفظ ہیں جو نہ اسم ہیں نہ فعل مگر موقع و محل کے لحاظ سے دونوں ہو سکتے ہیں۔

تبتی برمی شعبہ کی بعض زبانوں میں اسم اور فعل کا امتیاز نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسمائے عام کی ادائگی سے قاصر ہو گئی ہیں۔ تبتی اور برمی زبانیں جن میں ادبی ذخیرہ موجود ہے بعض طریقوں (اشارات و اصوات) سے ایک حد تک اس نقص سے پاک ہو گئی ہیں، مگر ابھی چین اور بنگال کے درمیان پہاڑی ملک میں قبائل کی غیر ترقی یافتہ بولیوں میں یہ نقص ابتک موجود ہے۔ بلکہ ہمیں یہاں ایسے قبائل ہی ملتے ہیں جن کی زبانیں عام اصطلاحات کو ادا کرنے سے قاصر ہیں، اور ان کا ذخیرۂ الفاظ صرف اسمائے ذات تک محدود ہے۔ ان میں اکثر زبانیں ایسی بھی ہیں، جن میں آدمی ایسے معمولی اسم عام کا مترادف لفظ بھی نہیں ہے۔ انگریز، سنگ فو، میکر، گارو کے لئے ان میں الفاظ مل جائیں گے، لیکن آدمی کے لئے کوئی لفظ نہ ملیگا۔ اسی طرح ان میں ایک لوشئی (Lushai) زبان ہے جس میں نو قسم کی چیونٹیوں کے نام تو پائے جاتے ہیں لیکن عام "چیونٹی" کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔

ایسے الفاظ جن سے رشتہ داری یا اعضائے جسمانی کا اظہار ہوتا ہے ان کا شمار اسمائے عام میں ہے عام طور پر لفظ "باپ" (جو کسی خاص شخص کا باپ نہیں ہے) ایک خیال ہے جو کسی قدر غور و خوض چاہتا ہے ایسے مفرد کلمات کا استعمال تبتی برمی زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔ مگر باستثنائے چند ہمیشہ کسی نہ کسی شخص کے ساتھ منسوب ہو کر استعمال ہوتا ہے۔ ان زبانوں میں "میرا باپ"، "تیری ماں"، "اس کا ہاتھ" وغیرہ فقرے آپ ملیں گے، مگر صرف ماں، باپ، یا ہاتھ کہیں استعمال ہوتا نظر نہ آیگا۔ اکثر تبتی برمی زبانوں میں ہم ان فقروں کا لفظی ترجمہ کرنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً:-

"باپ فطرتاً مہربان ہوتا ہے"۔ ایک ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔

(باقی دارد)

مترجمات

لاسلکی کا اصلی موجد

مشہور پندرہ روزہ رسالہ (Woman Engineer) میں "تلغراف النّاسخ" (Type Printing Telegraphy) کے موجد ڈیوڈ ایڈورڈ ہیوجز پر ایک دلچسپ مضمون پروفیسر اسپونر (Spooner) کے قلم سے نکلا ہے، ہیوجز در اصل خاندانِ ویلیش کا ایک نوجوان تھا جو سنہ ۱۸۳۱ء میں لندن میں پیدا ہوا تھا۔ حالت نوعمری میں اس کے والدین اُسے ممالک متحدہ (امریکہ) میں لے گئے۔ وہاں اس نے سائنس اور موسیقی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اور ایک روز جبکہ وہ پیانو بجا رہا تھا اس کے دل میں تلغراف النّاسخ کی ایجاد کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے مائیکروفون[له] (Microphone) ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ سے وہ ٹیلیفون کی تکمیل میں کامیاب ہو گیا۔ پروفیسر اسپونر رقمطراز ہیں کہ:-

"مائیکروفون کی ایجاد نے اس کو بعض قیمتی اور اہم تحقیقات کی طرف متوجہ کر دیا اور ۱۸۷۹ء میں اس نے اپنی دو بیش بہا ایجادوں "میزان امالۂ برقی" (Induction Balance) اور آلۂ آوازپیما (Sonometer) کا اعلان کیا۔ اور اسی سال کے آخر میں اس نے امواج برقی منسوب بہ ہرٹز (Hertz) کو ہرٹز سے پہلے، آلۂ کوہیرر[له] (Coherer) کو برانلی (Branly) سے پہلے (جیسا کہ ہیوجز نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے، جو اُس نے بتاریخ ۸ رمئی ۱۸۸۰ء میں رائل سوسائٹی کے سامنے پیش کیا تھا) اور لاسلکی کو لاج (Lodge) اور مارکونی (Marconi) وغیرہ سے قبل دریافت کر لیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے کیمبرج کے مشہور ریاضی داں اور اعزازی ناظم رائل سوسائٹی سر جارج اسٹوک سے "دماغ پر برقی رد پیدا کرنے" کے نظریہ میں اختلاف رائے ہو جانے کے باعث یہ عظیم الشان انکشافات غیر معروف رہے۔ ہیوجز اس بات کو اپنی شکست خیال کر کے اسقدر پست ہمت ہو گیا کہ اس نے مسائل مذکورہ پر جو مضمون رائل سوسائٹی

له وہ آلہ جس کے ذریعہ سے باریک سے باریک آواز سن لیجائے۔ له یہ آلہ ایک ٹیوب کی شکل کا ہوتا ہے اور دھات کی پتیوں سے بنایا جاتا ہے جب امواج کہربائی گذرتے ہیں تو اس ٹیوب کی برقی مقاومت کو بہت کچھ گھٹا دیتے ہیں۔ ۱۲۰

لے تیار کیا تھا اس کے پیش کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ اس ہوائی تلغراف لاسلکی
(Aerial Wireless Telegraphy) کا مہتم بالشان انکشاف تقریباً ۲۰ سال تک معرض
رہا۔ مگر ہیوجز نے ان مسائل سے متعلق اپنی تحقیقات کا سلسلہ ۱۸۸۶ء تک برابر جاری رکھا"

"یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ الکٹریشین (Electrician) کے اڈیٹر
ندعا پر ہیوجز نے تحقیقاتِ لاسلکی کے متعلق اپنی کامیابیوں کی روداد قلمبند کر دی جو خوش قسمتی سے تاریخی
ز کے لئے رسالہ مذکور مورخہ ۵ مئی ۱۸۹۹ء میں شائع ہو گئی ہے۔ اسی طرح رسالہ الیکٹریکل ریویو
ار جون ۱۸۹۹ء میں ایک مضمون ہیوجز کی تحقیقات و اختبارات لاسلکی کی تعریف میں شائع ہوا تھا۔
۱۸۷۷ء سے ہیوجز کا سلسلۂ تحقیقات ایک طویل داستان ہے۔ جن کی بدولت اس کو "ہوائی امواج
(Aerial Electric Waves)" یا "لاسلکی" کے ذریعہ پیغام رسانی میں کامیابی
المختصر ہیوجز ۵۰۰ گز کے فاصلہ تک پیغام رسانی میں کامیاب ہو گیا۔ مگر ایک میل کے بعید فاصلہ تک
شارات صاف طور پر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ کثرت غاز (گیس) اور متعدد پانی کے نل بیچ میں
ر اس کی لہروں کو جذب کر لیتے یا کمزور بنا دیتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس ناقابل تردید
ہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے موجود ہے کہ ہیوجز، اور صرف وہی اس "ہوائی برقی تلغراف" کا
ربانی تھا"

اگرچہ یہ عالی دماغ شخص اپنی تحقیقات کی اولیت جتانے میں ہمیشہ کسرِ نفسی کیا کرتا تھا تاہم وہ دوسروں
ناموں کی بڑی فیاضی سے داد دیتا تھا۔ چنانچہ مارکونی کی دماغی قابلیت کا وہ بڑا مداح اور معترف تھا۔

(ریویو آف ریویوز)

حروفِ تہجی کی اصلیت

جدید عہدِ حجری کے کتبات

ن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر اے۔ موویل نے وہاں کی "انجمن کتبات" کو مندرجہ ذیل سوالات
بھیجے ہیں:

(۱) کیا زمانۂ قبل التاریخ کا انسان پڑھ لکھ سکتا تھا؟
(۲) کیا اسی نے موجودہ حروف تہجی ایجاد کئے ہیں؟
(۳) ہمیں معلوم ہے کہ عہد حجری کے لوگ صناع اور کاریگر تھے، انکی بنائی ہوئی فیل شترانی (mammoth) اور برفانی بارہ سنگھے (Reindeer) کی رنگین اور منقش تصاویر آج بھی غاروں اور تہ خانوں میں محفوظ ہیں۔ مگر کیا وہ علمی و ادبی مذاق بھی رکھتے تھے؟"
حال ہی میں مقام گلوزل (Glozel) کے آثار قدیمہ کھودے گئے ہیں جن میں سے آلات، اسلحہ اور ظروف برآمد ہوئے ہیں، نیز پتھر کے بعض کتبات سے (جن کی نسبت ڈاکٹر موصوف کا دعویٰ ہے) یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہد حجری کے انسانوں نے حروف تہجی کا استعمال کیا تھا۔
اُن دنوں، جبکہ برفانی بارہ سنگھے ملک فرانس میں پھرا کرتے تھے، عہد قبل التاریخ کے انسان اپنے خیالات کا اظہار "حروف لفظی" سے کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر موریل نے تقریباً نو حروف اس قسم کے دریافت کرلئے ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ فینیقیا والوں نے درحقیقت اپنے حروف جدید عہد حجری (Neolithic) کے قبائل سے مستعار لئے تھے جیسا کہ ان دونوں کی قریبی مماثلت سے معلوم ہوتا ہے موسیو شالومان لیناش ڈاکٹر موریل کے اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے خاص طور پر مقام گلوزل کا سفر کیا اور مٹی کے ایک طبقہ سے برآمد شدہ ایک لوح کا بچشم خود معائنہ کیا۔ انکا بیان ہے کہ ان آثار قدیمہ میں کسی رومی یا گالی ظروف فلزی کا نشان تک نہیں پایا گیا۔ تقریباً پچاس تختیوں پر تحریر کی باقاعدہ سطریں منقوش ہیں جن میں سے بعض فینیقی اور قدیم ترین یونانی حروف سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں اگرچہ ان کے متن کو پڑھنا ناممکن ہے۔ آجکل اس نظریہ پر گرمجوشی سے علمی بحث چھڑی ہوئی ہے۔

گاؤکشی

شدھی اور سنگھٹن کے علمبردار سوامی شردھانند نے اپنے رسالہ (Liberator) (الناجی) میں گاؤکشی پر ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:۔
"گاؤکشی کے متعلق ہندوؤں کا طرز عمل مجھے ہرگز پسند نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان

ہیں سال بھر میں تیس ہزار سے زیادہ گایوں کی قربانی نہیں کیجاتی۔ ایک مسلمان مذہبًا یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک گائے کی قربانی سات مسلمانوں کو بہشت میں لیجائے گی۔ مگر تقریبًا دس لاکھ گائیں اور بیل ہر سال فوجی چھاؤنیوں میں برطانی افواج کے لئے ذبح کیجاتی ہیں۔ تقریبًا ۵ لاکھ ہندوستان کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے اور چالیس لاکھ کے قریب بیف (گائے کا گوشت) اور چمڑے کی تجارت کے لئے ذبح ہوتی ہیں۔ پھر ان سب گؤکشیوں پر ایک ہندو کو کیوں اذیت نہیں پہونچتی؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مسلمان قربانی کے جانوروں کی ایسی نمائش کرتے ہیں جو طیش انگیز ہوتی ہے اور اس لئے ہندو چراغ پا ہوتے ہیں لیکن پچیس لاکھ گائیں اور بیل کھلے راستوں پر سے مذبح میں ہنکا لیجاتے ہیں۔ پھر ان ہزارہا گایوں کی نمائش سے وہ کیوں برانگیختہ نہیں ہوتے؟ مسلمان (ہندوؤں کے خیال میں) اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک مذہبی ثواب کا کام کر رہے۔ لیکن ہمارے ایک نادان بھائی کے کسی فعل نادانی پر ہمیں برانگیختہ ہونے کا کونسا موقع ہے؟ ہندوؤں کو اپنے بھائیوں کے لئے خدا سے دعا کرنی چاہئے اور اون کو سمجھانا چاہئے کہ انسانی جذبات اور نفسانی خواہشات کی قربانی۔ نہ کہ خون اور گوشت کی قربانی۔ صرف خدا کے نزدیک مقبول ہوسکتی ہے۔ اور نفرت کی بجائے ہمیں ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش آنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ روش اختیار کی گئی تو نہ صرف ہندوؤں کو چڑھانے کا یہ طرز عمل ہمارے مسلمان بھائیوں کے دلوں سے نکل جائیگا بلکہ وہ سنجیدگی سے اس امر پر غور کریں گے کہ آیا گائے کی قربانی مذہبی حیثیت سے ضروری بھی ہے یا نہیں۔ تین چار سال سے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ایک بکرا دس روپیہ سے کم پر نہیں خریدا جاسکتا۔ مگر ایک گائے جو بیس روپیہ کو خریدی جائے سات آدمیوں کی طرف سے قربانی کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ تمام ہندو قطعًا گوشت کھانا چھوڑ دیں۔ تب بکرے وغیرہ ارزاں ہوجائیں گے۔ اور مسلمان اپنے بوڑھوں اور بچوں کو گائے کے دودھ سے (جو ماں کے دودھ سے بڑھ کر ہے) محروم نہ رکھ سکیں گے۔"

سوامی جی کی اس تجویز سے ان کے ہم مذہبوں کو اتفاق ہو یا نہو مگر ہمیں ان سے کلی اتفاق ہے۔ لیکن کیا سوامی جی نے اس کے امکان و عدم امکان پر بھی غور فرمایا ہے؟ ہمیں امید ہے کہ برادران وطن ہمارے لئے ضرور خدا سے دعا کریں گے لیکن دعا کی استجابت کے لئے بھی سوامی جی نے کوئی عمل بتلا دیا ہوتا تو بہتر ہوتا!

حضرت مسیح ہندوستان میں

...بدھ سوسائٹی کے ناظم اعزازی کو مندرجہ ذیل اطلاع امریکہ سے بذریعہ تار موصول ہوئی ہے :-
امریکہ کے ایک نامور ماہر اثریات پروفیسر لادرِ تح (Roerich) جو امریکہ کی ایک جماعت
...تہہ وسط ہند میں علمی و اثری تحقیقات میں مصروف ہیں، اطلاع دیتے ہیں کہ ان کو تبت کی کسی خانقاہ
...قلمی کتاب دستیاب ہوئی ہے جس میں حضرت یسوع مسیح کا بودھ مذہب سے واقفیت حاصل کرنے
...سے ہندوستان میں تشریف لانا بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے ہندوستان کی سیاحت کی اور تبلیغ کرتے
...پھر یروشلم (بیت المقدس) واپس تشریف لے گئے۔
یہ تھیوری صحیح ہو یا نہ ہو مگر ہے ضرور دلچسپ۔ دیکھیں پروفیسر موصوف اس کے ثبوت میں کونسی واضح
...مل دلائل پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک ان ہر دو مذاہب میں بعض وجوہ اشتراک کی بنا پر بودھ
...عیسائیت کا ماخذ اور اصل ہے۔ اگر صرف یہی وجہ اشتراک ایک مذہب کے دوسرے مذہب سے ماخوذ
...کے لئے کافی خیال کرلی جائے تو بنیادی اصول مذہبی کے لحاظ سے دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے ایکدوسر
...خوذ ہونیکا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔

اکبر کا مذہب

(عہد مغلیہ کی تصاویر پر سے)

ریورنڈ ٹی ایچ ہراس نے جو سینٹ زیویر کالج (بمبئی) میں تاریخ کے پروفیسر ہیں مغلیہ تصاویر پر اکبر کے مذہبی
...ات پر ,, کے عنوان سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک جلسہ میں بزیر صدارت سر للو بھائی شاہ
...دلچسپ لکچر دیا تھا۔ جسکا ملخص حسب ذیل ہے :-
ابتدا میں مقرر نے کہا کہ وہ صناعی نقطۂ خیال سے اس موضوع پر کچھ نہیں کہے گا۔ بلکہ وہ صرف ان
...پر سے اکبر کے مذہبی مباحثات پر ایک تاریخی تبصرہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ مقرر نے کہا کہ یوں تو تمام
دستاویزی سندات پر مبنی ہوا کرتی ہے مگر نقوش و تصاویر بھی مستند دستاویزیں ہونیکے

لحاظ سے استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے بیان کیا کہ:۔

اکبر ایک صوفی مزاج بادشاہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ ہندوستان کا اتحاد تمامتر مذہبی اتفاق پر منحصر ہے لہذا اس لئے مذہبی مباحثوں کو ترقی دی متعدد تواریخ سے اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا مزید ثبوت اس "عبادتخانہ" سے ملتا ہے جسکو اکبر نے ان مباحثات کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ وہاں تمام مذہب کے نمائندے ہندو، پارسی، عیسائی۔ مسلمان، جینی اکبر کی سرپرستی میں جمع ہوتے تھے ۱۵۷۳ء سے ۱۵۷۹ء تک اکبر ہندو مذہب کے زیر اثر تھا جس کی وجہ راجپوت کماریوں کے ساتھ اس کا عقد اور بیربل کی مصاحبت تھی اور دستور مہرجی رانا کے دربار اکبری میں شامل ہونیکی وجہ سے زردوشتی مذہب کا اثر اکبر پر پڑا چنانچہ یہ کہا جاتا تھا کہ اگرچہ اکبر اپنے دل سے ایک صوفی ہے مگر وہ رسوم مذہبی کے لحاظ سے پارسی ہوگیا ہے اثر ۱۵۸۰ء سے ۱۵۸۳ء تک قائم رہا۔ پھر اکبر نے اپنے دربار میں تین یسوعی پادریوں کو بلایا۔ چنانچہ ۱۵۸۳ سے ۱۵۸۷ء تک اس کا میلان عیسائیت کیجانب رہا۔ فادر مونسٹراٹ اور رفادو اکوادیوا مشہور عیسائی تھے جنھوں نے اکبر پہ یہ اثر ڈالا تھا"

اس کے بعد مقرر نے ان تین تصویروں کو جو عبادتخانہ کی تھیں پیش کیا۔ یہ تصاویر پونا سے ہاتھ لگی تھیں جہاں غالباً عہد پیشوا میں آگرہ سے لائی گئی تھیں۔ ان تصاویر میں ایک درختوں سے گھری ہوئی چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں اکبر مختلف مذاہب کے علماء کے بیچ میں بیٹھا ہوا ان کے مباحثہ میں سرگرم نظر آتا ہے۔ مقرر کا قیاس ہے کہ یہ پہاڑی کہیں فتحپور کے قریب ہوگی۔

قطعہ

سر کے ہمراہ ہے ساماں کی گرانباری بھی
نام کے ساتھ دیا مجھکو نشاں بھی تو نے
جان ہی آفت جاں تھی کہ ملی غرت بھی
پیٹ کیا کم تھا، کہ دی اُس پہ زباں بھی تو نے

ادبیات

حقیقت مجاز

(از جناب ابوالخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین بٹالوی)

(۱)

ریل گاڑی آہستہ سے چلدی۔ کسی کی حسرت بھری نگاہیں پلیٹ فارم کے ایک کونہ سے اُچٹ اُچٹ کر پہلے
گاڑی۔ پھر دوسری، تیسری۔ چوتھی اور پھر گارڈ صاحب کی گاڑی سے ٹکراتی ہوئیں اپنے ہاتھ کی ہتھیلیوں سے
گئیں۔ ہاتھ اک لمحہ کے لئے آنکھوں سے پھر جُدا ہوئے۔ نگاہیں ایک دفعہ پھر اٹھیں۔ گاڑی بہت دُور
چکی تھی۔ انجن کے سیاہ دہوئیں کے خفیف سے نشان آسمان پر کہیں کہیں نظر آ رہے تھے اور بس۔ محویت کا یہ عالم
ایک منٹ، دس منٹ۔ بیس منٹ گذر گئے پلیٹ فارم کا کونہ نہیں چھوڑا۔ کانپتا ہوا ہاتھ کوٹ کے اندر کیطرف گیا۔
بیب ایک چھوٹی سی تصویر نکالی۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں نے اُسے غور سے دیکھا گویا تصویر کا چہرہ دُھندلا تھا
سرے ہاتھ کے رومال سے تصویر کو صفا کیا مگر تصویر ویسی کی ویسی بلکہ کچھ اور زیادہ دھندلی تھی۔ اتنے میں خاکروب
جو اپنے جھاڑو کے پلیٹ فارم سے مسافروں کے پھینکے ہوئے پتے۔ کاغذ۔ سگریٹ کی خالی ڈبیاں صاف
رہا تھا۔ محمود کو ایک طرف ہٹ جانیکو کہا، اُس کے لبوں سے کچھ بڑبڑاہٹ کی آواز آئی۔ خاکروب مسکرایا۔ اور
ں محمود اپنا پلیٹ فارم ٹکٹ۔ گیٹ بابو کو دیکر لاہور اسٹیشن کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باہر
آئے۔

(۲)

دہلی ابھی دور تھی۔ ہر ٹھہرنے والے سٹیشن پر جہاں میل گاڑی ٹھہرتی۔ عذرا کی نگاہیں اپنے برقعہ کی جالیوں سے
ن چھن کر سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہر چلنے والے نوجوان پر پڑتیں اُسے خیال تھا کہ شاید محمود چلتی گاڑی میں سوار
ہو کر اُس کے ساتھ ساتھ آ رہا ہوگا۔ کیونکہ عذرا کو ایک شریف جنٹلمین بلا تنخواہ کے نوکر کی ضرورت تھی جو اُسکے
ئے ہر موقعہ ہر جگہ پر اشتہار کا کام دیتا اور وہ فقط محمود ہی اُس کی اس خاص ضرورت کو پورا کر سکتا تھا اور ساتھ

ہی اس کے وہمراہ اسٹیشن پر اُترتا۔ اچھی اچھی مٹھائی۔ عمدہ عمدہ پھل سگرٹ وغیرہ عذرا کے کمپارٹمنٹ تک پہنچاتا۔ عذرا خوش ہوتی..... مگر افسوس محمود گاڑی میں موجود نہ تھا۔ شاید وہ اس کے ہمراہ دہلی چلتا اگر عذرا اُسے ایک مرتبہ بھی اپنے ساتھ لے جانے کو کہتی۔

عذرا علم موسیقی میں کمال رکھتی تھی۔ چہرہ پر وہ نکھار موجود تھا جو دیگر بازاری حُسن سے بدرجہا بہتر سیرت صورت دونوں دلفریب تھیں۔ لاہور ہی میں نہیں دُور دُور تک شہرت پھیلی ہوئی تھی نواب اکرم بیگ کی شادی کی تقریب پر خاص طور سے بلائی گئی تھی۔ قدرت نے اچھا کیا کہ محمود اس وقت عذرا کے ہمراہ نہ تھا ورنہ کوئی اُسے اوباش، کوئی ناٹک کا دل فریفتہ ایکٹر اور کوئی رنڈی کی اداؤں کا کُشتہ کہتا۔

(۴)

محمود سر ڈالے رواں رواں سیدھا گھر پہنچا۔ وہ گھر جہاں اُس نے گذشتہ چھ ماہ کے عرصہ میں قدم تک نہ رکھا تھا بہنوں نے سلام کیا۔ ماں دیکھتے ہی بسم اللہ کہہ کر اُٹھی۔ دوڑی گلے چمٹ گئی۔ بلائیں لیں۔ منہ۔ سر چوما۔ پیار کیا ماں کے لئے ہزار لاکھ خوشی کی یہ ایک گھڑی تھی کہ بیٹا خود بخود گھر آیا مگر..... اُس کو ان باتوں سے کیا سروکار تھا۔ ماں کے متبرک ہاتھ گلے سے جھٹکے۔ نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور اُسے وہیں دالان میں چھوڑ اپنے اُس اوپر والے کمرہ میں آیا جو کبھی اُس کی آرامگاہ تھی۔ دم پھولا ہوا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ اوسان خطا تھے۔ دھم سے ایک خاک آلودہ پلنگ پر اوندھا گر پڑا۔ ماں کو اتنی طاقت کہاں تھی کہ دوبارہ بیٹے کے پاس آتی۔ جھڑکیاں سُنتی حال پوچھتی۔ دل کی آگ کو ٹھنڈا کرتی۔ بیچاری اتنی ہی خوشی میں کہ بیٹا خیر و عافیت سے گھر آگیا ایک خط اپنے بھائی کے نام جو سیالکوٹ میں آنریری مجسٹریٹ تھا لکھ بھیجا کہ محمود اب تندرست اور روبہ صحت ہے۔ بڑے ہسپتال سے ڈاکٹر نے گھر آنے کی اجازت دیدی ہے۔ کالج کی تعلیم بھی بدستور جاری کردیگا۔ ماں تھی شاید اتنا جھوٹ لکھنا سوار کھتی آخر کیوں نہ لکھتی ان تمام موہوم کے ساتھ ایک اُمید منسلک تھی کہ بھائی کی رضامندی کی نظر اُس کے رشتۂ حیات کو اور زیادہ کچھ مدت زندہ رہنے دے گی۔

ادھر محمود حالتِ اضطراب میں پڑا کروٹ پر کروٹ لے رہا تھا۔ سینہ میں ایک ہُوک اُٹھتی تھی اور ساتھ ہی جسم کو ٹھنڈا کر دیتی تھی۔ آنکھوں کے سامنے گذشتہ خیالات اُمنڈ اُمنڈ کر آرہے تھے۔ عذرا کے ساتھ دریا کی سیر کو نکلنا سینما کی تصویریں دیکھنا۔ تھیٹر میں ریزرو صوفہ پر بیٹھنا گویا یہ سب مناظر ایک ایک کرکے دل پر چوٹ لگا رہے تھے۔ ابھی خیالات میں منہمک وہ کئی گھنٹے عالمِ سکوت میں پڑا رہا۔ آخر ایک سرد آہ بھری اور پلنگ سے اُٹھکر

ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے کے بعد ایک بکس کو کھولا۔ چند خطوط نکالے جو اُسے عذرا نے عالم ابتدا میں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اور اُسے بیوفا کے نام سے موسوم کرتے ہوئے قلمبند کئے تھے۔ یہ سب عذرا کا داؤ پیچ تھا جس کو محمود بالکل نہ سمجھا خط آنکھوں کے سامنے آتے ہی ایک غبار سا اوٹھا۔ دو انگلیوں سے آنکھوں کو دبایا۔ دو موٹے موٹے پانی کے قطرے آنکھوں سے نکل کر اخساروں سے ہوتے ہوئے قمیص پر جذب ہوگئے۔ اور خط کا پرچہ اُٹھا سینہ پر چسپاں کردیا۔ گویا وہ مجسم عذرا ہے جسے وہ سمٹ سمٹ کر تنہائی میں پیار کر رہا ہے یہ موہوم تھا اور سراسر اتہام۔ نوجوانی کی غلط کاریاں تھیں اور بداعمالیوں کی روش۔

چاہئے تھا کہ عذرا کے ان مختلف پرچوں سے محمود کچھ سبق حاصل کرتا مگر اُسے اور بھی صداقت ہوگئی کہ اُس کی محبت کے جواب میں عذرا بہت حد تک صداقت رکھتی ہے۔ محمود۔ عذرا کا فریفتہ جمال اور شکار محبت ہوچکا تھا اور حق تو یہ ہے کہ بغیر اس کے اب صبر وسکون دشوار اور محال تھا۔

(۴)

عذرا کو دہلی کے اسٹیشن پر آؤ بھگت سے اُتار اگیا۔ علیحدہ ایک وسیع کوٹھی میں رہنے کو جگہ تھی۔ عذرا اکیلی نہ تھی۔ ساتھ بوڑھی اماں۔ ایک چھوکرا دو دو والا۔ اوستاد طبلچی بیسیوں کی تعداد میں ہمراہ تھے۔

شام کے وقت خود نواب صاحب عذرا کی مزاج پرسی کو حاضر ہوئے اور باتوں باتوں میں اس امر کا اظہار کردیا کہ دہلی اہل زبان ہونے کے باعث مشہور ہے گانے میں کہیں ایسی بات نہ رہجائے جو ہر موقعہ یا بعد از وقت پشیمانی نصیب ہو۔

مگر عذرا کوئی نادان گانے والی رنڈی نہ تھی باسمجھ تھی۔ ذہین تھی۔ خوبصورت تھی حسن کو سنوارنا خوب آتا تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ پڑھی لکھی تھی۔ ایک شریف مالدار نوجوان کو اپنے دامن محبت میں گرفتار کرنیکو اس میں سب سامان موجود تھے۔ دہلی کے گلی کوچہ میں عذرا کے گانے کی شہرت اور دہوم تھی۔ نواب صاحب اور بھی خوش تھے کہ اُن کے بعد اُن کے احباب کے حسب منشا گانا ہوا تھا۔ عذرا نے علاوہ مزدوری اور انعام واکرام کے اور بہت کچھ اس قلیل عرصہ میں کما لیا تھا۔ یعنی نواب اکرم بیگ کے چھوٹے بھائی نواب اکمل بیگ کو اپنی جال اور دلفریب اداؤں میں اسقدر پھنسا لیا تھا کہ ان دو چار دنوں میں وہ ہر سانس کے ساتھ عذرا کا نام لیتا۔ اوٹھتا بیٹھتا۔ عذرا کی تعریف کرتا۔ گانے کی محفل ختم ہو جانے کے بعد جب عذرا رہائشی کوٹھی میں جاتی

تو نواب اکمل بیگ لوگوں کی نظریں بچا کر وہاں پہنچتا اگر کسی غیر معمولی حس و حرکت کی وجہ سے کوٹھی کے اندر داخل نہ ہو سکتا۔ اِدہر اُدہر ٹہلتا اور واپس ہو جاتا۔ مگر عذرا ان تمام باتوں سے بیخبر نہ تھی وہ اپنے کمرے کے جھروکوں سے یہ سب کچھ دیکھتی اور دیکھہ دیکھہ کر خوش ہوتی۔

عذرا کو واپس جانے کو کہا گیا۔ شام کے وقت جب عذرا بمعہ اپنے آدمیوں کے دہلی اسٹیشن پر پہنچی اور گاڑی میں سوار ہوئی تو اپنی مجسّم کامیابی کو دیکھہ کر فرطِ انبساط سے باچھیں کھِل گئیں اور "آئیے نواب صاحب" کہہ کر کمپارٹمنٹ سے نیچے اُتر آئی نواب صاحب نے اِدہر اُدہر دیکھہ کر عذرا کو الگ ہونے کے لئے کہا۔ ان دو چار منٹ کی ملاقات کی گفتگو کا یہ خلاصہ تھا کہ وہ اب عذرا سے کمال عشق اور محبت رکھتا ہے اور بغیر اُس کے اب اُس کی زندگی یقینی طور پر بیکار اور بدمزہ رہے گی۔ عذرا نے بھی حسب ضرورت محبت کا معاہدہ کر لیا۔ مکّار عذرا نے اس بھولے ناتجربہ کار اکمل کی ہستی کو اپنے ڈوپٹے کے جھوتتے ہوئے آنچل سے آخری الوداع کہی اور گاڑی ایک آن کی آن میں دہلی سے کئی منزل دور تھی۔

(۵)

"مجھے حجاب اور ادب دونوں مانع ہیں کہ راز سربستہ اسطرح افشا کر دوں۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی تمہاری والدہ کے اُس خط کی نقل جو چند یوم ہوئے میرے والد مکرم کے نام موصول ہوا اس پرچہ کے ہمراہ تمہاری اطلاع کے لئے بھیج رہی ہوں۔ یہ خط گو اون کی بہن کا تھا مگر آجتک مضحکہ انگیز بنا رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُن کو تمہارے متعلق ایک ایک بات کی خبر ہے اور جب سے تمہارا رشتہ اتحاد کسی بازاری رقاصہ کے ساتھہ ہوا ہے میرے والد نے میری شادی کا بندوبست کہیں اور جگہ کر رکھا ہے۔

مجھے سخت رنج ہے کہ میری وہ خواہشات جن کے پورا ہونے کی امیدیں محض تمہارے ہی ساتھہ منسلک تھیں یوں برباد ہو رہی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم اپنی عقل سے کام لیتے اور جیسا کہ تمہاری باتوں سے ظاہر ہوا کرتا تھا میرے حاصل کرنے کے لئے ہر چند سعی کرتے۔ کالج کی تعلیم کو یوں نامکمل اور ادہورا چھوڑ دیا کہ فی زمانہ چار پیسہ بھی تمہاری قیمت نہیں ہو سکتی۔ میں حیران ہوں کہ اُس رقاصہ کو ایک شریف نوجوان جس کے ساتھہ کسی غریب بے بس لڑکی کی اُمیدیں وابستہ تھیں تباہ کرنے سے کیا ملا۔ کیا وہ تمہارا ساتھہ دیگی؟ یہ ہو نہیں سکتا۔ اُس کے لئے ایک چھوڑ سینکڑوں تم جیسے موجود ہیں۔

کسقدر تعجب انگیز ہے یہ منظر کہ تمہارے پاس اتنا اثاثہ بھی نہیں رہا کہ دو چار دن کے کھانے پینے کا

سامان بھی ہو سکے۔ اپنی بوڑھی اماں کو دیکھو اور اُس کے وہ دن بھی آنکھوں کے سامنے لاؤ جب اُس کا خاوند زندہ
تھا۔ دیکھو اب کیا حال ہے۔ یقیناً سے پچھلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ بیچاری اس غم میں مردہ ہو رہی ہے۔
غور کرو۔ تمہارے والد کو مرے ہوئے آج ایک سال مشکل سے ہوا ہو گا۔ وہ گھر جہاں دن رات پل پل
ہاتھی گھوڑے ہنہناتے تھے آج وہاں خاک اڑ رہی ہے۔ چالیس ہزار کی مالیت کا مکان ان دنوں میں جب
بنکر تیار ہوا تھا اور آج جس کی قیمت کچھ نہیں تو ستر اسی ہزار ہو سکتی ہے صرف پندرہ ہزار پر نیلام کرکے اس
بدبخت رقاصہ کے گھر ڈال دیا، افسوس۔ تم نے اپنی والدہ کا کوئی زیور ایسا باقی نہیں چھوڑا جو اسوقت اس بیچاری
کے کام آسکے۔ جاؤ، اب بھی وقت ہے اپنی والدہ کے قدموں کو پکڑ لو اور اپنے قصوروں کی معافی مانگو۔ کالج
کی تعلیم کو از سر نو پھر جاری کر دو۔
تمہاری تعلیم کے لئے میرے والد تمکو کچھ نہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے مگر جب سے انہیں تمہارے کارناموں کی
خبر ہوئی ہے گھر میں حکم دے رکھا ہے کہ میری بہن کے گھر ایک کوڑی تک نہ جائے گذشتہ دو چار ماہ جو روپیہ تمہیں
پہنچا تھا وہ سراسر میری کوششوں کا نتیجہ تھا۔
اغلب ہے اور تمہیں معلوم بھی ہو گیا ہو گا کہ میری شادی اسی ماہ کی آخری تاریخوں میں ہے اور جس سے میرا
رشتہ زندگی منسلک ہونے والا ہے وہ بھی کوئی غیر نہیں۔
اس خط کے جواب لکھنے کی فضول کوشش نہ کرنا ورنہ میری بے حرمتی ہو گی اگر ہو سکا تو میں کبھی کبھی بڑی
ماں کو کچھ نذر بھیج دیا کروں گی۔

اب آیندہ سے تمہاری ماموں زاد ہمشیر صغرا"

(باقی دارد)

(تصحیح کی تصحیح)

ماہ اگست کے زبان میں حضرت شاہ عالم صاحب قدس اللہ کی سنہ ولادت ووفات غلط چھپ گئی تھی
جس کی ستمبر نمبر کی "غلط آمیز تصحیح" کاتب صاحب کے خامۂ اعجاز رقم کی مرہون منت ہے لہذا ناظرین اس طرح درست
فرمالیں سنہ ولادت ۸۱۴ھ سنہ وفات ۸۸۰ھ اور اس غلط نامہ میں جہاں "قوسین میں" لکھا ہے وہاں
قوسین میں (خلیفہ جہانیاں جہاں گشت) بنا لیجیے۔

لطفِ نظّارہ

بہارِ باغ سے گو دل کو ہو جاتی ہے کچھ تسکیں — مگر جو بات دل میں ہے وہ گلشن میں نہیں ملتی
نگاہِ لطف فرما لاکھ ہو ممنونِ شادابی — نشاطِ روح کی لیکن کلی اس سے نہیں کھلتی

کسی معشوق صورت کو اگر میں دیکھ لیتا ہوں — تو آجاتی ہے دل میں خود بخود اک شانِ استغنا
اثر انداز اسکا حسن ہوگا کس طرح دل پر — کہ جس انداز کو دل چاہتا ہے وہ نہیں ملتا

نظر کے سامنے ہو ایک ایسا خوشنما منظر — کہ جسکی نزہت آگیں دلکشی پہ جان ہو شیدا
کہ جس کی روح پرور تازگی پر دل تڑپ جائے — بھرا ہو سبزۂ خودرو سے ایسا دامنِ صحرا

وہ صحرا جسکی وسعت۔ وسعتِ دل سے بھی بڑھکر ہو — نہ پہنچے جس کی مضبوطی کو استقلالِ انسانی
چلی جائیں ہزاروں پیچ و خم سے گھاٹیاں جسکی — زیادہ زلف سے ہو راستہ میں جس کے حیرانی

وہ صحرا جس کے ہوں آغوش میں بہتے ہوئے چشمے — وہ چشمے جن سے ہو جنگل کی آبادی کو سیرابی
پڑی ہو اسطرح پھولوں کی چادر جس سے ظاہر ہو — کہ ان کے بارِ احساں سے بھی جاتی ہے شادابی

نمایاں ہو سحر سے جب شفق گوں نور کا عالم — تو ہر اک چیز میں صحرا کے ہو انداز معصومی
بہارِ خرمی کیفیتِ قلبی پہ چھا جائے — مٹا دی خاطرِ آشفتہ سے اسباب محرومی

نشاطِ روح کے ہیں مرکزِ اصلی یہی جلوے — نہیں ہے دل کے بہلانے کا کچھ انکے سوا چارہ
یہی جلوے ہیں، جو کرتے ہیں پیدا ذوقِ روحانی — حقیقی طور پر حاصل ہے ان سے لطفِ نظارہ

قیصر (بھوپال)

تضمین

ناامیدی کی ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہوا　　اُن کے کوچے سے چلا میں دل کو سمجھاتا ہوا
مشعلِ دانش سے دکھلاتا طریقِ نیک و بد

اس گلی سے جا چکا ہے بارہا ناکام تو　　پھر بھی ہے محوِ فریبِ گردشِ ایام تو
ہو چکی رسوائیوں، ناکامیوں کی اب تو حد

ہو چکیں کتنی جفائیں تجھ پہ اے ناکامِ عشق　　مصلحت سے کام لے اور اب لے تو نامِ عشق
دامِ اُلفت سے رہائی کے لئے کر "جہد جد"

دل نے برافروختہ ہو کر دیا ایسا جواب　　بن نہ آیا مجھ سے کوئی اُسکی باتوں کا جواب
مصرعِ اوّل پہ چسپت ہو گیا پیرِ خرد

مجھ کو مقتل ہی ہی، دامن بھی کی نادہ اکو ہی دو رست　　میگریزم از جفائے دوست لیکن سوئے دست
چوں شرر خونم نہاں در تیغِ قاتل می شود

تلوک چند محروم

رباعیات

(زبان)

بک بک کی ہر اک شخص کی بیماری ہے　　کیا کیجئے مجبوری ہے لاچاری ہے
جاری رہتا تھا پہلے، دل عارف کا،　　اب دل کی جگہ، زبان ہی جاری ہے

ایضاً

چھوٹا سا یہ خنجر دل آزاری ہے　　زخم اس کا ہزار تیغ سے بھاری ہے
وہ نارِ سقر، کہ جس سے سب ڈرتے ہیں　　یہ سُرخ زباں اُسی کی چنگاری ہے

ایضاً

صورت کی طرح طرزِ بیان اچھی ہے　　تاثیر نہیں، تو، فغاں اچھی ہے
الفاظ بڑے سے بڑے مگر بے معنی　　دل چاہے خراب ہو زبان اچھی ہے

ایضاً

میرے لئے ہے خدا، جہاں تیرے لئے　　میرے لئے ہو مکیں، مکاں تیرے لئے
اے اپنی زباں پہ ناز کرنے والے　　دل میرے لئے ہو اور زباں تیرے لئے

امجد (حیدرآبادی)

عاشقِ مجاز سے

عشق میں کس کے عاشقِ جانباز — رنگ چہرہ کا ہو گیا ہے زرد؟
کیوں ہے مغموم، کیوں ہو پژمردہ — ہر گھڑی کیوں ہو لب پر آہِ سرد؟

سوکھ ہو گیا ہے کیوں کانٹا — کون سے گل سے تجھکو الفت ہو؟
کونسا ہے وہ لالہ رخ جس نے — کر دیا داغدار دل کو ترے؟

کون ایسی وہ چشمِ فتان ہے — اتنا جس کے لئے تو حیراں ہے؟
کس کی کاکل میں تو ہوا ہے اسیر — کس کی زلفوں میں پابجولاں ہے؟

کس کے رخسار پر تو ہے شیدا — کس زنخداں کی چاہ میں ڈوبا؟
کون ایسا ہے وہ پری تمثال — تیرے دل کو ہے جس نے موہ لیا؟

کیوں حسینوں پر مر رہا ہے تو — کیوں پرستش تو اُن کی کرتا ہو؟
کس لئے سر کو اُن کے آگے جھکا — تیرگی اپنے دل میں بھرتا ہے؟

چھوڑ دے عشق یہ مجازی ہو — اسمیں ہے جان و مال کا خطرہ
نہیں حاصل بجز فضیحت کے — اسمیں ہوتا ہے آدمی رسوا

عشقِ صادق کی ہے اگر خواہش — اُس صنم سے تو لو لگا اپنی
جس نے پیدا کیا تجھے انسان — اور مخلوق پر فضیلت دی

اختر جوناگڑھی

غزلیات

از جناب سید عابد علی صاحب عابد بی۔اے ایل ایل بی
پلیڈر۔لاہور

دل غیور شہید نیاز ہو نہ سکا
یہ آبگینۂ رنگیں گداز ہو نہ سکا

بہت بلند رہا رتبۂ وقار حرم
مگر صنمکدۂ گل طراز ہو نہ سکا

بھڑک رہا تھا مرے دل میں ایک شعلۂ عشق
جو نذر ضبط ہوا۔سرفراز ہو نہ سکا

دل نیاز کی تکمیل آرزو نہ ہوئی
شرار عشق بنا برق ناز ہو نہ سکا

سما گیا مری آنکھوں میں اشک خوں بنکر
جنون غم کا فسانہ دراز ہو نہ سکا

وقار حسن میں قایم رہی ادائے غرور
نظر فروز بنا دلنواز ہو نہ سکا

مری طرح سے غزل نغمہ ریز ہو نہ سکی
مری طرح سے کوئی گل طراز ہو نہ سکا

حرم کے گوشہ نشینوں میں جا رہا زاہد،
حریف شوخی حسن مجاز ہو نہ سکا

کچھ اس طرح سے پلائی کسی نے عابد کو
نہیں کہی نہ گئی۔احتراز ہو نہ سکا

(از جناب ابو الخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین بٹالوی)

ضبطِ غم نے مضطرب کو اور مضطر کر دیا
لا دوا تھا جو مرض قلب و جگر میں بھر دیا

حسن بخشا ناز بخشا حق نے مال و زر دیا
دل حسینوں کو دیا تو ظلم کا خوگر دیا

جان و دل میں رازِ غم کا آبلہ سا بھر دیا
ضبط کی تاثیر میں اک رنگ پیدا کر دیا

آؤ راہِ چشم سے آ کر تو، دل میں رہو
پردہ داروں کے لئے اللہ نے یہ گھر دیا

خاک ہوتا اُن پہ میری آہِ سوزاں کا اثر
جب خدا نے ہی اونہیں دل کی جگہ پتھر دیا

ہجر کی آتش میں جلنا دل کو بخشا عشق نے
جس سے جل جائے فلک وہ آہ میں اخگر دیا

حشر تک ساجد رہیگا آستانِ یار پر
اللہ، اللہ، باوفا، اللہ نے کیا سر دیا!!!

جانتے تھے راہِ الفت میں بھٹکنا ہے ہمیں
پھر بھلا کیوں اس کٹھن منزل میں رہبر دیا

لے اُڑے عرشِ معلیٰ پر نہ کیوں شوقِ سخن
حق نے پروازِ تخیل کے لئے یہ پر دیا

از ناظم الاخلاق حضرت ذہین (حیدر آباد)

عشق تو نے مشکلوں کو مجھ پہ آساں کر دیا
میری ہر اک آرزو کو وقفِ حرماں کر دیا

آتشِ الفت کی حدت میں گیا یہ دودِ آہ
رازِ پنہاں تو نے سوزِ دل نمایاں کر دیا

خود کو بیگانہ سمجھ کر کہہ دیا یکتا اسے
جلوۂ حسنِ ازل نے مجھ کو حیراں کر دیا

زیست کی امید کب تھی کشتۂ انداز کو
اور کچھ دن عشق نے جینے کا ساماں کر دیا

دیکھتا تھا آنکھ اٹھا کر حور کی جانب نہیں
زاہدِ دنیا تو نے کیوں مجھ کو پریشاں کر دیا

رحمتِ باری کو دیکھا جوش پر میں نے ذہین
کثرتِ عصیاں نے جب مجھ کو پشیماں کر دیا

جناب منشی بشیشر پرشاد صاحب منور خلف حضرت آفق مرحوم لکھنوی

دل سے ایک آہ کی درد کا مزا لیا ۔ صبر یوں ہزار بار ہمنے آزما لیا
صدقے اس حبیب کے جو ہو درد آشنا ۔ گر پڑا اگر کوئی دوڑ کر اٹھا لیا
سوز و ساز عاشقی کچھ ازل سے تھا پسند ۔ ہمنے خود ہی مانگ کر دل غم آشنا لیا
اسقدر ہے دہر میں بے وفائیوں کا زور ۔ جل اسی نے دی ہمیں جسکا آسرا لیا
ذرہ ذرہ خاک کا مظہر جمال ہے ۔ جس کی جستجو میں تھے اسکو ہمنے پا لیا
آنکھ بند جب ہوئی عالم خیال میں ۔ آستان یار کا دل نے راستہ لیا
خواہ رہکے آڑ میں خواہ آکے سامنے ۔ کام اپنا آپنے ہر طرح بنا لیا
خون ہے خموش کیوں کشتگان ناز کا ۔ کس نے اپنے ہاتھ میں خنجر جفا لیا
پاؤں ہے رکاب میں یہ بھی تو بتائے جا ۔ تمنے رخت آخرت اپنے ساتھ کیا لیا
حسن بے نیاز نے دھمکیاں قضا کی دیں ۔ جس نے انکے سامنے نام عشق کا لیا
بچ گیا منور آج ورنہ خیریت نہ تھی ۔ درد اٹھا تھا اگر ضبط نے دبا لیا

از خاکسار عبد الرحمن خوشتر منگرولی مدیر رسالہ ہذا

فلک ہے دیر سے تجویز میں بجلی گرانے کی ۔ الٰہی خیر ہو آفت زدوں کے آشیانے کی
یہ مانا ہمنے حوران جناں بھی خوبصورت ہیں ۔ مگر ان میں کہاں ایسی ادائیں دل لبھانے کی
چھڑاؤ لاکھ لیکن چھٹ نہیں سکتی ہے اے زاہد ۔ بری ہوتی ہے عادت دختِ رز کو منہ لگانے کی
ہمیں بھی مہرباں ہو کر کبھی جلوہ دکھا دینا ۔ نکل آئے اگر صورت کوئی صورت دکھانے کی
مری عرض تمنا پر بگڑ کر وہ یہ کہتے ہیں ۔ کہاں ہو ہوش میں آؤ کرو باتیں ٹھکانے کی
صبا نے چال، پھولوں نے چرایا رنگ گلشن میں ۔ اڑائی طرز غنچوں نے تمہارے مسکرانے کی
وہ مجھسے میرا حالِ درد دل سنکر یہ کہتے ہیں ۔ مناسب ہے یہ عادت چھوڑ دو باتیں بنانے کی
دہان زخم دل پر بھی تبسم آہی جاتا ہے ۔ ادا جب یاد آتی ہے تمہارے مسکرانے کی

نہیں اپنے بھی جب اپنے تو پھر کیا ذکر غیروں کا
بہت نازک ہے خوشتر آجکل حالت زمانے کی

اخبارِ علمیہ

جنین کی جنسیت حسبِ خواہش والدین

ایک حاملہ عورت کی تشخیص کا مسئلہ کہ وہ لڑکا جنے گی یا لڑکی، عرصۂ دراز سے سائنسدانوں کا مرکز توجہ ہے مگر اب تک بقول مسٹر وسچر (Vischer) اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ دریافت نہیں ہو سکا جسکو سائنٹفک اصول پر تسلیم کیا جا سکے۔

آجکل اس سے بھی زیادہ اہم اور پیچیدہ مسئلہ کو حل کرنے میں سائنسدانوں کی ایک جماعت منہمک ہے۔ یعنی کہ جنین کی جنسیت والدین کی خواہش کے مطابق ہو سکتی ہے۔ اگرچہ نباتات اور حیوانات پر اس کے تجربات عمل میں آرہے ہیں اور ان سے بعض اہم نتائج کا انکشاف ہوا ہے تاہم ماہرین علم الانسان اور اطبا کے مابین اس امر میں بہت کچھ اختلاف رائے ہے کہ ان تجربات کا علم انسانوں پر بھی چسپاں کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

زلزلوں کی پیشین گوئی کرنیوالہ آلہ

سائنس کی عجیب و غریب اختراعات میں سب سے اہم وہ ایجاد ہے جس کے ذریعہ سے زلزلہ زمین کی خبر فوراً معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ آلہ معمولی تھرمامیٹر کا سا ہوتا ہے۔ اس کا موجد ڈاکٹر طامس۔ اے جیگر ہے جو علم زلزلۂ ارضی کا ماہر ہے۔ بقول اس کے یہ آلہ زلزلۂ زمین کی خبر منٹ اور سکنڈ کے حساب سے ایسی ہی صحیح طور پر دے سکتا ہے جیسی کہ جزائر فلپائن میں طوفان کی آمد کے وقت وہاں کا ایجاد شدہ آلہ صحیح طور پر بتا دیتا ہے۔ اس آلہ کے دو حصے ہیں۔ اس کا ایک حصہ زمین پر ایک پیندے میں جما دیا جاتا ہے اور دوسرا حصہ عمارت کے کسی مناسب حصہ میں لگا دیا جاتا ہے۔

تصحیح رسالہ زبان بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
سرورق	۳	وَجَدْتُ	وَجَدْتُ
"	"	قُانُّ	قَان
"	"	فَقُلْ	فُقُل
۱	فہرست مضامین	ترجمات ۱۰	ترجمات.. از قاضی محمد ریاض صاحب اختر جونا گڈھی
۱	"	اخبار علمیہ.. "ف"	اخبار علمیہ.. از قاضی محمد رضا صاحب اختر جونا گڈھی
۱	"	کونل سے...	کونل سے.. از قاضی محمد نقیب صاحب اختر جونا گڈھ
۲	۸	مطالبات	مطایبات
"	"	المزح فی الکلام المليح فی الطعام	المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام
"	۱۰	دلبتگی	دلبستگی
۵	۴	مقابلۂ افتتاحی	مقالۂ افتتاحی
۶	۱	سرودیں پناہ	سرپرست دیں پناہ
"	۲	والی ریاست منگرول	والی ریاست منگرول نے
"	۵	اہل نہیں ہوئے	اہل نہیں ہوتے
۸	۲	پورا ہ	پُر رہ
۱۱	۱۰	ظلم لفلک	ظلم الفلک
۱۲	۹	کوبی بھی	(زیادہ ہے)
"	۱۵	فلاسفر	فلاسفہ
۱۳	۵	علما سے	علما نے
۱۴	۱۳	بدور اسلام سے	بدرِ اسلام سے
۱۵	۹	اعلی الرغم	علی الرغم
"	۱۲	رطب اللسان ہیں	رطب اللسان ہے
۱۶	۱۰	اسلام جونام ہے	اسلام نام ہے
"	۱۲	مقصد صرف ہے	مقصد صرف یہ ہے
۱۷	۲	ان اموز	ان امور
"	۲۱	مبارہو	مبارک ہو
۱۸	۸	جس کی عقلیں	جن کی عقلیں
۱۸	۱۸	کردی ہے یہ	کردی ہے کر
۱۹	۸	چارسلہ خاندان سے	چارسلہ خاندانوں سے
۱۹	۱	آزری	آزدی
۲۱	۸	بحرالکاہل کے پاس	بحرالکاہل کے پار
"	۱۹	ڈاوچواکنتا اینائی	ڈاوچواکنتا منتا اینائی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲	۱۲	دار ویدون کو	دار ویدیوں کو
۲۴	۲	شراب ملانے والوں	شراب پلانے والوں
"	۵	طلب وبیطاری	طبب و بیطاری
"	۹	تعقید وتکلیف	تعقید و تکلیف
۲۵	۱۴	یاقوت ہموی	یاقوت حموی
۲۶	۲	پچاس برس کردیئے	پچاس برس صرف کردئے
۲۸	۱۹	تیری زبان کو کیا گوئی کی ضرورت	تیری زبان کو کیا گویائی کی ضرورت
۲۹	۳۰	ٹی سنڈر لین	ٹی سنڈر لینڈ
"	۱۸	تعلیمی مطالہ کا اس عدر	تعلیمی مطالبہ کا اس قدر
۳۰	۲	رفتہ	رفتہ رفتہ
۳۰	۱۵	فرد کاری	مزدکاری
"	۱۵	کہیں سے زیادہ	کہیں زیادہ
۳۲	۱۴	دریافت کرلیا	دریافت کرلیا تھا
۳۳	۳	ازدواور مایا	ازدادر مایہ
۳۴	۱۲	چاپی رہی تھی	چائے پی رہی تھی
۳۵	۵	جرم اقرار دیا	جرم قرار دیا
"	۸	مبتلا ہولیگیں	مبتلا ہوگئیں
"	۲۱	محبت کیوں کریں	محبت کیونکر کریں
۳۹	۲	اہلیہ مغرمہ	اہلیہ محترمہ
"	۱۹	کیا تھا کیا ہوگا اس سے کیا حاصل	کیا تھا کیا ہوگا اس سے کیا حاصل؟
۴۰	۱۲	صرف اک نظر	صرف ایک نظر
۴۱	۱	دیجھنے	چھبنے
"	۶	پتہ دیتا ہے	پتہ دیتا ہے۔
"	۸	ہوا کا جھوں کا	ہوا کا جھونکا
۴۲	۳	نبشین	بینشیں
"	۶	رحمت	زحمت
۴۵	۷	محکمہ صنعت وحرفت کے	محکمہ صنعت وحرفت سے
۴۵	۹	کلیسائے پریش	کلیسائے پیرش
۴۵	۱۰	نشو ونما کی اور حفاظت	نشو ونما اور حفاظت
		کھیل کھیلئے	کھل کھیلئے

زبان

جلد ۱ — فہرست مضامین ماہ نومبر سنہ ۱۹۲۶ء — نمبر ۵

زبانِ خلق

از جناب منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی:-

رسالہ زبان کا پہلا نمبر پہنچا آپ نے اس کو کامیاب بنانے میں جس قابلیت دعرق ریزی سے کام لیا ہے وہ ہر طرح سے قابل تحسین ہے کاٹھیاواڑ جیسے مقام کو اردو علم وادب کے جیسے قابل قدر پرچہ کی ضرورت تھی اسکو آپنے بہ احسن الوجوہ اپنی اولوالعزمی سے پورا کر دکھایا دعا ہو کہ خدا وند تعالیٰ آپکے ارادہ میں برکت دے اور اسکو ترقی روزافزوں نصیب کرے بالفعل و تظلیں رسال خدمت ہیں اور آئندہ بھی انشاء اللہ قلمی معاونت میں دل سے آیکا

از جناب مولینا سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی، پروفیسر

آپ کی ہمت مردانہ اور ذوق علمی کی مدح کرتا ہوں کہ باوجود رسالوں کے ناکامیاب ہونے کے آپ نے کاٹھیاواڑ ایسے ملک سے ایک ادبی اردو کا رسالہ جاری فرمایا۔ خدا اُسے مقبول کرے اور آپ کی تمنا برآئے۔

از جناب محمد ایوب صاحب شمیم بی۔ اے۔ بی ٹی۔ ایم۔ آر۔ ایس۔ اے

آپ کا رسالہ نمبر ۲ نظر سے گذرا ماشاء اللہ خوب پرچہ ہے۔ میں آپ کی اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔۔۔۔ میری رائے ہے کہ حتی الوسع اعلیٰ مضامین کی فراہمی کا زیادہ خیال رکھا جائے تاکہ ناظرین کو رسالے سے کافی دلچسپی رہے۔ اس کا خیال انشاء اللہ میں بھی رکھوں گا۔

از جناب سعید رزمی صاحب (بھوپال)

رسالہ زبان معہ گرامی نامہ کے پہنچا۔ آپ کی کامیابی مستحق مبارکباد ہے خدا آپ کی کوششوں کو بارآور کرے۔۔۔۔۔۔ آپ نے ایک ایسے مقام سے رسالہ جاری کیا ہے جہاں اردو پر کس مپرسی کا عالم ہے اُس کی امداد ضروری ہے۔

از مولینا رشید احمد صاحب صدیقی (مرتب سہیل علیگڈھ)

زبان کی قلمی اعانت ہمارا فرض ہے آپ کے مساعی نہایت مبارک اور قابل ستایش ہیں خدا کرے آپ دقتوں سے جلد نہ گھبرائیں مجھ سے آپ نے قلمی اعانت کے لئے اصرار کیا ہے

مولینا راجکوٹی (پروفیسر عبدالعزیز صاحب) مدظلہٗ کے ارشادات اس پر مستزاد ہیں میں سوچتا ہوں کہ آخر کیا لکھوں
بہرحال دیکھئے اگر خدا کو منظور ہے تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔

مولوی عبدالستار صاحب فاروقی :-

کرمی خوشتر صاحب سلام مسنون

زبان پہنچا شکریہ اس کی تدریجی ترقی دیکھکر طبیعت کو ایک گونہ اطمینان وخوشی حاصل ہوئی ہے اس کے مضامین ان لاہوری پرچوں کے مقابلہ میں بہت پسند ہیں جن کی ظاہری ٹیپ ٹاپ تو بہت ہوتی ہے لیکن مضامین تمامتر بیکار وغیر مفید۔ ان کا ۴/۳ جزو ادب لطیف جن کو کثیف کہنا زیادہ موزوں ہوگا پر مشتمل ہوتا ہے
"زبان سبھا" میں "ملا رموزی" کی شرکت بہت ضروری تھی خدا کا شکر ہے کہ آپ ان کو ہمیشہ کے لئے کھینچ لائے، خدا نے چاہا تو اب اردو جرنلیزم کے ایوان میں زبان کو ایک مستقل سیٹ (جگہ) مل جائیگی جیسا کہ لیگ اقوام میں جرمنی کو مل گئی ہے۔ حالانکہ بہت سی حکومتیں اس کے لئے کوشاں تھیں اور ہیں اسی طرح ایوان اردو جرنلیزم میں جگہ پانے کے لئے بہت سے رسائل ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن وہ منزل ابھی ان کے لئے بہت دور ہے۔

جناب سعید زرمی صاحب :-

خوشتر صاحب

رسالہ پہنچ گیا۔ کارڈ بھی ملا زبان کی ترتیب میں آپ محنت وقابلیت صرف فرما رہے ہیں۔ مضامین بھی مفید اور بلند معیار کے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ آپ نے ایک ایسے ناموزوں مقام سے رسالہ جاری کرکے "اردو" سے اپنی محبت اور فرض شناسی کا ثبوت پیش کیا ہے خدا کرے کہ آپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔ اہل قلم حضرات کو آپ کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ ہر چند میں اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا۔ لیکن آپ کا محبت آمیز ارشاد واصرار مجبور کن ہے انشاءاللہ جلد کوئی مضمون پیش کرونگا۔

صفحۂ ادارت

ہم اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے یہ ضرور کہیں گے کہ "زبان" جس نکتہ نظر سے جاری کیا ہے اس نے اب تک اس کا کوئی عملی ثبوت نہیں دیا یعنی "زبان" اہل کاٹھیاواڑ کی خدمت میں سلیس اور سریع الفہم لٹریچر پیش کرنے سے جس کو بوجہ سادگی وروانی ایک بچہ بھی سمجھ سکے عاجز رہا ہے۔ اس ہمیں بہت صدمہ ہے لیکن کیا اہل ملک نے بھی (ہمیں بار بار اس کے اعادہ سے ندامت معلوم ہوتی ہے) کبھی اپنی ذمہ داری کا احساس کیا؟

دفتر میں اس قسم کے بہت سے خط موصول ہوئے ہیں کہ "زبان کی زبان بہت مشکل اور ادق ہوتی ہے" اگر یہ شکایت درست مانی جائے تو اس حیثیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ "ایک علمی رسالہ کے لحاظ نوعیت مضامین اپنی زبان اور استعمال علمی اصطلاحات سے گریز ایک ناگزیر امر ہے۔"

تاہم اگر مضامین نگار حضرات تھوڑی سی توجہ مبذول فرمائیں تو یہ مشکل آسانی سے حل ہوسکتی ہے چنانچہ بقول سرورش[۵] لکھنوی "کیا اچھا ہو اگر اس پرچہ میں یہ خصوصیت پیدا ہو جائے کہ اس کے سب مضامین چاہے وہ نظم میں ہوں یا نثر میں فارسی علت و اضافت سے پاک ہوں .... مجھ جیسے اور لکھنے والے جن سے ایڈیٹر صاحب نے قلمی مدد مانگی ہو، میں ان سے بھی یہی درخواست کرونگا کہ وہ جہاں تک ہوسکے، آسان زبان میں لکھنے کی کوشش کریں۔"

اسی طرح عربی و فارسی کے ایسے ادق اور دشوار الفاظ جن کے ہم معنی و مترادف الفاظ ہندی اردو میں موجود ہوں استعمال نہ کریں اور سادہ اور متعارف الفاظ تحریر فرمائیں اور ساتھ ہی ادائے مطالب کا پورا پورا لحاظ رکھیں تو ناظرین زبان کے لئے بہت کچھ سہولت اور آسانیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ امید ہمارے مقالہ نگار آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔
اڈیٹر

---

[۵] دیکھو زبان بابت اگست زبان خلق کے آخر پارسے۔۱۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زبان

ماہ نومبر ۱۹۲۶ء

مقالات

ناصر الدنیا والدین ملک نائب خسرو خاں گجراتی

(از مولینا ابو ظفر صاحب ۔ ندوی پروفیسر گجرات مہا ودیالہ احمد آباد)

ذیل کا گراں بہا تاریخی مضمون مولینا ابو ظفر صاحب ندوی نے ہماری استدعا پر توجہ فرما کر زبان کے لئے مرحمت فرمایا جس کے لئے ہم ان کی خدمت نہایت خلوص کے ساتھ ہدیۂ شکریہ پیش کرتے ہوئے امیدوار ہیں کہ آیندہ بھی زبان کے صفحات کو تاریخی معلومات سے مالامال فرمائیں گے۔

موصوف کا نام دنیائے ادب میں ہماری تعریف و توصیف سے مستغنی ہے آپ دارالعلوم ندوۃ العلما کے فارغ التحصیل اور اردو کے ایک زبردست انشاپرداز ہیں کچھ عرصے سے آپ احمد آباد کی گجرات مہا ودیالے کے پروفیسر ہیں" گجرات کی ایک مکمل و مبسوط تاریخ اردو میں تالیف فرمارہے ہیں جس سے امید ہے کہ اردو کے سرمایہ میں ایک نمایاں اضافہ ہوجائے گا۔

ایڈیٹر

خسرو خاں گجراتی کو تاریخ میں لوگوں نے بہت کم وقعت دی ہے۔ جس کا سب سے بڑا سبب ناجائز طریقہ سے حصول حکومت ہے۔ یا یہ کہ بہت ہی پیچ قوم کا آدمی تھا۔ لیکن یہ دونوں جرم کچھ ایسے مہاپاپ نہیں

ہیں۔ جن کا ارتکاب صرف خسرو خاں گجراتی ہی نے کیا ہو۔ بلکہ نظر غور سے دیکھو تو دنیا کا کوئی حصہ ایسے اولوالعزم فاتح کی تاریخی مثالوں سے خالی نہ ہوگا۔ قیصر، نپولین، سبکتگین، قطب الدین ایبک، چنگیز، نادر شاہ ان میں سے کون اعلیٰ خاندان رکھتا تھا۔ مول راج سولنکی اور علاء الدین خلجی نے تخت و تاج ٹھیک اسی طرح حاصل کیا۔ جیسا خسرو خاں نے۔ خسرو خاں گجراتی نے قطب الدین کی غفلت سے جو فائدہ اٹھایا وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ ذاتی حیثیت سے اپنی قوم اور ملک کے لئے جس طرح عقل و فراست سے کام لیا۔ اس کے باعث اس کے فخر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ ایک دوسری بات ہے کہ بعض موانع کے باعث وہ مقدم الذکر اشخاص کی طرح دنیا کا کامیاب بادشاہ نہ ہوسکا۔

نام و نسب و قوم کی تحقیق

یہ شخص گجرات کا رہنے والا تھا۔ اور قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کا وطن اصلی نہروالا پٹن کے پاس تھا۔ اس کے عروج کے زمانہ میں جبکہ بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کیا جارہا تھا۔ اس کے آس پاس تمام رشتہ دار نظر آتے ہیں۔ لیکن قریب ترین رشتہ دار یعنی باپ کہیں نظر نہیں آتا۔ اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ ابتدائے عمر میں وہ فوت ہوچکا تھا۔ مذہباً یہ ہندو تھا۔ اس کی ذات کے متعلق مورخوں کی رائے مختلف ہے۔ مورخ برنی اور فرشتہ نے "پروار" بہ بائے فارسی لکھا ہے۔ اور پرواری قوم گجرات میں ڈھیڑ (بھنگی)، لوگوں کو کہتے ہیں۔ بدایونی نے "بروار" بہ بائے عربی تحریر کیا ہے۔ اور گجرات گزیٹیر نے اسی کی تشریح کی ہے۔ کہ بروار، گجرات میں ایک شاخ کاٹھی اور آہیر وغیرہ کی ہے۔ جس کو بابریا بھی کہتے ہیں، یہ لوگ عموماً ملازم پیشہ ہوتے ہیں۔ گجرات کی عربی تاریخ ظفر الوالہ نے بھی برواری لکھا ہے۔ بعض لوگوں نے "پرمار" کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ راجپوتوں کی شاخ ہے جو گجرات اور مالوہ میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ عام مورخین اس پر متفق ہیں کہ خسرو خاں ادنیٰ قوم (ذات) کا آدمی تھا۔ اور راجپوتوں کی ذات ادنیٰ میں شمار نہیں کی جاتی۔ میرے خیال میں لفظ "پروار" اور "بروار" دونوں کی اصل "بھرواڑ" ہے۔ جو فارسی اور عربی قالب میں ڈھل کر پروار اور بروار ہوگیا ہے۔ گجرات میں "بھرواڑ" قوم بکثرت ہے۔ جن کا پیشہ بھیڑ، بکریاں چرانا ہے۔ اردو میں اس کے لئے لفظ "گڈریا" کا ہے۔ ہندو قوم ان کو نیچ ذات سمجھتی ہے۔ یہ لوگ مالوہ اور مارواڑ سے لے کر بمبئی تک بکریاں چراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ایسا ہے کہ خسرو خاں اسی قوم بھرواڑ

…تھا یہ قوم جنگلوں میں زندگی بسر کرنے کے سبب دلیر، بہادر، اور باہمت ہوتی ہے۔

…ش و
…لیم

خسرو خاں کے باپ کی طرح خود اُس کا بھی اصلی نام پروؤ خامیں ہے۔ اس کا مذہب کسی طرح تبدیل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق خاموش ہے۔ لیکن قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی تربیت اور صحبت سے متاثر ہو کر اس طرف مائل ہوا۔ غالباً بکریاں چرانے کے سلسلہ میں اس کا خاندان مالوہ نکل گیا تھا۔ کہ جنگ مالوہ شروع ہوئی اور اسیر …یا گیا۔ اور ملک شادی حاجب سلطان علاء الدین نے اس کی پرورش کا بار اپنے سر اُٹھالیا تبدیل …ے بعد اس کا نام "حسن" رکھا گیا۔ مورخوں نے عہد علائی میں متذکرہ بالا بیان کے سوا اور کسی قسم …ہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عہد علائی میں یہ غیر معروف رہا۔ جس کا سبب یا تو یہ ہو کہ صغیر السن …ے باعث کسی کام میں دخل نہ دے سکا۔ اور یا یہ کہ بڑے بڑے جنرل اور تجربہ کار اشخاص اُس عہد …د تھے۔ جن کے آگے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔ غرض ۷۱۶ھ میں جب سلطان قطب الدین تخت …بض ہوا۔ تو حسن قطب الدین کے دربار میں باریاب ہوا۔ ملک شادی کے زیر نگرانی اس نے جو …اصل کی۔ اب اُس کے اظہار کا وقت آگیا تھا۔ چنانچہ یہ تفصیل اُس کے کارنامے لکھے جاتے …ی علوم و فنون کے متعلق تاریخ کی زبان گنگ ہے۔ لیکن جنگ تعلق اور مدراس کے حملوں …ناسے تاریخ کے صفحوں پر ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فن جنگ میں وہ کافی ماہر تھا۔ اور …مام مذاق کے مطابق اس میں خوب مہارت بہم پہونچائی تھی۔

…الات و
…علقات

۷۱۸ھ میں قطب الدین خلجی جب دیوگڈھ کی بغاوت فرو کرنے گیا۔ تو خسرو خان حسن ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے حسن لیاقت اور کارہائے نمایاں کو دیکھ کر سلطان قطب الدین نے "خسرو خاں" کا خطاب عنایت فرمایا۔ اور اس کی بڑی عزت افزائی فرمائی۔

اگرچہ مورخ ضیاء برنی نے خسرو خاں گجراتی کے متعلق اکثر مقامات پر متعصبانہ کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ادنیٰ فکر و غور سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ زمانہ کے اقتضاء سے جو کچھ خسرو خاں …نے کیا وہ صحیح کیا۔ سلطان قطب الدین اپنے باپ سلطان علاء الدین کی طرح جو ملک کافور کا بیحد …ہو گیا تھا۔ خسرو خاں پر بہت زیادہ مہربان نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب دیوگڈھ سے واپس ہوا۔ تو …ے تجربہ کار اشخاص کی موجودگی میں خسرو خاں کو چتر اور دورباش دیکر تلنگانہ اور معبر (مدراس)

روانہ کیا۔ علاءالدین نے جس طرح ملک کافور کو با اختیار کرکے ملک دکن پر حاوی کردیا تھا۔ قطب الدین نے بھی خسرو خاں گجراتی کو معبر کا مختار کل بنادیا۔ خسرو خاں گجراتی بڑے ساز و سامان کے ساتھ مع امرا دولت دیوگڈھ سے پہلے تلنگانہ میں آیا۔ اور وہاں کے راجہ سے بعد محاصرہ ایک سو سے زیادہ ہاتھی اور بے شمار مال و دولت وصول کرکے "متعلی" کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں سے بھی نوسو بیس ہاتھی اور ایک ٹکڑہ الماس کا جو وزن میں پانچ درم تھا لے کر معبر پہونچا۔[۵۱] موسم برسات آگیا تھا اسلئے اس نے اسی جگہ چندے قیام کیا۔ اسی مقام پر ایک مسلمان تقی نامی سوداگر بڑا مالدار تھا اس نے صرف یہ سمجھ کر کہ مسلمانوں کا لشکر یہاں آیا ہے۔ جو مسلمانوں کو نہیں ستانے کا۔ اسی جگہ مقیم رہا۔ خسرو خاں گجراتی نے اس کو گرفتار کرلیا۔ اور اس کا تمام مال ضبط کرکے داخل خزانہ شاہی کیا۔ اور افسوس یہ ہے کہ یہ مظلوم مسلمان باوجود ان تمام مصائب کے بھی اپنی زندگی کو محفوظ نہ رکھ سکا۔[۵۲] خسرو خاں گجراتی بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ قطب الدین کی بدمستی اور عیش پرستی کو دیکھ کر ملک کافور کی طرح اس میں خود مختاری کی ہوس پیدا ہوئی۔ اور ایسا ہونا اس عہد کے لحاظ سے ایک قدرتی بات تھی۔ ایک ادنیٰ شخص کو اس قدر جلد بڑے بڑے عہدے اور خطابات دیئے گئے ہوں اور پھر ایک جرار لشکر اس کے ماتحت ہو۔ مال و دولت کا انبار بھی سامنے لگا ہو۔ اور پایہ تخت سے دور ایک خود مختار حاکم کے مثل رہتا ہو۔ تو اسکے دل میں ایسی خواہش کا پیدا ہونا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ چنانچہ بعض ہندوں اور ملک کافور کے بقیہ لوگوں کو ملاکر اس امر کے لئے مشورہ کرنے لگا۔ خسرو خاں گجراتی جب تک معبر میں رہا دن رات اسی دھن میں لگا رہا۔ کہ کس طرح تمام امرا سلطنت کو ملالیا جائے۔ یا خاتمہ کرکے خود مختاری کا اعلان کرے۔ جب یہ مشورہ عام طور پر مشہور ہو گیا۔ اور لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ تو فوجی سرداروں میں سے ملک تمر ملک تلبغہ یغدہ نے خسرو خاں گجراتی کو پیغام بھیجا کہ ہم نے سنا ہے کہ تم بغاوت کا ارادہ رکھتے ہو اور یہاں سے واپسی کی نیت نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ ہم ایسا نہیں کرنے دیں گے اور قبل اس کے کہ ہم تم کو مجبور کریں۔ بہتر ہے کہ تم واپسی کا ارادہ کرلو۔ اسی طرح ڈرا دھمکا کر خسرو خاں گجراتی کو واپسی پر مجبور کیا بموجب حکم سلطانی خسرو خاں کو دیوگڈھ سے پالکی پر سوار کراکر سات دن میں دہلی پہونچا دیا گیا۔ قطب الدین

۵۱ بدایونی صفحہ ۲۱۲ جلد ۱۔ ۱۲

۵۲ یہ تمام کام ایسے ہوئے جیسے نصرت خاں نے کھمبات فتح کرتے وقت تاجر بغدادی کے ساتھ کیا۔ ۱۲

اس کو دیکھتے ہی نرم ہوگیا۔ اس کے حسن خداداد اور چرب زبانی سے مسحور ہوگیا۔ اس نے بھی میٹھی میٹھی زبان سے امرارِ کبار کی سخت شکایت کی۔ اور اپنی سرکشی کے الزام کو اس طرح دور کیا۔ کہ یہ امرار کبار مجھ پر بغاوت کا جھوٹا الزام صرف اس لئے عائد کرتے ہیں کہ وہ فضیلت جو ان پر آپ نے مجھے عنایت فرمائی ہے۔ انہیں پسند نہیں۔ اور اس لئے مجھے آپ کی نظروں سے گرانا چاہتے ہیں اور یہ سب گواہ جھوٹے ہیں۔ بادشاہ نے یہ سب سچ سمجھ کر گواہوں کو مروا ڈالا۔ اور امرارِ دولت کی سخت توہین کی۔ اور ان میں سے اکثر کی جاگیریں واپس لے کر خسرو خاں گجراتی کو دیں۔ ان باتوں سے تمام امرار دولت خوف زدہ ہوگئے۔ اور بضرورت زمانہ خاموشی اختیار کر لی۔ جب خسرو خاں نے دیکھا کہ اب زمانہ ہمارے موافق ہوگیا ہے۔ تو اس نے ۸۱۷ھ میں بادشاہ سے شکایت بیجا کر کے ملک دینار ظفر خاں کو گجرات سے طلب کرا کر قتل کروا دیا۔ اور اس کے بجائے اپنے بھائی (ملک حسام الدین) کو گجرات کا گورنر بنا کر بھجوا دیا۔ یہ کارروائی ایک خاص غرض سے کی گئی تھی جس کی تفصیل یہ ہے کہ خسرو خاں گجراتی نے جب دیکھا کہ جو خود مختاری کا خواب معبر میں دیکھا تھا بدقسمتی سے اس کی تعبیر غلط نکلی۔ لیکن زمانہ کے موافق ہوتے ہی پھر جنون شروع ہوا۔ اور اس دفعہ اس نے پہلے سے بھی زیادہ دور کی سوچی یعنی گجرات جو وطن ہے۔ اس پر قبضہ کر لیا جائے۔ خیال یہ تھا کہ وہاں دولت حاصل کر کے اور فوجی بھرتی کے ذریعہ خاص وطن میں ہموطنوں کی امداد سے خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اور گمان یہ تھا کہ یہ کام بآسانی حاصل ہو جائیگا۔ اور اسی لئے بے چارہ ملک دینار کو قتل کروا دیا۔ اور اپنے بھائی حسام الدین کو دولت اور فوجی طاقت حاصل کرنے کے لئے گجرات کی گورنری دلوائی۔ لیکن نالایق ہونے کے سبب اس کام کو انجام نہ دے سکا۔ بلکہ سچ پوچھو تو نقصان پہونچایا۔ قطب الدین کی آنکھیں ہوتیں تو خسرو خاں گجراتی کے دونوں فریب ظاہر ہو جانے پر کافی بندوبست کر سکتا تھا۔ لیکن وہ بادۂ غفلت میں اس طرح مست تھا۔ کہ اس وقت بھی مدہوش رہا۔ اور خسرو خاں گجراتی اور حسام الدین گجراتی پر ایسا ہی بھروسہ کرتا رہا جیسا باپ کو لڑکے پر یا عاشق کو محبوب پر ہوتا ہے۔

خسرو خاں گجراتی نے دیکھا کہ یہ وار بھی خالی گیا۔ اور حسام الدین گجرات میں کوئی خود مختار سلطنت قائم نہ کر سکا۔ جس کی خسرو خاں گجراتی کو دلی خواہش تھی۔ دونوں مرتبہ تجربہ سے ثابت ہوگیا۔ کہ یا یہ تخت سے باہر ابھی علائی سردار موجود ہیں جو کام بننے نہیں دیتے ہیں۔ اسلئے اس بار

فدا زیادہ بلند پروازی سے کام لیا۔ اس نے خیال کیا کہ اس کا حل صرف اسی صورت سے ہو سکتا ہے کہ امرائے دربار کو ذلیل کر کے دہلی سے باہر نکال دیا جائے۔ یا اپنے ساتھ مل جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ اور پھر قطب الدین کو مار کر تخت پر قبضہ کر لے۔ چنانچہ کمر ہمت چست کر کے بلند حوصلگی کے ساتھ دلیرانہ اس کام کو انجام دینا شروع کر دیا۔

پس علاء الدین کے عہد کے بڑے بڑے امراء روزانہ سر دربار ذلیل کئے جانے لگے۔ تو بہ نامی گجراتی بھاٹ امرائے دولت سے ذلیل طور پر مسخری کرتا۔ جس کا انجام آخر کار یہی ہوا۔ کہ کچھ لوگ خسرو خاں سے مل گئے۔ اور کچھ لوگ خانہ نشین ہو گئے اور انھوں نے دربار کی حاضری موقوف کر دی۔ اور حسب رضا جاگیرانِ اپنی جاگیروں پر چلے گئے جب میدان خالی ہو گیا تو دربار میں ادنیٰ درجہ کے لوگ اپنی قوم میں سے بھرنا شروع کر دیا۔ ایک دن موقعہ پا کر بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور کی مہربانی سے بڑے درجہ تک پہنچ گیا ہوں۔ دور دراز ملکوں میں اپنے فتوحات کا ڈنکا بھی بجا چکا ہوں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ امرائے دولت مع اپنے خویش و اقربا کے جاہ و حشم کے ساتھ باہر نکلتے ہیں۔ اجازت ہو تو میں بھی گجرات سے اپنے رشتہ داروں کو بلا کر حضور کی مرحمت کا سزاوار بناؤں۔ اور اس بہانہ سے اس نے اپنے تمام رشتہ داروں کو طلب کر کے سارا دربار اُن سے بھر دیا۔ اسی درمیان بادشاہ شکار کے لئے "سرساوہ" گیا لوگوں کی رائے ہوئی کہ اسی شکارگاہ میں سلطان کا شکار کیا جائے۔ لیکن بہاء الدین دبیر، یوسف صوفی، پسر قرہ قیمار وغیرہ نے اس سے منع کیا۔ اور کہا کہ اگر بادشاہ یہاں مارا گیا تو اسلامی لشکر ہم سب لوگوں کا شکار کر لے گا۔ اور ایک بھی زندہ نہ بچیگا۔ اور ہم لوگوں کو پناہ کی جگہ نہ ملے گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ بادشاہ کو کوشک ہی میں قتل کیا جائے۔ اور بوقت ضرورت کوشک ہزار ستون کو پناہ کا مقام بنایا جائے۔ چنانچہ جب بادشاہ دہلی آیا۔ تو اس کی تیاری شروع کر دی ۲۰۷۰ھ میں گجرات کی صوبہ داری اپنے نام کرالی۔ اور پھر گجرات اور نہل واڑے سے فوجی بھرتی میں مشغول ہو گیا۔ یہاں تک کہ چند دنوں میں فوجی طاقت جمع کر کے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ باہر نکلنے لگا۔

(باقی دارد)

ہندوستان اور اس کی زبانیں

(مترجمہ جناب مولوی عبدالستار صاحب فاروقی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

بتہ بعض زبانیں ایسی ہیں جن کو اس نقص کا احساس ہو گیا ہے، اور وہ اس کو دُور کرنے کی کوشش
مصروف ہیں۔ ان سے ہمیں اس امر کے مطالعہ کا بخوبی موقع ملتا ہے کہ کس طرح ایک وحشی قبیلہ
زبان کو ترقی دیتا، اور وسیع بنا کر اعلیٰ اور عام خیالات کے اظہار کے قابل بنا دیتا ہے۔ عام بول چال
میرا" اور "تیرا" کی بجائے صیغۂ واحد غائب کی ضمیر زیادہ مستعمل ہے، اسی طرح ان میں کی بعض زبانوں
اس کا" کا استعمال بالکل غیر معین طور پر ہوتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ یہ ایک بے معنی لاحقہ ہے جس کا استعمال
م عام کے ساتھ غیر معین طور پر جائز ہو گیا ہے۔

اسی طرح ان زبانوں میں کوئی نحوی قاعدہ نہیں ہے جو ضمیر موصول کا قائم مقام کہا جا سکے مثلاً ہم
ا چاہتے ہیں کہ "وہ آدمی جو کل آیا تھا"، تو ہم کو اس طرح کہنا پڑیگا کہ "وہ کل آنے والا آدمی"۔ البتہ بعض
بانیں جن کو آرین زبانوں سے اختلاط کا موقع ملا ہے ضمیر موصول کا ٹھیک انگریزی کی طرح استعمال کرتی
بعض قبائل اس ضمیر کی سہولت کا احساس کرتے ہوئے اپنی زبانوں میں اس کو اختیار کرنے لگے ہیں۔
یقہ جس کے ذریعہ انہوں نے اس مشکل کو حل کیا ہے ہمارے لئے اس بات کی ایک قابل غور مثال ہے
طرح دور و دراز ملکوں میں بھی ایک انسانی دماغ اسی مسئلہ زبان بالکل یکساں طریقہ سے حل کر لیتا ہے
کہ ہم نے انگلستان میں ضمیر استفہام (what) کو ضمیر موصول کے لئے استعمال
روع کر دیا ہے، ٹھیک اسی طرح آسام کے قبیلہ لہوتا ناگا ([illegible]) نے
قبائل کی زبان کی امداد کے بغیر اس مطلب کو ادا کر لیا ہے۔ اگر انکو یہ کہنا ہو کہ "آپ جو چاہتے
لے لیں"، تو وہ جو کچھ کہیں گے اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا:-

"آپ کیا لینا چاہتے ہیں لے لیں"

تبتی برمی کے بالکل برعکس آرین زبانیں ہیں جن کو بائیس کروڑ تیس لاکھ شمالی اور مغربی ہندوستان کے

لوگ (جو تقریباً یورپ کی نصف آبادی کے برابر ہیں) استعمال کرتے ہیں۔ یہ آرین زبانیں جو ہماری یورپین زبانوں سے ایک طرح کی قرابت بعیدہ رکھتی ہیں ہمارے (یورپین) خیال کے مطابق ایک کثیر ذخیرۂ الفاظ اور نحوی قواعد پر مشتمل ہیں۔ اور ہر اس خیال کو جس کا ادراک نفس انسانی کر سکتا ہے، نہایت صفائی اور شستگی کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہیں۔ ان زبانوں کے پھیلنے بلکہ ہندوستان میں داخل ہونے کی صحیح تاریخ بھی ہمیں معلوم ہے۔ آرین زبانیں اس زبردست انڈو یوروپین خاندان کی ایک شاخ ہیں جس کی دوسری شاخیں یورپ کی مختلف زبانیں لاطینی، یونانی، انگریزی وغیرہ ہیں۔ انڈو یوروپین زبانوں کے اصل مسکن کا مسئلہ جہاں سے کہ وہ یورپ اور مغربی و جنوبی ایشیا میں پھیل گئیں، برسوں تک زیر بحث رہا ہے۔ ہم لوگ عام طور پر پروفیسر میکس مولر کی اس محفوظ رائے سے واقف ہیں کہ "انکا مسکن ایشیا میں کہیں ہے"۔ لیکن اس رائے کے بعد اور مقامات کے نام بھی پیش کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک مقام جنوبی روس کا میدانی ملک ہے جس کو بالعموم درست سمجھا جاتا ہے اور جس کی بعض علماء اب بھی تائید کر رہے ہیں۔ اس سے متعلق جدید ترین نظریہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر پی۔ جائلز نے "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ ان کا یہ نظریہ نباتات اور حیوانات کی تقسیم پر (جن کے نام قدیم الایام سے چلے آتے ہیں) تاریخ طبقات الارض، اور ان تحقیقات جدیدہ پر مبنی ہے جو حال ہی میں ایشیائے کوچک میں کی گئی ہیں۔ اس بنا پر وہ ان قبائل کے انتشار و افتراق کا مرکز اقصائے شمال مغرب میں ایک ایسے مقام کو قرار دیتے ہیں جسے موجودہ آسٹریا ہنگری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور یہیں سے وہ قبائل شمال، جنوب، اور مغرب، کی جانب پھیل گئے، جن کی زبان کی نمائندگی اس وقت مذکورۂ بالا السنہ یورپ کر رہی ہیں۔ دوسرے وہ قبائل جو پے در پے حملے کرتے ہوئے درۂ دانیال کو عبور کر کے ایشیائے کوچک پر حملہ آور ہوئے اسی طرح ان یورشوں کا حال جو ان سے پہلے بار بار وقوع پذیر ہوئیں، تاریخ قدیم میں درج ہو چکا ہے۔ ان خانہ بدوش قبائل میں سے بعض کے وجود کا شمالی الجزیرہ (میسوپوٹامیہ) تک پتہ چلتا ہے۔ پھر یہ دو ہزار سال قبل مسیح میں قوم متنی (Mitanni) یا میڈیا والوں کے نام سے ایران کے شمالی مغربی میں قدیم شہر ہنگ (میڈیا) اور اس کی نواحی میں نظر آتے ہیں۔ یہ مسئلہ ابھی بحث طلب ہے کہ آیا یہ لوگ یہاں پر براہ راست ایشیائے کوچک سے آئے تھے یا کسی اور راستہ سے۔ لیکن اس بات سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ تاریخ مذکورہ میں یہ قوم یہاں موجود تھی۔ ان ناموں اور الفاظ سے جو کتبات اور فرمانروایان مصر کے مراسلات

ں پائے جاتے ہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ایشیائے کوچک کی جلی (Mitanni) قوم سے بھی
ن کا تعلق تھا - جدید خیال کے مطابق وہ منڈا یا میڈیا والے ہی تھے جنھوں نے آریاؤں کے نام سے
ران پر تاخت وتاراج کی اور انہی میں سے ایک گروہ آگے بڑھتا ہوا افغانستان کے راستہ سے ہندوستان
ں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوا - ہندوستان کی سکونت سے اس گروہ کے لوگ اپنے ایرانی بھائیوں سے
کل دور افتادہ اور بے تعلق ہو گئے - اور ہر چہار طرف اپنے مخالف قبائل سے گھرے ہوئے تھے - تاہم
ہوں نے اپنی زبان کو اسی طرح پاک وصاف رکھا جس طرح میکسیکو اور پیرو کی اسپینی زبان موجودہ اسپینی
بان کی بہ نسبت سولھویں صدی کی زبان سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے اور آئرلینڈ کے ادنی طبقہ کی زبان
ہد الزابتھ کی انگریزی زبان کو یاد دلاتی ہے -

نڈا قوم کے ہندوستان میں آنے والے لوگوں کو یہاں کے دراویدیوں اور منڈا قوم کے اُن قبائل
ے سخت مقابلہ کرنا پڑا جو ہندوستان میں ان سے بہت پہلے سکونت پذیر ہو چکے تھے - اور جنھوں نے
ن کی بہت کچھ روک تھام کی لیکن یہ رفتہ رفتہ پنجاب میں پھیل گئے، گنگا کے وسیع میدانوں کو طے کرتے
ے بنگال کے قریب تک جا پہونچے، اور مغربی ساحل کی طرف گووا تک پہنچ گئے - مرور زمانہ کے ساتھ
س کے اصلی باشندوں سے ان کے ازدواجی تعلقات قائم ہوتے رہے یہاں تک کہ بنگال کے ہر باشندہ
کے جسم میں آرین خون کی کچھ نہ کچھ مقدار باقی ہے - لیکن ان کی زبان یہاں بھی ویسی ہی خالص جس کو انھوں
نے مفتوح اقوام میں رائج کر دیا - تبتی برمیوں کی طرح آریہ بیک وقت ہندوستان نہیں آگئے تھے بلکہ وہ
روہ در گروہ کئی صدیوں تک ہندوستان میں داخل ہوتے رہے - اور اس لئے لازمی طور پر بعد میں آنے
الوں کی زبان ان کے پیش رؤں کی زبان سے مختلف تھی - چنانچہ یہ فرق آج تک بھی برابر قائم ہے جو
ن کی اولادوں یعنی ہندوستان کی موجودہ بولیوں میں پایا جاتا ہے - بعض زبانیں جیسے ہندوستانی
اردو) وغیرہ انگریزی کی طرح آسان سلیس اور رواں ہیں، اور بعض جیسے مرہٹی وغیرہ قواعد کی زنجیروں
یں اسی طرح جکڑی ہوئی ہیں جیسے کہ ہم یورپین زبانوں میں جرمنی کو دیکھتے ہیں -

ہندوستان کی آرین زبانیں عام طور پر انڈو آرین کہلاتی ہیں اور ان کی قدیم ترین شکل جو ہمیں
علوم ہے وہ سنسکرت زبان ہے - قدیم ترین بولیوں میں جو صدیوں تک زبانی منقول ہوتے رہنے کے
بعد وید کے گیتوں میں نمودار ہوتی ہے وہ غالباً وہی آرین زبان ہے جو آریاؤں کی اولین ہجرت ہند

سے پہلے ایران میں بولی جاتی تھی۔ بعد میں اس زبان نے جو صورتیں اختیار کیں وہ اس آرین زبان کو پیش کرتی ہیں جو اس وقت اس مقام کے قرب وجوار میں بولی جاتی تھی جسے اب دہلی کہتے ہیں۔ اس زبان میں ایک کثیر ذخیرۂ ادب موجود ہے جس کا تذکرہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ اسی زبان اور اس کی متعلقہ زبانوں سے موجودہ انڈو آرین زبانیں پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں بڑی زبانیں یہ ہیں:-

(۱) **ہندی**۔ اس میں مختلف بولیاں لکھی جاتی ہیں، مشہور ہندوستانی اردو زبان بھی اسی میں شامل ہے۔ پنجاب اور بنگال کے مابین وادی گنگا کے تمام باشندوں کی زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ۹ کرور ۸۰ لاکھ ہے۔ جو ریاستہائے متحدہ (امریکہ) کی کل آبادی سے زیادہ ہے۔

(۲) **بنگالی**۔ ملک بنگال میں بولی جاتی ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس کے بولنے والے پانچ کرور ہیں۔

(۳) **مرہٹی**۔ بمبئی اور اس کے مشرق اور جنوب کے ملک میں مروّج ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد ایک کرور نوّے لاکھ ہے۔

(۴) **گجراتی**۔ ملک گجرات میں بولی جاتی ہے جو بمبئی کے جنوب میں واقع ہے۔ ایک کرور آدمی اس کو بولتے ہیں۔

(۵) **پنجابی**۔ ملک پنجاب میں مستعمل ہے۔ بولنے والوں کی تعداد ایک کرور ساٹھ لاکھ ہے۔

ان تمام زبانوں کا اپنا مستقل لٹریچر ہے جس کی ابتدا ہمارے ازمنۂ متوسطہ سے ہوتی ہے۔ انکا ادب اس زبردست شاعری کو اپنے دامن میں لئے ہوئے، جو خاص ایشیا کی پیداوار ہے نہایت خوشنما اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔

اس آخری ہجرت ہند کے بعد اُن آریاؤں کی زبان جو ایران میں پیچھے رہ گئے تھے، خود بخود ارتقائی مدارج طے کرنے لگی، اور جس طرح اطالوی زبان لاطینی سے ترقی کرکے بنی ہے اسی طرح وہ آخر کار موجودہ خوبصورت فارسی میں تبدیل ہوگئی۔ فارسی چونکہ ہندوستان کی زبان نہیں ہے اس لئے سردست ہمیں یہاں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کی طرف آریاؤں کی نقل وحرکت مابعد کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو مذکورہ بالا ابتدائی ہجرت ہند

کے بعد معرض وجود میں آئی۔ انڈو آرین قوم کے براہ افغانستان ہندوستان پہونچنے سے کچھ قبل ایران میں ان کی زبان (جبکہ وہ اسوقت بالکل ابتدائی حالت میں تھی) ہنوز موجودہ صورت طرف ترقی کر رہی تھی کہ ان کے دوسرے جتھوں نے شمال مشرقی رخ کی جانب بڑھنا شروع کیا آخر کار وہ پامیرس (Mmnsa کر) تک پہونچگئے۔ دنیا کے اس ناموافق اور غیر متوا مقام سے انہوں نے جنوب کی طرف پنجاب کے میدانوں کا رُخ کیا۔ اُن میں سے بعض دریائے سندھ کی وادی تک پہنچ گئے۔ وہاں وہ اپنے اُن متقدم بھائیوں سے مل گئے جو ان سے پہلے افغا ہوتے ہوئے یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ بقیہ آرین ہندوستان کی جانب پامیرس کے نشیب دردستان کے پہاڑی ملک میں رہ پڑے جن کی نسل سے آگے چل کر غیر متمدن "کافر" اور چترال اور گلگت کے باشندے پیدا ہوئے۔ ان میں سے بعض نے تو کشمیر کی پُر فضا گھاٹیوں کو اپنا مسکن بنایا جن کی نسل کی زبان موجودہ کشمیری ہے۔

اس کے بعد بھی جبکہ موجودہ ایران کی حدود قائم ہو چکی تھیں، ان کی نسلیں ایران سے آ افغانستان میں اقامت گزین ہوئیں، اور اپنے ساتھ اپنی زبان کو بھی لیتی آئیں جو آگے چل کر پشتو کہلائی۔ اس زبان کو اب وہاں کے پٹھان قبائل استعمال کرتے ہیں۔ پشتو زبان ایک مکمل اور لچک زبان ہے مگر اہل مغرب کے کانوں کو بے سُری معلوم ہوتی ہے۔ آخر میں ہم ہندوستان کے اس لسانی کو، جو غالباً سب سے پہلا معائنہ ہے، اس تاریخی حکایت کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ افغانستا میں یہ قصہ مشہور ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے اپنے وزیر آصف بن برخیا کو حکم دیا کہ وہ د کی تمام زبانوں کے نمونے پیش کرے۔ وزیر موصوف جب اس مہم کو انجام دیکر لوٹا تو اس نے حضرت سلیمان کے دربار میں ہر زبان کا نمونہ پیش کیا۔ جب پشتو کی باری آئی تو اس نے تھوڑی دیر توقف پھر ایک مٹی کے برتن میں ایک چھوٹا پتھر ڈال کر اس کو زور زور سے ہلا کر کہنے لگا کہ "یہ ہے قریب قر اس زبان کا نمونہ جسے افغانستان والے بولتے ہیں!" بایں ہمہ پشتو زبان سعدی و خیام کی دلکش کی خالہ زاد بہن ہے۔

میرے خیال میں مندرجہ بالا سطور میرے اس دعوی کی شاہد ہیں کہ اُن طریقوں کے مطالعہ لئے جن سے انسانوں نے زبان کے مسئلہ کو حل کیا ہے، ہندوستان ایک وسیع میدان ہے۔ یہا

ایسی زبانیں پائی جاتی ہیں جن کے قواعد صوتی صرف سو الفاظ سے زیادہ لفظ بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور وہ بڑی مشکل سے ان عام خیالات کا اظہار کر سکتی ہیں جو ہمارے نزدیک بالکل معمولی اور عام ہیں۔ بعض ایسی زبانیں بھی ہیں جو انگریزی زبان کے ذخیرۂ لغت سے صفائی اور شستگی میں برابری کرتی ہیں۔ ہم نے ایسی زبانیں دیکھی ہیں جن میں ہر کلمہ ایک لفظ ہوتا ہے، اور ایسی بھی جن میں کلمہ بہ کلمہ لگا کر اس کی صورت ایک عظیم الشان جملہ کی بنا دی جاتی ہے۔ ایسی زبانیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں جن میں نہ اسم ہے نہ فعل اور ہمارے خیال کے مطابق ان کی صرف و نحو ہی کا پتہ نہیں ہے، اور بعض ایسی بھی جو اپنے نحوی قواعد کے لحاظ سے یونانی اور لاطینی کو ٹکر مارتی ہیں۔ ہندوستان میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں کے ہر پہاڑی قبیلہ کی ایک جداگانہ زبان ہوتی ہے ——— وہ زبان جو ایک یا دو پشتوں کے بعد خود اس کے بولنے والوں کی اولادیں نہیں سمجھ سکتیں —— اور دس دس ہزار میل کے رقبہ والے میدان ہیں جہاں صرف ایک زبان صدیوں کے لٹریچر اور تاریخ کے ساتھ شروع سے آخر تک یکساں بولی جاتی ہے۔ با ایں ہمہ اس ملک پر مشرقی اسرار کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان زبانوں میں، یکے بعد دیگرے، ہمیں ازمنۂ گذشتہ کی غیر مسموع گنگناہٹ سنائی دیتی ہے، ان ایام قدیمہ کی جبکہ آرین قوم ارض فلسطین کے دریاؤں کے اس پار اپنے گلوں کو چراتی پھرتی تھی، جبکہ انڈو چینی ابھی اپنے مقام یانگ سی کیانگ سے باہر نہیں نکلے تھے، اور جبکہ کوئی قبل التاریخی ہندوستانی ٹیوسر[۱] (Teucer) خلیج بنگال کے اس پار سے لیکر انڈونیشیا تک اپنے ساتھیوں کو لیجانے اور وہاں سے مشرق میں پھرتے ہوئے بحر الکاہل میں آباد ہونے کی جرأت کر رہا تھا۔ اور غالباً اسی زمانہ میں لیموریا کا براعظم بھی موجود تھا جس کو بحر الہند کے تلاطم امواج نے دھو کر اس کا نام و نشان مٹا دیا۔ آرین، تبتی برمی، آسٹرک یا دراویدی زبانیں اپنے اصلی مساکن، اپنے مخصوص تمدن اور اپنی ترقی کے مختلف مدارج کو پیش کرتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک نے آخر کار زبانوں کے اختلاط اور میل جول کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔

زبان خیالات کا آئینہ ہے، بلکہ ایک جملہ میں لفظوں کی ترتیب بولنے والوں کی ترتیب خیالات کی آئینہ دار ہے۔ اور ہندوستان کے مرقع میں ہمیں نفس انسانی کی تصاویر کا ایک سلسلہ تہذیب و

---

[۱] یونانی بادشاہ کا شاہزادہ اور اجکس اعظم کا بھائی جو محاصرۂ ٹرائے میں تمام متحدہ یونانی افواج کیتا شریک جنگ تھا۔ ہومر کی ایلیڈ میں

ن کے اکثر مدارج میں دکھائی دیتا ہے ـــــ ایسی تصاویر جو نہایت ناموافق حالات کے موقع پر ان کی ت اور نئی ضروریات کے اظہار کے وسائل پر بخوبی روشنی ڈالتی ہیں۔ دریائے ایراوڈی کے اروں پر بسنے والے خونخوار وحشیوں کا نفس سوائے "خیالات" کے کسی چیز کا تصور کرنے سے عاجز ہونا ہے۔ تاہم اسمیں ترقی کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ضرورت کے مواقع پر وہ قوت ادراک انے کے لئے وسائل ایجاد کرسکتا ہے اور "خیالاتِ مجردہ" کو ظاہر کرنا سیکھتا ہے۔ وہ پہلا قدم اٹھاتا جو اسے وحشت و جاہلیت سے تہذیب و تمدن کی طرف لیجاتا ہے۔ اور بہیمیت سے نکال اُسے ے قدیم و جدید کے فلسفوں کی شاہراہ پر گامزن کردیتا ہے غرضکہ ہندوستان ہمارے نے لسانی مسائل، دماغی نشو و نما اور ان کے ارتقائی مدارج کی مثالیں بکثرت پیش کرتا ہے۔

قاصدِ امید

(از سید انتظام الدین شاہ قادری کوثر اکبرآبادی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

آ۔ اے قاصدِ امید آ۔ تو کیا ہے اور کون ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔ تجھکو کس چیز سے تشبیہ دوں؟ نہیں جانتا۔ میں اہل دُنیا سے سوال کرتا ہوں لیکن کوئی ایسا نہیں جو مجھے معقول جواب دے تمام دنیا بے رحم نظر آتی ہے پس تو آ اور ہلال عید، بن کر آ۔

میری مصیبتوں میں میرا کوئی شریک نہیں۔ میری تکلیف لاعلاج ہے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا جو ن خوش الحان کے چہچہوں کی دلکش آواز کان میں پہنچاتی ہے۔ سورج کا وہ نظارۂ دلکش وہ گوشۂ مشرق سے سر نکال کر اس پُرفضا زمین پر نگاہیں دوڑاتا ہے اور اس کی سنہری نیں کرنیں جو قطرات شبنم کو موتیوں کی طرح چمکا دیتی ہیں۔ رات کی خاموشی اور بلبل کا ترانہ جاں نواز ، سب میرے پژمردہ دل کو شگفتہ نہیں کرسکتے۔

پس آ۔ اے قاصد امید، آ۔

اور

مرکز آرزو بنکر آ۔

جواب استفسار جناب آزاد

(از مولینا سید اولاد حسین صاحب شاداں ـ بلگرامی)

ذیل کا عروضی جواب مولینا سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی نے مدیر نیرنگ (رامپور) کے استفسار پر لکھا ہے جس کو اگرچہ رسالہ "نیرنگ" ہی میں شائع ہونا چاہئے تھا لیکن از رہ کرم ہمیں "زبان" کے لئے مرحمت فرمایا ہے جس کو ہم بڑی خوشی سے درج کرتے ہوئے مولینائے موصوف سے اُمید کرتے ہیں کہ اسی طرح آیندہ بھی مستقل طور پر اپنی وسیع معلومات سے قارئین کرام کو مستفید فرمایا کریں گے۔

مولینائے موصوف ہندوستان میں مستثنےٰ قابلیت کے بزرگوار ہیں، فن عروض میں آپ کو جو مہارت تامہ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں رسالہ نیرنگ (رامپور) کے صفحات آپکے علمی کارناموں کے شاہد ہیں جن کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فن عروض میں آپ اپنی مثال ہیں۔

ایڈیٹر

جناب منشی عزیز اللہ خاں صاحب ایڈیٹر اور پروپرائٹر رسالہ نیرنگ رامپور تحریر فرماتے ہیں کہ جناب آزاد کاکوروی اپنی ایک غزل کے اس مصرع کی بابت

"عالم عالم سوختی و عالم عالم ساختی"

حقیر سے دریافت فرماتے ہیں کہ لفظ عالم ثانی سے عین دونوں جگہ اس مصرع میں کیا تقطیع سے گرتا ہے؟۔ اگر مصرع کی ساخت پر نظر کر کے جو مصنف کو پسند ہے بجنسہ برقرار رکھا جائے تو کوئی ہرج تو نہیں ہے یا مصرع ہی تبدیل کر دیا جائے۔

جواب

ایک مصرع کے لکھنے سے اکثر متحقق نہیں ہوتا کہ غزل کس بحر میں ہے۔ اگر جناب آزاد بحر رمل مثمن محذوف میں یہ غزل کہی ہے جس کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن دوبار

ہے تو ضرور لفظ عالم ثانی کا عین دونوں جگہ اس مصرع میں تقطیع سے خارج ہے لہٰذا عروضیوں کے مسلمات کے موافق بحر مذکور میں یہ مصرع ناموزوں ہوگا کیونکہ عین کا تقطیع سے گرنا ان کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس لئے ضرور مصرع تبدیلی کے لایق ہے۔ اگر جناب آزاد کو پسند آئے تو مصرع مذکور کو اس طرح بنالیں۔

"عالمے را سوختی و عالمے را ساختی"

جو عروضی کو مسمطات چہار گوشہ میں زحافات اذالہ و تسبیغ ۔ حذف و قصر ۔ وقف و کشف وغیرہ حشو میں لانا جائز سمجھتے ہیں وہ اس مصرع کو جبکہ واو عطف درمیان "سوختی و عالم" نہو بحر مدید مثمن سالم میں بروزن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن کہہ سکتے ہیں۔ اور بہ لحاظ حذف درمیانی رمل محذوف بھی کہا جاسکتا ہے گو یہ فرع رمل کی کتب عروض میں مرقوم نہیں۔

جناب قدر بلگرامی مرحوم کو زحافات مخصوصہ عروض و ضرب کو حشو میں نہ لانے کے بارہ میں اسدرجہ غلو ہے کہ جس کلام میں کسی اُستاد کے زحافات مذکور درمیان مصرع پائے جاتے ہیں تو جناب قدر ضرور کوئی تاویل فرماتے ہیں جس سے ان زحافات کا حشو میں آنا نہ پایا جائے۔ لیکن پھر بھی مفتعلن فاعلن چار بار کو بحر منسرح مثمن مطوی مکشوف بنایا ہے اور جناب محقق طوسی علیہ الرحمتہ کے اس قول سے کشف درمیانی کو جائز قرار دیا ہے حالانکہ کشف و وقف بھی عروض و ضرب سے مخصوص ہیں۔ قول محقق یہ ہے۔

چوں ایں وزن چہار خانہ شود مسمط یا غیر مسمط رکن دوم ہر مصراع ہم
مطوی مکشوف یا موقوف بکار دارند بر قیاس عروض و ضرب،

تفسیر اس قول محقق کی خود جناب قدر اس طرح فرماتے ہیں کہ جب وزن چہار خانہ ہو جائے تو ہر ایک خانہ قائم مقام ایک مصرع کا ہے۔ یعنی پورا وزن گویا مسطور ہو کر مضاعف ہو گیا ہے۔ بدیں صورت نصف مصرع ایسے وزن کا دراصل ایک مصرع ہو جائیگا۔ جب یہ ہوا تو کشف و وقف بر قیاس عروض و ضرب ٹھیک واقع ہو کر درمیان میں جائز ہو گا۔ یہاں زحافات مخصوصہ عروض و ضرب کے اس تاویل سے حشو میں لانے کے قائل ہو گئے مگر دوسرے مواقع پر بڑے شد و مد سے اس قانون کی مخالفت کرتے ہیں اور ایسی تاویل فرماتے ہیں جس سے ایسے زحافات کا حشو میں آنا نہ پایا جائے۔

کلام اساتذہ میں ایسے زحافات کا وقوع درمیان مصرع میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

بدر چاچی
در بحر غمت غواص۔ لالائے دو چشم ماست
صد لولوئے تر اینک بر طشت زرش غلطاں

باوجودیکہ تین قافیے غیر قوافی قصیدہ نہیں لائے پھر بھی مصرعہ اولیٰ میں تسبیغ درمیانی کو صرف کیا ہے۔

بدر چاچی
آں شاہد تپ لرزہ ادا سر طانش چوں سازو نزار
صفرا بود بر خاک وخانہ از تف حمیٰ ریختہ

اس شعر میں تین قوافی غیر قافیہ اصلی قصیدہ ہیں۔ تب اذالہ حشو میں صرف کیا ہے۔ حالانکہ اذالہ بھی عروض وضرب سے مخصوص ہے۔

اذالہ وتسبیغ وغیرہ کے حشو میں لانے پر جواز کی دلیل میرے نزدیک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تعریف قافیہ میں اہل فن یوں رقمطراز ہیں کہ:-

"وہ حرف یا حروف چند جن کو ابیات یا مصاریع کے آخر یا بمنزلہ آخر میں بالفاظ مختلفہ مکرر لائیں۔"

جب تعریف قافیہ میں قید آخر مصرع یا بیت کی تجویز کی جاتی ہے۔ پھر بھی بحور مستمطات چہار گوشہ میں تین قوافی غیر قافیہ اصلی قصیدہ سے آتے ہیں اور قید آخر مصرعہ یا بیت کی پروا نہیں کرتے۔ اس قاعدہ پر قیاس کرکے اگر زحافات مخصوصہ عروض وضرب کو رکن دوم وششم میں لائیں تو ہو سکتا ہے خصوصاً جب عمل اساتذہ اس قاعدہ کا موید ہے تو پھر ناجائز کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

گو اس بحث کو استفسار سے زیادہ تعلق نہ تھا مگر ضمن بیان میں جب یہ مسئلہ آپڑا تو میں سمجھتا ہوں کہ ناواقف کیلئے افادہ سے خالی نہ ہوگا۔ اب میں پھر اصل سوال کیطرف رجوع کرتا ہوں۔

بہت سے اساتذہ اردو وفارسی گو کو الف وصل کے دھوکے میں عین کو تقطیع سے گرانے میں سہو ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عین کا تلفظ اہل زبان اردو وفارسی مثل الف کرتے ہیں۔ اہل عرب ہی عین کو اس کے مخرج کے ساتھ ادا کرنے کے عادی ہیں اس لئے غیر عرب عین میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔ لیکن ایسا سہو عروضیوں کے نزدیک قابل معافی نہیں۔ چنانچہ میر شمس الدین فقیر علیہ الرحمۃ حدائق البلاغۃ میں

لکھتے ہیں۔

مولانا ظہوری بیتے ازیں باب آوردہ و مورد طعن شدہ و آں بیت ایں ست ؎

بستم دہ آں رشک یاقوت را

کہ سازم علاج عقل فرتوت را

عقل کا عین تقطیع سے خارج ہے۔ لیکن جناب میر غلام علی آزاد بلگرامی خزانہ عامرہ میں مصرع ثانی اس طرح تحریر فرماتے ہیں ؎ کہ سازم جواں عقل فرتوت را۔

ظاہر ہے کہ فرتوت کے مقابل "جواں" مناسب ہے نہ عقل

عاقل شاہجہان آبادی

ناتوانی تختہ بند یک مقام عاقل مباش　　　خاک بر سر میکند در خانۂ آئینہ آب

لفظ عاقل کا عین تقطیع میں نہیں آتا۔ جناب قدر فرماتے ہیں اگر مقام کی جگہ "مکان" ہو تو یہ عیب برطرف ہو جاتا ہے

ولہ　　اے بنقاب عارضت شعلۂ بال نگاہ　　　عکس تو در آئینہ یوسف مصری بچاہ

یہاں بھی عارض کا عین تقطیع سے خارج ہے اور کوئی تاویل بھی نہیں ہوتی۔

ناصر علی سرہندی　　　اے رگ جاں بہار ایں ہمہ بیرحمی چیست

خاک از مقدم تو خوں شدن عادت دارد

عادت کا عین تقطیع میں حذف ہو جاتا ہے۔

اہل ایران سے بھی یہ تسامح واقع ہوا ہے۔ خواجہ باقر عزت شیرازی

مراچند خردمنداں بحال خود نمی آرد　　　بایں افسانہا مجنون عشق عاقل نمیگردد

عاقل کا عین خارج از تقطیع ہے۔

خاقانی　　خاقانی عید آمد و خاقان بہ یمن جود　　　ہر کار کز خدائے بخواہد روا شود

میں لفظ عید کا تقطیع سے خارج ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عین باقی ہے مگر یائے تحتانی لفظ خاقانی کی تقطیع سے گر گئی۔ خواہ عین ساقط ہو یا یائے تحتانی دونوں کا سقوط ناجائز قرار دیتے ہیں۔ میر حسن دہلوی ؎

"اس عہدے سے کوئی بھی نکلا نہیں" لفظ عہدے کا عین تقطیع میں نہیں آتا۔

باوجود ان اشلہ کے ان شواہد سے تمسک کر کے سقوط عین جائز نہیں ہو سکتا ہے یہی مسئلہ اہل فن ہے واللہ اعلم بالصواب۔

مترجمات

مسیح علیہ السلام کے وجود سے انکار

مندرجہ بالا عنوان سے ولایت کے مشہور اخبار نیشن نے اپنی تازہ اشاعت میں ایک مقالہ شائع کیا ہے جس کا ملخص حسب ذیل ہے:-

امریکہ کے ایک شخص جارج براندس نے (Jesus a myth) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت مسیح کی شخصیت بالکل موضوع اور من گھڑت ہے، جیسے کہ ہرقلیس اور پرامیتھس کی شخصیتیں لوگوں نے وضع کرلی ہیں۔ یہ کوئی جدید نظریہ نہیں ہے، تنقید بائبل کے آغاز سے ہی اس کی ابتدا ہوچکی ہے جس کو تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوچکے ہیں اور اس نظریہ کی ترقی یافتہ صورت کو پچاس سال سے زاید عرصہ نہیں گزرا۔ یقیناً یہ مسئلہ ارتقاء مسیحیت کے مطالعہ کی راہ میں حائل ہونے والی مشکلات کے لئے بہت جلد حل طلب ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عہد نامہ جدید تاریخی حیثیت سے بالکل پایۂ استناد سے گرا ہوا ہے، اور کئی صدیوں تک اس کی صحت کے متعلق کوئی سوال پیدا نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ تاریخی تنقید کے اصول مدون ہونے سے پہلے کلیسائے عیسوی کا اقتدار و اثر پورے عروج پر تھا اور صدیوں تک جو لوگ اس بات کو ماننے کے عادی ہوچکے تھے کہ ہومر کی ایلیڈ کی تلخیص جنگ تروجن (Trojan) کو برای العین مشاہدہ کرنے والے ایک شخص نے تیار کی ہے (اور جو قسطنطین کے موضوع "عطیہ" کو بلا چون و چرا تسلیم کرتے رہے) وہ کبھی اس اساسی دستاویز پر اعتراض نہیں کرسکتے تھے جو ان کے مذہب کا مؤید تھا۔ حتیٰ کہ مارٹن لوتھر نے بھی اناجیل اربعہ کے اتحاد مضامین پر اپنے عدم اطمینان کو صاف طور پر ظاہر کردیا۔

۱۸۴۲ء میں جرمنی عالم کارل فرانڈریخ بہروت نے اس نظریہ کو ترقی دی کہ مسیح

آسینز (Essenes)[۵] کی ایک پوشیدہ جماعت کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح تھا جس کے ذریعہ سے وہ یہودیوں کو اپنی مادی رسم "مسیح" کے خیال سے ہٹانا چاہتی تھی۔

پونی صدی کے بعد برونو باور حیاتِ مسیح سے متعلق پختہ معاصرانہ شہادت کی عدم موجودگی میں کوئی معقول عذر تلاش کر رہا تھا۔ اس نے "مخفی انجمن" کے اس نظریہ کو ایک نئی تحریک دی، اور بڑی جرات سے اناجیل کی تاریخ تصنیف دوسری صدی عیسوی میں مقرر کرتے ہوئے اس بات کو ظاہر کیا کہ مسیح کا قصہ یزو بادشاہ روم کے عہد میں ایجاد ہوا ہے۔ اور اس پر آج تک حاشیہ آرائی ہوتی رہتی ہے۔ اس نے یہ استدلال کیا کہ عہد جاہلیت (قبل مسیح) کے فلاسفر، خصوصاً سینیکا (Seneca) عیسائیت کے ان اخلاقیات کی تدوین بہت پہلے کر چکے تھے۔ البتہ وہ اپنے خیالات کی عام اشاعت نہیں کر سکتے تھے اس لئے لوگوں نے ان کو ایک ایسی شخصیت سے منسوب کرنا چاہا جس میں "مافوق الفطرۃ" ہونے کی دلکشی پائی جائے۔ چنانچہ انہوں نے مسیح کا اسطورہ (Myth) وضع کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے نظریات تاریخی مشکلات کو حل کر دیتے ہیں، لیکن وہ اس "مافوق الفطرۃ مصنوعی شخصیت" سے تو بہر حال کچھ کم ہی قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ معجزات کی ان عقلی تاویلات کی طرح جو مسیح کو ایک طرح کا ہوڈینی بنا دیتے ہیں (جو دھوکہ بازی اور فریب دہی کی وجہ سے بہت ہر دلعزیز بن گیا تھا) یہ لوگ ان معجزات کی بہ نسبت اپنے نظریوں کے لئے زیادہ اعتماد کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ اور اس بات کو یاد دلاتے ہیں جو کسی عقیدت مند نے ایک مشہور معقولی سے طنزاً کہی تھی "وہ ہر بات کو ماننے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ وہ بائبل میں نہ ہو!" دساطیر دراصل اسقدر موضوع اور مخدوش نہیں ہوا کرتے جسقدر کہ ان کی روایت کا طریقہ ہوتا ہے یعنی کہ وہ ایک کے منہ سے نکل کر دوسرے کے منہ تک پہونچتے پہونچتے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ اگر مسیح کی شخصیت ایک قصہ کہانی ہے تو وہ کسی مخفی انجمن کی وضع و اختراع نہیں ہے بلکہ رفتہ رفتہ انسانی ضرورت اس کو وضع کرنے کی داعی ہوئی ہے۔

یقیناً عیسائی یا ملحد علما کی ایک کثیر جماعت اس بات پر اتفاق کرے گی کہ "روایات کا مسیح"، "تاریخی مسیح" سے بالکل جداگانہ ہے اور اکثر لوگ اس کو تسلیم کریں گے کہ یہ اس طور خواہ کتنا ہی غلط اور قابل اعتراض

[۵] یہودیوں کا وہ فرقہ جو مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔ ۱۲

ہو تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ضرور کوئی تاریخی شخصیت ہونی چاہئے جس کے متعلق لوگوں نے بعد میں مبالغہ کر دیا ہے۔ ؏

تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا

مسیح کے وجود سے متعلق کوئی اطمینان بخش شہادت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اور اگر یوسیفوس کا دستیاب شدہ ترجمہ (جس میں مسیح کا ذکر موجود ہے، (اور جسے عام طور پر زمانۂ مابعد کی تفسیر سمجھا گیا ہے) فی الحقیقت اتنا ہی قدیم ہو جتنا کہ کہا جاتا ہے تو مسیح کے تاریخی وجود کا یہ ایک بیّن ثبوت ہو سکتا ہے۔

برنرڈ شا کی تھیوری

انگریزی کا مشہور ڈراما نویس اور ادیب برنرڈ شا انگلستان کا ایک سربرآوردہ شخص ہے جس نے حال ہی میں اپنے علمی کارناموں کے صلہ میں "عطیۂ نوبل" حاصل کیا ہے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی اشاعتِ جدیدہ میں برنرڈ شا پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں سوانح حیات کے علاوہ اس کے علمی و ادبی کارناموں کا تذکرہ ہے۔ اسی مضمون میں شا کی تھیوری مندرجۂ ذیل الفاظ میں اجمالاً بیان کی گئی ہے:

"امراض، مفلسی، اور جنگ۔ یہ سب افعال خدا کے خلاف کئے جاتے ہیں اگر دنیا نے اس سیلاب کو نہ روکا اور خدا کے مقصد کو پورا کرنے کی کوشش نہ کی تو وہ بہت جلد نسل انسانی کو دنیا سے ناپید کردیگا جیسا کہ ان سے پہلے اس نے شعرانی حیوانات (Mammoth) کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا ہے۔

"تمہیں ایسی زندگی بسر کرنی چاہئے کہ جب مرنے لگو تو خدا پر تم اپنا قرض چھوڑ جاؤ۔" کیا یورپ کے مادہ پرست اس صدائے حق نیوش پر گوش برآواز ہوں گے؟

لفظ میمن انگریزی زبان میں

کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں میں ایک متمول تاجر قوم میمن کہلاتی ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ یہ

(اس) زبان کا لفظ ہے اور کسطرح اختیار کیا گیا۔ مگر انگریزی ادبیات میں اس کو استعمال ہوتے دیکھ کر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اسی کا ہمنوا لفظ (Mammon) ہے جس کے معنی سُریانی زبان میں دولت و ثروت کے ہیں! (ملاحظہ ہو ملٹن کی فردوس گم شدہ باب پہلا)

اسپنسر کی نظم فری کوئین (پریوں کی ملکہ) میں میمن ایک کیرکٹر ہے جس کی زبانی یہ الفاظ منقول ہیں:-

"اگر سر گایون میری اطاعت کریگا تو وہ دنیا میں سب سے بڑا دولتمند آدمی ہوگا"

(دیکھو کتاب مذکور باب ۲ فصل ۷)

گویا یہاں پر میمن کو "دولت کا دیوتا" بتایا گیا ہے!

بن جانسن اپنی کتاب "دی آلکیمسٹ" (کیمیا گر) میں "سر اپکیور میمن" اس آدمی کے لئے استعمال کرتا ہے جو "لذات دنیوی کا حریص" ہو۔

اسی طرح لوقا کی انجیل (۱۶ : ۹) میں مال و دولت کو "ناراستی کا میمن" بتایا گیا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ اسم کا اثر مسمیٰ پر ہوتا ہے تو تسلیم کرنا چاہئے کہ (خواہ اس کی اصلیت اور وجہ تسمیہ کچھ ہی ہو) ہمارے میمن بھائیوں کی قابل فخر دولتمندی اور خوشحالی پر اس کا اثر ضرور پڑا ہے۔ اور انکے زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ بات ذرا بھی حقیقت سے بعید نہیں معلوم ہوتی۔

آدبیات

مصوّرِ فطرت

اقبال جسطرح ذوقِ شعری میں بے مثل تھا، اسیطرح وہ مصوری میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اگر وہ یکطرف جذبات و محاکات سے کسی شعر کا ایک مجسمہ قائم کردیا کرتا تھا۔ تو دوسری طرف کاغذی پیراہن پر وہ مناظرِ فطرت میں اس حسن و خوبی کیساتھ رنگ آمیزی کرتا تھا کہ اصل و نقل میں تمیز نہیں ہوسکتی تھی۔ جب کبھی وہ کسی پھول یا کسی کلی کا نقش کھینچتا تھا تو اظہارِ رنگ کے ساتھ ہی، بو کا نمودار کردینا بھی اسی کا کام ہوتا تھا۔

ایک بار اس نے موسم برشکال کا منظر کھینچا، جس میں کالی گھٹاؤں کا اُٹھنا، بجلی کا چمک کر چھپنا، اور پانی کا برس کر بند ہونا تو ایک معمولی بات تھی۔ لیکن اُس وقت حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہتی تھی جبکہ اس منظر کو بغور دیکھنے سے ایسا یقین ہونے لگتا تھا کہ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے کان متاثر ہو رہے ہیں اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اس تیقن میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جایا کرتا تھا جبکہ شدید موسم گرما میں اس منظر کو پیش نظر رکھنے سے ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ صدائے برق و برودتِ ہوا، سامعہ و لامعہ سے مس ہو کر روح کو ایک گونہ فرحت بخش رہی ہے۔ غرضکہ وہ فطرۃً شاعر بھی تھا اور مصور بھی۔ ایسا مصور جو اپنے فن میں یکتائے زمانہ تھا۔ لیکن اس شغل سے اس کی کبھی تسکین نہیں ہوئی بلکہ ایک نامعلوم کاوش و جستجو میں مبتلا ہو گیا۔

شہر سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں تھا۔ جہاں چند کچے مکانوں کے علاوہ، ایک نیم پختہ مکان بھی تھا جس کے دروازہ کے سامنے قریب تر ایک چھوٹا سا باغیچہ لگا ہوا تھا

نمودِ صبح کی فضائے لطیف میں ٹھنڈی ہوا کی عطر بیزی میں صحرائے غنچے حسبِ معمول زر بکف رہا کرتے تھے، اور ہر صبح منتظر ہوتے تھے کہ وہ اپنے گلِ بیگانہ کو دیکھیں اور اس زر کو اُس پر سے نچھاور کریں اور خود بھی گلے کا ہار بن کر نثار ہو جائیں۔

اقبال ایک صبح اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اور چاہتا تھا کہ اس بہترین منظر کا نقش صفحۂ قرطاس پر قائم کرلے، کہ دفعتہً اس کی غیر متحرک و ساکن نگاہ میں ایک چشمک پیدا ہوئی، اسے محسوس کرکے کہ شاید سورج کی یہ شعاعِ اولین میری نگاہ میں پیوست ہو رہی ہے، آنکھیں بند کرکے گردن موڑی ہی تھی کہ دفعتہً سامنے باغیچہ میں ایک کیفیت نورانی، مافوقِ حسنِ انسانی اور اعجازِ حقیقت نسوانی یعنی کہ ایک زندہ جادو، یا ایک صحرائی حسن تھا جس کی بوئے دوشیزگی بوئے گل کے ساتھ مل کر گاؤں کی ساری فضا کو معطر کرنے لگی۔ لیکن آہ اس سے گاؤں کے رہنے والے بالکل بےخبر تھے۔

یہ غزالِ رعنا و آہوئے دشت ایک سفید ساری میں (جو کچھ میلی تھی) ملبوس تھی، اور ہرن کی طرح اس باغیچہ میں کلیلیں بھر رہی تھی۔ اس کا قد بلند قیامت زا تھا۔ اس کی شہلائے چشم بادہ ریز تھی۔ اس کے سیاہ و دراز گیسو کے بیچ میں اس کا حسین و ضو فشاں چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالی گھٹاؤں کے درمیان آفتاب چمکنے لگا ہو۔ تناسب اعضاء کے ساتھ کہربائی حصہ جسم کے نشیب و فراز میں کشش سحر زا تھی۔ اور معصوم حسن کا چشمہ پھوٹ پڑنے والے شباب کے دریا میں گر رہا تھا۔ یا یہ کہیے کہ بادۂ تند مینائے خام میں بھری جا رہی تھی۔ ایک طرف یہ دوشیزہ پھول توڑ کر ہار بنانے میں مشغول تھی۔ اور دوسری طرف مصورِ فطرت اقبال اس کی تصویر کھینچنے میں منہمک۔ اقبال کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے قلم میں لرزش تھی۔ اور اس کی ساری روح اس کے جسم سے نکل جانا چاہتی تھی۔ دفعتہً یہ سنبھلا اور ہوش قائم کئے۔ سب سے پہلے اس نے قلم کی باریک نوک سے اس کے تمام جسم کا ایک نقش قائم کیا، اس خیال سے کہ کہیں یہ لڑکی اپنا ہار گوندھ کر چل نہ دے۔ اس کے بعد جب اس کا قلم گھنے و سیاہ گیسو بنانے میں مصروف ہوا تو اسے خود محسوس ہونے لگا کہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔ پھر جب اس نے آنکھیں بنانی شروع کیں اور غشاوۂ بصر پر جب باریک و نازک رگوں میں ارغوانی رنگ بھرنا شروع کیا تو اس پر سکر طاری ہونے لگا۔ لیکن جب اس نے دوشیزگی کے اس پرشباب حصۂ جسم پر قلم کو جنبش دی، جسمیں فطرت نے کوٹ کوٹ کر بجلیاں بھر رکھی تھیں جس میں قوت کہربائی پوشیدہ تھی۔ اور جس کا برقی انجذاب قوتِ بصر کو جذب کر رہا تھا، یعنی کہ جسم کا وہ فراز حصہ مخزنِ برقیات و معدنِ کہربائیات تھا، اور جس کا تصور اقبال کی روح کو تحلیل کر رہا تھا تو اس وقت نشہ کی فراوانی سے یہ جھومنے لگا۔ اور شدت سرور سے اس پر ہذیان طاری ہونے لگا۔

بالآخر جب یہ پاؤں کی نازک و رنگین انگلیاں بنانے میں مشغول تھا تو اس وقت اس کا قلم اور یہ خود سجدہ میں گر گیا ا اور اس کے مُنہ سے مسرت انگیز صدا نکلی، جس کا مفہوم یہ تھا۔

"میں نے مقصد زندگی پالیا۔ اب اس دنیا میں مجھے کسی شئے کی ضرورت نہیں پھر کیا دیر ہے"؟

یہ کہا اور اس پر حیرت و سکوت طاری ہوگیا۔ اُسکی نگاہیں تصویر پر جم کر رہ گئیں اب اسے محسوس ہونے لگا کہ تصویر نے ابھر کر ایک جسم اختیار کرلیا ہے۔ اس سے اس کی روح میں ایک نوع کا ارتعاش پیدا ہونے لگا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے اس کو گلے سے لگاکر ایک مدید بوسہ لیا۔ جس سے اسے محسوس ہونے لگا کہ اسکی پیشانی عرق ریز ہے اور صورت سے اظہار انفعال۔

کچھ وقفے کے بعد یہ اس دوشیزہ کے پاس گیا، اس خیال سے کہ یہ تصویر اس کو دیدے۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ بڑہا کر تصویر لڑکی کو دی۔ لڑکی نے تصویر دیکھ کر ایک تبسم نگاہ اقبال پر ڈالی دفعتہً اس کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی اور یہ بے ہوش ہوکر گر پڑا اور خون مُنہ سے جاری ہونے لگا۔

لڑکی سہم کر اس کے پاس آئی۔ اور ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی ہی تھی کہ گرم آہ کے ساتھ خود بھی پھول کیطرح کملاکر رہگئی۔

امام اکبر آبادی

مناظرِ قدرت

از سید انتظام الدین شاہ قادری کوثر اکبر آبادی مسلم یونیورسٹی (علی گڈھ)

آج صبح سویرے۔ اتنے سویرے کہ چڑیوں نے اپنا صبح کا گیت بھی شروع نہیں کیا تھا میں باہر نکلا، اندھیرا اور اجالا اسطرح دست گریبان ہو رہے تھے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ اسوقت تک پالا کس کے ہاتھ رہا۔ لیکن پانچ منٹ کے اندر روشنی اچھی طرح نمودار ہوئی اور اندھیرا زائل ہوگیا یہ وقت بھی عجیب وقت ہے صبح کی فرحت بخش ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے سپیدۂ صبح کا نمودار ہونا بھی دلفریب ہے۔ مرغان خوش الحان کے چہچہے بھی دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر بھی اسکی خوبیوں اور لطافتوں سے واقف ہے اسکا ذکی الحس دماغ اس کیفیت سے متاثر ہوتا ہے اور وہ باتیں ہمکو بتلاتا ہے جو کبھی ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی ہونگی یہ وقت سونے کیلئے نہیں یہ وقت نیچر کے بننے سنورنے کا ہے وہ رات بھر کی اوس سے اپنا منہ صاف کرتی ہے اور اپنے محبوب (سورج) کے نکلنے سے قبل ہی آراستہ و پیراستہ ہوجاتی ہے ـــــ سیر کا ئیں ہزاروں آوازیں پرندوں کیڑے مکوڑوں اور پتوں کی آرہی تھیں میں اُس عالم میں جب خوشی کے خیالات انتہا پر پہنچ کر رنج و غم کے خیالات دل میں پیدا کردیتے ہیں ـــــ میری روح نیچر کے مناظر سے دلچسپی رکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی بلکہ مجھے خیال تھا کہ میں بھی پرندوں اور نیچر کی تمام خوشنما چیزوں کیطرح خوش ہوں ـــــ یکایک مجھے خیال آیا کہ انسان ایک دوسرے کا دشمن ہے اور اسی باعث نیچر کی اور اشیا کیطرح اسمیں زندہ دلی

حقیقتِ مجاز

(جناب ابوالخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین بٹالوی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۶)

خط ملا سرسری نگاہ سے دیکھا اور پھینک دیا۔ محمود کے لئے ان لفظوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی جو انہیں بار بار پڑھتا۔ سوچتا۔ سمجھتا کہ اس خط میں کیا لکھا ہے اور صغرا کہاں تک درست کہتی ہے۔

"مجھے اس صغرا کی کیا پرواہ۔ اس سے بدرجہا بہتر۔ حسینہ۔ باسلیقہ۔ پڑھی لکھی اور علم موسیقی سے واقف عذرا موجود ہے اور وہ سب خوبیاں جو ایک شریف نوجوان مرد کی بیوی بننے کے لئے ایک عورت میں ہونی چاہئیں وہ سب عذرا میں ہیں۔ اگر مکان بک گیا۔ جائداد تباہ کر دی تو بلا سے۔ آخر میں نے برا کیا کیا روپیہ تھا اس طرح نہیں اسیطرح صرف کر دیا۔ لوگ شادیوں میں گھر بار بیچ کر لگا دیتے ہیں اور پھر ان کی مرضی کے موافق بیوی نہیں ملتی اور اگر میں نے عذرا کے لئے اس تمام جائداد کو ان معنوں میں استعمال کیا تو کیا ہرج ....؟"

چٹھی رساں کی آواز نے محمود کو ان خیالات سے جلد رہائی دلا دی۔ وہ فوراً نیچے گیا اور ایک بیرنگ وصول کر لیا۔

"———— قدرت کا فیصلہ ہمیشہ اٹل رہا ہے۔ اور یہ وہ فیصلہ ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔ میرا یہ خط تمہارے دل پر میری طرف سے بہت شکوک پیدا کریگا۔ مگر دیکھنا یہ ہے میں کہاں تک سچی بات کہتی ہوں۔ میں جب دہلی پہنچی تو نواب اکرم بیگ کا چھوٹا بھائی نواب اکمل بیگ مجھے دیکھتے ہی ہزار جان سے مجھ پہ فریفتہ ہو گیا۔ اس کے لفظوں کی صداقت نے میرے دل پہ وہ گہرا اثر کیا جو تمہاری محبت تین چھ ماہ کے عرصہ میں نہ کر سکی۔ میرے دل نے اس امر کی گواہی دیدی کہ نواب صاحب کسقدر پاک طینت اور صاف دل ہیں۔ ان کی ایک ایک بات میرے پسند خاطر ہے تمہیں اچھی طرح معلوم ہے

کہیں بازاری رقاصہ کہلوانے کے نام سے کسقدر نفرت کرتی تھی - اور میری شروع ہی سے یہ خواہش
کہ کسی شریف نوجوان آدمی کے گھر بیٹھ جاؤں الحمد للہ میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہوگئی -
دل وجان کے مالک و مختار بس وہی نواب صاحب ہیں جنہوں نے آگرہ پہنچکر میرے ساتھ شادی کر لی
سے مجھے لکھنؤ آنا تھا اور وہاں سے اسی غرض کے لئے تم آگرہ جانا پڑا - میری یہی تمنا ہے کہ اپنے خاوند
آغوش محبت میں جان دیدوں - میرے لئے اُن کی ہستی قابل پرستش اور بہترین نعمت ہے اور
جانتی ہوں کہ وہ مجھے کہانتک عزیز ہیں - اُن میں وہ صفات اور وہ خوبیاں موجود ہیں جو مجھے تم میں
نہیں دیتیں - میرے دل میں اگر صاف کہوں اور تم بُرا نہ مانو تمہاری محبت بالکل نہ تھی - وہ بھی فقط ا
کے کہنے پر تمہاری محبت کا جواب دیدیا کرتی تھی - میرے دل نے تمہیں مطلقاً قبول نہیں کیا اور نہ ہی تم
اسقدر دلفریب خوبیاں تھیں جو مجھے گرویدہ کرسکتیں - بس اب یہی اچھا ہوگا کہ تم مجھے بھول جاؤ ا
کے لئے بھول جاؤ - اب میں وہ نہیں ہوں جو کبھی رقاصہ تھی - میرا نام بھی اب بازاری لفظوں میں نہ
آسکتا میں یہ سب کچھ جانتی ہوں کہ یہ خط پڑھ کر تم پر کیا کچھ نہ گذرے گی مگر حق گواہ ہے کہ میں مجبور
جس چیز کو میری آنکھیں پسند نہیں کرتیں جس کو میرا دل قبول نہیں کرتا اوس کو لیکر میں کیا کرو
جس کے پاس ایک لمحہ کے لئے بیٹھنے کو طبیعت نہیں چاہتی اُس کے پہلو میں تمام عمر کس طرح بسر کر
مگر خدارا میرے ملنے کی ہرگز سعی نہ کرنا ورنہ نواب صاحب تمہیں تکلیف پہنچائیں گے - لکھنے والی
جو کبھی عذرا تھی "

(۷)

نا اُمیدی کی گھٹا بند تاریکیوں میں چھپنے والا - مرکز یاس کے نقاط تک ختم ہو جانے والا - ب
اور ما بعد کی زیست کو بدنام کرنے والا تو ہی فقط تو ہی ایک جنس ہے جس کی ایک ایک رگ میں
کی محبت ہے - تو برباد ہو کہیں غارت ہو - ڈوب مر تا کہ تیرے ساتھ عذرا کا خیال بھی غارت
تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا - دُنیا اور آخرت دونو میری آنکھوں میں اندھیرے ہیں اے عذرا......
خوبصورت عذرا......   ......میں مستقبل کی توقع میں تھا - میں سوچتا تھا کہ آنے والے مبارک
اپنی زندگی تمہاری معیت میں گذار دوں گا - اور یہی خواہش تھی کہ میرا جام زرین حیات تیر
موت کے ہاتھوں چھلک کر تمام ہو جائے مگر......   مگر افسوس......

سب امیدیں خاک میں مل گئیں جس طرح صبح کے وقت اشبنم کے باریک قطرے طلوع آفتاب سے فنا ہوجاتے ہیں اسی طرح میں اپنی آرزوؤں امیدوں کے حصول کی ناکام کوشش کی وجہ سے اپنے آپ کو اس صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھا ہوں۔ اب مجھے کامل یقین ہوگیا کہ باہمی محبت سے متحد ہونے میں اس دنیا کی کوئی طاقت اتفاق نہیں کرسکتی اور جو کچھ عشق و محبت کے افسانے سُنے جارہے ہیں وہ یقیناً واقعات سے خالی ہیں۔ جب اسے عذرا............ اسے خوبصورت عذرا........ ایک پاک روح کی محبت تیرے دل پر اتنے عرصہ میں اثر نہ کرسکی تو کب امید ہوسکتی ہے کہ محبت کا پاک اور استوار رشتہ اس دنیا میں کسی کے ساتھ منسلک ہوسکے گا؟

آہ! عذرا !!............ یہ وہی پتھر ہے جس پر ہم دونوں کبھی آکر پہروں بیٹھا کرتے تھے........ یہ وہی پتھر ہے........ جس تک دریا کے پانی کی لہریں مست ہو ہو کر تیرے پاؤں کو مس کیا کرتی تھیں........ جب تک........ بیشک یہ وہی پتھر ہے جس پر ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر اپنی محبت کے پُرانے واقعات کو دُہرایا کرتے تھے........ آج میں ہوں اور یہ اکیلا پتھر........ عذرا، آ، دیکھ........ دیکھ عذرا یہ کہ دریا کا پانی کس بیتابی سے مجھے اپنے آغوش میں لینے کے لئے میری طرف بڑھ رہا ہے، آہ........ یہ درست ہے کہ میں اب زندہ نہیں رہ سکتا، مجھے یہ دریا کا پانی وہاں پہنچادیگا جہاں میری پلید روح بھی دُور کا ر دیجائیگی مگر کسی متبرک دہلیز سے ڈھاسنا لگائے تیری آمد کا آخری منتظر........ منتظر رہونگا جہاں تجھے معلوم ہوجائیگا کہ میں........

....

....

—— —— دریا کا پانی اس وقت زوروں پر تھا ایک خفیف جھٹکا محمود کے لئے کافی ہوا۔ پانی کی لہروں میں اضطراب نمودار ہوا۔ بہتے ہوئے پانی کی سطح پر پہلے چھوٹا پھر لمبا سا دائرہ پیدا ہوا۔ پھر اور بڑھا۔ وسیع ہوا۔ یہانتک کہ پانی کی لہروں میں بہت جلد نہاں ہوگیا۔

حسنِ بیان

مقصدِ سعیِ حیاتِ ناتواں بر آئے کاش
حاصلِ صد خرمنِ دل ہو نگاہ برق پاش

اوس کا ذوقِ جستجو بھی ہو جنونِ جستجو
جس کو منزل پر پہنچکر پھر ہو منزل کی تلاش

دشت میں بھی لے رہا ہوں میں گلستاں کے مزے
دستہ گل بنگئی ہو تن پہ کانٹوں کی خراش

گو رہا میں خشک لب، پھر بھی یہ دامن بچ سکا
دستِ ساقی کا کوئی دیکھے تو حسنِ ارتعاش

دل ہے جسے کہتے تھے نزہت گاہ حسن و عشق سب
آج وہ دل ہو شباب آلودہ امیدوں کی تلاش

اب تو گھر بھی اک بیاباں کا نمونہ بن گیا
اے جنونِ کار فرما تا قیامت زندہ باش

درد بھی تا حدِ امکان تحمل دل میں ہے
تا نہ ہو جائے کہیں دنیا میں رازِ حسن فاش

دل سی نازک چیز کا ہر وقت کھٹکا ہی مجھے
انکی نظروں سے کہیں گر کر نہ ہو یہ پاش پاش

سرد مہری سے زمانہ کی طبیعت بجھ گئی
دل ہو پہلو میں کہ گویا برف کی ہو کوئی قاش

قیصر (بھوپال)

چشمِ جاناں

کیا کہوں اس کی کیسی آنکھیں ہیں ۔۔۔ جھیل کی سطح جیسی آنکھیں ہیں
یہ وہ جادو بھری ہیں آنکھیں ہاں ۔۔۔ جن میں شوخی ہے اور شرم نہاں
شرم کے ساتھ جذبۂ الفت ۔۔۔ ہے سرور اس کا مایۂ راحت
ہے ان آنکھوں میں اک کشش ایسی ۔۔۔ کیسی ہی رات کی ہو تاریکی

اپنی جانب یہ کھینچ لیتی ہے
مانع اسکی نہیں ہے کوئی شے

خوشنما آنکھیں یہ سمندر ہیں ۔۔۔ ولولے ایسے اس کے اندر ہیں
کوشش و سعی لاکھ کیجے، مگر ۔۔۔ دیکھ سکتی نہیں ہے اُن کو نظر
جس طرح موسم بہاری میں ۔۔۔ آسماں ہو - ہیں ویسی ہی آنکھیں
ان رسیلی نشیلی آنکھوں سے ۔۔۔ کیوں نہ ہو حد سے بڑھکے عشق مجھے
ہیں یہ آنکھیں بصد شکوہ و شان ۔۔۔ مثل توام ستاروں کے تاباں
روشنی کا منار انہیں کہیے ۔۔۔ منتظر ان کے دید کے رہیے
رکھتا ہوں ان کو اپنی نظروں میں ۔۔۔ تاکہ نکلیں مری تمنائیں

ایسے روشن منار ہیں ہادی
پھر تو گھبرا نہ جاؤں گا میں کبھی

ہچکچاتا ہوں آنکھیں کہنے سے ۔۔۔ اِن کو - یہ تو ہیں صاف آئینے
عکس ان آئینوں میں الفت کا ۔۔۔ دیکھ لو صاف ہے نظر آتا
ہاں، بخوبی ہے یاد وہ دن ۔۔۔ بھول جاؤں اُسے نہیں ممکن
نظریں دونوں کی جب ملیں باہم ۔۔۔ ساتھ ہی روحیں ہو گئیں ہمدم
آنکھ سے اسکی میری آنکھ ملی ۔۔۔ نکلی دل سوز اک چنگاری

اُف! نظر ہائے وہ ترے غمزے — وہ کچوکے تری کٹاری سے
ابروؤں اور پلکوں میں سے تری — مدہ بھری آنکھیں ہیں غضب ڈھاتی

رقص کرنے پہ جب وہ آتی ہیں
ہر گھڑی بجلیاں گرا تی ہیں

آنکھ سے اس کی آنکھ میری ملی — ہوئی بوچھاڑ پھر تو تیروں کی
غلط انداز کی جو اس نے نگاہ — دفعتہً دل سے میرے نکلی آہ

نگہہ لطف سے جو پھر دیکھا
ہو گیا پھر میں جیسے تھا تیسا،

کیا زیارت مجھے ان آنکھوں کی — اے خدا پھر نصیب بھی ہو گی
وہ کن انکھیوں سے دیکھنا اس کا — اسکا دیکھ کر آنکھیں پھر چرا لینا
کیا کہوں کیسی اس کی ہے یہ ادا — دل یہ کہتا ہے کیجیے جان فدا

اے خدا! کاش پھر وہ وقت آئے
دل کی حسرت مری نکل جائے

(ماخوذ از انگریزی) — شاکر (میرٹھی)

بیاض حضرت کوثر اکبر آبادی (علیگ)

ہر جنبش نظر میں ندامت کی اک جھلک (لا اعلم) اس اعتراف جور کے قربان جائیے
ہزار بار یہ دیکھا کہ ان کے چہرے سے (لا اعلم) نظر جو ہٹ گئی آنکھوں میں روشنی نہ رہی
نشے میں آنکھ میں کچھ نیند کچھ بیداریاں (دلگیر) پھر کسی کو بزم میں یوں جلوہ آرا دیکھتے
میرے رونے کا جسمیں قصہ ہے (جوش) عمر کا بہترین حصہ ہے
نیچی نظروں سے گذر جائیں گذرنے والے (فانی) دل کی ٹھہری ہوئی دنیا تہ و بالا نہ کریں
منہ چھپانا تھا انہیں پہلے ہی روز (لا اعلم) اب کیا پردہ تو کیا پردہ کیا

نیرنگ زمانہ

لاتی ہے رنگ کیا کیا نیرنگئ زمانہ — پیش نظر کرشمے رہتے ہیں اس کے کیا کیا
اک نقش بوالعجب ہے یہ عالم طلسمی — جادو بھرا ہوا ہے اسکا ہر اک تماشا
حیرت فزائے دیدہ اس کا ہر ایک منظر — رنگ فریب ہر دم اس کا ہر ایک جلوا
تارا بنا ہوا ہے آنکھوں کا ہر بشر کی — پنہاں نظر نظر میں ہے نور حسن اس کا
وہ دلفریبیاں ہیں اس کی ادا ادا میں — ہر دل فدائے صورت ہر چشم دیدہ شیدا
دل سینکڑوں اڑائے آنکھیں ملا ملا کر — ہے چشم سحر فن میں جادو کسی پری کا
چالوں سے اسکی فتنے اٹھتے ہیں ہر قدم پر — رفتار ہے مقرر محشر کا اک نمونا
حیرت میں ڈالتا ہے رنگت بدل بدل کر — بازی گری ہے اسکی ادنیٰ سا اک کرشما
ممکن نہیں نکلنا دام بلا سے اس کے — ہر رشتہ محبت ڈالے ہوئے ہے پھندا
رلتا ہے گردشوں میں ذرات ہر کسی کو — گردوں سے کم نہیں ہے کچھ اسکا دور دورا
لاڈالتا ہے سب کو گرداب نیستی میں — یہ موج بحر ہستی ہے اسی کا اک کنارا
بربادیاں لگی ہیں ہر سو قدم قدم پر — دشوار ہے بشر کو اسمیں سنبھل کے چلنا
جو سر ابھارتا ہے ہوتا ہے سرنگوں وہ — یکساں نگاہ میں ہے پست و بلند اسکا
حاصل غم توام ہے اسمیں ہر اک بشر کو — پاتے نہیں خوشی کا نام و نشان اصلا
نقشہ ہے راحتوں کا تصویر رنج و غم کی — آلام نے اڑایا عیش و طرب کا خاکا
آغاز شادمانی انجام صد الم ہے — ہنسنا کوئی گھڑی کا ہے عمر بھر کا رونا
محلوں کے جو یہاں پر کل خواب دیکھتے تھے — ظالم نے آج انکو زیر زمیں سلایا
سب کو مٹا مٹا کر اک دن مٹے گا خود بھی — ہستی میں اس کی پنہاں ہے رنگ نیستی کا
تصویر اس جہاں کی اک نقش ہے خیالی — دھوکے میں ڈالتا ہے انساں کو اسکا نقشا
بہتر یہی ہے اس سے دل کو بچائے رکھئے — اچھا نہیں ہے رونق چالوں میں اسکی آنا

رونق (دہلوی)

یا للعجب

سمجھتا ہوں دم بھر میں یہ دم نہیں ہے   مگر پھر بھی خوش ہوں کوئی غم نہیں ہے
تعجب تعجب تعجب تعجب

لحد کا بھی ڈر ہے مگر ہنس رہا ہوں   سفر کا خطر ہے، مگر ہنس رہا ہوں
تعجب تعجب تعجب تعجب

ہے پیش نظر انقلاب زمانہ   ہر اک آج کی بات کل ہے فسانہ
ہر اک قافلہ ہو رہا ہے روانہ   نہیں اس ٹھکانے کا کوئی ٹھکانہ
سمجھتا ہوں دنیا میں، میں چند دن ہوں   مگر پھر بھی بے فکر ہوں مطمئن ہوں
تعجب تعجب تعجب تعجب

میں کوشش میں خاک جہاں چھانتا ہوں   پھر اس پر مقدر کو بھی مانتا ہوں
تعجب تعجب تعجب تعجب

اسی لغویت میں، میں خود پھنس رہا ہوں   مگر غیر کے فعل پر ہنس رہا ہوں
تعجب تعجب تعجب تعجب

کوئی کام نیکی کا کرتا نہیں ہوں   خدا کو سمجھتا ہوں ڈرتا نہیں ہوں
تعجب تعجب تعجب تعجب

امجد (حیدرآباد)

غزلیات

ازجناب منشی سید مہدی حسن صاحب احسن ڈرافٹسمٹ لکھنوی

خودکشی کا مسئلہ گو موردِ الزام تھا
اتفاقاً میں وہ کر گذرا جو تیرا کام تھا

ہستئ فانی کا اک جلوہ برائے نام تھا
میں چراغ صبح تھا یا آفتاب شام تھا

فطرتاً احکام واعظ سے مجھے نفرت نہ تھی
عشق سے فرصت اگر ملتی تو اچھا کام تھا

تھی خلل انداز خلوت میں کشاکش نزع کی
روح کو گہوارۂ دل میں بہت آرام تھا

ہمسے ناحق ہے ہماری سخت جانی کا گلہ
آب خنجر دیکھ لیتے یہ تمہارا کام تھا

لفظ کے معنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی
موت یعنی عشق کا اک دوسرا ہی نام تھا

اک بیہوشی سے وابستہ رہی امید و بیم
چارہ گر خطرہ سمجھتے تھے مجھے آرام تھا

ہجر کی شب دیدۂ خونبار کے کام آگیا
وہ جو اک قطرہ لہو دل میں برائے نام تھا

احسن ارباب حسد کی ہمنے کچھ پروا نہ کی
دوست وہ کرتے رہے جو دشمنوں کا کام تھا

از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی

نہیں ہے نام کو مہر و مروت مہ جبینوں میں
ادائے جاں ستاں کے اور کیا ہے ان حسینوں میں

نہ وہ ظاہر ہوں کہ مخفی ہوں وہ ہر حالت میں ہیں دلکش
انوکھے ہیں، نرالے ہیں جہاں کے نازنینوں میں

ستم کوشی، دل آزاری، جفا جوئی، و عیاری
بھری ہیں خوبیاں اس قسم کی لاکھوں حسینوں میں

خدا کی دین ہے یہ ہر کسی کو مل نہیں سکتی،
محبت گھر بناتی ہے ہمیشہ پاک سینوں میں

ہے باہر سرحد ادراک سے تیرا تصور بھی،
نظر آتی نہیں تصویر تیری دوربینوں میں

کیا کرتا ہے جو کسب ضیا اے مہ لقا تم سے
کہ اختر بھی ازل سے ہے تمہارے خوشہ چینوں میں

از خاکسار عبد الرحمن خوشتر منگرولی مدیر رسالہ ہذا

شغل ہے عشق آدمی کے لئے
دل ہے سینہ میں دردہی کے لئے

رنج و فرقت ہے وصل ہی کے لئے
غم زمانے میں ہے خوشی کے لئے

گذر اپنا وہیں نہیں ہوتا
خاک اڑاتے ہیں جس گلی کے لئے

بے قراری پہ میری کہتے ہیں
جان کیوں دے کوئی کسی کے لئے

کیا خبر تھی کہ جان جائے گی
دل لگایا تھا دل لگی کے لئے

لاگ ہو یا لگاؤ کچھ ہو ضرور
دہر میں لطف زندگی کے لئے

تم کو زیبا ادائے محبوبی،
ہم ہیں اے جان عاشقی کے لئے

ہم ہوں یا خضر یا ہوں عزرائیل
موت ہے ایک دن سبھی کے لئے

ہے شراب اک دوائے روح فزا
اس بڑھاپے میں شیخ جی کے لئے

کہتے ہیں وہ کہ لے ہم آئے ہیں
آج خوشتر تری خوشی کے لئے

تنقید و تبصرہ

اردو رسالے

الناظر (لکھنؤ) یہ رسالہ کم و بیش پندرہ سولہ سال برابر پابندی کیساتھ بزیر ادارت جناب ظفر الملک صاحب علوی لکھنؤ سے نکلتا ہے شروع شروع میں یہ نہایت شاندار نکلتا تھا ملک کے لائق اہل قلم اس کے خصوصی مقالہ نگار تھے ہر وقت اسکو اعلیٰ ترین بنانے کو کوشاں رہتے تھے۔ "نظر سے خوش گذرے" کے معلومات اور چبھتے ہوئے فقرے دلوں کو تڑپا دیتے ایک عرصہ تک اس کا یہی رنگ رہا لیکن افسوس کہ گردش روزگار نے اسکو بھی ایک حالت پر نہ رہنے دیا تاہم اب بھی اس میں ایک نہ ایک علمی مضمون ضرور ہوتا ہے چنانچہ اگست ۲۶ء کے نمبر میں پروفیسر معتضد الرحمن صاحب۔ ایم۔ اے کا طویل مضمون "شہادت" نہایت پرمغز و کارآمد ہے اور خود ایڈیٹر صاحب کا مسلسل مضمون "سفر حجاز کی مختصر روداد" روزنامچہ کی صورت میں خوب ہے۔

ستمبر نمبر میں جناب محمد خلیل الرحمن صاحب (صاحب اخبار الاندلس) کا تاریخی مضمون "تاریخ عرب" نہایت محققانہ ہے "شمع بے نور کا مدر ڈیوں کا نزع" دلچسپ ہے سید محی الدین صاحب قادری زور (صاحب روح تنقید) نے بڑی تحقیق و تلاش سے "میر انیس کی شاعری کا ایک زبردست عنصر" ظاہر کیا ہے۔

غرضکہ الناظر اب بھی اردو اور ملک کی خدمات انجام دیتا رہتا ہے ہر سال ایک انعامی مضمون بھی ہوتا ہے جس میں اہل قلم کو اپنی محنت کا کافی معاوضہ مل جاتا ہے۔

الناظر میں سب سے زیادہ جو بات ہمیں نئی اور قابل تقلید نظر آئی وہ یہ ہے کہ اس میں پچھلے مہینے کے رسالے کے مستقل عنوان کے تحت موقت الشیوع رسائل کے اعلیٰ علمی مضامین کا اخذ و اقتباس یا اُن کی روح کھینچکر قارئین الناظر کو بھی مستفید کیا جاتا ہے۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی ضخامت ۸۰ صفحے قیمت للعہ، پتہ الناظر پریس لکھنؤ۔

نگار (بھوپال) اس رسالہ کے بہترین ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے جبکہ اسکی عنان ادارت ملک کے ایک ایسے ادیب و انشا پرداز کے ہاتھ میں ہے جس کی جادو بیانی کا ایک عالم معترف اور جس کے اعلیٰ علمی و ادبی ذوق نے ملک سے خراج تحسین وصول کرکے اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا ہے۔

حضرت نیاز فتحپوری ملک کے ان مستثنے انشا پردازوں میں سے ہیں جن کا ادبیات اردو پر زبردست احسان ہے آپ کے ادبی شہ پارے اس قابل ہیں کہ تاریخ ارتقائے ادب میں زریں حروف سے لکھے جائیں، ہم یہ دیکھ کر بیحد خوش ہیں کہ ملک نے ان کی علمی و ادبی خدمات کی قدر بھی ویسی ہی کی جسکے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

چار پانچ سال کا عرصہ ہوا جب "نگار" اپنے آتشیں رخسار کی ضیا پاشیاں کرتا ہوا دنیائے ادب میں جلوہ افگن ہوا تھا عناصر نگار میں چند ایسے نفوس بھی تھے جن کے ادبی مضامین نے دنیائے ادب میں ایک تازہ ہل چل اور نئی روح پھونک دی تھی خصوصاً صاحب لالہ رخ (لطیف الدین احمد) کے لازوال ادبیات نگار کی حیات و شہرت کے اصلی باعث ہیں۔ لیکن اب مدت سے حضرت نیاز ان سے بے نیاز ہو گئے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ اب نیاز صاحب نگار کو ادبی رنگ (ادب لطیف) سے پاک رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ اکثر انکے گذشتہ "ملاحظات" سے ظاہر ہے وہ چاہتے ہیں بلکہ محسوس کرتے ہیں کہ ادب لطیف کا اردو کے خزانہ میں اسقدر سرمایہ جمع ہو گیا ہے کہ اب ملک کو اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے بلکہ اب ٹھوس مضامین کی طرف عوام کو رغبت دلائی جائے اور ایسے علمی مضامین صفحات نگار میں پیش کئے جائیں جس سے ناظرین کو جائز طور پر فائدہ پہنچے اگرچہ ایک حد تک نگار کو اس میں کامیابی ہو رہی ہے مگر اس میں صرف ٹھوس اور علمی مضامین ہی کا انبار نہیں ہوتا بلکہ اس میں اس امر کا التزام بھی کیا جاتا ہے کہ ٹھوس مضامین کے پڑھنے کے بعد دماغ کی تکان دور کرنے کے لئے ایک دو دلچسپ فسانے عمدہ نظمیں متین ظرافت، اور کبھی کبھی طنزیات پر بھی کوئی مضمون بہم پہنچایا جاتا ہے۔

زیر نظر نمبر (اکتوبر و نومبر) بھی اپنی گوناگوں خوبیوں سے مالامال ہے "مطالعہ شاعری"... "محمد بن ابی عامر" اور "لارڈ رپن کا عہد حکومت" خوب مضمون ہیں "روح تنقید کی ضرورت" اور "مخالفین کے اعتراضات کا جواب" بھی محنت سے لکھا گیا ہے فسانوں میں "شکست عہد" "اعانت مجرمانہ" اور "مرتضیٰ جاسوس" اپنی نوعیت کے لحاظ سے اچھے ہیں نومبر نمبر میں "میر تقی میر کے خارجی حالات کی ترجمانی" خوب کی گئی ہے "اثر دہلوی" اور "... گوئی" بھی ادبی مضمون اچھے ہیں تاج محل (آگرہ) کے متعلق مسٹر ادلڈوس ہکسلے کے اعتراض کا جواب اگرچہ

...ہے لیکن ایک متعصب انگریز کے جواب کی طرف
...دوں سب سے پہلے نگار نے اعتنا کی اُمید کا اسکے متعلق
...واقعیت رکھنے اور فن تعمیر سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب
...ایڈیٹر صاحب کی درخواست پر توجہ فرما کر اس مشرق کی بہترین
...عمارت کی نسبت معترض کے اعتراض کا مدلل و شافی جواب دینگے
اس نمبر کے فسانوں میں ایڈیٹر صاحب کا فسانہ "نقاب
اُٹھ جانے کے بعد" ہمارے ہندوستانی پیران طریقت کی
توجہ کے قابل ہے۔ یہ اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے امید کہ
ایڈیٹر صاحب اس سلسلہ کو جاری رکھکر پیری مریدی کی
...بے تکلف گو شرمناک رسومات کو اور بھی بے نقاب کرینگے
نگار کی قبولیت عام کی سب سے بڑی وجہ "استفسارات" ہے
...جس میں ایڈیٹر صاحب کیطرف سے نہایت قابلانہ اور محققانہ
...خیالات ہوتے ہیں یہ سلسلہ اب ادنیٰ و اعلیٰ طبقہ میں اسقدر
...پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ جس نمبر میں ایڈیٹر صاحب
...کی مصروفیتوں کے باعث یہ مستقل عنوان نہیں ہوتا تو ناظرین
...کو سخت ناگوار گذرتا ہے۔ ہم ایڈیٹر صاحب کو صلاح دینگے
...کہ نگار نے باوجود چند سالہ عمر کے اپنے دامن میں جن جواہر پاروں
...(استفسار و جوابات) کو جمع کیا ہے وہ اسقدر اہم اور ضروری ہیں
...کہ انہیں علیحدہ علیحدہ فنون کی حیثیت سے ترتیب دیکر بہت جلد
...کتابی صورتیں شائع کرا دیئے جائیں تاکہ خواص و عوام کی معلومات
...اور ادب اردو میں ایک بیش بہا سرمایہ فراہم ہو جائے۔
...سائز بڑے لکھائی چھپائی خاصی حجم ۹۶ صفحات سالانہ صرف
...اتنے بڑے رسالہ کیلئے بہت کم ہے۔ پتہ نور محل بھوپال۔

نظر۔ یہ چھوٹا سا گرہ سشنا رسالہ پہلے پہل ترچھی
نظر بنکر نکلا تھا اور اب صرف "نظر" ہو کر دارالادب لکھنؤ
سے شائع ہوتا ہے اس کے مدیر اعزازی جناب سید
فدا حسین صاحب بی۔ اے ہیں اور اراکین ادارت
خصوصی میں چار نام اور ہیں یہ پانچوں نظر کے حواس خمسہ
ہیں اور انہیں کی مساعی جمیلہ سے نظر اپنی نظر فریبیوں
سے شائقین ادب کے دلوں کو بھاتا رہتا ہے۔

اس رسالہ میں اگرچہ ادبی مضامین کا عنصر غالب ہوتا ہے
تاہم بعض دفعہ اچھے مضامین بھی نظر آجاتے ہیں چنانچہ
اگست نمبر میں جناب ایم۔ الیس عبدالرحمٰن صاحب
وارثی کا مضمون "تعلقات ازدواجی" اور ستمبر نمبر میں
الف لیلیٰ کے متعلق جناب مسعود الرحمٰن صاحب ندوی کا
محققانہ مضمون اچھا ہے۔

لیکن ہم مدیران خصوصی میں سے جناب آمین سلونوی
کو یہ ہدایت ضرور کرینگے کہ وہ ادبی (ادب لطیف)
مضامین کے انتخاب میں ذرا سختی سے کام لیں اور ایسے
مضامین اول تو قابل اندراج ہوتے ہی نہیں ہیں اور اگر
اس سے رسالہ پورا کرنا ہی مقصود ہو تو اور بات ہے۔
ایسے ادبی مضامین غائر نظر سے دیکھے جانے کے محتاج
ہوتے ہیں کیونکہ ان میں بیشتر حصہ مہملات اور بھاری
بھاری الفاظ کے استعمال پر مشتمل ہوتا ہے چنانچہ
"دنائے عہد" میں لفظ چکاں کا کوئی دس بارہ جگہ
استعمال کیا گیا ہے اور ہر جگہ عجیب و غریب ترکیبوں

ساتھ خلّاق ترنم چکاں۔ فردوس چکاں۔ گریہ چکانی۔ بم چکانیوں۔ بہار چکاں۔ قمر چکاں۔ علم چکاں تنویر چکانیاں وغیرہ اسی طرح لرزش اور لرزاں کا بھی جا بجا استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ جدت کیا تھا لہذا حضرت تین صاحب سلونوی کا فرض ہے کہ حتی الوسع ایسے مسموم لٹریچر سے نظر کو بچائے رکھیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط ضخامت ۴۰ صفحے سالانہ تین روپے "فی نظر تکبیر"

پیمانہ (آگرہ) یہ رسالہ شروع میں جناب ساغر صاحب کی زیر ادارت چھوٹی تختی پر نکلتا تھا اب کچھ عرصے سے ۲۰/۲۶ سائز پر باتصویر نکلنا شروع ہوا ہے جسکے مدیر اعلیٰ حضرت سیماب اکبرآبادی اور مدیر ثانی ساغر صاحب ہیں ابتداً ایڈیٹر صاحب کی جدت آفرین طبیعت "آدنگوریات" کے رنگ میں نہایت عریاں اور حیاسوز جذبات نکلتے تھے جس میں علاوہ مہملات کے غیر مانوس الفاظ اور نئی نئی لایعنی ترکیبوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ جس پر معاصرین نے بہت کچھ تنقید کی خصوصاً ادو معتبخ کی سال گذشتہ کے فائل میں "ساغر و پیمانہ" پر کئی مسلسل مضامین شائع ہوئے ہیں مضمون نگار نے پیمانہ کی بعض ایسی فاحش غلطیاں تبلائی ہیں جنکو تسلیم نہ کرنا ہٹ دھرمی ہے اگر اسکے اُس حصہ کو جس میں ساغر و سیماب پر بعض بیجا حملے اور فحش الزامات عائد کئے گئے ہیں نظر انداز کر دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ مضمون نگار نے بعض ایسے دقیع لٹریری اعتراضات کئے ہیں جو پیمانہ کی پیشانی پر ہمیشہ کلنک کے ٹیکے کی طرح روشن رہیں گے۔

چند ماہ ہوئے پیمانہ کو آگرہ سے لاہور منتقل کیا گیا تھا لیکن وہاں کی آب و ہوا راس نہ آنے پر پھر آگرہ آگیا ہے جہاں سے زیر نظر مشترکہ نمبر (ستمبر و اکتوبر) نکلا ہے۔

مستقل عنوانات میں سے "جرعات" (ساغر و پیمانہ کی رعایت سے) بجائے ایڈیٹوریل یا شذرات کے ہے ہر مستقل عنوان کے مضامین کی علیحدہ علیحدہ فہرست ہوا کرتی ہیں جس میں فضول ایک ایک صفحہ روکا جاتا ہے شاید ایڈیٹر صاحب پیمانہ کے نزدیک زبان کے تمام کتابی سواد ادبیات میں شامل ہیں اسی لئے "دل اتحاد کے تقاضے اور دنیا کا مستقبل" "قانون تمدن اور سیاسات مدن" "اور شاہجہاں کا یومیہ پروگرام" "ادبیات" کے مستقل عنوان کے تحت میں آگئے ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں۔ لسانیات میں بھی تمام مضامین اچھے ہیں نظموں میں ساغر صاحب کی نظم "چاند کا تبصرہ ماضیات عالم پر" جدید طرز پر لکھی گئی ہے جو طویل ہونے کے باعث دو نمبروں میں ختم ہوئی ہے اور آٹھ نو صفحوں پر حاوی ہے "شاعری" پر جناب محمود صاحب اسرائیلی کی نظم خوب ہے اسی طرح ملکہ شعریت، عورت کا دل، موج کے ساز پر ملاح کا گیت وغیرہ اچھی نظمیں ہیں الہامات کے تحت میں بھی تمام غزلیں اساتذہ حال کی فراہم کی گئی ہیں۔

ادیب مرحوم کی طرح تصویر کے متعلق ایک نظم بھی تی ہے چنانچہ شروع میں ایک یورپین لیڈی کی مغربی مذاق کی تصویر ہے جو "بہار شباب" سے موسوم کی گئی ہے اور جس پر جناب منظر صاحب صدیقی نے نظم میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ دوسری تصویر "کابل کی عیدگاہ کا دوگانہ" ہے جو افغانستان کے جدید دور تمدن کا ثبوت ہے۔ رسالہ میں ایک کارٹون بھی دیا گیا ہے جو ایک ادبی رسالہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔ بہر حال رسالہ اچھا ہے۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ خاصہ ہے ضخامت ۸۰ صفحات سالانہ قیمت ہے (پیمانہ دار الادب آگرہ سے ملسکتا ہے)

نیرنگ (رامپور) یہ رسالہ بھی پہلے چھوٹی تختی پر جناب محمد عزیز اللہ صاحب عزیز۔ ایچ۔ پی کی اڈیٹری میں نکلتا تھا اب بڑی تختی ۴۸ صفحات پر برابر پابندی کے ساتھ رامپور سے شائع ہوتا ہے اس میں زیادہ تر شاعرانہ چھیڑ چھاڑ اور تنقیدی مضامین ہوا کرتے ہیں چنانچہ زیر تبصرہ نمبر اگست ستمبر و اکتوبر میں بالترتیب استحکام شکوک، اشعر حقیقت، عروض واقف، دور حاضرہ کی شاعری، اور ایک عروضی تحقیق، وغیرہ مضامین شائقین شعر و سخن کے لئے بکار آمد ہیں بعض مضامین کا لہجہ ذرا سخت ہے کیا اچھا ہو اگر اعتراضات نیک نیتی پر مبنی ہوا کریں اور کسی ذاتی مخاصمت کی بنا پر خواہ مخواہ کسی کو نشانہ ملامت نہ بنایا جائے کہ اس سے بجائے فائدہ پہنچنے کے ناظرین خصوصاً مبتدی شعراء کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔

حضرت شوق قدوائی کی مثنوی "حسن" پر ہمارے زبردست اور پرانے انشا پرداز خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کا مسلسل تنقیدی مضمون بھی خوب ہے۔

اکثر نظمیں بہت اچھی ہیں خصوصاً جناب سید کلب احمد صاحب مانی جائسی کی نظم "مناظرہ حسن و عشق" لیکن سخت تعجب ہے کہ ہم اسی نظم کو یہ تیسری مرتبہ چھپی ہوئی دیکھ رہے ہیں اول اول العصر (لکھنو) میں پھر اس کے دو تین سال بعد نقاد (آگرہ) میں اور اب کئی سال کے بعد نیرنگ میں دیکھ رہے ہیں۔ نیرنگستان (شذرات نیرنگ) کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اڈیٹر صاحب نیرنگ نے مانی صاحب کے صاحبزادہ سے مانی صاحب کے کلام کی درخواست کی ہو گی اور انہوں نے مانی صاحب کی بیاض سے نقل کرکے یہ نظم روانہ کر دی ہو گی اس میں بظاہر اڈیٹر صاحب نیرنگ کا کوئی قصور نہیں ہے مضامین بھیجنے والے حضرات اس کے ذمہ دار ہیں انہیں ایسے مطبوعہ مضامین کے دوبارہ چھپوانے سے احتیاط کرنا چاہئے

رسالہ میں اکثر شعراء کے خطوں کے عکس بھی دیئے جاتے ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے رسالہ برا نہیں لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی قیمت سالانہ ہے۔

پتہ: منیجر رسالہ نیرنگ ریاست رامپور۔

دل (آگرہ) یہ چھوٹا سا دلکش و دیدہ زیب رسالہ جناب حکیم سید مہدی حسن صاحب شباب اکبر آبادی نے اپنی ادارت میں محض ادبی خدمات کو سر انجام دینے کی غرض سے جاری کیا ہے اور ایک حد تک اسکو اسمیں کامیابی ہو رہی ہے۔ آگرہ کے مشہور ادیب جناب لطیف الدین احمد صاحب، حافظ امام الدین صاحب، شفیع احمد صاحب شفیع اکبر آبادی اور محمود صاحب ایسی مقتدر و مستند ہستیاں اس کو بہترین ادبی رسالہ بنانے میں کوشاں ہیں نقاد مرحوم کے بھی بعض خصوصی مقالہ نگار گاہے ماہے اسمیں نظر آ جاتے ہیں یعنی مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی اور مولوی نذیر علی صاحب درد کاکوروی وغیرہ۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر حجم ۳۲ صفحے سالانہ ؏ ۔

پتہ۔ گڈھیا حکیمان آگرہ سے طلب فرمائیے۔

ظل السلطان (بھوپال) دار الاقبال بھوپال کا یہ زنانہ لٹریچر کا ماہانہ رسالہ برابر دس سال سے اپنی مسلسل خدمات انجام دے رہا ہے زنانہ لٹریچر کے اور بھی بہت سے رسالے نکلے اور ناقدردانی زمانے کے ہاتھوں فنا ہو گئے اب بھی کئی رسالے نکلتے ہیں اور آئے دن نکل رہے ہیں لیکن اس نے خواتین ہندوستان کے کار آمد مضامین کا حسقدر ذخیرہ بہم پہنچایا ہے کسی نے نہیں پہنچایا۔ نیز یہ فخر بھی اسی رسالہ کو حاصل ہے کہ اس کی ناظرات اور مسلسل پڑھنے والیاں آج ملک کی اچھی انشا پردازوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

آجکل بعض زنانہ رسائل میں اکثر انشا پرداز خواتین کے قلم سے نکلے ہوئے نہایت مخرب اخلاق اور پایہ ارتقا سے گرے ہوئے مضامین بھی ہوتے ہیں لیکن ظل السلطان کی یہ خوبی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اس نے اپنے دامن کو ان آلودگیوں سے ہمیشہ پاک و صاف رکھا اور اپنے سنجیدہ معیار سے ذرا بھی ہٹنے نہیں پایا اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں ابتداءً جن چند متبرک و مقتدر ہستیوں کے مضامین نکلتے تھے اب ان سے محروم ہے لیکن اس سے رسالہ کی شان میں کوئی فرق نہیں آنے پایا خصوصاً جب سے جناب سید محمد یوسف صاحب قیصر نے اس کی ادارت کا بار اپنے ذمہ لیا ہے رسالہ کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

زیر تنقید ستمبر نمبر میں "خد تعیمہ کی سرگذشت" ناظم زادی نے خوب لکھی ہے اور افادات رسکن ہے "عورت" کے متعلق محمد عبد الجمیل صاحب نے بڑی محنت سے اقتباس کیا ہے اور عباسی بیگم صاحبہ کا "صحرا کا پھول" بھی سبق آموز فسانہ، خوب ہے جو مسلسل ہے۔ اکتوبر کے رسالہ میں "حفظ الاطفال" حکیم محمد ابراہیم صاحب کا یکتانہ مضمون بار بار پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی ترقی کی تدبیریں یہ محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ کا وہ انعامی مضمون ہے جو ایڈیٹر اخبار "دربار" کے مضمون نگار خواتین کی ہمت افزائی کے خیال سے اسی

وضوع پر انعامی مقابلہ کے اعلان پر لکھا گیا تھا اور جس پر
جناب موصوفہ اور خیرالنساء صاحبہ نے انعامات حاصل
یے تھے اس مضمون میں نہایت مفید اور قابل عمل تجاویز پیش
کئی ہیں۔ "اولاد کی شادی کرتے وقت کن باتوں کا
لحاظ کرنا چاہئے" اور "اسلام میں عورت کا درجہ" اہلیہ
ی سعد الدین حیدر صاحب اور اہلیہ نصیر الدین صاحب
نے اچھے مضمون لکھے ہیں اس کے علاوہ حضرت قیصر
سب ہر ماہ کشکول میں نایاب جواہر پارے جمع کرتے ہیں۔
ی عالم نسواں کی خبروں سے بھی ناظرات ظل السلطان کو
ت بہم پہنچایا کرتے ہیں
غرض کہ رسالہ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اس قابل ہے
ندوستان کے ہر خواندہ اور ناخواندہ مرد و زن کو اسکا
دلسننا نہایت ضروری ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ
ں حجم ۴۸ صفحے سالانہ تین روپئے۔

پتہ: ۔ منیجر رسالہ ظل السلطان بھوپال

اس (بمبئی) یہ دیکھ کر کہ اب بلدۂ بمبئی جہاں دُنیا
سباب تعیش کی فراوانی۔ دولت کی ارزانی اور
لہو و لعب کی افراط ہے وہاں اب علمی مذاق کی
افزونی ہے، بے اندازہ مسرت حاصل ہوتی ہے
اس سے بہت پہلے یہاں سے بہت سے ادبی رسالے
لیکن وہ یا تو تمام تر شاعرانہ مطارحات پر مبنی
یا شعراء بمبئی کے باہمی مجادلہ کا میدان ہوتے
یا اس بحث سے ہٹ کر ایک دوسرے پر نہایت
خطرناک حملے کئے جاتے تھے۔

اگر ہماری یادداشت غلطی نہیں کرتی تو ہم کہہ سکتے ہیں
کہ بمبئی کے ابتدائی گلدستوں میں برق، منشور شفاعت،
ارمغان فرخ، غنچۂ جاوید، آفتاب، معلومات الوارث،
شکسپیر، اور لبرل اپنے مقاصد و اغراض باحسن الوجوہ
ادا کرتے تھے، موخرالذکر دو تین رسالے مخزن کے تتبع
میں بہت کچھ علمی خدمات انجام دیتے تھے خصوصاً حضرت
ناظم لکھنوی کا لبرل اور ان کے استاذ حضرت ناطق
سرسوی کا معلومات الوارث صحیح معنوں میں علم و ادب کی
خدمت کرتے تھے اس کے بعد ایک طویل عرصے تک
اہل بمبئی پر ایک جمود کا عالم طاری رہا اور اگر اس درمیان
میں کوئی گلدستہ نکلا بھی تو اس کا عدم و وجود یکساں رہا۔

لیکن مسرت کا مقام ہے کہ اب اسی مقام سے طویل
خاموشی کے بعد چند بہترین رسالے نکل رہے ہیں چنانچہ
انوار القدس (صوفیانہ) انجمن اشاعت اردو کی طرف سے
اقتباس، انجمن معین الادب کی جانب سے ادبستان
علمی و ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ان میں **اقتباس** سب سے چھوٹی اور چار جزو کا
رسالہ ہے جس کی عنان ادارت جناب شبر صاحب
بدایونی کے ہاتھ میں ہے اقتباس کا ساتواں نمبر بابت
ستمبر ۲۶ء ہمارے پاس بغرض تنقید موصول ہوا ہے۔
اس میں پہلا مضمون "ہماری چند انشا پرداز خواتین" جناب
حامد اللہ صاحب افسر بی۔ اے میرٹھی کا لکھا ہوا ہے

فاضل مضمون نگار نے چند مضمون نگار خواتین کے اُن جذبات عریاں پر جو انشائے لطیف کے نام سے ملک کے بعض ادبی رسائل میں رہتے ہیں تنقید کی ہے اور جا بجا ان کے ان حیا سوز مضامین کے نمونے بھی درج فرمائے ہیں جن سے نہ صرف خواتین کو احتراز کرنا چاہئے بلکہ ہمارے شعرا اور ادب لطیف کے شیدا ادیبوں کو بھی پرہیز کرنا چاہئے۔ یہ مضمون "نگار" سے اقتباس کیا گیا ہے لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا گیا اسیطرح حضرت نیاز کا فسانہ "فریب خیال" بھی نگار سے بلا حوالہ نقل کیا گیا ہے "بیحجابی اور تعلیم نسواں کا چوتھا نظارہ" میں جناب فصیح الزماں صاحب نے مرد کے مقابلہ میں عورت کی عدم افضلیت کا نہایت عالمانہ اور محققانہ ثبوت پیش کیا اس مضمون کے تین نظارہ اگلے نمبروں میں نکل چکے ہیں۔

ایڈیٹر صاحب اقتباس کی خدمت میں کیا ہم یہ مشورہ پیش کرسکتے ہیں کہ انتخاب و اقتباس مضامین میں بلند حوصلگی سے کام لیں کہ مضامین اقتباس کے لئے بہت وسعت ہے بہرکیف رسالہ کی ابتدائی حالت اچھی ہے سالانہ ۱۲؎

پتہ :۔ قادر بلڈنگ بمبئی نمبر ۹

ادبستان۔ یہ بھی بمبئی کا ایک باتصویر ادبی رسالہ ہے جو جناب رشید صاحب صدیقی کی ادارت میں ستمبر ۲۶ء سے نکلنا شروع ہوا ہے پہلے نمبر میں جناب قمر احمد صاحب بی۔ اے ال ال۔ بی۔ مدیر روزنامہ خلافت بمبئی نے "مذاق شاعری" خوب لکھا ہے "اسلام ملوکیت" پر راجہ غلام حیدر خانصاحب نے نیتجہ خیز مضمون لکھا نامور انشا پرداز جناب سلطان حیدر خانصاحب جوش نے اپنے مخصوص رنگ میں "دعائے نیم شبی" میں ایک فرضی آنریبل ایم سی (ممبر آف دی کانسل) کا مضحکہ خیز خاکہ اُڑایا ہے باقی تمام مضامین متبذل اور غیر مفید ہیں نظموں میں جناب محمود اسرائیلی کی نظم کومل اور مولانا وحید الدین صاحب سلیم کی غزل خوب ہے۔

اکتوبر نمبر میں "اردو رسائل کا کیا نصب العین ہونا چاہئے" راجہ غلام حیدر خانصاحب نے خوب لکھا ہے بلکہ سارے رسالے میں یہی ایک کام کا مضمون ہے۔

کیا اچھا ہو اگر ایڈیٹر صاحب مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں وسیع النظری سے کام لیں کہ نو آموز مضمون نگاروں کی رعایت اور حوصلہ افزائی سے رسالہ اپنے معیار سے گر جاتا ہے

تیسرا نمبر اگلے دو نمبروں سے اچھا نکلا ہے اسمیں مضامین اچھے ہیں چنانچہ "انگلستان کے سیاح"، "سلطان صلاح الدین" اور "تنظیم کے چار پہلو" قابل مطالعہ ہیں امید ہے کہ اسیطرح آیندہ نمبر میں بھی کام کے مضامین فراہم کئے جائیں گے۔

تصاویر کی نسبت بھی اتنی عرض ضرور کریں گے کہ تطابق سے کام نہیں لیا جاتا اکتوبر نمبر میں "نورمحل" کے نام سے رنگین تصویر زیب ادبستان کیگئی ہے وہ بمبئی کے ایک دار گجراتی رسالہ "بیسویں صدی" کے دیوالی نمبر سے لیگئی ہے جسمیں شہنشاہ جہانگیر کا کیرکٹر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ لب ہے رقص و سرود کی بزم گرم ہے اور جہانگیر "رام رنگی" کے مزے اُڑا رہا ہے اسی طرح نومبر نمبر میں "نغمہ" غالباً کسی رنڈی کی ہے جو ادبستان کے لئے کسی طرح بھی زیبا نہیں ہوسکتی

اگر ایڈیٹر صاحب ان فروگذاشتوں کے دور کرنے

پرستش فرمائیں گے تو ادبستان وقعی "ادبستان" کہلائے جانیکا مستحق ہو جائیگا۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ سائز ۲۰×۲۶ ضخامت ۴ جزو سالانہ للعہ، پتہ :- منیجر صاحب ادبستان دادرمین روڈ بمبئی نمبر ۱۴

حرم (پیلی بھیت) ضرورت تھی کہ ملک سے ایک ایسا رسالہ جاری کیا جائے جو نسوانی علاج معالجات پر مشتمل ہو سکے کہ اس غرض کو لیڈی ڈاکٹر بیگم عبدالغفور صاحب ایل۔ ایم۔ پی نے بخوبی پورا کر دیا ہے اس میں تمام تر ایسے مضامین ہوتے ہیں جن کا جاننا عورتوں اور مردوں کے لئے نہایت ضروری ہے چنانچہ نمبر ۳ بابت ماہ جون میں "طویل العمری" اور "تشنج اور حمل" ایڈیٹرس صاحبہ کے "قلم سے نکلے ہوئے مضامین نہایت مفید و کارآمد ہیں علاوہ ازیں ادبی، اخلاقی، اقتصادی اور امور خانہ داری پر بھی بعض اچھے مضمون ہیں خصوصاً "اردو شاعری اور ہندو عورتیں" "مصر کی ترقی و اقتصادی حالت پر ایک اجمالی نظر" خوب ہیں آخر میں بطور ضمیمہ ڈاکٹر عبدالغفور صاحب کی مسلسل تاریخ طب اسلامیہ پر مسلسل لکھ کر نہایت محققانہ اور پر از معلومات ہے۔

جولائی و اگست کے مشترکہ نمبر میں بھی "پیدائشی آشوب چشم" "عسرت الطمث" اور ایام حمل طبی مضمون قابل قدر ہیں جناب مدیرہ صاحبہ کی جانب سے طبی معلومات بھی خوب بہم پہنچائی گئی ہیں، ملک کی قابل فخر اور مشہور ادیبہ جناب نذر سجاد حیدر صاحبہ کا اخلاقی فسانہ "شادی خانہ بربادی" قابل قدر ہے۔ ب۔ ج صاحبہ کا "ایک عجیب خط" ادبی رنگ آمیزیوں سے بھرا ہوا ہے جس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بعض ادب لطیف کے شائق "جنس کرخت" کیطرح "جنس لطیف" میں بھی ایسی رنگین عبارت آرائی کرنے والی موجود ہیں۔ مدیرہ فاضلہ نے اس خط کو محض اس غرض سے شائع کیا ہے کہ "یہ طرز تحریر عورتوں کیلئے کہاں تک قابل تقلید ہو سکتا ہے؟" جہانتک ہمارا خیال ہے عورتوں اور مردوں کو ایسی ناکارہ عبارت آرائی سے جسمیں مطلب کم اور غیر ضروری الفاظ کی بھرمار ہو پرہیز کرنا چاہیئے کہ اس سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہمیشہ مفید مطلب اور کام کی باتیں لکھنا چاہیئں۔

ستمبر نمبر میں بھی بعض مضامین بہت اچھے ہیں۔ بچوں کی صحت و ذہنیت، دودھ، گندہ ذہنی، اور عورتوں کے لئے کام کی باتیں، اس نمبر کے طبی مضامین ہیں "ہمارے رہنماؤں کی پست خیالی" پر جناب نذر سجاد حیدر صاحبہ کی بلند خیالی قابل داد ہے اور کلکتہ میں ایک لاکھ زنان بازاری، اور ملک کی ترقی عورت کے ہاتھ میں ہے، قابل عمل و مطالعہ مضمون ہیں۔

یہ دیکھ کر ہمیں بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ اس رسالہ کا مقصد اجرا یہ ہے کہ :-

"اس رسالہ سے جو کچھ آمدنی ہوگی وہ غریب اور بیمار عورتوں کے علاج پر صرف کیجائیگی"، ہم بزور سفارش کرتے ہیں کہ ملک کے تمام خواندہ اور ناخواندہ افراد اس کے خریدار بن جائیں کہ اس سے اپنا اور دوسروں کا بھی بھلا ہوگا۔

تختی چھوٹی ضخامت ۳ جزو لکھائی چھپائی بھی بری نہیں سالانہ تین روپیہ۔

پتہ :- دفتر حرم محلہ کھمان پیلی بھیت (یو۔ پی)

اخبارِ علمیہ

درختوں کو رنگنے کی صنعت

جرمن کے مشہور سائنداں فرٹز وان بہر (Fritz - Von - Behr) نے درختوں کو مختلف رنگوں سے رنگنے کی عجیب و غریب صنعت ایجاد کی ہے - وہ پوشیدہ طریقے سے عمل کر کے ایک معمولی (Beech) کے درخت کو گلاب کے پیڑ میں اور بھوج پتر کے درخت کو مہاگنی (Mahogany) میں تبدیل کر لیتا ہے - تجربہ کار رنگ سازوں اور فرنیچر بنانے والوں کو باوجود تحقیق و تفتیش کے اسکا راز معلوم نہیں ہو سکا - یہ رنگ سطحی نہیں بلکہ درخت یا لکڑی کے اندر پیوست ہو کر پھر کبھی زائل نہیں ہوتا - اس قسم کی رنگین لکڑیوں سے کئی اشیا تیار کی گئی ہیں -

عصبی امراض کا سبب

امریکہ کے نامی اطبا نے، جو عرصۂ دراز سے اپنی تحقیقات میں مصروف تھے، معلوم کر لیا ہے تمام امراض عصبی شلاً التہاب اعصاب، ضعف اعصاب، ذیابیطس، عرق النسا، وجع القلب، وجع لعصب تا عصاب کی میکانکی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں، اور اس حرکت و تہیج کا مرکز وہ ہڈی ہے جو کمر کے نیچے جگہ واقع ہے جہاں کولہے کی ہڈیاں (ایک حلقہ میں) جڑی ہوئیں ہیں - انہوں نے اس کا تجربہ کر کے دیکھ کہ اس ہڈی کے اپنی جگہ سے ذرہ بھر ہٹنے پر ان جوڑوں کے ذریعہ تمام اعصاب پر دباؤ پڑتا ہے جس یہ امراض پیدا ہوتے ہیں - اگر اس ہڈی کو اپنی اصلی جگہ پر بٹھا دیا جائے تو ان کا دعویٰ ہے کہ کو جلد آرام ہو جائیگا -

زمانہ

جلد ۱ | فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء | نمبر ۶

زبانِ خلق

مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) اپنے رسا
بابت اکتوبر ۲۶ء میں) زبان پر حسب ذیل ریویو فرماتے ہیں:-

"زبان"

ایڈیٹر۔ عبدالرحمٰن خوشتر (منگرولی) سالانہ قیمت چار روپئے۔ منگرول (کاٹھیاواڑ) یہ رسالہ ایسے مقام سے شائع ہوا ہے جہاں کی زبان گجراتی ہے۔ ہم خوشتر صاحب کو ان کی سعی پر مبارکبا دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ پیارا رسالہ کامیابی کے ساتھ جاری رہے گا۔ علمی و ادبی مضامین کے لحاظ سے رسالہ قابل قدر ہے مضامین کے ساتھ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔ گجرات بھی ایک زمانہ میں اردو زبان کا مرکز رہا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ جناب خوشتر صاحب اور پروفیسر نواب علی صاحب جیسے صاحب ذوق حضرات کی بدولت اس کا چرچا پھر اس خطے میں ہونے لگے ہم بھی فاضل پروفیسر کے ہمنوا ہیں کہ:-

"مٹنے کی نہیں ہے کبھی گجرات میں اردو"

رسالہ "قوس قزح" لاہور بابت دسمبر ۲۶ء۔

زبان۔ بہ ادارت جناب عبدالرحمٰن صاحب خوشتر منگرولی۔ مقام اشاعت منگرول کاٹھیاوا

سائز ۲۰×۳۰ حجم ۴۸ صفحہ سالانہ چندہ چار روپیہ

کاٹھیاواڑ سے ایک اردو رسالہ کا اجرا ر واقعی نہایت ہمت کا کام ہے اور میں کارکنان کو مستحق مبارکباد سمجھتا ہوں۔ ہندوستان کے اس حصہ میں اردو نشر و اشاعت کی واقعی بہت ضرورت ہے "زبان" کے دو نمبر میرے سامنے ہیں دونوں ایک سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ زبان شستہ مضامین بلند پایہ غرض اس کی اٹھان بہت شاندار ہے۔

صفحۂ ادارت

ہمارے انحطاط و زوال کی علت و بر علم و ہنر سے بیگانہ وشی تبلائی جاتی ہے اگرچہ اس کی اصلیت و صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جب ہم اس "بیگانہ وشی" کے علل و اسباب پر غور کرتے ہیں تو اصل حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے کہ ادنیٰ اور اوسط طبقے کے افراد جو بوجہ قلت معاش اور خوفناک افلاس تعلیم و تدریس کے ان منازل کو بتدریج طے کرنے سے عاری ہوتے ہیں جہاں کامیابی کا امید افزا چہرہ نظر آتا ہے۔

ایسے افراد میں وہ شخص بڑا خوش قسمت مانا جاتا ہے جو سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے پہلے کچھ سدھ بدھ پڑھ لیتا ہے، ورنہ عام طور پر ان طبقات کے افراد ناخواندہ اور جاہل رہ جاتے ہیں اس کی وجہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اپنی اور اپنے متعلقین کی کم مائیگی و افلاس اور گذر اوقات کے افکار لاحق ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنی تعلیم کو آگے بڑھانے کی بجائے ہوشیار ہوتے ہی کہیں نہ کہیں ملازمت اختیار کر لیتے ہیں اس طرح ان کی تعلیمی ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں کتنی ایسی درسگاہیں اور کتنی ایسی ریاستیں ہیں جو ایسے افراد کے بچوں کو معقول وظائف دے کر انہیں فکر معاش نیز ان کے متعلقین کی گذر اوقات کی اہم ذمہ داری سے سبکدوش کر دیتی ہیں؟ جہاں تک ہمارا خیال ہے ایک بھی ایسی درسگاہ یا ریاست نہیں ہے جو ان کی تعلیمی ترقی کی ممد ہوں! ہاں بعض ریاستوں میں جبریہ تعلیم کا قانون نافذ ہو گیا ہے وہ بھی محض پرائمری تعلیم تک بغیر کسی اعانت و وظیفہ کے۔

جہاں اس مصیبت میں اور صوبہ جات مبتلا ہیں وہاں ہمارا جزیرہ نما کاٹھیاواڑ بھی اس آفت میں گھرا ہوا ہے جسے دیکھ کر سخت ملال ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ افسوس تو ان متمول ذمہ دار حضرات اور ارباب حل و عقد پر ہوتا ہے جو اس مصیبت کا تدارک اور اس آفت کے دفعیہ کی کوئی صورت نہیں نکال سکتے۔

ہمارے خیال میں کاٹھیاواڑ کے ارباب بست وکشاد کے قابل توجہ امر تعلیم نسواں ہے اگر وہ اس طرف کا
جدوجہد اور پوری سرگرمی کے ساتھ توجہ مبذول فرمائیں تو ان درماندوں کی بہت کچھ درمانی ہوسکتی ہے کیونکہ
پر لڑکوں کی طرح کمانے وغیرہ کا بار نہیں ہوتا صرف امور خانہ داری کی واقفیت ضروری ہوتی ہے جو بہت تھوڑا
میں حاصل ہوسکتی ہے اس لئے اگر ان کی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے تو وہ شادی تک خاص علمی استعداد
کرسکتی ہیں، اس طرح وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے زبردست ممد ومعاون ثابت ہونگی، اور ایک اہم مسئلہ
آسانی کے ساتھ حل ہوجائیگا۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں کچھ عرصے سے قوم کے نبض شناس افراد تعلیم نسواں کی اہمیت کو
محسوس کرتے ہوئے تعلیم نسواں کے متعلق، ان تھک اور قابل قدر جدوجہد کر رہے ہیں اور ان کی یہ سعی بھی
روز بروز کامیاب بھی ہوتی جاتی ہے۔

لیکن ان سطور کے لکھنے کی اصل غایت تو یہ ہے کہ کیا کاٹھیاواڑ کے ذی حوصلہ اور ذمہ دار حضرات نے
بھی اس مسئلہ میں کوئی عملی کارروائی کی؟ اور اگر کی ہے تو کس حد تک کامیابی ہوئی؟

جہاں تک ہمارا خیال ہے مسلمانان کاٹھیاواڑ، لڑکیوں کی تعلیم صرف اسقدر ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن
اور تعلیم نامہ کو ختم کردے، بس یہی ان کا منتہائے تعلیم ہے، عورت کے لئے لکھنا پڑھنا بدترین گناہ سمجھ کر تعلیم اس سے
آگے نہیں بڑھنے دیتے، اتنی تعلیم بھی محض اس لئے دلائی جاتی ہے کہ لڑکی کا ناطہ جوڑتے وقت لڑکے والوں
کو یہ کہہ سکیں کہ لڑکی "تعلیم یافتہ" ہے۔

اگرچہ کاٹھیاواڑ کے دو تین شہروں میں جہاں متمول میمنوں کی آبادی بکثرت ہے لڑکیوں کے مدرسے
کھول دیئے ہیں لیکن ان کا تعلیمی معیار نہایت پست ہے تاہم شکر ہے کہ اب اہل کاٹھیاواڑ بھی اس امر
کو محسوس کر رہے ہیں اگرچہ پردہ خواتین ہند کی تعلیمی ترقی میں سد سکندری کی طرح حائل ہے۔

انہیں امور کو مدنظر رکھکر حال میں ہمارے بیدار مغز اور علم دوست رئیس عالیجناب نواب شیخ محمد جہانگیر میاں
صاحب بہادر بالقابہ نے ریاست منگرول میں جابجا مدارس صبیات قائم کردیے ہیں اور اُن کے تعلیمی نصاب کو
اعلیٰ پیمانہ پر لانے کی سعی فرمارہے ہیں۔ کیا کاٹھیاواڑ کی دیگر اسلامی ریاستیں بھی کبھی اپنی اس زبردست
داری کو محسوس کریں گی؟

اس سلسلہ میں یہ خبر بھی مسرت سے پڑھی جائے گی کہ حال میں کاٹھیاواڑ کی ایک ہندو خاتون مس جمنابائی
اے کی ڈگری حاصل کرکے ریاست گونڈل کے روشن خیال ٹھاکر صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری
ممتاز عہدے پر سرفراز ہوئی ہے جن کو ہم ان کی کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔
کاٹھیاواڑ میں یہ پہلی ہندو عورت ہے جو اپنی اعلیٰ تعلیم کے باعث امور مملکت کی سیاسی گتھیوں کے
سلجھانے میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لے رہی ہے۔

ہم نے گذشتہ ستمبر نمبر میں عالی جاہ حضور نواب صاحب منگرول بالقابہ کی رقم اوقاف کا ذکر
کرتے ہوئے ایک عربی درس گاہ کے قیام و انعقاد کی طرف بھی موصوف الذکر کی توجہ منعطف کرائی تھی
شکر ہے کہ ہماری عرضداشت پر ہمارے کرم گستر و علم پرور حضور ولیعہد صاحب بہادر نے توجہ مبذول
فرمائی ہے بہ شرطیکہ ملک کے اہل استطاعت بھی اس کار اہم میں شرکت فرمائیں۔
اُمید ہے کہ بمبئی کے (اہل منگرول) ذی حوصلہ حضرات جنھیں مسلمانان کاٹھیاواڑ کی دینی و دنیوی
بہبود کا خیال شدت کے ساتھ ہے وہ اس علمی تحریک میں نمایاں حصہ لے کر اپنی اپنی علم دوستی و
فیاضی کا ثبوت دیں گے۔

ہم علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے کی خدمت میں ان کی انتخاب کونسل کی میمبری کی کامیابی پر
کمال مسرت و بہجت کے ساتھ تحیہ مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

ہماری یونیورسٹیوں کے تعلیمی مصارف کا حال ہمیشہ ناگفتہ بہ رہا ہے جس کا اصل سبب ملک کی بے التفاتی

اور اہل ثروت کی بے نیازی ہے چنانچہ ہماری قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ جس کی بنیاد تحریک خلافت کے زمانہ میں پڑی تھی آج ملک کی شاکی اور مالی مشکلات کی وجہ سے جاں بلب نظر آتی ہے، اگرچہ تقریباً اسی زمانہ میں مہاتما گاندھی کی ودیاپیٹھ (احمد آباد) کی بنیاد بھی پڑی تھی لیکن چونکہ وہ ہندؤں کی ہے جنہیں اپنے اس قومی تعلیمی مرکز کا پورا احساس ہے اس کے کارپردازان کو اب تک دست سوال دراز کرنے کی نوبت نہیں آئی اور جامعہ ملیہ جو مسلمانوں کی ہے جنہیں اس کی اہمیت کا کما حقہ احساس نہیں ہے اس کے کارپردازوں کو آج قوم کی خدمت میں اپیل کرنے کا وقت آگیا ہے۔

ہمارے پاس کارپردازان جامع ملیہ (دہلی) کی جانب سے ایک مطبوعہ اپیل برائے اندراج رسالہ موصول ہوئی ہے جس کو ہم بجنسہ درج کرتے ہوئے ملک کے ذمہ دار افراد سے اس کی اعانت و امداد کی پرجوش الفاظ میں سفارش کرتے ہیں۔

اپیل

"جامعہ ملیہ (نیشنل مسلم یونیورسٹی) کی بنیاد اگرچہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں پڑی لیکن وہ اول دن سے ایک مستقل تعلیمی نصب العین رکھتی تھی اور اسیکا نتیجہ تھا کہ ۱۹۲۴ء میں اسکے تمام ارکان نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ اسے خلافت کمیٹی سے الگ کرکے ایک مستقل اور خالص تعلیمی مرکز کی شکل دیدیجائے اور اس کے لئے جسقدر مالی اعانت کی ضرورت ہو اس کا بطور خود انتظام کیا جائے اور چونکہ علی گڑھ کے قیام میں اس کا اندیشہ کیا جاسکتا تھا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اس کی رقیبانہ چشمک باقی ہے اس لئے گزشتہ سال اس کا محل قیام بھی علی گڑھ سے دہلی منتقل دیا گیا جو ہر حیثیت سے ایک مرکزی انسٹی ٹیوشن کے لئے موزوں مقام ہے ہمارا یقین ہے کہ نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ ہندوستان کے لئے ایک ایسے قومی تعلیمی مرکز کی ضرورت وقت کی اصولی اور بنیادی ضرورتوں میں سے ہے اور اگر ملک کی بے اتفاقی سے یہ مرکز تکمیل تک نہ پہنچ سکا تو ایک نہایت قیمتی تعلیمی حرکت سے ملک کا مستقبل محروم ہو جائیگا، اگرچہ جامعہ کی مطلوبہ تکمیل کے لئے ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے لیکن اگر بالفعل پانچ ہزار روپیہ ماہوار آمدنی کا انتظام ہو جائے تو اس کی بنیاد اس حد تک مضبوط ہو جائیگی کہ بہتر تعلیمی نتائج فوراً حاصل کئے جاسکیں گے۔ یہ پانچ ہزار روپیہ ماہوار نہایت آسانی سے فراہم ہو سکتا ہے اگر ملک کے لاکھوں مستطیع اشخاص میں سے سو اہل خیر ایسے نکل آئیں جو پچاس روپیہ ماہوار اس عظیم الشان کام کے لئے وقف کرسکیں۔
ہم امید کرتے ہیں کہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں ایسے سو اہل خیر و استطاعت حضرات کا

مل آنا کچھ دشوار نہ ہوگا بشرطیکہ اس کارِ عظیم کی اہمیت اور اس کے نتائج محسوس کریں۔ ہم تمام ایسے حضرات سے اپیل کرتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کے لئے کم از کم اتنا ضرور کریں۔ ہم نے یہ اپیل کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس کرلی ہے، ہم ملک کو یقین دلائیں گے کہ اگر جامعہ ملیہ کی موجودہ حالت اور اس کے مستقبل کی طرف سے ہمیں پورا اطمینان نہ ہوتا تو ہم اس نئی اپیل کی ذمہ داری ہرگز قبول نہ کرتے۔ ہم یہ بھی ظاہر کردینا چاہتے ہیں کہ اب اس انسٹی ٹیوشن کو ملک کی کسی پولیٹیکل تحریک سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے، اور یہ کامل معنوں میں ایک خالص تعلیمی درسگاہ ہے۔"

(ڈاکٹر سر) محمد اقبال (نواب سر) ذوالفقار علیخاں (صاحبزادہ) آفتاب احمد خاں (مولینا)
ابوالکلام آزاد۔ اجمل (امیر جامعہ) مختار احمد انصاری (معتمد جامعہ)

غزل

(جناب محمد عبد الباسط صاحب باسط بھوپالی)

اشک سے روتا تھا میں اور تو غمِ دشمن میں تھا — ہائے اس آنسو کی قیمت جو ترے دامن میں تھا
ڈوب کر دریائے ناکامی میں کامل ہوگیا، — وہ تصور جو کنارِ آب جو گلشن میں تھا
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہوگیا — میں کہ اک روشن ستارہ صبح کے دامن میں تھا
کیا بتاؤں حسرتِ دیدارِ گل اے ہمصفیر — ہائے وہ پرواز جس سے میں کبھی گلشن میں تھا
کیوں کہوں تاریک تھی دنیا مرے گھر کی طرح — نور تھا لیکن چراغِ خانۂ دشمن میں تھا
حاصلِ صد آرزو ہے جذبۂ شوقِ نظر — آج وہ چلمن سے باہر ہے جو کل چلمن میں تھا
میری آنکھوں میں رہا تو یا دلِ مشتاق میں — حسن کس کا جلوہ گاہِ وادیِ ایمن میں تھا
کیوں ہنسی کو اپنے رونے پر مرجح جانئے — طعنۂ بے حاصلی ہر خندۂ گلشن میں تھا
اب جوانی میں اسے کس چیز سے تشبیہ دوں — جزوِ اعظم فتنۂ محشر کا جو بچپن میں تھا
بجلیاں ہیں اور باسط کا دلِ مشتاق ہے — کس جوانی کا تبسم وادیِ ایمن میں تھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء

مقالات

ناصر الدنیا والدین ملک نائب خسرو خاں گجراتی

(از مولٰنا ابو ظفر صاحب ندوی پروفیسر گجرات مہاودیالہ احمد آباد)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایک دن بادشاہ سے عرض کیا کہ میں شب و روز حضور کی خدمت میں رہتا ہوں اور میرے قرابت کے لوگ جو دُور دراز ملک سے صرف مجھ سے ملاقات کرنے آتے ہیں۔ وہ نہ مجھ سے مل سکتے ہیں۔ نہ میں ان سے کیونکہ حضور کے یہاں سے رات کو فراغت پاتا ہوں تو محل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے حضور اگر مناسب سمجھیں تو محل کی چابی میرے کسی معتمد کو سپرد فرمادیں۔ تاکہ رات کو ان لوگوں کو بلا کر مل سکوں بادشاہ نے بخوشی اس عرضداشت کو قبول فرماکر حکم دیا کہ محل کے چھوٹے دروازے کی کنجی خسرو خاں کے حوالہ کیجائے۔ خسرو خاں نے اس کو فال

ٹیک سمجھا۔ اب روزانہ بلا خطر گجراتی بھرواڑ محل میں آنے لگے۔ ہر رات یہ لوگ مسلح محل میں داخل ہوکر صبح تک اسی قسم کے مشورے کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ محل کا بچہ بچہ اس سے واقف ہوگیا۔ لیکن قطب الدین کی درشت مزاجی اور خسرو خاں پر اعتماد رکھنے کے باعث کسی کی مجال نہ تھی کہ قطب الدین کے کانوں تک اس کی خبر پہنچائے۔ قاضی ضیاء الدین[1] نے جو قاضی خاں کہلاتے تھے اور بادشاہ کے اُستاد بھی تھے۔ کمر ہمت باندھ کر ایک دن بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور معاملہ بہت نازک ہوگیا ہے۔ اور خسرو خاں گجراتی دن رات آپ کے برخلاف مشورہ کرتا رہتا ہے حضور تحقیقات فرمائیں۔ اگر واقعہ غلط نکلے۔ تو خسرو خاں کا اعتماد اور زیادہ بڑھ جائیگا اور جو صحیح نکلے تو حضور کی جان سلامت رہجائے گی۔ قطب الدین نے اس کا جواب بہت درشتی سے دیا۔ اور اس وفادار استاد کی کوئی پرواہ نہ کی۔ بلکہ جب تھوڑی دیر کے بعد خسرو خاں گجراتی آیا۔ تو قاضی خاں کی عرضداشت حرف بحرف سنا دی۔ خسرو خاں نے دیکھا کہ معاملہ پھر بگڑا جاتا ہے۔ اس لئے فوراً منہ بنا کر رونا شروع کر دیا۔ اور عرض کیا کہ تمام سرداروں سے پیار درجہ چونکہ حضور نے بلند فرمایا ہے۔ اس لئے لوگ میرے خون کے خواہاں ہیں۔ بادشاہ نے تسلی دہ الفاظ سے اُس کی خاطر داری کی۔

یہ واقعہ دن کے وقت کا ہے۔ جب رات ہوئی تو تمام گجراتی بھرواڑ محل میں مسلح جمع ہو گئے۔ اور حسب دستور رات زیادہ آجانے پر قاضی ضیاء الدین، پہرہ والوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا کہ خسرو خاں کا رشتہ دار "رندھول" نامی معہ چند گجراتی بھرواڑوں کے مسلح ایک جگہ چھپ رہے۔ اور محل ہزار ستون میں قاضی خاں گیا تو سامنے آکر ایک بیڑا پان کا قاضی خاں کو دیا۔ اور اس درمیان "جاہریا" نامی ایک بھرواڑ نے پیچھے سے قاضی خاں کو ایک تبر اس زور سے مارا کہ وہ فوراً مر گیا۔ قاضی خاں کے مرنے سے محل میں ایک شور پیدا ہوگیا۔ اور محل تمام گجراتی بھرواڑوں سے بھر گیا۔ اس شور و غوغا کو سُن کر قطب الدین نے خسرو خاں سے دریافت کیا کہ یہ کیسا شور ہے خسرو خاں تو واقف ہی تھا۔ نیچے دیکھ بھال کر اوپر واپس آیا۔ اور کہا کہ حضور گھوڑے اصطبل سے چھوٹ کر صحن میں آگئے ہیں[2]۔ لوگ پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی یہ گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ طوائی بھرواڑ

---

[1] ان کا پورا نام یہ ہے۔ قاضی خاں صدر جہاں مولانا ضیاء الدین بن مولانا شہاب الدین خطاط (ابن بطوطہ جلد دوم)

[2] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ خسرو خاں نے بادشاہ سے کہا کہ کچھ لوگ میرے رشتہ دار مسلمان ہونا چاہتے ہیں مگر خاندان کے ڈر سے دن کے بجائے رات کو آنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے اجازت دیدی جبکہ قاضی خاں کے قتل سے شور ہوا تو قطب الدین نے پوچھا کہ کیسا شور ہے۔ تو خسرو خاں نے کہا کہ حضور وہی لوگ مسلمان ہونے کے لئے آنا چاہتے ہیں مگر لوگ آنے نہیں دیتے ہیں۔ بادشاہ باتوں میں مشغول تھا کہ دوسرے لوگ اوپر

م سب اوپر پہنچ گئی۔ اب قطب الدین کی آنکھ کھلی اور سمجھا کہ بلوہ ہو گیا۔ فوراً زنان خانہ کی طرف بھاگا۔ لیکن خسرو خاں
(ا)تی نے یہ سمجھ کر کہ اگر زنان خانہ میں بادشاہ چلا گیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ اس لئے فوراً پیچھے سے بادشاہ کے
بسو پکڑ کر ہاتھوں میں مضبوطی سے لپیٹ لیا۔ بادشاہ نے اس کو گرا دیا۔ اور خسرو خاں کے سینہ پر چڑھ بیٹھا۔ پھر بھی
مضبوطی سے خسرو خاں بال پکڑے رہا تاکہ بادشاہ بھاگ نہ سکے۔ اس اثنار میں "جاہریا" نامی بھرواڑ محمد اسحاق
ور ابراہیم دونوں دربان خاص کو قتل کرکے بادشاہ تک پہنچ گیا خسرو خاں گجراتی نے چلا کر کہا کہ میں نیچے ہوں میرا
بال رکھنا" جاہریا" نے فوراً ایک تیر سلطان قطب الدین کی گردن پر مارا جس سے سلطان قطب الدین گر پڑا
پھر سر اسکا کاٹ لیا۔ اور ہر شخص جوان کا مزاحم ہوا مار ڈالا گیا۔

محل ہزار ستون کے نیچے اوپر غرض ہر طرف گجرات کی بھرواڑ قوم بھری پڑی تھی۔

رندھول گجراتی یا خسرو خاں کا ماموں۔ حسام الدین گجراتی خسرو خاں سوتیلا بھائی، جاہریا اور دوسرے بھرواڑ مل کر حرم خانہ میں گھس گئے۔ اور علاء الدین کی بیگم یعنی فرید خاں اور عمر خاں کی ماں کو فوراً مار ڈالا۔ اور تمام حرم میں ایک غدر برپا کر دیا۔ پھر واپس آکر دربار سجایا گیا۔ اور بڑے بڑے امراء مثل عین الملک ملتانی، محمد تغلق جونا، ملک وحید الدین قریشی، ملک بہاء الدین دبیر، اور قرابیگ کے دونوں لڑکے۔ طلب کئے گئے، اور بسیر واران ملک رات بھر نظر بند رہے۔ اور خسرو خاں گجراتی معہ اپنی قوم کے تمام رات انتظام مملکت، اور خانہ بربادی سلطان علاء الدین اور سلطان قطب الدین میں مصروف رہا۔ یہانتک کہ ذکور میں سے شیرخوار بچے تک جوان کے ہاتھ لگے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور اس طرح ملک نائب کا فور اور ملک نائب خسرو خاں نے یکے بعد دیگرے ہمیشہ کے لئے سلاطین خلجی کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔[۵]

جب آفتاب طلوع ہوا۔ اور خسرو خاں گجراتی کے حسب خواہش تمام معاملات طے ہو گئے، تو اس نے تخت شاہی پر قدم رکھا۔ اور تاج شاہی سر پر رکھ کر ناصر الدنیا والدین خسرو شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اور اسی نام سے سکے ڈھلوائے اور اسی نام سے مسجدوں میں ممبروں پر اماموں نے خطبے پڑھے اپنی بھائی حسام الدین خان خاناں، اور اپنے ماموں رندھول کو رائے رایان، اور قرہ قمار کے لڑکے کو شائستہ خاں، اور یوسف صوفی کو صوفی خاں، اور بہاء الدین دبیر کو اعظم الملک کا خطاب دیا۔ یہ وہ لوگ تھے۔ جن کے قوت بازو نے اس کو تخت دہلی دلوایا تھا۔ لیکن بعض دوسرے

---

۵ ضیاء برنی صفحہ ۴۰۹۔

امراء دولت کو فقط خوش اور اپنی طرف مائل کرنے کے لئے ہی خطابات اور عہدے دیئے۔ منجملہ اُن کے عین الملک
ملتانی کو عالم خاں کا خطاب دیا۔ اور تاج الملک وحید الدین قریشی کو وزارت، اور ملک فخر الدین جونا (محمد تغلق)
کو آخر بیگ (یعنی امیر اصطبل جو اُس زمانہ میں ایک بڑا عہدہ تھا اور صرف بھروسے کے لوگ اس عہدے پر مقرر کئے
جاتے تھے) کا عہدہ دیا گیا۔ خسرو خاں گجراتی تمام احتیاطی تدابیر سے فارغ ہو کر گجراتی بھرواڑوں کو انعامات دینے
شروع کئے اور علاء الدین کی طرح زرپاشی کر کے لوگوں کو ہم خیال بنانا چاہتا تھا۔ لیکن لوگ اس وقت تین گروہوں
میں منقسم تھے۔

(۱) خسرو خاں کے دلی ہوا خواہ۔

(۲) وہ جو بظاہر ہوا خواہ مگر دل سے بدخواہ تھے۔

(۳) جو بالکل مخالف تھے۔

ملک فخر الدین جونا، اور اُس کا باپ ملک غازی تغلق اسی آخری گروہ میں شامل تھے۔ لیکن ایسے لوگ یا تو دہلی سے
دور تھے۔ یا مثل عین الملک کے مصلحت وقت سے خاموش تھے۔

خسرو خاں کے لوگوں نے قصر شاہی کو بڑی بے باکی سے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ شاہی لوگوں کی تذلیل
ہونے لگی پوجا شاہی محل کے ہر گوشہ میں شروع کر دینے سے عام مسلمانوں میں ایک ہل چل مچ گئی۔ اگرچہ خسرو خاں اس
ہر طرح سے مطمئن ہو گیا تھا اور ڈھائی ماہ گذر جانے پر کسی صوبہ دار نے سرکشی نہیں کی۔ تاہم وہ ملک غازی تغلق سے
ہر وقت مخدوش رہا۔ اور اسی لئے اُس کے لڑکے کی بڑی خاطر داری کرتا تھا۔ لیکن فخر الدین جونا دہلی میں اور اس کا
باپ ملک غازی تغلق دیبالپور میں ہمیشہ پیچ و تاب کھاتے رہے۔ چنانچہ ملک غازی تغلق نے موقعہ دیکھ کر اُچھ،
ملتان کے حاکم کو لکھا کہ ہمارا ساتھ دو۔ اور دہلی پہنچ کر خلجی خاندان کو جو ہمارا اور تمہارا سرپرست ہے۔ خسرو خاں کے
پنجہ سے نجات دلاؤ۔ حاکم ملتان مغلطی[1] کشلو خاں نے جواب لکھا کہ میں ملتان کا اور تو دیبالپور کا حاکم ہے۔ ہم دونوں
کو شاہ دہلی سے مقابلہ کرنا خوب نہیں۔ ملک غازی نے "بہرام ایبہ" کو جو ملتان کے امرا میں سے اُچھ کا حاکم تھا لکھا کہ
حاکم ملتان کو درمیان سے دفع کر دو۔ اور لشکر لیکر مجھ سے مل جاؤ چنانچہ وہ حاکم ملتان کو قتل کر کے ملک غازی

[1] فرشتہ ج اول میں امراء ملتان لکھا ہے۔ باقی بدایونی ضیاء برنی اور گجرات کی عربی تاریخ
ظفر الوالہ میں حاکم اُچھ لکھا ہے۔

مل گیا۔ ملک بیگ لکھی حاکم سمانہ کو بھی اسی قسم کا خط لکھا تھا۔ مگر اُس نے اس خطوط کو خسرو خاں کے پاس بھیجدیا۔ اور لشکر لے کر ملک غازی پر حملہ آور ہوا۔ ملک غازی نے اُس کو شکست دی۔ ادہر یہ کارروائی ہو رہی تھی۔ ادر دہلی میں اس کا لڑکا ملک فخر الدین جونا دن رات اسی فکر میں رہتا کہ کس طرح دہلی سے بھاگ جاؤں۔ غرض پوشیدہ باپ کو ایک خط لکھا۔ جس میں اپنے مطلب کا اظہار کیا۔ باپ نے بھی اسی مطابق گھوڑوں کی ڈاک چوکی مقرر کردی۔ اور دو سوار بھیجکر قلعہ سرستی پر قابض ہو گیا۔ ملک فخر الدین جونا ایک رات موقعہ دیکھ کر گھوڑے کو اُس نے سرپٹ دوڑایا۔ اور سرستی پہنچ گیا[۵۱]۔ اور پھر وہاں سے دیبال پور آیا صبح کو جب خسرو خاں بستر راحت سے اُٹھا تو اُسکو ملک جونا کے فرار ہونے کی خبر ہوئی۔ اس سے وہ بہت خوف زدہ ہوا۔ اس لئے فوراً شائستہ خاں کو تعاقب میں روانہ کیا۔ مگر جب سرستی پہنچا تو معلوم ہوا۔ کہ وقت نکل گیا۔ اس لئے وہاں سے واپس آکر اپنی نامرادی کا اظہار کیا ادہر ملک غازی بھی ایک جرار فوج لے کر دہلی روانہ ہوا۔

ادہر خسرو خاں نے بھی بیس ہزار بھرواڑوں کی فوج خان خاناں حسام الدین کو دی اور صوفی خاں وغیرہ بھی شامل ہوئے۔ جب یہ گجراتی فوج ملک غازی کی فوج سے ٹکرائی تو پاش پاش ہو کر منتشر ہو گئی۔ خسرو خاں یہ سُنکر بہت گھبرایا۔ لیکن ہمت کر کے اُس نے فوج کی کمان خود لی۔ اور ایک جدید فوج کے ساتھ دہلی سے باہر نکلا[۵۳]۔ مگر کچھ زیادہ دور نہیں گیا۔ بلکہ حوض خاص کے پاس ٹھہر گیا۔ کیونکہ ملک غازی دہاوا مارتا ہوا بے درنگ آرہا تھا۔ اس لئے خسرو خاں نے دہلی کو خالی چھوڑنا پسند نہ کیا۔ اس وقت خزانہ کا دروازہ کھول دیا اور ہر سپاہی کو دو دو تین تین سال کی تنخواہ حوالہ کی۔ فقرا اور درویشوں کو عطیئے دیے گئے۔ گجراتی بھرواڑوں کو خزانہ کے جواہرات سے مالامال کر دیا گیا۔ اور ملک غازی کے لئے خزانہ میں ایک پائی نہ چھوڑی۔ اس نے سوچا کہ علاء الدین

---

۵۱ برایونی ج اول صفحہ ۲۱۸)

۵۲ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ خسرو خاں نے ملک فخر الدین جونا کو داروغہ اصطبل بنایا۔ مگر وہ دن رات بھاگ کر باپ کے پاس چلے جانے کے فکر میں رہتا تھا۔ ایک دن خسرو خاں نے کہا کہ اصطبل کے گھوڑے بہت فربہ ہو کر بدن گراتے جاتے ہیں اس لئے ملک جونا کو حکم دیا کہ روزانہ ان کو دوڑایا کرو۔ چنانچہ ایک گھنٹہ دو گھنٹہ روزانہ دہلی سے باہر جایا کرتا ایک دن موقعہ پاکر چلدیا اور دوپہر تک واپس نہ آیا تو خسرو خاں کو بھاگ جانے کی خبر کی گئی۔

۵۳ کل فوج چالیس ہزار تھی (فرشتہ جلد اول۔

کی طرح زرپاشی سے کام نکالوں۔ تو جلد کامیاب ہو جاؤنگا۔

غرض دونوں فوجیں مقابل ہوئیں۔ عین الملک ملتانی تو جنگ سے پہلے ہی مالوہ روانہ ہوگیا جس سے خسرو خاں کو پریشانی تو ضرور ہوئی لیکن اس کی ہمت و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو دونوں نے داد مردانگی دی۔ اول تغلق کی فوج نے شکست کھائی۔ لیکن تغلق کے تین سو سواروں کا دستہ اچانک فوج خسروی پر آپڑا جس سے فوج کو ایسا مرعوب کر دیا کہ خسرو خاں کی فوج تاب مقاومت نہ لاکر بھاگ نکلی۔ ملک تلبغہ ناگوری جو خسرو خاں کا بڑا طرفدار تھا۔ مارا گیا۔ اور یسر قرہ قیمار شائستہ خاں نے راہ فرار اختیار کی۔ خسرو خاں گجراتی نے اپنی ذات سے بڑی بہادری دکھلائی۔ اور بے انتہا جد و جہد کی۔ لیکن کارگر نہ ہوئی۔ غرض جمعہ کا دن تھا۔ عصر کے وقت تک جنگ برابر جاری رہی اور آخر شکست خسرو خاں گجراتی کی ہوئی۔ اور گجراتی بھرواڑ بے شمار مارے گئے۔

دوسرے دن جس نے جہاں بھرواڑوں کو پایا مار ڈالا۔ اور ہزاروں بھرواڑ گجرات بھاگتے ہوئے راستہ میں مارے گئے۔ خود خسرو خاں نے اپنا چتر اور لباس چھوڑ کر سادھوؤں جیسی صورت بنالی۔ اور اپنے قدیم آقا ملک شادی کے باغ میں روپوش ہوگیا۔ دوسرے دن جب گرفتار کرکے لایا گیا۔ تو ملک غازی تغلق سے کھانے اور پانی کی فرمائش کی۔ غازی تغلق نے دسترخوان بچھا کر اچھی طرح کھلایا اور پلایا اور پھر پوچھا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے تو خسرو خاں نے کہا۔ کہ بادشاہ جو بادشاہ کے ساتھ سلوک کرتا ہے چنانچہ ملک غازی تغلق کے حکم سے اسی جگہ جہاں قطب الدین قتل کیا گیا خسرو خاں کو بھی قتل کیا[۵۱] اور چونکہ خاندان خلجی میں سے کوئی مرد بالغ باقی نہ تھا اس لئے امراء دولت کے مشورہ سے ملک غازی غیاث الدین کے لقب سے تخت دہلی پر رونق افروز ہوا۔

یہ واقعہ ۷۲۰ھ کا ہے۔ اور خسرو خاں کی چار ماہ چند دن سلطنت رہی۔[۵۲]

خسرو خاں گجراتی کی وفات

خسرو خاں کی وفات کے متعلق عام مورخوں نے جو سن لکھا ہے وہ ۷۲۱ھ ہے۔ سوائے سیر المتاخرین کے کہ ۷۲۵ھ لکھتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں دونوں نے غلط تاریخ لکھی ہے۔ کیونکہ عام مورخین علاء الدین کی

---

۵۱ بدایونی (ج اول)

۵۲ خلاصہ از ضیا برنی و ظفر الوالہ

وفات ۷ر شوال ۷۱۶ھ پر متفق ہیں (مطابق ۱۹ر دسمبر ۱۳۱۶ء) اور اس کے بعد ۳۶ روز (تقریباً) ملک کافور حکمراں رہا۔ اور بعدہٗ قطب الدین اس کی جگہ آیا۔ اور یہ ماہ ذیقعدہ ۷۱۶ھ کا تھا۔ جب قطب الدین نے شہاب الدین کو معزول کرکے خود تخت حاصل کیا اور باقاعدہ تخت نشین ہوا تو بحر ظفر الوالہ کے عام مورخین کے نزدیک ۸ر محرم ۷۱۷ھ کی تاریخ تھی (مطابق ۲۲ر مارچ ۱۳۱۷ء) پھر سلطان قطب الدین کی موت ۵ر ربیع الاول ۷۲۱ھ ہجری (مطابق ۲۴ر مارچ ۱۳۲۱ء) لکھتے ہیں۔ سلطان کی موت اور خسرو خاں کی تخت نشینی گویا ایک ہی روز ہوئی اور اسی طرح خسرو خاں کی موت اور ملک تغلق کی تخت نشینی بھی گویا ایک ہی تاریخ واقع ہوئی۔ غازی تغلق بقول عام مورخین یکم شعبان ۷۲۱ھ کو تخت خلجی پر رونق افروز ہوا[۵۱]۔ اور خسرو خاں نے صرف چار ماہ سلطنت کی۔ پس اگر قطب الدین کی موت ۵ر ربیع الاول صحیح ہے۔ تو خسرو خاں کی موت اس حساب سے ۵ر رجب ۷۲۱ھ ہونی چاہئے حالانکہ بقول عام مورخین یکم شعبان ۷۲۱ھ ملک تغلق کی تخت نشینی ہوئی ہے۔ اور اس سے دو ایک روز بعد اسکی موت ہکو یقینی مسلم ہے۔ اور اگر یکم شعبان ۷۲۱ھ خسرو خاں کی وفات تسلیم کریں تو اس صورت میں کئی باتیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو واقعہ کے خلاف ہیں۔

(۱) یہ کہ اس صورت میں قطب الدین کی وفات بجائے ماہ ربیع الاول کے ماہ ربیع الثانی ہو جاتی ہے اور یہ عام مورخوں کے بیان کے خلاف ہے اور کوئی معتبر تاریخ اس کی موید نہیں۔

(۲) یہ کہ بداونی اور ضیا برنی دونوں معتبر تاریخوں نے ۷۲۰ھ لکھا ہے۔ خصوصاً ضیا برنی کے قریب العہد ہونے سے اس کا بیان زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔ بالخصوص جبکہ دوسری شہادتیں بھی اس کی موید ہوں۔

(۳) خسرو خاں نے تخت نشین ہوتے ہی حکم دیا کہ "ناصر الدنیا والدین خسرو خاں" کے نام سے سکے اور خطبے جاری کئے جائیں۔ پس اس وقت تک جو سکے دستیاب ہوئے ہیں اُن میں سے ایک بھی ۷۲۱ھ کا نہیں ہے۔ بلکہ سب ۷۲۰ھ کے ہیں۔ اور ایسا خیال نہ کرنا چاہئے کہ خسرو خاں ۷۲۰ھ اور ۷۲۱ھ دونوں میں رہا ہو کیونکہ خسرو خاں کے چار مہینے ۷۲۱ھ کے کسی صورت سے بھی ۷۲۰ھ میں نہیں آتے۔ اسلئے قطعاً یہ ماننا پڑے گا کہ خسرو خاں کا سنہ وفات ۷۲۰ھ ہی ہے۔

---

[۵۱] فرشتہ جلد اول بیان خسرو خاں مطبوعہ نول کشور ۱۲۰

میرے خیال میں عام مورخوں نے فرشتہ سے تاریخ نقل کی ہے اور غالباً اسی جگہ سے بعد کی کتابوں میں سنہ ۷۲۱ کی غلطی شروع ہوئی۔

خسرو خاں گجراتی کے سکّے

(۱) چاندی کا سکہ سنہ ۷۲۰ھ

السلطان الاعظم	خسرو شاہ السلطان
ناصر الدنیا والدین	الواثق بخیر الرحمٰن
ابو المظفر	ولی امیر المومنین

حاشیہ

ضرب ھذہ الفضۃ فی عشرین و سبع مایۃ

(۲)

السلطان الا	خسرو شاہ
عظم ناصر الدنیا	السلطان ولی امیر المومنین
والدین	

(۳) سنہ ۷۲۰ھ





السلطان الاعظم	خسرو شاہ السلطان
ناصر الدنیا والدین	الواثق بتایید الرحمٰن
ابو المظفر	ولی امیر المومنین

برحاشیہ

ضرب ھذہ السکۃ بحضرۃ دہلی فی سنۃ عشرین سبع مایۃ ۷۲۰

پہلے سکہ میں نام کے ساتھ یہ بھی مرقوم ہے کہ یہ سکہ چاندی کا ہے۔ اور ۷۲۰ھ کا ہے۔ دوسرے میں صرف نام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور تیسرے میں مقام ضرب یعنی دہلی مذکور ہے۔ یہ کل سکتے لنڈن انڈیا آفس میں موجود ہیں۔

خسرو خاں کے شکست کے اسباب

قابل سوال یہ امر ہے کہ باوجود تمام احتیاطی تدابیر کے بھی خسرو خاں کو فتح کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اسکے اسباب کیا ہیں۔ میرے خیال میں مندرجہ ذیل اسباب اس کی شکست کے ہیں۔

(۱) خسرو خاں گجراتی اگرچہ اپنی ذاتی لیاقت اور ہوشیاری سے تخت سلطنت تک پہنچا تھا۔ لیکن ذاتی طور پر اس میں اعلیٰ اخلاق موجود نہ تھے۔ جس کے ذریعہ بڑے بڑے امراء سلطنت اور خاص و عام کو اپنی طرف مائل کرتا۔ سلطان قطب الدین کے عہد ہی میں لوگ اس کے بد اخلاقی کے بکثرت شاکی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنی فوجی طاقت پر بڑا غرور تھا۔ غالباً اسی لئے عہد قطب الدین میں اس نے کسی بڑے جنرل اور ارکین دولت کو ملانے کی کوشش نہ کی۔ اسی باعث امراء سلطنت خسرو خاں سے اسی وقت تک ملے رہے۔ جب تک خسرو خاں فوجی طاقت سے ان کو ملائے رہا۔ اور جیسے ہی کہ خسرو خاں کا دباؤ کم ہوا۔ فوراً لوگ الگ ہوگئے۔

(۲) جو فوجی بھرتی خسرو خاں گجراتی نے کی تھی، وہ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے چالیس ہزار تھی مگر عموماً اس میں رنگروٹ بھرے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی باقاعدہ فوجوں سے لڑنے کی عمر بھر نوبت نہ آئی تھی۔ برخلاف اس کے مقابل کی فوج ایک آزمودہ جنرل ماتحت جنگی تعلیم یافتہ فوج تھی۔ اور اسی لئے گجراتی بھرداڑ زیادہ تر موت کے شکار ہوئے[۵]۔

(۳) خسرو خاں گجراتی کے فوجی لوگ جو زیادہ تر جاہل اور جنگلی تھے۔ ان کی خاطرداری اور تالیف قلوب کے خیال سے خسرو خاں نے جو مذہبی آزادی اور قومی رواداری برتی۔ اسمیں افراط تفریط سے بہت کام لیا گیا۔ مسجدوں

---

[۵] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ میں نے ملتان میں تغلق کی بنائی ہوئی مسجد میں یہ کتبہ لکھا ہوا دیکھا ہے کہ اس نے اڑتیس دفعہ تاتاریوں سے لڑکر ان کو شکست دی اور اس لئے اس کو لوگ ملک غازی کہتے ہیں۔ پھر ایسی تجربہ کار فوج کے مقابل گجراتی رنگروٹ کیا تاب مقاومت لاسکتے تھے۔ (جلد دوم باب ۱۲ فصل ۱۲)

میں مورتی پوجا ہونا اور قرآن کی توہین کرنا۔ یہ ایسی باتیں تھیں جن کو مسلمان کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسلئے دین دار مسلمان خسرو خاں سے نفرت کرنے لگے۔ اور عام پبلک کی نفرت یہ بھی اس کے ضعف کا سبب ہوا۔[۱۵]

(۴) دکن کی کل دولت جو علاء الدین خلجی کے زمانہ سے خزانہ میں جمع تھی۔ خسرو خاں گجراتی نے اس کو ایسے بیہودہ طریقے سے صرف کر ڈالا۔ جو کسی طرح بہ کار آمد ثابت نہ ہوا۔ بلکہ اس سے سخت نقصان پہنچا۔ کیونکہ خزانہ خالی ہونے کے سبب خسرو خاں پھر دوسری فوج بھرتی نہ کر سکا۔ اور یہ ایسی غلطی ہوئی کہ جس نے خسرو خاں کا کام بنا بنایا بگاڑ دیا۔

(۵) اس کے علاوہ خسرو خاں نے اپنی فوجی طاقت پر اسقدر بھروسہ کیا کہ انجام کار کے سوچنے کا خیال ہی دل میں نہ لایا۔ تھوڑی سی عقل و فراست سے کام لیتا تو ممکن ہے کہ کامیاب ہو جاتا۔ اس نے ذرا بھی خیال نہ کیا کہ ممکن ہے کہ شکست ہو اور ایسے وقت کے لئے کوئی محفوظ جگہ تیار رکھنا چاہئے۔ وہ اگر چاہتا تو گجرات اور دکن کے علاقہ میں کوئی ایسی جگہ محفوظ کر اسکتا تھا۔ جہاں بیٹھ کر عرصہ تک تغلق کی مدافعت میں مشغول رہتا۔ کیونکہ اس زمانہ میں ہر جگہ بدعملی کا دور تھا۔ پنجاب اور سندھ چھوڑ کر باقی ہر صوبہ میں وہ خود مختارانہ کامیاب ہو سکتا تھا۔

(۶) جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ امرا دولت اس سے ناراض تھے۔ صرف چند مسلمان امیر شریک کار تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے۔ جنکو قطب الدین کے ہاتھوں تکلیف پہنچی تھی۔ وہ صرف اسلئے خسرو خاں کے شریک ہو گئے تھے کہ قطب الدین کا دشمن تھا۔ اور دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ اور اسکے ساتھ شرکت سے فوری منافع کی بھی امید تھی اور اسی لئے میدان جنگ میں نظر آتا ہے کہ باوجود خسرو خاں کے ساتھی اور دوست ہونے کے شکست کے وقت کترا کر نکل گئے۔

(۷) یہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ خسرو خاں کی کامیابی کے باوجود کسی ہندو راجپوت نے اس کو مدد نہ دی۔ حالانکہ اطراف میں ابھی کئی ہندو ریاستیں موجود تھیں۔ اور یہ غالباً صرف اس سبب سے ہوا کہ خسرو خاں بہت نیچ اور ادنیٰ قوم کا آدمی تھا۔ جس کی سرداری راجپوت کسی طرح قبول نہیں کر سکتے تھے۔

---

[۱۵] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ خسرو خاں نے حکم دیا کہ کوئی گائے تمام ملک میں ذبح نہ کرے۔ ہندو گائے کا مارنا جائز نہیں سمجھتے۔ اگر کوئی گائے ذبح کر لیتا ہے تو اس کو یہ سزا دیتے ہیں کہ اس کو اسکی کھال میں سلوا کر جلا دیتے ہیں۔ یہ لوگ گائے کی نہایت تعظیم کرتے ہیں۔ اور ثواب کے لئے بھی اور بطور دوا کے بھی اس کے پیشاب کا استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کے گوبر سے گھر لیپتے ہیں۔ خسرو خاں چاہتا تھا کہ مسلمان بھی ایسا ہی کریں۔ اس لئے لوگ اس سے متنفر ہو گئے۔

(۸) خسرو خاں نے بعد قتل قطب الدین بادشاہی خاندان سے ایسا سلوک کیا جیسا کوئی فاتح میدان جنگ قیدیوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اور اس بُرے برتاؤ سے کسی کو خسرو خاں سے ہمدردی نہ رہی۔ لوگ لوہے اور سونے کے دباؤ سے خاموش تھے۔ ورنہ اس وحشیانہ برتاؤ سے جو دودھ پیتے بچے ر گود میں بچہ والی ماؤں کے ساتھ کیا۔ لوگ سخت متنفر ہوگئے تھے۔ وباللہ التوفیق۔ وفوق کل ذی علم علیم۔

نوائے تازہ

اللہ یہ کیا ہے نگہ یاس اثر میں / پیوست ہوئی جاتی ہے میرے ہی جگر میں
اب خون کے آنسو بھی نہیں دیدۂ تر میں / ایسی بھی کوئی آگ لگائے نہ جگر میں
ہے حاصل صد عمر خضر میری نظر میں / پایا ہے غم عشق جو دنیا کے سفر میں
اے اہل چمن جس نے کیا ہے مجھے مدہوش / وہ ہوش ربا جلوہ کہاں برگ گل تر میں
آسائش دارین بھی قیمت نہیں جس کی / وہ چیز ہو تم اہل تمنا کی نظر میں
اللہ رے دزدیدہ نظر، اف رے تبسم! / اک حشر بپا ہے دل ہر اہل نظر میں
اور اتنی گذارش ہے نوازا ہے جو تو نے / کھٹکوں نہ نگاہ فلک شعبدہ گر میں
ہے حوصلہ افزائی مشق ستم ناز / کیا رکھا ہے ورنہ مرے دل اور جگر میں
ناکامی پیہم سے بڑھا حوصلۂ شوق / جو دل کی تمنا تھی وہ سودا ہوئی سر میں
ہے نعمت دارین جو ساقی تجھے مل جائے / وہ مے جو ہے تیری نگہ کیف اثر میں
اب اس سے سوا اور ہو ارتبۂ الفت / دیوانہ ہوں میں اس ستم آرا کی نظر میں
ہے چارہ گرو! عشرت فردا کی نشانی / رہنے بھی دو باقی ہے جو ناسور جگر میں
دخاطر بیمار شب غم کی تمنا! / آ جلد، نہ چھپ گوشۂ دامان سحر میں
ہیں غالب و محوی کی طرح اور بھی برباد
سچ ہے کہ نہیں فائدہ کچھ عرض ہنر میں

محوی (لکھنوی)

علم ظاہری کی حقیقت

(از جناب مولوی منشی منصب علی صاحب بی۔ اے سابق ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر حلقہ جنوبی احاطہ بمبئی)

ذیل کا مضمون تصوفانہ رنگ میں ہونے کی وجہ سے ممکن ہے وہ حضرات جنہیں اس کا مذاق نہیں ہے اس کی تہ تک نہ پہنچ سکیں کیونکہ واضح ہونے پر بھی کئی مقامات اب بھی محتاج وضاحت ہیں لیکن اس سے زیادہ واضح ہونے سے ایسے مضامین کا اصل لطف فنا ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ مضمون غائر نظر سے پڑھے جانے کا مستحق ہے۔

اڈیٹر

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

آج ہم اس صحبت میں اس بات کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ آیا ہمارے علوم قابل اعتبار بھی ہیں؟ اور اگر اعتبار کے لائق ہیں تو کہاں تک؟

علوم کی بڑی تقسیمیں دو ہیں یعنی علوم ظاہر اور علوم باطن، علوم باطن تو اس لئے قابل اعتماد ہیں کہ ہمارے ایمان ان کے لئے گارنٹی ہیں۔ علوم ظاہر میں علوم مشرقی اور مغربی شامل ہیں۔ اہالیان مغرب کو اپنے علوم پر علی الخصوص بڑا ناز ہے۔ اور اہل ظاہر کے نزدیک حق ان کی تائید میں ہے کیونکہ ان کی ایجادات اور اختراعات ان کے حق بجانب ہونے پر دال ہیں مگر عقل معاش، عقل معاد کے سامنے بے حقیقت محض ہے نیز علوم ظاہر کے اہم مسائل ابھی تک لاینحل ہیں۔ کہاں ایرد پلین پر چڑھ کر خطرے میں پڑنا اور کہاں ؎

ان العاشقین بها عیونٌ	ترا ما لا یرو ها الناظرین
عاشقوں کی ایسی آنکھیں ہوتی ہیں	جبکو وہ دیکھتے ہیں اسے دیکھنے والے نہیں دیکھتے
جنحة تطیر بغیر ریش	الی الملکوت رب العالمین

اور بازو ہوتے ہیں جن سے بغیر پر کے اڑتے ہیں رب العالمین کے ملکوت کی طرف

ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا ؎

بُت کریں آرزو خدائی کی — شان ہے تیری کبریائی کی

آؤ اب اپنی تحقیقات کے میدان میں قدم رکھیں۔

"خواب خرگوش"

قبل اس کے کہ ہم اس میدان میں باقاعدہ گام زن ہوں اس بات کا پتہ لگانا ضروری ہے کہ ہمارے خواب کیا چیز ہیں۔ آنکھ ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی۔ کان بھی ظاہری و باطنی ہیں علیٰ ہذا القیاس دیگر حواس، لیکن ع پنبہ این گوش سر گوش سر است، کے مطابق ہم حواس ظاہری ہی سے کام لیتے رہے لہذا بیکار پڑے رہنے کی وجہ سے حواس باطنی درست نہ رہے حالانکہ حواس باطن بڑے کام کی چیز تھے۔ انسان کا کام لینا مگر اس نے ان سے کچھ کام نہ لیا اور ان کو بگڑنے دیا۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ خداوند تعالےٰ باوجود چشم و گوش ظاہری سے منزہ ہونے کے دیکھتا اور سنتا ہے لیکن کن آنکھوں سے دیکھتا ہے اور کن کانوں سے سنتا ہے اس کا معلوم کرنا نہ مشکل ہے نہ چنداں سود مند صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ جن آنکھوں اور کانوں سے انسان خواب میں دیکھتا ہے سنتا ہے جب وہ تصور میں نہیں آسکتے تو چشم و گوش خداوندی کا وہم وگمان سے بالاتر ہونا بالکل قرین قیاس ہے۔ اس سے زیادہ کرید و کاوش کرنا عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرنا ہے۔ اسی طرح خواجہ خضرؑ کی آنکھ کی جہاں رسائی ہے اور موسیٰؑ کی آنکھ اسے دیکھنے سے قاصر ہے خواجہ خضر سکندر کو ظلمات سے عبور کراتے ہیں، خضر دیکھتے ہیں لیکن سکندر اندھا ہے ؎

سیاہی گر بدانی نورِ ذات است
بہ تاریکی دروں آبِ حیات است

انسان جب سوتا ہے تو اس کے حواس ظاہری اپنی اپنی ڈیوٹی بجا لانے سے قاصر ہو جاتے ہیں مگر حواس باطنی دن رات سوتے جاگتے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ روح جو حواس ظاہری اور باطنی سے کام لینے والی ہے ہمیشہ جاگتی اور ان سے حسب لیاقت کام لیتی رہتی ہے لیکن خواب کے وقت محض حواس باطنہ کار آمد ہوتے ہیں اسی لئے توپ کی آواز سوتے وقت سونے والے کو بمشکل سنائی دیتی ہے کیونکہ وہ سوتے وقت عالم ارواح کی سیر میں مشغول ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ سیر اکثر بے معنی ہوتی ہے اسلئے کہ حواس باطنہ بیکار چھوڑے گئے ہیں تاہم کبھی کبھی خواب سچے نکل آتے ہیں کیونکہ روح اپنی اس قوت سے جو خداوند تعالےٰ نے اس میں ودیعت فرمائی ہے بعض اوقات سب بندھن توڑ پھوڑ کر ان سے کام لیتی ہے۔ ارواح لطیفہ کے نزدیک اسی لئے اکثر

صادقہ اور ارواح خبیثہ کے خواب جھوٹے نکلتے ہیں۔ حالت خواب میں روح خبیثہ دن بھر کے بکھیڑوں کا اعادہ کرتی ہے۔ اور روح لطیفہ وہی دیکھتی ہے جو عالم ارواح میں وقوع میں آرہا ہے۔ بہرحال حواس ظاہری کبھی سوتے ہیں کبھی جاگتے ہیں مگر روح ہر گھڑی ہر پل بیدار رہتی ہے۔ یہ صرف خواب و بیداری میں بلکہ حیات و ممات میں اس کی بیداری میں فرق نہیں آتا، روح حواس ظاہری سے جب کام لینا بند کردیتی ہے اس حالت کا نام خواب ہے اور جب حواس ظاہری اور باطنی دونوں سے کام لیتی ہے اس کا نام بیداری ہے حالانکہ بیداری نہ حالت خواب میں ہے اور نہ اس بیداری میں جس کو عوام بیداری کہتے ہیں کیونکہ جیسا کہ عبارت ذیل سے واضح ہوگا یہ بھی خواب ہے۔ بلکہ یہ خواب خرگوش جیسے ہم کوتاہ فہمی سے بیداری سمجھے بیٹھے ہیں خواب در خواب یعنی ڈبل خواب ہے۔

یقین کے تین درجے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، اور حق الیقین جو کچھ ہم خواب میں دیکھتے ہیں اس میں یقین کی تینوں قسمیں موجود ہوتی ہیں، شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہوتی مگر جس ڈبل خواب کو ہم بیداری سمجھے بیٹھے ہیں وہ اس دوسرے خواب کی تکذیب کرتا ہے اور تینوں اقسام یقین کو ملیامیٹ کرکے رکھدیتا ہے یہ حقیقت ہمارے یقینوں کی ہے، اور علم کی بنا یقین پر ہے لہٰذا اصطلاح عوام میں جس کو بیداری کہتے ہیں وہ در اصل یقین کی جڑ کاٹنا ہے ممکن ہے جیسا کہ یہ بیداری خواب کو جھوٹا ثابت کرتی ہے کوئی اور بیداری نکل آئے جو ہماری اس بیداری کو بھی خواب بنادے مگر متکلمین کے نزدیک اس دلیل سے دور تسلسل لازم آتا ہے مگر ہمارے نزدیک دور تسلسل اس لئے نہیں لازم آتا کہ مخبر صادق نے اصل بیداری کے علاوہ کسی اور بیداری کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ آیۂ فکشفنا عنك غطاءك فبصرك الیوم حدید (اب کھولدی ہم نے تیری اندھیری اب تیری نگاہ آج تیز ہے) سے ظاہر ہے نیز ہمیں النوم اخت الموت (نیند موت کی بہن ہے) کا سبق دیا گیا ہے یعنی موت کے بعد جو کچھ ظہور میں آنے والا ہے وہ بطور تنبیہ خواب میں دکھلایا جاتا ہے تاکہ انسان اپنی موت کی حقیقت پر غور کرے اور والاخرۃ خیر و ابقیٰ کے معنی سمجھ کر محض طلب معاش کے تفکرات ہی میں غلطاں و پیچاں نہ رہے اور طلب معاد کو پس پشت نہ ڈالے، ہر متنفس پر وہ وقت آنے والا ہے کہ جب اخیر میں الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر (غفلت میں رکھا تم کو بہتایت کی حرص نے یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھیں) کا خیال خدانخواستہ اسلئے موجب ندامت ہو اور کچھ بن نہ پڑے کیونکہ اس وقت کی ندامت کچھ کام نہ آئیگی ع — پھر پچتائے کیا ہوئے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، اور

بمصداق ؎

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

النوم اخت الموت سے پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا کے پیچھے ایک دوسری دنیا ہے جو اہل دل کے وہ مقام ہے جس کا یہ دنیا عکس ہے اسی لئے اس کو عالم مثال کہتے ہیں۔ یہی مقام وہ مقام ہے جہاں کو دوبارہ بیداری نصیب ہوگی اور موجودہ بیداری کو خواب سمجھے گا۔

ایک اعتراض البتہ ممکن ہے وہ یہ کہ حالت خواب کو حالت خواب میں ہم بیداری جانتے ہیں اور ا میں جو کچھ پیش آتا ہے اس کو ہم یقیناً بلا شک و شبہ صحیح و برحق تصور کرتے ہیں۔ بیدار ہوتے ہی وہ بہ خواب بن جاتا ہے۔ خواب کی بیداری میں کسی اور بیداری کا خیال و احساس بالکلیہ نہیں ہوتا مگر اسی میں خواب و بیداری دونوں کا علم ہو جاتا ہے جس کا خواب میں پتہ اور نشان نہ تھا اس لئے ممکن ہے اصل بیداری ہو اور کسی تیسری بیداری کا وجود نہ ہو پس واضح ہو کہ تعرف اشیاء باضدادھا (ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے) پہلی بیداری جسے ہم خواب کہتے ہیں یہی بیداری یا نزا خواب تھ بیداری نے اس یا خواب میں بین فرق پیدا کر دیا یا یوں کہو بیداریوں اور خوابوں میں اگر امتیاز نہ ہو کو اصل بیداری کی تلاش نہ ہوتی اور نہ کوئی اور چیز اصل بیداری کی طرف رہنما ہوتی لہذا یہ اختیا نہ ہوتا اور انسان ترقی و تنزل کا دروازہ مسدود ہو جاتا۔

آمدم برسر مطلب۔ حالت خواب میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے افسوس کہ اس سے کوئی علم ا پیدا نہیں کیا۔ اہل مغرب خواب کی تحقیقات میں سرگرداں ہیں مگر اب تک محض قیاسات سے کام لیا ہے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوا، باقی جتنے علوم و فنون ہیں وہ اس حالت بیداری کے نتائج ہیں، ا خدا نہ کرے ہماری بیداری خواب ثابت ہو گئی تو ہمارے علوم بھی دریا برد ہوئے۔ بہرحال یہ ع جن پر انسان کو غرہ ہے اگر بالکل از کار رفتہ نہیں تو مشکوک ضرور ہیں ؎

خفتہ آں باشد کہ او از ہر خیال
دارد امید و کند با او مقال

علوم از کار رفتہ اسلئے ہیں کہ فتنہ اور فساد کم ہونے کی بجائے زیادہ بڑھتا نظر آتا ہے اد

رب العزت میں انسان خلقت کے بارے میں ملائکہ کا فتویٰ قالوا اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک
الدماء الخ۔ (انھوں نے کہا کیا تو اس کو (دنیا میں) پیدا کرتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے)
لفظاً لفظاً پورا اتر رہا ہے جیسا کہ موجودہ زمانہ کے لڑائی جھگڑے شاہد ہیں فرق اتنا ہے کہ پہلے جہالت
سے کام لیا جاتا تھا اب علوم سے ع

ایں جہاں را بر خیالے داں رواں

نیز علوم ظاہری مبنی ہیں حواس ظاہری پر اور حواس ظاہری نکمے اور نہتے ہیں بلا اس قوتِ فیصلہ کے
جو رب العزت نے انسان کی ذات میں رکھی ہے مثلاً ریل گاڑی کے سفر میں ہم درختوں کو بھاگتے دیکھتے ہیں
مگر قوت فیصلہ بتلاتی ہے یہ سب غلط ہے درخت نہیں مگر گاڑی میں ہم بھاگے جاتے ہیں۔ سورج مشرق
سے مغرب کو جاتا نظر آتا ہے اس قاعدہ سے سورج نہیں بلکہ زمین مغرب سے مشرق کو جا رہی ہے
علیٰ ہذا القیاس دوسرے حواس بھی کبھی صواب پر ہیں اور کبھی خطا پر، مگر ہماری قوتِ فیصلہ ان کی غلطیوں کی
اصلاح کرتی ہے اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری قوت فیصلہ خود غلطی کرے۔ المجتھد یخطی ویصیب
(مجتہد خطا بھی کرتا ہے اور صواب بھی) اب مشکل یہ ہے کہ حواس ظاہری قوتِ فیصلہ کے محتاج ہیں اور قوت
فیصلہ حواس ظاہری کی۔ مثلاً پاگل دیکھتا ہے مگر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اندھا اور بہرا دیکھتے سنتے نہیں لہذا ایک گڑھے
میں گر جاتا ہے، دوسرا دم بخود رہتا ہے اور بہرہ کی حالت بقول شخصے یہ ہے کہ ع

ناصح کی بات سننے کو یاں کان ہی نہیں،

لہذا اعتماد کے قابل نہ حواس ہیں اور نہ قوت فیصلہ۔ علوم المشارق والمغارب حواس و فیصلہ کے
قوی کی باہمی کشمکش سے پیدا ہوئے ہیں لہٰذا ان علوم کی وقعت کتنی ہے اس کا فیصلہ ہر متنفس خود کر سکتا:

پائے استدلالیاں چوبیں بود،
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود،

رُباعی امجد

کوشش ہے تمام اپنی ستایش کے لئے — کیا کیا کرتے ہیں، ایک خواہش کے لئے
ہر ایک نمود پر مٹا جاتا ہے — پُتلے مٹی کے ہیں، نمایش کے لئے

امجد

پانی، برف، اولے

(جناب محمد اسمٰعیل صاحب ہاتف بھوپالی)

ہوا میں ہمیشہ ایک مقدار پانی کے ذرات کی موجود رہتی ہے اور ہوا جوں جوں گرم ہوتی جاتی ہے ووں ووں پانی کے ذرات بھاپ کی شکل میں ہوا میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ سورج کی گرمی زمین کی تری کو فضا میں جذب کرتی ہے۔ اگر ایک خشک، صاف اور خالی بوتل کے منہ کو دوسرے بوتل کے منہ سے لگائیں جس میں کھولتا ہوا پانی بھرا ہوا ہو اور آدھ منٹ کے منٹ الگ کرکے خالی بوتل میں مضبوط کاگ لگا دیں تو یہ پانی کے ذرات (بھاپ) سے بھر جائے گی اور جب تک بوتل گرم رہے گی یہ بھاپ پانی کی شکل میں تبدیل نہ ہوگی۔ لیکن نقطہ منطقۂ اطراف شیشہ، اور بھاپ کی مقدار تمام جہات میں یکساں نہیں ہوتی۔ پس معلوم ہوگیا کہ دنیا میں جتنا پانی ندیوں، دریاؤں اور سمندروں کی صورت میں نظر آتا ہے وہ سب ہوا میں سے آیا ہے اور بے شک ایک بہت بڑی مقدار پانی بھاپ کی ہوا میں ملی ہوئی ہے۔

اب ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیونکر اور کس طرح یہ بھاپ ہوا میں پراگندہ اور منتشر ہوتی ہے اگر تھوڑا سا عطر یا اور کوئی جوہر ہتیلی پر لیں تو وہ جلد گیس بن کر اڑ جاتا ہے اور ذرا میں ہاتھ خالی ہو جاتا ہے یہی کیفیت بخار آب کی بھی ہے لیکن یہ پھیلی ہوئی اور ساکن حالت میں بھاپ بن کر ہوا میں صعود کرتا ہے اور سورج کی گرمی کی تاثیر سے بخار بالاستمرار جو میں منتشر ہوتا ہے کیونکہ تمام پانی جو نہروں، ندیوں، نالوں، دریاؤں، اور بڑے بڑے سمندروں میں ہے اور جو تین چار حصّہ زمین کو گھیرے ہے حرارت آفتاب سے گرم ہو کر بھاپ بنتا اور فضا میں منتشر ہوتا ہے اور جب ہوا بخار سے بھر جاتی ہے تو اسباب جویہ کے سبب سے سرد ہونے پر حسب درجہ برودت کبھی کہر کی شکل میں نظر آتی ہے جو ہلکا ہونے کی بنا پر ہوا میں معلق رہتا ہے اور سرد تر ہونے کی حالت میں پانی کے دانوں (نقطۂ آب) کی صورت میں زمین پر برستی ہے جسے باراں کہتے ہیں اور جن جگہوں میں پانی بہت ہی برستا ہے وہاں ہوا میں ملی ہوئی بھاپ بہت ہی ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ مصادف ہوتی ہے ان حوادث کے تین سبب ہیں کیا تو بہت ہی ٹھنڈے اور مرتفع طبقات جو

ں بخار اور رطوبت آمیز گرم ہوا کا ارتفاع ہے یا گرم ہوا ٹھنڈی ہواؤں میں باہم داخل ہونا یا گرم ہواؤں کا اونچے
اڑوں کی سطح پر ملنا اور خط استوا اور دریاؤں کے قریب پانی برستا ہے، کیونکہ گرم ہوائیں بہت ہی سرد اور
ذطبقات سے اُٹھتی ہیں اور اس کی یہ وجہ ہے کہ گرم ہوا ٹھنڈی ہوا کے مقابلہ میں بہت ہی ہلکی ہوتی ہے یہی
ہے کہ مغربی یورپ میں پانی زیادہ برستا ہے۔ جو طیارے خلیج میوز کے اوپر سے بخار آمیز ہوا کے اندر سے گذرتے
ں وہ شہادت دیتے ہیں کہ سرد و بلند پہاڑوں اور علی العموم اُن جہات میں بکثرت پانی برستا ہے ۔ جو
رت سرد ہیں۔ اور انھیں جہات میں گرم ہوائیں مرور کرتی ہیں اور بخار ہوا کو مبدل بہ آب کرتی ہیں بخلاف
ں بہت کم بارش ان جہات میں ہوتی ہے جو اونچے اونچے پہاڑوں سے محاط ہیں جیسے ایشیا میں اور
ں صحراؤں میں جو دریاؤں سے دور ہیں اور علی العموم جہات گرم میں جہاں ٹھنڈی ہوائیں مرور کرتی
ں ۔ اور اگر کبھی درجۂ حرارت اسقدر اتر آتا ہے کہ درجۂ تجمد سے کیقدر کمتر رہے تو بخار ہوا نقطہ ہا ر
رن کی شکل میں متشکل ہوتی ہے جو خود بھی بہت ہی چھوٹے چھوٹے نقاط سے باہم متحد ہوتے ہیں اور
ں کے ٹکڑوں کی طرح زمین پر گرتے ہیں جسے برف برسنا کہا جاتا ہے۔ کبھی زیادہ تر یہی برف کے
ے باہم متحد ہو کر بہت برف کی چٹان بنا دیتے ہیں جسے یخ کہا جاتا ہے اور اس میں سے ٹوٹ ٹوٹ
بے کے کنکر یا کنکری کے برابر نظر آتے ہوئے زمین پر گرتے ہیں۔ جس سے کھیتوں اور جانوروں کا
اتلاف ہوتا ہے اور انھیں اولے برسنا کہتے ہیں۔

غزل

(از جناب نبے خاں صاحب سرخوش شادانی رامپوری ہیڈ مولوی گورنمنٹ اسکول مظفرنگر)

یہ ہے حسن کار فرما کہ ادائے دل نوازی — دل غزنوی پہ غالب ہوئی شوکت ایازی
مجھے سر بسجدہ دیکھا، کہا ہنس کے اس صنم نے — ترا سجدہ ہے ریائی تو ہے خود غرض نمازی
میں ہوں منزلوں کا ہارا مرا دل تھکا ہوا ہے — تو سُنا دے اے مغنی مجھے نغمۂ حجازی
وہ ہی خیر و شر کا مالک وہی نیک و بد کا خالق — جسے چاہے دے وہ ذلت جسے چاہے سرفرازی
نئے فلسفہ کی دھن ہے نئے لوگ اور نئی مت — نہ وہ مذہب غزالی نہ وہ قول فخر رازی
بنے بوالہوس تو کیا تو اسیر رنگ و بو ہے — ل مبتلائے سرخوش میں ہے درد پاکبازی

مترجمات

المستنصر عباسی کے زمانہ کی ایک گھڑی

مصر کے نامور رئیس اور اہل قلم امیر احمد تیمور پاشا کے کتبخانہ میں، فن تاریخ کے شعبہ میں نمبر ۱۲۸۳ پر ایک قلمی کتاب ہے۔ یہ تاریخی کتاب جس کے نام اور مصنف کا پتہ نہیں چلتا ۶۲۶ھ سے ۷۰۰ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے ۶۳۳ھ کے واقعات میں اس گھڑی کا تذکرہ کیا ہے جس کو امیر المومنین المستنصر نے مدرسۃ الطب والمستشفی میں (جو مدرسہ مستنصریہ کے ماتحت قائم ہوا تھا) رکھوایا تھا۔ پاشائے موصوف نے اپنی غیر مطبوع تالیف "التصویر عند العرب" میں کتاب مذکور سے اس گھڑی کا احوال نقل کیا ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

"اسی سال (یعنی ۶۳۳ھ) میں اس عمارت کی تکمیل ہوئی جو مدرسہ مستنصریہ کے سامنے واقع ہے اور اس کے نیچے ایک صُفّہ (چبوترہ) بنایا گیا جس پر طبیب اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر آنے والے مریضوں کا علاج کرے۔ اس چبوترہ کی دیوار پر ایک دائرہ کی شکل بنا کر اس میں کرۂ فلکی کا نقشہ اتارا گیا ہے۔ اس میں نازک دروازوں والے دو چھوٹے طاقچے بنائے گئے ہیں، اور اس دائرہ کے اندر دو طلائی کٹوروں میں سونے کے باز رکھے ہوئے ہیں جنکے اندر دو گولیاں اس کیفیت سے رکھی گئی ہیں جو نظر نہیں آسکتیں۔ گھنٹہ گزرنے پر ان بازوں کا منہ کھل جاتا اور وہ گولیاں نکلکر کٹوروں میں گرتی ہیں۔ ہر گولی کے گرنے پر ان طاقچوں کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں، اور ہر دروازہ جو سونے کا ہوتا ہے نقرئی بن جاتا ہے۔ وہ دونوں گولیاں کٹوروں میں گرتے ہی اپنے مقام پر واپس چلی جاتی ہیں۔ اس فلکِ لاجوردی میں بعینہ آفتاب طلوع ہوتا ہے، اور چاند نکلتے ہیں جو آفتاب کی گردش کے ساتھ حرکت کرتے، اور اس کے ساتھ ہی غروب ہو جاتے ہیں۔ جب رات ہو جاتی ہے تو یہ چاند اپنے پیچھے رکھی ہوئی روشنی کے ذریعہ طلوع ہوتے ہیں۔ اور جیسے ہی گھنٹہ ختم ہوتا ہے وہ روشنی بھی چاند کے حلقہ میں ختم ہو جاتی ہے۔ پھر دوسرے حلقۂ قمر میں شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ رات ختم ہو جاتی اور سورج نکل آتا ہے۔

اسی کے ذریعہ نماز کے اوقات معلوم کئے جاتے ہیں"

اس کے بعد مصنف نے اس گھڑی کی تعریف میں اس زمانہ کے شعراء کے مندرجۂ ذیل اشعار نقل کئے ہیں:-

يا ايها المنصور يا مالكاً
برأيه صعب الليالي يهون
شيدت لله ورضوانه
اشرف بنيان يروق العيون

ايوان حسن وضعه مدهش
يحار في منظره الناظرون
تصور فيه فلك دائر
والشمس تجري ما لها من سكون
دائرة من لازورد حوت
نقطة تبر فيه سر مصون
فتلك في الشكل وهذا معاً
كمثل هاء ركبت وسط نون

اے فتحمند! اے حاکم! جسکی رائے وتدبیر سے راتوں کی مشکل آسان ہوگئی ہے، تونے خالصاً لوجہ اللہ، اور اسکی خوشنودی کے واسطے بلند ترین عمارت بنوائی جس کا منظر آنکھوں کو بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔

ایسی ایوان نفیس جس کی صنعت عجیب وغریب ہے جو ناظرین کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔
اس میں فلک دوّار کی تصویر اتاری گئی ہے جسمیں آفتاب بلا سکون گھومتا رہتا ہے۔
لاجورد سے بنا ہوا ایک دائرہ ہے جو طلائی نقطہ پر محیط ہے، اسی میں سب راز پوشیدہ ہے۔
اس کی شکل بعینہٖ ایسی ہے جیسے ھا کو نون کے وسط میں ملا دیا گیا ہو۔

(الزہرا ربیع الثانی ۴۳ھ)

نباتات کی انسائیکلوپیڈیا

ڈاکٹر احمد عیسیٰ بک نے، جو طب اور لغت میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، ایک "معجم نباتات" مرتب کی ہے۔ یہ کتاب ان تمام نباتات پر حاوی ہے جن سے اندلس، مغرب، مصر و سوڈان، فلسطین، شام و عراق، تا زو یمن، اور تمام جزیرۃ العرب میں اہل عرب واقف تھے۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں چار ہزار لاتینی اسماء نباتات درج کئے گئے ہیں جو انواع نباتات پر مشتمل ہیں۔ ان کے بالمقابل انکی مختلف اقسام اور لاطینی مترادفات ہیں، پھر ان کے بائیں طرف فرانسیسی اور انگریزی نام دیئے گئے ہیں، اور بائیں جانب ان کے عربی یا معرب نام

لکھے گئے ہیں۔ مصر کی وزارت المعارف (محکمۂ تعلیم) نے مؤلف کے زیر اہتمام اس کتاب کو اپنی طرف سے شائع کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

جرمنی کے مشہور عالم نباتات پروفیسر شواین فورث (Schweinfurth) نے جو مصر کے مجمع العلمی کے صدر تھے، اسی موضوع پر دو سو صفحات کی ایک کتاب لکھی تھی. لیکن ڈاکٹر عیسیٰ بک نے اس کا استقصا کر کے اس کو اسقدر جامع بنا دیا ہے کہ وہ پروفیسر موصوف کی کتاب سے چوگنی ہو گئی ہے۔

اس کے ضمن میں ڈاکٹر موصوف نے ایک اور علمی کام یہ انجام دیا ہے کہ انہوں نے ان تمام اسمائے نباتات کو عربی لغت کی کتابوں مثل لسان العرب، المخصص، قاموس المحیط، اشجار و نباتات کے متعلق اصمعی اور ابن خالویہ کے رسائل، اور کتاب غریب المصنف وغیرہ سے اخذ کر کے لغات کے طریقہ پر مرتب کر لیا ہے اور اس کا نام "معجم النبات" رکھا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ہر نام کے بالمقابل اس کی تشریح بلا کم وکاست علمائے لغت سے نقل کر دی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اس موضوع پر مراجعت کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ جو متعدد کتابوں کی ورق گردانی سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ (الزہرا)

یورپ کے شاہی درباروں کی اخلاقی حالت

رسالہ "جرنل آف انڈین ہسٹری" بابت اگست سنہ ۲۶ء میں ایک مقالہ بعنوان "ڈاکٹر برنیر شاہجہاں کے دربار میں" سر تھیوڈور ماریسن کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ اس کے ضمن میں مضمون نگار سلاطین یورپ کے درباروں کی اخلاقی حالت کا موازنہ دربار مغلیہ سے کرتے ہوئے رقمطراز ہے:-

"میں امید کرتا ہوں کہ میں عام رائے کے خلاف کسی غلط بات کی مدافعت کرنے کا مجرم نہ خیال کیا جاؤں گا، اگر میں یہ کہوں کہ سترھویں صدی میں "مغل اعظم" کا دربار بہ لحاظ عیش پرستی و شاہد بازی کے نہ صرف ظاہراً مہذب اور شائستہ نظر آتا تھا، بلکہ باطناً بھی وہ فرانس اور انگلینڈ کے درباروں کی بہ نسبت زیادہ با اخلاق تھا۔

"عہد مغلیہ کی تاریخ میں اس مسرت انگیز اشتیاق کا وجود میں نہیں پاتا جو انگلینڈ اور فرانس کے اُمراء میں، اپنی بیٹیوں کی عصمت کو بادشاہ کی ہوسناکیوں پر قربان کر دینے کے لئے پیدا ہوا کرتا تھا۔ عین اس عمر میں جبکہ ہمارے خیال کے مطابق ابھی ان کو اسکول میں زیر تعلیم ہونا چاہیئے، نوجوان لڑکیاں ورسیلز یا وہائٹ ہال بھیجدی جاتی تھیں تاکہ وہ شاہی نوازشات سے "سرفراز" ہو کر متمول بن جائیں۔ بقول، سینٹ سائمن ہر والدین کی دلی تمنا یہی ہوتی تھی کہ ان کی لڑکی سب سے بڑا انعام حاصل کرے اور بادشاہ کی معشوقہ بن جائے۔ اس معاملہ میں انگلینڈ کا اخلاقی معیار کچھ زیادہ بلند نہ تھا،

جب آرابیلا چرچل، جیمس (ڈیوک آف یارک) کی منظور نظر بن گئی تو، بقول لارڈ میکالے، اس کے والدین اس تعجب خیز احساس مسرت میں پڑ گئے کہ ایسی سیدھی سادھی لڑکی کس طرح اس شاہی معیار انتخاب پر پوری اتری! اہل یورپ کی نظروں میں ایک شادی شدہ عورت سے بادشاہ کا تعشق کچھ بھی قابل اعتراض و ملامت نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مارکوئس دی مونٹیپاں کو لوئی چہاردہم (شاہ فرانس) کے ساتھ اپنی بہو کے تعشق کی خبر پہونچی تو اس نے کہا کہ "الحمد للہ اب تمول ہمارے گھر میں داخل ہونے لگا ہے!"

اطلاع

جن خریداران کا ششماہی چندہ اس ماہ کیساتھ ختم ہوتا ہے وہ ازراہ کرم اپنی آیندہ ششماہی یا سالانہ خریداری کا چندہ ذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر مشکور فرمائیں یا ویلو کی اجازت عطا فرمائیں۔ عدم اطلاع کی صورت میں آیندہ نمبر نہ ملنے کی شکایت نہ فرمائیں۔

منیجر

ادبیات

شہید تغافل

(از "بالم")

(۱)

سلیمہ حسین تھی لیکن اپنے حسن و جمال رعنائیوں اور اُس کی پوشیدہ فتنہ سامانیوں سے بے خبر تھی ہر چند دولت حسن سے مالا مال تھی لیکن قسمت کی ہیٹی غریب باپ کی بیٹی اور غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ جوانی و مفلسی کا ساتھ تھا۔ دل میں ہزاروں ولولے اور اُمنگیں پیدا ہوتیں اور پھر فنا ہو جاتی تھیں۔ اُس کا باپ حامد کانپور کے ایک تاجر چرم کے کارخانہ میں پندرہ روپیہ ماہوار کا ملازم تھا۔ لیکن دو ماہ سے علالت کی وجہ سے صاحب فراش تھا۔ گھر میں ایک بیوی، دو چھوٹے چھوٹے بچے اور جوان سلیمہ کل چار پانچ نفر کھانے والے اور کمانے والا صرف ایک حامد۔ ایک تو یونہی عسرت میں بسر ہوتی تھی اس پر حامد کی علالت مستزاد، غریبوں کے گھر میں اثاثہ ہوتا ہی کیا ہے تاہم زیور کی صورت میں جو کچھ سچا جھوٹا تھا اونے پونے داموں تمام بیچ ڈالا سلیمہ کی ماں اصغری بڑی کفایت شعاری سے اس کو صرف کرتی۔ اپنی اور سلیمہ کی ضروریات پر شوہر اور بچوں کی ضروریات کو مقدم سمجھتی تھی۔ کسی کسی دن ماں بیٹی فاقہ سے بھی گذار دیتی تھیں لیکن حامد کے علاج معالجہ میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتی تھی،

سلیمہ اپنی اور والدین کی اس ہلاکت آفرین و برباد کن عسرت و فلاکت دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی، تنہائی میں پہروں رویا کرتی تھی لیکن اس کا تدارک اس کے امکان سے باہر تھا۔ عورت ذات اور کیا کر سکتی تھی تمام تمام دن چکی چلاتی لیکن پھر بھی گردش فلک پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ ماں باپ اپنی جفاکش بیٹی کی پر محنت و مشقت دیکھ دیکھ کر الگ پریشان ہوتے تھے۔

سلیمہ کی تعلیم اگرچہ اعلیٰ معیار کی نہ تھی تاہم خداداد ذہانت اور شوق مطالعہ نے اس میں خاصی قابلیت پیدا کر دی تھی گھر کے کام دھندوں سے ذرا بھی فرصت ملتی کتب بینی یا سینا پرونا اس کا مشغلہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی جس سے وہ محلہ کی دیگر نوجوان لڑکیوں میں ممتاز تھی۔۔

(۲)

جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے کانپور میں الٰہی بخش سوداگر چرم کے تمول کی بڑی دھوم تھی، بڑا رحم دل اور کریم النفس تھا ہزارہا غربا و مساکین اس کی دولت و ثروت سے مستفیض ہوتے تھے دولت و اقبال، آل اولاد اللہ نے سب کچھ دیا تھا۔ بڑا لڑکا رحیم بخش علی گڑھ یونیورسٹی میں بی اے کی تعلیم پاتا تھا، غرض ہر حیثیت سے خوش نصیب تھ۔ حامد اسی کے کارخانہ کا ایک ادنیٰ ملازم تھا۔ چونکہ حامد بہت ملنسار اور محنتی آدمی تھا کارخانے کے تمام ملازمین کے دلوں میں اس کی وقعت تھی اور ہر چھوٹا بڑا اس کو یکساں طور پر چاہتا تھا۔

کارخانے کا ہر دلعزیز منیجر منظور احمد جو نو عمر ہونے کے باوجود نہایت۔ ہوشیار اور تجارتی معاملات میں خاصہ تجربہ رکھتا تھا۔ اپنی دیانت داری اور معاملہ فہمی کا الٰہی بخش کو بارہا ثبوت دے چکا تھا۔ اس لئے کارخانہ کا کل کاروبار اسی پر منحصر اور اسی کے دم سے الٰہی بخش کی تجارت و امارت قائم تھی، خرید و فروخت آمد و خرچ غرض کہ کالے سیاہ و سفید کا یہی مالک تھا ہر دلعزیزی اور نیک چلنی کے باعث الٰہی بخش کے زنانخانہ میں بھی بلا کسی عذر اور روک ٹوک کے آتا جاتا تھا۔ الٰہی بخش اور اس کی بیوی بھی اس کو اپنے حقیقی فرزند کی طرح چاہتے تھے۔

چونکہ منظور کام کے آدمیوں کا بڑا قدردان اور ان کا ہر قسم کا خیال رکھنے والا تھا۔ حامد ایسے محنتی و جفاکش شخص کی دو ماہ کی غیر حاضری نے اسکو اس کی عیادت و اعانت پر مجبور کر دیا اور وہ سیدھا اس کے مکان پر پہنچا۔

حامد کا مکان جو اس کا اپنا آبائی تھا قدیم طرز کا بنا ہوا تھا جسمیں دو چھوٹے چھوٹے کمرے ایک برآمدہ اور سامنے مختصر صحن تھا جس کو بلند دیواریں احاطہ کئے ہوئے تھیں، حامد کی علالت کی وجہ سے کبھی کبھار کوئی مرد عیادت کو آ جاتا تھا ورنہ اکثر محلہ کی عورتیں یا سلیمہ کی سہیلیاں بیٹھنے اور خوش گپیاں کرنے آیا کرتی تھیں، صدر دروازہ کو ہمیشہ اندر سے زنجیر لگی رہتی تھی جس کو کسی کے دستک دینے پر کبھی بچے اور کبھی سلیمہ کھولا کرتی تھیں، آج بھی حسب دستور جبکہ منظور نے دستک دی تو سلیمہ نے زنجیر کھولی لیکن جونہی دروازہ کھول کر پلٹی کیونکہ اس کے روبرو بجائے کسی عورت یا اپنی سہیلی گلنار کے ایک جوان رعنا کو دیکھا

چاہئے تو یہ تھا ایک غیر مرد کو دیکھ کر بھاگ جاتی مگر منظور کے مردانہ حسن نے لمحہ بھر کے لئے اس کو مبہوت بنا دیا آنکھیں چار ہوتے ہی دونوں پر ایک قسم کی سراسیمگی طاری ہو گئی جسم میں برقی رو دوڑ گئی۔ خون میں حدت، جذبات میں ہیجان اور دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ تبادلۂ نگاہ کے ساتھ دلوں میں کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ یہ تو وہی خوب جان سکتے ہیں جن کو ایسی لذت اندوز و لطف آفریں اولین موت نصیب ہوئی ہو، اور اس لطیف ترین آن واحد میں طویل ترین محبت کی داستانِ اضطراب کے مطالعہ کا موقع نصیب ہوا ہو۔ منظور اب جو سنبھلا تو وہ ناظورہ حسن چھلاوہ کی طرح نظروں سے غائب تھی۔

حامد نے اپنے غریب خانہ میں ایسی زبردست شخصیت کو دیکھ کر تعظیماً اُٹھنے کی کوشش کی لیکن منظور نے اس کو ایسا کرنے سے باز رکھتے ہوئے دریافت حال کیا۔ بڑی کوشش کے بعد ایک دوسرے آپس میں سوال و جواب کر سکتے تھے، منظور بے طرح دل کی دھڑکن کے سبب اور حامد نقاہت کے باعث، منظور کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ اگر یہاں مریض کے سوا کوئی اور شخص ہوتا تو وہ اس کے جذبات دلی کی کیفیت چہرے کے اتار چڑھاؤ سے تاڑ جاتا اسی لئے وہ علاج معالجہ کے متعلق کچھ یونہی سے استفسارات کے علاوہ زیادہ اظہار ہمدردی نہ کر سکا، پچاس روپے کے نوٹ بطور اعانت مریض کے حوالے کر کے اور آئندہ آنے کا وعدہ کر کے یہ دل گرفتہ و خستہ جگر ایک داغ جانسوز دل پر لیکر چلا گیا۔

(۳)

سلیمہ اور منظور کے چوٹ کھائے ہوئے دل مضطر و بیقرار ہیں ادھر سلیمہ، منظور کو دوبارہ دیکھنے کی آرزومند ہے تو ادھر منظور بھی اس کے جلوہ جاں سوز کے نظارہ کا طالب ہے، اگر ایک کو کسی کے دل پر قابض ہونے پر ناز ہے تو دوسرا بھی اس معبود حسن و شباب کے پرستار ہونے پر مغرور ہے اگر یہاں دل کی سیمابی کیفیت ہے تو وہاں اضطرابی حالت، اگر یہ ولولہ انگیز شباب کی اُمنگوں سے پریشان ہے تو وہ بھی جوانی کی طوفان خیز تمناؤں سے بیتاب ہے غرض کہ دونوں ایک ہی تیر کے زخمی، ایک ہی آرزو کے متمنی اور ایک ہی جذبہ سے متاثر ہیں۔ جو دل آج سے پہلے محبت کے نام سے واقف نہ تھے آج پر لطف و رنگین درد سے آشنا اور پر لذت خلش سے بہرہ اندوز ہیں۔

(باقی دارد)

لالۂ صحرا

دشت

فضائے دشت میں چھائی ہے ویرانی سی ویرانی
پھر اس پر سوزش گرما ہے وقف شعلہ سامانی

ہر اک جانب غبار ناتواں اٹھتا ہے ذرّوں سے
کہ پیچ و تاب میں اسکے ہے دود آسا پریشانی

رواں ہے موج اندر موج، لو جھلسی ہوئی ایسی
کہ گویا بحر ذاخر میں بپا ہو جوشش طغیانی

فضا میں ایک ہیبت زا ادا سی رقص کرتی ہے
بگولے دوڑتے ہیں صورت غول بیابانی

وہ منظر ہے کہ آنکھوں میں پھریں حسرت کی تصویریں
وہ منظر ہے کہ خواب عیش کی نکلی ہیں تعبیریں

نخلستان

مگر شاداب خطہ بھی ہے اک اس دشت ویراں میں
کہ نزہت کام آئی جسکی تخلیق گلستاں میں

ہوئی ہے سکون غم کی عشرت ذرے ذرے میں
تلاطم ہے نہاں لیکن ہوا کی موج لرزاں میں

یہاں دو پاک روحیں عشق کا دربار کرتی تھیں
کہ نغمے ہیں انہیں کے نالہائے عندلیباں میں

انہیں سے روشنی یہ مل گئی ہے ماہ تاباں کو
انہیں سے آئی ہیں یہ سرخیاں لعل بدخشاں میں

محبت ان کی تھی آئینہ دار نور یزدانی
وہ نکلے عرش پر جا کر جو ڈوبے بحر عصیاں میں

وہیں تربت بنی تھی اک شہید بیقراری کی
کہ پیہم دوسرے نے اس پہ برسوں اشک باری کی

لالۂ صحرا

ہوا آخر کسی کا مرہم زخم جگر پیدا
ہوا اس دشت میں اک غنچۂ رنگیں اثر پیدا

…ں کے تنکے کھل گئے غربت کی وادی میں
نہال عاشقی میں ہو گئے یعنی ثمر پیدا

محبت پھوٹ نکلی کاروان رنگ و بو ہو کر
اچانک ہو گیا ذرّوں میں عشق فتنہ گر پیدا

…ئی شمع کے جلنے سے دل کے تبکدے روشن
فریب آرزو کرنے لگا حسن نظر پیدا

… لالۂ صحرا، فروزاں ہیں وہاں اب تک
بہار عاشقی کی روح خنداں ہے وہاں اب تک

ماہِ تاباں

اے مہِ تاباں! سرور افزا ہے تیری روشنی
اُجلی اُجلی یہ شعاعیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی

ساکنانِ دہر پہ برسا رہا ہے نور تو
ہے سپہرِ کہنہ فلک گویا چراغِ طور تو

تیری ضو سے دامنِ لیلائے شب زرتار ہے
خلعتِ زر سے مزین ہر در و دیوار ہے

انجمِ تابندہ تابش سے تیری گل خوردہ ہیں
دامنِ چرخِ بریں میں غنچۂ پژمردہ ہیں

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے وادیٔ گل پوش میں
کاروانِ نور اُترا منظرِ خاموش میں

پیرہن سیماب کا پہنے ہوئے ہے موجِ آب
نور در آغوش ہے چشمِ نظر باز حباب

جوش سا دل میں ہے حسنِ روئے عالمتاب سے
تیرا جلوہ دیکھتا ہوں دیدۂ سرخاب سے

محوِ نظارہ ہوں۔ وارفتہ ہوں۔ دیوانہ ہوں میں
شمعِ حسنِ ماہ پر بچپن سے پروانہ ہوں میں

درس آموزِ حقیقت ہے ترا اوج و زوال
تیری ظلمت سے ہے روشن میرے دنیا کا خیال

گو مہِ رخشندہ شب افروز تیری ذات ہے
"چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے"

رہروِ صحرائے گردوں! کس کی ہے تجھکو تلاش
شاہدِ خاموش! کر مجھ پر تو اپنا راز فاش

تیرے دل میں کس کا روشن ہے چراغِ آرزو
لگ رہی ہے کس کی لو کس کا ہے داغِ آرزو

رات بھر مشعل لئے پھرتا ہے تو کس کے لئے
ماہِ انور۔ ہے سراپا جستجو کس کے لئے

مہر سے کرتا ہے کس کے دیکھنے کو کسبِ نور
کون وہ ناز آفریں ہے مخزنِ حسن و سرور

آہ سرگرداں عبث تو سعیٔ لاحاصل میں ہے
برقِ جاں افروز پنہاں میری آب و گل میں ہے

وہ ضیا افگن میرے دل کے سیہ خانے میں ہے
بادۂ نورِ ازل مٹی کے پیمانے میں ہے

برق (دہلوی)

فائدہ

چاہے جب ہر شخص اپنا فائدہ
کس طرح پھر ہو کسی کا فائدہ

ہے جزا احسان کی احسان ہی
کیجئے احسان ہو گا فائدہ

تم کو کچھ نقصان پہنچے گا نہیں
تم جو چاہو گے کسی کا فائدہ

ہو گی یہ نیت تو پہنچے گا ضرر
غیر کا نقصان اپنا فائدہ

مبتلائے معصیت ہو جاؤ گے
بدظنی سے کچھ نہ ہو گا فائدہ

خود غرض جو مشورہ دے گا ذہینؔ
سوچ لے گا پہلے اپنا فائدہ

ذہینؔ (از حیدرآباد)

زبان

رہے گا شاد وہی جس کی ہو زبان شیریں
کہ بدزبان سے خوش کوئی بھی جہاں میں نہیں

یہی زبان ہے آپس میں جو لڑاتی ہے
یہی زباں کہ ہر اک کو لبھاتی ہے

جہاں میں زخموں سے اسکے ہیں سینکڑوں نالاں
یہی تو کرتی ہے ہر ایک کو یہاں شاداں

یہی زبان تو عزت کو بھی ڈبوتی ہے
وہی ہے بات جو قند نبات ہوتی ہے

نہ بدزباں سے الفت بڑھائے گا کوئی
جو بدزباں ہو کوئی اس کو چاہے گا نہ کبھی

جو اپنے بس میں اسے رکھتے ہے وہی انساں
نہیں وہ آدمی قابو میں ہو نہ جس کے زباں

اسی زباں سے ہوتی ہے ہر جگہ ذلت
اسی سے آدمی پاتا ہے عزت و حرمت

جو دوسرے کو کہے گا برا سنے گا وہی
عزیزؔ آپ نے کیا خوب ہے یہ بات کہی

عزیز نظامی (حیدرآباد)

غزلیات

(منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی)

تیغ قاتل کا اشارہ ہے گرانجانوں سے — تم سبکدوش نہ ہو گے میرے احسانوں سے
بل کی لے خنجر قاتل نہ گرانجانوں سے — سر سمجھتے ہیں یہ پہلے ہی جدا شانوں سے
شعلہ رو! آگ نہ ہو سوختہ سامانوں سے — شمع کی گرمی بازار ہے پروانوں سے
چار دن بھی نہ نبھی پھر گئے پیمانوں سے — تم کو شیشے میں اتارا تھا کن ارمانوں سے
مست ہوں دیکھ کے ساقی کی نشیلی آنکھیں — اب نہ مے سے مجھے مطلب ہے نہ پیمانوں سے
شور فریاد کا کب اس پہ اثر ہوتا ہے — اونچا سنتا ہے بہت پیر فلک کانوں سے
ہجر میں یاد شب وصل سے لیتا ہوں مزے — دل کو بہلاتا ہوں گزرے ہوئے افسانوں سے
تشنۂ دید سے کیا آنکھ ملاؤ گے جبھی — جب مے حسن چھلک جائیگی پیمانوں سے
دیکھتے ہیں غضب آلودہ نگاہوں سے مجھے — پرسش دل بھی وہ کرتے ہیں تو پیمانوں سے
عین کثرت میں نظر آتا ہے وحدت کا ظہور — راز قدرت کا نمایاں ہے صنم خانوں سے
بس گیا جس کی نگاہوں میں جمال جاناں — اس کو کعبہ سے غرض ہے نہ صنم خانوں سے

شامل حلقۂ رنداں ہے کہیں برق ضرور
آج ہو حق کی صدا آتی ہے میخانوں سے

(جناب سید عابد علی صاحب عابد۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

غنچۂ پژمردہ ہوں ناشاد ہوں برباد ہوں — اور کہنے کو گلستاں میں گلستاں زاد ہوں
یا فلک پر تھا ابھی یا گر پڑا منزل پہ میں — برق وحشت ہوں قیود راہ سے آزاد ہوں
حسن کہتا تھا کہ ہے مجھ سے امیدوں کی بہار — عشق بول اٹھا رگ امید کا فصاد ہوں
گلفشاں ہے عشق سے میرے عروس کائنات — کار فرمائے بہار عالم ایجاد ہوں

ماورائے عشق ہر شے بے حقیقت ہو گئی
ان دنوں عابد دیار عشق میں آباد ہوں

اخبار علمیہ

ہوا پر دوڑنے والا موٹر پٹسبرگ کے ایک شخص نے ایک موٹر ایجاد کیا ہے جس کی نسبت اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہوا پر دوڑتا ہے۔ شروع میں یہ موٹر پٹرول کے تیل سے چلتا ہے اور جب دس میل فی گھنٹہ کی رفتار پر پہونچتا ہے تو پٹرول بند کردیا جاتا ہے اور موٹر صرف ہوا کے ذریعہ سے چلتا رہتا ہے۔ اس کا پہلا تجربہ حال ہی میں بمقام پٹسبرگ کیا گیا جس میں یہ موٹر فی گھنٹہ ۶۲ میل کی رفتار تک پہنچ گیا تھا۔

سب سے بڑا ہوائی جہاز دنیا میں سب سے بڑا ہوائی جہاز اس وقت جاپانی حکومت کی فرمایش سے بمقام فرائی ڈرشیفن، کانسٹن تالاب کے کنارے تیار ہو رہا ہے، اس میں سَو آدمی بیک وقت بیٹھ سکیں گے۔

کالر اور نکٹائی کی مخالفت فرانس کے ایک شاعر گستاد شارپنٹیر اور وہاں کے ایک ڈرامانویس ردمین کولس نے کالر پہننے کے خلاف ایک جمعیۃ "اینٹی کالر لیگ" کے نام سے قائم کی ہے۔ اس جمعیۃ کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا ہے کہ سخت کالر پہننا عقلاً اور طبًا مضر ہے۔ کیونکہ یہ ایک طرح کی فضول جکڑ بندی ہے۔ اس نئی جمعیۃ کے لیڈر کالروں اور نکٹائیوں کو مردوں کے لئے ایسا ہی خطرناک بتاتے ہیں جیسے کہ عورتوں کے لئے کورسیٹ (زنانہ سینہ بندی Corset) وہ اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ اس صنف ضعیف خلقت نے تو جرأت کرکے اس "تنگ ملبوس" کو اتار پھینکا، اور مردوں نے ابتک کالروں اور نکٹائیوں کی جکڑ بندیوں سے اپنے تئیں آزاد نہیں کیا!

زبان:۔ کیا ہمارے ملک کے انگریزی داں اور فیشن ایبل بننے کے شوقین نوجوان اس سے کچھ عبرت حاصل کریں گے؟

(اڈیٹر)

مریکہ کے لکھ پتی

بقول مسٹر میک کوئے، رجسٹرار خزانہ ریاستہائے متحدہ، امریکہ کے لکھ پتی آدمیوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے، اور آیندہ چل کر اس میں بڑی کمی واقع جائے گی۔ یہ اندازہ انکم ٹیکس کی موصولات پر سے کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ں گیارہ ہزار آدمی لکھ پتی ہیں جن میں ایک کروڑ پتی بھی ہے۔ گویا ہر ۴۵۰۰ کی آبادی میں سے ایک ص لکھ پتی ہے۔

یک مخدر دوا

توران یونیورسٹی کے ڈاکٹر سینڈوز نے ٹرکین نامی ایک مخدر دوائی ایجاد کی ہے جو اپنے منوم اثرات کے لحاظ سے عجیب غریب ہے۔

اک سے علاج

نیپلز (اٹلی) کے ایک پادری مسمی ڈان لوئیگی گیرو فیلو، تمام امراض جسمانی کا علاج خاک سے کرنے کے مدعی ہیں۔ انہوں نے اپنے اس نظریہ ٔ علاج کی بنیاد انجیل کے اس مقولہ پر رکھی ہے کہ "خاک کا پتلا ہے تو اور خاک میں مل جائیگا"۔

پادری صاحب موصوف کی دلیل یہ ہے کہ ہومیوپیتھک (علاج بالمثل) نقطۂ نظر سے، چونکہ انسان کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے، اس لئے اس کے واسطے یہی عنصر شفابخش ہو سکتا ہے چنانچہ مقام ..زولی کے قریب ایک سُرخ رنگ کی مٹی سے (جس میں گندھک اور تانبے کے اجزا رلے ہوئے نظر آتے ں) وہ گولیاں بنا کر اپنے مریضوں کو دیتے ہیں، اور ان کو شفا ہو جاتی ہے۔ اس مٹی کی کیمیاوی ترکیب ں بہ نسبت اس عقیدت مندی کو زیادہ دخل ہے جو پادری صاحب اپنے مریضوں میں یہ کہہ کر پیدا کر دیتے ہیں کہ: "یہ ہر جگہ کی خاک کی ہی تاثیر ہے"!

نیپلز کے ایک گنجان آبادی والے قصبہ میں پادری صاحب علاج کے لئے بلائے گئے۔ مریضہ خبکی مر ۱۸ سال کی تھی مرض دماغی میں مبتلا تھی اور تمام نامی گرامی ڈاکٹر اس کے علاج سے مایوس ہو چکے تھے۔ ر پادری صاحب نے اس لڑکی کے سر پر ایک سفید کپڑا باندھا اور تین مرتبہ پڑھ کر دم کیا تو وہ لڑکی تندرست ہو گئی سی طرح آپ نے دق، امراض قلب، امراض دنداں، گلسوے، وغیرہ کے علاج میں خاصی کامیابی حاصل کرلی ہے۔

گورنمنٹ کے تعلیمی اخراجات

"ہندوستان میں تعلیمی ترقی" کا رپورٹ گورنمنٹ کے تعلیمی کمشنر مسٹر ریچی نے شائع کیا ہے۔ اس رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے لہ ہندوستان کی تعلیم پر گورنمنٹ ۹۹۰۱۵۹۴ روپئے صرف کرتی ہے۔ جس کا اوسط رعایا میں سے

فی کس ۱۴ رپڑتا ہے۔ گویا اس حساب سے گورنمنٹ کے تعلیمی اخراجات ۹۰ ء ۹ سے لیکر ۹۱ ، ۴۷ تک گھٹ گئے ہیں اور ان میں تعلیمی فیسیں وغیرہ ملانے سے گورنمنٹ کا تعلیمی فنڈ ۸ ، ۲۱ سے ۴ ، ۲۲ تک ترقی کر گیا ہے۔ چنانچہ مختلف صوبجات میں ہر متعلم پر ۳ روپئے (بہار اور اڑیسہ میں) سے لیکر ۲۴ روپیہ (دہلی میں) تک خرچ پڑتا ہے۔

عورتوں کی نو آبادی لندن کے جنوب میں بمقام لنگفیلڈ عورتوں نے بطور خود معاش حاصل کرنے کے لئے اپنی ایک نو آبادی قائم کی ہے چند نوجوان عورتوں نے اس کو قائم کیا ہے جہاں انہوں نے کاشتکاری اور باغبانی کا پیشہ کرنے کے لئے ایک سو ایکڑ زمین اپنے لئے مخصوص کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ زراعت صرف مردوں ہی کا پیشہ نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی تن تنہا اس کام کو انجام دے سکتی ہیں، ان عورتوں نے اشتراکی زندگی اختیار کی ہے اور ہر معاملہ میں ان کو آزادی ہے سوائے اس کے کہ وہ اپنے شوہروں کو وہاں نہ آنے دیں۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس تین سے چار ایکڑ تک زمین ہے۔ علاوہ ازیں ان میں ایک نے انگورہ کے خرگوش پال رکھے ہیں، دوسری کے پاس گایوں کا گلہ ہے، تیسری نے سبزی ترکاری کا باغ لگایا ہے۔ تیسری اس نو آبادی کے لئے روٹیاں اور کیک پکایا کرتی ہو۔ پیداوار سے جو کچھ بچ رہتا ہے وہ اس کو قریب کی ایک شاہراہ پر لگی ہوئی دوکان پر فروخت کر دیتی ہیں تھوڑے عرصہ میں اس نو آبادی نے خاصی ترقی کر لی ہے اور کئی سو درخت میوہ جات کے وہاں لگ گئے ہیں۔ باایں ہمہ یہاں کی رہنے والیوں میں قناعت اور اطمینان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب انہوں نے شوہروں کو وہاں لانے کی ممانعت کا قانون منسوخ کر دیا ہے۔ شاید سخت کام اور محنت کے لئے مرد کی قوت کی ضرورت پڑی ہوگی۔ اس لئے انہوں نے اپنے قانون میں یہ ترمیم کی ہے کہ اب سے شادی شدہ عورتیں اپنی اپنی زمین کی کاشتکاری وغیرہ کاموں میں اپنے شوہروں سے امداد طلب کریں گی مجاز ہوں گی۔ مگر ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ اس نو آبادی کے انتظامی معاملات میں یہ غریب دخل نہ دے سکیں گے، کہتے ہیں کہ اس شرط پر تین شوہر وہاں پہنچ گئے ہیں۔

تفریس الفاظ صفحہ مندرجہ آئندہ فہرست الفاظ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اہل فارس بھی انگریزی ناموں کو ان کے اصلی تلفظ میں رکھنے کی کوشش کرنے کے بجائے عربوں کی طرح تعریب کرنے اور فارسیت کا جامہ پہنانے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

معرب الفاظ	اصلی الفاظ	
رویتر	ریوٹر	Reuter
فوریہ	فبروری (جو اردو میں فروری لکھا جاتا ہے)	February
دیکتاتوری	ڈیماکریسی	Democracy
مارس	مارچ	march
نیویورک	نیویارک	New york
ماشین	مشین	machine
استرالیا	اسٹریلیا	Australia
پاریس	پیرس	Paris
قنسول	قونصل	Counsel
پرفسور	پروفیسر	Professor
دکتور	ڈاکٹر	Doctor
اروپائی	یوروپین	European
رادیوم	ریڈیم	Redium
آتوموبل	آٹوموبل	Automobile
استاسیون	اسٹیشن	Station
پاکت (لفافہ)	پاکٹ	Packet
پستخانہ	پوسٹ آفس	Post Office

اس قسم کے صدہا معربات روزانہ فارسی اخبارات میں نظر آتے ہیں انکو جمع کرنے کے لئے ایک ضخیم
کی ضرورت ہے۔

عربی کے بجائے خالص فارسی مصطلحات

صدیوں سے فارسی اور عربی میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور آج بھی جسقدر عربیت کو اس

ں ہے کسی دوسری زبان کو نہیں مگر ایرانی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے جو محض فارسی الفاظ
رواج دینا چاہتی ہے ان میں بعض افراد ایسے بھی ہیں جو مملکت ایران کے ان شہروں کے ناموں کو بھی بدل
چاہتے ہیں جن کو عربوں نے معرب کر لیا تھا یا جن پر معرب ہونے کا گمان ہوتا ہے چنانچہ آقائے نوبخت
نے ایک علمی مضمون "پیش نہادہائے بیگانہ" میں لکھتے ہیں کہ بطام ۔ سوادکوہ ۔ جہرق ۔ اور دامغان
ل میں بستان ۔ فرشوادگر ۔ چہرہ اور دام کون تھے جو عربوں کے کثرت استعمال سے معرب ہا در
ہوگئے ہیں ذیل میں ان فارسی مصطلحات کی فہرست دی جاتی ہے جو مروجہ عربی الفاظ کے لئے
ع کی گئی ہیں۔

اسم اصلی	اسم پیش نہادی
فوج	درفش
سلطان	سرکردہان
رئیس ارکان حرب	ہمکان سرجنگ
مدارس نظام	دبستان سپاہ
وزارت	دستوری
مستشار	کنکاشگر
وزیر حرب	جنگ دستور
وزیر معارف	دانش دستور
دار الصفارۃ	فرستادہ گاہ
وزارت مالیہ	باجستان
وزیر داخلہ	ایران دستور
رئیس الوزرا	مہین دستور وغیرہ

دولابہ راستی کش

ایکسرے (X ray) کا استعمال ابتک متعدد امراض کے علاج معالجہ کے لئے مخصوص تھا لیکن اب جرمنی میں اس کا استعمال جرایم پیشہ افراد پر بھی کیا جاتا ہے۔ ایک برقی لیمپ کے ذریعہ مجرم کے چہرہ پر شعاعیں ڈالی جاتی ہیں جس سے وہ اپنے صحیح حالات بیان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ "دولابہ راستی کش" جرمنی کے ہر پولس اسٹیشن پر رکھا گیا ہے۔ انگلیوں کی جانچ بھی اب اسی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

سزائے شراب نوشی

امتناع شراب نوشی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے نیبراسکا (امریکہ) کی عدالت کے ایک جج مسٹر برائینٹ نے یہ سزا تجویز کی ہے کہ ایسے مجرموں کو بطور غذا صرف روٹی اور پانی دیا جائے۔ مقامی اخبارات نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی لیکن جج موصوف نے اپنے زیر ماتحت تمام ملازمین کو پانچ روز تک اس پر عمل پیرا ہونے کا حکم صادر کرکے اخبارات میں ایک اعلان شائع کرایا ہے کہ اس سزا سے جسمانی یا روحانی طاقت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

تنقید و تبصرہ

ت محمدی | منشی شیخ غلام محمدؐ صاحب مرحوم متوطن اولپاڑ (ضلع سورت) کو فن تاریخ سے گہری دلچسپی تھی خصوصاً گجرات کاٹھیاواڑ کی تاریخ سے خاصہ شغف رکھتے تھے چنانچہ ریاست
بلدہ کے محکمہ تاریخ میں ایک عرصہ تک تاریخ نویسی کی خدمت انجام دیتے رہے، جوناگڈھ کی ایک ضخیم تاریخ
م بہ مرات مصطفےٰ آباد (زیر طبع) بھی مرحوم ہی کی تصنیف بتائی جاتی ہے اس کے علاوہ بھی متعدد تاریخی
مرحوم کی یادگار ہیں۔

زیر تنقید کتاب گجرات کی مکمل اسلامی تاریخ ہے جس کو مصنف مرحوم کے لائق فرزند جناب منشی غلام احمدؐ
ب پرنسپل وکٹوریہ جبلی مدرسہ پوربندر (کاٹھیاواڑ) نے حال میں اپنے اہتمام سے بار اول طبع
ہے۔

شروع میں جناب شیخ محمد بہائی صاحب دیوان ریاست جوناگڈھ کی تصویر اور اُن کے نام پر انتساب ہے۔ اسکے
ب گجرات کا جغرافیہ ماضی وحال، دیسی ریاستوں سے برٹش گورنمنٹ کے پولیٹکل تعلقات، ریاستوں کے
ت درجات اور اقوام گجرات و قدیم راجگان گجرات کے خاندانی حالات نہایت اختصار کے ساتھ
ئے گئے ہیں، باب سوم سے اہل اسلام کا سلسلہ وار بیان ہے، چنانچہ بزمانہ خلافت راشدہ گجرات
انوں کا ورود، سلطان محمود غزنوی کا حملہ سومنات تحقیق سے لکھا ہے اس کے بعد پانچویں صدی
ے بارھویں صدی ہجری کے آخر تک سلاطین گجرات کے حالات پوری وضاحت سے لکھے ہیں۔ سلاطین
کے تاریخی کارناموں کے ساتھ ساتھ مصنف نے ان کے طرز حکومت، عدل و انصاف، طرز معاشرت
ات و خصائل پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے جو نہایت پر از معلومات اور مفید ہے غرضیکہ تاریخ
تقین کے لئے نہایت کارآمد اور گجرات کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں کو اس کا پڑھنا ضروری ہے۔

رست مضامین کے نہ ہونے سے حالات دریافت کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے اسی طرح بعض زبان
حسن غلطیاں رہ گئی ہیں یقین ہے کہ شیخ صاحب موصوف طبع دوم میں ان نقایص کی اصلاح فرما دینگے
ہائی چھپائی اور کاغذ خاصہ قیمت ۸؍ جو ۲۸۶ صفحات کی کتاب کے لئے زیادہ نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ۔ مندرجہ بالا پوربندر کے پتہ سے یا محمدی بک ڈپو اولپاڑہ ضلع سورت سے مل سکتی ہے۔

گلزار خلیل | یہ چھوٹا سا رسالہ جناب سید محمد کاظم صاحب عرف آغا خلیل متخلص بہ خلیل کھمباتی نے تصنیف فرمایا ہے اسمیں اندوی حروف تہجی ۲۷ سلام اور ایک مرثیہ ہے۔

سلام اول کا یہ مطلع ثانی ؎

روح القدس بھی شیدا ہے میرے صفیر کا
بلبل ہوں بوستانِ جناب امیر کا

ناسخ مغفور کے اس مشہور و معروف مطلع سے "غالباً" توارد ہوگیا ہے ؎

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا
روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

تیسرے سلام میں اثر ۔ نظر کے قوافی میں سوگور باندھ گئے ہیں لفظ سوگ ہندی الاصل ہے فارسی میں صرف ایک جگہ ترکیب اضافی کے ساتھ مستعمل ہے یعنی سوگوار لیکن اب تک صاحب لوگ. اہل سوگ یا سوگوار کہیں نظر سے نہیں گذرا اس لئے اس سے احتراز لازم ہے۔

ان معمولی فروگذاشتوں کے علاوہ بعض سلام سلامت وروانی کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں، لکھائی چھپائی عمدہ حجم ۴۰ صفحے قیمت صرف ۴ر

مصنف کے نام کھمبایت قریب جامع مسجد کے پتہ سے مل سکتی ہے

اردو رسالے

سہیل (علیگڈھ) | مسرت کا مقام ہے کہ اردو فن صحافت روز بروز پایۂ تکمیل کو پہنچتا جاتا ہے اور صحافت وارادت کے اصول و فرائض کی کما حقہ ادائیگی ہو رہی ہے۔ بعض رسالے تو اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے سبب یورپ کے اچھے رسالوں کے ہم پلہ نظر آتے ہیں اگرچہ یہ صحیح ہے

کہ یورپ بہ لحاظ خوشنما ٹائپ اور موقع بموقع رنگین و سادہ تصاویر کے ظاہری خوبیوں میں ہم سے گوئے سبقت لے گیا ہے اور ہم اردو ٹائپ کی نامقبولیت کے باعث اور لیتھو کی ناقابل برداشت دشواریوں اور کثیر اخراجات طباعت کی وجہ سے بہت پیچھے ہیں تاہم معنوی خوبیوں میں ہم ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں بلکہ بعض رسالہ تو اس صنعت یورپ سے بھی کہیں بالاتر ہیں چند رسالہ ایسے بھی ہیں جو ظاہری و معنوی دونوں اوصاف سے متصف ہیں اور ان میں سب سے پہلا نمبر سہیل کا ہے۔

انگریزی میں متعدد سہ ماہی رسالے نکلتے ہیں اور آئے دن نکلتے جارہے ہیں۔ اردو میں اس کی سخت کمی تھی لیکن شکر ہے کہ اس کمی کو مولینا عبدالحق صاحب بی۔اے نے ذریعہ اردو (اورنگ آباد) بوجہ احسن اور مولینا رشید احمد صاحب صدیقی نے ذریعہ سہیل بدرجہ اتم پورا کر دیا ہے۔

مولینا رشید احمد صاحب (صدیقی) ملک کے مشہور انشا پرداز ہیں جو اپنی مخصوص طرز نگارش کے باعث بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے ہیں اور جن کو اردو سے نہ صرف گہری دلچسپی ہے بلکہ اس کی نشر و اشاعت کے سچے بہی خواہ و ہمدرد ہیں اسلئے ملک کے اردو داں طبقہ کو جو توقعات ہونی چاہئے تھیں وہ باحسن الوجوہ ذریعہ سہیل انجام دے رہے ہیں

سہیل کا زیر تبصرہ نمبر ۳ بابت ستمبر سنہ ۲۶ء جس شان سے جلوہ گر ہوا ہے اور اپنے دامن میں جن جواہر پاروں کو لیکر قدردانان اردو کی خدمت میں حاضر ہوا ہے وہ میرے نزدیک لایق تحسین ہی نہیں بلکہ قابل صد رشک و حسد ہے (چشم بد دور) رسالہ خود اپنے مرتب کے ذوق صحیح، شغف علمی اور نگاہ انتخاب کا نمایاں طور پر ثبوت دے رہا ہے، سرورق کی سادگی ہزاروں بناؤ پر قربان ہے شروع میں "ارجن اور کرشنا" کی رنگین تصویر جناب عبدالرحمن صاحب چغتائی کے موئے قلم کی اعلیٰ صناعی کا ثبوت ہے، پھر صفحہ الف تا ہ ا فاضل مرتب کے کارآمد شذرات ہیں اس کے بعد رسالہ کے اصل مضامین صفحہ ۲ سے شروع ہوتے ہیں پہلا مضمون "اردو بطور ایک مذہبی زبان کے" سید طفیل احمد صاحب (علیگ) کا ہے جسمیں فاضل مقالہ نگار نے اردو میں دینیات اور مذہبی کتب کے منتقل ہونے پر اظہار امتنان و تشکر، ہندی و اردو کی رفتار ترقی میں تیزی و سستی اور اردو کو ایک مشترکہ زبان بنانے کے مشکلات نہایت فصاحت سے بیان فرمائے ہیں صفحہ ۱ سے خواجہ منظور حسن صاحب ایم۔اے نے روس کے مشہور فسانہ نگار ترگنف کے فسانہ "ایری ایڈی" کا اصل مصنف

سے مخصوص رنگ میں نہایت کامیاب ترجمہ فرمایا ہے یہ فسانہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے ۔ صفحہ ۳۰ پر "یک نظر راجع بہ تعلیم اسلامیات در علیگڑھ یونیورسٹیہ" کے عنوان سے جناب سید محمد ہادی صاحب ہادی مچھلی شہری نے علیگڑھ یونیورسٹی میں مذہبی تعلیم کے متعلق نہایت جامع اور سلیس فارسی مضمون سپرد قلم فرمایا ہے جس کو دیکھ کر زبان سے بے اختیار واہ نکل جاتی ہے کہ ہندوستان میں بھی ایسی فارسی نظم و نثر لکھنے والی ہستیاں موجود ہیں جو کسی طرح اہل زبان سے کم نہیں ہیں، لیکن کیا اچھا ہوتا اگر یہ گرانقدر خیالات اردو میں منتقل فرمائے جاتے کہ ناظرین سہیل میں بہت سے ایسے حضرات بھی ہوں گے جو فارسی سے بے بہرہ ہوں گے ۔ صفحہ ۴۴ پر "پنڈت زتشی اور بعض مضامین سہیل" والے مضمون میں شرر و سرشار کی طرز جدید میں ناول نویسی کی اولیت کا جھگڑا اور اردو میں عربی و فارسی یا سنسکرت اور ہندی کے الفاظ کو بیجا طور پر دخل دینے کی کشاکش سے شیخ و برہمن بلکہ "سید و پنڈت" کا اختلاف ہے ، اس کے بعد "قاصد سحاب" کا طویل مضمون جو پچاس صفحات پر حاوی ہے مہا کوی کالیداس کی میگھ دوت کی عاشقانہ نظموں کے اردو ترجمہ کا دیباچہ ہے جس پر فاضل مرتب کا ایک طویل نوٹ ہے جس سے ہر منصف مزاج کو اتفاق ہونا چاہیے، ترجمہ نظم میں بہت سی زبان اور شاعری کی غلطیاں موجود ہیں جن کے متعلق مرتب کے صلح جو قلم نے بہت دبی زبان سے آیندہ نمبر میں مشورہ دینے کا کہا ہے اس لئے ہم بھی اس کو انہی کے الفاظ میں صرف "اخلاقاً" نظر انداز کرتے ہیں اس کے بعد صفحہ ۱۱۵ سے ملک کے بہترین تنقیدی مضمون نگار جناب سید محی الدین صاحب زور کا بلند پایہ مضمون "اردو کے اسالیب بیان" شروع ہوتا ہے جس کا پہلا حصہ سہیل کے نمبر ۲ میں نکل چکا ہے ۔ اس مضمون میں زور صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے اردو کے اسالیب پر تاریخی نکتہ نظر سے اور محققانہ پیرایہ میں بحث کی ہے یہ مضمون جامع اور مبسوط ہونے کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ عوام کے فائدہ کے لئے علیحدہ کتابی صورت میں چھپوا دیا جائے ۔ آخری مضمون "اردو شاعری پر ایک نظر" جناب رشید احمد صاحب مرتب سہیل کے قلم سے نکلا ہوا ہے جو ہمارے شعراء کے لئے نہایت کارآمد قابل مطالعہ ہے ۔

اتنے بڑے رسالہ میں نظم کا حصہ بالکل نہیں ہے صرف حضرت گرامی کی ایک فارسی غزل ہے جو شعر و سخن سے دلچسپی اور ذوق رکھنے والوں کے لئے بالکل ناکافی ہے لہذا ہم فاضل مرتب کو اتنا مشورہ ضرور دیں گے کہ جہاں وہ اردو نثر کا ایسا قابل قدر سرمایہ فراہم کرتے ہیں وہاں ایسی ہی ملک کے بہترین

شعراکی دو تین نظمیں بہم پہنچا کر اس کمی کو پورا کر دیں گے۔

غرض کہ یہ ۱۶۶ صفحات اور ۳۰ × ۲۰/۸ سائز کا زبردست رسالہ عمدہ کاغذ اور اعلیٰ لکھائی چھپائی کے ساتھ سات روپیہ سالانہ میں بالکل مفت ہے فی پرچہ ۱۲/

ملنے کا پتہ۔ علیگڑھ یونیورسٹی۔ علیگڑھ

خیابان (لکھنو) یہ نیا رسالہ نہایت آب و تاب کے ساتھ جناب شہنشاہ حسین صاحب رضوی کی اڈیٹری میں لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا ہے جس کا پہلا نمبر بابت ماہ نومبر ہمارے سامنے ہے۔ اگرچہ کسی رسالہ کا صرف ایک ہی نمبر دیکھ کر کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے لیکن اسکو جیسے قابل مضمون نگار ملے ہیں وہ اس کے شاندار مستقبل کے لئے ضامن ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ خیابان کا وجود دنیائے صحافت میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگا۔

پہلے نمبر کے تمام تر عمدہ مضامین ناتمام ہیں اسلئے اسپر کوئی رائے زنی کرنا قبل از وقت ہے یہ رسالہ چار جزو کا ہے۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ اور سائز ۲۰ × ۲۶ ہے سالانہ پانچ روپیہ نمونہ ۸ آنہ۔

پتہ:۔ وکٹوریہ پریس لکھنؤ

قوس قزح (لاہور) اس باتصویر رسالہ کے مدیر مسؤل۔ جناب محمد وحید کیلانی۔ بی۔ اے اور مدیر اعزازی جناب محمد علیم الدین صاحب سالک بی۔ اے ہیں۔ قوس قزح اپنے سالانہ نمبر کے باعث بہت کچھ شہرت حاصل کر چکا ہے ہر نمبر میں دو تین رنگین و سادہ تصاویر ہوتی ہیں اور مضامین کے لحاظ سے بھی دیگر لاہوری رسالوں میں ممتاز ہے۔

زیر تبصرہ دسمبر نمبر میں " فارسی ڈرامے کا ارتقا " " تاریخ اشتراکیت، فلسفۂ غیب، اور مغلوں اور عادل شاہیوں کے تعلقات " بہت اچھے مضمون ہیں۔ فسانوں میں حضرت قضائی (ٹونکی) کا فسانہ " دل کی تاریخ " ست دلچسپ ہے لیکن اس میں جا بجا عربی کے الفاظ کی ایسی بھرمار کی گئی جس سے قصہ کی دلچسپی میں تو کوئی

نہیں آتا مگر پڑھنے والے کو نا واقفیت کی وجہ سے الجھن ضرور ہوتی ہے، حضرت تمکین الکاظمی صاحب کا "مسافر کرمان شاہ" بہت دلچسپ ہے۔

رسالہ کی لکھائی چھپائی اعلیٰ اور کاغذ عمدہ ہے سائز ۲۰×۳۰/۸ اور پانچ جزو کا ہے۔ اس پر سالانہ چندہ ۳ ہے، جو اتنے بڑے رسالہ کے لئے بالکل مفت ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر قوس قزح لاہور

آفتاب | یہ مشرقی ہندوستان کا مصور رسالہ بہ زیر ادارت جناب چراغ حسن صاحب حسرت کلکتہ سے جنوری ۲۶ء سے بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلنا شروع ہوا ہے۔ زیر نظر ستمبر نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندوستان کے بہترین لکھنے والے بہم پہنچائے ہیں اور مضامین کا انتخاب بھی اچھا ہوتا ہے چنانچہ نواب سید نصیر حسین صاحب خیال مدظلہ نے "ہندو اہل ہند" میں ہماری غذا کے متعلق قیمتی اور نتیجہ خیز خیال ظاہر فرمایا ہے "منی بیگم اور مغربی سیاح" ایک سچا تاریخی واقعہ نواب زادہ ہے۔ الف۔ ایم عبد العلی صاحب نے خوب لکھا ہے۔ نظمیں بھی بہت اچھی ہیں خصوصاً جناب اختر شیرانی کے لمعات اور حضرت شاد عظیم آبادی کی رباعیاں جذبات قلبیہ کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ بہر کیف رسالہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

لکھائی چھپائی دیدہ زیب کاغذ عمدہ حجم ۴۸ صفحے اور سرورق رنگین آرٹ پیپر پر اتنی خوبیوں پر سالانہ چندہ صرف ۱۲/

پتہ:۔ منیجر آفتاب نمبر ۱ گنگا دھر بابو لین کلکتہ

اڈیٹر

قواعد وضوابط رسالہ زبان

(۱) "زبان" ہر انگریزی مہینے کی ۵ تاریخ کو منگرول سے شائع ہوگا۔

(۲) "زبان" کی سالانہ قیمت عوام سے چار روپئے والیان ملک ومعاونین کرام جو کچھ عنایت فرمائیں۔

(۳) نمونہ کا پرچہ ٦ آنہ کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے۔

(۴) ششماہی چندہ عہ/ (ڈہائی روپیہ)

(۵) رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع ہر ماہ کی ۲۵ تک آجانا چاہیے۔

(٦) جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

(۷) ترسیل زر ودرخواست خریداری اور جملہ انتظامی امور کے متعلق منیجر رسالہ زبان منگرول (کاٹھیاواڑ) سے خط وکتابت کیجیے۔

(۸) مضامین بغرض اندراج رسالہ ریویو کے لئے کتابیں تبادلہ کے اخبارات ورسائل کے متعلق ایڈیٹر صاحب رسالہ زبان سے مراسلت کیجیے۔

(۹) "زبان" میں سیاسی مضامین درج نہ ہوں گے۔

(۱۰) اعلیٰ علمی وادبی مضامین کا معاوضہ (بشرط پسندیدگی) دیا جائیگا مگر اس میں اور نجیل مضامین کی تخصیص ہے۔

منیجر رسالہ زبان۔ منگرول (کاٹھیاواڑ)

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ	چوتھائی صفحہ	ضروری نوٹ
نرخ نامہ اشتہار				
ایک سال کے لئے	سہ/	صسہ/	عسہ/	فحش اور غیر مہذب اشتہار نہ لئے جائیں گے اجرت کا پیشگی آنا ضروری ہے۔ ٹائٹل پیج کے صفحہ ۲ و ۳ و ۴ کے لئے ذیل کے پتہ پر خط لکھئے۔
چھ ماہ کے لئے	صسہ/	عسہ/	ءعسہ/	منیجر زبان منگرول (کاٹھیاواڑ)
تین ماہ کے لئے	عسہ/	ءعسہ/	ہے/	
ایک ماہ کے لئے	ہے/	صہ/	سے/	

(باہتمام خواجہ صدیق حسین آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھپا)

رجسٹرڈ نمبر ۲۹۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لقد وجدت مکان القول ذا سعۃ — فان وجدت لساناً قائلاً فقل

زبان

کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی رسالہ

مرتبہ
عبدالرحمن خوشتر (منگرولی)

سالانہ (چار روپیہ) — ششماہی دو روپیہ

(نمونہ ۶ آنہ)

زبان

جلد ۲ || فہرست مضامین رسالہ زبان بابتہ ماہ جنوری ۱۹۲۷ء || نمبر ۱

زبان خلق

مولٰنا وحید الدین صاحب تسلیم پروفیسر جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد)

جو مضامین رسالہ میں شائع ہوتے ہیں میرے نزدیک وہ کاٹھیا واڑ کے پڑھنے والوں کے واسطے مشکل زبان میں ہوتے ہیں۔ آپ مضمون نگاروں سے اجازت لیکر ہر مضمون کی زبان کو سہل کر دیا کریں تاکہ وہ آپ کے اہل وطن کے پڑھنے کے لائق ہو جائیں۔ ورنہ خود زیادہ تر لکھیں۔ باہر کے مضامین کم لیں مضامین ایسے لینے چاہئیں جن سے وہاں کے لوگوں کو دلچسپی ہو اور اُن کو پڑھ کر نئی معلومات حاصل کرسکیں۔ مولوی[۱] زبان میں مضامین شائع کرنے سے ان کو فائدہ نہ ہوگا غالباً آپ اس کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت تمکین الکاظمی

...... خارزار کاٹھیاواڑ سے ایک علمی اور ادبی رسالہ کا اجرا آپ جیسے ذی ہمت بزرگوں ہی کا کام ہے اردو کی حقیقی خدمت یہی ہے کہ ان مقامات سے رسائل کا اجرا ہو جہاں اردو کی حالت گری ہوئی ہے اور انہیں مقامات کے رسائل کی امداد اردو کی حقیقی سرپرستی ہے جو ایسے مقامات سے شائع ہوتے ہیں، یقین فرمائیے کہ میں آپ کے خیال سے بالکل متفق ہوں اور امکانی امداد کے لئے حاضر، انشاء اللہ آپ مجھے "زبان" کا "ہم زبان" پائیں گے

یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ قاضی احمد میاں صاحب جوناگڈھ بھی زبان کی امداد فرما رہے ہیں مولوی صاحب موصوف مدت سے خاموش تھے، ادب اردو کو آپ کا شکور ہونا چاہئے کہ آپ نے "زبان" نکالکر قاضی صاحب کو بھی "ہم زبان" بنا لیا۔

رسالہ کی ترتیب عمدہ ہے مضامین بھی بہترین ہیں، معلومات جدیدہ میں کسی قدر وسعت چاہئے۔

لہ زبان اگر مضمون نگار حضرات خود ہی اس بات کا خیال رکھیں تو زیادہ مناسب ہے ۔ ۱۲

جناب سید محی الدین صاحب زورؔ قادری بی۔ اے پروفیسر جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد)

...... چونکہ آپ ایک ایسے مقام سے رسالہ نکال رہے ہیں جو اس قسم کی کوششوں سے اب تک تقریباً محروم تھا اور اس کے علاوہ آپ نے جس حد تک اس میں کامیابی حاصل کی ہے اس کی خوش آیند نوعیت نے مجبور کر دیا کہ "زبان" کے لئے کچھ لکھوں چنانچہ اس دو تین روز کے عرصہ میں ایک مضمون تیار ہوا ہے جو مرسل خدمت ہے ....

نکات

از ملا رموزی

حضرت مکرم مولوی عبدالرحمٰن خوشتر ایڈیٹر "زبان" بھی کچھ عجیب کینڈے کے بزرگ واقع ہوئے ہیں: ان کی مثال سے اگر ساری صحافی دُنیا کو خالی سمجھا جائے تو غلط نہیں، یہ حضرت اپنے وقت کے کچھ اس درجہ "مستقل مزاج" اس درجہ "ثابت قدم" اور اس درجہ "صدّی انسان" ہیں کہ اگر انھیں "نپولین کاٹھیاواڑ" کہا جائے تو بیجا نہیں، کیونکہ ان کے لغت میں بھی لفظ "ناممکن" اور ناامیدی کا وجود ہی نہیں،

ہم نے رسالہ "زبان" کے پہلے نمبر میں کہیں یونہی لکھدیا تھا کہ "ہم ہر نمبر میں نکات بکتے رہیں گے" مگر ہمارے اس وعدہ میں سچائی اتنی ہی تھی جتنا آٹے میں نمک، یا وکیلوں کی بحث میں صداقت اور پولیس والوں میں "دیانت" وجہ یہ تھی کہ ہم جانتے تھے کہ رسالہ "زبان" سے صوبہ کاٹھیاواڑ میں نہ کسی کو محبت ہوگی، نہ کوئی اس کی اشاعت میں کوشش کرے گا، اور نہ کوئی اسے مالی امداد دیگا جیسا کہ ہو بھی رہا ہے اس لئے چند دن میں بھائی خوشتر تو ہو جائیں گے "دیوالیہ" اور "زبان"- بے زبان[1]، لہٰذا ہم نے بھی مضمون کی طرف سے سادہ لی چپ،

مگر اُف رے خوشتر کا استقلال و حوصلہ کہ اونہوں نے بھی قسم ہی کھالی کہ رسالہ "زبان" جو اب جاری ہوا ہے تو بند ہونے کا نام ہی نہ لیگا، اور یہ شاید اس لئے کہ صوبہ کاٹھیاواڑ کے باشندوں پر کہیں یہ الزام نہ آجائے کہ وہ اپنے صوبہ کا ایک عدد رسالہ بھی نہ چلا سکے، لہٰذا خوشتر ممدوح کا "تقاضائے مضمون" برابر جاری ہے! اور اس سلسلہ میں اُنھوں نے ہمارے ساتھ جن تدابیر کو اختیار فرمایا وہ ملاحظہ ہوں،

---

[1] زبان خاکت بدہن۔

پہلے لکھا کہ معاوضہ دیں گے،

پھر۔ استدعا۔ التماس، عرض، گزارش۔ درخواست۔ یاددہانی۔ یادداشت۔ عرضداشت۔ مراسلہ۔ آفس نوٹ
آفس کاپی، آفس سلپ ڈی۔ او۔ اطلاع۔ اور عریضوں سے کام لیا،

پھر= لالچ۔ امید۔ توقع۔ دلاسا۔ ترغیب۔ تحریص۔ دلجوئی۔ دلدہی۔ دلداری۔ اور کسی قدر ورغلانے سے بھی کام لیا۔

پھر= خوشامد۔ تملق۔ چاپلوسی۔ منت۔ سماجت۔ التجا۔ الحاح۔ عقیدت، ارادت۔ بندگی۔ نیازمندی۔ نیازکیشی۔ دوستی، مودت۔ تعلقات، اور یارانے سے کام لیا اور ایک مرتبہ تو "ارے یار" بھی لکھدیا،

پھر= ڈانٹ ڈپٹ۔ دھمکی۔ سختی۔ شدت۔ ترش روئی۔ تلخ گفتاری۔ غصے۔ قہر۔ طیش۔ جھونج۔ جھڑکی۔ دھونس تخویف۔ تہدید۔ جھنجلاہٹ۔ تنبیہہ۔ تاکید۔ تعذیب۔ تعزیر۔ زجر اور توبیخ سے کام لیا۔

پھر۔ کج خلقی۔ کجروی۔ کج ادائی۔ بے مروتی۔ بے وفائی، بے رحمی، بے دردی، اور بداخلاقی سے کام لیا۔

پھر= وعظ۔ نصیحت۔ پند۔ موعظت۔ اور سمجھانے سے کام لیا۔

پھر= فصاحت۔ بلاغت۔ انشا، انشاد۔ تحریر۔ املا۔ خوش خطی۔ خوش نویسی۔ کتابت۔ خطاطی اور نقاشی سے کام لیا۔

لیکن ان سب کے مقابلہ میں ہنستے بھی۔ نان کاپریشن۔ نان وائیلنس۔ بائیکاٹ۔ واک آؤٹ۔ ترک موالات۔ مقاومت مجہول، عدم تعاون، عدم تشدد۔ خلاف ورزی۔ ستیہ گرہ۔ مقاطعہ۔ قطع تعلق۔ ان بن۔ گرونون۔ اور غرفش سے کام لیا تو بھائی صاحب سنئے اب۔ عمل۔ منتر۔ جادو۔ تعویذ۔ گنڈے۔ دعا۔ منت۔ مراد۔ نقشے۔ نیاز۔ فاتحہ۔ اور ایصال ثواب، کا حربہ سنبھال لیا اور آخر انہی میں سے کسی ایک چیز نے ہمارے اوپر اثر کیا اور ہم پھر رسالہ۔ زبان۔ میں حاضر ہو گئے۔ اب دعا دیجئے خوشتر کے حوصلہ کو اور اگر مناسب ہو تو زبان تانی۔ بے اعتنائی۔ بے رخی۔ بے مہری۔ بے توجہی۔ بے پروائی۔ اور بے فکری۔ پر شرما جائیے۔!

زبان آپ کو کون ورغلا سکتا ہے معلم الملکوت بھی آپ سے تو پناہ مانگتا ہے۔ ۱۲

ہم نے "پچھلے نکات" میں قومی خصوصیات کے تذکرہ میں بتلایا تھا کہ قوم، اس جماعت کو کہتے ہیں جس کی زبان لباس۔ مذہب۔ اور رسوم محفوظ و یکساں ہوں۔ لہٰذا جس جماعت کی مذکورہ خصوصیات میں سے ایک خصوصیت بھی کم ہو جائے یا بدل جائے، تو اس کے افراد پر لفظ ۔قوم۔ یا قومی۔ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ گریز بھائیوں کو دیکھئے۔ ہندوستان پر مرتے ہیں۔ دم دیتے ہیں۔ فدا ہوتے ہیں۔ صدقے جاتے ہیں۔ نثار ہوتے ہیں۔ یہاں آتے ہیں۔ رہتے ہیں۔ حکومت کرتے ہیں۔ تجارت کرتے ہیں۔ ہل چلاتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہیں۔ جوان ہوتے ہیں پڑھتے ہیں۔ ملازم ہوتے ہیں اور بوڑھے ہو کر "خدا گنج" بھی چلے جاتے ہیں، مگر عمر میں ایک مرتبہ بھی ہندوستان کا بنا ہوا انگرکھا۔ اچکن۔ شیروانی۔ کرتا۔ پاجامہ، لبادا۔ مرزائی صدری، شملہ کا۔ تہبند اور ۔ دھوتی، نہیں پہنتے پر نہیں پہنتے۔

خصوصیات قومی کی یہ ہے وہ حفاظت جو انگریزوں کے لباس میں پائی جاتی ہے، اسی طرح آپ کا کوئی کتنا ہی بے تکلف انگریز دوست ہو اگر آپ اُسے اپنی دعوت ولیمہ میں بلائیں گے تو آئیگا ضرور، مگر بیٹھے گا کرسی پر۔ منگنی کی تقریب میں آئیگا تو بیٹھے گا کرسی پر۔ نکاح میں تو کرسی پر۔ بارات میں کرسی پر۔ رخصت میں تو کرسی پر۔ چھٹی میں تو کرسی پر عقیقہ میں تو کرسی پر اور تقریب ختنہ میں تو یہ لوگ شریک ہی نہیں ہوتے، اسے کہتے ہیں قومی آداب کی حفاظت جو انگریزوں میں پائی جاتی ہے،

لیکن ایک ہندوستانی ہیں جن کے پاس آج نہ اُن کا قومی پاجامہ ہے نہ عمامہ، نہ لنگوٹ ہے نہ دھوتی۔ مشرقی فرش میں نہ قالین ہیں نہ گدا، نہ چاندنی ہے نہ تکیہ۔ اور تخت ہیں نہ چارپائیاں۔ جہاں ایم۔ اے ہوئے اور گلیڈسٹونی امت میں جا ملے۔ جہاں۔ ایل۔ ایل۔ بی، کیا اور لائیڈ جارج بن گئے۔ اب اگر سوال کیجئے کہ کیوں حضور یہ اپنا ملک ہندوستان انگریز بھائیوں سے واپس لینے کے لئے تو آپ چرخہ۔ ترک موالات۔ توڑ تاڑ۔ ایجی ٹیشن۔ لٹھ بازی اور بس چلے تو۔ قتل عام۔ تک تیار ہیں اور "ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے" کا نعرہ لگاتے پھرتے ہیں، مگر یہ تو فرمایئے کہ مذکورہ حالات میں آپ کے اندر ہندوستانی۔ ہونے کی بھی کوئی علامت موجود ہے، پھر اس پر کہتے ہیں کہ ہمیں "سوراج" کے بندر کے ساتھ بکرا بھی دلا دو"!!!

معاشرت اور زبان کے بعد اخلاق کا نقشہ بھی ملاحظہ ہو،

آپ ایک انگریز لارڈ کو بحر ظلمات میں ایک عدد کارڈ لکھ بھیجئے وہ اس کا جواب ضرور دیگا، لیکن اگر ایک غریب ہندوستانی اپنے سے، ذرا مالدار ہندوستانی، ذرا عہدہ دار ہندوستانی، ذرا افسر ہندوستانی، ذرا تھانیدار ہندوستانی، ذرا ڈپٹی کلکٹر ہندوستانی، ذرا چیف جسٹس ہندوستانی؛ ذرا ہندوستانی لیڈر۔ اور ذرا ہندوستانی ایڈیٹر کو گن میں پانچ مرتبہ بھی خط لکھے اور پھر مکتوب الیہ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ راقم غریب اور میری پوزیشن سے کم پوزیشن کا آدمی ہے تو بس پھر اکڑ جائیں گے اور عمر بھر جواب نہ دیں گے۔ اور تو اور خیر سے یہ اردو اخباروں کے طفل دبستاں ایڈیٹروں کی اکڑ فوں کا تو جواب ہی نہیں، جب آپ خطوط کا تار باندھ دیجئے تو کارڈ پر ایک آدھ سطر میں بس اتنا لکھ دیں گے کہ

"مصروفیت زیادہ ہے"

گویا آپ پتنگ کے کاغذ پر شائع ہونے والے دو پیسہ کے اخبار کے ایڈیٹر کیا ہیں دہلی کے گھنٹہ گھر ہیں جسکی گھڑی ایک سکینڈ کو بند ہی نہیں ہوتی،!!!

ہندو بھائیوں کو شکایت ہے کہ مسلمان اردو زبان میں عربی اور فارسی کو اسدرجہ داخل کر چکے ہیں اور تے جاتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے سمجھنے اور سمجھانے کے قابل ہی نہ رہی، اور اسی لئے ہندو اخباروں نے ن کا توڑ یوں کیا ہے کہ اپنے مضامین کے اندر آئے دن سنسکرت اور بھاشا کے نہایت غیر ضروری اور بھونڈے الفاظ ٹھونس کر اردو کے حسن سلاست کو تباہ کر رہے ہیں، حالانکہ اردو زبان کی جدید ترقی یا نشاۃ الثانیہ میں مسلمانوں نے اپنی بے تعصبی، اور فراخ حوصلگی کا جسقدر ثبوت دیا ہے وہ ذیل کے حقایق سے ظاہر ہے،

جنگ یورپ کے خاتمہ سے مشرق کی تمام قوموں میں زندگی کے جو امید افزا آثار پیدا ہوئے ہیں انہوں نے مشرق کی تمام زبانوں کو بھی متاثر کیا ہے اسی لئے اردو زبان بھی ایک ترقی کن دائرہ سے گزر رہی ہے۔ اسکی وسعت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے، اسی سلسلہ میں اردو صحافت میں نت نئی اصطلاحات، محاورے، ستعارے، اور الفاظ داخل ہو رہے ہیں جو زبان اردو کا جزو بنتے جا رہے ہیں، پچھلے آٹھ دس برس میں اردو صحافت میں مسلمانوں کی طرف سے جو نئے الفاظ داخل ہوئے ان میں سے ترک موالات، موتمر، اور مدیر،

نہایت کثیر الاستعمال ہیں اور انہیں اب اُردو کے الفاظ کہنا جائز ہے، لیکن اگر ان الفاظ کو آپ ہندوؤں کی تحریر۔ تقریر۔ یا اخبارات میں دیکھنا چاہیں تو نہ ملیں گے، بخلاف اس کے اسی عرصہ میں ہندوؤں کی طرف سے چند الفاظ وضع ہوئے اور اور بعض مسلمان آج بڑی خوشی سے اپنی تقریر و تحریر میں استعمال کر رہے ہیں اور اب یہ الفاظ مسلمانوں کی اس بے تعصبی سے اُردو کے الفاظ بن چکے جن میں سوراج۔ ستیہ گرہ۔ سبھا۔ مہاتما۔ سوامی۔ آشرم۔ گورکھشا۔ شدھی۔ اور سنگھٹن کے الفاظ خاص ہیں،

ہمیں یاد ہے کہ لاہور سے "سوراج" نام کا ایک اخبار ایک مسلمان ہی نے جاری کیا تھا۔ لفظ سبھا کو آج بھی لاہور کا ایک مسلمان رسالہ۔ بہارستان، اپنا مستقل عنوان بنائے ہوئے ہے، بقیہ تمام الفاظ آج مسلمانوں کی تقریر میں سنے اور سمجھے جاتے ہیں اور ہر مضمون میں ان کا استعمال ہو رہا ہے۔ یہ ہے مسلمانو کی رواداری جس سے وہ اپنے اس دعوی میں سچے ہیں کہ وہ اُردو زبان کو اپنی زبان نہیں بلکہ ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے ہیں۔

بہر حال آج کل اُردو زبان میں وضع الفاظ و اصطلاحات کا خاص دور ہے خدا کرے اسلامیہ کالجوں کے "انگریزی یافتہ مسلمان" اس مقابلہ میں پیچھے نہ رہجائیں اور وہ بھی انگریزی زبان کے چند موٹے موٹے الفاظ اُردو میں ٹھونس دیں کیونکہ اُن کی قومی غیرت سے یہی امید ہے، !!! آیندہ نمبر سے ایسے تمام نئے الفاظ کی فہرست دی جائیگی جو اس ماہ میں داخل ہوا کریں گے، انشاءاللہ

(از جناب محمد رضی الحسن صاحب رضی ایڈیٹر حسن خیال)

اُٹھتا نہیں ہے اب تو قدم کوئے یار سے
مجبوریوں نے کام لیا اختیار سے

پچھتاؤ گے سکون ہے سرمایۂ حیات
اچھی نہیں ہے چھیڑ دل بے قرار سے

لاکھوں ہیں داغ اب تو بجائے گل مراد
باغ نشاط دل میں خزاں ہے بہار سے،

تم نے جفا سے ہاتھ اٹھا کر غضب کیا
محروم ہو گئے ستم روزگار سے،

تیری نگاہ مہر کے ہوتے ہی باغباں
باد خزاں بدل گئی باد بہار سے،

بڑھتی ہی جا رہی ہیں تری مہربانیاں
جی کانپتا ہے گردش لیل و نہار سے

گویا رضی تلافی مافات ہو گئی،
دل بے قرار ہے نگہ شرمسار سے

صفحۂ ادارت

الحمدللہ کہ اس نمبر سے "زبان" کی دوسری جلد کا آغاز ہوتا ہے جس پر ہمیں بے اندازہ مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن ہم سے زیادہ ہمارے ملکی بھائیوں اور اہل ذوق کو خوش ہونا چاہیے کہ "زبان" نے باوجود اپنی نادادی و بے مائیگی کے مردانہ وار اقتصادی مشکلات کا مقابلہ کرکے ایک ششماہی ختم کردی اور اب دوسری ششماہی میں قدم رکھ رہا ہے۔ اگرچہ ع

کٹھن ہے راہ اور منزل کڑی ہے

"زبان" کی خوش قسمتی کہئے یا اس کی جاذبیت کہ اب اس کی جانب ملک کے نامور اہل قلم حضرات نے بھی اپنی توجہات منعطف فرمائی ہیں۔ چنانچہ ہمارے فخر کاٹھیاواڑ علامہ میمن عبدالعزیز صاحب راجکوٹی پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، مشہور تنقیدی مقالہ نگار جناب سید غلام محی الدین صاحب قادری زور بی۔ اے پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مولانا مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر ویدیا پیٹ احمدآباد اور جناب نگین الکاظمی وغیرہما نے "زبان" کے اس نمبر کو اپنے اپنے افادات سے مستفید و مفتخر فرمایا ہے جن کے لئے ہم ان کے مرہون منت ہیں۔

کئی اور مشہور و موقر اہل حضرات نے آیندہ سے "زبان" کی قلمی اعانت کا وعدہ فرمایا ہے جن کے رشحات خامہ سے قارئین زبان عنقریب بہرہ اندوز ہوں گے۔

اس وقت حصہ "ادبیات" اگرچہ بہت کچھ غیر مکمل ہے تاہم اس میں محمود اسرائیلی، ازدق دہلوی، ناہید سیدآبادی، ذہین حیدرآبادی اور تجمل جلالپوری وغیرہ ایسے مستند و مشہور حضرات نظر آئیں گے، ہم نے اس حصہ کو بھی بہترین بنانے کے لئے ملک کے نامور ادیب و شعراء کی خاص طور پر اعانت حاصل کی ہے جو انشاءاللہ آیندہ نمبر میں ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے۔

مترجمات و اخبار علمیہ کی خوبیوں کی نسبت کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ یہ مستقل عنوانات ہمارے مشفق دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب نے اپنے لئے مخصوص کر لئے ہیں جن کو غیر زبان سے بے لاگ اُردو ترجمہ کرنے میں ایسی مہارت تامہ حاصل ہے کہ اس کو اپنا بنا لیتے ہیں اور اصل کا گمان ہونے لگتا ہے، قاضی صاحب موصوف جس عرق ریزی و جانفشانی سے مصر و شام اور امریکہ و یورپ کے عربی و انگریزی رسائل کے پراز معلومات اور سائنس کے جدید مگر حیرت انگیز انکشافات کا ترجمہ کر کے نذر ناظرین کرتے ہیں وہ یقیناً مستحق ستائش قابل داد ہے۔

ان عنوانات کے بہترین ہونے کا اس سے پتہ چل سکتا ہے کہ انتخاب مضامین مترجمات کا اکثر "معارف" کے تلخیص و تبصرہ اور "زبان" کے مترجمات سے توارد ہو جاتا ہے اور جن کو ملک کے اکثر اہل اخبار و رسالہ اپنے اپنے اخبارات و رسائل میں نقل کرتے ہیں۔

ہر چند کہ اپنی توصیف آپ کرنا سخت معیوب اور اشتہار سے کم وقعت نہیں رکھتا لیکن اگر کسی مر واقعہ کا اظہار خودستائی کی مد میں داخل ہے تو ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ اس سے کوئی فرد بری نہیں ہے۔

اس نمبر کے ساتھ جو شبیہ "زیب زبان" کی جاتی ہے وہ ہمارے نواب فلک رفعت سکندر صولت گردوں جناب معلی القاب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ و حشمتہٗ فرمانفرمائے ریاست منگرول کی ہے اگرچہ اس سے "زبان" کا پہلا ہی نمبر مزین ہونا چاہئے تھا تاہم چونکہ "زبان" میں تصاویر کا آغاز اسی تصویر سے کیا جاتا ہے اسلئے اولیت کا سہرا اسی تمثیل کے سر ہے۔

"زبان" میں اس سلسلہ کو قائم رکھنے کا ہم وعدہ نہیں کرتے لیکن کوشش کریں گے کہ ہم اسکے ذریعہ ناظرین کرام کو مشاہیر و اہل قلم اصحاب سے کبھی کبھی روشناس کرانے کی عزت حاصل کرینگے۔

یوں تو کاٹھیاواڑ میں بہت سی محفلیں اور انجمنیں قائم ہیں جو ایک حد تک اپنے اپنے مذہبی و قومی مفاد کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کرتی رہتی ہیں لیکن غالباً انجمن اخوان الصفا (مانادور) اپنے اغراض و مقاصد کی خصوصیات کی بنا پر کاٹھیاواڑ میں پہلی انجمن ہے جو باوجود قلیل مدتی و محدود سرمایہ کے مسلمانان کاٹھیاواڑ کی تعلیم اور انہیں اُردو کو ترویج دینے کی شدت کیساتھ حامی ہے۔ اب کچھ عرصہ سے انجمن کے محدود سرمایہ سے ایک دوکان بھی کھولی گئی ہے جس میں علاوہ روزانہ ضروریات اور اسٹیشنری وغیرہ کے کم و بیش ہر قسم کی اشیاء مہیا کی گئی ہیں، اور شکر ہے کہ اہل مانادور بھی اپنی اس قومی دوکان

ہی سے خرید و فروخت کرتے ہیں، اس دوکان کی آمدنی سے انجمن حتی الامکان اپنے اغراض و مقاصد انجام دیتی ہے۔

اس انجمن کے جہاں اور بہت سے قوم کے مفید مطلب مقاصد ہیں وہاں ایک مقصد یہ بھی ہے "کہ کاٹھیاواڑ میں اُردو کو ترویج دینے کی ہر امکانی کوشش کی جائے"، چنانچہ اس مقصد عظیم کی تکمیل کے لئے علاوہ مقامی جد و جہد کے اس کے مہتمم اعلیٰ پیرزادہ عبدالقادر صاحب نے ہمیں چوبیس ۲۴ روپئے روانہ فرمائے ہیں کہ اس سے کاٹھیاواڑ کے چھ ۶ ایسے طلباء کے نام رسالہ زبان جاری کردیں جو رسالہ کے خریدار ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے لہٰذا ہم اعلان کرتے ہیں کہ درخواست دینے والے طلبہ اپنی اپنی درخواستوں کے ساتھ اپنے شہر کے ایک معزز شخص کی شہادت اور اپنے مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر کی تحریری سفارش بھی روانہ فرمائیں بعد تحقیق ان کے نام سال بھر کے لئے رسالہ زبان جاری کردیا جائیگا تمام درخواستیں بنام سکریٹری انجمن اخوان الصفا۔ مانا ودر (کاٹھیاواڑ) یا اڈیٹر رسالہ ہذا کے نام مذکورہ بالا شرائط پر آنی چاہئیں۔

امید کہ کاٹھیاواڑ کی دیگر انجمنیں بھی اپنے مقاصد میں اس مبارک مقصد کا اضافہ کرکے انجمن اخوان الصفا کی عملی تقلید کریں گی۔

ناظرین اور معاصرین کرام کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اب تک **زبان** کو جو خالص علمی و ادبی رسالہ ہے باوجود پورے سات ماہ کی مسلسل کوشش کے ڈاکخانہ کا رجسٹر نمبر نہیں ملا۔ جس کا سبب اصلی ایک "دلچسپ تعصب" ہے لیکن چونکہ اس کے متعلق ہمارے آخری تار کے جواب میں ایجنٹ ٹو دی گورنر جنرل (ویسٹرن انڈیا) کی جانب سے بجز اس کے کہ "یہ مسئلہ ابھی زیر غور ہے"، کوئی قطعی اور باضابطہ اطلاع موصول نہیں ہوئی ہے لہٰذا ہم بھی سر دست اس "اہم مسئلہ" پر روشنی ڈالنا قبل از وقت سمجھتے ہیں یا پھر ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

نتیجہ کے انتظار میں دفتر کو معقول نقصان برداشت کرنا پڑا ہے اگر اس پر بھی نتیجہ خاطر خواہ نہ ہوا تو پھر ع

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

لب کشائی کرینگے اور دنیائے صحافت میں صدائے احتجاج بلند کریں گے۔

ایڈیٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنوری — زبان — ۱۹۲۷ء

زبان

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی — کل جسم میں اک نطقِ مجسم ہے یہی
ہے عرش خدائے پاک، اگر پاک ہے دل — صادق ہے زبان، تو اسم اعظم ہے یہی
(امجد)

مقالات

تغلق

(از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی پروفیسر مادھو لال احمد آباد)

تغلق ایک ترکی لفظ ہے، جس کے معنی "پہاڑی" کے ہیں۔ یہ پشتو لفظ "رہیلہ" کے مرادف ہے۔ نوادر میں ہے کہ تغلق اور تغلغ ہم معنی ہیں۔ بلکہ تغلغ مبدل ہو کر تغلق ہو گیا ہے، جس کے معنی "اوسط" کے ہیں۔ مگر اس کوئی دلیل نہیں دی تغلق کے متعلق قدیم ترین بیان ابن بطوطہ کا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شیخ رکن الدین قریشی سے میں نے سنا ہے کہ تغلق ترک قوم سے "قرونہ" تھا۔ اور یہ ترکستان اور سندھ کے بیچ کے پہاڑوں میں رہتے ہیں۔

لفظ "قرونہ" کی نسبت آٹھویں صدی کا مشہور سیاح مارکو پولو اس طرح تشریح کرتا ہے کہ "قرونہ" ان کو کہتے ہیں کہ جن کی ماں ہندی اور باپ تاتاری ہو۔ ان لوگوں کا پیشہ لوٹ مار اور قزاقی ہے۔ جہاں ان کا لشکر جاتا ہے۔ وہ اس ملک کو بے چراغ کر ڈالتے ہیں" الخ۔ لفظ قرونہ کا ترجمہ عربی میں مولدین ہے، اور آجکل اصطلاح میں "یوریشین" کہتے ہیں۔

مشہور ہے کہ اصل میں یہ لوگ چین کے شمال میں "قرون جیدن" (یا خیدن) ایک پہاڑ ہے وہاں رہتے تھے پھر وہاں سے نکل کر مذکورہ علاقہ میں آ لبے۔

"مارکو پولو" پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ ان کا سردار "نکودار" ہے۔ جو چغتائی کا بھتیجہ ہے "یہ شخص اپنے چچا کے پاس سے بھاگ کر اور قرونہ کے لشکر کو لیکر بدخشاں کے راستہ کشمیر میں گیا۔ اور لاہور کو فتح کرکے وہاں بیٹھ گیا[له] اور مغلوں سے لڑتا رہا۔"

دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر لشکر کے ساتھ "قرونہ" کا طومان (دس ہزار آدمی) ہوا کرتا تھا۔ لیکن پھر ان لوگوں نے لشکر سے علیحدگی اختیار کرکے لوٹ مار کو اپنا پیشہ بنالیا اور غالباً اسی لوٹ مار کے سلسلہ میں انہیں ترکستان سے سندھ اور پنجاب تک کا سفر کرنا پڑا۔

خلاصۃ التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ سلطان کا باپ تغلق نامی سلطان غیاث الدین بلبن کے ترکی غلاموں میں سے تھا۔ اور اس کی ماں پنجاب کی قوم جاٹ سے تھی۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "قرونہ" کے لفظ سے ابن بطوطہ کے راوی شیخ قریشی نے یہی مراد لیا ہے۔ اور مارکوپولو کا بیان بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تغلق قوم کا نام نہ تھا۔ بلکہ شخص خاص کا نام تھا۔

مندرجہ بالا بیان کی تصدیق فرشتہ بھی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "میں جب لاہور گیا تو اہل علم سے اس معاملہ کی تحقیقات کی۔ لیکن کسی نے "تغلق" کے متعلق صحیح اور قابل وثوق بات نہیں بتائی۔ البتہ یہ بات سنی جو عام طور پر مشہور ہے کہ غیاث الدین تغلق کا باپ ملک تغلق۔ غیاث الدین بلبن کے غلاموں میں سے تھا۔ اور اس نے پنجابی جاٹ کی لڑکی سے شادی کرلی جس سے غیاث الدین تغلق پیدا ہوا۔"

سکوں سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک سکہ پر ہے :-

له جہانتک تاریخ کا تتبع کیا گیا ہے۔ ایسا کوئی مغل سردار نظر نہیں آتا کہ ہندوستان کا کوئی علاقہ خصوصاً لاہور جیسا مقام فتح کرکے مستقل قبضہ اس پر جما لیا ہو۔ بابر سے پہلے جس قدر تاتاری ہندوستان آئے بجز "تیمور" کے سب کے سب بلا استثنا ر مار کر نکال دیئے گئے۔ ایسی صورت میں مارکوپولو کے تحریر کی یہ تاویل کیجا سکتی ہے۔ کہ "نکودار" یا کوئی دوسرا مغل سردار ہندوستان آیا ہو اور مسلمان ہوگیا ہو۔ اور غوری غلاموں کے عہد میں کسی بادشاہ نے اُسے لاہور کا گورنر بنادیا ہو۔ جیسا کہ خلجی اور تغلق کے زمانہ میں ہوا تھا۔ اور بہت ممکن ہے کہ انہیں کے ساتھ تغلق کے باپ دادا آئے ہوں جیسا کہ آگے ثابت ہوگا۔

السلطان الغازی غیاث الدنیا والدین ابوالمظفر تغلق شاہ ناصر امیرالمومنین۔
پھر اس کے بیٹے کے سکہ پر درج ہے :۔
"المجاھد فی سبیل اللہ محمد بن تغلق شاہ" یا "محی سنن خاتم النبیین محمد بن تغلق شاہ"۔
ان سکوں سے شخصی نام کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تغلق خود ملک غازی غیاث الدین کا نام ہے نہ اس کے باپ کا۔

لیکن یہ بات مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے برخلاف ہوگی۔ اور فیصلہ ایک طرفہ بہت مشکل ہے۔ سکوں کے متعلق جواب دیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ اطمینان وہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ بات مشکوک رہی کہ تغلق یا تو خود ملک غازی غیاث الدین کا نام ہے یا اس کے باپ کا۔ میرا ذاتی رجحان یہ ہے کہ دونوں مذکورۂ بالا کتب کی سماعی روایتوں کے مقابل سکہ کی عینی شہادت زیادہ معتبر ہے۔ اس لئے تغلق خود غیاث الدین کا نام تھا۔

افسوس ہے کہ تاریخ میں ضیا برنی نے اور فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف نے اس لفظ کی کوئی تشریح نہیں کی۔ سراج عفیف یا امیر خسرو کا تغلق نامہ اگر مل جاتا تو بڑی آسانی سے اس کے متعلق رائے قایم کیجاسکتی مصنف طبقات اکبری کا بیان ہے کہ تغلق نامہ اس کے نظر سے گذرا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس نے ایک لفظ بھی اس کے متعلق نہیں لکھا۔ اور بڑی خاموشی کے ساتھ واقعات بیان کرتا ہوا نکل گیا ہے۔

اب رہی یہ بحث کہ تغلق ہندوستان کب آیا؟ اس کے متعلق مذکورۂ بالا کتابوں سے تو آپ کو معلوم ہوگیا کہ عہد بلبن میں آیا۔ لیکن ابن بطوطہ لکھتا ہے۔ کہ تغلق بہت مفلس تھا سندھ میں آیا تو کسی سوداگر کا گلہ بان ہوگیا۔ یہ عہد علاءالدین کا ذکر ہے۔ انہیں دنوں سلطان کا بھائی الغ خاں بطور حاکم ملتان آیا ہوا تھا۔ تغلق اس کے لشکر میں داخل ہوکر پہلے پیادوں پھر سواروں میں بھرتی ہوا۔ اس کی کارگزاری دیکھ کر اس کو افسر بنایا گیا۔ پھر میر آخور یعنی داروغۂ اصطبل، اور آخر کار امرا کبار میں سے ہوگیا۔

شمس سراج عفیف نے فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ تغلق، رجب، ابوبکر تینوں بھائی خراسان سے دہلی میں آئے۔ یہ زمانہ علاءالدین خلجی کا تھا۔ سلطان نے دہلی ہی میں مختلف عہدوں پر ممتاز کرکے ان سے کام لیا۔ آخر کار رجب انکی بہادری کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا تو سلطان علاءالدین خلجی نے دیبال پور (دیوبال پور) کا ان کو حاکم (گورنر) بنا کر بھیجا۔

ان پچھلے دو بیانوں سے جو قریب قریب متحد ہیں، یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیاث الدین تغلق خلجی

عہد میں ہندوستان آیا۔ نہ بلبن کے عہد میں۔ جیسا کہ فرشتہ نے لکھا ہے۔

اور اگر مصنف فیروز شاہی کے متعلق یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس نے اپنے آقا کو غلامی سے بچانے کے لئے چشم پوشی کی ہے تو ابن بطوطہ کو تحریر کرنے سے کون مانع تھا؟ پس اب اگر فرشتہ کی روایت صحیح تسلیم کر لی جائے تو تاویل صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ملک تغلق عہد بلبن میں آیا تھا لیکن بعد وفات بلبن ملک میں جب ابتری پھیلی دیکھی تو خراسان چلا گیا۔ اور پھر ان کے بیٹوں یا خود خلجی کے عہد میں واپس آیا۔

نسب نامہ

ترک قوم

|

اس کی ایک شاخ کا نام قرونہ
ملکِ تغلق قرونہ

رجب تغلق — ملک غازی تغلق (جو بعد میں غیاث الدین ہوا) — ابوبکر تغلق

- رجب تغلق
  - فیروز تغلق
    - محمد شاہ تغلق
- ملک غازی تغلق (جو بعد میں غیاث الدین ہوا)
  - محمد تغلق
- ابوبکر تغلق

نواب آصف الدولہ کا شکار

اور

میر و سودا

(ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب قادری زور بی۔ اے پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

اگر یوں کہا جائے کہ عالم اردو میں فن تنقید سرے سے مفقود تھا تو غالباً بیجا نہ ہوگا اور اگر تھا تو نہایت تشنہ اور غیر مکمل حالت میں جس کو ہم کسی طرح بھی تنقید نہیں کہہ سکتے۔ لیکن ملک کو مولینا سید غلام محی الدین صاحب قادری زور بی۔ اے کا ممنون ہونا چاہیئے کہ آپنے "روح تنقید" ایسی گرانقدر کتاب تصنیف سے اردو فن تنقید کو جدید یورپی اصول پر مکمل فرماکر اردو علم و ادب کی ایک زبردست کمی کو پورا کیا۔

ذیل کا قابل قدر تنقیدی مضمون بھی موصوف ہی کی نگارش خامہ کا مرہون منت ہے جس میں موصوف نے ناقدانہ نظر سے وہ وہ نکات پیدا کئے ہیں جو آجتک پردہ خفا میں تھے۔ ہم اس مضمون کو نہایت فخر کے ساتھ درج کرتے ہوئے موصوف سے استدعا کرتے ہیں کہ آیندہ بھی اسی طرح زبان کو نوازیں گے۔

ایڈیٹر

تنظیم کائنات کے وقت ایسی ہستیوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے تعین کر دینا خلاق عالم کے لئے ضروری تھا، جو اپنے ملک و ماحل کی ان معجز نما حقیقتوں کی ایک روئداد منضبط کرتی رہیں جنہیں وہ اپنے اطراف کی کارروائیوں میں جلوہ گر پاتی ہوں۔

ان معمولی غیر ہستیوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ واقعات کو اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھہ لیں اور پھر ان میں آ بن جن کو ان کا قلب و دماغ قابل یادگار سمجھتا ہو انہیں اپنے مخصوص ذریعہ اظہار —— خواہ و

شاعری ہو یا تاریخ نگاری، اور خواہ وہ نقاشی ہو یا مجسمہ سازی — کی مدد سے آنے والی نسلوں پر منکشف کرتی ہیں۔ یہ تو وہ کلیہ تھا جس کے تحت شاعروں، انشا پردازوں، نقاشوں معماروں اور مجسمہ سازوں کی آئے دن کی بے معقول تخلیقیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ہستیاں اپنے شاغل کو ایک مذہبی فرض یا ایک معاشرتی ضرورت کی حیثیت سے جاری رکھنے پر مجبور ہو جایا کرتی ہیں۔

کائنات کی فطرت کا اقتضا ہی یہ ہے کہ اُسے قلمبند کر لیا جائے۔ بقول امرسن تمام چیزیں خود اپنی تاریخ لکھنے میں مشغول ہیں ایک سیارہ ہو یا ایک کنکر، اپنا سایہ ڈالے بغیر نہیں رہتا، پتھر پہاڑ پر سے خراش چھوڑتا ہوا لڑھکتا ہے، دریا زمین پر بہتا ہے تو اپنا راستہ ضرور چھوڑتا چلا جاتا ہے، جانور فنا ہوتے ہیں لیکن میدانوں میں اپنی ہڈیاں چھوڑ جاتے ہیں، گھاس پھوس بھی جلتے وقت کوئلے پر اپنے دھیمے نشان چھوڑے بغیر نہیں جلتے، پانی کی بوند ٹپکنے کے بعد ریت یا پتھر پر اپنا نقش بنا دیتا ہے، برف یا ریت پر قدموں کے نشان چلنے والے کی غیر فانی یادگار ہے۔ انسان کا ہر کام اس کے ہم جنسوں کی ذہنیتوں اور خود اس کے چہرے اور اطوار میں اپنے نقوش ضرور ثبت کر دیتا ہے۔

میر تقی اور میرزا رفیع نے جس ماحول میں زندگی بسر کی اس کا اثر ان کی تخلیقی قوتوں پر پڑھنا ضروری تھا۔ انسان کی قوت حافظہ ایک ایسے آئینہ کے مانند ہے جو اپنے اطراف کی اشیا کی شکلیں حاصل کر کے ان میں جان ڈالتا ہے اور پھر نئی ترتیب سے ان کا انعکاس کرتا ہے، جس طرح کائنات کا ذرہ ذرہ اپنا اثر چھوڑنے پر مجبور ہے، انسان کی فطرت بھی اپنے انفعالیت تخیلات کو قلمبند کرتے رہنے کی مقتضی ہے ہماری زبان کے ایک موجودہ انشا پرداز کے قول کے مطابق انسان پیٹ کا ہلکا واقع ہوا ہے، جب تک وہ اظہار نہیں کرے گا اس کے پیٹ میں درد ہوتا رہے گا یہی ہے وہ بنیادی عنصر جس پر کسی زبان کے ادب و انشا کا انحصار ہوتا ہے اور جس کے تحت اس مضمون کے عنوان پر ہم کچھ روشنی ڈالنی چاہتے ہیں:—

نواب آصف الدولہ بہادر، رستم جنگ، وزیر الممالک: لکھنؤ کا وہ عالی نژاد تاجدار، جو خود مختار حکومت و ثروت حاصل کرنے کے بعد بھی اپنے قدیم لیکن کمزور دہلوی آقاؤں کی اسی طرح عزت و احترام کرتا رہا جس طرح اسکے بزرگ اجداد دہلی کے تاجداروں کے عروج عظمت کا زمانہ میں عام درباریوں کی طرح کیا کرتے تھے، ایک حقیقی علم پرور اور مردم شناس حکمراں کی طرح علما و فضلا اور شاعروں کی قدر دانی اور تربیت پر کمر باندھتا ہے۔ اس کی فیاضیاں بڑے بڑے عالی ہمتوں کو خس و خاشاک کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور پھر ان کی دنیا دی تشکیلوں کو

اسقدر سیراب کرتی ہیں کہ اس کے بعد وہ دنیا اور مافیہا سے بےخبر ہو جاتے ہیں۔

ایسی صورت میں میرزا رفیع اور میر تقی جیسی ہستیاں ——— وہ ہستیاں جو لکھنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں وہ ہستیاں جو ہر اس چیز کو جو اُن کی نظروں کے سامنے آتی ہے، یا جس کا انہیں کوئی تجربہ ہوتا ہے، ایک معیاری نمونہ سمجھ کر اس کا مرقعہ کھینچنے کو تیار رہو جاتی ہیں، وہ ہستیاں جو لوگوں کے اس خیال کو باطل سمجھتی ہیں کہ دنیا میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو ناقابل اظہار ہیں اور وہ ہستیاں جن کو یقین رہتا ہے کہ وہ تمام اشیا بھی جن کا صرف خیال کیا جاسکتا ہے حرف تحریر کے ذریعہ سے ظاہر کی جاسکتی ہیں ——— اس امر پر مجبور تھیں کہ ان تمام چیزوں کو اپنے قلمی مرقعوں کے ذریعہ سے زندہ جاوید بنا دیں جو اُن کے اطراف انہیں دکھائی دیتی تھیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے مرقعوں کی کثرت کے باعث میرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کے کلیات نگارستان بنے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کا صحیح تنقیدی زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کیا جائے اور اس نوع کے رنگ برنگ کے مرقعے نکال نکال کر نہ صرف اردو والوں کو محظوظ کرایا جائے بلکہ دنیائے ادب اردو کو دلکش اور پرلطف بنا دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس مضمون میں اپنے بساط کے موافق میر اور سودا دونوں کے ایک ہی چیز سے متعلقہ مرقعوں کا بالمقابلہ مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

نواب آصف الدولہ کو شکار کا خاص شوق تھا۔ اور جس طرح ان کی شادی کی تمام دھوم دھام اور ان کی دوسری دلچسپ تقریبوں اور مشغلوں کے نقشے ان کے زمانہ کے شاعروں کے کلام میں نمایاں نظر آتے ہیں اُن کے شکار کے متعلق بھی بعض بہتر سے بہتر تصویریں دستیاب ہوتی ہیں جن میں میر اور سودا کے عہد نامے زیادہ قابل ذکر ہیں۔

میر اور سودا کی طرزِ شاعری اور اسلوب بیان میں جسقدر فرق ہے وہ ادب اردو کا صحیح مذاق رکھنے والوں پر ظاہر ہے۔ ان دونوں کی شاعری میں ایک دوسرے سے بالکل مخالف رنگ کیوں اور کس طرح جھلکنے لگا اس کی تحقیق پیش کرنا ہمارے اس مضمون کے حدود سے باہر ہے یہاں ہم صرف اس امر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ ایک ہی موضوع پر ایک ہی زمانہ کے دو عظیم الشان اور ہم پلہ شاعر کس طرح نظر ڈالتے ہیں؟

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ سودا خارجی حالات کی ترجمانی کرنے میں میر تو کیا اردو کے اکثر شاعروں سے بہت بلند مرتبہ ہیں۔ انہوں نے بقدر خارجی مرقعے پیش کئے ہیں وہ اسقدر حقیقی اور نفیس معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد ہمیں ایک افتخار سا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اردو زبان بھی دنیا کی ترقی یافتہ اور

شائستہ زبانوں کی طرح کائنات اور اس کی گوناگونیوں کے خوبصورت اور مکمل مرقعوں سے محروم نہیں۔ کیا سودا کا پیش کردہ بدقسمت "گھوڑا" ادبی دنیا کا ایک اعلیٰ پایہ کا "کارٹون" نہیں؟ اور کیا اپنے زمانہ کی لڑائیوں اور کشمکشوں کے متعلق سودا کے بیانات نہایت نفیس حقیقت آمیز اور موافق فطرت مرقعے نہیں ہیں؟

سودا کی شاعری اور ان کی شاعرانہ عظمت کی حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کے لئے یقیناً ایک بہت بڑے "ظرف" کی ضرورت ہے۔ موجودہ "تنگنائے مضمون" غالب کے الفاظ کے مطابق "بقدر ذوق" نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہے کہ ہم ایسی کوششوں کی ابتدا کرنے کی جگہ یہاں ان کے اس قسم کے کمال کا ایک ایسا نمونہ دکھانا چاہتے ہیں جس میں وہ اپنے حریف میر تقی میر سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں!

نواب آصف الدولہ کے شکار سے متعلق میر نے مثنویوں کی شکل میں کئی صید نامے لکھے ہیں اور اس کے برخلاف سودا کی مثنویوں میں ایک ہی صید نامہ پایا جاتا ہے جو اظہار موضوع کے لحاظ سے بھی میر کے صید ناموں کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ تعجب ہے کہ سودا ـــ وہ سودا جو اس میدان میں ہمیشہ میر سے گوئے سبقت لیجایا کرتے تھے ـــ اس ایک موقع پر کیونکر ان سے بہت پیچھے رہ گئے؟

اس کی ایک وجہ بہت ممکن ہے یہ ہو کہ میر نے صید نامہ کی مثنویوں کو خاص اہتمام کے ساتھ لکھا۔ چنانچہ وہ ان تین مثنویوں کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

زمانہ[سہ] میں ہے رسم کہنہ کی یہ — امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ
کسو سے ہوئی شاہنامہ کی فکر — کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر
گیا شاہ جہاں نامہ کہہ کر کلیم — دل شاعراں رشک سے ہے دو نیم
کنھوں نے کہی عشق کی داستان — ہوا کوئی کہانے سے ہمداستان
لیے آصف الدولہ میں نے بھی میر — کہے صید نامے بہت بے نظیر
مگر نام نامی یہ مشہور ہو — گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو

اس کے برخلاف سودا نے ـــ معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق ادب کے متذکرہ اصول کے مطابق ـــ خاص اہتمام سے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی صید نامہ کی مثنوی میں صرف (٣٥) ابیات ہیں۔ اور میر کی صیدیہ

سہ (دیکھو کلیات میر ٦٢٥ ۔ مطبوعہ نول کشور کانپور)

مثنویوں میں تقریباً سات سوابیات موجود ہیں۔ اور اگرچہ ان مثنویوں کے درمیان میر نے کئی بڑی بڑی غزلیں بھی درج کردی ہیں لیکن ان کو علیحدہ کردینے کے بعد بھی میر کے جو خارجی بیانات باقی رہجاتے ہیں وہ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

سودا نے اپنی صیدیہ مثنوی کو اس طرح شروع کیا ہے :۔

سر صفحہ پر آج یوں صبحدم ۔۔۔ لگا دست سودا میں کہنے قلم
جو اس عہد میں ہند کا ہے وزیر ۔۔۔ بہمت جوان و بتدبیر پیر
بدہر آصف الدولہ جسکا ہے نام ۔۔۔ سلیمان شکوہ و ذوی الاحتشام
جہاں تولے وہ اپنی شمشیر کو ۔۔۔ تو روباہ سمجھے ہے وہ شیر کو
کیا ان نے ناگاہ بعزم شکار ۔۔۔ قدم رنجہ اپنا بہ سوئے شکار

(دیکھو "کلیات سودا" مطبوعہ نول کشور کانپور صفحہ ۱۰۵)

میر نے اپنی صیدیہ مثنویوں کو حسب ذیل اشعار سے شروع کیا ہے :۔

(۱) چلا آصف الدولہ بہر شکار ۔۔۔ ہنا د بیاباں سے اٹھا غبار
روانہ ہوئی فوج دریا رنگ ۔۔۔ لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ

(دیکھو "کلیات میر" صفحہ ۵۴۱)

(۲) چلا پھر بھی نواب گردوں شکار ۔۔۔ اسد باد کے گھوڑے پر ہو سوار
روانہ ہوئی فوج دریا مثال ۔۔۔ ہنگوں کی اب کھینچی جاوے گی کھال

(دیکھو "کلیات میر" صفحہ ۵۴۴)

(۳) مکرر ہے نواب کو قصد صید ۔۔۔ بیاباں بیابان دراب ہونگے قید
رواں بحر لشکر ہوا موج موج ۔۔۔ گئی چشم خورشید تک گرد فوج

(دیکھو "کلیات میر" صفحہ ۵۵۳)

ان مثنویوں میں میر نے نواب آصف الدولہ کی تعریف میں اور دعا کے طور پر حسب ذیل شعر لکھے ہیں جو ہر مثنوی کے آخر میں پائے جاتے ہیں :۔

(۱) بہت ہم نے دیکھے وزیر شہاں ۔۔۔ شکار ایسے دستور سے تھے کہاں
نکلو ار مجھے تو ہیں گے ہزار ۔۔۔ نہ میر ابھی ہوناہے یاں یادگار

غرض میر تا دورِ چرخِ بلند — رہے آصف الدولہ اقبال مند
کرے اس کا اقبال ہر لحظہ کام — شکار اس کے دشمن رہے صبح و شام

(دیکھو صفحہ ۵۴۳)

(۲) غرض ہے وزیرِ جہاں ارجمند — رئیس کلاں کار عالم پسند
در اسکا ہے بابِ سجودِ سراں — رہیں حکم کش اس کے زور آوراں
صدا وہ رہے یوں ہی دشمن شکار — جہاں میں سخن ہے مرا یادگار

(دیکھو صفحہ ۵۵۲)

(۳) نبے آصف الدولہ داد گر — سخنور نواز اور عاشق ہنر
وہش سے جہاں اسکی رونق پذیر — وزیرانِ دستور دین وزیر
کریمی کرے تو جہاں در جہاں — کفِ جود خورشید سا زر فشاں
سراپائے احساں سراپای ہمم — ہمہ تن مروت سراسر کرم
ہمیشہ رہے گرم سیر و شکار — یہ حرف دوات ہی ہے یادگار

(دیکھو صفحہ ۵۶۲)

اس کے برخلاف سودا نے اپنی صیدیہ مثنوی کے آغاز ہی میں نواب کی تعریف کردی ہی (جس کے متعلق شعار بیش کردیے جا چکے ہیں) اور مثنوی کو ایسے بیان پر ختم کردیا ہے جو مزید تفصیل کا خواہشمند ہے۔ ممکن ہی کہ انہوں نے میر کے صید نامے دیکھنے کے بعد خود بھی کوئی صید نامہ لکھنے کا خیال کیا ہو لیکن کسی وجہ سے اس کو اختتام تک پہنچانے کے قابل نہو سکے ہوں۔

میر کے صید ناموں کی غیر معمولی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہی کہ شاید انہیں ان کے باعث نواب سے کسی بڑے انعام کی امید ہو کیونکہ انھوں نے اپنی انہی مثنویوں کے آخر میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ :— اس وقت تک مجھے باوجودیکہ اچھا شعر گو ہونے کے لکھنؤ میں کوئی قدرداں نہیں ملا، لہٰذا پھر اپنے ان شاہکاروں کو لیکر دہلی لوٹ جانا چاہیے — میر کے اس مضمون کے شعر ملاحظہ ہوں:-

بہت کچھ کہا ہے کرو میر بس — کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا — خریدار لیکن نہ پایا گیا

شاعِ ہنر پھیر لیکر چلو، بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

(دیکھو صفحہ ۵۶۳)

ان مثنویوں کی کامیابی کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ نواب آصف الدولہ کی توصیف کے لئے سودا جیسی زبردست حریہ پر قادر تھے میر اسی سے محروم تھے۔ وہ غزل گو شاعر تھے، باطنی کیفیتوں کو ظاہر کرنا اور خوبی سے ظاہر کرنا ان کی صنفِ شاعری کی معراجِ کمال تھی۔ انہیں قصیدہ گوئی میں سودا کی برابری ہرگز نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ سودا کے قصیدے اگرچہ متعدد ہیں لیکن خاص نواب آصف الدولہ کی تعریف میں انہوں نے بڑے بڑے چھ قصیدے لکھے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:-

۱- پہلا قصیدہ کلیات کے صفحہ ۱۲۳ پر شروع ہوتا ہے اس کا مطلع یہ ہے:-

گر فلک اب یہ مہرباں ہوئے جوں تگرگ ابر دُرافشاں ہوئے

اس میں کل (۶۰) شعر ہیں۔

۲- دوسرا قصیدہ کلیات کے صفحہ ۱۲۵ پر سے شروع ہوتا ہے اس کا مطلع یہ ہے:-

کیا قلم کو رقم سے ہے منظور کہ صریر اس کے سے ہے دل کو سرور

اس میں کل (۳۸) شعر ہیں۔

۳- تیسرا قصیدہ کلیات کے صفحہ ۱۲۷ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:-

سودا پئے جیب جنوں نے کیا خوابِ خور حرام لائی گھر اس طبیب کے لے عقل جن کا نام

اس میں کل (۴۴) شعر ہیں۔

۴- چوتھا قصیدہ کلیات کے صفحہ ۱۲۸ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:-

تیرے سایہ تلے ہے تو وہ مہنت پشہ کر جائے دیو دار سے لڑنت

اس میں کل (۲۶) شعر ہیں۔

۵- پانچواں قصیدہ کلیات کے صفحہ ۱۲۹ سے شروع ہوتا ہے۔ اسکا مطلع یہ ہے:-

کیا تجھ کو سبھی مسند ایوان وزارت میں شوکتِ شاہی کہوں یا شانِ وزارت

اس میں کل (۱۰) شعر ہیں۔

۶- چھٹا قصیدہ عید رمضان کی مبارکباد ہے۔ اور پانچویں قصیدہ کے بعد ہی سے شروع ہوتا ہے

اس کا مطلع یہ ہے ؂

صیام عید ہے دل ہے خوشی سے الامال ۔۔۔۔۔ ہے طرب سے ہیں سب مست اپنے اپنے حال

اس میں کل (۱۱) شعر ہیں۔

سودا کے ان قصیدوں کے مقابلہ میں ہمیں میرؔ کی کلیات میں آصف الدولہ کی مدح کے متعلق صرف دو قصیدے دستیاب ہوتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

۱۔ پہلا قصیدہ کلیات کے صفحہ (۱۲) سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں کل (۴۰) شعر ہیں۔ جو دو مطلعوں میں تقسیم کردئے گئے ہیں اس کا پہلا مطلع ہے ؂

رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب ۔۔۔۔۔ آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب

اور دوسرا مطلع ہے ؂ اے ترے ڈر سے جگر شیروں کے آب ۔۔۔۔۔ دشمنوں کو دو بہا نہ اضطراب

۲۔ دوسرا قصیدہ کلیات کے صفحہ (۵۲۱) سے شروع ہوتا ہے اور قصائد کے سلسلہ میں شامل رہنے کی بجائے ترکیب بند کے بعد سے شروع کیا گیا ہے۔ اس میں کل (۵۸) شعر ہیں جو تین مطلعوں پر منقسم ہیں اسکا پہلا مطلع یہ ہے ؂ ہوا کئے ہیں زبس شکوہ فلک تحریر ۔۔۔۔۔ سیہ ہی کاغذ مشقی کے رنگ لوح منیر

ان دو قصیدوں کے علاوہ ایک اور قصیدہ بھی کسی بادشاہ کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ لیکن صاف طور پر نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس کی مدح میں ہے مدحیہ اشعار میں نہ آصف الدولہ کا نام ہے اور نہ کہیں ان کیطرف واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ آصف الدولہ ہی کی مدح میں لکھا گیا ہو اس میں (۷۰) شعر ہیں اور کلیات کے صفحہ (۵) سے شروع ہوتا ہے۔ چار مطلعوں پر منقسم ہے۔ پہلے کے دو مطلعوں میں تشبیب ہے اور تیسرے مطلع سے ممدوح کی تعریف کی طرف گریز کیا ہے۔ اسکا پہلا مطلع یہ ہے ؂

جو پہونچی قیامت تو آہ و فغاں ہے ۔۔۔۔۔ مرے ہاتھ میں دامن آسماں ہے

بہت کم قصیدے لکھنے کے باعث میرؔ کے لئے ضروری تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اس نوع کی کمزوری کی تلافی کرائیں۔ چنانچہ انھوں نے مثنویوں کے ذریعہ سے اس کام کو سرانجام کرنا چاہا اور بڑی بڑی چھ مثنویاں لکھیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ شکار نامہ نمبر (۱) اس میں تقریباً (۸۰) شعر ہیں اور یہ مثنوی کلیات کے صفحہ (۵۴۱) سے شروع ہوتی ہے۔

۲۔ " " (۲) " " (۳۰۰) " " " " (۵۴۴) " "

۴- صیدنامہ (۳) اس میں تقریباً (۳۳۵) شعر ہیں اور یہ مثنوی کلیات کے صفحہ (۵۵۳) سے شروع ہوتی ہے۔
مثنویوں نمبر (۲) اور (۳) میں کئی غزلیں بھی شامل ہیں۔

(۴) کدخدائی نواب۔ اسمیں تقریباً (۶۳) شعر ہیں اور یہ مثنوی کلیات کے صفحہ (۵۶۴) سے شروع ہوتی

(۵) آصف الدولہ کا ہولی کھیلنا۔ اسمیں تقریباً (۴۶) شعر ہیں اور یہ مثنوی کلیات کے صفحہ (۵۷۰) شروع

(۶) ساقی نامہ۔ اسمیں تقریباً (۱۱۸) شعر ہیں اور یہ مثنوی کلیات کے صفحہ (۵۷۹) سے شعر ہیں۔

ان کے علاوہ میر کے کلیات میں دس شعر کا ایک قطعہ بھی پایا جاتا ہے۔ جو نواب آصف الدولہ بہادر کے گھوڑے کی تعریف میں لکھا گیا ہے اور جو صفحہ (۵۴۳) سے شروع ہوتا ہے۔

اگرچہ میرزا رفیع سودا نے کئی بڑی بڑی مثنویاں لکھیں لیکن اس خاص موضوع سے متعلقہ مثنویوں میں وہ میر کے مقابلہ میں کامیابی نہیں حاصل کر سکے۔ ان مثنویوں میں میر کا خارجی حالات کو نہایت خوبی سے اور خاص طور پر پیش کرنے کی کوشش کرنا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ درحقیقت اپنی اس کمزوری کو دور کرنا چاہتے تھے جس کے باعث وہ بہترین قصیدے نہیں لکھ سکتے تھے اور جس کی وجہ سے سودا نے اردو زبان کے شاعروں میں ایک خاص اہمیت حاصل کرلی ہے۔

میر اور سودا کی صیدنامہ کی مثنویوں پر ایک عام تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد ہم ان کا بالمقابلہ مطالعہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ میر کے صیدناموں کی اہمیت اور سودا کے صیدنامہ پر ان کی فوقیت ظاہر ہو جائے۔

۱:- اس قسم کی کوشش کرتے وقت ہمیں سب سے پہلے جو چیز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ سودا کی مثنوی میں پہلے ہی سے نواب کی مدح شروع کر دی گئی ہے جو سودا کی قصیدہ گو فطرت کا ایک ٹھیک ٹھیک مظہر ہے۔ اس کے برخلاف میر کے تینوں صیدنامے نہایت آزادانہ اور بے لوثانہ انداز میں شروع ہوتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ہر ایک مثنوی کے آخر میں نواب کی تعریف ضرور کی ہے لیکن سودا کی آغازی تعریف کی طرح ان تینوں تعریفوں کے پڑھنے سے ذوق سلیم کو گرانی نہیں محسوس ہوتی۔

۲:- جس وقت نواب آصف الدولہ کی فوج جنگل میں داخل ہوتی ہے اسوقت کا نہایت نفیس اور موافق فطرت مرقع میر کی ہر مثنوی کے آغاز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً پہلی مثنوی کے آغاز میں وہ کہتے ہیں ؎

روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ   لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانے سے جانے لگے   وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے
سن آواز شیران نر ڈر گئے   پلنگ و نمر خوف سے مر گئے   (صفحہ ۵۴۱)

دوسری مثنوی میں لکھتے ہیں ؎

روانہ ہوئی فوج دریا مثال — نہنگوں کی اب کھینچی جاوے گی کھال
گیا شور تا آسمانِ بریں — ہوئی گرد افواج گردوں قریں
زمیں ہو گئی جائے خوف و خطر — فلک کو لگے دیکھنے شیر نر
چڑھا اس بسکہ دریائے فوج گراں — اتر ہاتھیوں کی گئی مستیاں
دبے چپ لگا چلنے بھیڑوں کی چال — پریشاں ہے گرگ بغل زن کا حال
پلنگوں نے کہسار کی راہ لی — نہنگوں نے دریا کی جا تھاہ لی
بگھیرے جو تھے دام سے چھا گئے — کشف نیچے ڈھالوں کے گھبرا گئے
درندے پرندے چرندے کچھے — گزندوں کے منہ گرد نیچے دبے (صفحہ ۵۴۴)

تیسری مثنوی کے آغاز ہی شعر ملاحظہ ہوں ؎

رواں بحر لشکر ہوا موج موج — گئی چشم خورشید تک گرد فوج
بحار و صحاری پہ ہے عرصہ تنگ — نمایاں، سراسیمہ ہیں، واں پلنگ
پہن بیٹھے ہیں شیر بیری لباس — کریں لوگ شاید فقیری کا پاس
چکارے ہرن دونوں اندیشہ مند — دلوں میں ہراس کمان و کمند
کہیں گرگِ وادی کو فکر گریز — نظر آیہ ہر او دبر کرے شیر تیز
بنوں میں ہے آشوب، کوہوں میں ڈر — بیاباں وطن سارے گرم سفر
کہیں امن ہو تو کہوں واں گئے — نکل آ گھروں سے پریشاں گئے
اسد کے نہ شیرانہ ہنکار ہے — نہ گفتار کو تاب رفتار ہے
جہاں کے تہاں فکر ہی میں کھڑے — کہ ڈنگل ہے جنگل میں کیا بن پڑے
ہوا دود بارود سے تیرہ رنگ — صدائے تفنگ و صدائے تفنگ
وحوش بیاباں کو دہشت غضب — ہوا میں کھڑکتے ہیں پتے کے سب (صفحہ ۵۵۲)

ن سے مقابلہ کرنے کے لئے سودا کے صید نامہ میں کوئی سماں نہیں پایا جاتا۔ انہوں نے شکار کرنے کا ذکر فوراً کا چھیڑ دیا ہے اس حقیقت حال کی طرف توجہ نہیں کی کہ جب ایک دم جنگل میں فوج گھس پڑے گی تو وہاں کے

انسانوں سے ناآشنا رہنے والے جانوروں کی کیا حالت ہوگی۔

۳۔ سودا کا صید نامہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا لکھنے والا ایک قصیدہ گو شاعر ہے۔ اس میں میر کے صید ناموں کی طرح موافق فطرت اشیا کے بہت کم مرقعے کھینچے گئے ہیں۔ ہر جگہ شان و شوکت اور علمیت جلوہ گر رہتی ہے جو قصیدہ گوئی کی معراج کمال ہے۔ کیا حسب ذیل اشعار کائنات کی حقیقتوں اور اصلی فطرت کی صحیح طور پر ترجمانی کر سکتے ہیں۔

نہ دیکھا جو گاؤ زمیں نے پناہ — قدم پیچھے دے اس کے اپنی پناہ
کیا دشت و بیشہ جو شیروں سے پاک — پڑی شیر کے ارنے کی یہ دھاک
رکھا نام پھر اس نے از خوف جاں — کہ جس شخص کا نام تھا شیر خاں
رہے دیکھ حیران صغیر و کبیر — جب آگے سے اٹھ بھاگے قالین کے شیر
زمیں سے فلک تک جو پہونچا یہ ذکر — پڑی اپنی برج اسد کو بھی فکر
اگر دیو دو دو داں جو آیا نظر — نہ چھوڑا غرض یہ اسے بوجھ کر (صفحات ۱۵، اور

اگرچہ میر کے صید ناموں میں بھی مبالغوں، صنعتوں، اور مخالف فطرت عنصر سے آلودہ اشعار ڈھونڈھنے سے حاصل ہیں لیکن سودا کے یہاں ان کی جو کثرت ہے اور جو بھدا پن پایا جاتا ہے اس سے میر کا کلام قطعاً پاک ہے۔

۴۔ سودا کے صید نامہ کا زیادہ حصہ ہاتھیوں — اور بالخصوص ایک خاص ہاتھی — کے شکار کی تو پر مبنی ہے۔ ان شعروں میں وہ کہتے ہیں کہ "واپسی کے وقت کئی ہاتھیوں کو زندہ پکڑ کر حلقہ بگوش لائے اور اگرچہ ہاتھی اچھے اور سواری کے موزوں ہے لیکن ان میں سے ایک ہاتھی ایسا خوبصورت ہے کہ میں اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔ نو آسمانوں کے نیچے ایسا ہاتھی کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اس کا قد و قامت اسقدر بلند ہے کہ اسے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا پہاڑ کو زنجیروں میں کھینچ لا رہے ہیں" اس کے بعد آخری دو شعروں میں اس طرح فرماتے ہیں کہ ؎

نہیں اس کی خوبی میں ذرہ قصور — خدا چشم بد سے رکھے اس کو دور
ترے سائے میں یہ بڑھے تا ابد — تجھے پرورش کی رہے اسکے کد

سودا کے اس بیان کے مقابلہ کے لئے میر کے تینوں صید ناموں میں سے ہاتھی کے متعلق کافی شعر حاصل کئے جا سکتے ہیں مثلاً صرف پہلے صید نامہ میں (۱۹) شعروں میں ہاتھی کے شکار کا سماں دکھایا گیا ہے۔

میر اور سودا کے اس قسم کے بیانوں کا زبردست فرق یہ ہے کہ سودا نے ہر چیز کے شکار کی صرف

تعریف کردی ہے، ان کا کامل مرقع نہیں پیش کیا۔ میر نے ہر قسم کے جانور کو شکار کرنے کے متفرق طریقے بتلانے کے علاوہ شکار کے وقت کا سماں بھی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر کر دیا ہے۔

ہاتھی کے شکار کے بعد میر کے تفصیلی مرقعوں میں مچھلی کے شکار سے متعلق بھی کئی شعر دستیاب ہو سکتے ہیں۔ (دیکھو صفحات ۴۲۲ھ اور ۴۲۵ھ) مچھلی کے شکار کے جسقدر طریقے اس زمانہ میں رائج تھے ان سب کے متعلق میر نے نہایت قابل وقعت مواد پیش کیا ہے۔

۵۔ آخر میں ہم میر کے اس زبردست کارنامہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہتے ہیں جس نے ان کو سودائے مخصوص جو لانگہ میں بھی دوش بدوش رہنے کے قابل بنا دیا ہے۔ یہ زبردست کارنامہ وہ متفرق تصویریں ہیں جو میر نے اثنائے شکار کے واقعات اور تجربات کے متعلق پیش کئے ہیں۔ پہاڑوں کی دلکشیاں، ان کی سر بفلک چوٹیوں کے نظر فریب مناظر گھنے جنگلوں کے خوفناک رستے، چٹیل میدانوں کی تکلیف دہ منزلیں اور دلکش و سرسبز مرغزاروں کے قیام کی رنگ رلیاں، بارش کی کیفیتیں اور سردی کی شدتیں فطرت کے وہ حقیقی جلوے ہیں جن کا اظہار کرنا واقعی اصلی شاعری ہے اور وہی شاعر کامگار شاعر کہلایا جا سکتا ہے جو انکی سچائی کے ساتھ ترجمانی کرنا جانتا ہے۔

ہمارے اس مضمون میں اسقدر وسعت نہیں ہے کہ ہم میر کی بعض طویل فطری تصویروں پر ایک تفصیلی نظر ڈال سکیں اس لئے ہم اس سلسلہ میں صرف ایک دو بیانات کے متعلق کچھ کہدینا چاہتے ہیں:-

میر نے ایک دفعہ ایک مہیب دریا کا سماں پیش کیا ہے جو نواب آصف الدولہ اور ان کی فوج کے رستہ میں حائل ہوتا ہے۔ اس کے تلاطم کو دیکھ کر نواب کے تمام ساتھی اس کے عبور کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر عوام کی جو ذہنیت ہوتی ہے اس کا حال اور پھر نواب کا اس کے عبور کرنے میں پہل کرنا اور اس کے بعد دریا کا بہت پایاب ہو جانا ان واقعات کو میر نے جس طریقہ پر بیان کیا ہے وہ نہایت فطری ہے۔ اس کے بعد شعر ملاحظہ ہوں:-

ہوا حائل راہ بحر عمیق	کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق
قریب آکے اتری پہ خائف تھی فوج	کہ بیٹھا دل اٹھتی تھی ہر ایک موج
مہیب اور آلودۂ خاک آب	بعینہ پھٹی آنکھ تھا ہر حباب
غضب لہر غیرت بلا جوش پر	تلاطم قیامت لئے دوش پر

چلے بس تو کچھ کوئی چارا کرے — گر دیکھ ہی کر کنارا کرے
تردد میں ہر اک کہ ہوں کیونکہ پار — کنارے پہ سرگشتہ گرداب وار
رواں آب ایسی روانی کے ساتھ — کہ جوں تشنگی ہو جوانی کے ساتھ
لگے باد چلنے جہاں شور تھا — کہ کم آب میں بھی بڑا زور تھا
تأمل سے اقبال نواب دیکھ — توقف کیا پہلے تو آب دیکھ
پھر اس پار جا کر اشارہ کیا، — کہ لشکر نے وہیں گزارا کیا
شتابی اترنے لگے لشکری — نہ خوش آب کا وہ نہ ویسی تری
کچھ اک ناؤ میں لے کچھ شتر کاٹ کر — شتابی سے دریا کہیں پاٹ کر
اترنے لگا لشکر بے کراں — کراں تا کراں تھا یہ محشر عیاں (صفحہ ۵۴۳)

شکار کے زمانہ میں ایک دفعہ شدت کی بارش بھی ہوئی۔ اس کی وجہ سے لشکریوں کی جو حالت ہوئی اسکا بھی آسیر نے ایک نہایت لطیف اور حقیقی مرقع پیش کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

پھر دن سے بارش لگی ہونے زور — رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور
ہوئے خیمے پانی کے اوپر حباب، — سب اسباب لوگوں کا تھا زیر آب
نہ پوچھ اور اسباب مردم کا حال — نہ چادر رہی خشک نے کوئی پال
قناعت اور تنبول سب سڑ گئے — کھڑے تھے جو کنڈلے اتر سب گئے
پھر اپانی لشکر میں پھیلا ہوا — اگر فرش بستر تھا تھیلا ہوا
ہوا سرد از بس ہوئی ایک بار — کلیجوں کے ہوئی تھی برچھی سی پار
پھرے بادلے لوگ منہ ڈھانپتے — جگر چھاتیوں میں رہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کید ہر شکار — ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار
بہت پیر جیب جی کو تجنے لگے — جوانوں کے بھی دانت بجنے لگے
سر تیغ خورشید پنہاں ہوا — نہ دیکھا مگر روئے جاناں ہوا
بہت اسپ اشتر موئے پاؤں پیٹ — نکالا وہیں خیمہ سے گھسیٹ

(صفحات ۵۴۶ - ۵۴۷)

اردو شاعری کی بدقسمتی سمجھیے یا اردو والوں کی تنگ نظری کو انہوں نے کائنات کی نیرنگیوں اور فطرت کی بوقلمونیوں مرقعوں کی طرف کبھی توجہ نہیں کی جو ان کے شاعروں کے کلیات میں کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے اگر ہمارے شاعروں کے دیوانوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور ان میں سے اس زبردست نوع شاعری کے نمونوں کا انتخاب ہو تو ہمیں یقین ہے کہ ایک ایسا کافی ذخیرہ فراہم ہو جائے گا جو کسی ترقی یافتہ زبان کے لئے افتخار ہو سکتا ہے۔

سودا، میرحسن، انشا، نظیر اکبرآبادی، میرانیس اور مرزا دبیر کی خارجی تصویریں تو خیر اس صنعت شاعری بہترین نمونے ہیں لیکن ہمارے وہ یورپ زدہ اہل زبان جو یہ سمجھتے ہیں کہ اردو شاعری صرف مشق عاشقی داستان اور گفتگو پر مشتمل ہے غالباً یہ معلوم کر کے متحیر ہو جائیں گے کہ میر جیسا داخلی حالات کی ترجمانی کرنے شاعر بھی کن پایہ کے خاص مرقعے پیش کر سکتا ہے۔

غزل

(جناب میاں احمد ابراہیم پٹیل احمد چشتی نظامی از بمبئی)

اللہ رے حسن یار ہے کیا حسن یار بھی
پنہاں بھی اہل دید سے ہے آشکار بھی

نکلے گا آپ ہی کی طلب میں ہمارا دم
کوچہ میں آپ ہی کے بنے گا مزار بھی

پیدا ہو چشم دل تو یہ پوری امید ہو
آساں نہیں ان آنکھوں سے دیدار یار بھی

رہتا ہوں شادکام جدائی میں صبح و شام
کتنی لطیف شے ہے غم وصل یار بھی

تیری نگاہ شوخ کے مانند آج کل
ملتا نہیں مزاج دل بے قرار بھی

پچھتائے آج شکوۂ بیداد کر کے ہم
دیکھا گیا نہ آہ انہیں شرمسار بھی

بدنام بھی ہمیں ہیں ہمیں نیک نام عشق
ناکام بھی ہمیں ہیں ہمیں کامگار بھی

تکلیف ہجر یار ہے احمد تو ایک دن
ہوگی نصیب راحت دیدار یار بھی

ادبیات

شہید تغافل

"بالم"

(بہ سلسلہ ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء)

دل گرفتہ منظور کل جہاں دل کھو کر آیا تھا آج پھر وہاں گیا لیکن آج کل کی طرح بیمن نہ تھا اور حامد نے
کل سے زیادہ تپاک سے خیر مقدم کیا۔ دیر تک علاج معالجہ اور کارخانہ کی نسبت آپس میں گفتگو ہوتی رہی
ادہر کی ہی باتیں ہوئیں مگر اسی دوران میں منظور کمرے میں بار بار کچھ متجسسانہ نظر سے بھی دیکھتا جاتا تھا
آخر حامد متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور کہنے لگا "حضور کو کسی چیز کی خواہش تو نہیں؟ منظور نے پھر کمرے میں ایک
نظر دوڑا کر کہا "ہاں کچھ یوں ہی سی پانی کی خواہش تھی مگر اب کچھ نہیں" حامد نے نہایت خلوص سے
ابھی حاضر ہوتا ہے" کہہ کر اپنی نحیف آواز سے سلیمہ کو پکارا جو برآمدے میں آ کر کسی قدر آڑ میں چپ چاپ
ہو گئی حامد نے پانی لانے کی فرمایش کرتے ہوئے کہا "آپ ہمارے مربی و محسن ہیں کسی صاف گلاس میں
پانی لے آؤ" سلیمہ لپک کر دوسرے کمرے میں گئی اور جلدی سے ایک بلوری گلاس کو صاف کر
اماں جان سے مردانہ کمرے میں پانی دے آنے کو کہا مگر ماں نے اسی کو لیجانے کو کہا۔ اگرچہ سلیمہ
لیکن پھر نسوانی شرم نے مجبور کیا اور قدم آگے نہ بڑھ سکا تھا اپنے مریض والد کی دوسری آواز پر اپنا
کیا اور منہ پر زیادہ تان کر اپنے تشنۂ دید عاشق کے سامنے نہایت لجاجت سے پیش کیا۔ منظور نے
مہوش کے ہاتھ سے جام آب حیات لیکر نوش کیا بلکہ کن انکھیوں سے ڈوپٹے میں چھنا ہوا شربت دید
کیا لیکن اب اس کی حالت متغیر ہو گئی شدت درد سے بیتاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ درد نے اٹھ کر بٹھانا چا
نے بیٹھنے نہ دیا، مریض کو تسلی بخش الفاظ سے ہمت دلا کر رخصت ہو گیا، اور سلیمہ کی حسرت بھری نگا

صحن کے دروازہ تک مشایعت کی۔

نگاہوں کی مقناطیسی کشش کہئے یا دل کی برقی قوت، جسنے منظور کو کئی بار مڑ مڑ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ نقصد آگے چلنے کا کرتا تھا لیکن قدم تھے کہ پیچھے ہی پڑتے جاتے تھے۔ بدقت تمام گرتے پڑتے مکان تک پہنچا، جوں جوں وقت گذرنے اور تنہائی ہونے لگی منظور کی حالت دگرگوں ہونے لگی، لب سے آہ فلک سوز اور آنکھوں سے اشک خونیں جاری ہوگئے نہ کسی کروٹ چین نہ کسی پہلو قرار غرض اسی خلفشار میں رات بسر کی۔

صبح کو پھر وہ تنہا اور خیال جاناں نہ کسی کی بات ہی پسند آتی ہے نہ دوستوں میں جی بہلتا ہے اور نہ کاروبار میں جی لگتا ہے البتہ خیال یار سے دل کو یک گونہ تسکین سی ہوجاتی ہے۔ طواف کوئے جاناں کا کئی بار ارادہ کرتا ہے لیکن پھر کسی خیال کے آنے سے فسخ کر دیتا ہے۔

ایک ہفتہ سے زائد عرصہ ہوگیا منظور آستان یار پر نہیں گیا، اگرچہ یہ مدت بہت قلیل ہے لیکن حسرت نصیب اور فرقت زدہ عشاق کے لئے تو قیامت سے کم نہیں۔ منظور نے بڑے صبر و استقلال سے کام لیا لیکن محروم دید سلیمہ کی حالت قابل رحم تھی، پہلو میں ایک پر لطف درد اور درد میں ایک مسرت بخش لذت محسوس کر رہی ہے، جب آتش عشق کے شعلے دل میں بھڑک اٹھتے ہیں تو لب سے آہیں بشکل دود نکلتی ہیں، اور آنکھوں سے ساون بھادوں برسنے لگتا ہے ہر وقت چشم براہ اور گوش برآواز رہتی ہے لیکن "جنت نظر" اور "فردوس گوش" سے محروم رہتی ہے۔

اپنی ہمراز سہیلی گلنار سے پہروں ذکر حبیب رہتا ہے جس سے کچھ تسکین سی ہوجاتی ہے ہرچند گلنار یقین دلاتی ہے کہ آگ کی آگ ایک ہی طرف نہیں ہوتی، منظور بھی لازمی طور پر آتش عشق و محبت میں جل رہا ہوگا مگر پاس ننگ و ناموس کی وجہ سے یا افشائے راز کے خیال سے دانستہ احتراز کرتا ہوگا لیکن سلیمہ ہے کہ اس کو کسی طرح یہ یقین نہیں آتا کہ وہ میری شمع حسن کا پروانہ اور میری زلف گرہ گیر کا اسیر ہوگیا ہوگا اس طرف منظور! ناتجربہ کار منظور! بھی اسی ادھیڑ بن میں پڑا ہوا ہے کہ یہ کیونکر باور کرلیا جائے کہ ایک مرتبہ اور صرف ایک مرتبہ کے دیکھ لینے سے وہ بھی میری طرح بیتاب ہوگی اور اس پر بھی عشق کا جادو چل گیا ہوگا!

منظور کبھی کبھی اپنی خیالی تدابیر کی ناکامیوں پر غور کرتا تو اس طرح دل ہی دل میں کہتا :-

"میں کیوں عیادت کے لئے گیا اور بیٹھے بٹھائے اپنی جان کو مبتلائے مصیبت کیا لیکن آہ! کیا خبر تھی کہ متاع صبر و ہوش کو لوٹ لینے والا کوئی اس کمین گاہ میں پوشیدہ ہوگا اور یوں اچانک

حملہ آور ہوگا! ـــــ لیکن شکر ہے کہ میں جس فاتح کا مفتوح ہوں وہ ایسا فاتح ہے کہ اگر اس کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے سورما اور شجاع آئیں تو ان کو بھی اپنے اپنے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آئے ـــ ہائے! ظالم نے کس بلا کا حسن پایا ہے، واللہ یہ حسن اگر کلیوپطرہ کی طرح اپنے کسی زبردست عزم کو لیکر منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہو تو عالم کون وفساد کو تہ وبالا کر ڈالے اور تمام دنیا اسی کا لوہا مانے، ہائے! اس شخص کی زندگی بھی کیسی قابل رشک ہوگی جو رات کو اس کے خواب آور گیسوئے عنبرین کے زیر سایہ موخواب اور صبح کو اس کی انگڑائی کے ساتھ بیدار ہوگا!! کیا ممکن نہیں کہ وہ خوش قسمت شخص منظور ہی ہو! ـــ ہرچند وہ غریب خاندان کی لڑکی ہے مگر خذف پاروں میں گوہر یکتا اور سنگ ریزوں میں لعل بے بہا ہے، یہ حسن! جو شاہوں کے محلوں کی زینت ہو سکتا ہے کیا ہر ایک کو میسر ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! لیکن منظور! ایک دن ضرور اس پیکر حسن و مجسمہ شباب پر متصرف ہوگا!"

جہاں اس کے یہ خیالات تھے وہاں ایک یہ بھی ل بھی اس کی آرزوؤں کا خون کئے بغیر نہ رہتا تھا:- کہ ایک مجہول الاحوال اور ادنیٰ درجہ کے ملازم پیشہ شخص کی لڑکی سے رشتۂ مناکحت جوڑنے سے وہ معززین شہر کی نظروں سے گر جائیگا، برادری میں حقیر اور احباب میں انگشت نما ہو جائیگا" یہی ایک ایسا خیال تھا جو اس کے عزائم کو متزلزل کر دیتا تھا اور اس دوراہہ پر پہنچکر اس کا پائے ثبات ڈگمگا جاتا تھا۔

منظور سات آٹھ روز کی غیر حاضری کے باوجود خادم کی طرف سے غافل نہیں رہا برابر اس کے علاج معالجہ کے لئے ڈاکٹروں کو بھیجتا رہتا ہے اور ان کی فیس ادا کرتا ہے مگر یہ سب کچھ کیا از روئے ہمدردی ہے؟ اس کا جواب اگرچہ مشکل نہیں ہے تاہم ماننا پڑے گا کہ اس نے بیحد ہمدرد اور بے قرار دل پایا تھا۔

چونکہ نسبتاً مرد سے عورت کا جذبہ عشق زیادہ قوی اور صادق ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج منظور کے دل میں آستانِ دلربا پر جانے کا بار بار خیال پیدا ہوتا ہے وہ جانے کے لئے آمادہ ہی تھا کہ اسکو ڈاکٹر کی طرف سے اس مطلب کی چٹھی ملتی ہے کہ "مریض کی حالت ناگفتہ بہ ہے وہ اکثر آپ کو یاد بھی کرتی ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو شام کے پانچ بجے میرے ہمراہ چلیں"

اب کیا تھا منظور کو معقول وجہ ہاتھ آگئی۔ بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا تھا کہ کب وقت آئے اور

وہ مریض کے گھر یا در جاناں پر جائے خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ جلدی سے ڈاکٹر کے گھر پہنچا اور اس کے ہمراہ روانہ ہوا مگر پہلو میں تڑپنے والا دل اور دل میں ایک رنگین آرزو لئے ہوئے

آج حامد کا حال زیادہ تشویشناک و زبون ہے اور اب اس کی زندگی کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ منظور خاموش مریض کے قریب ایک صوفہ پر بیٹھا ہے اور ڈاکٹر مریض کے معائنہ میں مصروف ہے۔ حامد ایک کھٹیا پر بےحس و حرکت آنکھیں بند کئے ہوئے پڑا ہے، کمرے میں یاس و حرماں کا عالم چھایا ہوا ہے در و دیوار سے اداسی ٹپک رہی ہے اور زنانہ کمرے میں قیامت کا سماں ہے سلیمہ اور اس کی ماں نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر لی ہیں کیونکہ انکو بھی آج حامد کی زندگی سے کچھ یاس سی ہو گئی ہے — اگر منظور انکی ایسے وقت میں دستگیری نہ کرتا تو خدا جانے ان غریبوں کا کیا حشر ہوتا! اس میں شک نہیں کہ حامد کب سے اپنی بیوی بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چل بسا ہوتا لیکن خدائے مسبب الاسباب ایسے بے کسوں اور لاچاروں کے لئے کوئی نہ کوئی سبب ضرور بنا دیتا ہے جس سے ان کی مایوسیاں امیدوں سے بدل جاتی ہیں۔

مریض نے طویل سکوت کے بعد ایک لمبی مگر نہایت نحیف سانس کے ساتھ آنکھیں کھولیں جس نے پہلے ڈاکٹر پھر منظور احمد کی طرف دیکھا اور منہ پر ایک تبسم کی لشاسی سی چھا گئی اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن لب ہل کر رہ گئے۔ منظور یہ سمجھ کر کہ مریض کچھ کہنا چاہتا ہے اس کے قریب آکر جھک گیا بالآخر بیمار حامد نے ایک آخری کوشش کر کے نہایت آہستگی سے کہا "آپکو دیکھ کر میری روح کو اطمینان ہو گیا — میری زندگی اب چند لمحات کی مہمان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری ایک آخری گذارش...... سلیمہ کو آپ کے سپرد......" خدا ترس منظور نے اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا مقصد سمجھ کر فوراً کہا "اطمینان رکھو میں اس کی کفالت کا ذمہ دار ہوں"

حامد گویا انہی الفاظ کے سننے کا منتظر تھا ایک زور کی ہچکی لی اور عالم جاودانی کی طرف چل بسا ڈاکٹر اٹھ کر چلا گیا اور منظور کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی جو مردانہ کمرے کی دیواروں کو چیرتی ہوئی زنانخانہ تک بھی پہنچ گئی موقع شناس اصغری اگرچہ بچوں کے سنبھالنے میں مصروف تھی لیکن وہ اس نازک حالت سے بے خبر نہ تھی جونہی اس کے کان پر منظور کی چیخ کی آواز پڑی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر دیوانہ وار مضطر و پریشان مردانہ کمرے تک چلی آئی جس بات پر کھٹکی تھی وہی سماں دیکھ کر نہایت کرب و ملال کے ساتھ ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگی سلیمہ بھی اپنی ماں کی آہ و زاری سن کر مردانہ کمرے میں گھس آئی اور شریک ماتم ہو گئی۔

خستہ و مغموم منظور بھی باچشم نم مکان سے باہر نکل آیا۔

جب اس سانحۂ جانکاہ کا حال منظور کی زبانی خدا بخش کو معلوم ہوا تو ایک معقول رقم اس کی تجہیز و تکفین کے لئے روانہ کی اور آیندہ کے لئے بھی بہت کچھ اطمینان دلایا۔

(۴)

سلیمہ کی کفالت کا ضامن منظور، نہایت پریشان اور عجب کشمکش میں مبتلا ہے، حامد کا چہلم بھی ہو گیا مگر ابھی تک دیدار یار سے محروم ہے اگرچہ اپنے وعدہ پر قایم ہے اور برابر حامد کے پس ماندوں کی خدمت کرتا رہتا ہے لیکن اس کے مکان پر کبھی نہیں جاتا اگر جانے کا قصد بھی کرتا ہے تو ہمت یاری نہیں دیتی اور یہ خیال کہ اب میرا وہاں جانا اس حیثیت سے کہ میں انکا معاون ہوں ان بیکسوں کو شرمندہ کرتا ہے علاوہ ازیں جس گھر میں جوان و حسین لڑکی ہو میرے بار بار جانے سے لوگوں اور ہمسایوں کو کیا گمان پیدا ہوگا خواہ مخواہ میں انگشت نما اور وہ بدنام ہوں گے اس کو وہاں جانے سے اور دیدار جاناں سے باز رکھتا تھا۔

دفتر میں جاتا تو بادل ناخواستہ۔ احباب سے ملتا تو شکستہ خاطر اور جب تک گھر میں رہتا نہایت مضمحل و پژمردہ کارکنان دفتر و کارخانہ ملنے جلنے والے اور گھر کے لوگ اس کی طبیعت کا یہ فوری تغیر دیکھ دیکھ کر محو حیرت تھے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ بعض بے تکلف دوست تو صاف صاف کہدیتے تھے کہ تم لاکھ چھپاؤ مگر عشق کبھی نہیں چھپ سکتا۔ یہ ہر وقت کی خاموشی اور کھویا ہوا سا رہنا صاف بتلا رہا ہے کہ کہیں دل کھو کر آئے ہو، مگر منظور ان کو ہنس کر ٹال دیتا اور کبھی اختلاج قلب کا بہانہ پیش کر دیتا تھا اور کسی کو تو اپنی عدم صحت کا ذکر کر کے پہاڑ پر جانے کا خیال بھی ظاہر کر دیتا تھا مگر اصل راز سے کسی کو آگاہ نہ کرتا تھا۔ اسی بیچینی کی وجہ سے اپنے آقا خدا بخش کے ہاں بھی اکثر کم جاتا تھا۔

آج بھی حسب دستور دفتر میں ملول و غمگین بیٹھا ہوا ہے بیچینی سے کرسی پر پہلو بدل رہا ہے کہ ایک نو عمر لڑکا دفتر میں آ کر منظور کو ایک چٹھی پیش کرتا ہے وہ جوں جوں اس کو پڑھتا جاتا ہے چہرے سے بشاشت اور مسرت مترشح ہوتی جاتی ہے۔ یک بیک خوشی سے باچھیں کھل گئیں اور تمام غم غلط ہو گیا چٹھی دو تین مرتبہ پڑھی اور پڑھ کر حامل رقعہ سے مخاطب ہوا۔

"صاحبزادے ہماری چٹھی بھی لے جاؤ گے"

لڑکے نے کہا "بے تو جاتا مگر وہ تو آج کہیں اور رہنے کو چلی گئی ہیں"

منظور نے گھبرا کر پوچھا کہیں اور! کیا اس نے آج ہی یہ رقعہ نہیں دیا؟

لڑکا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو آپا نے ابھی دیا ہے۔

منظور۔ اور تمہاری آپا نے بھی کچھ زبانی نہیں کہا۔

لڑکا۔ نہیں تو!

منظور نے لڑکے سے زیادہ استفسار مناسب نہ سمجھا اور اس کے ہاتھ میں پانچ روپیہ دیکر رخصت کر دیا۔ منظور ابھی ابھی جو چند لمحوں کی خوشی حاصل ہوئی تھی حزن و ملال سے یکسر مبدل ہو گئی۔ دل میں خیالات کا ایک حشر بپا ہو گیا بہت دیر تک سوچتا رہا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ خط کس کا ہے آخر سلیمہ کے مکان پر بھی ہو آیا اور لڑکے کے بیان کی تصدیق کر لی۔ مکان پر آکر اس خط کے معمہ کو حل کرنے میں مصروف ہوا اور اس طرح خیال آرائیاں کرنے لگا۔

یہ کیسے مان لیا جائے کہ یہ محبت نامہ سلیمہ ہی کے دست نازک کا لکھا ہوا ہے؟ یہ قطعی اس کے ہاتھ کی تحریر نہیں ہے جس قابلیت سے اسمیں اظہار خیال کیا گیا ہے وہ ہرگز صنف لطیف کی فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا! مگر مشکل یہ ہے کہ اس سے قبل میں نے اس کی کوئی تحریر بھی نہیں دیکھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میرے دوستوں میں سے کسی نے میری پریشانی کا اصل راز کسی صورت سے دریافت کر لیا ہو اور مجھے دام محبت سے آزاد کرنے کے لئے یہ سعی نامشکور کی ہو! بے شک یہی بات ہے! ورنہ وہ چٹھی میں ضرور اپنی روانگی کی اطلاع بھی تحریر کر دیتی۔ یہ ناممکن ہے کہ کہیں اپنی برادری میں کچھ دنوں کے لئے رہنے کو جانے کا خیال ہوا اور اس کی خبر خود اس کو نہ ہو اور اس طرح اچانک روانگی کے لئے تیار ہو کر چلی گئی ہو! بالفرض اگر ایسا ہی ہوتا تو بھی وہ اپنی سہیلی گلنار کو جس کی وساطت سے یہ چٹھی بھیجی گئی ہے ضرور اپنی روانگی سے مطلع کر جاتی اور یہ بھی غیر ممکن ہے کہ اگر کسی رشتہ دار نے آج ہی اپنی ہمراہ انہیں لے چلنے پر مجبور کیا ہو اور قریب ہی رہنے والی اور ہمراز دل سہیلی گلنار کو اس کی اطلاع نہ ہو ـــ کہیں گلنار نے تو میرا مضحکہ نہیں اڑایا؟! لیکن اس کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت اور پھر اس کو میرے ہی ساتھ ایسا کرنے کی کیسے جرات ہو سکتی ہے ضرور دال میں کالا ہے وہ پھر اس نامہ دلربا کو جیب سے نکال کر اس طرح پڑھنے لگتا ہے:۔

میرے ...... محسن!

"میں جس جذبہ سے متاثر ہو کر ان سطروں کے لکھنے پر مجبور ہوئی ہوں وہ اس قابل ہے کہ میں "بیگناہ"

تصور کی جاؤں۔ اگرچہ ہماری اسلامی اور ہندوستانی تہذیب اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم نامحرموں سے نامہ و پیام کریں۔ ہمارے نزدیک یہ فعل ایک بدترین جرم ہے لیکن اپنے محسن کے احسانات کا شکر گذار نہ ہونا اس سے بھی بدترین گناہ ہے، اس لئے پہلے مجھے اپنے بے پایاں الطاف و احسانات کا شکریہ ادا کرنے کی اجازت دیجئے اور پھر اپنے دل .... ہائے میرا قلم کچھ اور لکھنا چاہتا ہے لیکن آگے نہیں چل سکتا۔ کیا میں اس امر کے دریافت کرنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ میری نیاز مندیوں کی آپ کے دل ...... لیکن میری سہیلی گلنار (جس کے چھوٹے بھائی کی معرفت آپ کی خدمت میں یہ چٹھی پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہی ہوں) ہر چند تسلی دلاتی ہے کہ لاگ کی آگ ایک ہی طرف نہیں ہوتی لیکن آہ! میں اسکو کیا کروں کہ دل نہیں مانتا اور چاہتا ہے کہ خود آپ سے .... ہائے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا...... بس جی یہی چاہتا ہے کہ کاغذ پر بجائے سیاہ حروف کے سینے سے دل نکال کر رکھدوں کہ اظہار حال کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں — لیکن پھر شرم معلوم ہوتی ہے حالانکہ وہ سب کچھ لکھ رہی ہوں جو کچھ نہ لکھنا چاہئے تھا۔

ندامت اور خوف تو اس امر سے ہے کہ کہیں آپ میری امیدوں کو....... آہ اس دن کے لئے خدا مجھے زندہ نہ رکھے اس کے تصور ہی سے مری تو جان گھلی جاتی ہے — توبہ! توبہ!! ابھی سے یہ بدشگونی — معاف فرمائیں اگر یہ خیال سوء ظنی کے مترادف ہو! اب مجھ میں اس سے زیادہ لکھنے کی سکت نہیں۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں نے کن مصیبتوں سے ان سطور کو پورا کیا ہے؟ آہ!"

آپ کے ......کی

"س"

جذبۂ عشق سے متاثر ہو کر اظہار محبت کرنا نہایت بھدا اور بھونڈا طریقہ تھا اس لئے اظہار تشکر و امتنان کے بہانے کس عمدگی کے ساتھ جذبات دلی کا اظہار کیا ہے۔ یہ کہیں نہیں لکھا کہ میں تم کو چاہتی ہوں مگر اشاروں ہی اشاروں میں سب کچھ لکھدیا اور پھر کچھ لکھا بھی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ع

کاش سمجھے جذا کرے "کوئی"

وہ مجھ سے سُننا چاہتی ہے کہ ان کی نیاز مندیوں (ناز آفرینیوں) کی میرے دل میں کہاں تک وقعت ہے۔ پھر یہ بھی خواہش ہے کہ میں اس کے ساتھ اپنی محبت کا اس طرح اقرار کروں کہ اُسے یقین آجائے۔ مگر ساتھ یہ خوف بھی دامنگیر ہے کہ کہیں میں اس کی اُمیدوں کو پامال نہ کروں گا۔ اس کو بدشگونی سمجھنا پھر بدگمان ہو کر فوراً معافی چاہنا۔ ایک انفعال متالم سے عبارت کو ادھوری چھوڑ کر بھی مطلب کو ہاتھ سے نہ جانے دینا واللہ نسائیت کی مکمل تصویر ہے

لیکن کیا ایک عورت کی جس کی تعلیم نہایت معمولی ہے یہ تحریر ہو سکتی ہے؟ بہ فرض محال اگر ہے تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ سلیمہ ہی کے دست نازک کی تحریر ہے!! یہ سب تو ایک طرف لیکن سوال یہ ہے کہ اصغری اور سلیمہ کہاں غائب ہو گئیں!

یہی ایک ایسا سوال تھا جو اس کو بیچین کئے دیتا تھا اور کسی نتیجہ پر پہنچنے نہیں دیتا تھا۔ کچھ دیر تک ہاتھ پیچھے کئے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا پھر کسی خیال کے آتے ہی گھر سے نکل کر کہیں چلا گیا۔

(باقی)

غزل

(جناب محمد اسمٰعیل صاحب ہاتف بھوپالی)

وہ اب ہیں اپنے بسمل کا تڑپنا دیکھنے والے
کہاں ہیں حسنِ خود آرا کا جلوا دیکھنے والے

دلِ مُردہ کی ہر رگ اک جہانِ بے قراری ہے
یہ کس گہری نظر سے تو نے دیکھا دیکھنے والے

ہزاروں سال بیت اللہ میں رہ رہ کے نکلے ہیں
بتوں کو دیکھ او برقِ کلیسا دیکھنے والے

لرز جاتے ہیں، ڈرتے ہیں، دعائے خیر کرتے ہیں
مرے رونے پہ اس ظالم کا ہنسنا دیکھنے والے

یہاں سے گوہرِ مقصود حاصل ہو نہیں سکتا
خدا گھر میں جائیں موجِ دریا دیکھنے والے

نہ آ اہلِ نظر کے سامنے بے پردہ! اے ظالم!
ابھی بیہوش ہو جائیں گے جلوا دیکھنے والے

میں اپنی ابتدا کا آپ ہی انجام ہوں ہاتف
نہیں! میری محبت کا نتیجہ دیکھنے والے

مژدۂ حیات

(یہ نظم "جامعہ ملیہ دہلی" کے یوم تاسیس کے جشن میں پڑھی گئی تھی)

اے چرخ کے جور سہنے والے — دنیائے ستم کے رہنے والے
سیلاب فنا میں بہنے والے — گو کہہ گئے تجھ سے کہنے والے

رفتار گر تری وہی ہے
ملینت میں اثر تری ہی ہے

ساقیٔ فلک صراحی بردوش — ہاتھوں میں لئے ہیں جام پُرجوش
اس بزم سے آہ تو ہے روپوش — دنیائے وجود میں ہے خاموش

اس دور نشاط پر نظر کر
لے جام حیات تو بھی بھر کر

تو کیوں ہدف سنانِ غم ہے — کیوں کشتۂ خنجر ستم ہے؟
کیا دہر میں تو کسی سے کم ہے — دل تیرا صفا میں جام جم ہے،

ہر دم سے ترے فروغ ہستی
کیوں ہو گیا آشنائے پستی؟

ویرانے میں تیرے اب بھی ناداں — موجود ہیں دلکشی کے ساماں
مستور ہے خاک میں گلستاں — ہر ذرہ میں ہے ابھی نمایاں،

بھڑکا تھا جو طور پر شرارہ
چمکا تھا حرا سے جو ستارہ

اس نور سے پھر دیا جلا دے — پھر بزم جہاں کو جگمگا دے
پھر ظلمت جہل کو مٹا دے — پردہ رخ علم سے اٹھا دے

نکہت سے جہاں کو پاک کر دے
غفلت کی قبا کو چاک کر دے

اے جامعۂ ملیہ کے ایواں — سایہ میں ترے پلے جو انساں
بھر اُن کے دلوں میں نورِ ایماں — کر علم میں اُن کو فخرِ دوراں

گیتی پہ عمر وہ لے کے نکلیں
گردوں پہ قمر وہ بن کے نکلیں

ان کے دلِ مُردہ کو جلا دے — اک جامِ حیات کا پلا دے
آئینۂ حق نما دکھا دے — تو خاک کو کیمیا بنا دے

غرناطہ و قرطبہ کے ثانی
تا حشر ہو تیری زندگانی

محمود (اسرائیلی)

غزل

(از جناب حضرت اختر صاحب)

نشۂ الفت میں جو سرشار ہے — مست و بیخود ہے وہی ہشیار ہے
بحرِ الفت میں ہوا جو غوطہ زن — دو جہاں میں اس کا بیڑا پار ہے
وعدۂ فردا پہ ہو کیونکر یقیں — روز و شب ان کا یہی اقرار ہے
قدر کر ان آنسوؤں کی اے فلک! — دیدۂ تر ابرِ گوہر بار ہے
خندۂ گل دیکھ کر یاد آ گیا — یوں شگفتہ زخمِ دامندار ہے
کرتے ہیں وہ آج گل گشتِ چمن — مقتلِ عشاق لالہ زار ہے
یا الٰہی آج دل کی خیر ہو! — شوخیوں پر ابروئے خونخوار ہے

نام اختر ان کا ہے "آرامِ جاں"
ہم تو یہ کہتے ہیں "دل آزار ہے"!

تیتری

تیتری کب سے دیکھتا ہوں جب تجھے
دیکھ الفت ہے کتنی تجھ سے مجھے

مثل پریوں کے پر نکالے ہوئے
جونک نٹ کی طرح سنبھالے ہوئے

پاؤں اپنے جما کے پھول پہ تو
سونگھے جاتی ہے پھول کی خوشبو

فکر اس وقت کچھ تجھے ہے نہ غم
جیسے ہوتا ہے سکتہ کا عالم

نہیں ہم کو خبر یہ ہوتی ہے
چوستی ہے تو رس کہ سوتی ہے

کس قدر تو ہے بے حس و حرکت
پھول کے حسن پر یہ محویت!

خوب لے لے مزے تو راحت کے
عیش و آزادی و فراغت کے

آئے گا جب نسیم کا جھونکا!
پھر مسرت کا تیتری پوچھنا کیا

لے اڑے گا تجھے ہوا میں وہ
تجھ کو پہنچائے گا فضا میں وہ

باغ میرا ہے یہ شجر میرے
اور یہ پھول میری خواہش کے

ہیں پرستان کے جو تیرے پر
ان کو آرام دے تھکیں وہ اگر

لے تو آرام اس طرح سے یہاں
ہے یہ گویا حرم۔ یہاں ہے اماں

جی ترا جتنی دفعہ چاہے آ
نہیں ہے اس میں ڈر کی بات ذرا

بیٹھ جا تو یہاں کی ڈالی پر
بار تیرا نہ ہوگا مالی پر

ہم سنائیں گے دھوپ چھاؤں کے گیت
تیتری دیکھ ہم سے کر لے پیت

تجھ سے باتیں کریں گے گرمی کی
میٹھی سب باتیں اور نرمی کی

باتیں اس وقت کی کہ ہم بھی تھے
تیری مانند ننھے منے سے

ہائے اک وہ بھی کیا زمانہ تھا
نہ رہا یاد اک فسانہ تھا

وہ مزے کے تھے دن بھی کتنے بڑے
تھے برابر وہ اب کے دس دن کے

ذہین حیدر

غزلیات

حضرت تجمل جلالپوری مدظلہ

ہم بھی یہ چاہتے ہیں دلِ بے قرار بھی
دے رنج آسماں بھی تڑپائے یار بھی

کتنی ہے کیف زا نگہ مست یار بھی
سرشار بادہ کش بھی پرہیزگار بھی

اک تم کہ غیر پر نگہ التفات ہے
اک ہم کہ ہیں تمھیں پہ فدا بھی نثار بھی

کس طرح مفلسی میں کریں حلقِ خشک تر
نادار رند ہیں نہیں ملتی ادھار بھی

کی تجھ سے دوستی تو جہاں بھی ہوا خلاف
رکھتا ہے دشمنی فلک کج مدار بھی

ہیں بعد مرگ بھی وہ ہوں افتادگی پسند
ہوتا نہیں بلند لحد کا غبار بھی

افسانہ ہے وہی دلِ خانہ خراب کا
جو تم کو ناپسند بھی ہے ناگوار بھی

ٹھکرا کے میری قبر کو کہتے ہیں ناز سے
جب وہ نہیں تو کیوں ہو نشانِ مزار بھی

مٹتی نہیں ہے ہستی موہوم کی خلش
کٹتی نہیں ہے زندگی مستعار بھی

رحمت نے بڑھ کے مژدہ بخشش سنا دیا
ہونے نہ پائے اہل گنہ شرمسار بھی

ہیں حال مفلسی میں تجمل غنی مزاج
بے مایہ بھی ہیں ہم ہیں مالدار بھی

ممتاز الشعراء منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی

بھڑکا ہوا ہے شعلۂ برقِ جمال بھی
پیدا ہے رنگِ حسن میں شانِ جلال بھی

ماہِ دو ہفتہ ہوتا ہے گھٹ کر ہلال بھی
اک روز ہے کمال کو آخر زوال بھی

ملنے کی آرزو بھی ہے اسکا خیال بھی
تیرا پیار بھی ہے یاد بھی۔ شوقِ وصال بھی

ہے مبتلائے غم دلِ آشفتہ حال بھی
بکھرا ہوا ہے صورتِ گیسو خیال بھی

دل ہی نہیں ہے وقفِ تمنائے دیدِ حسن
صرفِ وفورِ شوق ہے چشمِ خیال بھی

آتش فروز دل میں تجلئ یار ہے
پردے میں ہے جمال کے شانِ جلال بھی

صورت کسی کی رہنے لگی دل میں جلوہ گر
تصویرِ حسن بنگیا رنگِ خیال بھی

رنگت ہے انقلاب کی پست و بلند دہر
وابستہ عروج یہاں ہے زوال بھی

دل بنگیا ہے آئینہ تصویرِ حسن کا
نظروں میں ہے جمال بھی اسکا جلال بھی

تاکیدِ ضبط بنگئی مہرِ لبِ سکوت
کھلتی نہیں زبان دمِ اظہارِ حال بھی

پہلے ہی روئے یار سویدائے چشم تھا
تِل نظر کا بنگیا عارض کا خال بھی

چشمِ غضب بھی انکی پئے دل ستم نہیں
چمکا ہوا ہے غازۂ روئے ہلال بھی

شیدائے حسن جبکہ ہے اے دل ازل سے تو
اس بے مثال کی کہیں دیکھی مثال بھی

ٹکڑے فقط نہیں ہے گریبانِ آرزو
ہاتھوں سے تیرے چاک ہے جیبِ خیال بھی

کہتی ہیں عشق میں مری وقت پسندیاں
اک امرِ سہل ہے مجھے کارِ محال بھی

تصویرِ حسن پھرتی ہے جس کی نگاہ میں
رہتا ہے میرے دل میں وہ بنکر خیال بھی

محشر میں جوشِ رحمتِ باری کو دیکھ کر
ہے موجزن مرا عرقِ انفعال بھی

کاغذ پہ اڑ چلی ہیں جو مضموں کی شوخیاں
حسنِ رقم نے بھر دیا رنگِ خیال بھی

زینت فزائے بزم و عزیزِ جہاں ہوں میں
رونق بھی مجھ کو کہتے ہیں سب پیارے لال بھی

مُترجمات

ارتقاء ارض کا قرآنی نظریہ

اور

موجودہ تحقیقات طبقات الارض

مندرجہ بالا عنوان سے ایک مختصر مگر پُر از معلومات مضمون نواب کرامت جنگ بہادر کے قلم سے دوکنگ کے رسالہ اسلامک ریویو میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے ارتقاء ارض سے متعلق زمانہ حال کے یورپین ماہرین طبقات الارض کی تحقیقات کو بیان کیا ہے۔ اس کا مجمل خاکہ علی الترتیب حسب ذیل ہے:۔

(۱) عہد قدیم کے قشر ارض کا پھیل کر ضخیم ہونا، اور آخر کار تمام سطح زمین پر چھا جانا

(۲) بخارات کا زمین سے اٹھ کر مجتمع ہونا اور بارش کی جھڑیاں بن کر برسنا۔

(۳) نباتات اور سبزہ کی کثرت و رُوئیدگی۔

(۴) حیوانی زندگی۔

اس کے بعد مضمون نگار نے ثابت کیا ہے کہ آج سے تیرہ سو برس پیشتر قرآن مجید نے اس نظریہ کو اسی ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اب ہم قرآن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ آخری کتاب سماوی زمین کے اس نظریہ ارتقاء کو کس طرح بیان کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا	اور اس کے علاوہ زمین کو بچھایا
اَخْرَجَ مِنْهَا مَاۗءَهَا وَمَرْعٰىهَا	اسی میں سے اسکا پانی اور اسکا چارا نکالا
وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا	اور پہاڑوں کو (اسمیں) گاڑ کر (ہلا دیا)
مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (سورہ)	یہ سب تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے فائدہ کے لئے

"قرآن مجید سے اس نظریہ کی مطابقت کسقدر تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے؟" قرآن میں پہلے زمین اور قشر ارض کی وسعت کا ذکر ہے، پھر پانی کے اجتماع، پھر سبزہ و روئیدگی اور آخر میں حیوانی زندگی کی پیدائش کا بیان ہے جن میں کا اشرف المخلوق "انسان" ہے۔

"ماہرین طبقات الارض کی تحقیق میں بھی یہی ترتیب نظر آتی ہے۔ یعنی ایک قدیم قشر ارض کی موجودگی اس کی تدریجی وسعت اور حجم، اس کا تمام سطح زمین پر چھا جانا، پھر بخارات کا مجتمع ہو کر پانی بننا، سبزہ و نباتات کی روئیدگی اور اس کے بعد حیوانی زندگی"

"مذکورہ بالا مطابقت میں میں نے پہاڑوں کو قصداً نظر انداز کر دیا ہے۔ اگرچہ اسکا بیان (تحقیقات جدیدہ اور قرآن) دونوں میں موجود ہے۔ کیونکہ یہ سلسلۂ ارتقا راب تک ختم نہیں ہوا جیسا کہ آتش فشاں پہاڑوں کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے۔ میرا مقصد صرف تخلیق کی سلسلہ وار ترتیب دکھانا ہے"

کیا اب بھی لوگوں کو اس بات میں شک ہو سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام (علیہ الوف التحیۃ والسلام) کا ذریعۂ وحی والہام خدا کے سوا کوئی اور تھا؟

لذّتِ الم

مسٹر جیمس ڈگلس اخبار سنڈے ایکسپریس میں رقمطراز ہیں:۔

"میں ہمیشہ مصائب و آلام کے خلاف بہت جد و جہد کیا کرتا تھا۔ مجھے وہ ایک قسم کا بیہودہ پن اور ظلم معلوم ہوتا تھا۔ مگر میری زندگی کے تجربہ نے مجھے سکھا دیا کہ اگر تکالیف اور رنج و غم کا وجود نہ ہوتا تو ہمیں لازمی طور پر انہیں پیدا کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔ کیونکہ بغیر دُکھ درد کے ہم وہ نہیں ہو سکتے جو ہم ہیں اور آئندہ ہو سکتے ہیں"

"میں نے ایسے مرد اور عورتوں کو دیکھا ہے جنہوں نے درد و الم کی آگ میں سے نکل کر ایک نئی روح پیدا کر لی ہے۔ اگرچہ وہ استحالہ اور تشویہ کا عمل نہیں جانتے تھے۔ کیونکہ تکالیف میں مبتلا ہوتے ہی وہ سراسیمہ اور پریشان ہو گئے، اور رنج و غم کے شعلوں میں حیرت و استعجاب کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارنے لگے، مگر جب وہ اس سے باہر نکلے تو زیادہ نرم دل، نہایت سادہ، مستقل مزاج

اور ہر دلعزیز بن کر نکلے۔

"بہر حال زندگی ایک بڑی معلّم ہے اور تا بقید حیات اس مدرسہ میں ہمیں درس ملتا رہتا ہے، جہاں ہم ہر روز ایک تازہ سبق سیکھتے رہتے ہیں۔ اور جوں جوں ہماری عمر ترقی کرتی جاتی ہے، ہم اپنے آلام کی بدولت اپنی مسرتوں کو پہچانتے ہیں۔ ہمارے مصائب ہمارے لذائذ کی بہ نسبت زیادہ رازوں کا انکشاف کرتے ہیں۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آیتِ شریفہ اِنَّ مَعَ العُسرِ یُسراً کی بہترین تفسیر نہیں ہے؟

غزل

(از جناب شریف تسکری بھوپالی)

قیامت ہی گذرنا ہی تو یوں مجھ پر گذر جائے
تری زلفیں بکھر جائیں ترا گیسو سنور جائے

ستم ہے اے محبت وہ نگاہیں پھیر کر جائے
جسے حدِ نظر تک دیکھنے میری نظر جائے

کسی کی سمت کیوں آخر ترا تیرِ نظر جائے
مرے سینہ میں در آئے مرے دل میں اتر جائے

حیاتِ مضطرب اک چیز ہے دنیائے الفت میں
خداوندا قیامت تک نہ یہ دردِ جگر جائے

نگاہِ ناز و چشمِ شوق دونوں یوں ملیں یارب
وہ اپنا کام کر جائے یہ اپنا کام کر جائے

پڑینگی اس پہ رشک آمیز نظریں اہلِ جنت کی
تری دیوار کے سایہ میں جو دم بھر ٹھہر جائے

یہ حسرت ہی ہمیشہ کے لئے بیہوش ہو جاؤں
نگاہِ مست میرا ساغرِ امید بھر جائے

محبت میں کسی کی پیروی کیوں کر گوارا ہو
چلے وہ راہ کیوں فکری جدھر کو راہبر جائے

اخبار علمیہ

فوٹوگرافی کا ارتقاء

ایک فرانسیسی موجد موسیو نوگس نے ایک سکنڈ میں تین سو فوٹو لینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ توپ کے منہ سے نکلنے والے گولے کی تصویر لے سکتا ہے۔ موسیو مذکور کا دعویٰ ہے کہ اس کی یہ ایجاد سریع السیر سینوموٹوگرافی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردے گی۔ ابھی وہ اس بات کی کوشش کررہا ہے کہ فی سکنڈ چھ سو تصاویر تک اس کو پہنچا دے۔

تشخیص امراض بذریعہ تصاویر

برلن (جرمنی) کے ایک طبیب ڈاکٹر آلیسنر نے اندرون معدہ کے امراض کی تشخیص کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے کہ وہ ایک نلکی کو — جس کے سرے پر تیز روشنی اور ایک چھوٹا سا آئینہ لگا ہوتا ہے — ایک مریض کے پیٹ میں اتار کر اس کا فوٹو لیتا ہے۔ اس آئینہ کے ذریعہ سے احشاء کا عکس ایک سات فلم والے چھوٹے سے کیمرے میں پڑتا ہے، جو صرف ایک سیکنڈ میں سات تصویریں بیک وقت اتار لیتا ہے، ان تصاویر سے مریض کے اندرونی امراض کی پوری تشخیص ہو جاتی ہے۔

حمیٰ محرقہ کے جراثیم

ٹوکیو (جاپان) کی امپریل یونیورسٹی کے پروفیسر ساتا نے ثابت کیا ہے کہ حمیٰ محرقہ کے جراثیم بہت آسانی سے جلد اور بیرونی مسامات میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس جدید تحقیق سے اس مرض کے انسداد کے لئے اب تک جو تدابیر مہیا کی گئی ہیں ان کو بالکل بدل دینا پڑے گا۔

ایک عجیب گھڑی

پیرڈیا (کٹیالونیا) کے ایک نوجوان گھڑی ساز مسمی کیلکسٹو آربیرو نے ایک عجیب گھڑی بنائی ہے جس کی نسبت اس کا دعویٰ ہے کہ یہ گھڑی بلا کوکنے کے ہمیشہ چلتی رہے گی۔ اس گھڑی میں یہ صنعت رکھی گئی ہے کہ وہ سکنڈ، منٹ، گھنٹے، دن، ہفتہ، مہینہ اور سال بتاتی ہے۔ اس سے دن اور رات کے گھنٹے، ہفتہ اور مہینہ کے دن، لوند کے برس، بروج فلک، سال کے باقی ماندہ ہفتے، طلوع و غروب کے اوقات اور چاند کے تشکلات وغیرہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس گھڑی کو جس کے پرزے آٹھ سو سے زائد ہیں، اس گھڑی ساز نے اپنی بالائی فرصت کے وقت گیارہ سو گھنٹوں میں یہ گھڑی تیار کی ہے۔

تصحیح رسالۂ زبان بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۲۶ء

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹	۷	قومی کا ثبوت	قومی ہمدردی کا ثبوت
"	۸	پچیس مرحمت فرمائیے	پچیس روپئے مرحمت فرمائیے
"	۱۱	نفس گذار	نفس گداز
۱۳	۱۴	ترقی کی زینہ پر	ترقی کے زینہ پر
۱۵	۵-۶	ریاست منگرول نے زبان کیلئے	ریاست منگرول نے ذیل کا مضمون زبان کیلئے
۱۷	۱۱	اصطلاحات	اصلاحات
۲۱	۲	منجملہ بائیس	منجملہ چھبیس
۲۶	۲	یورپ بڑے بڑے ممالک	یورپ کے بڑے بڑے ممالک
۲۸	۱۴	مذہبی اور سختی	مذہبی سختی
۳۲	۱۷	متن کو بڑھنا	متن کو پڑھنا
۳۴	۱۷	تلو بھائی شاہ نے	(نے زائد ہے)
۴۱	۷	بھرا ہو سبندہ خود رو	بھرا ہو سبزۂ خودرو
"	۱۰	جس سے	جن سے
"	۱۳	شادی	شادے
۴۲	۸	جد جا	جدا جدا
"	۱۵	ہراک شخص کی	ہراک شخص کو
۴۳	۴	کوئے گل سے تجھکو الفت ہے	تجھکو الفت ہے کوئے گل سے

تصحیح رسالۂ زبان بابتہ ماہ نومبر ۱۹۲۶ء

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۲	نکتۂ نظر سے	نقطۂ نظر سے
۴	۸	حیثیت	حقیقت
۵	۸	خدمت نہایت	خدمت میں نہایت
۷	۸	صغیراسن	صغیر السن
"	۱۲	بہ تفصیل	بہ تفصیل
۸	۳	معاصرد	محاصرد
۱۲	۱۹	بعض کے وجوہ کا	بعض کے وجود کا
۱۶	۱	قواعد صوتی	قواعد حرفی
۱۷	۳	"خیالات"	"خیالات مجردہ"
۲۳	۵	مفر کرتے ہوئے	مقرر کرتے ہوئے
"	۱۸	دساطیر	اساطیر
"	۲۴	اس طورد	اس طورہ
۲۶	۱۸	غشادۂ بصر	غشاوۂ بصر
۳۲	۶	امیدوں کی تلاش	امیدوں کی لاش
۳۳	۱۹	ہاں مجھی خوب ہو یاد وہ دن	ہاں مجھے خوب یاد ہے وہ دن
۳۴	۱۰	اسکا دکھکر	(اسکا زائد)
۳۵	۱	پیش نظر کرشمع	پیش نظر کرشمے
۳۷	۹	اک بیہوشی	ایک بیہوشی
۳۸	۲	ادائے جانستاں کے اور کیا ہی	بجز ناز و ادا کے اور کیا ہے
۴۱	کالم اول ۱۳	(اشارد جوابات)	(استفسارات جوابات)
۴۲	" ۹	تحتی	تقطیع
۴۳	" ۱۲	تحتی	تقطیع
۴۴	۱۸	نا قدردانی فرمانے کے	نا قدردانی زمانہ کے
۴۵	کالم اول ۱۳	اس بحث	اصل بحث
"	کالم دوم ۱۸	چھوٹی اور	چھوٹی تقطیع اور
۴۶	کالم اول	رسائل میں نہ رہتے ہیں	رسائل میں نکلتے رہتے ہیں
"	" ۲۱	"اسلام ملوکیت"	"اسلام اور ملوکیت"
"	" ۲۲	نتیجہ خیز مضمون ملک نامور	نتیجہ خیز مضمون لکھا ہے ملک کے نامور

زبان

جلد۲ | فہرست مضامین رسالہ زبان بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۲۷ء | نمبر۲

زبانِ خلق

"معارف" اعظم گڈھ بابت جنوری ۱۹۲۷ء

"زبان" کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی ماہوار رسالہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر عبدالرحمٰن صاحب خوشتر ہیں، اردو دانانِ کاٹھیاواڑ کا یہ پہلا علمی قدم ہے مضامین سے اعلیٰ علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے، اُمید ہے کہ کاٹھیاواڑ اپنے شایانِ شان ترقی اس رسالہ کو بخشنے میں کامیاب ہوگا۔ ضخامت ۴۰ صفحے سالانہ چندہ للعہ۔

روزنامہ زمیندار لاہور (جلد ۴ نمبر ۲۹ سنڈے ایڈیشن)

"زبان" کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی رسالہ جو مولینا عبدالرحمٰن صاحب خوشتر منگرولی کے زیرِ ادارت نکل رہا ہے مضامین عمدہ ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا ہے قیمت سالانہ چار روپے ششماہی ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مینجر رسالہ زبان منگرول (کاٹھیاواڑ)

روزنامہ ہمدرد دہلی (جلد ۴ نمبر ۳۴)

"زبان" یہ رسالہ، منگرول (کاٹھیاواڑ) سے نکلنا شروع ہوا ہے، اب تک اُردو رسائل کا اجراء زیادہ تر پنجاب تک محدود تھا اس ایک سال کے دوران میں لاہور سے نہ معلوم کتنے رسالے نکلے ہیں جو تقریباً سب ایک ہی طرز کے ہیں اور بقول "معارف" کے اگر ان میں سے ایک کا سرورق دوسرے پر لگا دیا جائے تو کوئی فرق نہ ہوگا، بہرحال پنجاب سے اُردو رسالوں کا اس کثرت سے نکلنا تعجب خیز ہو یا نہ ہو لیکن کاٹھیاواڑ جیسی جگہ سے اُردو زبان میں ادبی رسالہ شائع کرنا یقیناً قابلِ قدر ہے، ایسی صورت میں جبکہ کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں کو اپنی اردو دانی کا کوئی دعویٰ نہیں وہاں سے ایک علمی و ادبی رسالے کے اجراء سے اردو دانانِ کاٹھیاواڑ کے ذوقِ علمی کا پتہ چلتا ہے، رسالے کے ایڈیٹر عبدالرحمٰن صاحب خوشتر ہیں، انتخاب مضامین سے ان کے علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے، ترتیب مضامین اور کتابت و طباعت کی طرف ذرا اور اگر توجہ کر دی جائے تو یقیناً "زبان" بہت سے تجارتی رسالوں سے اچھا ہو جائے گا ہم دعا کرتے ہیں کہ خوشتر صاحب "زبان" کے ذریعہ سے اپنے صوبہ میں اردو زبان کی خاطر خواہ خدمت کر سکیں۔ سالانہ چندہ للعہ۔

اخبار ریاست دہلی (جلد سوم نمبر ۲۰)

"زبان"

کاٹھیاواڑ میں زبان اُردو کا مذاق بہت کم ہے ہمیں یہ دیکھکر دلی مسرت ہوئی کہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب خوشتر مانگرولی نے ماہوار رسالہ "زبان" کا اجرا کر کے اس علاقے میں پہلا ادبی قدم اٹھایا ہے۔ منگرول میں پریس کی دشواریوں کی وجہ سے کارکنان رسالہ ہزاروں میل کے فاصلہ پر آگرہ میں انتظام طباعت کے لئے مجبور ہیں۔ لیکن ان تمام موانعات کے باوجود "زبان" ایک کامیاب پرچہ کہا جاسکتا ہے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب میں کافی محنت کی جاتی ہے اور اس وقت بھی اسکا ادبی معیار کسی اچھے اُردو رسالے سے ہرگز کم نہیں۔ ہم اپنے جدید معاصر کا خیر مقدم کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ مولانا خوشتر نے جو کاٹھیاواڑ میں اردو علم ادب کی شمع روشن کی ہے وہ باد حوادث کے جھونکوں سے محفوظ رہے۔

کاغذ لکھائی چھپائی صاف چندہ سالانہ للعہ؟ منیجر صاحب رسالہ "زبان" منگرول (کاٹھیاواڑ) سے طلب کیجئے۔

"آئینہ" (کانپور) (جلد اول نمبر سوم)

"زبان" منگرول (کاٹھیاواڑ) کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ ہے کاٹھیاواڑ جیسے حصہ ہند سے اردو "زبان" کا رسالہ شائع ہونا بظاہر تعجب خیز معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ہندوستان کی ملکی و قومی مشترکہ زبان اُردو کی ہمہ گیری کا ایک بین ثبوت ہے زبان خصوصیت کے ساتھ علمی مضامین شائع کرتا ہے اور اس لئے اس کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ دوسرے رسائل کی طرح زبان بھی اہل علم کی بے اعتنائی کا گلہ گذار ہے اسکا شکوہ ہی کیا کہ یہ عام شکایت ہے یقیناً مولانا خوشتر ہمیں معاف فرمائینگے اگر ہم انکی خدمت میں اپنے ایک مکرم دوست کی رائے (جو انہوں نے آئینہ کا پہلا نمبر دیکھکر ظاہر فرمائی تھی) پیش کرنے کی جراٴت کریں یعنی "موجودہ زمانہ ایسے خوش مذاق لوگ بہت کم ہیں جو صرف علمی مضامین کی بنا پر کسی رسالہ کی حوصلہ افزائی فرمانا اپنا فرض سمجھیں ضرورت ہے کہ علمی مضامین کے ساتھ ساتھ کچھ عوام کی دلچسپی کا سامان بھی مہیا کیا جائے" ہمارے نزدیک "زبان" کی خدمت کرنا ہر اہل علم اور علم دوست کا فرض ہے۔ کراؤن سائز حجم ۳ جز قیمت سالانہ چار روپیہ للعہ ششماہی عہ؍۔

صفحۂ ادارت

اس نمبر کے ساتھ جو تصویر "زیب زبان" کی جاتی ہے وہ ہمارے کرمفرما حضور فیض گنجور نواب غلام معین الدین خانجی صاحب بہادر (بابی) والیٔ ریاست مانا ودر (کاٹھیاواڑ) کی ہے اسوقت آپ کی عمر ۱۶ سال کی ہے اور راجکمار کالج (راجکوٹ) میں تعلیم پاتے ہیں آپ اس صغرسنی میں نہایت ہوشیار، ذکی الحس اور بیدار مغز واقع ہوئے ہیں بلکہ اپنے والد بزرگوار کی طرح فیاض اور ہمدرد ملک و قوم ہیں اور آپ کے دل میں بھی اپنی غریب رعایا کی فلاح و بہبودی کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔

صغرسنی کے باعث ریاست مانا ودر کی عنانِ حکومت آپ کی والدہ ماجدہ مخدومہ و معظمہ عالیہ جناب فاطمہ بیگم صاحبہ صدیقہ دام اقبالہا ایجنٹ آف مانا ودر کے ہاتھ میں ہے جو نہایت قابلیت کے ساتھ امور ریاست اور اپنی ذمہ داریوں کو ایک بیدار مغز رئیس کی طرح انجام فرماتی ہیں۔

بیگم صاحبہ موصوفہ ہمارے نواب صاحب بہادر بانتعابہ د والی منگرول، کی بڑی صاحبزادی صاحبہ ہیں جنہوں نے اپنے عالی دماغ اور روشن خیال والد بزرگوار کے سایہ عاطفت میں علوم و سیاست حاضرہ کی تعلیم و تربیت حاصل کی ہے، موصوفہ کو جہاں انگریزی تحریر و تقریر میں مہارت تامہ حاصل ہے وہاں اردو سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ ہم عنقریب آپ کے افکار عالیہ سے قارئین زبان کو بہرہ اندوز کریں گے۔

شرر و شاد کی وفات پر مونت الشیوع رسائل نے خوب خوب نوٹ لکھے ہیں بلکہ بعض رسائل نے تو اس پر انعامی مضامین بھی لکھوائے ہیں لیکن ہم ان مرحومین کی ماتم گساری میں بوجہ تاخیر اشاعت رسالہ سب سے پیچھے رہ گئے تھے لہٰذا اب ہم بھی سخت حزن و ملال کے ساتھ ماتم گسار ہیں۔

اگرچہ یہ ہر دو مستند و مقتدر ادیب اپنی عمر طبعی کو پہنچکر فوت ہوئے ہیں لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی وفات سے دنیائے ادب میں ایک ناقابل تلافی حادثہ وقوع میں آیا ہے اور اس سے اردو علم و ادب کو جو نقصان ہوا ہے برسوں تک اس کی تلافی نہیں ہوسکتی، ایک اگر نثر نگاری میں بادشاہ تھا تو دوسرا نظم نگاری میں اپنے رنگ کا اُستاد تھا۔

اخیر میں ہم دست بدعا ہیں کہ خدا مرحومین کو اپنی جوار رحمت میں جگہ اور پس ماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ابھی ہم نشترؔ و شادؔ کے ماتم ہی میں مصروف ہیں اور ابھی ہمارے آنسو بھی خشک نہیں ہونے پائے تھے کہ یہ خبر وحشت اثر سنی گئی ہے کہ ملک کے مشہور نغمہ گو اور نازک خیال شاعر حضرت مضطرؔ خیرآبادی نے بھی ہمیں اپنی دائمی مفارقت کا ایک داغ دیا انا للہ وانا علیہ راجعون۔

آج جہاں ہم ان پیہم ادبی حادثوں سے مغموم و رنجیدہ ہیں وہاں ایک روحانی صدمہ سے بھی غمگین و حزین ہیں یعنی ۱۱ر فروری سنہ ۴۲ء کو ہمارے کاٹھیاواڑ کے برگزیدہ و مقدس بزرگ سجادہ نشین حضرت سید محمد صاحب (دہنگرو) نے ۸۴ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی جانب کوچ فرمایا انا للہ وانا علیہ راجعون۔

مرحوم نہایت خلیق و با مروت اور برگزیدہ بزرگوار تھے۔ آپ کے مریدوں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچی تھی اور آپ سینکڑوں عقیدت مندوں کو روحانی فیض پہنچاتا تھا۔

مرحوم کے خلف اکبر اور جانشین جناب سید عبدالصمد صاحب (عرف بڑا صاحب) سے ہمیں توقع ہے کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پہ چلیں گے اور نہایت صلح و آشتی سے اپنے فرائض کی انجام دہی کا خیال رکھیں گے۔

ادیٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فروری **زبان** ۱۹۲۷ء

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی — کل جسم میں اک نطق مجسم ہے یہی
ہے عرش خدائے پاک، اگر پاک ہو دل — صادق ہے زبان تو اسم اعظم ہے یہی

مقالات

گجرات کا ایک غیر معروف عربی سفرنامہ

۱۱۳۳ھ

(از علامہ عبد العزیز راجکوٹی پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

ہمارے محترم علامہ راجکوٹی کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسے نامعلوم مقامات سے علمی، ادبی اور تاریخی جواہر پارے نکال لاتے ہیں جو حاشیۂ وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے۔ اُن کی دسیع کتب بینی، محققانہ تلاش وجستجو اور علمی تحقیقات کی بدولت کئی نایاب اور نادر جواہر علم وادب کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔

ذیل کا مضمون جو آج سے دو سو برس پیشتر کے ایک عرب سیاح کا سفرنامۂ گجرات ہے، اور جو تاریخی حیثیت سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، علامہ موصوف نے اپنی توجہ خاص اور لطف عمیم سے ہمیں بغرض اندراج

رسالۂ زبان عنایت فرمایا ہے اس کے لئے ہم اپنے محترم کے خاص طور پر ممنون ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ آیندہ
بھی اپنے وطن مالوف کے ایک علمی پرچہ کی سرپرستی اور اعانت سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

ایڈیٹر

"مکرم مدیر صاحب زبان منگرول کا پیہم اصرار تھا کہ ان کے رسالہ کے لئے کوئی مضمون دوں۔ بہت غور کیا تو
ایسا موضوع جو میرے وطن کی آب و ہوا کے لئے موافق ہوتا نہ سوجھا میں راجکوٹ ہی میں تھا کہ کتاب نزہۃ الجلیس
ومنیۃ الأدیب الأنیس مصر سے پہنچی یہ ایک بارھویں صدی ہجری کے ادیب عباس بن علی بن نورالدین المکی الحسینی الموسوی
کی تالیف ہے جس کی طویل فصول میں مؤلف نے اپنا سفرنامہ عراق ایران گجرات اور یمن اس بری طرح مدغم کردیا تھا کہ
پڑھنے والے کو سفرنامہ کے وجود کا خیال بھی نہ ہو۔
ہرچند کہ سفرنامہ بہت متأخر زمانہ کا لکھا ہوا ہے مگر صرف اس خیال پر کہ اس میں چند جزوی واقعات مرہٹوں کی جنگوں
اس عہد کے ملکی اور غیر ملکی اعیان کے حالات کسی قدر تفصیل سے آگئے ہیں میں نے راجکوٹ ہی میں اگست ۱۹۲۹ء
اس کا ترجمہ شروع کردیا جو بدقت تمام بباعث قلت فرصت آج ۲۲ جنوری ۲۷ء کو علیگڈھ میں تمام ہوتا ہے۔
تاریخی حواشی نہایت اہم تھے مگر نہ یہاں ضروری مواد مہیا تھا نہ فرصت اس لئے خوشتر صاحب کے مطالبہ کو
التوائی میں نہیں ڈالتا۔
مجھے اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ مؤلف کے حالات سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر لمحمد خلیل المرادی میں ڈھونڈھتا
و بدقسمتی سے ہمارے کتبخانہ میں موجود نہیں۔

میمن عبدالعزیز راجکوٹی
ریڈر ان عربک مسلم یونیورسٹی
علیگڈھ (یو۔پی)

ص ۲۲۶ ج ۱
جب ۶ صفر ۱۱۳۳ھ کی شام ہوئی تو ہم بصرہ سے کشتی میں سوار ہوکر روانہ ہندوستان ہوئے۔ ہمارے ہمراہ
ابراہیم بن ذکریا تھے۔ اور کشتی مرحوم امیر فارس خاں کی تھی جو دراصل سید علی شاطری کی ملکیت تھی اور اس وقت امیر
فارس خاں نے اُن سے کرایہ پر لیلی تھی۔ راستہ میں ایک جزیرہ آیا جس کے سامنے ہم چھ دن لنگرانداز رہے تا آنکہ ناخدائے
کشتی نے اپنا تمام سامان وہاں سے لیکر کشتی میں بار کردیا پھر ہم چل پڑے اور راستہ میں طرح طرح کی اذیتیں اٹھائیں

مطبوعہ مطبع وہبیہ مصر ۱۲۹۳ھ در دو جلد۔

پھر یکم ربیع الاول کو بندرگاہ کنج میں داخل ہوئے جو نہایت دلکشا اور سرور افزا بندر ہے یہاں اطراف سے بکثرت
ہوئے آتے ہیں۔ یہاں کے باشندے بھلے لوگ ہیں۔ یہاں ہماری ملاقات جناب سید محمد بن ماجد بحرینی سے
ہوئی جو اچھی طرح پیش آئے۔ [صفحہ ۳۶۹] پھر کوئی چار روز کنج میں ٹھہر کر روانۂ بندرگاہِ سورت ہوئے۔ شب و روز مسلسل بحر ہند
میں کشتی چلاتے رہے تا آنکہ ۲۵ ربیع الاول کو بوقت ظہر بارہ میں لنگر انداز ہوئے جو سورت کا بندر ہے۔ اس
بندر میں انگریزوں کا ایک بڑا جہاز تھا جس نے ہمیں بندر میں نہ گھسنے دیا۔ وہ کسی کشتی کو اترنے نہ دیتا تھا کہ اس کے
حاکم نابینا شیخ الاسلام خاں اور انگریزوں کے مابین عبدالرحمٰن اسحٰق کی کشتی چھین لینے کے بارہ میں اختلاف ہو گیا تھا۔
اس قصہ کو بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ دوسرے روز ہمیں اجازت مل گئی۔ ۲۷ ربیع الاول کی صبح کو ہم
بندرگاہِ سورت میں داخل ہوئے جو نہر (نربدا) کے کنارے ہندوستان کا بڑے سے بڑا بندر ہے۔ [صفحہ ۳۷۰] جب میں داخل
ہوا تو یہاں ہر اچھی چیز دکھائی دی جو انسان کو اہل و وطن کی یاد تک بھلا دے۔ یہاں بہت سے عالی شان محلات
سرسبز باغات آباد بازار منور مسجدیں اور مشہور حمام ہیں۔ یہاں ایک سر بفلک قلعہ ہے جو بجائے خود اچھا خاصہ
شہر ہے اور جو ترکوں کا بنایا ہوا ہے۔ بندر کے گرد دو شہر پناہیں ہیں قدیم اور جدید۔ قدیم ترکوں کی پرانے وقتوں
کی بنائی ہوئی ہے۔ اور نئی کے برج امیر مبارز خاں نے بنوائے تھے اور اس پر سلطانی خزانہ
سے روپیہ صرف کیا تھا پھر اس کی تکمیل حیدر خاں نے کی تھی۔ یہاں میری ملاقات امیر فارس خاں سے ہوئی
جس نے بہت کچھ فضل و کرم کیا۔ اور قلعہ دار میرزا کے بھانجے سے بھی ملا اس نے بھی عنایت کی۔ اور علامہ سید علی شاطری
سے بھی ملا۔ اور قطب مولانا سید عبداللہ بن ولی سید علی عیدروس اور سید زین عیدروس اور سید عبدالقادر عیدروس
اور سید مصطفیٰ عیدروس اور سید محمد عیدروس اور سید صادق عیدروس اور سید احمد عیدروس الغرض ان سب کی خدمت
سے سعادت اندوز ہوا۔ اور یہاں کے مشہور تاجر شیخ ابراہیم بن خلیل قدسی سے ملا جو بہت خوبی سے پیش آئے۔ ان کے
علاوہ ان مشاہیر تجار سے بھی ملا اور ان کے حسن سلوک سے مسرور ہوا جناب ابراہیم چلپی دورلی، احمد چلپی ولد حاجی
صالح درویش، حاجی عبدالرحمٰن حبوس، حاجی حسن بدوی چلپی۔ حسین حمیدان اور ان کے بھتیجے جناب مصطفیٰ حمیدان
اور حاجی علی درویش اسی طرح یہاں کے عالم جلیل سید سعد اسعد اور سید علی مومن اور امیر جلیل صارم علی خاں اور شاہ
ایران کے ایلچی مولانا سید مرتضیٰ بن سید علی خفاف سے ملاقی ہوا۔ نیز حاکم سورت شیخ الاسلام خاں سے بھی ملا جو بدترین
اندھا ہے جو آنکھ اور دل دونوں کا اندھا ہے اور مزید برآں اعلیٰ درجہ کا بخیل اور بزدل بھی۔ اور آیۂ کریمہ «من کان فی ھٰذہ
أعمی فھو فی الآخرۃ أعمی و أضل سبیلا» کا مصداق ہے اللہ اس کا برا کرے۔

پھر جب یکم شعبان سنہ ۱۲۳۱ھ کا روز آیا تو ہم خدائے تعالےٰ پر بھروسہ کرکے عالی جناب دہلی موہن، نامی شہر کی طرف ہوئے
...مان ہمراہ ہمارے محترم استاذ شریعت و شیخ طریقت مولانا سید یوسف بن سید احمد رفاعی ستھے۔ راستے میں ایک قصبہ انکلیسر
انکلیشور) نامی آیا۔ جہاں نہایت عمدہ ہندوستانی کاغذ طیار ہوتا ہے۔ پھر ہم بڑوچ (بھروچ) پہنچے۔ جو ایک عظیم الشان نہر
...بدا) کے کنارے ایک بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں ایک سر بفلک قلعہ ہے یہاں سے مشہور بھروچی لٹھے کی برآمد ہوتی ہے۔ یہاں
...نرا زہ مال یہاں سے شیریں ہوتا ہے۔ یہاں تین روز ٹھہر کر ہم شہر بڑودہ پہنچے جو نہایت آباد اور بارونق شہر ہے۔ یہاں سے
...ری لٹھے کی برآمد ہوتی ہے۔ یہاں بھی ہم تین روز مقیم رہے یہاں میں مشہور رئیس جناب حاجی جعفر سے ملا جو رستم علیخاں
...شہر میں انہوں نے اچھی طرح خاطر و مدارات کی۔ پھر یہاں سے روانہ ہو کر دبھوئی پہنچے۔ جو قدیم زمانہ سے بتوں کا شہر تھا
...تا ہے۔ اس قصبہ کی فصیل تمام تر کالے پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ جسکا چھوٹے سے چھوٹا پتھر دو ذرع کے برابر ہوگا یا کچھ زیادہ اس
...کے تین دروازے ہیں۔ اور تینوں رنگا رنگ مورتیوں اور عجیب و غریب ہیکلوں سے منقش ہے۔ یہاں سے
...قماش برآمد ہوتا ہے۔ یہاں ایک بڑا تالاب ہے جسکا دور تقریباً ایک میل یا کچھ زیادہ ہوگا وہ تمام تر گھڑے ہوئے پتھروں
...۔ اور اس کے گرد درختوں کی گول قطار ہے۔ یہاں ایک نہایت خدا پرست زاہدہ عورت کا مزار ہے جسکا نام مادرکری
...یک محیر العقول بات یہ ہے کہ اس کی قبر پر پتھر کا ایک چھوٹا سا ستون ہے جس میں انسانی سر کی گنجائش کے برابر ایک
...خ ہے۔ سو جب کوئی جھوٹی قسم کھا کر آتا ہے اور اس سوراخ میں اپنا سر ڈال لیتا ہے تو اسکا گلا گھٹنے لگتا ہے اور وہ
...رخ اپنا سر نکال نہیں سکتا جب تک توبہ نہ کرے یا اپنی قسم پوری نہ کرے۔ اور سچی قسم کھانے والا بے محابا اپنا سر ڈالکر
...ی لیتا ہے میرے سامنے جبکہ میں مرحوم مہر علی خاں کے عہد میں یہاں کا محتسب تھا اس امر کا بارہا تجربہ کیا گیا ہے
...ٹھیک اترا ہے۔ اس مزار کی اور بھی کرامتیں ہیں۔ اللہ ہمیں اپنے نیک بندوں کی برکتوں سے ہر دو جہاں میں سرخرو
...ے۔ پھر ہم دبھوئی میں ایک دن ٹھہر کر روانہ ہو گئے راستہ میں تمام کفار کے علاقے ہی آتے رہے پھر کہیں جا کر ۱۵ شعبان
...مان پہنچے یہ شہر سر بفلک پہاڑوں اور بلند درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں کے دروازوں اور گلیوں میں بے حساب
...ے رہتے ہیں۔ یہاں عظیم الجثہ بندر بھی بکثرت ہیں جو بڑے نڈر اور مہیب ہیں یہاں ایک اونچا اور سر بفلک پہاڑ بھی ہے
...کے راجہ کا نام وردی سنگھ ہے۔ جو ظاہر میں کافر اور باطن میں مسلمان ہے۔ اس لئے کہ اُس کے اہل و عیال اور اقارب
...سب کافر اور بت پرست ہیں۔ بنا بریں اوس نے ان کے اندیشہ سے اپنے اسلام لانے کے قصہ کو چھپا رکھا ہے۔ میں
...خلوت میں ملا اور اُسکو سورہ یٰسین اور سورہ رحمٰن پڑھائی اور اوسکو دعا حرز سیفی اور اسمائے حُسنے کا اجازہ دیا۔ اس نے
...ں اقامت کرنے کی استدعا کی جسکو میں نے منظور نہ کیا اسکا سبب بہت عجیب ہے۔ وہ یہ کہ میں نے سُنا ہے کہ وہ

ایک فقیر مسمے شاہ غریب کے متعلق بے حد خوش عقیدہ اور ارادتمند تہا۔ فقیر بہی بہت نیک دل اور باخدا تہا چند سے وہ راجہ کے ہاں رہا اور اُسکو قرآن پڑہایا پہر اُس سے وطن جانے کی اجازت مانگی جو لعبد دقت دیگئی۔ پہر جونہی کہ وہ نکلا راجہ نے اُسکے پیچھے چند آدمی کردیئے۔ جو اوس کو قتل کرکے راجہ کے پاس لے آئے۔ راجہ نے اُس کو اپنے ہاں دفن کیا اور اوس پر ایک عالی شان مزار بنوایا جس کی بڑی زیارت ہوتی ہے اور راجہ اپنی خوش اعتقادی سے قندیل لنگر اور خندقوں میں بہت روپیہ خرچ کرتا ہے۔ میں بہی جان جانے کے ڈر سے یہاں مقیم نہ ہوسکا۔

القصہ ہم وہاں پانچ روز نہایت عزت و احترام کے ساتہ رہے۔ راجہ نے بہت کچھ عنایتیں کیں۔ پہر ہم وہاں سے کوچ کرکے حدود لنظر بار کے پہلے شہر کرکون میں پہنچے۔ یہ شہر خوش وضع اور دلکش ہے۔ یہاں پان کے درخت بے حساب ہوتے ہیں۔ کبہی جانور بہی اس کو چرتے ہیں۔ ایک پیسہ میں ایک ہزار سفید اعلیٰ اور بڑے پان ملتے ہیں۔ اور کبہی اس مقدار سے بہی زیادہ ملجاتے ہیں۔

وہاں ہم ایک روز ٹہر کر ایک بڑے شہر پہنچے جس کو جیور کہتے ہیں اور جو ایک بڑی ندی کے کنارہ پر ہے۔ یہاں ایک عالیشان قبہ ہے جس میں ایک شخص مسمے میتی چود[له] مدفون ہے جس کا مزار بہت بڑا ہے۔ اس شہر کا حاکم عوض خاں ہے جو وزیر نظام الملک کا خسر ہے۔ یہ بخل و طمع کے لئے سخت بدنام اور رسوا ہے۔

[۲۹۵] پہر جب رمضان المبارک کا چاند دکہائی دیا تو ہم عنایت ایزدی سے شہر برہان پور میں داخل ہوئے اور یہاں کے رئیس [۲۹۶] کبیر مولانا سید احمد دمشقی کے مہمان ہوئے۔ جو ان علاقوں کے کوتوال ہیں اور انکا خطاب زین الدین خاں ہے۔ انہوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی اور ہمیں دس روز انعام و اکرام سے مہمان رکھا۔ ہم ان کے بھتیجوں سید نور الدین، سید حسین، سید جعفر اور سید علی سے ملے جو بہت اچھی طرح پیش آئے۔ برہان پور بہت خوب محکم و خوش قطع شہر ہے۔ یہاں عالی شان محلات آباد بازار، دلکشا باغات، ستہرے حمام، اور عمدہ مسجدیں ہیں۔ اس کی شہر پناہ بلند ہے۔ یہاں غریب الوطن کا دل بہلجاتا ہے۔ ایک بڑی نہر اس کو گہیرے ہوئے ہے۔ یہاں فخری انگور بکثرت ہوتا ہے اور اس درجہ ارزاں کہ بار ہا گدہوں کو بطور چارہ دیا جاتا ہے۔

[له] کہتے ہیں اس کی دختر بہت ملیح تہی یہ قاضی کی عدالت میں جاکر بولا کہ میں نے اپنے گہر میں سیب کا ایک درخت بویا ہے جو اب پہل دینے لگا۔ ایک سیب ہے جو پک گیا ہے مگر میری بیوی مجہے کہانے نہیں دیتی سو کیا میں اوس کو کہا سکتا ہوں۔ نادان قاضی نے کہا ہی ہاں کیوں نہیں؟ موذی گہر جاکر بیٹی کے ساتہ زنا کرلیا۔ اہل شہر اس کے متعلق بڑا اعتقاد رکہتے ہیں جو اُن کی جہالت کی دلیل ہے۔ (از اصل)

پھر ہم خدائے جہان پر بھروسہ کرکے سرزمین گوندوانہ کی طرف ہو لئے۔ راستہ میں ہمیں ایک قریہ مسمّے آسیر گڈھ ملا ایک سر بفلک پہاڑ ہے جس پر ایک بے نظیر قلعہ ہے۔ اس پر تین فصیلیں ہیں۔ دو بڑے بڑے پتھروں کی ہیں اور ایک ٹھوس پتھر سے تراشیدہ۔ جو ایک ہی قطعہ ہے۔ اس کا دور ایک میل اور طول میں قدِ آدم ہے۔ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ جنات نے سلیمانؑ کے لیے بنائی ہے۔ یہاں بے حساب انگور ہوتا ہے جو لطافت شیرینی اور ارزانی میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ یہاں ہم ایک روز ٹھہرے۔

پھر کوچ کرکے شہر گرائی میں آئے۔ یہاں ایک نہایت بلند قلعہ ہے اور یہاں کا پادشاہ مہان سنگھ ہے جو بت پرست ہے۔ اس نے ہماری خاطر و مدارات کی اس لئے ہم وہاں ایک روز ٹھہر کر چل پڑے۔

پھر جب ذی القعدہ کی پہلی تاریخ ہوئی تو ہم نے سرزمین گوندوانہ میں قدم دھرا۔ اس شہر کا نام دیوگڈھ چاندہ ہے جس کے معنی دیوؤں کا قلعہ کے ہیں۔ ہم یہاں کے نجیب و کریم پادشاہ راجہ بخت بلند کے ہاں مہمان ہوئے اس نے ہماری خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہاں میں سید کریم صاحب خلق عظیم سیدی و ملجائی و مرشدی سید بدر بن سید غالب موسوی رفاعی سے ملا۔ جو میرے قادریہ اور رفاعیہ طریقہ کے پیر و مرشد ہیں۔ انہوں نے مجھے سلطان سے کہہ کر اپنے گھر میں اتار کر رکھا۔ سلطان نے ان کی خواہش کو اس لئے منظور کیا کہ انہوں نے ہی اس کو کفر و شرک سے چھڑا کر بندۂ توحید بنایا ہے۔ سلطان ان کی بہت عزت کرتا ہے۔ یہاں ان کے بہت سے گاؤں اور قصبے ہیں جن کی پیداوار بہت زیادہ ہے۔ سو میں نہایت فراغت کے ساتھ ان کے ہاں عزت و توقیر کے ساتھ رہا۔

پھر جب ۱۲ محرم الحرام ۱۱۳۴ھ کی بابرکت صبح نمودار ہوئی۔ تو ہم اپنے شیخ طریقت استاذی سید بدر الدین سید غالب رفاعی مرحوم کے معیت میں اللہ پر بھروسہ کرکے دیوگڈھ چاندہ سے باگڈھ کی طرف رو نوردہ ہوئے۔ باگڈھ بگاف فارسی شیروں کے راستہ کو کہتے ہیں۔ کہ ہم اس راہ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چلے جاتے تھے بحالیکہ ہمارے ارد گرد شیر دہاڑیں مارتے۔ دونوں شہروں میں ۱۲ مرحلہ کی مسافت ہے۔ مگر اللہ کے فضل سے ہم ہر طرح محفوظ رہے اسی پر توکل کرکے ہم شیروں کی دست درازی سے بےخوف ہو گئے۔ سو ہم اسی طرح شیروں کی دہاڑوں میں بدحواس ہوئے چلتے رہے تا آنکہ جب باگڈھ اور ہمارے مابین نصف مرحلہ کا فاصلہ رہ گیا تو ہماری پیشوائی کرنے کے لئے وہاں کا بادشاہ راجہ علی شاہ نکلا۔ کہ وہ سید مذکور کے ہاتھ پر بیعت ہوا تھا۔ یہ بادشاہ راجہ بخت بلند مذکور کا فرزند ہے بڑی جمعیت کے ساتھ ہمارے استقبال کو نکلا یعنی کہ اپنے سواروں پیادوں اور جھنڈوں سمیت۔ اور اسی روز اس نے عام دعوت کی۔

پھر جب محرم کی ۲۵ تاریخ ہوئی تو ہم راجہ کے ہمراہ باگڑھ میں داخل ہوئے۔ راجہ پادشاہ کو کہتے ہیں۔ ہم امیر شیر خاں
کے دولت خانہ پر اُترے جو یہاں کا دیوان تھا اُس نے ہمارے لئے معقول روزینہ مقرر کر دیا۔ ایک رات ہمیں ایک
غیر معقول بات سے سابقہ ہوا۔ وہ یہ کہ ہمارے شیخ مذکور گانے کے بڑے شائق تھے سُنتے ہی اُن پر وجد کی کیفیت طاری
ہو جاتی تھی۔ اُنکے ہاں صوفیۂ کرام کے معمول کے مطابق چند گوّیے ملازم تھے۔ کہ صوفی لوگ بالاجماع یہی کہتے ہیں کہ سماع
ظاہر میں فتنہ اور باطن میں باعث عبرت ہے۔ سو جو عبرت سے باخبر ہو اُس کے لئے گانا سُننا جائز ہے۔ القصہ ایک رات
راجہ مذکور نے آن کر اثنائے گفتگو میں سید صاحب سے کہا کہ میرے ہاں تین گوّیے ہیں جو صفائے گلو حُسنِ لہجہ اور راگوں سے باخبر
ہونے میں اپنے نظیر نہیں رکھتے پہلے یہ امیر عالم علی خاں کے خاص گوّیے تھے جو سید عبد اللہ خاں وزیر فرخ سیر شاہِ ہند
کا بھانجہ تھا۔ مگر جب امیر عالم علی خاں اور وزیر نظام الملک میں لڑائی ہو گئی اور مقدم الذکر مارا گیا تو اوس کے تمام حاشیہ
نشین بکھر گئے اور یہ تینوں گوّیے جو باہم بھائی بھائی ہیں راجہ علی شاہ کے ہاں پہنچے اس نے اونپر بہت انعام و اکرام
کیا اور آن کو سالانہ پانچ سو روپیہ پر ملازم رکھ لیا۔ یہ سب کچھ علاوہ گھوڑوں، خلعتوں، طعام اور دیگر انعام و اکرام کے ہے۔
سید نے راجہ سے کہا کہ اول ان کو میرے پاس بھیجدو تاکہ میں اون کو جانچ لوں راجہ نے اونکو اپنے بڑے فرزند بادل شاہ
یعنی شاہِ ابر کے ہمراہ سید کے ہاں بھیجا۔ سید نے اُن سے موسیقی کے متعلق جس سے وہ باخبر تھے بات چیت کی تا آنکہ
وہ ایک ہندی راگ کا ذکر کرنے لگے جس کو دیپک کہتے ہیں۔ یہ راگ عالم کے عجائبات میں سے ہے۔ اس کی ایک راگنی
ہے جس کو تُمنجری کہتے ہیں اور وہ بھی عجائبات میں سے ہے اس کے جاننے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ گوّیوں نے
کہا کہ ہم اس کو اچھی طرح جانتے ہیں اور گا بھی سکتے ہیں۔ اس پر سید نے اون کو حکم کیا۔ شہزادہ سید کے ایک پہلو پر کھڑا
تھا اور اُس کے آدمی ہاتھوں میں ڈھالیں اور تلواریں لئے اُس کے سر پر کھڑے تھے۔ مجلس میں کوئی ۲۰ اُمرا وغیرہ بھی
موجود تھے۔ جونہی ان گوّیوں نے گانا شروع کیا ہم از خود رفتہ ہو کر مدہوش ہونے لگے گو ہمنے شراب پی نہیں تھی پھر
بھی متوالے ہو گئے۔ حتی کہ اگر کوئی چور اُچکا آن کر ہمارے کپڑے بھی اُتار لیجاتا تو ہمیں خبر تک نہ ہوتی۔ اسی حالت میں
ایک گھڑی سے زیادہ وقت گذر گیا۔ ایک فقیر شاہ عنایت اللہ جو ہمارے ہمراہیوں میں سے تھا ہمارے درمیان اسی
حالت میں آیا۔ وجد و حال اُس کے دماغ پر پورے طور پر مسلط ہو گیا اور اس کے اندر قوتِ تمیز باقی نہ رہی۔ کچھ آگے
بڑھ کر اوس نے شاہزادہ کی تلوار جو وہیں پڑی تھی اُٹھالی۔ ادہر ہم سب یہ ماجرے آنکھوں سے دیکھ رہے تھے
مگر کسی میں اتنی قدرت نہ تھی کہ اُٹھ کر اُس کے ہاتھ سے تلوار چھین لے۔ ادہر فقیر نے تلوار کو نیام سے نکالا اور اُسکی
نوک اپنی ناف پر رکھ کر پورے زور سے دبائی۔ ہمنے جو دیکھا تو تلوار اُس کی پیٹھ سے چمکتی ہوئی نکل رہی تھی۔ فقیر کا

تو خاتمہ ہوگیا۔ ہم سب یہ ساری کیفیت دیکھتے رہے مگر کسی میں اتنا یارا نہ تھا کہ اس کو منع کرے یا نہیں از مرگ اوس کو زمین پر سے اٹھالے۔ یہ سب کچھ اس راگنی کا اور علی الخصوص اس کو صبح کے وقت گانے کا نتیجہ تھا۔

پھر جب ۱۰ رصفر ۱۲۳۳ھ کو صبح ہوئی تو ہم باگڑہ سے برہانپور کی طرف چلے۔ اثنائے راہ میں ہمیں ایک شہر اسلام نگر نامی ملا جہاں ایک مستحکم قلعہ ہے۔ یہاں کا حاکم امیر دوست محمد خاں افغانی ہے جو نہایت دلیر مظفر اور کریم النسان ہے۔ یہ سلیمانی[۵] ہے خالد بن الولید رض کی اولاد میں سے ہے۔ ہم اس کے قلعہ میں مقیم ہوئے تین روز نہایت عزت و توقیر کے ساتھ اسکے ہاں رہے۔ پھر وہاں سے روانہ ہوکر تیسرے دن دریائے نربدہ کے کنارے پہنچے۔ اس دن دریا کو عبور نہ کرسکے۔ سو رات وہیں گذاری اور دوسرے دن کشتیوں میں بیٹھ کر عبور کیا۔ پھر ہمیں راستہ میں ایک شہر سے ہنڈیا ملا۔ یہاں ایک پختہ قلعہ ہے اور ملا دو پیازہ کا مزار بھی یہیں ہے۔

پھر ۴ ربیع الاول کو ہم راجہ فتح سنگھ کی معیت میں کرائی کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں ہم تین روز بہت اطمینان سے رہے۔ پھر وہاں سے کوچ کرکے بیابانوں میں چلتے رہے پھر جب ۸ ربیع الاول ہوئی تو دارالسرور برہانپور میں پہنچے اور سید کریم جناب احمد دمشقی المخاطب نواب زین الدین خاں مذکور کے دولتکدہ پر فروکش ہوئے۔ انکی سید بدر سے کچھ قرابت ہے۔ کہ سید کے والد نے دمشقی کی بھتیجی سے عقد کیا تھا۔ ان کے بھائی سید عمر دمشقی تھے۔ ان کا خطاب بھی زین الدین خاں تھا ان کے مرنے کے بعد ان کے بھائی کو انہیں کا منصب اور خطاب دیا گیا۔ القصہ ہم انکے ہاں بہت عزت و اکرام کے ساتھ رہے۔

پھر ۱۲ شوال ۱۲۳۳ھ کو ہم برہانپور سے نکل کر راہ گرائے سورت ہوئے۔ راستہ پرخطر تھا اس لئے قریباً ایک مرحلہ چل کر ہمنے دشمن کے ایک ہوشیار آدمی کو مبلغ ستر روپیہ پر بطور بدرقہ نوکر رکھا۔ یہاں بدرقہ کو نایک کہتے ہیں۔ القصہ ہم دشمن کی زمین میں نایک کی موجودگی کے باعث بے خوف و خطر سفر کرتے رہے تاآنکہ شہر نباپور میں پہنچے جو دشمن کا شہر ہے پہلے یہ سلطان کا تھا اور اب اوس پر غنیم قابض ہوگیا ہے۔ شہر کا سردار بلوچی ہماری پیشوائی کو بڑی دھوم دھام سے نکلا ہماری خوب آؤبھگت کی اور ہمارے ہمراہ تین سوار اور تین پیادے کردئے تاکہ ہمیں بلا مزاحمت بندرگاہ سورت تک پہنچادیں۔

---

۵ عرب لوگ اسی بنا پر افغانی کو سلیمان کہتے ہیں۔ مگر افاغنہ کا سیف اللہ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہونا گو افاغنہ کو بڑا دعویٰ ہے مگر محقق نہیں ہوا

پھر ہم ۱۹ شوال کی صبح کو بخوشی بندرگاہ سورت پر پہنچے اور مرجان شامی کے محلہ کے ایک مکان میں اترے ساری
ت جاتی رہی اور دوست احباب سے ملے۔

پھر جب ۱۴ ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ کی صبح نمودار ہوئی تو ہم بندرگاہ سورت سے احمد آباد کو روانہ ہوئے۔ ہمارے
و یہ یہ اصحاب تھے حاجی عبدالنبی بن حاجی کاظم درویش، اُن کے خسر علی کربلائی اور حاجی حسن الدورقی۔ راستہ میں
راگذر انگلیشور، بھروچ اور بڑودہ کیطرف سے ہوا۔ ہم ان شہروں کا حال پہلے لکھ آئے ہیں۔ پھر ہم بڑودہ سے نکل کر
ناپیر کے راستہ پر ہو لئے۔ یہ بڑا منحوس پُرخطر اور مورد آفات راستہ ہے۔ یہاں کے کولی کفار کا پیشہ بجز جنگ و جدل کے اور
نہیں۔ ان کا کوئی مذہب نہیں معلوم ہوتا۔ ہم بہ توفیق الٰہی ان کے ملک میں دو مرحلے چلے۔ پھر تیسرے دن نہر نربدا
کنارے پہنچے۔ یہاں کولیوں نے ہمیں آن لیا اور قافلہ کے لوگوں سے ایک معتدبہ رقم وصول کی۔ تب جاکر ہمیں نہر نربدا
ورکرنے دی۔ ہمنے عصر کے قریب بعد ہزار دقت نہر عبور کی۔ اتنے میں دوسری طرف سے کچھ اور لوگ آکر بولے کہ
استہ میں لٹیروں کی ایک ٹولی قافلہ کے انتظار میں پڑی ہے۔ الغرض اس بہانہ سے انہوں نے بھی ایک رقم وصول کی
لہ قافلہ کو کسی اور راہ سے لیچلیں آخر ہمیں رات کو انہیں کے ایک گاؤں میں بسیرا کرنا پڑا جہاں ہمنے نہایت رنج و تعب
رحسرت والم سے رات گذاری۔ رات بھر نہ سوئے اور علی الصباح روانہ ہوگئے ہمیں مال و جان کی سلامتی کی امید
تھی۔ آخر ان کے ملک سے قریب زوال نکل گئے پھر انہیں شیاطین کے ایک گاؤں میں پہنچے جس کے حاکم کا نام باوجی تھا
اپنے ہمراہ کولیوں کا ایک جم غفیر لئے ہوئے قافلہ لوٹنے کے ارادہ سے نکلا مگر ہمنے کچھ مال پیش کش کرکے پیچھا چھڑالیا۔
ر ہم مغرب کے قریب شہر نڑیاد میں پہنچے یہ شاہی ممالک محروسہ میں سے ہے۔ یہاں نہایت لطیف جلیبیاں بنتی ہیں
ب اور چیز دودھ کی ہوتی ہے جس کو لڈوا (لڈو) کہتے ہیں جو نہایت پُرلطف ہوتی ہے۔ یہیں ہمنے رات گذاری اور
ن کو قیلولہ کیا پھر اگلی رات سوئے۔ اور تڑکا ہوتے ہی نکل کھڑے ہوئے اور پُرامن شاہی راستہ میں چلتے رہے
آنکہ قریہ محمود آباد میں پہنچے۔

یہاں سے چل کر ۲۲ ربیع الثانی کو بوقت عصر شہر گجرات (احمد آباد) پہنچ گئے یہ نہایت عمدہ اور شاندار شہر
ہے۔ اللہ نے زمین کو برکت دی ہے اس کا منظر چشم بینا کو خیرہ کر دیتا ہے۔ ایک مصر (قاہرہ) دیکھنے والے نے مجھ سے
ماکہ بلامبالغہ یہ اُس سے بڑا ہے۔ یہ سلطان احمد کا بنایا ہوا ہے جو تیموری خاندان کے علاوہ ایک اور شاہی خاندان سے تھا اسی کے
ام سے یہ شہر نامزد ہے اس کی قبر بھی یہیں ہے جو نہایت عمدہ سنگ رخام کی بنی ہوئی ہے اس پر رنگا رنگ نقش و نگار بنے ہوئے
ہیں اسکا قبہ نہایت عجیب و غریب دستکاری سے بنا ہے جو بنانے والے کی حکمت و دانش کا پتہ دیتا ہے اسکا مزار بہت بڑا ہے

دراوسکی خیراتیں بھی کچھ کم نہیں جو آج تک برابر فقرا و مساکین پر تقسیم ہوتی ہیں۔ شہر کی فصیل نہایت بلند اور مستحکم ہے قلعہ بھی مضبوط ہے اور شہر ایک بڑی نہر دسابرمتی) کے کنارے بسا ہوا ہے۔ یہاں عالیشان حویلیاں ہیں متور چاند ہیں پانی ہیں پرندے ہیں۔ بیش قیمت آم ہوتے ہیں جن کی خوشبو مشک و عنبر کیطرح مہکتی ہے اور جو نہایت ارزاں بکتے ہیں۔ یہاں سے دوسرے ممالک کو زنگارنگ اور قسم قسم کے کپڑے مثلاً سوتی کمخواب وغیرہ برآمد ہوتے ہیں۔ اسی شہر سے ولی کامل شیخ ہارون گجراتی منسوب ہیں جو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی صحبت سے مستفیض ہوئے تھے شیخ ہارون مذکور کا وصال مکہ مکرمہ میں ہوا تھا آپکا مزار سوق اللیل میں شریف احمد بن حازم کے گھر کے نیچے ہے اسپر ایک قبہ ہے جسکی زیارت ہوتی ہے اسی سے ولی عارف اور امام علامہ شیخ علی متقی گجراتی[۱] منسوب ہیں جن کی وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی اور جو جنۃ المعلیٰ (گورستان مکہ) میں مدفون ہوئے۔ آج تک یہیں آپ کی نسل موجود ہے۔ الغرض یہاں میں کوتہ پارچہ (شاید بیٹنے جوراہہ) میں سید کریم مولانا السید یوسف بن رئیس جلیل سید محمد نجفی کے دولت خانہ پر فروکش ہوا۔ سید محمد بڑے فیاض اور محسن بزرگ تھے زندگی میں بڑی عزت سے رہے تا آنکہ بندر ذیال میں سنہ ۱۱۳۰ھ میں داعی اجل کو لبیک کہی۔

میں گجرات کے گورنر امیر حامد خاں سے ملا جو وزیر نظام الملک کے چچا تھے نیز امیر شجاعت خاں اور اون کے برادران امیر بیرم علیخاں و امیر قلی خاں اور امیر رئیس مہر علیخاں اور اونکے صاحبزادے اشرف الدین خاں اور امیر خانہ زاد علیخاں اور تاجر کریم شیخ عبدالستار بن میاں عثمان، اور سوداگر حاجی کاظم درویش اور تاجر حاجی صالح اصفہانی سے بھی ملا۔ مؤخر الذکر نے میری خاطر و مدارات کی اور میں نے احمد آباد کے مشاغل دلپسند طریق سے انجام دیدیئے۔

پس جب ۲۶ جمادی الاولی سنہ ۱۱۳۷ھ کی شام ہوئی تو ہم توفیق ایزدی احمد آباد سے سید یوسف بن سید محمد نجفی کی معیت میں اور امیر کبیر مہر علیخاں کی رفاقت میں دیوحی کی طرف روانہ ہوئے جسکا ذکر پہلے آچکا ہے اس شہر کی گورنری بادشاہ نے مہر علیخاں کو بخشی تھی سید یوسف کا اس امیر کے بھائی پر کچھ قرض تھا جسکی مقدار ہندوستانی سکہ میں تیرہ ہزار روپیہ تھی سید نے اسی لئے امیر کی ہمراہی اختیار کی تھی کہ اون کا قرصہ ملکی پیداوار سے جمع کرکے ادا کر دیا جائے سو ہم باامن وامان چلتے رہے تا آنکہ سلامتی سے دیوحی پہنچے۔ امیر مذکور نے مجھے منصب احتساب پر فائز کرنیکا وعدہ کیا تھا جسکو ایفا کیا یعنی کہ مجھے بلدہ مذکورہ کا ناظر و محتسب کر دیا مگر افسوس دنیا نے ہمسے وفا نہ کی اور ہماری کاربرآری کے بعد ہمسے منہ موڑنے لگی سچ ہے کہ "اہل علم کے نصیب میں علم ہے اور جہال کی قسمت میں مال"، دنیا پر دل باختہ ہونا خراب و خیال کا بوجھ بننا ہے۔

---

[۱] دیکھو مرات احمدی ۲ × ۵۵۔

اسکا باعث یہ ہے کہ نواب رستم علیخاں نے بادشاہ سے شہر مذکور اجارہ پر حاصل کیا اور مہر علیخاں کو چار ماہ کی گورنری کے بعد معزول کردیا اور ہم بھی بعد حسرت دیاس وہاں سے نکلے ازاں بعد رستم علی خاں نے سید یوسف علی خاں کے اوس قرضہ کی کفالت کی جو اوسکا اوس کے خسر مہر علیخاں کے ذمہ واجب الادا تھا۔ سو ہم بھی پلٹے اور اُسکے ہاں تقریبًا دو ماہ ٹھہرے مگر سید مذکور کو دو ہزار سے زیادہ رقم نہ ملی۔ جب دیکھا کہ ٹالم ٹول ہو رہی ہے اور ملتا ملاتا کچھ نہیں تو سید کو وہیں چھوڑ کر ہم احمد آباد کو روانہ ہو گئے۔ ادہر سید نے اپنے خسر مہر علیخاں سے باقی قرضہ کا تقاضہ کیا تو بعد مدت مدید کہیں تین ہزار اور اُگلوائے۔

سنہ ۱۱۳۰ھ

پھر ۲۱ محرم سنہ ۱۱۳۰ھ کو ہم احمد آباد سے مشہور بندرگاہ کھمبایت کی طرف روانہ ہوئے جو کبھی ہندوستان کے بڑے بندروں میں شمار ہوتا تھا مگر اب ویران پڑا ہے اور اوسکا دسواں حصہ بھی باقی نہیں۔ یہاں ہم رئیس مرزا زمان کھمبایتی کے دولت خانہ پر فروکش ہوئے۔ پھر ۲۰ محرم الحرام سنہ ۱۱۳۰ھ کو ہم جہاز میں سوار ہو کر کھمبایت سے سورت گئے اور ۲۵ محرم بندر مذکور میں بخیر و عافیت داخل ہوئے اور یہیں ٹھہر گئے۔

یہاں ہم ادیب فاضل شیخ عبد المحسن بن شیخ تاج الدین القلعی مفتی مکہ سے ملے نیز ان اصحاب سے ادیب کریم شیخ احمد بن علان شریف مکہ ادیب کامل سید عبد اللہ بن سید محمد السلفیتی القدسی اپنے استاذ علامہ حضرت سید عبد اللہ بن سید جعفر باعلوی ملقب بہ مدھر علامہ سید جعفر صادق عیدروس، سید اسمٰعیل عطا اللہ، اونکے فرزند سید اسعد سید عبد الرحمن قسطنطینی سید عبد الرحمن امین، شیخ عباس حانی شیخ محمد دمشقی، قاضی مصطفےٰ بن قاضی جدہ قاضی احمد۔ یہ تمام بزرگ بیت اللہ کے باشندے ہیں اور غریب الوطنی نے انہیں یہاں ڈالدیا ہے اللہ ہم سب کو واپس وطن پہنچائے۔ آمین۔

پھر یکم ربیع الاول سنہ ۱۱۳۱ھ کو ہم بمعیت شیخ احمد بن علان شریف مکہ سورت سے شاہجہاں آباد کی طرف روانہ ہوئے راستہ میں احمد آباد کیطرف سے گذر ہوا جہاں ہم تین ماہ ٹھہرے شریف نے یہاں سے مقررہ قمیص مول لیں پھر احمد آباد سے شاہجہاں آباد کو ہو لئے اس سال دکن میں بہت بڑی ٹڈیاں آئی تھیں ایک ایک ٹڈی بالشت بھر کی تھی۔

اس سال کے وقائع میں سے یہ ہے کہ امیر حامد خاں جو وزیر نظام الملک کے چچا تھے احمد آباد کے گورنر تھے۔ امیر شجاعت خاں بھی جو اوس وقت کے اکابر میں سے تھے وہیں مقیم تھے بادشاہ نے حامد خاں کو معزول کر کے سربلند خاں کو اوسکی جگہ تعینات کیا جو اوسوقت بادشاہ کی ڈیوڑھی پر حاضر تھا۔ شجاعت خاں کو شاہی حکم ملا کہ سربلند خاں کے پہنچنے تک تم شہر کا انتظام کرو اور تمام اختیارات تمہیں دیئے جاتے ہیں۔ شجاعت خاں نے گجرات کے تمام اُمراؤ کو طلب کیا اور شاہی فرمان پڑھ سنایا۔ تمام چھوٹے بڑے امراؤ نے فرمان کی تعمیل کی اور پھر شجاعت خاں نے حامد خاں کو پیام بھیجا کہ وہ قلعہ اور ملک اوس کے حوالہ کر کے احمد آباد سے نکل جائے۔ وہ نہ مانا اور آمادۂ عصیاں ہوا۔ دونوں کے مابین شہر کے وسط میں تیر

شب و روز مسلسل خونریز جنگ رہی اور توپیں چلیں پھر مجبوراً حامد خاں کو نکلنا پڑا اور شجاعت خاں نے اوس کی جگہ سنبھالی ادہر حامد خاں مسلسل پانچ دن کنکریہ طلاؤ[۵] (تالاب) پر مقیم رہا۔ یہ تالاب پتھروں سے پختہ کیا ہوا ہے اس کے گرد انواع و اقسام کے پھل پھول ہیں جن کے اوپر پرندے چہچہاتے رہتے ہیں۔ پھر حامد خاں وہاں سے کوچ کرکے دکن پہنچا تاکہ اپنے برادر زادہ نظام الملک مخاطب بہ قلیچ خاں بن غازی الدین خاں سے کمک لیکر شجاعت خاں سے احمد آباد چھین لے۔ سو نظام نے ستر ہزار سواروں سے اُسکی امداد کی جو تمام تر غنیم (مرہٹے) کے جنگجو تھے اور جن کا قائد اعظم (کنتاجی) نامی ایک دیو عفریت تھا۔ الغرض۔ حامد خاں اس لشکر جرار کو ہمراہ لیکر احمد آباد کی طرف بڑھا۔ اب اس قصہ کو یہیں چھوڑو۔

ادہر شیخ احمد بن علان ہم لوگوں کی معیت میں احمد آباد سے شاہجہاں آباد کے ارادہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ چار دن چلکر ہم کرنج نامی بستی پر پہنچے یہاں ایک دن ٹھہرے جب اس سے روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو اطلاع ملی کہ حامد خاں بہمراہی لشکر آج شام کو یہاں پہنچ جائیگا۔ سو سچ مچ عصر کے بعد حامد خاں غنیم کا ایک جرار لشکر لیکر آن پہنچا دوسرے دن ہمارے پاس ایک آدمی بھیجا کہ اگر اسکو اپنے قریب گاڑھے رہو گے تو غنیم (مرہٹوں) کے شر سے محفوظ رہو گے۔ پھر اوس نے امن و امان کا پیام پہنچایا اور شیخ احمد بن علان کو طلب کیا سو شیخ اپنے ہمراہ کچھ تحائف لیکر چلے جن میں ایک بڑی شمشیر قاقم کی پوستین اور طنچہ کی ایک جوڑی تھی اوس نے شیخ کی خوب آؤبھگت کی اور اونکو غنیم کی چھیڑ سے سلامت و امان کی خوشخبری دی۔ پھر شیخ نے حامد خاں سے شاہجہاں آباد جانے کی اجازت چاہی مگر اوس نے بدیں علت منع کیا کہ اثنائے راہ میں کولی ڈاکو بکثرت ہیں جنہوں نے رہزنی کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے اور قافلوں کے قتل و غارت کو اپنا شیوہ اور کہا کہ ہمارے ساتھ احمد آباد چلئے تا آنکہ حالت پُر سکون ہو جائے۔ سو ہم بتعمیل حکم بادل ناخواستہ احمد آباد واپس ہوئے۔

سو ہم اس لشکر جرار کی معیت میں چلے تا آنکہ شاہی باغ تک پہونچے جو ایک نہایت شاندار بادشاہی باغ ہے اس کو اعظم شاہ بن اورنگ زیب نے نہر کے کنارے بنوایا تھا۔ ہم یہاں ذرا دن چڑھے پہنچے۔ اسی دم شجاعت خاں اپنا عظیم [۱۲۳] لشکر لیکر ہماری طرف بڑھا دونوں لشکروں میں مٹھ بھیڑ ہو گئی کشمکش و کوشش شروع ہوئی پرے باندھے گئے تلواریں سونتی گئیں اور ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اُتارنے لگے۔ یہ دن ہمارے حق میں بلا خیز تھا کہ ہر سمت سے توپوں اور بندوقوں کی گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ الغرض حامد خاں فتح مند ہوا یعنی کہ وہ شجاعت خاں سے دو چار ہوا دونوں نے تلواریں چلائیں اور تیر پھینکے حامد خاں نے اوسکی پیشانی پر تیر مار کر اوسکو ہاتھی پر سے گرا دیا اور آگے بڑھکر اوسکا سر کاٹ لیا۔ پھر اوسکا سارا خزانہ و مال و منال لوٹ لیا فلاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہ بات دُنیا کے رازہائے سربستہ

۵ دیکھو مرآت احمدی ۲ × ۱۲۳۔

ست ہے۔ ورنہ اگر ان دونوں کا مقابلہ کرو تو حامد خاں[1] کرتا ہے برتا نہیں اور شجاعت خاں بڑا فیاض اور کریم ہے جبکہ حامد خاں جہان بھر کا کنجوس مکھی چوس ہے۔ ولیکن یہ تقسیم ایزدی ہے اور مشیت الٰہی جس میں کسی کو دم مارنے کا یارا نہیں۔

القصہ حامد خاں مظفر و منصور ہو کر احمد آباد میں داخل ہوا۔ پانچ دن گذر جانے کے بعد اوس نے شجاعت خاں کے حقیقی بھائی امیر ابراہیم قلی خاں کو اپنے سامنے طلب کیا اور اُس کو امان دی ابراہیم کے دل میں اپنے بھائی کا قصاص لینے کا خیال لگا تھا۔ قلعہ میں گھستے ہی جونہی اُس کی نگاہ حامد خاں پر پڑی تلوار سوت کر اوس کے پیچھے لپکا حامد خاں بھاگا اور ابراہیم بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑا تا آنکہ وہ زنان خانہ میں پہنچا ابراہیم اون کو دیکھ کر نیز جھپٹنے کا خیال کر کے کچھ ہچکچا گیا گو دل میں آتش انتقام برافروختہ تھی۔ مگر جونہی کہ وہ قلعہ کی طرف بڑھا تو دیکھتا ہے کہ وہ پانچ ہزار جنگجویوں کے نرغہ میں پھنسا ہوا ہے جو شمشیر بکف ہیں مگر وہ بے محابا شیر ژیاں کی طرح اون پر لپکا اور پہلے حملہ ہی میں ساٹھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر ادہر وہ کثیر انبوہ اور ہاتھیوں سے ہر طرف سے گھر گیا تھا جنہوں نے اس کی تکے بوٹیاں کر ڈالیں سو اوس پر اس کا خاتمہ ہوا۔ یہ امیر بڑا مہمان نواز غریب پرور اور دلیر تھا حامد خاں کے ہاتھوں ان دونوں بھائیوں کا خاتمہ ہوا دنیا اسیطرح سفلہ پروری کیا کرتی ہے۔

— ادہر حامد خاں نے احمد آباد میں چند ہی روز گذارے تھے کہ اُسے یہ خبر ملی کہ رستم علیخاں جو ان دونوں مرحوموں کا تیسرا بھائی تھا تیس ہزار جنگجویوں کو لیکر آرہا ہے۔ رستم سورت کا گورنر تھا جب اوسے اپنے دونو بھائیوں کے قتل ہونے کی اطلاع ملی تو بہت گھبرایا اور یہ لشکر لیکر نکلا۔ حامد خاں سامنے آیا اور دونوں کا مٹھ بھیڑ قریہ اراس (داسو) میں ہوا جو احمد آباد سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ دونوں میں ہولناک لڑائی ہوئی۔ رستم نے اُس کو بہت بڑی شکست دی اور اُس کے لشکر کو سخت ہزیمت اوس کے خزانے لوٹ لئے اور اُس کے تمام راستے بند کر دیئے۔ حامد خاں دُم دبا کر بھاگا اور پیچھے پیچھے رستم اوس کا تعاقب کرتا ہا مگر افسوس کہ رستم کے اپنے لشکر نے اوسکے ساتھ غداری کی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ سال بھر غنیم سے لڑ رہا تھا جن کا سردار بیلوجی دبیلاجی، تھا جب اوس کو اپنے بھائیوں کے قتل ہونے کی خبر ملی تو یہ خبر اوس پر شاق گذری اس لئے اُس نے بیلوجی سے مبلغ ایک لاکھ روپیہ نقد دو ہاتھی اور ایک خلعت فاخرہ پر مصالحت کر لی کہ وہ دونوں حامد خاں کے خلاف یکدل ہو جائیں۔ مگر اندرونی طور پر بیلوجی حامد خاں کے خلاف اس سازش سے پہلے ہی آگاہ کر دیا۔ سو جب وہ دونو لشکروں میں مٹھ بھیڑ ہوئی تو رستم تین ہزار عرب جنگجویوں کے ساتھ لیکر حامد خاں پر حملہ آور ہوا

[1] عربوں نے چونکہ وہ ہندوستان میں خیرات اگھوانے آتے ہیں ہندوستانیوں کے حسن و قبح کا معیار اس بات کو بنالیا ہے کہ جو دے وہ حاتم اور جو نہ دے وہ حرامی بطال۔ تا دم تحریر یہ حالت باقی ہے۔ ہر چند کہ مصنف کے بیان پر اور مورخ بھی متفق ہیں۔

ب رہا اور ہنوز وہ اوس کے تعاقب ہی میں تھا کہ ملعون بلوچی موقع سے فائدہ اٹھا کر پچیس ہزار کی جمعیت سے شکر پر عقب سے حملہ آور ہوا صدہا آدمیوں کو قتل کیا اور رستم کے لشکر کو حوالی و اطراف کے گاؤں میں بھگا دیا اور ان ہیاد اور توپیں لوٹ لیں اور پھر اپنا توپ خانہ اور لشکر لیکر رستم اور اس کے ہمراہی عربوں کو گھیر لیا۔ تو حامد خاں ہی جان آئی اس لئے وہ بھی پلٹ کر اپنے سواروں کے ساتھ خم ٹھوک کر جم گیا۔ رستم علی خاں برابر اسی حالت مردوں لڑا کیا اوس کے بہادر ساتھی ایک ایک کرکے قتل ہوگئے اور اس کے ساتھ صرف پچیس عرب بہادر رہے۔ ن میں طرفین کے بے شمار آدمی کھیت رہے اور ہر روز حامد خاں کو اپنے بھتیجے کی طرف سے کمک پہنچتی رہی حتی کہ جمعیت ایک لاکھ ساٹھ ہزار جنگجو مرہٹوں پر مشتمل ہوگئی جو اٹھارویں روز تمام و کمال رستم پر حملہ آور ہوئی اور اوسکو قتل

٥

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

رستم بڑا جامع کمالات عالی ہمت اور غیور امیر تھا اگر دنیا نے کس کے ساتھ وفا کی ہے جو اس کے ساتھ کرتی پھر حامد خاں بیت کر خوش خوش احمد آباد واپس ہوا۔ ان تینوں بے نظیر بھائیوں کو قتل کرکے بادشاہ (محمد شاہ) سے سرکشی اختیار یا اور بے طرح ظلم شروع کردیا۔ اس نے شیخ احمد بن علان سے وعدہ کیا تھا کہ اوس کو بہت کچھ دے دلا کر بادشاہ روانہ کردے گا۔ مگر پھر وعدہ وفا نہ کیا بلکہ الٹا شیخ کے وہ تمام گھوڑے جو مبارک بن احمد شریف مکہ نے شاہ ے نے بھیجے تھے لوٹ لئے۔ انہی دنوں قمر الدین خاں وزیر شاہی کی پھوپھی بارادۂ حج بیت اللہ دہلی سے پہنچی تھیں۔

ں نے جو دیکھا کہ حالت بگڑ رہی ہے اور غنیم اور حامد خاں کے ہاتھوں ہر طرف ابتری اور بربادی پھا رہی ہے ان پریشان کن حالات سے اکتا گیا ہے تو اللہ کے بھروسہ وزیر کی پھوپھی کی معیت میں بندرگاہ سورت کی روانہ ہوگیا۔ سوہ ١ [١٣٥] رمضان ١١٣٨ھ کو وزیر کی پھوپھی کے ہمراہ چل کر بانکانیر پہنچے۔ حامد خاں نے غنیم کے پچاس انہ کردیئے تھے تاکہ بدذات کولیوں کی دراز دستیوں سے بچاؤ ہو سکے۔ راستہ میں کولیوں کے ہاتھوں بہیں تیں پہنچیں تا آنکہ ٢٨ رمضان المبارک کو بعون ایزدی سورت پہنچ گئے

٧ ہر محرم جمادی الاخری ١١٣٩ھ کو ملا محمد علی بن عبد الحی بن ملا عبد الغفور کے فخر اسلام نامی جہاز میں سوار ہوئے جس کی سنے اس طرح کہی ہے

فخذ تاریخ فخر الاسلام مینا — تماماً فی المعانی فیہ لطف
فخر اسلام کی تاریخ پوری لے لیجئے — جس کے معنی میں لطافت ہے

فبسم اللہ مجریہا دواما   وبسم اللہ مرساہا یحف

اللہ ہی کے نام پر یہ ہمیشہ چلے   اور اسی کے نام سے اسکا بندرگاہ گہرا ہو

میرا سفر بندرگاہ سورت سے رئیس عبد الرحمن بن عبد القادر ناخدا اور سید حسین بن سید محمد رفیع کی معیت میں ہوا۔ انھوں نے دوستی کا حق ادا کیا اور ان کی ہمراہی بندرگاہ مخا تک رہی۔ سو ہم ہندوستان کے وسیع سمندر میں چلتے رہے تا آنکہ اسی مہینہ کی ۱۸ تاریخ کی صبح کو خیریت سے عدن پہنچے۔

(مترجم - سفرنامۂ گجرات یہاں ختم کیا جاتا ہے باقی سفرنامۂ یمن وغیرہ ہمیں مطلوب نہیں)

اگست ۱۹۲۶ء — ۱۲ جنوری ۱۹۲۷ء

راجکوٹ و علیگڑھ۔

عبد العزیز المیمنی

ے یہاں جو دیئے تاریخ ۱۰۹۰۸ھ غلطی ہے۔ معلوم نہیں مصنف نے کس طرح حساب کیا ہے۔

نفسیات اور اکبر

(از جناب عابد علی صاحب عابدؔ بی۔اے۔ ایل ایل۔بی)

اکبر دورِ زوال کا شاعر ہے۔ لیکن ادوارِ انحطاط آفرین دور کی وہ تمام خصوصیات جو ہر ایک فرد میں پائی جاتی چاہئیں
یں نہیں۔ اس روشن مگر حیرت انگیز حقیقت نفس الامری کو ذہن نشین کرنے کے لئے چند ایک باتوں کو تفصیل سے بیان کرنا
ری ہوگا۔ یہ نفسیات کا ایک لطیف نکتہ ہے۔ کہ ہر ایک قوم کے مدارج ارتقا میں تہذیب و تمدن شاعری کے دوش
ں راہ ترقی پر گامزن ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدن کا عروج شاعری میں سطوت اور بلند آہنگی پیدا کر دیتا ہے شاعری
کی شاعری ہو جاتی ہے اسی طرح انحطاط و زوال کے اثرات شاعری کے زاویہ نگاہ کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ یہی
عری دل کے تمام جذبات کو مردہ کر دیتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ دورِ زوال کی افسردگی جذبات بہترین انفرادی شاعری
ی ہے۔ کیونکہ اس وقت شاعر واردات قلب کو بیان کرتا ہے۔ اور دور نشاط کی شاعری تیز پر سطوت اور باشوکت ہوتی
لیکن اس میں وہ انفرادی عنصر نہیں ہوتا جسے سوز و گداز کا خطاب دیا جاتا ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد یہ نکتہ قابلِ لحاظ ہے۔ کہ قانون ارتقا کے ہمہ گیر اثر کے تحت میں زوال پذیری ایک حد
تعین ہے اس کے بعد دورِ زوال کے تمام جذبات پھر ابھرنا شروع ہوتے ہیں۔ لیکن حیات جدید کی یہ سرعت اور شدت یقینی
قوم کو شاہراہ مستقیم سے ہٹا دیتی ہے۔ اس وقت جو شاعر اعتدال سے تجاوز نہ کرے اور حیات جدید کے تمام پہلوؤں
یاں طور سے ظاہر کرکے ایک خاص کشمکش ایک عظیم جد و جہد کا پیغام دیتا رہے۔ حقیقت میں وہی اصلی شاعر ہے۔ یہ تو سب
ہ لیکن اجتماع کی متحدہ رائے کے اثرات ہر ایک فرد کو جس کی رائے اجتماع سے اختلاف کے باوجود دور اندیشی اور اولوالعزمی
ی ہو جھک جانے پر مجبور کرتے ہیں اس وقت شاعر قائد کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نازک موقع پر ایک قائد اور شاعر کے امتیازی خصائل خلط ملط ہو جاتے ہیں۔
ی سطوت و نفوذ ذاتی جس کے بغیر کوئی قائد حقیقی معنی میں قائد نہیں کہلا سکتا شاعر میں بھی موجود ہوتا ہے وہ کبھی کسی
نفر رائے سے جو مضر ہو اتفاق نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی ذاتی وجاہت اور خود اعتمادی سے کام لیکر مستقل مزاجی سے اپنے
ں کو ادا کئے جاتا ہے۔ حتی کہ اس کی یہ مسلسل رواداری اجتماع کے قلوب پر اپنا نقش چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ اور آخر کار
نا کی تمام قوت ایک زبردست قوت ارادی کے مطیع ہو جاتی ہے۔ بس انہیں تمام نقوش تاثر کو قبول کرنا اور انہیں زبانِ شعر

سے ادا کرنا اکبر کا کمال ہے۔

یہ ایک عام خیال ہے کہ اس ملک کا ادب اس کی معاشری۔ تمدنی اور اصلاحی حالت کا آئینہ دار ہوتا ہے
کلیے کی تصدیق کے لئے آپ کو اکبر سے بہتر کوئی شاعر نہ ملے گا جس انداز سے اس نے قوم کے جذبات کی ترجمانی کی۔
دور ماضی کے تمام شاعروں میں نایاب ہے۔

یہاں ہمارا مقصد ان شعروں کو نقل کرنا نہیں۔ جن میں قوم کو ابھارا گیا ہے جہاں اکبر کے دور اندیش دل و دماغ
اجتماع کی پیروی نہ کرتے ہوئے ایک دوامی جدوجہد جاری رکھی ہے۔ ان کا تفصیلی بیان آپ آئندہ صفحات میں
یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس دور زوال کے تمام انحطاط آفرین خیالات سے اکبر کہاں تک متاثر ہوا؟

بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکبر نے کسی انحطاط آفرین جذبے کی ترجمانی نہیں کی۔ مگر اس کے کلیات کو غو
دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ان اثرات سے آزاد نہیں رہا۔ لیکن اکبر کا حقیقی کمال یہ ہے۔ کہ جذبات کے اس
پہلو کو اس نے اپنی جدت سے روشن کر دکھایا ہے۔ نفس کی جتنی کیفیتیں ہیں ان کا لازمی اصول یہ ہے کہ ارتقاء کے
کی ہر ایک ترتیب کے معکوس عمل سے متاثر ہوتی ہیں یعنی جو جذبات نفس انسانی میں سب سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں
سب سے اخیر میں انحطاط قبول کرتے ہیں۔ اور جو جذبات سب سے بعد میں ظاہر ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے سوا
ہو جاتے ہیں۔ اس عمل کے زیر اثر حیات کے ہر ایک پہلو پر افسردگی چھائی رہتی ہے۔ اور صرف کشاکش عمل ہی ا
شے ہے جو انسانی دل و دماغ کو ان روح فرسا خیالات سے چھٹکارا دلا سکے۔ اکبر عمل کی کشاکش پیدا کرنا چاہتا ہے۔
تہذیب سے بچ کر۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی کوشش کسی حد تک ناکام ہو کر افسردہ ہو جاتی ہیں۔ یہ افسردگی انحطا
کا پہلا زینہ ہے۔ مگر خیال رکھنا چاہئے۔ کہ اکبر کی افسردگی وہ درماندگی کی کیفیت میں جو بار دار منجمد ہوتی ہے۔ اور
کوئی ٹھوکر بیدار نہیں کر سکتی۔ اس کی افسردگی لطیف رقیق اور رنگین ہے اور چونکہ اکبر کی افتاد طبیعت صوفیانہ تھی
افسردگی میں ایک تسلیم و رضا کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔ جو روح رواں کی طرح مصرعوں کے ہر لفظ میں جاری و سار
کس پُر درد انداز سے کہتا ہے ؎

بلبلِ دل کے لئے ہر داغ گلشن ہے یہاں — ہر نفس راہ جنوں میں گل بدامن ہے یہاں
ہے تجلی نورِ حسرت کی ہر آہِ شعلہ بار — ہر تپش سینے کی برق طور ایمن ہے یہاں
شعلۂ غم سے دلِ سوزاں میں کیا جان آ گئی — روح پر در اختلاطِ برق و خرمن ہے یہاں
شعلہ ہائے غم سے ہے نشو و نمائے باغِ دل — دامنِ ابرِ کرم ہر برقِ خرمن ہے یہاں

محبت ہمیشہ سے ہر ملک کے شاعروں کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ مگر کسی شخص نے اب تک یہ کوشش نہیں کی۔ کہ محبت کے وہ تمام پہلو بھی دکھائے جائیں۔ جن میں گو ابتذال تو ہے۔ مگر جن پر حقیقت میں محبت کا جذبہ اساسی طور پر بنی ہے۔ ہر ایک شاعر نے محبت کو روحانی فرض کرتے ہوئے اس کو سراہا ہے۔ اس کی رنگینیاں اس کی خواہشات کی فراوانی۔ پاکیزگی اور تقدس کی قدر سے لیکر تعریف کی ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے۔ کہ اس، پرسوز جذبے سے کسی بھی نوع انسانی کا دل خالی نہیں۔ اس کی کیفیات اس قدر لطیف ہیں کہ پانی کے بلبلوں کی طرح ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ مگر نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے محبت کے جذبے کی تحلیل شاعروں کی تمام تعریفوں سے مختلف ہے۔

اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے حکماء کے دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک کا خیال ہے کہ قانون فطرت نے کسی شخص کو واحد نہیں پیدا کیا۔ بلکہ ہر ایک شخص کا ..... ایک روحانی عکس یا مثنیٰ بھی پیدا کیا ہے جس کے ساتھ اس کو بیحد مجالست اور دلبستگی ہوتی ہے" لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ دونوں ایک جگہ نہیں پائے جاتے۔ اگر کوئی انگلستان ہے تو دوسرا امریکہ۔ اس لئے عام طور پر معاشقے کی نشو و نما مشکل ہو جاتی ہے۔

دوسرے گروہ کا ادعا ہے کہ ہر ایک مرد و عورت میں بشرطیکہ ان کی صحت میں کسی قسم کا فتور یا نقص نہ ہو۔ معاشقے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور جہاں بھی کوئی باصحت جوان اور خوبصورت عورت باہم مل کر رہیں گے محبت پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ جب تک اجتماع کی بندشیں انہیں قیود رسمی سے مجبور رکھتی ہیں۔ بے شک یہ چنگاری سلگتی رہتی ہے۔ مگر جہاں انہیں کوئی ایسا موقع ملا کہ اجتماع نے ان دونوں کو ذرا سی بھی آزادی بخشی یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اسکے بعد ناممکن ہو جاتا ہے کہ کوئی طاقت ان دونوں کو ملنے سے باز رکھ سکے۔ یہ فطرت کا ایک اٹل قانون ہے اور توراث عمرانی میں شامل۔ ان باتوں سے ثابت ہو گیا ہوگا کہ جوان مرد اور عورت کے لئے اپنی آرزوؤں کو کسی خاص مرکز تک محدود رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے خیالات خود اختیاری طور سے معاشقے کی طرف راغب ہوں گے۔ ہاں یہی رغبت جب کسی خاص محبوب سے مختص ہو جاتی ہے۔ اور مجالست و دلبستگی ایک گہرے رشتہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تو اس کیفیت کو عشق کہتے ہیں۔ اس کیفیت کے بعد اگر محبوب نہ ملے تو سخت اضطراب اور کاہش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور جب تک محبوب سے ملاقات حاصل نہ ہو چین نہیں آتا۔ مگر یہ تمام کیفیتیں صرف عشق پر ہی منحصر ہیں۔ کسی جوان آدمی یا عورت کو ایک عرصے تک اپنی جنس مقابل سے ناآشنا رکھئے اور پھر دیکھئے کہ اس کے نفس میں بھی وہی اضطراب اور کاہش پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔ محبت کی تعریفیں تو بہت سی ہو چکی ہیں جن میں سے شیفتہ کا یہ شعر مقبول خاص و عام ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

گر ایسی کوئی تعریف نہ کی گئی تھی۔ جس سے محبت کا اساسی جذبہ بھی ظاہر ہو۔ اکبر کی ایک تعریف سننے کے قابل ہے۔ کہتا ہے ؎

کیا بلائے جاں جوانی میں طبیعت ہو گئی
جس حسیں سے مل گئی آنکھیں محبت ہو گئی

محبت کی یہ تمام کیفیات بیان کرتے وقت غالباً ہوس کے مظاہر کا ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ مظاہر محبت کے لوازمات ہیں اور اس کے بغیر محبت میں وہ شدت اور حدت نہیں پیدا ہوتی۔ جو محبت کی جان ہے۔ پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ محبت کے ساتھ ہی ہوس کے مظاہر کیوں لذیذ اور دل آویز معلوم ہوتے ہیں۔

اس کا جواب دینے کے لئے غالباً نفسیات کا ایک نکتہ کافی ہو۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز نہایت محبوب ہو اس کے ذرائع حصول بھی لذیذ اور دل آویز ہو جاتے ہیں۔ اور انسان ان کو بھی اسی طرح محبوب سمجھنے لگ جاتا ہے جس طرح شئے موصوف کو۔ اس کی ایک ادنیٰ سی مثال دولت کی ہر دلعزیزی ہوگی۔ بہت کم اشخاص ایسے ہونگے جن کے ذہن میں دولت کی عشرت کا تصور ان محبوب اشیاء کی وجہ سے پیدا ہو۔ جو دولت کے بدلے خریدی جاسکتی ہے۔ دراصل دولت کی محبوبیت کی وجہ یہی تھی۔ کہ اس کے بدلے زندگی کی تمام عشرتیں خریدی جاسکتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہی حصول عشرت کا ذریعہ خود بھی ایک احساس عشرت ایک کیفیت انبساط کا باعث ہونے لگا۔ مگر اب تک اس کی یہی وجہ تھی کہ دولت کے حصول کیساتھ ہی عشرت کے حصول کا خیال آتا تھا مگر بعد میں دولت بذات خود عزیز ہو گئی۔ اور اب ہم اپنے ذہن میں دولت کو ہی معبود و مقصود سمجھ کر اس کے ذرائع حصول کو محبوب تصور کرنے لگے ہیں۔ اور دولت ایک انفرادی خوشی قرار پا گئی۔

اسی طرح شروع میں تو ہوس کے مناظر و مظاہر محض اسلئے عزیز تصور کئے جاتے ہوں گے۔ کہ وہ محبت کے لوازمات ہیں۔ مگر بعد ازیں رفتہ رفتہ انہوں نے بھی ایک مستقل انفرادی حیثیت اختیار کرلی۔ اور وہ بھی عشرت کا ایک امتیازی قرار دیئے جانے لگے۔ اگر یہاں تک بات ختم ہو جاتی تو خیریت تھی مگر بعض شاعروں نے ہوس کے مناظر و مظاہر کو محبت کی پاکیزگی اور تقدس سے ناآشنا کر لیا۔ اور صرف انہیں کے مختلف پہلوؤں کو لے کر اپنے شعروں میں ادا کرنے لگے۔ ان کا خیال غالباً یہ تھا کہ نفس انسانی پر اگر اپنے اختیار سے بھی کسی جذبے کے مظاہر جسمانی طاری کرلئے جائیں تو رفتہ وہی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کئی شاعروں نے محض ہوس کے مناظر و مظاہر سے محبت کے مشکل الحصول جذبے کو تہیج کرنا چاہا لیکن وہ بہت دور نکل گئے۔ انہیں میں کا ایک کا مشہور شعر ہے۔

پہ سیر ہے کہ دوپٹہ اڑا رہی ہے صبا
جو وہ چھپاتے ہیں سینہ کمر نہیں چھپتی

اکبر نے بھی انہیں مناظر کو بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی قوت احساس۔ مدارج ارتقا کے زیر اثر تمدن جدیدہ کے مطابق ہوگئی۔ اسی لئے اس کے جذبات ہوس میں بھی شستگی ہے۔ اور کہیں ذرہ برابر بھی سوقیانہ رنگ نظر نہیں آتا۔ ہاں البتہ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اخلاقیات کو ان مناظر سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ بھی ایک منضبط اصول ہے۔ جسقدر اعمال انسانی حیات میں براہ راست ممد و معاون ہوتے ہیں۔ ان کو سوسائٹی نگاہ اکراہ سے دیکھتی ہے۔ کیونکہ محبت ہی جس کا انتہائی معراج اتحاد جسمی ہے۔ توارث عمرانی کا ایک جزو ہے اور صیانت حیات کا ایک اہم عنصر۔ اسلئے اس کے تمام مناظر میں بھی بلند آہنگی کا پایا جانا سوسائٹی کے نزدیک برا ہے۔

لیکن اکبر ان خطرناک شاہراہوں سے بچکر چلتا ہے۔ وہ بہت کھلتا ہے تو ان شعروں میں۔ کہ ؎

امید بوسہ و ابرو و زلف و چشم کسے
مرے نصیب کہاں اور یہ بلائیں کہاں

ہوائے دست بھی ہے عنبر افشاں۔ عروج بھی ہے سر جبیں کا
نثار ہونے کی دو اجازت۔ محل نہیں ہے نہیں نہیں کا

کچھ انتظار میں موقع کے طول ہجر ہوا
کچھ ابتدائے محبت میں ہاں نہیں بھی ہوئی

یہ عمر یہ حسن یہ ناز و ادا اس پر یہ سنگار اللہ اللہ
مستی نگہ آف اف کی جگہ" سینے کا ابھار اللہ اللہ
گالوں میں ترے کندن کی دمک بالوں میں ترے عنبر کی مہک
سینے پہ جواہر کی یہ چمک اور اس پہ یہ ہار اللہ اللہ
بکھری ہوئی زلفیں دام بلا یہ جنبش مژگاں تیر قضا
تقویٰ کی عدو ہیں لغزش پا یہ رنگ خمار اللہ اللہ
خود خالق قدرت نازاں ہے۔ ہر چشم تماشا حیراں ہے

ہمیں ہنستے تھے زیادہ گناہ اکبر پر
ہمیں کو اب یہ ہے حسرت ہمیں نے کیوں نہ کیا

آخری شعر ہوس کی ایک عجیب کیفیت کا حامل ہے۔ قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی خاص وجہ سے گناہ کا اقدام نہیں سکتا وہ اپنے دل کی تسلی کے لئے تاویلیں گھڑ لیتا ہے۔ اور بادی النظر میں گنہگار کی لغزشوں پر ہنستا ہے۔ مگر ب وقت ایسا آتا ہے کہ اسکی طبیعت بار ریا پارسائی سے اکتا کر کوئی تنوع چاہتی ہے مگر اس وقت وہ حدت و رارت جو محبت کی جان باقی نہیں رہتی۔ یا اس کی کمزور فطرت ہر ایک گناہ کے اقدام سے ڈرتی ہے۔ اسی یفیت کو شبلی نے بھی ایسے ہی مؤثر پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیب ست سالک را
خجل گشتم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

احساس ندامت کا تاثر پیدا کرنے کے لئے غالباً ظرافت سے بہتر کوئی حربہ نہیں۔ اور اکبر کی افتاد طبیعت ستم ظریفانہ ہے۔ وہ دوسروں کی بیوقوفی پر ہنستا ہے مگر ضروری ہے کہ اکبر کی ہنسی کو سمجھنے کے لئے اس بات کی کوشش ی جائے کہ خود ہنسی کا راز کیا شئے ہے۔ معمول ہے کہ ہر ایک قسم کی بدہیئتی کو دیکھ کر ہمیں خواہ مخواہ ہنسی آجاتی ہے وئی شخص خلاف معمول لمبا ہو یا موٹا ہو تو اس کی دیکھ کر دل میں خواہ مخواہ ایک گدگدی سی ہوتی ہے چنانچہ ماہرین فسیات کا خیال ہے۔ کہ یہ اس زمانہ جہالت کی یادگار ہے۔ جب انسان بالکل وحشی تھا۔ اور جنگلوں اور غاروں میں رہا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ جنگجو اور ظالم تھا اور اپنے دشمنوں کو کسی خطرناک حربے سے قتل کر کے ان کی بدصورتی اور بدہیئتی پر ہنستا اس کا دستور قانون التزام عواید معینہ کے زیر اثر انسان کی ہر ایک حرکت جو اس سے ظہور میں آیا کرتی تھی۔ جو کسی تکلیف کو رفع کرنے میں معاون تھی۔ نظام عصبی میں اس طرح جاگزیں ہو گئی۔ کہ اب ائتلاف افکار سے فوراً ہمارا نفس اپنے اوپر وہ مظاہر طاری کر لیتا ہے۔ جو زمانہ گذشتہ میں کیا کرتا تھا۔

یہ تو ہوئی ہنسی کی حقیقت اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبر انسانی افعال و اعمال کی حماقتوں پر کسی حیثیت سے نظر ڈال کر

رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کی بدعادتیں چھڑوانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مضحکہ کیا جائے تاکہ وہ بار بار خیال کرتا رہے کہ مجھ اس بدعادت سے ندامت حاصل ہوئی ہے۔ اکبر نے اسی اصول کو مدنظر رکھ کر ظرافت کا نمایاں پہلو اختیار کیا ہے۔ لیکن اس کی ظرافت بالکل سطحی ہے۔ اس معانی بین السطور میں ہمدردی کا وہی جذبہ متحرک ہے جو ہر ایک بالغ نظر انسان کے دل میں ہونا چاہیئے۔

جدید تہذیب کے تمام اثرات کو اپنی قوم کے لئے مضر سمجھ کر اس نے شروع سے ہی ان تمام رسوم کی مخالفت شروع کی تھی۔ جو شرقی تمدن کے پرانے اصولوں سے متضاد تھے۔ اس کی قدامت پرستی کبھی اس بات کی روادار نہ ہوسکتی تھی کہ وہ تمام باتیں جن کی وجہ سے دوسری شعلہ بہ پیراہن اقوام بدنام ہیں۔ ہندوستانیوں میں رائج ہوجائیں۔ اس کا صدق دل سے یہی خیال تھا کہ مغربی تمدن سے وہیں تک فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک وہ مشرق کی تہذیب کو فنا نہ کردے۔ جدید رنگ تعلیم سے جو نقصانات پیدا ہوسکتے ہیں اکبر ان کا بخوبی اندازہ لگا چکا تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ مغربی تعلیم کی اندھا دھند تقلید۔ قوم کے نونہالوں کو فلسفہ اور الحاد کے خطرناک مسائل سے آشنا تو کردے گی۔ لیکن وہ نتائج جو اس تعلیم و تربیت سے پیدا ہو جانے ضروری ہیں ان کا علاج مغربی تعلیم کے بہترین ماہروں کے ہاں بھی نہیں۔ کیونکہ جن جذبات کی نشو و نما مشرقی فضا میں ہو رہی تھی ان کے لئے عمل کا میدان کوئی بھی نہ تھا مغرب میں تو مغربی جذبات پھل پھول بھی سکتے ہیں مگر مشرق ابھی ان اثرات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مغرب کی آزادیٔ خیال اور بے نیازی طریق۔ مشرق کی پابند اور اسیر کیفیت میں حاصل نہیں ہوسکتی علیگڈھ کالج کی نسبت انہیں شبہات کو بیان کرتے ہوئے اپنی معمولی ظرافت سے کام لیکر کہتا ہے ؎

خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے

بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے امیر زادے شریف زادے

لطیف و خوش وضع چست و چالاک صاف و پاکیزہ شاد و خرم

طبیعتوں میں ہے ان کی جودت دلوں میں انکے ہیں نیک ارادے

کمال محنت سے پڑھ رہے ہیں کمال غیرت سے بڑھ رہے ہیں

سوار مشرق کی راہ میں ہیں تو مغربی راہ میں پیادے

ہر اک ہے انہیں کا بیشک ایسا کہ آپ اُسے چاہتے ہیں جیسا

دکھائے محفل میں قد رعنا جو آپ آئیں تو سر جھکا دے

فقیر مانگے تو صاف کہہ دیں کہ تو ہے مضبوط جا کما کھا
قبول فرمائیں آپ دعوت تو اپنا سرمایہ کل کھلا دے

تبوں سے انکو نہیں لگاوٹ مسوں کی لیتے نہیں وہ آہٹ
تمام قوت ہے صرف خواندن نظر کے بھولے ہیں ذکی سادے

نظر بھی آئے جو زلف پیچاں تو سمجھیں یہ کوئی پالسی ہے
الکٹرک لائٹ اسکو سمجھیں جو برق وش کوئی مسکرا دے

نکلتے ہیں کر کے غول بندی بنام تہذیب و درد مندی
یہ کہہ کے لیتے ہیں سب سے چندے ہمیں جو تم دو تمہیں خدا دے

انہیں اسی بات پر یقیں ہے کہ بس یہی اصل کار دیں ہے
اسی سے ہوگا فروغ قومی اسی سے چمکیں گے باپ دادے

مکان کالج کے سب مکیں ہیں ابھی انہیں تجربے نہیں ہیں
خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر ہے کیسی منزل ہیں کیسے جادے

دلوں میں ان کے ہے نور ایماں قوی نہیں ہے مگر نگہباں
ہوائے منطق ادائے طفلی یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے

فریب دے کر نکالے مطلب سکھائے تحقیر دین و مذہب
مٹا دے آخر کو وضع ملت نمود ذاتی کو گو بڑھا دے

یہی بس اکبر کی التجا ہے جناب باری میں یہ دعا ہے
علوم حکمت کا درس ان کو پروفیسر دیں سمجھ خدا دے

مغربی تعلیم نے پردے کی نسبت بھی لوگوں کے دلوں کو متاثر کرنا چاہا تھا۔ مگر اکبر نے اس کی بہت شدو مد سے مخالفت کی۔ اور اگرچہ ہر طرف سے اس پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑیں ہوئیں مگر وہ اپنی دھن کا پکا ہی کہتا رہا۔ وقت نہیں آیا۔ کہ عورتوں کو پردے کی نسبت اتنی آزادی دی جائے۔ تعلیم نسواں کی نسبت وہ خوشگوار خیال رکھتا تھا مگر اس کے ساتھ جو پردے کے اٹھنے کی ضد تھی۔ وہ اس کو خطرناک محسوس ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ا

ظرافت کے بے پناہ تیر دلوں کو چھید ڈالتے تھے۔ کیونکہ خود اسکے کئی شعر شاہد ہیں کہ لوگ اس کے اس طرزِ عمل سے نالاں ہو کر اس سے بہت برا سلوک کرتے تھے ایک شعر ہے کہ ؎

حمایت پردے کی بیٹے تو کی تھی خوش مزاجی سے
مجھے کہلوا رہے گالیاں وہ اپنی باجی سے

لیکن یہاں بھی اس کی طبعی ظرافت اس کو کبھی نہیں چھوڑتی۔ وہ اجتماع کو متاثر بھی کرنا چاہتا ہے تو اسی طرح ان کے اعمال و افعال پر ہنس ہنس کر ؎

جو مُنہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس
چھپینگی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک

عوام باندھ لیں دوہر کو تھرڈ وانٹر میں
سکنڈ وفسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کبتک

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام آئیں گی چلمن کی تیلیاں کبتک

یہ مانا حضرتِ اکبر ہیں حامیِ پردہ
مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کبتک

مغربی تمدن نے جس طرح عوام کو متاثر کیا ہے اور جس طرح ان کے تمام جذبات کو محکوم کر لیا ہے۔ اس کے نتائج یہ ہوئے۔ کہ وہ روایات جن سے مشرقی تمدن کا دم خم تھا سب مٹ گئیں مشرقی تمدن کا نام بناد سفا کی جس سے ایک کا نقصان تو ہزار کا نفع ہوتا تھا۔ خود قوم کے دلوں میں بری لگنی جانے لگی۔ اور انگریزی خواں لوگوں کے دل جو محض مغربی خیالات کے پروردہ تھے۔ حقیقت میں یہ خیال کرنے لگے۔ اسلام بزورِ شمشیر ہی پھیلا تھا۔ اس تمام ضبط کی وجہ اور اس کے نتائج کو نمایاں کرنے کے لئے اکبر نے برقِ کلیسا لکھی طوالت کے خوف سے ہم ان کے کئی شعر حذف کر کے چند ایک شعر نقل کرتے ہیں کیونکہ یہ نظم مقبولِ عام ہو چکی ہے۔

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ،

دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ
جوہرِ تیغِ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینہ رو پہ نثار
اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک
موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد
مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ یہ وہم
میرے اسلام کو ایک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولے کہ تو پھر مجھکو بھی راضی سمجھو

محبت کے تمام لوازمات میں سے رشک و رقابت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جس کی مخلوط حیثیتوں نے شاعر دل کو ہمیشہ ایک گورکھ دھندے میں مبتلا رکھا ہے۔ ماہرین نفسیات اس کی تحلیل یوں کرتے ہیں کہ رشک ہمیشہ دو انفرادی جذبات کے تابع ہوتا ہے۔ رنج اور خوف۔ جب کسی محبوب ملکیت کی نسبت یہ خوف پیدا ہونے لگتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے قبضے میں چلی جائیگی تو جس وقت خوف کوئی مستقل اور معروف شکل اختیار کر لے رشک کے جذبے کی تخلیق ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ایک عاشق اپنے معشوق کی نسبت ذرا سا رقابت کا شبہ بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ محبت جس قدر مضطرب اور دیوانہ وار ہوتی چلی جائیگی۔ اسی مقدار سے رشک کے مدارج احساس بھی بڑھتے چلے جائیں گے۔ جہاں محبت زیادہ ہوگی وہیں شکایت اور اسی قسم کے فرعی جذبات بھی ہمرکاب ہونگے۔ صرف یہی حیات کی نزاکت و لطافت

اس حقیقت ثابتہ کی مظہر ہوتی ہے کہ رشک کرنے والے شخص کے دل میں محبت کا ایک سمندر موجزن ہے۔ پھر رشک کچھ انہیں چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا۔ جو محبوب کی جُدائی پر اختیار رکھتی ہوں۔ بلکہ محض محبوب کی جدائی کے خیال کے ساتھ اگر کسی اور شخص کا بھی خیال آجائے جس کی نسبت یہ شبہ ہو کہ شاید وہ فرقت کا باعث ہوگا تو خواہ مخواہ رشک کا جذبہ مشتعل ہو جاتا ہے۔ مگر عام طور پر یہ حالت سوسائٹی کے اسفل ترین گروہ کی ہو جاتی ہے ورنہ مہذب افراد ہیں جن میں شاعر اپنی کیفیات کی لطافت و نفاست کی وجہ سے ممتاز ترین شخصیت ہے۔ اس قسم کے رشک سے گریز کرتے ہیں جس میں ابتذال کا شائبہ ہو۔ کیونکہ محبوب کی ہر ایک بات پر شبہ کرنا اور بے سبب اس شبے کی سُست بنیاد پر رشک و رقابت کی ایک سر بہ فلک دیوار کھڑی کر دینا مذاق سلیم سے دور۔ اور ابتذال فطرت کی نشانی ہے۔ لیکن یہ کلیہ شاعروں پر صادق نہیں آتا۔ انہیں دنیا کی ہر ایک چیز سے عداوت ہے۔ ہوا محبوب کی زلفوں کو بکھرا کر ان سے اٹھکیلیاں کرتی ہے سورج کی شعاعیں تار نقاب بن کر روئے صبیح کے بوسے لیتی ہیں معنبر و معطر لباس ہمیشہ جسم نازنیں کو چھوتا رہتا ہے۔ خاک راہ ہر وقت قدمبوسی کرتی رہتی ہے۔ گلہائے چمن کو محبوب کے سیمین قدموں سے پامال ہونے کا فخر حاصل ہے مگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ ان تمام باتوں سے رشک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کیونکہ جذبہ رشک کا اہم تر عنصر یعنی انکے محبوب کی جدائی کا باعث ان میں کوئی بھی نہیں اور اس عنصر کے بغیر یہ جذبہ حقیقت میں تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ شاعروں کا مبالغہ آفرینی اور قوت احساس کی رواداری کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی کہنا پڑتا ہے کہ سوائے چند شاعروں کے جن کی مثال النادر کا معدوم کی سی ہے۔ ہر ایک نغز گو نے اسی طرح کی بے حقیقت چیزوں کی وجہ سے رشک کے صدمے اُٹھائے ہیں۔ اسی کے معاصرین کا تو کیا ذکر۔ کہ وہ اس کی شان کے آگے کچھ وقعت ہی نہیں رکھتے۔ خود غالب نے نفسانی جذبات پر اتنی قدرت رکھتا۔ جگہ جگہ اس قسم کے جذبات ظاہر کئے ہیں مثلاً

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

آتا ہے مرے قتل کو پر جوش رشک سے
مرتا ہوں اسکے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے ان کی ایک تار

ڈرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو،

اس جذبے کی تحلیل کی بہترین مثالیں آپ کو میر کے یہاں ملیں گی اور پھر یہ بات بھی ہے کہ کونسا ایسا جذبہ ہے جس میر نے بہترین طریق سے ادا نہ کر دیا ہو۔ لیکن اکبر نے بھی جس حسنِ بیان و اسلوب سے اس جذبے کی تشریح کی ہے وہ کچھ کم نہیں انہیں ہر جگہ اس بات کا خیال رہے کہ رشک کے لئے کافی سے زیادہ وجوہات موجود ہوں تاکہ سامع کے ذہن پر وہی نقوش تاثر ثبت ہو جائیں جن کی وہ ترجمانی کرنا چاہتا ہے چند ایک شعر سنئے۔

وہی میں ہوں کہ غیروں کو وہاں آنے نہ دیتا تھا
وہی میں ہوں کہ پہروں منتیں کرتا ہوں درباں کی

رشک آتا ہی جو تکئے پہ وہ سر رکھتے ہیں
صاحب حسن نہ کہیں ہو مرے زانو کی طرح

غیروں کو اپنے ہاتھ سے ہنس کر کھلا دیا
مجھ سے کبیدہ ہو کے کہا پان، لیجئے

وہ جانتے ہیں غیر مرے گھر میں ہے مہمان
آئیں گے تو مجھ پر کوئی احسان نہ کریں گے

میں کیا ہوں خوش اگر ان کو رہی نہ الفت غیر
ملیں گے اس سے محبت اگر نہیں ہی سہی

صبا بھی اس گل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا یہ کھٹکا
کوئی شگوفہ نہ ہیسہ کھلائے۔ پیام لائی نہ ہو کہیں کا

اب میں اس مضمون کو اکبر کے چند منتخب اشعار پر ختم کرتا ہوں۔ جن سے ان کے اخلاقیات کے نقطہ نگاہ کا اندازہ بخوبی ہو سکے گا۔

جو اپنی زندگانی کو حباب آسا سمجھتے ہیں،
نفس کی موج کو موجِ لب دریا سمجھتے ہیں:
گواہی دیں گے روزِ حشر یہ سارے گناہوں کی
سمجھتا میں نہیں لیکن مرے اعضا سمجھتے ہیں
شریکِ حال دنیا میں نظر آتا نہیں کوئی
فقط اک بے کسی ہے جسکو ہم اپنا سمجھتے ہیں
جو ہیں اہلِ بصیرت اس تماشا گاہِ ہستی میں
طلسمِ زندگی کو کھیل لڑکوں کا سمجھتے ہیں،

عابد

ادبیات

چلمن کی جھلک

(از جناب ابوالخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین ٹبالوی)

چلمن کی ایک خفیف جھلک، اللہ جانے، کسی آنکھوں والے کے لئے تڑپ کا کیونکر ایک عظیم الشان حادثہ پیدا کر دیتی ہے....؟ ما بعد یاد کچھ بھی نہیں رہتا۔ ہاں یاد کا ایک مکمل نقشہ قیامت تک ہاں باقی رہ جاتا ہے ایک زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اسی گذشتہ واقعہ کے دوبارہ دیکھنے کو آنکھیں پھر کچھ ثانیہ بھر کے لئے وہاں کُھب جاتی ہیں۔ یہ ایک حس ہوا کرتی ہے مگر دیکھنے والا تو ہوتا ہے اکثر معصوم..........!

وہ سمجھتا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ عالم متانت کے عہد شباب کی ایک ایک منزل میں قیامت تک کے نقشے نہاں ہوتے ہیں جو ظاہر و باطن دونوں صورتوں میں ایک خوشگوار لذت سے ہرگز کم نہیں۔ یوں تو کہنے کو ایک دیکھنا ہے مگر اللہ.......! یہ دیکھنا!! کسی آنکھوں والے کو نصیب ہو کہ سینہ میں ایک دل ہوتا ہے اور ہوتا رہتا ہے قیامت تک ذبح.......!

دل میں کسی آن دیکھی صورت کا میٹھا میٹھا درد اور اس درد میں میٹھی میٹھی لذتیں اس کی زندگی بھر کو دنیاوی تعلقات سے یک سو کرنے کے لئے اسباب بن جاتی ہیں۔ یہ ایک مرض ہوتا ہے مگر مریض کا رتبہ حاصل کرنے کے بعد وہ جب یہ معلوم کرتا ہے کہ اس کا مرض کبھی بھی تشخیص نہیں ہو سکتا تو وہ ایک غائبانہ درد ڈھونڈتا ہے۔ درد ایک حقیقی درد بنجاتا ہے اور اس کی کہنہ مگر اب تلخ لذتیں ہزاروں مشکلات کی منازل طے کرنے کے بعد اب اسے وہاں پہنچا دیتی ہیں جہاں خود اسے اپنی ایک ایک حرکت میں ہزار گویا لاکھ چلمن کی جھلک کا لطف حاصل ہے جس پر وہ پیار سے فنا ہونے کے بعد ابدی زندگی حاصل کر بیٹھتا ہے۔ اس دنیا کے بسنے والے اب اسے خدا بولتے ہیں۔

بلبل و قمری

عالم میں ایک باغ تھا بے مثل لاجواب   کرتا تھا حسن باغ جہاں جس سے اکتساب
گل جس کے عطر بیز تھے گل جسکی مشک بو

اک گوشہ میں تھے بلبل و قمری کے آشیاں   ہوتی تھیں شاخ گل پہ یہ جب دونوں نغمہ خواں
بادِ نسیم رقص دکھاتی تھی چار سو

قمری نے عندلیب سے اکدن کیا خطاب   دلدادہ سرو کی ہوں میں تو عاشق گلاب
طالب تو شاخ گل کی میں جویائے آب جو

پھولوں سے انس تجھکو نہ زنہار چاہیئے   گردن میں تیری رشتہ زنار چاہیئے
گر مجھ سے رسم وراہ کی ہے تجھ کو جستجو

سنکر کلام قمری کا بلبل ہوئی ملول   کہنے لگی یہ شرط میں کیونکر کروں قبول
فطرت کو تیری کیسے بناؤں میں اپنی خو

قمری نے عندلیب کو پھر یہ دیا جواب   ہوگا نہ اتحاد ہمارا یہ کامیاب
سنتی ہوں تیری نسل ہے دنیا میں جنگجو

پھر دونوں صحن باغ میں جنگ آزما ہوئیں   وقف جفا ہوئیں، ہدف ابتلا ہوئیں
پھولوں کی آنکھ سے بھی ٹپکنے لگا لہو

دوش صبا پہ اڑنے لگے تار آشیاں   فریاد کر رہا تھا ہر اک مرغ گلستاں
کیا خاک میں ملی ہے گلستاں کی آبرو

صیاد تھا کشادہ گلستاں میں جسکا دام   جو کر رہا تھا ان کی اسیری کے اہتمام
بر آئی اس کے دیدۂ حسرت کی آرزو

مرغانِ نغمہ سنج قفس میں ہوئے اسیر   ویراں ہوا وہ گلشن بے مثل و بے نظیر
بادِ خزاں اڑانے لگی خاک چار سو

محمود (اسرائیلی)

جلوۂ وحدت

حجاب چشم عالم ہے اگر تم کو عیاں ہو کر
سما جاؤ مرے دل میں مرا راز نہاں ہو کر

تلاش یار میں برسوں پھرے وہم و گماں ہو کر
نشاں اُس بے نشاں کا ہم نے پایا بے نشاں ہو کر

جدھر دیکھو تمہارے ہی تمہارے سارے جلوے ہیں
چھپو گے کس طرف آرائش بزم جہاں ہو کر

حجاب روئے روشن پردہ دار درد الفت ہے
کہ یاد حسن بھی دل میں رہی راز نہاں ہو کر

تمہیں جلوہ فروز دل۔ تمہیں آئینہ گیتی،
تمہیں تم ہو نظر میں زینت کون و مکاں ہو کر

دو عالم میں وہی ہے اک تجلی حسن پنہاں کی
بہت دیکھا بہت گذرے یہاں ہو کر وہاں ہو کر

تمہارے ہی کرشمے ہیں یہ ہست و بود کے جلوے
ازل سے تا ابد ہو تم۔ حیات جاوداں ہو کر

کوئی تو ترجمان درد دل ہو اپنا فرقت میں
مزا ہو راز الفت بول اُٹھے خود زباں ہو کر

ہمارا انکار از حسن و الفت چھپ نہیں سکتا
یہ افسانہ زمانے میں رہیگا چیستاں ہو کر

ہمیں ہم ہوں تمہیں تم ہو دوئی سب دور ہو جائے
رہے گر پردۂ چشم تمنا درمیاں ہو کر

دبا جاتا ہوں احسانوں میں فرط شرمساری سے
پس مردن بھی یاروں پہ رہا بار گراں ہو کر

پھنسا رکھا ہے دل نے موج گرداب محبت میں
ڈبو دے گی یہ کشتی بحر الفت میں رواں ہو کر

ہوئیں جب بند آنکھیں بخیہ دی شوق میں رونق
اُتر آئے نظر میں ذات کے جلوے عیاں ہو کر

رونق (دہلوی)

الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل

ز و شب، ارض و سما، شام و سحر کچھ بھی نہیں　　زور و زر، لعل و گہر، مال و منال کچھ بھی نہیں
و حسن و پری، حسنِ بشر کچھ بھی نہیں　　یوں تو کہنے کو بہت کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں
سب اُدھر ہی کے کرشمے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

خافونی ولا تخافوھم

غ و پیکان و سنان، تیر و تبر کچھ بھی نہیں　　دست انساں میں یہاں نفع و ضرر کچھ بھی نہیں
ہے قالین کا شیر اس سے خطر کچھ بھی نہیں　　دیکھنے ہی کا یہ عالم ہے اثر کچھ بھی نہیں
سب اُدھر ہی کے کرشمے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

من یضللہ فلا ھادی لہ

ب نہ ہو بخت موافق تو ہنر کچھ بھی نہیں　　گر نہ ہو جلوۂ خورشید سحر کچھ بھی نہیں
ب بصیرت ہی نہ ہو، نورِ بصر کچھ بھی نہیں　　جب خدا ہی نہ ہو ہادی تو خضر کچھ بھی نہیں
سب اُدھر ہی کے کرشمے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

ان القوۃ للہ جمیعا

ل سمندر سے ہوئے سینکڑوں چشمے جاری　　ایک ہی نور کے انوار ہیں، نوری ناری
ایک ہی جلوہ ہے سب کون و مکاں میں ساری　　ہے اسی ایک خدا کے لئے قوت ساری
سب اُدھر ہی کے کرشمے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

واللہ خلقکم وما تعملون

بو کسی زلف کی ہے نافۂ تاتاری میں　　کس کا انداز ہے یہ گل کی طرحداری میں
ہے تجلی کوئی اس روح کی بیداری میں　　کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں
سب اُدھر ہی کے کرشمے ہیں ادھر کچھ بھی نہیں

امجد (حیدرآباد).

ترجمات

دامنِ گلچیں

قرآن مجید چینی زبان میں

قرآن کریم صحیفۂ آسمانی ہونے کے لحاظ سے ہمارا دین وایمان اور ہمارے پاک برگزیدہ مذہب اسلام کی اصل الاصول ہے۔ کتاب مقدس کی اس اہمیت کے
ہ میں اس کی نشر واشاعت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ مقابلتہً بائبل کو دیکھئے کہ مشرق ومغرب کی کوئی
ن ایسی نہیں ہے جس میں اس کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ حالانکہ مسلمانوں کیطرف سے قرآن مجید کا کوئی صحیح معتبر اور متفق علیہ
انگریزی میں ابتک نہیں ہوسکا! دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے جو تراجم پائے جاتے ہیں انہیں "اپنوں"
بہ نسبت "غیروں" کا حصہ زیادہ ہے اگرچہ یہ ایک طرف "کتاب مبین" کی حقانیت کا ثبوت ہے تو دوسری جانب
انوں کی کم توجہی اور بے حسی کو بھی ظاہر کررہا ہے۔ کہ جس کام کو ہمیں کرنا تھا اسکو غیروں نے انجام دیا۔

ایسے ممالک میں جہاں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے قرآن مجید کے تراجم کی اشد ضرورت ہے۔ چین
مسلمانوں کی تعداد بیس کروڑ بتلائی جاتی ہے۔ لیکن ان کے مذہبی حالات جہانتک ہمیں معلوم ہوسکے ہیں ان سے
اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خواص بھی اپنے مذہب سے پوری واقفیت نہیں رکھتے۔ تا بعوام چہ رسد۔
ں لحاظ سے وہاں مذہبی لٹریچر کی اشاعت ایک شدید اور فوری ضرورت ہے۔ خصوصاً ایک معتبر ومستند
جمۂ قرآن کی۔

حال ہی میں مسٹر یو۔ ایل۔ اے محی الدین نے جو وہاں کے ایک مشہور مسلمان ہیں قرآن مجید کا چینی زبان
ں ترجمہ کرانیکی زبردست ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ اگرچہ یہ ترجمہ مولوی محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمہ پر سے
یا جائیگا۔ اور اس لئے ترجمہ در ترجمہ ہوکر اصل کے مطابق اس کی صحت میں بہت کچھ احتمال رہیگا۔ تاہم اسمیں شک
نہیں ہے کہ اگر اس قسم کی کوششیں جاری رہیں تو آیندہ چین کے مسلمانوں میں تحقیق کا مذاق پیدا ہوجائیگا۔ اور وہ
بی زبان کے مطالعہ کیطرف متوجہ ہوکر قرآن مجید کو اصل عربی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں بڑی مسرت
ہوتی اگر صاحب موصوف نے اصل عربی سے اسکا ترجمہ کرایا ہوتا۔

ہیں معلوم ہوا ہے کہ چینی زبان میں قرآن مجید کی ایک تفسیر عربی متن کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ جیساکہ
اب "پیام امن" میں محمد عبداللہ صاحب مناس نے بحوالہ "ریویو دی مونڈے مسلمان" (ج ۴ صفحہ ۴۵)
ن کیا ہے اور اس تفسیر کا نمونہ بھی دیا ہے اگر مترجم اس تفسیر سے افادہ کریں گے۔ تو قرآن مجید کے اصل متن کو
بنے میں بہت کچھ آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

ر صحیح اور مخرب اخلاق کتابیں نذر آتش، مغرب کے مدعیان علم و دانش اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ مطعون
کرتے رہے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ علم اور اہل علم کی سخت مخالفت
ہے، اور ان کی تصانیف کو نیست و نابود کرنے کے لئے طرح طرح کے جور و ستم روا رکھے ہیں۔ اور کہ علم اور اسلام اضداد
حیثیت رکھتے ہیں جو کبھی جمع نہیں ہو سکتیں۔ ان غلط اعتراضات اور نام نہاد الزامات کا جواب عقلی و نقلی حیثیت
ے بارہا دیا جا چکا ہے۔ نیز کئی مرتبہ الزامی جواب بھی پیش کر دیا گیا ہے یعنی کہ کلیسائے عیسوی کے ان شدید اور
تناک مظالم کی کہیں نظیر نہیں ملتی جو اس نے اور اس کے پیروؤں نے علم و حکمت کی مخالفت میں روا رکھے ہیں تاریخیں
ستم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ "تاریخ اپنے تئیں دہراتی ہے" تو اس شائستگی اور
ذیب کے زمانہ میں بھی اس قسم کی مثالیں زیادہ حیرت اور استعجاب نہیں پیدا کر سکتیں۔ جن میں کی ایک تازہ مثال
ال ہی میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔

حال ہی میں شکاگو ٹریبون کے نام ایک لاسلکی پیغام وہ عجیب و غریب منظر بیان کرتا ہے جبکہ ہرلن (امریکہ) کے
نڈامنٹلسٹ عیسائیوں نے نامور سائنس داں مسٹر ایچ۔ جی ویلس کی کتاب Outline History
ر دیگر کتابوں کو جلا دیا گیا۔ اس بنا پر کہ ہرلن بپٹسٹ چرچ کے پاسٹر ریونڈ جے۔ آر بلیک نے ان کے جلانے
نتویٰ صادر کر دیا تھا۔ اور اس "مجرمانہ لٹریچر" کو جناب ممدوح نے بنفس نفیس اپنی "مقدس قمچی" سے گھسیٹ کر سلگتی
وئی آگ میں شعلہ زن ہونے کے لئے جھونک دیا! کیوں؟ محض اسلئے کہ ریونڈ موصوف اپنے پیروؤں کو (جنمیں سے
یک شخص نے بھی کتاب مذکور کو دیکھنے کی تکلیف نہیں اٹھائی تھی) یہ سمجھایا کہ کتاب مذکور سے کتاب پیدائش کے متن
کی صریح تکذیب ہوتی ہے! جس پر اس جماعت کے ہر رکن نے یہ عہد کیا ہے کہ اب سے اگر کتاب مذکور کا کوئی نسخہ
ن کے شہر میں آئیگا تو وہ اسکے پڑھنے سے محترز رہیں گے!

نہ صرف کتاب مذکور ہی اس آگ کی نذر کر دی گئی، جو کلیسا کے احاطہ میں روشن کی گئی تھی، بلکہ زین گرے
کی کتاب "آخری انسان سے" تاش کی ایک گڈی، اور ایک ہفتہ وار اخبار بھی اس کے شریک حال تھے کیونکہ

ریورنڈ موصوف کی رائے میں زین گرے کی یہ کتاب عام متلاشیان حق کے لئے بہت زیادہ "مصالحدار" تھی۔ اور
تاش نیک آدمیوں کے تنزل و انحطاط کا کارخانہ تھا۔ جس کا مدمقابل صرف مینوشی اور رندانہ زندگی ہو سکتی ہے۔ اور
کہ ہفتہ وار اخبار سے سوائے تضیع اوقات کے اور کچھ حاصل نہیں تھا جو بجائے اس کے خدائے عزوجل کی عبادت
میں صحیح طور پر استعمال ہو سکتے ہیں۔
دیکھیں ہم مسٹر ولیس اس واقعہ سے کس قدر متاثر ہوتے ہیں اور ہم یہ سُننا چاہتے ہیں کہ وہ یورپ اور امریکہ
کی اس نام نہاد "مسیحیت،، کی نسبت کیا ارشاد فرماتے ہیں!

لندن میں مذہب عیسوی پر مادیت و خود غرضی کا غلبہ

کسی اخبار کے نمایندہ سے بشپ آف لندن کی ملاقات کا حال لندن میگزین
میں شائع ہوا ہے۔ دوران گفتگو میں بشپ موصوف نے فرمایا کہ:۔
"آج کل لندن ۱۹۰۱ء کے لندن سے بالکل جداگانہ نظر آتا ہے۔ اسوقت جو خیالات لوگوں کے دلوں پر
حکمراں تھے اب ان کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ بہ نسبت پیشتر کے مادیت اور مذہب سے بیزاری لوگوں میں بکثرت سائر و
دائر ہے مرد یا عورت کل زندگی کا غیر ذمہ دار نصب العین عہد حاضر کا ایک اہم جزو ہے۔ بار بار مزدوروں اور اہل حرفت
کے جھگڑے اسبات کو ثابت کر رہے ہیں کہ خود غرضی کا عمل اب تک قائم ہے۔ اور شبینہ عشرت کدوں اور اسی
قسم کے زمانہ حال کے خطرات سے اسبات کی تصدیق ہوتی ہے کہ شر و فساد کی کون کونسی قوتیں اپنا کام کر رہی ہیں
اگرچہ عوام الناس بادی النظر میں مذہب کی طرف نسبتاً بہت کم مائل نظر آتے ہیں جیسے کہ وہ پچیس سال پیشتر تھے تاہم
ان سب کے عمق قلب میں ایک وسیع اور خلوص آمیز مذہبی روح پائی جاتی ہے"
"مرکز تمدن،، کے اس مذہبی پیشوا کو ان کی تشخیص پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہم صرف اس قدر عرض کرنیکی
جرات کرتے ہیں کہ:۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے!

قدیم علم جغرافیہ کے محافظ

علم جغرافیہ میں مسلمانوں کے کارناموں کا محققین یورپ کو اعتراف ہے، چنانچہ
رسالہ جاگرافیکل جرنل بابت مئی ۱۹۲۶ء میں گاڈفری کیلنڈر نے ایک امریکن
مصنف کی کتاب ازمنہ وسطیٰ کا جغرافیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ قدیم علم جغرافیہ کی حفاظت کر کے مسلمانوں نے
دنیا پر کیا کیا احسانات کئے ہیں۔

۔اتوں کا امتیاز اور مساوات اسلامی

ہمارے ملک ہندوستان میں ذاتوں کا امتیاز ایک لعنت کبریٰ ہے جس کو دیکھکر اور سن کر بیرونی ممالک کے لوگ سخت تعجب اور ۔وس کا اظہار کرتے ہیں۔ مصر کی ایک ماہر فن تعلیم خاتون مس ذکیہ عبدالحمید سلیمان جو ہندوستان کی سیاحت ۔آئی ہوئی تھیں اور گذشتہ ماہ میں مصر واپس گئیں۔ انہوں نے پریس کے ایک نمایندہ کے سامنے اس بات پر ۔وس ظاہر کیا کہ ہندوستان میں ذات پات کا امتیاز بہت ملحوظ رکھا جاتا ہے جس کا ان کے ملک (مصر) ۔نام ونشان تک نہیں ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ:۔

ہمارے ملک کے لوگ اکثر مسلمان ہیں جہاں ہر گوشہ میں اسلامی جمہوریت کی شان نظر آتی ہے۔ بادشاہ ۔رفقیر ایک ہی جانماز پر مصر کی مسجد میں نماز پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ غرض کہ ہم ایک دوسرے کو بہ نظر حقارت ۔ں دیکھتے جیسا کہ ہندوستان میں عام طور پر نظر آتا ہے۔

۔سائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا جدید اڈیشن،

یورپ کی علمی ترقی کی رفتار کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ گذشتہ پچیس سال کے اندر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جیسی ۔یر المجلدات کتاب کے تین جدید اڈیشن یکے بعد دیگرے شائع ہو چکے ہیں۔ اب اس کا تیرھواں اڈیشن کچھ دنوں ۔شائع ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں پہونچیگا۔ اس طبع جدید کا مقصد یہ ہے کہ گذشتہ پندرہ سال کی تمام انسانی ۔فوات اور علمی کارناموں کا ایک تازہ تبصرہ اس میں شامل کیا جائے۔ اس طبع جدید کی بین الاقوامی حیثیت کا اندازہ ۔ں کے مضمون "ایفون" سے ہو سکتا ہے۔ مضمون "کیپٹالزم" (سرمایہ داری) خود اس کتاب کے مدیر اعلیٰ مسٹر ۔ے۔ ایل کاروِن کے قلم سے نکلا ہے۔ "سوشیالزم" (اشتراکیت) پر مشہور اشتراکی اور ادیب برنرڈ شانے ایک بسیط مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ "تعقہ بولشوزم" ایک روسی اہل قلم ٹروٹسکی نے لکھا ہے۔ "دنیا کی واپسی" پر مسٹر ۔بلوکس نے ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے اور کرنل ہاوس نے پیرس کی موتمر السلام (پیس کانفرنس) کا احوال قلم بند ۔یا ہے۔ اس کے مضمون نگاروں میں مسٹر ہیریٹ، ڈاکٹر امسٹر تیسین، پریسیڈنٹ مبارک، ہنگریا کا وزیر اعظم ۔اؤنٹ بتھلن اور پریسیڈنٹ کولیج کے کابینہ (مجلس وزرار) کے ۵ ممبر جیسے مشاہیر اہل قلم شامل ہیں۔

تبصرہ

کتاب الحج والزیارۃ

(مؤلفہ جناب مولوی منورالدین صاحب دہلوی بی۔اے)

(از قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

اسلام کے ابتدائی زمانوں میں اور بعد کو بھی پیروان اسلام بغیر مذہب کے ایک قدم نہیں چلتے تھے۔ مذہب ہی کا اوڑھنا بچھونا اور مذہب ہی ان کا تکیہ تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے غافل ہونا گناہ سمجھتے تھے۔ وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہوئے تھے کہ جس مذہب کے ہم پیرو ہیں اس کے سچے نام لیوا اس وقت تک نہیں کہے جا سکتے جب تک کہ ہم اس کی ایک ایک بات کو سمجھکر لوگوں کے ذہن نشین نہ کرا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مذہبی لٹریچر اس کثرت کے ساتھ موجود ہے میرا خیال ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتا۔ سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنے نبی برحق ؐ کے تمام احکام (قولی و فعلی) کو جمع کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین صدیوں میں فن حدیث ایک مستقل فن کی حیثیت سے مدون ہونے لگا اور زمانہ دراز تک بزرگان سلف اسکی تکمیل پر کمربستہ رہے۔ اسی کی دوش بدوش قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے فن تفسیر کی بنیاد پڑی اور اس فن میں اس کثرت سے کتابیں لکھی گئیں کہ ان میں سے بعض بعض کی ضخامت سو سے لیکر چار سو مجلدات تک پہنچ گئی۔ اگرچہ احکام قرانی اور احادیث کے معتدبہ ذخیرہ پر سے دوسری صدی ہجری ہی میں۔ شرعی احکام کی فقہی تدوین شروع ہو گئی تھی۔ لیکن چند صدیوں میں وہ عظیم الشان اور مستقل "فن فقہ" مرتب ہوگیا جس نے تمام احکام شرعیہ اور انکی ہر ممکن جزئیات کو اپنے دامن میں سمیٹ کر لوگوں کو بہت سی دقتوں سے نجات دیدی۔ اس فن کی ترتیب و تدوین بزرگان سلف کے ہاتھوں تکمیل کو پہونچگئی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا فقہی کتابوں کی شروح، حواشی اور تعلیقات کا ایک وافر ذخیرہ کتب جمع ہو گیا۔ مگر یہ تمام ذخیرہ عربی زبان میں ہے جس کا کچھ حصہ فارسی اور اردو میں منتقل ہو چکا ہے اور جو عرصہ دراز سے عربی زبان سے ہماری بے توجہی کی بدولت صرف ان "ملانوں" کے لئے مخصوص ہو گیا ہے جو عربی مدارس کے فارغ التحصیل ہیں۔ اور یہی محدود طبقۂ علما رہے جن سے بعض موقعوں پر مذہبی احکام کی نسبت استفتا کیا جاتا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب ابتداء اسلام میں علوم شرعیہ نے اسقدر ترقی نہیں کی تھی تو مسلمان

ت پابند مذہب اور دینی احکام کی جزئیات تک سے واقف اور ان پر عمل پیرا تھے۔ مگر جوں جوں مذہبی لٹریچر سیع ہوتا گیا انھیں احکام سے غفلت اور بے پروائی پیدا ہوتی گئی۔

اس دور مادیت و الحاد میں جبکہ مذہب سے بیگانہ وشی اور اس کے احکام سے بے پروائی عام طور پر بڑھتی اتی ہے بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اپنا وقت تمام تر مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتے ہوں۔ ان میں بھی بہت وڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو خاص کر مذہب کے تشریعی احکام کو بالاستیعاب اور غور و خوض کے ساتھ ھتے ہوں۔ وہ زمانہ گیا جبکہ ہر شخص فقیہہ اور عالم ہوتا تھا۔ اور اپنے فرائض مذہبی کی ادائیگی میں دوسرے کا محتاج ہیں ہوتا تھا اگر کوئی مسئلہ اسے غلط معلوم ہوتا تو اس کی تحقیق کرتا تھا اور اس کی یہ تحقیق دوسروں کے لئے مشعل ہدایت کا م دیتی تھی۔ مگر آج ایک "ادنیٰ گنوار" سے لیکر ایک "اعلیٰ تعلیم یافتہ" اور "روشن خیال" مسلمان تک اپنے ضروری حکام دینی سے ناواقف اور دوسرے کا محتاج نظر آتا ہے۔ ہم نے اکثر "اعلیٰ تعلیم یافتہ" حضرات کو دیکھا ہے کہ اگر وہ ینیات" کی تحصیل اپنے لئے باعث ننگ و عار نہیں تو "ملاؤں" کے لئے مخصوص ضرور سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ن انہیں لوگوں کے لئے وضع ہوا ہے جو "خشک ملا" اور عالم بننا چاہتے ہوں۔ احکام مذہبی اور مسائل دینی سے و گردانی مسلمانوں کے لئے بیحد شرمناک ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس طبقہ نے جو اپنے یں دینیات کا محافظ اور "انبیا کا وارث" سمجھتا ہے، بہت کم اسطرف توجہ کی ہے کہ دینیات کے ذخیرہ کو عوام ی دسترس کے قابل بنایا جاوے۔ اس سمت میں ابتک جتنی کوششیں ہو چکی ہیں وہ کچھ تو روش زمانہ ے مطابق عام مذاق کے خلاف تھیں۔ اور کچھ تو لفظی ترجموں نے ان کو بے لطف کر دیا تھا آج اگر کوئی سمجھدار دی چاہے تو ان سے بخوبی استفادہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اہل علم کے طبقہ ا کوئی باکمال فرد اُٹھے اور بہ طریق جدید احکام فقہیہ کا استقصا سادہ اور سلیس زبان میں کرے جس سے عوام ناس کو مستفید ہونے کا موقعہ ملے۔ اور ہر پڑھا لکھا مسلمان، جب کبھی ضرورت پیش آئے، اپنے مذہب کے مسائل ے واقف ہو سکے۔

ہمیں یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی کہ یہ اہم مذہبی ضرورت ہمارے زمانہ کے ایک روشن خیال صاحب علم نے بوجہ حسن پوری کر دی ہے ہماری مراد اپنے فاضل اور باکمال دوست جناب مولوی منور الدین صاحب بی۔ اے ز دہلوی) اسسے ہے، جنھوں نے اس ضروری موضوع یعنی فقہ اسلامی پر "فتاوائے عثمانی" کے نام سے کا مل چھ جلدیں غایت استقصا اور ترتیب جدید کے ساتھ لکھ کر تمام مسلمانان ہند کو گرانبار احسان بنایا ہے

فجزاہ اللہ خیر الجزاء و شکر اللہ سعیہ۔

ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ علمی اور دینی خدمت "تعلیم یافتہ" گروہ کے ایک "قدیم الخیال" فرد نے انجام دی ہے جس کی توقع دیوبند یا ندوہ کے "دستار فضیلت" باندھنے والے مولویوں سے ہو سکتی تھی۔

کاں اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!

یہ سلسلۂ "فتاوی عثمانی" ہز اگزالٹڈ ہائنس حضور نظام کے نام پر معنون کیا گیا ہے جس کی پہلی کڑی کتاب الحج والزیارۃ کے نام سے اُردو میں شائع ہوئی ہے۔ اگرچہ ہمیں اس کو بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا تاہم اس کا اکثر حصہ ہم نے سرسری نظر سے دیکھا ہے جس کی بنا پر ہم یہ رائے دینے کے قابل ہوئے ہیں کہ جہاں تک علم فقہ کا تعلق ہے اس جلد میں حج خانۂ کعبہ، اس کے تمام احکام اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کا پورا استقصا کر لیا گیا ہے۔ مؤلف نے جدید اسلوب پر اس کو حج کے متعلق حوالہ کی ایک جامع کتاب بنا دی ہے۔ جغرافیائی نقشوں اور ڈایاگراموں کے ذریعہ مقامات زیارت، مقابر د آثار کی پوری تفصیل نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ سب پر مستزاد یہ کہ ان تمام باتوں کے لئے کتب معتبرہ کا حوالہ دیدیا ہے، اصطلاحات کی تشریح کی ہے اور ہر ممکن طریقہ سے ایک ایک مسئلہ کو آسان اور عام فہم عبارت میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ غرضکہ مؤلف موصوف اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

یہ کتاب جہاں خواص اہل علم کے لئے بہترین حوالہ کا کام دے سکتی ہے وہاں عام اُردو دانوں کے لئے بھی بہت کارآمد ہے۔ اور ہر سال فریضۂ حج ادا کرنے مسلمانوں کو اُن کے معلمین سے بے نیاز کردے گی جو اس پیشہ کی بدولت لاکھوں بندگانِ خدا کو ناجائز فضول خرچیوں میں مبتلا کرتے رہتے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب اس قدر جدت آمیز ہے کہ عربی فارسی اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرانا چاہئے تاکہ تمام دُنیا کے مسلمان اس سے یکساں طور پر مستفید ہو سکیں۔ بحالت موجودہ اگر یہی سلسلہ مکمل چھپ جائے تو بسا غنیمت ہے۔ حضور نظام خلداللہ ملکہ و سلطنتہ کے دست کرم سے توقع ہے کہ سلسلہ کی بقیہ کتابیں بھی بہت جلد حلیۂ طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونگی ہم تمام مسلمانوں خواص و عوام سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ ضرور اس پورے سلسلہ کے

خریدار بنجائیں اور اپنے مذہبی احکام و مسائل سے واقف ہو کر دین و دنیا دونوں میں سرخروئی حاصل کریں مجوده کتاب کی قیمت جو بڑی تقطیع پر خاصی ضخیم ہے تین، روپیہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ :- مولوی منورالدین صاحب۔ بی۔ اے
رہٹ منزل۔ دہلی

نذر رمضان

یہ ایک ۱۶ صفحوں کا مختصر رسالہ ہے جسکو "حافظ سید مظہر احمد ادھمی پسر مولوی حکیم حاجی سید ظفر احمد صاحب مرحوم و مغفور"، نے بہ "تحریک مولوی ظفر علیخاں واخی نجم الدین ومیاں سید عبداللہ اشتیاق علی وغیرہ وغیرہ" تالیف فرمایا ہے۔
اس رسالہ میں مولف نے "لیلتہ القدر" کے فضائل سے متعلق چند روایات صحیحہ کو یکجا جمع کردیا ہے" اور سورۃ القدر کی مختصر و متعارف تفسیر لکھی ہے۔ اس لحاظ سے اس کا دوسرا نام "تفسیر للیلتہ القدر" بھی ہے۔ روایات کے شروع میں کتب احادیث کے لئے م۔ خ۔ ق وغیرہ علامات استعمال کرنے کی بجائے ہر روایت کے آخر میں کتاب کا پورا نام لکھدیا جاتا تو بہتر تھا۔
آخر میں مولف نے فارسی زبان میں ہندوستان کے اُن تین خاندانوں کا نسب نامہ منسلک کردیا ہے۔ جو حضرت ابراہیم ادہم رح کی اولاد سے ہیں۔ اس رسالہ میں یہ ضمیمہ بالکل غیرضروری معلوم ہوتا ہے۔
کاغذ لکھائی چھپائی معمولی، قیمت درج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ
حافظ سید مظہر احمد آدہمی، فتحگڑھ بھوپال

اخبار علمیہ

مقیاس المحبت

حال ہی میں لندن کے ایک ڈاکٹر نے کلائی کی گھڑی سے مشابہ "اومیٹر" نام کا ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے انسانی محبت کی مقدار کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اکثر مرد و عورتیں اس "طبیب عشق" کے پاس اپنے عشق و محبت کا امتحان کرانے جاتے ہیں، اور وہ ان کے بائیں کی کلائی پر اس آلہ کو رکھ کر بتا دیتا ہے کہ انہیں اپنے محبوب کے ساتھ سچی محبت ہے یا نہیں۔

خدانخواستہ اگر یہ آلہ کہیں ہندوستان میں آگیا تو ہمارے مدعیان عشق و محبت " یعنی ہمارے شعرا کی قلعی کھل جائے گی۔

تفسیر بقاعی کی اشاعت

مصر کی مجلس دار الکتب نے طے کر لیا ہے کہ وہ کتاب نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور ان شائع کرے گی۔ اس کے مصنف علامہ ابو اسحاق ابراہیم بن عمر البقاعی (۸۰۹ھ ۔ ۸۸۵ھ) ہیں۔ کتاب چھ جلدوں میں ہے اور غالباً چھپنے کے بعد ایک ایک جلد ہزار ہزار صفحات کی ہوگی۔

شرق اردن کے آثار قدیمہ

برٹش میوزیم کی طرف سے ماہرین علم الآثار کی ایک جماعت شرق اردن میں اثری تحقیقات کے لئے بھیجی گئی ہے۔ اس جماعت کو پرانے زرین کپڑے ہاتھ لگے ہیں جن میں قیمتی جواہرات ٹکے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک قیمتی خزانہ ہیں سے برآمد ہوئے ہیں جو توت عنخ آموں کے خزائن سے بھی زیادہ اہم ہے۔

لاش کی حفاظت

جس طرح مصر قدیم میں ایک مخصوص مسالہ کے ذریعہ ہزارہا سال تک لاش کو محفوظ رکھ سکتے تھے ایسا ہی حال میں ایک اطالین کیمیاگر نے ایجاد کیا ہے جس سے انسان کی لاش برسوں تک محفوظ رکھی جا سکیگی۔ اگر یہ مردہ رسم پھر زندہ ہو گئی تو متمول اشخاص کے مردے بجائے قبرستان میں آسودہ خاک ہونے کے ڈرائنگ روم کی کاغذی تصویروں اور مرمریں مجسموں کی جگہ حاصل کرلیں گے۔

ایک دو سُر والے
حلق کی ۴۵ ہزار میں خرید

حال میں برٹش محکمہ طبابت نے ایک شخص کا گلا جس میں سے دو قسم کی آوازیں ایک ساتھ نکلتی ہیں اس غرض سے خرید کیا ہے کہ شخص مذکور کے مرجانے کے بعد اسکو چیر کر تجربہ کیا جائے کہ اس میں وہ کونسی غیر معمولی چیز تھی جس سے تمام انسانی حلقوم کے خلاف دو سُر نکلتے تھے۔

سب سے چھوٹا برقی لیمپ

حال میں ماہرین برقیات نے ایک ایسا برقی لیمپ بنایا ہے جو خاتم میں نگین کی طرح بہ آسانی رہ سکتا ہے اس لیمپ کی روشنی سے تاریکی میں ایک شخص نہایت آسانی سے لکھ پڑھ سکتا ہے۔

غزل

(ناظم الاخلاق حضرت ذہین حیدرآبادی)

دہر میں حسن کا طوفاں نظر آتا ہے مجھے
اک جہاں ہے کہ پریشاں نظر آتا ہے مجھے

بام پر جلوۂ جاناں نظر آتا ہے مجھے
طور پر شعلۂ تاباں نظر آتا ہے مجھے

جی کے بہلانے کا ساماں نظر آتا ہے مجھے
دل پہ ہر داغ گلستاں نظر آتا ہے مجھے

جلوۂ حسن ازل کب ہے نظر سے پنہاں
تیری صورت میں نمایاں نظر آتا ہے مجھے

دیکھ لیتا ہوں اس آئینہ میں جلوہ اسکا
دل میں اپنا مہ تاباں نظر آتا ہے مجھے

نظر آتا ہے مجھے بحر بہ دامان قطرہ
ذرہ ریگ بیاباں نظر آتا ہے مجھے

لئے پھرتا ہے مجھے دشت نوردی کا خیال
قیس جنگل میں پریشاں نظر آتا ہے مجھے

ہے مسرت کے تصور سے مسرت حاصل
اب بیاباں بھی گلستاں نظر آتا ہے مجھے

کون تکلیف کا ساتھی ہو کہ جب ہو بیکس وقت
اپنا سایہ بھی گریزاں نظر آتا ہے مجھے

بے خودی چشم بصیرت ہو حقیقت میں ذہین
ہر طرف جلوۂ جاناں نظر آتا ہے مجھے

اعتذار

اب تک زبان آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھپتا تھا۔ لیکن چونکہ وہاں سے پرچہ چھپکر بروقت نہیں آتا تھا اور خریداروں کو تاخیر اشاعت کی سخت شکایت رہا کرتی تھی ہمنے یہ نمبر کانگریس الکٹرک پریس دہلی میں چھپوایا لیکن دہلی کے چیف کمشنر صاحب کے ڈیکلیریشن کے نہ منظور کرنے سے مارچ واپریل کا موجودہ نمبر معرض التوا میں پڑا رہا ناچار ہمیں دہلی جانا پڑا اور بہ ہزار دقت تین ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد ڈیکلیریشن پاس کراکر پرچہ شایع کرانے کی اجازت حاصل کی اُمید ہے کہ ناظرین کرام ہماری مجبوریوں کو مدنظر رکھکر اس تین ماہ کی غیر حاضری اور غیر معمولی رُکاوٹ کو نظر انداز فرمائینگے اور زبان سے بدظن نہ ہوجائیں گے۔

مئی وجون کا مشترکہ نمبر عنقریب حاضر ہوگا اور جولائی کا سالانہ نمبر بھی جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان کے تمام خاص نمبروں سے ارفع واعلیٰ ہے بڑی آب وتاب سے چھپکر وسط ستمبر تک حاضر خدمت ہوگا۔

اُمید ہے کہ ہمارے اس واجبی اعتذار سے ناظرین زبان مطمئن ہوجائیں گے

دہلی ۔ یکم ستمبر ۱۹۲۷ء　　　　اڈیٹر "زبان"

(مولانا اے۔ آر۔ خوشتر سنگرولی پرنٹر وپبلشر کے اہتمام سے کانگریس پریس دہلی سے چھپکر شائع ہوا)

شبیہ مبارک ۔ اس نمبر میں جو تصویر زبان کی زینت کو دوبالا کر رہی ہے وہ اعلیحضرت قدر
ت ہز ہائینس میر علی نواز خاں بہادر المتخلص بہ ناز والی ریاست خیرپور دستدہ دوام اقبالہٗ و
ت کی ہے جو ہمیں اپنے کرمفرما جناب رضاالحق صاحب عباسی نے ازراہ کرم عنایت فرمائی ہے جس کو
یت فخر کیساتھ درج زبان کرتے ہوئے موصوف کے شکر گذار ہیں ۔
عباسی صاحب موصوف کچھ عرصہ سے ریاست منگرول سے علیحدہ ہو کر خیرپور تشریف لیگئے ہیں ۔
وہ اعلیحضرت میر صاحب بالقابہ کے پرائیویٹ سکرٹری کے ممتاز عہدہ پر سرفراز ہیں ۔ حال میں آپ منگرول
یف لے آئے تھے انکی زبانی اعلیحضرت میر صاحب بالقابہ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق کریمانہ کی بجید
یف سنی ۔ آپ کے ان اوصاف کو انشاءاللہ ہم آئندہ نمبر میں بوضاحت بیان کرینگے ۔ اس موقعہ پر صرف
قدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ موصوف نے نہایت ہمدرد دل پایا ہے ۔ اور ملک و قوم کی بہبودی میں
ہر وقت آپ مصروف رہتے ہیں ۔ علاوہ ازیں جہاں آپ کو امور حکمرانی میں اعلیٰ دستگاہ حاصل ہے
اعلیٰ علمی قابلیت میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے ۔ علمی مذاق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ اچھے اچھے قابل فضلاءِ
سے ہر وقت آپ کا دربار بھرا رہتا ہے ۔ جن کی حد سے زیادہ قدردانی اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے
اردو فارسی میں آپ بے لاگ شعر فرماتے ہیں جو صد درجہ مؤثر و پُر درد ہوتے ہیں ۔ آپ صاحب دیوان
ہیں مطبوعہ دیوان سے آپ کی وہ غزل جو آپ کو نہ صرف پسند ہی ہے بلکہ اس کو اپنا نصب العین
ے ہوئے ہیں اور سختی سے اس پر کاربند ہیں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں ۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۲)
ہم دیگر رؤسا ہند کی خدمت میں باادب عرض کرتے ہیں کہ وہ بھی اس غزل کو اپنا نصب العین بلکہ
مول حکمرانی قرار دیکر اس پر سختی سے عمل پیرا ہوں ۔

خوشتر (منگرولی)

زبان

جلد ۲ | فہرست مضامین رسالہ زبان بابتہ ماہ مارچ و اپریل ۱۹۲۶ء | نمبر ۳

زبان خلق

حرم (پھلی بھیت) بابت فروری ۱۹۲۷ء

زبان منگرول :۔ یہ رسالہ مخدومی و مکرمی جناب عبدالرحمٰن صاحب خوشتر منگرولی کی زیرادارت منگرول واقع کاٹھیاواڑ سے جاری ہوا ہے۔ اب تک اس کے پانچ نمبر شایع ہوچکے ہیں۔ سرزمین کاٹھیاواڑ کا یہ پہلا علمی وادبی رسالہ ہے۔ اس وقت اکتوبر و نومبر کے پرچے پیش نظر ہیں کسی گذشتہ نمبر میں حضرت خالد بنگالی کی ایک نظم "اے گل زمین ڈھاکہ" کے زیر عنوان شایع ہوئی تھی یہ نظم ادب العالیہ کا ایک بہترین نمونہ ہے نومبر کے پرچہ میں جناب امجد حیدرآبادی کی ایک نظم بالعجب بھی خوب ہے ایسی نظموں کے مطالعہ سے دل ودماغ منور ہوتے ہیں۔ اس نظم کا کچھ حصہ ناظرات حرم کے مطالعہ کے لئے درج کیا جاتا ہے

اکتوبر کے پرچہ میں ضیاء الملک ملا رموزی صاحب نے خوب خوب نکات بیان فرمائے ہیں پڑھنے اور سوچنے کی چیز ہیں جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی کا مضمون "زوجیت عامہ اور قرآن مجید" نہایت قیمتی ہے اردو زبان میں ایسے مضامین کی بہت زیادہ ضرورت ہے "ایران زیر حکومت رضا خان" "ہندوستان اور اس کی زبان" "حقیقت مجاز" "ملک نائب خسرو خاں گجراتی" "جواب استفسار از جناب آزاد" یہ تمام گراں بہا اور پُر از معلومات ہیں پبلک کا فرض ہے کہ وہ مخدومی و مکرمی جناب خوشتر صاحب کی حوصلہ افزائی کرے پرچہ نہایت قابلیت کے ساتھ ترتیب دیا جاتا ہے سالانہ چندہ چار روپے ہے اور ششماہی عہ؎ نمونہ ۶ آنہ

آئینہ (کانپور) بابت مارچ ۱۹۲۷ء

منگرول (کاٹھیاواڑ) کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ ہے کاٹھیاواڑ جیسے حصہ ہند سے اُردو زبان کا رسالہ ہونا بظاہر تعجب خیز معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ہندوستان کی ملکی و قومی مشترکہ زبان اردو کی ہمہ گیری کا ایک بین ثبوت ہے۔ زبان خصوصیت کے ساتھ علمی مضامین شایع کرتا ہے اور اس لئے اس کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے دوسرے رسایل کی طرح زبان بھی اہل علم کی بے اعتنائی کا گلہ گذار ہے اس کا شکوہ ہی کیا کہ یہ ایک عام شکایت ہے یقیناً مولانا خوشتر ہمیں معاف فرمائیں گے اگر ہم اُن کی خدمت میں اپنے ایک مکرم دوست کی رائے (جو اونھوں نے آئندہ

پہلا نمبر دیکھکر ظاہر فرمائی تھی) پیش کرنے کی جرأت کریں یعنی" فی زمانہ ایسے خوش مذاق لوگ بہت کم ہیں جو صرف علمی مضامین کی بناء پر کسی رسالہ کی حوصلہ افزائی فرمانا اپنا فرض منصبی سمجھیں ضرورت ہے کہ علمی مضامین کے ساتھ ساتھ کچھ عوام کی دلچسپی کا سامان بھی مہیا کیا جاتے" ہمارے نزدیک زبان کی خدمت کرنا ہر اہل علم اور علم دوست کا فرض ہے۔

کراؤن سائز حجم تین جزو قیمت سالانہ چار روپے ششماہی دو روپے آٹھ آنے۔

نظر (لکھنؤ) بابت مارچ ۱۹۲۷ء

زبان۔ اس نام کا ایک علمی و ادبی رسالہ جو سرزمین کاٹھیاواڑ کا پہلا ادبی جریدہ ہے میرے پیش نظر ہے۔ حضرت خوشتر منگرولی کی زیر ادارت ماہوار شایع ہو رہا ہے۔ سالانہ قیمت چار روپے مناسب ہے۔ میں نہایت مسرور ہوں اور دل سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ملک کے اس حصہ سے یہ رسالہ اردو زبان میں اجراء ہو رہا ہے جس کو دوسرے لفظوں میں ایک شورزمین کہنا بجا ہوگا یقیناً تحسین و آفرین کے مستحق حضرت خوشتر ہیں۔ لکھائی چھپائی ترتیب مضامین کے علاوہ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک غیر مرکزی حصہ کی حیثیت سے اُس کا معیار ادب کسی طرح کم نہیں ہے۔

نیرنگ خیال (لاہور) بابت فروری ۱۹۲۷ء

'زبان' جناب عبدالرحمن صاحب خوشتر منگرولی نے کاٹھیاواڑ کے مرکز منگرول سے شایع کیا ہے رسالہ $\frac{20 \times 30}{8}$ سائز پر شایع ہوا ہے لکھائی چھپائی کاغذ بہتر ہے۔ جناب عبدالرحمن صاحب رسالہ کو نہایت قابلیت سے مرتب کرتے ہیں اور ہمیں اُن کی محنت اور کوشش سے توقع ہے کہ رسالہ بہت جلد ترقی کریگا۔ رسالہ میں عام پسند مضامین کے علاوہ علمی اور محققانہ مضامین بھی شایع ہوتے ہیں اُمید ہے رؤسائے منگرول رسالہ کی سرپرستی اختیار کئے رکھیں گے تاکہ کاٹھیاواڑ سے اُردو کا یہ رسالہ ہمیشہ شایع ہوتا رہے۔ رسالہ کا چندہ صرف چار روپے ہے جو خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کم ہے شائقین ضرور سرپرستی اختیار کریں۔

جناب محمود الحسن صاحب **محمود** اسرائیلی

خطہ (گجرات) کاٹھیاواڑ اردو زبان کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ "زبان" نے ایام طفولیت ہی سے جس شوخی اور ہونہاری کا ثبوت دیا ہے اس سے یہ توقع ہوتی ہے کہ اگر اُردو کے ممتاز انشاء پرداز اور خوش فکر شاعروں کی نگرانی اور سرپرستی میں یہ رسالہ پروان چڑھا تو انشاءاللہ تعالیٰ مستقبل قریب میں "زبان" کو ادبی صحافت میں وہی خاص درجہ حاصل ہو جائیگا جو اس کی سرزمین کو اردو زبان میں ہے۔

صفحہ ادارت

ـے دن ہندوستان کے ہر گوشے سے اخبارات و جرائد جس کثرت سے نکل رہے ہیں اور روز بروز اردو کے خزانے
باضافہ ہو رہا ہے اُس کو دیکھ کر ہم بلند آہنگی سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو صحافت کا موجودہ دور ترقی کا دور ہے۔
ـضبہ اردو کا یہ عہد جہانگیری آئندہ ایک صدی کے بعد "عہد زریں" سے یاد کیا جائے گا۔ اگرچہ اردو خزانہ میں
لمی سرمایہ کا عشر عشیر بھی فراہم نہیں ہوا ہے لیکن چونکہ اردو کو علمی زبان بنانے میں انتہائی کوششیں کی جا رہی ہیں
ـس کی چند ملیہ نازانجمنیں اس کو بروئے کار لانے میں نہ صرف شدت کے ساتھ سرگرم کار ہیں بلکہ عملی ثبوت بھی دے رہی
ں سے ہمیں امید بندھتی ہے کہ اگر اس کی ترقی کا یہی عالم رہا تو آئندہ بہت تھوڑے عرصہ میں اردو بھی دیگر زبردست علمی سرمایہ رکھنے
ـانوں کے دوش بدوش نظر آنے گی۔

ـرمعصر "سہیل" (علیگڈھ) نے اپنی اپریل ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں موقت الشیوع رسایل و اخبارات کی جو فہرست پیش
ـگو وہ نامکمل ہے اور اب ایک سال کے بعد اب اس میں معتد بہ اضافہ بھی ہو گیا ہے تاہم اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے
دستان کے مختلف گوشوں سے اردو کے ہفتہ روزہ، ماہوار، اور سہ ماہی تقریباً اسّی رسالے شایع ہو رہے ہیں ان
ـض رسائل نے تو ایسے ایسے مقامات سے اردو کا علم بلند کیا ہے جہاں اس سے قبل کوئی اس کا نام لیوا بھی نہ تھا۔
ـلن سوال یہ ہے کہ ان رسایل میں کتنے ایسے رسالے ہیں جو خالص اور واقعی علم ادب کی خدمات بجا لاتے ہیں؟ ہمارے
ـیں پانچ سات ہی ایسے رسالے نکلیں گے جو بجا طور پر اردو کی خدمات انجام دیتے ہیں! مگر اس سے یہ خیال نہ کیا جائے
ـی طرح دیگر رسایل بھی بیکار اور غیر ضروری ہیں!! نہیں بلکہ وہ ایک ایسی خدمت انجام دے رہے ہیں جو اعلیٰ اور
ـعلمی رسالے نہیں انجام دے سکتے، ان رسایل میں اکثر رسالے اپنے عام پسند مضامین اور دلچسپ فسانوں سے ایسے
ـوں طبقے میں جو پُر مغز، فلسفیانہ، مورخانہ اور محققانہ علمی مضامین سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، اردو پڑھنے کی ترغیب
ـق پیدا کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ انہیں ٹھوس مضامین کے پڑھنے کی طرف بھی مایل کرتے ہیں اس لئے یہ بھی ایک قسم
ـدو کی خدمت ہے۔

٭ اس میں شک نہیں کہ بعض وہ رسایل جو تجارتی مفاد کو مدنظر رکھ کر جاری کئے گئے ہیں اپنے عریاں اور اخلاق سوز مضامین سے
ـب کے دامن کو آلودہ کر رہے ہیں اور عوام میں بد مذاقی کو وسعت دے رہے ہیں۔

علاوہ ازیں یوں بھی رسائل ایک زبردست علمی خدمت ادا کر رہے ہیں جس کا احساس شاید ہی کسی کو ہوگا اور وہ یہ ہے کہ بعض مصنفین جو بے مایہ ہونے کے سبب نیز ناقدری ابنائے ملک کے باعث اپنی تصانیف کو مستقل طور پر نہیں چھپوا سکتے یعنی کتابی جامہ نہیں پہنا سکتے رسالوں میں بالاقساط شائع کرا دیتے ہیں جن میں بعض تصنیفات اور تخیل ہونے کی وجہ سے قابل قدر ہوتی ہیں کچھ عرصے کے بعد رسالہ کی زندگی مستعار کے ساتھ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتی ہے اور اس طرح ان کی کوششوں اور علمی کارنامے صفحۂ ہستی سے فنا اور برباد ہو جاتے ہیں جو ہماری بدنصیبی اور اردو کے زوال کی علامت ہے۔

جہاں ہم اردو کی ترقی پر شادیانے بجاتے ہیں وہاں ہمیں اس کا ماتم بھی کرنا چاہئے کہ بیہودہ ناولوں اور مخرب الاخلاق فسانوں نے طوفان بے تمیزی مچا رکھا ہے اور جن کا زہریلا اثر اردو کے شجر ارتقا کی بیخ کنی کر رہا ہے۔ ان کی اشاعت کو روکنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے خیال میں اس کام کے لئے ایک "دار الانتقاد" کے انعقاد کی ضرورت ہے جہاں سے ہر مصنف کو حسب تصنیف معقول فیس وصول کر کے بلا رو رعایت ایک منصفانہ "تنقیدی سند" دی جس کو مصنف اپنی تصنیف کے شروع میں بطور سرٹیفکیٹ کے لگا دے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ بیہودہ اور فضول لٹریچر کی اشاعت خود بخود رک جائیگی ہر شخص جو یہ امتیاز نہیں کر سکتا کہ کون سی کتاب صحیح اور محققانہ ہے اور کون سی غلط اور غیر محققانہ ہے اور کس کا مطالعہ مفید اور کس کا پڑھنا مضر اخلاق ہے بآسانی امتیاز کرنے لگے گا اور اپنے مذاق کی کتب کا بلا خوف مطالعہ کر سکے گا، انتقاد کی جانب سے ختم سال پر جن تصانیف کو اسناد دی گئی ہوں ان کو بطور رپورٹ کے شائع کر دے کہ اس سے ہر شخص فائدہ حاصل کر سکے۔

اس کام کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس میں ایک زبردست مالی سرمایہ کی قربانی ضرورت ہے جس کا فراہم کرنا چنداں مشکل نہیں ہے جب ہم قوم کی پست خیالی اور فقدان مذاق کو دیکھتے ہیں تو ہمارے حوصلے پست اور ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں اور کسی جدید طلب علمی تحریک کو بروئے کار لانے میں اپنے آپ کو مجبور اور بے دست و پا پاتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) اور دار المصنفین (اعظم گڈھ) کے علمی کارناموں کو دیکھتے ہوئے ہمیں کسی جدید انجمن یا دائرہ کے انعقاد کی ضرورت نہیں ہے اس کے علاوہ چند اور انجمنیں بھی ہیں جو اس کام میں ہماری اعانت کر سکتی ہیں چنانچہ دائرۃ المعارف (حیدرآباد) اور انجمن اردوئے معلیٰ (علیگڈھ) وغیرہ جن کے متفقہ مشورے سے اس اہم کام کی تکمیل ہو سکتی ہے یعنی یہ انجمنیں بالاتمام امور پر غور کر کے مختلف شعبہ ہائے علوم کو آپس میں تقسیم کر لیں اور ہر انجمن اپنے متعلقہ شعبہ کی کتب اپنی ماتحت تحقیق و تصحیح کے ساتھ شائع کروائے جو مصنف اپنی تصنیف خود اپنے زیر اہتمام چھپوائے اس کو متعلقہ شعبہ کی انجمن

جانب سے بالاستیعاب اور ناقدانہ نظر سے دیکھنے کے بعد سند دی جائے کہ وہ مستند سمجھی جائے۔
اگر مذکورۃ الصدر انجمنیں متفقہ طور پر تصفیہ کرکے باہم متحد ہو جائیں تو ایک مہتم بالشان علمی خدمت انجام پا جائے اور قلمرو اردو کو یہ "اتحاد اربعہ" بہت کچھ فائدہ پہنچا سکے۔ وما توفیق الخ
ہمیں امید ہے کہ مذکورہ بالا تجویز کو معزز معاصرین اپنے رسالوں میں اپنی رائے صائب کے ساتھ درج فرماکر مشکور فرمائیں نیز مذکورہ انجمنیں بھی اس پر توجہ مبذول فرماکر ہمیں ممنون بنائیں گی۔

شرر مرحوم کی یادگار میں مکرمی ایڈیٹر صاحب النّاظر لکھنؤ نے ایک "انعامی مقابلہ" قرار دیا ہے جس کے شرائط کی تفصیل دوسری جگہ درج کرتے ہیں اس کے متعلق ہم اپنے مقالہ نگار خصوصی حضرت نور (صاحب روح تنقید) کو اس طرف توجہ دلائیں گے کہ وہ شرر مرحوم کی تصانیف پر مبصرانہ نظر ڈال کر ایک تنقیدی مضمون سپرد قلم فرمائیں اور ملک کو اپنے نکتہ رس خیالات سے ممنون فرمائیں۔
تعویق اشاعت کے باعث آخر ہم مجبور ہوکر دوسرے مطبع سے طباعت کا انتظام کرتے ہیں خدا کرے کہیں یہ بھی "ستم ظریف" نہ نکلے اگرچہ ہم نے ہر طرح کی پیش بندی کرلی ہے۔
چونکہ ہم نے قارئین زبان کی خدمت میں فروری کا زبان وسط مئی میں حاضر کیا تھا اس لئے بہت پیچھے رہ جانے کے باعث مارچ و اپریل کا مشترکہ نمبر نکال رہے ہیں۔ جو غالباً وسط جون تک قدر دانان زبان کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا اور انشا اخیر جون تک مئی و جون کا مشترکہ نمبر بھی شائع ہو جائے گا جس سے توقع ہے کہ بہت جلد تاخیر اشاعت کی شکایت رفع ہو جا

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ باوجود دو تین ماہ کا عرصہ گذر جانے کے اب تک ہمارے کاٹھیاواڑی بھائیوں نے انجمن اخوان الصفا (مانا دور) کے عطیہ سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بھائی ا مستغنی ہیں کہ انہیں کسی کی امداد و اعانت کی ضرورت ہی نہیں ہے یا پھر کسی کی امداد و اعانت کو اپنی توہین و کسر شان کے مترادف خیال کرتے ہیں بہرحال اس سے ہماری غفلت و خود فراموشی ظاہر ہے۔
کیا کاٹھیاواڑ کو بھی کبھی وہ دن میسر آئیگا کہ اس کا ہر فرد اردو خواں و اردو داں نظر آئے گا؟ اور کیا اس بنجر اور بے زمین سے ایسے نونہال بھی پیدا ہوں گے جو اپنے علمی کارناموں سے ہندوستان بھر میں دھوم مچا دیں گے۔
صورت حالات اور موجودہ "شان بے نیازی" دیکھتے ہوئے تو ہمیں ایک صدی تک اس کی توقع نہ رکھنی چاہئے کیونکہ

کلام الملوک ملک الکلام

(طبع زاد ہز ہائی نس میر علی نواز خاں بہادر ناز فرماں روائے ریاست خیرپور (سندھ) خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ)

ہوا خورشید کا ہمسر ستارہ میری قسمت کا — تماشا دیکھتا ہوں یا الٰہی تیری قدرت کا
مجھے پابند کر احسان کا، انصاف کی خو دے — کھلے یا رب میرے ہاتھوں سے دروازہ عدالت کا
یوں ہو فرض مجھ پر ملک کی اپنے نگہبانی — جسے سب میر کہتے ہیں وہ راعی ہر رعیت کا
بری دریادلی سے چشمہائے فیض جاری ہوں — غریبوں کی خبرگیری ہو فخر میری دولت کا
خدا کے روبرو جھکتا رہے سر میرا سجدے میں — رہے دل میں مرے ہر دم تصور اس کی عظمت کا
رہے نوشیرواں کے عدل کا سر پر مرے سایہ — سیاست میں میری ہو رنگ اکبر کی حکومت کا
عطا ہو مجھکو ہمت خادم اسلام ہونے کی — بڑھے رتبہ میری کوشش سے قوم و دین و ملت کا
بری بیکس نوازی کا بجے ڈنکا زمانے میں — رہے سکہ میرے دینار و درہم پر شرافت کا
سی کا دل تو کیا، ٹوٹے نہ مجھ سے مے کا شیشہ بھی — نہ پائے استقامت لڑکھڑائے میری نیت کا
جواں ہو میرے سایہ میں میرا نور نظر یعنی — یہ وارث ہے میرا، میرے وطن کا، میری عزت کا

نہ ہو کیوں ناز مجھکو اپنے نشہ کی ترنگوں پر
پئے بیٹھا ہوں ساغر ساقیٔ کوثر کی الفت کا

صاحبزادہ میر فیض محمد خانصاحب ولیعہد بہادر ریاست خیرپور۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مارچ واپریل

زبان

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی　　کل جسم میں اک نطق مجسم ہے یہی
ہے عرش خدائے پاک اگر پاک ہی دل　　صادق ہے زبان تو اسم اعظم ہے یہی

مقالات

اسلام کی بدنصیبی

(اللھم ارحم امۃ محمد صلعم)

(علامہ میمن عبد العزیز صاحب راجکوٹی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

"ہم اپنے محترم و مخرکاٹھیاواڑ علامۂ میمن عبد العزیز صاحب راجکوٹی کے اس دوسرے مضمون کو" زبان" میں شائع کرنے کی عزت حاصل کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ مضمون آج بہت قبل چھپ جانا چاہیے تھا لیکن چونکہ علامہ محترم کے خامۂ حقیقت نگار سے نکلا ہے اور پھر اس میں ترکوں کا جذبہ مغرب پرستی سے متاثر ہوکر مذہب اسلام پر تصرف کرنا اور حسب خواہش اس کی ملحدانہ اصلاح کرکے ایک جذبہ مذہب کی بنیاد ڈالنا اسلاف کے کارناموں کو بے وقعت کرکے اسکی جگہ مغرب کے اخلاق سوز تمدن کو رواج دینا وغیرہ وغیرہ پر نہایت مؤثر اور مدلل بحث کی ہے اس لئے ہم نہایت خوشی کے ساتھ درج زبان کرتے ہیں" ایڈیٹر

اسلام کی بدنصیبی

اللّٰہم ارحم امّۃ محمد صلعم

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ‏ ‏ ‏ ‏ کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

ہمارے جادو بیان مقرر اور سحر نگار محرر ہمیشہ ہمیں اسلامیوں کے عہد ماضی کے کارنامے سنا سنا کر غفلت کی گہری نیند سلاتے ہیں جس سے ہم اپنے طور پر یہ طے کر چکے ہیں کہ اُن کا ان اعمال حسنہ سے متصف ہونا ہمارے لئے کافی وافی اور انہوں نے ہمیں اکتساب فضایل کے بارگراں سے سبکدوش کر دیا ہے۔ گویا یہ بھی کوئی فرض کفایہ ہوا یا مسیحیوں کا ہ۔

دل کی آنکھ جب کور ہو جاتی ہے تو وہ ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی جس میں دماغی غلامی کا مریض مبتلا ہو جاتا ہے وہ عین علت کو ت گردانتا ہے یہ جملہ گو مختصر سا ہے مگر اپنی معنوی ہمہ گیری کے باعث ادبار زدہ قوم کی پوری زندگی پر طابق النعل مل منطبق ہوتا ہے۔

سلام کی بدنصیبی کی گھٹائیں کچھ اس قدر تو بتو امڈتی آرہی ہیں کہ چشم بینا بالکل بیکار ہوئی جا رہی ہے کوئی حد دکھائی نہیں جہاں یہ سلسلہ ختم ہو اور آئیندہ کے لئے اُمید کی راہ کھول سکے۔

بڑا ظلم ہے کہ سدا ناواقف مخاطبین کو مدحیہ افسانے سنا سنا کر خوش وقت کیا جائے اور اُن کے اسلاف کی منقبتیں سراہ ن کی آنکھوں پر جہالت کی پٹی باندھ دی جائے۔ یعنی کہ اُنہیں امروز و فردا میں مقابلہ کر کے محاسبۂ نفس سے محروم رکھا جائے۔ اس طرح قوم و ملت کے مجموعی اغراض کو کسی اخبار یا رسالہ کے مقامی اغراض کی بھینٹ پر بُری طرح ذبح کر دیا جاتے۔ سچا مدبر وہی شخص ہو سکتا ہے جو قوم کو قبل از وقوع حادثہ خبردار کر دے۔ خواہ تھوڑی سی دیر کے لئے اُس کو تجہیل و تحمیق کا انعام کیوں نہ دیا جائے۔ مگر وہ ژرف نگاہ اور غواص ناصح کسی طرح ان ادنیٰ امشوشات میں اُلجھ کر راہ و رسم سے کسی ح رد گرداں نہ ہو۔ بقول عرفی

نوا را تلخ ترمے زن چو ذوق نغمہ کم یابی ‏ ‏ * ‏ ‏ حُدی را تیز ترمے خواں چو محمل را گراں بینی

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عالم اسلامی میں اس وقت ایک قیامت خیز طوفان افکار دِرآرہا ہے۔ اسلامی ڈاک ہمیں

ہفتہ وار الفتح زیر امتیاز مکرمی الشیخ محب الدین الخطیب کے محرم سنہ ۵۲ھ کے اجزاء۔

بتاتی ہے کہ ہمارے دشمن ہمارے لئے جو گڑھے کھود رہے ہیں اُن سے کہیں زیادہ گہرے کنوئیں ہم نے خود اپنے لئے ہاتھوں کھود لئے ہیں اور برعکس مفاد آیۃ کریمہ وکفی اللہ المومنین القتال خاکم بدہن کفی اللہ الکافرین کا منظر درپیش ہے۔ جو حکیم الامۃ سید جمال الدین افغانی کی پیشین گوئی کو حرف بحرف صحیح ٹھہراتا ہے "مسلمانوں کو اللہ کر ان کی کسی رگ میں حیات کی صلاحیت نہیں اور ان کے بعد کسی ایسی قوم کو لائے جو ہنوز سادہ ہو اور پھر اُس سے کلمۃ اللہ کا کام لے" او کما قال

وہی مصطفےٰ کمال جو کل انگورہ میں بزمانہ جنگ یونان بلاناغہ مسجد میں حاضری دیتا اور بارگاہ ایزدی میں مسلمانوں کے لئے بتضرع و نیاز دست بدعا رہا کرتا تھا اور جو شیخ شریف احمد سنوسی سے بار بار بخاری کا ختم کرانے کی التجائیں کیا وہی آج بر خود غلط ہو کر حسب فرمان الٰہی ان الانسان لیطغیٰ ان رآہ استغنیٰ شروع اسلام کی رفیع الشان کو ڈھانے میں مسمی بشیرین کا علم الملکوت بن رہا ہے اور کوس لمن الملک بجا رہا ہے۔

وائے گر در پس امروز بود فردائے

(۱) وہ مسلم کے لئے ارتداد کو جائز قرار دیتا ہے۔

(۲) تعدد ازدواج کو دلو ضرورۃً از روئے قانون بند کر دیتا ہے۔

(۳) مسلم خاتون کو غیر مسلم کے ساتھ بسلسلۂ عقد جوڑ دیتا ہے۔

(۴) سوئٹزرلینڈ کے قانون تمدن کو جس میں بھانجی سے عقد کرنا روا رکھا گیا ہے اپنے ممالک میں بزور رواج دے،

(۵) نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں یعنی بیولس اور تینگے کو کالج کی بنچوں پر جبراً ساتھ بٹھاتا ہے۔

(۶) پورے قلمرو سے فقہ اسلامی کا نام و نشان میٹ دیتا ہے۔

(۷) تمام محاکم شرعیہ کو اُلٹا کر کے ہر شرعی شے حتیٰ کہ لفظ شریعت کے اطلاق کو جرم قرار دیتا ہے۔

(۸) محکمۂ مشیخت اسلامیہ کو اڑا کر اُس کی بجائے ایک حقیر دائرۂ دیانت کو قائم کرتا ہے۔

(۹) تمام باشندوں کو ہیٹ کے استعمال پر مجبور کرتا ہے مگر یہ سب کچھ کیوں؟ محض تفریح کے لئے! اور جو کوئی ہیٹ کو ٹھکرا دیتا ہے اُس کی گردن ماردی جاتی ہے۔ چنانچہ سینکڑوں مشائخ دین کا اسی جرم کی پاداش میں صفایا کر دیا گیا

(۱۰) عربی حروف کی بجائے لاطینی حروف کی منظور شدہ تجویز کو آہستہ آہستہ عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے

---

[۱] دیکھو حاضر العالم الاسلامی کے حاشیہ میں ترجمہ سید جمال الدین۔

ھیم اس طرح لکھا گیا تو اُس کا تلفظ ناممکن ہو جائے گا مگر نہیں اُنہوں نے تو پہلے ہی سے سوچ رکھا ہے کہ حروف لاطینی
ے کمل رواج پانے تک قلمرو ترکی میں سرے سے کوئی قرآن خواں ہی نہ رہے گا۔ اس لئے اُنہیں کسی تشویش سے دوچار نہ
ہونا پڑے گا۔ لاقدر اللہ

(۱۱) تمام مدارس شرعیہ کو مقفل کر کے صرف ایک مدرسہ لاہوت کو باقی رکھا ہے جو یورپی طریق پر الٰہیات کی تعلیم دیتا ہے۔

(۱۲) شرعی اوقاف کو ضبط کر کے وقف کرنے والوں کی شرطوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔

(۱۳) تمام اخبارات ورسائل کے نام یہ سرلیغ قضا تبلیغ نافذ ہوا ہے کہ وہ بیک وقت اسلام پر دھاوا بول دیں
ہ عالم اسلامی کو "گھنونے" کے ناپاک نام سے پکاریں۔

(۱۴) حج کو غیر معینہ مدت کے لئے روک دیا گیا ہے۔

(۱۵) اعلان کر دیا گیا ہے کہ ترکی کو بمقابلہ غیر مسلم ممالک کے اسلامی ممالک اور ان کے باشندوں سے کوئی خاص علاقہ یا ہمدردی
ہیں (۱۶ ......) وغیرہ وغیرہ

کیا ہنوز یہ حکومت اسلامی ہے؟ یا کیا ان تمام باتوں کو بعض سہل انگار لوگوں کی طرح گپ گزٹ سے تعبیر کیا جائے گا۔
بعض متعمق مگر جامد شخصیتوں کی طرح اس کو یورپی طاقتوں کی رضا جوئی اور دل دہی پر محمول کیا جائے گا۔
میر ان بزرگوں سے سوال ہے کہ حبشہ (ایتھوپیا) کے لوگ تو باقاعدہ اور پرانے مسیحی ہیں پھر کیوں اُن کے ممالک کے
مد بجزے کرنے کو یورپ کے مسیحی گرگے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ کیا ترکوں کو لاطینی حروف اور ہیٹ کے استعمال نے میسولینی
طالوی فرعون کی اس دھمکی سے باز رکھا کہ وہ اس بنا پر کہ اناطولیہ اصل میں رومانوی ملک ہے جب چاہے اُس کو غصب کر سکتا
ہے۔ کیا وہ اطالوی قانونِ عقوبت اختیار کر کے اطالیہ کے ملک الشعراء جبرئیل دانونضیو کو اس ناہنجار حرکت سے باز رکھ سکے
اُس نے اپنی ایک زبردست نظم میں اپنی قوم کو استرداد اناطولیہ پر اُکسایا ہے جو کبھی اطالویوں کے اسلاف رومانیوں کے
الک محروسہ میں تھا۔ کیا ہیٹ نے قضیۂ موصل میں ترکوں کی نامرادی میں کچھ مدد کی۔
ہاں مگر اب پے بہ پے ٹھوکریں کھا کھا کر بعض ترک کچھ سنبھلنے لگے ہیں۔ اور اس حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں کہ یورپ کے
بھی برخلاف آیۂ کریمہ ولن ترضی عنک الیہود ولا النصاری حتیٰ تتبع ملتہم وہ کبھی اُن کے ترک مذہب سے بھی راضی
ہوں گے مگر "بعد از خرابی بصرہ" عام ترک علی الخصوص انجمن اتحاد و ترقی کے ممبر تو پہلے ہی سے اس حقیقت کو خوب جانتے تھے
رہ بچارے مغلوب و مقہور تھے نیز یونان پر فتح پاکر مصطفےٰ کمال پوری ترکی کے مال و منال اور دین و ناموس کا بلا شرکت غیرے

مالک بن بیٹھا ہے اور لوگ اُس کے اس احسان کو دیکھ کر اُس کی ہر بیجا حرکت پر باوجود ناپسندیدگی خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر امتہ
اللہ جارج کی جنگ یورپ میں کامیابی اور پھر زبان امن سخت گیری کے قصہ سے سبق لینا چاہئے۔

فالملک یبقی مع الکفر المبین ولا * یبقی مع الظلم فی بدو ولا حضر

کہتے ہیں کہ بالشویکوں نے ترکوں کو اس مغرب پرستی پر بہت کچھ سخت وسُست کہا ہے کہ وہ اس طرح نہ مشرقی رہیں گے اور
مغربی اور بمقتضائے لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء وہ دونوں امتوں کی ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے۔ بارے وہ
اب کچھ سنبھلنے لگے ہیں جس کا پتہ اُن کے موتمر مکہ میں وفد بھیجنے سے لگ سکتا ہے۔

مصطفےٰ کمال نے بہانہ پاکر موجودہ سازش قتل کے سلسلہ میں تمام رطب ویابس اور مجرم وغیر مجرم ہستیوں کو جن میں دس بارہ
نہایت جلیل القدر شخصیتیں بھی ملوث ہیں اپنے آہنی قدم سے روندد ینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ حالانکہ ترکی قوم اُن نیک نہاد
اور کارگذار نفوس کے بعد پھر جسم بے جان رہ جاتی ہے اور یوں بھی ترکوں میں اعلیٰ قابلیتوں کے لوگ کون سی زائد تعداد میں تھے
جو اُن کو کم کرنے کی ضرورت لاحق ہو۔ کیا اُن غیر معمولی نفوس کو جو براہ راست اس جرم میں شریک نہ تھے معاف کر کے ایک نیک
مثال نہیں قایم کی جا سکتی تھی۔

ذرا آیئے۔ ہم اس واقعہ کی نظیر سیرت نبوی میں ڈھونڈیں مغازی ابوالاسود میں ہے کہ جب رسول کریم صلعم جنگ تبوک
سے واپس لوٹ رہے تھے تو راستہ میں ایک گھاٹی اور ایک وادی سے دوچار ہوئے۔ چند منافقوں نے باہم گریہ سمجھوتہ کرلیا
جوں ہی آپ گھاٹی پر پہنچیں آپ کو نیچے دھکیل دیں تاکہ اس طرح آپ کا نعوذ باللہ خاتمہ ہو جاتے۔ جب آپ نے اس سازش
پر اطلاع پائی تو حکم دیا کہ سب لوگ وادی کا راستہ لیں اور آپ مع چند مخصوص اصحاب کے گھاٹی پر سے گذریں گے۔ مگر چونکہ ان
باطنوں کی نیت ناپاک تھی یہ آپ کی سانڈنی کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ سو آپ نے حضرت حذیفہ رضؓ کو بھیجا کہ ان کو یہاں سے ہٹا کر وا
کے راستہ پر لگا دو۔ وہ ہیبت زدہ ہو کر کہ شاید آپ اُن کی سازش سے مطلع ہو گئے ہیں وادی کی راہ کی طرف ہو لئے۔ ادھر آپ
حذیفہؓ سے فرمایا کہ تمہیں کچھ خبر بھی ہے؟ یہ لوگ میری جان لینے کے ارادہ سے پیچھے ہو لئے تھے۔ حضرت حذیفہ رضؓ بولے
ارشاد ہو تو اُن کی گردنیں ماردوں آپ نے فرمایا نہیں! نہیں!! لوگ کہیں گے کہ محمد اپنے ہی آدمیوں کو مار ڈالتا ہے
سبحان اللہ فداہ ابی وامی آپ کی تو یہ سیرت تھی کہ وانک لعلیٰ خلق عظیم اور بالمؤمنین رؤف رحیم
تھے مگر ہاں مصطفےٰ کمال کے پیش نظر تو اطالوی قانون عقوبت ہے جس میں وان تعفوا اقرب للتقویٰ کی آیت ہی نہیں

ان حالات اور آیندہ کوائف کو دیکھتے ہوئے ابن سعود اور اخوان نجد نہ تھی کہ قابل برداشت ہوجاتی ہے بلکہ ذرا اور
ہے اترنے سے قابل تحسین و آفرین ہاں اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو موجودہ عالم اسلامی کی پوست کندہ حالتوں اور
یفیتوں سے باخبر ہیں۔ خیر اب اس قصہ کو ختم کیجئے۔

اب چلئے ذرا آپ کو وادی نیل کی طرف لے چلیں جس کو عربی میں قبت الاسلام اور مدینۃ الاسلام کے گراں قدر القاب دیئے
ہتے ہیں۔ ابھی حلقہ بگوشاں توحید کی دلوں پر مصر کے قاضی علی عبدالرزاق ازہری کی کتاب الاسلام واصول الحکم کا زخم
تازہ ہی ہوگا جس میں آنحضرت نے اسلام کے نصف حصہ کو جو دنیوی فلاح و بہبود سے متعلق تھا بالکل لغو اور بے معنی قرار دیا تھا
اور جس کے رد میں تونس و مصر کے علماء کی طرف سے تین کتابیں ابھی ابھی نکلی ہیں جن میں ان کے پادرہوا اور سفیہانہ استدلالات
کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں کہ یکایک وہاں سے اور بھی تیز و تند طوفان در طوفان اٹھنے شروع ہوئے جنہوں نے راقم الحروف
کی مہر سکوت کو توڑا اور اس کو اس بات پر مجبور کیا کہ اپنے برادران دین کو حقیقی احوال سے آگاہ کرے۔

ایک صاحب جو دینی اور ایمانی غیرت سے متصف ہیں جرائد مصریہ کے جن میں السیاست آگے آگے نظر آتا ہے اس الحاد و
زندقہ اور کفر و تعطیل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج سے پہلے تو اللواء المؤید اور الشعب
وغیرہ اخبارات اگر بالفرض کہیں سے کسی داعی الحاد کی آواز اٹھتی تو علماء کو اس کے رد کی دعوت دیا کرتے یا خود ہی اس کا دنداں
شکن جواب دے دیا کرتے تھے۔ مگر اب تو حالت دگرگوں ہوچلی ہے جو کوئی اپنے اخبار کو چلا کر جیب بھر لینا چاہتا ہے وہ ناجائز
طور پر آزادی مطابع سے فائدہ اٹھا کر ملحدانہ مضامین شائع کرتا ہے۔ گویا وہ اپنے کو ایک اسلامی حکومت کے ممالک محروسہ میں
نہیں دیکھتا بلکہ یوروپ کے کسی دہری ملک میں فالی اللہ المشتکی۔

اس تمرّد اور تفریج سے تنگ آکر اور حفاظت دین و ایمان کے فرض کا احساس کرکے چند مخلص علمائے ازہر اٹھے اور ایک
ہفتہ وار اخبار انہیں بدلگاموں کی زبان دوزی اور دہان بندی کے لئے جاری کیا جس کا نام الفتح ہے جس کے چیف ایڈیٹر
علامۂ ازہر جناب عبدالباقی سرور نعیم اور پروپرائٹر یا آنریری ایڈیٹر اور صاحب سیاست ہمارے محب صادق اور مخلص جاں نثار
الشیخ محب الدین الخطیب ہیں اللہ ان کے ارادوں کو پورا کرے۔

ابھی چند روز ہوئے کہ مصر کے چند احمقوں نے برنیطہ (ہیٹ) کی مدح سرائی اور طربوش (ترکی ٹوپی) کی مذمت میں
مسلسل بیسیوں مضمونوں کا انبار لگا دیا تھا کہ جمعیت طبیہ نے ان کی حوصلہ افزائی کے طور پر تمدن و صحت کا مختصر ترین کانستہ
ھونڈ لگا اور اعلان کیا کہ ترکی ٹوپی نے لوگوں کی صحت جسمانی کو برباد کر رکھا ہے ان کے جسم لاغر کردئے ہیں ان کی تعداد اموات بڑھا
دی ہے اور پیدائش کے اعداد و شمار کم کردئے ہیں جس سے ان کی تعلیمی حالت پست اور ان کے دماغی قوا برباد ہوگئے ہیں۔

بس پھر کیا تھا سارے استعماری دیوتا ایک زبان ہو کر بول اٹھے کہ جی ہاں بالکل بجا ہے۔ ہاں صاحب وہ مدنیت علم اور طبیعت و فطرت کے بھی خلاف ہے نیز وہ اہل عرب سے مخالفت کے لئے بالکل غیر موزوں ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ (نعوذ باللہ) ادھر ایک گروہ جو ذرا دینی اور ملی طبقہ کو خاموش کر دینا بھی ضروری سمجھتا تھا لفظ طربوش کو یونانی الاصل قرار دے کر طربوش کو غیر اسلامی چیز بتا کر لوگوں کو روگرداں کرنے لگا مگر خدا میرے محترم علامہ احمد تیمور پاشا کا بھلا کرے کہ انہوں نے طربوش کو سر پوش فارسی کا معرب دکھا کر اس کی اسلامی تاریخ پر ایک بے نظیر مضمون لکھا جس سے اس وہم کا تو قلع قمع ہو گیا۔ بعض احباب حضرت سعد پاشا زاغلول سے استفسار کرنے لگے آپ نے فرمایا کہ طربوش کا مسئلہ بلحاظ ایک قومی پوشاک ہونے کے محض قومی ہے سو اگر ہم نے اپنی پوشاک بدل دی تو دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ گویا ہم نے اپنی قومیت بھی بدل ڈالی اور قوم میں قومیت نہ ہو وہ مردہ کا حکم رکھتی ہے اس لئے انہوں نے یہاں سے بھی منہ کی کھائی۔ ادھر جمعیۃ طبیہ کے شلذ ارطبہ کیفیت سے جس کے بانی مبانی علی بک ابراہیم تھے کہ باوجود شدت اہتمام کسی نے اپنے سر اس مدنی مہم کے لئے پیش نہ کیا، ایک سر کے جو عنقریب اپنے دماغ میں سے سودائے تفریخ کو دور کر دے گا۔ جب اس کو کوئی اپنا ہمنوا نہ ملے گا۔

ابھی یہ سلسلہ مصر کی فضا میں پھیل ہی رہا تھا کہ ایک سخت ترین ملحد نے اٹھ کر قرآن و دین پر سفیہانہ حملے شروع کر دئے۔ ہماری مراد ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے ہے جو من کان فی هذه اعمى فهو فى الآخرة اعمى کا مصداق ہے۔

یہ نوخیز اندھا ازہر میں تعلیم پاتا رہا اور پھر کوشش کی کہ وہاں سے عالمیت کی ڈگری حاصل کرے۔ امتحان میں بیٹھا اور فیل ہوا۔ پھر کیا تھا ازہر اور ازہری علماء کی تنقیص کو اپنا وتیرہ بنا لیا اور ادھر جامعۂ مصریہ میں (جو اجنبی مداریوں کے اشارہ پر ازہر کی مٹی گھٹانے کے لئے بنائی گئی تھی اور جس کا مقصد مصر کے پیر نابالغوں کو رقص کرانا تھا وبس) اسی ڈگری کے لئے کوشش کی اور ذکرٰی ابی العلاء لکھ کر یہ ڈگری حاصل کی۔ اس کتاب میں حضرت نے یوروپ کے طریقۂ تصنیف کو جس میں ہر واقعہ کی تحلیل کی جاتی اور ہر شے کے اسباب و علل کی تلاش کی جاتی ہے بہت سراہا ہے اور قدیم طریقہ کو بہت کچھ برا بتا کر لکھا ہے کہ اس سلسلہ کی تمام گذشتہ تالیفیں ابو العلاء کی تاریخ نہیں بن سکتیں بلکہ آیندہ تاریخ لکھنے والے کے لئے مواد کا کام دے سکتی ہیں فقط۔ یعنی گویا یہ لیوتھ سلمون وغیرہ مستشرقین بھی مغرب کی تقلید میں آپ سے پیچھے ہیں۔ میں نے اپنی تالیف ابو العلاء و ما الیہ میں جو عنقریب مصر سے چھپکر نکلنے والی ہے ان کی چشم بصیرت وا کر دی ہے اور ان کے لاتعداد جاہلانہ اقوال کی پوری طرح تردید کر دی ہے۔

ہم نے اپنے سابق مضمون "ابو العلاء اور مستشرق یوروپ کے اغلاط" مطبوعہ معارف میں مکاتزۂ یوروپ کے مبلغ علم پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔

القصہ جامعہ کی متفرنجین نے آپ کو تاریخ قدیم کا پروفیسر بنا دیا اور اب آداب عربیہ کے پروفیسر ہیں۔ اسی اثنا میں یہ یورپ گئے اور دل باختہ ہو کر آئے ایک میم سے شادی کرلی جس سے کچھ لڑکیاں بھی ہیں۔ اب ہر بات میں وہ مغرب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ان کے نزدیک علم اخلاق آداب غرض ہر شے اہل یورپ ہی کی ہے۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

جامعہ کی کرسی اور رنج مغرب نے ان کو کچھ اس درجہ برخود غلط بنا دیا کہ ان ہی دنوں ایک کتاب بنام الشعر الجاھلی[1] لکھی جس میں اسلام پر نہایت ناپاک اور خام حملے کئے جن کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"موجودہ علوم کی روشنی میں دین بھی بظاہر اور احوال اجتماعیہ کی طرح ہے نہ وہ آسمان سے اترا ہے نہ وحی الٰہی سے اس کو کچھ سروکار ہے بلکہ وہ تو اسی خاک کا زائیدہ ہے جس طرح نفس جماعت بھی یہیں کی پیداوار ہے سو یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس علم کے جو دین کو ایسا کچھ سمجھتا ہے اور دین کے مابین کسی طرح اتفاق نہیں ہو سکتا"

"قرآن حکیم منزل من عند اللہ نہیں بلکہ وہ پادر ہوا افسانوں پر مشتمل ہے جو سیاسی اغراض کی بنا پر گھڑے گئے ہیں"۔

خاص مسلمانوں کی طرف سے ان سفیہانہ اعتراضوں کی بوچھاڑ نے غیرت ایمانی رکھنے والوں کو مجبور کیا کہ ادھر تو باقاعدہ ان کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں اور ترکی بہ ترکی جواب دیں اور اُدھر وزارت مصری کا دروازہ کھٹکھٹائیں کہ شاہی مذاہب پر ان بے جا حملات کے باوجود حکومت کیوں خاموش ہے۔

منصورہ سے بذریعۂ تلغراف یہ فریاد اٹھی کہ ڈاکٹر طہ حسین کی دست درازیوں پر خاموش رہنے سے جس نے قرآن کی تکذیب اور سرکاری دین کی توہین کی ہے اس کی دلیری کو اور بڑھا دیا ہے جس سے اس نے جریدۂ سیاست نمبر ۱۹ میں لکھا ہے کہ "اللہ کا وجود اور انبیاء کی نبوت علم کے نزدیک خرافات ہے" اور کہ علم قرآن کی تکذیب کرتا ہے جس طرح اس نے پہلے یہ مطالبہ کیا تھا کہ "تمام معاہد دینیہ بند کر دئے جائیں" پھر ہم علماء داعیان کے دستخط ہیں۔

اس فریاد سے پہلے کے واقعات یہ ہیں کہ صاحب الفضیلہ شیخ مصطفےٰ قادیانی نے جو مجلس نواب کے ممبر ہیں وزیر معارف سے اس سوال کا جواب مانگا ہے۔

آپ کے علم میں یہ بات آچکی ہوگی کہ ڈاکٹر طہ حسین نے جامعہ کے طلبہ کے روبرو صاف صاف قرآن کی تکذیب کی ہے کہ وہ ابراہیم و اسمٰعیل کے کعبہ بنانے کا واقعہ بیان کر کے لکھتے ہیں کہ "ہم مجبور ہیں کہ اس قصہ میں گونہ چالبازی کو دخل دیں جس کا

[1] زبان۔ اس کے متعلق صفحات آئندہ پر مولانا اختر صاحب کا مفصل مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

مقصد یہود و عرب اور تورات و قرآن میں باہمی لگاؤ پیدا کرنا ہے" ملا۔ از کتاب الشعر الجاہلی۔ پھر آگے چل کر فرماتے ہیں جس سے اب اس قصہ کی حقیقت عیاں ہو گئی کہ یہ اسلام سے کچھ ہی پہلے گھڑ لیا گیا تھا۔ اور اسلام نے اس کو دینی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر قبول کر لیا۔ لہٰذا ادبی اور لغوی تاریخ کو چاہیئے کہ جب وہ فصیح عربی کی اصل کی کھوج لگانے لگے تو اس قصہ کی طرف مطلق التفات نہ کرے" ص۲۹۔ پھر کتاب کے پہلے صفحہ میں لکھتے ہیں کہ" میں اس بحث کو پھیلانا چاہتا ہوں یعنی کہ تحریر کرنا گو جامعہ کے طلباء کے سامنے جو دو سو سے کسی طرح کم نہ ہوں گے اس کا اعلان کر دینا بھی شہرت میں کسی طرح کم نہیں" اور پھر آگے چند مطالبات ہیں جو آئندہ آئیں گے۔

علماء کے اس فساد بلا پر معدن الحادیعنی جریدہ سیاست اپنے نمبر ۷ جولائی میں لکھتا ہے کہ طٰہٰ حسین کی کتاب پر علماء نے بہت چیخ پکار کی ہے حالانکہ جب پچھلی وزارت میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا تھا تو تمام ارباب حل و عقد نے صاف کہہ دیا تھا کہ کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں جس کا نوٹس لیا جائے نیز جامعہ کی کونسل نے فیصلہ کر دیا ہے کہ کسی سرکاری مجلس کو حق نہیں کہ وہ جامعہ کے امور میں ہاتھ ڈالے۔ بایں ہمہ ڈاکٹر موصوف نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر جامعہ نے کتاب کی تمام کاپیاں خرید کر فتنہ کا سدِ باب بھی کر دیا تھا۔ شیخ الازہر نے اس حل کو منظور کر کے قضیہ کا خاتمہ کر دیا تھا۔ سو بحالات موجودہ علماء کا اس مسئلہ کو دوبارہ چھیڑنا اُن کی نیک نیتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا وغیرہ"۔

یہ سارے بیانات یا خلاف واقع ہیں یا دیدہ و دانستہ اغماض کرتے ہیں جس طرح الفتح میں اُن کے حرف حرف کی پوری تکذیب کی گئی ہے۔

مصر کے مشہور انشاء پرداز فاضل شیخ مصطفیٰ صادق رافعی نے اس اعجوبہ پر کوکب الشرق میں ایک مضمون بعنوان" ڈکھانے کا مسلمان نہ حقیقی" سپرد قلم کیا ہے جس میں ایک تناقض پر سخت حیرت کا اظہار کیا ہے کہ وہ قرآن بلکہ جمیع ادیان کی تکذیب کرنے کے باوجود جس طرح اُس کا دعویٰ ہے پکا مومن بھی ہے۔ سبحانک ھذا بھتان عظیم۔

علماء کی اس شدید مقاومت سے تنگ آ کر ڈاکٹر مذکور نے سیاست میں دو مضمون لکھے۔ جن میں وہ یوں اپنی ہٹ پر اڑا رہا ہے کہ

" دین ایک طرف ہے اور علم دوسری طرف۔ دونوں کا اتحاد ناممکن ہے جو دونوں کو ملانا چاہے وہ یا دھوکہ باز ہے یا خود فریب خوردہ"۔

پھر فرماتے ہیں کہ

" علم جس طرح میرے دوست عزمی کا قول ہے ہمیشہ اپنے نئے نئے مدارج میں ترقی پذیر ہے سو اگر آج ہم

کسی تورات یا قرآن کی آیۃ کی ایک تاویل کرتے ہو تو مجبوراً تمہیں کل ایک اور تاویل کرنی ہوگی۔ الخ"

ہاں یہ یاد رہے کہ ڈاکٹر مذکور الحاد کے اقانیم ثلثہ میں سے ایک ہیں اور باقی دو استاذ محمود عربی اور ڈاکٹر ہیکل ہیں۔

اور دوسرے مضمون کا جو ۲ محرم کے سیاست میں علمائے ازہر پر دیا ہوا ہوتا ہے مختصر اقتباس حسب ذیل ہے۔

میں ارکان پارلیمنٹ سے جن کے ہاتھ میں آج کل مصر کی زمام اختیار ہے صاف صاف کہدینا چاہتا ہوں کہ شیوخ کے جمود نے مصر میں ایک شر عظیم پیدا کر دیا ہے۔ میں پھر علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اُن کے تلی ذائقض اُن سے دو باتوں کا التزام چاہتے ہیں (۱) موقت ہے مگر ضروری کہ قانونی اور سیاسی وسایل سے کام لے کر شیوخ کو اس امر سے باز رکھا جائے کہ وہ قوم کی عقلی سیاسی اور علمی زندگی پر قابض ہو جائیں۔ (۲) اس جمود کا انسداد کیا جائے اور موجودہ اور آیندہ نسلوں کو اس کے شر سے بچا لیا جائے۔ پھر فرماتے ہیں کہ جب تک ازہر موجود ہے اور جب تک اُس کے ملحقہ مدارس اضلاع میں منتشر ہیں۔ برابر فساد چند در چند ہوتا رہیگا۔ بھلا مدارس حکومت کی مدنی تعلیم اور ازہر کی دینی بغیر ٹکرائے کیونکر ساتھ ساتھ چل سکیں گی۔

علمائے وزارت کو سخت تہدید کی ہے اور زور دار وسائل سے کام لینے کی دھمکی دی ہے اور چند امور کا مطالبہ کیا ہے کہ ایسے آدمی کو برطرف کر دیا جائے اُس کو قرار واقعی سزا دی جائے، کتاب کو معدوم کر دیا جائے، آیندہ کے لئے جرائد کو ایسے مضامین شایع کرنے سے روکا جائے، اور مذہبی آزادی کی واقعی تشریح اور حد بندی کر دی جائے تاکہ پھر کسی کو سرکاری مذہب پر طعن کرنے کی جرأت نہ ہو۔

جہاں تک معلوم ہے وزارت نے بعض امور کا واقعی سد باب کر دیا ہے اور بعض کے متعلق ہنوز اُس کے جواب کا سخت انتظار کیا جا رہا ہے۔

ہم نے بخوف طوالت اِن بے معنی اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی کہ یہ اعتراضات ان حضرت کے زادۂ طبع نہیں بلکہ وہ تو محض مبشرین مسیحیت کی آنریری طور پر خدمت بجا لا رہے ہیں اور اپنی جہالت کے باعث استعمار کی بیڑیوں کو اپنے پاؤں میں اور بھی مضبوط کر رہے ہیں اور مغرب کی دماغی بندگی کر کے بقول عرب لا فی العیر ولا فی النفیر کہیں کے نہیں رہے۔ نیز اس فرض کو الفتح نے پورے طور پر ادا کر دیا ہے۔

آخر میں ہم اُسی فقرے کو دہراتے ہیں اللّٰھم ارحم امۃ محمد صلعم

اے لبِ را پردۂ یثرب بخواب ❊ خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

شعر جاہلیت کا انکار

اور

"جامعہ مصریہ" کا ایک ملحد

(از مولانا قاضی احمد میاں صاحب اختر (جوناگڈھی)

ڈاکٹر طہٰ حسین جامعہ مصریہ کا سند یافتہ اور وہاں عربی ادبیات کا پروفیسر ہے۔ جامعہ مذکورہ میں اس نے چند لکچر دیتے ان لکچروں کو اس نے کتابی صورت میں جمع کر کے الشعر الجاہلی کے نام سے شایع کیا ہے اس کتاب نے مصر کے مذہبی طبقہ کو بہت برانگیختہ کر دیا ہے! اور وہاں کے علماء اور ادباء نے اس کی تردید کی ہے۔ چونکہ اس کتاب میں اسلام پر بعض دریدہ حملے کئے گئے ہیں اس بناء پر جامع ازہر کے شیخ نے جو مذہبی درسگاہوں کے صدر اور امور مذہبی کے رئیس ہیں علماء ازہر کی ایک کمیٹی مقرر کر کے اس کو اس کتاب پر ناقدانہ نظر ڈالنے اور قابل گرفت امور بابت رپورٹ کرنے کا کام سپرد کیا تھا۔ چنانچہ کمیٹی مذکور نے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنا رپورٹ مرتب کر کے شیخ موصوف کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ یہ رپورٹ اخبار المقطم میں شایع ہوا ہے۔ ترجمہ حسب ذیل ہے۔

اختر

مخدوم و محترم حضرت مولانا استاد اکبر شیخ جامعہ ازہر

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آنجناب کے حسب الحکم قرآن کریم کی تکذیب سے متعلق۔ جو طہٰ حسین نے اپنی کتاب الشعر الجاہلی میں کی ہے تفتیش کرنے کے لئے ہماری کمیٹی کا اجتماع ہوا تھا اور چنانچہ کافی مطالعہ تفحص اور استقراء کے بعد اس کا رپورٹ مرتب کیا گیا ہے جو ارسال خدمت ہے۔

"یہ کتاب ۱۸۳ صفحات پر ہے اور اس کا موضوع شعر جاہلیت کا انکار ہے کیونکہ اس کے مصنف کے خیال میں یہ کلام بعد از اسلام کا وضع کیا ہوا ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ اس نے اپنی اس بحث کی بنیاد دیکارٹے فرانسیسی فلسفی کے تتبع میں اپنے مذہب اور قوم سے علیحدہ ہو کر رکھی ہے۔ کتاب مذکور تمامتر الحاد اور زندقہ سے مملو ہے اور اس میں متعدد ارشادات پائے جاتے ہیں جو مذہب اسلام کے خلاف ہیں۔ ان کو ایسے طلباء کے سامنے بیان کرنا جو دینی معلومات سے بے بہرہ ہیں بیحد خطرناک اور ان کے عقاید فاسد بنانے والے، قوم میں فتنۂ عظیم برپا کرنے والے اور حکومت اور ملکی مذہب کے سراسر خلاف ہے۔

اس کمیٹی کی رائے ہے کہ ملک کی تعلیم سے جب تک اس روح الحاد کا استیصال، اس شجر عظیم کی بیخکنی نہ کی جائے۔ اور حلقۂ تعلیم کو اس لامذہبیت سے پاک نہ کر دیا جائے (جس کی بعض افراد "آزادی رائے" کے پردے میں کر رہے ہیں) تو نظام تعلیم کے بگڑنے، فوضویت پھیلنے اور امن عامہ میں خلل واقع ہونے کا قوی اندیشہ ہے کیونکہ مذہب ہی بنیاد امن و اطمینان کی ہے۔

اگرچہ بادی النظر میں اس کتاب کا موضوع شعر جاہلیت کا انکار ہے مگر درحقیقت بادنیٰ تامل معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ کفر و الحاد کے ستونوں میں سے ایک بڑا ستون ہے جو مذاہب کی عمارت کو منہدم کر دینے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مذہبی خصوصاً اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کر کے اس کے ضمن میں عربی اصول لغت کی بڑی اصل یعنی جاہلیت کے کلام نظم و نثر کا انکار کیا ہے۔ جو قرآن و حدیث کے سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ فی الجملہ یہ مقصد ہے اس کتاب کا۔ اب ہم اس کے بعض صریح کفریات اور ملحدانہ مقامات کو پیش کرتے ہیں۔

مؤلف صفحہ ۲۶ میں لکھتا ہے:۔

"توراۃ اور قرآن مجید کا کام صرف یہ تھا کہ وہ ابراہیم اور اسمٰعیل کا ذکر کر دے لیکن ان میں ان دو ناموں کا ایراد ان کے وجود کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ اس قصہ کے اثبات کے علاوہ جو اسمٰعیل بن ابراہیم کی ہجرت مکہ سے تعلق رکھتا ہے۔"

مؤلف نے اس طرح سیدنا حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل (علیہما السلام) کی ہجرت کا انکار کرتے ہوئے قرآن مجید میں ان کے ناموں کے ورود کو تاریخی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جو اللہ تعالیٰ کے اس قول کی صریح تکذیب ہے۔ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ارشاد ہوتا ہے۔

وَاذ قالَ ابراهيم رَبِّ اجعل هٰذا البلد آمنا
واجنبني وبني ان نعبد الاصنام، رب انهن
اضللن كثيراً من الناس فمن تبعني فانه مني
ومن عصاني فانك غفور رحيم۔ ربنا اني
اسكنت من ذريتي بواد غير ذي زرع عند
بيتك المحرم، ربنا ليقيموا الصلوٰة فاجعل
افئدة من الناس تهوي اليهم وارزقهم
من الثمرات لعلهم يشكرون۔

اور جب کہا ابراہیم نے اے رب اس شہر کو پرامن بنا دے اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ (کیونکہ) اے پروردگار انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا پس جس نے میری پیروی کی وہ مجھ میں سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے رب بیشک میں نے اپنی ایک اولاد میدان میں جہاں کھیتی نہیں تیرے محترم گھر کے نزدیک تاکہ اے رب وہ نماز کو قائم کریں پس لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا دے کہ ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ اور ان کو میووں سے رزق عطا کر شاید وہ شکر ادا کریں۔

(ابراہیم)

پھر اسی صفحہ میں رقمطراز ہے:۔

"ہم یہ ماننے رکھنے پر مجبور ہیں کہ ہم اس قصہ (قصہ ہجرت) کو ایک قسم کا 'حیلہ' سمجھیں جو ایک طرف یہودیوں اور عربوں میں اور دوسری طرف قرآن اور توراۃ کے مابین اتحاد پیدا کرنے کی غرض سے وضع کیا گیا ہے۔"

اپنے اس قول میں وہ صریح کرتا ہے کہ قرآن مجید نے یہ "حیلہ" اس لئے وضع کیا ہے کہ وہ جھوٹ موٹ سیاسی یا مذہبی اسباب کی بنا پر اہل عرب کو ایک بزرگ خاندان اور سلسلۂ نسب سے منسوب کرکے یہود کے ساتھ اتحاد پیدا کرائے۔

یہ انتہائی فحش و فجور اور طعن علی القرآن ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی "ابوت عرب" پر جس کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ	اور تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں کی گئی جو تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب ہے۔

صفحہ ۲۷ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"ساتویں صدی عیسوی میں اہل عرب کی طبیعتیں اس قسم کی اساطیر (واقعہ ہجرت) کو قبول کرنے کے لئے مستعد تھیں"

آگے چل کر ۲۸ میں تو یہاں تک لکھتا ہے:۔

"پس کوئی وجہ ایسی نہیں تھی جو قریش کو اس بات کے قبول کرنے سے باز رکھتی کہ کعبہ حضرت اسمٰعیل و ابراہیم کا بنایا ہوا نہیں ہے جیسا کہ رومیوں نے اس سے قبل اور اسی طرح کے مشترک اسباب کی بنا پر ایک اور اسطورہ سے (*[illegible]*) (جس کو اہل یونان نے وضع کیا تھا) کہ روما اینیاس بن بریام صاحب طرواده سے منسوب ہے تسلیم کرلیا تھا۔ یہی حالت اس قصہ کی ہے۔ بس یہ قبل از اسلام کا بنایا ہوا اور حدیث العہد ہے۔ اسلام نے دینی اغراض کے اس میں غلو کیا اور اہل مکہ نے سیاسی اغراض کے لئے اس کو تسلیم کرلیا۔ اس لئے تاریخ ادبی و لغوی کا فرض ہے کہ وہ عربی زبان کی اصل کا سراغ لگاتے وقت اس قصہ کی طرف توجہ نہ کرے۔

مندرجہ ذیل آیات قرآنی کی صریحی تکذیب ہے کہ:۔

(۱) وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ الخ (سورۂ بقر)	اور جب ابراہیم اور اسماعیل اس خانۂ (خدا) کی بنیادوں کو اونچا کریں گے۔
(۲) وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَلَّا تُشْرِكْ	اور جب ہم نے ابراہیم کے لئے خانہ (کعبہ) کی جگہ مقرر کردی تاکہ تو

بی شیئاً وطهر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود واذن فی الناس بالحج یأتوک رجالاً وعلی کل ضامر یأتین من کل فج عمیق

میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک و صاف رکھے اور حج کے لئے لوگوں میں ندا کر وہ پیادہ پا اور لاغر اونٹ پر راہ دور و دراز سے سوار ہو کر تیرے پاس آئیں۔

(۳) واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی وعهدنا الی ابراهیم واسماعیل ان طهرا بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود

(۳) پکڑو جہاں ابراہیم کھڑا ہوا نماز کی جگہ اور عہد لیا ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے کہ پاک رکھیں میرے گھر کو واسطے طواف کرنے والوں کے اور اعتکاف کرنے والوں کے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے۔

اس کے علاوہ اور وہ آیات جو اس موضوع پر قرآن مجید میں موجود ہیں۔

مصنف تکذیب ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ اس میں مذہبی اور سیاسی اغراض کے لئے حیلہ اور تدلیس سے کام لیا گیا ہے اور ان ہی اغراض کی ماتحت یہ جھوٹے قصے وضع کئے گئے ہیں۔ گویا مؤلف اس بات کا قائل ہے کہ قرآن مجید اپنے تاریخی قصص میں معتبر اور قابل اعتبار نہیں۔

یہ کفر فاحش طلبار کی ذہنیت پر کیسا کچھ اثر نہ ڈالے گا اور ان کے مذہبی عقاید کو ملیا میٹ نہ کر دے گا۔ پھر اس تکذیب کے بعد صحت اور اعتبار کے لحاظ سے ان کے دلوں میں قرآن مجید کی کون سی وقعت باقی رہے گی

صفحہ ۳۲ میں لکھتا ہے :۔

"قرآن مجید کے متعلق ایک روایت چلی آتی ہے (اور اگر ہمارے یا کسی اور شخص کے پاس اس کا استقصا کرنے اور اُسر پر تفصیل سے بحث کرنے کے لئے کافی وقت ہوتا تو اُس کو بیان کر سکتے) وہ یہ ہے کہ وہ ایک ہی زبان اور ایک ہی لہجہ میں تلاوت کیا جاتا ہے اور کہ وہ قریش کی زبان میں اور ان ہی کے لہجہ میں ہے حالانکہ عرب کے مختلف قبایل کے پڑھنے والوں کی وجہ سے اس کی قرأتیں مختلف اور اس کے لہجہ متعدد ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے اس میں بہت بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے۔"

آگے چل کر لکھتا ہے :۔

ہماری مراد یہاں اختلاف قرأت سے ہے جس کو عقل قبول کرتی ہے، نقل اس کی اجازت دیتی اور ضرورت اس کی مقتضی ہے۔ وہ قبایل عرب کے مابین لہجوں کا اختلاف ہے جو اس بات پر قادر نہ تھے کہ اپنے گلوں۔ زبانوں اور ہونٹوں کو بدل دیتے۔ تاکہ وہ بھی ایسا ہی قرآن مجید پڑھ سکتے جیسا کہ پیغمبر اسلام اور اُن کے اہل قبیلہ کیا کرتے تھے۔ پس ان کی قرأت ان کے طرز تکلم کے مطابق ہوا کرتی تھی۔"

یہاں مؤلف اس بات کا انکار کرتا ہے کہ قرأتیں آنحضرت صلعم سے منقول نہیں ہیں بلکہ وہ قبایل کے اختلاف لہجات کی وجہ سے ہے، یعنی اس کے نزدیک قرأت سبعہ آنحضرت سے منقول نہیں ہے۔ حالانکہ یہ امر مسلم ہے کہ قرأت سبعہ متواتر اور بذریعہ وحی آتاری گئی ہیں اور کہ اُن کا منکر کافر ہے۔

مقدمات مندرجہ کے علاوہ کئی صفحات اس کی کتاب کے ایسے ملال انگیز اشارات سے بھرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۱۹ میں لکھتا ہے:۔

"ظہور اسلام کے وقت اور بعد میں اہل عرب میں یہ خیال رائج ہو گیا کہ اسلام دین ابراہیمی کی تجدید کرنے کو آیا۔"

اس سے پہلے کے ایک صفحہ میں لکھتا ہے:۔

"لیکن مسلمانوں نے یہ چاہا کہ وہ مذہب اسلام کی اولیت کو بلاد عرب میں ثابت کر دیں کہ وہ آنحضرت سے قبل بھی موجود تھا اور کہ مذہب اسلام خلاصہ اور نتیجہ ہے ان مذاہب حقہ کا جن کو خدائے تعالیٰ نے اگلے پیغمبروں پر اس سے قبل نازل کیا تھا۔"

یہ آیات ذیل کی صریحی تکذیب ہے:۔

ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین (نحل)	پھر ہم نے تیری طرف وحی نازل کی کہ ابراہیم موحد کے مذہب کی پیروی کر اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔
ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین اٰمنوا	ابراہیم سے زیادہ مناسبت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو ایمان لائے۔

یہ بعینہ وہی باتیں ہیں جو نزول قرآن کے وقت مشرکین طعناً کہا کرتے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے۔

وقال الذین کفروا ان ھذا الا افک افتراہ واعانہ علیہ قوم اٰخرون فقد جاءو ظلما وزورا وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ واصیلا (فرقان)	اور کافروں نے کہا یہ کچھ نہیں مگر جھوٹ جو باندھ لایا ہے اور اس پر اس کو مدد دی دوسری قوم نے پس تحقیق وہ آئے ناانصافی اور جھوٹ پر اور کہنے لگے یہ کہانیاں ہیں جو لکھی ہیں سو وہی لکھوائی جاتی ہیں اس کے پاس صبح اور شام۔

لہذا یہ کمیٹی آنجناب کی خدمت اقدس میں مؤلف کے صریح کفریات سے صرف وہی باتیں پیش کرتی ہے جو بہت کم قدر میں اس نے معلوم کی ہیں۔ علاوہ ازیں جو کچھ اس نے اپنی کتاب کے ضمن میں الحاد و زندقہ کا اظہار کیا ہے اُس کو نظرانداز کرتی ہے۔

ہم آنجناب اور حکومت مصر کی خدمت میں مطالبہ کرتے ہیں کہ اس ملحد اور باغی مذہب شخص پر حد شرعی جاری کی جاوے۔ خصوصاً اس جرم کے لئے کہ اس نے تعلیم کی آڑ میں یہ باتیں مذہب کی عمارت کو منہدم کرنے کے لئے ضمناً داخل کی ہیں۔ جن کی وجہ سے آئے دن ہم ایک حادثہ سے فارغ نہیں ہوتے کہ دوسرا حادثہ رونما ہوتا ہے جو عام مسلمانوں کو اپنے مذہب پر مطمئن نہیں رہنے دیتا۔

بنابریں ہم آنجناب اور حکومت سے یہ استدعا کرتے ہیں کہ ابناء ملک کی حفاظت کی خاطر اس مرض کا سدباب کر دیا جائے جو بُری طرح پھیل رہا ہے کہ یہ لوگ آگے چل کر ملک و قوم کے مہمات امور میں ارباب حل و عقد ہونے والے ہیں۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ مسلمانوں کا روپیہ اور ان کے اوقاف ایسی تعلیم پر کیوں ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ اس عار کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور جس کی اشاعت پر یہ داعی الحاد تلا ہوا ہے حالانکہ اس کو اسی روپیہ سے بہت بڑی تنخواہ دی جاتی ہے۔

کیا وزارت معارف اسی طریقہ سے قوم اور آئندہ نسلوں کی خدمت کرنا چاہتی ہے؟ اور کیا اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے؟

اُمید ہے کہ آنجناب ہماری اس تحریر سے اتفاق فرمائیں گے۔

۲۶ شوال سنہ ۱۳۴۴ھ

دستخط کنندگان

محمود الدیناری ۔ عبدالمعطی الشرشمی ۔ محمد عبدالسلام القبانی ۔ عبدربہ مفتاح ۔ عبدالحکیم عطا

محمد ہلال الابیاری ۔ عبدالرحمٰن المحلاوی ۔ محمد علی سلامہ

؎ یہ اشارہ ہے قاضی علی عبدالرازق کی کتاب الحکم والاسلام کی طرف جس پر علماء ازہر کی جانب سے مواخذہ ہو چکا ہے۔

شہزادہ مراد بخش کی نظر بندی

(از جناب مولوی مظہر احمد ادھمی "ملا" "منشی" فاضل)

تمام مورخ اس بات میں ہمزبان ہیں کہ شہزادہ مراد بخش کی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ ذراسی بات پر مزاج میں برافروختگی پیدا ہو جاتی تھی اور سادہ لوح ایسا کہ جہاں مصاحبوں نے الٹی سیدھی خوشامدیں کیں کہ وہ اُن کے کہنے میں آگیا۔

مراد بخش کی نظر بندی کی کل ذمہ داری خود اُس کی ذات پر عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ جو جال اُس نے محی الدین احمد عالمگیر اورنگ زیب کے لئے نصر شاہ عباس کے مشورہ سے پھیلایا تھا وہ خود معہ اپنے غلط کار مشیر کے اُس کا شکار ہوا۔ عربی مقولہ ہے۔ "البادی اظلم" چنانچہ آج مہذب دُنیا بھی اسی پر عامل ہے۔ اور جنگ کی تمام ذمہ داریاں اسی قوم یا ملک پر عاید کی جاتی ہیں جس کی طرف سے ابتدا ہو۔ چنانچہ جنگ عظیم کا تمام الزام اسی بنا پر جرمنی پر عاید کئے گئے اور اُس کا خمیازہ بھی اسی کو بھگتنا پڑا۔

سموگڈھ کی فتح تک کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اورنگ زیب نے شہزادہ مراد کے ساتھ بدسلوکی کا ارادہ کر لیا تھا۔ بلکہ اس وقت تک سختی کے ساتھ اُس معاہدہ کا پابند تھا جو دونوں میں ہوا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ شاہی اعزاز سے پیش آتا تھا اور شاہ کے لقب سے تخاطب کرتا۔ بدنیتی کی ابتدا مراد کی جانب سے ہوئی۔ اُس زمانہ میں سلطنت کے واسطے اپنے بھائی، چچا اور قریب سے قریب رشتہ دار کو انتہائی سرد مہری کے ساتھ نیست و نابود کرنا اعلیٰ طبقہ میں ایسا ہی جائز خیال کیا جاتا تھا جس طرح آج کل مہذب اقوام میں کمزور اور مغلوب اقوام کو پامال کرنا اور ہر ممکن طریقہ سے مٹا دینا عین مصلحت اور پالیسی پر مبنی قرار دیا جاتا ہے۔

اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے مراد اس بدنیتی کا مرتکب ہوا اُس نے ایک روز اورنگ زیب کو دعوت کے حیلہ سے بلا کر گرفتار اور قتل کرنا چاہا اور جب اورنگ زیب دعوت میں شریک ہوا تو قرائن سے معاملہ کی اہمیت کو سمجھ گیا اور حکمت عملی سے اپنے آپ کو موت کے مُنہ سے چھڑا لیا اور بعد میں حفاظت خود اختیاری کے اصول پر شہزادہ مراد بخش کو گرفتار کر کے نہایت احترام کے ساتھ گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ ہم کرنل ڈاؤ[1] کی تاریخ سے اس واقعہ کو پیش کرتے ہیں چنانچہ وہ

[1] Dows Work upon Hindustan Vol: III P. 234 ملا

ہے کہ سموگڈھ کی فتح کے بعد مراد بخش کے مصاحبوں نے اس کو کچھ ایسے سبق پڑھائے کہ وہ دل ہی دل میں اورنگ زیب سے حسد کرنے لگا اور یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس کو قتل کر دے تاکہ کسی قسم کا اندیشہ باقی ہی نہ رہے۔ اور وہ بلا شرکت غیرے ہندوستان کا بادشاہ بن جائے اگرچہ اورنگ زیب اسی کو بادشاہ تسلیم کرتا تھا۔ اس خیال کو لئے ہوئے مراد نے ایک فوج مرتب کی اور بھائی کے ساتھ آگے بڑھنے میں روپیہ نہ ہونے کا عذر پیش کیا۔ چونکہ اورنگ زیب کو کسی قسم بدگمانی نہ تھی اس لئے نہایت فراخدلی کے ساتھ بیس لاکھ روپیہ بھیجدیا۔

مراد بخش ابھی متھرا کے کیمپ پر پہنچا ہی تھا کہ اورنگ زیب کو ایک شاہی ضیافت میں مدعو کیا۔ چونکہ اس کو بھائی کے ظاہ برتاؤ کی بناء پر پورا اطمینان اور بھروسہ تھا اس لئے وہ نہایت خندہ پیشانی اور خوش دلی کے ساتھ اس ضیافت میں شریک ہو یہ دونوں بھائی دسترخوان پر بیٹھے ہی تھے کہ نظر شاہ عباس آیا۔ یہ شہزادہ مراد کے باورچیخانہ کا افسر اور رازدار تھا۔ اس نے مرا کو اشارہ سے بلاکر کہا۔" اورنگ زیب کے شاندار لباس کے خاتمہ کا زرین موقعہ یہی ہے۔

اورنگ زیب جس کو صورت دیکھکر دلی جذبات کے پتہ لگانے میں خاص کمال تھا فوراً تاڑ گیا جس پر مراد کی حرکات و سکنا نے شہادت کی مہر لگادی۔ مگر وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اس خونی منظر کو دیکھتا رہا۔ مگر اپنے چہرہ یا حرکات سے کسی قسم کے خوف وخیال کا اندیشہ تک ظاہر نہ ہونے دیا تاآنکہ مراد نے نظر شاہ عباس کو یہ کہکر رخصت کر دیا کہ " اشارہ کے منتظر ہو اب تو اورنگ زیب کو پورا الیقین ہو گیا کہ آج میرا قصہ تمام ہے مگر اس دور اندیش نے زبان سے ایک حرف بھی نہ اور چند لمحوں کے بعد مچھلی کی طرح فرش پر تڑپنے لگا کہ درد گردہ کی وجہ سے بے چین ہے اس کی بے چینی اور کراہنے کی آوا سن کر اس کے باڈی گارڈ کے سردار آموجود ہوتے اور مریض کو فوراً اپنے کیمپ میں لے آئے۔ تین روز تک اورنگ زیب نے کسی پر معاملہ کا انکشاف نہ ہونے دیا اور برابر علاج ہوتا رہا۔

مراد کی سادہ لوحی نے بھائی کو سچ مچ کا بیمار خیال کر لیا۔ اور اپنے کرتوتوں پر ذرا بھی نظر نہ ڈالی اور ایک منٹ کے لۓ بھی یہ خیال نہ کیا کہ میرے ارادے کو اورنگ زیب بھانپ گیا اور اس حکمت عملی سے اپنی جان بچا کر چلا گیا۔ تین روز کے متو علاج کے بعد اورنگ زیب کو مصنوعی درد گردہ سے صحت ہوئی۔ اب اپنے غسل صحت کا ایک جشن منایا اور اس میں مراد کو مدعو کیا اور لکھا کہ ایک طائفہ اس کے یہاں آیا ہے جو اپنے آپ کو علم موسیقی کا ماہر ظاہر کرتا ہے اس کے حسن ظاہری اور باط کی تعریف کچھ اس خوبی کے ساتھ کی کہ مراد جو عیش وعشرت کا بندہ تھا فوراً آمادہ ہو گیا اور باوجود اپنے چند مشیروں کی ممانعہ کے بھائی کے کیمپ میں چلا گیا۔

مراد کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ جوں ہی وہ اندرونی خیموں میں داخل ہوا تو چند نوجوان عورتوں نے ایسا پر تپاک استقبا

کہ وہ حیران رہ گیا۔ پھر کچھ اس نازو انداز سے گایا بجایا کہ مراد جو خود بھی راگ راگنیوں سے باخبر تھا مست ہوگیا۔ اور فوراً شراب لانے کا حکم دیا۔ "شراب" کا لفظ نکلنا تھا کہ فوراً تعمیل کی گئی۔ دور پر دور چلنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ نشہ میں چور ہوگیا۔ نیند کا غلبہ پاکر پلنگ پر جا لیٹا اور ایک عورت کے زانو پر سر رکھ کر دین و دنیا سے بے خبر ہوگیا۔ دوسرے خیمہ میں اس کے سردار اور باڈی گارڈ لطف اٹھا رہے تھے۔ اور اپنے آقا کی طرح وہ بھی نشے میں ایسے چور اور مدہوش ہوئے کہ اپنے آقا کی نگرانی اور حفاظت جان تک کا خیال نہ رہا۔

اورنگ زیب پہلے تو اس منظر کو بغور دیکھتا رہا اس کے بعد ظفر جنگ اور تین دیگر سرداروں کو حکم دیا کہ وہ خیمہ میں جاکر مراد کو مقید کرلیں۔ جب یہ لوگ پلنگ کے پاس آئے تو دیکھا کہ اورنگ زیب نے مراد کی تلوار پیش قبض کو پہلے ہی سے علیحدہ کر دیا ہے۔ جیسے ہی مراد کو گرفتار کرنا چاہا وہ بیدار ہوگیا۔ چاروں طرف دیکھا اور اس قدر زور سے چلایا کہ گرفتار کرنے والے سردار خوف زدہ ہوکر لرزنے لگے۔ اس کیفیت کو دیکھکر اورنگ زیب جو پس پردہ کھڑا تھا سامنے آیا اور تہدید کے لہجہ میں کہا "آپ نے میری جان لینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا اگر میں بھی آپ کی طرح بے خبر ہوتا تو آج مجھے قید خانہ میں پہنچے تیسرا دن ہوتا۔ لہذا آپ کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ یا تو خود کو حوالہ کر دیجیے یا موت کو ترجیح دیجیے" اس کے بعد اپنے سرداروں کو حکم دیا اگر یہ ذرا بھی سرتابی کریں تو ان کو باندھ لو۔ مراد نے بھائی کی یہ ملامت سن کر اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے خود کو ظفر جنگ کے حوالہ کر دیا۔

نظر شاہ عباس جو مراد کا خاص مشیر تھا دوسرے خیمہ میں میر بخش کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے خیمہ کی رسیاں کاٹ دی گئیں اور خیمہ نظر شاہ عباس پر آگرا وہ دب کر زخمی ہوا اور گرفتار ہوگیا۔ مراد کا باڈی گارڈ اور دوسرے سردار فوراً اورنگ زیب کے روبرو پیش کئے گئے۔ جنہوں نے وفاداری اور اطاعت شعاری کی قسم کھائی۔

آدھی رات بھی نہ گذری تھی کہ یہ سب قصہ ختم ہوگیا اور صبح صادق سے پہلے پہلے مراد معہ اپنے ساتھیوں کے ہاتھی پر سوار آگرہ بھیج دیا گیا جہاں سے وہ بر وقت گوالیار منتقل کر دیا گیا۔ جہاں مراد کے لئے ہر قسم کا عیش و آرام مہیا کیا گیا تھا۔ لیکن صرف آئندہ خانہ جنگی کے خیال سے اس کی آزادی سلب کرلی گئی تھی۔

علی نقی خاں کے لڑکوں نے جب مراد پر قتل کا دعویٰ دائر کیا تو اورنگ زیب کو سخت صدمہ ہوا اور خون بہا دیکر معاملہ کو ختم کرنے کی اور بہت سی تدابیر کیں لیکن مستغیث قتل ہی پر مصر تھا۔ اس لئے مقدمہ محکمۂ قضا کے سپرد کر دیا۔

مراد کے قتل کی نسبت اکثر مورخوں نے سخت غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اُن سے بڑھا ہوا تعجب اُن حضرات کا ہے جو اس قتل کو نہایت شدومد کے ساتھ بیان کرتے اور بلا دلیل اورنگ زیب پر الزام لگایا کرتے ہیں۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر

بر قتل مراد کے اصل واقعات خافی خاں کی تاریخ اور عالمگیر نامہ سے ناظرین کے سامنے پیش کردیں۔

خافی خاں کا باپ شہزادہ مراد کا خاص معتمد اور ملازم تھا۔ اور جو کوششیں مراد کو قلعہ گوالیار سے بھگا لے جانے کی گئیں [۵۱] ان میں وہ خود بھی شریک تھا اور دل سے مراد کا طرفدار اور بہی خواہ تھا۔ خود اس کا بیان ہے کہ "مراد بخش نے علی نقی خاں کو بے گناہ مار ڈالا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے جنہوں نے قتل کا دعویٰ مراد پر دائر کیا۔ بڑا بیٹا اورنگ زیب کے سمجھانے بجھانے پر دعوے سے دست بردار ہوگیا۔ مگر چھوٹا بیٹا کسی طرح بھی راضی نہ ہوا"

قتل کا ثبوت [۵۲] مکمل تھا۔ ملزم کو اقرار بھی تھا۔ قاضی نے اندرونی طور سے جب وہ گوالیار کے قلعہ میں مراد کے شاہانہ اعزاز کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان قلمبند کر رہا تھا چاہا کہ وہ اقرار نہ کرے۔ مگر ملزم نے صاف اقرار کیا تو پھر قاضی نے سزائے قصاص تجویز کی۔ مگر اورنگ زیب محض اس دعوے کی بنا پر مدعی سے عمر بھر ناراض رہا چنانچہ خافی خاں جیسے مخالف کے قلم سے جو الفاظ اس معاملہ میں نکلے وہ ملاحظہ ہوں۔

"چوں پسر کلاں از دعوی خون پدرابا نمود۔ بادشاہ قدردان (یعنی) اورنگ زیب از فرمول خدمات حضور و دیگر عنایات تفقد حال او شد۔"	جب کہ بڑے بیٹے نے باپ کے دعوی خون سے دست برداری پیش کردی تو بادشاہ قدردان یعنی اورنگ زیب نے دربار کی خدمات اس کو بخشیں اور قسم قسم کی عنایات اس کے حال پر کرتا رہا۔

قدیم تعلقات کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ خافی خاں مراد کا ہمدرد اور بہی خواہ تھا اور اورنگ زیب سے سخت متنفر۔ اس وجہ سے [۵۳] مؤرخ نے حتی الامکان حقیقت پر پردہ ڈالنے کی سخت کوشش کی مگر سچ ہر حال میں ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ اس کے مندرجہ بالا الفاظ خود بتاتے ہیں کہ اس کا یہ بیان کہ "قیاس ہوتا ہے کہ مراد کے قتل کا دعویٰ اورنگ زیب کی ایما سے دائر ہوا ہو" قطعی غلط ناقابل تسلیم اور اس مصنف کی سادہ لوحی اور من گھڑت کا بیّن ثبوت ہے۔ اسی طرح بعض دوستوں کی تاریخ دانی جو زبان فارسی اور تاریخ سے بے خبر ہونے کے باوجود اورنگ زیب پر الزام عاید کیا کرتے ہیں اور بھی مضحکہ خیز ہے۔

---

[۵۱] عثمانیہ یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ تاریخ جلد سوم ۲۷۶ [۵۲] عالمگیر نامہ صفحہ ۱۰۶ [۵۳] منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۱۵۶۔

"رسم الخط"

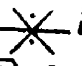
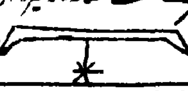
(تمکین کاظمی)

" یہ مضمون صرف میری ہی دماغی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے لئے مسٹر عباس شروانی "
" کے مضمون (الف، ب ت) مطبوعہ مخزن جلد (۱۱) نمبر (۲) بابت سنہ ۱۹۰۶ء اور مولوی سید یوسف الدین صاحب "
" مرحوم صوبیدار گلبرگہ کی تصنیف (الخط الاسلامی) سے بھی مدد لی گئی ہے "

" ت ل "

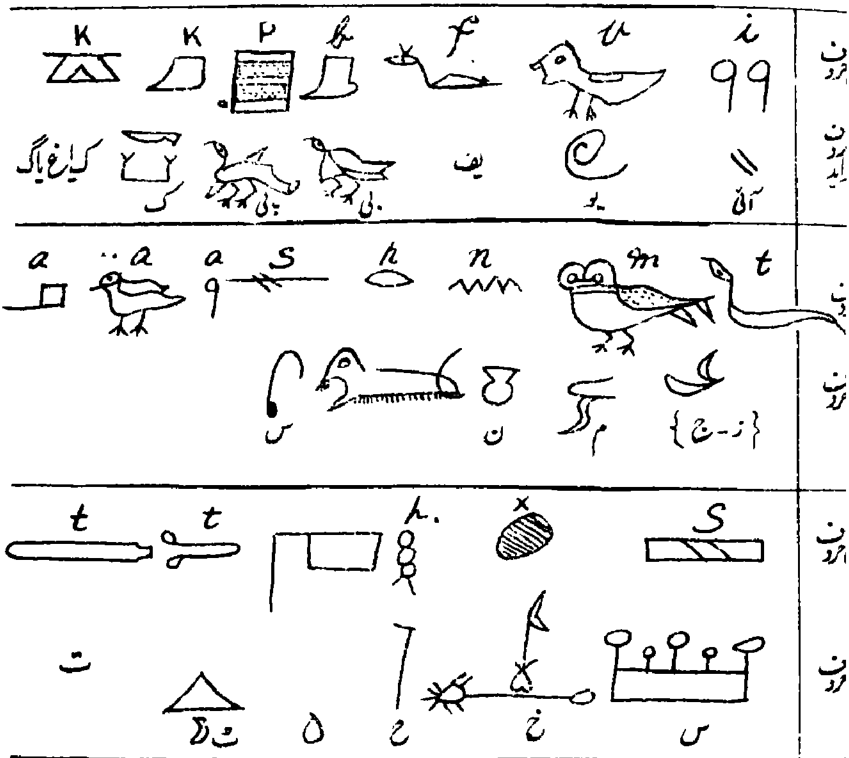
الف، ب، ت کی ایجاد کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ زبانوں کے حروف کی ایجاد کا سہرا " چین " والوں کے سر ہے اور اکثر لوگوں کو اس کا یقین ہے کہ حرف کے موجد اہل " فینشیا " ہیں، مگر در اصل ایسا نہیں ہے اس کے موجد اہل " مصر" ہیں اور کاٹ چھانٹ کر کے اسے راستے پر لانے والے اہل " فینشیا "

سب سے پہلے حروف کی ضرورت کو مصریوں نے محسوس کیا چونکہ وہ جانوروں کی پرستش کرتے تھے، اس لئے اظہار خیال کا ذریعہ حیوانات ہی کی تصاویر قرار دی گئیں، بعض جگہ جہاں پر کہ جانوروں سے کام نہ چلا، وہاں ایسی چیزوں کی تصاویر اختیار کی گئیں جو عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں، اس طرح انہوں نے ایک مکمل الف، ب، ت، بنائی اور اُن کا نام " مقدس حروف " رکھا، انہیں حروف کو یونانی زبان میں " ہیراگلفک " کہتے ہیں، چونکہ " ہیراگلفک " میں تصاویر ہی تصاویر تھیں اور ان کا جلد اور سہولیت کے ساتھ لکھا جانا ممکن نہ تھا، اس لئے ان کی دو قسمیں کر لی گئیں، ایک " ہراٹک " جو صرف مذہبی کاموں کے لئے مخصوص تھی، دوسری " ڈماٹک " جو عام کاموں کے لئے استعمال کی جاتی تھی، جیسا کہ آج کل " موڑی " اور " بالبودہ " (مراہٹی) مذہبی اور دنیوی کاموں کے لئے علیحدہ علیحدہ ہیں۔

" ہراٹک " اور " ڈماٹک " حروف معنی کے لحاظ سے دو طرح کے تھے، " آئیڈیوگرافک " (Ideographic i.e. (کاشف الخیالات) اور " فونک " (phonic) (کاشف الصوت) ان میں بھی ایک ایک کو دو دو حصوں پر منقسم کیا گیا، یعنی " آئیڈیوگرافک " میں ایک حصہ وہ کیا گیا جو اس قسم کی تصویروں پر مشتمل تھا جن سے بعینہٖ وہی اشیاء معلوم ہوں شلاً  سے ستارہ وغیرہ اور دوسرا حصہ اس قسم کے نشانات کا کیا گیا جن سے صرف اظہار مشابہت مقصود ہو جیسے  سے رات وغیرہ لیعنی آسمان اور اس کے نیچے ستارہ کیونکہ

آسمان پر رات ہی کو نظر آتا ہے۔

فونک" میں سے ایک تو وہ حصہ علیحدہ کر دیا گیا جس سے صرف آواز معلوم ہو مثلاً 'آ' 'او' 'ای' وغیرہ اور دوسرا
جس سے ایک مرکب آواز کے مختلف حصے معلوم ہو سکیں مثلاً 'ہائے' 'ہا' 'سن' وغیرہ اس طرح پندرہ حروف تیار ہو گئے
یہ آ پڑی کہ آوازیں اکیس تھیں، اس لئے انہیں پندرہ اشکال سے اکیس حروف بنائے گئے اور ان میں بعض آوازیں
تھیں جن کے لئے ایک سے زاید حروف بھی تھے ملاحظہ ہو نقشہ



دہ حروف ہیں جنہیں مصریوں نے پہلے پہل ایجاد کیا۔ جس قدر کہ تمدن و تہذیب میں زیادتی ہوتی گئی لکھنے پڑھنے کی
ت بڑھنے لگی، اور ان حروف کی نوشت و خواند میں تکلیف ہونے لگی، جدت پسند طبائع نے ان حروف کی صورت
کو ضائع کر کے ایک اور ہی وضع قطع پیدا کر لی۔" زرافین مصر" نے ان حروف میں اور دس حرفوں کا ازدیاد کر دیا۔

سب سے پہلے جنہوں نے مصری حروف کو سیکھا اور اُن میں تبدیلی کی وہ اہلِ "فنیشیا"[۵۵] تھے، چونکہ یہ قوم "مصر" سے تجارتی تعلقات رکھتی تھی اس لئے ایک دوسرے کے تمدن و تہذیب سے واقف تھے۔ اہلِ "فنیشیا" نے حیوان پرست مصریوں کے پاس ایک کام کی چیز دیکھ کر خود ہتیا لی اور اس کو کتر بیونت کر کے دُنیا کے آگے پیش کر دیا، مگر انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم اس کے موجد ہیں بلکہ بعض کوتاہ بیں مصنفوں نے ایجادِ حروف کا سہرا اہلِ "فنیشیا کے سر باندھ دیا، درا صل وہ موجد نہیں بلکہ مصری موجد ہیں، حروف پر اہلِ "فنیشیا" کا وہی احسان ہے جیسا کہ "اردو شاعری" پر دہلی والوں کا، اور حروف سے مصر کو وہی تعلق ہے جو "اردو شاعری" سے دکن" کو ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اہلِ "فنیشیا" مصری حروف کے علاوہ خود ایک نئی طرز کے حروف کے موجد ہیں۔ مگر یہ بھی غلط ہے۔ البتہ اہلِ "فنیشیا" نے مصریوں سے حروف لینے کے بعد شکلیں تو پہلے پہل وہی قائم رکھیں۔ مگر نام بدل دیئے۔ بعض فونیشین کتبے[۵۴] جو دستیاب ہوئے ہیں خود اس امر کے گواہ ہیں کہ ان کے حروف کی شکل بالکل "مصری ہیراگلف" سے ملتی ہے،

ان اشکال کے لکھنے اور پتھروں پر کھودنے میں بڑی دقت کا سامنا ہوتا تھا، اس لئے اس میں کچھ جدت تو فونیشین لوگوں نے دکھائی اور جو باتیں ان سے رہ گئی تھیں انہیں "عبرانیوں نے پورا کر دیا۔

خطِ "حمیر" جس کو اہلِ "مدینہ" نے بشیر بن عبدالملک سے سیکھا تھا خط کوفی کہلانے لگا[۵۳] جب کہ "کوفہ" کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا) اہلِ مدینہ میں سے "جذم بن عمرہ" نے "خط حمیر" یا خط "کوفی" کو نیا لباس پہنا دیا اور یہ "خط جذم" بن گیا، گویا مدینہ میں اب "حمیر" کا خط باقی نہ تھا بلکہ "خط جذم" رائج تھا سنہ ۲ ہجری نبوی تک خط جذم بالکل بیکار رہا کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی ہجرت نبوی کے بعد سے اس کی ضرورت پڑنے لگی اور "خط جذم" موجودہ (عربی) خط بن گیا، سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے بھی خط جذم کو دیکھ ایک خط ایجاد کیا مگر وہ شہرت نہ پا سکا،

---

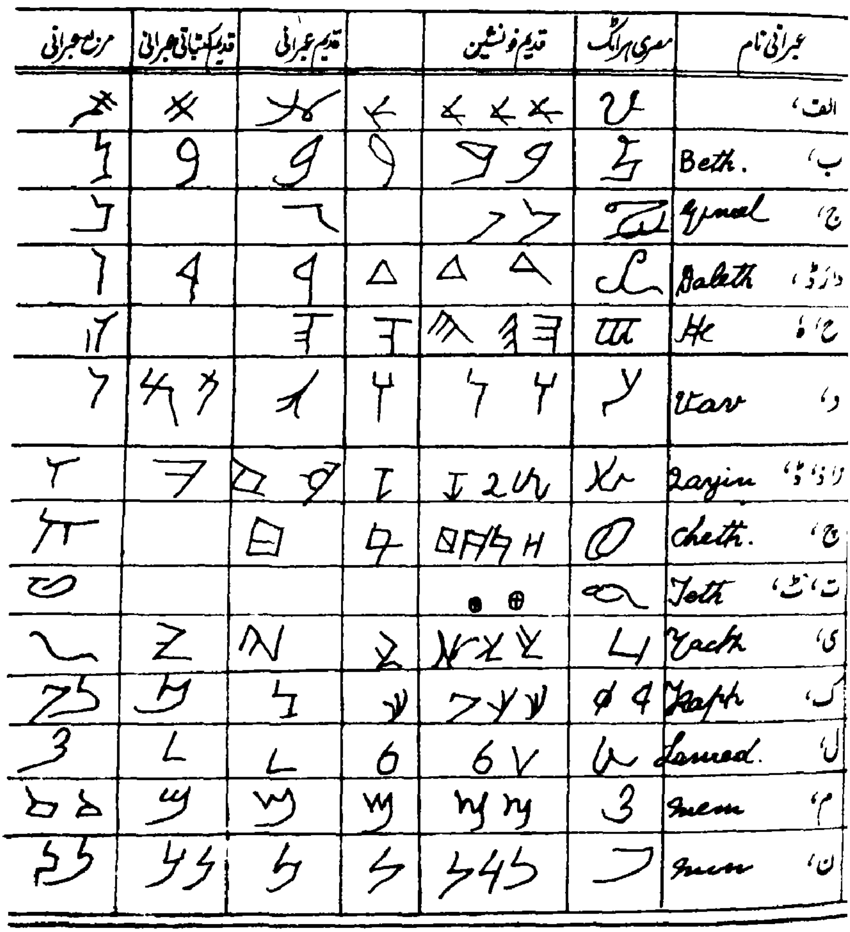
۵۳ مطابع تقریبہ صفحہ ۹

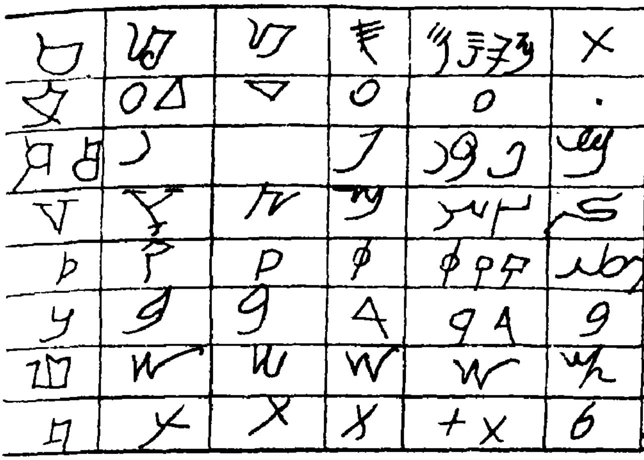
۵۴ سنہ ۱۹۰۳ء میں جو کُتبے (ہ) قوم کے برآمد ہوئے ہیں وہ بالکل ہیراگلف ہیں۔ مگر فونیشین حروف میں وہیئیت یہی اولاد سام سے ہے) ۱۲

۵۵ "فنیشین" سام کی اولاد سے ہیں۔ بعضوں نے انہیں کنعانیوں سے بھی منسوب کیا ہے، یہ ملک مصر کے محاذ میں بحرِ احمر کے کنارے ایشیائے کوچک کے بڑے حصہ میں آباد تھے ۱۲

...رت مسیح سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل "یونانیوں" (سیریا) یا اہل ارم نے فونشین حروف کو سامنے رکھ کر ...ور وضع کے حروف بنائے، ان حروف کو اہل "ارم" سے عبرانیوں نے لیا اور "مربع عبرانی" نام رکھا، اب ...ن فونشین سے بالکل ہی مختلف ہوگئے تھے کیونکہ قدیم فونشین میں پہلے تو خود اونہوں نے ہی تبدیلیاں کیں ...عبرانیوں نے جدت طرازی کی اور اہل ارم نے تو بالکل ہی نئی وضع بنا دی۔

...ب ہم ایک ایسا نقشہ پیش کریں گے جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ "قدیم عبرانی" "کتابتی عبرانی" "قدیم فونشین" ...عبرانی" یہ مصری ہرانک سے کس قدر ملتی ہیں اور ہمارا خیال کس حد تک صحیح ہے۔





۱۵	س،	Samekh
۱۶	ع،	Ayin.
۱۷	پ اف،	Pe.
۱۸	ص،	Tsadhe
۱۹	ق،	Kaph
۲۰	ر،	Resh
۲۱	ش،	Shin
۲۲	ط،	Tav

اس نقشہ کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہو جائیگا کہ مصریوں نے پہل پہلے جو حروف بنائے وہ آگے چل کر خود انہیں کی جدت طرازی سے کس قدر بدل گئے اور پھر ان متغیر حروف میں فنیشا والوں نے کیا دست درازی کی۔ اور ان کے بعد عبرانیوں نے کیا کیا موشگافیاں کیں اور پھر "کتباتی حروف" کس طرح علیحدہ کئے گئے، "مربع عبرانی" کس قدر سہل اور صاف حروف بن گئے اگر ہم اس کو یہاں دہرائیں تو کچھ نازیبا نہ ہوگا کیونکہ مصریوں کے حروف ہی کئی ایک جنم بدل کر "مربع عبرانی" بن گئے۔

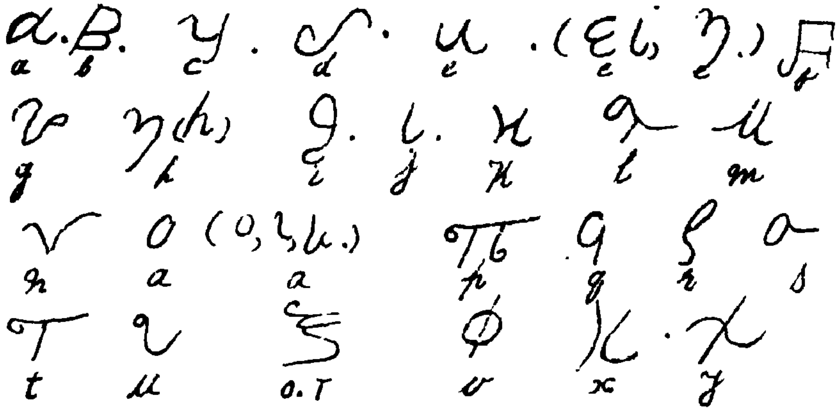
غالباً حروف کو مصریوں کی ایجاد ثابت کرنے کے لئے اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ ہوگی۔

"مربع عبرانی" نے آگے چل کر دو شاخیں اختیار کیں ایک تو وہ جو مشرق کو گئی اور دوسری مغرب کو، ان دونوں شاخوں نے مغربی اور مشرقی آب وہوا کے اثر سے ایسی صورت بدلی کہ ایک کو دوسرے سے سروکار ہی نہ رہا۔

چونکہ ہم کو مشرقی شاخ کی نسبت بہت کچھ لکھنا ہے اس لئے ہم پہلی شاخ (مغربی) کو علیحدہ کرکے اس کی سوانح ختم کر لیتے ہیں۔

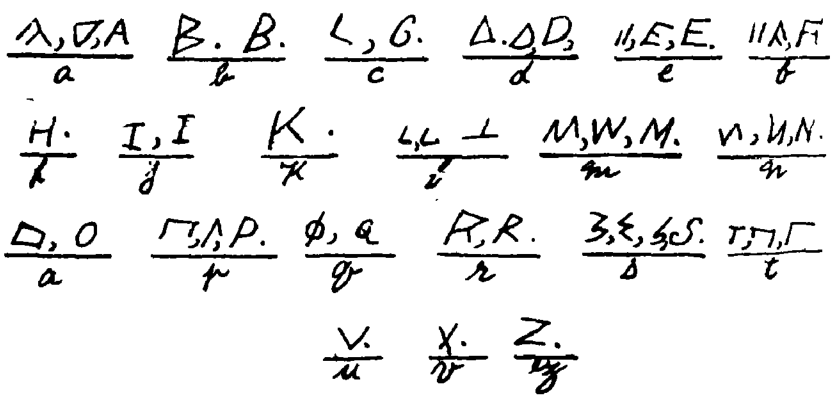
مغربی شاخ (فونشین یا مربع عبرانی) ایشیائے کوچک کے شمالی حصہ سے سیدھے یونان جا پہونچی، یہاں پر اس نے بالکل ہی نرالی وضع اختیار کرلی، جس کی یادگار اب تک یورپ میں حروف باقی ہیں۔

یونانی قدیم



قدیم یونانی حروف کو لے کر یورپ نے نئے قالب میں ڈھالا جواب تک موجود ہیں اور جن سے ہمیں دن رات کام پڑتا ہے۔ اسی ایک شاخ کو یورپ کے علاوہ لاطینی لوگوں نے بھی لیا اور معمولی کتر بیونت کے بعد بالکل گھڑ ڈال لیا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حروف انہیں راس بھی آ گئے۔

قدیم لاطینی حروف



اب گویا مغربی شاخ کی سوانح ختم ہوئی، ان حروف نے جن کا نقشہ دیا گیا ہے۔ آگے چل کر کس قدر ترقی کی اور کتنی تبدیلی ہوئی ہر ایک شخص جانتا ہے۔

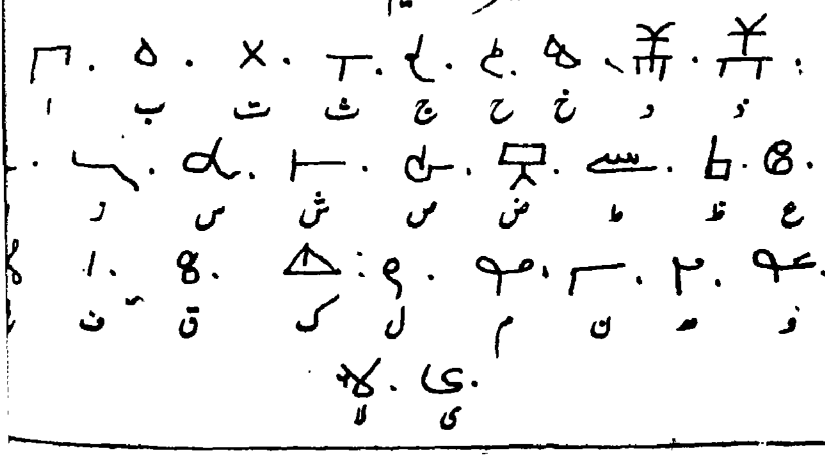
اب ہم مشرقی شاخ کی حالت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اس شاخ میں سے ہی دو شاخیں پیدا ہوگئیں ایک تو وہ ج
نوب جا پہنچی اور دوسری وہ جو ایران جا دھمکی۔

مورخین اسلام نے اس میں بہت اختلاف کیا ہے کہ سب سے پہلے عربی خط میں کس نے کتابت کی مگر بعض لوگوں ک
خیال[1] ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے خط لیا گیا اور بعضوں نے سیدنا اسمٰعیل[2] علیہ السلام کے خط سے خط عربی کا وضع ہو
ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض اولاد اسمٰعیل[3] سے نزار بن عدنان کے خط سے اس خط کا لیا جانا ثابت کرتے
ہیں۔ مگر ہماری دانست میں یہ صرف خوش فہمی یا مذہبی تخیل ہے کیونکہ ہم نے آج تک ایک حروف بھی سیدنا آدم یا سیدنا
اسمٰعیل یا نزار بن عدنان کے خط کا نہیں دیکھا اور نہ کسی نے اپنی تحقیق کے دوران میں اس دعوے کو ثابت کر دکھایا۔

ابن خلدون نے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ اہل "حمیر[4]" نے سب سے پہلے عربی میں خط و کتابت کی مگر وہ بھی
ساکت ہیں کہ حمیر نے کس سے سیکھا۔

خیال یہ ہوتا ہے کہ "مربع عبرانی" یا "فونشین" سے "حمیر" نے اپنا خط مرتب کیا کیونکہ اس کے پیشتر کسی خط کا
موجود ہونا ہی غیر ثابت ہے اور اس کے علاوہ خط "حمیر" کی ہیئت خود پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ ایک شاخ ہے
"عبرانی" یا "فونشین" کی مگر "حمیر" نے اس قدر احسان ضرور کیا کہ اس بدصورت خط کو کسی قدر صورت دار بنا لیا۔

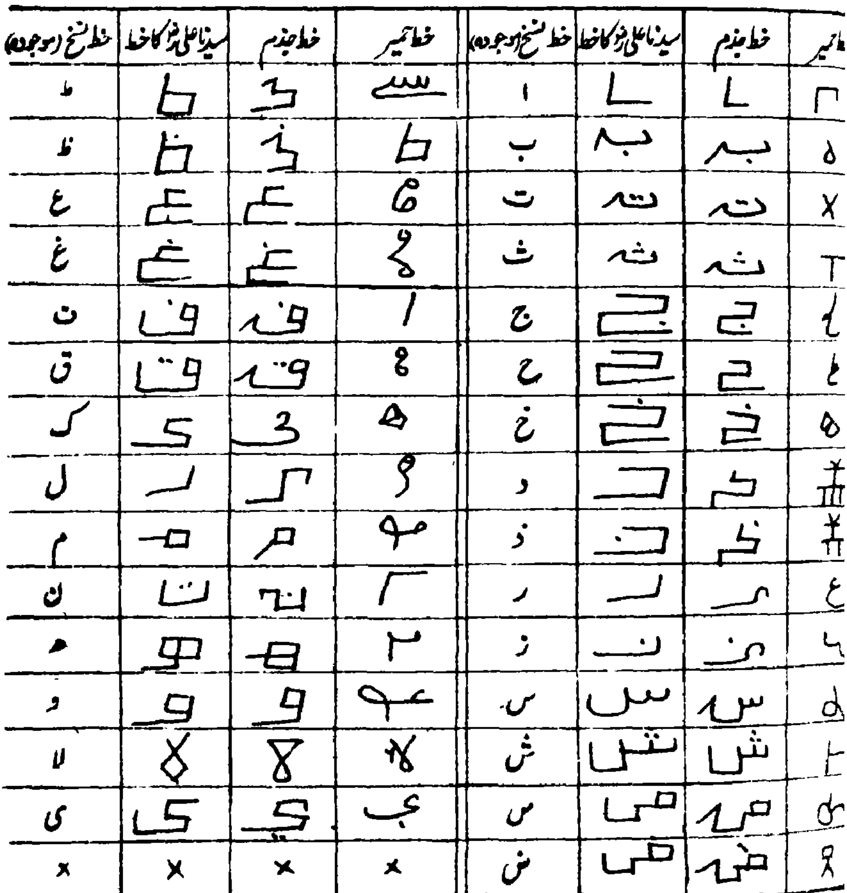
حمیر کا قدیم خط



[1] دیکھو سیوطی کتاب اوائل اور مزہری ج ۲ ص ۳۴۳ [2] دیکھو مطالع بدریہ ص ۵ وانوفاتی [3] دیکھو سیرۃ حلبی [4] مقدمہ

ں خط کو "خط حمیر" یا حمیر کا "طریقۂ کتابت" کہتے تھے۔ شاہان[۵۲] حمیر نے چونکہ بڑی ہی دیدہ ریزی اور دقت کے بعد اس
ں ایک طرح کی صلاحیت پیدا کی تھی اس لئے کوئی شخص بغیر ان کی اجازت کے خط حمیر نہ سیکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی اس خط
نا چاہتا تو اس کو چند خاص شرائط کی پابندی بھی کرنی پڑتی تھی۔

حمیر" سے "تبابعہ[۵۳]" نے ان حروف کو سیکھا اور "تبابعہ" سے "حیرہ" نے اور اہل "حیرہ" سے "اکیدر بن عبدالملک[۵۴]"
دومۃ الجندل) کے بھائی بشیر بن عبدالملک نے سیکھ کر اہل مکہ کو سکھایا۔
ل کے نقشہ سے معلوم ہو جائیگا کہ خط حمیر کو کس طرح بدلا گیا اور حضرت سیدنا علی رض کا خط کیسا تھا،



۵۰ نشان دیکھئے صفحہ ۱۴۲ پر ملاحظہ ہو ۱۲

زمانۂ خلافت میں مصاحف عثمانی اور احادیث "جزم" (کوفی) میں لکھے جاتے تھے زمانۂ نبوت کے بعد حکومت عرب کے فتوحات بڑھانے اور "بصرہ" اور "کوفہ" کو مرکز اسلام قرار دیا، اور ایک طرح کا تمدن بھی پیدا ہونے لگا، ادھر حکومت اسلام عرب "افریقہ" اور اندلس پر محیط تھی اور دوسری طرف بنی عباس نے بغداد کی بنا ڈالی اور وہ بغداد ہی حکومت عرب کا صدر مقام بن گیا۔ اور اہل بغداد نے خط کوفی[۵۱] کو بدل کر اور تیرہ (۱۳) خط وضع کئے جن کی تفصیل یہ ہے:۔

"(۱) خط طومار (۲) خط سجلات (۳) خط عہود (۴) خط مومرات (۵) خط امانات (۶) خط دیباج (۷) خط مدبج
(۸) خط مرصع (۹) خط ریاش (۱۰) خط غبار (۱۱) خط خرش (۱۲) خط بیاض (۱۳) خط حواشی"

یہ خطوط خط کوفی سے بالکل مغایرت رکھتے تھے ہر خط کے استعمال کا موقع خاص تھا اور ہر ایک کے لئے قلم بھی جداگانہ تھے مثلاً

(۱) خط طومار[۱] سے بقلم جلی کتبے لکھے جاتے تھے، جن کے آثار عمارات عرب پر ابھی باقی ہیں۔

(۲) خط عہود[۲]، خط مومرات[۳]، خط امانات[۴]، کا قلم متوسط تھا جس سے احکام اور قبالے اور دستاویزات وغیرہ لکھی جاتی تھیں

(۴) خط دیباج[۵]، خط مدبج[۶]، خط مرصع[۷]، خط ریاش[۸]، یہ محض خوشنویسی کے لئے تھے جن کی کشش ایک دانگ سے (۶) دانگ تک تھی۔

(۵) خط غبار[۹]، خط خرش[۱۰]، خط بیاض[۱۱]، خط حواشی[۱۲]، وہ خطوط تھے جن سے قرآن مجید اور دیگر کتب لکھے جاتے تھے، یہ خط تیسری صدی ہجری تک چلے۔ مگر جب ابن مقلہ[۵۲] نے نئے چھ خط ایجاد کئے تو یہ سب خطوط بھلا دئے گئے، جن کا ایک حرف بھی آج نظر نہیں آتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۹) ۵۴ "حمیر" ملوک یمن سے تھے ابرہہ بن صالح جو آغاز اسلام کے زمانہ میں یمن کا بادشاہ تھا وہ قبیلہ حمیر ہی سے تھا۔

(حاشیہ صفحہ ۴۳۱) ۵۱ مقدمہ ابن خلدون ص ۵۲ تبابعہ (جمع تبع) یہ قبیلہ بھی حمیر ملوک یمن ہی سے تعلق رکھتا تھا ۵۳ مطالعہ للہ ص ۱۲ ۵۳

حاشیہ صفحہ ہذا ۵۱ نامۂ دانشوراں ۵۲ محمد بن علی بن حسین بن مقلہ ۲۷۲ھ میں یکم شوال کو پیدا ہوا، علم فقہ، تفسیر، قراءت، ادب، وغیرہ میں مانا جاتا تھا، اور بڑا ہی خوشنویس تھا ۳۱۶ھ میں اپنی خداداد لیاقت سے ترقی کر کے خلیفہ المقتدر عباسی کا وزیر اعظم ہوگیا مگر تین بار قید ایک بار شہر بدر کیا گیا اور پھر وزارت پر واپس آیا آخر ۳۲۴ھ میں خلیفہ راضی باللہ نے سیدھا ہاتھ کٹوا کر قید کر دیا اور ۳۲۸ھ میں جیل میں قتل، ابن مقلہ کا ایک بھائی بھی تھا جس کا نام ابو عبداللہ تھا اور وہ بھی خوشنویس تھا ابو عبداللہ ... رمضان ۲۷۸ھ کو پیدا ہوا اور ربیع الثانی ۳۳۸

ابن مقلہ نے اصول خطاطی مقرر کئے اور ان کا مدار سطح اور دور پر رکھا اور (۱) خط محقق (۲) خط ریحان، (۳) خط ثلث ریحانی (۴) خط نسخ، (۵) خط توقیع (۶) خط رقاع وضع کیا۔ ابن مقلہ کے یہ خطوط تقریباً (۵۰) برس تک جاری رہے ابن بواب[1] نے ان کو بھی مٹا دیا اور اپنے نئے خطوط کو رواج دیا سنہ ۔۔۔ھ عماد الدولہ دیلمی (عضد الدولہ) کے عہد میں حسن بن حسین بن علی فارسی نے خط کاتب، خط نسخ، خط رقاع، خط ثلث کو سامنے رکھ کر "خط تعلیق" وضع کیا جس کا نام خط ترسیل بھی مشہور تھا، اسی زمانہ میں خواجہ میر علی رمز تبریزی نے خط نسخ اور تعلیق کو ملا کر ایک نیا خط ایجاد کیا جس کا نام "نسخ تعلیق" رکھا گیا جو رفتہ رفتہ "نستعلیق" کے نام سے مشہور ہو گیا، خواجہ میر علی رمز کے بیٹے میر عبداللہ اور میر عماد نے اس خط میں تصرفات کر کے ایک عمدہ معیار پر قائم کر دیا۔

خط نستعلیق سے بھی دو خط نکالے گئے۔ چونکہ نستعلیق دیر میں لکھا جاتا تھا اس لئے سنہ ۱۱۔۔ھ میں مرتضیٰ قلی شاملو حاکم ہرات نے خط شکستہ وضع کیا جو روزانہ معمولی خط و کتابت کے لئے تھا اسی زمانہ میں مرتضیٰ قلی خاں کے منشی "شفیعا" نے خط شکستہ میں کچھ گھٹا بڑھا کر ایک اور ہی ڈھانچہ تیار کر دیا جس کا نام "خط شفیعا" مشہور ہو گیا، اس خط میں بعض بعض باتیں خط تعلیق کی رکھی گئی تھیں جیسے رائے پیچیدہ (حـرحـ) ی، ن پیچیدہ (ـے، کنعـ)، خط نستعلیق کے ساتھ ہی ساتھ خط شکستہ اور شفیعا کا رواج بھی ہو گیا جو آج تک جاری ہے۔

ہندوستان اور عرب و عجم میں خط نسخ، نستعلیق، شکستہ، شفیعا، رائج ہے اور اسی خط میں کاروبار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان مروجہ خطوط کی ابتدا اور ارتقا ظاہر کر دی گئی ہے ان شاء اللہ آئندہ کسی موقعہ پر "سنسکرت" و فارسی قدیم (ژند، اوستا) وغیرہ کے متعلق بھی اپنی تحقیقات پیش کی جائے گی،

آخر میں مسٹر عباس شیروانی اور مولوی سید محمد یوسف الدین صاحب مرحوم کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے کیونکہ مسٹر شیروانی کے مضمون اور مولوی صاحب مرحوم کی تالیف سے مجھے بہت مدد ملی۔

---

[1] ابوالحسن بن علی بن ہلال (بواب) چوتھی صدی عیسوی میں بغداد میں پیدا ہوا ابن بواب خوش نویسی کے علاوہ علوم ادبیہ وفن رت وغیرہ میں بھی کمال رکھتا تھا مگر خوش نویس ہی مشہور رہا، چونکہ اس کا باپ علی بن ہلال بارگاہ خلافت میں بوابی کی خدمت پر مامور تھا یہ ابن بواب مشہور ہو گیا۔ ابن بواب ۲ جمادی الاول روز پنجشنبہ سنہ ۴۲۳ھ کو بغداد میں انتقال کیا اور امام حنبل کے پاس مدفون ہوا ۱۲۰ (ابن خلکان)

کاشتکاروں کی حکومت

(جناب سید محمد یوسف صاحب قیصر مدیر ظل السلطان بھوپال)

گذشتہ بیس سال سے ڈنمارک ایک ایسی دلچسپ جگہ ہوگیا ہے۔ جہاں تمدنی مسایل کو مطالعہ کرنے کی غرض سے۔ ترقی یافتہ ملکوں کے ہوشیار اور قابل لوگ آتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ملک ڈنمارک پولیٹیکل مصالح کا ایک دلچسپ مرکز ہے اور دُنیا کے اُن چند خطوں میں سے ہے جو اپنے ملکی ذرایع کو نہایت ہوشیاری اور ہوش مندی سے اقتصادی ترقی اور رعایا کی فلاح و بہبودی پر صرف کرتا ہے۔ خواہ ہم انگلستان کو جائیں یا فرانس اور جرمنی اور امریکہ کو۔ ہمکو ہر پولیٹیکل اسٹیٹ شاہنشاہی تمدن پر ملیگی۔ جہاں مختلف پارٹیاں اور خاص طبقے کے لوگ جو نہ تو عام رعایا کے قایم مقام ہیں اور نہ قایم مقام ہونا ظاہر کرتے ہیں اور نہ عام رعایا کے کسی کام آ سکتے ہیں برخلاف اس کے ڈنمارک کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک کی دولت کو لوگوں میں برابر تقسیم کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ ملک کی پیداوار کو بڑھا سکتا ہے۔

اور دوسری قسم کی مونوپولی کو بالکل جائز نہیں رکھتا۔ یہ افلاس کو دور کر سکتا ہے اور اپنی رعایا کو راحت و آرام سے رکھ سکتا ہے۔ ڈنمارک نے اس قدر علم کو ترقی دی ہے کہ بے علمی اُس ملک سے دور ہوگئی ہے اور ایسے طرز کی سوسائٹیاں بنائی ہیں جن سے ہر شخص کو مساوات کی آسانیاں حاصل ہوسکتی ہیں۔

ڈنمارک نے ایک ایسی چھوٹی سی قوم جس کی وقعت ہوسکتی ہے اُس کو بنا کر بتا دیا ہے کہ یہاں کے لوگوں نے بڑی خوشی کے ساتھ شاہنشاہی اقتدار اور مملکت کے حاصل کرنے یا زبردست بری اور بحری فوج رکھ کر کچھ اور حاصل کرنے کی تمنا سے اپنے آپ کو بری کر رکھا ہے۔ مختصر یہ کہ یہاں کے لوگ ان باتوں کے پیچھے نہیں پڑتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے مقبوضہ جزیرہ آئس لینڈ کو بھی آزاد کر رکھا ہے اور سمندر پار جا کر کسی حصول کی تمنا نہیں کرتے۔ اس کو دوسروں کے ملک اور زمین سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ صرف اپنے ملک کی ترقی اور اپنی تیس لاکھ رعایا کے فلاح و بہبودی میں مصروف رہتا ہے۔

ڈنمارک کو جو اس قدر شہرت حاصل ہوئی ہے وہ صرف کوآپریٹو آرگنائزیشن کا باعث ہے۔ کاشتکاروں میں کوآپریٹو کا طریقہ تو عام طور سے رائج ہو ہی گیا ہے۔ لیکن اب خاص شہروں میں ڈنمارک کے بھی یہی طریقہ مطبوعہ عام ہو رہا

نکہ اس تحریک نے ایسی تجارتی جمہوریت پیدا کر دی ہے کہ بلا اتفاق یا بلا مانگ خریداروں کے مال بنا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ کاشتکاروں نے اپنی ذاتی ڈائریاں۔ بیکن کی فیکٹری۔ انڈے جمع کرنے والی سوسائٹیاں۔ بنک اور دیگر اقسام کے کارخانے مثل نسل کشی سوسائٹیاں وغیرہ قائم کر رکھی ہیں۔ ہر کاشتکار عموماً تین سے لے کر دس انجمنوں تک کا ممبر ہے۔ اور اس کی فیملی میں اگر دوسرا شخص ہو تو اس کا تعلق کسی نہ کسی کوآپریٹو انجمن سے ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی کوآپریٹو کے کام لگی ہوئی ہوتی ہے اور وہ کیمیکل۔ میکانکل اور صنعت کے طریقے سیکھتا ہے۔ اور اس کو ایک علمی طریقہ اس طرح پر کام کرنے کا حاصل ہو جاتا ہے۔ کوآپریٹو ایک ایسی ایجنسی ہے جو کاشتکاروں کو بربادی اور لوگوں کی غارت گری سے بچاتی ہے۔ چنانچہ ہزاروں کوآپریٹو سوسائٹیاں ہیں جن پر وہاں کے لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ وہی لوگ سلطنت میں حکومت حاصل کئے ہوئے ہیں جو لوگ کوآپریٹو کے طریقوں میں تعلیم پا چکے ہیں۔ اس تحریک نے دورنگی کو بالکل دور کر دیا ہے۔ جو دیگر ممالک میں پائی جاتی ہے یعنی اس نے سیاست داں اور پولٹیکل سلطنتوں کو دبا دیا ہے اور کاشتکاروں کی ایک ایسی سلطنت ہوگئی ہے۔ جہاں پولٹیکل آئینہ سے کاشتکاروں کی ضروریات کو دیکھا جاتا ہے۔

دیگر ملکوں میں جس طرح روپیہ والے لوگ ایجنسیاں قائم کر کے کاروبار کرتے ہیں یہاں وہ کاروبار کاشتکار خود کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی فصل آپ پیدا کرتے ہیں۔ خود چیزیں بناتے ہیں۔ اور اپنی پیداوار کا بیوپار خود کرتے ہیں۔ وہ اپنے مویشی کے واسطے دور دور کے مارکٹ سے اجناس۔ اپنی ذاتی ضروریات کا سامان۔ نیز آلات کشاورزی منگواتے ہیں۔ وہ اپنے گھر۔ فصل اور مویشی کی حفاظت خود کرتے ہیں وہ اپنے بنک کا کام آپ کرتے ہیں۔ اپنا سرمایہ رکھتے ہیں۔ نسل کشی سوسائٹیاں اور ترقی مویشی کی سوسائٹی کا کام خود کرتے ہیں۔ اور وہ خود تھوک فروشی کے نرخ سے خرید کر آپس میں خردہ فروشی کے نرخ پر تقسیم کر لیتے ہیں۔

اس کوآپریشن نے نہ صرف اُن کے فضول مصارف کو کم کر دیا ہے بلکہ اُس ملک کے سوشیل حالت کو بھی بدل دیا ہے اس نے سرمایہ داروں کا زور گھٹا دیا ہے اور سود کا نرخ بھی کم کر دیا ہے۔ اس کا یہ سبب ہوا کہ تعلیم عام طور پر مقبول ہو گئی۔ اور چھوٹے چھوٹے زمینداروں کا قاعدہ رائج ہو گیا۔ انتظامی قوت کے ساتھ پولٹیکل قوت بھی بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے زمینداروں کو خصوصاً سرمایہ داروں کو جو اپنے سرمایہ کے ذریعہ سے غریب لوگوں کو لوٹتے تھے۔ گرا دیا ہے۔

زمینداروں نے بھی اپنی کاشت کو چھوٹا کر دیا۔ اس لئے بجائے گیہوں بونے کے اُنہوں نے نسل کشی مویشیان۔ مکھن سازی اور بیکن بنانے کا کام شروع کر دیا اور گائے کی نسل میں ایسی خوبی کے ساتھ ترقی دی کہ اُن کا دودھ اور مکھن زیادہ نکلنے لگا۔ اس نے ڈین کے مزارعین کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ غرضکہ چالیس سال کے عرصہ میں یہاں کے لوگ ایسے

فارغ البال ہوگئے جو شاید دُنیا کے پردے پر ہوں۔ لوگوں کی فلاح کا اندازہ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈن
ڈنمارک کا شمار بڑے دولتمند ملکوں کے ساتھ ہوگیا ہے۔ اگرچہ اُس کی زمین ایسی زرخیز نہیں ہے۔

زیادہ تر کاشتکار چھوٹی چھوٹی آراضی کے ہیں کل کاشتکار ڈہائی لاکھ ہیں۔ منجملہ اُن کے پونے دو لاکھ کاشت
ایسے ہیں جن کے پاس ۳۷ - ۲۷ - ایکڑ آراضی ہے۔ باقی کاشتکاروں میں کچھ ۳۲ - ۳۲ - ایکڑ کے ہیں اور جو ۷ - ۱۷
ایکڑ والے ہیں۔ اگرچہ وہ چھوٹے کاشتکار ہیں تاہم اس قدر رقبہ اُن کے پیٹ بھرنے اور آسایش کے ساتھ رہنے
واسطے کافی ہوتا ہے اور اُن کو کسی کی ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر ہو کی یہ رائے ہے کہ اگر اگریکلچر کو اقتصادی زندگی کا ذریعہ بنایا جائے تو بغیر زمینداری یا کاشتکاری کے
ہے۔ اس لئے زمینداری۔ باہمی اتفاق اور تعلیم گویا اقتصادی زندگی کی بنیاد ہے۔ جس طریقہ پر اُس ملک میں لا
زمینیں دی گئی ہیں وہ اُس ملک کی خاص تہذیب کا ایک نمونہ ہے۔ اور ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ باوجود اس
زمینداری کے کسی قسم کی پولٹیکل تحریک کا اثر نہیں ہوتا۔ حالانکہ انگلستان اور پرشیا میں بھی زمینداری ہے لیکن
پولٹیکل تحریک کا اثر ضرور لیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی حالت قدیم روس کی بھی تھی۔ یہی مسئلہ اجارہ زمین کا آئرلینڈ
محرک رہا اور لوگوں کے افلاس کا باعث ہوا۔ غرض جہاں کے لوگ اپنے گھروں کے مالک اور اپنی زمینوں کی کا
کرتے ہوئے پائے گئے وہاں جُداگانہ اسپرٹ اور جُداگانہ پولٹیکل طریقہ دیکھا گیا۔ یہاں تک کہ جن ملکوں میں ز
کو حق ملکیت حاصل ہے وہ ڈیماکریسی اور رسپانسبل گورنمنٹ کے خواہاں ہیں۔ اور اُن کی ایسی ہی اُمیدیں
اور آزادی کے خیالات ہیں جیسے ممالک ہالینڈ۔ فرانس۔ سوئزرلینڈ۔ اور اسکنڈیویا کے لوگوں کے ہیں۔

جدید نقشہ سے ظاہر ہے کہ ڈنمارک میں ۱۰ - ۱ بٹہ دار کاشتکار ہیں اور بقیہ ۸۹ ر ۹ زمیندار ہیں۔ جن
کے پاس ۱۲ - ایکڑ سے لے کر ۱۴۷ - ایکڑ تک آراضی ہے وہ مزدوروں کے ذریعہ سے اپنا کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ
تعلیمیافتہ ہیں اور سیاسیات نیز کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے کاموں میں جن میں وہ شریک ہیں۔ اپنا بہت سادہ
کرتے ہیں۔ یہی لوگ جنٹلمین کہلاتے ہیں اور اپنے ضلع کے سیاسی کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ تیس سا
پارلیمنٹ میں انہیں کا فروغ دیکھا جاتا ہے۔

زمانہ موجودہ کے طریقہ کاشت میں وہ پوری مہارت رکھتے ہیں۔ نرخوں سے باخبر رہتے ہیں۔ علم میکانک
دستگاہ رکھتے ہیں۔ اور بسا اوقات کیمسٹ کی خدمت بھی اچھی طرح انجام دیتے ہیں۔ اگریکلچر کو سائنٹیفک اصو
کرنے کا علم اُن کے دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان کو نہ زیادہ زمین حاصل کرنے کی آرزو ہے اور نہ دولتمند

نما ہے۔ اگر اُن کی کوئی آرزو ہے تو یہ ہے کہ وہ اچھے کاشتکار بنیں۔ یہی لوگ قوم کی پولٹیکل جماعت میں ہیں جن کے ہاتھوں میں حکومت ہے۔

حوصلہ مندی۔ بلند نظری اور مثلاً کام کرنے کی اولوالعزمی۔ پٹہ دار کاشتکاروں میں ہونا ناممکن ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ زراعت کو برباد کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسے کاشتکار کھیت کو اس وجہ سے ترقی نہیں دیتے کہ وہ ملکیت زمیندار کی ہوتی ہے اور مالک اس وجہ سے ترقی نہیں کرتا کہ اُس سے اُس کی ذات کو منافع کی اُمید نہیں ہوتی۔ مزید براں ایسے کاشتکار کی یہ خواہش ہمیشہ ہوتی ہے کہ ایک کھیت سے حتی الامکان منفعت حاصل کر کے دوسرے کھیت میں منتقل ہو جائے۔

ڈنمارک کا کاشتکار اس اصول کی تعلیم حاصل کرتا ہے کہ کس طرح گائے کی پرورش کی جاتی ہے کس طرح اس کو دانہ پانی دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ بہت زیادہ عمدہ قسم کا مکھن تیار کر سکے۔ اور اُس مکھن کو عمدہ سے ٹین کے ڈبوں میں بھرے تاکہ خریدار خوشی خوشی خرید لیں۔ وہ بازار کے حالات کو معلوم کرتا رہتا ہے اور زمین کی مٹی کی جانچ کراتا ہے اور نو ایجاد آلات کشاورزی اور آلات ڈائری فارم جن کو انجمن نے یا اُس موضع کے آدمیوں نے متفق ہو کر منگایا ہوا استعمال کرتا ہے۔

ڈنمارک کو صورت حال پر یہی لوگ لائے ہیں۔ کاشتکاروں نے سیاسی حکومت قائم کی نرخ بازار۔ خرید و فروخت اور کل ملک کے لین دین کا معاملہ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اونھوں نے اپنے طریقہ کو اس طرح ترقی دی ہے کہ پٹہ داری کو بالکل متروک کر دیا ہے۔ اور بر بنائے ترقی مالکانہ زمینداری قائم کر دی ہے۔ بادشاہ ایک "کانسٹی ٹیوشنل منارک" ہے جو اپنی رعایا کی مرضی کا خواہاں ہے یعنی وہ اپنی رعایا کو قانوناً حکم نہیں دیتا بلکہ مشورہ دیتا ہے۔

ڈنمارک دنیا کے اُن چند ملکوں میں سے ہے جہاں پولٹیکل حق پائے ہوئے لوگوں کو پولٹیکل حکومت سے بذریعہ Ballot کے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اور پولٹیکل ڈیماکریسی کو ایسی ترقی دی ہے کہ شاذ ہی کسی ملک میں ہو۔ پہلے ان لوگوں نے یہ کیا کہ بادشاہ کے اختیارات کو کم کر دیا۔ پھر بڑے بڑے زمینداروں کے ہاتھ سے حکومت چھین لی۔ چنانچہ ایک پشت تک ان لوگوں نے پارلیمنٹ کے Lower House کو اپنی حکومت میں رکھا۔ اُس کے بعد مزدوروں کو شریک کر کے مجلس پارلیمنٹ اور وزارت اور کل محکمہ جات دادرسی پر حکومت شروع کر دی۔ سچ تو یہ ہے کہ سیاسی جمہوریت جس کو کہتے ہیں وہ ڈنمارک ہی میں پائی جاتی ہے۔

کل زرخیز آراضی کا لگان یکساں ہے۔ ان دنوں پھر آراضی کی قیمت جانچ کر دوبارہ قائم کی گئی ہے تاکہ اُس کے بموجب تشخیص لگان کا ایک معیار قائم ہو جائے چنانچہ آراضی اور عمارت کی تخمینی قیمت پر بحساب فی ہزار ۱، لگان لگایا گیا ہے

ڈنمارک کا کاشتکار زمیندار بھی ہے۔ مہاجن بھی ہے۔ سوداگر بھی ہے اور کارکن بھی ہے۔ وہ کوآپریٹیو یونین اور ایجنسی کے ذریعہ سے کام کرنا زیادہ پسند کرتا ہے بمقابلہ "Semi-Socialistic" یا سلطنت کے تحت ایجنسیوں کے ذریعہ سے۔ جیساکہ جرمنی اور سوئزرلینڈ میں رائج ہے۔ یہاں کے لوگ مسئلہ انڈیوڈوالزم "Individualism" اور سوشیالزم "Socialism" میں اپنے کو بے مثال سمجھتے ہیں۔

اُن قوانین کی روسے جو ۱۸۹۹ء ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۹ء میں جاری ہوئے تھے۔ گورنمنٹ نے ایک رقم پچاس لاکھ کروز crowns کی نکالی جس کے ذریعہ سے جو جدید چھوٹے چھوٹے کاشتکار بنائے گئے۔ اُن کو چار فیصدی سالانہ کے سود پر رقم مذکور میں سے پیشگی دی گئی۔ اور اوسطاً ۸۔۸ ایکڑ آراضی کے وہ کاشتکار ہوتے۔ چنانچہ اُن سے زرقرض کی وصولی کی یہ صورت رکھی گئی کہ پہلے پانچ سال تک صرف اصل پر سود لیا جاوے۔ اُس کے بعد اُس رقم قرض کے دو ٹکڑے کر دئے جائیں یعنی ایک ٹکڑا ۲/۳ کا اور دوسرا ۱/۳ کا۔ یہ حصہ جو ۲/۳ کا ہو اُس کو پبلک سٹاک بنا دیا جائے اور اس کو بذمہ داری گورنمنٹ بازار میں فروخت کر دیا جائے اور یہ فروخت کی کارروائی ڈنمارک کا "مارگیج Mortgage" بنک کرے۔ لیکن ۱/۳ والا حصہ جو فروخت نہیں ہوگا۔ اس پر قرضخواہ پانچ فی صدی سالانہ سود دیتا رہے۔ جس میں سے ایک فیصدی بسلسلہ ادائیگی اصل رقم کے مفروضہ سمجھا جائے۔ پس جب کہ یہ ۲/۳ والا حصہ ۴۶½ سال میں ادا ہو جائے۔ تو اُس دوسرے حصہ کو جو ۱/۳ والا ہے۔ پبلک اسٹاک سے منتقل کر کے اسی صورت سے ادائیگی کرائی جائے۔ تاکہ ۹۸ سال میں کل قرضہ ادا ہو جائے

سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد ایک نیا قانون پاس ہوا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سلطنت سے آراضی حاصل کر کے ملکیت کا حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ صورت یہ رکھی گئی ہے کہ جس شخص کو کسی پارلیمنٹ کے ممبر کے واسطے ووٹ دینے کا حق حاصل ہے اور وہ متقی اور پرہیزگار اور محنتی ہونے کا سارٹیفکیٹ کونسل سے پیش کر سکتا ہے۔ اُس کو حق ملکیت مل سکتا ہے۔ اُس کو خریداری آراضی کے لئے روپیہ دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کو قیمت آراضی پر صرف سود دینا پڑتا ہے جو قانوناً ساڑھے چار فیصدی سالانہ رکھا گیا ہے۔

ایسے چھوٹے چھوٹے نئے زمیندار سلطنت سے کھیت لگان پر لے لیتے ہیں۔ لگان آراضی کی قیمت پر لگایا جاتا ہے جس کی وقتاً فوقتاً تشخیص ہوتی رہتی ہے۔ کاشتکار کو بغرض ترقی مدد دینے کے لئے سلطنت نے یہ قاعدہ رکھا ہے کہ اُس کی عمارت جس قیمت کی ہوتی ہے۔ اُس قیمت کا ۹/۱۰ حصہ بطور قرض دے دیتی ہے۔ اور اگر عمارت سنہ ۱۹۱۴ء کی بنی ہوئی ہے تو اس سے بھی زیادہ رقم دے دیتی ہے جس پر ابتدائی دس سال تک قرضخواہ کو زر سود نہیں دینا پڑتا۔ وہ اپنے کھیتوں کو اپنے بچوں کے نام منتقل کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ فروخت کرنا چاہے تو سب سے پہلے سلطنت کو خرید

ہیت پر لے لینے کا حق ہوتا ہے۔ اور مالک کو ترقی کرنے کا پورا معاوضہ دیدیا جاتا ہے۔
مزدوروں کے کام کرنے کے اوقات، لڑکوں کی عمر۔ یعنی جس عمر کے لڑکے کارخانوں میں کام کر سکتے ہیں۔ عالم ضعیفی لئے پنشن۔ اُن بیوگان کا وظیفہ جن کے بچے چودہ سال کی کم عمر کے ہیں۔ بیماروں اور بے روزگاروں کے واسطے بیمہ ہ کا قانون بنا دیا گیا ہے۔ جس کو "سوشیل لاء" کہتے ہیں۔
کرایہ ریل کو مقرر کرنے کا اصول پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعہ سے مقرر کردیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:۔
۱۔ شرح کرایہ ایسی ہو۔ جس سے ڈنمارک کی اقتصادی حالت میں ترقی ہو۔
۲۔ جس قدر مسافت زیادہ ہوتی جائے۔ شرح کرایہ میں کمی ہوتی جائے۔
بغرض تشخیص کرایہ ایک کمیشن مقرر ہوا۔ جس نے تحقیقات کیا کہ ریل کی آمدنی میں اضافہ ہونا چاہئے اور یہ سفارش کی کہ رح کرایہ نہایت احتیاط کے ساتھ بڑھائی جاوے۔ اور اوسط ہو تاکہ آمدورفت میں کمی نہ ہو جاوے۔ اس لئے بمقابلہ بالنہ کرایہ کے بہترین انتظام کا کیا جانا مناسب خیال کیا گیا۔ جس سے اصلی آمدنی میں اضافہ ہو جائے اور اس کی تکمیل ے واسطے دو تجویزیں سوچی گئیں۔ اول یہ کہ جو صیغہ محدود اور پیچیدہ ہو اور جس میں مصارف زیادہ ہوں۔ اس کی اصلاح جاوے۔ دوسری یہ کہ منافع کو تقسیم کرنے کا قاعدہ مقرر کردیا جاوے تاکہ کل ملازمان ریلوے منفعت حاصل کرنے کی غرض ے حتی الامکان ترقی آمدنی میں کوشش کریں اور قاعدہ یہ رکھا گیا کہ اگر کل مصارف پر دو فیصدی سے زیادہ منافع ہو۔ اس زیادہ رقم منافع کو ڈائرکٹروں اور دیگر ملازمان مستقل میں علاوہ تنخواہ کے حسب شرح ذیل تقسیم کردیا جاوے۔
اگر ۵۰ فیصدی منافع ہو تو دو سے ۲½ فیصدی تک اصل سرمایہ میں شامل ہوگا بقیہ تقسیم کردیا جائیگا۔

″ ۳۰	″	″	۲½	″	۳	″	″	″	″	″
″ ۱۰	″	″	۳	″	۴	″	″	″	″	″
″ ۵	″	″	۴	″	۶	″	″	″	″	″

لیکن منافع چونکہ ۶ فیصدی سے زیادہ نہوا۔ اس لئے اسٹاف کے حق میں جو رقم بغرض تقسیم بچی وہ بہت ہی خفیف ی۔ کیونکہ یہ مناسب نہیں خیال کیا گیا کہ آمدنی کو بہت زیادہ بڑھانے کے واسطے ملازمان کو ترغیب دی جاوے۔ اس سے سلطنت کے بہت سے کاموں کے نقصان کا اندیشہ تھا۔
ہر ملک کے مرتبہ بجٹ سے اُس طبقہ کے لوگوں کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اُس ملک کی حکومت دی ہے۔ جہاں جمہوریت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ وہاں آمدنی۔ وراثت اور دولت پر ٹیکس لگایا جاتا ہے لیکن جہاں

حکومت زراعتی عمائد یا تجار کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہاں ٹیکس اشیاء کے کھپت پر لگایا جاتا ہے۔ بہرحال بجٹ ایک آئینہ ہے جس سے اُس ملک کی حکومت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ نیز اُس طبقہ کے لوگوں کا حال ظاہر ہوتا ہے جو اُس ملک پر حکومت کرتا ہے۔

ڈنمارک ایک ایسا ملک ہے جہاں تجارت آزاد ہے اور اس کی انڈسٹری کسی حفاظت کی محتاج نہیں ہے اور نہ اس کی پیداوار کا کوئی حریف ہے۔ جو مقابلہ کرے وہی شے اُس ملک میں جاتی ہے جو وہاں پیدا نہیں ہوتی۔ اُس ملک میں معمولی کارآمد چیزیں جس طریقہ سے بلا محصول آتی ہیں۔ وہ اس سے ظاہر ہے۔ البتہ مسکرات پر محصول سخت ہے۔ شکر، تنباکو، سگریٹ، موٹر کار اور اشیاء تفریحی بھی خارج محصول نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے صیغوں پر مثلاً جائداد اور وراثت وغیرہ پر بھی ٹیکس لگا ہے۔ چنانچہ سلطنت کو بڑی آمدنی انکم ٹیکس سے ہوتی ہے۔ عمارات اور آراضیات پر بلحاظ اُن کی تخمینی قیمت کے فی ہزار ا را ٹکس لیا جاتا ہے۔

رعایا کو اپنی آمدنی پر ایک حد معین تک بشرح ۵ و ۴ ر ا فیصدی ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ یعنی جس کی پہلی آمدنی بارہ سو روپیہ کی ہوتی ہے وہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتا ہے اور جن لڑکوں کی عمر ۱۴ سال سے کم ہے اُن کے لئے الاؤنس مقرر ہے۔ لمیٹڈ کمپنیوں کے منافع پر اس طریقہ سے ٹکس لگایا گیا ہے کہ ۴ فیصدی کی شرح سے شرکار کا حق نکال کر رقم بقایا منافع پر تین فی صدی شرح سے ٹکس لیا جاتا ہے۔ تیننسٹ پر بھی ٹیکس بشرح ایک تا تین فیصدی بلحاظ مقدار جائداد لگا ہوا ہے اس شرط کے ساتھ کہ اگر وارث مورث کا فرزند خاص ہے اور اگر وارث مورث کا رشتہ دار دور کا ہے تو دس یا بارہ فیصدی ٹکس دینا پڑتا ہے۔ غرضکہ ان سب کے علاوہ ملک کو دیگر ذرائع آمدنی کے بھی حاصل ہیں۔ مثلاً ریل۔ ڈاک خانہ۔ فیس بندرگاہ اور قومی بنک وغیرہ۔

سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں جو کل آمدنی ۴۰.۵ ملین (یعنی چالیس کروڑ پچاس لاکھ) کرونس کی ہوئی تھی اُس میں سے دو کروڑ پچاس لاکھ کرونس کی آمدنی صرف ٹکس کی تھی۔ بجٹ کی سرسری تقسیم حسب ذیل ہے:۔

بابت امداد صنعت و تجارت	۱۰ فیصدی
بابت اخلاقی ترقی و فلاح	۳۰ فیصدی
بابت افواج بری و بحری	۳۰ فیصدی
بابت انتظامات ملک مثلاً سول، پولیس، پنشن وغیرہ	۲۰ فیصدی
بابت سود متعلق قومی قرضہ	۱۰ فیصدی

اخلاقی ترقی اور فلاح کے لئے جو ۳۰ فیصدی رکھا گیا ہے۔ اُس کی تقسیم حسب ذیل ہے:۔

بابت پنشن ضعیفی	۵ فیصدی
بابت ہسپتال اور پناہ گاہ معذورین	۶ و ۲/۱ فیصدی
بابت ہائی اسکول	۵ فیصدی
بابت تعلیم سائنس	۵ فیصدی

ومی قرضہ اس قدر ہے جس کا حساب فی باشندہ ۳۲ ڈالر پڑتا ہے اور رقم اُس قرضہ کی ریل اور چھوٹی آراضیات لگی ہوئی ہے۔

میونسپلٹی کو جو آمدنی ہوتی ہے وہ زیادہ تر اموے اور ہر طرح کے بیوپار پر ٹیکس سے ہوتی ہے۔ چنانچہ میونسپلٹی نے ٹیکس زدہ شہر اور ہر جائداد پر لگا رکھا ہے۔ البتہ وہ شخص جس کی آمدنی ایک ہزار کی ہے یا وہ شرح ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ اور اگر صاحب اولاد ہے تو علاوہ ایک ہزار کے ہر بچہ کے لئے ایک سو روپیہ بھی ٹیکس سے بری ہے۔ لیکن حدود سے وزکرنے پر لحاظ مقدار آمدنی ٹیکس لیا جاتا ہے جس کی شرح ایک فیصدی سے چھ فیصدی تک ہے۔

ڈاکٹر ہووتے اپنے دلچسپ مضمون میں باشندگان امریکہ کو خاص طور سے توجہ دلاتے ہیں کہ وہ ڈنمارک کے طریقہ باہمی اتحاد فاق سکول سٹڈائریاں اور مارکٹ ایجنسیوں وغیرہ وغیرہ کے حالات کو پڑھ کر سبق حاصل کریں۔ نیز کاشتکار اور زراعت نہ لوگوں کو زمیندارانہ حیثیت پر لے آنا ایک ایسی بڑی کامیابی ہے جو نہایت قابل غور و مطالعہ ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہو نے امریکہ کے کاشتکاروں کو اپنے مضمون میں یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ بھی اپنے ڈینش بھائی کی طرح سیاسیات میں سی اور عملی حصہ لیں۔ اس لئے کہ حسب بیان مضمون نگار۔ امریکہ کے کاشتکاروں کا بھی ویسا ہی تاریک حال ہے جیسا کہ ہند کے کاشتکاروں کا ہے۔ جو دلالوں اور درمیانی لوگوں کے ہاتھ سے لٹے ہوئے ہیں۔ اور اُن کی حالت قریباً غلامی کے درجہ کو پہنچ گئی ہے۔

پہلا ستم یہ ہے کہ امریکہ کا کاشتکار یہ نہیں جانتا کہ اُس کے تیار کردہ اجناس کی قیمت کیا ہوگی۔ اور وہ اجناس کہاں فروخت ہوں گے۔ وہ فصل پر تخم ریزی کرتا ہے۔ مزدور لگاتا ہے۔ قرض سے زیر بار ہوتا ہے۔ اور بالکل بے خبر رہتا ہے وہ نہیں جانتا کہ اُس کی پیداوار کی کیا قیمت آئے گی۔ اور اُس سے اُس کی مزدوری اور مصارف بھی اٹھیں گے یا نہیں۔ اول تو اُس کی شے کی قیمت اُس کے ملک کے کل پیداوار یا کل دنیا کی پیداوار پر ٹھہرا دی جاتی ہے۔ بعد ازاں بیچ والے لوگ۔ دلال اور خریدار اُس کی اشیاء کی قیمت ٹھہرا دیتے ہیں۔ اور مالک سے کوئی مشورہ نہیں لیا جاتا۔

خریداران آپس میں مقابلتاً قیمت نہیں ٹھہراتے۔ بلکہ جب کاشتکار اپنی شے بیچنا چاہتا ہے۔ اُسی وقت قیمت ٹھہرادی جاتی ہے۔ قیمت کو پبلک نہیں مقرر کرتی۔ بلکہ وہ دلالی ایجنسیاں ٹھہراتی ہیں۔ جن کے ہاتھ میں بازار ہے اور جو کم قیمت پر خریدتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ مزید براں کاشتکار اس اُمید پر کہ بازار کا نرخ چڑھنے پر اپنی پیداوار کو فروخت کرے گا۔ اپنے غلہ کو جمع نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ اُس کے پاس ذرائع آسانی کے نہیں ہیں۔ بنک ان کو قرض دینے کے واسطے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے کاشتکار کو فصل کے ختم ہونے پر اپنی پیداوار کو فروخت کردینا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ اُس قرضہ کو ادا کردے۔ جو اُس نے بغرض کاشت لیا ہے۔

یہ واقعات ہندوستانی کاشتکاروں کے حالات سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن ڈنمارک کے کاشتکار کی حالت بدرجہا بہتر ہے فقط

منازل حیات

(جناب سید مطلب حسین صاحب بی۔ اے عالی لکھنوی)

ہ زمانے کی کش مکش انسان کو اس بات کا بہت کم موقعہ دیتی ہے کہ وہ فطرت کی تمام دلچسپ چیزوں پر غور کرے۔ ہماری
ں غور و فکر کرنے کے لئے بہت تھوڑا وقفہ ہوتا ہے۔ ہر وقت ایک نہ ایک کام کے لئے اور ہر کام کسی نہ کسی وقت
خصوص ہے اور دست فطرت کی بنائی ہوئی دل فریبیوں سے لطف اندوز ہونا، ایک اتنا غیر ضروری فعل معلوم
ہ کہ اس کی طرف کبھی کوئی توجہ ہی نہیں کرتا۔ قدرت کی اور دل فریبیوں کو جانے دیجئے۔ خود انسان کی مختصر حیات
د فطرت نے قایم کئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، ایک خاص کیفیت رکھتا ہے۔ طفلی کی معصومانہ شرارتیں، شباب
اُمنگیں ضعیفی کی متانت و بردباری اور ان سب کی جُدا جُدا خصوصیات کی تشریح ایک ایسا موضوع ہے جس
ے بڑا فلسفی بھی اپنے نظریات کا مرکز قرار دے سکتا ہے۔

طفلی کا دلچسپ و خوشگوار زمانہ جس میں ہم کو اپنی ضروریات پوری کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ نہ ہم پر فرایض عاید ہوتے
ہیں اور نہ ہم کو فرایض کا احساس ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گذر جاتا ہے اور ہم کو اس کا خیال تک نہیں ہوتا
یہ ہے کہ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ جس میں احساس ہونا بھی نہ چاہئے۔

ں میں صرف ایک بات کی فکر رہتی ہے اور وہ یہ کہ ہم جیسے بھی ہو سکے مسرت و شادمانی حاصل کریں۔ رنج و غم۔ غور و
ے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ اور ہم مسرت و شادمانی کے خیالی دُنیا میں بسر کرتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے عالم بالا کا تھا
رنیائے فانی کی منازل طے کرتا ہے، اُس پر فرائض کی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ اس عالم سرور کو جس میں
لک رہا ہے بھولتا جاتا ہے اور اس کے لئے نئے نئے ابواب تفکرات کے کھلتے جاتے ہیں۔ اور چونکہ ان سے نیا
نہ پڑتا ہے۔ اس لئے انسان پر ایک حیرت کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ طفلی کی دلفریبیوں کو اس طرح بھول جاتا
ا ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔

ں کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہوتی ہے کہ بچپن میں انسان کا دماغ نئے نئے خیالات اور مادی اشیاء کا عکس
جلد قبول کر لیتا ہے اور چونکہ قوت ارادی بالکل ابتدائی درجہ میں ہوتی ہے۔ اس لئے نہ انسان اس کی
ں کرتا اور نہ کر سکتا ہے کہ وہ تمام خیالات و نقوش جو دماغ پر مرتسم ہو سکتے ہیں قایم رہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

دھندلے دھندلے نقش اور معمولی معمولی خیالات ذہن سے اتر جاتے ہیں اور اُن کی جگہ دماغ میں زیادہ وزنی خیالات اور گہرے نقش جگہ پاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم اُن دلچسپیوں کا پورے طور پر احساس کر ہی نہیں سکتے جو عہد طفلی میں میسر تھیں۔ بچوں کو جو خوشی ایک دوسرے سے مل کر ایک نئے کھلونے پا کر ہوتی ہے اُس کا اندازہ کوئی معمر شخص کر ہی نہیں سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی حالت کو بالکل فراموش کر چکا ہے۔ وہ بچوں کو نہایت شغف سے ان باتوں میں مصروف دیکھتا ہے جو اس کی نظر میں بالکل حقیر ہیں تو اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ چیزیں اور وہ اشغال بھی جنہیں میں دلچسپ خیال کرتا ہوں اسی طرح بے کیف اور بے نتیجہ ہیں، جس طرح بچوں کی مشغولیت میری نظر میں ہے

لیکن قدرت کا یہ انتظام حد درجہ قابل تعریف ہے کہ ہم کو طفلی کی دلفریبیوں کی بے حقیقتی، ایام طفلی میں، شباب کی دلچسپیوں کی بے حقیقتی شباب میں، اور پیری کے تفکرات کے بے اصل ہونے کا پیری میں احساس نہیں ہونے پاتا بلکہ اُس وقت کے گذر جانے کے بعد ہوتا ہے اور اس طرح انسان دنیاوی تفکرات اور مصائب کے درمیان کبھی کبھی ان نظر فریب دلفریبیوں سے دل بہلا لیتا ہے۔

لیکن ہاں زمانہ طفلی میں ایک چیز ضرور کبھی کبھی طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے اور وہ یہ احساس کہ ہم کیوں دوسروں کی طرح معزز نہیں خیال کئے جاتے۔ ہم ابھی دوسروں سے کمزور ناتواں ہیں۔ اور دوسروں کی دلبستگی کا سامان ہیں۔ اس موقع پر کبھی کبھی ہم تمنا کرنے لگتے ہیں کہ کاش ہم بھی جلد سرحد شباب میں قدم رکھیں۔ اور ہم کو دوسرے لوگ ممتاز خیال کریں۔

شباب | وہ زمانہ جس کی تمنا طفلی میں اور جس کی حسرت ضعیفی میں انسان کے دل میں رہتی ہے۔ جب آتا ہے تو اس کا احساس نہیں ہوتا کتنی مست شباب ہستیاں ایسی ہیں۔ جن کو اس حالت میں کبھی اس کا خیال بھی آتا ہے کہ ہم اب جوان ہیں اور گو یہ خیال نہ آئے مگر یہ ضرور ہوتا ہے کہ معصومانہ ادائیں اور خواہشات رخصت ہو چکی ہیں۔ پر زور اور بعض حالتوں میں ناقابل تسخیر جذبات انسان پر قابو پا لیتے ہیں۔ اور انسان اپنے میں کچھ تغیر ضرور پاتا ہے اب تک اس کا مقصد زندگی، محض حصول مسرت تھا۔ دُنیا اس کے لئے محض ایک سرسبز و شاداب چمن کی حیثیت رکھتی تھی لیکن اب فرائض کا بار بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ دماغ میں خیالات اتنی سرعت سے جگہ نہیں پاتے نہ نقوش مرتسم ہوتے ہیں جیسے پیشتر ہوتے تھے۔ بلکہ انسان اب یہ تمیز کرنے لگتا ہے کہ کون چیز قابل غور و فکر ہے۔ اور کون چیز ناقابل اعتنا اور جب انسان غور و فکر کرتا ہے تو جو نقوش اس کے ذہن میں بنتے ہیں وہ کافی گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں اور جو خیالات وہ قائم کرتا ہے وہ ذہن میں عرصہ دراز تک محفوظ بھی رہتے ہیں۔

اس حالت میں پہنچکر انسان کی دائرۂ عمل بھی بدل جاتا ہے۔ جن باتوں میں پیشتر اس کا انہماک رہتا تھا۔ اب وہ غیر دلچسپ نظر آتی ہیں۔ نئے نئے مشغلوں میں اس کو دلچسپی ہوتی ہے۔ نئے نئے خیالات نئی نئی باتیں ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس نقالی سے جو عام طور پر انسان بچپن میں دوسروں کی کرتا ہے۔ نجات حاصل ہوجاتی ہے۔ دل میں یہ احساس ہوتا ہے کہ اب ہم میں اور دوسروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ہماری رائے کی وہی وقعت ہے جو دوسروں کی رائے کی ہوتی ہے۔ طبیعت کو پیشتر صرف اُن چیزوں سے رغبت ہوتی تھی جن سے دلچسپی حاصل ہوتی تھی۔ اب دلچسپی کے ساتھ ساتھ فائدہ بھی مدنظر رہتا ہے۔ اور انسان وہ کام بھی کرتا ہے جن سے اگر دلچسپی نہ بھی ہو تاہم فائدہ ہو یعنی بخیال خوشی اس کی نظر میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنے فائدے اور نقصان کو سمجھنے لگتا ہے۔ پیشتر تمام کاموں کا مقصد حصول مسرت ہوتا تھا لیکن اب مقصد صرف حصول مسرت نہیں بلکہ حصول زر، حصول عزت، یا شہرت وغیرہ ہوتا ہے۔ اور انسان میں وہ بات پیدا ہوتی ہے جس کو کسی حد تک دور بینی پیش بینی، مآل اندیشی وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ تفکرات اور ایسی تفکرات جو اکثر برسوں انسان کو محنت و مشقت میں مبتلا رکھتی ہیں سامنے رہتی ہیں۔

باوجود ان تمام باتوں کے حصول مسرت کا شوق اکثر فائدے اور منفعت کے خیال پر غالب آجاتا ہے۔ اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ انسان ابھی حدود شباب سے باہر نہیں نکلا ہے۔ اسی عہد حیات کے چند خصوصیات یہ بھی ہیں کہ انسان کسی معاملے پر بے انتہا غور و خوض کرکے اس پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اکثر بے سوچے سمجھے وہ وہ کام کر ڈالتا ہے جس کا نتیجہ اکثر خود اسی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ حالانکہ اس میں یہ مادہ موجود ہوتا ہے کہ وہ ان تمام نتیجوں پر غور کرلے جو پیش آنے والے ہیں۔

ضعیفی

حیات انسان کی آخری منزل جس کو لوگ سب سے زیادہ ناپسند کرتے ہیں ضعیفی ہے۔ لیکن جس طرح بہار کے بعد خزاں کا آنا ضروری ہے اسی طرح طفلی و شباب کے بعد پیری بھی آنا لازمی ہے۔ اور بظاہر کوئی ایسا سبب معلوم نہیں ہوتا کہ لوگ اسے ناپسند کریں۔ طفلی میں جو مسرت انسان حاصل کرتا ہے خود اس سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا کیونکہ اُسے ان نعمات کی قدر نہیں ہوسکتی۔ اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس حالت کے مقابل مصائب و تکالیف بھی ہیں۔ شباب میں جن جن باتوں سے اُسے سابقہ پڑتا ہے وہ سب پیری میں اس کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اس طرح حیات انسانی کی ابتدا و انتہا سے وہ پورے طور پر واقف ہوتا ہے۔ اور اسی بنا پر مآل اندیشی، دور بینی کی صفات اس میں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قوائے جسمانی کمزور ہوجاتے ہیں۔ جسم میں چستی و چالاکی کا پتہ نہیں رہتا۔ لیکن اس کے

مقابل میں تمام عمر کا تجربہ اس کو حاصل رہتا ہے اور یہ بات اگر قابل ترجیح نہیں ہے تو کم از کم ان حالات سے کسی طرح خرا[ب] نہیں ہے جو انسان کو ابتدائی دو دوروں میں پیش آتے ہیں۔

شباب میں انسان کے دل میں اُمنگ، طبیعت میں جوش اور سر میں ترقی کا سودا ہوتا ہے اور یہ چیز اس کو ہمیشہ آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن ضعیفی میں چونکہ جسمانی طاقت کم ہو جاتی ہے اور انسان کو برابر اس کا احساس ہوتا رہتا ہے اس لئے وہ غیر مفید اور فضول اُمیدوں، خواہشوں اور توقعات کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ اور اس طرح زندگی میں ایک خاص قسم کی طمانیت اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

ایک خاص فرق جو اس زمانے میں ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان مسرت و شادمانی حاصل کرنے سے ایک بڑی حد تک گریز کرتا ہے۔ اب اس کو منافع کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ حالانکہ وہ مدت جس میں کہ وہ ان منافع سے بہرہ ور ہوگا۔ دن بدن کم ہوتا جاتا ہے۔

لیکن چونکہ وہ ایک مدت تک دنیا میں رہتا ہے۔ اس کی ہر چیز سے لطف اُٹھاتا ہے۔ اس لئے یہاں کی ہر ہر شے اُ[سے] دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس لئے وہ موت سے بہ نسبت جوانوں کے زیادہ خائف رہتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شباب میں انسان ہر چیز حتی کہ زندگی کی طرف سے بھی بے پروا رہتا ہے۔ اور اگر حیات کا آخری منظر اُسے دیکھنا پڑتا ہے تو اُسے زیادہ بُرا نہیں معلوم ہوتا لیکن اس کے مقابل ضعیفوں کے لئے دنیا اور دُنیا کی چیزوں سے کنارہ کشی کرنا بہت زیادہ شاق ہوتا ہے۔

حیات انسانی کے مختلف ادوار کا مطالعہ نہایت دلچسپ چیز ہے اور ان میں سے ہر ایک دور بجائے خود اتنا دلچسپ ہے کہ اس پر مستقل مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

انداز

(اسٹایل)

(از جناب سید عابد علی صاحب عابدؔ بی۔اے ایل ایل۔بی)

کسی زبان کا سرسری مطالعہ بھی اس بات کا ثبوت بہم پہنچا سکتا ہے کہ جب ہم انداز کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان تمام قومی روایات اور ملی خصوصیات کو مدّ نظر رکھ کر کرتے ہیں جو قومی زبان میں رچ گئی ہیں۔

اگر دو آدمی اس طرح کے تصور کئے جائیں جن کی فطرت معاشری، ذہنی، جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے بالکل یکساں ہو اور جو تاریخ عالم کے کسی ایک دور کے کسی ایک لمحہ میں پیدا ہوں اور اس طرح پیدا ہوں کہ ان کے ماحول متحد الوضع ہوں اور مختلف زبانیں سیکھیں تو ناممکن ہوگا کہ وہ ادب کے ذریعہ ایک ہی پیغام کو ایک ہی طرح کے الفاظ میں ادا کر سکیں ان کی مادری زبان کی خصوصیات امتیازی ادائے مطالب کی قدرت کو معینہ حلقوں میں محدود کر دیں گی۔ قطع نظر اس سے کہ جن مطالب کا ذکر نا مقصود تھا وہ بالکل ایک ہی موضوع پر حاوی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم ایسے دو اشخاص کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جو ایک ہی طرح کی ذہنی، جسمانی، اخلاقی ساخت کے ساتھ پیدا ہوں۔ اور جن کے الفاظ من حیث اللذ بالکل ایک ہی طرح کے ہوں۔

یاد رکھو کہ انداز صرف ان ہی قومی خصوصیات کا نشان نہیں ہے جو مروجہ زبانوں میں جاری و ساری ہیں اور جو کسی قوم کے ذہنی ارتقار کو ثابت کرنے میں مدد دیتی ہیں بلکہ ان ذاتی خصوصیتوں کا آئینہ دار بھی ہے۔ جو کسی ایک فرد واحد سے ملحق ہوتی ہیں۔ جو کچھ کوئی فردِ واحد اپنے دل و دماغ سے کام لے کر کہیگا اُس کی سیرت کا آئینہ دار ہوگا جس قدر کوئی شخص عوام الناس سے مختلف ہوتا چلا جائے گا۔ اُسی قدر اُس کی تحریر و تقریر میں ادائے مطالب کے بیّن امتیازی نشان پائے جائیں گے۔ شکسپیر، فردوسی، غالب سے لے کر حالی، داغ تک چلے آؤ اور پھر حالی، داغ معمولی منشیوں تک پہنچ جاؤ جوں جوں تم بلند درجوں سے نیچے چلے آؤ گے۔ امتیاز و تفریق کے خطوط مدھم ہوتے چلے جائیں گے۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا کسی شخص کی تحریر و تقریر کا انداز اس کی سیرت کا مکمل آئینہ دار ہو سکتا یا بالفاظ دیگر کیا کوئی اس قسم قانون موجود ہے جس کے مدلل و مرتب اصولوں سے کام لے کر ہم کسی فردِ واحد کی سیرت کی ذہنی تشکیل قایم کر سکتے ہیں۔ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ دیکھو جب ہم کسی کے ساتھ سالہا سال رہتے ہیں اس کی تحریر و تقریر سے وقتاً فوقتاً مستفید ہوتے رہتے ہیں تب بھی اُس کی سیرت کا صحیح اندازہ قایم نہیں کر سکتے۔ انداز وہ آئینہ ہے جس میں کسی فرد واحد کی سیرت کے

کچھ حصے نامکمل نظر آتے ہیں اور مسخ شدہ سیرت کی مکمل ماہیت پوشیدہ رہتی ہے کوئی غیر شخص کی اور غیر شخص کے متعلق سب کچھ نہیں جان سکتا کیونکہ خود کوئی سب کچھ اپنے متعلق نہیں جانتا۔ جب کوئی مصنف ایک مخصوص لہجہ ایک مخصوص ذہنیت ایک مخصوص زاویہ نگاہ ایک مخصوص انداز اختیار کرتا ہے تو اُس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ مواد تحریر میں اخفا انتخاب غلط بیانی سے کام لینے پر مجبور ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ ظاہر و باطن تحریر میں یکساں نظر آئیں۔ کوئی نقاد یہ نہیں کہہ سکتا اور کہے تو جھوٹا ہے کہ وہ کسی مصنف کی تصانیف کو بہ نظر غایر مطالعہ کرکے مصنف کی روحانی گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ البتہ میں یہ کہنے کی ہمت اپنے آپ میں ضرور پاتا ہوں کہ انداز کی خصوصیات کو مصنف کی ذاتی خصوصیات اور اس کے ذہنی تعینات سے ایک گہرا تعلق ہوتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ کسی خاص انداز کے اختیار کرنے میں یا وضع کرنے میں یا استعمال کرنے میں کوئی شخص یہ نہیں سکتا کہ وہ ان ذہنی اور تعصبی طاقتوں سے بلند ہو جائے جو تخیل ادراک وجدان اور تعین گفتگو سے متعلق ہیں عین اسی طرح جس طرح کوئی پہلوان یہ نہیں کر سکتا کہ اپنی طاقت کے استعمال میں ان قوتوں سے بالاتر ہو کر رہے جو اس کی جسمانی ساخت چال اور بہادری سے متعلق ہے۔ ہر ایک صنعت کا شاہ کار لازمی طور پر صناع کی ذہنی کیفیات اور وسعتوں کی پیچیدہ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔

ادبی تصانیف میں احساسی طور پر اخلاقی اور جذباتی ذہنیتوں کے فروق باہمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مبالغہ، خود آپ بیتی کسی خاص پہلو کو زیادہ شوخ کرنا ان مصنفوں کا شیوہ ہے جن کی ذہنیت وسعتیں چاہتی ہے۔ سنجیدگی حفظ انتخاب مختلف رنگوں کا مدہم ہونا اُن مصنفوں کا شیوہ ہے جن کی ذہنیت خودنمائی میں محتاط ہے۔ رتن ناتھ مصنفین پہلے گروہ سے تعلق رکھتا ہے محمد علی دوسرے گروہ سے۔ ڈراموں میں خاص کر مصنف کو ایسے افراد تخلیق کرتے پڑتے جن کے جذبات و حیات ضرورتاً اس سے بالکل مختلف ہیں اور انہوں نے اپنی معاشری حالتوں کے ماتحت اپنے اصلی رنگو میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ ڈرامہ نویس اس کام کو وجدان و ادراک کی سرعت اور تاثر و ہمدردی شدت سے انجام دیتا ہے اس کے تخلیق شدہ افراد کے افعال و اقوال میں فرداً فرداً موضوع اور ماحول کی مطابقت میں سنجیدگی۔ مسرت غم نشہ عشرت پسندی یا نت گئی کی ایک سطح جاری و ساری رہتی ہے لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے مندرجہ بالا معیار پر اُن جذبات کے بیان کرنے میں جو خود ڈرامہ نویس   اوپر طاری ہو چکے ہوں کوئی پورا نہیں اترتا سوائے اُن حضرات جن کو فطرت کی طرف سے ایک خاص ملادر لیست ہوا ہے۔

آغا حشر کی فطرت گیر طبیعت اس بات کو سمجھتی ہے لیکن وہ موجودہ اردو اسٹیج کی روایات کو برقرار رکھنے میں اس قدر کو ہیں کہ اُن کی آزاد ذہنیت چند ایک رسوم و قواعد میں گھر جاتی ہے۔

پھر بھی وہ اس اعتبار سے اپنے فن میں یکتا ہے۔

حکیم احمد شجاع بی۔ اے علیگ قابلِ تحسین ہیں کہ ان کا ڈرامہ "باپ کا گناہ" ان تمام قیود سے آزاد ہے جو اردو اسٹیج سے متعلق ہیں اور حقیقت میں ایک مکمل ڈرامہ کہلانے کا مستحق ہے۔ سیرت کا انداز پر اثر دیکھنا۔ دوم درجے کے ڈرامہ نویس ٹریجیڈی لکھیں یا کامیڈی ان کے تخلیق شدہ افراد کے پیچھے ہمیشہ ان کی اپنی نقاب پوش صورت جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بہت بڑے مصنفین کی تحریروں میں سیرت کا اثر اتنا نمایاں نہیں ہوتا لیکن فطرت کے مظاہر کو پیش کرتے ہوئے ان کی ذاتی خصوصیات ایک مبہم سے پردے کے پیچھے جھلکتی ہوئی دکھائی دے جاتی ہے۔ غور سے دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ غالب ٹیگور۔ فردوسی۔ ہومر۔ اقبال کا نقطۂ نگاہ زندگی کی جزئیات سے بالکل مختلف ہے۔

ذہنی تاثرات کا اثر انداز پر مترتب ہوتا ہے اس کی مثالیں دیکھو کہ فلسفی استدلال میں۔ ذہنی مقتدا اپنی تبلیغ میں۔ منطقی اپنی کلیات میں۔ شاعر اپنی نظم میں۔ سائنس داں اپنے ثبوت میں ایک ہی موضوع کے لئے مختلف تراکیب کا استعمال کریگا۔ ایک اشکال کی صورت میں سوچتا ہے۔ دوسرا رسمی استقلال کے ذریعہ۔ تیسرا بحث کے ذریعہ ایک نتیجے پر پہنچتا ہے۔ چوتھا بلند آہنگ ادعا کو فصاحت کا لباس پہناتا ہے۔

اسی طرح جمال پرستی اور دیگر جسمانی خصوصیات انداز پر اپنا پرتو ڈالتی ہیں۔ اگر مصنف نے ذہن پر رنگوں آوازوں روشنیوں اور شکلوں میں سے کسی ایک چیز کا اثر گہرا مترتب ہو چکا ہو تو ان چیزوں کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے زیادہ تر زورِ قلم اسی شے پر مرکوز ہوگا۔ جو ان کے ذہن پر محیط ہے۔

قصبی تو قیس انداز کے ذریعہ اسی طرح ظاہر ہوتی ہے جس طرح ذہنی تعلیم۔ سائنس کی ہو یا قانون کی ادب کی ہو یا انشا کی۔ تاثرات توصیف کی کتاب کے متعلق ہوں یا شہر کے متعلق معاشری ماحول۔ نجیب الطرفین پیدائش۔ زندگی کے مختلف مظاہر یہ تمام چیزیں فرداً فرداً حسب تاثر مصنف کے قلم میں رنگ بھریں گی۔

صرف یہ ہی نہیں بلکہ انتخاب الفاظ میں بھی مصنف کی ذہنیت کا عکس موجود ہوتا ہے کسی شخص کا ذخیرۂ الفاظ۔ انتخاب ترکیب فقروں کا دروبست۔ رنگینیٔ انشاء اختصار و ایجاز اس کے اخلاقی اور روحانی نقطۂ نگاہ کو واضح کرتا ہے۔ وقفے کی علامتیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ مصنف کے ذہن میں وقت کی کیا قیمت ہے۔ اور وہ سکون و اطمینان کو کس قدر عزیز رکھتا ہے ادبی انداز۔ جذبات۔ احساسات۔ شدت سرعت و تاثر اور نقطۂ نگاہ پر مبنی ہوتا ہے۔

سائنس کا استدلال نفسی کیفیات سے معرا ہے اور جس شدت سے ناولوں۔ افسانوں اور نظموں میں مصنف کی سیرت جس قدر جلوہ زن ہوتی ہے۔ سائنس کی کتابوں میں نہیں ہو سکتی۔

سائنس میں قدرت اداے مطالب بصفت تعریح و تشریح کافی ہے لیکن نظموں اور افسانوں میں جو اثر پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے یہ سلسلہ جذباتی خیالی کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نفاست کی کمی و بیشی ہی ایسی شے ہے جو صاحب انداز و طرز ہونے میں بے انتہا مدد دیتی ہے۔ غالب اسلئے غالب ہے کہ اس کی نزاکت طبع اشعار میں جاری و ساری ہے۔ شکسپیر یوں شکسپیر ہے کہ اس کی نفاست خیال فطرت کی گہرائیوں کو پالیتی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ موضوع تشنہ رہ گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع کو شاداب کرنے کے لئے نہ صرف ادب کا ایک وسیع مطالعہ ضروری ہے بلکہ نفسیات اجتماع کے ساتھ ساتھ جذبات کا نقطہ داں ہونا بھی ضروری ہے اور ان تینوں چیزوں کا ایک فرد واحد میں جمع ہونا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے

تصانیف شرر پر تنقید و تبصرہ کے لئے

انعامی مقابلہ

مولانا شرر مرحوم نے اردو زبان کی جو خدمات انجام دیں، اُن کی اہمیت و عظمت کا اعتراف مختلف صورتوں میں کیا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی تک کسی کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی کہ مولانا کی تصانیف پر مفصل تنقید و تبصرہ لکھ کر اُن کی خصوصیات کو نمایاں کیا جائے اور بتایا جائے کہ ادب کے جن مختلف شعبوں کی اُنہوں نے خدمت کی اُن میں سے ہر ایک میں اُن کی کیا منزلت تھی، اور کن کن امور میں شعبہ کے دوسرے مشاہیر اہل قلم سے وہ ممتاز تھے، اور واضح کیا جائے کہ خالص انشاء پردازی کی حیثیت سے ان کو کس طبقہ میں جگہ ملنا چاہیئے۔

الناظر میں انعامی مقابلوں کا سلسلہ شروع کرنے کا بڑا مقصد یہی ہے کہ لوگوں میں ادبی تنقید کا ذوق پیدا ہو اور جو کچھ سرمایہ ہماری زبان میں فراہم ہو چکا ہے اسکی مختلف حیثیتوں سے جانچ پڑتال ہوتی رہے۔ اس لئے ملک کے جملہ اہل قلم حضرات کو صلائے عام دی جاتی ہے کہ شرائط مندرجہ ذیل کو پیش نظر رکھ کر اس ضروری، مفید اور دلچسپ موضوع پر طبع آزمائی فرمائیں۔

شرائط مقابلہ

(۱) مضمون فلسکیپ کاغذ کے کم از کم ۵۰ صفحوں پر صرف ایک جانب لکھا جائے۔

(۲) ۳۱۔ جولائی ۱۹۲۶ء تک رجسٹری کے ذریعہ دفتر الناظر میں وصول ہو جائے۔

(بقیہ صفحہ ۱۵۶)

بنائے احمد آباد کی کیفیت

(جناب مولوی ضیاء الحق صاحب عباسی احمد آبادی مرحوم)

گجرات میں متعدد مقامات پر مرآت احمدی جو فارسی میں گجرات کاٹھیاواڑ کی مکمل تاریخ ہے۔ کے قلمی نسخے محفوظ ہیں مگر اب تک نہ اس کے اصل چھپنے کی نوبت آئی ہے اور نہ اس کا مکمل ترجمہ ہی طبع ہوا ہے اگرچہ مولوی ضیاء الحق صاحب عباسی احمد آبادی اس کا مکمل ترجمہ کر چکے ہیں مگر اس میں سے جو چار ضخیم جلدوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، صرف پہلی جلد سنہ ۱۳۱۰ ہجری میں چھپنے پائی تھی کہ مترجم کا انتقال ہو گیا اور بقایا یہ ذخیرہ اب تک کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا

ہم اپنے کرم دوست جناب وسیع الحق صاحب عباسی کے شکرگزار ہیں کہ آپ نے ہماری خواہش پر اس میں سے "بنائے احمد آباد کی کیفیت" زبان کے لئے مرحمت فرمائی اور اپنے بزرگوار کی اس یادگار کو چھپوانے کے لئے صاف کر رہے ہیں۔

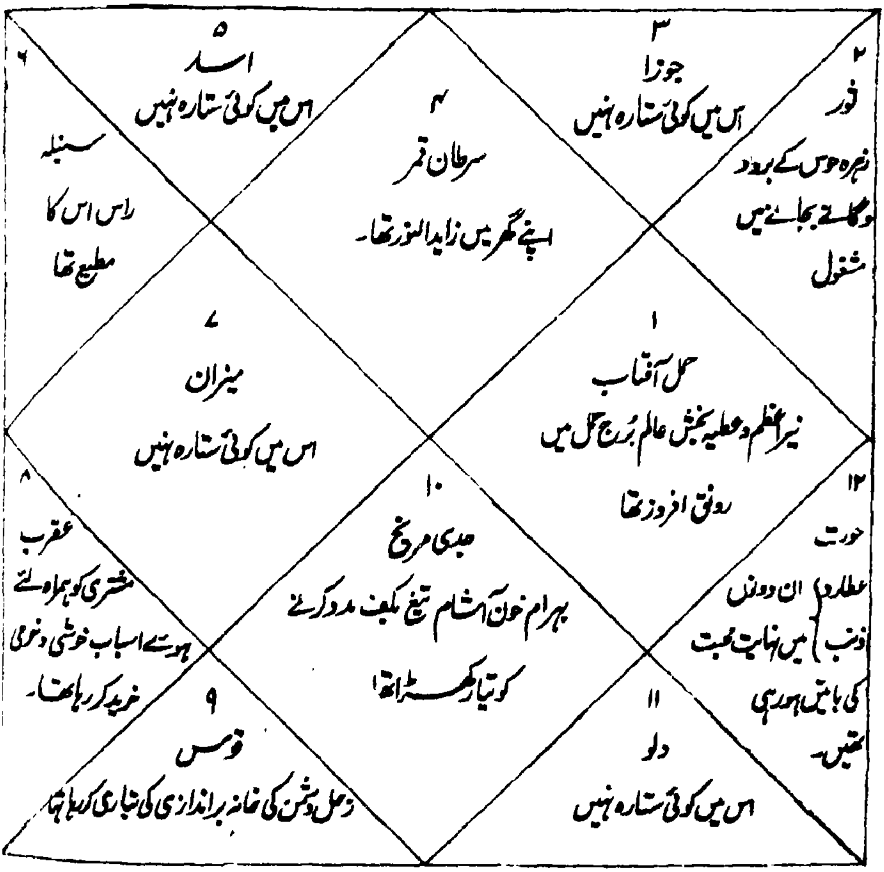
ہم انشاء اللہ اس میں سے وقتاً فوقتاً اہم تاریخی واقعات نذر ناظرین کیا کریں گے۔

"اڈیٹر"

مظفر شاہ کے پوتے سلطان احمد نے احمد آباد کے آباد کرنے کا بیڑا اُس وقت اُٹھایا جب کہ وہ اپنے چچا زاد بھائی مودود بن فیروز خاں سے لڑ بھڑ کر گجرات فتح کر چکا تھا۔

مودود کا استیصال کر کے سنہ ۸۱۳ ہجری میں قصبۂ اساول میں وارد ہوا۔ سب سے پہلے رسم تخت نشینی ادا ہوئی۔ آسا بھیل جس کا یہ قصبہ تھا بڑے نامی گرامی سرکشوں میں شمار کیا جاتا تھا اُس کا بھی سلطان احمد کے جاہ و جلال نے استیصال کر دیا۔ بادشاہ چند روز تک بے فکر ہو کر دریائے سابرمتی کے کنارے سیر و شکار میں مصروف رہا۔ دریا کی آب و ہوا نے چھینٹے دے دے کر بادشاہ کو گرویدہ بنا لیا اور گرویدہ بھی ایسا بنایا کہ انجام کار یہیں کا ہو رہا۔ ایک روز سیر دریا میں طبیعت ایسی ہلی کہ رفیقوں اور مصاحبوں سے اس کے کنارے ایک شہر آباد کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ بادشاہ کی طبیعت کا رجحان ابتدا سے بزرگانِ دین و اہل اللہ کی طرف تھا اور اُن کا حد درجہ معتقد رہا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں حضرت سراج المحققین شیخ احمد کھٹو المعروف گنج بخش قدس سرہٗ موضع سرکھیج میں تشریف فرما تھے بادشاہ کو خیال گذرا کہ اگر حضرت موصوف میرے ارادے میں معین و مددگار

ہوں تو ساری مشکلیں آسان ہو جائیں۔ بادشاہ بصدق ارادت آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بنائے احمد آباد کی کیفیت بیان کر کے اجازت چاہی۔ آپ کی زبانِ مبارک سے بَارَکَ اللّٰہُ فِی اِرَادَتِکَ ارشاد ہوا۔ یہ سنکر بادشاہ بہت محظوظ ہوا اور دریائے سابرمتی کے شرقی رویہ قصبہ آساول میں ایک میدان مسطحہ مگر نہایت پُر فضا پسند فرما کر منجموں کو زائچہ تیار کرنے کا حکم فرمایا۔ حکم شاہی سے منجمان ذی علم نے بنائے احمد آباد کا زائچہ طیار کر کے تاریخ متعین کی۔ قمری مہینہ ذی قعدہ کی تیسری تاریخ بروز پنجشنبہ مطابق بیساکھ شدی پنچمی سمبت ۱۴۶۹ بکرماجیتی مرادف سنہ ۱۳۱۴ شاکی سالواہن کے روز پندرہ گھڑی اور پینتیس ۳۵ پل دن چڑھے بعد پُس نکشتر کا عمل شروع ہوا تھا۔ زائچہ حسب ذیل ہے۔



شان ایزدی دیکھئے کہ حسن اتفاق سے ایسا زائچہ واقع ہوا کہ ساتوں ستارے اور دو گرہ بارہ برجوں میں مقیم تھے۔
علاوہ بریں بنائے احمد آباد کے متعلق یہ بات بھی مشہور خلایق ہے کہ اس کی بنیاد چار احمد نامی بزرگوں کے دست مبارک سے ڈالی گئی تھی۔ جن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ حضرت شیخ بزرگ قدوۃ المحققین سراج الملت والدین شیخ احمد کھٹو المعروف بہ گنج بخش قدس سرہ
۲۔ سلطان احمد خود والی ملک۔
۳۔ ملک احمد جو دروازہ کالوپور (احمد آباد) کے قریب گوشۂ لحد میں لیٹے ہوئے اپنی آباد کی ہوئی بستی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔
۴۔ قاضی احمد صاحب جنید۔ آپ حضرت گنج احمد صاحب کے خلیفہ تھے اور پیران پٹن میں آپ کا مزار مبارک زیارت گاہ اہل اسلام ہے۔ آپ کے لوح مزار پر بھی یہ عبارت کندہ ہے کہ "جن چار احمد نامی بزرگوں نے بنیاد احمد قائم کی تھی ان میں سے ایک آپ بھی تھے۔"

"حصار"

حصار احمد آباد ۸۱۳ھ ہجری میں شروع ہو کر تین سال کے عرصہ میں پورا تعمیر ہو گیا۔ تمام حصار کی عمارت پکی اینٹ اور چونے کی نہایت مستحکم بنی ہوئی ہے۔ مگر جس قدر حصہ دریائے سابر کے دامن سے وابستہ ہے اتنا حصہ کرنگ سنگ خارا کا بنا ہوا ہے۔ اس قلعہ کے کل بارہ دروازے اور اکیس ۳۹ اتالیس برج اور ۶ چھ گوشے ہیں۔ تمام قلعہ کی عمارت میں اس سرے سے اس سرے تک فصیل قلعہ پر چھ ہزار سات سو ۶۳ تریسٹھ کنگرے بنے ہوئے ہیں۔ قلعہ کی سافت دو کوس اور ایک جریب ہے۔ قلعۂ ارک جس کو بھدر بھی کہتے ہیں انہیں ایام میں معہ ایک پتھر کی مسجد کے تیار ہوا تھا۔ قلعہ کی دیوار کی بلندی سات آٹھ گز سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر شاہجہاں کے زمانہ میں قلعۂ ارک (بھدر) میں کھڑکی سے ملحقہ دیوار سیف خاں نے از سر نو تعمیر کروائی تھی جو تخمیناً پندرہ گز اونچی ہو گئی۔ چونکہ اس دیوار کے برابر سے دریائے سابر بہتا ہے۔ حفظ ما تقدم کے خیال سے یہ دیوار اس قدر بلند بنائی گئی ہے۔

شہر کا طول رائے پور دروازہ سے لے کر جس کو دہلی دروازہ بھی کہتے ہیں جمال پور تک فی مابین شمال و جنوب تین ہزار ایک سو پچیس گز اور عرض قلعۂ ارک کے جھروکے سے لے کر سارنگ پور دروازے تک فی مابین مشرق و مغرب نو ہزار ۹ پانسو گز ہے۔ قلعہ کی اندرونی زمین جس میں آبادی ہے دو ہزار دو سو ۲۲۲۹ انتیس بیگہ اور تیرہ بسوہ ہیں۔ شاعر گرامی علوائے شیرازی نے آبادی کی تاریخ میں چند اشعار نظم کئے ہیں جو ذیل میں درج ہیں:۔

چنیں گفت حلوائے شیریں سخن | کہ افشاند صد درج دُر در سخن
کہ چوں چند گہ شاہ گردوں حرام | شدش بر لب رود سابر مقام
دیبنے بغایت ز خناک دید | دگر دامن خاکِ او پاک دید
ہوائے کہ میگرد دل را ہوس | نسیمش چو مشک خطا خوش نفس
مکانے تزہ دید و جائے لطیف | محل خوش آب و ہوائے لطیف
بالہام غیبی و لطف الہ | چنیں آمد اندر دل پادشاہ
در آں سرزمین مروح ہوا | کند تازہ شہرے معظم بنا
ہماں لحظہ بانی طلب کرد شاہ | بفرمود تا ہمدر آں جائے گاہ
بسازد یکی شہر عالی اساس | کہ گویند سکان خاکش سپاس
سر خاک براوج خضرا برد | خرامی را براوج ثریا برد
بنائے برآرد بقصر فلک | کہ در وے شود خیرہ چشم ملک
پے دفع یاجوج کیں آوری | کشد بر زمیں سدِ اسکندری
کند سرزمیں آسمانے بنا | کہ خشتش بود جام گیتی نما
یکے مصر جامع کند آشکار | کہ خاکش برد آب چین و تتار
نشاپور را از حسد جاں کند | کہ گجرات رشک خراساں کند
طلب کرد اصحاب علم نجوم | کہ بودند گنجور گنج علوم
دقایق شناسان دورِ فلک | کہ واقف بودند از سما تا سمک
مطالع کشایان سطح سپہر | طوالع نمایان ناہید و مہر
بہ بینند ہر کوکبی را شرف | نظر بر کشادند از ہر طرف
بفرمان شاہنشہ بختیار | بکردند ساعات سعد اختیار
چو بانی بنا بر کشید از زمین | برو خواند ہر دم فلک آفریں
چو یکبار خشتی بخشش نہاد | ملک گفت مسعود و فرخندہ باد
نو آباد شہرے شدہ بر زمیں | سوادش چو خالی بروئے زمیں

جو ترتیب آں شہرِ عالی مقام　　شد از ناصر الدین احمد تمام
ورا نام ہم احمد آباد شد　　در آں ملت احمد آباد شد
شدہ تازہ شہرے عمارت پذیر　　کہ گردوں ندیدش بدوراں نظیر
الٰہی تو ایں شہر عالی بنا
بدہ تا بحشرش زوال و فنا

شہر کے دروازے

شرقی۔ کالوپور[1]۔ سارنگ پور[2]۔ استوڑیہ[3]
غربی۔ خان پور[4]۔ رائے کھڑ[5]۔ خان جہاں[6]۔
شمالی۔ دریا پور[7]۔ ایڈریا دہلی دروازہ[8]۔ شاہ پور[9]
جنوبی۔ جمال پور[10]۔ بند دروازہ[11]۔ رائے پور[12]۔

ان بارہ دروازوں کے علاوہ دو اور کھڑکیاں بھی ہیں جن کے نام دریچہ باغ بھدر اور کھڑکی حلیم ہیں۔ بند دروازہ اور حلیم کی کھڑکی کے متعلق بہت سے اقوال زبانِ خاص و عام ہیں۔ لیکن چونکہ اُن کی صداقت مشکوک ہے لہذا اُن کو یہاں قلمبند نہیں کیا جاتا۔

قلعۂ ارک یا بھدر کی اندرونی زمین کا عرض و طول

طول۔ دریائے سابرمتی کے کنارے سے اُس قدیم بڑے دروازے تک جس کے دونوں طرف دو بڑے بڑے برج ہیں چار سو اسی گز۔ (۴۸۰ گز)

عرض۔ بھدر کی اندرونی مسجد سے جس کو خود بادشاہ سلطان احمد نے تعمیر کروائی تھی۔ باغ کے دروازے تک جو شمال میں واقع ہے چار سو گز (۴۰۰ گز)

قلعۂ ارک یا بھدر کے اول تیرہ برج تھے۔ نجم الدولہ جلاد نے اپنے زمانہ حکومت میں ایک برج نیا تعمیر کروایا تھا۔ جب سے چودہ برج قایم ہیں۔ بادشاہی نقار خانے کا دروازہ اور باغ کا دروازہ قدیم عمارت میں شامل ہیں۔ کچہری والا دروازہ ناظموں کے زمانہ حکومت میں نیا تعمیر ہوا۔ سلاطین گجرات و ناظمان صوبہ جو بعد کو دارالسلطنت دہلی سے نامزد ہو کر آ

کرتے تھے اسی قلعۂ ارک میں رہتے تھے۔ اس قلعۂ ارک کی وجہ تسمیہ کے متعلق بھی بہت سی لغو باتیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ لیکن ان میں سے بجز ایک کے اور سب باتیں قابل اعتبار نہیں اور وہ یہ ہے کہ چونکہ پٹن میں ایک پرانے زمانہ کا قلعہ اسی قسم کا ہے اور اس میں ہندوؤں کی بھدر کالی ماتا کا مندر واقع ہے۔ لہٰذا اس بنا پر قلعۂ ارک، قلعۂ بھدر کے نام سے مشہور ہوگیا۔ چاپانیر اور احمد نگر کے قلعہ ارک بھی اسی طرح بھدر کے نام سے مشہور ہوگئے۔

جب یہ شہر آباد ہوگیا تو سلاطین گجرات نے اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ ہر بادشاہ کے زمانہ میں آبادی نے ترقی کی سلطان محمود بیگڑہ کے زمانہ میں اس قدر آبادی بڑھ گئی کہ دنیا کے اعلیٰ شہروں میں شمار کیا جانے لگا۔ قلعۂ ارک میں خود بادشاہ نے بھی کئی عمارتیں تعمیر کروائیں جو ایک مدت تک اصلی حالت میں آباد تھیں لیکن زمانہ کی دست بردسے رفتہ رفتہ کر کالعدم ہوگئیں۔ اب چند کھنڈر باقی رہ گئے ہیں جو آگلی شان و شوکت کا مرثیہ زبان حال سے پڑھ رہے ہیں۔

شہر میں صدہا مسجدیں نہایت عمدہ اور پتھر کی بنی ہوئی اب تک زمانہ سلف کی یادگار ہیں۔ راستے اور بازار ایسے وسیع اور کشادہ ترتیب دیئے گئے تھے کہ لوگوں کو اور خریداروں کو کسی قسم کی دقت پیش نہ آتی تھی۔ شہر کے ارد گرد تین سو ساٹھ اور ایک بیان کے مطابق تین سو اسی پور سے آباد تھے۔ گویا پورے محیط ہوکر تمام شہر کو گھیرے ہوئے تھے۔ سلطان محمود ثانی نے اپنے زمانہ سلف میں محمود آباد کو دارالسلطنت قرار دیا۔ وہاں کی آب و ہوا کچھ ایسی مطبوع طبع ہوئی کہ ہمیشہ وہیں رہا کرتا تھا۔

احمد آباد اور محمود آباد میں بارہ کوس کا فاصلہ ہے۔ لوگوں کو آباد کر کے دور دیہ بازار ترتیب دیا اور اس بازار کے اطراف و جوانب میں متوسلان سلطنت کے لئے مکانات تعمیر کروائے جس سے احمد آباد سے لے کر محمود آباد تک گویا ایک ہی شہر دکھائی دیتا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۱۵۰)

(۳) اصحاب ذیل مضامین کی جانچ کریں گے:۔

۱۔ مولوی عبدالحق بی اے سکرٹری انجمن ترقی اردو

۲۔ مولوی سید محفوظ علی بی اے بدایوں

۳۔ مسٹر سید سجاد حیدر (یلدرم) بی اے علیگڈھ

۴۔ منشی امیر احمد علوی بی۔ اے نیچ چھاؤنی

۵۔ مولوی عبدالماجد بی۔ اے دریاباد ضلع بارہ بنکی

(بقیہ صفحہ ۱۶۶)

ادبیات

الوداعی ملاقات

(جناب احمد عبداللہ صاحب المسدوسی متعلم بی۔ اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

ذیل کا افسانہ مشہور افسانہ نویس اسٹیونسن کے ایک فسانہ کا ترجمہ ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ نہ صرف انوکھا ہے بلکہ دلچسپ بھی ہے۔ ہم جناب احمد عبداللہ صاحب المسدوسی بی۔ اے کے ممنون ہیں کہ آپ نے ازرہِ زبان نوازی مذکور فسانہ نویس کے شاہ کار فسانہ will of the millions کا ترجمہ بھی مرحمت فرمایا ہے جو طویل اور بیحد دلچسپ و اثر انگیز ہے۔ انشاءاللہ بہت جلد ہدیۂ ناظرین کریں گے۔

اڈیٹر

میں اس فن کا ماہر نہیں ہوں اور حقیقت پوچھئے تو اس میں کمال حاصل کرنا تو مجھے دنیا میں مشکل ترین معلوم ہوتا ہے اور ایدآپ کا بھی یہی خیال ہو۔ دو چار میل جانے والے کو وداع کرنا نہایت آسان ہے مگر ہم کبھی بھی ایسے معمولی سفر پر وداع کرنے لے نہیں بلائے جاتے، ہم صرف ایسے ہی موقعہ پر اسٹیشن پہنچتے ہیں جب کہ ہمارا دوست ایک دراز تر سفر پر ایک طویل مدت کے لئے جا رہا ہے، جتنا زیادہ دوست عزیز، سفر لانبا اور جدائی طویل ہوگی۔ اتنا ہی جلد ہم اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کریں گے اور ناکام ہوں گے اس طرح گویا ہماری ناکامی، موقع کی نزاکت اور ہمارے جذبات کی گہرائی کی نسبت سے ہوگی۔ کمرہ میں بلکہ دہلیز پر بھی ہم نہایت خوشی کے ساتھ ؎

بسفر رفتنت مبارکباد بسلامت روی و باز آئی

سکنے اور اپنے پرخلوص جذبات رنج و غم کو بشرہ سے ظاہر کرسکتے ہیں۔ نہ الفاظ ہمارے جذبات کے اظہار میں ناکام رہتے ہیں اور جانبین میں سے کوئی کسی قسم کی رکاوٹ اور جھجک محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ ہمارے تعلقات کا رشتہ ابھی استوار ہوتا ہے۔ یہ آخری زت طلبی رسمی ہوتی ہے۔ پھر کیوں نہ اس تکلف کا قلع و قمع کر دیا جائے، جدا ہونے والے دوست ہمیشہ از راہ اخلاق و انکساری ار کرتے ہیں کہ کرایہ کے بھاڑے میں اسٹیشن تک تکلیف گوارا فرماکر محجوب نہ کیجئیگا۔ اور ہمیشہ ہی ہم ان درخواستوں کو خلوص کے انی سمجھکر سُنا ان سُنا کر دیتے ہیں۔ اور اگر کبھی بھولے پن سے ہم ان کی درخواست کو منظور کرلیتے ہیں تو وہ اس کا بُرا مانتے ہیں۔

چونکہ وہ فی الحقیقت ہم سے الوداعی ملاقات کے متمنی اور دلی خواہشمند معلوم ہوتے ہیں اور اس خواہش کو دل سے بھی پورا کیا جاتا ہے مگر افسوس کہ اس وقت ہمارے درمیان ایک خلیج حایل ہو جاتی ہے اور ہم بے فائدہ اپنے بازو اس کی طرف عبور کرنے کے لئے پھیلاتے ہیں، ہمارے لئے آخری موقعہ باقی رہتا ہے لیکن ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہم اس طرح خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں جس طرح حیوان انسان کو دیکھا کرتے ہیں، ہمارے دل میں خیالات اور کہنے سننے کا طوفان برپا رہتا ہے۔ مگر ہم خاموش ٹکٹکی لگائے رہ جاتے ہیں ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ وہی دوست ہیں جن سے کل شب مل چکے ہیں اور وہ بھی اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ہم بدلے نہیں ہیں۔ لیکن باوجود اس کے کائنات کی ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی ہے اور اس قلیل عرصہ میں اختلاف کی خلیج اس قدر وسیع ہو جاتی ہے کہ ہم یہ چاہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح گارڈ سیٹی دے کر اس تکلیف دہ اور مضحکہ انگیز صورت حال کا خاتمہ کر دے۔

گذشتہ ہفتہ ایک سرد اور کہر آلود صبح مجھے ایک دیرینہ دوست کو جو امریکہ جا رہا تھا۔ وداع کرنے کے لئے اسٹیشن جانا پڑا۔ رات ہم اس کو ایک رخصتی ڈنر دے ——— جس میں رنج کے ساتھ خوشی کا عنصر بھی ملا ہوا تھا مدعو کر چکے تھے۔ سالہا سال کے بعد غالباً وہ واپس ہوگا، ہم میں سے بہت سارے اس کو دوبارہ دیکھ بھی نہیں سکیں گے، ہم جب ماضی کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ مستقبل حالات پر اپنے پروں کا جو سایہ ڈال رہا تھا اس سے ناواقف نہیں تھے۔ ہم اپنے مہمان کی دوستی پر جس طرح شکر گذار تھے اس کی جدائی پر ملول و رنجیدہ بھی تھے۔ یہ دونوں جذبے ساتھ ساتھ مصروف عمل تھے بلاشبہ وہ ایک کامیاب "الوداع" تھی۔

اب ہم پلیٹ فارم پر خاموش اور از خود رفتہ کھڑے ہوئے تھے اور ریل گاڑی کی کھڑکی میں ہمارے دوست کا چہرہ نظر آ رہا تھا لیکن وہ تو ایک اجنبی کا چہرہ تھا ——— خوش کرنے کا متمنی، فریادی اور خود فراموش اجنبی کا چہرہ تھا، ہم میں سے ایک نے کہا کیا ہر چیز موجود ہے؟ اس طرح طلسم سکوت ٹوٹا۔ ہمارے دوست نے ایک دل فریب اشارہ کے ساتھ جواب دیا جی ہاں ہر چیز موجود ہے۔ ایک خالی اور حیران دماغ آدمی کی طرح زور دے کر اس نے پھر دہرایا "جی ہاں ہر چیز موجود ہے" میں نے کہا آپ ٹرین میں لنچ کھانے کے قابل ہو سکیں گے حالانکہ یہی پیشین گوئی ایک سے زیادہ مرتبہ کی جا چکی تھی۔ اس نے تصدیق کرتے ہوئے کہا "جی ہاں" اور گاڑی سیدھا لورپول گئی ہے یہ بات ہم کو عجیب معلوم ہوئی کہ، ہم ایک دوسرے کی طرف پُر معنی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور آخر کار ہم میں سے ایک نے پوچھا کہ کیا گاڑی کریو (Crewe) پر نہیں ٹھہرتی۔ ہمارے دوست نے مختصر جواب دیا کہ "نہیں"، وہ بالکل بے چین معلوم ہوتا تھا۔ مگر بڑی دیر تک انتظار کی تکلیف برداشت کرنی پڑی، ہم میں سے ایک نے بناوٹی ہنسی اور سر کو جنبش دے کر کہا "ٹھیک ہے" جنبش سر، ہنسی اور بے معنی "ٹھیک ہے" غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر ادا کئے گئے تھے۔

دوسرا سکوت ہم میں سے ایک کی کھانسی سے ٹوٹا اور کھانسی کا یہ دورہ ہر شخص جانتا ہے کہ ارادی تھا لیکن اس سے وقت گذاری تو بہر حال ہو گئی، پلیٹ فارم پر شور کم نہیں ہوا تھا ٹرین کے چھوٹنے کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ہمارے اور ہمارے دوست کی اس آفت سے رہائی کی نیک ساعت ——— ہنوز دلی دور است۔

میری متجسس نگاہوں نے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو جو ہمارے ڈبہ سے دوسری کھڑکی میں کھڑی ہوئی لیڈی سے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا گفتگو کر رہا تھا تاڑا۔ اس کا خوبصورت چہرہ دیکھا ہوا تھا، نوجوان لیڈی صاف طور پر امریکن معلوم ہوتی تھی اور وہ انگریز تھا ورنہ میں اس کے تحکمانہ اور مؤثر انداز سے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتا کہ وہ اس کا باپ ہے میں اس کی گفتگو سننا چاہتا تھا، مجھے یقین ہے کہ وہ بہترین مشورے دے رہا تھا۔ اور اس کی نگاہوں میں محبت و ہمدردی کے زبردست جذبے ——— نظارہ بڑا خوبصورت تھا اس کی شخصیت پُراسرار اور مقناطیسی نظر آ رہی تھی جب اس نے آخری ہدایات اور مشوروں کا دفتر کھول کر رکھ دیا تو میں یہاں کھڑا ہوا اس کی اس مقناطیسی قوت کے اثرات کو محسوس کر رہا تھا، پُراسرار شخصیت اور اس کی مقناطیسیت سے اس کے چہرہ کی طرح میں خوب واقف تھا مگر مجھے اس کا تجربہ کہاں ہوا تھا۔

سرنا فاًنا مجھے یاد آ گیا کہ یہ شخص ہیوبرٹ لی راس (Hew le Ross) تھا مگر اب اس میں کتنا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ یہ سات یا آٹھ سال پہلے شہر کی ایک سڑک کا واقعہ ہے اس وقت وہ ہمیشہ کی طرح بیکار تھا۔ اس لئے مجھ سے دو کراؤن قرض لے سکتے۔ اس کو قرض دینا اپنی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھنا تھا، اس کا وجود ہمیشہ مقناطیسی رہا ہے اس کی اس مقناطیسی شخصیت نے اس کو لندن کے اسٹیج پر کیوں کامیاب نہیں بنایا۔ میرے لئے ہمیشہ یہ معمہ رہا ہے وہ نہایت کامیاب اور اعلیٰ درجہ کا ایکٹر اور معمولاً اخلاق کا آدمی تھا مگر بہت سے اپنے ہم پیشہ افراد کی طرح ہیوبٹ برلی راس (میں یہاں اس کا اصلی نام جس سے وہ مشہور ہے نہیں بتا سکتا) بتدریج قعرِ گمنامی میں گرتا ——— باہر چلا گیا اور اس طرح میں اُس کو دوسروں کی طرح بھلا بیٹھا۔

اس کو اتنے سالوں کے بعد یہاں پلیٹ فارم پر اس طرح کامیاب اور خوش حال دیکھنا تعجب خیز تھا نہ صرف اس کی نادری کی وجہ سے بلکہ اس کے بیش قیمت لباس کے سبب اس کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ پہلے نقلی اونی کوٹ اس کے حجامت بڑھے ہوئے چہرہ کی طرح اس کا غیر منفک جزو معلوم ہوتا تھا مگر اب اس کا لباس قیمتی اور اصولی تھا جو لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف بلا تامّل مائل کرتا تھا۔ وہ مالک نیک معلوم ہوتا تھا۔ ہر شخص اس کے وداع کرنے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا۔ "برائے مہربانی ہٹ کر کھڑے ہو جائیے" گاڑی چلنے والی تھی میں نے اپنے دوست کو الوداعی دستی ہلائی۔ لی راس وہیں کھڑا رہا وہ نوجوان امریکن لیڈی کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے کھڑا تھا "جناب برائے مہربانی ہٹ جائیے" اس نے حکم کی تعمیل کی مگر فوراً ہی پھر کچھ کہنے

کے لئے آگے بڑھا، میرا خیال ہے کہ آنسو اس کی آنکھوں میں لہرا رہے تھے بالآخر وہ ٹرین کے نظروں سے اوجھل ہو جا
میری طرف پھرا۔ وہ مجھ سے مل کر خوش معلوم ہوتا تھا اس نے مجھ سے دریافت کیا "اتنے سالوں تک آپ کہاں غائب
اس کے ساتھ ہی مجھے دو کراؤن واپس کر دیئے گویا کہ وہ قرض کل لیا گیا تھا وہ میرے بازو میں اپنا بازو ڈالے اور آہستہ
پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے بیان کرنے لگا۔ میرے ڈرامائی تنقیدوں کو وہ ہر ہفتہ کس مسرت اور خوشی کے ساتھ پڑھتا
میں نے جواب میں پوچھا کہ اسٹیج سے وہ کس طرح غائب ہو گیا اس نے کہا کہ ہاں ٹھیک ہے مگر آج کل میں اسٹیج پر
کرتا ہوں اس نے یہ جملہ اسٹیج پر زور دیکر کہا تھا اس لئے میں نے دریافت کیا کہ پھر وہ کہاں ایکٹ کیا کرتا ہے پلیٹ
نے جواب دیا میں نے کہا کہ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ محفل رقص و سرود (Concert) پر ایکٹ کرتے ہیں
اپنی چھڑی کو زمین پر مارتے ہوئے کہنے لگا کہ پلیٹ فارم سے میری مراد یہ جگہ ہے کیا اس کی پُراسرار کامیابی اور خوش حالی
دیوانہ بنا دیا تھا مگر نہیں وہ تو بالکل صحیح الدماغ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے ذرا زیادہ صاف صاف الفاظ میں اپنا ما
کرنے کی درخواست کی۔

اس نے اپنا عطا کردہ سگرٹ سلگانے کے لئے روشنی پیش کرتے ہوئے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ کسی دوست کو رخصت
تھے۔ میں نے تائید کی تو اس نے پوچھا کہ خود آپ کیا خیال کرتے ہیں کہ میں یہاں کیا خیال کر رہا ہوں میں نے کہا کہ اس
کرتے ہوئے میں نے دیکھا ہے اس نے متانت سے جواب دیا کہ "نہیں" وہ لیڈی میری دوست نہیں تھی۔ میں اس سے
آج صبح یہاں آدھ گھنٹہ سے بھی کم پہلے ملا ہوں۔ یہاں دوبارہ اس نے اپنی چھڑی سے پلیٹ فارم پر ٹھونسا دیا۔ میں نے
کا اقرار کیا وہ مسکرایا اور کہنے لگا شاید آپ نے انگریزی امریکی معاشرتی انجمن کی خبر سنی ہو گی میں اس سے لاعلم تھا اس نے
باشندگان امریکہ میں سے جو ہر سال انگلستان سے گذرتے ہیں سینکڑوں ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کوئی انگریز دوست نہ
زمانے میں یہ لوگ تعارفی خطوط لایا کرتے تھے مگر انگریز ایسے طوطا چشم اور جوہر مہمان نوازی سے عاری ہیں کہ ان خطوط کی
خطوں کے کاغذ سے بھی کم قدر و قیمت ہوتی ہے بی راس نے کہا کہ یہ انجمن ایک قدیم ضرورت کو پورا کرتی ہے امریکن
ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثروں کے ہاں خرچ کرنے کو خوب رقم ہوتی ہے یہ انجمن ان کو انگریز دوست مہیا کرتی ہے
فیس انجمن رکھ لیتی ہے اور پچاس فیصدی دوستوں کو دیتی ہے افسوس ہے کہ میں اس انجمن کا ناظم نہیں ہوں، صرف
رخصت کرنے والوں میں سے ہوں تاہم اپنی جگہ پر خوش اور اچھا ہوں اور اگر ناظم ہوتا تو نہایت مالدار ہوتا۔ میں نے مزید
کی خواہش کی اس نے کہا کہ اکثر و بیشتر امریکن انگلینڈ میں دوست پیدا کرنا نہیں چاہتے مگر وہ سب کے سب ہیج مسفر
کے سننے کے مشتاق رہتے ہیں۔ فیس تنہا مسافر کے لئے ۵ پونڈ (۲۵) ڈالر اور ذرا زیادہ مسافروں کی جماعت کے لئے

ہے ۔ وہ اپنی روانگی کی تاریخ اور حلیہ سے ۔ جس کے ذریعہ رخصت کرنے والا انہیں پہچان سکے اطلاع دیتے ہوئے فیس انجمن میں بھجوا دیتے ہیں تب ــــــ ہاں تب ان کو نہایت تپاک سے وداع کیا جاتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ اس کا حاصل کیا ؟ اس نے جواب دیا کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ان کو اس سے اپنی نوبت اور دوستوں سے محرومی کا خیال نہیں ہوتا، اس سے ان کی عزت گارڈ کی نظروں میں بڑھ جاتی ہے اس کی وجہ سے ان کے ساتھی ۔ جو لوگ جہاز پر ان کے ہم سفر ہونے والے ہیں ان کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنے پاتے اور ان کو پورے سفر میں ایک حیثیت حاصل ہو جاتی ہے قطع نظر اس کے خود اس میں ایک بڑی مسرت ہے، آپ نے مجھے اس لیڈی کو رخصت کرتے ہوئے دیکھا ہے کیا آپ کے خیال میں میں نے اس کو خوبصورتی کے ساتھ ادا نہیں کیا نہایت خوبصورتی سے میں نے آزار کیا، مجھے تم پر رشک آتا تھا میں وہاں کھڑا ہوا تھا۔

ــــــ ٹھیک ہے میں اس کا تصور کر سکتا ہوں اور آپ وہاں سرسے پاؤں تک لرزتے، خاموشی کے ساتھ بُت کی تصویر بنے اور اپنے دوست کو گھورتے ہوئے گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے میں جانتا ہوں کہ اس فن کا مطالعہ کرنے اور اس پیشہ کو اختیار کرنے سے پہلے میں بھی اسی طرح کیا کرتا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اب میں نے کمال حاصل کر لیا ہے۔ ابھی تک میں پلیٹ فارم کا طفل مکتب ہوں جیسا کہ خود آپ کو تجربہ ہوا ہے ریلوے اسٹیشن تمام مضافات سے زیادہ ایکٹ کے لئے مشکل مقام ہے گومیں نے ناراضگی سے کہا کہ جناب معاف کیجئے میں ایکٹ نہیں کر رہا تھا بلکہ میں فی الحقیقت محسوس کر رہا تھا ۔ اس نے کہا کہ صاحبزادے علی ہذا القیاس میرا بھی یہی حال تھا۔ آپ بغیر محسوس کئے ایکٹ نہیں کر سکتے جب گاڑی روانہ ہوئی ہے تو کیا تم نے میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطروں کو چھلکتے ہوتے نہیں دیکھا ؟ میں نے ان کو نکل پڑنے پر مجبور نہیں کیا میں تم سے کہوں کہ میں فی الحقیقت متاثر ہو گیا تھا میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی متاثر ہو گئے تھے مگر باوجود اس کے تم اس کے ثبوت میں ایک آنسو بھی نہیں بہا سکے۔ تم اپنے جذبات کے اظہار پر قادر نہیں ہو گو یا دوسرے الفاظ میں تم ریلوے اسٹیشن پر ایکٹ نہیں کر سکتے میں چیخ اٹھا کہ مجھے سکھاؤ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور آخرکار اس نے کہا اچھا مگر وداع کرنے کا موسم اب عملاً ختم ہو چکا ہے البتہ میں تم کو ایک درس دوں گا۔ میرے درس میں کئی طلبہ شریک ہوتے ہیں اس نے ایک مطالعہ دہ نوٹ بک کو دیکھتے ہوئے کہا ہاں میں تم کو صرف منگل اور جمعہ کے دن ایک گھنٹہ دے سکوں گا۔

مجھے اقرار ہے کہ اس کی شرائط کڑی تھیں مگر میں ان پر چیں بجبیں نہیں ہوں مجھے منظور ہے۔

احمد عبداللہ المسدوسی متعلم بی ۔ اے عثمانیہ کالج

"خاکِ بسر"

(از عشرت رحمانی الجبوبی رامپوری)

(۱)

"نوشتۂ تقدیر کا مطالعہ انسانی نگاہ کے اختیار میں نہیں"

"کیا" ہوگا۔ اور کس طرح ہوگا۔ کچھ کسی کو نہیں معلوم ہوتا۔ مگر انسان جدوجہد کو کام میں لاتے ہوئے 'عمل' کے میدان میں قدم بڑھاتا ہے تو کچھ ہو ہی جاتا ہے۔

مرزا عابد میرٹھ میں سب انسپکٹر تھے۔ تقدیر نے 'رشوت ستانی' کے مقدمہ میں پھنسا کر بریت محال کر دی۔ اور وارو غرجی بشکل جیل خانہ کے منہ سے نکل کر صرف 'موقوفی' کی ناقابل برداشت سزا پاگئے۔ کچھ دنوں گذرا وقار جس طرح بن پڑی کرتے رہے۔ مگر جلد ہی قسمت کا دوسرا فیصلہ صادر ہوا کہ صرف اسی قدر اکتفا نہیں۔

کل اثاثہ ختم ہوگیا اور مرزا صاحب بیچارے کس مپرسی کے عالم میں نظر آنے لگے۔ غریب کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔ ایک بیوی اور ایک خود۔ کل سات ذی روح افراد کی تن پروری کا انتظام۔ ناقابل بیان مصیبت تھا۔ پولیس کے سب انسپکٹر کی حیثیت سے اہل شہر کی نظروں میں جو وقعت تھی مقدمہ میں ماخوذ ہونے اور برخاستگی کے باعث کچھ بھی نہ رہی۔ اکثر دشمن انتقام کے لئے آمادہ ہوگئے اس بدنصیبی اور غربت کا شریک دنیا میں ملنا تو امکان سے بعید۔ ع

کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے

(۲)

غریب مصیبت کے مارے۔ تن بہ تقدیر میرٹھ سے روانہ ہوگئے۔ کیونکہ غیرت و شرافت کا تقاضہ یہی تھا کہ داروغہ پر اہل شہر کی نظریں اب بیباکانہ، بے وقعتی سے نہ پڑیں!

نہ معلوم کس مصیبت سے اور کہاں سے کچھ سامان فروخت کرکے اور کیا کیا کرکے بیوی بچوں کو ہمراہ لیا اور سیدھے بمبئی سدھارے۔

بمبئی سا شہر اور بے روزگار مرزا جی۔ مع ایک مختصر مجمع کے کس طرح مصیبت کٹ سکتی ہے۔

اور پھر تقدیر و تدبیر دست و گریباں۔ "تقدیر" تدبیر سے اعترافِ شکست کے لئے مصر۔

فاقوں کی نوبت پہنچی۔ نہ تن پر کپڑا درست ہے۔ نہ پاؤں میں جوتہ۔ کس سے امداد کے طالب ہوں۔ کیا کریں۔ کہاں جائیں۔ عرصہ کے بعد منت، سماجت سے ایک کارخانہ میں مزدوری شروع کردی، ایک لڑکا جو (عمر میں پندرہ برس کا اور سب سے بڑا تھا)۔ اور خود صبح سے شام تک وہاں کام کرتے تو دو روپے مل جاتے۔ جس سے کچھ جان میں جان آئی۔ حالت سنبھالی۔ سنبھلنے بھی نہ پائے کہ "قسمت" نے پھر ایک طمانچہ رسید کیا جس سے بے دم ہو گئے۔ یعنی جس کارخانہ میں کام کرتے تھے۔ وہاں منیجر سے کسی معاملہ میں جھگڑا ہو گیا۔ شریف آدمی تھے سخت و سست کی برداشت نہ کر سکے۔ "لوہے کی سلاخ"، جوشِ انتقام میں ان کے ہاتھوں سے گذر کر اس کے سر تک پہنچی اور منیجر کے لئے پیغامِ قضا بن گئی،

یہ ایک نئی مصیبت سر پڑی۔ گرفتار ہوئے۔ قتل کے جرم میں مع لڑکے کے چالان ہوا۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ سشن سپرد ہوا۔ اب ان کو ملازمت کی "فرعونیت" یاد آئی۔ کیا کیا کارنامے ——— !!
"ایک سب انسپکٹر پولیس" ——— "اور ایک ادنیٰ مزدور بہ حیثیت قاتل"۔ دونوں حالتوں کا موازنہ ——— دلخراش اور روح فرسائے احساس ——— ! اُدھر بیوی اور بچے بے سہارے۔ فاقوں کے مارے۔ زندہ درگور، کبھی خواب میں بھی یہ گمان نہ تھا کہ مرزا عابد سب انسپکٹر ——— ان مصائب کی کشمکش کے بعد جیلخانہ میں ایک قاتل کی حیثیت سے "موت و زندگی" کی کشاکش، کا نظارہ دیکھ سکیں گے۔ اور خاندان بھیک بھی نہ پا سکیگا۔ مگر کاتبِ تقدیر کے زبردست قلم نے تو یہ سب کچھ پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا۔ جو "اٹل" ثابت ہوا!

اب مرزا صاحب نے اپنے تمام گناہوں پر اشکِ ندامت بہاتے۔ اور بصد الحاح وزاری عفو کی درخواست درگاہِ صمدیت میں پیش کی۔ کہ رحمتِ حق ان کو بخش دے۔ اُس بارگاہ میں کسی کی "التجا" بیکار نہیں جاتی۔
دریائے رحمت جوش زن ہوا۔ خطائیں معاف ہوئیں۔ مگر "منتقمِ حقیقی" کا فیصلہ انصاف کے خلاف ہرگز نہیں۔

(۳)

قسمت نے بھی کچھ یاوری کی۔ کارخانہ کا مالک۔ مرزا صاحب کی بےکسی اور مفلسی پر رحم کھا کر ہمدردی پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ اُس کی نظر میں "منیجر متوفی" کا قصور ثابت ہوتا تھا۔ بیحد محنت و کوشش کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کرتے گا، اور ثابت کرا دیا کہ منیجر نے پستول سے حملہ کیا تھا۔ جان بچانے کے لئے مرزا "عابد" نے لوہے کی سلاخ "استعمال" کی جو ناگہاں موت کا باعث ہوئی۔ عمداً قتل کا ارتکاب عمل میں نہیں آیا۔

اور لڑکا بالکل بے قصور ہے - موقعۂ واردات پر اُس کی موجودگی بھی ثابت نہیں ہے"
عدالت سے حکم ہوا کہ لڑکے کو بالکل بری کیا جائے - چونکہ واقعات سے ثابت ہے کہ منیجر کا ارادہ مرزا عابد کو پستول
ہلاک کرنے کا قطعی تھا - اس لئے مرزا نے حفاظت جان کی غرض سے یہ عمل کیا جو اتفاقاً موت کا باعث ہوا -
حقاق حفاظت خود اختیاری" ثابت ہے - لیکن تاہم ایک سال کی "قید سخت" کی سزا دی جاتی ہے"
مرزا جی کے نزدیک یہ بھی بری ہونا تھا "جان بچی لاکھوں پائے" کہتے جیلخانہ پہنچے -
مگر خاندان کی مصیبت افلاس کے ہاتھوں ناگفتہ بہ " خدا کے رحم و کرم کا شکر ادا نہیں کر سکتے کہ جان بچ ہی گئی
ا محنت مزدوری کرتا اور جس طرح بھی ہو سکتا - خورو نوش کا انتظام ہو جاتا -
خدا خدا کر کے مصیبت کے دن گذارے - ایک سال کے بعد مرزا جی میعاد ختم کر کے رہا ہوئے -
کارخانہ میں پہنچے - مالک نے تسلی و اطمینان کر کے کسی کام پر تقرر کر دیا - اب دونوں باپ بیٹے مل کر چالیس پچاس
یہ ماہوار کما لیتے اور خدا کا شکر ادا کر کے معمولی طور پر گذر اوقات کرتے - اسی طرح دو سال کا عرصہ ہو گیا - اس درمیان
چالیس پچاس روپیہ پس انداز کر کے جمع بھی ہو گئے - مالک کارخانہ کے مشورہ سے اونہوں نے ارادہ کیا کہ کچھ معمولی تجارت
سلسلہ شروع کریں - کسی "کپڑے کے کارخانہ" میں مالک ان کو لے گیا اور کچھ کپڑا جو مشین میں کٹ کر خراب ہو گیا تھا -
س روپے میں خرید لیا - اور بازار میں مختلف طریقے سے اسے فروخت کر دیا ، اسی طرح کچھ عرصہ تک سلسلہ جاری رہا -
ے بعد مرزا صاحب نے سُنا کہ "بانات" کے کچھ تھان ایک کارخانہ میں نیلام ہو رہے ہیں - یہ فوراً پہنچے اور قیمت طے
ر ڈیڑھ سو روپے میں کل تھان خرید لئے
ان کی بیوی سینا پرونا بخوبی جانتی تھیں - رائے ہوئی کہ اس "بانات" سے مختلف کپڑے تیار کئے جائیں - چنانچہ ایک
مرزئی" پہلے تیار ہوئی اور لڑکا اُسے بازار لے گیا - امداد ربانی شامل حال تھی - اتفاقاً کوئی والیِ ریاست بغرض
ر و تفریح آئے ہوئے تھے - بازار سے گذر رہے تھے کہ اُن کی نظر اس "مرزئی" پر پڑی - نہایت سلیقہ سے بیل بوٹہ کا
م کیا گیا تھا خوبصورت اور جدید طریقہ کی معلوم ہوئی - لڑکے کو قریب بُلا کر "مرزئی" قبضہ میں کی - اور بغیر دریافت
نچسو روپیہ عنایت ہوئے - لڑکا حیران و ششدر تھا کسی طرح یقین نہیں آسکتا تھا کہ اس قدر رقم ' اس کی قیمت
لمید نواب صاحب مضحکہ اڑاتے ہیں - ! لیکن جب اُن کی سواری نظروں سے غائب ہو گئی - تو یقین ہوا کہ - واقعی
نیت ادا کی گئی ہے -

بدحواس دوڑتا ہوا گھر پہنچا۔ ماں باپ اس بے اندازہ رقم کو دیکھ کر دم بخود ہوگئے۔ پھر خیال کر لیا کہ رئیس کی پسند ہے۔ شاہانہ عطیہ ہے۔ کوئی حیرت افزا واقعہ نہیں۔

تقدیر نے کروٹ بدلی۔ دن پھرے۔ مرزا خوش خوش مالک کے پاس پہنچا واقعہ بیان کیا۔ اس نے بھی مبارکباد دی اور اس نے کہا کہ ابھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ "کالبا دیوی روڈ" پر ایک ہوٹل کو رات 'آگ' نے خاکستر کر دیا۔ اس کی خاک۔ نیلام ہو رہی ہے۔ فوراً جاؤ اور وہ "خاک" خرید لو۔ قسمت آزمائی کرو۔ دیکھو "قدرت کو کیا منظور ہے"

مرزا بہت حیران و پریشان ہوئے۔ مالک کا کیا مطلب ہے۔ اس 'رقم' سے ناراض تو نہیں ہوگیا۔ 'خاک' کی خریداری کسی ذی ہوش۔ کا کام نہیں۔ ہوٹل جل کر خاک سیاہ ہو چکا۔ اس کی 'خاک' کیا 'اکسیر' ہوگئی۔ کیا معاملہ ہے۔ خاک کا میں کیا کروں —"

اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ مالک نے ہنس کر کہا "مرزا جی! میں سمجھتا ہوں تم اس تقریر سے حیران ہو گے۔ مگر تم کو اس معاملہ میں تجربہ نہیں۔ تمہاری سراسیمگی بیجا نہیں۔ کچھ خوف نہ کرو۔ فوراً جاؤ اور 'خاک' کی خریداری کرو۔ کیا تعجب ہے۔ تمہاری تقدیر۔ اور تائید غیبی۔ اُسے 'اکسیر' بنا دے۔ اپنی پھوٹی تقدیر خاک میں ڈھونڈو۔ بس جلد جاؤ۔ ہم اس قسم کی تجارت کا راز سمجھتے ہیں۔

(۵)

ناچار مرزا غریب چل دئے۔ وہاں پہنچکر دیکھتے ہیں۔ خاک کے تودے آسمان سے ٹکرا رہے ہیں۔ پہاڑ کے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ششدر کھڑے ہوئے۔ مگر غور کیا تو اکثر تجار موجود تھے۔ اور خریدنے کے لئے آمادہ۔ مالک کی ہدایت کا بھی خیال کیا۔ جرأت کر کے کچھ رد و بدل کے بعد چھ سو روپے میں 'خاک' کے پہاڑ خرید لے اور مالک کے پاس پہنچے۔ اُس نے کہا "مزدور لیجاؤ" اور تقدیر کی جستجو کراؤ" اس پر یہ بہت رنجیدہ اور پریشان ہوئے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ آخر مالک نے ان کو سمجھا کر اصرار سے مزدور روانہ کئے اور خود ان کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مزدور نے خاک کے ڈھیر میں سے ایک 'ڈبیہ' نکالی۔ سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی چھوٹی ڈبیہ تھی۔ مالک نے فوراً اسے کھولا۔ مرزا جی نے بھی اُسے دیکھا۔ اب تو حیرت و خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہنسی سے بیتاب ہو گئے۔ "ہیرے" کی چمک نے آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دی۔ مالک نے مزدوروں سے کہدیا کہ اب جو کچھ اس میں سے ملے وہ سب تم لوگوں کی قیمت ہے اور مرزا کو ہمراہ لے کر چلا آیا۔ ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال ٭ کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے۔

(۶)

اب وہی مرزا عابد ہیں جو ایک ادنیٰ مزدور کی حیثیت سے کارخانہ میں کام کرتے تھے۔ کہ اُن کے ذاتی کارخانو میں ہزاروں مزدور نظر آتے ہیں۔ "بیک گردشِ چرخ نیلوفری * کیا کیا ہو چکا ـــــ قدرت کی کاروائیاں انسانی عقل کی رسائی سے مستثنیٰ ہیں"

"پولیس کا سب انسپکٹر ـــــ میرٹھ کے ایک علاقہ کا بادشاہ" ـــــ "محتاج۔ بیکس، فاقہ زدہ "۔ بمبئی مزدور، ـــــ (قتل کے جرم میں ماخوذ) ـــــ (مالک کارخانہ امداد ربانی سے ہمدردی پر آمادہ) ـــــ جیلخانہ قیدی کی حیثیت سے ـــــ (نازپروردہ ـــــ اولاد۔ اور شریف بیوی، ٹکڑوں اور چیتھڑوں کو محتاج۔ بیکسی کے عالم میں قابلِ رحم) ـــــ پھر وہی مزدور ـــــ ایک ادنیٰ تاجر، پارچہ فروش ـــــ اور ایک گردش میں وہی ـــــ خاک بسر ـــــ خاک کے ڈھیر سے لکھ پتی ـــــ بمبئی کا رئیس التجار ـــــ "سیٹھ عابد" ـــــ جس کی کوٹھی میں سینکڑوں عمائدین شہر اور افسران پولیس "حلقۂ احباب" میں شامل نظر آتے ہیں ـــــ"

"خدائی اُس کی ہے، جس پر نظر پڑی تیری"

(مصورِ فطرت) عشرت رحمانی المجوبی

(بقیہ صفحہ ۱۵۶)

(۴) بہترین مضمون نگار کو حسب ذیل انعامات دیے جائیں گے۔

۱۔ تمغۂ شہر (سونے کا)

۲۔ ایک سو ایک (۱۰۱) روپے کی تھیلی

۳۔ مضمون کے پچاس مطبوعہ نسخے

(۵) جس مضمون پر انعام دیا جائے گا، نیز جملہ مضامین کے مجموعہ کے حقوق طبع و اشاعت بحق الناظر محفوظ رہیں گے۔ اور مجموعہ شایع ہونے سے قبل کوئی مضمون الناظر کے سوا کہیں اور شایع نہ ہو سکے گا۔

ظفر الملک ایڈیٹر الناظر

شہید تغافل

"بالم"

(بہ سلسلہ ماہ جنوری)

(۵)

کون! سلیمہ!! منظور کے منہ سے انتہائی حیرت و استعجاب کی حالت میں سلیمہ کو الٰہی بخش کے مکان پر دیکھ
بے ساختہ نکل گیا۔ سلیمہ جو منظور کو دیکھکر زینے ہی پر ٹھٹک کر ٹھہر گئی تھی جذبہ محبت و وفور اضطراب سے آنکھ
سے نہ رکنے والا سیل سرشک بہانے لگی۔ اگرچہ دونوں کے درمیان شرم و حیا کی ایک بسیط خلیج حایل تھی لیکن ا
کے دل معاملہ کی نوعیت کے سمجھنے سمجھانے میں مصروف تھے، یہ کہنا تو مشکل ہے کہ کون کہاں تک کامیاب رہا مگر
میں شک نہیں کہ حسن، عشق میں اور عشق، حسن میں مدغم ہوگیا تھا جس سے ان سرشاران بادہ حسن و عشق سے
کیفیت مخفی نہ تھی خدا جانے یہ دلچسپ منظر اور کب تک قایم رہتا اگر ماما برآمدے سے نکلکر ان متوالوں کو موقع
نزاکت کا احساس نہ کراتی۔ سلیمہ چونک کر ماما کے ساتھ نیچے چلی گئی اور منظور اس خواب پریشان سے بیدار تو ہ
اس کی تعبیر سے گھبرا رہا تھا یعنی ماما پر اصل راز کے منکشف ہو جانے پر نہایت سراسیمہ و پریشان تھا۔ کچھ دیر تک
کھڑا سوچتا رہا بالآخر ملاقاتی کمرے میں گیا۔ جہاں خوش قسمتی سے اس وقت کوئی نہ تھا جو اس کے بشرے سے اند
جذبات کا پتہ لگا سکتا۔ اس لئے اپنی حالت درست کرنے کا کافی موقعہ مل گیا۔ موجودہ واقعات پر ایک تنقیدی ن
دوڑائی کوئی پندرہ بیس منٹ کی فکر و غور کے بعد شاید وہ کسی مستقل نتیجہ پر پہنچا اور کمرے سے نکلکر نہایت مستقل مز
کے ساتھ باختہ حواس مجتمع کر کے زنانسکی طرف چلا۔

الٰہی بخش کی کوٹھی ایک پرفضا مقام پر واقع ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف ایک وسیع احاطہ تھا اسی میں ملاز
کی کوٹھی سے ملحقہ مکانات اور ایک طرف اصطبل و موٹر خانہ بنا ہوا تھا کوٹھی کے زیریں حصہ میں چند کمرے اور ایک شا
ڈرائنگ روم تھا جو کسی بڑے آدمی کی ملاقات ہی کے وقت کھولا جاتا تھا یا جب کبھی میاں رحیم بخش علیگڈھ سے چھٹیوں
پر آتے تو دوستوں کی آمد و رفت کی وجہ سے کھلا رہتا ورنہ عموماً بالائی دیوان خانہ میں ہی ملاقات لی جاتی تھی۔ اوپر
بیٹھکے میں جانے کے لئے علاوہ پشت کے زینے کے ایک علیحدہ محاذ پر بھی زینہ تھا۔ پشت کی جانب کا زینہ ملازمین و

کے لئے مخصوص تھا۔ منظور اکثر اسی زینے سے آتا جاتا تھا حسب دستور آج جب وہ اس زینے سے اوپر جا رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر سلیمہ سے مٹھ بھیڑ ہو گئی۔

زنانہ میں اجازت لیکر منظور داخل ہوا ایک صوفے پر الٰہی بخش دراز تھے اور قریب ہی ایک کرسی پر ان کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں منظور کو دیکھکر الٰہی بخش نے کہا۔ منظور! کیا وجہ ہے کہ میں تم کو کئی روز سے نہایت پریشان و متفکر دیکھ رہا ہوں؛ خدانخواستہ کہیں اندرونی مرض تو نہیں لاحق ہو گیا؟

مرض تو نہیں ہے کچھ یوں ہی سی طبیعت نڈھال اور دل پر ایک قسم کی مُردنی سی چھائی ہوئی رہتی ہے۔

اگر کام کی کثرت اور کلرکوں کی کمی ہو تو چند اور محرر عارضی طور پر رکھ لیجیے جس سے کام کا بار بھی ہلکا ہو اور کام میں سہولت بھی ہو۔ تم صرف گھنٹہ آدھ گھنٹہ ضروری کام دیکھ لیا کرو اور باقی تمام کام کے متعلق ماتحتوں کو ضروری ہدایات کر دیا کرو۔ دیکھو انشاء اللہ آیندہ ماہ مئی میں میاں رحیم بخش بھی علیگڈھ سے ایم۔ اے پاس ہو کر آ جائیں گے۔ تمہارا بہت سا کام وہ بھی انجام دیا کریں گے۔

اول تو کام کی ایسی کثرت نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو طبیعت اس سے اکتاتی نہیں ہے بلکہ فرصت اور تنہائی میں جی پریشان ہونے لگتا ہے تاہم اگر میاں آ جائیں گے تو علاوہ کاروبار دنیا سے واقف ہونے کے بہت کچھ تجارتی معاملات میں بھی تجربہ حاصل کر لیں گے جو ان کے لئے بے انتہا ضروری ہے بلکہ میرے خیال میں تو اب انہیں بہت جلد اپنے کام کو ہاتھ میں لینا چاہئے۔

ابھی تو وہ ناتجربہ کار ہیں۔ تمہارے ماتحت ایک عرصہ تک کام کریں گے۔ جب کہیں وہ تجارتی معاملات کو سمجھنے کے قابل ہوں گے۔

اس قسم کی گفتگو کے بعد کچھ کارخانے کے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔ دوران گفتگو میں منظور نے محمد حامد کے مر جانے پر بھی اظہار تاسف کیا جس پر الٰہی بخش فوراً بول اٹھے ہاں وہ چونکہ اپنا پرانا اور دیانت دار آدمی تھا میں نے برسوں سے اس کی بیوی بچوں کو بھی اپنے ہاں ہی بلا لیا ہے تاکہ وہ حامد کے مرنے اور اپنے افلاس کے تفکرات سے پریشان نہ ہوں، یہاں انہیں گھر کے آدمیوں کی طرح رکھتے ہیں اور ان سے کوئی خدمت نہیں لیتے کوٹھی کے زیریں حصہ میں ایک کمرہ بھی دے رکھا ہے۔

منظور اصل حقیقت کے ظاہر ہو جانے سے قدرے مطمئن ہو گیا مگر پھر بھی ایک خیال شدت کے ساتھ اس کو بےچین کئے ہوئے تھا جس کا تدارک بظاہر اس کے حیطہ امکان سے باہر تھا تاہم بشاش چہرہ بنا کر اپنے آقا کی اس ہمدردی کی

مردری کی بہت تعریف کی اس کے بعد وہ رخصت لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

لور کو اب یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں ماما اس کے راز کو طشت از بام نہ کر دے اور اس نے عرصہ دراز سے جن دلوں
ریفانہ کیرکٹر کا سکہ جمایا ہے کہیں بے وقعت نہ کر دے وہ اسی فکر میں آہستہ آہستہ زینہ سے اتر رہا تھا کہ اُس
ن میں کسی فوری خیال کے آتے ہی بعجلت زینہ طے کر کے سیدھا ماما کے کمرے میں گیا جہاں سلیمہ بیٹھی رو رہی تھی۔
اس کو تسلیاں اور دلاسے دے رہی تھی، منظور کی آمد پر خاموش ہوگئی ماما نے تواضع کرتے ہوئے کھٹیا پر بیٹھنے
منظور نے بغیر شکریہ ادا کئے ماما سے کچھ ایسی صورت بنا کر اور ایسے لہجہ میں جس میں انفعال وانکسار کی نمایاں
ھی کہا " دیکھو آج سے تم ہماری رازدار ہو ہماری لاج تمہارے ہاتھ ہے اگر تم نے رازداری سے کام لیا تو
جاں بلب ہستیوں کو موت کے پنجے سے رہائی دلوائی۔ اور ہم اس رازداری کے صلہ میں علاوہ زرکثیر تادم زندگی
ے احسان مند رہیں گے۔"

جو لوں بھی بہت بھلی اور با مروت تھی " زر کثیر " کا لفظ سنکر بشاش ہوگئی اور کہنے لگی بیٹا تم بے فکر رہو۔ ایسے
اروں راز ہائے سربستہ میرے سینے میں محفوظ ہیں کیا مجال ہے کہ کسی کو اس کی ہوا بھی لگنے پاتے۔ میں کب سے
دی کو بھی یہی سمجھا رہی ہوں مگر ان کو تو شاید آج ہی جی بھر کر رونا ہے جو چُپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں ہر چند
دلاتی ہوں مگر یہ ہیں کہ ٹسوے بہاتے ہی چلی جاتی ہیں اور کسی صورت سے رونا نہیں چھوڑتیں۔

ظور نے سلیمہ سے کسی قدر قریب آ کر کہا کہ اب ہمیں کوئی خوف وہراس نہیں ہے بلکہ ہمیں جیسی ایک مشفقہ راز دار
ت تھی خدا نے ویسی ہی ملا دی ہے۔ انشاء اللہ اب بہت جلد ہم ان قیود وسلاسل سے یک لخت آزاد
ں گے۔

کے بعد ماما کے ہاتھ میں چند نوٹ دے کر گھر کی طرف چل دیا۔

(۶)

لور رات بھر اسی کشمکش و پیچ میں رہا کہ کیونکر سلیمہ کو اپنے آقا کے گھر سے علیحدہ کرلے جب کہ اس نے محض از روئے
دی و غمخواری ان کو ورطۂ آفت سے نکال کر اپنے زیر سایہ آرام وراحت سے لا رکھا ہے، اس صورت میں سلیمہ یا
اماں اصغری کی الٰہی بخش کے ہاں سے علیحدگی نہ صرف احسان فراموشی ہے بلکہ خوان نعمت ہے، اور خود الٰہی بخش
ن کی یہ حرکت ناگوار گذرے گی پھر کون سی ایسی تدبیر کی جائے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔
ظور کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے سلیمہ سے مل کر اس کے مافی الضمیر سے واقف ہونا ضروری خیال کرتا تھا چنانچہ دوسرے

روز شام کو پھر ماما کے کمرے میں گیا ماما بیٹھی کچھ سی رہی تھی منظور کو دیکھکر سینا چھوڑ دیا اور کہنے لگی آپ بڑی دیر سے آسکتے میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ منظور نے بجائے اس کے سوال کا جواب دینے کے کہا اگر سلیمہ یہاں آسکتی ہو میں اس سے کچھ دیر کے لئے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں کیا تم انہیں یہاں بھیج سکتی ہو؟ ہاں بھیج تو سکتی ہوں ماما نے کہا مگر مشکل یہ ہے کہ اس وقت وہ اور اُن کی اماں بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں دیکھیئے میں اوپر جاتی ہوں موقعہ ملا تو بھیجدوں گی مگر آپ ذرا احتیاط سے کام لیں۔

ماما یہ کہہ کر اوپر چلی گئی اور منظور پوشیدہ طور پر کمرے میں بیٹھا ہوا انتظار کرنے لگا۔ کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی منظور کا بیقرار دل خوشی سے سینے میں بلیتوں اچھلنے لگا۔ سلیمہ نہایت سہمی ہوئی دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ منظور اس کو دیکھ کر کچھ ایسا مرعوب ہوگیا کہ چند لمحوں تک اس پر سکر کی ایسی کیفیت طاری رہی پھر لجاجت سے آبدیدہ ہو کر کہنے لگا:۔

پیاری سلیمہ! میں اس وقت اظہار محبت کرنے نہیں آیا اور نہ اب اس کی چنداں ضرورت ہے اس لئے میں بلا کسی تمہید کے صاف صاف مطلب عرض کرتا ہوں کہ کیا آپ مجھے اپنی غلامی کا شرف بخشنے کو تیار ہیں؟ تاکہ میں کسی نتیجہ پر پہنچکر کوئی مُناسب انتظام کرسکوں اور اپنے مستقبل کو خوشگوار بنا سکوں۔

سلیمہ ایسی ناسمجھ نہ تھی جو اس کھلے ہوئے پیغام مسرت کو نہ سمجھ سکتی لیکن جواب دینے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ نسوانی شرم اُس پر غالب تھی۔ اس لئے بدستور نیچی گردن کئے خاموش ہی کھڑی رہی، منظور نے بیتاب ہو کر پھر کہا:۔

دیکھیئے وقت بہت کم ہے "خموشی کی نیم رضا" سے میں نیم جان رہنا نہیں پسند کرتا۔ میں آج اپنی زندگی کا فیصلہ صاف الفاظ میں آپ کے لبِ نازک سے سُننا چاہتا ہوں۔ میری حیات و موت کا انحصار آپ کی جنبشِ لب پر موقوف ہے لہذا میں صاف صاف سُننا چاہتا ہوں کہ آیا مجھے آپ کی غلامی کا شرف حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں!!

یہ کہکر منظور نے بچشم نم اپنا سر اس کے قدموں میں ڈال دیا، سلیمہ جلدی سے اپنے گرم اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُٹھا کر بولی" مجھے شرمندہ نہ کرو میں ہمیشہ سے آپ کی ہوں اور ہمیشہ آپ کی رہوں گی"۔

یہ فقرہ روح پرور سُن کر منظور کی آنکھوں سے اشک مسرت کا دریا اُمنڈ آیا اور سلیمہ نے بھی اشکبار و بیقرار ہو کر اپنے تئیں اس کی آغوش کے سپرد کر دیا۔

کچھ دیر کے لئے یہ دونوں سرشار بادۂ الفت دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر کسی اور ہی عالم میں پہنچ گئے اس وقت عشق کا پرلذت درد محبت چکاں دلوں کو ایسا مزا دے رہا تھا کہ گویا آج ہی یہ دو جانیں ایک قالب ہو کر حیات ابدی حاصل کر لینگی۔ مگر ماما کے پاؤں کی چاپ نے نہیں اُس کے کھنکھارنے کی آواز نے ان خود فراموشان محبت کو ایک دوسرے سے اس طرح علیحدہ کیا جس طرح شاخ سے گل اور گل سے بلبل جدا ہوتے ہیں۔

ماما کی آمد پر یہ دونوں اپنی اضطراری کیفیت سے اس قدر منفعل و محجوب تھے کہ زمین پر گڑھی ہوئی نظریں اوپر کو نہیں اٹھا سکتے تھے آخر ماما نے سلیمہ سے کہا تمہاری اماں کسی کام سے نیچے آرہی ہیں تم لپک کر اپنے کمرے میں چلی جاؤ ورنہ غضب ہوگی" سلیمہ سنبھلی آنکھوں سے آنسو خشک کئے اور لباس درست کر کے جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ منظور نے جو اپنی جگہ پر خفیف ہو رہا تھا ماما سے دریافت کیا میرے یہاں ہونے کا تو کسی کو علم نہیں ہوا؟

کسی کو کیسے علم ہو سکتا ہے ماما نے کہا جب کہ میں نے کسی سے کہا نہیں ہے بلکہ اصغری نے کئی مرتبہ اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن میں ہر بار ایک نہ ایک ایسی بات یا سوال کر بیٹھتی تھی کہ وہ جواب دینے کے لئے مجبور ہو جاتی تھی (بات کا پہلو بدل کر اور ذرا خندہ رو ہو کر) کہئے آج تو خوب مرادیں بر آئیں؟

یہ سب تمہاری عنایت ہے منظور نے کہا ورنہ ایسا موقع شاید قیامت تک ہاتھ نہ آتا (جیب میں ہاتھ ڈال کر) یہ لو اپنی خدمت کا صلہ، میں ذرا اوپر ہو آؤں تم مجھے پھر یہیں ملنا۔

اس کی کیا ضرورت ہے ماما نے کسی قدر لجاجت سے کہتے ہوئے بیس روپے کے نوٹ لے لئے۔

الٰہی بخش اور چند مہاجن ملاقاتی کمرے میں بیٹھے ہوئے کسی لین دین کے معاملہ پر گفتگو کر رہے تھے کہ منظور آ گیا جس کو دیکھ کر الٰہی بخش نے کہا لو یہ آ گئے اب ان سے گفتگو کیجئے۔ اس معاملہ میں انہیں کو کلی اختیار ہے، یہ کہکر الٰہی بخش تو زنانہ میں چلے گئے اور منظور ان سے بات چیت میں مصروف ہوا مگر بہت جلد اس معاملہ کو رفع دفع کر کے الٰہی بخش سے زنانہ میں آ کر ملا معاملہ معلومہ کے متعلق اختصار میں سمجھایا پھر کارخانہ اور دفتر کی مختصر سی کیفیت بیان کر کے منظور پھر ماما کے کمرے میں آیا۔

سلیمہ اپنی والدہ کے چلے جانے کے بعد فوراً ہی بن سنور کر آ گئی تھی ماما اوپر کام کاج میں مصروف تھی۔ اس لئے سلیمہ خوش ہو رہی تھی کہ اب جی بھر کر پیار و محبت کی باتیں ہوں گی تنہائی پا کر منظور بھی مصروف ہوا کہ۔ اظہار خیالات کا یہ موقعہ غنیمت ہے۔

اس وقت سلیمہ کے حسن پر بلا کا نکھار تھا۔ دلکش اداؤں کے ساتھ بناؤ سنگھار نے اس کی رعنائیوں کو دوبالا کر دیا تھا۔

منظور کو دیکھکر اول تو زیر لب متبسم ہوئی پھر فوراً ہی نیچی گردن کرکے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی، منظور کو اس ادا نے مار ہی تو ڈالا اگر اس وقت منظور کی بجائے اور کوئی ہوتا تو وہ بے اختیار ہو کر سلیمہ سے چمٹ جاتا مگر منظور کے جسم میں شرافت کا خون تھا اس لئے یہ حرکت تو نہ کی مگر اتنا تو کہہ ہی دیا کہ :-

مجھے ہلاک کرنے کے لئے کیا سادگی کم تھی جو اس پر یہ آرائش کرکے مجھے کھو دینے کا سامان کیا گیا ہے۔

پیاری سلیمہ! اب میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جلد تم کو اپنے گھر کی ملکہ بنا کر اپنے کلبہ احزاں کی رونق بڑھاؤں، کیا واقعی تم اپنے اس غلام کو اس قابل سمجھتی ہو؟!

میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب بھی یہی کہتی ہوں کہ سلیمہ ہمیشہ سے آپ کی ہے اور ہمیشہ آپ کی رہے گی"

اگر یہی ہے تو اب بہت جلد تمہیں اس مکان کو چھوڑ دینا چاہتے میں یہاں کچھ نہیں کر سکتا۔

یہاں آنے کے بارے میں اماجان تو سخت خلاف تھیں لیکن میں نے محض اس خیال سے کہ اس بہانہ سے کبھی کبھی آپ کی صورت زیبا کے دیکھنے کا موقع تو مل جائیگا اپنی والدہ کو بیگم صاحبہ کے بلانے پر یہاں آنے کے لئے رضامند کر لیا۔ ورنہ ہم اپنی محنت مزدوری کو عیش و راحت پر ترجیح دیتے ہیں اور دال روٹی کو من سلوا سمجھتے ہیں اور اس زندگی سے اس کو بہتر خیال کرتے ہیں۔

جب تو اب بھی تم اپنی والدہ کو یہاں سے گھر چلنے پر رضامند کر سکتی ہو؟

ہاں میں ضرور ایسا کر سکتی ہوں مگر پھر..........

تم اطمینان رکھو میں نے سب سوچ لیا ہے کل میں خود بھی تمہاری والدہ سے آکر ملوں گا۔

قند پارسی

(جناب بختی خاں صاحب سرخوش شادانی رامپوری ہیڈ مولوی گورنمنٹ سکول مظفر نگر)

شوق چوگاں چو میداں بہ برد جاناں را — عاشقاں گوئے بباز ند سر خود شاں را
نیک سہل است کہ سیلاب برد بنیاں را — عشق رسوائے محبت بکند انساں را
ترس از گریۂ خونین من اے سنگیں دل — پرورد قطرۂ اشکم بہ بغل طوفاں را
وائے آں قوم کہ بیگانہ رود از رہ عشق — خبر از عالم انساں بتود حیراں را
ساقیا خیز کہ آمد ز حرم شور اذاں — مژدۂ عیش بدہ مطرب خوش الحاں را

ہر کرا قطرہ ز ابر کرمش حاصل شد
ہمچو سرخوش بہ پشیزے نخرد عماں را

دیگر

(جناب نواب حسین نواز جنگ بہادر خسرو ادل تعلقدار (کلکٹر) ضلع گلبرگہ)

دم ز نسیم چوں زنم بوئے نگار کے رسد — در دل بے قرار من صبر و قرار کے رسد
من بجمال روئے تو از ہمہ چیز فارغم — چہرۂ ماہ بر فلک گرد و غبار کے رسد
در د ترا ست آرزو زاں گل و لالہ می دمد — در دل غم رسیدہ را تازہ بہار کے رسد
زلف و رخ تو در دلم کیفیتے کہ می دہد — سنبل و گل چہ سر زند لیل و نہار کے رسد
گردش چشم تو مرا ساغر نو کند عطا — مست سرور عیش را رنج خمار کے رسد
عارض شمس را اگر جلوہ شود از قمر — جلوۂ نازنین من در شب تار کے رسد

جذب وفا چہ کردہ بر من دل کہ گفتہ است
خسرو جاں نثار من سینہ فگار کے رسد

ہلالِ عید

اے ہلالِ عید، کشتیِ فلک، ابروئے حور — اے کلیدِ شادمانی، جامِ صہبائے سرور
موجِ دریائے کرم، محرابِ ایوانِ سخا — تارِ گیسوئے زرافشاں ناخنِ حسرت کُشا
لذتِ نظارہ حاصل تجھ سے چشمِ شوق کو — اور اک کیفِ سکوں میرے دلِ پُر ذوق کو
ہر برس جب روئے زیبا اپنا دکھلاتا ہے تو — اک بشارت اہلِ دُنیا کے لئے لاتا ہے تو
اب کے تیرے آئینہ خانہ میں جو تنویر ہے — اس میں ہندوستاں کے مستقبل کی اک تصویر ہے
دے رہے ہیں جس کے خط و خال پیغامِ حیات — سوئے شرق ہو رہی ہے گردشِ جامِ حیات

ہو چکے سب سیر گو تیری شعاعِ نور سے
ایک شاعر ہے کہ بیٹھا تک رہا ہے دور سے

محمود (اسرائیلی)

کشف کاشف

(۱) سوزِ دل میں کیفیت آنکھوں کے پیمانے میں ہے
شمع کی تنویر، دو صورت سے پروانے میں ہے
(۲) مجتمع جس سے رہا شیرازۂ رنگ و ضو
منتشر اب وہ بہارِ داغ ویرانے میں ہے
(۳) وہ کڑی، تھا ربط جس کا قیس کی زنجیر سے
سلسلہ در سلسلہ، اب میرے افسانے میں ہے
(۴) سنگ ریزے ہیں حنائی سرخ ہیں لب ہائے خار
نکہتِ تقسیمِ بہارِ زخم ویرانے میں ہے
(۵) میں تو واعظ خونِ دل پیتا ہوں اک انداز سے
تو سمجھ افسردۂ انگور پیمانے میں ہے

کاشف (اکبر آبادی)

نوائے سروش

نام ہی نام ہو جس کام میں وہ کام نہ کر
کام کر، کام سے پہلے ہوسِ نام نہ کر

تیرے انجام میں پنہاں ہیں ہزاروں آغاز
اپنے آغاز کو وابستۂ انجام نہ کر

دل کو وسواس و خیالات کا مرکز نہ بنا
اپنے اس گھر کو کبھی رہ گذرِ عام نہ کر

ایک دن منزلِ مقصد تجھے مل جائیگی
جادۂ پیمائی میں فکرِ سحر و شام نہ کر

کامیابی کی تمنا ہے اگر دل میں تیرے
طلبِ عیش نہ کر خواہشِ آرام نہ کر

ثروت و عزتِ دنیا کو نہ دے دل میں جگہ
حرمِ قدس کو بازی گہِ اصنام نہ کر

کامرانی کی نمودار ہوئی جس سے سحر
اپنے اس دل کو تو خورشیدِ لبِ بام نہ کر

انتظارِ مے و ساغر بھی خمار آگیں ہے
بزمِ ساقی میں کبھی تذکرۂ جام نہ کر

قیصر (از بھوپال)

حسیاتِ فکری

تڑپتی ہے شہادت کے لیے میری رگِ جاں تک
مگر بھی کھچا رہتا ہے مجھ سے اُن کا پیکاں تک

یہ کس مظلوم کی لاش آئی ہے گورِ غریباں میں
ہیں جس کے خون سے رنگین ذراتِ پریشاں تک

مٹا ڈالیں وہ میرے نقشِ ہستی کو مٹا ڈالیں
اُلٹ دیتی ہیں جو نظریں بساطِ بزمِ امکاں تک

مما وحشت میں بھی رسمِ عام کا پیرو نہیں ہوتا
ہے ورنہ فاصلہ ہی کیا میرے گھر سے بیاباں تک

یہی وہ دل ہے جس میں بھیڑ رہتی تھی اُمنگوں کی — دفورِ یاس سے اب لاپتہ ہیں شوق و ارماں تک
مجھے ہمدم سکونِ قلب حاصل ہو تو کیوں کر ہو — ہٹائے سے نہیں ہٹتے خیالاتِ پریشاں تک
وہاں میرا قفس صیاد نے کچھ سوچ کر رکھا — جہاں سے جا نہیں سکتے ہیں نالے بھی گلستاں تک

کسی کو کیا خبر فکری مرے حالِ پریشاں کی
مرے نالے تو ہیں محدود دیوارِ زنداں تک

فکری (از بھوپال)

حجابات

نالہ مضرابِ محبت کے لئے اک ساز ہے — سر سے پا تک درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہے
دل سراپا درد ہے اور وہ سراپا ناز ہے — حسن کی فطرت میں سنتے ہیں کوئی اعجاز ہے
دیکھنے کے قابل ہیں حسن و عشق کی نیرنگیاں — ایک پابندِ خلش ہے ایک محوِ ناز ہے
آستانِ دوست سے اُٹھنے کی طاقت ہی نہیں — میری قسمت کو مری واماندگی پر ناز ہے
شوقِ موسیٰ بے خطا ہے جوشِ حیرت بے قصور — گرمیٔ ہنگامہ اُس کا شعلۂ آواز ہے
لوگ کیوں سمجھے ہوئے ہیں درد کا انجام موت — اب ہمارے داستانِ زیست کا آغاز ہے
کیوں کھچا جاتا ہے دل کیوں روح میں ہے اضطراب — کون دیتا ہے صدائیں کس کی یہ آواز ہے
اُس طرف پردے میں بیتاب اشاعت حسنِ دوست — اس طرف آنکھوں کے آگے اک حجابِ ناز ہے
کیا جواب اے ضبطِ غم بے اختیاری کا مری — جب شکستِ رنگ ہی آئینہ دارِ راز ہے
ذوق پیدا کر کے ڈال ان سب پہ اک گہری نگاہ — عالمِ امکاں کا ہر ذرہ سراپا راز ہے

اضطرابِ روح اب دیکھا نہیں جاتا امینؔ
نغمے سب خاموش ہیں وقتِ شکستِ ساز ہے

امینؔ سلونوی

کیفیات

(رُباعیات)

سب راز فنا اور بقا کا معلوم　　یہ بود و نبود کا تماشہ معلوم
اے کیفؔ سراب ہے یہ سیلاب جہاں　　رنگینی ہنگامۂ دُنیا معلوم

ڈوبی ہوئی کیفیت میں ہستی مری　　بکھری ہوئی نگینوں میں مستی میری
اللہ رے تاثیر جنوں زائی کیف　　ہمدوش فلک ہے آج پستی میری

کیوں کہتے ہو چہرہ سے نقاب اُٹھتا ہے　　کہدو کہ نگاہوں سے حجاب اٹھتا ہے
کچھ بھی نہیں اے کیفؔ اگر سچ پوچھو　　اک پردۂ نیرنگ سراب اُٹھتا ہے

روداد چمن بھی گلفشانی میری　　قصہ تھا دو عالم کا کہانی میری
جب پردہ اٹھا تو یہ سمجھ میں آیا　　اک "عالم کیف" تھی جوانی میری

کیفؔ (مرادآبادی)

کارفرمائی عشق

ں میں عشق کی چاروں طرف کیسی حکومت ہے　　ہر اک دل کو یہاں اک دوسرے کے دل سے نسبت ہے
ن درد دل کے واسطے جاں بخش صحت ہے　　یہ روح قالب بے جاں ہے جانِ آدمیت ہے
ازل سے تا ابد ہے کارفرما سارے عالم میں
خدا تم جس کو کہتے ہو وہ خود بھی اک محبت ہے

اخترؔ (جوناگڈھی)

آلودہ معصیت

اے خالقِ بےہمتا ۔ رحمٰن و غنی یکتا
حنان و غنی یکتا
سبحان و غنی یکتا
منان و غنی یکتا
برہان و غنی یکتا
دیان و غنی یکتا
سلطان و غنی یکتا
کر نظرِ کرم شاہا ۔ ہوں بےکس و بیچارہ
آلودہ معصیت

کی تو نے مدد یارب ۔ سنج و غم و حرماں میں
جب نوح کی طوفاں میں
ایوب کی حرماں میں
یعقوب کی احزاں میں
محبوس کی زنداں میں
پھر میں غم درماں میں
کب تک رہوں ارماں میں
ہاں رحم میرے اللہ ۔ مجبور رہوں ناکارہ
آلودہ معصیت

گم کردہ و بےکس ہوں ۔ حیران و پریشاں ہوں
آلودہ عصیاں ہوں
وقفِ غم و حرماں ہوں
مجبور ہوں گریاں ہوں
بگڑا ہوا ایماں ہوں
اُجڑا سا گلستاں ہوں
اب سر بہ گریباں ہوں
آخر ترا بندہ ہوں ۔ بندہ بھی قدکا ہارا
آلودہ معصیت

اللہ کرم فرما ۔ دل ریش ہوں گریاں ہوں
نادم ہوں پشیماں ہوں
رحمت پہ میں نازاں ہوں
جو کچھ ہوں مسلماں ہوں
ہاں صاحبِ ایماں ہوں
میں اور پریشاں ہوں
کس واسطے حیراں ہوں
ہاں نگہِ کرم شاہا ۔ بر بندۂ آوارہ
آلودہ معصیت

جلووں سے ترے یارب ۔ معمور بیاباں ہے
پُر نور گلستاں ہے
کیفیت بُستاں ہے

رحمت کے تصدق میں ۔ توفیق عطا کر دے
سرشار وفا کر دے
دل قبلہ نما کر دے

آئینۂ امکاں ہے — رحمت کی گھٹا کر دے
خورشید درخشاں ہے — توحید بپا کر دے
گویا مہ تاباں ہے — نالہ کو رسا کر دے
شاہد میرا ایماں ہے — مقبول دعا کر دے
محروم رہے یارب - کیوں طالب نظارہ — پھر کفر مٹا ڈالے - اک خستہ ناکارہ
آلودہ معصیت — آلودہ معصیت

اسلام کی الفت دے - اور اپنی محبت دے — احمدؐ کے تصدق میں - بے لوث صداقت دے
مسلم کو اقامت دے — کفار کو ذلت دے
کچھ نفس پہ قدرت دے — اسلام کو عزت دے
ایمان کی دولت دے — گلبانگ مسرت دے
احساس ندامت دے — مسلم کو وہ طاقت دے
خوددار صداقت دے — ہر عزم میں وسعت دے
اسلام کو رفعت دے — ہر شان میں شوکت دے
مقبول دعائیں کر - ہوں بیکس و بیچارہ — ہاں کفر مٹا ڈالے - اک خستہ ناکارہ
آلودہ معصیت — آلودہ معصیت

عشرت رحمانی المجبوبی (رامپوری)

شباب رفتہ کی یاد میں

وہ ساعتیں مزہ کی وہ خوشگوار گھڑیاں — حسرت مجھے کسی کی میرا کسی کو ارماں
عہدِ شباب تک تھا لطفِ شباب اپنا — اب میں ہوں اور دل میں رنج و الم کی دنیا
تو اے شبابِ رفتہ ارمانِ زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

یادِ شباب دل میں رہ رہ کے آرہی ہے — اور آٹھ آٹھ آنسو مجھکو رُلا رہی ہے
اس طرح بھی کسی کی بن کر بگڑ نہ جائے — دشمن کو بھی نہ ایسا صدمہ خدا دکھائے

تو اے شباب رفتہ ارمانِ زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

تو کیا گیا کہ مجھکو برباد کر گیا ہے — جب تو نہیں تو ایسے جینے کا لطف کیا ہے
مر مر کے زندگانی کرنے سے فائدہ کیا — میں اس طرح جیا بھی تو زیست کا مزا کیا

تو اے شباب رفتہ ارمانِ زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

میں مست و بیخبر تھا نشہ میں تیرے ایسا — دنیا کی فکر تھی کچھ مجھکو نہ خوفِ عقبیٰ
اب فرطِ غم نے میرا سینہ میں دم رُکا ہے — اک رنگ آرہا ہے اک رنگ جا رہا ہے

تو اے شباب رفتہ ارمانِ زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جان زندگی تھا

مجھ سے جدا ہوا ہے جب سے شباب میرا — دل غم سے ہو گیا ہے جل کر کباب میرا
بارِ دگر جو اس کی مجھ تک نہ ہو رسائی — تو بھیجدے الٰہی مجھکو کسی کی آئی

تو اے شباب رفتہ ارمانِ زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

بس اے اثر نہ رو تو اس بیوفا کا رونا — ہو کر کبھی کسی کا ہرگز نہیں یہ رہتا
اس پر ہی منحصر کیا اس کا ہی کیا گلا ہے — دایم کوئی کسی کا ہو کر نہیں رہا ہے

تو اے شباب رفتہ ارمان زندگی تھا
ارمانِ زندگی تھا یا جانِ زندگی تھا

اثر رامپوری

قرض

قرض ہرگز نہ لو کہ آفت ہے — اس کا انجام اک مصیبت ہے
سمجھو اس کو نہ تھوڑی سی زحمت — زحمتوں میں ہے یہ بڑی زحمت
مفلسی ہے بلا خدا کی پناہ — کر ہی دیتی ہے آدمی کو تباہ
خیر کیا مفلسی میں کوئی کرے — ہے ملک گر بشر بچے شر سے
خرچ آمد سے کم کرو بھائی — تا نہ افلاس سے ہو رسوائی
ہے کفایت شعاری اچھی شے — مطمئن اس سے قلب رہتا ہے
آپ کو جب تم سنبھالو گے — کام غیروں کے کیا نکالو گے

پہلے ہو جاؤ اپنے آپ معین
پھر کرو غیر کی مدد بھی ذہین

ذہین (حیدرآباد)

عمر کی گھڑی

زندگی وہ ہے جو صلح و آشتی میں کٹ گئی — ہے غنیمت وہ گھڑی جو بندگی میں کٹ گئی
غور کر کیا فائدہ ہے ظلم و نخوت سے ذرا — سوچ غافل عمر سب تیری اسی میں کٹ گئی
اے بشر تو دل کو ہر دم نیکیوں سے شاد کر — یہ سمجھ پھر عمر سب عیش و خوشی میں کٹ گئی
دن وہی ہے جس میں خالق کی عبادت ہو گئی — رات وہ ہے رات جو یاد نبی میں کٹ گئی

کیا عبادت وقت پیری ہو سکے تم سے عزیز
حیف ہے ساری جوانی دل لگی میں کٹ گئی

عزیز (از حیدرآباد)

غزلیات

(جناب سید محمد شمس الحق صاحب خیال۔ وکیل عدالت رام پور)

سر میں جو سمایا مرے سودائے محبت
بیساختہ دل بول اٹھا ہائے محبت

مجنوں ہوں۔ بجا ہے مجھے دعوائے محبت
حصہ میں مرے آئی ہے لیلائے محبت

دشمن کو بھی دیکھا تو نظر دوست ہی آیا
اللہ ری یک رنگیٔ دنیائے محبت

کیا جانے کوئی اہلِ محبت کے شرف کو
خورشید ہے ہر ذرۂ صحرائے محبت

آزاد کیا فکر سے کونین کی مجھ کو
قربان ترے نشۂ صہبائے محبت

سر کی نہ خبر رہتی ہے انسان کو نہ تن کی
جب جوش پر آتا ہے یہ سودائے محبت

جب دل بھی عزیز آپ کو ہے جان بھی پیاری
باطل ہے خیال آپ کا دعوائے محبت

از ابوالافتخار سید عبدالغفار فخرؔ حیدرآبادی (ہند)

دفعِ لب تشنگیٔ قتل مقدر میں نہیں — قطرۂ آب جو قاتل ترے خنجر میں نہیں
حسرتِ لذتِ آزادِ دلِ زار پہ حیف — تابِ مشقِ ستم آرائی ستمگر میں نہیں
عزمِ ساقی کی تواضع مرے دل میں کیا ہو — مَے کی اک بوند بھی صد حیف کہ ساغر میں نہیں
بحرِ زخار ہے گر دل تو اُمنگیں موجیں — ایک طوفان ہے شوریدگی اس سر میں نہیں
عرضِ ارمانِ دلی۔ شرحِ تمنائے وصال — اور کچھ اس کے سوا شوق کے دفتر میں نہیں
ان سے کچھ کہہ کے میں اکبار جو ہوں مہر بلب — جانتا ہوں کہ مزہ عرض مکرر میں نہیں
تیری اک حشر خرامی سے ہیں سو حشر بپا — فتنہ پردازیاں یہ فتنۂ محشر میں نہیں
کیوں نہ ہو دشت نوردی کا جنوں سر پہ سوار — کوئی دلچسپی کا ساماں ہی جب گھر میں نہیں

ضبطِ بےتابیٔ ارماں کی ہے کوشش بیسود
تاب اے فخرؔ اب اتنی دلِ مضطر میں نہیں

"غزل"

از "تبسم نظامی" (ع)

طور ہی کیا کیفِ حسنِ دید سے بیہوش ہے — میری آنکھوں پر بھی طاری حیرت خاموش ہے
حسنِ پنہاں کارسازِ جذبۂ مدہوش ہے — پیشِ محمل "قیس" مثلِ آہوئے خاموش ہے
انتہائے یاس نے ناکامِ اُلفت کر دیا" — ذرہ ذرہ میری دنیا کا وبالِ دوش ہے
آسماں کی گردشوں کے ساتھ ہے دورِ نشاط — ساغرِ دل میں ازل سے بادۂ سرجوش ہے
کیوں نہیں آتا حقیقی" نغمۂ دل تا بہ گوش — کیا نفس کا زیر و بم صوتِ حقیقت پوش ہے
درد کی وہ کیفیت جاتی رہی اب کیا کروں — آج دُنیائے تمنا محشرِ خاموش ہے

منکشف یوں گلفشانیٔ "تبسم" ہوگئی
حسن" اکثر برگِ گُل کی اوٹ میں روپوش ہے

جناب شیخ محمد میاں صاحب ضیاؔ اے صدیقی منگرولی ہیڈ ماسٹر مدرسہ زینت الاسلام (راولپنڈی)

تمنا ہے کہ دل جب ہی سے جانِ پُر الم نکلے — چلے رُک رُک کے خنجر حلق پر تھم تھم کے دم نکلے
جو ہم بت خانہ سے تفریح کو اُس سمت جا پہنچے — حرم سے بہرِ استقبال اربابِ حرم نکلے
یہ ہے ارمان دُونا لطف حاصل ہو شہادت کا — ہمارے قتل کو نکلے تو شمشیرِ دو دم نکلے
نہ پورے اُترے آخر آپ اقرارِ محبت میں — غلط سرکار کے سب وعدہ و قول و قسم نکلے
نظر آتے تھے کتنے بھولے بھالے عہدِ طفلی میں — مگر ہو کر جواں تم تو غضب نکلے ستم نکلے
فدا ہونے کو پھر مر مر کے زندہ ہوتے جاتے ہیں — قتیلِ تیغِ حسرت تیرے کتنے تازہ دم نکلے

یقیں ہے خاتمہ میرا مَعَ الایمان ہو جائے
محمد لب سے گر نامِ محمد مرتے دم نکلے

(خاکسار خوشتر منگرولی اڈیٹر رسالہ ہذا)

یادِ زلفِ بُتِ خود کام ہوتی جاتی ہے — کارگر تیرگیِ شام ہوئی جاتی ہے
جلوہ گر ہو کے دکھاتے نہیں کیوں اپنا جمال — بیٹری بیٹر تہِ بام ہوئی جاتی ہے
ہائے کس طرح کٹے گی شبِ تاریکِ وصال — گُل مری شمعِ سرِ شام ہوئی جاتی ہے
دور ہے منزلِ مقصود ابھی کالے کوسوں — راستہ ہی میں مجھے شام ہوئی جاتی ہے
غیر پر بھی نگہِ مہر لگی ہے ہونے — جو نظر خاص تھی وہ عام ہوئی جاتی ہے
زاہدِ خشک کا بھی ہاتھ بڑھا جاتا ہے — دُخترِ رز بزم میں بدنام ہوئی جاتی ہے

مہرباں ہیں جو ولیعہد بہادر خوشتر
رُخصت اب گردشِ ایام ہوئی جاتی ہے

تنقید و تبصرہ

اُردُو کے رسالے

رریویو کرنے کے متعلق مؤقر ہمعصر "خیابان" (لکھنؤ) کی اس رائے سے اگرچہ ہم متفق ہیں کہ :۔ "صرف قدیم
بر رسایل پر تنقید کریں جدید رسایل کا قدیم پر تنقید کرنا کچھ لا حاصل ہی سا ہے" ہمعصر مذکور تو اس "شناگستری"
م شکنی کر کے خارج از جماعت اور ملحد ہو گیا۔ لیکن اگر ہم بھی موجودہ دورِ صحافت کی اس "تقلیدی سنت"
ن کریں تو خوف ہے کہ کہیں مذہب صحافت کے 'مفتیانِ ادب' کے نزدیک 'غیر مقلد' نہ قرار پائیں۔
اس کورانہ تقلید' پہ کاربند ہوتے ہیں۔

رسایل پر ریویو کرنے کے مروجہ اور مخصوص طریقے سے ہمیں سخت اختلاف ہے۔ اس طریقۂ تنقید میں خواہ
رردی مضمر ہو خواہ حوصلہ افزائی' یا "تو من تُرا حاجی بگویم' کا راز پوشیدہ ہو یا اپنے عیوب کی پردہ پوشی
ہی ہو مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ طریقہ ہے نہایت ہی ناپسندیدہ اور اصول تبصرہ نگاری
ملاف، ہم اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر بلند آہنگی سے کہہ سکتے ہیں کہ آج تک "زبان" پہ معزز معاصرین
نہ افزا تبصرے کئے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اصول تبصرہ نگاری کو مدنظر رکھ کر کیا گیا
ے ایک ہی راگ الاپا ہے اور سب نے ایک زبان ہو کر اس کی مدح سرائی کی ہے، مگر کسی نے بھی اس کے
رف ہماری توجہ منعطف نہیں کرائی حالانکہ ہم اپنے عیوب اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔

سے رسالے ایسے ہیں جن کا نہ کوئی نصب العین ہے اور نہ کوئی مقصد، ہاں "علمی و ادبی" کے دعویدار ضرور
ہ اس دعوی کی تصدیق کے لئے رسالہ اٹھا کر دیکھا جاتا ہے تو دعوے کی قلعی کھل جاتی ہے۔ کیونکہ اکثر مدیران
یاز نوعیت مضامین مختلف مضامین سے رسالہ کو پُر کر کے اپنے فرائض ادارت سے سبکدوش ہو جاتے
بر ایک طرف جدید انشاء پردازوں کی حوصلہ افزائی کو مدنظر رکھتے ہیں اور ملک میں ادبی مذاق کو وسعت دینے
ں کرتے ہیں تو دوسری طرف بے نتیجہ اور غیر مفید بلکہ اخلاق سوز لٹریچر کا ادب اردو میں اضافہ کرتے ہیں
ن رسایل اس عام کلیہ سے مستثنیٰ ہیں ان میں سے علاوہ دیگر کار آمد و مفید رسایل کے "شمع" آگرہ
ن پر کار آمد و مفید ہونے کا اطلاق جائز ہو سکتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ محمد حبیب صاحب اور حسن عابد

صاحب جعفری ایسے دو قابل آکسن، اور بار ایٹ لا کے ہاتھوں ہر ماہ بزم علم و ادب کو اپنی ضوفشانیوں سے منور کرتا ہو۔

"شمع" کا زیر تبصرہ فروری نمبر مرزا محمد اسمٰعیل خاں صاحب دیوان ریاست میسور اور آصف جاہ نواب ابوالمنا خاں معتمد جنگ کی تصاویر سے مزین کیا گیا ہے اور جن کے متعلق مدیران رسالہ کی جانب سے مضامین بھی لکھے گئے ہیں۔

مضامین میں محکومیت نسواں، قرون وسطیٰ میں ہندوستان کے براہ خشکی بار برداری اور آمد و رفت کے ذرائع، شمع مزار، اور شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا پایہ اردو ادبیات میں، اچھے مضمون ہیں۔

پہلا مضمون جارج اسٹوارٹ مل کے انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے اگرچہ اس مضمون کی ہم نے اگلی دو قسطیں نہیں دیکھیں تاہم اس آخری قسط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے یورپی نقطہ نگاہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "عورتیں مردوں کی طرح ہر جائز پیشہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں، سرکاری اور کاروباری کاموں میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لے سکتی ہیں۔ سیاسیات کے پیچیدہ عقدہ حل کر سکتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہندوستانی ان کو اس قابل نہ سمجھ کر بلکہ ناقص العقل خیال کر کے ان کاموں سے باز رکھتے ہیں اور انہیں مساوی حقوق نہیں دیتے۔ اور اس جنس بے کس کو گھریلو زندگی کے تاریک ایام بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

شاید یہ مضمون اُن مغرب پرستوں کے لئے جو یورپ کی اندھا دھند تقلید کی لعنت میں گرفتار ہیں کارآمد ہو مگر ہم "ہندوستانی مسلمانوں" کے لئے بیکار اور غیر ضروری ہے۔ ہم تو ملبن کی آڑ میں نسوانیت کی جھلک دیکھنے والے ہیں اور عورت کو "عورت" کے معنوں میں دیکھنے کے متمنی ہیں، دوسرا مضمون جعفری صاحب (مدیر شمع) نے بڑا تحقیق و تلاش سے لکھا ہے۔ یہ مضمون بھی گذشتہ سے پیوستہ ہے۔ تیسرا مضمون "شمع مزار" نہایت دقت خیز اور عبرت آمیز ہے اس کا پہلا نمبر ستمبر ۱۹۲۶ء کے شمع میں شائع ہوا تھا یہ "تیسرا آنسو" (کمپنی بہادر کے سایہ عاطفت میں) نامکمل اس اشاعت میں شائع ہوا ہے جس میں عہد مغلیہ کے زوال کے حالات، نہایت دردناک اور مؤثر پیرایہ میں تحریر فرمائے ہیں خصوصاً شاہ ظفر کے حالات بہت الم انگیز ہیں ان کی شاعری پر بھی ایک مبصرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اور موقع بموقع اشعار بھی دیئے گئے ہیں غرض یہ مضمون اس قابل ہے کہ مکمل ہونے پر کتابی صورت میں شائع کرا دیا جائے، چوتھا مضمون جو حالی پر لکھا گیا ہے وہ ناتمام ہے۔

مارچ کے شمع میں منشی ذکاء اللہ دہلوی، قوانین ٹرکی کی آزادی اور تعلیم اسلام، علماء کی صحبت، کامیابی کا راز، اور

کی اصلاح' اچھے مضامین ہیں پہلا مضمون مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز کے انگریزی مضمون کا ترجمہ جناب ضیاء الدین احمد صاحب برنی نے کیا ہے اور خوب کیا ہے قابل مترجم صاحب انگریزی اخبارات ورسایل کے تنقید نگار ہیں، مضمون زیر بحث میں جیسا کہ اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے مولانا مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کے حالات زندگی ہیں۔ اس لئے قابل قدر ہے مگر اس کی وقعت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ منشی صاحب مرحوم کے ایک انگریز دوست کے بے لوث اور پرخلوص قلب و قلم سے نکلا ہوا ہے' یہ مضمون جیسا کہ مترجم صاحب کے نوٹ سے ظاہر ہے غیر مطبوعہ ہے اور اس کو مولانا ذکاء اللہ صاحب کے حالات زندگی کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کر دیا جائے گا۔

دوسرے مضمون میں ٹرکی کے موجودہ سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور مذہبی انقلاب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اسی قبیل کا ایک مضمون زبان کے موجودہ نمبر میں علامہ عبدالعزیز صاحب راجکوٹی کا درج ہے اس لئے اس کے متعلق زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ تیسرا مضمون جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے ناظم محکمہ آثار قدیمہ حیدرآباد (دکن) کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے اورنگ آباد کالج کے سالانہ جلسہ کے موقع پر (نومبر ۲۶ء) کی تھی اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اساتذہ (علماء) کے اعلیٰ کیرکٹر کا طلباء پر کیسا اثر پڑتا ہے اور ان کی صحبت سے کتنا فائدہ حاصل ہوتا ہے قابل مقرر نے اپنی کیمبرج کے پروفیسروں سے ملاقات اور ان کے علمی انہماک کا ذکر بھی کیا ہے جو ہمارے ہندوستانی پروفیسروں کے لئے کارآمد ہے۔ چوتھا مضمون خود جعفری صاحب مدیر شمع کا ہے جن کا ایک نہ ایک مفید مضمون ہر نمبر میں ہوتا ہے یہ مضمون بھی بہت مفید اور سود مند ہے ملک کو ایسے اصلاحی مضامین کی سخت ضرورت ہے یہ ایسا مضمون ہے کہ کئی کتب کے مطالعہ کے بعد بھی ہمیں حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم خوش ہیں کہ مدیران شمع نے اس سلسلہ کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

اپریل نمبر میں 'مملکت عوز' جناب نور بخش صاحب نے بڑی تحقیق و تلاش سے لکھا ہے 'بہو بیگم' کے متعلق بھی مولانا علم الدین صاحب بی۔ اے نے محنت سے مواد فراہم کیا ہے۔ 'آفتاب کا راز' جعفری صاحب کا سائنٹفک مضمون ہے جو پُراز معلومات ہے۔

علاوہ ان علمی و ادبی مضامین کے ہر نمبر میں کوئی نہ کوئی فسانہ اور عمدہ نظم بھی ہوا کرتی ہے۔ اور ہر ماہ ثاقب۔ قزلباش شاد۔ صفی۔ محشر۔ وحشت وغیرہ اساتذہ کا تازہ کلام ناظرین شمع کی ضیافت طبع کے لئے بہم پہنچایا جاتا ہے اور مطبوعات جدیدہ پر ریویو بھی نہایت قابلیت سے کئے جاتے ہیں۔ غرضیکہ یہ رسالہ ہر حیثیت سے قابل قدر ہے۔ لکھائی۔ چھپائی اور کاغذ عمدہ سائز ۲۰×۲۶ حجم ۶ جزو سالانہ چھ روپے + ملنے کا پتہ: حسن منزل شاہ گنج۔ آگرہ

"علیگڈھ میگزین" بھی موقت الشیوع رسایل میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے جو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے پابندی "باقاعدہ" جناب مولوی عبدالباسط صاحب بی۔اے۔ایل ایل۔بی کی ادارت میں شایع ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ نمبر مارچ۔اپریل و مئی ۱۹۲۶ء جلد ۴ نمبر اول ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کی شبیہہ سے آراستہ ہے اور "بھوپال پر نونہال علیگڈھ" کے زیر عنوان ایڈیٹر صاحب کا تہنیت نامہ ہے پھر "بھوپال دار اشرف والاقبال" کے تحت جناب قاضی جلال صاحب نے تاریخ بھوپال پر ایک بسیط گر ناتمام مضمون لکھا ہے جو میگزین کے صفحات سے الگ از ابجد تا کلمن ہے، اس کے بعد عالیجناب غازی پاشا سفیر جمہوریت ترکی (در کابل) کی تصویر اور ان کے خط کا عکس دیا گیا ہے۔ جو انہوں نے کابل سے وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے نام پنجاہ سالہ جوبلی کے موقعہ پر عدم شرکت کی معذرت اور کالج کے ساتھ اپنی ہمدردی کے اظہار کے متعلق لکھا ہے صفحہ ۱۴ پر ہمارے "یلدرم" صاحب نے کہیں شملہ کالکا ریلوے پر کسی "آہو" کو دیکھ لیا ہوگا اُس کا دل فریب نقشہ نہایت دل کش الفاظ میں نظم فرمایا ہے کیا "یلدرم" صاحب اب بھی "دیکھتے ہیں"؟ "تذکرہ منصور کے چند اوراق" مولوی محمد امین صاحب پروفیسر عربی چاٹگام کا قابل قدر علمی مضمون ہے جو ان کی اسی موضوع پر غیر مطبوعہ تصنیف کا کچھ حصہ ہے۔ اس میں اعتقادات پر نفسیات سے بحث کی ہے اور جا بجا بھگوت گیتا کے شلوک سے استدلال کیا ہے "صبحیات" کے زیر عنوان پروفیسر وحید الدین صاحب تسلیم کے چند مختلف اشعار ہیں جن میں صبح کا نظر فریب سماں دکھایا گیا ہے "فلسفہ مسرت" محمد لیاقت اللہ صاحب نظیر بریلوی نے اچھا مضمون لکھا ہے "روشنی کی رفتار" مولوی حامد حسن صاحب قادری ایڈیٹر سعید کا مضمون بھی خوب ہے اسی طرح "پان اسلامزم کی حقیقت" (ناتمام) والا مضمون بھی پر از معلومات ہے "اگر موت ابن خواب کی نیند ہوتی" جناب عظمت صاحب دہلوی کی لی رک نظم (انگریزی تخیل کا ترجمہ) سادگی و سلاست کے لحاظ سے بہت اچھی ہے "مکتوب مہدی" ہمارے کرمفرما حضرت دلگیر صاحب کے نام ہے جس کو ہم نے زبان میں بھی نقل کیا "شہر صفی آباد کا خاکہ" "غلطت پنولین" اور "انداز خود نمائی" معمولی مضمون ہیں "تتلی" پر دور موجودہ کے قریب قریب تمام شعرا نے طبع آزمائیاں کی ہیں تاہم درد صاحب کی "تتلی" "رقاصہ فطرت" ہے "پیام شوق" آغا صاحب کے رنگ میں ایک خط ہے جو علاوہ دلی کی بیگمات کی نوچدار زبان کے دلچسپ بھی ہے "پُر اسرار جوگن" ہمارے مکرمی و محبی جناب محمود الحسن صاحب کا دلچسپ فسانہ ہے "ترانہ بے صدا" کے عنوان سے نواب مرزا جعفر علی صاحب اثر نے داس آبہنانی کے تتبع میں خوب نظم لکھی ہے اسی طرح "اسلام کی علمی اور اخلاقی" فتوحات کے تحت ایک طویل نظم جناب انیس رضوی امروہوی کی ہے جو اچھی ہے "حسن الکلام" تعلیم نسواں پر رابعہ اور نجمہ کا نتیجہ

مکالمہ ہے "بیوہ اور ہلال عید" والی نظم بھی درد انگیز ہے غزلیات میں ثاقب۔ قزلباش لکھنوی اور یاس عظیم آبادی کی غزلیں بہت اچھی ہیں "قندپارسی" اور "سحر سہیل" کے عنوان سے ہادی مچھلی شہری اور مولانا اقبال احمد خاں صاحب سہیل کی فارسی غزلیں بھی خوب ہیں اخیر کے چار صفحوں پر "تنقید و تبصرہ" ہے اس نمبر کی ضخامت ۱۱۲ صفحے ہے۔

اکتوبر و نومبر ۱۹۲۶ء کے میگزین میں پہلا مضمون 'امرء القیس اور شاعری' مولوی عبدالباقی صاحب بی۔ اے ایل ایل۔ بی کا ہے جو ناتمام ہے دوسرا مضمون 'حصن حصین' موت کے مقابلے کے لئے رابرٹ موئی اسٹیونسن کے ایک مضمون کا ترجمہ جناب حامد حسن صاحب قادری نے کیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے اچھا ہے جناب سید محمد بدرالدین صاحب علوی نے 'سامی زبانوں کی اصل عربی ہے' کے ثبوت میں چند عربی الفاظ پیش کرکے سامی زبانوں کے ہم شکل اور ہم معنی الفاظ سے مقابلہ و استدلال کیا ہے۔ 'ولا تمناہی' ہیئتی مضمون ہے "نئی نسل کا رجحان آزادی" مکرمی جناب محمود الحسن صاحب نے لکھا ہے رسالہ بھر میں یہی ایک کام کا مضمون ہے۔ تاریخ قنوج کا ایک خونی ورق پرتھی راج اور سنجوگتا کا تاریخی فسانہ بشیر احمد صاحب علوی نے کامیاب اور مؤثر لکھا ہے اسی طرح ایک 'ادھ جلا سگریٹ' نے جناب عبدالعلی صاحب کے قلم سے اپنی "آپ بیتی" یا حب الوطنی کا فسانہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے رنگ میں بہت دلسوز لکھوایا ہے۔

نظموں میں جناب اختر شیرانی کی 'دعا' اور محمد شبیہ الحسن صاحب کی نظم 'ایک ہندی مسلمان کا پیغام' (غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے نام) اچھی اور پُر جوش ہے غزلیات میں بھی پروفیسر سلیم صاحب اور جناب ہادی مچھلی شہری کی غزلیں خوب ہیں یہ نمبر ۷۶ صفحوں پر ختم ہوا ہے۔

میگزین کی جلد ۴ کا نمبر ۳ نہیں موصول ہوا چوتھا نمبر بابت دسمبر جنوری فروری ۱۹۲۷ء زیر تبصرہ ہے، شذرات میں قابل ایڈیٹر صاحب نے اپنا الوداعی نوٹ تحریر فرمایا ہے یعنی جس طرح گورنمنٹ برطانیہ کی یہ پالیسی کہ کوئی بڑے سے بڑا عہدیدار بھی اپنے مفوضہ عہدے پر مخصوص زمانہ اور مقررہ وقت سے ایک ماہ بھی زاید نہیں رہ سکتا۔ غالباً اسی حکومت کی پالیسی کو مدنظر رکھ کر میگزین کے مدیر بھی ایک "عمر معینہ" وقت کے بعد بدل دئے جاتے ہیں۔ 'حکومت' کا دائرہ عمل تو ایک قانون کے ماتحت ہے لیکن 'صحافت' کا غیر قانونی میدان عمل بہت وسیع ہے۔ جہاں پر مدیر 'ہر کہ آمد عمارت نوساخت' کے مطابق جولانی طبع دکھاتا ہے۔ اور لوگوں کو اپنے مذاق اور طرز عمل کی پیروی کرنے کی دعوت دیتا ہے اور چل دیتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ آیندہ میگزین کی ادارت کی ذمہ داری ہمارے محبی جناب محمود الحسن صاحب کو تفویض ہوئی ہے۔ جن کے علمی انہماک اور ادبی شفقت سے ہمیں آمید ہے کہ محب موصوف اپنے زمانۂ ادارت میں میگزین کی امتیازی شان کو قایم رکھیں گے بلکہ دوچند کرنے کی سعی کریں گے۔ ہم اپنے دوست کی خدمت میں اس علمی عہدے پر سرفراز ہونے کی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

صفحہ ۹ پر "کالکا شملہ ریل کا منظر" چودہری خوشی محمد صاحب ناظر کی وہ مقبول و مشہور نظم ہے جو آج سے بہت پہلے ملک سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے مگر افسوس ہے کہ مطبوعہ نظم بلا حوالہ نقل کی گئی ہے، اس کے بعد "نظریہ تمدن" خود ایڈیٹر صاحب کا مضمون ہے جو نہایت محققانہ اور مفید ہے۔ ایسے مضامین کی اردو لٹریچر میں سخت کمی ہے مگر شکر ہے کہ میگزین اس خدمت کو ایک حد تک انجام دے رہا ہے "ترقی معکوس" ملا نشاطی کے نگارش خامہ کا نتیجہ ہے اس میں دلچسپ پیرایہ میں وہ ہمسفر ہندی و سندہی کا مکالمہ قایم کر کے بڑے بڑے سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی مسایل اس خوبی سے حل کئے گئے ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں "بعد رابع" ریاضی کا مضمون ہے جس کے تین نمبر گذشتہ نمبر میں نکل چکے ہیں یہ مضمون شاید ریاضی دانوں کے لئے مفید ہو مگر اس خشک مضمون میں عوام کی کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی اللغۃ العصریۃ عربی نظم جو الزہرا سے نقل کی گئی ہے۔ بلا ترجمہ غیر عربی دانوں کے لئے غیر مفید ہے، اسی طرح جناب سید محمد ہادی صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا فارسی مضمون "تدقیقات اردو" اردو "تدقیقات" میں کہاں تک مفید ہو سکتا ہے؟ کم از کم ہماری سمجھ سے تو بالاتر ہے! ہاں اگر اس سے اپنی لیاقت کا اظہار مقصود ہو تو اور بات ہے۔

"فطرت کی ستم ظریفی" تماشائی کا طویل اور نتیجہ خیز فسانہ ہے 'ہندوستان پر عربوں کا سب سے پہلا حملہ' جناب مولوی سید حسن صاحب برنی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی نے نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھا ہے "ایک ہوا باز کی کہانی" میں ہوائی جہاز سے چھتری کے ذریعے نیچے اترنے کا تجربہ اس کی اپنی زبانی لکھا گیا ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

"فریب نظر" ادبی مضمون خوب ہے "فارسی شاعری اور صوفیا کی امرد پرستی پر ایک نظر" جناب محمد علی خاں صاحب اثر ایچ۔ پی (رامپوری) نے صوفیوں پر امرد پرستی کے الزام کو رد کرنے اور ان کے پاک نفس کا ذکر نہایت صفائی سے کیا ہے۔ "فلومِلا" میاتھیا آرنلڈ کی ایک دلگداز نظم کا نثر میں ترجمہ محمد ابراہیم صاحب متعلم ایم۔ ایس۔ سی نے کیا ہے۔ "امرء القیس اور شاعری" والا مسلسل مضمون اس نمبر کے ساتھ ختم ہوتا ہے "حیات" میں سر رائیڈر ہیگرڈ کے ایک ناول کے اس حصہ کا ترجمہ ہے جس میں شاہ سلیمان کے جواہرات کی کان کی تلاش کے متعلق ذکر آیا ہے۔ "مصر کا مینار اعظم" میں ملکہ ہٹیفر بیس کے مقبرہ کی ۱۹۲۵ء میں دریافت کے متعلق کار آمد معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں "اظہار محبت" "شمیم

...ودی صاحب کا ترجمہ فسانہ ہے (صفحہ ۱۰ سے آخر صفحہ ۷۶ تک کتب ورسائل پر "تنقید و تبصرہ" کیا گیا ہے۔
نظموں میں "سالک کی ادا" "خطاب بہ علیگڈھ" اور "ہلال عید" اچھی ہیں۔ اسی طرح غزلیات میں "محسوسات فانی"
...نگ بخش" اور کیفیات کے زیر تحت اچھی غزلیں ہیں۔ غرضیکہ ہر لحاظ سے یہ رسالہ اچھا ہے اور بہترین لکھائی چھپائی کے
...سے بھی مسلم یونیورسٹی پریس مشہور ہے۔

"مرقع" (لکھنؤ) بھی اعلیٰ رسائل میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اس کا زیر تبصرہ جنوری (۱۹۲۷ء) نمبر "خاص نمبر"
ہے جو با اعتبار مضامین و ضخامت قابل ذکر ہے۔ مرقع بجائے تصاویر کے ہر ماہ اساتذۂ متقدمین و حال کے خطوط کے عکس
...ہر کرتا ہے اس نمبر میں سات عکسی تحریریں ہیں جن میں بحر شاگرد رشید ناسخ لکھنوی منیر شکوہ آبادی داغ دہلوی اور
...ر مینائی کے خطوط خصوصیت سے قابل ملاحظہ ہیں۔

مضامین میں "سیرۃ اصحاب کا ایک ورق" "سیدنا آدم علیہ السلام" "حرز جاں" اور "شیشہ سازی" بہترین مضامین کہے
...سکتے ہیں فسانوں میں "جان عالم اور ملکہ مہر نگار" جادو نگار نیاز صاحب کا بہت اچھا فسانہ ہے نظمیں اور غزلیں بھی مستند
...ندانے عالم ہم کیگئی ہیں خصوصاً "خمریات ریاض" کا ہر ہر شعر سرور بخش و کیفیت انگیز ہے غرض چھوٹے بڑے نظم و
...نثر کے ۳۰ مضامین دو کالم کے ۹۶ صفحوں پر حاوی ہیں۔

ہم اس نمبر کے لئے جناب وصل صاحب بلگرامی کی مساعی جمیلہ کی داد دیتے ہیں اور فراہمی مضامین و طیاری رسالہ پر
...مبارکباد دیتے ہیں۔

مرقع کے اکثر مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ ہر نمبر میں ایک دو مضمون ایسے اہل قلم
کے فراہم کئے جاتے ہیں جن پر اردو زبان کو ہمیشہ ناز رہیگا۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اگر بہترین نہیں ہے تو برا بھی نہیں
ہے سالانہ للعہ ر۔

ملنے کا پتہ:۔ مینجر مرقع نظیر آباد لکھنؤ

لاہور کے تمام جرائد میں اپنی شان کا انوکھا جریدہ بلا شبہ "نیرنگ خیال" کہا جاسکتا ہے۔ جنوری نمبر میں گیارہ تصاویر
ہیں جن میں سے علامہ سر اقبال، نورجہاں، مقبرہ نورجہاں، مقبرہ انارکلی، مقبرہ شہنشاہ جہانگیر اور چغتائی کی رنگین
تصویر "اسرار حیات" وغیرہ اچھی ہیں۔ تاریخ لاہور کے متعلق تین بسیط مضمون اچھے ہیں۔ سید امتیاز علی صاحب تاج
کا ڈرامہ "انارکلی" بہترین ڈرامہ ہے اسی طرح فلک سیر سرحدی کا فسانہ "غالب کا ایک شعر" بہت دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر
سر اقبال کی شاعری پر اڈیٹر صاحب کا مضمون اگرچہ مختصر ہے مگر جامع ہے نظمیں اور غزلیات بھی اچھی ہیں۔
...روری کے نیرنگ خیال میں آٹھ تصویریں ہیں جن میں فانی بدایونی کی تصویر کے علاوہ تمام غیر ضروری ہیں اسی طرح

مضامین میں بھی "ترقی نسواں اور ہندوستان" "صنفِ نازک" "مطالبہ" اور "احباب صادق" چھوٹے چھوٹے اور معمولی مضامین ہیں "ایک بوسہ کا راز" دلچسپ فسانہ ہے اور کوثر لکھنوی کی نظم "وجہ خاموشی" اور جناب سید عابد علی صاحب عابد کی غزل اچھی ہے۔

متعدد تصاویر کے ساتھ ہر نمبر پانچ جزو کا ہوتا ہے اس پر سالانہ صرف ۳ روپے علاوہ ازیں سال میں دو تین خاص نمبر بھی بڑے اہتمام سے نکالے جاتے ہیں۔

ملنے کا پتہ :- مینیجر رسالہ نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور

انقلاب یہ بھی لاہور کا "ادبی و سیاسی دلچسپیوں کا ماہانہ مجموعہ" ہے جو فتح چند نسیم اور کنھیا لال ثاقب بی۔اے کی مشترکہ کوشش سے شایع ہوتا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ دسمبر ۱۹۲۶ء کا "خواتین نمبر" جے دیوی صاحبہ ایک ہندو لیڈی کی زیرادارت شائع ہوا ہے جس میں آٹھ نو تصاویر ہیں اور سب کی سب خواتین ہی کی ہیں اسی طرح مضامین بھی تمام تر خواتین ہی کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں جن میں "تعلیم نسواں" بر جموہن رانی جی شرغہ کا اور محترمہ بیگم محمد علی صاحب کا مضمون "استانیوں کی ضرورت" دونوں اچھے ہیں اسی طرح "بہترین اصول صحت" "باپ نسوان" اور ایڈیٹرس صاحبہ کا مضمون "رفیق زندگی" بہت اچھے اور کارآمد مضمون ہیں فسانے بھی تمامتر خواتین کے لئے مفید ہیں اگرچہ صحت زبان کا لحاظ نہیں رکھا گیا تاہم یہ نمبر بہر طور پڑھی لکھی خاتون کو دیکھنا چاہیے ہم حیا صاحبہ کو ان کی اس سعی بلیغ داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ (حجم ۹۶ صفحے)

جنوری کا انقلاب (سالگرہ نمبر) بھی متعدد تصاویر و فسانوں سے پُر ہے اور اس میں بھی "عالم نسواں" مرتبہ جے دیوی حیا ایک رسالہ کی صورت میں بطور ضمیمہ شامل ہے اس میں ایڈیٹرس صاحبہ کا مضمون "کیا تعلیم سے عورت خشک اور فلسفی بن جاتی ہے" فیصلہ کن ہے اسی طرح "میرا بائی" والا مضمون بھی اچھا ہے اور فسانے بھی تمام دلچسپ ہیں اس نمبر کی ضخامت ۱۲۰ صفحے ہے۔ اس پر سالانہ چندہ صرف ۳ روپیہ۔
لکھائی چھپائی معمولی ملنے کا پتہ :-

مینیجر انقلاب ریلوے روڈ لاہور

"اڈیٹر"

صفحۂ ادارت

گزشتہ نمبر میں ہم نے اعلیٰحضرت ہز ہائینس میر علی نواز خاں بہادر دام اقبالہٗ وحشمتہٗ والی ریاست خیرپور (سندھ) کی تصویر کے متعلق اپنے نوٹ میں موصوف الصدر کے مزید حالات حالات قارئین زبان کی خدمت میں پیش کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس جگہ درج کرتے ہیں۔

حال میں زبان کے ڈکلریشن کے متعلق ہمیں دہلی جانے کا اتفاق ہوا تھا اس دوران میں خیرپور (سندھ) جانے کا اتفاق ہوا تھا اس دوران میں خیرپور جانے کا بھی موقع مل گیا چنانچہ مکرمی ومحترمی جناب رضاء الحق صاحب عباسی پرائیوٹ سکریٹری میر صاحب بہادر بالقابہ کے توسل سے ہمیں حضور میر صاحب بہادر کی خدمت میں باریابی کا بھی شرف حاصل ہوا اور ہمنے عباسی صاحب سے محترم موصوف کے جو جو اوصاف حمیدہ اور اخلاق کریمانہ سنے تھے اس سے کہیں بڑھکر اعلیٰ اوصاف سے انکو متصف پایا ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ

ہمیں آپ سے شرف نیاز حاصل کرکے ان بے بنیاد اور بے سروپا اطلاعات کو مشتہر کرنے والے اخبارات کی حالت پر جنکا مقصد واحد محض رؤسا کی بری بھلی باتیں شائع کرکے روپیہ کمانا ہے سخت افسوس ہوا کہ وہ اپنے اغراض کی تکمیل کی خاطر کیسی کیسی دور از حقیقت خبریں شائع کرکے فن صحافت کو بدنام کر رہے ہیں

اس قحط الرجال کے زمانے میں مسلمان رؤساء ہند میں ایک بھی ایسا رئیس نہیں ہے جو آپکے مقابلہ میں پیش کیا جاسکے۔ رعایائے خیرپور کو اپنی خوش بختی پر ناز کرنا چاہیئے کہ انکو ایک ایسا رعایا پرور وہمدرد اور مشفق تاجدار میسر آیا ہے جو ہر وقت انکی فلاح وبہبودی میں مصروف رہتا ہے۔ افسوس آپکی فیاضی ودریادلی جو غریب رعایا کی اعانت وہمدردی یا اہل فضل وکمال کی قدردانی پر مبنی ہوتی ہے خارجی اور سیاسی دنیا اسکو "فضول خرچی" سے تعبیر کرتی ہے یہ انکی نادانی وناواقفیت کا ادنیٰ ثبوت ہے۔

اگر ہم یہاں آپکی اولوالعزمی، فیاضی، کریم النفسی، حلیم الطبعی، منکسر المزاجی اور رعایا پروری کے اوصاف کو اختصار میں بھی حیطۂ تحریر میں لائیں تو ایک دفتر ہوجائے تاہم ہم ان سے متاثر ہوکر آپکے نیز ریاست کے جستہ جستہ حالات جو حقیقت پر مبنی ہیں لکھدینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ریاست خیرپور مغربی ہندوستان میں اول درجہ کی واحد اسلامی دیسی ریاست ہے آپ اپنے نامور والد بزرگوار

ہزہائینس میر سر امام بخش بہادر جی-سی-آئی-ای سابق والیٔ خیرپور کی رحلت کے بعد ۱۹۲۱ء میں سریر آرائے ریاست ہوئے، آپکی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی ہے اور آپ انگریزی، عربی، فارسی، اردو، سندھی، اور پنجابی زبانوں سے کما حقہٗ واقف ہیں۔

آپکے عہد معدلت مہد میں ریاست میں اسکولوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہنچی ہے جس میں ہزارہا طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اسی طرح بہت سے عمدہ شفاخانے بھی ہیں جہاں سے بیش قیمت ادویہ اور طبی مشورہ مفت دیا جاتا ہے آپنے اپنی ہندو رعایا کے لئے ایک مندر بھی تعمیر کرایا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ کو ہر مذہب سے دلچسپی ہے اور انکا خاص مقصد اپنی ہندو مسلم رعایا میں یگانگت اور رواداری کے جذبات کا پیدا کرنا ہے آپنے اس مندر کا جہاں ہندو مسلمان اپنے قومی مراسم اور طریقہ عبادت پر عامل ہو کر ایک ساتھ بھائیوں کی طرح مل سکتے ہیں "دھابیر آشرم" نام تجویز فرمایا ہے آپ رعایا کی معروضات کو بذات خود نہایت غور و خوض سے سنتے ہیں اور انکے ساتھ شاہانہ مراعات کو روا رکھتے ہیں۔

ریاست نے ایک لاکھ پانچ ہزار کی گراں قدر رقم کنگ اڈورڈ میموریل فنڈ میں ایک لاکھ مسلم یونیورسٹی فنڈ میں بیس ہزار احاطۂ بمبئی کے چیف اسکاؤٹ ماسٹروں کی ٹریننگ کیلئے اور پندرہ ہزار کی رقم تعلیمی کانفرنس بمبئی منعقدہ پونا کو دی ہے۔

آپنے اپنی زیر نگرانی رعایا و ریاست کی بہبودی و ترقی کی خاطر اپنے اختیار سے ایک کونسل کا تقرر فرمایا ہے جو آئے دن ذرائع آمدنی و ترقی اور رعایا کے مفاد کی تدابیر عمل میں لا رہی ہے، طبقہ ادنیٰ کے افراد بہ نسبت سابق زائد اجرت پر کام کرتے ہیں، پیداوار کی مدات میں ترقی دی گئی ہے، آبادی، تعلیمی محکمہ جات اور خیراتی شفاخانہ ریاست میں یوماً فیوماً بڑھتے جاتے ہیں اور رعایا بھی آپکے زیر ظل عاطفت شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور انکو ہر قسم کی سہولتیں ریاست کی بہم پہنچائی جاتی ہیں جس سے قوی امید ہے کہ موجودہ فرمانروا اپنے وسیع مشرقی و مغربی تجربات سے رعایا و ریاست کو ایسی ترقی دینگے جسکی نظیر ریاست کے گذشتہ صفحات تاریخ میں ڈھونڈھے سے نہ ملیگی

آپ جہاں صاحب ملک و مال ہیں وہاں صاحب تصنیف و دیوان بھی ہیں یعنی آپکا ایک مختصر سا دیوان پاکٹ سائز نہایت نفیس و دیدہ زیب چھپ گیا ہے جسمیں سے ایک غزل اس نمبر میں بھی ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے۔ اخیر میں ہم بقول شخصے دست بدعا ہیں کہ ؎

پاؤں پھیلائے رعایا چین سے سوتی رہے　　علم و دولت کی ترقی ملک میں ہوتی رہے

خدا کا لاکھ شکر ہے کہ باوجود بے بضاعتی و کم مائگی کے آج رسالہ زبان ہزاروں مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی عمر کا پہلا سال ختم کرتا ہے۔ ہم اس موقع پر اپنے ان تمام معاونین اور قدردانوں کا بصدق دل شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے گاہ گاہ دامے درمے اور قلمے ہماری معاونت فرما کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ہمارے قلمی معاونین اسی طرح اپنے شہ کار اعلیٰ علمی مضامین سے زبان نوازی فرمایا کرینگے اور زبان کو ہندوستان کے اعلیٰ رسائل میں شمار کئے جانے کے قابل بنا دینگے۔

زبان نے اپنی ایک سالہ مدت قلیل میں ملک و قوم کی جو کچھ بھلی بری خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں اور زبان نے جس بلند معیار علمی کو اپنے لئے مختص کیا ہے اُسکو از اول تا آیندم جس خوبی و عمدگی سے نباہا اور نباہ رہا ہے یہ امر بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا ملک و قوم نے بھی زبان کی علمی خدمات کی ویسی ہی داد دی جسکا کہ وہ واقعی مستحق و سزاوار ہے ؟ تو افسوس کہ نفی کے سوا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔

اگرچہ ہم اس بنا پر اپنے تئیں مغرور ہیں کہ زبان نے باوجود ملک کی بے اعتنائی و کم توجہی کے اس بنجر و پُرشور زمین پر اپنے وجود کو ابتک قائم رکھا لیکن با فسوس کہ اب ان اسباب و وجوہ کے ساتھ یہ نونہال ادب سرسبز و باریاب ہوتے اور پھولتے پھلتے نہیں نظر آتا اور ہم آج سخت مایوسی کے ساتھ بادل ناخواستہ یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ "اگر ملک و قوم کی ناقدردانی کا یہی عالم رہا تو یہ کاٹھیاواڑ کا واحد علمی رسالہ آئندہ سے بند کر دیا جائیگا"

یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کس طرح بعض اہل رسالہ اپنے رسالہ کی ہزاروں کی تعداد اشاعت کا اعلان کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور "فن اشتہار" کو کس تکذیب سے درجہ تکمیل کو پہونچاتے ہیں ؛ ہمیں تو صرف اپنے "احوال واقعی" کی گذارش منظور ہے۔ رسالہ زبان ہر ماہ پانسو کی تعداد میں چھپتا ہے اور رسالہ چھپکر منگرول تک پہنچنے میں ہمیں ایک سو روپیہ کی لاگت آتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں خریداروں کی تعداد صرف ۱۳۲ ہے اب ناظرین خود ہی اندازہ فرمائیں کہ ابتک رسالہ کو جاری رکھنے میں ہم کسقدر زیر بار ہوئے ہونگے۔

کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں کی آبادی از روئے مردم شماری سنہ ۱۹۲۱ء ۱،۰۲،۹۱،۱۰۲ ہے ان میں سے زبان کے خریدار صرف ۷۰ ہیں جن میں سے ۴۵ خریدار تو منگرول ہی کے ہیں اور اگر ان کو کاٹھیاواڑی خریداروں کی تعداد میں سے وضع

کردیں تو پورے کاٹھیاواڑ میں سے صرف ۲۳ خریدار زبان کو میسر آئے ہیں۔ کیا یہ امر اہل کاٹھیاواڑ کیلئے باعث "شرمندگی" نہیں؟ لیکن انکے جمود و خود فراموشی کو دیکھکر ہم یہی کہیں گے کہ "کاٹھیاواڑ" ع ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا۔

جہاں یہ مالی وجوہات ہماری راہ ترقی میں حائل ہیں وہاں چند اور اسباب بھی زبان کی مشکلات میں اضافہ کررہے ہیں۔ ناظرین کرام کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ زبان ابتک "نان رجسٹرڈ" ہے جس سے ہمیں بجائے ایک پیسہ کا ٹکٹ چسپاں کرنیکے ایک آنے کا ٹکٹ لگانا پڑتا ہے جو ہمارے لئے ناقابل برداشت نقصان ہے۔

ریاست جوناگڈھ اور منگرول کے سیاسی معاملات خواہ کیسے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ رسالہ زبان کو (جسکو سیاسیات سے کوئی دور تعلق بھی نہیں ہے) کیوں ایک "سیاسی آرگن" سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ ریاست جوناگڈھ کے فیاض حکمراں اور انکے روشن خیال دیوان صاحب اس مسئلہ پر نظر ثانی فرمائینگے بلکہ اس علمی صحیفہ کی سرپرستی فرماکر اپنی فیاضی و علم دوستی کا ثبوت دینگے۔

یہی وہ موانعات ہیں جن سے تنگ آکر ہم رسالہ بند کردینے پر آمادہ ہوئے ہیں کیا اس کی ذمہ داری ملک و قوم پر نہیں عائد ہوتی؟ لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا اگر ملک کے چند ذی حوصلہ افراد رسالہ کی قدردانی اور حوصلہ افزائی پر کمربستہ ہوجائیں۔

ہمنے آجتک خریداران و معاونین سے رسالہ زبان کی توسیع اشاعت کے متعلق کوئی درخواست نہیں کی لیکن اگر ہم سخت مجبوری و مایوسی کی حالت میں اسکی استدعا کریں تو غالباً بیجا نہ ہوگا لہذا ہم اپنے ناظرین کرام سے التماس کرتے ہیں کہ اگر آپ زبان زندہ اور برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اگر آپ کے خیال میں اسکی خدمات واقعی ملک و قوم کے لئے سودمند ثابت ہوسکتی ہے تو اسکی امداد کے لئے طیار ہوجائیں اپنے احباب سے سفارش کریں اور انکو زبان کی خریداری پر مائل فرمائیں۔

اگر ہر خریدار تین تین چار چار خریدار بہم پہنچائے تو امید ہے کہ زبان کی تمام موجودہ مشکلات رفع ہوجائیں گی۔ اور وہ آیندہ آپکی خدمت بجالانیکے قابل ہوجائیگا اور پھر تعویق اشاعت کی شکایت بھی جو بسبب اقلیت خریداران کے رہا کرتی ہے دور ہوجائیگی۔

ہمنے کسی گذشتہ اشاعت میں انہی صفحات میں سلطان محمود بیگڑھ کی جوناگڈھ پر حملہ آوری کیکے اصل اسباب کا

ذکر کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ ہم اسکے متعلق ایک اہم تاریخی دستاویز کا عکس معہ مفصل حالات کے درج زبان کریں گے خوشی ہے کہ آج ہم اپنا وعدہ پورا کرتے ہیں۔ ناظرین مضمون و ایک قدیم دستاویز اور اہم تاریخی انکشاف ملاحظہ فرمائیں۔

اس سلسلہ میں ہمیں جناب سید واصل میاں صاحب کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ آپ نے اپنے خرچ سے دستاویزات کے عکس خاص زبان کیلئے طیار کرواکر مرحمت فرمائے ہیں نیز ہم مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی کے بھی مشکور ہیں کہ انہوں نے ہماری استدعا پر ان دستاویزات کے متعلق نہایت عرقریزی و جانفشانی سے ایک مفصل اور قابل قدر تاریخی مضمون قلمبند فرماکر عطا فرمایا ہے۔

موجودہ دور صحافت کی تقلید میں ہمنے بھی عزم کیا ہے کہ زبان کا آیندہ نمبر "خاص نمبر" ہو چنانچہ ہمنے اس کی تیاری میں ملک کے مشہور اور مستند اہل قلم حضرات کے معرکۃ الآرا مضامین خاص طور پر حاصل کئے ہیں۔ جن میں سے مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی اڈیٹر الہلال مولانا مولوی عبدالسلام صاحب ندوی۔ پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم۔اے۔ ال ٹی (بڑودہ کالج) اور جناب سید غلام محی الدین صاحب زور ایم۔اے (صاحب روح تنقید) وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اسی طرح "ادبیات" میں ملک کے مایہ ناز اور نغزگو شعراے حال کا کلام بلاغت نظام اور دلچسپ فسانے بھی بہم پہنچائے گئے ہیں۔

یہ نمبر اعلیٰ پیمانہ پر نفیس طباعت وکتابت کے ساتھ عمدہ کاغذ اور دوچند ضخامت پر متعدد تصاویر کے ساتھ شائع ہوگا تصاویر میں مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی کی تصویر اپنی نوعیت کے لحاظ سے قابل دید ہوگی ہم اسکے متعلق اسوقت صرف اسی قدر لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ناظرین خاص نمبر کے منتظر رہیں

"اڈیٹر"

اطلاع

زبان آیندہ خاص نمبر خریداران کے نام ذریعہ ویلو مبلغ للعہ کا روانہ کیا جائیگا جن حضرات کو سال آیندہ کی خریداری منظور نہ ہو وہ براہ کرم ایک پوسٹ کارڈ لکھکر ہمیں مطلع فرمائیں کہ دفتر اسکی واپسی کے نقصان سے بچے۔ ویلو اس نمبر کے موصول ہونے کے دس روز بعد روانہ کیا جائیگا۔

مینجر رسالہ "زبان"

کلام الملوک ملوک الکلام

عطیہ ہز ہائینس میر علی نواز خاں بہادر متخلص بہ ناز والی ریاست خیرپور (سندھ) دام اقبالہ واجلالہ

میں بہر رنگ اپنی ہی ضد ہوں — آپ محسود آپ حاسد ہوں
آپ مختار آپ ہوں مجبور — آپ مسجود آپ ساجد ہوں
آپ موسیٰ ہوں آپ جلوہ طور — آپ مشہود آپ شاہد ہوں
آپ ہوں عبد آپ ہوں مولیٰ — آپ معبود آپ عابد ہوں
خود پرست و خدا پرست ہوں میں — آپ مومن ہوں آپ ملحد ہوں
مشتبہ ہے میری حقیقت حال — گاہ میکش ہوں گاہ زاہد ہوں
مرداے ساکنانِ ملک عدم — اک مسافر ہوں تازہ وارد ہوں
کون قیمت لگائے گا میری — میں زمانہ میں جنس کاسد ہوں
کیوں نہ من جاؤں روٹھکر سو بار — دل کی ہٹ ہوں نہ آپکی ضد ہوں
کیا حساب و کتاب کا کھٹکا — حرف باطل ہوں مدزائد ہوں

جی رہا ہوں کسی پہ مر کر ناز
اک نئی زندگی کا موجد ہوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مئی و جون   **زبان**   سنہ ۱۹۲۷ء

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی
کل جسم میں اک نطق مجسم ہے یہی
ہے عرش خدائے پاک اگر پاک ہے دل
صادق ہے زبان تو اسم اعظم ہے یہی
(امجد)

مقالات

ایک قدیم دستاویز
اور
اہم تاریخی انکشاف

(از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی پروفیسر مہاودیالے (احمد آباد)

اس وقت دو مقدس ہستیوں کے خطوط کا عکس شائع کیا جاتا ہے جو تاریخی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتا ہے، یہ دونوں بزرگ اپنے وقت میں یگانۂ روزگار تھے - ان میں سے پہلا خط سید رکن الدین عرف سید راجو بن سید آدم بن سید سکندر[1] کا ہے آپکا سلسلہ نسب حضرت موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے آپ تو خالص منگر دلی (کاٹھیاواڑی) ہیں مگر آپکے جد امجد کا اصلی وطن ترمذ (ترکستان) تھا جنکا اسم گرامی سید سکندر بن مسعود حسینی ہے، آپ اوائل عمر میں اُچھ (سندھ) حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہانگشت کی خدمت میں حاضر ہوکر عام مریدوں کی طرح فیضیاب ہوتے رہے

[1] تذکرۃ الانساب میں آپکا سلسلہ نسب اس طرح لکھا ہے :-
مخدوم سید سکندر بن مسعود بن عمر بن قاسم بن شاہجی بن علی بن موسیٰ بن علی بن حسن بن علی بن ابراہیم بن موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

کچھ عرصہ کے بعد حضرت مخدوم کو معلوم ہوا کہ آپ صحیح النسب سادات میں سے ہیں پس آپ نے ادب سادات کے لحاظ سے سید سکندر سے خدمت لینی موقوف کر دی، اور جب یہ سوال کیا گیا کہ تم نے اپنی سیادت کو کیوں مخفی رکھا تو سید سکندر نے جواب دیا کہ تعلیم اور رشد و ہدایت حاصل کرنے میں سیادت کا اظہار کچھ موزوں نہ معلوم ہوا۔ اس سے حضرت مخدوم نے انکی ذہانت اور فطانت کو محسوس کر کے انکی طرف توجہ زیادہ مبذول کی اور کچھ عرصہ کے بعد آپنے اپنی خلافت سے ممتاز فرمایا اور حکم دیا کہ سورٹھ کے علاقے میں جا کر مخلوق کو ہدایت کرو۔

محمد شاہ تغلق کے عہد میں جب "طغی" غلام نے گجرات میں بغاوت کی اور شاہی فوج سے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کی ٹھٹھہ (سندھ) میں آکر جام کے یہاں پناہ لی۔ سلطان محمد نے ایک بڑی فوج سے محاصرہ شروع کیا لیکن عین موقع پر وہ اس جہان فانی سے چل بسا اور فیروز شاہ تغلق اس کا جانشین ہوا۔ اس نے اسوقت تو مصلحت وقت سے محاصرہ اٹھا لیا اور دہلی کو مراجعت کی مگر کچھ عرصہ کے بعد سنہ ۷۶۳ھ میں ٹھٹھہ کا محاصرہ کر لیا[۵۱]، لیکن سامان رسد کی قلت اور وبائی امراض پھیل جانے کے سبب فوج کا کثیر حصہ ضائع ہو گیا۔ اس لئے فوجی طیاری کی غرض سے گجرات چلا آیا اور دوسرے سال سنہ ۷۶۴ھ میں ایک بڑی جمعیت کے ساتھ ٹھٹھہ کا پھر محاصرہ کیا طرفین کے کثیر آدمی مارے گئے اور محاصرہ نے طول کھینچا خود فیروز شاہ کی فوج تنگ آگئی تھی اور سامان رسد ختم ہو جانے کے باعث ٹھٹھہ کے لوگ بھی بیحد خوفزدہ ہو گئے تھے اسلئے ٹھٹھہ والوں نے حضرت مخدوم کے پاس پیغام بھیجا کہ بشرط اماں ہم لوگ اطاعت کے لئے بخوشی راضی ہیں، آپ واسطہ بنکر ہماری صلح کرا دیجئے۔ چنانچہ آپ نے صلح کرا دی۔ حضرت مخدوم کی یہ پہلی ملاقات سلطان سے ہے۔ یہ واقعہ سنہ ۷۶۴ھ کا ہے۔

---

[۵۱] افسوس ہے کہ کسی تاریخ میں محاصرہ ٹھٹھہ کا سنہ نہیں ملتا عفیف سراج اس عہد کا ہمعصر مورخ ہے اسنے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں بڑی تفصیل سے فیروز شاہ کے حالات تحریر کئے ہیں اس چند سو صفحہ کی کتاب میں اس مرد صالح نے ایک واقعہ کا بھی بھولے سے سنہ نہیں لکھا۔ بہر حال اکثر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ فیروز شاہ سنہ ۷۶۲ھ میں بنگالہ سے دہلی واپس آیا اور نگر کوٹ کا محاصرہ کیا طبقات اکبری نے اس سنہ کے ساتھ ماہ رجب بھی لکھا ہے۔ تو اغلب ہے کہ اس سنہ میں اسنے نگر کوٹ کا محاصرہ کر کے فتح کر لیا ہو اس صورت میں نگر کوٹ کی فتح بھی سنہ ۷۶۲ھ میں شامل ہو گی اسکے بعد وہ سندھ ٹھٹھہ کے محاصرہ کیلئے گیا پس یا تو اس سنہ میں سندھ پہنچ گیا اور یا سنہ ۷۶۳ھ میں پہنچا میں نے اسی کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس زمانہ کے وسائل آمد و رفت کو مد نظر رکھتے ہوئے قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ اس بڑی فوج کے ساتھ چھ ماہ میں وہ دہلی سے نگر کوٹ کا محاصرہ کرنے اور پھر بعد فتح سندھ بھی پہنچ جائے اسلئے مجھے یقین ہے کہ وہ سنہ ۷۶۳ھ کا ہوگا۔ پھر بادشاہ گجرات چلا گیا اور ایک سال کی تیاری کے بعد پھر ٹھٹھہ آیا اور کامیاب رہا اس لحاظ فتح ٹھٹھہ

م ۷۶۴ھ میں ہوئی۔

سیدنا سکندر بن مسعود کی ولادت باسعادت سنہ ۷۵۰ھ میں ہوئی[۱] اور خورد سالی میں اچھ حضرت مخدوم جہانیاں کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اور غالباً اسی باعث آپکو اپنی والدہ بی بی مریم کی خدمت سپرد کی اور اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ سلطان سے حضرت مخدوم کی پہلی ملاقات جب سنہ ۷۶۲ھ میں ہوئی تو آپ موقع پر موجود ہونگے اور آپکی عمر شریف اسوقت ۱۲-۱۳ سال تک کی ہوگی۔ جب آپکی عمر تقریباً ۱۹-۲۰ سال کی ہوئی تو خرقہ خلافت عطا فرماکر قصبہ منگلور ملک سورٹھ میں ہدایت خلق کے لئے قیام کرنے کی آپ کو ہدایت کی۔ اور فیروز شاہ تغلق کو جو آپکا عقیدتمند مرید تھا آپکے لئے سفارش کی۔ چنانچہ آپ اچھ (سندھ) سے پہلے دہلی تشریف لائے اور فیروز شاہ تغلق سے ملاقات کی جس نے آپ کی بڑی عزت کی اور ہر طرح مدارات سے پیش آیا انہیں دنوں میں یعنی سنہ ۷۷۰ھ[۲] میں ایک فوج منگلور کو راجہ کنوریال کی تنبیہ کیلیے جا رہی تھی[۳] آپ بھی بطور ایک مجاہد کے شریک ہو گئے آپکے ساتھ آپکے مریدوں اور عقیدتمندوں کا بھی ایک مجمع تھا وہ بھی اسمیں شامل ہو گیا اس فوج کا افسر ملک عزالدین بن آرام شاہ تھا یہ مختصر فوج دہلی سے چلکر منگرول پہنچ گئی اور راجہ نے صلح کے مقابل جنگ کو زیادہ پسند کیا۔ دونوں میں سخت مقابلہ ہوا راجہ مارا گیا اور مسلمانوں کی کامل فتح ہوئی اور فتح کی یادگار

---

[۱] ریاض الاولیا۔ حالات سید سکندر بن مسعود۔ [۲] تاریخ الاولیا صفحہ ۲۲۰۔ [۳] میں نے لفظ "تنبیہ" اسلئے لکھا ہے کہ اس جنگ کا کسی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ بظاہر سبب اشتعال کا نظر آتا ہے جس سے فوج کشی کیجائے۔ پس قرین قیاس یہ ہے کہ اس سے پہلے محمد تغلق جوناگڈھ فتح کر چکا تھا اور اسکے مضافات مع سواحل اسکے تابع فرمان تھے انھیں میں منگلور کا راجہ بھی تھا منگلور بندرگاہ ہونے کے باعث ہمیشہ مختلف المذاہب تاجروں کا مسکن رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان تاجروں اور راجہ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے اور مسلمانوں کی حفاظت جان و مال کیلئے ایک مختصر فوج بھیجنی پڑی گو اس مختصر مہم کا تاریخ میں ذکر نہیں ہے مگر اس کی تصدیق اس کتبہ سے ہوتی ہے جو فتح منگلور کی یادگار میں جامع مسجد کے ایک بازو پر لگایا گیا تھا جو فی الحال بوہرہ واڑ کی مسجد میں لگا ہوا ہے۔ اسیطرح عزالدین ایک غیر معروف افسر ہے البتہ ضیاء برنی نے جہاں فیروز شاہ کے امرا کی فہرست لکھی ہے وہاں ایک امیر کا نام ملک عزالدین بھی ہے اور بدایونی جلد اول صفحہ ۲۲۶ مطبوعہ کلکتہ میں تحریر ہے کہ "البتہ بعہد محمد تغلق ملک عزالدین یحیٰ نامی ایک امیر ہے جسکو اعظم الملک کا خطاب ملا تھا"۔ شاید وہی ہو لیکن جامع مسجد کے کتبہ سے اس کے باپ کا نام آرام شاہ معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ کچھ اس شخص کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ دیوان رنچھوڑ جی اپنی تاریخ سورٹھ (قلمی) میں لکھتے ہیں کہ فوج کے دو حصے ہوئے ایک کا افسر عزالدین تھا ؛ جو منگلور میں جاکر جنگ آزما ہوا اور دوسرے کا شمشیر خاں جسنے جوناگڈھ کا محاصرہ کیا اصل عبارت یہ ہے کہ (شمشیر خاں بہ فرمان فیروز شاہ در جوناگڈھ باندک جنگ و جدل فتح ساختہ راجہ کھینگار بہ پناہ کوہ گرنار جاں بسلامت بردو شہر تاراج رفت) اسی طرح منگرول کی نسبت بھی لکھا ہے (صفحہ ۴۹ قلمی بخط مصنف) اس بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ

بقیہ صفحہ

میں جامع مسجد کی بنیاد رکھی گئی جو ۸۵۰ھ میں طیار ہوئی جیسا کہ جامع مسجد کے کتبہ سے ظاہر۔[۵۱]

سیدنا سکندر بن مسعود اس جگہ (منگرول) مقیم ہوگئے اور آپکی خانقاہ کے لئے ایک گاؤں سلطان کی طرف عطا ہوا جسکا نام پہلے دیول پور تھا جسکو بدل کر مخدوم پور رکھا گیا۔ آپ ۵۰ برس زندہ رہکر ۸۲۵ھ میں راہی ملک بقا ہوئے آپکے دو فرزند تھے سید آدم۔ اور سید راجو ان میں سید آدم آپکے خلیفہ ہوئے جیسا کہ اس عکس تحریر کے مضمون سے ظاہر ہے آپکے وصال کے بعد آپکے لڑکے رکن الدین عرف سید راجو کو خلافت ملی۔ اور یہی سید رکن الدین ہیں جنکی تحریر کا عکس اسوقت شائع کیا جاتا ہے۔

دوسری تحریر حضرت شاہ عالم کی ہے جو سید رکن الدین کے جواب میں ہے حضرت شاہ عالم کے والد بزرگوار معروف بہ قطب عالم ہیں اور وہ فرزند ہیں سید ناصر الدین کے جو لڑکے ہیں سید تاجلال الدین حسین مخدوم جہانیاں جہانگشت کے حضرت قطب عالم سلطان مظفر اول کے عہد میں پٹن تشریف لائے آپکا اصلی وطن اچھ (سندھ) ہے کنیت آپکی ابو محمد اور اسم گرامی عبداللہ اور لقب برہان الدین اور مشہور بہ قطب عالم

جب اچھ سے آپ پٹن تشریف لائے تو سلطان احمد اول نے بڑی عقیدتمندی کے ساتھ زانوئے ارادت آپکے سامنے تہ کیا اور احمد آباد کا شہر جب تیار ہوگیا تو احمد آباد سے تین کوس پر ایک مقام ہے جو آجکل بٹوہ کے نام سے مشہور ہے اور شاہی وقتوں میں اسکو رسول آباد کہتے تھے آپ فروکش ہوئے۔ اور عقیدتمندوں نے ایک قلیل عرصہ میں اس جنگل کو آباد کر کے قابل زیارت جگہ بنادی۔ آپکی وفات ۸۵۷ھ ہے[۵۲]۔ آپکے بعد آپ کے منجھلے لڑکے شاہ عالم خلیفہ ہوئے آپکی کنیت ابوالبرکات اسم گرامی محمد اور لقب سراج الدین ہے مگر مشہور بین العوام والخواص شاہ عالم کے نام سے ہیں[۵۳] آپکا سلسلہ نسب

بقیہ صفحہ کے راجوں نے محمد تغلق کے مرنے پر جس نے انکو فتح کر لیا تھا خود مختار ہو بیٹھے تھے اور خراج دینا بند کر دیا تھا اس لئے ان دونوں پر چڑھائی ضروری سمجھی گئی۔ [۵۱] اس تحریر سے معلوم ہوا کہ سیدنا سکندر دہلی ہوکر خشکی کے راستہ منگلور پہنچے۔ اچھ سے براہ سمندر منگلور نہیں آئے جیسا کہ منگلور کے عوام میں مشہور ہے اسی طرح یہ بات بھی پایہ صداقت سے گری ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت بہ بہانہ بارات شادی مع سلح سپاہیوں کے ڈولیں میں بیٹھکر قلعہ میں پہنچ گئے۔ بلند پایہ بزرگوں کی ذات ایسے مکروہ اسباب دنیاوی سے مبرا ہوتی ہے اصل یہ ہے کہ غیر محتاط لوگوں نے دوسروں کا واقعہ آپکی طرف منسوب کر دیا حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ مرہٹوں کے عہد حکومت میں جبکہ منگلور پر وہ قابض تھے۔ سادات منگلور نے پُر فریب طریقہ سے مرہٹوں کو نکالکر خود قابض ہوگئے تھے جیسا کہ دیوان رنچھوڑجی کی تاریخ سورٹھ میں یہ بیان مفصل موجود ہے

[۵۲] اخبار الاخیار صفحہ ۱۵۷ مجتبائی اور بعض کتب مثلاً معارج الولایت میں سنہ وفات ۸۶۵ھ ہے۔

[۵۳] تاریخ الاولیا جلد ۲ صفحہ ۲۴۷

سیدنا امام علی نقی تک پہنچتا ہے[۵۱] آپکی ولادت باسعادت ۸۷۵ھ ہے سلسلہ کے لحاظ سے طریقہ سہروردیہ کے پابند تھے لیکن سیدنا شیخ احمد کھٹو سے بھی قادریہ مغربیہ طریقہ پر فیضیاب ہوئے گو آپ کو لوگ شاہ عالم کے نام سے جانتے ہیں مگر اپنے زمانہ میں زیادہ تر "میاں منجھلا" کے نام سے مشہور تھے جیسا کہ سیدنا رکن الدین راجو کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب اخبار الاخیار میں آپکا نام "شاہ منجھن" لکھا ہے حضرت پیر محمد شاہ رحمۃ اللہ نے متوفی ۱۱۶۲ھ اپنی کتاب "شجرہ عروجیہ" منظومہ میں بھی یہی نام لکھا ہے[۵۲] چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بقول حق انا الحق کشف عالم — بہ "منجھن شہ محمد شاہ عالم"

مولف برکات الاولیا نے لکھا ہے کہ "شاہ منجھن بخاری بھی آپکو کہتے ہیں" یہی مصنف تاریخ اولیا میں لکھتا ہے کہ آپ ملقب بہ منجھن پیر ہیں" اور پھر آگے چلکر اسکی تشریح کرتا ہوا لکھتا ہے کہ "آپ تین بھائیوں میں اوسط ہیں اسلئے آپ کو منجھلے پیر کہتے ہیں" ایک گجراتی تاریخ قلمی نظر سے گذری اس میں "منجھلا میاں" لکھا تھا صاحب مرآۃ سکندری نے ایک جگہ منجھن اور دوسری جگہ منجھلا تحریر کیا ہے۔

ان بیانات سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپکا صحیح نام "میاں منجھلا" ہی ہے جیسا کہ سیدنا رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ نے جو انکے ہمعصر ہیں بہت واضح طریقہ سے لکھا ہے اور بعد میں کاتبوں کی غفلت سے تصحیف ہو کر "ل" ساقط ہو گیا حضرت پیر محمد شاہ کے شعر میں بھی اگر "ل" ساقط نہ ہو تو مصرع موزوں رہتا ہے۔

آپکی وفات ۸۸۰ھ میں ہوئی ہے۔ آپ سلطان محمود بیگڑھ کے ہمعصر ہیں سلطان آپکا بڑا ادب کرتا تھا اور آپکے حکموں کی تعمیل اپنا فرض سمجھتا تھا۔ آپکے خلفا گجرات میں بکثرت ہیں اور آپکے کرامات عام طور پر بہت معروف ہیں آپ شاہانہ ٹھاٹھ سے رہا کرتے تھے۔ اور اسی لئے غالباً شیخ محدث دہلوی نے باوجود اعتراف کمالات و مقامات عالیہ کے آپ کی نسبت تحریر کیا ہے کہ "بعض اوقات لباس حریری پوشید و بر مشرب ملامتیہ می رفت"۔

میرے خیال میں آپ خلوت در انجمن کے مسلک پر عامل تھے اور اسی سبب سے دنیاوی وجاہت نے روحانیت پر قابو نہ پایا۔

اس تقریب کے بعد اب ہم سیدنا رکن الدین کے خط کا اور حضرت شاہ عالم کے جواب کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں

وھو ھذا

---

[۵۱] تذکرۃ الانساب صفحہ ۱۳۲ مرآۃ احمدی میں ہے کہ نسب آپکا سید جعفر مثنیٰ برادر حسن عسکری تک پہنچتا ہے۔

[۵۲] یہ کتاب ابھی تک قلمی ہے اور کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ میں محفوظ ہے۔

(۱) خلاصہ خط سید نا رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ

"یہ بندہ عرصہ دراز سے اس بات کی آرزو دل میں رکھتا تھا کہ آپ جیسے روشن ضمیر مرشد کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر شرف قدمبوسی حاصل کرے لیکن بدقسمتی سے اس وقت تک علائق دنیاوی و بداعمالی میں اس طرح منہمک رہا کہ حضور انور کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکا جسکا دل کو بیحد قلق ہے اگر حضور اقدس اس طرف توجہ فرمائیں اور اجازت دیں تو حاضر ہو کر سربلندی اور افتخار حاصل کروں، دوسری گذارش یہ ہے کہ میرے دادا سید سکندر بن مسعود رحمۃ اللہ علیہ کو آپکے پردادا حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت رحمۃ اللہ علیہ نے سورٹھ میں قیام کرنے کا حکم دیا تھا چنانچہ حسب الحکم خدمت مخلوق میں اپنی عمر بسر کی اُنکے بعد میرے والد مرحوم بھی قدم بہ قدم چلکر اس خدمت کو ادا کرتے رہے۔ والد کے انتقال کے بعد یہ خاکسار اُنکی پیروی کیلئے تیار ہوا لیکن مشکلات اسقدر پیش ہیں کہ آگے قدم بڑھنا مشکل ہو گیا ہے خصوصاً **قلعۂ گرنار** کا راجہ اور حکامان وقت اس قدر مسلمانوں کے برخلاف ہیں کہ اب اس جگہ قیام کرنا دشوار ہو گیا ہے اس لئے یہ وقت مدد کا ہے اس لئے آپ دعا فرمائیں کہ خدا ہماری مشکلات کو دفع کرے اور مدد کرکے ہمکو اس ظلم سے نجات دیں"

(۲) خلاصۂ جواب حضرت شاہ عالم

"آنجناب کا خط ملا۔ آپکی صحت کا حال معلوم کرکے خوشی ہوئی آپنے ہم سے ملاقات کا جو ارادہ کیا ہے یہ مبارک ارادہ ہے آپ ضرور آئیے، آپکے آنے سے معاملات جلد طے ہو جائینگے حل مشکلات کے لئے بہتر یہ ہے کہ آپ خدا کی طرف اپنی مشغولیت کو بڑھا دیجئے اور ہر وقت امید و بیم کی حالت میں رہیئے جو شیوۂ فقراء صالحین ہے اور ہر نماز کے بعد **اَللّٰھُمَّ نَسْتَعِیْنُ بِکَ عَلٰی طَاعَتِکَ** دس دفعہ پڑھا کیجئے مجھکو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپکے خاندان کے لئے کوئی وظیفہ مقرر نہیں ہے میں آج ہی دیوان سلطانی سے ملکر عرض کر دونگا ملاقات کے وقت تک اسکا ظہور ہو جائیگا حاکم قلعہ گرنار کی جو شکایت آپنے لکھی ہے اسکے متعلق آپ بیفکر رہیں حاکم مذکور عنقریب اپنی سزا کو پہنچے گا۔ اُسوقت دوست خوش اور دشمن ذلیل ہونگے۔ غیب کو حاضر سمجھ کر اس بات کا یقین رکھیں۔ آپ اپنے بچوں اور حاضرین مجلس کو میری دعائیں مخصوص جانیں اور خط و کتابت جاری رکھیں کیونکہ خط و کتابت بھی نصف ملاقات کے برابر ہے **وصلی اللّٰہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ اجمعین**۔

میں اس مضمون کے ضمن میں قلعہ گرنار یعنی جوناگڈھ اور اسکے راجہ کا ذکر کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اس مضمون سے متعلق ہے۔

جوناگڈھ

جوناگڈھ، گرنار جیسے بلند وبالا پہاڑ کے سبب ہمیشہ مستحکم مقاموں میں سمجھا گیا ہے اور اسی سبب سے بہت کم لوگوں نے اسکے فتح کی ہمت کی سب سے پہلے مسلمان بادشاہوں میں محمد تغلق نے اسکی طرف توجہ کی راجہ گرنار نے ایک شاہی مجرم کو پناہ دی تھی جسکے باعث محمد تغلق نے اسکو فتح کر کے اپنے مقبوضات میں شامل کرلیا[۱] لیکن بعد وفات محمد شاہ راجہ پھر قابض ہو کر باغی ہو گیا اسلئے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس پر فوج کشی کی گئی[۲] جب خاندان تغلق معرض زوال میں آیا اور ہر صوبہ کے ناظم خود مختار ہو بیٹھے تو گجرات کے ناظم کی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر راجہ پھر آزاد ہو گیا، مظفر شاہ اول کے بعد جب احمد شاہ اول نے تخت گجرات پر قدم رکھا تو بعد کوشش کے بعد تمام سرکشوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن راجہ گرنار اپنے قدرتی مستحکم قلعہ کے بھروسے پر مطیع نہ ہوا اسلئے مجبوراً ۸۱۷ھ میں احمد شاہ کو باقاعدہ فوج کشی کرنی پڑی چنانچہ دیوان رنچھوڑجی اپنی تاریخ سورٹھ میں لکھتے ہیں :۔

چوں بادشاہ احمد شاہ گجراتی بہ حمیت دین محمدی لشکر استیصال جوناگڈھ کشید راجہ کھینگار بن جے سنگھ و دیوانش میر تنک (میر سنگھ) ناگر تاب اقامت نیاوردہ بہ پناہ قلعہ در سمت ۱۴۷۰ بکرمی سلامت ماندند۔ اما از تطاول بہادران اجل طبعی نہ ماند۔ شہر غارت شد۔ چہ در شہر وچہ در پرگنہ جات جابجا سید قاسم والو الخیر کہ برائے تحصیل از سلامی تھانہ گذاشتہ بود مسلمانان را جاگیر دادہ آباداں ساخت۔ (صفحہ ۴۹ قلمی بہ خط مصنف)

جب بادشاہ احمد گجراتی نے دین محمدی کی حمیت میں جوناگڈھ کی بیخ کنی کیلئے فوج کشی کی تو راجہ کھینگار بن جے سنگھ اور اوسکا وزیر میر تنک (میر سنگھ) ناگر (شہر میں) ٹھہر نہ سکے اور ۱۴۷۰ سمہ بکرمی میں قلعۂ (گرنار) کی پناہ میں (جاکر) سلامت رہے لیکن بہادروں کی زبردستی سے طبعی موت تک جی نہ سکے شہر لٹ گیا۔ کیا شہر میں اور کیا علاقوں میں جابجا سید قاسم اور ابوالخیر نے جنکو سلامی کا روپیہ وصول کرنیکے لئے تھانہ (دار بناکر) قائم کئے تھے۔ مسلمانوں کو جاگیریں دیکر آباد کئے۔ صفحہ ۴۹ قلمی بدست مولف۔

مرآۃ احمدی میں بھی اسطرح لکھا ہوا ہے۔

اما قلعہ جوناگڈھ کہ قریب دامن کوہ گرنار واقع است بدست سلطان افتاد۔ زمینداران سورٹھ مطیع ومنقاد گشتہ پیش کش قبول نمودند صفحہ ۵۱

لیکن قلعۂ جوناگڈھ جو کوہ گرنار کے دامن کے قریب واقع ہے سلطان کے ہاتھ آگیا (ضلعۂ) سورٹھ کے زمینداروں نے تابع فرمان ہو کر پیش کشی دینا قبول کیا۔ صفحہ ۵۱

[۱] ضیا برنی واقعہ محمد تغلق [۲] تاریخ سورٹھ صفحہ ۴۹ قلمی بخط مصنف

سلطان احمد کے بعد گجرات کمزور ہاتھوں میں ہونے کے سبب غیر منظم - اور خانہ جنگی سے بدعملی پھیل گئی راجہ گرنا
اس بدنظمی سے پھر فائدہ اٹھاکر خود مختار ہوگیا اور لوازمات شاہی کا استعمال کرنے لگا محمود بیگڑہ نے جب زمام حکومت
اپنے ہاتھ میں لی تو راجہ گرنار اُسی طرح خود مختار تھا جس طرح محمد تغلق سے پہلے۔ اسوقت قلعہ پر قبضہ راجہ منڈلک
(راماندلک) کا تھا راجہ منڈلک کا چُوراسمہ خاندان تقریباً دو ہزار برس سے اس پر قابض چلا آرہا تھا[1] راجہ مانڈلک
اس خاندان کا آخری راجہ تھا اور دنیا میں آخری تاجداروں کا جو حال ہوتا ہے وہی راجہ منڈلک کا تھا مغلیہ سلطنت
کے آخری بادشاہوں کی طرح یہ بھی مغرور اور عیش پرست تھا چنانچہ عام کتب تاریخ میں یہ مشہور روایت درج ہے کہ اس
عہد میں ہبیسل نامی ایک بقال تھا جو "من موہن" نامی ایک خوبصورت عورت رکھتا تھا جب اسکی خبر راجہ کو ہوئی تو اس
عورت کو اسنے اپنے محل میں طلب کر کے شب باش ہوا اسی طرح موضع موبنہ ضلع جوناگڈھ ایک حسین عورت "ناگی چارن
رہتی تھی جسکا شہرہ سنکر بہ بہانہ شکار روانہ ہوا، جب اسکے گھر پہنچا تو وہ عورت اسکو مہمان سمجھکر اسکی عزت افزائی کو اٹھ
مگر راجہ اسکو دیکھکر ایسا بدمست ہوا کہ بے اختیار اپنا دست ہوس اسکے قبہ ہائے نوری کی طرف دراز کیا۔ جس کا انجا
کچھ اچھا نہ نکلا (تاریخ سورٹھ قلمی)

راجہ بیحد مغرور ہوگیا تھا، اور کسی کی نصیحت پر کان نہیں دھرتا تھا۔ اپنے باپ دادوں کی طرح وہ بزرگوں کا ادب
ولحاظ نہ کرتا تھا چنانچہ "نرسی مہا برش" کی اسنے سخت توہین کی جسکا اثر عوام پر اچھا نہ پڑا، راجہ کی طرف سے عام
پر نفرت پھیل گئی لوگوں کا خیال ہے کہ اس عابد کی بددعا سے سلطنت چلی گئی، دیوان رنچھوڑ جی کے الفاظ یہ ہیں۔

وبشامت گناہے کہ باچنیں مرد عارف بے ادبی کرد سلطنت ازخاندان رائے زادگان چوراسمہ رفت	اور اس گناہ کی شامت سے کہ ایسے عارف شخص کی بے اد کی چوڑاسمہ خاندان کے رائے زادوں سے سلطنت نکل گ

غرض یہی عیش پرستی اور امور سلطنت سے بے پرواہی تھی جسکے سبب حکامان سلطنت اپنے فرائض سے غافل
ہوکر دراز دستی پر اتر آئے - اور اس سے تمام ملک میں برائی پھیل گئی۔ مرآۃ سکندری میں ہے کہ

القصہ قرمچیان ولایت سورٹھ دائماتاخت وباخت اطراف بلاد گجرات می نمودند۔ و وز دانش درپیشہ دزدی مُصر بودند۔	قصہ مختصر ملک سورٹھ کے دہاقین ہمیشہ بلاد گجرات تاخت تاراج کرتے رہتے تھے اور اوسکے قزاق ڈاکہ زنی میں اصر کرتے تھے۔

[1] مرآۃ سکندری۔

اس بدامنی کے سبب قافلے عام طور پر لٹنے لگ گئے تھے۔ مسافر اور تاجران غیر ملکی بیحد خوفزدہ اور غیر مطمئن تھے۔ یک قلمی گجراتی تاریخ میں ہے کہ ایک عرب خاندان کو جو سورٹھ میں سفر کر رہا تھا سورٹھ والوں نے لوٹ لیا' اور حاکمان سورٹھ نے اسکی فریاد پر کوئی توجہ نہ کی مجبوراً اس نے احمد آباد محمود شاہ کے پاس عرضداشت بھیجی۔ حاکمان سورٹھ نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ مذہبی معاملات میں بھی جبر و اکراہ شروع کیا۔ جس سے غیر ہند رعایا میں سخت بیدلی پھیل گئی اور راجہ کی حکومت سے بیزار ہو گئے۔ دیوان رنچھوڑجی اپنی تاریخ سورٹھ میں تحریر کرتے ہیں:-

"بعد حملہ احمد شاہ اپنے مذہب کی کشش سے ہر قسم کے مسلمان سندھی۔ بلوچ۔ جٹ۔ کھوکھر۔ ملک ملتانی۔ قریشی۔ افغانی اور غوری اس ملک میں آباد ہو گئے۔ راجہ نے ہر شخص سے پختہ عہد لینا شروع کیا کہ ریش تراشینگے۔ گائے ذبح نہ کرینگے اور مسجد کی طاق میں شیولنگ کا نقشہ بنا کر اس کو سجدہ کیا کرینگے (صفحہ ۹۴ قلمی)"

غالباً اسی قسم کے مظالم تھے جس سے سیدنا رکن الدین رحمۃ اللہ جیسے گوشہ نشین عابد و زاہد مرنج و مرنجاں طبیعت رکھنے والے شخص بھی گھبرا اٹھے، سیدنا رکن الدین رحمہ اللہ نے اپنے خط میں شاہ عالم سے انھیں مظالم کی شکایت کر کے خدا سے دفع مظالم کی استدعا کی ہے و باللہ التوفیق

آخیر میں عکس بلائے تحریر کی اصل عبارت معہ ترجمہ پیش کر کے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

عرضداشت سیدنا رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ

"بندہ خاندان حضرت نبوی رکن الدین آدم بن سید سکندر حسینی پرورده و نہال گردانیده منسلک به سلک بندگی .... منبع .. .. الاتقیا سراج الاصفیا شمس الفقرا مرشد الطالبین۔ برہان المحققین ختم المجتہدین سید السادات منبع الکرم والکرامات شیخ جلال الحق والشرع والدین قدس اللہ سره العزیز است و من المہد الی اللحد با عن جد طوق عبدیت و عبودیت من الخالق والمخلوق برگردن جان داده اللہم زد ولا تنقص۔ کمترین خدام بکلیہ تراب اقدام در مقام عبودیت شرط العبد بجا می آرد۔ و بازمی نماید مدتے مدید است متوالی اللیالی والایام متواتر الشہور الاعوام آرزو رتقار و آرزو روئے طلعت شاہ و شاہزادہ کونین کبد رشہور الثقلین قطب المشائخ زبدۃ الاخیار برگزیدہ حضرت الملک الملک پیش ادا آیۂ الذین لاخوف علیہم سید السادات منبع العلم والعبادات مفخر اہل السیادت حجت اہل شرع

والطریقۃ الشیخ الاعظم والمعظم والقدوۃ الاکرم شیخ محمد عرف میان معظم وکرم «میان منجھلا» خلد اللہ رایات جلالتہ منصوبہ علاقبۃ السماک وآیات کمالہ علی جبہۃ الافلاک - بندہ امیدوار دوالہ دیدار برائے مشاہدۂ مامون وطلعت ہمایون خدا وندا شدہ - لالہ آسا داغ را بخون دل تر می کند ونیلوفر مثال در آب دیدہ غوطہ می خورد - ودائم الاوقات بتضرع وابتہال از حضرت ذوالجلال ومسبب الاسباب مسالت می نماید یا رب العالمین نعمت ملاقات شاہ عدیم المثال کریم الخصال علی احسن حال عنایت فرما بہ منہ وکمال کرمہ اشتیاق پابوس از حد غائت را اگر حرفے نویسم ز اشتیاقت قلم در شرح آں عاجز بماند - بعزۃ اللہ وجلالہ، عمر خویش بر منہا بردم وی برم بنوعے شرف پابوس وآستانہ بوسی مشرف شوم وخاک آستانہ در دیدہ جہاں بیں سرمہ کنم - وشرائط بندگی بجا آرم - ہمدریں آرزو عمرے رود بر حیات عالم غدار چہ اعتماد ترسم کہ فرصت نکند وبہ تمنائے مذکور ترسم بجہت ایں معنی بندہ در تفکر می باشد ودر خود می خرد شد وبہ عزیمت می کوشد ولیسا اہتمام دارد بعد ہزار نیازمندی در دائرہ خدمت گاراں باریابد بواسطہ قید الماراشد من قید الحدید میسر نمی شود - العبد یدبر اللہ یقدر -

ہر وقت کہ عنایت ابدی وسعادت سرمدی خواہد بود وبخت یاوری خواہد کرد شاہزادہ ثقلین بجانب خدمہ اذن خواہد فرمود طالب بمطلوب خواہد آورد - النصیب یصیب ؎

خواہم کہ بپرم سوے وصلت   لیکن چہ کنم کہ پر نہ دارم

چندکرت بندہ خواست بہ موازنہ خود بحضرت شاہزادہ کونین عریضہ نیازمندی وشکستگی باز نماید فکر... مزاحم قدم من شد مدعقل بعجز معترف می کند چوں اولیائی تحت قبائی لا یعرفہم غیری فرمان شدہ است بندہ بکدام زبان تقریر را در گماں انداز ودچہ نویسد خاما استظہارے در باطن راہ یافت بحضرت پیران دین مریدان یقین حال خود باز نمودہ اند - با ایں دانستہ شوخی کردہ ام ووقاحت را در کار بستم وعریضہ باز نمودہ ام وخود را باآنکہ ہیچ محلے ندارم بہ مبارک ظاہر نہ گشتہ ام بستم در زمرہ ثنا سرایاں درگاہ شاہزادہ بندہ نواز در آوردہ ام چہ کنم در ماندہ ام در دریا۔ درماندگی فرو رفتہ ہستم چنانچہ ہستم اگر کیفیت واقعہ حال کما حقہ باز دیدہ آید طویل افتد وشکایت حق سبحانہ وتعالیٰ باشد بندہ کالہائم فی البوادی ایام منصرف میکند وسکونت قصبہ منگور برحکم (حوالت بندگی) قطب اقطاب عالم قدس سرہ العزیز سید السادات سید سکندر مرحوم اختیار کردہ اند وقصبہ مذکور خاصہ اسلام نصب کردہ حضرت قطب الاقطاب علم بندگی مخدوم جہانیاں قدس اللہ روحہٗ بعد الاستخارہ والاشارہ سید سکندر مسعود حسینی را در شہر سودھرہ نامزد کردہ اند وسکونت قصبہ مذکور فرمودہ اند درادقت (دراں وقت) در شہر مذکور ہمہ جا کفر بود وسید السادات

...فرمان بود سرانجام رسانیده اند۔ چوں بہ مغرب فنا فرہ شدند والد مرحوم نیز تشبہ طریق وسع امکان باتمام رسانیدہ
...فات والد مرحوم بندہ خاکروب آستانہ بصورت لنگاں وکوراں وضعیفاں برحسب طاقت بشری بامید
...من تشبہ بقوم فھو منھم وان لم یعمل بعملہم دراں راہ می شتابد۔ امادر وقت سید
...مات دنیاوی فراغ ندارد معلوم فرمودہ باشند۔ مقدم قلعہ گرنار (زیراکوشی) دراسلام می کند بہ سمع شاہ ولایت
...معارضہ داشتہ شدہ وقت اعانت است ازسکونت درقصبہ مذکور دشوار دارد الا بہ عنایت باری تعالیٰ و
...ت اعانت شاہزادہ معظم ومکرم ہمہ کارہا حسب مطلوب خواہد رسید ومدعیان مقہور خواہند شد"
التماس ایں حال آشفتہ ...... وضلالۃ ..... رحمت کنا ازظلمات (انگیں) .... بہ سائل ..... از
...خدمت ..... بندہ حلقہ ...... کمربستہ بخدمت ..... اتمام گشت قصہ حال بحضور دارد ..... واثق
...نعمت ہائے دارین ملاحظہ میاں معظم ..... مرحمت ..... مرقد اقدس ..... عالم قدس ..... حضر ..... بواسطہ نغمہا
... حضرت قطب عالم بودند بندہ کرم ..... آرزو دیدار ست کالمریض الی ..... العافیۃ ونیاز مند حضور شد .....
...ش بود می باید ..... ہم تصور حل اماں بعید انشارہ ..... قریب حضرت درخدمت اشارہ فرمایند وبہر ..... بالمنتہا.....
..... ازمیاں التست ایں بندہ ..... وسرفراز فرمایند امید بفضل باری تعالیٰ ..... وجائے مستحکم رابرمحل صلح بنظر
...خواہد گذشت نعمت دولت دارین"

...ب حضرت شاہ عالم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد لوازم دعا ازدیاد حیات وکفایت مہمات ..... وترقی درجات وتعلی مقامات (خدمت) بنابر جمع سید السادات
... تعالیٰ ... آل طٰہٰ ویٰسین بن سید المرسلین سید رکن الدولۃ والدین المعروف سید راجو لازال فی عون اللہ الرحمٰن
...دمکتوب مرغوب خدمت اخوی دام سعادتہ مبنی ازکمال اعتقاد ومعلم ازوفور اتحاد درباب غالب شدن سلام اشتیاق
...یت بااین مخلص وصول یافت دریافت اخبار صحت ذات فرحت فراواں وبہجت بے پایاں بحصول پیوست۔ مقرر ضمیر نور
...اینجانب غیبت خدمت اخوی را برحکم المرءمع من احب خصوصاً تصور میکند۔ ونیت صادق موجب ثواب علیٰ ست
...بارک تعالیٰ بمراد ومتمنیٰ دل رساند"

دعوة الغائب اسرع الاجابة .. بذکر حق مشغول باشید۔ کما قال اللہ تعالیٰ فاذکرونی اذکرکم و برائے تحیا
توفیق بر طاعت بعد ہر فریضہ این کلمات دہ بار گویند اللھم انا نستعین بك علی طاعتك و اوقات را بذکر
تدبیر و تفکر صمدی معمور دارند و در رجا و خوف باشند۔ تا بمقصود دینی و دنیاوی برسند و از حضرت عزت خواستہ شدہ اسم
نواختہ سمع حضرت قطبیہ مرشدیہ ہمت تاباں باشد بمنہ واحسان کرمہ۔ دیگر چنانچہ حضرت قطب اقطاب عالم قدس اللہ
واوصل الغایۃ (فتوحہ) .. .. سید السادات سعد الملۃ والدین سکندر مسعود حسینی مفوض گردانیدہ .. .. وہما جا باشد
.. .. باد بشیخ مرشد با تو است و نیز ما با تو ایم در حق دوستاں و مخالفاں حکم بیش ازاں .. .. فرمودہ اند۔ و بقلم کرم مثالہ
عطا کردہ اند معمول اند دیگر بیش از مکتوب معلوم .. .. اخوی باخیلی نہ استقامت و وظیفہ تعین ندارد۔ دریں وقت می
خاندان بسیار اند خود با اصحاب دیوان حماہ اللہ تعالیٰ ملاقات خواہد کرد۔ برحسب مشاہدہ معائنہ خواہد شد از جہت ملاقۂ
اہتمام کلی بہ نشستہ بودند۔ مبارک باشد غنیمت است زود بیائید (آمدنت) ہمہ کارہا برسد بہ مطلوب خواہد رسید۔ و آنکہ از جہد
فسدہ مقدم قلعہ گرنار مع .. .. از قصبہ منگلو مسطور بود مقدم مذکور مقہور است عن قریب الایام بہ سزا خود خواہد پیوست
مقر ضمیر الور باد۔ (بہ ترک درویشانہ .. .. ارسال نداشت) بر کار بند و موقوف ندارد و اولیا نعمت مسرور واعدا ردّا
مقہور۔ و ہیچ تفکر را بخود راہ نہ دہند کہ راہ سوئے دوست ہر آئینہ ابد السنت باید کہ غیبت را حضور دانند مراسلات شرائط
جاری دارند المکتوب نصف المشاہدہ" فرزندان ہر یک و حضار مجلس ہمہ بدعا مخصوص اند۔ وصلی اللہ علی خیر خلقہ
محمد و آلہ اجمعین ط

ترجمہ عرض داشت سیدنا رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ

بندہ خاندان نبوی رکن الدین آدم بن سید سکندر حسینی جو پروردہ اور تعلیم یافتہ بندگی کی لڑی (ہار) میں پرویا
سرچشمہ پرہیزگاران برگزیدہ لوگوں کے چراغ فقیروں کے آفتاب طالبان حق کے مرشد محققوں کی دلیل آخری مجتہدوں
کے۔ سردار سخاوت اور بزرگیوں کے سرچشمہ شیخ جلال الحق والدین رجلال الدین جہانیاں جہانگشت) کا ہے اور ابتدا سے
اسوقت تک باپ دادوں سے خالق و مخلوق کی طرف سے غلامی اور عقیدت کا طوق اپنی گردن میں رکھتا ہے۔ اے خدا اسکو
زیادہ کر اور کم نہ ہونے دے غلاموں میں سب سے کم درجہ کا آدمی بلکہ قدموں کی خاک بندگی کی جگہ میں وعدہ کی شرط کو پورا
ہوا عرض کرتا ہے کہ ایک عرصہ ہوا پے در پے رات اور دن آئے سال اور مہینے گذرے کہ ملاقات کا خیال اور دونوں

اہزادہ کے روشن چہرہ کے دیدار کا آرزو مند ہوں ۔ جو دونوں جہان کے مہینوں میں مثل بدر کے ہے ۔ مشائخ کا قطب
ہتر ۔ خدا کے منتخب ۔ آیۃ الذین لاخوف علیہم انکے پیش نظر سیدوں کے سردار علم عبادت کے سرچشمہ
کے مفخر صاحبان شریعت و طریقت کی دلیل بڑے اور بزرگ شیخ پیشوا باعزت شیخ محمد مشہور بہ "میاں منجھلا" اللہ
وں کے جھنڈے کو آسمان کے قبہ پر ہمیشہ قائم رکھے اور انکے کمالات کے نشانیوں کو آسمان کی طرف ہمیشہ ظاہر رکھے
نق دیدار آقا کے مبارک چہرہ کے مشاہدہ کا امیدوار ہوا ہے لالہ کی طرح رخ کو خون دل سے تر کرتا ہے اور نیلوفر کی
وں کے پانی میں غوطہ مارتا ہے اور ہمیشہ اور ہر وقت عاجزی کے ساتھ خدائے برتر سے یہ بندہ سوال کرتا رہتا ہے
مان کے پروردگار! اپنے کمال مہربانی اور احسان سے بہتر طریقہ پر کریم الاخلاق بادشاہ کے ملاقات کی نعمت عطا

قدمبوسی کے بے انتہا اشتیاق کی بابت اگر میں ایک حرف بھی لکھوں تو بوجہ غلبہ شوق قلم اسکے بیان سے عاجز رہ جائے
للہ کی عزت اور اسکے جلال کی کہ اپنی عمر گنا ہوں میں بسر کی اور کر رہا ہوں چاہتا ہوں کہ کسی طرح قدمبوسی اور آستانہ بوسی
۔ حاصل کروں اور دنیا کو دیکھنے والی آنکھ میں آستانہ کی خاک کا سرمہ لگاؤں اور غلامی کی شرائط ادا کروں ۔ انھیں
میں میری عمر گذر رہی ہے ۔ اس بے وفا دنیا کی زندگی پر کیا بھروسہ، مجھے خوف ہے کہ شاید مہلت نہ مل سکے اور
مذکور میں بندہ بار ہا اس سبب سے پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے اور دل سے ارادہ کرتا ہے اور بہت اہتمام رکھتا ہے کہ لاکھوں
کے ساتھ غلاموں کے حلقہ میں باریاب پائے لیکن مطابق اس مثل کے "کہ پانی کی قید لوہے کی قید سے زیادہ سخت ہے" یہ آرزو
تی بندہ کچھ تدبیر کرتا ہے اور خدا کچھ اور انتظام کرتا ہے جس وقت خدا کی عنایت اور ہمیشگی کی سعادت ہوگی اور میرا نصیب
تو دونوں جہان کے شاہزادہ اپنے پاس آنکی اجازت دینگے ۔ طالب مطلوب کے پاس پہونچے گا اور جو نصیب میں
یگا ۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپکے پاس اڑکر جاؤں مگر کیا کروں کہ پر نہیں ہے ۔ بارہا دل میں آیا کہ حضرت شاہزادہ
اپنی حاجتمندی اور بے نوائی کا عریضہ (خط) لکھوں لیکن خیالات وقت پر مزاحم ہوئے اور عقل عاجزی کا
نے لگی چونکہ "اولیاء تحت قبائی لایعرفہم غیری" (میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں انکو میرے سوا
ا نہیں جانتا) کا حکم ہو چکا ہے تو پھر بندہ کس زبان سے تقریر کو گمان میں لاوے اور کیا لکھے ۔ لیکن مدد چاہنے کا
طن میں آیا ۔ پیران دین کے آگے یقین رکھنے والے مریدوں نے اپنا حال کھولا ہے ۔ باوجود ان باتوں کے علم کے
شوخی کی سنے اور بے ادبی سے کام لیکر عریضہ (خط) پیش کیا ہے اور باوجودیکہ میں اپنے آپ کو کسی لائق نہیں سمجھتا
لر سارک مجھ پر کبھی پڑی پھر بھی میں نے اپنے آپ کو تعریف کرنے والوں کی جماعت میں شامل کر لیا ۔

اور شاہزادہ غریب پرور کے دربار میں حاضر ہو گیا کیا کروں کہ مصیبت کا مارا ہوں اور مصیبت کے دریا میں غوطہ کھا رہا ہوں جیسا کہ ظاہر ہے اگر حقیقت حال کا اظہار کروں تو بات طویل ہو جائیگی اور خدا کی شکایت سمجھی جائیگی بندہ جنگلوں میں بھٹکنے والے کی طرح دن گذار رہا ہے۔ قصبہ منگلور کا قیام سید سکندر مرحوم نے قطب اقطاب عالم (جلال الدین جہانیاں جہانگشت) کے حکم پر اختیار کیا ہے اور اگرچہ حضرت قطب اقطاب علم بندگی مخدوم جہانیاں (پاک کرے اللہ انکی روح کو) نے قصبہ مذکور میں استخارہ اور اشارہ کے بعد علم اسلام خود نصب کیا ہے لیکن سید سکندر مسعود حسینی کو شہر سورٹھ میں نامزد کر کے قصبہ منگلور میں قیام کا حکم فرمایا اسوقت شہر مذکور میں ہر جگہ کفر تھا اور سید السادات مذکور نے حکم کے مطابق سرانجام دیا جب وہ وفات پا گئے تو والد مرحوم بھی حتی الامکان انکے نقش قدم پر چلتے رہے بعد وفات والد مرحوم کے بندہ آستانہ کی خاک چھاننے والا لنگڑے اندھے اور کمزوروں کی طرح اپنی طاقت کے مطابق اس حدیث کی امید پر راہ طے کر رہا ہے کہ "جسنے کسی قوم کی مشابہت اختیار کر لی تو وہ انھیں میں سے شمار کیا جائیگا اگرچہ انکے جیسے اعمال اسکے نہوں" لیکن سید موصوف کے وقت میں دنیاوی مصیبتوں نے اسقدر وسعت اختیار نہ کی تھی آنجناب کے ذہن نشیں رہے قلعہ گرنار کا حاکم اسلام کو کمزور کرنے میں کوشش کرتا ہے خصوصیت سے حضور کے کانوں تک یہ بات پہنچائی ہے۔ مدد کا وقت ہے قصبہ مذکور میں اب قیام مشکل ہو گیا ہے لیکن خدا کی مہربانی اور شاہزادہ معظم کی عنایت سے تمام کام آسانی سے حاصل ہو جائیگا اور دشمن ذلیل ہونگے۔

ترجمہ خط حضرت شاہ عالم رحمۃ اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد پیش کرنے دعائے زیادتی عمر اور حل مشکلات اور ترقی درجات اور بلندی مقامات پوتے حضرت مجمع سید السادات کے جو سرچشمہ . . . تعالیٰ طٰہٰ و یٰسین کی اولاد سید المرسلین کے بیٹے سید رکن الدولۃ والدین (رکن الدین مشہور بہ راجو ہیں مہربان خدا کی مدد ہمیشہ آپکے ساتھ رہے (یہ بندہ) ظاہر کرتا ہے کہ پسندیدہ خط میرے بھائی کا (خدا انکی نیک بختی کو ہمیشہ قائم رکھے) اس خلوص رکھنے والے تک پایا جو کمال اعتقاد پر مبنی اور زیادتی اتحاد کا ظاہر کرنے والا اور غلبہ سلام و اشتیاق کو بتانے والا تھا آپکی ذات کی صحت کی خبر سے بیحد خوشی اور بے انتہا مسرت حاصل ہوئی روشن دل کو معلوم ہو . . . بندہ اپنے بھائی کی غیر حاضری کو خصوصیت سے "المرء مع من احب" (آدمی جسکو پسند کرتا ہے اسی کے ساتھ ہے) کے موافق خیال کرتا ہے۔ اور سچی نیت عمل کے ثواب کا باعث ہے۔ خدا کی

مقصد دلی تک پہونچائے (غائب کی دعا جلد قبول ہوتی ہے) آپ خدا کی یاد میں مشغول رہیں جیسا کہ خدا خود فرماتا ہے
ھکو یاد کرو میں بھی تم کو یاد کرونگا - اور سرکشوں پر فتح کی توفیق پانے کے لئے بعد ہر فریضہ نماز کے اس کلمہ کو دس بار پڑھیں
مدالخ (اے میرے خدا میں تجھ سے تیری فرماں برداری کے ذریعہ مدد طلب کرتا ہوں) اور اپنے اوقات کو ذکر- فکر
مدا کے دہیان میں مصروف رکھیں اور امید و بیم کی حالت میں رہیں تاکہ دینی و دنیاوی مقصود تک آپ پہونچ جائیں
مدا سے یہ بات چاہی گئی ہے - حضرت قطبیہ مرشدیہ (حضرت مرشد قطب اقطاب کے کانوں تک پہونچی ہوئی
اسکے احسان اور کرم کے دسہ پر ہمت بلند رکھو.

امر دوم یہ کہ حضرت قطب اقطاب عالم نے (پاک کرے اللہ انکی روح کو اور ہم تک اُن کی خوشی کو پہونچائے)
ید السادات سعد الملۃ والدین سکندر حسینی کو سپرد کیا تھا . .. . شیخ مرشد تمہارے ساتھ ہے اور ہم بھی
رے ساتھ ہیں - دوست اور دشمن کے بارے میں حکم انھیں سے ہے جیسا کہ فرمایا ہے اور سخی قلم سے بار ہا عطا
ہ کی شان اپنا معمول بنایا ہے -

دوسری بات یہ ہے کہ خط سے پہلے معلوم ہوا کہ میر ابھائی مع خاندان کے مستقل وظیفہ معین نہیں رکھتا بندہ خود
والوں سے (اللہ ان کو محفوظ رکھے) ملاقات کریگا - ملاقات کے موقعہ پر ظاہر ہوگا - ملاقات کے لئے پورے بندوبست
لق آپ نے لکھا ہے - آنا مبارک ہو - غنیمت ہے جلد آئیے آپکے آنے سے تمام کام حسب خواہش انجام پا جائینگے
لجہ مقدم قلعہ گرنار کے دنماد کے متعلق .. .. .. قصبہ منگلور سے لکھا تھا - تو مقدم مذکور پر غضب نازل ہوچکا ہے
ینی سزا کو پہونچے گا آپکے روشن دل کو معلوم ہو .. .. .. بلند پایہ احباب خوش ہونگے - اور سلطنت کے دشمنوں
کا قہر نازل ہوگا - آپ کسی قسم کا تردد نہ کریں کہ دوست کی طرف کا راستہ بے شک بدل کا ہے - چاہئے کہ
ضر کو حاضر جانیں - اور خط و کتابت جاری رکھیں کیونکہ خط بھی آدھی ملاقات ہے آپکے ہر ایک لڑکے اور حاضرین
میں سے ہر شخص دعا کے ساتھ مخصوص ہیں - اور اللہ کی رحمت سب سے بہتر مخلوق حضرت محمد اور انکی تمام اولاد
ہو -

اس مضمون کے بعض حصوں پر مولانا مولوی سید محمد حسن صاحب کے اعتراضات
ماہنامہ رسالہ زبان بابت جون جولائی خاص نمبر صفحہ ۱۵ ملاحظہ فرمائیں

عربوں کے علوم

(از جناب حافظ سید مظہر احمد صاحب ادیب بھوپالی)

مانۂ جاہلیت | زمانۂ جاہلیت کے عرب اپنے جملہ علوم کو سینوں میں محفوظ رکھتے تھے۔ جو سینہ بسینہ منتقل ہوتے رہتے ے۔ مگر عام طور سے اُن کو حوالۂ قلم کرنیکے معتاد نہ تھے۔ جزیرۃ العرب میں اتنے قدیم زمانہ سے حروف کا استعمال چلا آرہا ہے (جسکی مجمل تاریخ انشاءاللہ آیندہ پیش کرینگے) کہ اوسکی صحیح تاریخ کا پتہ لگانا ایک اہم ترین کام ہے۔ عرب اپنے وم ذاتیہ کو نہ کتابی شکل میں جمع کرتے تھے اور نہ اسکو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن مقابر کے کتبہ اس کو ین کے ساتھ ثابت کرتے ہیں کہ وہ حروف کا استعمال دیر یا یادگاروں میں کرتے تھے۔ لیکن ان نوشتوں کے علاوہ ہ بھی تھا نوک زباں تھا کہ بچے اپنے باپوں سے سیکھتے اور متقدمین اپنی متاخرین کو تکرار روایت تابع سمع اور دلوں ی جانچ اور پرکھ سے سکھلایا کرتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عربوں کے وہ علوم جن میں اُنکو خاص دلچسپی تھی (۱) شعر (۲) خطابت (۳) انساب اور (۴) قیافہ تھے۔

علم قیافہ میں انکو وہ ید طولیٰ تھا کہ آدمی کی ہیئت شکل رنگ اور بات چیت سے اوسکے اخلاق عادات اور صفات کا فوری پتہ لگالیتے اور جس نتیجہ پر وہ پہنچتے شاید ہی خطا کرتا ہو۔ جس سے اُنکے ذہن کی رسائی اور تیزیٔ فکر پتہ چلتا ہے۔

(۵) تاریخ عربوں کا خاص فن تھا جس سے انکی طبیعت کو گہرا لگاؤ تھا جو نئی حوادث انکے ملک میں رونما ہوتے وہ اُن کو کبھی بطور اخبار متفرقہ بیان کرتے اور کبھی اُن کو یاد کرتے اور یاد کراتے۔ اسیطرح جن دوسری اقوام سے ن کو ملنے کا اتفاق ہوتا اُن کے ممالک کے واقعات قدیمہ وجدیدہ کو سنتے اور یاد کرلیتے۔ کیونکہ انکا خیال تھا کہ واقعا الم مثل ایک رہٹ کے ہیں کہ وہی ڈولچیاں اپنے چکر میں اوپر سے نیچے جاتی اور پانی کو باہر پھینکتی ہیں۔ جب ایک ی نوعیت کے اسباب پیدا ہوں گے تو اُن سے وہی واقعات رونما ہوجائینگے جو ایک بار ہو چکے ہیں۔ اِس لئے خود کو اور لک کو آیندہ خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے تاریخ کا جاننا نہایت اہم ترین شے ہے۔

یہی عربوں کا وہ نظریہ ہے جو آگے چلکر فلسفہ تاریخ بنجاتا ہے جسکی بنیاد ابن خلدون نے ڈالی اور رفتہ رفتہ بمصداق "ہر کہ آمد برآں مزید کرد" یورپ میں فلسفۂ تاریخ ایک جداگانہ ہی علم ہوگیا ہے۔

(۶) علم ہیئت۔ چونکہ عربوں کو ریگستان میں جہاں راستہ کا پتہ لگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ طول طویل سفر کرنا پڑتا تھا اس لئے وہ ابتدا ہی میں اس پر مجبور تھے۔ کہ ستاروں کی مدد سے اپنے راستوں کا پتہ لگائیں انکے سہارے دور دراز سفروں کو طے کریں۔ اسلئے بروج اور منازل شمس میں وہ مرتبہ اور دست قدرت ہوگئی کہ ایک قوم بھی انکے لگے کی نہ تھی۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ عرب کو علوم ہیئت اور اجرام فلکی سے کیا نسبت۔ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے کیونکہ جب ایک عرب کو تاروں بھری رات میں سفر کرنیکا اتفاق ہوا اور اوس نے بعض ستاروں کو خاص خاص مقام پر طلوع و غروب ہوتے دیکھا۔ تو اونکی مدد سے اس نے راستہ آسانی اور صحت کے ساتھ دریافت کرلیا۔ چونکہ انکا دن رات سفر ہی میں گذرتا تھا۔ اسلئے بلا علم گردش اجرام فلکی ایک لمحہ بھی کام نہیں چل سکتا تھا۔ اور عرب کے لق و دق میدانوں میں سے گذرجانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اسلئے ضرورت نے اس پر مجبور کیا کہ وہ فلکی منازل شمس و قمر اور مواقع نجوم کو اپنی پڑوسی کلدانیوں سے جنہوں نے دنیا میں سب سے پہلے رصدگاہ قائم کرکے بروج کے علامات اور نشانات قائم کئے تھے اور موجودہ تقسیم اوقات بھی ان ہی کی یادگار ہے۔

(۷) طب بالتجربہ۔ اس علم میں عربوں کو کافی حصہ ملا تھا۔ یہ مختلف جڑی بوٹیوں اور بسیط اجزا کا بار بار تجربہ کرتے اور جب اپنے تجربات کو صحیح پاتے تو انہی کی مدد سے علاج کرتے۔ بیماریوں میں پچھنے لگاتے اور بعض ناقابل علاج امراض میں آخری دوا داغ کو خیال کرتے اور کام میں بھی لاتے تھے۔

ان تمام علوم کو ایک عرب اپنے صفحات دل پر یادداشت اور رسائی فکر کی قلم دوات سے اسطرح لکھتا کہ مٹائے نہ مٹتا تھا مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ عرب نے اپنے ہاتھ میں کس وقت قلم کو سنبھالا۔ ان کے تمام علوم۔ ادب زبان اور دفتر کا خزانہ اشعار رہیں کیونکہ جب کوئی عرب کھڑے ہوکر ندوۃ الحی میں اشعار پڑھتا تو اوسکی قوت گویائی اُسکے علوم مخفیہ کا پردہ اُلٹ دیتی۔ اسکے دلی راز اُسکے افکار میں جھلک دکھلا جاتے۔ نطق انکے ودائع دلی کو ظاہر کردیتا بایں ہمہ عرب لوازم مدنیت و حضارت سے بہت دور تھا۔ لیکن جب اُن کا کوئی فرد علوم متمدنہ سے باخبر ہو جاتا تھا تو وہ اپنی ذکاء طبع کی بدولت بڑی بڑی اقوام کے سربرآوردہ ہستیوں سے گوئے سبقت لیجاتا تھا۔

زمانہ ابتدائے اسلام | بازار عکاظ کی بدولت مختلف قبائل عرب کی زبانیں ایک ہی معیار پر آگئیں جس نے زبان کے شیرازہ کو منتشر نہونے دیا۔ اس ادبی بازار نے ان کو ایک ہی اسلوب اور لغۃ مسلمہ کے استعمال پر مجبور کر کے مختلف قبائل کی زبانوں کو ایک سلسلہ میں منسلک کر دیا۔

اسوقت لغتہ قریش اور زبان حمیری مسلمہ زبانیں تھیں۔ لیکن جب آفتاب ہدایت واسلام عرب کے افق پر چمکا اور قرآن لغتہ قریش میں نازل ہوا تو اوسکو زبان حمیر پر تفوق حاصل ہوگیا اور دوسرے قبائل کی زبانوں کا ذکر ہی فضول ہے۔ تمام خطباء شعراء اور متکلمین نے لغتہ قریش کے سامنے گردن تسلیم وطاعت خم کر دی اور اس وقت سے آج تک یہی زبان تمام عربی مکاتبات نثر ونظم میں رائج ہے۔

ابتدا اسلام میں قریش ہی بلاغت کے مالک تھے۔ اور یہ ہی اسالیب کلام میں تصرف کرتے تھے لیکن جب قوم کے سامنے قرآن مجید آیا اور اس نے بلاغت قرآنی اور اسکے بدیع اسالیب کو کہیں بڑھ چڑھ کر پایا تو اُس کی ساری بلاغت اور قوت لسانی ماند ہوگئی۔ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ قرآن کریم کی وجہ سے زبان میں وسعت اور زیب زینت پیدا ہوگئی۔ کیونکہ قرآنی تراکیب نہایت محکم تھیں اور بیان نہایت واضح۔ اور باعتبار ترتیب و بلاغت کے انتہائی درجۂ کمال پر تھا۔ ان تراکیب اور ان اسالیب سے زبان اور بھی چمک اٹھی۔

عربی کی سب سے پہلی کتاب وہ کتاب جس سے عرب سب سے پہلے روشناس ہوئے قرآن حکیم ہے۔ یہ منشیوں اور شعراء کے لئے راہبر ہے اور جب اُنکو کسی قسم کی ادبی مشکل پیش آتی تو وہ قرآن کی طرف رجوع کرتے اور قرآن کی عبارت کو مثال میں لاتے کیونکہ قرآن کی ترتیب ونظم الفاظ عربوں کے مالوف ترتیب سے زیادہ بین اور بالاتر ہے۔ یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے کہ قرآن آداب کا مصدر اور حکمت و دانش کا سرچشمہ ہے اور اخلاق کریمہ کا معدن۔ انسانی طبائع کی کجی کو سیدھا کرنیوالا تہذیب وتمدن کی روح پھونکنے والا ہے۔ لیکن ہمارے بعض دوستوں کا یہ جبری فیصلہ کہ قرآن تمدنی اور معاشرتی ترقیات میں مانع ہے۔ آفتاب پر دھول ڈالنا اور ایک وہمی وفرضی بات ہے اور اسلام پر صریح غلط الزام۔ کیونکہ قرآن حکیم میں ایسی ہزارہا آیات موجود ہیں جو علوم دنیوی کی تعلیم کی ترغیب دیتی اور اُنکے دریافت کرنے پر آمادہ کرتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں ارکان تمدن اور اسباب حضرت زیادہ قوی نہ تھے اور اسوقت قوم وملت کو اُنکی چنداں ضرورت بھی نہ تھی اس وجہ سے لوگ اسطرف متوجہ نہیں ہوئے۔ لیکن جب مصالح ملکی سے فرصت ہوئی اور تمدنی ترقی کی ضرورت محسوس ہوئی تو مسلمان نہایت زور وشور کے ساتھ اس میں مصروف ہوئے اور جس سرعت کے ساتھ انھوں نے ترقی کی ہے اوس سے تاریخ کے صفحات پُر ہیں۔

میں یہ بلاخوف تردید عرض کرونگا کہ اگر قرآن نہ ہوتو عربی زبان میں وہ فصاحت وبلاغت ہرگز نہ پیدا ہوتی جسپر آج اس زبان کو ناز ہے وہ ہرگز ایک ہی اسلوب پر قائم نہ رہتی بلکہ جس طرح قبل از اسلام بدلتی رہی تھی اسیطرح پھر بدلتی یہانتک کہ آج قدیم اسالیب وزبان کا اثر بھی باقی نہ رہتا جبکہ اور زبانوں کے تغیرات شاہد ہیں۔

ئے اسلام کی اور کتابت

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب پر امیت اور جہالت چھائی ہوئی تھی۔ ظہورِ اسلام کے ساتھ ساتھ کتابت کی اشاعت ہوئی اور وحی کی تدوین کی وجہ سے اور اُن خطوط کے سبب ر نبی صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہوں اور امراء کے پاس تبلیغ اسلام کیلئے بھیجا کرتے تھے عرب میں منشیوں اور ں بہتات ہوئی۔ اس وقت تک عرب علوم کو کتب میں تدوین کرنے کو معیوب خیال کرتے اور کتابی شکل میں علمیہ کو لانے سے اعراض کرتے تھے۔ وہ صرف اپنی قوتِ حافظہ اور اپنی یادداشت کے صحائف پر اعتماد اور کرتے تھے۔

بتدائے اسلام میں مسلمانوں کے خاص علوم قرآن۔ تفسیر اور روایت حدیث (صلی اللہ علیہ وسلم) تک محدود ر قوم ان علوم کو صحابہ اور تابعین سے بوجہ قربت عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم زبانی سیکھتے اور یاد کر لیتے تھے۔ کا خیال تھا کہ اگر وہ سیکھیں گے تو نوشتہ پر اعتماد رہیگا اور کوئی بھی حفظ کرنے کی طرف مائل نہ ہوگا۔ اور انکا اتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ نوشتوں میں تحریف کی جا سکتی ہے۔ اور جب سینوں میں محفوظ رہینگے تو مخالف اقوام ت بردسے بچ سکیں گے۔ اور احکام کچھ سے کچھ ہو جائینگے۔

رسول اکرم نے جنگ بدر کے قیدیوں کو یہ حکم دیا تھا کہ جو اپنا فدیہ نہ دے سکے وہ مسلمان بچوں کو کتابت کی تعلیم دے وانِ جنگ ہے جو اس پر عائد کیا جاتا ہے گویا قومی عام تعلیم کا سنگِ بنیاد دنیا میں سب سے پہلے محمد رسول اللہ ما۔

حضرت عمر بن الخطاب کے عہد خلافت سے قبل خراج کے رجسٹر عربی زبان میں نہ تھے بلکہ دوسری زبانوں ے جاتے تھے۔ آپ نے عربی زبان کو دفتری اور سرکاری زبان قرار دیا کہ جملہ حساب و کتاب عربی ہی میں لکھے یں۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے اِس عصرِ منیر میں تمام ملک و ملت میں کتابت کی اشاعت ہوئی۔ اور علم نیمہ بہہ نکلے۔

میر انیس

اور

عون و محمد کا کردار

(از جناب محمد عبد القادر صاحب سروری)

عون اور محمد حضرت زینب بنت علی کے بیٹے اور امام حسین علیہ السلام کے بھانجے ہیں۔ جسوقت امام گھر سے کوفے کو چلے ہیں یہ دونوں کمسن تھے میدان کربلا میں انھوں نے اپنی شجاعت کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اور شامی فوج کے ہاتھ جام شہادت نوش کیا۔

"حضرت زینب کے یہ دونوں لڑکے درحقیقت افسانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ انکے متعلق تواریخ میں کچھ نہیں چلتا اور انکی پیدائش مرثیہ میں میر انیس کی قوت تخلیق کی ممنون منت ہے۔ انیس نے جہاں کربلا کے ایک واقعہ کو پھیلا کر ایک پورا قصہ بنانے کی کوشش کی ہے وہیں بہت سے موقعوں کو کامیاب بنانے کے لئے اونھوں نے نئے نئے قصے بھی پیدا کئے ہیں جنمیں سب سے زیادہ نمایاں اور مہتم بالشان عون اور محمد ہیں جنکے حالات مختلف مقامات پر مختلف مرثیوں میں ملتے ہیں اکثر انکا ذکر ضمنی آیا ہے۔ لیکن میر انیس نے انکے متعلق مستقل مرثیے بھی تحریر کئے ہیں جنمیں انکے اپنی مادر مہربان سے رخصت ہونے، امام سے اجازت لیکر جنگ میں جانے، اور دشمنوں کی فوج سے لڑکر جوہر شجاعت دکھاتے ہوئے یزیدیوں کے ہاتھوں سے شہید ہونیکا ذکر کیا ہے۔

یہاں یہ امر قابل یادداشت ہے کہ انیس کے مرثیوں کی تکمیل ایک قصہ کی شکل میں کبھی نہیں ہوئی ہے بلکہ اپنے مطمح نظر یعنی امام کے یزید کی فوج سے دشت کربلا میں جنگ کرنے اور جام شہادت نوش فرمانے کے واقعہ کو ڈراما بنانے کی غرض سے اس واقعہ سے پہلے اور بعد کے بہت سے حالات بیان کئے ہیں تاکہ سامعین پر اثر کامل ہو اور یہ اونکو اس منتہا تک رہبری کرے جہاں پہونچکر انکے قصہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن قصہ نگار کا یہ فرض

---

۵ موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۲۶

ہے کہ وہ منتہا تک پہونچا کر قصہ کو ختم نہ کردے بلکہ اسکو آخر تک لیجا کر اسکے نتائج بھی نمایاں کرے تاکہ سامعین مجلس سے ایک انتقامی احساس کے ساتھ اٹھیں۔

مندرجہ بالا اسباب ایسے تھے کہ شاعر کو انفرادی حیثیت سے اشخاص قصہ کی طرف توجہ کرنیکا بہت کم موقعہ مل سکتا تھا، بلکہ اسلئے کہ وہ کسی خاص شخص قصہ کی تصویر مرکزی واقعات سے متعلق پیش کر رہا ہو۔ جب شاعر کو انفرادی اشخاص قصہ پر توجہ کرنے کا موقعہ بھی نہ مل سکا تو اسکو اس امر کی بھی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کردار نگاری کے ان تمام اصولوں کی پابندی کرتا جو ایک شخص قصہ کی کردار کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ مرثیہ میں انیس کو مرکزی اشخاص قصہ کی طرف سے توجہ ہٹانے کی مہلت ہی نہیں تھی تاہم ضمنی طور پر انہوں نے مخصوص اشخاص قصہ کی سیرت کے متعلق جو نقوش کہیں کہیں چھوڑے ہیں وہ بیحد قابل قدر ہیں۔ اور ان سے اشخاص قصہ کی سیرت پر ایک بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے لیکن انکے کردار میں تدریجی ارتقا کی توقع رکھنا محض فضول ہے۔ کیونکہ تدریجی ارتقا کا دکھانا موضوع کی نوعیت کے لحاظ سے شاعر کے لئے ناممکن تھا۔ یہاں اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ میر انیس مرثیہ لکھ رہے تھے نہ کہ قصہ، اور وہ ضروری وقت انکے قابو میں تھا وہ امام کے گھر سے نکلنے سے لیکر، دشت کربلا میں کوفیوں کے خنجر بیداد سے شہادت کبریٰ حاصل کرنے تک تھا۔ جو زیادہ سے زیادہ چند ماہ ہو سکتا ہے اس عرصہ میں کوئی کیونکر کسی کردار کو مکمل پیش کر سکتا ہے اگر میر انیس ایسا کرتے بھی تو یہ ایک غلطی ہوتی اسمیں شک نہیں کہ میر انیس نے آنحضرت اور حضرت فاطمہ زہرا کے وقت سے لیکر اہل بیت نبی کے یزید کے دربار، بلکہ مدینہ واپس ہونے تک کے بھی واقعات بیان کئے ہیں لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے یہ محض تمہید (Exposition) اور خاتمہ (Downfall) تھا جسکی بذات خود کوئی اہمیت نہیں۔

مذکورہ بالا طویل بحث کا مقصد صرف اسقدر تھا کہ یہ بتلایا جائے کہ عون اور محمد دونوں کے کردار میں تدریجی ارتقا کا ڈھونڈھنا فضول ہے۔ انکے متعلق صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس سے انکی کرداری خصوصیات، طرز روش، اور رجحانات کا انکی پتہ چل سکتا ہے۔

عون اور محمد کا تعلق ایک ایسے برگزیدہ خاندان سے تھا جن میں ایک طرف مذہبی تقدس کے سرچشمے اور دوسری طرف شجاعت اور بہادری کے خزانے ابل رہے تھے جعفر طیار انکے والد، علی حیدر کرار، خیبر شکن، انکے دادا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکے مورث اعلیٰ تھے۔ لہذا ان میں بھی ایک طرف تو تقدس کی وجہ سے، ایک شان انقیاد، اور رضا و تسلیم پیدا ہو گئی تھی۔ دوسری طرف شجاعت اور دلیری رگوں اور پٹھوں میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ پھر انکے عادات

اطوار کے متعلق صرف اسقدر کہنا کافی ہے کہ انھوں نے حضرت زینب سی دلیر اور ضابطہ اور خوددار والدہ محترمہ کی آغوش شفقت میں تربیت پائی تھی۔

عونؑ اور محمدؑ اپنے بیمار باپ کو چھوڑ کر امام کے ساتھ کوفہ چلنے کو طیار ہو گئے حضرت عباسؑ قاسمؑ وغیرہ اپنے اپنے ہمجولیوں سے جدا ہوتے ہیں تو عونؑ اور محمدؑ بھی اپنے ہم سنوں کو وداع کر رہے ہیں اور ہ

روتے ہیں وہ جو عون و محمد کے ہیں ہمسن ۔۔۔ کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن
اس داغ سے چین آئے ہمیں یہ نہیں ممکن ۔۔۔ گرمی کا مہینہ ہے سفر کے یہ نہیں دن
تم حضرت شبیر کے سایہ میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اُٹھانے کو چلے ہو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اپنے ساتھیوں میں بڑے ہر دلعزیز اور محبوب تھے جنکے چھوڑنے پر وہ اظہار تاسف کرتے ہیں۔ عونؑ و محمدؑ کی وفاداری ملاحظہ ہو ہ

ہم جولیوں سے کہتے ہیں وہ دونو برادر ۔۔۔ ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیونکر ۔۔۔ ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر
وہ دن ہو کہ ہم حق غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

"شہ کی مشہور شیدا" (زینب) کے بیٹوں سے اسی قسم کی توقع تھی۔ کمسنوں میں اس قسم کا پاس نمک کم ہی دیکھا جاتا ہے۔ مگر کیوں نہ ہو مادر مشفق کی تعلیم تھی۔

غرض عونؑ اور محمدؑ کوفے پہونچتے ہیں اور یہی مقام ہے جہاں تخلیق کا مقصد پورا ہوتا ہے۔

جب حضرت عباسؑ اہل بیت اطہار کے لئے خیمے نصب کر رہے تھے۔ اُدھر سے یزید کی فوج اُمنڈنی شروع ہوتی ہے امام کے ساتھی بھی تیار ہو جاتے ہیں حضرت عباس کو عَلَم دئے جانے کی گن سن پاکر عونؑ و محمدؑ آپس میں مشورہ کرنے لگتے ہیں کہ فوج کی علمبرداری ہمارا موروثی حق ہے۔ اسلئے عَلَم لینے کیلئے ہم ماموں سے کہیں۔ بڑے بھائی جو زیادہ ہوشیار ہیں روکتے ہیں کہ یہ موقع نہیں۔ خاموش رہو۔ ہمارا کام تو محض ماموں پر فدا ہونا ہے علاوہ اسکے اماں جان بھی سنینگی تو خفا ہونگی حالانکہ ماں اس تمام گن سن کو پس پردہ کھڑی سُن رہی تھیں۔ دونوں کو ڈانٹا اور حکم دیا کہ اگر عباس علم حاصل کریں تو فوراً انھیں تم تہنیت دو ورنہ ہ

کنبے میں ایک نے بھی اگر سن لیا یہ حال
کہتی ہوں صاف میں مجھے ہوگا بہت ملال[1]

پھر سمجھاتی ہیں کہ ؎

صدقے گئی خلاف ادب کچھ سخن نہ ہو
میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

[1] نم کے جھگڑے کو میر وحید نے جس عدگی سے نظم فرمایا ہے جی نہیں چاہتا کہ ہم اس موقع پر ناظرین زبان کو اس سے محروم رکھیں، اگرچہ پورا مرثیہ ع "پائے کیا حضرت زینب نے نایاب پسر" دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جس میں "کردار نگاری" کا اعلیٰ نمونہ وحید صاحب نے اپنے خاص رنگ میں پیش کیا ہے، ہمارا خیال ہے کہ بہ لحاظ سلاست و روزمرہ وحید صاحب نے جس "بات چیت" کو نظم فرمایا ہے اور اس میں جو کامیابی انکو حاصل ہوئی ہے غالباً آجتک کسی مرثیہ گو کو یہ بات میسر نہیں آئی۔ یہاں ہم چند بند نمونۃً درج کرتے ہیں جس سے قارئین کو خود اندازہ ہوجائیگا کہ وحید کس پایہ کا شاعر تھا، اور اگر عمر نے وفا کی ہوتی تو وہ آگے چلکر کیا سے کیا ہو جاتا۔ "ایڈیٹر"

۲۱
پاچکے جب علم فوج جناب عباس
آبدیدہ یہ گئے زینب ناشاد کے پاس
ماں نے گھبرا کے کہا خیر تو ہے کیوں ہو اداس
جوڑ کر ہاتھ یہ کی عرض کہ اے عرش اساس
چھوٹے ماموں کو علم شہ نے دیا خوب کیا
ہم کو تقدیر نے ناحقیوں میں محجوب کیا

۲۲
یوں تو ہر امر کے مالک ہیں امام آفاق
پر یہ صدمہ ہے کہ ہم پر نہیں اب وہ اشفاق
منہ دکھانا ہمیں کسطرح نہ دنیا میں ہو شاق
حیف کی جا ہے کہ تھا کچھ نہ ہمیں استحقاق
اپنے جد جعفر ذی رتبہ و ذیجاہ نہ تھے
آپ فرمائیں کہ نانا اسد اللہ نہ تھے

۲۳
غور سے دیکھ کے منہ حضرت زینب نے کہا
خوب یہ دل میں سمائی ہوئی ہے نام خدا
اس گھڑی بات وہ کی تم نے جو تھی نازیبا
مصلحت میں شہ والا کے تمھیں دخل ہے کیا
فوج چڑھ آئی ہے موقع نہیں دم لینے کا
وقت سر دینے کا یہ ہے کہ علم لینے کا

۲۴
نیک و بد جانتے ہو نام خدا ہوشیار
چاہیئے ہے کہ ہو جراروں کے پوتے جرار
عہدہ پانے پہ قرابت کا نہیں دار و مدار
پوتے جعفر کے ہو تو جنگ پہ رہو تیار
جیتو نیں دیکھ کے تھرائیں جواں لشکر کے
صفدری کے جو نواسے ہو اگر حیدر کے

۲۵
اوچھی باتوں پہ مہذب نہیں کرتے ہیں خیال
جانشیں وہ جو دکھائے اب و جد کے افعال
فخر کیا مل گیا ترکے میں اگر منصب و مال
یہ وراثت ہے کہ ہاتھ آئے بزرگوں کا کمال
وہی کردار وہی عزم وہی کام کرے
خلق میں اپنے بزرگوں کی طرح نام کرے

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قاسم و اکبر سے پہلے اگر رن میں جاؤ تو میں ماں اور تم بیٹے ورنہ دودھ نہ بخشوں گی۔ یہ سنکر دونوں
سعادتمند خاموش ہو جاتے ہیں۔

سوء اتفاق سے جب جنگ شروع ہو جاتی ہے تو باوجود عون اور محمد کے بار بار اجازت طلب کرنے کے امام ان کو
رن میں جانے نہیں دیتے یہانتک کہ تمام رفقائے امام شہید ہو جاتے ہیں۔ حضرت زینب نہایت بے چینی سے اصرار کر رہی
ہیں کہ آخر کب لڑنے کیلئے نکلینگے اور اپنا حق نمک۔ اور حق غلامی ادا کرینگے۔ آخر جب اجازت لیکر ماں سے رخصت ہونے
آتے ہیں۔ تو ماں ان سے منھ پھیر لیتی ہیں۔ اور شکایت کرتی ہیں کہ میرے حکم کی متابعت کیوں نہیں ہوتی۔ سعادتمند لڑکے
یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان کو اجازت نہیں ملی تھی۔ اسپر حضرت زینب نے وہ بہترین طعن آمیز شکایت کی جو ادب
میں عدیم المثال ہے ؂

انصاف تو کیجئے مجھے کیونکر نہ گلا ہو وہ پہلے نہ بیدم ہوں، لہو جن میں ملا ہو

کھلتا نہیں کچھ، اور شجاعت انھیں کیا ہے حضرت تو سلامت ہیں یہ عجلت انھیں کیا ہے

جب کوئی نہ ہووے گا تو یہ جنگ کریں گے کیا عیب ہے پہلے نہ مرے بعد مریں گے

ماں کا غصہ دیکھکر لڑکے کانپ جاتے ہیں اور عذر کرتے ہیں کہ حضرت عباس مزاحم ہوئے تب اس زبردست سیرت
کی مالک خاتون نے ایک جہاں دیدہ سپہ سالار کیطرح جاپنے سپاہیوں کو نصیحت کرتا ہے۔ وہ تقریر کی جو اپنی آپ مثال
ہے ؂

ہاں چاہئے منھ نیزہ و خنجر سے نہ پھیرو دو شیر ہو، مل کر عمر و شمر کو گھیرو

بھائی کسی ہنگام میں بھائی کو نہ چھوڑے دونوں میں کوئی عقدہ کشائی کو نہ چھوڑے

توقیر تمھاری ہو امیری ناموری ہو سر دونوں کا لاؤ تو میں جانوں کہ جری ہو

ایسے تو نہیں جو بُجھے مجوب کروگے　　　میں دودھ نہ بخشوں گی جو پیاسے نہ مروگے

دونوں سرفروش بہادروں کے دل پر ماں کی طعن آمیز تقریر سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کرتی ہے۔ ماموں جان پر فدا ہونیکے لئے تیار ہوکر خیمہ گاہ اہل بیتِ نبوی سے نکلتے ہیں۔ اور یزید کی فوج کا مقابلہ اس جانبازانہ دلیری کے ساتھ کرتے ہیں کہ مادرِ مشفق کے آخری جملے، ان کے کانوں میں صدا بنکر گونجتے رہتے ہیں۔ اسی حال میں زمین پر گرتے ہیں۔ اور ان کی پاک روحیں جسم سے علیحدہ ہوکر "ناناجان کے پاس" چلی جاتی ہیں۔ مگر اپنے پیچھے ایک سرمدی نغمہ خود فروشی کا چھوڑ جاتے ہیں۔

یہاں وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے جسکے لئے انیس نے انکی تخلیق کی تھی۔

"زبان" کا خاص نمبر

انگلستان اور ہندوستان میں تعلیم کے طریقے

(از سید محمد یوسف قیصر مدیر رسالہ ظل السلطان بھوپال)

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کا طریقہ جو اس وقت رائج ہے وہ اُن تعلیمی خیالات پر مبنی ہے جو انگلستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن اس میں ایک نقص یہ ہے کہ انگلستان میں تو یہ طریقہ تعلیم اُس ملک کے موافق ہے لیکن ہندوستان میں یہ طریقہ غیر ملک سے آیا ہے اور اسلئے بالکل ایک اجنبی طریقہ ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جو باتیں انگلستان میں تعلیمی طریقہ کی معمولی کوتاہیوں کے زمرہ میں شامل ہوتی ہیں وہ ہندوستان میں برائیوں کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں

کئی سال ہوئے کہ نیویارک کے رسالہ ہیرپرس میگزین کے صفحات میں لارڈ ہیلڈین نے انگلستان کے تعلیمی طریقے کے نقائص اور اُس میں جن باتوں کی ضرورت ہے اُن کے متعلق لکھا تھا۔

ایک ہندو شخص جو امریکہ میں رہتا ہے اُس نے ماڈرن ریویو میں ایک چھوٹا سا مضمون لارڈ موصوف کے خیالات کی بنا پر تعلیم کے متعلق لکھا ہے اُس مضمون میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ اشخاص مخاطب کئے گئے ہیں۔ لارڈ ہیلڈین صاحب کے خیالات کے بموجب انگلستان کے طریقہ تعلیم میں چار بڑے نقص ہیں اور مضمون نویس نے اُن چاروں نقص کے متعلق یہ امر ظاہر کیا ہے کہ اُن کا ہمارے طریقہ تعلیم پر کیا اثر پڑتا ہے۔

سب سے اول اور نہایت ہی بڑا نقص انگلستان کے تعلیمی طریقہ میں یہ ہے کہ وہ غیر جمہوری ہے جیسا کہ لارڈ ہیلڈین کہتے ہیں کہ "انگلستان میں امرا اور غربا کے لڑکوں کے درمیان تعلیمی امور میں مساوات کا برتاؤ نہیں کیا جاتا علاوہ ازیں انگلستان کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں یہ شک ابھی تک پھیلا ہوا ہے کہ تعلیم ایک خطرناک چیز ہے اور یہ کہ وہ آدمیوں میں پریشانی پھیلاتی ہے اور اُن میں خود مختاری یا تمرد کا مادہ پیدا کر دیتی ہے اور وہ لوگ اپنے آپ کو اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھنے لگتے ہیں۔

دوسرا مہلک نقص یہ ہے کہ انگلستان میں امور سائنس کی کامل تحقیقات کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے اور تعلیم میں قوم کے کاروبار کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے اس کے متعلق لارڈ ہیلڈین کہتے ہیں کہ۔

"دستکاری اور تجارتی امور کی قدر و منزلت کرنے اور اس کیلئے سامان بہم پہونچانے اور سائنس کی تعلیم اور

تحقیقات کرنے میں انگلستان جرمنی اور امریکہ سے ایک زمانہ نہیں بلکہ تین زمانے پیچھے ہے"۔

یہ ہی نقائص اُس برائی کے باعث ہیں جس پر آج سنتے ہیں کہ اس قدر افسوس کیا جا رہا ہے یعنی ضروری دستکاریاں انگلستان سے اُن کے رقیب اس واسطے چھین لیجاتے ہیں کہ وہ سائنس کے طریقوں کو کام میں لاتے ہیں۔

تیسرا نقص برطانیہ کے تعلیمی طریقہ میں یہ ہے کہ وہاں کی رعایا کے لئے حقیقی قومی حیثیت کا کوئی تعلیمی طریقہ نہیں ہے لیکن اس ملک میں ہر ایک فرقہ کی علیحدہ علیحدہ بہت کثرت سے درسگاہیں ہیں۔ تعلیم میں جو فرقہ بندی کا خیال رکھنے سے نقص پیدا ہوتا ہے اُسکے متعلق لارڈ موصوف کہتے ہیں۔

"دنیا میں کوئی ایسا عجیب و غریب نظارہ نہیں ہے جیسا کہ پارلیمنٹ میں تعلیمی قانون کے مشورہ کی بحث کے وقت پیش نظر ہوتا ہے۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ میں جب کبھی تعلیمی قانون کا مسودہ پیش ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ تقریباً ایک لڑائی کا اکھاڑا بنجاتا ہے اور یہ لڑائی تعلیم کے ماہرین میں نہیں ہوتی ہے بلکہ مختلف مذہبی علما کے درمیان ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُسکے خاص فرقہ کا لحاظ رکھا جائے اور ہر ایک اس سوال کے ساتھ قومی لحاظ کا اسی طریقہ سے برتاؤ کرتا ہے یعنی اپنے فرقہ کو ہی کل قوم کے مانند خیال کرتا ہے"۔

چوتھا بڑا نقص انگلستان کے تعلیمی طریقہ میں یہ ہے کہ تعلیم کے نتیجہ پر خیال نہیں کیا جاتا اسکے متعلق لارڈ موصوف کہتے ہیں "جب میں وار آفس (دفتر جنگ) میں تھا تو مجھکو یہ معلوم کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ رنگروٹ جو بھرتی کئے جاتے ہیں اُن میں تیرہ فیصدی ایسے ہوتے ہیں کہ جو بالکل لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اس کا کیا سبب ہے؟ اُن کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم ابتدائی مدارس میں ضرور دی گئی تھی لیکن جسوقت انھوں نے مدرسہ چھوڑا تو جو کچھ انھوں نے پڑھا تھا اُس سب کو بھلا دیا کیونکہ اُن کو اس میں مزید دلچسپی باقی نہ رہی، مزید دلچسپی باقی نہ رہنے کا باعث یہ ہے کہ اُن کی آیندہ تعلیم جاری رکھنے کے لئے ایسے مدارس نہیں ہیں جن میں وہ تعلیم پا سکیں اور نہ اُنکی آیندہ زندگی بسر کرنے کے لئے ایسا انتظام ہے کہ جس سے اُن میں یہ ترغیب پیدا ہو کہ وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھیں ہم کو انھیں پھر تعلیم دینی پڑتی ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر حماقت کا کام ہے کہ ابتدائی۔ اوسط درجہ، صنعتی یا یونیورسٹی کی تعلیم میں سے ہر ایک تعلیم کو علیحدہ علیحدہ خیال کر رکھا ہے اور ان کے متعلق علیحدہ علیحدہ ہی خیال کیا جاتا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ ایک کا خیال دوسرے کے ساتھ میں رکھا جائے۔

تعلیم کی یہ حالت ایسی خطرناک ہے کہ اس قدر خطرہ کسی بری یا بحری فوج کا نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ خطرہ جہالت

اغی قوت کی کمزوری، خیال کرنے اور عمل کرنے کے نامکمل طریقوں کا ہے۔ جس سے ذہانت میں ترقی نہیں ہوسکتی اور اپنی
یب طاقتوں کے مقابلہ میں ہر ایک کام کو سائنس کے طریقوں اور تحقیقاتوں سے کرتے ہیں۔ ہمارے طریقے بہت ہی ادنیٰ
رجہ کے ہیں۔

جرمنی کے کیمیا دان پروفیسر حکام سائنس کے تجربوں کے کارخانوں اور جماعتوں کے کمروں میں اور دفتروں میں
شیدہ طور سے کام کرتے رہتے ہیں جس سے وہ ہمارے مرتبہ کو دنیا کی قوموں میں شاید براہ راست کم لیکن ڈریڈناٹون
ں بہ نسبت بہت زیادہ خوفناک طریقہ سے نقصان پہونچاتے ہیں۔ ہم کو جواب کام کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہم کو اُن کا مقابلہ
ن کے کاموں کو اُنکے ملک میں ہی سیکھ کر کرنا چاہئے اور اپنے آپ کو جفاکش اور مثل اُنکے قابل بنانا چاہئے ایسا کرنے
یں بلاشک بڑا روپیہ صرف ہوگا۔ لیکن ہر ایک پیسہ جو اس خرچ میں لگے گا وہ بجا طور پر صرف ہوگا اور کسی طور سے قابل
عتراض نہیں ہوسکتا

جو نازک وقت ہمارے سامنے ہے اور ہم اُس کو نازک وقت ہی سے تعبیر کرتے ہیں اُس کا انسداد اُسی صورت
یں ہوسکے گا جب کہ ہم بھی اُنہی طریقوں کو کام میں لائیں جو جرمنی نے اپنی شکستہ حالت کی اصلاح کے لئے اختیار کئے تھے
بلکہ ایک صدی پیشتر اوس کو نپولین نے نیچا دکھایا تھا پھر جرمنی کو کس نے بچایا؟ اُسکے بچانے والے ایسے اشخاص تھے
جیسے رفش اور روان ہمبولڈٹ جنھوں نے جرمنی قوم سے استدعا کی کہ وہ تعلیم حاصل کریں جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بہ نسبت
دیگر چیزوں کے اونھوں نے تعلیم سے وہ برتری حاصل کی ہے جو اس وقت اُنکو ہے۔ اسی قسم کی استدعا اب ہم سے بھی
کیجائے۔ ہم کو ابھی اس امر کو تسلیم کرنا چاہئے کہ تعلیم پر ہی ہماری آیندہ بہبودی کا انحصار ہے۔

لارڈ ہیلڈین کے مضمون مذکورہ بالا کا خلاصہ دیگر مضمون نویس لکھتا ہے کہ جو چار بڑے نقص انگلستان کے طریقہ
تعلیم میں بتلائے گئے ہیں وہ ہی نقص ہندوستان میں بھی موجود ہیں۔

(۱) غربا کے بچوں کو تعلیم پانے کا کوئی موقع نہیں ہے حتیٰ کہ ابتدائی تعلیم کا بھی۔

(۲) ہندوستان کی یونیورسٹیاں محض کلرک پیدا کر رہی ہیں اور عملی طور پر ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں
تحقیقات کے کام کی کوئی سہولتیں نہیں رکھی گئی ہیں۔

(۳) فرقہ بندی بھی ہمارے طریقہ تعلیم میں ایک بڑا خطرہ پیدا ہو گئی ہے۔
جاپان نے بدھ مذہب والوں اور شنتو مذہب والوں کے لئے علیحدہ علیحدہ یونیورسٹیاں قائم نہیں کیں اور
نہ چین نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے لیکن معلوم نہیں کہ پھر ہم کیوں اس ناقص طریقہ کو اختیار کریں۔

(۴) اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں پر بھی تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے مدارس نہیں ہیں اور نہ ہمارا موجودہ تعلیمی طریقہ ہماری قومی قابلیتوں کو ترقی دینے دیتا ہے۔

مضمون نویس اس کے علاج کے متعلق تحریر کرتا ہے کہ جو کچھ بڑے نازک وقت کے لئے علاج گریٹ برٹن کے لئے تجویز کیا گیا ہے وہ ہی طریقہ بالکل ہندوستان کے لوگوں کیلئے بھی کارآمد ہے۔

اگر انگلستان کے ایک سب سے بڑے مدبر کا یہ خیال ہے کہ انگلستان کو جرمنی اور امریکہ کے طریقہ تعلیم کی تقلید کرنی چاہئے تو کیا پھر ہمارے لئے بھی یہ امر مناسب نہیں ہے کہ ہم بھی امریکہ جاکر وہاں کی تعلیم سے فیضیاب ہوں۔ جس سے ہماری قوت بطور ایک قوم کے مستحکم ہو۔ جرمنی جانے کا خیال تو ابھی کچھ زمانہ کے لئے دل سے نکال دینا چاہئے۔

غزل

(جناب عرشی نعمانی رامپوری)

وہ بادۂ شبینہ میں لذت نہیں رہی
پہلی سی مجھکو خواہش شہرت نہیں رہی

اب انتظار وعدۂ شام و سحر کہاں
ہاں ہاں مجھے وہ پہلی سی اُلفت نہیں رہی

اظہار آرزو تو بڑی بات ہے یہاں
خود نفس آرزو کی بھی جرأت نہیں رہی

شاہد مجاز تیری حقیقت کے سامنے
واللہ! میری کوئی حقیقت نہیں رہی

اک خستہ جاں پہ اتنے ستم ہائے روزگار
اُف! آمد نفس کی بھی مہلت نہیں رہی

میرا نہیں تو میری محبت کا پاس کر
ظالم تجھے کسی کی محبت نہیں رہی

(از حضرت خالد (بنگالی))

ملتے ہی نگاہوں کے حیا آگئی تمکو
لو آج محبت کی نظر پا گئی تمکو

پھر جلوہ طلب ہے رُخ روشن سے تمہارے
وہ طور کے پہلو سے صدا آگئی تمکو

یوں عرش کو چھو لینے کے قائل نہیں عشاق
جب جانیں اگر آہ رسا پاگئی تمکو

پھر حسن میں پہلی سی وہ تمکیں نہیں رہتی
کیا بات شب وصل بھی سمجھا گئی تمکو

وہ سبزہ پامال نہ خاکستر برباد
خالد سے کہو کس کی نظر کھا گئی تمکو

خاموشی

(جناب محمد حسن خاں صاحب متین حیدرآبادی)

تعریف:- خاموشی سے مراد وہ پسندیدہ خصلت ہے جو قوت ناطقہ کو بیہودہ باتوں سے باز رکھتی اور اُن عیوب کی پردہ پوشی ہوتی ہے جو شرافت انسانی کے لئے ایک بدنما دھبہ ہے۔ اس سے بسیار گوئی کی عادت بد زائل، اور کم گوئی کا ملکہ راسخ ہوجاتا ہے۔

ضرورت:- اگر کوئی شے علی التسلسل حرکت کرتی رہے اور اسکو سکون حاصل نہو تو ممکن ہے وہ شے بہت جلد بیکارہ ہوجائے۔ یہی حال گویائی و خموشی کا ہے۔ جب تک گویائی بحد اعتدال ہوتی ہے تو وہ خموشی کہلاتی ہے۔ اور اگر اس میں افراط اور تفریط ہو تو دو حالتوں سے خالی نہیں۔ وہ یا تو بسیار گوئی ہے یا لب بستگی و بے زبانی۔

بسیار گوئی سے انسان کا دماغ نہ صرف مختل ہی ہوتا ہے بلکہ مالیخولیا اور ہذیان کی کیفیت طاری ہوتی ہے بزرجمہر کا حکیمانہ قول اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جو شخص بسیار گوئی پر زیادہ مائل ہوتا ہے یقین جانو کہ اس کو جنون ہوگیا ہے۔ کیونکہ "اَلْمِکْثَارُ مِهْذَارٌ" بسیار گوئی بیہودہ گوئی ہے اور بیہودہ گو فاتر العقل ہوتا ہے۔

لب بستگی سے انسان جوہر گویائی کھو بیٹھتا ہے۔ اس میں اور گونگوں میں کوئی فرق نہیں باقی رہتا جسطرح گویائی انسان کے لئے ہنر ہے اسی طرح گونگا پن عیب ہے۔ گونگے کی عامۃ الناس کے نزدیک کوئی عزت نہیں۔ خاموشی اختیار کرنے والا انسان عاقل و متین اور معزز و مؤقر سمجھا جاتا ہے۔

فضیلت:- خاموشی موجب درازی حیات ہے اور اس کا اختیار کرنا باعث نجات۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "مَنْ سَکَتَ سَلِمَ وَمَنْ سَلِمَ فَقَدْ نَجَیٰ" یعنی جس شخص نے خاموشی اختیار کی وہ سلامت رہا۔ اور جو سلامت رہا اس نے نجات پائی۔ بخلاف اس کے بسیار گوئی سبب آفت ہے اور اس کا التزام وجہ ذلت۔

مرزا صائب نے کیا خوب کہا ہے ؎

زباں زہرزہ درائی بجاں رساند مرا   لب خموش بدار الاماں رساند مرا

اس میں شک نہیں کلام میں خوش بیانی کی حلاوت ضرور ہے۔ لیکن خموشی میں ایک ایسی لذت موجود ہے جو سالکان طریقت کے دل میں معرفت الٰہیہ کا چسکا پیدا کر دیتی ہے ؎ صائب۔

بخاموشی محیط معرفت کن جانِ گویا را   بجان بے نفس چوں ماہیاں کن سیر دریا را

عیسیٰ علیہ السلام سے حواریوں نے عرض کی کہ آپ ہم کو ایسی نصیحت فرمائیے۔ جس سے ہم جنت میں داخل ہوں فرمایا کہ کہ مطلق بات نہ کرو۔ کہا یہ ہم سے ممکن نہیں۔ فرمایا "جس وقت کوئی کلمہ زبان سے نکالو، وہ کلمۃ الخیر ہو۔ بسیار گوئی دل کو تاریک کر دیتی ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ جنت کے طلبگار ہیں وہ ہرزہ درائی ترک کر دیں اور خاموشی اختیار کریں کیونکہ خاموشی دل کی تاریکی دور کر کے نورانیت بخشتی ہے۔ صائب کہتا ہے ؎

جنت در بستہ باشد مہر خاموشی ترا   چہرۂ زریں میکند چوں بہ نمد پوشی ترا

فوائد:۔ خموشی کے فوائد بیشمار ہیں۔ جن کا بیان حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ اخلاق محسنی میں ملاحسین واعظ طاب ثراہ نے خموشی کے بیان میں ایک دلچسپ حکایت قلمبند کی ہے کہ "نوشیرواں کے دربار میں ایک دفعہ قیصر روم، خاقان چین، رائے ہند موجود تھے۔ نوشیرواں نے فرمایا کہ مدتوں کے بعد ایسے شاذ و نادر مجمع کا اتفاق ہوتا ہے۔ اس موقع پر چاہیے کہ ہم میں سے ہر ایک کچھ تقریر کرے کیونکہ کلام الملوک ملوک الکلام (شاہوں کی باتیں سخن کا بادشاہ ہوتی ہیں) جب ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اس وقت افسوس کرنا پڑیگا۔ اور ہمارے اس اجتماع کی یادگار صفحہ روزگار پر باقی رہیگی ؎

دریں سرائے کہن خوئے کن بخوش سخنی   کہ بہتر از سخن خوب یادگارے نیست

نوشیرواں نے جب یہ بات کہی، تو سب نے باظہار انکسار کہا کہ کلام کی ابتدا آپ ہی کی جانب سے ہو۔ نوشیرواں اس طرح دُر فشاں ہوا کہ مجھے آج تک ان باتوں سے جو میری زبان سے نہیں نکلیں۔ کبھی پشیمان نہ ہونا پڑا۔ البتہ جو باتیں زبان سے کہی گئیں۔ ان سے مجھے بحد ندامت حاصل ہوئی اسکے بعد قیصر روم نے اپنے زریں خیالات اس طرح ظاہر کئے کہ جن باتوں کو میں نے ابتک نہیں کہا ہے اُن کے کہنے پر قادر ہوں اور جن باتوں کو کہدیا ہے وہ میرے حد امکان سے باہر ہیں۔ یعنی وہ تیر سخن جو شست بیان سے ابھی نہیں نکلا۔ مجھے اس پر قدرت حاصل ہے۔ جس وقت چاہوں نشانہ پر لگا سکتا ہوں۔ لیکن جب وہ کمان تقریر سے نکل چکے تو اس کا لوٹانا ناممکن ہے"

خاقان چین نے اپنے مشک سخن سے مشام مجلس کو اس طرح معطر کیا کہ جو بات میں زبان سے نہ کہوں، وہ میری (بات) مغلوب ہے اور میں اس پر غالب ہوں، جو بات میں نے کہدی ہے میں اس (بات) کا مغلوب ہوں، وہ مجھ پر غالب ہے۔ اور زبردست پر غلبہ ناممکن۔ یعنی جب تک عروس سخن پردۂ فکر میں ہے۔ اسوقت تک مشاطۂ مشیت کو اختیار حاصل ہے۔ چاہے منصۂ نطق پر بٹھائے چاہے نقاب عدم اس کے چہرے پر ڈالدے۔ لیکن جب پردے

سے باہر نکل آئے۔ تو ممکن نہیں کہ وہ خلوت خانۂ مستوری میں دوبارہ جاسکے۔

رائے ہند نے اپنے گلہائے فصاحت سے اہل دربار کے دماغ اس طرح تازہ کئے کہ" ہر وہ کلمہ جو بیان کیاجاتا ہے وہ یا تو درست ہوگا یا نادرست۔ اگر (کلمہ) درست ہے تو قائل اس کا اسوقت تک ذمہ دار ہے۔ جب تک وہ اس سے بری الذمہ نہو۔ یا اگر وہ نادرست ہے تو کچھ فائدہ نہ دیگا۔ اسلئے ہر دو حال میں خاموشی اولیٰ ہے۔ قطعہ

بہ پیرے رسیدم در اقصائے یونان　　بدو گفتم اے آنکہ با عقل و ہوشی
زمر دم چہ بہتر بہر حال گفتا　　خموشی! خموشی!! خموشی!!! خموشی!!!!

غلط فہمی کا ازالہ:۔ مذکورہ بالا دلائل سے یہ نتیجہ مستخرج ہوتا ہے کہ انسان کو اَن کہی بات پر قدرت حاصل ہے۔ اور کہی ہوئی بات اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اور دوسرا نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ کہنے سے نہ کہنا بہتر۔

خموشی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بالکل بات نہ کریں زبان تک نہ ہلائیں، گونگے بنے بیٹھے رہیں۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ بے ضرورت نہ بولیں، کم گوئی کی عادت ڈالیں بات کریں مگر سوچ سمجھ کر۔

ہر کام کے لئے حدود مقرر ہیں اور ہر عمل کیلئے اصول۔ جو کام توازن پر قائم ہیں۔ وہی عقلمندوں کے نزدیک مقبول تریں ہے۔ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا جہاں تک ہوسکے ہم خموشی اختیار کریں نہ اس حد تک کہ حصول مقاصد میں مانع ہو، اور نہ اس درجہ کہ بسیار گو کہلائیں ؂ سعدی رحمۃ اللہ علیہ

دو چیز طیرہ عقل است دم فرو بستن　　بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

جو لوگ خاموشی کے معنی بے زبانی کے سمجھے ہوئے ہیں۔ اور بے زبانی کو اپنا شعار ٹھیرایا ہے۔ اُن کا حال اُس شہزادے کی مانند ہے جو علم ظاہری و باطنی میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے بعد اُسکے اُستاد نے تکمیل فضائل کیلئے اس کو خاموشی کی تلقین فرمائی۔ شہزادے نے اس وقت سے شیوۂ خاموشی کو اپنا پیرایہ روزگار بنایا، اور اس درجہ خاموش اور بے زبان ہوگیا۔ جیسا کہ ایک مادرزاد گونگا ہوتا ہے

بادشاہ اور اس کے مصاحبین یہ خیال کرنے لگے کہ شہزادے کے دماغ میں کچھ خلل پیدا ہوگیا ہے اس لئے حکماء واطباء سے تشخیص بھی کرائی گئی۔ مگر کسی نے اس کے مرض کو نہ پہچانا۔ آخر میں ایک حکیم نے یہ تجویز کی کہ علی الصباح شہزادے کو جنگل میں ہواخوری کے لئے لیجایا کریں، تو وہ تندرست ہوکر بات کرنے لگیگا۔

دوسرے دن شہزادے کو مع حشم و خدم روانہ کیا گیا۔ جب جنگل میں پہونچے تو ایک کبک دری دریدہ دہن ہوکر پکار اُٹھا، شہزادے کے رفقاء میں سے ایک نے جونہی اسکی آواز سنی، بندوق کا نشانہ بنایا، شہزادے کی زبان سے

بے ساختہ یہ بات نکل پڑی "ارے بیوقوف اگر تو نہ بولتا تو کیوں مارا جاتا"

جب یہ جنگل سے واپس ہوئے تو اس کی خبر بادشاہ کو پہنچائی گئی بادشاہ سنکر خوش ہوا۔ مگر سوائے اتنی بات کے شہزادہ پھر کبھی نہ بولا۔ اور حسب عادت معہودہ خاموش رہا۔ عرصہ دراز کے بعد پھر اسی حکیم سے استمزاج کیا گیا تو اس نے کہا کہ شہزادے کو کوڑے رسید کریں۔

شہزادے کو جب کوڑے لگائے جا رہے تھے تو کہا "وہاں بولنے پر چکور بندوق سے مارا گیا۔ یہاں میں نے خاموشی اختیار کی تو کوڑے کھانے پڑے ع گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

پس خردمند کو چاہئے گفتگو اور خاموشی کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دے قطعہ

نظر کردم بچشم عقل و دانش — نہ دیدم بہ ز خاموشی خصالے
نگویم لب بہ بندد دیدہ بر دوز — ولیکن ہر مقلے را مقالے

حفظ لسان:- اگرچہ بسیار گوئی ولب بستگی کا پایہ فضیلت سے گرا ہوا ہے۔ لیکن لب بستگی کو بسیار گوئی پر اسلئے تقدم بالشرف حاصل ہے کہ زبان بسیار گوئی کی صورت میں ذمائم ورذائل سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتی۔ البتہ لب بستگی کی صورت میں حفظ لسان ممکن ہے۔ جس طرح تلوار کی حفاظت نیام سے ہو سکتی ہے۔ اسی طرح زبان کی حفاظت لب سے۔

زبان تیغ تیز کی طرح واقع ہوئی ہے۔ جسکی تیزی کے آگے تیغ آبدار بھی پانی بھرتی ہے۔ جس کسی کو اس سے زخم پہنچا وہ کبھی مندمل نہ ہوا۔ اسلئے اس تیغ کا نیام میں ہی رہنا انسب ہے ؎

چھری کا تیر کا تلوار کا تو گھاؤ بھرا — لگا جو زخم زباں کا رہا ہمیشہ ہرا

جہاں تک ہو سکے دروغ گوئی چاپلوسی اور غمازی سے زبان کی حفاظت وصیانت کریں کیونکہ اس قسم کی لغزشیں بیہودہ [illegible] داخل ہیں۔ جو لوگ زبان دراز بسیار گو اور ہرزہ درا ہوتے ہیں ان کیلئے خسر الدنیا والاٰخرۃ ہے ہمارے نبی کریم علی التحیۃ والتسلیم فرماتے ہیں "ھل یکب الناس فی النار علی مناخرھم الاحصائد السنتھم" [illegible] زبان درازی کے سبب منہ کے بل آگ میں جھونکے جائینگے) جو لوگ اپنی زبان کو بدگوئی۔ دروغ و نمامی سے نہیں [illegible] ان کیلئے یہ بد عادتیں ایک دن وبال جان ثابت ہونگی ؎ ناسخ

[illegible] نی اس بزم میں بطور زباں جس کی دراز — شمع کی طرح سے سر کٹنے میں تاخیر نہیں

تحصیل علوم و فنون کیلئے احکامات اسلامیہ

(جناب سید آل حسن صاحب اختر کنلیری)

کسی قوم کیلئے یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ وہ جہالت کے تاریک غاروں میں رہکر اپنی عمر بسر کرے۔ عربوں میں قبل اسلام جہالت، خانہ جنگی، بت پرستی، عیاشی اور دیگر رسومات قبیحہ کا اسقدر زور تھا کہ اُن کو خواب میں بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ عادات خبیثہ تباہ کن اور قابل ترک ہیں۔ اُن کا افلاس روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا۔ اور اُنکی دماغی قوت لغو شاعری۔ ہجو و مدح۔ خاندانی مشیخت۔ اور جنگجویانہ خصائل کی داد میں صرف ہوتی تھی۔ جب اسلام کا نور پھیلا تو شراب کے ظروف توڑے گئے۔ زانیوں کیلئے درے بنائے گئے۔ اور لغو شاعری۔ بیہودہ انشا پردازی کو مخرب اخلاق اور قوم کی پستی کا سبب قرار دیا گیا۔

ابتدا میں ارشادات قرآنیہ کے بموجب مسلمانوں کو علوم و فنون حاصل کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ انھوں نے قدیم فلسفہ یونان کی عمیق نظر سے مطالعہ کیا۔ اور انواع و اقسام کی جدت کی۔ یورپ کے محققین اس امر کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ فلسفۂ یونانیہ کو عرب نے زندہ کیا۔ چھ صدیوں تک خلفائے امیہ اور عباسیہ کے عہد میں علوم طب، ہندسہ، اقلیدس طبعی، نجوم، ہیئت، فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ، ادب، قواعد وغیرہ رونق پر رہے۔

قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ مشاہدات عالم پر غور و فکر کر کے اپنی فلاح و بہبود کے راستے تلاش کرو۔ اپنا دماغ فضولیات اور خرافات میں صرف نہ کرو۔ ابتدا سے انتہا تک کل قرآن مجید ایسے احکامات سے پُر ہے کہ انسان کیا ہے۔ اسکی اصل فلاح کس بات میں ہے۔ ظالم لوگ کیسے تباہ ہو جاتے ہیں۔ نیک لوگ کیسے سرسبز ہوتے ہیں؛ ہوائیں کیسے چلتی ہیں بادل کیسے بنتے ہیں۔ بجلی کیا ہے۔ چاند، سورج، ستاروں، پہاڑوں، زمین، آسمان، دریاؤں، حیوانات و نباتات و جمادات پر غور کرو۔ اپنے وجود، اپنے نفس، اور اپنے اعضا پر غور کرو۔ جہاز کیسے چلتے ہیں، دودھ کیسے بنتا ہے، بارش کسطرح ہوتی ہے۔ پرند کسطرح ہوامیں پرواز کرتے ہیں۔

آجکل یورپ، امریکہ، جاپان و جرمنی نے انھیں ارشادات حقہ پر کلیۃً عمل کر کے دنیا کو حیرت انگیز ترقی کر کے دکھلادی ہے۔ قرآن مجید عقل سکھاتا ہے۔ غیر اقوام سیکھتی ہیں۔ غور کرتی ہیں۔ نتیجہ نکالتی ہیں۔ نئی نئی راہیں نکالتی ہیں۔ مگر انکے معلم اول سستی و تاریکی میں ہیں۔

ذیل میں قرآن مجید کے چیدہ چیدہ مقامات درج کئے جاتے ہیں۔ انکو پڑھ کر ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کے مذہب میں حکمت

دانش، غور وفکر، عقل وتمیز کو کس کس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤتی الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا وما یذکر الا اولوا الالباب

جسکو چاہتا ہے اللہ حکمت عطا فرماتا ہے اور جسکو حکمت ملی اسکو خیر کثیر ملی۔

(گفت حکمت را خدا خیرے کثیر ہر کجا ایں خیرا بینی بگیر

یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجٰت واللہ بما تعملون خبیر ۝

تم میں سے جو مومن ہیں اور جنکو علم دیا گیا ہے اللہ اُنکے درجے بلند کرا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء ۝

مگر اللہ سے اُسکے وہی بندہ ڈرتے ہیں جو جانکار ہیں۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون ط انما یتذکر اولوا الالباب ۝

تو پوچھ کیا جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں۔ نصیحت تو بس اہل دانش ہی پکڑتے ہیں۔

اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین

میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں

ان فی السمٰوات والارض لآیات للمومنین ۝ وفی خلقکم وما یبث من دابۃ آیات لقوم یوقنون ۝ واختلاف اللیل والنہار وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیی بہ الارض بعد موتھا وتصریف الریاح آیت لقوم یعقلون ۝

بیشک آسمانوں اور زمین میں مومنوں کیواسطے نشانیاں ہیں او تمھاری پیدائش میں اور نیز جانوروں میں جنکو وہ پھیلاتا ہے یقین کرنیوالے لوگوں کے واسطے نشانیاں ہیں اور رات اور دن کے تغیر وتبدل میں اور اس رزق میں جو اللہ نے آسمانوں سے اتارا او اس زمین کو اسکے مرنیکے بعد زندہ کر دیتا ہے اور ہواؤں کے چلنے میں عقل والے لوگوں کے واسطے نشانات ہیں۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ۝ قف والی السماء کیف رفعت ۝ قف والی الجبال کیف نصبت ۝ قف والی الارض کیف سطحت ۝ قف

کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسا پیدا کیا گیا۔ اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے قائم کئے گئے اور زمین کی طرف کہ کیسے پھیلائی گئی۔

اللہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون ۝ وسخر لکم ما فی السمٰوات وما فی الارض جمیعا منہ ط ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون ۝

اللہ وہ ہے جس نے سمندر کو تمھارے لئے پابند احکام بنا دیا۔ کہ اسمیں اسکے حکم سے کشتی چل سکے تاکہ اس کے فضل سے کمائی کر سکا اور اسکی قدر کرو اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسکو پابند احکام بنا دیا ہے۔ بیشک اسمیں فکر کرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں

والشمس وضحٰها ٥ والقمر اذا تلٰها ٥ والنهار اذا جلّٰها ٥ والّيل اذا يغشٰها ٥ والسماء وما بنٰها ٥ والارض وما طحٰها ٥ ونفس وما سوّٰها ٥ فالهمها فجورها وتقوٰها ٥

قسم ہے سورج کی اور اسکی دھوپ کی اور چاند کی جو اس کے پیچھے روشنی ہووے اور دن کی جب وہ اسے ظاہر کرے اور رات کی جب وہ اسے ڈھانپ لے اور آسمان کی جسے اس نے بنایا اور زمین کی جسنے اُسے درست کیا۔ پس اسکے اندر بدی اور نیکی کا علم الہام کر دیا۔

ان احکامات پر مسلمانوں نے عمل کیا تو اور قوموں سے علوم و فنون میں بڑھے رہے اور اُن کا اقبال زبردست رہا احادیث صحیحہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم و فنون کے حصول کیلئے کسقدر زور دیا گیا ہے علم کو ہر مسلمان مرد و عورت پر یکساں طور پر فرض قرار دیا گیا ہے العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ تلاش علم میں جو پریشانیاں حائل ہوں ان کو برداشت کرو اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ علم کی شمع چین میں روشن ہو تو پروانہ وار چین کا سفر کیا کرو۔ ایک گھڑی علم حاصل کرنا اور دوسروں کو سکھانا تمام رات کی شب بیداری اور عبادت سے بہتر ہے۔ ایک عالم کی فضیلت عابد جاہل پر اسقدر ہے جسقدر کہ میری فضیلت ایک ادنیٰ امتی پر اَلعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الانبیاء عالم لوگ نبیوں کے جانشین ہوتے ہیں۔

انکے علاوہ ہزاروں احکام و اقوال کسب علوم و فنون کے متعلق نقل کئے جا سکتے ہیں۔ مگر افسوس مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے احکام پر اغیار کو عمل کرتا ہوا دیکھکر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔

آخر میں مسلمانوں کو عبرت دلانیکے لئے اقوام یورپ کی رائے مذہب اسلام کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں کہ اگلے زمانوں میں مسلمان دیگر اقوام کے استاد رہ چکے ہیں۔ آجکل وہ اغیار کے مقابلہ میں پست شکست خوردہ ہیں۔

یہ قومیں مسلمانوں کی نسبت یہ کہتی ہیں کہ وہ اسلام فطرت اللہ کے مخالف ہے۔ اسلام محض لفظ پرستی، ظاہر پرستی، رسم پرستی، اور انسان پرستی سکھاتا ہے۔ مسلمان تحریر کو دین کا دشمن خیال کرتے ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کے دماغوں کو آہنی قالب میں بند کر دیا ہے۔ نماز بے سمجھے لفظوں کا دُہرانا کافی سمجھا گیا ہے۔ آمین پکار کر یا آہستہ کہنے پر جھگڑے ہوتے اور قرأت فاتحہ خلف امام پر تکفیر بازی ہوتی ہے مگر بامعنی پڑھنے یا سمجھنے پر کوئی بحث نہیں۔

آجکل کے مسلمانوں کی حالت کا صحیح فوٹو مندرجہ بالا سطور میں آگیا ہے۔ قرآن و حدیث کی اعلیٰ درجہ کی

اشاعت یورپ وامریکہ میں ہو اور ان کو پڑھ پڑھ کر اغیار عمل کریں مگر مسلمان دست وپا شکستہ حالت میں گوشہ نشین مفلس وقلاش۔ مقروض وتنگدست بنکر اسلام کو بدنام کریں۔ یہ باتیں اسلام سے محبت رکھنے والے شخص کو اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اطمینان قلب

(از جناب سید عبداللہ صاحب المعروف بہ سلطان میاں منگرولی)

ذیل میں ہم اپنے دوست جناب سلطان میاں صاحب منگرولی کا مضمون درج کرتے ہوئے زبان کے ذریعہ ایک جدید کاٹھیاواڑی نشا پرداز کو دنیائے ادب سے روشناس کرانے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔

موصوف کو عربی فارسی اور گجراتی میں کافی مہارت حاصل ہے اور اگر اردو میں بھی چندے یونہی مشق جاری رہی تو انشاءاللہ کاٹھیاواڑ میں ایک جدید انشاپرداز کا اضافہ ہو جائیگا۔ امید ہے کہ ہمارے دوست اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے" اڈیٹر"

اطمینانِ قلب انسان کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ہم دنیا میں جس کسی کو دیکھتے ہیں وہ شب و روز اسی کوشش اور جد و جہد میں نظر آتا ہے کہ کسی صورت بھی مجھے چین کی زندگی میسر ہو اور بغیر چین کی زندگی کے اطمینان قلب میسر نہیں ہوتا بلکہ اطمینان قلب ہی کا نام چین کی زندگی ہے اور اطمینان قلب جملہ نعمتہائے دنیوی کے حاصل ہونے سے نصیب ہے اور یہ کسی شخص واحد میں بیک وقت جمع ہو جانا اگر محال نہیں تو نایاب ضرور ہے۔ ایک شخص کو ہم دیکھتے ہیں کہ اُسکے پاس رہنے کیلئے اعلیٰ مکانات، پہننے کے لئے عمدہ لباس، اور عیش و عشرت کے جملہ اسباب مہیا ہیں۔ دولتمند بھی ہے اولاد کی جانب سے بھی خوش نصیب ہے، اور خویش و اقارب میں بھی صلح و اتفاق ہے مگر ایک تندرستی نہیں ہے ذکچھ نہیں ہے یا سب نعمتیں ہیں مگر دولت نہیں یا سب کچھ ہے مگر خویش و اقارب میں نااتفاقی ہے یا اولاد نہیں۔ یا ولاد ہے تو فرمان بردار نہیں غرضیکہ کسی ایک نعمت کی بھی عدم موجودگی اطمینان قلب کیلئے مارج ہو گی ہم اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں کسی کو بھی چین اور اطمینان حاصل نہیں ہے مگر ہمارا یہ خیال بھی غلط ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنکی زندگی چین سے گذرتی ہے مگر وہ وہی اہل اللہ ہیں جنھوں نے لذات دنیوی پر راحت اخروی کو ترجیح دے رکھی ہے اور اس دنیائے فانی کی ہر لذت کو عارضی سمجھتے ہیں، آپکو تعجب ہوگا کہ کیا ان میں کوئی بیمار نہیں ہوتا؟ ان میں کوئی مفلس اور لاولد نہیں ہوتا؟ ہوتا کیوں نہیں وہ تمام حادثات و رنج و غم جو انسانی زندگی میں لاحق ہو سکتے ہیں اُس سے اُن کو بھی دوچار ہونا پڑتا ہے مگر باوجود اسکے اُنکا قلب مطمئن رہتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے قلب میں صرف خدا تعالیٰ کی محبت ہی کو جگہ دے رکھی ہے۔

ایسے لوگ جب کوئی روزگار کرتے ہیں، اولاد کو پیار کرتے ہیں یا لوگوں سے ملتے جلتے ہیں تو محض حصول اکل حلال

ادائگی حقوق، اور بنی نوع انسان کی ہمدردی کے خیال سے جو ایک انسان ہونیکی حیثیت سے ہر انسان پر فرض ہے نہ یکہ دنیادار انسان کی طرح حصول مال تکمیل عیش اور دنیاوی جاہ و منصب کے خیال سے ع

آب در کشتی ہلاک کشتی است

ایک دنیادار کو باوجود بہم سعی و کوشش کے بھی ان سے اطمینان نہیں حاصل ہوتا اور ان کو (اہل اللہ) انہی میں اطمینان کلی حاصل ہوتا ہے اسکی کیا وجہ؟ بات یہ ہے ان عارضی اور بظاہر محبوب اشیا کی انکی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہوتی اسی لئے جب ان اشیا کا فقدان ہوجاتا ہے یا ان سے چھین لیجاتی ہیں تو چونکہ پہلے ہی ان کو دل میں جگہ نہیں دی تھی کوئی تشویش اور بیچینی نہیں ہوتی وہ اپنی جملہ محبوب اشیاء کو محبوب حقیقی کی ملک جانتے ہیں بلکہ اسکی رضا و خوشنودی کیلئے اپنی جان عزیز تک اُس پر قربان کر دیتے ہیں پھر بھی کہتے ہیں ؎

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اہل اللہ کو خدا تعالیٰ سے خالص اور حقیقی محبت ہوتی ہے اور محبت کا اقتضا ہے کہ یاد محبوب سے کاشانہ دل کو آباد رکھے مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ او کما قال۔ اسلئے وہ کبھی بیچین نہیں ہوتے نتیجہ یہ کہ چین کی زندگی خدا کی یاد میں مضمر ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ اطمینان قلب کا طریقہ خود خدا بتاتا ہے کہ خدا کی یاد سے دلوں کو چین نصیب ہوتا ہے۔

غزل

(جناب محمد احمد یار خاں صاحب عبرت تلمیذ عشرت رامپوری)

شوق سے اے سنگدل کر ظلم بھی بیداد بھی — کر دیا وقفِ ستم ہمنے دل ناشاد بھی
تلخ کامی سے گنوائی جانِ شیریں حیف ہے — منزلِ اُلفت میں تھک کر رہگیا فرہاد بھی
اس دلِ بیتاب کو دم بھر نہ دم لینے دیا — ہوگئی اُنسے زیادہ سخت اُن کی یاد بھی
قابلِ افسوس ہے بیمارِ غم کی بیکسی — ضعف اتنا ہے کہ ہو سکتی نہیں فریاد بھی
جب خیال آیا تو دل قابو سے باہر ہوگیا — ہے ستم غربت میں یارانِ وطن کی یاد بھی

ان بتوں کے عشق میں دیوانگی سے فائدہ
کچھ تو ہونی چاہئے عبرت خدا کی یاد بھی

+

اُردو پر مغربی زبان کا اثر

(جناب حامد رضا خاں صاحب متعلم نظامی از علیگڈھ)

جسقدر زبانیں ہندوستان وغیر ممالک میں مروج ہیں، جتنی قدیم ہوتی جاتی ہیں، اسی قدر ہر زبان میں ایک نیا سرمایہ جمع ہوتا جاتا ہے۔ قدیم کتابوں کے مطالعہ سے تحقیق ہوا کہ موجودہ اردو قدیم محاورات وخیالات سے معرا ہے۔ یعنی اردو ایک زمانہ میں تلفظ کی زینتوں سے محروم تھی۔ اب اُردو زبان کا مستقبل شاندار نظر آرہا ہے۔ اُردو کے جراکو دو سو برس کا زمانہ گذر گیا۔ اسلئے کہ اب اردو میں کوئی نسخہ ۱۱۴۸ھ سے پہلے کا نہیں پایا جاتا۔ ان دو صدیوں میں اُردو نے بہت کچھ ارتقائی منزلیں طے کرلیں اور ہر دور میں کسی دوسری زبان کے عناصر شامل ہوتے رہے۔

تاہم اردو جب عالم وجود میں آئی، اسوقت غالباً دوسری زبانوں کا اشتراک اس درجہ نہ تھا جسقدر اب اُردو میں انگریزی الفاظ مستعمل ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزی حکومت کا ہندوستان پر پورے طور پر تسلط ہوگیا، اراکین سلطنت ضرورت کے موافق اپنی زبان کی اشاعت کرتے رہے۔ گو انگریزی زبان میں بھی اسوقت دوسری بان کا عنصر شامل تھا مگر انگریزی زبان والوں نے اس اشتراک کو باعث تنزل نہ سمجھا۔

یہی اک راز تھا جس نے انگریزی زبان کو ایک زندہ زبان بنادیا۔ اکثر میری نظر سے اُردو کے مختلف مضامین گذرے مگر کوئی مضمون ایسا نہیں پایا جو مغربی رنگ سے بچا ہوا ہو۔ یہی حال روزمرہ بول چال کا ہے۔ آجکل ایک دہقانی بھی پوسٹ کارڈ۔ ڈاکٹر۔ ریل۔ انجن۔ ڈرائیور۔ گارڈ۔ اسٹیشن وغیرہ انگریزی الفاظ سمجھتا اور کہتا ہے انگریزی داں طبقہ کو قطع نظر کرتے ہوئے اردو ہندی کے ہر معمولی طالب علم کو ڈرل، اسکول، کلاس بولتے سنا گیا ہے۔

اردو اخبارات کا کوئی کالم انگریزی الفاظ سے معرا نہیں دیکھا جاتا۔ یہی باعث ہے کہ ہندوستان میں اخبارات سے رغبت نہیں جسقدر لوگ اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں انگریزی الفاظ کی بھرمار سے اُلجھن ہوتی ہے۔

ہرچند یوپی کے دیوانی و فوجداری مقدمات و معاملات بھی اردو کے رہین منت ہیں مگر انگریزیت سے محروم نہیں، تجارتی دنیا میں خرید و فروخت کرنے والے، ذخیرہ، سوڈا، کاسٹک، ٹاٹری، پیپرمنٹ، وسیلن وغیرہ انگریزی الفاظ بلا تکلف بولتے ہیں۔

ـلیم ہے ٭

مگر گذارش یہ ہے کہ جب ہم اپنا مطلب اُردو زبان میں بخوبی ادا کر سکتے ہیں تو دوسری زبان کے اشتراک کی جنجال
ـت باقی رہتی ہے۔ (البتہ جن انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اُنکے لئے مجبوری ہے) گویہ باتیں
ـاننے کی باتیں ہیں۔ مگر مجھے صرف اُن اصحاب سے (جو موجودہ اردو زبان کے اشتراک سے انحراف کرتے ہیں) یہ
ـناہے کیا انگریزی زبان کی شرکت سے اُردو ایک باقاعدہ مستند زبان بن سکتی ہے؟

ـدو کا خزانہ فارسی و عربی تراکیب سے نہیں بھر سکتا۔

ـیرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اُردو کی تکمیل و ترصیع کیلئے موجودہ رنگ اشتراک غنیمت ہے، میں زمانہ کا رنگ
ـہوئے یہ عرض کرونگا۔ کہ اگر فلسفہ اور ادبیات کے تراجم کی پذیرائی نہ کی گئی۔ اور ہمیشہ صدائے انحراف گونجا کی
ـدر نقصان اُردو کو انگریزی الفاظ کے اشتراک سے پہنچا ہے اس سے زائد نقصان کا اندیشہ ہے۔

حیدرآباد دکن میں اُردو بہت کچھ ترقی کر چکی ہے اور روز افزوں اصلاح پذیر ہے۔ اردو زبان سے انگریزی
ـطع کئے جارہے ہیں۔

ـہ انگریزی لفظ کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ مثلاً موٹر کو ہوا گاڑی کہتے ہیں، اور ہر قسم کی گاڑیوں پر
ـمبر بھی اردو میں لکھے جاتے ہیں۔

کٹنگ سیلون' کا ترجمہ اردو میں اصلاح خانہ کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں جن صوبوں میں اُردو کی پامالی تھی اب وہاں بھی اردو کو نوازا جارہا ہے۔ مثلاً مدراس سے
ـخبارات کا اجرا قابل ستائش ہے۔

ـیک مثال (کاٹھیاوار) منگرول کی پیش نظر ہے، منگرول سے صحیفۂ زبان کا اجرا ر خوشتر صاحب کی ادب نوازی
ـستی کا ثبوت ہے، اُردو زبان کی اصلاح و اشاعت کیلئے (کاٹھیاوار) سے ایک ادبی و علمی رسالہ کا اجرا
ـی تھا میں اس کمی کو اکثر محسوس کرتا تھا۔

ـشکر ہے کہ یہ کمی پوری ہوگئی، مگر کمی کے ساتھ، تاہم رسالۂ زبان کا معیار غنیمت ہے، یہ خوشتر صاحب کی کوششوں

ـزی الفاظ'' اردو میں اس طرح مروج ہو گئے ہیں، کہ انگریزی نہ جاننے والا زبان سے ادا کرتے وقت کوئی امتیاز لفظی نہیں کر سکتا
ـبان کاش! اس کمی کو ''سبائی فرقہ'' کا کوئی فرد پورا کرسکتا!!

کا خوشگوار نتیجہ ہے، میں صدق دل سے دعا کرتا ہوں۔
خدا خوشتر صاحب کو ہمت دے، اور کاٹھیاواڑ کے باشندگان کو توفیق، تاکہ زبان کے مقاصد پورے ہوتے رہیں۔"

مضمون کے غیر مربوط ہو جانے کا خیال دامنگیر ہے" اسلئے نفس مضمون کو بالا کرتے ہوئے اس موقعہ پر مناسب ہو گا اگر یہ بتا دیا جائے کہ اُردو نے یو۔پی میں پرورش پائی اور اقتدار بھی یہیں حاصل ہوا۔ اسلئے تنزل بھی یو۔پی ہی میں ہو تھا۔ اور ہو کر رہا۔ اسکا ثبوت ہمیں مل رہا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان (علاوہ اُنکے جو موجودہ ادب لطیف کے حامی اور مددگار ہیں) قطعی خاموش نظر آتے ہیں۔
آج صوبۂ پنجاب ادبی دنیا میں ترقی کر رہا ہے۔ اور اُردو کی خدمت لاہور والے پنجاب کو اُردو کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ غیر ممکن ہے[1]
مختصر جس طرح دوسرے صوبے اردو کو ترقی دے رہے ہیں۔ اور انگریزی الفاظ اردو سے نکال رہے ہیں۔ کاش۔ یو پی والے بھی اس منزل تک پہنچنے کی کوشش کریں۔
برخلاف اسکے تقاضا کیا جاتا ہے" کہ اُردو کو فارسی اور عربی میں جذب کرنا۔ اُردو کے ساتھ ظلم ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ اُردو میں انگریزی عناصر کس درجہ شامل ہو رہے ہیں"
ہندی رسائل جو اپنے ارادوں میں ایک حد تک کامیاب ہیں" اُنکا مقصد اولیں یہی ہے کہ بھاشا سنسکرت میں جذب کر دی جائے " لہذا جب تمام قوموں کو یہ حق حاصل ہے" کہ اپنے طرز عمل کے مطابق کام کریں۔ تو اوبائے اُردو کو فارسی و عربی کے عمل اشتراک سے کیوں باز رکھنے کی کوشش کیجاتی ہے (؟ زبان)

---

[1] زبان: آپ غیر ممکن کی رٹ لگاتے رہیں" پنجاب" اپنا کام کر رہا ہے۔

دورِ حاضرہ کے شاعر

(جناب عشرت رحمانی المحبوبی رامپوری)

آجکل ہماری ادبیات کا معیار ناقابل اظہار ہے۔ عام رائے ہے کہ "دنیائے شاعری میں ترقی رونما ہے۔ ہر شہر اور قصبہ میں شاعروں کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی ہے ہر فرد ادب کی خدمت میں منہمک ہے"

لیکن بغور دیکھا جائے تو یہی 'ترقی' 'تباہی' کے مترادف ہوسکتی ہے۔ 'ادبیات' پر جو ظلم آجکل کے نوخیز 'ادیب' (بزعم خود) روا رکھتے ہیں۔ ناگفتہ بہ ہے۔

ہر فرد دبشر جو معمولی اردو پڑھ لکھ سکتا ہے، دو چار بے تکی غزلیں کہکر مسلم الثبوت "شاعر" بننے کو تیار غزلوں کی اشاعت کیلئے ہمارے بعض بعض .. .. رسائل کافی سے زیادہ ہیں۔ جنکے اجرا، کی غرض صرف تجارت" دہ .. .. "مدیر"، بمصداق "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" ادارت کی خوب گت بنا رہے ہیں۔

انمل بیجوڑ تکبندی کا نام شاعری ہے۔ رسائل کی کوئی نہیں۔ مضمون کی فراہمی ہو تو کیونکر اور کہاں سے، بس یہی شاعر اُن رسائل کے معاون ٹھہرے۔ "لکھیں عیسیٰ پڑھیں موسیٰ" تمام موزوں ناموزوں غزلیں۔ اولاً "زنبیل ارادت کیونکر پُر ہو" دوئم خود مدیر صاحب کچھ قابلیت رکھتے ہوں۔ اُن کو تو چندہ کی وصولیابی سے فرصت ہو تو مضامین کی تدوین کی جانب توجہ ہوسکے۔

اس قسم کے رسائل کا تو فرض یہی ہے کہ صرف وہی مہملات شائع کریں جنکا تعلق براہ راست اعلیٰ معاون یا سرپرست سے ہو خواہ وہ کچھ بھی ہو۔ معاون کیلئے "زمیندار" یا کسی حالت میں مالدار ہونا لازم ہے۔ اور بس۔ شاعری پر جو ظلم ہمارے موجودہ 'فاضل' شعراء نے روا رکھا ہے قابل افسوس ہے۔ اور پھر "دعوئ استادی" ناگفتنی۔"

نثر ہو یا نظم آجکل کے مضمون نگار حضرات کی یہی حالت ہے۔ لیکن نثر پر کسیقدر توجہ 'کم' فرمائی جاتی ہے۔ 'نظم' خصوصیت سے 'تختۂ مشق' ہے۔ اور ہر طرح یہ ثابت کرنیکی کوشش کیجا رہی ہے کہ 'شاعری' جو بیشتر ایک ادبی اخلاقی اور شریف فن مانا جاتا تھا۔ محض تفریحی مشغلہ ہے۔ 'پتنگ بازی' یا اور ہزاروں 'بازیاں'، جسطرح رائج ہیں۔ اسیطرح 'شاعری' بھی 'بیکاری' کا شغل ہے۔ اس سے زیادہ اسکی اہمیت ہمارے 'نوخیز' شعراء کی نگاہ میں نہیں اور

ہرگز نہیں۔ یہ خیال کرکے ہوجو گلفشانیاں ہو رہی ہیں۔ معاذاللہ۔

لیکن اس سے قابل افسوس وحیرت ایک امر ہے۔ ہمارے بعض وہ حضرات جنکو شاہیر کی فہرست میں شمار کیاجاتاہے جو علم استادی بلند کئے ہوئے دنیائے ادب میں ہر پونگ مچائے ہوئے ہیں۔ اور دو چار لمبے چوڑے لایعنی خطابات کو (بزعم باطل) شرف قبولیت عنایت کئے ہوئے ہیں۔ وہی۔ آجکل سب سے زیادہ مہملات کی گرم بازاری میں مشغول نظر آتے ہیں۔ جنکی ذات سے ادبی ترقی کی امید کیجاتی ہے۔ وہ اسکی بیخ کنی کیلئے (نشۂ استادی میں سرشار) تیار ہیں۔

ذیل میں دور حاضرہ کے قابل اور نامور شعرا کا نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے۔ میرا مقصد ہرگز ہرگز تعریض نہیں تنقید ضرور ہے۔ عام طور پر تنقید کے معنی تعریض ہیں۔ یہ بھی ہماری ایک کمزوری ہے۔ تنقید ترقی کا اہم ذریعہ بن سکتی ہے۔ لیکن ذاتیات سے کوئی تعلق نہو۔ صاف اور بے لوث تنقید فرض ہر اس فرد کا جسکا تعلق ادبی خدمات سے ہے۔ جہاں جہاں میری "عقل" کا قصور متصور ہو۔ کرم فرماکر وضاحت فرما دیجئے تاکہ استفادہ ہوسکے

"رسالہ خورشید میرٹھ"

مئی سنہ ۲۴ء

امیرالکلام۔ حسان الہند حضرت غریب سہارنپوری

ط بہت اچھا اگر میری کہانی تم نہیں سنتے
کسی سے کشتگان کربلا کی داستاں سنلو

کیا خوب ارشاد ہے۔ آپکی داستان "کشتگان کربلا کی داستان" سے ضرور مشابہ ہے۔ معاذاللہ۔ کیا بلند پروازی ہے۔

س غریب انساں نہیں ہے درحقیقت اک فرشتہ ہے
تحیر میں رہو برسوں جو اس کی داستاں سنلو

معقول۔ شاعری اسی کا نام ہے۔ آپکے فرشتہ ہونے میں کسکو کلام ہوسکتا ہے۔ غالباً ہر وہ ہستی جس کی حیرت فزا ہو "فرشتہ" کہلائے جانیکی مستحق ہوسکتی ہے۔ نرالی جدت ہے۔

خورشید جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

۵۳ جو اُترا غسل کرنے کے لئے وہ بحرِ محبوبی
تو پھیلے ہاتھ دریا کے کھلا آغوش دریا کا

نہیں معلوم 'دریا کے ہاتھ کسطرح پھیلے' اور آغوش 'کیونکر' کھلا' - پھیلے اور کھلا دونوں فعل ماضی ہیں - جو ظاہر کرتے ہیں کہ محبوب کے دریا میں اُترنے سے پہلے ہاتھ اور آغوش بند تھے - یہ بھی واضح نہیں کہ شاعر کی مراد ہاتھ اور آغوش دریا سے کیا ہے اور اسمیں کیا جدت پیدا کی ہے - (وا ہے کسی کے واسطے آغوشِ نقش پا) غالباً اس مصرعہ کے وا ہے' صیغۂ حال سے دھوکہ کھاکر "پھیلے ہاتھ اور کھلا آغوش دریا کا" فعل ماضی استعمال کیا گیا ہے - جو غلط ہے -

رسالہ جلوۂ یار میرٹھ

جون و جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

۵۴ یہ بھی فانی ہے فنا ہو جائے گا مٹ جائیگا
چار دن کو رونقِ بازارِ دنیا اور ہے

جناب حسان الہند کی ایجاد یہ بھی کس قدر نرالی ہے - 'رونق' کو 'مذکر' فرماتے ہیں - آجتک تو 'رونق' 'مونث' سنا ہے - شعر کی نثر کیجئے - غالباً بازار کی مناسبت نے "فنا ہو جائیگا" "مٹ جائیگا" لکھنے پر مجبور کیا - قادر الکلامی اسی کے معنی ہیں -

فصیح البیان جناب افسر صدیقی امروہوی

۵۵ قبرِ عاشق سے نظر پھیر کے جانے والے
تو نے اس ڈھیر کی ٹھوکر بھی کبھی کھائی ہے

ماشاءاللہ فصاحت تو آپکے بیان سے "ٹپکتی" ہے - ڈھیر کی ٹھوکر کھانیکا استفسار انوکھی ترکیب ہے -

۵۶ میں بھی وحدت کے مزے لوٹ رہا ہوں ظالم
تیری یکتائی کا جوڑا میری تنہائی ہے

یکتائی کا جوڑا، کیا اچھی زبان ہے۔ آپ فصیح البیان ہیں۔

۵۳ چشم ساقی سے جوانی میں جو چھلکی تھی شراب
بنکے گردش مرے حصہ میں وہی آئی ہے

کیسا وجد انگیز شعر فرمایا ہے۔ افسوس کہ اس ادق مسئلہ کو حل کرنیکی لیاقت نہیں۔ تشریح فرمادیجئے تو بعید از علم دوستی نہوگا۔ حضرت فصیح البیان زحمت فرمائیں۔

جناب منشی جان محمد صاحب انور تلمیذ حضرت مضطر خیر آبادی

۵ کس غضب کی یہ الٰہی شب تنہائی ہے
شرط بدکر تو قیامت سے نہیں آئی ہے

"شرط بدنا" خوب فصاحت ہے۔ جدید محاورہ ہے۔ "شرط کرنا" تو سُنا۔ لیکن اسکی سند درکار ہے۔

جناب منشی شیاما چرن صاحب ترم مختار بریلوی تلمیذ جناب حلم بریلوی

۵ باڑھ تلوار کی جلادنے بنوائی ہے
آج کیا جانیے کس کس کی قضا آئی ہے

تلوار کی باڑھ بنوانا، جدید محاورہ ہے۔ جو جناب ترم نے تراشا اور جناب حلم نے حلیم الطبعی سے تسلیم کرکے اسکے اجرا کی اجازت دی۔ فصیح وصحیح محاورہ "باڑھ رکھنا" یا "باڑھ رکھوانا" ہے۔ سند درکار ہے

جناب زخمی از سیونی

۵ قتل کے بعد مرے آپ بھی پچھتائیں گے
عاشقوں میں یہی اک آپ کا شیدائی ہے

قتل کسکا۔ اور شیدائی کون ہے"۔ "انداز بیان نرالا ہے۔ نثر کیجئے۔ عجیب وغریب اُردو ہے۔ فرماتے ہیں۔ "میرے قتل کے بعد آپ بھی پچھتائینگے" (کیونکہ) عاشقوں میں یہی اک آپکا شیدائی ہے۔ مہمل ہے۔ "میں ہی اک آپکا شیدائی ہوں،، ہونا چاہیئے۔

جناب منشی سالگ رام صاحب سالک گرداری

۵
کیا بتاؤں کہ محبت میں ہیں جھگڑے کیا کیا
کبھی خفت کبھی ذلت کبھی رسوائی ہے

ماشاء اللہ۔ منشی صاحب۔ واقعی محبت میں بھی جھگڑے ہیں۔ حسن وعشق کا مرقع ہے آپکا شعر۔ خفت بھی کیا خوب ہے۔ اللہ اللہ کیسے کیسے جھگڑے ہیں۔ اور پھر آپکی ادائگی۔ اے سبحان اللہ۔ کبھی یہ بھی غور کیا۔ شعر گفتن چہ ضرور۔ شاید کسی مرض کی دوا ہے۔

جناب حافظ قادر بخش صاحب شباب تلمیذ جناب مشتاق

۵
دل ہے مضطر شبِ غم آنکھ ممنائی ہے
کاش ایسے میں وہ آجائیں تو تنہائی ہے

کیا مہمل ادائگی ہے۔ مصرع ثانی کی بے ربطی قابل داد ہے۔ "ایسے میں وہ آجائیں تو تنہائی" بھی خوب ہے۔

کچھ اس انداز سے ہے شاخ گلِ تر کا تناؤ
کہ نظر میں کسی معشوق کی رعنائی ہے

"شاخ گل تر کا تناؤ"۔ کیا فصاحت ہے۔ معاذاللہ۔ تناؤ اور رعنائی کا تناسب۔ کیا خوب!

ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی جانشین نواب فصیح الملک بہادر مرحوم

۵
آپ سے اور مجھ سے لطف وکرم کی امید
کبھی یہ بات ہوئی ہے کبھی ہو آئی ہے

فصیح العصر کی فصاحت ملاحظہ ہو۔ "ہو آئی ہے"۔ عجیب وغریب محاورہ ہے۔ جس سے آجتک کان آشنا نہ تھے۔ ہوا نہ معلوم کہاں کی زبان ہے۔ غالباً خاص ناروہ میں استعمال ہوتی ہے۔ "ہوتی آئی ہے"، تو سنا ہے۔ لیکن یہ انوکھی ترکیب ہے

سند: (ناخدا کی ناخدائی دیکھ لی)۔

۵۲
بیٹھکر وہ مرے پہلو میں یہ فرماتے ہیں
کیوں جی اب بھی تمھیں دعوائے شکیبائی ہے

کیسا فصیح و بلیغ شعر فرمایا ہے۔ مگر کج فہمی کو کیا کہئے مطلب و معنی سمجھنے سے قاصر "دعوائے شکیبائی" تشریح طلب ہے۔ شعر ضرور لطیف ہوگا۔

اب کہانتک اس لغویات کا اظہار کیا جائے۔ بطور مثال چند نمونے پیش کئے گئے۔ جو امید ہے کہ میری گذارش واقعی کی تصدیق کیلئے کسیقدر کافی ہونگے۔ یہ ہیں ہمارے اوستادان وقت کے کمالات۔ خدا ہدایت فرمائے۔ آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ تعریض منظور نہیں۔ بلکہ حقیقت کا اظہار جو ایک ادبی خادم کا فرض ہے ۔۵

آزاد ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

عشرت رحمانی المحبوبی

غزل

(جناب منشی عبداللطیف صاحب شاد شاگرد حضرت امیر مینائی)

کبھی ہم ضعف میں آہیں کبھی فریاد کرتے ہیں
یہ پردے ساز خاموشی کے ہیں چڑھتے اترتے ہیں

کچھ ایسے حد سے باہر ہجر کے صدمے گذرتے ہیں
کہ دل سے درد دل کو ہم الگ محسوس کرتے ہیں

نہ لگی اے نظر تیغ نظر کے زخم پنہاں کو
شہیدان نگہ حوروں کی چشم بد سے ڈرتے ہیں

نہیں محسوس ہوتی آہٹ انکے پائے نازک کی
وہ میری عمر بنکر کوئے دشمن سے گذرتے ہیں

مرنو کی طرح رکھتے ہیں اک نمود آدمی ہستی
فنا ہونے سے ہم اپنے کو آپ ایجاد کرتے ہیں

نگاہ سے کرتے ہیں پیدا تن کو بیمار میں لرزش
وہ حسن کہربائی نبض خس میں جذب کرتے ہیں

یہ کمزوری ہے کہہ دینا کلام شاد مغلق ہے
نکالنے سے نہ تمہ ہم ہدیہ دشمن کو کرتے ہیں

دورِ قدیم و جدید کی شاعری پر ایک نظر

(جناب ولایت حسین خانصاحب اثر رامپوری)

اساتذہ متقدمین و متاخرین نے اصنافِ سخن میں سے جس جس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اُس کو بلحاظ وقت و مذاق اسی نظر سے دیکھنا ہر صاحبِ ذوق و اہلِ نظر کا فرض ہے۔ ہمکو خوش ہونا چاہیئے کہ وہ ہمارے لئے ہر قسم کا کافی سے زیادہ سرمایہ چھوڑ گئے ہیں اگر ہم اب بھی اس سے فائدہ نہ اٹھائیں تو اس سے زیادہ ہماری کم نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے دیکھا جاتا ہے کہ برخلاف دورِ قدیم کے دورِ جدید کی شاعری میں زیادہ تر لفاظی کیجا رہی ہے جو عام زبان کی وسعت کو محدود کرتی ہے۔ ضرورت ہے کہ روزمرہ اور عام بول چال کو وسعت دیجائے۔ پروفیسر آزاد نے آبحیات میں خواجہ آتش مرحوم لکھنوی کے حال میں ان کے طرزِ کلام پر تحریر کیا ہے "کہ" جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورۂ اردو کا دستورالعمل ہے اور انشا پردازئ ہند کا اعلیٰ نمونہ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اُسی طرح انھوں نے شعر کہہ دئے ہیں انکے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی،، واقعی کلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ اس سے اُس عہد کی بول چال کا انداز ہو سکے۔ افسوس ہے کہ دورِ حاضرہ کے نوجوان تعلیم یافتہ نئی روشنی کے دلدادہ طرزِ کہن کے ناپسند کرنے والے اس طرف کچھ توجہ نہیں کرتے۔ روزمرہ اور عام بول چال کو "جس سے کلام میں روانی بشستگی اور صفائی پائی جاتی ہے" غلط فہمی سے عدم قابلیت کا سبب ٹھیراتے ہیں سبب یہ ہے کہ اول تو برعم قابلیت کسی اُستاد سے رجوع کرنا گوارا نہیں کرتے اور اگر ایسا کرتے بھی ہیں تو اصول و قواعد کی پابندی نہیں کرتے۔ خدا ان کے یارانِ طریقت کو خوش رکھے جو ہمیشہ واہ وا سبحان اللہ سے انکے کلام کو چار چاند لگاتے رہتے ہیں اور انھیں مشقِ سخن کی زحمت سے بچا کر بزعم خود اُستاد ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ پھر تو یہ بھی اظہار قابلیت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے اور دل کھول کر ہر صنف میں ایسی لفاظی کرتے ہیں کہ نفس مطلب فوت ہو جانے تک کا لحاظ نہیں کرتے۔ ایسا تو اکثر و بیشتر ہوتا ہے کہ پرشکوہ الفاظ کی بھرمار سے کلام کو ایسا مغلق کر لیتے ہیں کہ جو مطلب ہوتا ہے وہ الفاظ اشعار سے ادا نہیں ہوتا۔ لگتے لگانے پڑتے ہیں اور یہ اسی کو معیار قابلیت سمجھتے ہیں خدا انھیں اساتذہ کے کلام سے فائدہ اٹھانیکی توفیق دے اور یہ اپنے میں اظہارِ خیالات کی روزمرہ اور عام بول چال میں قوت پیدا کریں البتہ جو خیالات و مضامین عام زبان میں ادا نہوں اور علمی الفاظ وضع کرنیکی ضرورت پیش آئے تو مجبوری ہے۔

مترجمات

مطبوعات قدیمہ کی قدر وقیمت

عنوان بالا سے الزہرا کے تازہ پرچہ میں ایک پر از معلومات مضمون شائع ہوا ہے جسمیں مضمون نگار نے بعض اُن یوروپی مطبوعات مصر کا تذکرہ کیا ہے جو مختلف اوقات میں بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہوتی رہی ہیں -

نام کتاب	کس سنہ میں یا فروخت ہوئی	قیمت	کیفیت
تورات	سنہ ۱۸۲۲ء	۱۲۸ لیرہ	یہ کتاب غوجن برگ میں ٹائپ میں بزبان لاطینی پندرھویں صدی کے نصف میں شائع ہوئی تھی -
"	سنہ ۱۸۴۱ء	۱۹۰ لیرہ	
"	سنہ ۱۸۸۳ء	۳۹۰ لیرہ	
"	سنہ ۱۸۹۷ء	۴۰۰ لیرہ	
کتاب المزامیر			خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو چھڑے پر ٹائپ میں سنہ ۱۴۵۷ء میں شائع ہوئی تھی - اسکا پہلا نسخہ لوئی ہشتدہم نے بارہ ہزار فرانک میں خریدا تھا - موجودہ زمانہ میں اسکا صرف ایک نسخہ باقی ہے -
کتاب المزامیر مطبوعہ سنہ ۱۴۵۹ء	سنہ ۱۸۸۱ء	۱۲۲،۰۰۰ فرانک	سنہ ۱۸۸۱ء میں اسکے صرف بارہ نسخہ موجود تھے جن میں سے ایک مذکورہ قیمت پر فروخت ہوا تھا -
الاقتدار بالمسیح مطبوعہ سنہ ۱۴۷۱ء	سنہ ۱۹۰۵ء	۳،۰۰۰ فرانک	یہ کتاب موٹے خط میں صرف ۷۰ صفحات پر مشتمل تھی -

کتب خانہ جامعہ پرنسٹن (امریکہ) میں روم کے مشہور شاعر ورجل کا ایک دیوان ہے جو روم میں پہلی بار سنہ ۱۴۶۹ء میں

مرتب ہوا تھا خیال ہے کہ اسکی قیمت بیحد و شمار ہوگی اس جامعہ کو بھی اپنی اس ملکیت پر بہت فخر و ناز ہے۔ یہ سنکر حیرت ہوتی ہے کہ شکیسپر کی مطبوعہ تصنیفات کی قیمت کا اندازہ اسکی اپنی زندگی میں صرف ۰۰، پونڈ کیا گیا تھا۔ ابو الفرج اصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی کو (جسکا تذکرہ اسی رسالہ میں اختر صاحب کر چکے ہیں) پچاس برس میں مرتب کیا تھا جسکا ایک نسخہ کہتے ہیں کہ سیف الدولہ بن حمدان حاکم حلب کی خدمت میں خود مصنف نے تحفۃً بھیجا تھا جس کے صلہ میں حاکم مذکور نے ایک ہزار دینار مصنف کو دئے تھے (افسوس) صاحب بن عباد کہتے ہیں "حاکم نے ابو الفرج کی کوئی قدر نہ کی اور انتہائی بخل سے کام لیا مصنف اس سے کئی چند انعام و اکرام کا مستحق تھا۔

مغلوں کا محکمہ احتساب

ہندوستان کے مشہور مورخ پروفیسر جدو ناتھ سرکار نے اپنی محققانہ تالیف "نظام حکومت مغلیہ" "Mughal Administration" میں "عہد مغلیہ میں محتسب کے فرائض" پر ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی لیکن چونکہ "زبان" کا یہ عنوان خاص محض تراجم کے لئے وقف ہے اسلئے ہم بھی ترجمہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں اس موقع پر یہ بتلا دینا نامناسب نہیں معلوم ہوتا کہ پروفیسر صاحب نے اس عنوان کے تحت میں جو کچھ لکھا ہے وہ بعض دستاویزات از قسم فرامین و دستور العمل کے مطالعہ کا نتیجہ ہے جیسا کہ آپ نے اس کتاب میں آگے چلکر تشریح کردی ہے اگر انھوں نے اس موضوع پر خالص اسلامی نقطۂ نظر کا مطالعہ کیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ اس مضمون میں ایک امتیازی شان پیدا ہو جاتی بہر حال مغل شاہی محکمۂ احتساب پر انھوں نے جو کچھ معلومات فراہم کی ہیں۔ انکا ملخص یہ ہے وہ قانون اسلام کی رُو سے بادشاہ وقت کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک محتسب کو مقرر کرے جو عوام کو قرآنی احکام کی پیروی میں مستعد رکھے۔ محتسب کے فرائض میں احکام و اوامر (خدا) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر لوگوں کو آمادہ کرنا اور نواہی سے باز رکھنے کی سعی کرنا داخل ہے مثلاً بادہ خواری۔ بھنگ نوشی و دیگر سیال اور نشہ آور اشیاء کے استعمال سے روکنا اور قمار بازی و دیگر خلاف شرع امور سے لوگوں کو باز رکھنا وغیرہ۔

خشک نشیلی چیزوں کی ممانعت نہ تھی افیون اور گانجہ کا استعمال جائز قرار دیا گیا تھا۔ ملحدانہ خیالات انکار رسالت اور روزہ نماز سے غفلت شعاری پر کسی مسلمان کو سزا کا مستوجب ٹھرانا بھی محتسب کے فرائض میں داخل تھا۔ محتسب کا یہ معمول ہوتا تھا کہ وہ سپاہیوں کی ایک جماعت لیکر شاہراہوں اور گلی کوچوں میں گشت کرتا اور ان دوکانوں اور گھروں کو

ڈھونڈھ کر مسمار کرا دیتا تھا جہاں خلاف شرع امور کا ارتکاب کیا جاتا تھا یعنی جہاں شراب یا اور کوئی دوسری
نشہ والی چیزیں فروخت ہوتی تھیں یا جہاں جوا کھیلا جاتا تھا - اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی آبادی کو احکام اسلام
کی تنبیہ و تلقین کیجاتی تھی بعض اوقات اس جماعت کو ان احدؔ "خراباتیوں" کے خلاف جو آمادۂ فساد اور مقابلہ
ہو جاتے تھے مسلح کارروائی کرنی پڑتی تھی۔

اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد حکومت میں نو تعمیر منادر کا انہدام بھی محتسب کے فرائض میں داخل تھا دیکھو تاریخ
زیب تیسرا حصہ" مصنفہ جدو ناتھ سرکار" صفحات ۹۳، ۹۴، ۳۲۳) (افسوس ہے کہ مصنف نے اپنی ہی ایک دوسری
کا حوالہ دینا مناسب سمجھا اگر اصل ماخذ کا حوالہ دیا جاتا تو اس جملہ کی صداقت و حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی) محتسب
تقرری کے وقت حسب ذیل ہدایات دیجاتی تھیں - ان مسلمانوں کو جو مذہب حقہ کی عبادات و مراسم سے نابلد ہیں آگاہ
گروہ سہل انکاری اور غفلت سے کام لیں تو زجر و توبیخ کرو یا تنبیہ سزا دو بازاروں اور گلیوں میں دیکھو کہ کسی نے خلاف
دستور سڑک کے کسی حصہ کو روکا یا راستہ کو بند تو نہیں کر دیا ہے یا بازار کے اس حصہ پر قبضہ کر کے دوکان تو نہیں لگائی
عام گذرگاہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اور یہ خلاف ورزیاں ہوتی ہوں تو ان کا سدباب کرو اور قانون کی اطاعت
شہر میں نشیلی اشیاء کے استعمال یا بازاری عورتوں کے قیام کی ہرگز اجازت نہ دو کیونکہ نواہی شرع میں انکا شمار
ان لوگوں کو جو قرآنی احکام کی نافرمانی کرتے ہیں نیکی کی طرف ہدایت کرو لیکن ایک سختی کا برتاؤ نہ کرو ورنہ وہ تمھارے
آزار ہو جائینگے تمھیں چاہئے کہ پہلے سرگروہ اشرار کو متنبہ کرو اگر وہ پھر بھی تمھاری باتوں کو خاطر میں نہ لائیں تو عامل
سامنے ان کو پیش کرنے کی کوشش کرو"

فلسطین کی جدید اثری تحقیقات

ارض الانجیل "Bible Lands" یں یوریشلم اور مشرق قریبہ کی مشنری جماعت کا سہ ماہی آرگن ہے ایک اہم مضمون فلسطین کی موجودہ تحقیقات اثری پر شائع ہوا ہے ہم اس مضمون کے بعض ضروری حصے پیشکش ناظرین کرتے ہیں۔ "عالمگیر جنگ کے بعد فلسطین میں سول نظام حکومت کے قیام پر برطانوی مدرسہ علم الآثار کے ڈائرکٹر کی ماتحتی میں آثار قدیمہ کے ایک محکمہ کا خاکہ تیار کیا گیا تھا جسکا عملی افتتاح سنہ ۱۹۲۰ء میں ہوا لیکن سنہ ۱۹۱۸ء میں ہی یہ قائم ہو چکا تھا یہاں کی قدیم اور مشہور سوسائٹی "Ecole Biblique de S. Etienne" ہے اور امریکن جماعت محققین مشرق سنہ ۱۹۰۰ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی کوشش "فلسطینی تحقیقاتی فنڈ" (سنہ ۱۸۶۵ء) کا قیام تھی جو کامیاب ہو کر ان اداروں کی شکل میں ظاہر ہوا ہے ان یوروپی جماعتوں کے علاوہ خالص یہودی ادارات اور تحقیقاتی جماعتیں ہیں۔ غیر ذمہ دارانہ تحقیقاتی سلسلہ کو بند کرنا تحقیق و تدقیق مسائل میں سائینٹفک اصول پر کام کرنے میں مدد دینا ایسے طلباء کی ایک جماعت تیار کرنا جو فن تحقیقات میں ماہر ہوں اور نتائج تحقیقات جو خواہ علمی ہوں یا مادی کی حفاظت کرنا یہ ان ادارات کے فرائض اغراض اور مقاصد ہیں۔

ان اطراف میں کھودائی اور تحقیقات کرنے سے جو اہم نتائج نکلے ہیں انکا تذکرہ ارض الانجیل کے پچھلے نمبروں میں مفصل کیا جا چکا ہے۔ یروشلم کی قدامت پر اب کوئی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی اور یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت داؤد (علیہ السلام) سے بہت پہلے اس شہر کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور اس لئے معبد سلیمان علیہ السلام سے بہت پہلے بھی یہاں ایک معبد ضرور رہا ہوگا۔

گلیلین سر کی نسبت جسکو فلسطین کے نتائج تحقیقات میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ آج سے بیس ہزار یا اس سے بھی پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے فلسطین کی قدامت بھی پایۂ ثبوت کو پہونچتی جا رہی ہے اور یقیناً یہ حقیقت ظاہر ہو کے رہیگی۔

ببیل (جبیل۔ پہاڑ جو یونانی لفظ "Biblos" سے مشتق خیال کیا جاتا ہے اور جو بیروت کے شمال کی جانب واقع ہے فرانسیسیوں نے بعض عمدہ قبریں دریافت کی ہیں جو بارھویں خاندان (۲۱۰۰ قبل مسیح علیہ السلام) کی ہمعصر خیال کیجاتی ہیں۔ انکے اور بھی صدیاں پہلے کی ہی قیاس کی جاتی ہیں بائبل اور مصر کے باہمی تعلقات بہت قدیم

درگھیرے تھے اور اسوقت سے تھے جبکہ شام کو مصری صوبہ جات میں نہ شمار کیا جاتا تھا۔ مصری معبد کی تحقیقات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قدیم اور متوسط شاہوں کی ملکیت میں تھا۔ اہرام، شاہ بائبیل کے کتبہ کو ایک خاص اہمیت دیجاتی ہے کیونکہ فنیشین ایپی گرافی کا یہ قدیم ترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے اسکا سن کتابت بارھویں صدی قبل ولادت مسیح ہے۔

تل مشرف (شام) میں ایک وسیع و عظیم قلعہ کے آثار موجود ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ اسکی فصیل ۲۵ فٹ اونچی رہی ہوگی۔

اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جماعتوں کے علاوہ جنکا تذکرہ آغاز میں کیا گیا ہے امریکہ اور یوروپ کے مشہور دارالعلوموں کی جماعتیں بھی ان اطراف میں مشغول تحقیقات رہتی ہیں۔

یہ مضمون آخر میں اس اطلاع پر ختم ہوا ہے کہ اس موضوع پر اے۔ ایس میکیسٹر کی کتاب "A century of excavation in Palestine" بہترین خیال کیجاتی ہے یوں تو شام کے آثار قدیمہ پر صدہا کتابیں لکھی گئیں ہیں۔

یادگار قدیم

جے پور ایک مشہور ریاست راجپوتانہ میں ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت ضیاء الحق والدین مولنا سید شاہ ضیاء الدین علیہ الرحمۃ آسودۂ خواب ہیں جو حضرت قطب الاقطاب خواجہ محمد فخر الدین چشتی دہلوی قدس سرہٗ کے خلیفہ اعظم اور خاندان چشت کا روشن چراغ ہیں۔ آپ ہی کے دست مبارک سے مدرسہ ضیاء الاسلام قائم ہوا تھا جسکو آپ نے ایک اعلیٰ پیمانہ پر پہنچا دیا تھا لیکن اب زمانہ کے جزرومد سے اسکی حالت قابل غور ہے۔ جے پور میں اولاً اسلامی آبادی نسبتاً کم اور ہے تو غربا کی۔ زیادہ ضرورت ہے کہ یہاں تعلیم اسلامی جاری رکھی جاسے تو یہاں کے مسلمان علم دین سے واقفیت حاصل کریں پس اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس قدیم کو قائم رکھیں تو اسکی ہر طرح امداد کیجئے۔ ما علینا الا البلاغ

ترسیل زر بنام مولوی محمد افتخار علی صاحب ناظم مدرسہ ضیاء الاسلام محلہ چھوٹا کہرہ جے پور سٹی ہونا چاہیے۔

المشتہر

سکریٹری مدرسہ

ادبیات

فلسفی وِل

(جناب احمد عبد اللہ المسدوسی متعلم جامعہ عثمانیہ)

(۱)

گرنی جہاں وِل، اپنے متبنی لئے ہوئے والدین کے ساتھ رہتا تھا وادی کے زیریں حصہ میں سر بفلک پہاڑوں اور صنوبر کے درختوں کے درمیان واقع تھی، اوپر کے حصہ میں ایک پہاڑ پر دوسرا پہاڑ واقع تھا جو گنجان اور اونچے ساگوان کے درختوں کی گہرائیوں سے نکل کر آسمان کا اپنی عریانی سے مقابلہ کرتا تھا کچھ اوپر کی طرف لمبا حصہ کھمبے کے مانند جو جھاڑی دار پہاڑی پر چھایا ہوا ہو واقع تھا۔ وِل کے کانوں میں گرجا کے گھنٹوں کی مہین اور نقرئی آواز ہوا موافق ہوتی تو آیا کرتی تھی نیچے وادی زیادہ ڈھلوان مگر ساتھ ہی ساتھ دونوں جانب کشادہ ہوتی گئی تھی۔ گرنی کے قریب بلندی سے اسکی پوری لمبائی صاف طور پر دکھائی دیتی تھی اور اس وادی سے دور آگے ایک وسیع میدان میں دریا چمکتا راستہ بدلتا ہوا اور اپنے منزل مقصود سمندر کی طرف ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف بہتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس وادی کے اوپر ایک درہ تھا جو ہمسایہ سلطنت میں نکلتا تھا پس خاموش اور دیہی مقام ہونیکی وجہ سے سڑک پر جو اس پار دریا کے کنارے کنارے گئی تھی دو عظیم الشان اور طاقتور جماعتوں کے درمیان مسافرین کی کثرت رہتی تھی۔ گرما کے پورے موسم میں ادھر جانیوالے مسافرین کی گاڑیوں یا گرنی سے پرے نیچے کی طرف آنیوالوں کی آواز سنائی دیتی تھی اور چونکہ دوسری جانب سے چڑھنا نسبتاً آسان تھا اس لئے مسافرین کا اس راستہ پر زیادہ ہجوم نہوتا، پانچواں حصہ نیچے کی طرف آتا تو ایک حصہ اوپر کی جانب جاتا ان تمام گاڑیوں میں جنکو سفر کرتے ہوئے وِل نے دیکھا تھا یہ تناسب تھا۔ پیدل مسافرین کا تناسب تو اس سے بھی زیادہ تھا۔ تمام سبک رفتار پیدل مسافرین اور تمام چلتر فروش دیہاتی تاجر اپنے عجیب و غریب سامان تجارت سے لدے ہوئے نیچے کی طرف دریا کی مانند جوان کا ہمسفر تھا جاتے تھے۔ یہی نہیں جب وِل ابھی بچہ تھا تو دنیا کے ایک بڑے حصہ میں خوفناک لڑائی چھڑ گئی، اخبارات کے کالم فتح و شکست کی خبروں سے معمور ہوتے تھے، زمین گھوڑوں کے ٹاپ کی آواز سے گونج اٹھی تھی اور اکثر اوقات کئی مسلسل دن تک اور میلوں تک چاروں جانب نیک اور

غریب لوگوں کو میدانوں میں محنت کرنے سے لڑائی کے ہنگامہ اور شور و شغب کی آوازیں گھبرا دیتی تھیں۔ وادی میں ایک زمانہ تک ان سب کے متعلق کچھ نہیں سنا گیا لیکن آخرکار ایک سپہ سالار فوج کو درے کی دوسری جانب لے گیا اور تین دن تک سوار اور پیدل، توپ و قرنا کی آوازوں میں گرنی سے نیچے کی طرف جوق در جوق جاتے رہے۔ تمام دن یہ لڑکا دروازہ کھڑا ہوا انکو دیکھتا رہا۔ باقاعدہ مارچ، زرد چہرے، حجامت بڑھی ہوئی، آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی، اڑے ہوئے رنگ کے نشان، دبلے بارہ غلام ان سب نے اسکو ایک قسم کی تکان، رحم اور تعجب کے احساسات سے بھر دیا اور رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد وہ توپوں کی گرج اور گھوڑوں کے ٹاپ کی آواز اور جنگ کی آواز باز گشت کو گرنی کے اوپر اور نیچے سنتا رہا۔ وادی میں کسی نے اس لڑائی کے حشر کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں سنا کیونکہ ان لوگوں نے اس مصیبت کے زمانے میں گپ شپ اڑانا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اسکے باوجود دول کو ایک امر صاف طور پر نظر آتا تھا کہ ایک آدمی بھی اس مہم سے لوٹ کر نہیں آیا یہ سب کہاں گئے؟ تمام پیدل مسافر اور سبک رفتار چلر فروش اپنے عجیب و غریب سامانِ تجارت کے ساتھ کہاں گئے؟ تیز قدم گاڑیاں کہاں گئیں؟ دریا کا پانی ہمیشہ نیچے کی طرف بہتا ہوا اور ہمیشہ اوپر سے تازہ دم ہو کر کہاں جاتا ہے؟ یہاں تک کہ ہوا بھی اکثر وادی کے نشیب میں بہتی اور اپنے ساتھ گرے ہوئے پتوں کو نیچے کی طرف پھینک دیتی ہے۔ اسکو جاندار اور غیر جاندار اشیا کی یہ ایک بہت بڑی سازش معلوم ہوتی تھی کہ وہ سب کے سب تیزی اور خوشی کے ساتھ نیچے کی طرف جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف پیچھے رہ گیا ہے اس لکڑی کے مانند جو راستہ پر پڑی ہوئی ہو۔ بعض اوقات اس امر کا نظارہ اسکو خوش کر دیا کرتا تھا کہ کس طرح مچھلیاں دریا کی اوپر کی جانب چڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں جبکہ تمام دنیا نیچے ایک نامعلوم دنیا کی طرف جا رہی ہے کم از کم مچھلیاں تو اسکے ساتھ شرطِ وفاداری نباہ رہی ہیں۔

ایک صبح اس نے گرنی کے مالک سے پوچھا کہ دریا کہاں جاتا ہے؟

وہ وادی کے زیریں حصہ میں کئی گرنیوں کو ——— لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سے اسٹرڈک تک ۶۰ گرنیوں کو ——— چلاتا اور پھر بھی تھکتا نہیں ہے۔ پھر وہاں سے نیچے کے ممالک میں جاتا، بہت بڑے اناج کے ملک کو سیراب کرتا اور چند خوبصورت شہروں میں سے جہاں لوگوں کا بیان ہے کہ بادشاہ یکہ و تنہا رفیع الشان محلوں میں جنکے دروازوں کے سامنے سنتری ٹہلتا رہتا ہے رہتے ہیں گزرتا ہے پھر وہ پلوں کے نیچے سے جنکے اوپر پتھر کے مجسمے جو پانی کو دیکھتے اور مسکراتے ہیں کیونکہ وہ پانی کے دیکھنے کے بڑے مشتاق ہیں نصب کئے جاتے ہیں گزرتا ہے پھر وہ ریت اور کیچڑ کے درمیان سے ہو کر آگے ہی آگے جاتا۔ تا آنکہ اس دریا میں جا گرتا ہے جہاں جزائر "غرب الہند" سے تمباکو اور طوطے لانے والے جہاز ہیں۔ ہمارے اس مقام سے گاتا ہوا جب یہ دریا گذرتا ہے تو اسکو بڑا فاصلہ طے کرنا باقی رہتا ہے

وِل نے پوچھا کہ بھلا سمندر کیا بلا ہے ؟

گرنی کا مالک چیخ اٹھا۔ خدا تم سب کی مدد کرے سمندر خدا کی مخلوقات میں عظیم ترین چیز ہے۔ سمندر وہ ہے جہاں دنیا کا تمام پانی کھاری پانی کی ایک بڑی جھیل میں جا گرتا ہے سمندر میرے ہاتھ کی طرح مسطح اور بچے کی طرح بیگناہ ہے لیکن لوگ وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ جب ہوا چلتی ہے تو اس میں پانی کے ایسے پہاڑ پیدا ہوتے ہیں جو ہمارے زبردست ترین پہاڑوں سے بڑے ہوتے، ہماری اس گرنی سے بدرجہا بڑے جہازوں کو نگل جاتے اور ایسا شور کرتے ہیں کہ تم میلوں تک زمین پر انکی آواز سن سکتے ہو انمیں بھینسے سے پانچ گنا بڑی مچھلی ہے اور ایسا پرانا سانپ ہے جو ہمارے اس دریا کے اتنا لمبا اور اس دنیا کے اتنا قدیم ہے آدمی کیطرح اسکے چہرہ پر مونچھ ہیں اور سر پر چاندی کا تاج ہے۔

وِل دل میں خیال کرنے لگا کہ اس نے ایسی چیز کبھی نہیں سنی۔ اس نے دنیا اور اسکے تمام خطرات اور عجائبات کے متعلق جو دریا کے نیچے واقع ہے سوالات کا طومار باندھ دیا یہانتک کہ بوڑھا مالک مجبور و متاثر ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پہاڑ کی چوٹی پر لیگیا جہاں سے وادی اور میدان صاف طور پر نظر آتے تھے۔ آفتاب غروب ہونیکو تھا اور صاف و شفاف آسمان پر آفتاب نیچے کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ شام کی زرد دھوپ میں ہر چیز صاف اور خوبصورت نظر آتی تھی۔ وِل نے اپنی زندگی میں ملک کی اتنی وسعت کو نہیں دیکھا تھا وہ مبہوت کھڑا ہوا تھا ایک متسلط اور فاتحانہ جذبہ نے اسکے جسم اور روح پر قبضہ پالیا۔ اس کا دل سینہ میں اس زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ سانس نہ لے سکا منظر—— شہر، جنگل، میدان، دریا کا درخشاں پل اور زمین کا گوشہ جو چمکدار آسمان کے گوشہ کو مس کرتا تھا—— اسکی آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا۔ آفتاب چکر لگاتا ہوا اور جب رخ بدلا تو ان عجیب شکلوں کو دور پھینکتا ہوا جو خیال کے سریاں کے ساتھ غائب ہو جاتے اور اپنی جگہ دوسرے خیالات کو دیدیتے ہیں معلوم ہوا۔ وِل نے اپنے چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور زار زار رونے لگا۔ غریب مالک گرنی نے پریشانی اور تذبذب میں یہی مناسب خیال کیا کہ اسکو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر خاموشی کے ساتھ گھر واپس لیجائے۔

اس دن سے وِل کا دل نئی نئی آوازوں اور امیدوں کا کاشانہ تھا، ایک نامعلوم شے اسکے دل سے رسہ کشی کرتی تھی بہتا ہوا پانی جب وہ اس کے بہاؤ پر خیال آرائی کرتا تو اپنے ساتھ اسکی آرزوؤں کو بہالیجاتا تھا، ہوا جب بے شمار درختوں کی چوٹیوں کو ایک ادا سے چھیڑتی ہوئی گزرتی تو اسکو جرأت انگیز الفاظ میں مبارکباد کے ترانے سنایا کرتی تھی۔ شاخیں نیچے کی طرف اشارہ کرتی تھیں، صاف اور کھلی سڑک جو زاویہ بناتی ہوئی پلٹتی ہوئی بستی کی جانب تیز تیز جاتی اپنی درخواستوں سے اس کا دل ٹکڑے کرتی تھی۔ اس نے بلندی پر بیٹھکر اپنی زندگی کے بہترین اوقات نیچے دریا کی روانی اور چاروں طرف ہموار خطہ ہائے زمین کے دیکھنے میں صرف کئے، وہ ان ٹکڑہائے ابر کو غور سے دیکھتا رہتا جو آہستہ خرام

ہواؤں کے کاندھوں پر سفر کرتے اور اپنے ارغوانی سایہ کو میدانوں کے بیچ سے کھینچ لیجاتے تھے یا پھر وہ کبھی راستہ کے کنارے کھڑا ہو جاتا اور گاڑیوں کا جو دریا کے کنارے کنارے نیچے کی طرف لڑکھڑاتی ہوئی جاتی تھیں اپنی نگاہوں سے تعاقب کرتا تھا۔ ہر وہ چیز جو اس راستہ سے جاتی چاہے ابر ہو یا گاڑی چڑیا ہو یا چشمہ کا بلوریں پانی اس جیون خواہش کے اندر اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکا دل بھی اسکے ساتھ اڑا چلا جا رہا ہے۔

سائنسدان اور اہلِ علم ہم سے بیان کرتے ہیں کہ ملاحوں کے تمام حوادثات اور اقوام و قبائل کے وہ تمام ایکدوسرے کے خلاف اقدامات اور جارحانہ کارروائیاں جنکی اقواموں اور باقیات الصالحات سے پرانی تاریخ بھرپور رہی ہے۔ نتیجہ ہے وہ "طلب اور رسد" کے مشکل قواعد اور ایک قسم کی فطری جبلت کا کہ سستی خوراک حاصل کیجائے۔ غور و خوض کرنیوالے کے لئے یہ ایک کمزور، بودی اور قابل رحم تشریح نظر آتی ہے۔ قبائل جو شمال و مشرق سے امنڈ آئے اگر فی الواقع وہ آگے کو دوسروں کے پیچھے سے ڈھکیلنے سے بڑھے تھے تو اسکے ساتھ ہی ساتھ ہم کو اقرار کرنا پڑیگا کہ جنوب و مغرب کے مقناطیسی اثر سے کھنچ آئے تھے۔ دوسرے ممالک کی شہرت ان تک پہنچی، لازوال[۵۱] شہر کا نام انکے کانوں میں گونجا۔ وہ نوآباد نہیں بلکہ زائرین تھے۔ وہ شراب سونا اور دھوپ کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے مگر انکے دلوں میں اس سے زیادہ شریفانہ اور اعلیٰ و ارفع مقصد پنہاں تھا۔ وہ وہی اضطراب اور نوعِ انسان کی نیش تمدن تکلیف جو عظیم الشان کامیابیوں کے دروازہ کھولتی اور المناک ناکامیوں کا منحوس چہرہ دکھلاتی ہے وہ جس نے اکارس[۵۲] کے ساتھ اپنے بازو ملائے تھے، جس نے کولمبس کو غیر آباد اور امواج بحر ظلمت میں بھجوایا تھا اسی نے ان وحشی اور بربری قبائل کو آمادہ کیا ہمت دلائی اور اس خطرناک سفر پر تیار کیا۔ ایک مشہور قصہ ہے جو نہایت عمدگی کے ساتھ انکی اصلی حالت کو ظاہر کرتا ہے کہ ان جہاں گردوں کی ایک سفر کرنیوالی جماعت نے ایک لوہے کا جوتہ پہنے ہوئے بوڑھے کو پایا بوڑھے نے دریافت کیا کہ کہاں جا رہے ہو، متفقہ آواز میں انھوں نے جواب دیا کہ "لازوال شہر" کو اس نے انکو مایوس نگاہوں سے دیکھا اور کہا کہ میں نے اسکو دنیا کے بہت بڑے حصہ میں ڈھونڈھ ڈالا، جوتہ جو میں پہنا ہوا ہوں ایسے تین جوڑے میں نے اس زیارت کے شوق میں پھاڑ ڈالے ہیں اور چوتھا اب میرے

[۵۱] لازوال شہر سے مراد روم ہے جسکا نام کسی زمانہ میں اٹلی کے وحشی اور بربری اقوام کے حملوں کے لئے محرک کا کام دیتا تھا۔

[۵۲] اکارس، ڈیڈالس کا بیٹا اور یونانی دیومالا کا ہوشیار کاریگر جس نے پرواز کے لئے پر اور بازو بنائے تھے۔ اکارس آفتاب کے قریب تک جس نے اسکے بازو پگھلا دئے تھے اڑا اور بازوں کے پگھلنے کی وجہ سے سمندر میں گر پڑا وہ "اکارین سمندر" اسی کے نام سے موسوم ہے ۱۲۔

پاؤں کے نیچے گھس رہا ہے تاہم ابتک میں نے اس شہر کا پتہ نہیں پایا بوڑھا مرّا اور انکو حیرت زدہ چھوڑ کر اپنے راستہ پر ہو لیا۔

تاہم یہ واقعہ میدان کے متعلق دِل کے ارادہ کی گہرائی کا بہت کم مقابلہ کرسکتا ہے۔ اگر وہ صرف میدانوں میں دوڑ تک جا سکتا تو وہ محسوس کرسکتا تھا کہ اسکی نگاہیں صاف اور روشن ہوجائینگی اور اسکی سماعت زیادہ خوشگوار ہوجائیگی اور اسکا سانس زیادہ آرام کے ساتھ چلنے لگیگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ موجودہ جگہ میں دوسری جگہ سے اکھاڑ کر لگایا گیا تھا اسلئے سوکھ رہا تھا وہ پردیس میں تھا اور وطن کے لئے بیچین۔ رفتہ رفتہ نیچے کی دنیا کے متعلق اسکے پراگندہ خیالات میں ایک سکون پیدا ہوگیا۔ دریا جو ہمیشہ رواں اور ترقی پذیر تھا یہانتک کہ عظیم الشان سمندر میں جا ملتا تھا، خوبصورت آدمیوں سے مملو گنجان شہر، گانیوالوں کی جماعتیں، مرمریں محل جو رات میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مصنوعی طلائی ستاروں (قندیلوں) سے بقعۂ نور بنی رہتی ہیں، عالیشان گرجا، قابل وفاضل (جامعات (یونیورسٹیاں) بہادر افواج اور ناقابلِ شمار دولت جو نہ قانون میں جمع کیگئی ہے، امیرانہ رعب دار آواز جو آفتاب کی روشنی میں بلند ہوتی ہے اور دبے پاؤں آدھی رات کے قتل کی تیزی ان سب کو اس نے اب اپنے خیالات میں مجتمع کر لیا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ وطن کے لئے بیمار تھا۔ اس کا پیکر ٹھہرتا ہے وہ اس شخص کا سا تھا جو دھندلکے میں سویا ہوا ہو اور اپنے ہاتھوں کو قسم قسم کے رنگ اور طرح طرح کی آواز والی زندگی کی طرف محبت سے بڑھاتا ہو۔ یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں کہ وہ بیمار اور رنجیدہ تھا۔ وہ جانیگا اور مچھلیوں سے کہیگا کہ وہ اپنی زندگی کی خاطر پیدا کئے گئے تھے، انکو کیڑوں، بہنے والے پانی اور دریا کے کنارے ایک سوراخ سے زیادہ کی ہوس نہیں ہے لیکن اسکا خمیر اور طرح تیار ہوا تھا خواہشات اور آرزوؤں سے مملو۔ رنگا رنگ جلووں سے معمور دنیا بھی اسکی امیدوں کے دریا کا قطرہ تھی سچی زندگی اور روشن دھوپ دور میدان میں پائی جاتی ہے آہ کہ مرنے سے پہلے اس آفتاب کی روشنی کو دیکھنا، زریں خطہ دنیا میں خوش خوش سیر کرنا، تعلیم یافتہ گویوں کی جان نواز موسیقی اور گھنٹوں کی گرجا کے شیریں آواز کا سننا، خوشی کے میدان میں مسرت کے عالم میں پھرنا اور تعطیلات میں باغوں کی سیر کرنا کیا ہی دلنواز ہوگا! وہ چیخ اٹھا کہ "مچھلیو اگر تم صرف اپنی ناک کو نشیب کی طرف موڑ لو تو تم ان فسانوی پانیوں میں نہایت آسانی سے تیروگی، تمہارے سروں پر سے بادل کے مانند بڑے بڑے جہازوں کو گزرتے ہوئے اور بڑے بڑے "پانی پہاڑوں" کو تمام دن مترنم اور موسیقی آواز میں گاتے ہوئے سنوگی مگر افسوس کہ مچھلیاں صبر وتحمل کے ساتھ اپنی قدیم رخ کو ہی دیکھتی رہیں تاآنکہ دِل بمشکل سمجھ سکتا کہ اسکو اس پر ہنسنا چاہیئے یا رونا۔

اس اثنا میں مال دِل کے بازو سر ملک سے کسی ایسی چیز کے مانند جو تصویر میں نظر آتی ہو گزر گیا۔ شاید اس نے کسی مسافر سے سلام وپیام کا تبادلہ کیا یا ایک بوڑھے شریف آدمی کو سفری ٹوپی پہنے گاڑی کے دریچہ میں بیٹھا ہوا دیکھا ہو

لیکن یہ فی الحقیقت اس کا واہمہ تھا کہ اسنے اپنے خیالات میں ایسا تصور کیا آخر کار اسکے خیالات کے بدلنے کا وقت آگیا مالک گرنی نے جو ایک حد تک حریص آدمی تھا اور جائز منافع کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا گرنی کو ایک چھوٹی سی سرائے میں بدلدیا اور خوش قسمتی کہ فائدہ کے مواقع حاصل ہونیکے سبب کئی اصطبل بھی بنالئے اور اس طرح سڑک پر ہوٹل اور سرائے کے مالک کی حیثیت اختیار کر لیا۔ اب وِل کا فرض تھا کہ مسافرین کی خاطر و تواضع کرے جب وہ ناشتہ کرنیکے لئے گرنی کے باغ کے سرے پر چھوٹے سے سائبان کے نیچے بیٹھتے تھے تو آپ کو یقین رکھنا چاہیئے کہ انکی گفتگو سننے کے لئے اسنے اپنے کانوں کو کھلا رکھا ہوگا جب وہ شراب اور امولٹ (omelette) لایا کرتا تھا تو باہر کی دنیا کے متعلق بہت ساری نئی باتیں اسنے معلوم کی ہونگی۔ اکثر اوقات وہ تنہا مہمانوں کے ساتھ گفتگو اور بحث کا سلسلہ چھیڑ دیا کرتا تھا اور دانشمندانہ سوالات اور متانت آمیز توجہ کے ساتھ نہ صرف اپنی خواہش کو پورا کرتا بلکہ مسافرین کے دلوں کو موہ لیتا اور انکی اچھی رایوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا تھا۔ بہت سے مسافرین نے بوڑھے جوڑے سے خدمتگار لڑکے کی سفارش کی اور ایک پروفیسر صاحب تو اسکو اپنے ساتھ لیجانے کے بڑے خواہشمند تھے تاکہ شہر میں اسکو عمدہ اور بہتر تعلیم دلاسکیں۔ گرنی کا مالک اور اسکی بیوی اس سے بڑے متعجب ہوئے اور اس سے زیادہ خوش بھی سرائے کھولنے کے خیال کو وہ بہت اچھا خیال کرتے تھے۔ بڈھا اکثر رائے زنی کرتا تھا کہ تم دیکھتی ہو کہ اس میں سرائے کا مالک بننے کی کتنی صلاحیت موجود ہے وہ سوائے اسکے اور کچھ نہ کرسکیگا۔ اس طرح زندگی نہایت اطمینان کے ساتھ سوائے وِل کے سب کے لئے گذرتی گئی۔ ہر ایک گاڑی جو سرائے کو چھوڑ کر چلی جاتی اپنے ساتھ وِل کا ایک حصہ لیجاتے ہوئے معلوم ہوتی اور جب لوگ مذاق کے طور پر اسکے لئے جگہ پیش کرتے تو بمشکل وہ اپنے جذبہ پر قابو پاسکتا تھا۔ راتیں گذرتی گئیں اور ان میں وہ برابر خواب دیکھتا گیا کہ وہ مستعجل نوکروں کے ذریعہ نیند سے اٹھایا گیا ہے کہ ایک خوشنما اور شاندار گاڑی دروازہ پر اسکو نیچے میدان میں لیجانے کے خیال سے انتظار کر رہی ہے۔ راتیں اسی حالت میں گذرتی گئیں یہانتک کہ یہ خواب جو اولاً اسکو تمامتر مسرت معلوم ہوتے تھے اب رنج اور مایوسی کی صورت اختیار کرنے لگے۔ رات کی آواز اور گاڑی کے انتظار نے اسکے دل میں مستقل جگہ اختیار کرلی ایسی کہ بیک اسکی آرزو بھی کیجائے اور اس سے خوف بھی۔

ایک دن جب وِل سولھویں سال میں تھا ایک موٹا مگر نوجوان آدمی غروب آفتاب کے وقت رات گزارنے آیا وہ ''صابر نظر آنے والا''، خوش آدمی تھا جو ایک تھیلا اٹھائے ہوئے تھا۔ جب ڈنر تیار ہو رہا تھا تو وہ سائبان میں ایک کتاب دیکھنے کے لئے بیٹھ گیا لیکن جونہی اسنے وِل کو غور سے دیکھا کتاب ایک طرف رکھدیا وہ صاف طور پر ان لوگوں

ے ایک معلوم ہوتا تھا جو زندہ آدمیوں کو کاغذ اور سیاہی کے آدمیوں پر ترجیح دیتے ہیں خود ول نے اگرچہ پہلی نگاہ میں وار دکی ذات میں کوئی خاص کشش نہیں دیکھی لیکن بہت جلد اسکی معقول اور سنجیدہ باتوں میں مسرت محسوس کرنے لگا ور آخرکار اسکے اخلاق اور عقلمندی کا گرویدہ ہوگیا۔ دونوں بہت بڑی رات تک بیٹھے رہے اور تقریباً دو بجے رات کو ل نے اپنا دل نوجوان کے سامنے کھولکر رکھدیا اور بیان کیا کہ کس طرح وہ وادی کو چھوڑنے کی آرزو کرتا رہا ہے اور یدان کے شہروں سے اسکی کیسی درخشاں امیدیں وابستہ ہیں نوجوان نے سیٹی بجائی ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ میرے وان دوست فی الحقیقت اس چھوٹی سی عمر میں تم بڑے خیالی آدمی ہو اور بہت سی ایسی چیزوں کے آرزومند ہو جن کو تم ہیں پاسکتے۔ تم یہ سنکر شرمندہ ہوگے کہ تمہارے ان نسانوی شہروں میں بھی بہت سے لوگ تمہاری جیسی حماقت میں رفتار اور یہاں پہاڑوں میں آنیکے لئے بیتاب ہیں۔ مجھے یہ بیان کرنے دو کہ وہ لوگ جو نیچے میدانوں میں جاتے ہیں بت جلد پھر وہاں سے واپس آنیکی دلی آرزو کرتے ہیں۔ ہوا نہ وہاں اس قدر صاف وسبک ہے نہ سورج یہاں سے یادہ تاباں اور روشن ہے۔ رہے خوبصورت مرد و عورت تو تم ان میں سے اکثروں کو چیتھڑے لگائے اور انکے چہروں خطرناک بیماریوں سے بدنما پاؤگے، غریبوں اور حساس لوگوں کے لئے شہر ایسی بری جگہ ہے کہ اکثر لوگ اپنے ہاتھوں ودکشی کرنیکو ترجیح دیتے ہیں۔

ول نے جواب دیا کہ آپ مجھے نہایت سیدھا سادھا اور بیوقوف خیال کرتے ہیں۔ میں وادی سے باہر نہیں گیا یکن یقین کیجئے کہ اسکے باوجود اپنی آنکھوں کو کام میں لایا ہے مجھے معلوم ہے کہ ایک چیز کی زندگی دوسرے پر کیسے منحصر ہوتی ہے مثلاً میں جانتا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کو پکڑنے اور ان سے ملنے کی غرض سے کس طرح مچھلی بھنور میں چکر لگاتی ہے ورگڈریہ جو بھیڑوں کو مکان واپس لیجاتے ہوئے ایسا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے صرف ڈنر کی غرض اسمیں پوشیدہ ہوتی ہے میں نے تمہارے شہروں میں تمام چیزوں کو اچھا اور قابل تعریف پانے کا کبھی خیال ظاہر نہیں کیا یہ وہ شئی نہیں ہے جس سے میرے دل میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اگرچہ کسی زمانے میں یہ بھی ایک وجہ تھی اگرچہ میں ہمیشہ یہیں رہا ہوں، یکن سالہائے گذشتہ کے اندر سوالات کے ذریعہ بہت ساری باتیں معلوم کی ہیں جو یقیناً میرے پرانے خیالات کا مداوا ہیں لیکن کیا تم مجھے وہ تمام چیزیں دیکھے بغیر جو دیکھنے کے قابل ہیں اور وہ تمام کئے بغیر جو آدمی کرسکتا ہے جانوروں اور بارا کتے کی طرح مرنے دوگے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی زندگی کے تمام ایام اس سڑک اور دریا کے درمیان گزار دوں اور بغیر اپنی زندگی کو اعلیٰ زینہ پر پہونچانے کی کوشش کئے اپنی زندگی کے انفاس پورے کردوں، ول چیخ اٹھا کہ ایسی زندگی پر میں اچانک موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

نوجوان نے کہاکہ ہزاروں آدمی تمہاری سی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں لیکن کوئی بھی رنجیدہ نہیں ہے۔

وِل نے آرزومندانہ لہجہ میں کہاکہ اگر ہزاروں آدمی ایسا چاہتے ہیں تو کوئی ان میں میری جگہ کیوں نہیں سنبھالتا کامل اندھیرا چھایا ہوا تھا سائبان میں لیمپ لٹک رہا اور میز اور گفتگو کرنے والوں کے چہرہ کو روشن کر رہا تھا، رات کے اندھیرے کے خلاف کمان کی جالیوں پر کی بیل نظر آتی تھی، فریہ نوجوان اٹھا، وِل کا ہاتھ پکڑکر کھلے آسمان کے نیچے لےگیا اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیاکہ کیا تمنے کبھی ستاروں کو بھی دیکھا ہے؟ ہزاروں مرتبہ کیا تم جانتے ہوکہ وہ کیا ہیں انکے متعلق مختلف اوقات میں کئی خیالات مرے ذہن میں آتے رہے ہیں نوجوان نے کہاان میں ہمارے ایسے عالم ہیں بعض از میں سے چھوٹے اور اکثر ان میں سے لاکھوں درجہ بڑے ہیں بعض ان میں سے جن کو تم ٹمٹماتے دیکھتے ہو نہ صرف مستقل عالم ہیں بلکہ مجموعہ ہائے عالم ہیں ان میں سے ہر ایک میں کیا ہے؟ ہم نہیں جانتے ممکن ہے کہ ہماری تمام مشکلات کا جواب یا ہمارے تمام مصائب کا علاج ہو بریں ہم ان تک ہم نہیں پہونچ سکتے ہمارے ان قریب ترین ہمسایوں تک پہونچنے کے لئے ہوشیار سے ہوشیار کاریگر بھی کوئی جہاز تیار کرسکتا ہے اور نہ ان میں سے معمر ترین انسان کی زندگی ہی ایسے طویل سفر کے لئے کافی ہوسکتی ہے جب ایک بڑی لڑائی میں شکست ہوتی ہے یاکوئی عزیز دوست داغ مفارقت دیجاتا ہے یا جب ہمارے خیالات میں جوار بھاٹا ہوتا ہے تب بھی یہ ستارے بغیر کسی تکان کے چمکتے رہتے ہیں ہم انسانوں کی پوری فوج یہاں نیچے مجتمع کھڑی ہوکر اپنی پوری آواز سے چیخے تب بھی ہماری آواز ان تک معمولی سرگوشی کی صورت میں بھی نہیں پہونچ سکتی اگر ہم بلند ترین پہاڑ پر بھی چڑھجادیں تو ان سے قریب نہیں ہوتے جو کچھ ہم کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جہاں باغ میں انکے پیچھے کھڑے ہوجائیں اپنی ٹوپیاں سروں سے اتارلیں تاکہ تاروں کی روشنی ہمارے سروں پر چمکتی رہے میرا سر چونکہ گنجا ہے اسلئے میرا دعویٰ ہے کہ تم اسکو تاریکی میں چمکتا ہوا دیکھوگے کہ اب کیا خیال ہے؟

وِل نے کہاکہ ”میں دیکھتا ہوں کہ ہم پنجرے میں بند ہیں“

کچھ اسی طرح ”کیا تمنے کبھی کسی گلہری کو پنجرے میں بند اور دوسری گلہری کو فلسفیانہ انداز میں اپنے گھونسلے میں بیٹھے ہوئے غور کرتے دیکھا ہے؟ مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ بیوقوف ہے۔“

(۲)

پادری کی بیٹی

چند سال کے بعد ایک ہی سرا میں بوڑھوں کا انتقال ہوگیا جنکی اونکے متبنیٰ بیٹے نے خوب تیمارداری کی اور مرنیکے بعد جی بھر کے خاموشی کے ساتھ ماتم کیا لوگوں نے جو اسکے عجیب وغریب خیالات سے واقف ہوگئے تھے خیال کیا کہ وہ جلد جائداد فروخت کرکے قسمت آزمائی کی دھن میں دریا کے نیچے چلا جائیگا مگر دل کی طرف سے اس قسم کے ارادہ کا کوئی نشان ظاہر نہوا برخلاف اسکے اس نے سرائے کے کاروبار کو عمدہ پیمانہ پر چلانا شروع کردیا اور چند ملازم بھی اس غرض کے لئے نوکر رکھ لئے اس طرح وہ ایک مہربان، منطقی اور بدگو لئے "یانتایلوں میں ۶ فٹ ۳ انچ، مضبوط جسم اور دوستانہ آواز کی صفات سے متصف ہوکر رہنے لگا۔ بہت جلد اس نے ضلع اور گرد ونواح میں عجیب قسم کے آدمی کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی پہلے پہل یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ ابتدا ہی سے عجیب قسم کا آدمی تھا اور گفتگو میں ہمیشہ پامال اور پیش پا افتادہ اسناد سے استدلال واستشہاد کرکے ذوق صحیح وعقل سلیم کا ثبوت دے چکا تھا لیکن جس چیز نے اسکے نام کا ڈنکا بجادیا اور شہرت کے پردوں پر اس کے نام کو اُڑایا وہ پادری کی لڑکی مارجری کے ساتھ کورٹ شپ کا واقعہ تھا۔

پادری کی مارجری ۱۹ سے کچھ کم تھی اور دل بیس سال کے قریب تھا وہ خوبصورت اور اس خطہ ملک میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لڑکی تھی یہ خاندانی اثر کا ثمرہ تھا وہ بڑی خوددار اور مغرور تھی اور نہایت خودداری کے ساتھ اس نے شادی کے کئی پیشکش اور پیامات کو ٹھکرادیا تھا جسکی وجہ سے اطراف وجوانب میں لوگ اسکو برا بھلا کہتے تھے لیکن فی الحقیقت وہ نیک اور اچھی لڑکی تھی اور ایسی اچھی تھی کہ کسی آدمی کو بھی اپنے سے راضی رکھ سکتی تھی۔

دل کو اگرچہ اسکے مکان سے پادری کدہ اور چرچ صرف دو میل تھے اسکو دیکھنے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا وہ صرف اتوار کو وہاں جایا کرتا تھا اتفاق کہ پادری کدہ کی مرمت اور درستی کی ضرورت پیش آئی اور پادری اور اسکی لڑکی نے تقریباً ایک مہینہ تک گنے ہوئے شرائط پر سرائے میں بسر کیا، سرائے اور گرنی کی آمدنی اور مالک گرنی کی کفایت شعاری کیوجہ سے ہمارا دوست مالدار ہوگیا تھا اسکے علاوہ وہ طبیعت کی عمدگی اور عقلمندی کے لئے جن کا شادی کے معاملہ میں خاص درجہ ہے لوگوں میں مشہور تھا اس وجہ سے انکے بدخواہوں میں یہ افواہ گرم تھی کہ پادری اور اسکی لڑکی نے آنکھ بند کیے بغیر کسی غرض کے وہاں رہائش اختیار نہیں کی ہے۔ ول دنیا میں آخری آدمی تھا جسکو ڈرا دھمکا کر یا لالچ دیکر شادی کرنے پر راضی کیا جاسکتا اگر آپ صرف اسکی ان خاموش آنکھوں کو دیکھیں گے جو صاف ہونیکے باوجود شادابی میں پانی کے چشمے معلوم ہوتی ہیں اور جن میں ایک قسم کی ایسی شفاف روشنی ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی حصہ سے آرہی ہے تو آپ فوراً سمجھ جائینگے کہ وہ ایسا آدمی ہے جو اپنے دل کا جائزہ دار ہے اور اس پر ہمیشہ مستقل اور جما ہوا رہیگا۔ یہ سوال البتہ کیا

جاسکتا ہے کہ مارجری دل کی صاف گوئی اور استقلال میں مدمقابل ثابت ہوگی کہ نہیں ؟ یا ان میں سے کون شادی کے بعد حکمرانی کریگا ؟ لیکن مارجری نے شادی کے متعلق اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور اپنے باپ کے ساتھ نہایت خاموشی اور بے تعلقی کے ساتھ رہنے لگی۔

چونکہ موسم کا آغاز تھا اسلئے وِل کے ہاں مسافرین کم اور دیر سے آتے تھے مگر یاسمن کھلنے لگی تھی موسم ایسا معتدل تھا کہ جماعت جالی کے اندر ڈنر کھایا کرتی تھی دریا کی روانی کی خوشگوار آواز اور جنگل کے طیور کے ترانوں کی گونج انکے کانوں میں آتی تھی۔ وِل بہت جلد ان کھانوں میں ایک خاص قسم کی فرحت محسوس کرنے لگا۔ پادری ایک حد تک سست ساتھی اور میز پر اونگھنے کا عادی تھا لیکن کبھی اسکی زبان سے بیرحمانہ اور سخت کلمہ نہیں نکلا، پادری کی لڑکی اپنے ظروف کی انتہائی خوبصورتی کے ساتھ جس کا تصور ممکن ہے تعریف کیا کرتی تھی جو کچھ وہ کہتی ایسا اچھا اور خوبصورت معلوم ہوتا کہ وِل کے دل میں اسکی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا جب وہ آگے کو اُگنے والے سرو کے درخت کی طرف پشت کئے جھکتی تو وہ اسکے چہرہ کو دیکھ سکتا اسوقت اسکی آنکھیں نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ برق پاشی کرتی نظر آتی تھیں روشنی اسکے بالوں کے اطراف دستی کی طرح حلقہ کئے معلوم ہوتی تھی، اسکے زرد گال کو ایک قسم کی شے جو بمشکل تبسم کہی جا سکتی ہے تھرتھرا دیا کرتی تھی تو وِل ایک خوشگوار یاس کے عالم میں اس کا نظارہ کرنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکتا تھا اسکی تنہائی کے لمحات تک میں وہ اس قدر مکمل، نیچے پاؤں کی انگلیوں سے لیکر اسکے لباس کے دامن تک جاندار نظر آتی تھی کہ بقیہ مخلوقات اسکے مقابلہ میں بمنزلۂ صفر نظر آتی تھیں۔ اگر وِل اسکو چھوڑ کر اطراف کے منظر کو دیکھتا تو درخت بے حس اور بے معنی نظر آتے تھے، بادل فضائے آسمان میں مردہ چیزوں کی طرح معلق نظر آتے تھے یہانتک کہ پہاڑ کی چوٹیاں بھی بے نور اور خوبصورتی و جمال سے معرا نظر آتی تھیں۔ اس لڑکی کی رعنائی و خوبصورتی کے مقابلہ میں تمام وادی کا حسن و جمال پھیکا پڑ جاتا تھا۔

اپنی سوسائٹی میں وِل ہمیشہ اپنے بنی نوع کا مشاہدہ کرتا تھا لیکن مارجری کے معاملہ میں اسکا مشاہدہ تکلیف دہ حد تک حریص ہوگیا تھا جو کچھ وہ کہتی سنتا اور ساتھ ہی ساتھ اسکی آنکھوں سے دل کے ان مطالب و مضامین کے نقوش کو جو بیان نہیں کئے جاسکتے پڑھا کرتا تھا بہت سی نیک، ہمدردانہ اور پرخلوص تقریروں کی گونج اسکے گوش دل میں سنائی دیتی تھی وہ ایک ایسی روح سے واقف ہوگیا تھا جو نہایت خوبصورتی کیساتھ اسپر چھا رہی تھی۔ بغیر کسی شک و شبہ اور بغیر کسی آرزو کے کامل اطمینان میں لپٹی اور بسی ہوئی۔ اسکے چہرہ کو اسکے خیالات سے علیحدہ کرنا ناممکن تھا، اسکی آواز کی تبدیلی، اسکی آواز کی سریلی موسیقیت، اسکی آنکھوں کی روشنی اور اسکے چہرہ کے مختلف رنگ اور حرکات و سکنات جو تلخ اور شیریں الفاظ سے اس اتار چڑھاؤ اور زیر و بم کے مانند جو گوتے کی آواز کو ہموار کرتے اور مترنم بناتے ہیں ہم آہنگ ان سب کا نقشہ

ا جری کی یاد کے ساتھ ول سے دل و دماغ پر کھنچ جاتا کرتا تھا اس کا اثر قصہ مختصر ایک ایسی شے تھا جسکی نہ تقسیم کیجا سکتی ہے ورنہ جسکو بحث و گفتگو کا آماجگاہ بنایا جا سکتا ہے بلکہ جسکو صرف امتنان و ابتہاج کے عالم میں محسوس کیا جا سکتا ہے ول کے لئے اسکا وجود بچپن کی یاد تازہ کرتا تھا اور اس کا خیال طلوع صبح، رواں پانی اور سب سے پہلے کھلنے والے گل بنفشہ ور یاسمن کے پیچھے پناہ گیر ہوتا تھا یہ بہار کے ان پھولوں کے مانند جو ہم میں اس لطیف اور نازک احساس اور پر اسرار اجنبیت کے اثر کو از سر نو زندہ کرتے ہیں جو درصورت ثانی سالوں کی آمد کے ساتھ ساتھ زندگی کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں پہلی مرتبہ یا ایک طویل وقفہ کے بعد دوبارہ دیکھی ہوئی اشیا کی حقیقت ہے۔ محبوب کے چہرہ کا ایک ادنیٰ نظارہ انسان کے اخلاق و عادات کو از سر نو ابدی سرچشمہ سے سیراب کرتا اور تازگی بخشتا ہے۔

ایک دن ڈنر کے بعد ول صنوبر کے درختوں کے درمیان گشت کرنے لگا ایک یاس آگیں مسرت نے اسکو سر سے پیر تک ڈھانپ لیا اور جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا اپنے آپ پر اور منظر پر ہنستا گیا۔ دریا آگے کو بڑھی ہوئی چٹانوں سے ٹکراتا، ساز بجاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ صحرا میں ایک چڑیا زور سے گانے لگی پہاڑ کی چوٹیاں انتہا درجہ اونچی ہوتی دکھائی دینے لگیں اور وقتاً فوقتاً جب وہ انکو دیکھتا تو معلوم یوں ہوتا کہ ایک مربیانہ مگر محزون تشویش کے ساتھ اسکی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہی ہیں اسکو راستہ ایک ایسی اونچائی پر لیگیا جہاں سے میدان صاف نظر آتا تھا وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور ایک گہرے اور خوش آیند خیال میں مستغرق ہو گیا۔ میدان سامنے چاروں طرف اپنے شہروں اور طلائی دریا کے ساتھ نظر آتا تھا دنیا کی بہشت سوائے پرندوں کے ایک بڑے حلقے کے جو نیچے اترتا، اوپر جاتا اور نیلی فضا میں چاروں طرف چکر لگاتا تھا خواب نوشین کے مزے لے رہی تھی۔ اسنے مارجری کا نام بآواز بلند دہرایا اور اسکی یہ آواز کانوں کو بھلی معلوم ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور مارجری کی صورت نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ خیالات و اوصاف کے جلو میں نمودار ہو گئی دریا ہمیشہ بہیگا پرندے زیادہ سے زیادہ اوپر اڑینگے تا آنکہ آسمان کو چھو لیں گے اگرچہ اسکو بہتر دھوپ مل رہی تھی مگر اسنے خیال کیا کہ یہاں اپنی ہی وادی میں صبر کے ساتھ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر بیٹھے رہنا فضول اور جنون نوازی ہے۔ دوسرے دن میز پر ول نے جبکہ پادری اپنا پائپ بھر رہا تھا ایک قسم کی سلسلہ جنبانی اور چھیڑ کا اس طرح آغاز کیا "مس مارجری میں نہیں جانتا کہ کبھی میں نے کسی سے تم سے زیادہ محبت کی ہو میں بہت بڑی دور تک سرد اور غیر مہربانی کا برتاؤ کرنے والا آدمی ہوں یہ میں دل سے نہیں چاہتا بلکہ یہ میرے عجیب و غریب طریقے سے غور و خوض کرنیکا نتیجہ ہے کہ لوگ مجھ سے بہت دور معلوم ہوتے ہیں گویا کہ میرے اطراف ایک حلقہ کھنچا ہوا ہے آپ کے سوا جس کے سب باہر ہیں میں دوسروں کو گفتگو کرتے اور ہنستے دیکھتا ہوں مگر آپ آپ تو قریب آگئی ہیں۔

اس نے دریافت کیا کہ مس مارجری اسکو ناپسند تو نہیں کرتی ہیں؟ مارجری نے کوئی جواب نہیں دیا پادری نے کہا کہ لڑکی جواب دے۔ ڈل نے کہا کہ پادری صاحب میں اسکو مجبور کرنا نہیں چاہتا میری زبان خود اسوقت بند ہے۔ اسکو استعمال نہیں کرسکتا اور وہ تو عورت ہے لیکن ابھی لڑکپن باقی ہے لیکن میں اپنی حد تک جہاں تک میں سمجھ سکا چاہے لوگ اسکے معنی کچھ ہی لیں خیال کرتا ہوں کہ میں محبت میں گرفتار ہوں میں اپنے منھ میاں مٹھو بننا پسند نہیں کرتا ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں لیکن میرا خیال یہ ہے اگر مس مارجری اپنے نزدیک کچھ اور خیال کرتی ہیں تو کیا براہ مہربانی وہ سر ہلاوینگی؟

مارجری خاموش تھی اور اس نے ایسی کوئی علامت ظاہر ہونے نہ دی جس سے معلوم ہوتا کہ اس نے گفتگو سنی۔ دل نے پوچھا کیوں پادری صاحب یہ کیا بات ہے؟ پادری نے کہا کہ لڑکی کو بات کرنی چاہئے ہمارا یہ پڑوسی ای مارجری کہتا ہے کہ وہ تجھ سے محبت کرتا ہے کیا تو اس سے محبت کرتی ہے ہاں یا نہیں؟ کہدے۔

مارجری نے لجاتے اور ہچکچاتے ہوئے کہا کہ میں خیال کرتی ہوں کہ مجھے اس سے محبت ہے دل خوشی سے اٹھا کہ کافی ہے یہی میری خواہش تھی اور اسکے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں نہایت اطمنان کے ساتھ میز کے درمیان سے لیکر ایک منٹ تک رکھا۔

اپنی چلم کو دوبارہ منھ میں رکھتے ہوئے پادری نے کہا کہ "تمھاری شادی ہو جانی چاہئے" دل نے کہا آپ سمجھے کیا یہ ٹھیک اور مناسب بات ہے؟ پادری نے جواب دیا یہ تو لازمی اور لابدی ہے۔ عاشق نے کہا "تو ٹھیک ہے"

دو یا تین دن دل کیلئے بڑی مسرت کے عالم میں گذر گئے اگرچہ بازو کھڑے ہونیوالا بمشکل اس مسرت کو محسوس کرسکتا۔ وہ مارجری کے بالمقابل کھانے، اس سے گفتگو کرنے اور اسکے باپ کی موجودگی میں اشتیاق بھری نظروں سے دیکھنے لگا لیکن اس نے اسکو تنہا دیکھنے کی کوشش کی اور نہ کسی اور طرح اپنے ابتدائی طرز عمل کو بدلا۔ اس سے شاید کسی حد تک لڑکی مایوس تھی اور یہ مایوسی ناوا جب بھی نہ تھی لیکن اگر کسی کے تصور و خیال میں رات دن رہنا اور اسکی زندگی کا پلٹ دینا کافی ہے تو پھر دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کامل طور پر مطمئن تھی کیونکہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس کے دل سے دور نہیں ہوئی تھی۔ وہ ندی کے کنارے بیٹھا ہوا گرداب اور بھنور کو، اپنے توازن کو برقرار رکھنے والی گھاس اور جھکی ہوئی گھانس کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ تنہا باہر ارغوانی آسمان کے نیچے گھوما کرتا اور تمام کالی چڑیاں درختوں کی شاخوں سے اسکو جھانکا کرتی تھیں۔ وہ علی الصباح اٹھتا اور آسمان کو پہلے سے طلائی ہوتے دیکھتا اور روشنی کو پھاٹک

ںمیں وجست کرتے دیکھتا تھا۔ ان تمام اوقات میں وہ اکثر سوچا کرتا کہ اس نے ایسی چیزیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ یہ کیا
ہے کہ یہ سب چیزیں اب اسقدر مختلف نظر آتی ہیں؟ اسکی گرنی کے پھیوں کی آواز یا جھاڑوں کے درمیان ہوا کی
سنسناہٹ اسکو حیران و مسحور کر دیتی تھی۔ انتہا درجہ مسحور کن اور طلسمی خیالات بن بلائے اسکے دل میں آیا کرتے تھے وہ
قدر خوش تھا کہ راتوں کو سو نہ سکتا اور اسقدر بے چین تھا کہ مارجری سے علیحدہ ہو کر بمشکل اطمینان سے بیٹھ سکتا تھا۔ باوجود
ےکے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ حاصل نہیں ہوئی بلکہ کھو گئی ہے۔ ایکدن جبکہ وہ تفریح سے واپس ہو رہی تھی دل نے مارجری کو
ںمیں پھول چنتے ہوئے پا لیا۔ اسکے قریب پہونچا تو بازو باز دا آہستہ آہستہ چلنے لگا اور دریافت کیا کہ "کیا تم پھولوں کو
سند کرتی ہو؟ بلاشبہ میں انکو انتہا درجہ پسند کرتی ہوں کیا تم بھی پسند کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ کیوں نہیں؟ مگر اتنا زیادہ
ں جب کام تمام ختم ہو جائیں تو یہ ایک چھوٹا سا تفریحی مشغلہ ہے میں نے لوگوں کو اس سے حد درجہ محبت کرتے ہوئے
کھا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرتے جیسا تم کر رہی ہو۔ ٹھہرتے اور اوپر اسکی طرف دیکھتے ہوئے مارجری نے دریافت کیا
س طرح؟ اس نے جواب دیا کہ انکو توڑتے ہوئے وہ جہاں ہیں وہیں بہت اچھے اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں مگر تم
رجاؤ۔ مارجری نے کہا کہ میں خاص انکو اپنے لئے حاصل کرنا چاہتی ہوں تاکہ میں انکو اپنے دل کے پاس اور اپنے کمرہ
ں رکھ سکوں۔ جب وہ یہاں اُگتے ہیں تو وہ مجھے خواہش دلاتے اور زبان حال سے کہتے ہیں کہ "یہاں آ اور گلچینی
" لیکن جونہی ایک دفعہ میں انکو توڑ لیتی ہوں اور اپنے بازو پر رکھدیتی ہوں تو خوبصورتی بڑی ہوتی ہے اور میں ان کو
ایت آرام اور ہلکے دل کے ساتھ دیکھتی ہوں۔ دل نے جواب دیا کہ تم انکے متعلق پھر نہ خیال کرینگے خیال سے انکو حاصل
نا چاہتی ہو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ جب میں لڑکا تھا کیا کرتا تھا کیونکہ دور میدان کو دیکھنے کی مرے دل میں آرزو تھی اور
ں وہاں جہاں جاکر زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا تھا جانیکی خواہش کرتا تھا کیا یہ معقول استدلال نہیں ہے؟ پیاری!
ری!! اگر لوگ خیال کریں تو تمام دنیا میری ہی طرح کریگی اور تم اپنے پھولوں کو تنہا اپنے مقام پر ہی رہنے دوگی جسطرح
میں یہاں پہاڑوں پر مقیم ہوں۔ یکایک وہ کہہ اٹھا "خدا کی پناہ" اور جب مارجری نے دریافت کیا کہ کیا غلطی ہوئی تو
ںاس نے سوال کو بدلدیا اور مکان میں چہرہ پر ایک حد تک مضحک تاثرات لئے ہوئے چلدیا۔

وہ میز پر خاموش رہا۔ جب رات ہو گئی اور ستارے سروں پر چمکنے لگے تو وہ گھنٹوں تیز تیز باغ اور صحن کے درمیان
ٹہلتا رہا۔ مارجری کے کمرہ میں ابتک روشنی باقی تھی جو سیاہ اور نیلے پہاڑوں اور سفید ستاروں کی روشنی میں ایک چھوٹی سی
نجی رنگ کی لمبی لکیر معلوم ہوتی تھی۔ دل کے خیالات بار بار دریچہ کی طرف منتقل ہوتے تھے مگر اسکے خیالات کچھ زیادہ
منتقل ہو سکے سے نہ تھے۔ وہ خیال آرائی کرنے لگا کہ وہ وہاں اپنے کمرہ میں اور ستارے یہاں سر کے اوپر آسمان پر ہیں۔

— دونوں پر رحم اور خدا کا فضل — دونوں کا اسکی زندگی پر گہرا اثر تھا دنیا سے کامل قناعت اور بیزاری میں دونوں نے اسکی زندگی کو پرسکون بنایا تھا اور ان سے اس سے زیادہ اور کس چیز کی خواہش تھی ہا فریہ نوجوان اور اسکے نصائح اسکے دل میں اسقدر تازہ تھے کہ اسنے اپنا سر پیچھے کی طرف جھکا دیا، اپنے دونوں ہاتھوں سے منھ ڈھانپ لیا اور بالآخر بڑبڑاتا ہوا بستر پر جا لیٹا۔

دوسری دفعہ صبح منھ اندھیرے اس نے دوبارہ مارجری کو باغ میں دیکھا اور اس سے گفتگو کا سلسلہ چھیڑ کر بیہودہ طور سے یوں مخاطب ہوا کہ میں شادی کے معاملہ میں غور کرتا رہا ہوں اور کامل غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ کوئی چیز نہیں ہے۔

مارجری ایک سنٹ کے لئے اسکی طرف مڑی مگر اسکا سرخ لیکن رحم بھرا چہرہ (ان حالات کے تحت فرشتہ کو غیرت اور شرم آتی) چمک اٹھا اور وہ دوبارہ زمین کو خموشی کے عالم میں دیکھنے لگی۔ وہ اسکو کانپتا ہوا دیکھ سکتا تھا وہ کچھ پیچھے ہٹ کر کہنے لگا کہ میں امید کرتا ہوں کہ تم اسکا خیال نہ کروگی اور تم کو کرنا بھی نہ چاہئے میں اس پر خوب غور کر چکا ہوں میری جان کی قسم اسمیں کوئی ایسی بات نہیں ہے ہم جتنے قریب ہیں اس سے ایک انچ بھی زیادہ قریب نہیں ہو سکتے اگر میں عقلمند ہوں اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں ہے۔

مارجری نے کہا میرے ساتھ سیر بیکار ہے مجھے خوب یاد ہے کہ تم نے اپنے کھلونے بنائے جانیکو پسند نہیں کیا اب میں دیکھتی ہوں کہ ہم غلطی پر تھے حقیقت پوچھو تو تم نے کبھی میرا خیال ہی نہیں کیا مجھے صرف اس کا افسوس ہے کہ میں ابتک غلط فہمی میں مبتلا رہی۔

ول نے بڑے زور سے کہا کہ معاف کرنا تم میرا مطلب نہ سمجھ سکیں میں تم سے کبھی محبت کرتا تھا یا نہیں اسکو میں لوگوں پر چھوڑتا ہوں لیکن ایک چیز کے متعلق تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ میرا احساس نہیں بدلا اور دوسرے تم اس پر فخر کر سکتی ہو کہ تم نے میری زندگی اور کیریکٹر کو بالکل بدل دیا ہے۔ میرے الفاظ میرا ٹھیک مطلب ہوتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شادی کرنا کچھ زیادہ اہم ہے تم اپنے والد کے ساتھ رہا کرو میں تم کو ہفتہ میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ جسطرح کہ لوگ گرجا کو جاتے ہیں دیکھنے کے لئے آیا کرونگا اور اس طرح ہم دونوں اس اثنا میں بہت زیادہ خوش رہا کرینگے یہ میرا خیال ہے اگر تمہارا خیال یہ نہ ہو تو میں شادی پر راضی ہوں۔

مارجری نے کہا کہ کیا تم جانتے ہو کہ تم میری ہتک کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا مارجری میں تو نہیں اگر ایک صاف ضمیر میں کوئی چیز ہو تو شائد وہ کر رہی ہو میں نہیں میں تو اپنے دل کی سچی محبت تیرے حسن کی بارگاہ میں پیش کرتا

سکو قبول کر یا ٹھکرا دے اگرچہ مجھے شبہ ہے کہ جو کچھ واقع ہو چکا ہے اسکو بدلنا اور میرے خیالات کی بندھن کی گرہ کو لنا تیری اور میری قوت سے باہر ہے۔ اگر تو پسند کرے تو میں تجھ سے شادی کرلوں لیکن میں بار بار یہی کہونگا کہ وہ کوئی اہم نہیں ہے بہتر یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دوست رہیں اگرچہ میں ایک خاموش آدمی ہوں تاہم میں نے بہت سی یں دیکھی ہیں۔ مجھ پر اعتماد کر اور میری تجویز کو قبول کرلے یا اگر تو اسکو ناپسند کرتی ہے تو ظاہر کر میں فوراً تجھ سے شادی ول گا۔

ایک عرصہ تک سکوت طاری رہا اور ول جو تکلیف محسوس کرنے لگا تھا نتیجہ کے متعلق غضب ناک ہونے لگا اس نے اپنے دل کی حالت بیان کرنے میں تم بہت مغرور معلوم ہوتی ہو۔ مجھے یقین کرو کہ یہ برا ہے۔ صاف صاف اظہار و اقرار گی کو آرام دہ بناتے ہیں مجھ سے زیادہ کیا کوئی شخص عورت کا احترام کرسکتا ہے؟ میں اپنی رائے ظاہر کرچکا اور تجھ کو قع دیتا ہوں کیا میں تجھ سے شادی کرلوں؟ یا تو میری دوستی پر جسکو میں زیادہ مناسب سمجھتا ہوں اکتفا کریگی؟ یا تو بھلائی ائی کے لئے مجھ سے سیر ہو چکی ہے؟ خدا کے لئے کچھ تو زبان سے کہہ، تو جانتی ہے کہ تیرے باپ نے کہا تھا کہ ایسے معاملات لیوں کو اپنے عندیات بیان کردینے چاہئیں۔ اس پر مارجری کو ہوش آیا وہ بغیر ایک لفظ کہے پلٹی، تیزی سے باغ میں ، ہو کر مکان میں ول کو نتیجہ کے متعلق پس وپیش کی حالت میں چھوڑ کر چلدی۔ وہ آہستہ سے سیٹی بجاتا ہوا باغ میں تا رہا۔ بعض اوقات ٹھہرتا، آسمان اور پہاڑ کی چوٹیوں پر غور کرتا بعض اوقات ندی کے سرے پر جا بیٹھتا اور دیوانگی سے پانی کو دیکھا کرتا ام تشویش و اضطراب اسکی فطرت اور زندگی کے لئے، اس زندگی کے لئے جسکو اس نے عزم صمیم کے ساتھ اختیار کرلیا ا ایسا عجیب اور نیا تھا کہ وہ مارجری کی آمد پر افسوس کرنے لگا وہ خیال کرتا کہ میں ایسا ہی خوش تھا جیسا کہ ایک آدمی سکتا ہے اگر کبھی میں چاہتا تو یہاں نیچے آجاتا اور تمام دن مچھلیوں کو دیکھا کرتا گویا کہ میں اپنی پرانی گرنی کی طرح مقیم طمئن تھا۔

مارجری ڈنر کے لئے نیچے آئی تو بہت خاموش اور حسین معلوم ہوتی تھی جوں ہی تینوں میز پر بیٹھ گئے اُس نے پنے باپ سے گفتگو شروع کردی اسکی آنکھیں رکابی پر جمی ہوئی تھیں لیکن اسکی مایوسی اور تشویش کی کوئی دوسری است نہیں پائی جاتی تھی اسنے کہا ابا جان میں اور مسٹر ول معاملات کے متعلق تبادلہ خیالات کرتے رہتے ہیں ہم سمجھتے ہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور مسٹر ول میری درخواست پر ادی کا خیال ترک کردینے پر راضی ہو گئے ہیں مگر وہ پھر بھی ماضی کی طرح میرے سچے دوست رہینگے آپ دیکھتے ہیں کہ سی قسم کے جھگڑے کا میاں شائبہ بھی نہیں ہے اور انشاء اللہ مستقبل میں ہم انکو متعدد مرتبہ دیکھیں گے کیونکہ ہمیشہ

انکی آمد کا ہمارے گھر میں خیر مقدم کیا جائیگا۔ یقیناً اباجان آپ خوب سمجھ سکتے ہیں لیکن ہمارے لئے موجودہ حالت میں مسٹر ول کے مکان کو چھوڑنا بہتر ہوگا جو کچھ واقع ہوچکا ہے اسکے بعد مجھے اندیشہ ہے کہ ہم مشکل پسندیدہ مقام ثابت ہوسکیں گے۔ ول جو ابتداء سے بمشکل اپنے آپ پر قابو رکھ سکا تھا اس پر بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا اور حقیقی یاس کے عالم میں گویا کہ وہ مداخلت اور اختلاف کرنا چاہتا ہے اس لئے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا —— مارجری نے کہا کہ آپ از راہ مہربانی معاملات کو خود سمجھے بیان کرنے دینگے۔

ول اسکے چہرہ کے اثرات اور اسکی آواز کی گونج سے زرد اور خاموش ہوگیا وہ اس نتیجہ پر پہونچ چکا تھا کہ لڑکی میں ایسی باتیں ہیں جو اسکی سمجھ سے باہر ہیں اور اس رائے میں وہ بالکل حق بجانب تھا۔ غریب پادری بالکل ما... اور رنجیدہ ہوگیا اسنے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی کہ یہ سب ایک سچے عاشق کے معمولی سے جھگڑے سے زیادہ ... نہیں ہے جو شام ہونے سے پہلے ختم ہوجائیگا لیکن جب اسکی پوری طرح تردید کی گئی تو پھر اس امر پر زور دیتے ... جب لڑائی کا کوئی واقعہ نہیں ہے تو جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ بوڑھا آدمی اپنے میزبان اور اسکی مہماند... دونوں کو چاہتا ہے۔ یہ عجیب ہے کہ لڑکی نے دونوں کا کیسا فیصلہ کیا اور کس طرح نسوانی قابلیت اور رہنمائی سے ... کو ہم رائے کرلیا۔ یہ اس کا کام مشکل معلوم ہوتا تھا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعات ہی ایسے ہوگئے ہیں اور اس کا باپ اسی سہ پہر کو زراعت کی گاڑی میں بیٹھکر نیچے وادی میں ایک دوسرے جھونپڑے کے اندر انکا خا... تیار ہونے تک چلے گئے۔ ول اسکو بہت غور سے دیکھتا رہا تھا اسلئے مارجری کی مایوسی ناکامی اور رغم سے د... تھا۔ جب اسکو تنہائی ملی تو بہت سارے اہم معاملات کا اسکو فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ بہت غمگین اور اداس تھا۔ ا... زندگی سے تمام فائدہ جاچکا تھا، جب تک اچھا معلوم ہوتا آسمان پر وہ اختر شماری کرتا تھا وہ ایک حد تک پناہ طمانیت قلب کے پانے میں ناکام ہوچکا تھا اور مارجری کے متعلق وہ روحانی کشمکش میں مبتلا تھا وہ اسکے برتاؤ اور مشتعل تھا تاہم اسکی محبت سے باز نہ رہ سکتا تھا وہ خیال کرتا کہ اس خاموش روح میں جسکا اس نے ابتک... نہیں کیا تھا اس سے ایک مقدس مگر مغرور فرشتہ کو پالیا ہے۔ اگرچیکہ وہ اس امر کو سمجھ چکا تھا کہ اسکی مصنوعی اطمینان... زندگی کو اس کا اثر صحتیاب نہیں بلکہ مریض بنا دیگا تاہم اسکو حاصل کرنیکی دلی آرزو سے وہ کنارہ کش نہیں ہو... تھا اس شخص کے مانند جو ابتک سایہ اور چھاؤں کے درمیان رہا ہو اور پہلی مرتبہ دھوپ میں آیا ہو وہ خوش بھی تھا رنجیدہ بھی۔

جوں جوں دن گذرتے گئے اسکے خیالات میں ترقی ہوتی گئی کبھی اپنے ارادہ کی مضبوطی کی ڈینگ ما...

اور کبھی اپنی لاطائل اور بیہودہ احتیاط پر لعنت و ملامت کرتا تھا۔ اوّل الذکر جذبا سکے صحیح خیالات کا غالباً صحیح آئینہ دار تھا اور انسان کے جذبات و میلانات کے رخ کی بہترین طریقہ سے ترجمانی کرتا تھا۔ لیکن ثانی الذکر خیال وقتاً فوقتاً ناقابل ضبط قوت کے ساتھ آیا کرتا تھا اسوقت وہ تمام خیالات اور دلائل کو بھول جاتا، اپنے مکان اور باغ کے درمیان ٹہلا کرتا تھا یا صنوبر کے درختوں کے درمیان اس شخص کے مانند جو رنج و افسوس میں آپے سے باہر ہو رہا ہو گھوما کرتا۔ خاموش اور تنہی دل وِل کے لئے معاملات کی یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی اسلئے اس نے ارادہ کیا کسی طرح اسکا خاتمہ کرونگا پس گرما کی ایک گرم سہ پہر میں اس نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا، ایک کانٹوں دار چھڑی ہاتھ میں لی اور ندی کے کنارے کنارے وادی کے نیچے کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ارادہ کے ساتھ ہی اسکا فطری اور عادتی اطمینان قلب واپس آگیا اس نے صاف اور خوشگوار موسم، اور منظر کی بوقلمونی سے بغیر کسی قسم کے خوف اور ناگوار حرص کی آمیزش کے لطف اٹھایا۔ معاملات کا انقلاب بھی تقریباً اسکے لئے ایسا ہی تھا۔ مارجری قبول کرے تو اس دفعہ وہ اس سے شادی کریگا جو ہر طرح ٹھیک اور مناسب ہے۔ اگر وہ انکار کر دے تو ممکنہ کوشش کو ناکام میں لانے کے باعث وہ ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیگا لیکن اسے یقین تھا کہ مارجری انکار کر دیگی اور جونہی دوبارہ اسنے ندی کے ایک زاویہ سے درختوں میں سے جھانکتے ہوئے مارجری پر سایہ کئے ہوئے ارغوانی چھت کو دیکھا تو راستہ سے لوٹ جانیکا نصف ارادہ کیا اور نصف سے زیادہ وہ اپنے تلون اور عدم استقلال پر شرمندہ تھا۔

مارجری اسکو دیکھکر خوش معلوم ہوتی تھی بغیر کسی اظہار محبت اور تمہید کے اس نے اپنا ہاتھ دیا وِل نے کہا میں شادی کے معاملہ پر غور کرتا رہا ہوں اس نے جواب دیا علی ہذا القیاس میں بھی غور کرتی رہی ہوں میں آپ کی نہایت عقلمند آدمی کی سی عزت کرتی ہوں۔ آپ نے مجھے مجھ سے بھی زیادہ عمدگی کے ساتھ سمجھا اور اب میں کامل یقین رکھتی ہوں کہ معاملات علی حالہ بہت اچھے ہیں وِل نے کہا ساتھ ہی ۔۔ قطع کلام کر کے مارجری نے کہا آپ تھک گئے ہونگے، کرسی پر بیٹھئے اور مجھے شراب کا ایک گلاس پیش کرنے دیجئے سہ پہر بہت گرم ہے میں چاہتی ہوں کہ آپ اس ملاقات سے ناخوش نہ ہوں آپ کبھی کبھی آیا کیجئے، ہفتہ میں ایک مرتبہ بشرطیکہ آپ وقت کا خون کر سکیں۔ میں ہمیشہ اپنے دوستوں کو دیکھکر خوش ہوتی ہوں۔

وِل نے دل میں خیال کیا کہ بس ٹھیک ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر نہیں تھا۔ اس روز وہ بہت اچھی طرح ملا، اچھی حالت میں مکان کو واپس آیا اور اس معاملہ پر پھر کچھ زیادہ غور نہیں کیا۔ تین سال تک وِل اور مارجری دونوں میں سے کسی کی جانب سے بغیر کسی محبت کے لفظ کے اظہار کے ہفتہ میں ایک دو مرتبہ ملتے رہے۔ اس تمام عرصہ میں

مجھے یقین ہے کہ ول ایسا ہی خوش رہا جیسا کہ کوئی آدمی رہ سکتا ہے مارجری کو دیکھنے سے وہ اپنے آپکو ایک م
روکتا اکثر اوقات پادری کدھ کے راستہ پر آدھی دور تک جاتا اور یہ خیال کرکے کہ زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا[1] اشتیاق
بڑھانے کے خیال سے لوٹ آتا وہاں سڑک کے کنارے ایک کونا تھا جہاں سے وہ وادی میں صنوبر کے درختو
درمیان کھڑا ہو کر گرجا کے احاطہ کو دیکھ سکتا۔ وہ وہاں اکثر بیٹھ جاتا اور واپس ہونے سے پہلے بیٹھ کر اکثر خیالا
کے گھوڑے دوڑایا کرتا تھا وہاں اسکو دھندلکے میں بیٹھے ہوئے پانے کے کسان ایسے عادی ہوگئے تھے کہ انھ
نے اسکو گرنی والا وِل کے گوشہ سے موسوم کر دیا تھا

تیسرے سال کے اختتام پر کسی اور سے شادی کرکے مارجری نے اسکے ساتھ برا مذاق اور سلوک کیا۔ ول۔
اپنے چہرہ کو مردانگی سے بدلنے نہ دیا۔ صرف اتنا ریمارک کیا کہ جتنا کم وہ عورت کی سرشت کے متعلق سمجھ سکا ہے ا
بناپر تین سال سے پہلے اس سے شادی نہ کرنے میں اس نے بڑی عقلمندی کا ثبوت پیش کیا ہے مارجری بھی ا
عادات کے خلاف ایسی ہی بیوفا تھی جیسی اسکی صنف کی اور افراد کا حال ہے اس بچاؤ پر وہ اپنے آپ کو مبارکباد
اور نتیجہ پر اپنی فراست کے متعلق اعلیٰ رائے قائم کرتا تھا لیکن دل میں وہ ناخوش تھا مہینہ دو مہینہ تک اندر ہی اندا
رہا اور دبلا ہو گیا۔

اس شادی کے ایک سال بعد وِل ایک رات سڑک پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سے ہوشیار ہوا۔ سرا
کا دروازہ جلد جلد کھٹکھٹایا جا رہا تھا اس نے اپنا دریچہ کھولا اور ایک کھیت کے ملازم کو گھوڑے پر سوار ایک کوتل گ
کی لگام تھاما ہوا دیکھا جس نے بیان کیا کہ ممکنہ عجلت میں اسکو اسکے ساتھ چلنا چاہیئے کیونکہ مارجری قریب المرگ
اسکو فوراً اپنے بستر مرگ پر لانے کے لئے بھجوایا تھا۔ وِل کوئی اچھا سوار نہیں تھا ایسا آہستہ آہستہ چلا کہ غریب مار
جب وہ پہونچا تو موت کے بہت قریب تھی انھوں نے کچھ دیر تک تخلیہ میں باتیں کیں جب آخری مرتبہ اس جہان فانی
مارجری نے سانس لیا تو وہ وہاں موجود تھا اور زار زار گریاں ہوا۔

(۳)

موت

[1] زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا حدیث ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ فاصلہ سے ملاکرو محبت بڑھیگی۔

میدان کے شہروں میں سال بہ سال زبردست حوادث اور مصائب کے ساتھ گذر گئے۔ خونی انقلابات خون کی
ں میں ڈوب گئے، یہاں وہاں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دھن کے پکے ہیئت داں رصدگاہوں میں نئے نئے ستاروں
ریافت میں مصروف رہے؛ بقعۂ نور تھیٹروں میں کھیل ہوتے رہے۔ پلنگوں پر مریض شفاخانوں میں لیجائے جاتے
ے۔ اور اس طرح انسانوں کی تمام دوڑ دھوپ اور ہنگامے آباد مرکزوں میں جاری رہے۔ اوپر ول کی وادی میں
اور موسم کا دور دورہ تھا۔ تیز دریا میں مچھلیاں تیرتی، طیور سروں پر چکر لگاتے؛ تاروں کے نیچے سرو کے درخت اُگتے
تے، ان سب پر مستزاد سر بفلک کوہ آسمان سے باتیں کرتے کھڑے تھے۔ ول سرائے سے یہاں تک آتا جاتا رہا۔ یہاں
، سفیدی اسکے بالوں میں نمودار ہوگئی لیکن اسکا دل ابھی نوجوان اور جری تھا، اسکی نبض معتدل تھی اور ہاتھ میں لٹک
ی سے حرکت کرتی تھی اسکے دونوں گالوں پر پختہ سیب کے مانند سرخی تھی۔ وہ کسی قدر جھک گیا تھا مگر اسکے قدم اب
مضبوط تھے، اسکے مضبوط ہاتھ تو تمام آدمیوں سے دوستانہ دباؤ کے ساتھ ملتے تھے۔ اسکے چہرہ پر وہ جھریاں جو کھلی
کا نتیجہ ہوتی ہیں نمودار ہوگئی تھیں اور جنکی سدا دھوپ میں جلنے کے اثرات سے زیادہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ جھریاں کاہل
ی کی کاہلی کو بڑھا دیتی ہیں لیکن ول جیسے صاف آنکھوں اور ہنس مکھ چہرہ کے آدمی کے لئے اسکی سادہ اور آسان
دگی میں دوسری دلکشی پیدا کر دیتی ہیں۔ اسکی گفتگو عقلمندانہ مقولوں اور کہاوتوں سے پر ہوتی تھی، وہ دوسروں کو
ھتا اور دوسرے اسکو چاہتے تھے۔ جب موسم میں وادی مسافرین سے معمور ہوتی تو ول کے سائبان میں پر لطف
یں بسر ہوتی تھیں۔ اسکے خیالات جو پڑوسیوں کو "مجذوب کی بڑ" معلوم ہوتے تھے شہروں اور کالجوں کے لوگ اکثر
دیے انتہا پسند کرتے تھے۔ وہ بوڑھا تھا اور قابل تھا اور دن بدن اسکی شہرت کو پر لگ رہے تھے اسکی شہرت میدانوں
ے شہروں تک جا پہنچی تھی۔

نوجوان اور تعلیم یافتہ جو گرما میں سفر کے اندر چا خانوں میں بیٹھے ہوتے گرنی والے ول اور اسکی خام اور ناہموار
کے سادہ فلسفہ پر بحث و مذاکرہ کرتے تھے۔ یقین ہے کہ بہت ساری دعوتیں آئیں مگر اسکو اوپر کی وادی سے نیچے کر
ہروں میں آنے پر آمادہ نہ کر سکیں وہ سر ہلاتا اور ایک پر معنی انداز میں تمباکو کی چلم پر ہنستے ہوئے جواب دیتا تھا "دوستو
ت دیر سے آئے میں اب مردہ ہوں۔ میں جی بھی چکا اور مر بھی۔ دو سال پہلے تم میرے خیالات اور ارادوں سے واقف
د سکتے تھے لیکن اب تو تم مجھے ترغیب بھی نہیں دے سکتے یہ زیادہ دنوں تک زندگی کا نتیجہ ہے کہ انسان زندگی کی
پرواہ کرنا چھوڑ دیتا ہے ایک اچھے ڈنر اور طویل زندگی میں صرف یہ فرق ہے کہ ڈنر میں میٹھی چیزیں آخر میں آتی ہیں کبھی
ا سونیا میں لڑکا تھا تو اس پر حیران تھا کہ دیکھنے کے قابل اور عجیب چیز آیا میں ہوں یا دنیا؟ مگر اب میں جانتا ہوں کہ

دیکھنے کے قابل ہیں ہوں اور اسی پرمضبوطی کے ساتھ جما ہوا ہوں اس نے دنارت اور زبون ہمتی کی کوئی علامات ظاہر نہیں ہونے دیں بلکہ مضبوط اور عالی ہمت رہا لیکن آخر میں لوگ بیان کرتے ہیں کہ وہ خاموش ہوگیا تھا اور گھنٹوں تک دوسروں کو باتیں کرتے ہوئے ہمدردانہ اور مسرور سکوت میں سنا کرتا تھا مگر جب گفتگو کرتا تو اصل مبحث سے باہر نہیں ہوتا اور یہ گفتگو پرانے تجربوں سے مملو ہوتی تھی سورج کے پہاڑ کی چوٹی سے شام میں گلے ملتے وقت یا بہت رات گئے سائبان میں ستاروں کے نیچے کسی ناقابل حصول اور مقناطیسی کشش کا نظارہ اس کی خوشی میں اضافہ کرتا تھا۔

ایک رات اپنی عمر کے ۷۰ سال میں وہ جسم اور روح کی تکلیف میں بستر پر جاگنے سے اُکتا کر اٹھا، کپڑے پہنا اور خیال آرائی کرنیکے لئے سائبان میں جا بیٹھا کامل اندھیرا چھایا ہوا تھا، آسمان پر ایک ستارہ بھی نظر نہ آتا تھا، دریا خاموش اور سویا ہوا تھا اور گیلے درخت اور میدان کو معطر کر رہے تھے۔ دن میں گرجتا رہا تھا اور دوسرے دن اس سے زیادہ کڑک چمک کے آثار ہویدا تھے۔ تاریک اور ڈراونی رات ۷۰ سال کی عمر والے کے لئے، نہ معلوم موسم، بیداری یا اسکے بوڑھے اعضا میں بخار کی خفیف سی حرارت کے سبب دِل کا دل اضطراب انگیز اور حزن آگیں یادسے تھم گیا۔ اسکا بچپن، فربہ نوجوان کے ساتھ کی رات اسکے متبنی لئے ہوئے والدین کی موت مارجری کے ساتھ بہاسکے ایام اور بہت سے وہ معمولی واقعات جو دوسروں کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے لیکن باوجود اسکے کسی شخص کی زندگی کا جزو لاینفک ہوتے ہیں، دیدہ اشیاء، شنیدہ الفاظ، غلط تعبیر شدہ نظریں اپنے بھولے ہوئے کناروں سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسکی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا۔ مرحومین اسکے ساتھ تھے، یادگے اس نازک کھیل میں جو اسکے دماغ کے سامنے صف بستہ ہو رہا تھا انھوں نے نہ صرف حصہ لیا بلکہ اسکے جسمانی حواس کو بھی جیسا کہ وہ گہرے خوابوں میں کرتے ہیں متاثر کر رہے تھے۔ فربہ نوجوان مقابل کے میز پر بازوں کے بل جھکا ہوا گھور رہا تھا۔ مارجری باغ اور سائبان کے درمیان پھولوں سے دامن بھری ہوئی آئی اور گئی۔ وہ بوڑھے پادری کے زور سے جھٹکنے یا ناک سے سانس چھوڑنے کی آواز سنتا تھا۔ اس کی ہوشیاری کی موج چکر لگائی اور چلی گئی۔ بعض اوقات اپنے ماضی کی یاد میں وہ اونگتا اور ڈوب جاتا اور بعض اوقات اپنے آپ پر حیرت کا اظہار کرتا ہوا جاگ اٹھتا۔ لیکن آدھی رات کے وقت مرحوم مالک گرنی کی آواز سے جو مکان کے باہر سے آرہی تھی وہ چونک پڑا، بوڑھا خریداروں کی آمد پر ایسا کرنیکا عادی تھا، وہم ایسا کامل تھا کہ دل اپنی جگہ پر سے اچھل پڑا اور آواز کے دہرائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سننے لگا تو ندی کی گنگناہٹ اور اپنے تپ زدہ کانوں کی گونج کے علاوہ ایک دوسری آواز سنائی دینے لگی یہ گھوڑوں کے ہلنے اور ہنہنانے اور ہارنس کی چرچر کی آواز معلوم ہوتی تھی گویا ایک گاڑی سڑک پر بے صبر آدمیوں نے صحن کے دروازہ کے سامنے لا کھڑا کی ہے۔ ایسے وقت میں اس ناہموار

ناک راستہ پر عجیب اور ڈراونے خیالات ول کے دماغ میں چکرانے لگے۔ ول نے انکو دماغ سے دور کر دیا اپنی پر سائبان میں بیٹھ گیا اور نیند بہتے ہوئے پانی کیطرح اسپر چلی آئی۔ مرحوم مالک گرنی کی آواز سے وہ دوبارہ جاگ اٹھا جو لی بہ نسبت زیادہ باریک اور مدھم تھی اور دوبارہ اسکو گاڑی کی آواز سنائی دی یہانتک کہ آخرکار وہ اپنے آپ پر ڈرپوک بچے کی مانند جس سے مذاق کیا جائے ہنستا ہوا اور اپنے شک و شبہ کو دور کرنے کے لئے پھاٹک کی طرف

سائبان سے پھاٹک تک کچھ زیادہ فاصلہ نہیں تھا تاہم وہاں جانیکے لئے ول کو کافی عرصہ لگا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مردے ں اس پر مجتمع ہو گئے اور ہر قدم پر اسکے راستہ میں حائل ہو رہے ہیں وہ سورج مکھی پھولوں کی روح پر قبضہ کرنیوالی نفاست یسے متحیر ہو گیا معلوم ہوتا تھا کہ اسکے باغ میں ایک سرے سے دوسرے تک یہی پھول لگے ہوئے ہیں۔ مرطوب رات یک سانس میں تمام خوشبو کو بکھیر دیا تھا سورج مکھی غریب مارجری کے محبوب پھول تھے اور اوسکی وفات کے بعد سے ول ن میں ایک بھی نیا درخت لگایا نہیں گیا تھا۔ وہ خیال کرنے لگا کہ "غریب مارجری اور اسکے سورج مکھی پھولوں کا تصور دیوانہ بنا دیگا۔ اسکے ساتھ ہی اسنے دریچہ کی طرف اپنی نگاہ اٹھائی جو کسی زمانہ میں مارجری کی قیام گاہ تھا اگر اس سے رہ متعجب اور حیران ہو رہا تھا تو اب خوفزدہ تھا کیونکہ کمرہ میں روشنی تھی کمرہ کے دریچہ میں پہلے کی طرح ایک نارنجی رنگ معلوم ہوتی تھی اس رات کی طرح جبکہ تذبذب کے عالم میں کھڑے ہو کر ستاروں کو پکارا اٹھا تھا پردہ کا کنارا اٹھایا اور لیا۔ تمثیل ایک منٹ کے لئے بھی معلوم ہوئی لیکن اس نے ایک حد تک ول کو خوفزدہ کر دیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا کے خاکہ اور تاریک رات کو اسکے پیچھے دیکھنے لگا۔ جب وہ اس طرح کھڑا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر تک ہاں خاموش کھڑا رہا۔ تو سڑک کی آوازیں از سر نو کان میں آنے لگیں اور کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک مسافر سے ملنے طرف لپٹا جو صحن میں اس سے ملنے کی غرض سے آ رہا تھا۔ سڑک پر ایک بڑی گاڑی سی نووارد کے پیچھے نظر آتی تھی اور پیچھے چند سرو کے سیاہ جھاڑ بہت سی کلغیوں کے مانند دکھائی دیتے تھے۔

مختصر فوجی انداز میں نووارد نے پوچھا "جناب ول" ول نے جواب دیا "جناب کیا میں آپکی کچھ خدمت کرسکتا دوسرے نے کہا میں نے آپ کا بڑا شہرہ سنا ہے اگرچہ کاموں سے مجھے بالکل فرصت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی مارے سائبان میں شراب کی ایک بوتل پینا چاہتا ہوں۔ میں جانے سے پہلے انشاء اللہ اپنا تعارف کروادونگا۔ جالی تک ول نے رہنمائی کی لیمپ روشن کیا اور بوتل کا ڈھکنا کھول کر پیش کیا۔ وہ اس قسم کی تکلفانہ ملاقاتوں دی تھا اور بہت سی مایوسیوں کے انجام کے طور پر ان ملاقاتوں سے کسی چیز کی بہت کم امید رکھتا تھا۔ ایک

قسم کا پردہ اسکے حواس پر چھا گیا اور وقت کی نزاکت اور انوکھے پن پر غور کرنے سے روکدیا اس نے خوابیدہ آدمی کی طرح حرکت کی، معلوم ہوتا تھا کہ خیال کی سی سرعت اور تیزی کے ساتھ لیمپ روشن ہوگیا اور بوتل کھل گئی تاہم اپنے ملاقاتی کی آمد کے متعلق ایک قسم کی تشویش ضرور اسکے دل میں تھی۔ اس نے بیفائدہ چہرہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش یا تو اس نے لیمپ مضبوط نہیں پکڑا یا اسکی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا کہ اسکو میز پر اپنے ساتھ ایک سایہ سا دکھائی شیشے اور گلاس کو صاف کرتے ہوئے وہ اس سایہ کو گھورتا رہا اور ایک قسم کا خوف محسوس کرنے لگا۔ اس پر سکون چھا گیا کیونکہ وہ کچھ نہیں سن سکا۔ ندی کی روانی تک نہیں۔ صرف اسکے سانس کے چلنے کی آواز اس کے کانوں آرہی تھی

درشتی سے نوواردنے کہا کیا کر رہے ہو، شراب ڈالتے ہوئے دل نے کہا میں جناب اپنے فریضہ کو انجام دے رہا ہوں نوواردنے کہا میں جانتا ہوں کہ تم جری اور دُھن کے پکے آدمی، دِل نے کسی قدر اطمینان کی ہنسی سر کی حرکت سے اثبات میں جواب دیا نوواردنے کہا میں بھی ایسا ہی ہوں، میری دلی آرزو ہے کہ لوگوں کی میں حاضر رہا کروں، میں نے اپنے سوا کسی کو مستقل نہیں پایا میں اپنے وقت بادشاہ ہوں، سپہ سالار ہوں اور مذہبی صناعوں کے خیالات کو آزما چکا ہوں اگر میں کہوں گا کہ یہاں میں تمھاری مستقل مزاجی کا امتحان کرنیکے لئے آیا ہوں تو تم کیا کہوگے؟ دِل سخت جواب دینے کے لئے زبان کھولنے والا ہی تھا کہ ایک تجربہ کار اور بوڑھے مالک سرائے اخلاق اس پر غالب آگئے اور اسکے غصہ پر قابو پایا ہاتھ کے شفیق اشارہ سے جواب دیا مسافر نے کہا معلوم ہوتا ہے اپنی جگہ پر برقرار رہنے یعنی اپنی سرائے سے لپٹے رہنے پر مقر رہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میری گاڑی میں تم میرے ایک گشت کے لئے چلو۔ اس بوتل کے خالی ہونے سے پہلے تمکو چلنا پڑیگا۔ دل نے ہنستے ہوئے جواب دیا یقیناً کہ یہ عجیب بات ہے کیوں جناب میں یہاں پرانے سرو کے درخت کی طرح اگا ہوں شیطان بھی بمشکل مجھکو یہاں اکھاڑ سکتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم ایک دلچسپ بوڑھے آدمی ہو۔ میں تم کو دوسری بوتل دونگا تاکہ تم میرے جھگڑنے کی تکلیف گوارا نہ کرو۔ اس تمام عرصہ میں دِل کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی اور بے رونقی بڑھتی رہی تھی مگر حد تک تیز اور سرد لرزنے والی نگاہ سے واقف ہوتا رہا جو اسکو مشتعل مگر ساتھ ہی ساتھ اس پر قبضہ کر رہی تھی۔ گھبرائی آواز میں جس سے وہ خود سہم گیا کہ اٹھا کہ تم کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ میں یہاں مکان پر اسلئے مقیم ہوں کہ خدا کی سے ڈرتا ہوں۔ خدا جانتا ہے کہ میں اس زندگی سے بیزار ہوں اور جب ایک زیادہ طویل سفر کا وقت آئیگا تو میں سمجھ کہ میں اپنے آپ کو بالکل تیار پاؤنگا۔

نووارد نے گلاس خالی کیا اور اپنے پاس سے اسکو دور پھینکدیا وہ کچھ دیر تک نیچے دیکھتا رہا پھر میز پر جھک کر انگلی سے ول کے بازو کو تین مرتبہ مارا اور اطمینان سے کہا کہ "وقت آچکا ہے" جہاں اسنے چھوا تھا وہاں ایک خوفناک لہر دوڑ گئی اسکی آواز کا لہجہ بھدا اور پریشان کن تھا جو عجیب طریقہ سے ول کے کانوں میں گونجا ایک حد تک ہراسانی سے ول نے پوچھا معاف کیجئے آپ کا کیا مطلب ہے، میری طرف دیکھو تمہاری نظر ڈوب رہی ہے اپنا ہاتھ اٹھاؤ وہ بجی سے شل ہو چکا ہے، ماسٹر ول! یہ آخری تمہاری شراب کی بوتل ہے اور زمین پر آخری رات ہے ول نے پوچھا آپ ڈاکٹر ہیں دوسرے نے جواب دیا بہترین جو کبھی پردۂ دنیا میں تھا کیونکہ میں ایک ہی نسخہ سے جسم اور روح دونوں کا علاج کرتا ہوں میں تمام تکالیف کو دور کرتا اور تمام گناہوں کو بخشتا ہوں میرے مریض زندگی میں جو غلطیاں کرتے ہیں میں انکی اصلاح کرتا اور انکو دوبارہ اپنے قدموں پر آزاد چھوڑ دیتا ہوں۔

ول نے کہا مجھے آپکی ضرورت نہیں ڈاکٹر نے کہا ماسٹر ول تمام آدمیوں کے لئے ایک ایسا وقت آتا ہے جبکہ حیات کا تاج انکے ہاتھوں سے لیلیا جاتا ہے چونکہ تم عقلمند، صابر و خاموش تھے اور بہت دنوں سے اسکے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھے اسلئے وہ وقت تمہارے لئے دیر سے آیا۔ تمہاری گرنی میں جو کچھ دیکھنے کے قابل تھا، تم دیکھ چکے لیکن اب تمہاری زندگی قریب الختم ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا کہ اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔ اپنے مہمان کو غور سے دیکھتے ہوئے ول نے کہا تم عجیب طبیعت کے آدمی ہو۔ نووارد نے کہا میں قانونِ فطرت ہوں اور لوگ مجھے موت کہتے ہیں۔

ول پکار اٹھا پہلے ہی آپ نے یہ کیوں نہیں فرمایا میں گذشتہ کئی سال سے آپکا منتظر ہوں، اپنا ہاتھ لاؤ خوش آمدید نووارد نے کہا میرے بازو پر جھک جاؤ کیونکہ تمہاری طاقت جواب دے رہی ہے، مجھ پر جتنی ضرورت ہو جھک جاؤ، میں اگرچہ بوڑھا ہوں، تاہم مضبوط بھی ہوں میری گاڑی تک صرف تین قدم ہیں اور وہاں پہونچتے ہی تمہاری تمام تکالیف ختم ہو جائینگی۔ نووارد نے کہا کیوں ول میں تم سے ایسی محبت کرتا ہوں گویا کہ تم میرے بیٹے ہو ان تمام آدمیوں کی بہ نسبت جنکے پاس میں اپنی اس طویل زندگی میں گیا ہوں تمہارے نزدیک میں بڑی خوشی سے آیا ہوں میں کسی قدر سخت گیر ہوں اور بعض اوقات پہلی ہی نگاہ میں لوگوں کو ناراض کر دیتا ہوں لیکن تم جیسے آدمیوں کا میں دلی دوست ہوں۔ ول نے جواب دیا جب سے مارجری لیلی گئی ہے میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ تم ہی ایک ایسے دوست ہو جس کا میں منتظر ہوں اس طرح جوڑا ہاتھ میں ہاتھ ملائے صحن کو عبور کر گیا۔

ایک نوکر اسوقت جاگ اٹھا اور دوبارہ سونے سے پہلے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنی اس رات نیچے تمام وادی

میں میدان کی طرف بہنے والی صاف اور رواں ہوا کے مانند آواز آتی رہی۔ دوسری صبح جب دنیا سو کر اٹھی تو یقینیہ گرنے والا دل اپنے آخری سفر پر جا چکا تھا۔

(اسٹیونسن)

تصحیح

گذشتہ مارچ و اپریل کے مشترکہ نمبر میں علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی کتابت کی غلطیوں کے چند فاحش غلطیاں رہ گ ناظرین کرام اس طرح درست فرمالیں۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹۷	۵	نکات وادارت	صفو ادارت
۹۷	۵	ملارموزی	ایڈیٹر
۱۰۰	۱۷	پڑھنے ترغیب	پڑھنے کی ترغیب
۱۰۱	۴	ساتھ ہمیشہ	ساتھ وہ بھی ہمیشہ
۱۰۱	۴	ہو جاتی ہے	ہو جاتی ہیں
۱۰۱	۵	کاوشوں	کاوشیں
۱۰۱	۱۰	تنقیدی سند دی	تنقیدی سند دی جائے
۱۰۱	۱۶	قربانی ضرورت	قربانی کی ضرورت
۱۰۴	۱۲	ایک جذبہ مذہب	ایک جدید مذہب
۱۱۴	۱۰	پیش کر دیا	پیش کر دی
۱۱۴	۱۱	شائع ہوا	شائع ہوئی
۱۲۰	۱۶	خموشی کی نیم رضا	"خموشی نیم رضا"
۱۷۴	۱۴	شیرازہ رنگ وضو	شیرازہ رنگ نمو
۱۸۴	۱۲	شب تاریک وصال	شب تاریک فراق

الٹن لاک کے آخری الفاظ

(ماخوذ از نظم کنگسلی)

حسرت، حسرت، حسرت، حسرت

ہر جاہل پر، ہر کاہل پر
خاک اڑاتی باد صبا ہے
ہر ویرانہ وقف بکا ہے
گلشن سے اٹھتی یہ صدا ہے
شور بپا ہے ہر ساحل پر
بیکاری سے مرنا بہتر

نفرت، نفرت، نفرت، نفرت

اس پر جو باکار نہیں ہے
جو خو کردہ ظلم و جفا ہے
جو بزدل محتاج و گدا ہے
جس کو ہر خیرات روا ہے
زیست کا وہ حقدار نہیں ہے
قول خدا بیکار نہیں ہے

جاگو، جاگو، جاگو، جاگو

جو کرنا ہے کرتے جاؤ
رات گئی اور سورج نکلا
پھول کھلا اور غنچہ چٹکا
کھلی عدالت حاکم آیا
کیا کہتے ہو سامنے آؤ
کام کرو یا قبر میں جاؤ

(محمود اسرائیلی)

نوائے راز

بن گئے اسرارِ حسن و عشق افسانہ طراز
ہو رہا ہے ضبط کے آثار سے افشائے راز

جی میں آتا ہے کہ ان سے جا کے پوچھا چاہیئے
التفاتِ ناز کے قابل ہے کیا میرا نیاز؛

مرنے والا مر گیا اور اس کا دم آخر ہوا
بس لئے بیٹھے رہیں وہ اپنی شانِ حسن و ناز

مر گئے پھر بھی نہ کچھ سمجھے کہ یہ کیا چیز ہے
موت جسکو زندگی کا جانتے تھے ایک راز

بیخودی میں ہو گئے اسرارِ خودداری عیاں
مشکلاتِ زندگی نے کر دیا ہے بے نیاز

رنج و غم نے مجھکو مرنے کی بھی کچھ فرصت نہ دی
میرا سوزِ غم ہے میری زندگی کا ایک ساز

اضطراب جاوداں نے کیں بہت آسانیاں
ہے مگر طولِ شبِ فرقت بھی اک آہِ دراز

چارہ گر بالیں پہ کیوں بیٹھے ہوئے ہیں فکر میں
اس مریضِ غم کا اب تو بس خدا ہے چارہ ساز

اسکو سن لیجئے اب افسانۂ غم ختم ہے
چند سانسیں ہیں مگر شرح گلہائے دراز

قیصر (از بھوپال)

انشا پردازی

ینۂ جہاں ہوں، جام جہاں نما ہوں — میں شرحِ حالِ رازِ اشرار و اتقیا ہوں
سخن ہے میرا اک موجۂ ترنم — چرخِ ادب کی مجھ سے قائم ہے بزمِ انجم
ار سے ہے میرے ہر سخن درخشاں — منشیِ چرخ بھی ہے مجھ پر فدا بصد جاں
نجینۂ بیاں ہوں، سرمایۂ زباں ہوں — شانِ سخنوراں ہوں جانِ سخنوراں ہوں
ھ سے گلِ مضامیں کا رنگ و بو ہے تازہ — میں چہرۂ عروسِ تخئیل کا ہوں غازہ
ولا پھلا ہے مجھ سے گلزارِ رمز و معنیٰ — جاری ہے دم قدم سے میرے بیاں کا دریا
صنف میں ہے میری کچھ اور ہی لطافت — جادو ہے گر بیاں میں تو شعر میں ہے حکمت
دیِ گمرہاں ہوں، خضرِ رہِ صفا ہوں — گم گشتہ کارواں کا بیدار کن درا ہوں
رے وجود سے ہے لطفِ سخن جہاں میں — اعجاز موسوی ہے میرے لب و دہاں میں

اہلِ مجاز پر ہے روشن مری حقیقت
سن لو متین! "میں ہوں تفسیرِ رنج و راحت"

متین حیدرآبادی

تصوّر

اک پیاری پیاری صورت	اک موہنی سی مورت
یوں سامنے کھڑی ہے	جیسے کوئی پری ہے
چہرہ ہے یوں درخشاں	جیسے کہ ماہ تاباں
پیشانی ہے سراپا	اک چاند کا سا ٹکڑا
آنکھوں میں مستیاں ہیں	ہونٹوں پہ بجلیاں ہیں
معصوم ہیں نگاہیں	خوابیدہ ہیں ادائیں
گیسو ہیں کالے کالے	کاندھوں پہ اپنے ڈالے
دو ہاتھ گورے گورے	دونوں طرف ہیں لٹکے
سادا سا پیرہن ہے	رنگینی چمن ہے
ایک ہلکا سا ڈوپٹہ	سینے کے پاس رکھا

اک نور ہے سراپا
اک حور ہے مجسم

ہر شان اک ادا ہے	ہر آن دلربا ہ
آنکھوں میں بے نیازی	نظروں میں دلنواز
مخمور ہیں نگاہیں	مینوشِ ہیں فضا
زلفیں بکھر رہی ہیں	بےچین کر رہی ہ
گالوں پہ ایسی لالی	جیسے شفق کی سر
پلکیں جھپک رہی ہیں	آنکھیں جھک رہی ہ
اک حشر اٹھا رہی ہیں	فتنے جگا رہی ہ
گوری ہتیلیاں ہیں	بیکس کی داستاں
سرخی جھلک رہی ہے	مہندی سی لگی ہوئی
ہونٹوں پہ ہے تبسم	ہر سانس میں تر

یہ سکر زا نظارا
اف یہ غضب کا عالم

میں مست ہو رہا ہوں — چپ چاپ وہ کھڑی ہے
میں حال کہہ رہا ہوں — وہ مسکرا رہی ہے
بپتا سنا رہا ہوں — خاموش سن رہی ہے

میں اسکو دیکھتا ہوں
وہ مجھکو دیکھتی ہے

کیف (مراد آبادی)

دردِ عشق

(قطعہ)

(عطیہ لسان الملک ندرت بیان صاحبزادہ)

کسی بیدرد نے اک دردمندِ عشق سے پوچھا کہ کہتے ہیں "دردِ عشق" اور کیا چیز الفت ہے
کہا اس دردمندِ عشق نے رو کر کبھی ہنس کر جسے کہتے ہیں الفت بیخودی کی ایک حالت ہے
یہ "دردِ عشق" وہ شے ہے فنا ہو کر نہیں مٹتا دلِ زندہ میں گویا غیر فانی ایک لذت ہے
وہ لذت ایسی لذت ہے بیاں جس کا نہیں ممکن وہ اک گنگ کا جو سپنا ہے اک رازِ حقیقت ہے
وہی رازِ حقیقت جو کہ رازِ کن فکاں ٹھہرا وہی روزِ ازل سے دل میں انساں کے ودیعت ہے
وہی جو ہر جو ذاتِ خاص نے مرغوب فرمایا ہوا ہے جلوہ گر دل میں یہی دردِ محبت ہے
مزے دردِ محبت کے کوئی عشاق سے پوچھے اگرچہ درد ہے ظاہر میں لیکن عین راحت ہے
وہ راحت ہے کہ جس میں لاکھوں آفتیں پنہاں ہر آفت مگر اس کی نویدِ عیش و عشرت ہے

وہ عیش روح پرور ہے سرورِ جانفزا ذائق
تخیل بھی بظاہر جس کا دل پر اک مصیبت ہے

کیفیات

ہستی بے ثبات کا اب بھی تو اعتبا[ر ہے] دورِ خزاں کے ہاتھ میں دامنِ لالہ زار ہے
دل طفیلِ رازِ عشق کا رازدار [ہے] اب یہ ناز حبیب ہے دل میں خیالِ یار ہے
وسعتِ ہر حباب میں نازشِ اختصا[ر ہے] نقش بر آب ہے حیات دیکھ اسیرِ کائنات
دیکھی ہے اختیار تھا یہ بھی مری بہا[ر ہے] عیش و نشاطِ آرزو خونِ حیات آرزو
سجدہ گہ مجاز میں مٹنے کو بیقرا[ر ہے] پردۂ گل سے اب نکل حسنِ ازل کہ دل مرا
ضبط مرا حریف ہو ہم کوئی غمگسا[ر ہو] اشکِ ستم ظریف ہو درد دلِ نحیف ہو
عشق کا وہ سرور تھا حسن کا یہ خما[ر ہے] ناز میں اب نیاز ہے عمرِ وفا دراز ہو
چشمِ سیاہ مست میں کشمکشِ خما[ر ہے] حیف یہ دلنوازیاں آہ یہ کیف زائیاں
لطف و کرم کے جوش میں سعیِ کرد[گار ہے] اٹھو تو سہی یہ انفعال بارِ گناہ کو سنبھال
شدتِ جور میں نہاں راحتِ جانِ زا[ر ہے] عشقِ ستم سے اور بھی ذوقِ ستم فزوں ہوا

آب کرم سے اے کریم دور ہو داغِ معصیت
عشرتِ زار دلفگار آج تو شرمسار ہے

عشرت رحمانی المحبوبی رامپوری

چڑیا کے انڈے

سنہری دھوپ میں دن بھر مزے سے
پھدکتے اڑتے پھرتے ہیں پرندے
درختوں کے ہیں پتے ان کے خیمے
یہیں آپس میں ہیں وہ بحث کرتے

وہ دیکھو شاخ پر اک گھونسلا ہے
ہے چھوٹا سا مگر کیا خوشنما ہے
ہیں اس میں چار ننھے ننھے انڈے
انھیں سیتی ہے چڑیا کس خوشی سے
یہ نیلے انڈے جب دیتی ہے چڑیا
تو اُن کو رات دن سیتی ہے چڑیا

ابھی میں دیکھ آیا چڑھ کے اوپر
کہ بچے ہیں ابھی انڈوں کے اندر
جب انڈے کھٹکیں گے ماں باپ انکے
نکل آئینگے چوں چوں کر کے بچے
بڑے ہو کر یہی بچے ابھی سے
چمن میں چہچہائیں گے خوشی سے
اٹھالیں گے یہ سر پر سارا جنگل
منائیں گے یہ سب جنگل میں منگل

ذرا بچو یہ سوچو دل میں اپنے
پرندوں کے ہیں بچے تم سے چھوٹے
ابھی کمسن بھی ہیں کمزور بھی ہیں
مگر کچھ خوبیاں ان میں بڑی ہیں
وہ تھوڑے عرصہ میں اڑتے پھرینگے
سنائیں گے وہ سب کو اپنے نغمے

قوی ہو کر حقارت کی نظر سے
کبھی ان کو نہیں ہم دیکھ سکتے
یہ جس دم میٹھے میٹھے گائینگے گیت
تو ہم کو اُن کے بس تڑپائیں گے گیت
یہ برگد اور پیپل کے شجر پر
کریں گے نغمہ سنجی شاد ہو کر
اگرچہ ہم ہیں عاقل اور دانا
بڑے ہم فلسفی ہیں یہ بھی مانا
مگر اوپر کب اڑنے پاتے ہیں ہم
زمیں پر جوتیاں چٹخاتے ہیں ہم

ذہین حیدرآبادی

غمزدہ کوئل

کوبکو صحرا بصحرا پھر رہی ہے کیوں اداس — خیر تو ہے کیوں سراسیمہ ہے کیوں ہے بے حواس
غمزدہ کوئل یہ کیسی دکھ بھری آواز ہے — ترے ہر نالے میں تری زندگی کا راز ہے
خانماں برباد نکلا عشق افسونگر تیرا — محشر انگیز تمنا ہے دل مضطر تیرا
ترے دردانگیز نالوں میں نہیں کچھ بھی اثر — کیوں تجھے تڑپا رہی ہے شدتِ دردِ جگر
رکھتا ہے بیتاب کیا شوقِ گوناگوں تجھے — مخلصی دیتا نہیں ہے عشق کا افسوں تجھے
رنگ ماتم کا ہے تجھ پر کس لئے چھایا ہوا — نالہ کرتی ہے تو اڑ جاتا ہے ہوش آیا ہوا
آسماں سنتا نہیں ہے کچھ تری فریاد کو — صبر بھی دیتا نہیں ترے دلِ ناشاد کو
تری ہستی کا ابھی مجھ پر نہیں عقدہ کھلا — کس سے پوچھوں میں تری سرگشتگی کا ماجرا
تو ہے میرا گم شدہ دل یہ تو میں کیونکر کہوں — ہاں کسی بیتاب کا تجھکو دلِ مضطر کہوں
قابلِ عبرت ہے ترا حال دنیا کے لئے — زندگی ہے تلخ تجھ سے ناشکیبا کے لئے
تجھ سے سنا چاہتا ہوں داستانِ دردوغم — پھر سنانا چاہتا ہوں کچھ بیانِ دردوغم
ہے بھرا ترے رگ و ریشے میں دردِ عاشقی — ہے وبالِ دوش تجھکو اب یہ تری زندگی

مشغلہ یوں نالہ و فریاد کا اچھا نہیں
کچھ تو کر سامانِ تسکینِ دلِ اندوہگیں

اقدس (حیدرآبادی)

کوئل کی صدا

پیاری کوئل جو مجھے تیری صدا آتی ہے — بخدا تن سے مری جان نکل جاتی ہے
تیری آواز بہت دل کو مرے بھاتی ہے — کیوں تو بے چین ہے کس کے لئے چلاتی ہے
دلربایانہ ہیں انداز تو دلکش ہے صدا
دل تڑپتا ہے مرا سنکے تری آہ و بکا

کس کی فرقت میں ہوا حال ہے ابتر تیرا — کس پہ آیا ہے بتا سچ دل مضطر تیرا
سنگدل ہے وہ بڑا کون ہے دلبر تیرا — نالہ سنتا ہوں جو ہر وقت میں اکثر تیرا
ماتمی کس لئے پہنا ہے بتا تونے لباس
کس کے غم میں تو رہا کرتی ہے ہر وقت اداس

لب پہ فریاد ہے کیوں کس کے لئے چشم ہے تر — کیوں ترے چاہنے والے کو نہیں تیری خبر
کیوں تجھے چین نہیں مجھکو بتا آٹھ پہر — یاد میں کس کی رہا کرتی ہے تو شام و سحر
تیری آواز ہے پیاری تو تو ہے متوالی
ہجر میں کس کے تری شکل ہوئی ہے کالی

بیوفا ہے وہ بڑا جس نے تجھے رنج دیا — بیکسی پر تری افسوس نہ کچھ رحم کیا
یاد معشوق میں پھرتی ہے یہاں کیوں تنہا — بات کر مجھ سے ذرا میں بھی ہوں ہمراز ترا
سچ ہے دنیا میں کسی کا بھی کوئی یار نہیں
ہیں تو مکار بہت کوئی وفادار نہیں

رحم آیا نہیں مجھ پر بھی مرے قاتل کو — وار پورا نہ کیا چھوڑ گیا بسمل کو
یاد آئی نہ مری بھول کے اس غافل کو — پاس آ رو کے نکالیں گے غبار دل کو
نہ تو ہمدرد ہے میرا نہ کوئی تیرا عزیز
اک خدا کو ہے بقا اور ہے فانی ہر چیز

عزیز حیدرآبادی

(خاکسار خوشتر منگروی مدیر رسالہ ہذا)

مزا پوچھے کوئی زخم خدنگ ناز کا ہم سے
تڑپ کر کہہ رہا ہے طائر قبلہ نما ہم سے

تلا ہے ظلم پر گردوں مقدر ہے خفا ہم سے
پھریں تری نگاہیں کیا زمانہ پھر گیا ہم سے

نہ ہو بدظن نہ رہ برہم غنیمت ہے ہمارا دم
ملینگے چاہنے والے نہ پھر اے بیوفا ہم سے

سنا کر مجھکو کہتے ہیں مخاطب کر کے غیروں کو
نہ رکھے عاشقوں میں کوئی امید وفا ہم سے

ہوا ہے ہم میں انمیں اسطرح سے عہد الفت کا
پھریں اللہ سے گر ہم پھریں اقرار با ہم سے

چھپایا لاکھ تم نے دل میں راز الفت دشمن
تمھاری نیچی نظروں نے مگر سب کہدیا ہم سے

تمھیں سچے ہیں جھوٹے ہی سہی تکرار جانے دو
نہ نکلے گا نتیجہ کوئی بھی اس بحث با ہم سے

بنی ہے جان پر ایسی کہ کچھ بھی بن نہیں پڑتی
جو وہ بگڑے ہوئے ہیں تو قضا بھی ہے خفا ہم سے

ہم اپنے خون دل سے سینچتے رہتے ہیں اے قاتل
نہ کیوں مانوس ہو گلزار مقتل کی فضا ہم سے

بتائے کون کس سے ہم کریں دریافت اے خوشتر
رہا کرتا ہے بدظن کیوں بت کافر ادا ہم سے

جلد ۳ | فہرست مضامین رسالہ زبان بابتہ ماہ جولائی و اگست ۱۹۲۷ء عیسوی | نمبر ۱

تصاویر
(۱) عالیجناب شیخ عبد الخالق صاحب بہادر ولیعہد ریاست منگرول
(۲) امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد دہلوی (۳) جناب سید غلام محی الدین صاحب زور قادری - ایم - اے

نکات

از "ملا رموزی"

جنون، خبط، مالیخولیا، اور، دیوانگی کا مجموعہ اگر دیکھنا ہو تو کسی مضمون نگار یا شاعر کو اُس وقت چھپ کر دیکھو جب وہ مضمون لکھ رہا ہو یا غزل کہہ رہا ہو، یہ جس قدر نامور مضمون نگار دنیا میں آج کل نظر آ رہے ہیں اگر اُن کا نمونہ دیکھنا ہو تو بس ہمیں دیکھ لو اور سمجھ لو کہ اسی طرح مضمون لکھتے ہیں مثلاً اگر خدا نخواستہ آپ ہمیں مضمون لکھتے دیکھ لیں تو آپ کو مضمون نگاری کی عظمت کا اندازہ ہو جائے گا، چنانچہ ہم جس طرح مضمون لکھتے ہیں وہ یوں ہے کہ:-

چلتے، پھرتے، اُٹھتے، بیٹھتے، جاگتے اور سوتے، مضمون کا عنوان سوچتے رہتے ہیں، جب سوچ لیا تو پھر نہایت غرور کے ساتھ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں، پھر وہ جو سادہ کاغذ میز پر رکھ جاتی ہے ادھیں قلم کی نوک سے سیدھا کرتے ہیں، اور لکھنا شروع کر دیتے ہیں، کہ یکایک دماغ معطل ہو جاتا ہے تو ہم آسمان دیکھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں! پھر قلم کو منہ میں داب لیتے ہیں! پھر قلم کو سر پر مارتے ہیں مگر اس سلیقہ سے کہ کوئی سمجھے سر کھجا رہے ہیں۔ پھر یہ مصرعہ گنگناتے ہیں کہ ؎

"وہ جو گھر میں نہیں تو کچھ بھی نہیں"

پھر اس مصرعہ میں سُر پیدا کرتے ہیں، پھر قلم اور میز سے طبلہ کا کام لیتے ہیں اور اس سے اپنی نغمہ سرائی کو باقاعدہ بناتے ہیں پھر الاپتے ہیں، پھر تان لگاتے ہیں کہ مضمون یاد آ جاتا ہے اور پھر مضمون نگاری شروع ہو جاتی ہے، کہ یکایک پھر دماغ .... اب قلم ہاتھ سے پٹک دیتے ہیں اور دونوں پاؤں میز پر دراز کر کے کرسی کو جھولا دیتے ہیں اور وہی مصرعہ پھر پڑھتے ہیں کہ ؎

"وہ جو گھر میں نہیں تو کچھ بھی نہیں"

ی اگر مضمون نہ سوجھا تو چارپائی پر مع قلم دوات لیٹ جاتے ہیں اور مضمون لکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ
ں دماغ پھر .... پھر لیٹے لیٹے

"جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں"

ے ہیں کہ اتنے میں زور شور سے چھینک آتی ہیں مگر ہم لکھے جاتے ہیں، اب لیٹے لیٹے لکھنے سے بدن
ن پسند سستی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہندوستانی حکمران مسلمانوں کی امداد کے لیے لندن
ے انگریزوں کو ہندوستان آنا پڑا اور اب یہی غریب ہندوستانی حکمرانی کے ذمہ دار ہیں۔

ں سستی سے ہم اس طرف سے لیٹ جاتے ہیں مگر لکھے جاتے ہیں پھر اس طرف سے لیٹ جاتے
ہ جاتے ہیں، پھر ایک ہاتھ پھیلاتے ہیں مگر لکھے جاتے ہیں پھر دونوں پاؤں دراز کرتے ہیں
تے ہیں، پھر تکیہ لگا کر اوندھے لیٹ جاتے ہیں مگر لکھے جاتے ہیں، پھر ایک دو جمائیاں لیتے ہیں مگر
ہیں، بارے اب یہاں سے غنودگی کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے مگر لکھے جاتے ہیں، اب غنودگی
لمہ ترقی کرتا ہے مگر لکھے جاتے ہیں اب مضمون کی سطریں ٹیڑھی ہونا شروع ہوتی ہیں مگر لکھے جاتے
لفظوں سے حروف غائب ہونا شروع ہوتے ہیں مگر لکھے جاتے ہیں کہ اتنے میں آواز آتی ہے۔

"آگ سلگے، کب لکڑیاں پھاڑی جائیں گی"

"اور کب روٹی پکیگی"

واز ادن کی ہوتی ہے اور ہم جھنجھلا کر مضمون پھینک کر کلہاڑی سنبھال لیتے ہیں، مضمون لکھنے
ن کے ڈر سے لکڑی پھاڑنا پانی بھرنا، سودا سلف لانا کہئے دماغ کے لئے کس قدر مفید ہے ؟؟؟
مضامین باشفقت "کو مفت طلب کرنا ایڈیٹروں کا ہے نہ "انگریزی مارشل لار"!

ا جون کو لنڈن میں "مادری زبانوں میں تعلیم" کے متعلق ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہندوستانی
ر حیدر آبادی نے ہندوستان میں مادری زبان میں تعلیم دینے پر زور دیا اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ
ی بات لنڈن کانفرنس میں سنی بھی گئی یا نہیں؟ لیکن سوال یہ ہے کیا ہندوستانیوں کی نجات
ہے کہ وہ ایم۔ اے تک کی تعلیم اردو زبان میں حاصل کریں؟

ہمارے خیال میں تو جب تک ہندوستانی ذیل کے امور میں "حق مادری" کو تسلیم نہ کریں گے کچھ ہم
مثلاً وہ تمام ہندوستانیوں کو اپنا پاجامہ بھی "مادری" استعمال کرنا چاہئے اسی طرح علی گڈھ والوں سے
جائے کہ وہ کالج کی زندگی سے نکل کر اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں سے "مادری زبان" ہی
فرمایا کریں، پھر تمام انگریز بھائیوں سے کہدیا جائے کہ وہ ہر ہندوستانی سے "اردو زبان" میں گفتگو کریں
گو ہندوستانی سوراج کے قابل نہیں مگر اردو زبان خوب جانتے ہیں؛

صوبجات متحدہ جو کسی وقت اردو زبان کے لئے مصدر و مرکز کا کام دے چکے ہیں آج مسلما
کی "انگریزی پرستی" کے صدقہ اردو زبان سے تہی دامن نظر آتے ہیں، شلاً یہاں ۱۹۱۳ء میں ہند
زبان کے اخباروں کی تعداد (۵۶) تھی اور اردو زبان کے اخباروں کی تعداد (۷۹) تھی، لیکن تیرا
بعد یعنی ۱۹۲۶ء میں ہندی زبان کے اخباروں کی تعداد (۲۴۶) اور اردو زبان کے اخباروں کی تعداد
(۱۹۶) ہے گویا اس عرصہ میں ہندی اخباروں کی تعداد اردو اخبارات سے بقدر (۵۰) زیادہ ہو گئی
اس سے اندازہ کر لیجئے کہ مسلمانوں کو اپنی زبان سے جسے وہ ملک کی مشترکہ زبان کا درجہ دینا چا
ہیں کہاں تک محبت ہے؟ گر ہم یہی کہیں گے کہ یہ سب نتیجہ ہے تپلون پہننے اور اخبار۔ پانیر۔ خرید

اخباروں میں جس طرح ایک طبقہ۔ اخبار میں ہوتا ہے اسی طرح رسالوں میں ایک طبقہ رسالہ
کرتا ہے اگر اب ایک طبقہ "رسالہ خوار" پیدا ہوا ہے، ادہر رسالوں میں جب سے "خاص نمبر
کی گھوڑ دوڑ شروع ہوئی ہے اس۔ رسالہ خوار۔ طبقہ کا زور بہت بڑھ گیا ہے، آئے دن رسا
ایڈیٹر رویا کرتے ہیں کہ ہمارے رسالے چوری جاتے رہے، اتفاق سے اس مرتبہ ہم نے ایک ڈ
میں دیکھا کہ ایک رسالہ کا خاص نمبر بیٹھے پڑھ رہے تھے، بعد ملاحظہ سے گوند سے اسی طرح بند
رکھدیا اور دوسرا رسالہ کھولا یہ ڈاک خانے کے "ڈلیوری کلرک" تھے جو اخباروں اور رسالو
چٹیں پھاڑ کر ملاحظہ فرماتے تھے اور پھر بند کر کے ڈاکیہ کو تقسیم کے لئے دیتے تھے

ہم نے محسوس کیا کہ آخر ڈاک خانہ والے رسالے کے خاص نمبروں پر اس قدر کیوں فریفتہ

سالے خاص نمبروں کے صفحۂ اول کو اس قدر رنگین بناتے ہیں کہ وہ نقش و نگار کا خاصا ڈرائنگ ماسٹر
ہے اس لئے ہم تمام رسالوں کے ایڈیٹروں کو چوری سے محفوظ رہنے کی یہ تدبیر بتلاتے ہیں کہ وہ اپنے
نبروں کے صفحۂ اول کو رنگین بنانے کی جگہ سیاہ رکھا کریں اور اس پر بجائے رسالہ کے نام لکھنے کے
ریں۔ دعا گنج العرش فارسی ہے انشاء اللہ مسلمان ڈاک خانے والے اس پر سوائے بوسہ دینے کے
نہ ڈالیں گے اور ڈاکیہ بھی اُسے سینہ سے لگائے ہوئے سیدھا خریدار کے گھر پہونچا دیا کرے گا،
ہے ڈاک خانوں کے ہندو ملازم سو وہ بھی لفظ فارسی، کی وجہ سے اس رسالہ کو ہاتھ نہ لگائیں گے،
ے رسالہ۔ زبان۔ کا خاص نمبر اسی ترکیب سے شائع ہو۔

اطلاع

زبان کی چند مکمل جلدیں دفتر میں موجود ہیں جن صاحب کو ضرورت ہو فوراً بیعہ بھیجکر ایک سال کی دو مکمل جلدیں طلب فرمائیں۔ موقع ہاتھ سے نکل جانے کے بعد یہ علمی جواہر پارے پھر کہیں دستیاب نہ ہوں گے۔

منیجر "زبان"
منگرول (کاٹھیاواڑ)

قصیدہ در تہنیت تشریف آوری از سیاحت مصر و یورپ حضور لامع النور شیخ عبدالخالق صاحب بہادر ولیعہد ریاست مانگرول دام اقبالہٗ و اجلالہٗ

از نتیجۂ فکر احقر خوشتر منگرولی (مدیر رسالہ ہٰذا)

طرب انگیز ہے کیا یہ شور بحر بے پایاں
مچا تا ہے خوشی میں کونسی یہ اسقدر طوفاں

مسرت ساکنان بحر کو کیوں کر نہ ہو حاصل
تلاطم میں تموج میں تفرج خیز ہے طغیاں

مسرت کی ہیں سطح بحر پہ لہریں رواں ہر سو
مناتی ہیں اچھل کر مچھلیاں کیوں جوش میں خوشیاں

نہیں پھولے سماتے کیوں حباب بحر جامہ میں
خوشی کے عالم قلزم میں کیوں ہر سمت ہیں سامان

سمندر کیا لئے جاتا ہے اور لاتا ہے خوشخبری
یہ کیسا آج جزر و مد میں یارب راز ہے پنہاں

یہ موجیں کس کے آمد کی خبر لائی ہیں ساحل پر
صدف کس کے نچھاور کو ہے لائی گوہر غلطاں

ہے آیا کون بحری راہ سے بحر کرم ایسا
کہ جس پر بحر احمر اور ہے بحر عرب نازاں

نوید جانفزا لائی ہے باد شرطہ ساحل پر
وہ آتے ہیں جو ہیں دریا دلی میں حاتم دوراں

وہی بحر سخا در ثمیں درّ گوہر یکتا
ولیعہد بہادر شیخ عبدالخالق ذیشاں

معہ الخیر آج آئے مصر و یورپ کی سیاحت سے
معہ فرزند و بیگم کیا بہ لطف خالق یزداں

انہیں کے آج استقبال کی تقریب جشن میں
بنا ہے گلشن منگرول رشک گلشن رضواں

مضامیں کے بہا وہ جودت طبع رواں دریا
کہ سن کر پانی پانی شرم سے ہوں عرفی و سحباں

خطا بیہ پڑھوں وہ مطلع توصیف اے خوشتر
کہ جس کو سن کے ارباب سخن ہوں شُشدر و حیراں

ٌ یہ قصیدہ ممدوح گرامی کے سفر یورپ کی تشریف بری کی تقریب میں جلوہ گر ہونے اور عرصہ ہوا جو ابتدا لکھا تھا اس وقت لکھ [illegible]

مطلع

تو اے سیاحِ یورپ شیخ عبدالخالق ذیشاں
وحیدِ عصر، فیاضِ زماں ہے حاتمِ دوراں

جہانگیرِ زماں ہے تو جو عہدِ اکبری ہے یہ
ولیعہدی تجھے زیبا ہے شاہی ہے تجھی شایاں

امورِ مملکت مشکل سے مشکل سہل کر دے تو
ترے آگے سیاسی عقدہ دشوار ہے آساں

نہنگ و شیر بھی تیرے مطیعِ حکم رہتے ہیں
ترا اقلیم بحر و بر پہ ہے حکم و عمل یکساں

تو چاہے تو رواں ہو فلسِ ماہی پر ترا سکّہ
خراجِ بحر چاہے تو صدف دی گوہرِ غلطاں

ہم آفاق میں ہمسر کوئی تیرا نہیں ملتا
ہے اپنا آپ ہی ثانی تو زیرِ گنبدِ گرداں

رعایا پروری و عدل کوشی دین ہے تیرا
مساوات و رواداری برتنا ہے ترا ایماں

سخا سے رحم سے انصاف سے اخلاق سے اپنے
ہر اک کو کر لیا ہے تو نے اپنا بندۂ احساں

نہیں ہندو مسلماں میں کوئی تخصیص اعلیٰ کی
نگاہِ عدل بیں میں ہے رعایا سب تجھے یکساں

ہے طرزِ حکمرانی در رعایا پروری ایسی
ہر اک کو فخر ہے ہونے کا تیرا طابعِ فرماں

خلیق و با مروت ہے شفیق و با محبت ہے
حلیم و معدلت گستر ہے تو ہی اے شہِ ذیشاں

دُر افشاں ہو اگر تو بزم میں اے رونقِ محفل
فصیحانِ جہاں بھی ہوں فصاحت پر تری حیراں

اگر تیور بدل کر رزم میں شمشیر زن ہو تو
شجاعانِ جہاں کے ترے آگے ہوش ہوں پرّاں

شجاعت اور ہمت کا تری وہ مان لیں لوہا
اگر ہوں آج گیو و گودرز و سام و رستم و دستاں

دکھا کر تو نے بحرِ فکر میں غواصیاں خوشتر
کئے حاصل ہیں مدح و وصف کے کیا کیا درِ غلطاں

بس اب کر دے دعا پر مختصر تو اس قصیدے کو
ہوا وصفِ شہِ عالی گہر میں خوب دُر افشاں

رہے بیخوف تری کشتیِ عمرِ رواں جاری (د) روانی بحر میں جب تک رہے اور موج میں طوفاں

نہ ڈر باد مخالف کا رہے اس کو نہ طوفاں کا
نہ بیم و خوف گرداب بلا سے بحرِ بے پایاں

ترے دشمن جو ہوں غرقاب ہوں بحرِ مذلت میں
ترے احباب ہوں تاباں مثالِ گوہرِ تاباں

تری جو آرزوئیں ہوں خدا پوری کرے ساری
ترے بر لائے سارے خالقِ اکبر دلی ارماں

رہے پھولا پھلا دائم چمن تیری مرادوں کا
رہے اس گلشنِ عالم میں تو مثلِ گُلِ خنداں

دعا تیرے بھی خواہوں کی ہر دل سے یہی ہر دم
رہے تا حشر تو با خیر و خوبی خرم و شاداں

جذباتِ آثر

(جناب ولایت حسین خاں صاحب آثر رامپوری)

پھر وہی خواب پریشاں نظر آتا ہے مجھے
پھر وہی حشر کا ساماں نظر آتا ہے مجھے

سن رہا ہوں وہ عیادت کیلئے آئیں گے
دردِ دل قابلِ درماں نظر آتا ہے مجھے

ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ اب وحشت میں
ہاتھ سے دور گریباں نظر آتا ہے مجھے

خیر ہے اے دلِ ناشاد نصیب اعدا
کچھ ترا حال پریشاں نظر آتا ہے مجھے

کہدیا کس سے یہ احوالِ پریشاں اپنا
کون ہے سر بگریباں نظر آتا ہے مجھے

چشم امید رکھوں اور جہاں میں کس سے
دل ہی جب جاں کا خواہاں نظر آتا ہے مجھے

پھرنے والے ہیں خدا چاہے تو پھر دن اپنے
پھر وہی عیش کا ساماں نظر آتا ہے مجھے

سوزِ الفت کی بدولت یہ ہوا ہے عالم
دل کا ہر داغ گلستاں نظر آتا ہے مجھے

سختیاں راہِ محبت میں اٹھائیں ایسی
کارِ دشوار بھی آساں نظر آتا ہے مجھے

چشم و دل میں جو سمایا ہے اثرؔ جلوۂ یار
کبھی پیدا کبھی پنہاں نظر آتا ہے مجھے

صفحۂ ادارت

خدا خدا کرکے زبان نے اپنی عمر کا ایک سال ختم کردیا - آج دوسرے سال میں ہزاروں امیدوں کو لے کر داخل ہو رہا ہے - خدا کرے کہ گذشتہ سال کی طرح سال رواں بھی اس کے لئے ویسا ہی منحوس و مہلک اور بھاری ثابت نہ ہو - ہمارا ہی جی جانتا ہے کہ کس طرح اس نے سال گذشتہ کو مر مر کے اور لمبی لمبی سانسیں لیکر اور کن کن مصائب کا سامنا کرکے ختم کیا ہے باوجود اس تجربہ اور معقول مالی نقصانات کے ہم اس کو پھر قائم رکھنے سعی اور زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں - اگرچہ ہمیں اس بات کا پہلے ہی سے کھٹکا تھا کہ "کہیں ہماری یہ سعی سعی لاحاصل ثابت نہ ہو" آخر وہی ہوا اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک نے ہماری اس درخواست پر کوئی توجہ نہیں کی ہماری سعی کی کوئی داد نہیں دی اور ہماری جان کاہیوں کا کوئی صلہ نہیں دیا یہی وجہ ہے کہ آج اس کی زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور جینے کی کوئی امید نظر نہیں آئی اور ظاہرا اس کی حیات سے مایوسی ہوچلی ہے مگر دنیا بہ امید قائم کے پرانے مقولے پر عمل پیرا ہوکر ہم اس کے قیام و ثبات کے لئے ایک آخری جدوجہد کر رہے ہیں اگر ہم اس میں بھی ناکام رہے تو ملک و قوم کے جمود و بدمذاقی کا ماتم کرکے **زبان** کو ہمیشہ کے لئے **بند** کردیں گے -

ہم بارہا اس امر کا اظہار کرچکے ہیں کہ ہم نے زبان کا اجرا کسی خاص سرمایہ سے نہیں کیا محض اپنائے ملک کی قدردانی کے بھروسے پر اس کو جاری کیا تھا اور یہ بھی علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ اس میں جلب منفعت کا کوئی شائبہ ہے نہ ذاتی منافع مقصود ہے لیکن افسوس کہ ہماری توقعات کے خلاف ملک نے انتہائی غفلت شعاری اور خود فراموشی سے کام لیا ؏

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

اب اگر ہم زبان کے بند ہونے کے اصلی سبب میں اپنوں کا شکوہ کرتے ہوئے یہ کہیں تو غالبا کسی طرح بیجا نہ ہوگا ؎

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

ہم حسب وعدہ قارئین زبان کی خدمت میں یہ خاص نمبر جو بیش بہا علمی جواہر پاروں سے مالامال ہے اور جس کی تیاری میں ہم کو اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ صرفہ آیا ہے اس امید پر پیش کرتے ہیں کہ شاید ہمارے گذشتہ نقصانات کی تلافی ہوجائے ورنہ گزشتہ نقصانات کے ساتھ یہ مزید نقصان تو ہے ہی ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوتے ہیں اور ناظرین کو ان کے فرض "توسیع اشاعت" کی جس کا ہم گذشتہ نمبر میں اعلان کرچکے ہیں یاددہانی کرتے ہیں۔ دیکھیں اب بھی ہماری اس حقیر کوشش کی داد دی جاتی ہے یا نہیں ؎

دل دے کے ان سے دادِ وفا مانگتا ہوں میں
ہے دیکھنے کی چیز "یہ حسنِ طلب" میرا

اگر حسب درخواست ہر خریدار نے تین تین چار چار خریدار ہم پہنچا دے تو تو انشاءاللہ زبان پھر اپنی شیریں کلامی سے نہایت پابندی کے ساتھ ہر ماہ اپنے قدر دانوں کی خدمت بجالانے کے قابل ہوجائیگا ورنہ درصورت عدم توجہ وہی ہوگا جو ہم کہہ چکے ہیں یعنی رسالہ بند کردیا جائے گا اور **وی۔ پی** وصول کرنے والوں سے اس نمبر کی قیمت وصول کرکے ان کی بقیہ رقم واپس کردی جائے گی ؎

آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

آہ! دنیا، پرانقلاب دنیا!! اور دورنگی دنیا کی یہ کیسی نیرنگی ہے کہ ہم گذشتہ اسی ماہ میں **زبان** کے اجرا کا بڑی دھوم سے اور بڑی بڑی امیدوں کے ساتھ نہایت شاندار الفاظ میں **افتتاحیہ** لکھ رہے تھے اور آج پورے ایک سال کے بعد اسی ماہ میں ہم نہایت حسرت و یاس سے اس کا اختتامیہ لکھ رہے ہیں، الوداع لکھ رہے ہیں وہ اگر اس کی تولید کا خوش آیند نغمہ تھا تو یہ اس کی جوانا مرگی کا پر درد مرثیہ ہے آہ! ؎

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بے کھلے مرجھا گئے

اس خوف سے کہ مبادا قدردانانِ زبان نے ہماری درخواست پر بدستور بے پروائی برتی اور

شان بے نیازی قائم رکھی تو ہم آیندہ نمبر نہ شائع کرسکیں گے اس لئے یہاں ہم اپنے ان تمام قلمی معاونین جنھوں نے ہماری استدعا پر اپنے اپنے افادات سے زبان نوازی فرمائی ہے، اس اجنبی راہ میں خضر راہ بن کر رہنمائی کی ہے، ہمارا ساتھ دیا ہے اور گاہ گاہ ہمارا ہاتھ بٹایا ہے دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے اس تصدیعہ کی معافی چاہتے ہیں اور خواستگار عفو ہیں امید ہے کہ وہ ہمیں ضرور معاف فرمائیں گے۔

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

تصاویر۔ اس خاص نمبر کو جن خاص تصاویر سے مزین کیا گیا ہے ان میں سے پہلی تصویر ہمارے مربی و محسن کرم گستر و معارف قدردان علم و ہنر حضور **شیخ عبد الخالق** صاحب صدیقی ولیعہد بہادر ریاست منگرول کی ہے، ہمارے اس جواں بخت و جواں سال ولیعہد کو مبدء فیاض نے نہ صرف ملکی حکمرانی عطا فرمائی ہے بلکہ ایسی غیر معمولی ذہانت و قابلیت کا مالک بھی بنایا ہے جس سے وہ ہمارے دلوں پر حکومت اور ہمارے خیالات پر حکمرانی کرتا ہے جہاں یہ اہم ملکی امور کے سلجھانے اور بڑے بڑے سیاسی عقدوں کو آسانی سے حل کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے وہاں قوم کی بہبودی و فلاح اور ملک کی اصلاحی تدابیر بھی اسی سہولت سے عمل میں لانے کی قابلیت رکھتا ہے جس کو دیکھ کر عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آدمی ایک ہی دفعہ کی ملاقات میں اس کے علوی خیال اور حسن اخلاق کا معترف ہو جاتا ہے۔

غرض کہ آپ کو قدرت کے فیاض ہاتھوں نے ایسا ہی دل و دماغ عطا فرمایا ہے جیسا ایک منصف رئیس کا ہونا چاہیئے۔ پہلو میں ہمدرد دل اور دل میں رحم و کرم اور ملک و ابنائے جنس کی ہمدردی اور مذہبی جوش اسی قدر موجود ہے جس قدر ایک سچے مسلمان کے دل میں ہوتا ہے ان خوبیوں کے ساتھ آپ حسن سیرت و اخلاق کا بہترین نمونہ اور انکسار و تواضع کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔

باوجود ریاست کے کاراہم کے آپ کا علمی ذوق بھی قابل داد ہے۔ اردو ادبیات سے خاصہ شغف ہے خصوصاً مرثیہ کے ادبیات سے بڑی دلچسپی ہے۔ مرثیہ اس ڈھنگ سے پڑھتے ہیں کہ رزم و بزم کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں اور سامعین پر ایک وجدانی نقشہ طاری فرما دیتے ہیں۔ غرض آپ کی ذات کاٹھیاواڑ کے لئے مایۂ نازش ہے۔

دوسری تصویر امام الہند مولانا ابوالکلام صاحب آزاد دہلوی ایڈیٹر الہلال کی ہے جو ہمیں اپنے کرم فرما اور موصوف الصدر کے دوست جناب رضا الحق صاحب عباسی پرائیویٹ سیکریٹری ہیز آف خیر پور (سندھ) سے موصول ہوئی ہے جس کے لئے ہم عباسی صاحب کے ممنون ہیں۔

اس بات کا بہت کم اصحاب کو علم ہوگا کہ ہم جس علامہ محترم کے عالم شباب کی یہ تصویر زیب زبان کرتے ہیں اور جو آج ہمیں صحیح مسلک پر چلنے کی تعلیم، ہمارے اسلاف کے اصول پر چلنے کی ہدایت، ہمارے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی، اور ہم میں مذہبی۔قومی۔اور سیاسی روح پھونکنے کی قابل قدر جدوجہد کر رہا ہے اور جس کے دل میں مذہبی جوش اور قومی ہمدردی بدرجہ اتم موجود ہے اور جو الہلال ایسے مؤقر اور شاندار اخبار کو آج نہایت قابلیت سے ایڈٹ کر رہا ہے وہی آج سے ۲۵ سال قبل عین عالم شباب میں بھی یہی دل و دماغ رکھتا تھا دل میں یہی درد اور خیال میں یہی وسعت رکھتا اور "لسان الصدق" جیسے خالص علمی رسالہ کو ایڈٹ کرتا تھا جن میں قوم کی بیداری کی بھی تجاویز پیش کرتا تھا جن کو آج ہم اس کی ہر تقریر اور ہر تحریر میں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس وقت بھی جاننے والے اُسی عمق نظر سے دیکھتے تھے۔ اسی لئے تصویر کی مناسبت سے ہم نے مضمون "مسلمانوں کا ذخیرہ علوم فنون" بھی موصوف کے عالم شباب ہی کے زمانہ کا بہم پہنچایا ہے یقین ہے کہ ناظرین قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

تیسری تصویر زمانہ حاضرہ کے نوجوان اور ہونہار ادیب (عازم انگلستان) ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب زورؔ قادری ایم۔ اے کی ہے جس کو ہم نہایت فخر کے ساتھ پیش کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں آپ حال ہی میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ایم۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں جس کی ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

موصوف کا نام اگرچہ "روح تنقید" کے ذریعہ علمی دنیا میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا لیکن دنیا علم و ادب کو آپ سے اس سے کہیں بہتر و افضل تصانیف کی توقع ہے جو امید ہے کہ بہت جلد اُر کے علمی خزانہ میں زبردست اضافہ ثابت ہونگی۔

دُعا ہے کہ موصوف جس غرض سے ولایت کا سفر کرتے ہیں اس میں کامیابی کے ساتھ فتحمند ہوں۔

مضامین ۔ اس نمبر میں جتنے مضامین شائع کئے جاتے ہیں ان سب میں زبان کا اصل معیار قائم ہے ہم چاہتے ہیں کہ زبان کا ہر نمبر ایسے ہی مضامین سے آراستہ ہو کر قارئین کرام کی معلومات کا باعث ہوا کرے اور یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے اگر زبان کے مقالہ نگار اس طرف توجہ فرمائیں۔

سیرت رسول اللہؐ کی تمہید یہ مضمون ہمارے مکرم پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم۔اے کی اسی نام کی زیر تالیف کتاب کی تمہید کا کچھ حصہ ہے جو موصوف نے خاص زبان کے لئے عنایت فرمایا ہے جس کے لئے ہم موصوف کے بیحد شکر گزار ہیں۔

کوئی ۱۹۔۲۰ برس کا عرصہ ہوا موصوف نے "تذکرۃ المصطفےٰ" نام ایک مختصر سی کتاب اسی موضوع پر لکھی تھی لیکن "سیرت رسول اللہ" (مرہٹی انسائیکلو پیڈیا کی ان غلط تحریرات نے جو ہمارے رسول اللہ صلعم کے خلاف لکھی گئی تھیں جس کا ذکر ہم گذشتہ اگست ۲۶ء کے زبان میں کر چکے ہیں موصوف کو اس اہم خدمت کے انجام دینے کے لئے مجبور کیا ہے) جیسا کہ اس کی تمہید ہی سے معلوم ہوتا ہے مشرق و مغرب کے قدیم و جدید ماخذوں سے جدید طرز پر مرتب کی جا رہی ہے جو بلاشبہ اپنی طرز میں انوکھی اور زار دو میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔ موصوف یہ بھی خوشخبری دیتے ہیں کہ اب تک دو سو صفحات سے زاید لکھے جا چکے ہیں۔

"**مسلمانوں کا ذخیرہ علوم و فنون**" اس مضمون کی نسبت اسی قدر کہنا کافی ہے کہ یہ علامہ ابوالکلام آزاد دہلوی ایڈیٹر الہلال کے خامہ معجز رقم سے نکلا ہوا ہے اور اس پر علامہ شبلی مرحوم کا نوٹ بطور مہر ثبت ہے "علمائے ماہرین السنہ" یہ مضمون ملک کے مشہور و مایہ ناز مضمون نگار و مصنف مولانا عبد السلام صاحب ندوی کے زور قلم کا نتیجہ ہے جو ہمیں اپنے مکرم جناب سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر مہا ودیالے احمد آباد کی معرفت موصول ہوا ہے جسکو شکریہ کے ساتھ درج رسالہ کرتے ہوئے امیدر کھتے ہیں کہ اسی طرح مولانا اے محترم زبان نوازی سے ہمیں سرفراز فرمایا کریں گے۔

"**دیو دیوی**" یہ تاریخی مضمون ہمارے خاص کرمفرما اور زبان کے زبردست قلمی معاون مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر مہا ودیالے (احمد آباد) کی دماغ سوزی کا نتیجہ ہے جو ہمیں زبان کے خاص نمبر کے لئے عطا فرمایا ہے، اگرچہ ان کے نتائج افکار کا سب سے زیادہ مستحق "معارف" (اعظم گڈھ) ہے پھر بھی وہ ہمیں ہر نمبر کے لئے کچھ نہ کچھ مرحمت فرمایا ہی کرتے ہیں جس کے لئے ہم

موصوف کا جس قدر بھی شکریہ ادا کریں کم ہے ۔ حق تو یہ ہے کہ چونکہ "دیول دیوی" کو گجرات سے ایک خاص تعلق ہے اس بنا پر اس مضمون کے سب سے زیادہ ہمیں حق دار ہیں امید ہے کہ موصوف اس قبیل کے مضامین سے زبان کے حقوق کی حق تلفی نہ فرمایا کریں گے ۔

"اردو کے پیغام گو شاعر" ہمارے خاص کرم مولانا ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب زور ایم ۔ اے (جامعہ عثمانیہ) کا یہ دوسرا معرکۃ الآرا مضمون ہے جس کو ہم زبان میں شائع کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں موصوف نے اس مضمون میں اردو کے ان شعرا کا حال جنھوں نے قوم کو بیداری کا پیغام دیا ہے نہایت قابلیت سے ناقدانہ رنگ میں لکھا ہے موصوف کو اس رنگ میں جو ید طولیٰ حاصل ہے "روح تنقید" اس پر دال ہے زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں ہے ۔

"نفسیات اسباب آرائش" اس نئے موضوع پر جناب سید عابد علی صاحب عابد بی ۔ اے ال ۔ ال ۔ بی نے قلم اٹھایا ہے اگرچہ مختصر ہے تاہم ایک حد تک کامیابی کے ساتھ اس پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔

گجرات کی ایک قدیم عربی تاریخ اور جالینوس والے مضامین مکرم حضرت زور صاحب کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں جنھیں شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے ہم معزز مقالہ نگاروں سے توقع رکھتے ہیں کہ آیندہ بھی وہ اپنے افادات سے زبان کو مستفید فرمایا کریں گے ۔

"شوہر کے نام" جو خط شائع کیا جاتا ہے وہ ہمیں محترمہ جناب ہمشیرہ صاحبہ مطلب حسین صاحب عالی لکھنوی نے عنایت فرمایا ہے جس کے لئے ہم محترمہ موصوفہ کے شکور ہیں ۔ اس مضمون میں پردے کی پامال بحث کو نہایت قابلیت سے لکھ کر اس میں جان ڈال دی ہے موصوفہ نے بے پردگی کی خرابیوں کو ایسے مدلل طریق پر بیان فرمایا ہے کہ ممکن نہیں پردے کے مخالف ان حقایق صادقہ سے انکار کرنے کی ہمت کرسکیں ہاں ہٹ دھرمی کی اور بات ہے ۔

"اقوال زرین" ہمارے کرم دوست جناب حافظ امام الدین صاحب امام اکبرآبادی نے اپنے خاص رنگ میں خوب لکھا ہے بھلا "زلال در و دوابہ" والا مضمون بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت رکھتا ہے ہاں "مصور فطرت" کے ہم قائل ہیں جس میں ادب عالیہ کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا گیا ہے ۔

"لازوال شاعر" شوکت صاحب تھانوی کے ہم مشکور ہیں کہ آپ نے ازرہ زبان نوازی اپنا

ایک ادبی فسانہ زبان کو بھی عطا فرمایا امید ہے کہ آیندہ بھی ہمیں شکریہ کا موقع دیا جائے گا۔

حصّہ نظم میں بھی اس مرتبہ سب کی سب نظمیں قابل داد ہیں کس کس کی تعریف کی جائے ہر نظم کا ہر ہر شعر نیر و نشتر کا حکم رکھتا ہے حضرت محوی لکھنوی خالد بنگالی برق دہلوی اور قیصر صاحب کے ہم بہت ممنون ہیں کہ اونھوں نے ہماری استدعا پر اس خاص نمبر کے لئے اپنا اپنا کلام مرحمت فرمایا اسی طرح غزلیات عنایت فرمانے والے تمام شعرا کے بھی خاص طور پر شکر گزار ہیں۔

اس مرتبہ "نکات" میں ہمارے دوست ملّا رموزی صاحب نے بہت "پھیکا پکوان" پیش کیا ہے اس کا سبب شاید "اونچی دوکان" ہو جانے کا ہے۔

افسوس ہے کہ ہم اس نمبر میں کتب موصولہ پر ریویو نہیں کرسکے اور بعض مضامین بھی شائع ہونے سے رہ گئے ہیں بہ شرط زندگی انشاراللہ آیندہ نمبر میں اس کمی کو پورا کر دیں گے۔

خوشتر (منگرولی)
مدیر

گذشتہ مئی و جون کے مشترکہ نمبر میں "ایک قدیم دستاویز اور اہم تاریخی انکشاف" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اس کے خلاف ہمارے پاس ایک مضمون آیا ہے جسکو ہم بجائے تمام و کمال درج کردینے کے یہاں صرف اُسی حصّہ کو نقل کردینا مناسب خیال کرتے ہیں جس میں مضمون مذکورہ بالا کی چند موٹی اور فاحش غلطیاں تبلائی گئی ہیں امید ہے کہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر مہادیالے (احمد آباد) ان وقیع اعتراضات کا معقول جواب عنایت فرمائیں گے اور اپنی زیر تالیف تاریخ گجرات میں ان واقعات کو پوری تحقیق و تدقیق سے لکھیں گے تاکہ آیندہ کسی اعتراض کی گنجایش نہ رہنے پائے۔

گذشتہ مضمون میں حسب ذیل امور تنقیح طلب اور قابل اعتراض ہیں جن کو نمبروار درج کرکے بالترتیب جوابات دیئے گئے ہیں۔ وھو ہٰذا

"ایڈیٹر"

(الف) محاصرہ و فتح نگرکوٹ کے بعد چھ ماہ میں سندھ پہنچنا۔
(ب) انہی دنوں یعنی ۷۷۰ھ میں ایک فوج منگلور کو راجہ کنور پال کی تنبیہ کے لئے جا رہی تھی۔
(ج) اس تحریر سے معلوم ہوا کہ سید سکندرؒ دہلی ہو کر خشکی کے راستہ سے ...... تا ختم
نوٹ اس میں امور ذیل تنقیح طلب ہیں۔
(۱) "فوج منگلور کو کنور پال کی تنبیہ کے لئے جا رہی تھی"
(۲) "آپ بھی بطور والنٹیر کے شریک ہو گئے"۔
(۳) "مریدوں کا مجمع بھی تقلیداً شریک ہو گیا"۔
(۴) "اس جنگ کا کسی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں"
(۵) "مگر جامع مسجد کے کتبہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے"۔
(۶) "منگلور کے عوام" سے کیا مراد ہے"۔
(۷) "آپ بہ بہانہ بارات شادی مع مسلح سپاہیوں کے ڈولہ میں بیٹھ کر قلعہ میں نہیں پہنچ گئے"
(۸) "بلند پایہ بزرگوں کی ذات ایسے مکروہ اسباب دنیاوی سے مبرا ہوتی ہے"۔
(۹) "صحیح یہ ہے کہ مرہٹوں کے عہد حکومت میں سادات منگلور پر فریب طریقہ سے مرہٹوں کو نکال کر خود قابض ہو گئے تھے"۔
(۱۰) "جیسا کہ دیوان رنچھوڑجی کی تاریخ سورٹھ میں مفصلاً موجود ہے"۔

جوابات

(الف) یہ امر مستبعد نہیں اس لئے کہ نگرکوٹ خود ملک سندھ میں واقع ہے دیکھو کتب جغرافیہ قدیم۔
(ب)، (ج) نمبر (۱) حقیقت یہ ہے کہ فوج کنور پال کی تنبیہ کے لئے اتفاقیہ نہیں جا رہی تھی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تاریخوں میں ذکر ہوتا۔ بلکہ حضرت جہانگشتؒ کی فرمایش سے سلطان فیروز شاہ نے یہ فوج خاص طور پر آپ کی مدد کے لئے تیار کی تھی۔
(۲) آپ بطور ایک مجاہد کے شریک نہیں ہو گئے تھے۔ بلکہ آپ ہی عسکر یا امیر الجیش تھے اور ماتحت افسر عزیز الدین کی باقاعدہ فوج آپکی زیر فرمان۔ جس طرح بادشاہ حقیقتاً بادشاہ ہے اور سپہ سالار اس کا نوکر۔

(۳) مریدوں کا مجمع بھی تقلیداً شامل نہیں ہوا تھا بلکہ اصالتاً لشکر مجاہدین ہی تھا اور "عز الدین کا
دستہ آپ کی کمک۔

واقعہ یہ ہے کہ حضور نبوی کے حسب ارشاد حضرت جہانگشت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مریدین کے ایک جم غفیر کو آپکی
میں دیا اور فیروز کی باقاعدہ فوج کا ایک حصہ بطور کمک براہ خشکی روانہ ہوا۔ آپ کے ہمراہ وہ تبرکات بھی تھے
مخدوم کو جہاں گردی میں ملے تھے اور صرف آپ کو حسب الامر اعطا ہوئے تھے۔ آپ معہ لشکر مجاہدین
ساحل پر اُترے علی الصباح محافہ وار بیل گاڑیوں میں سوار ہو کر دیل واو کے رستے شہر کے غربی
سے برات کے بہانہ شہر میں داخل ہوئے۔ دروازے کے پہرے دار کو شک گذرا اس نے ایک
برچھی گھونپ دی وہ حضرت ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ کے سینے سے پار ہوگئی آپ نے وہیں جام شہادت نوش
اسی جگہ مدفون ہیں۔ معاً مجاہدین تکبیریں پڑھتے ہوئے تلواریں سونت کر گاڑیوں میں سے کود پڑے
تے بڑھتے راجہ کے محل تک پہنچے۔ راجہ مارا گیا۔ مستورات حسب دستور راجپوتان قلعہ کے شمال مغربی
ہی بہ سنجن شاہ کا کوٹھا میں بند ہو کر ستی ہوگئیں۔ شہر پر مجاہدین کا قبضہ ہوگیا مگر راجہ کا بقیۃ السیف
مع امرار شہر کے بڑے مندر میں (جو اب جامع مسجد ہے) پناہ گزین ہوگیا اور کمک کا انتظار کرنے
کے تیسرے روز عز الدین کا لشکر بھی آگیا اور مندر پر متحدہ حملہ ہوا۔ سخت گھمسان کی لڑائی ہوئی
لشکر بالکل تباہ ہوگیا مسلمان بھی بڑی تعداد میں شہید ہوئے جو وہیں مندر کے شرقی دروازے
والی باولی میں (جو عرصہ سے پاٹ دی گئی ہے) دفن کئے گئے۔ اسی وجہ سے اس جگہ کا نام
شہیداں" اب تک چلا آتا ہے۔

حسب الامر حضرت مخدوم مع بقیہ مجاہدین منگلور ہی میں اقامت گزیں ہوئے شہر کی حکومت شاہی
کے حوالہ کی اور آپ حسب دستور اُچھ خانقاہ قائم کرکے ریاضات وارشاد میں مصروف ہوئے
متوکلین کے لنگر کے لئے ایک گاؤں مسمیٰ بہ دیول پور حال مخدوم پور منظور فرمایا۔ یہ روایت حضرت
کی اباً عن جدٍ مسلسل ومستند ہے۔ جو بالکل اسی طرح محفوظ چلی آتی ہے جس طرح تبرکات ورسوم اور
لقہ روایات اور اس مسلسل روایت کے بعض بعض اہم فقرات کی تصدیق سنگی کتبات اور رقعہ جات
نجات شاہی وکتب تاریخ وطریقت سے بھی ہوتی ہے مثلاً مرقعہ مصورہ محولہ رسالہ ہٰذا میں دیکھو فقرہ
ملوث قصبہ منگلور برحکم حوالت بندگی قطب اقطاب عالم قدس اللہ سرہٗ العزیز سید السادات سید سکندر

مرحوم اختیار کردہ اند وقصبہ مذکور خاصہ اسلام نصب کردہ حضرت قطب اقطاب عالم ہند گی مخدوم جہانیہ
قدس اللہ روحہ بعد الاستخارہ والاشارہ سید السادات سید سکندر مسعود حسینی در شہر سورٹھ نام زد کردہ
دسکونت قصبہ مذکور فرمودہ اند ودرآں وقت در شہر مذکور ہمہ جا کفر بود وسید السادات چنانچہ فر...
بود سر انجام رسانیدہ اند"

ہمارے ہر سہ دعاوی مذکورہ اس فقرہ سے اور خصوصاً خط کشیدہ جملوں سے بالکل واضح طور پر
ہیں جن میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔ ولی الاشارۃ و اشارۃ الی البشارۃ و یعرفہا اھلہا۔

(۴) کیا دنیا بھر کی موجودہ تاریخیں دیکھ لی گئی ہیں؟ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ بہت تاریخوں میں اس
ذکر ہوا اور وہ تاریخیں حوادث کی نذر ہو گئی ہوں جس طرح لاکھوں کتابیں ملکی انقلابات میں تلف ہو گ
اور ہو رہی ہیں۔ کسی تاریخ میں ذکر نہ ہونے سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ یہ واقعہ گذرا ہی نہیں کیا ساری
کے تمام چھوٹے بڑے واقعات بالاستیعاب تاریخوں میں منضبط ہیں۔ ایسے چھوٹے واقعات جن میں ط
کے ڈیڑھ دو ہزار سپاہی" معروف پیکار ہوئے ہوں تاریخوں میں کہاں آیا کرتے ہیں الا ماشا
اور یہ اگر صحیح بھی ہو تو کیا حرج ہے جبکہ

(۵) "جامع مسجد کے سنگی کتبہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے" کیا یہ تصدیق کسی تاریخ
سے زیادہ معتبر نہیں؟ نیز اس کی مزید تصدیق رقعہ مسطورہ کی اس عبارت "وسید السادات چنانچہ
بود سر انجام رسیدہ اند" سے ہوتی ہے لفظ خط کشیدہ پر غور فرمائیے نیز اور بھی بہ کثرت اس کی
ہیں جو۔ ردًا للاختصار بالفعل محذوف۔

(۶) "منگرول کے عوام" کی تعریض بالکل غیر ضروری تھی جبکہ اس دعوہ پر جو تاریخ اولہ
کی محولہ عبارت سے پیش کیا گیا ہے جس سے صرف فیروز سے ملاقات اور آپ کی تکریم ثابت ہوتی
آپ کے دعوے کا ایک لفظ بھی اس میں منقول نہیں۔ جب کہ اس دعوی پر کوئی امر اہم بلکہ خاص الخاص سا
منگرول سے ہے کیونکہ انہی کی یہ روایت ہے اور یہی حاملان روایت ہیں تو ارثاً اباً عن جدٍ۔ اگرچہ ان عو
موجودہ ریکارڈ میں خاص اس دعوی (ورود براہ سمندر) کا کوئی خاص تحریری ثبوت نہیں ہے مگر پورا
مسلسل روایت کے بعض بعض اہم فقرات کے جستہ جستہ ثبوت اور مضبوط ثبوت موجود ہیں مثلاً رقعہ مح
تو اس پر قیاس کرکے عام روایت کی صحت کا حکم لگانا بعید از عقل نہیں۔ اور پھر روایت بھی اس قد

ندر سے شہر تک ایک میل کے راستہ کی تعین کہ "دیل داو کے راستہ سے شہر میں آئے"۔

(۷) "آپ بہ بہانہ بارات شادی مع مسلح سپاہیوں کے ڈولہ (یعنی بیل گاڑی محافہ دار) میں بیٹھ کر
میں نہیں پہنچ گئے"، اسلئے کہ

(۸) بلند پایہ بزرگوں کی ذات ایسے مکروہ اسباب دنیاوی سے مبرا ہے۔
بزرگوں کے متعلق ایک مسلمان کو ایسے ہی حسن ظن سے کام لینا چاہئے مگر اس میں کسی قدر افراط ہو گئی
۔قدیم سے قدیم تاریخ جو دنیا کو معلوم ہے آج تک پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ دنیا کا ہمیشہ اسپر عمل درآمد
ہے۔ فردوسی و نظامی سے ہزاروں برس پیشتر ہومر کی نظموں اور مہابھارت کی رزم آرائیوں تک اور اہل
یارٹا (محاصرۂ ٹرائے) اور قدیم فنیقیہ کی مہمات تک سیکسن و بولونیا۔ روما اور کارتھیج۔ ایران۔ توران
و مصر۔ حمیر و فارس غرض کوئی ملک اور کوئی قوم تاریخی دنیا میں ان مکروہ اسباب دنیاوی سے نہیں بچی۔
علیہ السلام کی قوم نے بھی اسپر عمل کیا۔ عیسائیوں کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ عرب کی فائق فنون سپہگری
عظم یہی تھا اور اب بھی ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا یہ مکروہ اسباب دنیاوی میں سے ہے یا نہیں۔ جواب بالکل واضح ہے کہ "نہیں"
حدود جنگ تک اور ان کے باہر یقیناً "ہاں"، الحرب خدعۃ کیا اٹل قانون ہے اور کان ؐ اذا اراد غزوۃ
بغیرھا (صحیح بخاری) اب تو غالباً اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ رہے گی۔

(۹ - ۱۰) واقعہ یہ ہے کہ حضرت سید سکندری کی فتح کے بعد الحرب سجالٌ کے اصول پر کبھی
طور پر مسلمانوں اور ہندوؤں کا قبضہ ہوا مگر سید سکندر کے سوا کبھی علی الانفراد سیدوں کا قبضہ نہیں ہوا
قبائی مالک ہوئے کبھی ملک اور کبھی شیخ۔ ان جنگوں میں یہ تو غیر ممکن تھا کہ سید شریک نہ ہوں جبکہ شہر
مسلمان شامل ہوں شامل تو ضرور ہوئے مگر صرف مجاہد یا سپاہی کی حیثیت سے ہیرو ورشپ کبھی نہ لی
پر چھوٹے چھوٹے افسروں کے طور پر کچھ کام کیا ہو مگر کبھی حاکم علی الاستقلال نہ بنے۔ بخ کے رقعہ جات
اسے پتہ لگ سکتا ہے۔ نیز تمام روایات و تواریخ وغیرہ میں کہیں بھی منفردانہ قبضہ سادات کا ذکر نہیں
ان رگھو رکھی ہند اور اس کے ناقلین کے۔ اور خاص اخراج مرہٹہ کا واقعہ تو سب سے اخیر یعنی زمانہ
کا ہے اور جب سے آج تک مسلمانوں کا مسلسل قبضہ چلا آتا ہے۔
جنگ مرہٹہ کو قاضی مرتضیٰ نے اس زمانہ کی کاٹھیاواڑی اردو میں نظم کیا ہے یہ مثنوی یہاں منگرول

میں ریاست کی جانب سے شائع ہو چکی ہے اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

مار مونڈا مرود مرہٹہ کا
گردن
سال۔کاڑا تمام سورٹھ کا
کانٹا۔ نکالا

اس مثنوی میں بڑے بڑے افسروں کے نام ہیں مگر سیدوں کا نشان بھی نہیں۔ اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہوگا۔ دیوان رنچھوڑجی نے تقریباً سو برس بعد اپنی تاریخ لکھی ہے اس طرح پر فریب طرق کا ایک حرف بھی قافی مرتضیٰ کی پوری مثنوی میں نہیں ملتا وہ تو بالکل اسی قسم کی جنگوں کی ایک چنگاری تھی جیسی نور الدین زنگی یا اس کے غلام صلاح الدین ایوبی یا بایزید یلدرم یا طارق بن سنان یا قتیبہ بن مسلم یا یزید بن مہلب وغیرہ مشاہیر اسلام کے وقتوں میں ہوتی رہی ہیں۔

دیوان رنچھوڑجی بن امرجی ریاست جوناگڈھ کی تاریخ سورٹھہ کو تاریخ کہنا تاریخ کا منہ چڑانا ہے ایک دفتر مہملات، ایک خریطہ فضولیات، ایک طومار ڈھلیات کو میں نہیں جانتا کہ اور کیا کہوں ؏

این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

اس مجموعہ خرافات کا کچھ نمونہ دیکھنا ہو تو اس کے صفحہ ۳ سے صفحہ ۹ ایک۔ (قصہ راجہ بھار جیٹھوا یا قصہ چہل تن و کاسہ غیب) نظر ڈال جائیے اس قدر گنجائش کہاں کہ یہ ۶ - ۷ صفحے یہاں نقل کئے جائیں۔"

قطعہ

ہیں بے گناہوں پہ ظلم و ستم تماشہ ہیں یہ فرد عدل میں کیسا نیا اضافہ
گناہگاروں کو ملتی ہیں قید میں خیرات مگر مکان میں جو بچے ہیں انکو فاقہ

محمد ا...

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جولائی **زبان** ۱۹۲۷ء

اس عالم تن میں جان عالم ہے یہی
کل جسم میں اک نطق مجسّم ہے یہی
ہے عرش خدائے پاک، اگر پاک ہے دل
صادق ہے زباں تو اسم اعظم ہے یہی

مقالات

سیرت رسول اللہ کی تمہید

از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے (بڑودہ کالج)

رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اگرچہ ادیان سابقہ کے تمام پیغمبروں اور ہادیوں کو منجانب اللہ مامور یقین کرکے اپنی امت کو صاف الفاظ میں ہدایت کردی کہ ان سب بزرگوں کی ہم عظمت کریں اور ان کی شان میں کسی قسم کی گستاخی نہ کریں اتنا ہی نہیں بلکہ کتب سابقہ میں ان پاک نفسوں کی سیرت کے متعلق جو بیہودہ

اور شرمناک روایات مندرج ہیں اُن کو غلطی اور کوتاہ بینی پر محمول کر کے ان قدسی نفوس کی پاکیزہ روی اور خدا پرستی کی شہادت دیں لیکن نبی اُمّیؐ کی اس حق پسندی حقیقت شناسی اور وسیع الخیالی کا صلہ یہ ملتا ہے کہ اس دور تہذیب میں بھی جبکہ تحقیق اور ہمہ دانی کا دعویٰ نہایت بلند آہنگی سے کیا جاتا ہے آپ کے واقعات زندگی پر ٹھنڈے دل سے انصافانہ نظر ڈالنا کیا معنی تدلیس کے آبدوزوں اور افترا کے تیاروں سے سیرت پاک کے سفینہ نجات کو غرق کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کی طبیعت عجب متلون واقع ہوئی ہے قریش مکہ نے جسے اس کی امانت اور صداقت کے صلہ میں الامین کا لقب دیا تھا اسی کو جب وہ اُن کے تزکیہ نفوس کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور توحید کامل کی تعلیم دیتا ہے ساحر اور مجنون کہہ کر پکارتے ہیں۔ زمانہ حال کے مستشرقین جسے پیغمبر کر تسلیم کرتے ہیں اسی کو جب وہ مدینہ میں اصلاح بین الناس کے لئے اسوۂ حسنہ کی عملی مثال پیش کرتا ہے عیش پرست اور دنیا ساز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ قریش کی وہ جہالت تھی جس نے آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا اور جو اُس وقت اُٹھ گیا جب فتح مکہ کے دن وہی جس کو اُنہوں نے ناحق طرح طرح کے ظلم وستم کے بعد گھر سے نکالا تھا اور اس کے خون کے پیاسے تھے اُن سے جبکہ وہ قیدی بنے ہوئے موت وحیات کی کشمکش میں تھے یوں خطاب کرتا ہے

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔ آج تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

لیکن مستشرقین اور ان کے مقلد ہمارے ابنائے وطن کا یہ علم ہے جو حجاب اکبر ہو رہا ہے۔ اس ظلمت میں اُنہیں پیغمبر مکہ شاہ مدینہ نظر آتا ہے یعنی شاہی کا مفہوم استبداد اور تعیش جو ان کے ذہن میں ہے اور اس کے ساتھ زمانہ موجودہ کی سیاسی چالوں کا جو نقش ان کے سامنے کھنچا ہے وہ ان انوار نبوت کو جو مدینہ میں آپ کے قول اور فعل سے صاف جھلکتے ہیں پوشیدہ کر دیتا ہے لیکن ایک حد تک وہ معذور بھی ہیں جس کو تشریح کی ضرورت ہے۔

گذشتہ صدی کے نصف آخر میں یورپ نے علوم وفنون میں حیرت انگیز ترقی کے ساتھ مذاہب عالم کے متعلق معلومات کا کافی ذخیرہ اور نایاب کتب کو تلاش کر کے اور ان کے متنوں اور تراجم شائع کر کے جمع کر دیا جس سے تحقیق اور تدقیق کا راستہ آسان ہو گیا۔ ہم یورپ کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ اس کے مایۂ ناز فرزندوں نے ہمارے اسلاف کے علمی کارنامے جو دست بردِ زمانہ سے فراموش ہو چکے تھے ہمارے سامنے پیش کر دیئے۔ کتب مغازی وسیر کے اصل ماخذ جو ہمارے قلمی کتب خانوں کی بربادی

ہمارے ذوق علمی کے فقدان سے قریب قریب مفقود ہو چلے تھے مستشرقین یورپ کی مساعی جمیلہ کی بدولت
ہم کو ملے۔ سب سے قدیم ماخذ محمد ابن اسحٰق (وفات ۱۵۱ھ مطابق ۷۶۸ء) کی کتاب المغازی ہے۔
یہ کتاب تو ایک مدت سے مفقود ہو چکی ہے جب کہ مارگولیوتھ نے اپنی کتاب (Mohammedan
Islam and the rise of) کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ لیکن اس کتاب کو جس شکل
میں ابن ہشام نے (وفات ۲۱۳ھ مطابق ۸۲۹ء) جو ایک محدث اور مورخ تھے ابن اسحٰق کے ایک
شاگرد زیاد بن عبداللہ البکائی (۱۸۳ھ) کی روایت سے حذف و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا اور جس کا
نام سیرت الرسول رکھا اس کو وستنفلڈ نے ۱۸۶۰ء میں گوتنگن سے شائع کیا۔ ۱۸۶۴ء میں گستاؤ ویل
نے اسی کا جرمن ترجمہ اسٹگرٹ سے شائع کیا۔

دوسرا قدیم ماخذ طبقات ابن سعد ہے۔ محمد ابن سعد (۲۲۰ھ۔ ۸۴۴ء) اگرچہ مشہور قصہ گو
واقدی (۲۰۷ھ مطابق ۸۲۳ء) کے شاگرد اور کاتب ہیں۔ لیکن محدثین کے نزدیک استاد کی
طرح بے اعتبار نہیں ہیں۔ رسول کریم اور اصحابہ کے حالات میں ایک ضخیم کتاب ۱۲ جلدوں میں لکھی تھی
تقریباً ناپید ہو چکی تھی، قیصر ولیم نے پروفیسر شاخو کو ایک رقم کثیر عطا کر کے قسطنطنیہ اور مصر وغیرہ سے
اس کتاب کے اجزا فراہم کرا کے کامل نسخہ تیار کر کے چھپوانا شروع کیا۔ آنحضرتؐ کے حالات دو جلدوں
میں شائع ہو چکے ہیں مگر ان میں جو حالات درج ہیں اس کا بڑا حصہ واقدی سے مروی ہے۔ ابن سعد
نے ۲۳۵ھ مطابق ۸۴۵ء میں انتقال کیا۔ اسی سلسلہ میں واقدی کی کتاب المغازی کو بھی یاد رکھنا
چاہیے جس کو ۱۸۵۵ء میں کریمر نے کلکتہ سے شائع کیا۔ یہ نسخہ ناقص ہے جیسا کہ مارگولیوتھ کا بیان ہے
۱۸۸۲ء میں ولہاسن نے واقدی کے ایک دوسرے نسخہ کا مختصر ترجمہ (Mohammed
in Madina)
برلن سے شائع کیا۔

تیسرا قدیم ماخذ محمد ابن جریر الطبری (وفات ۳۱۰ھ مطابق ۹۲۳ء) کی تاریخ الامم والملوک
ہے جس کی جزو ثانی و ثالث میں آنحضرت صلعم کے حالات مذکور ہیں۔ یہ حالات زیادہ تر ابن اسحٰق کی
کتاب کا معتد بہ حصہ طبری میں موجود ہے۔ اس مبسوط اور مستند تاریخ کو نولڈکی اور جے بارتھ نے چودہ
برس کی محنت میں ۱۸۸۵ء میں جرمنی کے مشہور شہر لیدن سے شائع کیا۔ اس سلسلہ
میں تاریخ یعقوبی ابن واضح (وفات ۲۹۲ھ مطابق ۹۰۵ء) بھی قابل ذکر ہے۔ جس کو ہوتسما نے اسی

شہر لیڈن سے دو برس پیشتر شائع کیا تھا اس کتاب کے دو جزو ہیں۔ اول میں تاریخ دول عالم اور دوسرے میں آنحضرت صلعم کے عہد مبارک سے ۲۷۹ھ یعنی المعتمد علی اللہ العباسی کے دور تک علم رجال میں ابن حجر کی مشہور کتاب اصابہ کو اسپرنگر نے کلکتہ سے ۱۸۵۶ء میں شائع کیا۔

ان ماخذوں کے اشاعت سے مستشرقین یورپ کے معلومات وسیع ہو گئے اور اب انھوں نے عالمانہ رنگ میں سیرت نبوی اور اسلام پر قلم اُٹھایا لیکن صدیوں کی قومی منافرت اور سیاسی تفوق کا احساس سنگ راہ رہا۔ سوء اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اسلام کی سیاسی قوت پامال ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا تھا۔ ایران میں قاچاریہ آفتاب لب بام تھا اور "یورپ کا مرد بیمار" (ترک) ۱۸۵۳ء کی جنگ میں روس سے بری طرح زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا۔ مصر شیر برطانیہ کے پنجہ میں تھا اور مراکش کی پگڑی رند فرانس نے اُچھال دی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں سر ولیم میور نے سیرت نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر لندن سے شائع کی اور اُسی سال اسپرنگر نے برلن سے سیرت پر اپنی تصنیف شائع کی۔ ان کتابوں کے متعلق مارگولیوث کا تبصرہ سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں۔

میور نے جو سیرت لکھی ہے وہ کھلی ہوئی مسیحیت کی جنبہ داری ہے اور اسپرنگر نے چند ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کا علم الاسلاف غیر معتبر ہے" (دیباچہ محمدؐ اینڈ رائز آف اسلام صفحہ ۴) میور اور اسپرنگر اگر اس وقت زندہ ہوتے تو ضرور یہ کہتے۔

من از چہ عاشقم ورند و مست و نامہ سیاہ
ہزار شکر کہ یاران شہر بیگنہ اند

بہر حال میور اور اسپرنگر نے جس طرز کی ابتدا کی اسمیں روز افزوں ترقی ہوتی گئی مشہور مستشرق گولڈ زیہر نولڈکے اور کراہل کے تصانیف اس فن میں ان کے وسعت معلومات۔ دقت نظر اور ذوق علمی کے شاہد ہیں مثلاً گولڈ زیہر کی (Mohammedan Studies) "محمڈن اسٹڈیز" ۱۸۹۰ء میں نولدکی کی "دس لبن محمدز" ۱۸۶۳ء میں شائع ہوئی۔ اور ڈاکٹر کراہل کی کتاب "محمد" ۱۸۶۳ء میں لیپزگ سے نکلی جو سیرت میں ایک مسیحی کے قلم سے نکلی ہوئی بڑی حد تک منصفانہ تصنیف ہے۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن اس کا کیا علاج تھا کہ جس طرح کتب عہد عتیق میں جو آسمانی مانی جاتی ہیں حضرات موسیٰ داؤدؑ اور سلیمان علیہما السلام کے متعلق بہت سی لغو اور شرمناک روایات منقول ہیں اسی طرح آنحضرت کی سیرت

ے متعلق ان قدیم ماخذوں میں بھی ویسی ہی روایات مندرج تھیں۔ ان اکاذیب باطلہ کو ضعیف مورخین مابعد
ے آنکھ بند کرکے نقل کردیا مستشرقین یورپ نے تنقیص رسول اور تفضیح اسلام کے لئے ایک سہل الحصول
ریعہ سمجھ کر بے چون وچرا تسلیم کرلیا۔ اور پھر اپنے زور قلم سے رائی کا پہاڑ بنا دیا جس کا کاٹنا دشوار ہو گیا۔
س لئے ہم پہلے ان قدیم ماخذوں اور ان کے مصنفین پر نظر ڈالتے ہیں۔

سیرت رسول کریم اس وقت سے حفظ و تحریر کے ذریعہ سے محفوظ ہونا شروع ہوئی جب سے
ارحرا میں ایک دُرِ یتیم کے نورانی قلب پر اقرأ باسم ربك الذی خلق کے الفاظ نقش ہو کر زبان
ک پر جاری ہوئے۔ یہ سلسلہ ۲۳ سال تک جاری رہا اور ۱۱۴ سورتیں جمع ہو گئیں جن میں آپ کے ابتدائی حالات
انگی زندگی غزوات اور تعلیمات غرض کہ خلق عظیم اور اسوہ حسنہ کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ اس مجموعہ
و وفات رسول کے ایک سال بعد حضرت ابو بکرؓ نے ایک کامل نسخہ میں لکھوا دیا جس کی چھ نقلیں حضرت
ثمانؓ نے بلاد اسلامیہ میں بھیجدیں۔ اس نسخہ کو ہم قرآن مجید کہتے ہیں اور اغیار اگر اس کو کلام اللہ نہ
یں تو کم از کم سیرت محمدؐ تو تسلیم کرنا پڑے گا ورنہ تاریخ اور واقعیت کی آنکھوں میں خاک جھونکیں
غرض کہ پچاس سال تک یہی قرآن تھا جس میں سیرت رسول کا مطالعہ ہوتا تھا لیکن جب بنی امیہ
بنائے اسلام کے سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھے اور عہد جاہلیت کے امراض پھر عود کر آئے تو
سیرت رسول کے واقعات اہل کتاب کے قصص و روایات اور عجم کے افسانوں کے رنگ میں بیان
ہونے لگے امر پر طرہ یہ کہ سیاسی اثر نے جو بنی امیہ کے جور و ستم سے محیط ہو گیا تھا اکثر واقعات کی صورت
کو مسخ کر دیا۔ ۶۵ھ میں جب عبد الملک ابن مروان کو تخت نشینی کا مژدہ سنایا گیا تو اس وقت وہ
قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول تھا اس نے کتاب اللہ کو بند کیا اور کہنے لگا ھذا فراق بینی وبینك
ممکن ہے یہ الفاظ اس کی ابتدائی مرتاضانہ زندگی کے رخصت ہونے پر تحسر کے لہجہ میں نکلے ہوں لیکن یہ
واقعہ ہے کہ حکومت ملتے ہی قرآن رخصت ہو گیا۔ عبد اللہ بن زبیرؓ کو کعبہ میں قتل کرکے وہ ان کے بھائی
عروہ کو لکھتا ہے کہ ابو سفیان کے حالات متعلق جنگ بدر لکھ بھیجو۔ عروہ نے جو تحریر بھیجی وہ تاریخ طبری
یں درج ہے جس پر ہم غزوہ بدر کے ضمن میں تبصرہ کریں گے یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ یہ تحریر
سورہ انفال کی کھلی ہوئی شہادت کے مقابلہ میں گویا روئی کا ایک تار تھا جس سے فائدہ اٹھا کر بعد کے وقائع
نگاروں نے آنحضرتؐ پر قافلہ لوٹنے کا الزام لگایا ہے۔ عبد الملک ایک بیدار مغز اور مدبر فرمانروا تھا۔

اُس نے بہت سے مفید اصلاحات کئے اور اسلام کی دینا وی سلطنت کا پایہ مستحکم کر دیا لیکن اپنے بزرگ مقتولان بدر کی یاد اور اپنے دادا حَکَم کا اخراج بھول نہیں سکتا تھا وہ اس معاملہ میں وموی پہلے تھا پھر حلقہ بگوش اسلام۔ اس کے عہد میں روایات قلمبند کئے گئے اور اس کے جانشینوں کے زمانہ میں مستقل تصانیف کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ طبقات ابن سعد میں امام زہری کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

كنا نكره كتاب العلم حتى اكرهنا عليه هؤلاء الامراء — ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے یہانتک کہ ان امرا نے ہم کو مجبور کیا۔

(ص۳۶ مصری)

زہری جن کا نام محمد بن مسلم ہے ۵۰ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے تحصیل علم کا شوق تھا اوائل عمر میں وہ ہولناک واقعہ حرّہ دیکھا تھا جب حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ہی فوج یزید مدینہ کو تاراج کر رہی تھی مہاجرین و انصار بیدریغ قتل ہو رہے تھے اور مسجد نبوی کی بے حرمتی ہو رہی تھی۔ زہری کے والد مسلم مصعب بن زبیرؓ کے جنہیں عبد الملک نے ایک خونخوار جنگ کے بعد قتل کیا تھا شریک تھے مگر اُنھوں نے جنگ و جدال سے پرہیز کیا اور نشر حدیث و روایات میں مشغول رہے۔ تیس برس کے سن میں عبد الملک کے دربار میں گئے اور مقربین خاص میں داخل ہوئے ہشام ابن عبد الملک نے اپنی عہد حکومت میں ان کو اپنے بچوں کی تعلیم پر مقرر کیا غرض کہ ۱۲۴ھ تک جو ان کا سن وفات ہے مقرب دربار اور عہدہ قضا پر فائز رہے۔ مغازی اور سیر کا بڑا حصہ انہیں کی مرویات ہیں۔ اکثر روایات پر ماحول کا اثر بھی صاف نظر آتا ہے (تفصیل آگے آئیگی) ان کے شاگردوں میں دو شخص بہت مشہور ہوئے ایک موسیٰ بن عقبہ (دفات ۱۴۱ھ) جنھوں نے ایک مختصر کتاب مغازی پر لکھی تھی مگر وہ مدت سے مفقود ہو گئی اگرچہ کتب سیر میں اکثر اس کے حوالے آتے ہیں۔ دوسرے محمد بن اسحاق جنکا کتاب المغازی کا ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں۔

محمد بن اسحق ۱۲ھ میں عراق کے ایک گرجا میں عین التمر سے ایک شخص یسار گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور قبیلہ عبد اللہ بن قیس مطلبی کے موالیوں میں داخل ہو کر وہیں رہنے لگا۔ محمد بن اسحق اس کے پوتے ہیں جن کی نشو و نما عہد بنی امیہ میں ہوئی۔ ولادت کی تاریخ ضبط نہیں کی گئی ہاں سن وفات ۱۵۱ھ طبری میں درج ہے۔ ابن اسحق کو ابتدا سے قصص و روایات کا شوق تھا اور احادیث

نبوی کا بھی ذوق تھا اکثر صحابہ سے فیض حاصل کیا تھا مگر اس کے ساتھ اہل کتاب سے بھی بے سروپا روایات نقل کرتے تھے۔ یہ روایات تو خیر لیکن جب احادیث نبوی میں بھی اونھوں نے امام مالک ایسے محدث وفقیہ کے مقابلہ میں یہ دعویٰ کیا۔

اعرضوا علی علم مالک فانی بیطارہ — میرے سامنے مالک کا علم پیش کرو کہ میں اس کا بیطار (ڈاکٹر) ہوں

میزان الاعتدال (ص۱۷) جلد ثالث

تو امام موصوف نے اس خیال سے کہ اس شخص کی جھوٹی روایات سے فتنے پیدا ہوں گے فرمایا

انظروا الی دجال من الدجاجلہ — دجالوں میں سے ایک دجال کو دیکھو۔

میزان الاعتدال (ص۲۱)

اہل مدینہ چونکہ امام موصوف کے فضل و کمال اور تقدس و تفقہ کے معتقد تھے اس لئے ابن اسحٰق کو مدینہ چھوڑ کر ایک عرصہ تک مصر پھر عراق میں رہنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بنی امیہ کی حکومت کا دفتر الٹ چکا تھا اور ان کے دل دہلانے والے مظالم کا بدلہ ایسی سفاکی سے لیا جا رہا تھا جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی تھی۔ رسول کریم نے فتح کے بعد کشتگان بدر کو بلا لحاظ مسلم و کافر دفن کیا لیکن آپ کے ابن عم السفاح نے حکومت حاصل کرکے نہ صرف ہزاروں بنی امیہ کو تہ تیغ کردیا بلکہ مردوں کی لاشیں بھی قبروں سے نکال کر پھکوادیں سفاح کے بعد اس کا بھائی منصور تخت نشین ہوا۔ منصور عباسیوں کا عبدالملک ہے اس نے بنی عباس کی حکومت کی عمارت ایسی مستحکم کردی کہ چھ سو برس تک قائم رہی وہ مدبر مقنن اور علم دوست تھا۔ اس نے ابن اسحٰق کو بغداد میں بلایا جہاں انہوں نے اطمینان سے اپنی وسیع معلومات اور مجموعہ روایات کو قلمبند کرنا شروع کیا اگرچہ ان کے استاد المحترم زہری نے مغازی پر ایک مستقل تصنیف کی تھی اور حضرت عروہؓ ابن زبیر کے متعلق ایسی ہی روایت کشف الظنون میں موجود ہے لیکن سیرت نبوی میں اس وقت تک کوئی مستقل اور مفصل کتاب نہ تھی یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کی فتوحات چین سے اندلس تک اور نومسلموں کی تعداد لاکھوں تک پہونچ چکے تھے جن میں یہود نصاریٰ مجوس بت پرست بھی تھے۔ حضرت موسیٰ کے مغازی و سیر کتب عہد عتیق میں موجود تھے زرتشت اور بزرگان عجم کی داستانیں وساتیر اور پہلوی کتابوں میں متداول تھیں جن میں سے بعض کا عربی میں ترجمہ بھی ہوچکا تھا ہشام بن عبدالملک کے میر منشی جبلہ بن سالم نے ۱۲۳ھ میں تاریخ عجم ایک مفصل اور مبسوط تاریخ کا ترجمہ کیا تھا جن میں سلاطین کی تصاویر بھی انکی خاص

وضع وقطع اور لباس وزیورکے ساتھ شامل تھیں۔ اسی طرح عبداللہ بن مقفع نے جو پہلوی کا عالم اور عربی کا قادر الکلام استاد تھا منصور کے عہد میں ایران کے ایک دوسرے مفصل اور مقبول کتاب السیر خدائی نامہ کا ترجمہ کیا جس کا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا۔ غرض کہ گردوپیش کے یہ حالات تھے جب ابن اسحٰق نے منصور کو قدردان اور مہربان پاکر سیرت نبوی دو حصوں میں لکھی (۱) کتاب المبتدا جسکا دوسرا نام بقول مصنف سیرت الحلبیہ کتاب المبدا وقصص الانبیاء ہے (۲) کتاب المغازی اس کتاب میں چونکہ دلچسپ قصے پرلطف داستانیں مسلسل واقعات اور جابجا اشعار اور قصیدے درج تھے عام طور پر اس قدر مقبول ہوئی کہ ابن اسحٰق کو "امام المغازی" کا لقب دیا گیا لیکن اسی کے ساتھ فن حدیث کے بہت سے ثقہ علما کی نظروں سے گر گئے اگرچہ بعضوں نے توثیق بھی کی۔ محدث دارقطنی (۳۸۵ھ / ۹۹۵ء) نے خوب فیصلہ کیا ہے۔

ھو صالح الحدیث ما لا عندی	اس کا قول درست ہے میرے نزدیک
ذنب الا قد حشا فی السیرۃ من	اس میں برائی نہیں سوائے اس کے
الاشیاء المنکرۃ المنقطعۃ والاشعار	کہ وہ سیرت میں منکر بیتیں۔ منقطع روائتیں
المکذوبۃ۔	اور جھوٹی اشعار بھر دیئے ہیں۔

(میزان الاعتدال صفحہ ۲۱ جلد سوم)

ابن اسحٰق اگرچہ جدت تحریر اور طرز ادا کے باعث امام المغازی کہلائے لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ بہت سی منقطع روایات جن کی نسبت وہ لکھتے ہیں "مجھ سے بعض اہل علم نے کہا" اہل کتاب کے بہت سے باطل اقوال اور سیکڑوں اشعار جو انھوں نے شعرائے وقت سے کہلا کر کتاب کو دلچسپ بنانے کے لئے جس کی نسبت چاہا منسوب کر دیا غلط اور لغو ہیں ان میں سے چند اکاذیب باطلہ کو زمانہ حال میں مخالفین اسلام سنداً پیش کرتے ہیں لیکن ان کی قلعی اُسی زمانہ میں کُھل چکی تھی (تفصیل آگے آئیگی) بہرحال ابن اسحٰق کی کتاب چشمۂ شیریں بھی ہے اور سراب بھی ایک وادی ہے جس میں تختہ گلاب بھی ہیں اور پھولوں کے جھنڈ بھی۔ اسی وجہ سے حافظ ابن حجر کو جو بہت زیادہ روایت پرست ہیں ابن اسحٰق کے متعلق تقریب التہذیب میں لکھنا پڑا۔ امام المغازی صدوق یدلس۔

محمد بن عمر الواقدی | یہ بھی بنی ہشام کے موالیوں میں ہیں ۱۳۰ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے

ابتدائی تحصیل کے بعد بغداد میں جو اُس وقت عباسیوں کا پایہ تخت تھا سکونت اختیار کی۔ ان کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ موافق اور مخالف سبھی قائل تھے مجاہد ابن موسیٰ کا قول ہے کہ میں نے واقدی سے زیادہ حفظ یاد رکھنے والا نہیں دیکھا۔

بنی اُمیہ کے خالص عربی مذاق کے مقابلہ میں عباسیوں کا رنگ عجمی تھا جن کے دربار میں داستان سرائی کا شوق تھا واقدی کی بڑی قدر ہوئی اور ایسے شخص کی جو وسعت معلومات میں زندہ النائیکلوپیڈیا (دائرہ المعارف) تھا برامکہ جو عجمی النسل اور علم و ہنر کے شیدا تھے کیوں نہ قدر کرتے چنانچہ بہت جلد شرقی بغداد کے عہدہ قضا پر فائز ہو کر عیش و آرام سے رہنے لگے اور سیرت میں کتاب المغازی جس کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں تصنیف کی۔ ان کا طرز بیان دلچسپ تھا۔ واقعات اس خوبی سے بیان کرتے تھے کہ کیا ممکن کہیں سے سلسلہ ٹوٹ جائے۔ روایات منقطع ہوں یا ضعیف موضوع ہوں یا صحیح ان کو اس سے بحث نہ تھی۔ یہ خشک بحثیں اور اسناد کے لمبے چوڑے زنجیریں اُنہوں نے محدثین کے لئے چھوڑ دیں ان کو گرمی سخن اور لطف کلام کے نشہ میں کچھ اور نظر نہیں آتا تھا صرف رسماً ابتدا میں اسناد گنوا دیئے پھر جس طرح سے چاہا داستان شروع کر دی۔ رسُول کریم صلعم جب رومیوں کے اجتماع کی خبر سُن کر ۹ھ میں تبوک واقع شام کی جانب گرمیوں کے موسم اور عسرت کی حالت میں بعزم جہاد فی سبیل اللہ روانہ ہوئے ہیں تو جناب واقدی لکھتے ہیں کہ رسُول اللہ نے فرمایا

لتا رعوا معی الی الشام لعلکم ان تصیبوا بنات الاصفر۔
(کتاب المغازی ص۴۲۴ مطبوعہ کلکتہ)

میرے ساتھ شام کی جانب بڑھو شاید بنی اصفر کی بیٹیاں (حسینان روم) تمہارے ہاتھ لگیں۔

جہاد کی یہ تحریص کیا عہد واقدی کی عیش پرستی کی تصویر ہے یا اس رسُول برحق کے تعلیم کی جو حضرت ابو موسیٰ الاشعری سے بخاری اور مسلم دونوں میں یوں مروی ہے۔

من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

جو اس واسطے لڑے کہ خدا کا بول بالا ہو وہ راہ خدا کا غازی ہے۔

واقدی کی اس ہرزہ سرائی اور دروغبافی کا مقابلہ ابن اسحٰق کی روایت سے کرو جسے طبری نے نقل کیا ہے "غزوہ تبوک کے لئے جب آنحضرتؐ سامان کر رہے تھے آپ نے جد بن قیس سے (جو منافق تھا) فرمایا

هل لك العام فی جلاد بنی الاصفر — کیا یہ سال تیرا بنی اصفر (رومیوں) کے مقابلہ کے لئے ہے۔

اس نے جواب دیا مجھے نہ لیجائیے کیونکہ مجھے فتنہ کا خوف ہے میری قوم کو خوب معلوم ہے کہ میں عورتوں کا کس قدر شیفتہ ہوں وہاں بنی اصفر کی عورتوں کو دیکھ کر صبر نہ کرسکوں گا" (طبری جلد سوم صہ ۱۴۲)

اللہ اکبر واقدی نے اپنے رسول برحق کے اس قول پر کہ "جس نے میری طرف وہ بات لگا دی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں کرلے" کچھ غور نہ کیا۔ ان کو رخسار آتشیں کی کشش ایسی جگہ کھینچ لے گئی ہے جس کی صفت یہ ہے نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ۔

واقدی کی انہیں اکاذیب باطلہ کے جھوٹے موتیوں کو مستشرقین نے ایک بیش بہا تاج" بنا کر اپنی تحقیق وتدقیق کے سر پر رکھ دیا ہے لیکن وہ یاد رکھیں کہ واقدی کی آبرو گیارہ سو برس ہوئے خاک میں مل چکی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں "مدینہ میں سات آدمی تھے جو جعلی اسناد بنایا کرتے تھے ان میں ایک واقدی ہے" (تہذیب ابن حجر) اسی کتاب میں امام احمد بن حنبل کا یہ قول درج ہے "الواقدی کذاب"

میزان الاعتدال ذہبی میں لکھا ہے۔

استقر الاجماع علی وھن الواقدی — واقدی کے ضعیف ہونے پر اجماع ہو چکا ہے۔

ائمہ حدیث اور ثقات کا یہ فیصلہ جس بنا پر ہے اس کے تفصیلی روایات واقدی کے ضمن میں ہم آگے بیان کریں گے یہاں اس قدر اشارہ کافی ہے کہ گردو پیش کے حالات اور درباریوں نے واقدی کو تباہ کیا وہ امام ابوحنیفہ نہ تھے جنہوں لے قید میں جانا گوارا کیا مگر عہدہ قضا قبول نہ کیا۔ وہ دربار کے نبض شناس تھے جاہ وعزت کے ہوس میں انھوں نے اپنی وسعت معلومات سے جا وبیجا فائدہ اٹھایا۔ جس طرح یورپ کے فلسفہ جدید کا امام بیکن نے امارت کے نشہ میں شرمناک اخلاقی کمزوری دکھائی اسی طرح قاضی بغداد واقدی نے حب جاہ میں اپنے دامن علم کو کذب سے آلودہ کر دیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون اور یورپ کی سرپرستی

(مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی ایڈیٹر الہلال)

مسلمانوں کے لئے درحقیقت یہ بات سخت قابل شرم ہے کہ جس میدان میں انہیں ہمت کا قدم رکھنا تھا، آج اغیار وہاں بازی لے گئے ہیں عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے بلکہ مسلمانوں کی جان روح، عنصر جوکچھ کہو عربی ہے اسی میں مسلمانوں کے تمام علوم وفنون اسی خزانہ میں محفوظ ہیں لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اس بے بہا خزانہ پر یورپ کا قبضہ ہے، اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی اس جرأت کو تک رہے ہیں۔ درحقیقت مسلمانوں کی غفلت سے عربی کا تمام سرمایہ تباہ ہونے والا تھا، اگر یورپ اس کی حفاظت پر آمادہ نہ ہوجاتا، تاریخ وادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کے الگ کردینے کے بعد عربی کا ادراس کے ساتھ مسلمانوں کا کشکول خالی ہوجاتا ہے، صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آرہی ہیں، صرف یہی نہیں، اگر یہ سرمایہ یورپ کی بدولت بربادی سے محفوظ رہا، اور بجائے ایک کرم خوردہ نسخہ کے دنیا میں ہزاروں نسخے پیدا ہوگئے بلکہ عربی زبان اور عربی علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں جس قدر معلومات اور تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے ان کو ہمارے علما کے دماغوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی جگہ نہ ملی ہوگی، عربی کی علم اللسان، لغت، صرف، نحو، عروض، اور قوافی کے متعلق بیسیوں کتابیں اس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئیں ہیں کہ اگر اس کا نصف حصہ بھی ہماری زبانوں میں آجائے تو بیش بہا معلومات سے مالا مال ہوجائے۔

ڈاکٹر لائیٹز ہماری اس افسوس ناک غفلت کو محسوس کرکے لکھتے ہیں،، کہ مسلمان ہیں تو بہت

گروہ جانتے کیا ہیں، اگر آج عربی کی کوئی عمدہ تاریخ یا کوئی عمدہ دیوان درکار ہو تو یورپ سے مانگنا پڑے گا ابن خلدون، ابن رشد، ابن بطوطہ، حاجی خلیفہ، ابن اثیر اور مقریزی جو اسلام میں آسمان علم کے آفتاب ہیں یہاں ان کو کوئی جانتا بھی نہیں، تابط شرا، امراء القیس، بحتری اور ابو تمام کا دیوان کتنے آدمیوں نے پڑھا ہوگا؟ یورپ میں صدہا آدمی یہ کتابیں پڑھتے ہیں اور ترجمۂ قرآن تو لاکھوں''

ڈاکٹر لائٹنر کو تو صرف اس کا افسوس ہے کہ'' اگر عربی کی کوئی عمدہ کتاب درکار ہو تو مسلمانوں کو یورپ سے مانگنا پڑے''، لیکن ہمیں یہ افسوس ہے کہ مسلمانوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں چھاپی ہیں اور انہیں چھاپ کر ہم پر اور ہمارے علوم پر کتنا بڑا زبردست احسان کیا ہے، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کے ذریعہ علماء اسلام کو یورپ کی ان خدمات سے واقف کریں جن کی بدولت آج انہیں اس امر کا موقعہ حاصل ہے کہ اپنے علمی ذخیرہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس مضمون کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں یہ دکھلایا ہے۔ کہ یورپ کو عربی اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی۔ اور صرف و نحو لغت و ادب کے متعلق کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں ترتیب دی گئیں دوسرے حصہ میں ان کتابوں کی مفصل فہرست دی ہے جو یورپ کی کوشش سے چھپکر شائع ہوئیں''

(شبلی)

یورپ کو عربی علوم کی طرف کب توجہ ہوئی؟ اور کیونکر ہوئی؟ یہ بجائے خود ایک دلچسپ مضمون ہے جس کے بیان کی یہاں نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت، صرف اس قدر بتلانا سلسلۂ مضمون کے لحاظ سے ضروری ہے کہ عربی سے یورپ کب روشناس ہوا۔ اور کیونکر عربی علوم و فنون مشرق سے مغرب میں منتقل ہوگئے۔

دنیا کے حیرت انگیز واقعات میں غالباً یہ واقعہ بھی عجیب و غریب ہے کہ یورپ کی شائستگی کی بنا ایک ایسی پولیٹکل خونریزی نے رکھی جو دنیا کا سب سے زیادہ نقصان کرنے والی جنگ تسلیم کیگئی ہے گیارھویں صدی عیسوی میں جبکہ مسلمان ترقی کے انتہائی درجہ تک بلند ہو چکے تھے یورپ میں ہر طرف تاریکی تھی، لیکن صلیبی لڑائیوں نے یکایک یورپ کو موقعہ دیا کہ مسلمانوں کی شائستگی کا مطالعہ کرے بیت المقدس اور انطاکیہ میں جب رومی سلطنت قائم ہوگئی اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کے ذرائع وسعت کے ساتھ

ہوگئے تو یورپ کی آنکھیں کھلیں اور مسلمانوں کی شائستگی کا اسے پہلا تجربہ ہوا شام میں قسمت آزمائی کرنے
بعد جب یورپ کے جانبازوں نے مغرب کا رخ کیا تو یہ اثر بھی ساتھ لے گئے کہ مسلمان علمی عملی ترقیات کے
ں اکیلے مخزن ہیں، اور تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ اسلامی دنیا کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

اس اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ یورپ میں مسلمانوں کی ترقی اور شائستگی پر عام توجہ ہوگئی اور یہ توجہ برابر بڑھتی
کیونکہ صلیبی حملوں کی بدولت بار بار یورپ کا اسلامی ممالک میں گذر ہوا اور ہر مرتبہ مسلمانوں کی علمی ترقی
یرت انگیز آثار نظر آئے، اس لئے ایک طرف تو یورپ نے مسلمانوں کی تباہی کا بیڑا اٹھایا، اور دوسری
، اپنے حریف کی شاگردی پر آمادہ ہوگیا۔

اس ذکر میں ایک عجیب بات یہ ہے، کہ چونکہ اس زمانہ میں یورپ میں عام تعلیم نہ تھی اور لاطینی و یونانی زبانوں
علیم پادریوں اور اراکین سلطنت کے لئے مخصوص تھی اس لئے مغرب سے مشرق کی طرف جس گروہ کا علمی
ں میں اوّل قدم اٹھا وہ مذہبی پیشواؤں کا مقدس گروہ تھا، حیرت یہ ہے کہ یہی گروہ آگے چل کر الحاد اور سب
ے کے پریشان خواب دیکھنے لگا اور اسلامی فلسفہ کی اشاعت اس کی تعبیر بتلائی گئی حالانکہ ابتدا میں اشاعت
یہ بھی یہی نادان گروہ ہوا۔

گیارھویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں کے علوم و فنون پر یورپ کو توجہ ہوئی، اور چودھویں صدی
اواخر تک فلسفہ کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوگئیں ابتدا میں متعدد محکمے قائم کئے گئے کہ لاطینی داں
یوں کی مدد سے فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کی جائیں، پھر پوپ اکزنڈس پنجم کے حکم سے عربی اور دیگر مشرقی
ں کی تحصیل کے لئے یورپ کے نوجوان طلبا اندلس روانہ کئے گئے اندلس میں چونکہ خود عیسائی اور یہودی
میں مسلمانوں کے شاگرد و رشید تھے، اس لئے یورپ کے طلبا ان کی اعانت سے فائدہ اٹھاکر بہت
عربی اور عبرانی میں قابلیت حاصل کر لیتے اور فارغ التحصیل ہوکر علمی کتابوں کے ترجموں میں مشغول ہوجاتے۔
جن لوگوں نے یورپ کے مختلف حصوں سے اندلس کا سفر کیا، اور عربی زبان سے واقفیت پیدا کرکے
تراجم میں مشغول ہوئے ان کے نام آج تاریخی صفحات پر موجود ہیں ان میں بہت سے طالب علم ایسے ہیں
ں نے طلب علم میں حب الوطنی کے تعید سے خود کو ہمیشہ کے لئے آزاد کر لیا، اور ساری عمر طلیطلہ کے پرائیویٹ
ں اور قرطبہ کے دار العلوموں میں صرف کردی کچھ طالب علم ایسے ہیں جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشرق
تاز ملکوں کی خاک چھانتے پھرے اور ایک عرصہ کی تلاش و تحقیق کے بعد سرزمین مغرب میں قدم رکھا، تو

تو اسلامی علوم و فنون کی معلومات سے ان کا کاسۂ دماغ لبریز تھا، ہارڈمین کیمیون اس زمانہ کا مشہور طبیب اور ہیئت داں ہے یہ اپنے وطن اٹلی سے نکل کر محض عربی کے شوق میں طلیطلہ پہنچا اور ایک عرصہ کی اقامت کے بعد جب کافی واقفیت حاصل کر لی تو متعدد کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

پیٹر زمارمٹ ایک فرانسیسی راہب تھا جس کو جغرافیہ کا شوق دامنگیر ہوا اسی شوق میں اندلس کا سفر کیا افریقہ کی خاک چھانی اور مدت تک آوارہ گردی کے بعد مسلمانوں سے اس علم کو حاصل کیا۔

ڈنیل مارلی اور پیٹر نہ ماکر نے اسی طرح اندلس کا سفر کر کے عربی زبان سے واقفیت پیدا کی، آخرالذکر نے قرآن شریف کا عربی سے ترجمہ بھی کیا اور آنحضرت کی سوانح عمری بھی لاطینی میں ترتیب دی، ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے نام تاریخ میں پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض کے ترجمے اور تصنیفات اس وقت تک یورپ میں موجود ہیں ان کوششوں نے یورپ کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے علوم سے واقف کر دیا اور اسلامی فلسفہ نے عام طور پر مقبولیت حاصل کر لی۔

لیکن چونکہ یورپ میں اس وقت تک عربی زبان کی کوئی باضابطہ درسگاہ نہ تھی، اس لئے عربی زبان سے وہی خوش قسمت اشخاص واقفیت حاصل کر سکتے تھے، جن میں مشرقی ممالک کے سفر اور وہاں کی کثیر اخراجات اور دقتوں کے متحمل ہونے کی طاقت تھی، لیکن سولہویں صدی سے عربی زبان کی باضابطہ تعلیم خود یورپ میں شروع ہو گئی، ١٦٢٢ء میں پندرھویں گری گورس پوپ نے روم میں ایک انجمن قائم کی، جس کا مقصد اگرچہ مسیحی عقائد کی اشاعت تھا، مگر اس کے قیام سے بہت بڑا ضمنی فائدہ یہ ہوا، کہ عربی زبان کی تعلیم پر یورپ کو توجہ ہو گئی اس کے بعد ہی ١٦٢٧ء میں خاص پوپ اربانس کے حکم سے اس انجمن کے متعلق مشرقی زبانوں کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا، تاکہ نوجوان پادری مشرقی زبانوں کی تعلیم پا کر اشاعت مذہب کی غرض سے باہر جا سکیں، اس مدرسہ میں خاص طور پر عربی اور سریانی زبانوں کے پروفیسر مشرقی ممالک سے بلوا کر مقرر کئے گئے تھے، عربی کتابیں پہلے پہل دنیا میں اسی مدرسہ کی بدولت چھپ کر شائع ہوئیں تعلیم کے لئے ضرورت ہوئی کہ صرف ونحو اور ادب کی کتابیں بہ کثرت مہیا ہوں اس لئے چند رسالے خود پروفیسروں نے لکھے اور کچھ کتابیں قدیم زمانے کی لکھی ہوئی دستیاب کیں اور انہیں نہایت اہتمام سے طبع کرا کر شائع کیا۔

صرف ونحو عربی کی جو کتابیں یورپ میں لکھی گئیں

اس انجمن نے عربی کے لئے

جو کچھ کیا وہ درحقیقت ایک مذہبی کام تھا، لیکن اسی زمانہ میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوگئے جنھوں نے محض ذاتی
وشش اور مذاق سے عربی زبان میں قابلیت بہم پہنچائی اور پھر صرف و نحو اور ادب و لغت کی کتابیں
لکھ کر یورپ میں اس مذاق کو عام کیا ان لوگوں میں پہلا شخص آرپی نیو نامی ایک عالم ہے جو ہالینڈ کا
شندہ تھا مشرقی زبانوں کے شوق میں وطن سے نکل کر دور دراز ملکوں کی سیاحت کی اور متعدد
بانوں کو حاصل کر کے ۱۶۱۳ء میں ہالینڈ واپس آیا، ہالینڈ میں چونکہ اس کی قابلیت کی شہرت پیشتر ہی سے
پہنچ چکی تھی اس لئے پہنچتے ہی لیڈن یونیورسٹی کا پروفیسر ہوگیا اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہالینڈ
کے مدرسوں میں عربی زبان کی تعلیم داخل ہوگئی اور صرف و نحو عربی میں سب سے پہلے ایک رسالہ
ترتیب دیا، آرپی نیو کے بعد لافن وارنر نامی ایک شخص نے عربی کی طرف خاص توجہ کی یہ عالم
۱۶۱۹ء میں پیدا ہوا، اور ۱۶۶۵ء میں وفات پائی ۱۶۴۰ء میں مشرقی ممالک کا سفر کر کے عربی کی نادر
کتابیں جمع کیں اور لیڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں داخل کردیں۔

سترھویں صدی کے اواخر تک اسی طرح خاص خاص لوگوں کی کوشش سے عربی لٹریچر
کا مذاق ترقی کرتا رہا۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے اوائل سے یورپ میں عربی کا دوسرا دور شروع ہوا
جس نے موجودہ زمانے کی عظیم الشان توجہ کی بنا رکھی، اس دور کا افتتاح ایک فرانسیسی عالم پروفیسر
۔۔۔ دسر کی تصنیفات سے ہوا، جو نہ صرف عربی کا ماہر تھا بلکہ مشرق کی دیگر مشہور زبانوں میں بھی کافی
مہارت رکھتا تھا علاوہ اور تصنیفات کے اس کی ایک قابل قدر تصنیف عربی کی مبسوط صرف و نحو ہے
جس کی دو ضخیم جلدیں ۱۸۱۰ء میں چھپ کر شائع ہوئیں اس کتاب میں مصنف نے ایک مفید التزام یہ کیا
ہے کہ جن جن صرفی و نحوی مسائل کو لکھا ہے ان کے متعلق بطور شواہد کے عربی اشعار بھی پیش کر دئیے
ہیں اس دور میں چند اسباب ایسے جمع ہوگئے جن سے عربی پر یورپ کو غیر معمولی توجہ ہوگئی منجملہ
ان کے ایک بڑا سبب انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط ہے مسلمانان ہند کا یہ زمانہ اگرچہ زمانۂ انحطاط
تھا مگر پھر بھی عربی تعلیم کا مذاق عام طور پر موجود تھا، یہاں تک کہ لکھنؤ اور دہلی کے جو علماء آج زیادہ
مشہور ہیں وہ اسی آخری دور کی یادگار ہیں اس لئے انگریزوں کو بھی عربی پر توجہ ہوئی اور اس توجہ
سے جو مفید نتائج پیدا ہوئے ان میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور بمبئی کا نام خصوصیت کے ساتھ
قابل ذکر ہے، لیکن اس کا مفصل بیان آگے آئے گا۔ یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے، کہ انگریز

بھی فرانسیسیوں کے ساتھ اس دور میں برابر کے شریک رہے مشہور انگریز عالم لمسڈن نے کلکتہ میں چند مولویوں کی مدد سے ایک عمدہ کتاب صرف و نحو پر لکھ کر ۱۸۱۳ء میں شائع کی اسی طرح کلکتہ میں دو اور رسالے اسی زمانہ کے قریب قریب شائع ہوئے جن میں سے ایک رسالے میں عربی کی چھوٹی بڑی حکایتیں جمع کی ہیں اور دوسرے رسالے میں الف لیلہ کے تیسرے حصہ کا انتخاب اور ترجمہ تھا، اس دور میں صرف و نحو کی تین کتابیں اور قابل ذکر لکھی گئیں۔

(۱) علامہ ای والڈ جرمنی کی صرف و نحو عربی ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۳ء تک چھپ کر لیپزنگ سے شائع ہوئی۔

(۲) علامہ کاسپری کی صرف و نحو پہلی مرتبہ ۱۸۴۸ء میں چھپ کر لیپزنگ سے شائع ہوئی پھر علامہ اگسٹس نے ترمیم و تہذیب کے بعد ۱۸۵۲ء میں دوبارہ شائع کیا یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۸۸۰ء تک اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے تھے۔

(۳) پھر ۱۸۵۹ء میں ایک انگریز عالم رایٹ نے کاسپری کی صرف و نحو کو چند مطالب بڑھا کر انگریزی ترجمہ کے ساتھ دو جلدوں میں مرتب کیا جو لنڈن میں چھپ کر شائع ہوئی۔

یورپ کے علما رنے جب عربی زبان پر توجہ کی تو ان کو صرف و نحو کی ایسی کتابوں کی تلاش ہوئی جو ان کے لئے مفید ہوں جب ایسی کتابیں نہیں ملیں تو خود انھوں نے کوشش کر کے کتابیں تصنیف کیں اور آنے والے زمانہ کے لئے عربی زبان کی تعلیم کا سامان مہیا کیا اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ اسی کوشش پر مبنی ہیں۔

لیکن بڑا احسان جو یورپ نے عربی زبان پر کیا وہ ان محققانہ لغتوں کی ترتیب ہے جن کی نظیر عربی میں نہیں مل سکتی پہلا لغت جو یورپ میں شائع ہوا وہ جحیوس نامی ایک فاضل مستشرق کی تصنیف ہے جو اٹلی کا رہنے والا تھا پھر علامہ جولیس نے اس کی تقلید کی اور

یورپ نے عربی کے جو لغت ترتیب دیئے

۱۶۵۳ء میں اپنا عربی لغت لیڈن سے شائع کیا یہ دونوں لغت چونکہ صرف عربی کے تھے اس لئے علامہ مانینسکی نے دو نہایت ضخیم جلدوں میں مشرق کی تین مشہور زبانوں عربی فارسی ترکی کا ایک جامع لغت تیار کیا، اور ہر لفظ کا مطلب لاطینی اور جرمنی دونوں زبانوں میں درج کیا، اس لغت

نام کنز اللغات الشرقیہ ہے ۱۶۸۰ء میں وائنا دار السلطنت آسٹریا سے چھپ کر شائع ہوا۔
اس کے بعد علامہ فرائیتگ نے چار جلدوں میں، اور کازی مرسکی نے فرنچ میں اور باڈجر اور
ن نے انگریزی میں چار لغت تیار کئے جو ۱۸۳۰ء سے ۱۸۸۱ء تک چھپ کر شائع ہوئے ان میں پہلا
ت یورپ میں زیادہ مشہور اور متداول ہے۔
ان سات لغتوں میں چھ لغت عربی کے عام لغتوں کی طرح ہیں، جن میں کوئی خاص تحقیق یا جامعیت
ہیں پائی جاتی، لیکن ساتواں لغت علامہ لین کا اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ اس مصنف نے نہایت
شش سے عربی کے تمام قاموس جمع کئے اور انگریزی میں ایک جامع لغت تیار کیا۔
لیکن جس بے نظیر لغت نے عربی کو ہمیشہ کے لئے اپنا مرہون منت بنالیا، وہ مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر
زی کا قاموس ( ) ہے یعنی اضافہ لغت عربی
س العلما مولینا شبلی نعمانی کے کتب خانہ میں یہ لغت میری نظر سے گذرا دو ضخیم جلدوں میں وہ تمام الفاظ اور
طلاحات جمع کئے ہیں جو عربی کے کسی لغت میں نہیں ملتے، کامل پچاس برس کی محنت اور تلاش سے
بے نظیر لغت تیار ہوا، تاریخ وادب اور علوم وفنون کی سیکڑوں کتابیں چھان ڈالیں اور جہاں کہیں
تم کے الفاظ ملے جمع کر لئے، پھر سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کر کے نہایت کوشش سے ان کا
غ لگایا، اور تحقیق وتنقید کے بعد جو مفہوم ثابت ہوا اسے لفظ بلفظ درج کیا پہلی جلد کی ابتدا میں ان
بوں کی فہرست دی ہے جن سے اس لغت کی ترتیب میں مدد لی گئی، اس کے دیکھنے سے اس محقق
تلاش وتحقیق کا سرسری اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سی نایاب کتابیں جمع کیں، اور کس طرح ان سے مبہم
ل الفاظ کا پتہ لگایا؛
مسلمانوں نے جب اسپین فتح کر کے ایک متمدن سلطنت کی بنا ڈالی تو آٹھ سو برس کے اثر نے اسپین
کی زبان میں عربی کے سیکڑوں لفظ داخل کر دیئے یہ الفاظ آج بھی اسپینی زبان میں موجود ہیں مگر اختلاف
ولہجہ نے ان کی صورت اس طرح بدل دی ہے کہ ان کا سراغ لگانا آسان نہیں ہے۔
پروفیسر دوزی نے جدت کی محنت سے ایک لغت تیار کیا ہے جس میں عربی کے وہ تمام الفاظ جمع
ہیں، اور دکھلایا ہے کہ ان لفظوں نے موجودہ صورت کیونکر اختیار کی اور عربی میں ان کی اصلی صورت
تھی؟

افسوس ہے کہ یہ دونوں بے نظیر لغت فرنچ میں ہیں اور ہم براہ راست ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ادب عربی کے منتخبات

ان کتابوں کے علاوہ ایک اور چیز قابل ذکر ہے یورپ نے عربی علم ادب کے نہایت مفید منتخبات ترتیب دیئے ہیں اور ان منتخبات میں ادب کی بعض ان کتابوں کا انتخاب ہے جو اس وقت تک چھپ کر شائع نہیں ہوئیں اور یورپ کے خاص خاص کتب خانوں میں محفوظ ہیں ان میں سے بعض منتخبات میں عربی کی قدیم شاعری کے نمونے دیئے ہیں بعض میں ضرب الامثال اور عرب کی اصطلاحات جمع کئے ہیں اس قسم کی چودہ کتابوں کے نام اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں جن میں سے دو کتابیں بیروت میں اور باقی لنڈن برلن اور پائرس وغیرہ میں چھپی ہیں۔

لغت دارجہ کی صرف و نحو

آج کل جو عربی عام طور پر بجز نجد کے علاوہ تمام عرب میں مستعمل ہے اس کو لغت دارجہ کہتے ہیں یورپ نے دارجہ کے بھی صرف و نحو لکھے ہیں اور نہایت اہتمام سے لکھے ہیں۔

سب سے پہلے کالنس نامی مستشرق نے ۱۸۰۸ء میں دارجہ کی صرف و نحو لکھی اور اسپین میں چھپکر شائع ہوئی پھر دومیے نے لکہ کرواناسے شائع کی اسی طرح ۱۸۹۰ء تک بارہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں صرف ایک کتاب مصر کے ایک مسلمان عالم کی تصنیف ہے جو غالباً یورپ ہی کی تحریک سے لکھی گئی،

لغت دارجہ کے مجموعہ امثال

صرف و نحو کے علاوہ لغت دارجہ کی ان ضرب المثلوں کو بھی (جو عام زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں) یورپ کے بعض عالموں نے نہایت کوشش سے جمع کیا ہے اور عرب کے مختلف حصوں کے مجموعہ الگ الگ ترتیب دیئے ہیں مثلاً علامہ لینڈبرگ نے خاص شام کی ضرب المثلیں جمع کی ہیں باد جرنے صرف مکہ معظمہ کا امثال ترتیب دیئے ہیں ان مجموعوں کے علاوہ سوسین نامی ایک مصنف نے ایک جامع مجموعہ امثال ترتیب دیا ہے جس میں عام طور پر دارجہ کے تمام امثال اور حکیمانہ مقولے جمع کئے ہیں،

امثال کے علاوہ جو قصے اور چھوٹی چھوٹی حکائتیں عرب کے مختلف خطوں میں مشہور ہیں اور جن سے ان کے اخلاق وعادات اور طرز معاشرت کا پتہ چل سکتا ہے جرمنی کے چند مستشرقوں نے ان کو

نہایت تلاش سے جمع کیا ہے اس قسم کی تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) سوسین کا مجموعہ حکایات جس میں موصل اور ماردین کی حکایتیں جمع کی ہیں یہ رسالہ مضمون
صورت میں جرمنی کے ایک اخبار میں شائع ہوا تھا،

(۲) سبی ٹابیک کا مجموعہ جو ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے چھپ کر شائع ہوا،

(۳) لینڈبرگ کا مجموعہ جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا،

(الندوہ اکتوبر ۱۹۰۵ء)

اقوال زرین

(از امام اکبر آبادی)

) دنیا میں ہر مرد اپنے فعل کا مختار ہوتا ہے، لیکن ایک عورت کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے۔

) ایک سنجیدہ و عقلمند، ایک عالم و فلاسفر، اور ایک بہادر سورما، اگرچہ اپنے اپنے میدان کے مرد ہوتے
لیکن ایک عورت کے مقابلہ میں ذلیل و خوار بنجایا کرتے ہیں۔

) جب عورت اپنے محسوسات کو سمجھ لیتی ہے تو دشوار کو آسان، نادستیاب کو دستیاب، اور ناممکن کو
بنادیتی ہے۔

) عورت کا تلون سمندر کی موج ہے، اسکی پیشانی کے بل سمندر کی لہریں ہیں، اور اس کا عزم ایک مستقل
ہے۔

) جو راز عورت کے دل میں ہوتا ہے، وہ اس کی زبان پر نہیں آتا، اگر زبان پر آتا ہے تو منہ سے باہر نہیں نکلتا، اور
باہر نکلتا ہے تو عملی جامہ پہن لیتا ہے (۶) عورت ایک معمہ ہے، جسکا حل نہیں۔ ایک راز ہے، جسکا انکشاف نہیں۔
بگولا ہے، جسکا مسکن نہیں، اور ایک بھید ہے، جسکا حل اس کائنات میں نہیں (۷) پرستش کے قابل نہ تو پتھر کی
ت ہے اور نہ دولت کی دیوی۔ بلکہ صرف عورت ہے، بشرطیکہ وہ عورت ہو (۸) وہ قومیں جو ترقی کے بام پر سر
ہی ہیں، صدقہ ہے عورت کے اس مسرت آگین لمحہ کا، جبکہ مرد دنیا کے کاموں سے گھبرا کر اسکی صحبت اختیار
لے اپنے دماغ کو تازہ کرتا ہے (۹) اس عورت سے جو ایک سے بات کرتی ہو، دوسرے کی طرف نگاہ ہو، اور

علمائے ماہرین السنہ

(از مولانا مولوی عبدالسلام صاحب ندوی)

اگرچہ ملکی، سیاسی، مذہبی اور علمی، غرض ہر حیثیت سے اسلام کی تاریخ کا اقتضا یہ تھا کہ مسلمانوں میں بہ کثرت علما مختلف زبانوں کے پیدا ہوتے۔ لیکن اسلام نے اپنے ملکی مذہبی، اور علمی اقتدار کی بنا پر دوسری قوموں کا ہم زبان بننا گوارا نہیں کیا۔ بلکہ اس نے جن ممالک پر فاتحانہ حکومتیں کیں وہاں کی قوموں کو خود اپنا ہم زبان بنالیا۔ یا کم از کم ان کو اپنے پیغمبر کی عربی زبان کے سیکھنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن باایں ہمہ اس کے زیر سایہ، یہودی، رومی، عیسائی، پارسی اور حبشی وغیرہ قومیں موجود تھیں۔ جن سے اس کو مختلف قسم کے تعلقات رکھنے پڑتے تھے۔ اسلئے قدرتی طور پر وہ ان زبانوں سے متاثر ہوتا تھا۔ خود قرآن و حدیث میں مختلف زبانوں کے بہ کثرت الفاظ موجود ہیں۔ اور رسول اللہ صلعم اور صحابہ کی زبان سے بھی عربی کے علاوہ غیر زبانوں کے الفاظ نکلے ہیں۔ بعض صحابہ کے حالات میں مذکور ہے کہ وہ اہل کتاب کے صحائف آسمانی سے واقفیت رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رض کے تذکرے میں علاوہ ذہبی نے لکھا ہے کہ:۔

"انھوں نے اہل کتاب کی تمام کتابیں حاصل کی تھیں۔ اور مستمراً اونکا مطالعہ کیا تھا اور اسمیں عجائبات دیکھے تھے۔"

اسد الغابہ میں ہے "وہ فاضل اور عالم تھے، قرآن کو اور اگلی کتابوں کو پڑھا تھا"

مسند دارمی میں ہے "کہ حضرت عمر بن الخطاب رض تورات کا ایک نسخہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں لائے، اور کھول کر پڑھنے لگے[۱]"

اور اسد الغابہ میں ہے کہ تورات کا یہ نسخہ ان کے ایک یہودی دوست نے جو بنی قریظہ کا تھا، اپنے ہاتھ سے لکھکر دیا تھا[۲] جس سے علانیہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام بزرگ عربی زبان کے علاوہ عبرانی اور سریانی

---

[۱] مسند دارمی صفحہ ۶۲ ۔ [۲] اسد الغابہ تذکرہ حضرت عبداللہ بن ثابت انصاری رض

...ان ہی واقف تھے۔ اور نہ صرف سرسری طور پر واقف تھے بلکہ اس زبان کی کتابوں کا اچھی طرح مطالعہ
...سکتے تھے۔

...ہی، اور علمی حیثیت کے علاوہ بعض صحابہ نے سیاسی ضرورتوں سے بھی عبرانی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ ...ل اللہ صلعم کو چونکہ یہودیوں کے ساتھ خط و کتابت کرنی پڑتی تھی اس لئے زید بن ثابت رض نے آپ کے حکم سے ...نی زبان سیکھی۔ اور پندرہ ہی روز کے بعد اس میں خط و کتابت کے قابل ہو گئے۔[۵۱]

اس کے بعد بنو امیہ کے زمانہ میں غیر زبانوں کے علوم و فنون کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی۔ دولت عباسیہ ...کمیل کے درجہ تک پہونچی اور اکبر کے زمانہ میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس لئے قدرتی طور پر مسلمانوں میں بہ کثرت ...انے دوسری زبانوں میں مہارت حاصل کی لیکن اس موقع پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ جو کچھ تھا محض سلطنت ...و صلہ افزائی کا نتیجہ تھا۔ اور مسلمانوں نے جن غیر زبانوں میں کمال پیدا کیا۔ ان کی حالت آج بالکل انگریزی ...ان کی تھی۔ جس کو ہر شخص کسب معاش کے لئے سیکھ رہا ہے۔ لیکن اولاً تو خود حکماء اسلام کے حالات کے ...العہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اول اول یہ زبانیں محض علمی ذوق کی تکمیل کے لئے سیکھی تھیں۔ کیونکہ ...م قدیم علوم و فنون یونانی، لاطینی، اور سریانی زبانوں میں تھے۔ اور جب ان زبانوں سے واقفیت نہ حاصل ...جاتی۔ ان علوم میں کمال پیدا کرنا ناممکن تھا۔ اس لئے حکماء اسلام نے اسی علمی ذوق کے پورا کرنے کے ...لئے یہ زبانیں سیکھیں۔ جو بعد کو کسب معاش کا ذریعہ بھی بن گئیں۔ دوسرے یہ کہ محکمہ تراجم کے بند ہو جانے کے ...بھی ہمکو متعدد علما کے نام ملتے ہیں۔ جو مختلف زبانوں کے ماہر تھے۔ چنانچہ اس موقع پر ہم اس قسم کے ...چند بزرگوں کے حالات درج کرتے ہیں۔

...ین الدین ...بو حسن آمدی

نہایت معزز اور موقر تھے۔ علم تعبیر رویا میں کمال حاصل تھا۔ متعدد زبانوں، مثلاً مغولی (مغل)، ترکی، فارسی، رومی اور عزلی وغیرہ کے ماہر تھے۔ چنانچہ جب سلطان غازان خاں ۶۹۵ھ میں بغداد آیا۔ تو لوگوں نے اس سے علامہ موصوف کا تذکرہ کیا۔ وہ ان کی ملاقات کا مشتاق ہوا۔ اور کہا کہ کل جب میں مدرسہ مستنصریہ میں آؤں گا۔ ان سے ملوں گا۔ چنانچہ وہ جب اس مدرسہ میں آیا۔ تو لوگوں نے ایک عام جلسہ کیا۔ اور بغداد کے

[۵۱] بخاری باب الاحکام باب ترجمۃ الحکام۔

تمام اعیان واکابر جن میں شیخ زین الدین آمدی بھی شامل تھے، مدرسہ میں جمع ہوئے۔ غازان خاں آیا تو اس نے اپنے اکابر امرار کو حکم دیا کہ وہ لوگ یکے با دیگرے اس سے پہلے مدرسہ میں داخل ہو کر شیخ زین الدین کو سلام کریں۔ اور ان میں ہر ایک ان کے امتحان کے لئے اپنے آپ کو خود بادشاہ ظاہر کرے۔ چنانچہ اس ترتیب کے موافق جب کوئی امیر آتا تھا، تو لوگ عزت اور مسرت کا اظہار کرتے تھے۔ اور اس کو شیخ زین الدین کی خدمت میں سلام کرنے کے لئے لے جاتے تھے۔ شیخ سکون و وقار کے ساتھ ہر ایک کے سلام کا جواب دے دیتے تھے۔ لیکن کسی قسم کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ آخر میں غازان خاں پہلے امرا سے کم شان و شوکت کے ساتھ آیا اور سلام کر کے شیخ سے مصافحہ کیا۔ چنانچہ جب اس نے شیخ سے ہاتھ ملایا۔ تو وہ اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس کے ہاتھ چومے، اس کی ملاقات کو اہمیت دی۔ اس کے ساتھ غیر معمولی طور پر پیش آئے۔ اور پہلے مغولی زبان میں، پھر ترکی، پھر فارسی پھر رومی پھر عربی میں اس کو دعائیں دیں۔ چونکہ وہ بے بصر تھے۔ اس لئے سلطان غازان خاں کو ان کی ذہانت اور فطانت پر تعجب ہوا۔ اور اسی وقت ان کو خلعت و مال سے سرفراز کیا۔ اور ماہانہ تین سو درہم بطور وظیفہ کے مقرر کر دے اور بادشاہ کے علاوہ امرا، وزرا، اور خواتین نے بھی ان کی قدر و منزلت کی۔

زباندانی کے علاوہ اس بے بصری کے حالت میں ان میں بعض عجیب و غریب خصوصیات نہایت حیرت انگیز تھیں۔ مثلاً وہ کتابوں کی تجارت کرتے تھے، اور اپنے پاس کتابوں کا وافر ذخیرہ رکھتے تھے۔ لیکن جب ان میں سے کسی کتاب کی فرمایش کی جاتی تو اپنے کتب خانے میں جاتے۔ اور تمام کتابوں میں سے مطلوبہ کتاب کو اس سرعت کے ساتھ نکال لاتے کہ گویا اس کو انہوں نے ابھی رکھا ہے۔ اگر وہ کتاب کئی جلدوں میں ہوتی اور ان میں سے مثلاً پہلی یا دوسری یا تیسری جلد طلب کی جاتی تو بعینہ وہی جلد اٹھا لاتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پہلے کتابوں کو ہاتھ سے چھوتے تھے۔ پھر کہتے تھے "کہ اس کتاب میں اتنے اجزا یا صفحے ہیں"، اور جو کچھ وہ کہتے تھے وہ صحیح نکلتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کتاب کے صفحے پر ہاتھ پھیر کر یہ بتا دیتے تھے کہ اس صفحے میں اتنی سطریں ہیں۔ فلاں جگہ جلی خط سے لکھا ہوا ہے۔ اور فلاں جگہ سرخ روشنائی کی کتابت ہے۔ اگر وہ کتاب مختلف الخط یعنے دو یا تین کاتبوں کی لکھی ہوئی ہوتی تو یہ بتا دیتے تھے کہ فلاں مقام سے فلاں مقام تک خط مختلف ہو گیا ہے۔ وہ جن کتابوں کو بہ غرض تجارت جمع کرتے تھے۔ ان سب کی قیمت ان کو صحیح طور پر معلوم رہتی تھی۔ جس کی وجہ یہ

تی کہ جب وہ کتابوں کو خریدتے تھے۔ تو ایک باریک کاغذ کا ٹکڑا لے کر ایک یا اس سے زیادہ حروف تہجی کی صورت میں اس کی پتلی سی بتی بنا لیتے تھے، اور چونکہ جمل کے حساب سے ہر حرف ایک عدد معین پر دلالت کرتا ہے۔ اور اسی طریقہ سے شعرا تاریخ نکال لیتے ہیں اس لئے کتاب کی قیمت کی جو تعداد ہوتی تھی اسی تعداد کے حروف کے مطابق یہ بتی بناتے تھے۔ اور اس کتاب کی جلد کے اندر چپکا دیتے تھے۔ اور جلد کے اوپر بھی اتنے ہی بڑا کاغذ چسپاں کر دیتے تھے۔ اس لئے جب کسی کتاب کی قیمت بھول جاتے تھے۔ تو انھی ابھرے ہوئے کاغذی حروف کو ٹٹول کر اس کو معلوم کر لیتے تھے۔[۵۱]

علامہ وجیہ الدین ابن الدھان الواسطی

زبان داں علما میں یہ دوسرے بزرگ ہیں ۵۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۱۲ھ میں وفات پائی۔ واسط میں علامہ ابو سعید نصر بن محمد بن مسلم مؤدب وغیرہ سے، اور بغداد میں ابن خشاب سے تعلیم حاصل کی۔ مدتوں کمال ابن الانباری کی صحبت سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اور ان کے سب سے زیادہ محبوب شیخ وہی ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد "نظامیہ" میں جو اسلام کا سب سے بڑا دارالعلوم تھا کئی سال تک نحو کی تعلیم دی۔ اور ان کے حلقۂ درس سے ایک جماعت فارغ التحصیل ہو کر نکلی۔ وہ عربی زبان کے ساتھ ترکی، فارسی، رومی، حبشی اور زنگی زبانیں بھی جانتے تھے۔ اور ایک عجمی طالب علم جب عربی میں معنی نہیں سمجھتا تھا تو اسکو عجمی زبان میں مطلب سمجھا دیتے تھے۔[۵۲]

ایک اور بزرگ علامہ فخر الدین فارسی اور ترکی زبان کے ماہر تھے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان سے اور لوگوں نے یہ دونوں زبانیں سیکھی تھیں۔ چنانچہ شیخ اثیر الدین ابو حیان فرماتے ہیں۔

"اور ہم نے انھی فخر الدین سے ترکی اور فارسی زبانیں لکھیں۔ اور وہ ان دونوں زبانوں کے عالم تھے۔ افراداً اور ترکیباً ان کو جانتے تھے۔ عربی دانی نے ان کو اس میں مدد دی تھی۔ انھوں نے بہت سے قصائد لکھے ہیں جن میں ایک قصیدہ ترکی زبان کے قواعد میں ہے۔"[۵۳] الخ

کیا ہمارے علما بھی عربی زبان کی اعانت سے اس قسم کا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں؟

---

۵۱ نکت الھمیان فی نکت العمیان للصفدی صفحہ ۲۰۷ - ۲۰۸

۵۲ نکت الھمیان ص ۲۳۳ - ص ۲۳۴

۵۳ کتاب مذکور ص ۲۷۴

دیول دیوی

(از مولانا مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر بھاؤ نگر کالج احمد آباد)

"راجہ کرن"، باگھیلہ راجپوت کا آخری راجہ تھا جو گجرات کے شہر پٹن یعنی انہل واڑا میں حکومت کرتا تھا۔
۶۹۷ھ میں دہلی کے شہنشاہ علاء الدین خلجی سے راجہ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ چنانچہ سنہ مذکور کے
بدائی مہینوں میں الماس بیگ الغ خاں جو سلطان کا بھائی تھا اور نصرت خاں جالیسری جو سلطان کا وزیر تھا،
م گجرات کے لئے مامور ہوئے۔ اور "مادھو" جو راجہ کرن کا وزیر تھا اور اس سے ناراض ہو کر دہلی چلا آیا تھا
ہری کے لئے ہمراہ کر دیا گیا۔ یہ دونوں ایک جرار لشکر لے کر راجہ کرن والئے گجرات پر حملہ آور ہوئے۔ راجہ
اہی لشکر کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور اپنے صدر مقام انہل واڑ[۵] کو چھوڑ کر بدحواسی کے ساتھ فرار ہو گیا۔
دہ باگلانہ (جو آج کل ضلع ناسک ملک خاندیس میں شمار کیا جاتا ہے) میں جا کر قیام کیا الغ خاں کو اس جنگ
ں مال غنیمت کے ساتھ راجہ کرن کی ایک رانی "کنولا دیوی" اور دوسری عورتیں بھی ہاتھ لگیں۔ جو اسیر
و کر دہلی میں آئیں۔ کنولا دیوی باقاعدہ سلطان علاء الدین کے حرم میں داخل کی گئی۔ اور اس نے بوجہ اپنی
بصورتی، خوش سیرتی اور سلیقہ مندی کے سلطان کے دل میں بہت قدر و منزلت پیدا کر لی۔ ۷۰۶ھ میں
ملک کافور حسب فتح دکن کے لئے جا رہا تھا۔ تو کنولا دیوی نے ایک دن موقعہ پا کر اور سلطان کو خوش دیکھ کر
درخواست کی کہ میری دو لڑکیاں جو وہاں چھوٹ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو خدام شاہی پر تصدق

---

۵ بعض گجراتی اور سنسکرت کتابوں میں درج ہے کہ یہ جنگ "اسادل"، کے پاس ہوئی۔ اور راجہ کرن باگھیلہ اسی جگہ
سے شکست کھا کر باگلانہ بھاگا۔ اور غالباً اسی سبب سے کنولا دیوی کو ساتھ نہ لے سکا جو معلوم ہوتا ہے کہ پٹن میں تھی
(۱) راجہ کرن کے بزرگوں کو اس زمانہ کے راجہ نے "باگھیل یا واگھیل"، نامی ایک گاؤں جاگیر میں
دیا تھا آہستہ آہستہ یہ طاقتور ہو کر راج دبا بیٹھے اور پھر مہاراجہ گجرات بن بیٹھے۔ اسی گاؤں کی مناسبت سے
لوگ انہیں باگھیلہ کہتے ہیں۔

ہو چکی ہے۔ مگر دوسری زندہ ہے۔ خون کے تعلق سے دل بے اختیار تڑپ رہا ہے اگر حضور کی توجہ ہو جائے تو میرا مطلب حاصل ہو سکتا ہے۔ بیٹی کو ماں کے ساتھ ملانے میں حضور سے قیامت کے دن کچھ مواخذہ ہوگا۔ امیر خسرو نے عشقیہ میں اس کو اسطرح شروع کیا،

شبے خوش دید داراے زمن را	ایک رات بادشاہ کو خوش دیکھ کر اپنے
بعرض آورد۔ راز خویشتن را	دل کا بھید یوں عرض کیا۔

"پھر آگے چل لڑکیوں کا تذکرہ کرتی"،

کہ از شاخِ جوانی بر درختم	کہ میرے درخت پر جوانی کی شاخ سے
دو غنچہ ناشگفتہ داشت بختم	میرا نصیب دو بن کھلی کلی رکھتا تھا۔

اس کے بعد اپنی خوش قسمتی کو اپنی نسبت اس طرح ادا کرتی ہے۔

شدم من خوش زبختِ روشن خویش	میں اپنی خوش نصیبی سے مسرور ہوں
ولی ماند آں دو گل در گلشن خویش	لیکن وہ دونوں پھول اپنے باغ میں رہ گئے۔

"اب وہ اصل مطلب ادا کرتی ہے"

دوم ماندہ ست و چون پیوند خون ست	دوسری زندہ ہے اور چونکہ وہ میری
دل من ہر آں خون بے سکون است	لخت جگر ہے بدین سبب میرا دل اُس کے
دمے گر مہر شہ بر بندد تا بد	لئے بے چین۔ اگر بادشاہ کی مہربانی میرے
بگرمی خوں بخوں پیوند ماند	اوپر ہو خون کے ساتھ خون ملکر سکون حاصل کرے۔

چونکہ سلطان علاء الدین اپنے بیٹے خضر خاں کے لئے پہلے ہی سے کسی عمدہ موقع کا متلاشی تھا اسلئے رانی کنولا دیوی کی یہ تجویز[1] اُس کو پسند آئی۔ رائے کرن کو رشتہ کا پیغام بھیجا گیا۔ اور اس۔

(مقدمہ دیول رانی مطبوعہ علی گڑھ)

[1] غالباً کنولا دیوی نے یہ دیکھا ہوگا کہ شاہزادہ خضر خاں کی ماں "ملکہ جہان" کا اقتدار بڑھتا جاتا ہے۔ کہیں ایسا نہ

نہایت خوشی سے اس پیغام کو منظور کیا۔ اور چاہتا تھا کہ شاہانہ جہیز کے ساتھ دیول دیوی کو دہلی روانہ کردے چنانچہ رائے کرن کی خوشی اور مسرت کو امیر خسرو رح اس طرح ادا کرتے ہیں۔

سر آرائے ملکِ ہندو آں کرن	ہندوؤں کے ملک کا راجہ کرن جو اُس
کہ بُد صاحبقران رائے دراں قرن	زمانہ میں اپنے وقت کا صاحبقران تھا
ازیں شادی کہ آمد ناگہانش	اس مسرت سے جو اسُ کو اچانک حاصل
نگنجید اندرونِ پوست جانش	ہوئی جامہ میں پھولا نہ سماتا تھا۔

لیکن پھر سلطان کی رائے بدل گئی، اور گجرات کو ممالک محروسہ میں شامل کرلینے کا فیصلہ کرلیا[۵۱]۔ غرض ملک کافور فتح دکن کے لئے مالوہ ہوتا ہوا گجرات پہونچا اور وہاں سے دکن چلا گیا۔ بموجب حکم سلطانی حاکم مالوہ اور گجرات اسُ کے ممد و معاون قرار پائے۔ حاکم گجرات نے بگلانہ کا محاصرہ کیا۔ الپ خاں اور پنج مین " کے علاوہ دوسرے سردار بھی اس میں جد و جہد اور سعی بے حد کررہے تھے۔ الپ خاں نے راجہ کرن کو پیغام بھیجا کہ دیول دیوی حوالہ کردو۔ تاکہ اسُ کی ماں تک پہونچا دی جائے راجہ کرن نے اسے نامنظور کیا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ٦٢٩) سلطان کا جو رجحان میری طرف بڑھ رہا ہے اس کے باعث مجھے کچھ نقصان پہونچے۔ یا بعد سلطان مجھے کوئی تکلیف اٹھانا پڑے۔ بدیں خیال اسُ نے یہ تدبیر سوچی دیول دیوی کی شادی خضر خاں کے ساتھ کردی اس صورت میں وہ بعد علاء الدین بھی آرام سے رہ سکتی ہے۔ کیونکہ خضر خاں ولی عہد اور وارث تخت تھا۔

۵۱ رانی کنولا دیوی کی یہ تجویز اور راجہ کرن کی رضامندی کسی معتبر تاریخ میں مذکور نہیں ہے۔ اس لئے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ معاملات پنج کے طور پر طے ہوئے تھے۔ اور غالبًا یہ معاہدہ ہوا ہوگا کہ گجرات کا راج کرن کو واپس دیا جائے اور وہ دیول دیوی سے خضر خاں کی شادی کردے۔ غالبًا اسی سبب سے وہ راضی ہوگیا تھا۔ اسُ نے دلمیں خیال کیا ہوگا کہ ایسا سمجھوں گا کہ ترک میری ایک لڑکی کو اٹھا لے گئے۔ جیسا کہ فیروز شاہ تغلق کی ماں نے اپنے خاندان کو یہ فقرہ کہکر تسکین دی تھی لیکن پھر سلطان کی رائے کیوں بدلی؟ میرے خیال میں ملکہ جہاں نے اس جوڑ کا توڑ کیا۔ یعنی اپنے بھائی الپ خاں کی لڑکی سے شادی کرنے کے لئے اسُ نے ان تمام تدبیروں کو درہم برہم کرڈالا۔ اور جب سلطان کا ارادہ بدل گیا اور الپ خاں کی لڑکی سے نسبت پختہ ہوگئی تو گجرات ممالک محروسہ میں داخل کرلیا گیا۔ تاہم کنولا دیوی کی خاطر دیول دیوی کو دہلی لے آنے کا حکم صادر کردیا

اس سے قبل کا واقعہ یہ ہے کہ راجہ کرن جب شکست پاکر خاندیس کی سرحد پر پہونچا تو اس نے دیوگڈھ (دولت آباد) کے راجہ رام دیو سے مدد کی درخواست کی۔ مگر اس نے مدد دینے کا کوئی وعدہ نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا کرنا علاء الدین خلجی سے جنگ مول لینا ہے۔ لیکن اس کے لڑکے شنکر دیو نے راجہ کرن کو اس کی لڑکی سے شادی کا پیغام بھیجا مگر چونکہ شنکر دیو[51] مرہٹہ تھا۔ اور راجہ گجرات راجپوت، اور راجپوت اپنے کو مرہٹوں سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کرن باگھیلہ نے انکار کر دیا۔ اب جو دیول دیوی کی مانگ علاء الدین کی طرف سے ہوئی تو راجہ سمجھ گیا۔ کہ میرے پاس لڑکی رہی تو ایک نہ ایک دن ضرور چھن جائے گی۔ ادہر الپ خاں ناظم گجرات نے ایک بڑی فوج کے ساتھ پے در پے حملوں سے راجہ کرن کو پریشان کر ڈالا۔ دو ماہ تک جس طرح سے ہوا۔ راجہ مدافعت میں سرگرم رہا۔ اسی درمیان شنکر دیو نے اپنے باپ کی بلا اجازت اپنے بھائی بھیم دیو کو بڑے بیش قیمت تحائف کے ساتھ راجہ کرن کے پاس بھیجا۔ کہ "آریہ راجپوت اگرچہ ترکستان ہی سے آئے ہیں اور اس لئے ترکوں کے ہم قوم ہیں۔ پھر بھی مذہبی مخالفت کے سبب ایک دوسرے سے ملنا بہت دشوار ہے۔ اور ہم تمہارے ہم مذہب ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم لڑکی کو میرے عقد میں دیکر روانہ کر دو۔ تاکہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ اور ترک کوچ کر جائیں"

راجہ کرن نے دیوگڈھ سے فوجی امداد کی امید پر دیول دیوی کو تمام شرائط طے کرکے بھیم دیو کے سپرد کر دیا۔ اور وہ لے کر غیر معروف راستہ سے دیوگڈھ روانہ ہوگیا[52]۔ ادہر ناظم گجرات کو یہ حال معلوم ہوا۔ تو بہت مضطرب ہوا۔ کہ اس پری کو دیو اڑا لے گیا، تو پھر میں بادشاہ کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ رہونگا۔ یہ خیال کرکے کرن باگھیلہ پر اس سختی سے حملے شروع کئے[53]، کہ بے چارہ تمام سامان چھوڑ کر حیران پریشان بھاگ نکلا

---

[51] مورخوں نے اس کے نام مختلف لکھے ہیں۔ کسی نے سنگل دیو، اور کسی نے سنکھن دیو، اسی طرح اس کے بھائی کا بھیلم دیو، حالانکہ صحیح گجراتی نام "شنکر دیو، اور بھیم دیو ہے (دیکھو کتاب "کرن باگھیلہ") گجراتی مصنفہ رجسٹرار آف ودیا پیٹھ احمد آباد۔

[52] یہ تمام حالات فرشتہ سے لئے گئے ہیں۔ اور کہیں کہیں دوسری تاریخوں سے بھی کافی مدد لی ہے۔

[53] جناب مولوی رشید احمد صاحب انصاری جنہوں نے ایک مفید مقدمہ "دول رانی خضر خاں"، معروف بہ مثنوی عشقیہ پر لکھا ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گجرات پر دو دفعہ حملہ کیا گیا۔ اول دفعہ جبکہ کنولا دی ہاتھ آئی اور بار دوم

اور دیوگڈھ کی راہ لی۔ ناظم گجرات بھی تعاقب کرتا ہوا دیوگڑھ سے ایک دن کی راہ پر آگیا۔ مگر گوہر مقصود ہاتھ آیا۔ حیران تھا کہ کیا کرے۔ تقریباً مایوس ہوچکا تھا۔ دریا کے کنارے دیوگڑھ کے قریب خیمہ زن تھا۔ کہ ہراول کے چار سو سپاہی جو سردار "پنچ من" کے ماتحت تھے، اجازت لے کر غار آلورا دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے اتفاقاً وہاں ہندوؤں کی فوج پر نظر پڑی اور غلطی سے ایسا سمجھا کہ راجہ رام دیو کی فوج نے ہم پر چھاپہ مارنے کا قصد کیا ہے۔ حالانکہ یہ فوج بھیم دیو کی تھی۔ جو دیول دیوی کے ساتھ غیر معروف پہاڑی راستہ سے دیوگڑھ کے قریب پہونچ چکی تھی۔ ترک فوراً جنگ کے لئے تیار ہوگئے اور تیر اندازی شروع کردی۔ ا۱

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴۱) جبکہ دیول دیوی پر قبضہ ہوا۔ حالانکہ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ گجرات پر حملہ صرف ایک ہی دفعہ ہوا اور دوسری جنگ باگلانہ میں ہوئی جو ناسک ضلع میں واقع ہے اور آجکل جس کو "ستانہ" کہتے ہیں۔ اور اس آخری جنگ میں ناظم گجرات خود شریک تھا۔ فرشتہ میں صاف لکھا ہے "کہ رایان دکن کی سرکوبی کے لئے جب فوج ملک کافور لے کر چلا کنولا دیوی نے دیول دیوی کے متعلق بات کہی۔ سلطان نے ناظم مالوہ و ناظم گجرات کو ملک کافور کی اطاعت اور مدد کے لئے اور دیول دیوی کو حاصل کرنے کے لئے تاکید کی۔ پھر لکھتا ہے "الغ خاں ناظم گجرات" نے گجرات سے فوج لے کر بگلانہ (باگلانہ) کا قصد کیا۔ اور رائے کرن نے جنگ کرکے دو ماہ تک اپنا مقام بچایا" تاریخ بدایونی میں ہے:

"نہروالا (انہل واڑہ) را بعد از ہزیمت رائے کرن نہب و غارت کردہ تعاقب آں نمود۔ و رائے کرن در پناہ رائے بیرم دیو (رام دیو) کہ والی دیوگیر (دیوگڑھ) بود از ولایت دکن پیوست" پس جب دکن چلا گیا اور پھر گجرات آنا یا قبضہ کرنا اس کا ثابت نہیں ہوتا تو دوبارہ حملہ گجرات کیا معنی؟ ضیاء برنی لکھتا ہے کہ در سال سوم جلوس علائی (۶۹۷ھ) الغ خاں و نصرت خاں با اُمرا و سرلشکران و حشم بسیار جانب گجرات لشکر کشیدند، نہروالا و تمام گجرات را نہب و تاراج کردند و کرن رائے گجرات از نہروالا گریخت و بر رام دیو در دیوگیر (دیوگڑھ) رفت" گجرات کی عربی تاریخ ظفر الوالہ میں ہے فلما کانا بالقرب من نہروالا خرج الیھما (یعنی الغ خاں و نصرت خاں) صاحبھا الرائے کرن، وکانت منہم شدۃ۔ انجلت بہزیمۃ الرائے الی دیوگیر واستاسر اہلہ۔ ان تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوگیا کہ راجہ کرن پھر دوبارہ حدود گجرات میں داخل نہیں ہوا جس سے جنگ دوم گجرات میں ہوتی۔ البتہ گجراتی تاریخوں سے اسقدر واضح ہوتا ہے کہ الغ خاں کے چلے جانے کے بعد گجرات میں بلوہ ہوگیا۔ جسکو جلد رفع کردیا گیا اور الپ خاں کے مستقل گورنر بنانے پر تمام گجرات میں امن ہوگیا۔

باوجود کثرت فوج کے بھی ترکوں کے تیروں سے عاجز آکر بھاگنے لگی۔ اور تھوڑی دیر میں فوج اِدھر اُدھر منتشر ہوگئی۔ اسی ہنگامہ میں ایک ایک تیر دیول دیوی کے گھوڑے کو لگا جس سے وہ زخمی ہوگیا۔ سپاہیوں نے اس پہ ہجوم کیا۔ اور اس کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک لونڈی نے کہا کہ دیکھنا یہ راج کماری دیول دیوی ہے، اس کا ادب رکھو۔ یہ سنتے ہی تمام سپاہیوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی سردار "پنچ من"، کو اپنی اس کامیابی پر بڑا فخر حاصل ہوا۔ اس نے فوراً محافہ میں سوار کرایا اور ناظم گجرات کے پاس لے گیا۔ ناظم گجرات کو بھی بے انتہا مسرت ہوئی۔ فوراً وہاں سے گجرات روانہ ہوگیا، اور پٹن پہونچ کر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شاہزادیوں کے مانند روانہ کیا اور اسی سال کے آخر میں اپنی ماں کنولا دیوی شاہ بیگم کے پاس پہونچ گئی۔ جس کے دیکھنے سے بیگم کو بے انتہا مسرت ہوئی۔ دیول دیوی محل سرا میں داخل ہو کر خاص قصر شاہی میں رہنے لگی۔ شاہزادہ خضر خاں چونکہ بچہ تھا۔ اور دیول دیوی بھی چھوٹی تھی اس لئے اکثر اوقات دونوں ساتھ کھیلا کرتے تھے[۱]

ایک دن سلطان نے خلوت میں خضر خاں کو طلب کیا اور ملکہ جہاں[۲] (مابک بیگم) کو اشارہ کیا کہ تجویز ہوئی ہے اس کو ظاہر کر دینا چاہئے۔ ملکہ جہاں نے کہا کہ حضور کا منشا رمبارک ہے کہ تمہاری شادی دیول دیوی سے کر دی جائے۔ خضر خاں مارے شرم کے کچھ نہ کہہ سکا، اور چپ چاپ باہر چلا آیا۔ لیکن دیول دیوی کی محبت اس کے تمام رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

---

[۱] دیول دیوی کے متعلق مصنف مراۃ احمدی نے لکھا ہے "کہ جب دیول دیوی گرفتار ہوئی تو ہنوز خرد سال تھی، الغ خاں نے اپنی فرزندی میں قبول کر کے پرورش کی اور پھر بہ حکم سلطانی خضر خاں سے شادی کر دی" میرے خیال میں یہ بیان کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اول تو اُس کی ماں موجود تھی۔ غیر کے ہاں پرورش پانے کی حاجت ہی کیا تھی۔ پھر اسقدر اصرار کے ساتھ کنولا رانی نے اسکو منگوایا تھا۔ اُس نے کیسے گوارا کیا کہ وہ اسکی آنکھوں سے دور الغ خاں کے سپرد کر دی جائے۔ دوسرے الغ خاں فتح گجرات کے چھ سات ماہ بعد تو مر گیا وہ کیونکر بحکم سلطانی شادی کر سکتا تھا۔ اگر مان لیا جائے کہ الغ خاں سے مطلب الپ خاں ہے تو اول تو وہ گجرات میں رہتا تھا۔ اور بہ تحقیق معلوم ہے کہ دیول دیوی دہلی سے پھر کبھی گجرات نہ آئی۔ سوم خود الپ خاں کی بیٹی سے خضر خاں کی شادی ہوئی۔ تو کیا جانکر اپنی بیٹی کے ساتھ سوکن بھی داماد کو دیتا د[۲]

[۲] یہ نام ابن بطوطہ نے لکھا ہے جو ۷۲۸ھ میں بہ مقام مکہ اس بیگم سے ملا تھا۔ لیکن ظفر الوالہ میں برخلاف ابن بطوطہ کے اس

اس وقت دیول دیوی کی عمر آٹھ سال کی تھی[ملے] - اور خضر خاں دس سال کا دیول دیوی کو اس رشتہ کی کچھ خبر نہ تھی۔ مگر وہ اپنے بھائی کی شباہت کے سبب جو خضر خاں میں پائی جاتی تھی۔ خضر خاں سے محبت کرتی تھی۔ لیکن خضر خاں واقف تھا۔ کہ وہ کسی روز اس کی دولہن بننے والی ہے دونوں اکثر اوقات ساتھ رہتے تھے اور نہایت شوق سے کھیلا کرتے۔

جب دیول دیوی نے نویں برس میں قدم رکھا۔ اور خضر خاں بھی سن بلوغ کو پہونچتا ہوا معلوم ہوا۔ تو ایک روز سلطان نے ملکہ جہاں (ماہک بیگم) کو بلا کر کہا کہ ماشاء اللہ اب خضر خاں جوان ہو گیا ہے۔ اس کی شادی کی فکر ہونی چاہئے۔ آخر باہمی مشورہ سے یہ قرار پایا کہ خضر خاں کے ماموں الپ خاں کی لڑکی سے رشتہ کا پیام بھیجا جائے، جو ملکہ جہاں کی بھتیجی تھی۔ الپ خاں نے نہایت فخر اور خوشی سے اس رشتہ کو منظور کیا۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو نے اس کو اس طرح لکھا ہے۔

الپ خاں کاں بلندی یافت از بخت پذیرفت آں مبارک مژدہ از تخت	الپ خاں جس نے اپنے نصیب کو بلند مرتبہ پر پایا تخت شاہی کی طرف سے اس مبارک خوشخبری کو قبول کیا۔

قصر شاہی کی مستورات پر جب یہ راز ظاہر ہوا۔ تو خیر اندیشی اور نیک خواہی کی راہ سے ان کی ایک جماعت ملکہ جہاں کی حضور میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی۔ کہ الپ خاں کی لڑکی بھی کوئی غیر نہیں ہے - وہ بھی آپ ہی کی لڑکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خدا نہ خواستہ اس کو کوئی تکلیف یا رنج پہونچے - یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ اس سے لاپروائی یا غفلت برتی جائے، خضر خاں کا رشتہ جب سے اعلیٰ حضرت (سلطان علاء الدین خلجی) نے دیول دیوی کے ساتھ کر دیا ہے اسی کے نام پر والہ و شیدا ہے - دوسری لڑکیوں کی طرف مطلق اس کو توجہ نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ دونوں کو الگ کر دیا جائے۔ چنانچہ دونوں کے لئے جدا جدا مکان مقرر کر دیا گیا۔ ہفتہ عشرہ میں گاہ گاہ ملاقات ہوتی تھی۔ لیکن جب خضر خاں اور دیول دیوی کے عشق

ملے دیول دیوی کی نسبت امیر خسرو نے آٹھ سال لکھا ہے۔ لیکن عام مورخین اس بارے میں جو لکھتے ہیں آگے چل کر اس کے متعلق کافی بحث کروں گا۔ اور کتب تاریخی کے تتبع سے جو میری رائے قائم ہوئی ہے اس کا بھی اظہار کر دونگا۔

محبت کا چرچا شاہی محل میں زیادہ ہونے لگا۔ اور ملکہ جہاں کو اس کے متعلق متواتر خبریں ملنے لگیں اور یہ واقعہ پایہ ثبوت کو پہونچ گیا۔ تو اُس نے حکم دیا کہ دیول دیوی لال محل میں بھیجدی جائے چنانچہ ملکہ جہاں کے حکم کے بموجب دیول دیوی کو سنگھاسن (تخت رواں) میں بٹھا کر مع سہیلیوں اور کنیزوں کے لال محل کی جانب روانہ کر دیا۔ اس واقعہ کی خبر فوراً خضر خاں کو پہونچی، خضر خاں اُس وقت اُستاد کی خدمت میں حاضر تھا، اُس وقت یہ سن کر جو حالت ہوئی ہے وہ بہت دردناک ہے۔ غرض یہ وحشت ناک خبر سنکر شاہزادہ مکتب سے بے تحاشا بھاگا، اور رانی دیول دیوی کے سکھپال (تخت رواں) کو جا پکڑا۔ دونوں مل کر خوب روئے اور طرفین سے محبت کی نشانیوں کا تبادلہ ہو کر ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ خضر خاں کا رشتہ دیول دیوی سے اگرچہ سلطان کر چکا تھا۔ مگر بہ مشورہ والدہ خضر خاں (ملکہ جہاں) یہ معرض التوا میں پڑ گیا۔ اور آلپ خاں کی لڑکی سے شادی قرار پا گئی۔ اور اس کا سامان ہونے لگا تین سال تک متواتر اس کی تیاری ہوتی رہی۔ جب وقت آیا تو اس جشن شادی میں تمام شہر اور کوچہ بازار کی آرائش کی گئی۔ جا بجا ڈیرے، خیمے، استادہ کیے گئے۔ اور زرین پردے اور شامیانے برپا کیے گئے تمام در و دیوار پر عجیب و غریب نقوش و تصاویر آویزاں و نمایاں کیے گئے۔ اور تمام گلی کوچوں میں ریشمی فرش بچھائے گئے۔ غرضیکہ نوبت اور شادیانے، تلوار اور خنجر کے کرتب دکھانے والوں کے اکھاڑے، نٹوں اور شعبدہ بازوں کے تماشے، گیند کا آسمان میں اُچھالنا، تلوار کو پانی کی طرح نگل جانا، ناک کے راستہ چاقو چڑھا لینا، بہروپیوں کے سانگ، ولایتیوں[۱] اور ہندوستانیوں کے راگ و باجے، ہندوستانی گانیوالیوں کے ناچ اور راگ کی محفلیں، جا بہ جا منجنیقوں کا نصب کیا جانا، اور اُن سے روپیوں اور اشرفیوں کی بارش کا ہونا، یہ تمام باتیں ہیں جن سے اس جشن کو ترتیب دی گئی[۲]۔ منجموں کی ساعت سعید مقرر ہو چکنے پر شمس الحق خضر خاں گھوڑے پر سوار ہوا۔ تمام اُمرا ارکان دولت پا پیادہ ساتھ ہوئے۔ ہاتھیوں پر زرین عماریاں کسی ہیں، اور چاروں طرف برہنہ تلواروں اور خنجروں سے نظر بد کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ راستے میں موتیوں اور جواہرات کی بکھیر ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جلوس آلپ خاں کے مکان پر پہونچا، شاہزادہ

---

[۱] ولایتی سے مراد ترکی اور افغانی ہیں۔ کیونکہ اُس زمانہ میں فرنگیوں (یورپین) کا نام و نشان بھی ہند میں نہ تھا۔ ۱۲

[۲] جشن کی تفصیل فقط اس لئے لکھدی ہے کہ اس سے اُس زمانہ کی تہذیب اور جشن کا حال معلوم ہو۔ ۱۲

نے مسند پر جلوس فرمایا اور تمام اراکین دولت اپنے اپنے درجوں کے مطابق دائیں اور بائیں بیٹھے، ۲۳ رمضان المبارک ۷۱۱ھ کو صدر جہاں نے منجموں کی بتائی ہوئی ساعت سعید میں خطبۂ نکاح پڑھا اور ایک گراں قدر مہر پر عقد ہوگیا۔ تمام حاضرین پر موتیوں اور جواہرات کی بکھیر ہوئی، لوگوں کو قیمتی انعامات سے مالامال کردیا گیا اور بعد فراغت نکاح یہ جلوس اسی ترتیب سے واپس آیا۔ غرّہ ذی الحجہ شب دوشنبہ ۷۱۱ھ حسب مقرر منجمین ایک پہر رات گذرنے کے بعد شاہزادہ محل میں داخل ہوا زرنگار فرش پر ایک پر تکلف کرسی بچھائی گئی، اور اس پر شاہزادہ بٹھایا گیا۔ موتی اور جواہرات نچھاور کیے گئے۔ موتیوں کے نورانی سیارے فضا میں سرگرم سیر تھے کہ اچانک سامنے سے ابر دور ہوگیا (یعنی دولھن کی رونمائی ہوئی) یہ تمام باتیں ہوئیں۔ لیکن خود خضر خاں کے دل کا کیا حال تھا اسکو حضرت امیر خسرو کی زبانی سُنئے؟

همه شاداں ز خضر خاں غم اندیش — غمگیں خضر خاں سے سب کوئی خوش تھا

خضر خاں هم۔ ولیکن با غم خویش — خود خضر خاں بھی۔ لیکن اپنے غم کے سبب

نه از خویش و نه از خویشا خبر داشت — اپنے آپ اور قرابتداروں کی خبر نہ رکھتا تھا

که تن آں جا، و دل جائے دگر داشت — کیونکہ اسکا جسم اس جگہ مگر دل دوسری جگہ (دیول دیوی

گو خضر خاں کی شادی ہوگئی۔ مگر اُس کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ وہ شرم کے سبب اپنے ماں باپ کے منشا کے خلاف لب کشائی نہ کرسکا اور یہ ایسی بات تھی جو ملکہ جہاں اور قصر شاہی کی مستورات کو اچھی طرح معلوم تھی۔ مگر غالباً وہ سمجھتی تھی کہ شادی کے بعد دیول دیوی کو فراموش کردیگا۔ لیکن ان کا خیال غلط ثابت ہوا۔ خضر خاں کا عشق اور اُس کی شیفتگی دن بدن بڑھتی گئی۔ جب معاملہ حد سے گذر گیا اور خضر خاں نے دیکھا کہ والدین کی غفلت بدستور ہے تو مجبوراً اُس نے اپنے ایک محرم راز کو اپنی والدہ ملکہ جہاں کے پاس بھیجا۔

اس نے خضر خاں کی حالت زار اس طرح ظاہر کی کہ ملکہ اُس سے بے حد متاثر ہوئی۔ پھر اُس نے کہا بھتیجی کی خاطر اپنے لڑکے کو ہلاک کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ یہ سُن کر ملکہ جہاں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ آخر کار ملکہ جہاں نے سلطان علاء الدین خلجی سے اجازت طلب کرکے گھر کے چند خاص آدمیوں کی موجودگی میں خضر خاں اور دیول دیوی کا نکاح ہوگیا۔

چنانچہ مثنوی عشقیہ میں ہے۔

نهفته با درونی خاصه چند — چند مخصوص آدمیوں کے روبرو
نشست و عقد کابین کرد پیوند — خفیہ طور پر عقد ہوگیا۔

خضر خاں جب اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو اس کی حالت میں ایک تبدیلی واقع ہوئی۔ اس نے
ہیات سے توبہ کرلی۔ اور حضرت نظام الدین بدایونی سے بیعت کرکے ان کے مریدوں کے حلقہ میں
ہوگیا۔ اور عبادت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ عرصہ تک یہی حال رہا، آخر جب علاء الدین خلجی بیمار ہوا۔[۱]
رخاں نے نذر مانی کہ اگر سلطان کی صحت ہوئی تو پاپیادہ ہتناپور (شاید دہلی کے پاس کسی بزرگ کا مزار تھا)
یارت کو جاؤنگا۔ اور سلطان کو جب قدرے صحت ہوئی تو اپنی منت پوری کرنے کو روانہ ہوا ملک کافور
(جو اس وقت نائب ملک تھا) بادشاہ کو خضر خاں سے ناراض کرادیا، جو صرف عیادت کے لئے
ان کے پاس آیا تھا۔ اور اسی طرح اس کے خسر الپ خاں کو قتل کرادیا، جس کو سلطان نے گجرات
عض مشورہ کے لئے بلایا تھا۔ چنانچہ خضر خاں کو حکم دیا گیا کہ فوراً امروہہ چلا جائے، اور بلا طلب ہرگز دہلی
ئے۔ جب میرٹھ پہونچا تو اس سے ولی عہدی کے علامات، چتر، دورباش وغیرہ بھی واپس کرنے کا حکم ملا۔
ہ ملک حسام الدین کے سپرد کرکے وہ امروہہ چلا گیا۔ جہاں پہونچکر وہ سخت رنج والم میں مبتلا رہا۔ جب کچھ سکون
تو اس نے غور کیا اور سمجھا کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ وہ عتاب شاہی کی تلخی سے ناواقف تھا۔ اس نے
ل کیا کہ بے خطا ہونے کے سبب سلطان کی ناخوشی کا ایسی حالت میں اندیشہ نہ ہونا چاہئے۔ یہ سوچ کر
سب فوراً دہلی پہونچکر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ سلطان اس وقت اس کے آنے سے بہت خوش
۔ اور پدرانہ شفقت سے گلے لگایا۔ اور معذرت کی۔ لیکن چند روز کے بعد جب خضر خاں غافل ہوگیا اور
ں و عشرت میں مشغول ہوکر دربار کی پابندی ترک کردی تو نائب ملک، کافور کو موقع مل گیا۔ اس نے کہا کہ خضر خاں
شادی خاں بعض امرا کی سازش سے آپ کی جان لینے کے خواہاں ہیں۔ اور چند غلاموں اور خواجہ سراؤں
اس کی تائید کرادی۔ سلطان نے حکم دیا کہ خضر خاں اور شادی خاں قلعہ گوالیار میں قید کئے جائیں۔ اور
جہاں کو بھی محل سرا سے نکال کر پرانی دہلی میں بھیجدیا گیا، ان واقعات سے، اور نیز ملک کافور کی بدعنوانیوں
ملکی بغاوتوں کی جو خبریں متواتر آنے لگیں تو علاء الدین کی علالت بڑھتی گئی، حالت روز بروز ردی ہوتی

ضیا برنی مرض استسقا رکھتا ہے۔ اور بدایونی سل ودق تجویز کرتا ہے۔

جاتی تھی اور کسی طبیب کی دوا کارگر نہ ہوتی تھی، آخر اسی حالت میں مورخہ ۷ شوال ۷۱۵ھ میں علاء الدین نے وفات پائی[۵۱] دوسرے دن ملک کافور خضر خاں کے چھوٹے بھائی شہاب الدین کو جس کی عمر سات سال کی تھی، تخت پر بٹھا کر خود حکومت کرنے لگا، اور ملک سنبل کو باربکی کا عہدہ دے کر فوراً گوالیار روانہ کیا کہ خضر خاں اور شادی کی آنکھیں بے نور کر دے، چنانچہ گوالیار پہونچ کر اس کے سپاہی آنکھوں کو بے نور کر دیتے ہیں۔ ملک کافور چاہتا ہے کہ خضر خاں کے تیسرے بھائی مبارک خاں کا بھی کام تمام کر دے، لیکن تقدیر نے تدبیر پلٹ دی اور جن لوگوں کو قتل کے لئے مقرر کیا تھا، ان لوگوں نے رات کے وقت جب سب لوگ اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے، ملک کافور کے خیمہ میں گھس کر اس کو قتل کر ڈالا، خضر خاں کو جب اس کی خبر ملی تو خدا کا شکر کیا۔ مگر کچھ خوش نہ ہوا۔ مبارک خاں اس واقعہ سے دو ماہ تک اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین عمر خاں کی نیابت میں اور پھر روز یکشنبہ ۲۴ محرم ۷۱۶ھ کو تخت پر رونق افروز ہو کر کاروبار سلطنت انجام دینے[۵۲] اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ خطاب اختیار کیا۔ اور شہاب الدین کو اندھا کر کے گوالیار خضر خاں کے پاس روانہ کر دیا۔ اور پھر اپنے جلوس کے دوسرے سال ۷۱۸ھ میں فوج کشی دکن کے واپسی کے وقت جب بہ مقام جھائن پہونچا[۵۳] تو ملک شادی سر سلاحدار کو گوالیار روانہ کیا، تاکہ جملہ شاہزادوں کو قتل کر کے ان کے اہل و عیال کو دہلی لے آئے۔ اس قتل کا اصلی سبب تو وہ سیاسی مصلحت تھی جو ملک اسد الدین (سلطان علاء الدین کا بھتیجا) نے سازش قتل مبارک شاہ کر کے پیدا کر دی تھی، لیکن خضر خاں پر اس وقت تک کوئی بیا جرم ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس لئے مبارک شاہ نے ایک نیا حیلہ تراشا یعنی دیول دیوی کو طلب کیا۔ جس کے جواب میں خضر خاں نے شاہی حکم ماننے سے قطعاً انکار کر دیا۔ اس جواب کو امیر خسرو کی زبان سے سن لیجئے۔

کہ شہ را ملک رانی چوں وفا کرد
دول رانی بہ من بائد رہا کرد

کہ بادشاہ کے ساتھ جب "سلطنت" نے وفادار
تو دول رانی (دیول دیوی) "کو مجھے بخشدینا چاہ

---

[۵۱] عام مورخین ۷۱۶ھ لکھتے ہیں (یہ سن مثنوی عشقیہ کی ہے)

[۵۲] مقدمہ دول رانی میں یہ سن ہے ورنہ عام مورخین ۷۱۶ھ لکھتے ہیں ۱۲

[۵۳] اس حساب سے ۷۱۸ھ ہونا چاہئے ۱۲

چو با من ہمیست ایں یار جانی	جبکہ میرا دلی دوست میرے ساتھ ہے، تو پہلے
سر من دور کن، زاں پس تو دانی	میرا سر قلم کر لو، پیچھے تم جانو!

دشاہ اس جواب سے طیش میں آکر۔ ملک شادی کو حکم دیا کہ فوراً گوالیار جاکر شاہزادوں کو قتل کر دے ناپچہ ملک شادی ایک رات دن میں مسافت طے کرکے گوالیار پہونچا۔ اور شاہی حکم سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ ستورات میں شور قیامت برپا ہوا۔ شاہزادے سامنے لائے گئے قتل کا حکم دیا جاتا ہے مگر کسی کی ہمت ہیں پڑتی ہے۔ آخر کار ایک پنچ ذات کا ہندو اپنے افسر سے تیغ آب دار لے کر خضر خاں کو قتل کرتا ہے۔ ور اس کے بعد دوسرے شاہزادوں کی باری آتی ہے اور قتل کئے جاتے ہیں اور اُنکی لاشیں بصد حسرت س قلعہ گوالیار کے ایک برج میں جس کا نام نبے مبدرہے دفن کی گئیں" (مترجم)

اسلامی مورخوں کے تحریر کے بہ موجب دیول دیوی ۶۹۳ھ میں پیدا ہوئی۔ وہ چار سال کی تھی کہ آغوش در سے محروم کر دی گئی۔ اپنی زندگی کے تیرھویں دور کو ختم کر رہی تھی کہ دہلی پہونچی۔ اٹھارہ اُنیس برس کی عمر میں خضر خاں سے اس کا نکاح ہوا۔ تقریباً چوبیس زینے عمر کے طے کر چکی تھی کہ اپنے عزیز از جان شوہر کے ساتھ قید خانہ پہونچی اور اسی سال اپنے محبوب کے ظاہر میں آنکھوں کو بے نور ہوتے ہوئے اپنی روشن آنکھوں سے دیکھا۔ چھبیس ۲۶ برس کے سن میں بیوہ ہوگئی۔ خضر خاں جب تک زندہ رہا رانی دیول دیوی نے بڑی وفاداری سے اُس کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ گوالیار کے جیل خانہ میں بھی ہم اُس کو دیکھتے ہیں۔ قطب الدین کی طلب پر بڑی آسانی سے ملک شادی کے ساتھ دہلی پہونچ کر شاہ بیگم بن سکتی تھی مگر اس نے تخت پر محبت کو ترجیح دی۔ اور وفاداری کے ساتھ زندگی کے آخری لمحہ تک خضر خاں کا اُس نے ساتھ دیا دیول دیوی رانی کے عمر کے متعلق مختلف تاریخوں کے تتبع سے جو سنین معلوم ہوئے ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

واقعات	سنہ	عمر	کیفیت
ولادت	۶۹۳ھ	۱	
حملہ گجرات	۶۹۷ھ	۴	امیر خسرو رح کے نزدیک حملہ گجرات کے وقت اسکی عمر
نسبت خضر خاں بہ دیول دیوی	۷۰۵ھ	۱۲	کل چھ ماہ کی تھی۔ اس حساب سے آخر تک ۴ سال کا فرق

کیفیت	عمر	سنہ	واقعات
رہتا ہے یعنی خسرو خاں کے وقت وہ ۲۴ سال کی تھی	۱۴	سنہ ۷۰۶ھ	حملہ باگلانہ
نکاح ماہ رمضان میں اور رخصتی ماہ ذی الحجہ میں ہوئی۔	۱۹	سنہ ۷۱۱ھ	شادی خضر خاں با دختر الپ خاں
یہ سنہ مقدمہ دولرانی میں ہے۔ بدایونی ۷۱۱ھ لکھتا ہے جو میرے	۲۱	سنہ ۷۱۳ھ	نکاح دیول دیوی با خضر خاں
نزدیک صحیح نہیں۔	۲۳	سنہ ۷۱۵ھ	قید گوالیار
	۲۴	سنہ ۷۱۶ھ	کور چشمی خضر خاں
	۲۵	سنہ ۷۱۷ھ	جلوس قطب الدین
	۲۶	سنہ ۷۱۸ھ	قتل خضر خاں
	۲۸	سنہ ۷۲۰ھ	قتل قطب الدین
	۲۸	سنہ ۷۲۰ھ	قتل خسرو خاں گجراتی

مولوی ذکار اللہ صاحب نے اپنی تاریخ ہند میں ایک روایت لکھی ہے کہ دیول دیوی خضر خاں کے بچانے میں خود بھی ماری گئی۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ خضر خاں کے قتل کے بعد ملک شادی تمام خاندان خلجی کے متعلقوں کو جن میں دیول دیوی بھی شامل تھی، دہلی لے آیا۔

گجرات کی عربی تاریخ ظفر الوالہ میں ہے کہ دیول دیوی مع اپنی والدہ کے دہلی پہونچا دی گئی۔ جہاں اسکی مرضی کے خلاف قطب الدین نے نکاح کر لیا۔ بعض تاریخوں میں تحریر ہے کہ قطب الدین کے قتل کے بعد وہ خسرو خاں کے تصرف میں آئی۔ بہرحال خسرو خاں کے وقت تک اس کی عمر ۲۸ برس کی تھی۔ اور یہ آخری بات ہے جو تاریخوں میں دیول دیوی رانی کے متعلق ملتی ہے۔ اس کے بعد کسی واقعات سے تاریخ خاموش ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ کب تک زندہ رہی۔ اور کب اس نے وفات پائی۔ ممکن ہے کہ خسرو خاں کے قتل کے وقت جو ہنگامہ برپا ہوا، اس میں کسی نے ہم وطن اور طرف دار سمجھ کر قتل کر دیا ہو۔ اور یہ بھی پردہ خفا میں ہے کہ آیا وہ صاحب اولاد تھی۔ یا اس سے محروم۔

اسی عہد میں (سنہ ۷۱۵ھ) مشہور شاعر حضرت امیر خسرو نے اس واقعہ کو نظم کر کے ایک کتاب لکھی

ہے جس کو عام طور پر لوگ مثنوی عشقیہ کہتے ہیں۔ لیکن خود امیر خسرو نے اس کا نام "دول رانی خضر خاں" رکھا ہے۔ اور اس تبدیلی کی وجہ یہ لکھی کہ اس پری پیکر کے نام کا اول حصہ لفظ "دیو" سے شروع ہوتا تھا۔ اس لئے اسکو بدل کر ہم نے دَوَل کر دیا۔ جو دولت کی جمع ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

دَوَل رانی کہ ہست اندر زمانہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ زطاؤسانِ ہندوستاں یگانہ

برسم ہندوی از نام نالبش ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دراوّل بود دیولدے خطابش

بنامِ آں پری چو دیورہ داشت ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ فسوں بندہ زآں دیوش نگہداشت

چناں رسمے بدل کردم مراعات ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ از ہندی عَلَم برزد بہندات

یکے علت در و لنگندم از کار ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ دیول را دول کردم بہ ہنجار

دول جمع دولتہاست در شمع ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دریں نامہ است دولتہا بے جمع

چو رانی بود صاحب دولت و کام ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دَوَل رانی مرکب کردمش نام

ہند میں اس کے مختلف نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ لیکن اس کتاب کا بہترین نسخہ ظاہر جس کے لحاظ سے وہ ہے جو خدا بخش خاں کی لائبریری (بانکی پور پٹنہ) میں ہے۔ جس کو نواب شہاب الدین احمد ناظم گجرات نے بمقام احمد آباد ۹۹۵ھ میں تیار کرایا۔ اور میر محمد شریف وقوعی نیشاپوری نے اسکی تصحیح کی۔ اسی مثنوی کو بڑی صحت کے ساتھ مع ایک بہترین مقدمہ کے مولوی رشید احمد صاحب سالم انصاری نے حسب منشا نواب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم سابق سکریٹری علی گڈھ کالج ۱۹۱۷ء میں شائع کرایا ہے جو بڑی تحقیق اور محنت سے لکھی گئی ہے۔

اردو کے پیغام گو شاعر

(از ابوالحسنات جناب غلام محی الدین صاحب قادری زورؔ، ایم ۔ اے)

(۱)

ہر زبان کا ادب کسی نہ کسی طرح سے اس کے بولنے والوں کی ذہنیتوں کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے۔ قوموں کے سیاسی اور معاشرتی رجحانات ان کی زبانوں اور ادبیات پر بھی اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء وہ سال ہے جس نے یہاں کے باشندوں کو ایک زبردست انقلاب سے روشناس کرا دیا۔

ہر عالیشان تمدن اور پرشکوہ سلطنت کے آخری ایام جن رنگ رلیوں اور بے ہودگیوں میں آلودہ رہتے ہیں وہ سب ۱۸۵۷ء سے قبل ہندوستان میں رائج تھیں۔ اردو کی خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ اس کو ایک ایسی قوم اور ایک ایسے ملک میں جنم لینے کا موقع ملا جس کی ذہنیتیں تمدنی اور معاشرتی نقاط نظر سے اپنی بساط کے موافق عروج کمال کو پہونچ چکی تھیں لیکن یہ بھی فطرت کا ایک عجیب معمہ ہے کہ جہاں کہیں کوئی چیز کسی ایک پہلو کے لحاظ سے ارتقائی مدارج طے کرنے میں مصروف رہتی ہے اس کے ساتھ ہی کسی دوسری صنف میں اسکو تنزل کی سیڑھیوں پر سے اترنا پڑتا ہے۔

سلطنتوں اور قوموں کو عروج کے زمانہ میں سخت کشمکش اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے اس لئے اُن کے افراد تازہ دم، سرگرم، ہوشیار اور مستعد رہتے ہیں لیکن جہاں ان کی کوششیں انھیں کامگاریوں کی صورتیں دکھانی شروع کر دیتی ہیں اور جہاں معاشرتی ذرائع آسان ہونے کے باعث تنازع البقا کے لئے کسی دوڑ دھوپ کی ضرورت باقی نہیں رہتی ان کی انفرادی اور اجتماعی حیثیتوں میں نقص پیدا ہونے لگتا ہے اور عیش و عشرت کے ایسے تخم پڑ جاتے ہیں جو بہت جلد سرسبز و شاداب درختوں کی شکل میں نمودار ہونے لگتے ہیں۔

ایسی صورت میں ادب و انشا کا متاثر ہونا بھی ایک لازمی امر ہے۔ چنانچہ ہماری زبان اردو بھی اپنے بولنے والوں کی ذہنیتوں سے کافی طور پر متاثر ہوگئی اور اس میں وہ تمام تکلف، تصنع اور لایعنی عناصر شامل ہوگئے جو اس زمانہ کی تہذیب اور آداب معاشرت کے اجزائے لاینفک تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کی شاعری کے متعلق حالی نے اپنے "مسدس" میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس حقیقت کے زبردست ترجمان ہیں

نے اردو کے شاعروں کو ایک طرف تو فارسی کی تقلید اور اس کے اثر کے باعث اور دوسری طرف ان کے (معا)شرتی اور سیاسی کاموں کی بنا پر اس قسم کی شعری تخلیق پر مجبور کر دیا تھا۔ حالی کہتے ہیں ؎

وہ شعر اور قصائد کے ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر — ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے — عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے — مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

سخن جو ہے یاں آج حصہ ہمارا — نہیں قوم کو ظلم اہرا جس سے چارا
ہر اک کذب و بہتاں ہجو جسمیں گوارا — مجسم ہوا اس کا اگر جھوٹ سارا
بنے ہند میں اس سے اور اک ہمالا
ہمالا سے ہو جس کی چوٹی دوبالا

زمانہ میں جتنے قلی اور نفر ہیں — کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور ہیں
گویئے امیروں کے نورِ نظر ہیں — ڈفالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں
مگر اس تپ دق میں جو مبتلا ہیں
خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

جو سُنتے نہ ہوں، جی سے جائیں گذر سب — ہو میلا جہاں، گم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ، گر شہر چھوڑیں نفر سب — جو تتر جائیں مہتر، تو گندے ہوں گھر سب
یہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے

طوایف کو از بر ہیں دیوان ان کے | گویوں پہ بے حد ہیں احسان ان کے
نکلتے ہیں نیکوں میں ارمان ان کے | ثنا خواں ہیں ابلیس شیطان ان کے

کہ عقلوں پہ پردے دیئے ڈال انھوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال انھوں نے

لیکن جب اس تمدن و معاشرت کا جہاز ایک غیر قوم کی حکومت و غلبہ کے تیز و تند طوفان میں غوطے کھانے لگا تو اس کی شاعری اور انشا پردازی کا گہرا اور شوخ رنگ بھی دُھل دُھلا کر دھندلا اور دھیما پڑنا شروع ہوا، یہی وہ عمل ہے جس نے بعض حساس ہستیوں کو اس خاص رنگ میں رنگ دیا جس پر ہم اپنے اس مضمون میں کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اور جس کی بنا پر ان خاص ہستیوں نے اپنے ملک و قوم کے آگے خاص خاص پیغام پیش کئے تھے۔

(۲)

۱۸۵۷ء کے قیامت خیز واقعہ کے بعد جہاں ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کی حالت نہایت دردناک ہوگئی تو جس طرح اُن کے بعض روشن خیال افراد قنوطیت کے بحر منجمد میں غرق ہونے لگے، چند ہمتوں نے مستعد ہو کر قوم کے اس ڈوبتے ہوئے جہاز کو بچانے کی بھی کوشش کی اس کا واحد ذریعہ ان کی نظروں میں سوائے اس کے اور کوئی نہ تھا کہ —— دریع الدہر کیف ما دار —— یا بقول غالب —— پھر و اس طرف کو جدہر کی ہوا ہو —— پر عمل کریں۔

ان یا بہت افراد میں جنھوں نے سب سے پہلے ان قدیم طرز معاشرت اور ادبیات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا سرسید، آزاد اور حالی سب سے زیادہ اہم ہیں سرسید کے وسیع جولانگہ عمل کے متعلق بحث کرنا اس وقت ہمیں مقصود نہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آزاد اور حالی کی اس قسم کی کوششوں اور ان کی نوعیت کے متعلق خیالات کا کچھ اظہار کریں۔

محمد حسین آزاد پہلے اردو ادیب ہیں جنھوں نے انگریزی خیالات سے متاثر ہو کر اردو کو بھی انگریزی نہج پر چلانے کا خیال پیدا کیا اور اس باب میں انھوں نے اس قدر خوش مذاقی اور بلند حوصلگی سے کام لیا کہ ان کی محنتوں کی بے اختیار داد نکل پڑتی ہے۔ انھوں نے نثر اور نظم دونوں کا اسلوب اگرچہ قدیم ہی رکھا لیکن ان کے مطالب بالکل بدل دیے۔

اردو دانوں کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کرنے کی یہ پہلی ادبی کوشش تھی۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ آزاد اپنی اس کوشش میں ایک حد تک ضرور کامیاب رہے۔ انہوں نے "نیرنگ خیال" میں نثر کے جو مضامین پیش کئے ہیں وہ بھی انگریزی خیالات کے جزواً وکلاً حامل ہیں اور ان مضامین کی طرح ان کی تمام نظمیں بھی اسی مقصد کی وفادار کارگذار ہیں۔

آزاد کی طرح حالی نے بھی اس کام کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں کرنل ہالرائڈ کی مرہون منت ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو بھی حقیقی شاعر ہوتا وہ ایسے زمانہ میں یقیناً وہی کام کرتا جو حالی نے کیا۔

حالی اپنے زمانہ اور قوم کی صحیح پیداوار تھے۔ اس زمانہ اور قوم کا اقتضا ہی یہ تھا کہ ایک حالی ضرور پیدا ہو جاتا۔ اگرچہ آزاد نے اس کام میں تقدیم کی لیکن پہلے تو انہیں اس میں کمال حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اور دوسرے یہ کہ نثر کی طرف (اور وہ بھی خاص قسم کی نثر کی طرف) متوجہ ہونے باعث ان کی شاعرانہ قوتیں حالی کی شاعرانہ قوتوں کے مقابلہ میں زیادہ سرسبز نہ ہو سکیں۔

آزاد دنیا میں شاعری کے لئے نہیں بھیجے گئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے جو کچھ شعری تخلیق کی ہے وہ معمولی درجہ کی بھی نہیں ہے لیکن صرف اسی پر آزاد کی تمام شہرت کا دارومدار نہیں کیا جا سکتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر آزاد کی نثری خدمات کو ان کی ادبی پیداوار سے علیحدہ کر لیا جائے تو پھر ان کی شخصیت کی وہ عظمت باقی نہیں رہتی جس کی خاطر آج ہم انہیں اردو کا ایک زبردست محسن اور اس کے عناصر خمسہ (سرسید، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد) میں شمار کرتے ہیں ان کی نظمیں انہیں دنیائے اردو میں ایک عظیم الشان حیات جاودانی نہیں بخش سکتیں۔ اس کے برخلاف اگر حالی سے ان کے نثری کارنامے علیحدہ بھی کر لئے جائیں تو ہماری نظروں میں ان کی وہی عظمت باقی رہتی ہے۔ اگر حالی نثر میں ایک سطر بھی نہ لکھتے تو بھی ان کا نام دنیائے اردو میں ہمیشہ روشن رہتا۔

(۳)

حالی نے جس ماحول میں نشو و نما حاصل کی اور اپنی زندگی میں انہیں جن جن خیالات سے سابقہ پڑا وہ ضرور اس قابل تھے کہ ان کی حساس طبیعت کو متاثر کر کے ان کی شاعرانہ قوتوں کو ابھار دیتے۔ وہ شخص جس نے اپنی آنکھوں سے ایک ایسا زمانہ دیکھا ہو جبکہ اس کے ہم وطن آزاد اور اغیار کی اطاعت سے قطعاً ناآشنا تھے، وہ شخص جس نے ایک ایسی فضا میں زندگی بسر کی ہو جبکہ اس کے ہم قوم حاکموں کی شان سے سر اونچا کئے پھرتے تھے

اور وہ شخص جو شہر دہلی میں شام کے وقت چاندنی چوک میں ہر طرف امیروں اور شریف زادوں کو اپنی اپنی قا[illegible]
آن بان اور تزک و احتشام کے ساتھ متفرق سواریوں پر نکلتے ہوئے دیکھتا تھا، جب انہی ہم وطنوں کو دو[illegible]
کے قبضہ اقتدار میں بیکس پاتا ہوگا اور انہی ہم قوموں کو اغیار کی غلامی میں خراب و خستہ حال دیکھتا ہوگا تو اس
دل پہ کیا گذرتی ہوگی؟

غدر کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کی تباہی جس درجہ تک پہونچ گئی تھی اس کا اظہار کرنا تو کجا مر[illegible]
خیال ہی سے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں کوئی مسلمان نظر آتا تھا انگریز حکام اس کو مجرم سمجھتے
ان کا خیال تھا کہ چونکہ ہندوستان میں پہلے مسلمانوں کی سلطنت تھی اسلئے صرف انہیں نے ہمارے خلا[illegible]
بغاوت کی۔ اسلئے وہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی جاگیریں، اراضیات اور مکانات دیئے گئے۔ غرض اس طرح مسلما[illegible]
تباہ و برباد کردیئے گئے بڑے بڑے شریف اور امیر خاندان منتشر ہو گئے۔ ان کی اولاد غریبوں سے بھی بدتر زند[illegible]
بسر کرنے پر مجبور ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس میں وہ تمام برائیاں پیدا ہو گئیں جو ایک ایسی محکوم اور غلام قوم میں خود بخو[illegible]
پیدا ہونے لگتی ہیں جو اپنی آزادی کے زمانہ میں بھی کاہل الوجود اور پست خیال ہونے کے علاوہ سیکڑ[illegible]
طرح کی بے ہودگیوں میں مبتلا ہو گئی۔

مولوی حالی نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کا جو دردناک مرقعہ پیش کیا ہے اس سے ہمیں غدر کے [illegible]
ہی مسلمانوں کی جو حالت ہو گئی تھی اس کا ایک صحیح مرقعہ نظر آجاتا ہے وہ کہتے ہیں ؎

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے　　کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آبا کو ہم سے گہن ہے　　ہمارا قدم ننگ اہل وطن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

نہ قوموں میں عزت، نہ جلسوں میں وقعت　　نہ اپنوں سے الفت، نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی، دماغوں میں نخوت　　خیالوں میں پستی، کمالوں سے نفرت
عداوت نہاں، دوستی آشکارا
غرض کی تواضع، غرض کی مدارا

نہ اہل حکومت کے ہمراز ہیں ہم　　نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم

نہ جلسوں میں شایانِ اعزاز ہیں ہم　　نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصّہ ہمارا ہے سوداگری میں

تنزل نے کی ہے بری گت ہماری　　بہت دور پہنچی ہے نکبت ہماری
گئی گذری دنیا سے عزت ہماری　　نہیں کچھ ابھرنے کی صورت ہماری
پڑے ہیں اک امید کے ہم سہارے
توقع پہ جنت کے جیتے ہیں سارے

مسلمانوں کی حالت پہ ایک نظر ڈالنے کے بعد حالیؔ نے اپنے ہم وطن ہندوؤں کی ارتقائی منازل کا بھی تذکرہ کیا ہے اس کے بعد ایک دو بند ملاحظہ ہوں :-

دکاں اُن کی ہے اور بازار اُن کا　　ٍبنج ان کا ہے اور بیوپار ان کا
زمانہ میں پھیلا ہے بیوپار ان کا　　ہے پیر و جواں برسرکار ان کا
مدار اہل کاری کا ہے اب انہیں پر
انہیں کے ہیں آفس، انہیں کے ہیں دفتر

جو گرتے ہیں گر کر سنبھل جاتے ہیں وہ،　　پڑے زد تو بچ کر نکل جاتے ہیں وہ
ہر اک سانچہ میں جاکے ڈھل جاتے ہیں وہ　　جہاں رنگ بدلا بدل جاتے ہیں وہ
ہر اک وقت کا مقتضا جانتے ہیں
زمانے کے تیور وہ پہچانتے ہیں

کیا ان اشعار سے اس امر پر کافی روشنی نہیں پڑتی کہ ہندوؤں نے انگریزی حکومت کے ہندوستان میں قائم ہونے کے ساتھ ہی انگریزی زبان کی تحصیل کی طرف اسی شوق اور سرعت کے ساتھ توجہ کی جس شوق اور سرعت سے انہوں نے مسلمانوں کے عہد حکومت میں فارسی کی طرف رغبت کی تھی اس کے برخلاف مسلمانوں نے ایک زمانہ تک انگریزی تعلیم کو باعث کفر قرار دیا، اور اگر سر سید جیسا باہمت شخص اُٹھ کھڑا نہ ہوتا تو نہ معلوم کتنے زمانہ کے بعد مسلمان انگریزی کی طرف متوجہ ہوتے؟

اسی سلسلہ میں حالیؔ جہاں اپنے ہم قوموں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ انگریزوں کی طرف

ٹر ہیں اور نہ صرف ان کی زبان بلکہ خیالات کی بھی تحصیل کی کوشش کریں، اس کے ضمن میں وہ اہل یورپ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں یہ چیز بھی نہایت موافق فطرت ہے وہ کہتے ہیں ؎

کسی وقت جی بھر کے سوتے نہیں وہ | کبھی سیر محنت سے ہوتے نہیں وہ
بضاعت کو اپنی ڈبوتے نہیں وہ | کوئی لمحہ بیکار کھوتے نہیں وہ
نہ چلنے سے تھکتے نہ اکتاتے ہیں وہ
بہت بڑھ گئے اور بڑھے جاتے ہیں وہ

کیا اس وقت کے مسلمان ایک ایسی قوم کے دوش بدوش رہ سکتے تھے جن کو صفات متذکرہ بالا ہوں؟ اس کے مقابلہ کے لئے اگر ہم "ضمیمہ" مسدس حالی کے وہ اشعار پیش کردیں تو نامناسب نہ ہوگا جن میں حالی نے مسلمانوں کی بے سر و سامانی کا خاکہ کھینچا ہے۔ اہل یورپ کی تذکرہ بالا حالت کے مطالعہ کے بعد جب اسلامیوں کی حسب ذیل حالت کا اندازہ کرنے پر کوئی شاعر مجبور ہو جائے تو کیونکر اس کے جذبات کو ٹھیس نہ لگتی ہوگی اور پھر کیوں وہ دردناک صدائیں بلند کرنے پر مجبور نہ ہو جاتا ہوگا؟ کہتے ہیں ؎

نہ پاس ان کے چادر، نہ بستر ہے گھر کا | نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا | صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا
کنول مجلسوں میں، قلم دفتروں میں
اثاثہ ہے سب عاریت کا گھروں میں

(۴)

ان حالتوں کے مدنظر کہاں تک کوئی شخص زندہ دل رہ سکتا ہے! چنانچہ حالی بھی قنوطیت میں غرق ہو گئے۔ اور اس امر کے اظہار پر مجبور ہو گئے کہ ؎

تباہی کے خواب آ رہے ہیں نظر سب | مصیبت کی ہے ہونے والی سحر اب

ساتھ ہی حالی کے انداز میں سوز و گداز پیدا ہو گیا۔ انہوں نے جب مسلمانوں اور اسلام کے متعلق مسدس لکھا تو اسکو پہلی دفعہ یاس پر ختم کر دیا چنانچہ از منۂ ماضیہ کے زبردست تمدنوں کے خاتموں کو پیش نظر کرکے انہوں نے اس امر کا اعلان کر دیا کہ اب مسلمانوں کی قوم دوبارہ ترقی نہیں کر سکتی۔ کس قدر دلخراش صدائیں ہیں!!

یہاں ہر ترقی کی غایت یہی ہے | سر انجام ہر قوم و ملت یہی ہے

صدا ہے زمانہ کی عادت یہی ہے　　　طلسم جہاں کی حقیقت یہی ہے
بہت یاں ہوئے خشک چشمے اُبل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

کہاں ہیں وہ اہرام مصری کے بانی　　　کہاں ہیں وہ گردان زابلستانی
گئے پیشدادی کدھر اور کیانی　　　مٹا کر رہی سب کو دنیائے فانی
لگاؤ کہیں کھوج کلدانیوں کا،
بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں کا

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے　　　جہاں کی وراثت اسی کو سزا ہے
سوا اس کے انجام سب کا فنا ہے　　　نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے
مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

حالی کے تمام کلام اور بالخصوص مسدس میں رنگینی اور تکلف دونوں نام کو بھی نہیں پائے جاتے ے کلام کی بڑی خصوصیت سادگی اور جوش ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ اس قسم کے طوفان میں زندگی رنے کے بعد حالی کی شاعری میں وہ رنگینی اور بانکپن نہیں پایا جاسکتا تھا جو غدر کے پہلے کے اکثر شاعروں ب تھا۔ یہ تو طبیعت کا اثر تھا اس کے علاوہ انہیں جن موضوعوں پر قلم اٹھانا پڑتا تھا وہ بھی ایسے نہیں تھے اس میں رنگینی اور تکلف سے کام لے سکتے۔

حالی تکلف اور تصنع کے لئے نہیں پیدا کئے گئے تھے یوں بھی دنیا کا کوئی شاعر اپنی طبیعت پر زور دیکر رجہ کے شعر نہیں پیش کرسکتا اکثر بہترین شاعرانہ شاہکار سے جوش و جذبہ ہی کے عالم میں نکل پڑتے ہیں چنانچہ نے بھی اپنے مسدس کو اپنی طبیعت کے مطابق یاس انگیز صداؤں پر ختم کردیا۔ یہ امر سرسید کو برا معلوم ایک ایسے انسان تھے جو ناامیدی اور قنوط کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے اور اگرچہ اس وقت ستان کے تمام مسلمان اپنی فلاح و بہبود سے قطعاً ناامید ہوگئے تھے لیکن سرسید ایک ایسی شخصیت نے امید کے دامن کو نہیں چھوڑا اور آفریں ہے ان کی ہمت پر کہ وہ اپنے مقاصد میں زیادہ حد تک ب رہے۔

سرسید نے مولوی حالی کو مجبور کیا کہ وہ اس مسدس کو دلخراش نالوں پر ختم نہ کر دیں بلکہ اس کے بعد ایک ضمیمہ لکھ کر امید افزا حالات کا ذکر کریں اور اپنی قوم کو ڈھارس دلائیں۔ چنانچہ حالی نے مسدس کا ایک "ضمیمہ" بھی ک اور اس میں امید سے خطاب کرتے ہوئے حسب ذیل ابتدائی بند کے ساتھ کائنات کے ان واقعات کا ذ جن میں تباہی اور بربادی کے بادل اُمڈ اُمڈ کر آئے لیکن پھر بہت جلد نکل گئے ؎

بس اے ناامیدی! نہ یوں دل بجھا تو — جھلک اے امید! اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو — فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو
ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں،

وہی حالی جنھوں نے اپنے زمانہ اور ماحول سے مجبور ہو کر "مسدس" کے لکھتے وقت آواز بلند کی تھ

امیروں کی تم سن چکے داستاں سب — چلن ہو چکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہے تم پر عیاں سب — بگڑنے کو بیٹھے ہیں تیاریاں سب
یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے،
ستوں مرکز ثقل سے ہٹ گیا ہے
یہ جو کچھ ہوا ایک ثمرہ ہے اس کا — کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانہ نے اونچے سے جس کو گرایا — وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا
نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

سرسید کے کاموں سے متاثر ہونے اور ان کی فرمائش پر جب اس مسدس کا ضمیمہ لکھتے ہیں تو ذیل امید افزا خیالات کا اظہار کرتے ہیں ؎

گر ہے ابھی یہ دیا ٹمٹماتا — بجھا جو کہ ہے یاں نظر سب کو آتا

. . . .

یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحط الناس — نہیں قوم کے پر سب افراد یکساں
سفال و خذف کے ہی انبار گریاں — جواہر کے ٹکڑے بھی ہیں اس میں پنہاں

چھپے سنگریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزہ زر بھی ہیں کچھ

لیکن چونکہ مسدس کا ضمیمہ ایک حد تک فرمائشی چیز تھی اس لئے اس میں وہ اصلیت اور جوش نہیں پایا جاتا
مسدس میں دکھائی دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ضمیمہ مسدس کی طرح مقبول نہ ہو سکا۔

(۵)

اگرچہ حالی کے کلام میں بالعموم یاس کی جھلکیں نمودار ہیں لیکن سرسید کے اثر کی وجہ سے بعد میں وہ بھی
لمانوں کی ترقی کی امید رکھنے لگے تھے ۔سرسید کی طرح ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ
ں جول کرکے ترقی کرنی چاہئے ۔ اسلام کی قدیم روایات یورپ کی موجودہ تہذیب سے میل کھاتی ہیں ۔ ہند
واجی اسلام ٹھیٹ اسلام نہیں ۔ اور ٹھیٹ اسلام یورپ کی موجودہ تہذیب کے منافی نہیں لہذا مسلمانوں
یورپ کی تہذیب اختیار کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہئے ۔

جب مسلمان دولت ، حکومت اور سیاست سے محروم ہو گئے تو انہیں چاہئے کہ کسی نہ کسی طرح سے
س کی تلافی کریں اور بحالت موجودہ اس کی صورت یہی ہے کہ وہ یورپ کی طرز معاشرت اختیار کرلیں کیونکہ
اسلام کی ضد نہیں ہے ۔ نیز یہ کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ جدھر زمانہ پھرے
طرف کو نہ پھر جائے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی پھرو اس طرف کو ہوا ہو جدھر کی

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

رہوگے یونہی فارغ البال کب تک نہ بدلوگے یہ چال اور ڈھال کب تک
رہے گی نئی پود پامال کب تک نہ چھوڑوگے تم بھیڑیا چال کب تک
سب اگلے فسانے فراموش کر دو
تعصب کے شعلہ کو خاموش کر دو

یہ ہے حالی کی شاعری کا پیغام ۔

لیکن اس پیغام کو ماننے کے لئے ان کے ہم قوم اول اول ہرگز راضی نہ تھے ۔ کیونکہ انہیں انگریزوں
ماہر چیز سے نفرت تھی یہ مجبوری زمانہ نہ تھا ۔ اس میں لوگوں کی مخالفت اور طعن و تشنیع کا طوفان اٹھا ایک

فطری امر تھا چنانچہ ان کے مخالفوں اور پرانی طرزِ معاشرت کے علم برداروں نے نثر اور نظم دونوں کے ذریعہ سے ان کی مخالفتیں کیں۔ لیکن چونکہ نثر دیرپا نہیں ہوتی اس لئے مر گئی اور وہ نظمیں جن میں کچھ جان تھی اور جو حقیقی معنوں میں نظمیں تھیں زندہ رہ گئیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر خان بہادر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کی ہیں۔

(۶)

اکبر بھی حالی کی طرح اپنے زمانہ اور ماحول کی حقیقی پیداوار اور وفادار نمایندے تھے۔ جس طرح حالی اپنے دیرینہ تجربوں اور غور و فکر کے باعث اپنا خاص پیغام سنانے پر مجبور تھے، اکبر بھی عبوری دور کی خصوصیات کے زیر اثر حالی کے پیغام کا رد عمل کرنے پر مجبور تھے۔ ان کے کلام اور خیالات کی اٹھان بھی یقیناً فطری ہے۔ اس عبوری زمانہ کا اقتضا ہی یہ تھا کہ ایک اکبر ضرور پیدا ہو جاتا۔

اکبر حالی کی طرح دل سے قوم کے بہی خواہ تھے۔ اس کے علاوہ قدرت نے انہیں ایک ایسا کمال عنایت کیا تھا کہ وہ جن لوگوں پر طنز کرتے تھے وہ بھی انہی کی طرح ان سے محظوظ ہوتے تھے۔ یہ خاص ملکہ صرف اکبر ہی کا حصہ تھا اور اس کے ذریعہ انھوں نے حالی کے برخلاف تہذیب حاضرہ کے معائب بیان کرنے میں زبردست کامیابی حاصل کی۔

اگرچہ حالی کی طرح اکبر کے کلام میں بھی غزلیات کا فقدان نہیں لیکن حالی ہی کی طرح وہ بھی ایک خاص غزل گو شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہیں ہوئے۔ اکبر اپنے آخری زمانے میں غزلیں بہت کم لکھتے تھے۔ عموماً سیاسی، اخلاقی، عارفانہ اور ظریفانہ نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اس وقت جو کچھ غزلیں انھوں نے لکھی ہیں ——— اور جن کی تعداد کم بھی نہیں ——— ان میں بھی غزلیت کا عام عنصر بہت کم ہے۔ مثلاً اس زمانہ کی غزلوں کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:-

اس عہد میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے	اس باغ میں طوطی کے لئے توت نہیں ہے
نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا	سائنس سے سنتے تھے کہیں موت نہیں ہے
نیچر ہی کا مطیع ہے بہت معتبر اکبر	تم دیکھتے ہو پھل میں کہیں چھوت نہیں ہے

دورِ تہذیب میں پریوں کا ہوا دور نقاب	ہم بھی اب چاک گریبان کو سئے لیتے ہیں

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں — آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا — میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

اکبر کی شاعری اس وقت معراج کمال کو پہونچتی ہوئی نظر آتی ہے جب وہ نئی روشنی کے متعلق طنز آمیز نظمیں لکھنی شروع کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی اور اکبر دونوں قوم کی خستہ حالی سے سخت متاثر تھے لیکن اس کے علاج کے طریقے دونوں نے بالکل مختلف اختیار کئے۔ اکبر کا پیغام حالی کے برخلاف یہ تھا کہ ——— خالص مذہب کی طرف جاؤ، نئی تہذیب کی طرف نہ بڑھو اور قدیم روایات کو نہ چھوڑو ——— انکا خیال ہے کہ سر سید اور حالی کے پیغامات پر عمل کرنے سے :-

ہم کو نئی روشنی کے حلقے جکڑ رہے ہیں — باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں، قومی ہے یا تنزل — گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں
ٹانکے وہ لگ رہے ہیں جو کروٹوں میں ٹوٹیں — بخیے جو فطرتی تھے وہ اب ادھڑ رہے ہیں
چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی — لیکن امید کیا ہو جب دل بگڑ رہے ہیں
یہ زیور معانی کسکی کریں گے زینت — لفظوں کے یہ نگینے کیوں آپ جڑ رہے ہیں

اکبر نے اپنے ماحول کی ——— جو ایک عبوری دور کا بہترین منظر تھا ——— جسقدر نفیس ترجمانی کی ہے اس کے متعلق بعض شعر ملاحظہ ہوں ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں — میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیویاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ہم کو — دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

تہذیب نو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبر — دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت کے کام دیکھو — کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گذر رہی ہے؟
دل میں خوشی بہت ہے یا رنج یا تردد — کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے؟

ترقی کی تہیں ہم پر چڑھائیں — گھٹا کی دولت اپیچیں بڑھائیں
یہیں ہر پھر کے آیا بی نصیبن — وہ گو اسکول میں برسوں پڑھائیں

غرض اکبر نے جو کچھ لکھا ہے اپنے ذاتی مشاہدہ کے بعد اور بعض دفعہ پیش بینی سے لکھا ہے۔ اگرچہ حالی کی طرح ان کے دل میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا لیکن جس طرح انھوں نے اپنا پیغام حالی سے بالکل مختلف قرار دیا اس کے ظاہر کرنے کا طریقہ بھی حالی کے طریقۂ اظہار سے بالکل علیحدہ نوعیت کا اختیار کیا۔ اکبر جو کچھ کہتے ہیں ظرافت کے ساتھ کہتے ہیں اور حالی جو کچھ بیان کرتے ہیں سوز و گداز کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

(۷)

اکبر اور حالی دونوں کے پیغام سے ابھی مسلمانوں کے کان آشنا ہونے ہی پاتے ہیں کہ ان دونوں سے متاثر ہو کر ایک تیسرا شاعر پیدا ہوتا ہے۔ وہ ان دونوں کے خیالات کی نوعیت اور انداز بیان کو دیکھتا ہے کبھی حالی کی نقل اتارتا ہے اور کبھی اکبر کی ریس کرتا ہے چنانچہ اول اول اس کے لئے کوئی خاص راستہ نہیں پیدا ہوتا۔

وہ حالی سے مسلمانوں کے موجودہ مصائب کو بیان کرنا سیکھتا ہے اور اکبر سے قدیم روایات اسلامی کو نہ چھوڑنے اور نئی تہذیب کو مضر سمجھنے کے خیالات اخذ کرتا ہے۔ اکبر تہذیب نو کے مخالف تھے حالی اسکے مخالف نہیں۔ اقبال نے ایک بات حالی سے لی اور ایک اکبر سے۔ وہ بھی تہذیب نو کے مخالف ہیں وہ دنیا کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ وطنیت کا خیال جو یورپ میں جڑ پکڑ گیا ہے کائنات کے لئے سخت مضر ہے اس کے برخلاف حب انسان دراصل اعلیٰ معراج ترقی ہے۔ اگرچہ یورپ والوں نے بھی اس کو اپنا معیار ترقی اور اصول زندگی قرار دیا ہے لیکن وہ اس پر صحیح طور پر عمل پیرا نہیں ہے اور نہ بحالت موجودہ ہو سکتے ہیں اس کے برخلاف اسلام میں حب انسانی کا جو تخیل پیش کیا گیا ہے وہ بہت زیادہ مکمل اور پختہ ہونے کے علاوہ اس قابل ہے کہ اس پر آسانی سے عمل کیا جا سکے۔

اقبال نے یہ خیال کس لئے قائم کیا اور اس قسم کا پیغام کیوں پہونچایا اس پر ایک نظر ڈالنا اردو کے پیغام گو شاعروں کے پیغاموں کے مقابل مطالعہ کا ایک لازمی عنصر ہے۔

(۸)

اگر ہم اقبالؔ کی شاعری کا ان کی زندگی کی روشنی میں مطالعہ کریں تو ہماری یہ منزل بہت جلد طے ہو جاتی ہے۔ ان کی زندگی کے لحاظ سے ان کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے جن کی تفصیل یہ ہے:
پہلا دور ولایت جانے سے قبل کا ہے۔ اس وقت وہ داغؔ کی شاگردی میں حسن و عشق کے مضامین باندھتے تھے اور حالیؔ کی تقلید میں مسلمانوں کے باہمی منافقات اور دیگر خرابیوں کا ذکر کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ہندوؤں کے اثر سے ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر اس کا نغمہ گایا۔ اس وقت وہ اس بات کے خواہشمند تھے کہ مناظر قدرت سے ہم کلام ہوں لیکن موخر الذکر ان کی طرف مخاطب نہیں ہوتے تھے۔ وہ اسرار فطرت سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن غزل گوئی کے میدان میں گامزن ہونے اور عشق مجازی کی بھول بھلیوں میں پھنسے رہنے کے باعث انہیں ناکامی ہوتی ہے۔
اقبالؔ کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جب کہ وہ ولایت میں تھے وہاں وہ اپنے ماحول کی سیاسی اور معاشرتی حالتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سوسائٹی کے اجزا پر غور کرنے کے بعد انہیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یورپ کے تمدن کا انجام ٹھیک نہیں۔ وہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے جھگڑے سے زبردست سبق حاصل کرتے ہیں انہیں ان جھگڑوں اور جمہوریت وغیرہ کے خیال کی تہ میں استبدادہی استبداد نظر آتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ وہاں وطن پرستی کا جذبہ شدت سے موجزن ہے۔ ایک قوم دوسری سے بڑھنا اور اس کو اپنے سے حقیر کرنا چاہتی ہے۔ ان تمام امور کے مدنظر وہ یورپ کے تمدن سے بیزار ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کی بنیاد متزلزل ہے اور آخر کار وہ خود ہی اپنی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ اس لئے وہ حب انسانی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگیں۔ اقبالؔ کے اس خیال یا پیشین گوئی کے مطابق یورپ میں بہت جلد جنگ چھڑ جاتی ہے۔
اگرچہ یورپ میں حب انسانی کا میلان پیدا ہو چکا تھا۔ فرانس کے انقلاب نے اخوت، مساوات اور آزادی تینوں چیزوں کی طرف رغبت پیدا کرائی تھی مگر عمل ہمیشہ اس کے برخلاف ہوتا رہا۔ یہ دیکھ کر اقبالؔ کا خیال اسلام کے اتحاد و اخوت و مساوات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ انہیں اسلام میں یہ چیزیں مکمل حالت میں نظر آتی ہیں اس لئے اب وہ تہیہ کر لیتے ہیں کہ انہی تین چیزوں کو دنیا کے آگے مکمل حالات میں پیش کریں۔
اقبالؔ کی شاعری کے اس دور میں وطنیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کو وہ انسان کے لئے مضر

سمجھنے لگتے ہیں ان کے تخیل میں چونکہ انسانوں کی باہمی محبت کے خیال موجزن ہونے لگتے ہیں اس لئے انہیں کائنات کی ہر چیز بات کرتی نظر آتی ہے اور محبت کا سبق سکھاتی ہے۔

دور اول میں تلاش پائی جاتی ہے اور دوسرے دور میں آیندہ کے لئے کوئی جولانگہ عمل اور مطمح نظر تیار کرنے کی کوشش۔

تیسرے دور میں ایک خاص کارزار عمل کا خاکہ تیار کرکے پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس دور میں اقبال کا خیال قران شریف کی اس آیت کی طرف جاتا ہے کہ

انا عرضنا الامانت علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوماً جہولا۔

اور وہ اس کی تشریح و توضیح کرنے پر مائل ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو جو دیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان خدا کا خلیفہ ہے اور دنیا کے امام۔ نیز یہ کہ خدا نے مسلمانوں کو تمام دنیا کی قوموں میں سے منتخب کیا اور بلند مرتبہ بنایا۔

ان خیالات تک پہونچنے کے بعد اقبال اس امر پر غور کرنا شروع کرتے ہیں کہ دنیا کا امام بنانے کے لئے اسلام نے مسلمانوں کو کن کن چیزوں کی طرف متوجہ کیا؟ اور اس نتیجہ تک پہونچتے ہیں کہ مسلمان سب سے چند چیزوں کو مطمح نظر قرار دیں مثلاً

اتحاد ملی :۔ اقبال یہ سبق دیتے ہیں کہ قوم انفرادی حالت میں نہ رہے بلکہ ہر شخص قوم کی خاطر اپنی کا بڑا حصہ قربان کر دے۔ کیونکہ ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ۔۔۔ قطرہ دریا میں ہے اور بیرون دریا کچھ نہیں

رازِ زندگی :۔ مسلمانوں کو زندہ رہنا چاہئے یہ اقبال کی شاعری کا ایک موضوعی عنصر بن گیا ہے۔"خضر راہ" اور "طلوع اسلام" ان دونوں نظموں میں انھوں نے اس امر کے متعلق بہتر سے بہتر شہ پارے پیش کئے ہیں۔ بعض نمونے یہ ہیں :؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ۔۔۔ ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے ۔۔۔ سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ ۔۔۔ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں،
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں،
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہی ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں
یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم،
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را؟ طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دل گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

---

(۹)

اقبال نے جس موضوع کو اپنی شاعری کا پیغام قرار دیا ہے وہ نہایت خشک تھا، اس کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اس کے لئے اقبال نے مستقبل کی تابناک جھلکیں دکھانی شروع کیں اور نہایت یقین کے ساتھ اس بات پر زور دیا کہ مجھے آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور وہ پھر اپنی پرانی عظمت حاصل کرنے والے ہیں اسلئے انہوں نے مسلمانوں کو اس طرح ہمت دلائی کہ ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت کی نوا کوئی

یہ رجائی پہلو ہے۔ اسلام کا حقیقی پہلو بھی دراصل رجائی ہے۔ اس کا کوئی عنصر قنوطیت آمیز نہیں۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔ قرآن شریف میں جہاں جہاں خدا کے غضب سے ڈرایا گیا ہے رجائیت بھی ہر جگہ جھلکتی نظر آتی ہے۔ اقبال کی آخری نظمیں اسی رجائیت سے معمور ہیں وہ مستقبل کی امیدوں کی دمنو شکن صدائیں بلند کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد — بہار آمد شکار آمد نگار آمد بہار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا — صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانون پیشیں ساز دہ ساقی — کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش — پس از مدت ازیں شاخ کہن بانگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدر و حنین آور — تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
اگر شاخ خلیل از خون ما نمناک میگردد — ببازار محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاک شہیدے برگہائے لالہ می پاشم — کہ خونش با نہال ملت ما سازگار آمد

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

حالی نے جس قسم کا پیغام پیش کیا اور اکبر نے اس کا جس بنا پر رد عمل کیا اور اسکے مخالف ایک نیا پیغام سنایا یہ تمام چیزیں اقبال کے کلام میں ایک مکمل حیثیت کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی ہیں۔ حالی اور اکبر دونو انتہائی تھے اقبال نے اگرچہ اعتدالی ہونے کا ثبوت بھی نہیں دیا لیکن ایک ایسا پیغام سنایا جس سے ان کی قوم پیش روؤں کے پیغاموں سے زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کی وجہ اس پیغام کی صرف نوعیت ہی نہیں تھی بلکہ اس پیش کرنے کا طریقہ بھی تھا۔

حالی کے طریقہ بیان میں قنوطیت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ اکثر بار خاطر ہو جایا کرتا تھا۔ اکبر اپنی خوش مذاقی سے اس قدر ہنسا دیا کرتے تھے کہ ان کے سننے والے ان کے کلام کے سنجیدہ پہلو پر غور کرنا بھول جاتے تھے۔ اس کے برخلاف اقبال اسقدر رجائیت آمیز صدائیں بلند کرتے ہیں کہ ان کے سننے

جوق در جوق اہلِ ذوق جمع ہونے لگے ہیں اور ان کے کلام کو مقدس جان کر اس کا سننا، پڑھنا اور دہرانا ضروری سمجھتے ہیں یہ وہ زبردست کامیابی ہے جو اب تک اردو کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی!!

(۱۰)

اقبال کے پیغام نے مسلمانوں کو جگانے میں کس حد تک کامیابی حاصل کی اس کے متعلق گفتگو کرنا ہمارے موجودہ موضوع میں داخل نہیں یہاں اسی امر کا اظہار ضروری ہے کہ ان کی شاعری نے اردو کے اسلوبِ شاعری کو بہت متاثر کیا۔ آجکل کے نوجوان شاعر اپنی شعر گوئی کی ابتدا اقبال کی شاعری کی تقلید سے کرتے ہیں اور اگرچہ اس وقت تک متعدد شاعر مزاج اس طرز میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش میں مشغول ہیں لیکن شاید ہی کوئی ہو جو اس سعی میں کامیاب کہلایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے موجودہ شاعروں کے مدنظر کوئی بھی بحالت موجودہ پیغام گو شاعر نہیں معلوم ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض شاعر اپنی طبیعت کی فطری افتاد کے مطابق خاص خاص رنگوں میں اور خاص خاص موضوعوں پر اپنی سخنوری کا اظہار کر رہے ہیں لیکن یہ چیز تو غدر سے پہلے بھی اردو شاعری میں موجود تھی۔ ہم نے "غالب کی ذہنیت" کے مضمون کے پہلے حصہ میں اس امر پر کافی روشنی ڈالی ہے اور اس مضمون کو اسی کے مدنظر لکھا ہے۔ موجودہ مضمون میں ہم اردو کی پیغامی شاعری سے بحث کر رہے ہیں اور جس طرح ہمیں غدر سے پہلے پیغامی شاعری مفقود نظر آتی ہے، اقبال کے بعد بھی اس کی موجودگی کے کوئی بڑے آثار دکھائی نہیں دیتے تاہم اس مضمون کے ختم کرنے سے قبل ہم اردو کے ان دو قسم کے شاعروں کا ذکر کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں جن میں سے ایک تو وہ ہیں جن کے متعلق بعض اربابِ ذوق کا خیال ہے کہ وہ آئندہ پیغام گو شاعر بن جائیں گے۔ اور دوسرے وہ جو اپنے اشعار کے ذریعہ اس امر کے مدعی ہیں کہ ان کا لکھنے والا ایک پیغام گو ہستی ہے۔

اول الذکر طبقہ میں جوشؔ ملیح آبادی اور عظمت اللہ خاں دہلوی کے نام قابلِ ذکر ہیں اور موخر الذکر میں سلیم پانی پتی اور ہاشمی فرید آبادی کی ہستیاں۔

جوشؔ کی سحر پرستی ان کے کلام میں اکثر نمودار رہتی ہے۔ نمودِ صبح کی دل آویزیاں ان کے سمندِ جذبات پر تازیانہ کا کام کر جاتی ہے اس وقت تک انکا کلام کسی خاص پیغام کا حامل نہیں ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ زمانہ انہیں کسی پیغام گوئی کی طرف متوجہ کر دے۔ کم از کم ان کے بعض احباب کو تو اس پر یقین ہے کہ وہ ایک پیغام گو شاعر ثابت ہو رہیں گے۔

عظمت اللہ خاں اگرچہ خود کو شاعر بھی نہیں سمجھتے لیکن ان کی شاعری یقیناً ایک انقلاب کن شاعری نظر آتی ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کی عام طرز روش ——— یعنی فارسی شاعری کی تقلید ——— کا ردعمل کیا اور ہندی اعری کی طرف توجہ کی۔ ایک حقیقی ہندوستانی کے صحیح جذبات و خیالات کے ادا کرنے کا بہترین اور رزوں پیرایہ وہی ہے جو ہندی شاعری میں ظاہر ہوتا ہے۔ فارسی شاعری ایک غیر ملک کی چیز ہے اور اردو ں اس کے بغیر تقلید کرنا ایک مضحکہ خیز بات ہے تاہم یہ مضحکہ خیز بات اردو کے رگ وپے میں سرایت کر گئی ہے ظمت نے اپنی شاعری کو اردو کے ایک فطری سرچشمے سے سیراب کرنا چاہا۔ انھوں نے نہ صرف ہندی الفاظ ر ہندی بحریں اختیار کیں بلکہ ہندی شاعری کے بعض موضوعی عناصر بھی اپنے شاعری کے ذریعہ اردو میں قل کر دیئے۔ چونکہ ہندی شاعری کی رو سے جذبات کی ترجمانی کرنے والی ہستی مرد کی نہیں بلکہ عورت کی وتی ہے اس لئے انھوں نے بھی اپنی شاعری میں عورت ہی کی زبان سے بڑی دلچسپ اور دل خراش صدائیں سنائی ہیں۔ اگر عظمت ایک حقیقی شاعر نہ بھی ہوں (جیسا کہ خود ان کا خیال ہے) تو اتنا ضرور ہے ہ ان کی شاعری سے اردو ادب بے حد متاثر ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ وہ ایک عہد آفریں شاعری ثابت وجائے۔

پروفیسر سلیم نے شاعر کی حیثیت سے کبھی شہرت نہیں پائی لیکن وہ اوائل عمر ہی سے شعر گوئی کی مشق رتے چلے آرہے ہیں ان کی شاعری جوش وجذبہ اور الفاظ کی رنگ آمیزیوں سے معمور ہوتی ہے۔ گرچہ انہیں اردو دنیا میں اب تک ایک پیغام گو شاعر کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی لیکن امید ہے کہ انکی اعری کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دے جائے گی۔

مولانا سلیم کے مخاطب زیادہ تر نوجوان رہتے ہیں۔ اور اگرچہ مولانا اردو کے دور ماضی کو ایک آخری یادگا ں لیکن ان کی طبیعت اس قدر نوجوان ہے کہ ان کا کلام ایک ایسے نوجوان کا کلام معلوم ہوتا ہے جسکے ل میں ترقی کی امنگیں طوفان بپا کر رہی ہوں اور جس کا دماغ ولولہ انگیز خیالات سے نمونہ محشر بنا ہوا ہو

مولوی ہاشمی فرید آبادی مولانا سلیم کی طرح نہ تو ایک پرگو شاعر ہیں اور نہ کسی خاص طبقہ سے خاطب رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر اور بہت دیر میں لکھتے ہیں۔ انھوں نے بھی مولانا سلیم کی طرح چمنستان نثر میں تفریح کرتے کرتے کچھ ہی عرصہ قبل سے گلگشت نظم کے لئے قدم بڑھانے شروع کئے ہیں۔ ان کی طبیعت میں جوش وجذبہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے قیام علی گڑھ کے

زمانہ میں اپنی شاعری کے ذریعہ اسی طرح شورش بپا کردی تھی جس طرح محمود اسرائیلی کی نظموں نے خلافت کی کشمکش کے زمانہ میں بمبئی میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا ـــــ یہ چیز ان عناصر میں سے ہے جو کسی شخص کو پیغام گو شاعر کے سلسلہ میں شریک کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

ہاشمی کی شاعری پر اول اول فارسیت کا ـــــ اور خصوصاً غالب کی طرز کی فارسیت کا ـــــ رنگ زیادہ غالب تھا اب انکی شاعری کا ایک دوسرا دور شروع ہوتا نظر آتا ہے۔ ان کی جدید نظمیں ہندیت سے زیادہ متاثر ہیں۔ یہ نہایت مبارک تبدیلی ہے!

ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت سوز و گداز ہے جو پروفیسر سلیم کے کلام میں جوش و جذبہ کے اندر دب جاتی ہے۔ اس کے باعث ہاشمی کے بعض اشعار انہیں ایک اعلیٰ شاعر ثابت کرتے ہیں۔ اگر انکی نظموں کے وہ شعر ہماری سمجھ میں نہیں آسکتے جن کے تصوف اور فلسفہ کو عام سخن فہم نہیں سمجھ سکتے اور جن کے سمجھنے کے لئے بقول مولوی عبدالحق "ایک خاص ذوق کی ضرورت ہے" تو ہمیں ان کے ان اشعار کی خوبیوں سے درگذر نہیں کرنا چاہیئے جو ہماری سمجھ میں آتے ہیں اور جن کو سمجھ لینے کے بعد ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

(۱۱)

اردو کے پیغام گو شاعروں کے سلسلہ میں اس امر کا اظہار بھی غیر ضروری نہیں کہ اورنگ آباد میں جہاں مولوی عبدالحق کے باعث کبھی کبھی اردو کی "گرمیٔ بزم" پیدا ہو جایا کرتی ہے چند اور شاعر اُنہی کی زیر تربیت پیغام گوئی کے لئے تیار ہوتے نظر آتے ہیں جن میں سے ایک غلام طیب صاحب ہیں اور دوسرے ہمارے دوست وہاج الدین صاحب۔

غلام طیب صاحب نے اقبال کی طرز میں بڑے بڑے پیغام سنانے شروع کر دیئے ہیں لیکن ان کے دل میں ابھی وطنیت ہی کے جذبات موجزن ہیں جو اقبال کی شاعری کے پہلے دور کی ایک ضمنی خصوصیت ہے۔

طیب کی شاعری پر عظمت کی عہد آفرینی کا بھی اثر پڑا ہے۔ وہ اپنے موضوعوں کے لحاظ سے اقبال کے اور اسلوب کے لحاظ سے عظمت کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ ان دونوں چیزوں سے مرکب ہو کر ان کی ادبی پیداوار اردو کی پیغامی شاعری میں اضافہ کا باعث بن سکے۔

مولوی وہاج الدین خاص طور پر اقبال کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ان کی شعری کوشش

ان نوجوانوں کی کوششوں سے بہتر ہیں جو اقبال کی پیروی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔

ان چند شعراکے علاوہ جب ہم اردو کے دوسرے شاعروں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بعض شاعروں مثلاً امین حزیں، حفیظ جالندہری، محمود اسرائیلی، تلوک چند محروم، مرزا ہادی رسوا، شوکت علی خاں فانی، اقبال علی سہیل، اصغر گونڈوی، ریاض، عزیز، صفی اور اثر لکھنوی، حسرت موہانی، افسر میرٹھی، آزاد انصاری، کیفی چریا کوٹی، ضامن کنتوری، نظم طباطبائی، امجد اور ذہین حیدر آبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے موجودہ موضوع کے لحاظ سے ان میں سے ایک بھی فی الحال ایسا نہیں نظر آتا جس پر تفصیل سے بحث کی جائے اگرچہ سب کسی نہ کسی طرح سے ادبیات اردو کی خدمت میں سرگرم ہیں اور اپنی اپنی خصوصیات شاعری کے باعث اس قابل ہیں کہ ان پر نہایت طویل مقالے لکھے جائیں۔

بہت ممکن ہے کہ انہی میں سے بعض کا ذکر آیندہ کسی وقت اس موضوع کے تحت بھی کیا جا سکے جس پر اس وقت ہمنے ناظرین کی معیت میں ایک سرسری نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

انجام ہستی

(طبعزاد استاد نامی مولانا تجمل چشتی قادری)

ہی مرغ روح صید دام ہستی
گرفتار غم و آلام ہستی
تغافل کیشی و رندی کہاں تک
نہ رہ ناداں مست جام ہستی

ازل میں جب ملا پیغام ہستی
نہ سمجھے آہ ہم انجام ہستی
تپاں ہیں بر سر خاک مذلت
قتیل تیرش صمصام ہستی

رہا تا عمر اسیر حسرت و یاس
کجا میں اور کجا آرام ہستی
صدائے عبرت افزائی جہاں ہے
فغان مردم ناکام ہستی

نہ صبح آرزو ہو صبح محشر
نظر آئے سواد شام ہستی
شریک پختہ مغزان ازل ہو
نہ رہ محو خیال خام ہستی

سراپا مورد الزام ٹھہرے
ملا آخر یہی انعام ہستی
سنبھل اے مرغ دل بگڑی بنی ہے
فضائے باغ صبح و شام ہستی

نظر ہوتی جو اپنی نیستی پر
نہ لاتا کوئی لب پر نام ہستی
ہوئے رسوا نہ بدنام خلائق
بہت اچھے رہے گمنام ہستی

ہوا اعضا شکن ثابت بالآخر
خمار بادہ گلفام ہستی
دلیل پستی ہمت ہے غافل
تمنائے عروج بام ہستی

تجمل بعد مدت ہم یہ سمجھے
تھی اپنی نیستی انجام ہستی

نفسیات اسباب آرائش

(از جناب سید عابد علی صاحب عابد بی ۔ اے ال ۔ ال ۔ بی)

رت کی ساخت اور طرز تعمیر میں نہیں۔ تو گھر کی اندرونی آرائش میں انگریزوں کو اولیت کا رتبہ حاصل ہے۔
ز اد لوگوں کا مذاق تناسب الوان و رنگ کے علاوہ نہایت خام کار ہے۔ فرانس کے لوگ اسباب
سے متعلق ایک شاداب اور نفیس زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔ یا کم از کم ان کے مذاق میں سلیم عناصر نمایاں
ں لیکن ان کی فطری خوش مزاجی جس کے باعث انہیں اپنے وقت کا ایک معتد بہ حصہ باہر صرف
ہے۔ اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اندرونی آرائش کی طرف توجہ کریں مشرقی اقوام کا
یش ذوق سلیم سے مملو ہوتا ہے۔ لیکن آوارہ۔
سکاٹ لینڈ کے رہنے والے آرائش کا اہتمام نہیں کر سکتے اور ڈچ شاید یہ تو سمجھتے نہیں۔ کہ
ریاں نہیں ہوتے اور دریوں و بستروں میں کچھ فرق ہے امریکوی ذوق آرائش ناقابل برداشت
ں کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں نسلی اعتبار سے کوئی امارت نہیں ہوتی۔ اسلئے نتیجتہً انہوں نے
لئے ناگزیر طور پر ایک دو امارت زر تیار کر لی ہے جہاں شخصی حکومت ہے وہاں امارت کے
مدام کے شان و شکوہ کی صورت اختیار کرتے ہیں امریکہ والوں کے ہاں دولت کی نمائش امارت
م ترین مظہروں میں سے ہے اسی تغیر اصول کے ماتحت لازمی طور پر امریکہ والے اپنے ذوق سلیم
ت کی نمائش میں مدغم کر دیتے ہیں۔
ثال کے طور پر انگلستان میں قیمتی اشیار کی نمائش اس تاثر کو تخلیق کرنے کے لئے ناکافی ہوگی
بیل ہیں اس نمائش سے یہ بھی لازمی طور پر نہ ثابت ہو سکے گا کہ نمائش کا بانی صاحب ذوق ہے
باعث یہ ہے کہ انگلستان میں دولت امارت نسلی کا ثبوت نہیں دوسرے یہ کہ وہاں کے نشتی
ن کا خون آخر ش ابتذال سے پاک ہے اپنے آپ کو ذوق سلیم کے محدود دائرہ میں مقید رکھتے
ربے معنی نمائش زر سے احتراز کرتے ہیں اس کا اثر یہ ہے کہ عوام میں بھی صاحب ذوق پیدا ہو گئے
ز بسکہ امریکہ میں دولت ریاست کا معیار اولین ہے اس لئے اس کی نمائش امارت نسلی کا واحد

متمیز عنصر سمجھی جاتی ہے اور عوام الناس امرا کے تتبع میں ذوق سلیم سے عاری ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شایہ جمال اور شوکت ہم معنی الفاظ ہیں حقیقت یہ ہے کہ امریکوی اعتبارات سے کسی شے کی صلاحیت آرائش کا اندازہ اس کی قیمت کی کمی اور بیشی سے لگایا جاتا ہے۔

اسی معیار کے تقرر کے بعد لغزشوں کی تخلیق ضروری تھی لیکن ان تمام لغزشوں کا معدن وہ جنتر ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

ایک صناع کے لئے، سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ایک ایسا امریکوی مکان ہے جو امریکوی زاویہ نگاہ سے سجایا گیا ہو فقدان تناسب اس کا سب سے نمایاں عیب ہوتا ہے فقدان تناسب سے وہی شے مراد ہے جو کسی تصویر میں فقدان تناسب کہلاتی ہے۔ کیونکہ تصویر اور مکان دونوں چیزوں کے لئے ایسے مسلم الثبوت قوانین منضبط کر دیئے گئے ہیں جو صنعت کے ہر شعبے پر حاوی ہیں۔

جس معیار سے ہم کسی تصویر کے محاسن اعلیٰ کو جانچتے ہیں اسی معیار فرنیچر کی ترتیب کو جانچنا چاہئے فقدان تناسب بعض اوقات اسباب آرائش کے انواع کے متعلق ہوتا ہے لیکن اکثر اسکا ثبوت الوان و اشکال کے ذریعہ بہم پہنچتا ہے آنکھیں اسباب آرائش کی غیر شاعرانہ ترتیب سے دکھنے لگتی متوازی اور سیدھے خطوط کی کثرت تنوع کا فقدان موجود ہوتا ہے یا اگر کہیں کوئی تنوع ہوتا ہے تو متوازی خطوط زاویہ قائم پر کاٹ دیئے جاتے ہیں اور اگر خم دار خطوط موجود بھی ہوتے ہیں تو ان کا تسلسل ایک ہی نوع کا ہوتا ہے۔ دوسرے اسباب آرائش کے اعتبار سے بعض اوقات پردوں کا انتخاب بہت لغو ہوتا ہے رسمی اسباب آرائش کے ساتھ پردے بالکل غیر ضروری ہیں اور پردوں کی کثرت ہمیشہ ذوق سلیم کی منافی ہوتی ہے۔ پردوں کے انتخاب کا معیار وہ مجموعی تاثر ہے جو دیکھنے والے کے ذہن میں پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

پچھلے دنوں سے دریوں کا انتخاب کچھ صحیح ہونے لگا ہے لیکن ابھی دریوں کے نقوش اور رنگ غلط انتخاب کئے جاتے ہیں یہی حال غالیچوں کا ہے۔ غالیچہ کمرے کی روح ہے۔ غالیچے کے رنگوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ باقی اسباب آرائش شکلیں کیا ہونی چاہئیں اور انہیں کس ترتیب سے سجانا چاہئے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر کمرے کا فرش بڑا ہو تو غالیچے کے نقوش کے دائرے بڑے ہونے چاہئیں اور اگر چھوٹا تو چھوٹے۔ غالیچے کی بناوٹ نہایت حسین ہونی چاہئے امریکہ میں اکثر صرف اس طرح کی اشکال پسند کی جاتی ہیں جن کے پھول

معمولی پھولوں میں سے ہوں اور جن کے الوان بالکل بے معنی ہوں۔ معمولی اشیار کی تصاویر غالیچوں پر لغویت مذاق کا سب سے زیادہ ثبوت ہے۔

بھڑک امریکوی فلسفۂ آرائش میں بدترین عنصر ہے یہ اس غیر فطری مذاق کا نتیجہ ہے جو دوست کی نمائش نے پیدا کر دیا ہے۔ امریکہ کے لوگ گیس کی روشنی کو بہت پسند کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ گھر کے اندر گیس کی روشنی کا داخلہ قانوناً منع ہونا چاہئے اس کی کرخت اور غیر متناسب روشنی احساس سلیم کو مجروح کرتی ہے جو شخص دماغ بھی رکھتا ہے اور آنکھیں بھی وہ اسے کبھی نہیں برتے گا لطیف روشنی جسے صناع ٹھنڈے نور سے تعبیر کرتے ہیں اپنے گداز مایوں کی معیت میں کمرے کی زینت کو چار چاند لگا دے گی۔ معمولی لیمپ بلور کے ملفوف کے ساتھ اسقدر حسین معلوم ہوتا ہے جس کا جواب نہیں "لصف ملفوف" فیشن کی تخلیق ہے اور جو لوگ اسے اندھا دھند برتتے ہیں وہ یا تو ذوق سلیم کے اصولی احساسات سے بے خبر ہیں یا فیشن کی اندھا دھند تقلید کے عادی بلوری ملفوف میں سے روشنی چاندنی کی طرح چھن چھن کر برستی ہے "لصف ملفوف" کی روشنی غیر متناسب اور ناگوار ہوتی ہے اسباب آرائش کی اقتصادی زینت اسی روشنی سے تباہ ہو جاتی ہے۔

بلور کے معاملے میں امریکوی ذوق کا ابتذال بالکل نمایاں ہو جاتا ہے یہ لوگ چمک پر مرتے ہیں اور صرف اسے ایک نقطۂ ابتذال کے ایسے وسیع معانی مضمر ہیں جن کی تفسیر تحصیل حاصل ہے۔ ٹمٹماتی ہوئی متحرک شعاعیں کبھی کبھی خوش گوار معلوم ہوتی ہیں۔ مجانین و حمقا ان سے ہمیشہ حظ اٹھاتے ہیں لیکن کمرے کے اسباب آرائش میں انہیں ہرگز کوئی دخل نہ ہونا چاہئے۔ چمک کے شوق نے امریکہ والوں کو اس بات پر بھی مجبور کیا ہے کہ وہ شیشوں کی جا و بے جا نمائش کریں۔ یہ لوگ دیواروں کو باوقار بلند شیشوں سے پر کر دیتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ ہفت خوان رستم کا میدان مار لیا جو اشخاص ارتقا یافتہ آنکھیں رکھتے ہیں وہ بیک نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیشوں کی کثرت اسقدر بری معلوم ہوتی ہے۔ عکس سے قطع نظر شیشہ آنکھوں کے سامنے ایک بے رنگ صاف مسلسل غیر متنوع سطح پیش کرتا ہے۔ عکس کے اعتبار سے شیشہ ایک مہیب اور نفرت انگیز تسلسل کا خالق ہے حقیقت یہ ہے کہ جب کسی کمرے میں چار یا پانچ شیشے لگا دیے جاتے ہیں اور ان کے تناسب و تدوین کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تو بہ اعتبار صنعت اس کمرے کی کوئی شکل نہیں رہتی۔ اس کے ساتھ جب شیشوں کی چمک کا خیال کیا جائے جسے تابش اندر تابش کہنا بجا ہوگا تو اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ بہ ہیئت مجموعی ذہن پر ایک مہیب اور غیر منظم اثر مرتب ہوتا ہے۔

ہر شخص واحد ایسے کمرے میں داخل کے بعد فوراً ہی احساس کرے گا کہ اسباب آرائش میں کوئی بولتا ہوا نقش رہ گیا ہے ہر چند وہ یہ نہ بتا سکے گا کہ نقش کیا ہے۔

کبھی کبھی امریکہ میں اسباب آرائش وجدانی طریقہ سے سجایا جاتا ہے۔ لیکن دولتمند حضرات کے ہاں ذوق سلیم کا شائبہ تک بھی نہیں۔

ہندوستان نفاست ذوق اور قدامت تمدن کے اعتبار سے زبان زد خلایق ہے لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نئی تہذیب کے عناصر کی آمیزش سے ہمارے اسباب آرائش کی سجاوٹ اس طرق سے کیجاتی ہے کہ وہ تمام سکون ریز کیفیت مٹ جاتی ہے جو ہندوستانی تخیل آرائش سے وابستہ تھی۔ اُجلی اُجلی چاندنیاں گاؤتکیے اور مختلف اشیا زینت کی ایک شاعرانہ سی بے ترتیبی ذہن پر سکون کا ایک ناقابل بیان اثر مرتب کرتی تھی۔ موجودہ مخلوط طریق آرائش آرام دہ ضرور ہے لیکن اس مشرقی نفاست سے عاری ہے جو ہماری رگوں میں رچی ہوئی تھی۔ اور جس کا امتیازی عنصر سکون و اطمینان تھا تکلفات کی ماہیت پر غور کرو اگر یہ مشرقی ذہنیت کے سکون و اطمینان ضامن نہیں تو اور کیا ہیں۔

گجرات کی ایک قدیم عربی تاریخ

(از جناب سید محمد صاحب قادری۔ بی۔ اے متعلم ایم۔ اے)

انگلستان کے مشہور مستشرق سر اڈورڈ ڈینی سن راس کی مساعی جمیلہ سے گجرات کی ایک نایاب اور
ربی تاریخ کا اصل مسودہ کلکتہ کے مدرسہ عالیہ سے برآمد ہوا اور انہی کی ان تھک کوشش سے حواشی اور
دری اشاروں کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہوا ہے۔ مستشرق موصوف نے اپنی ایک تقریر
لسلہ میں اس کے متعلق نہایت مفید و کار آمد معلومات کا اظہار فرمایا تھا۔ ذیل کا مضمون زیادہ تر انہی کی
ردہ معلومات کا حاصل ہے۔

اس کتاب کی دریافت کا حال بھی عجیب دلچسپ ہے۔ کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں جس کو ہندوستان کے
گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۰ء میں قائم کیا تھا، اس کتاب کا اصل مسودہ نہایت ردی اور لا
ی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس مدرسہ کی صدارت پر یوں تو بہت سے یوروپین فائز رہے لیکن ان میں سے
ں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ ایک تو ڈاکٹر اسپرنگر جس نے سیرۃ النبی صلعم جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھا کر
شہرت حاصل کی اور دوسرا بلاک من جس نے اپنی تحقیقات سے تاریخ ہند کے اسلامی دور کے متعلق
سی قدیم کتابوں کی تصحیح کر کے ان کو مرتب و شائع کیا ہے۔ یہ دونوں اپنے وقت کے مشہور مستشرق تھ
موصًا ڈاکٹر اسپرنگر نے تو بہت سی قدیم کتابیں دریافت کی ہیں اور بڑی محنت و تلاش سے ان کے مصنفین
کے حالات و واقعات بہم پہنچائے ہیں۔ تقریبًا یہی حال بلاک من کا بھی تھا۔ آئین اکبری وغیرہ وغیرہ
مستند و معتبر تاریخی کتابیں اس کی مساعی سے دست برد زمانہ سے بچ گئیں۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ
ب ان کی نظروں سے نہیں گزری ہو گی کیونکہ مدرسہ مذکور کے تمام نسخے ان دونوں نے ایک ایک کر کے
دالے مگر تعجب ہے کہ اس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں کی اور یہ اسی طرح لاعلمی و گمنامی میں پڑی رہی۔
۱۹۱۱ء میں سر اڈورڈ ڈینی سن راس ہندوستان آئے اور مدرسہ عالیہ کے کتب خانہ کا معائنہ کیا۔
ہلے ہی ان کی نظر اس نسخہ پر پڑی۔ سرسری طور پر دیکھ کر آپ نے اس کی اشاعت ضروری پائی اور
فور لارڈ کرزن سے جو اس وقت ہندوستان کا ویسرائے تھا، حکومت کے مصارف سے اس کے

شائع کرانیکی درخواست کی ۔ لارڈ کرزن نے بھی جو خود تاریخ ہند و آثار قدیمہ کا دلدادہ تھا، حکومت کی طرف سے اس کی اشاعت منظور کر لی۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں میں سلسلہ دستاویزات ([illegible] Records Series) کے نام سے ایک سلسلۂ اشاعت قائم ہوا تھا۔ اس کتاب کو بھی اس سلسلہ میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں اس کی پہلی جلد طبع ہوئی اور دوسری جلد بھی ۱۹۲۱ء میں شائع ہو گئی۔ غالباً اس سال اس کی تیسری جلد بھی زیور طبع سے آراستہ ہو جائے گی۔

اس کتاب کا یہی ایک نسخہ اب تک پایا گیا ہے اور باوجود سعی بلیغ کے کوئی اور نسخہ جزواً یا کلاً نہیں ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود مصنف کا مسودہ تھا جو رفتار زمانہ سے گجرات سے نکل کر کلکتہ پہنچ گیا۔ اس کتاب کا نام "ظفر الوالہ" ہے۔ اور ساری کتاب میں صرف دو مرتبہ اس کا اعادہ ہوا ہے۔ اس کے دو حصے یا دفتر ہیں۔ پہلے دفتر میں جو تقریباً پوری کتاب کے تین چوتھائی حصہ پر مشتمل ہے، گجرات کے مسلمان بادشاہوں کی جو ۱۳۹۶ء سے ۱۵۷۲ء تک حکمراں رہے، مفصل و مستند تاریخ ہے۔ دوران کتاب میں اتفاقیہ طور پر مختلف موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے اور جنوبی عرب، جون پور، دکن اور مندو کی ریاستوں کا حال بھی مندرج ہے۔ اور بعض مشاہیر کے طویل حالات بھی نقل کئے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے اس کے چند ابتدائی اوراق جن میں پہلے دو بادشاہ مظفر اور احمد کا حال تھا، لاپتہ ہیں۔ یہ امر اس وجہ سے اور زیادہ قابل افسوس ہے کہ خصوصاً ان دو بادشاہوں کے متعلق دوسرے مورخین کے بیانات متضاد اور مجمل ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ نہایت اہم ہے۔ دوسرے دفتر میں ہندوستان کے مختلف اقطاع کی اسلامی ریاستوں کی مختصر تاریخ ہے۔ یہ حصہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ دفتر اول کے بیانات کی طرح اس کے اقوال چشم دید اور زیادہ مستند نہیں ہو سکتے۔ تاہم اس میں بعض ایسے اضافی واقعات اور قدیم ترین کتابوں کے اقتباسات ہیں جو اس وقت بالکل لاپتہ ہیں اور جن سے موجودہ تاریخیں ساکت ہیں۔ علاوہ ازیں عربی زبان میں اس سے بہتر ہندوستان کے اسلامی دور کی کوئی مختصر تاریخ موجود نہیں۔

صوبہ گجرات جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے ہندوستان کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں سندھ اور راجپوتانہ ہے، مشرق میں دکن اور مغرب و جنوب میں بحیرہ عرب پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کے مشہور شہر احمد آباد، بھڑوچ، بڑودہ، سورت اور ڈیو ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی کے قبل تک اس سرزمین پر مختلف ہندو راجہ حکمراں رہے جن سے اس وقت ہمکو کوئی سروکار نہیں۔ سب سے پہلے سلطان شہاب الدین غوری نے اپنی فتوحات

ہند کے سلسلہ میں گجرات کے ہندو راجہ سے بھی جنگ کی تھی اور اس کو خراج ادا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر یہ فتح کچھ زیادہ پائدار ثابت نہ ہوئی۔ سلطان شہاب الدین کے ہٹتے ہی راجہ پھر خود مختار اور آزاد ہو گیا۔ سنہ ۱۲۹۷ء م سنہ ۶۹۷ھ میں سلطان علاء الدین خلجی نے پہلی مرتبہ اس صوبہ کو فتح کیا۔ اس وقت سے لے کر سنہ ۱۷۵۸ء میں مرہٹوں کے قابض ہونے تک یہ صوبہ اسلامی حکومت کے تحت رہا۔ اس طرح یہاں مسلمانوں کی حکومت کوئی ساڑھے چار سو سال تک قائم رہی۔ اس مدت کو حسب ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تیرھویں صدی عیسوی۔ قدیم شاہان دہلی کی حکومت۔

۲۔ چودھویں صدی سے سولھویں صدی کے اختتام تک کوئی پونے دو سو سال۔ احمد آباد کے مقامی بادشاہوں کی حکومت۔

۳۔ دو سو سال تک۔ سلاطین مغلیہ کا اقتدار۔

سلطان علاء الدین خلجی نے تخت نشین ہوتے ہی سنہ ۱۲۹۷ء میں اپنے وزیر ملک نصرت اور ایک جرنیل الغ خاں نامی کو فتح گجرات کے لئے روانہ کیا۔ الغ خاں نے نہایت آسانی سے فتح حاصل کر لی اور اپنی طرف سے ایک شخص کو عامل مقرر کیا اور خود آس پاس کے علاقوں کو فتح کر کے سارے گجرات کا صدر صوبہ دار ہو گیا۔

چند سال بعد اس کی جگہ عین الملک نامی ایک امیر کے سپرد کی گئی اور اس کو دہلی واپس بلا لیا گیا۔ عین الملک کا جانشین قطب الدین مبارک شاہ ہوا۔ یہ بادشاہ وقت کا خسر بھی تھا۔ صوبہ داری پر فائز ہوتے ہی اسکو ظفر خاں کا خطاب دیا گیا اور اسی نے (جو غالباً سنہ ۱۳۹۱ء میں صوبہ دار ہوا تھا) گجرات کی خود مختار اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً پونے دو سو سال تک قائم رہی۔ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ظفر خاں نے کس وقت علی الاعلان اپنی خود مختاری کا اظہار کیا۔ غالباً اس نے سنہ ۱۳۹۶ء میں شاہان دہلی کی اطاعت سے انحراف کیا ہے۔

ظفر خاں ایک راجپوت نو مسلم تھا اور اس کا دور حکومت ہر وقت معرض خطر میں رہا۔ نہ تو اس وقت گجرات کی سرحدیں محفوظ تھیں اور نہ خود گجرات کے اندر امرا اور مقتدر باشندوں میں اس کی اطاعت کا خیال پوری طرح جاگزیں تھا۔ چند سال بیم و امید میں خود مختارانہ حکومت کر کے آخر کار ظفر خاں سنہ ۱۴۱۱ء میں فوت ہوا اور اس کا پوتا احمد اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔ احمد ہی دراصل بانی حکومت کا مستحق ہے۔ اس نے اپنے حسن تدبیر اور زبردست سیاسی قوت کے ذریعہ تمام خطروں کا انفراغ کیا اور ہر طرح سلطنت کو محفوظ و مصون کر کے اپنے جانشینوں کے حوالہ کیا۔ اسی نے شہر احمد آباد کی بنیاد ڈالی تھی اور اس کو ہر طرح سے آراستہ کر کے اپنا پایہ تخت قرار دیا تھا۔

اس خاندان کے جملہ چودہ بادشاہ گزرے ہیں۔ ان میں سے صرف دو خاص طور پر اہم ہیں۔ پہلا محمود شاہ بیگڑا جس نے سنہ ۱۴۵۸ء سے سنہ ۱۵۱۱ء تک حکومت کی اور جوناگڈھ اور چپانیر کے مضبوط قلعے حاصل کئے اور ساحل کی حفاظت کے لئے بحری فوج بنائی۔ دوسرا بادشاہ بہادر شاہ ہے۔ اس نے مالوہ فتح کر کے اسکو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور ڈیو نامی بستی پرتگالیوں کے حوالہ کی جو اب تک انہی کے قبضہ میں ہے۔ بہادر شاہ انہی کے ہاتھوں سنہ ۱۵۳۶ء میں مارا گیا۔ بہادر شاہ کے بعد تین اور بادشاہ ہوئے لیکن یہ طاقتور امرا کے ہاتھوں میں بالکل کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ جو امیر اپنے اقران و امثال میں زیادہ طاقتور ہوتا وہ بادشاہ پر مسلط ہو جاتا اور جس طرح چاہتا اس کے نام پر راجدھانی کرتا۔ آخری بادشاہ مظفر شاہ ثالث ہے جس نے سنہ ۱۵٦۱ء میں تخت سلطنت پر جلوس کیا تھا۔ اسکے دور حکومت میں اکبر نے سنہ ۱۵۷۳ء میں گجرات پر حملہ کیا اور سارا علاقہ ختم کر لیا۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے اس خاندان کا پہلا بادشاہ راجپوت نسل سے تھا اور یہاں کے اکثر امرا بھی نو مسلم جنکو اپنے نئے مذہب سے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ وہ برائے نام مسلمان تھے اور ہندوؤں کی صحبت میں ہندو رسم و رواج کے پابند تھے۔ مگر ان کے علاوہ بہت سے امرا اور سرداران لشکر خالص اسلامی ممالک کے باشندے تھے اور فوج کا اکثر و بیشتر حصہ بھی ولایتی سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ ایک معاصر مورخ کا بیان ہے کہ سنہ ۱۵۱۱ء میں محمود بیگڑا کی وفات کے وقت شاہان گجرات کی فوج کی تعداد ایک لاکھ تھی مگر سنہ ۱۵۷۲ء میں اکبر کے حملہ کے وقت گھٹ گھٹا کر صرف بارہ ہزار رہ گئی تھی اور یہ بھی تمامتر بیرونی ممالک کے باشندوں پر مشتمل تھی۔ (۷۰۰) حبشی (۳۰۰) ترک، (۴۰۰) بلعمی، (٦۰۰) غوری، (۵۰۰) مغل (۵۰۰) بخاری سادات (۴۰۰۰) افغانی اور متفرق (۵۰۰۰) سپاہی تھے۔ اس اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ گجرات میں ولایتی سپاہیوں نے گھر کر لیا تھا اور انہی مختلف اقوام کے سرداروں میں سے جو شخص زیادہ طاقتور ہو وہ بادشاہ پر حاوی ہو جاتا تھا۔ اسی اسلامی خانوادہ کی مفصل اور صحیح تاریخ پیش نظر کتاب میں بیان ہوئی ہے۔

اس تاریخ کا مصنف حاجی دبیر کے نام سے مشہور ہیں۔ خود اس نے اپنے حالات شرح و بسط کے ساتھ مگر بالکل بے ترتیب اسی کتاب میں بیان کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی نام عبداللہ محمد ابن سراج الدین عمر الہندادلی تھا۔ وہ سنہ ۱۵۴۰ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۵۵٦ء تک وہیں رہ کر تعلیم و تربیت پائی۔ اسکا باپ سولھویں صدی کے اوائل میں بمقام پٹن پیدا ہوا تھا اور اس کا تعلق کسی ایرانی الاصل خاندان سے ہے۔ اس کے آبا و اجداد ایران کے باشندے تھے اور مغلوں کے حملہ ایران کے وقت جو نا در گردی شروع

ہوئی اس سے پریشان خاطر ہوکر ان لوگوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور سندھ کے شہر ملتان میں سکونت پذیر ہوئے۔ مغلوں نے ایران کو لوٹ کر بس نہ کیا بلکہ تیمور نے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر چڑھائی کی اور دہلی میں قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس آشوب و پریشانی میں مصنف کا جد اعلیٰ جو اس وقت ملتان میں مقیم تھا معہ اپنے اہل وعیال کے گجرات کی طرف بھاگا اور قصبہ ٹپن میں جاکر دم لیا۔ اسوقت گجرات کے تخت حکومت پر ظفر خاں بانی خاندان جلوہ افروز تھا۔

سلطان مظفر شاہ ثانی کے عہد حکومت میں ایک نووارد امیر نے معہ اپنے اہل وعیال کے ٹپن میں آکر سکونت اختیار کی۔ اس امیر کے لڑکے سے جو آگے چل کر آصف خاں کے خطاب سے مفتخر اور تاریخ گجرات میں ممتاز ہوا، حاجی دبیر کے والد سراج الدین کی درستی ہو گئی جو مدت العمر دونوں نے نباہ دی۔ ۱۵۳۵ء میں بہادر شاہ والی گجرات اور ہمایوں کے تعلقات بالکل کشیدہ ہو گئے اور دونوں میں جنگ چھڑ جانے کے آثار نظر آنے لگے بہادر شاہ نے اس خیال سے کہ فتح وشکست تو نصیبوں سے ہوتی ہے، مصلحت اس میں دیکھی کہ فی الفور اپنے حرم اور خزانہ کو آصف خاں کے ہمراہ مکہ معظمہ بھیج دے۔ آصف خاں نے چلتے ہوئے اپنے خاندان کے ساتھ اپنے دوست سراج الدین اور اس کے اہل وعیال کو بھی لے لیا اور سب مل کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں خیر وخوبی سے پہنچکر بہادر شاہ کی زندگی تک امن چین سے رہے۔ بہادر شاہ کی وفات کے دوسرے سال ہی خسرو پاشا والی مصر وحجاز ویمن کے حکم سے اس کا حرم وخزانہ ضبط کر لیا گیا۔

۱۵۳۸ء میں بادشاہ وقت نے آصف خاں کو گجرات بلا لیا اور آصف خاں نے چلتے ہوئے مابقی خزانہ اور حرم کی نگرانی سراج الدین کے حوالے کی جس نے بچی کھچی دولت کا بہت بڑا حصہ دے دلا کر بہادر شاہ کے حرم کے لئے اطمینان حاصل کیا۔ بہادر شاہ کے جانشین سب کے سب کمزور اور برائے نام بادشاہ تھے۔ کسی مطلب آشنا اور سنگدل امیر نے موقع پاکر ۱۵۵۳ء میں بادشاہ، اس کی بیوی اور اس کے خیر خواہ مشیر آصف خاں تینوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس حادثہ کے ۱ دسال بعد سراج الدین اپنے لڑکے عبد اللہ محمدؐ (مصنف تاریخ ہٰذا) کو لے کر ہندوستان میں داخل ہوا۔ اسوقت عبد اللہ محمدؐ کی عمر (۱۶) سال تھی۔ ہندوستان میں دوبارہ آکر سراج الدین نے احمد آباد میں سکونت اختیار کی۔

عبد اللہ محمدؐ نے ابتداً ۱۵۵۸ء میں ایک امیر محمدؐ الغ خاں کی ملازمت کی اور اپنے آقا کے نام پر اپنا لقب الغ خاں رکھا۔ خود اس نے اپنے ملازم ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک روز سرِ شام وہ

الغ خاں کے دربار میں حاضر تھا۔ اور خان کے آگے ایک کتاب، سادہ کاغذ اور قلمدان رکھا ہوا تھا۔ وزیر خیرات خاں نے اس کی طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ کیا تم لکھ پڑھ سکتے ہو۔ اس نے سمجھا کہ شاید کتاب سے کچھ نقل کروانا چاہتا ہے صورت نویسی کردونگا اس لئے کہدیا ہاں۔ یہ سُنکر وزیر نے چنگیز خاں نامی ایک امیر کے نام خط تحریر کرنے کا حکم دیا۔ وہ فارسی خط وکتابت سے عاری تھا اس لئے اس مشکل سے نجات پانے کی فکر کرنے لگا۔ مغرب کا وقت قریب تھا قلم بنانا شروع کیا۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی اور خان اور اس کا وزیر نماز کے لئے اُٹھ کر چلے گئے۔ یہ موقع غنیمت جان کر وہ بھی وہاں سے چلتا بنا۔ تھوڑی دور جاکر خیال کیا اگر گھر چلا جاتا ہوں تو مغرب کا وقت گزر جاتا ہے۔ نماز پڑھ لینی چاہئے۔ یہ سوچ کر وہیں قریب میں نماز پڑھنے لگا۔ خان نماز سے فارغ ہو کر آیا تو اس کو غائب پایا۔ حکم دیا کہ حاجی دبیر کو پکڑ لاؤ۔ ملازموں نے کشاں کشاں لاکر عبداللہ محمدؐ کو خان کے آگے حاضر کیا۔ اب مجبوراً اُس کو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہ خط لکھدینا پڑا۔ اسکے بعد چند روز تک وہ گھر سے باہر نہیں نکلا۔ خان نے پھر یاد کیا اور اس کے حکم سے دوبارہ اسکو دبیری کی خدمت انجام دینی پڑی۔ اس عرصہ میں وہ دو تین امیروں کی ملازمت کرتا رہا۔ آخر کار اپنے قدیم آقا کی عنایات کا گرویدہ ہوکر پھر اس کی ملازمت اختیار کر لی۔

۱۵۷۲ء میں اکبر احمد آباد میں داخل ہوا اور الغ خاں نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی۔ اور حاجی دبیر کو بھی اکبر کے روبرو پیش کر دیا۔ اکبر نے اس کو اپنے اماکن مکہ معظمہ کا نگرانکار بنا کر مکہ معظمہ روانہ کیا۔ اسطرح اس نے سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے ۱۵۷۲ء میں دوبارہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ ۱۵۷۶ء تک الغ خاں متوسل رہا۔ اس کے بعد بیس سال ایک اور امیر سیف الملک کی ملازمت کی۔ آخر کار ۱۵۹۵ء میں تیسرے امیر فولاد خاں کی نوکری اختیار کی اور اس کے انتقال (۱۶۰۵ء) تک اسی کا متوسل رہا۔ یہاں تک اس کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اسکے بعد اس کے کیا مشاغل رہے اور اس نے کیسی زندگی بسر کی کچھ معلوم نہیں۔ تاریخ ہٰذا میں اس نے اپنی ایک اور تالیف کا دو جگہ ذکر کیا ہے۔ یہ اس کے آقا الغ خاں کی سوانحعمری ہے اور اسکا نام "فواتح الاقبال وفوائد الانتقال" بتایا ہے۔ اس کا ہنوز کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ اغلب ہے کہ اس میں اس نے اپنے حالات زیادہ تفصیل سے لکھے ہوں گے۔

اس نے اپنے فرصت کے اوقات میں یہ تاریخ لکھنا شروع کی تھی۔ اگرچہ اس میں کوئی واقعہ ۱۶۰۵ء کے بعد کا قلمبند نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۶۱۱ء تک اس کتاب کی نظر ثانی اور اضافے کرتا رہا کیونکہ جا بجا اس نے

جالینوس

(از جناب احمد عارف صاحب حیدرآباد)

یہ عجیب بات ہے جالینوس[1] کو یونانی حکماء میں شمار کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ یونانی نہیں کیونکہ تمام مورخین
ہ انگریز ہوں یا عرب، اس امر پر متفق ہیں کہ اس کی جائے پیدائش ایشیائے کوچک ہے۔ اس میں کچھ
نہیں کہ اس کے آبا و اجداد اصلاً یونانی تھے، لیکن اہل یونان کے علمی، سیاسی، اور تمدنی انحطاط
مانہ میں جبکہ رومیوں کی ترقی کا عہد شباب تھا، وہ ایشیائے کوچک کے ایک شہر پرگاش[2] میں آکر آباد ہوگئے
، اسی سرزمین کو اس یگانۂ روزگار حکیم کے وطن ہونے کی عزت حاصل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ، اسی خاندانی
ب پر وہ یونانی مشہور ہوا ہوگا ورنہ حقیقت میں ایسا سمجھنا ایک تاریخی غلطی کا ارتکاب کرنا ہے۔ بہرحال ۱۳۰ء
ب یہ پیدا ہوا تو اس کا باپ نیکن فضل و کمال میں شہرۂ آفاق رکھتا تھا۔ یعنی ہندسہ و ریاضی اور مساحت
بحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ، منطق، ہیئت میں کافی دستگاہ حاصل تھی ایسے باپ کا بیٹا جسکی
یں قدرت نے ابتدا ہی سے غیر معمولی قابلیتیں ودیعت کر دی تھیں بہترین تعلیم و تربیت سے کیوں
م رہتا۔ چنانچہ ہوش سنبھالتے ہی نیکن نے اس کو علوم ریاضیہ کی تعلیم دینی شروع کی جس کا وہ خود امام
لیم کیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جالینوس بہت ذہین واقع ہوا تھا۔ اس کو اپنا روزانہ سبق ایک ہی مرتبہ کے
لینے سے حفظ ہو جاتا تھا۔ اس کے وہ ہم سبق طلبہ جن میں کچھ سنورنے کے لچھن اور ہونہاری کی نشانیاں
جاتی تھیں، اپنی ان تھک محنت سے اس کو زک دینے کی کوششیں کیا کرتے۔ لیکن ناکامی ہمیشہ ان کی
ت میں لکھی تھی۔ اسی زائد از ضرورت ذہانت نے نیکن کو اسکی تعلیم و تربیت کی طرف بہت زیادہ متوجہ
ا۔ وہ خود تعلیم دینے کے علاوہ شہر کے علماء اور ماہر اساتذہ کی خدمت میں اس کو بھیجا کرتا، غرض باپ کی
و تربیت، فضلائے عصر کا فیض صحبت اور خود اس کی خداداد ذہانت نے اسکی عمر کے پندرہویں برس

---

[1] انگریزی میں اسے گیلن Galen یا گیلنس Galenus لکھتے ہیں ۱۲
[2] س کا جدید نام سمرنا ہے اور اہل عرب کے ہاں اس کا قدیم معرب نام فرغاموس ہے۔ ۱۲

ہی میں اُسے تمام علوم ریاضیہ کا استاد بنا دیا۔

اس کے بعد نیکن نے اپنے لایق بیٹے کو فلسفہ کی تعلیم دلانی شروع کی۔ فلسفہ کی تحصیل میں دو ہی برس گذرے تھے کہ یکایک نیکن نے اسے علم طب کی تحصیل کے لئے مجبور کر دیا[۱]۔ گو ابتدا میں اسے اس فن سے کچھ دلچسپی نہ ہوئی۔ لیکن جوں جوں اس میں بصیرت پیدا ہوتی گئی، ویسے ہی اس کے خیالات میں بھی نمایاں انقلاب ہوتا گیا۔ ریعان شباب ہی میں دنیوی لذتوں اور حرص و ہوس کو انسان کا قاتل جان کر ان چھوڑنے کے علاوہ سب سے بڑا تغیر جو اس کے خیالات میں ہوا وہ ساری کائنات میں انسان کا ذلیل اور بے حقیقت ہونا ہے۔ سنہ ۱۴۹ء میں جبکہ اس کی عمر انیس سال کی تھی، جالینوس اپنے نوجوان احباب کی ایک پر تکلف دعوت میوہ خوری میں شریک ہوا تو اصول صحت کے برخلاف مجبوراً خوب میوے کھا گیا۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ کچھ عرصہ کے بعد سخت بیمار ہو گیا۔ اور ابھی پوری طرح تندرست بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ایک اور روح فرسا سانحہ پڑا یعنی اس کے باپ کا سایہ عاطفت اس کے سر سے اٹھ گیا۔ ذہنی انقلاب نے پہلے ہی سے جب اس کو نفس کش کے اور مرتاض بنا یا تو اس کی جان ناتوان بمشکل اس بوجھ کی حامل تھی۔ اب اس مصیبت نے اور بھی قیامت ڈھا دی۔ تحصیل علم سے الگ فکر معیشت بھی دامنگیر ہوئی اور اسی سبب سے صحت دن بدن خراب ہونے لگی۔ چنانچہ آٹھ سال کے عرصہ تک مختلف بیماریوں کا شکار رہتا رہا۔ لیکن یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ تحصیل علم کی راہ میں گو مصائب کا ایک بڑا پہاڑ حائل تھا مگر اس کی ہمت بلند نے کبھی پیچھے منہ نہ دیکھا۔ اور برابر اسی دوران پریشانی میں اپنے مقصد کے پیچھے دوڑتا رہا۔ بارے خدا خدا کر کے اٹھائیس برس کی عمر میں جب علم طب سے فراغت پائی تو اس کی مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

جالینوس دو برس تک برابر اپنے وطن ہی میں پیشہ طبابت کو فروغ دیتا رہا۔ اس کے بعد اس نے میں روم کا سفر اختیار کیا۔ ان دنوں روم ترقی تہذیب، اور فضل و کمال کا مرکز ہو رہا تھا، اطراف عالم سے اہل علم و کمال کھنچے کھنچے اس شہر میں چلے آتے تھے۔ زوال پذیر خطہ یونان کے تمام کاملان فن ایک ایک کر کے اسی علم آباد، کی زینت ہو چکے تھے۔ اگر جالینوس جیسا فرد فرید اس سرزمین کو اپنے کمالات کا جو

---

[۱] دفعتاً انقلاب کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ نیکن نے خواب میں اپنے بیٹے کو بحیثیت طبیب کے مراتب حاصل کرتے دیکھا تھا۔

نہ سمجھا تو کیا کرتا۔ غرض جب یہ رومتہ الکبریٰ میں وارد ہوا ہے تو ادریس لیوس انطونی نوس سریر آرائے حکومت تھا۔ چونکہ پہلے ہی سے اسی نوجوان حکیم کا آوازۂ کمال بلند ہو چکا تھا اس لئے اہل روم نے تپاک کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد جالینوس نے مسلسل کئی دن تک عام جلسوں میں علم تشریح پر تقریریں کیں اس کی غیر معمولی قوت تقریر، فصاحت و بلاغت اور علم تشریح، کے انوکھے اندازِ تشریح نے عام طور پر وہ قبولیت حاصل کی کہ تمام رومیوں نے بالاتفاق اس کو "معجز بیان[۵]" کا خطاب دیا۔

ایک مرتبہ اکابر روم اور حاذق اطبائے یونان اس کی تقریر سننے کے لئے کسی جلسہ میں فروکش تھے تقریر کرتے کرتے اس نے کچھ پرندوں کو طلب کیا اور کسی کی مختلف رگیں کاٹ دیں اور کسی کا پیٹ چاک کر کے اندرونی آلایش کو تتر بتر کر دیا۔ پھر اطبائے حاضر سے خطاب کر کے ایک ادعائی رنگ میں کہنے لگا "کون ایسا طبیب ہے جو ان کٹی ہوئی رگوں اور اس بے ترتیب آلایش کو اپنی اصلی حالت میں مرتب کر سکتا ہے؟" جب کسی نے بھی اس صلا پر لبیک نہ کہا تو خود اسی نے ان پرندوں کو کچھ اس طرح ٹھیک کر دیا جیسے وہ پہلے ہی سے صحیح و سالم تھے۔ اسی واقعہ کا لوگوں پر اور خاص کر عہدہ داروں پر بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ ایک عہدہ دار نے کسی فوجی دواخانہ کی مہتممی پیش کی۔ جالینوس نے اسے بہ طیب خاطر قبول کیا اور اس خوش اسلوبی سے مفوضہ خدمت کو انجام دینے لگا کہ سینکڑوں مایوس مریض شفا پانے لگے۔ اس حسن کارگذاری نے چند ہی دنوں میں اسے صدر فوجی دواخانہ کا مہتمم بنا دیا۔ علی ہذا القیاس یہاں بھی اس نے اپنی کارروائی کا اسقدر سکہ بٹھایا کہ روم سے شام تک اسی کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ حسن قبول اور شہرت عام خدا کی دی ہوئی نعمت تھی، تعجب تھا اگر یہ اُسے شہنشاہ وقت کے دربار میں نہ پہنچا دیتی۔ چنانچہ اس اعزاز سے مفتخر ہونے کے بعد، آپ دیکھیں گے کہ وہ شہزادگان والاتبار کا معالج خاص مقرر ہوا ہے اور یہ وہ خدمت ہے جس کی آرزو میں نامور اور حاذق اطبا اپنی عمریں صرف کرتے تھے۔

شاہی قرب، گو جاہ پسندوں کے نزدیک کتنا ہی بام منزلت پر پہنچانے والا کیوں نہ ہو۔ لیکن ایک اس حکیم کے لئے جس نے دنیا کی ایسی دل بہانے والی چیزوں پر ایک عرصہ تک غور کر کے انہیں بے حقیقت

---

۵ رومی زبان کا اصلی لفظ "Paradoxologus" ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ "Wonder-Maker" ہے۔

بھا ہو، کیا حیثیت رکھتا تھا ؟ طوعاً و کرہاً وہ کچھ دنوں تک تو اس خدمت کو انجام دیتا رہا، اور خود اسی کے
حاظ میں یہ مدت گویا اس کی آزاد طبیعت کے لئے قید سخت سے کسی طرح کم نہ تھی۔ لیکن اس کے بعد بڑی
شواریوں کے ساتھ واپس وطن کی اجازت چاہ کر یہاں سے چل کھڑا ہوا۔ وطن مالوف کی خدمت کا شوق
ور طلب علم کا ذوق عرصہ سے دل میں کھول رہا تھا، اب ان کو پورا کرنے کا سامان ہاتھ آیا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ
ں دو مشہور باکمال روم میں قیام پذیر تھے۔ ایک پیلاپ نامی شخص تھا جو فن طب میں بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے
بنیس، جو علم فلسفہ کا عالم مانا جاتا تھا۔ دراصل انہی کاملان فن سے مستفید ہونے کی خاطر جالینوس نے روم کا سفر
ختیار کیا تھا۔ لیکن اس کی ہر دلعزیزی اور اعزاز شاہی نے اسے اس امر کا موقع ہی نہ دیا۔ اب جوان ملازمت سے
رصت ملی تو کچھ عرصہ کے لئے ان بزرگوں کے آگے زانوئے شاگردی تہ کیا[۱]۔ اسی طرح ریتھنز اسکندریہ اور مصر میں باکمالوں
کی خبر پاکر ان سے خوشہ چینی کی اور کچھ عرصہ کے بعد وطن چلا گیا۔

جالینوس نے اب ارادہ کر لیا کہ مدت العمر اہل ملک کی خدمت اور حصول کمال میں بسر کر دونگا۔ انسان کے
رادے تو بہت کچھ ہوا کرتے ہیں لیکن ہر وقت ان کی تکمیل قدرت کے نزدیک کچھ بھی ضروری نہیں اور انسان
کی زندگی میں انہیں فسخ عزائم کی وجہ سے جو زبردست تغیرات ہو جاتے ہیں ان کی ذمہ دار صرف یہی قدرت نیرنگ
واز ہے۔ بیچارہ وطن میں آکر ستانے بھی نہ پایا تھا کہ دفعتاً قیصر روم کا فرمان قضا شیم اس کی طلبی میں آپہنچا۔ شاد
باید زیستن ناشاد باید زیستن، اب حاضر دربار ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دربار میں حاضر ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد
ملک میں ۱۶۷ء میں وبا شروع ہو گئی جالینوس کو اس خصوص میں بہت کچھ سرگرمیاں دکھانی پڑیں۔ اس کے بعد جب قیصر
روم کشورکشائی کے نشہ میں جھومتا ہوا شہر روم سے نکلا تو حکم ہوا کہ جالینوس میدان جنگ میں صدر طبیب کی خدمت
انجام دے۔ لیکن جالینوس نے اپنی کسی منت کا بہانہ کر کے جو روم کے مندر میں خاص انہیں دنوں میں پوری
کی جاتی تھی اجازت چاہی۔ قیصر روم نے اپنے واپس آنے تک شہزادہ کامودس[۲] کے معالج رہنے کی شرط پر
اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ قیصر روم کی واپسی پر وہ پھر اپنے وطن روانہ ہوا۔ طلب علم و کمال کے

---

[۱] بعض مورخین کا قول یہ بھی ہے کہ جالینوس نے شہر روم میں وارد ہوتے ہی پیلاپ (Pelop
اور البینس (Albinus) سے استفادہ کیا ہے۔
[۲] (Commodus)

شوق نے اس کو وطن میں بھی نچلا بیٹھنے نہ دیا۔ یہاں تک اسکی بقیہ عمر سیر و سفر ہی میں بسر ہوگئی۔ اس مدت میں اس نے بیسوں مشہور اہل کمال سے اکتساب فن کیا۔ بالآخر حالت سیاحت ہی میں یہ مشہور علم و کمال جبکہ وہ جزیرہ سائپرس میں مقیم تھا ۲۰۰ء سن میں ستر برس کی عمر میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔

بڑے لوگوں کی موت حقیقت میں موت نہیں ہوتی بلکہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ بڑائی کیا ہے؟ انسان کا کمالات اور پاکیزہ صفات سے متصف ہونا یہی چیز ہے جو اسکو عزت و شہرت کے پر لگا کر اڑاتی اور بقائے دوام کے دربار میں لا بٹھاتی ہے۔ ایسے ہی باکمال بزرگوں کے نقوش قدم ہوتے ہیں جو شمع ہدایت بنکر بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے ہیں۔ آج دنیا اٹھارہ سو برس آگے نکل آئی ہے۔ لیکن جالینوس کی بزرگی اور ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ آج بھی عوام اس سے اسیطرح مستفید ہو رہے ہیں جسطرح پہلے اس کے ضیائے کمال سے روشن دماغ بن گئے تھے۔

اگر جالینوس کو یونانی حکماء میں شریک کیا جائے (جیسا کہ ہوتا آیا ہے) تو اس کا نمبر ان مشہور و معروف حکماء میں بحیثیت زمانہ گو سب سے آخر ہے لیکن بہ اعتبار صاحب کمال ہونے کے وہ اُن سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ بلکہ علم و فضل اور اپنے فن میں مجتہدانہ نظر رکھنے کی بنا پر وہ ان میں سے اکثروں سے بڑھا چڑھا خیال کیا جاتا ہے۔ زمانہ حال میں طب جدید کی روز افزوں ترقی نے یونانی طب کا بازار ایک عرصہ سے سرد کر رکھا ہے۔ اور ان دونوں میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ یہی ہے کہ یونانی طب میں زیادہ ظن و قیاس ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے طب جدید بغیر تجربہ کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا لیکن جالینوس کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ فن طب میں تمام عمر اس کا مسلک جزئیات تک میں تجربات پر مبنی رہا۔ اس کا قول تھا کہ طب میں میری ہر ایک رائے گویا ایک تجربہ ہے۔ علم تشریح (اناٹمی) میں جو معلومات اسکو حاصل تھے اور غیر معمولی اضافہ کے ساتھ اس نے جس طرح اس علم کو مدون کیا ہے وہ تمام حکمائے یونان میں اسی کا اور صرف اسی کا حصہ ہے۔

جالینوس کو جو شہرت اور مقبولیت اپنی زندگی میں حاصل ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء اور سلاطین کی اسکو مجبوراً درباداریاں کرنی پڑتی تھی۔ لیکن یہی پابندیاں اسکو آزاد طبیعت پر بڑی شاق گزرتی تھیں۔ وہ ہر وقت ان کی صحبت سے پہلو بچانے کی نفرت کی ساتھ کوششیں کیا کرتا تھا۔ اسی بنا پر اس نے بہت کچھ تکلیفیں بھی اٹھائی ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بادشاہوں نے بزور حکومت اس کو اپنا پابند بنانا چاہا اور اس نے فرار ہو کر مدت مدید تک شہر شہر کی خاک چھانی ہے۔ اس کا طرز زندگی حکیمانہ اصول پر مبنی تھا۔ کثرت سے مطالعہ کتب کیا کرتا تھا۔ سوتا اور کھاتا تو بہت کم لیکن بولتا بہت زیادہ تھا۔ ہر چیز میں صفائی اور پاکی کا بہت اہتمام کیا کرتا تھا دو چیزیں دل سے مرغوب تھیں، خوشبو اور موسیقی۔ موسیقی میں خود کو بھی کچھ دخل تھا اس لئے عموماً الاپتا رہتا تھا۔ سیر و تفریح کا بہت شایق تھا۔ اور مناظر قدرت کی

ل فریبیوس سے بیحد حظ حاصل کرتا تھا۔ خوش مزاجی، خندہ پیشانی اور خلق و مروت کی مجسم تصویر تھا۔

جالینوس ایک ہمہ گیر لیاقت کا انشا پرداز تسلیم کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تصانیف خواہ وہ کسی فن یں ہوں قطعاً عالمانہ اور مجتہدانہ ہیں۔ اپنے وقت میں علم منطق کا وہ ایک منفرد عالم مانا جاتا تھا اور اس علم میں س نے جو کچھ اضافے کئے ہیں وہ آج بھی محفوظ ہیں اور قدیم علم منطق کی تاریخ میں اس کا یہ کارنامہ وقیع ترین حیثیت کھتا ہے۔ روستہ الکبریٰ کے شاہی کتب خانہ میں اس کی بے شمار تصانیف محفوظ کر لی گئی تھیں لیکن افسوس کہ س لاجواب کتب خانہ کو آگ لگ گئی اور تمام علمی ذخیرہ خاک میں مل گیا۔ اس پر بھی اس نے اپنی تصانیف سینکڑوں لی تعداد میں یادگار چھوڑیں[۵] لیکن آج بہت ہی کم کتابوں کا وجود دنیا میں ہے۔ زیادہ تر اس کے تصانیف کا موضوع قواعد اخلاقیات اور منطق رہا ہے۔ ان میں بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو غلط طور پر اس کی طرف منسوب ہو گئی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جو مشتبہ سمجھی جاتی ہیں۔ بہر حال تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ صرف تراسی رسالے شائع شدہ کتابوں میں ایسے ہیں جنہیں یقین کے ساتھ جالینوس کی تصانیف کہا سکتا ہے۔

غزل

(از:۔ شوکت تھانوی)

اگر دل میں خیالِ شکوۂ بیداد آتا ہے
تو اس کے ساتھ پیمانِ وفا بھی یاد آتا ہے

جہاں سے نہرِ شیریں آ رہی ہے باغ خسرو میں
وہیں سے خون میں ڈوبا ہوا فرہاد آتا ہے

جہاں آغازِ فصلِ گل میں غنچے مسکراتے ہیں
وہیں اپنا دلِ مرحوم مجھکو یاد آتا ہے

وہیں کھینچے لئے جاتی ہے مجھکو آرزو میری
جہاں سے اک زمانہ باد دل ناشاد آتا ہے

ہم اپنی تلخ انجامی کو یکسر بھول جاتے ہیں
جب آغازِ محبت کا زمانہ یاد آتا ہے

یہ نغمے خوب ہیں اے خوش نوایانِ چمن لیکن
اسی کے شوق میں سوئے چمن صیاد آتا ہے

بہت ہمدرد ہیں دنیا کے ساتھی بھی مگر شوکت
مصیبت کے زمانہ میں خدا ہی یاد آتا ہے

۵لہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مذکور ہے کہ جالینوس کی کل تصانیف کی تعداد ۵۰۰ ہے۔ ۱۲

"دنیائے افسانہ" پر ایک سرسری نظر

(جناب محمد محسن خانصاحب متین حیدرآبادی)

"دنیائے افسانہ" ہمارے کرمفرما مولوی عبدالقادر سروری ایم۔اے کی مصنفہ ہے۔ جس کو موصوف نے ایم۔اے کی تعلیم کے زمانہ میں لکھا ہے۔ یہ کتاب اصول و مبادیات فسانہ نگاری پر اردو زبان میں سب سے پہلی ہے۔ اس کے شیوع سے عوام کے لئے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ وہ افسانوں کے محاسن و معائب سے آگاہ ہوجائیں گے۔ اور افسانوں کی غلط رفتار کے لئے ان کی آگاہی روک کا کام دیگی۔ اور رفتہ رفتہ افسانوں کا عام معیار بلند ہوتا جائیگا۔ نیز یہ امر ظاہر ہے کہ کسی افسانہ تراش کی تصنیف علمی طبقہ میں اس وقت تک قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی جائے گی جب تک کہ اس نے افسانوں کے حسن و قبح سے آگاہ ہو کر قصہ نہ لکھا ہو۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب کہ افسانے کے فن پر کوئی جامع کتاب موجود ہو۔ اگرچہ مغربی فاضلوں نے اولاً اس فن کی تدوین پر قلم اٹھایا اور ایک حد تک انکو اس مقصد میں کامیابی ہوئی۔ اردو میں اس کی بہت کمی تھی جو کچھ اس کے اجزا موجود تھے وہ "اجزائے پریشان" کی سی حالت میں تھے۔ اُن کو ایک جامع کتاب کی شکل میں پیش کرنا سروری جیسے ذی ہمت فاضل طیلسانی ہی کا کام ہے۔

اس وقت فاضل موصوف کی عمر ۲۴ - ۲۵ سال کے درمیان ہے۔ لیکن اُن کے زور قلم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق، انشا پرداز ہیں۔ حال ہی کا ذکر ہے کہ موصوف نے جامعہ عثمانیہ سے "ماسٹر آف آرٹس" کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب اُن کے زمانہ تعلیم کی یادگار ہے۔ لیکن یہ ایک تخلیقی چیز ہونے کی حیثیت سے توقع کیجاتی ہے کہ دنیائے ادب میں ایک زبردست شاہکار کا رتبہ عظیم حاصل کرے گی۔ کتاب زیر تنقید (۲۰) ابواب پر مشتمل ہے۔ جن میں "حقیقت اور افسانہ" "افسانہ کا ارتقا،" "اردو زبان، اور افسانے" "ابتدائی دور کے افسانے،" "فورٹ ولیم کالج کی کوشش" "اردو ناول" کے عنوانوں کے تحت شرح و بسط کے ساتھ عالمانہ اور فلسفیانہ بحث کی گئی ہے چنانچہ ہم ذیل میں ناظرین کی تفریح کے لئے کتاب ہذا سے چند سطریں نقل کرتے ہیں:-

"اپنے موضوع کو کامیاب بنانے کے لئے ایک فن کار کو بیشک عالم مثالی میں زندگی بسر کرنی"

"چاہیے۔ تخیل ایک طلسمات ہے جس میں قدم رکھتے ہی ساری کائنات شگفتہ نظر آنے لگتی ہے"
"لیکن کبھی کبھی عالم حقیقی میں بھی اتر آنا اس کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جب تک فنکار کے پیرائن"
"تخیل میں حقائق دنیاوی سوزن عیسیٰ کی طرح اسے نہ رہیں بہت ممکن ہے کہ وہ عرش معلیٰ سے.."
"بھی پرے اڑنے لگے حقایق پر نظر جمائے رکھنے سے ناول محض خیالی واقعات کا مجموعہ بنکر"
"نہیں رہجاتا بلکہ اس میں حقیقت شعری پیدا ہو جاتی ہے جن کا زبردست وکیل ارسطو ہے"

فاضل مصنف نے اس کتاب میں فنی ضرورت کے لحاظ سے جونادر الفاظ کی تراش خراش اور اصطلاحا[ت]
کی وضع وقطع میں جابجا اپنی اعلیٰ انشاء پردازی کا ثبوت پیش کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ چنانچہ کتا[ب]
لہٰذا سے ناظرین کی دلچسپی ومعلومات کی غرض سے ذیل میں چند اصطلاحیں اور نادر ترکیبیں پیش کیجاتی [ہیں]

استہزا خیز۔ فنکار۔ تماشکار۔ فوق فطری افسانے۔ موعظانہ قصے۔ تخم کاری۔ وجود پذیر۔
رزمیہ نگاری۔ طربیہ ناول۔ حزنیہ ناول۔ تماشہ گھر۔ انقلاب کن رستخیز۔ غفلت ورزی۔
ساقط از اعتبار۔ بلا توسط غیرے۔ کثیف خاکہ۔ گندہ احساسات۔ حقایق ملہمانہ۔ انفرادانہ
تشخص۔ موازنہ کن واقعات۔ کردار نگاری۔ حقیقت شعاری۔ رجائیت۔ کردار کشی۔ خارجیت۔
ادب علمی ادب الہامی۔ نطری افسانے۔

اس کتاب میں خیالی افسانوں کی جو تقسیم کی گئی ہے وہ چار عنوانات کے تحت ہے (۱) قصہ (۲) تمثیل (۳) [خ]
(۴) رومانس۔ قارئین کرام کو تمثیل پر شتباہ ہوتا ہوگا۔ اس لئے کہ اہل ایران نے ڈراما کا ترجمہ تمثیل کیا ہے
یہاں تمثیل سے مراد ڈراما نہیں ہے۔ بلکہ افسانہ کی ایک قسم ہے۔ لایق مصنف نے اس کی توضیح بذریعہ امثلہ
کی ہے۔ شاید اردو میں ایسا کوئی قصہ انکی نظر سے نہ گذرا ہوگا۔ "عشق ومحبت، حادثات اور مہمات کے رز[میہ]
قصے رومانس کہلاتے ہیں،" "رومانس" کے لئے اردو میں داستان کا لفظ موجود تھا۔ لفظ "خرد لاینا[ہی]
منتی دوبار استعمال ہوا ہے۔ ہندی اور عربی الفاظ میں فارسی ترکیب مثلاً نقل وسوانگ۔ فارسی الفا[ظ]
میں عربی ترکیب مثلاً بالراست۔ نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مصنف صاحب اس کتاب
آیندہ ایڈیشن کو۔ ع "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" کا مصداق بنائیں گے۔

ادبیات

تصوّرات

جب آدھی رات کو بزمِ جہاں خاموش ہوتی ہے ۔۔۔ حیاتِ عالمِ ایجاد جب بیہوش ہوتی ہے
دلِ مہجور دہراتا ہے افسانہ محبت کا ۔۔۔ فلک پر بزمِ انجم جب سراپا گوش ہوتی ہے
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

میں جب دنیا و مافیہا سے غافل ہوکے سوتا ہوں ۔۔۔ اور احساسات کی ہر قید سے آزاد ہوتا ہوں
جہانِ خواب میں پھرتی ہے تصویر محبت کی ۔۔۔ کلیجہ تھام کر اُٹھ بیٹھتا ہوں خوب روتا ہوں
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

سحر کے جھٹپٹے میں عابد و معبود ملتے ہیں ۔۔۔ بہت بے پردہ ہوکر ساجد و مسجود ملتے ہیں
مرا ذوقِ پرستش خواب سے بیدار ہوتا ہے ۔۔۔ نیاز و ناز سے جب حامد و محمود ملتے ہیں
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

مرے دلمیں سما جاتا ہے جب ذوقِ عبودیت ۔۔۔ مری تن میں اتر آتی ہے جب روحِ الوہیت
میں جب سجدہ گذارِ آستانِ عشق ہوتا ہوں ۔۔۔ مجھے جب قیدِ ہستی سے چھڑا لیتی ہے محویت
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

گل و ریحاں کے پردوں سے کوئی ہوتا ہے جب ظاہر ۔۔۔ عبودیت سے جب حمد و ثنا کرتا ہے ہر طائر
لبِ اظہار جو دل سے کیا کرتا ہے جب باتیں ۔۔۔ فنا ہوتا ہے جب جذباتِ حسن و عشق میں شاعر
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

نظر آتا ہے سورج آسماں پر اہلِ عالم کو ۔۔۔ شعاعیں جذب کر لیتی ہیں جب قطراتِ شبنم کو
مری فطرت میں ہو جاتی ہے جب اک تشنگی پیدا ۔۔۔ مرا دامن چھپا لیتا ہے میری چشمِ پرنم کو

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

دہنِ غنچہ کا جب میں دیکھ لیتا ہوں گلستاں میں — اُتر آتی ہیں جب نرگس کی آنکھیں چشمِ حیراں میں
مرے دل میں تپش اٹھتی ہے جب سوزِ محبت کی — کھٹکتا ہے کوئی کانٹا سا جب میری رگِ جاں میں

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

پپیہا "پی کہاں ہے" "پی کہاں ہے" کہہ کے روتا ہے — کوئی کافر ادا بھونرا کلی کے دل میں سوتا ہے
تصور میں نظر آتی ہے اک دنیا محبت کی — گل و بلبل میں جب رازِ و نیازِ عشق ہوتا ہے

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

بہم ہوتے ہیں جب حسن و محبت ایک محفل میں — حقیقت کروٹیں لیتی ہے جب دنیائے باطل میں
تہی آغوشیاں میری مجھے بیچین کرتی ہیں — نئے ارمان ہو جاتے ہیں جب پیدا مرے دل میں

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

کیا کرتے ہیں قطرے جستجو میں جب سمندر کی — فضا سے کشمکش ہوتی ہے جب ذرات خودسر کی
رگ و پے میں مری جب روح کی گردش سماتی ہے — میں جب تسکین کرنا چاہتا ہوں قلبِ مضطر کی

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

بساطِ آب و گل پر ہوتے ہیں جب رنگ و بو پیدا — ہوا کرتی ہے جب گلہائے تر میں اک نمو پیدا
مری نظریں جب ان سے اکتسابِ کیف کرتی ہیں — مرے دل میں ہوا کرتی ہے جب اک آرزو پیدا

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

قمر خورشید سے جب اکتسابِ نور کرتا ہے — اور اس دنیا کو اپنے نور سے معمور کرتا ہے
شعاعِ پرضیا جب مجھکو مجھ سے چھین لیتی ہے — مجھے جب خود فراموشی پہ دل مجبور کرتا ہے

خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

اکبر حیدری

پہاڑی لڑکی

(از جناب محمد شفیع صاحب کاشف اکبرآبادی)

خدایان حسن و عشق میں اپنے خونی روزنامچہ کی گمشدگی سے سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے کہ یہ کون موشگاف ہے جو اہل ارض پر ہمارے پوشیدہ حالات کا انکشاف کر رہا ہے؟ —

کیا ہم بتادیں کہ آج صحرائے "ایک فیلڈ" کی ایک "حور صحرا" مرقی کی تصویر دوشیزگی اپنے خامہ رنگین طراز سے ادب و معانی کے دلاویز رنگ میں قرطاس زبان پر کھینچکر .... کی شیفتگی کو طشت ازبام کرنے والا وہی کاشف (صاحب شوالہ) ہے جس نے عرصہ ایک سال کا ہوا انہی صفحات پر ارض ناتف کی مدفن قدح الکاثنات یا قبلہ آذر کے ذی روح اور متحرک بت زادہ کے حسن کی شرح کرتے ہوئے ہرناق کے راز عشق کو فاش کیا تھا؟!

کیوپڈ اپنے بے پناہ تیر سے جو کام لے رہا ہے کیا ظالم کاشف اپنے خوں چکاں قلم سے وہی کام نہیں لیتا؟

نوٹ:- چونکہ آیندہ کیوپڈ کے خفیہ کارناموں کا انکشاف زبان ہی کے ذریعہ ہوا کرے گا لہٰذا پہلو میں زخمی دل رکھنے والوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ ان صفحات کا ضرور مطالعہ کریں ممکن ہے کہ جراحت دل کے اندمال کی اسی سے کوئی صورت نکل آئے!!! — حالانکہ ترجمان عشاق کا تو یہ قول ہے کہ

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی   لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

"ایڈیٹر"

(۱)

سالمی اپنی عشرت گاہ زمردین میں نسیم کے لطیف ترین جھونکوں سے کھیل رہی تھی۔ نیم خوابی کی نیم مست ادائیں اُس کی زہرہ آفریں انگڑائیوں کو بوسۂ پرستش دے رہی تھیں۔ سالمی نزاکت اور طراوت اُس کی نازک پیکر

سہیلیاں اس کے کفِ پا کے آئینوں کو غبارِ نگاہ سے صاف کر رہی تھیں۔ یکایک ساگی ایک موج محسوس کی طرح اٹھی۔ اور کیوپڈ کی طرف جو اپنے تیر و کمان کو تکیہ بالش بنائے ہوئے سو رہا تھا دیکھ کر بولی۔ کیوپڈ اٹھو میں تمہیں ایک کارِ عظیم کے انجام دینے کے لئے زمین پر بھیجنا چاہتی ہوں۔

کیوپڈ تیر و کمان ہاتھ میں لئے ہوئے اٹھا۔ معصومیت نے اوس کی انگھڑیوں کو بوسے دیئے۔ وہ نہایت ادب آمیز لہجہ میں بولا۔ ساگی وہ کام کیا ہے میں تیار ہوں۔ ساگی نے بلورین گردن اٹھائی اور اپنی مخمور آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے بولی "جاؤ تلاش کرو دنیا میں غیرت، رحم، اور محبت کا کہیں نشان باقی ہے یا نہیں۔ اچھی طرح تحقیق کرو اور مجھے آ کر جواب دو۔

کیوپڈ نے کمان میں تیر جوڑا۔ اور کماندار وں کے اندازِ خرام کے ساتھ ایک طرف روانہ ہو گیا۔

(۲)

کسان اپنے جھونپڑے میں آسودگی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی بیوی اور دو لڑکیاں ایک ہی میز پر سادہ کھانا کھانے میں مصروف تھیں۔ سادگی اور جمود و سکون اس کے تسلی خانہ کے گوشہ گوشہ سے جھلک رہا تھا۔ محنت کے بعد انتہائی واماندگی کی خاموش کیفیتیں ہر چہرہ پر برس رہی تھیں۔ اور کیوپڈ اپنی تلاش کی منزلیں طے کرتا ہوا اس جھونپڑے کے باہر چلا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ سکون کے نقوشِ غیر متحرک اس مکانِ سادہ پر چھائے ہوئے ہیں۔ چلتے چلتے اس نے ایک تیر اس کے دروازہ پر بھی پھینک ہی دیا۔ اور غائب ہو گیا۔

مرفی کسان کی سب سے بڑی اور سب سے حسین لڑکی نے ایک نئی انگڑائی لی۔ اس کی آنکھوں سے کچھ نئے آنسو نکلے اس کا گداز سینہ کچھ زیادہ ابھر گیا۔ وہ ایک نامعلوم جذبے سے متاثر ہو کر گھبرائی ہوئی سی اٹھی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ ایک ٹوکری اٹھائی، اور جھونپڑے سے باہر چل دی۔ اس کی رفتار میں برقیت جسم میں لچک، اور آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اٹھلاتی ہوئی گھر سے دور نکل گئی اور پھولوں کے اس کنج میں جا پہنچی جو اس کے کھیتوں کے قریب دریا کے ساحل پر مہک رہا تھا۔ اس نے بہت سے پھول جلد جلد توڑ لئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگی گویا کہ اسے کسی کا انتظار تھا۔ اس کے دل میں کوئی ارادہ نہ تھا مگر وہ ایک ارادہ سے لبریز نظر آتی تھی۔

تھیول، اس کے باپ کا ایک کاشتکار دور سے مسکراتا ہوا آیا۔ مرفی کو نئی شان خود نمائی میں کھڑا

ن کا تبسم معنی خیز ہوگیا۔ وہ خلاف عادت آگے بڑھا چلا گیا اور اب مرنی بالکل اس کے پاس تھی۔ ہوائے ساحل کے بھیگے ہوئے جھونکے دونوں کے سادہ لباسوں کو آپس میں ہمکنار کر رہے تھے۔ مرنی کچھ دیر خاموش رہی پھر ایک ول میتھول کو نذر کیا اور اس کے گلے میں بے اختیار باہیں ڈال دیں۔ میتھول چاہتا تھا کہ مرنی کے جذبات کی پذیرائی ے لئے اپنے ہاتھوں کو بھی جنبش دے، مگر مرنی اس سے فوراً جدا ہوگئی۔ اور اسی خرام بدمست کے ساتھ اُنکی ن تبسم نگاہوں سے دیکھتی ہوئی دور چلی گئی۔ میتھول سراسیگی کی بے خودی میں وہیں کھڑا رہا اور وہ نظروں ے غائب تھی۔

مرنی خدا جانے کیا چاہتی تھی، اس کی مستانہ کیفیتیں خدا معلوم اُسے کہاں لے جا رہی ہیں وہ بڑھی چلی گئی، ر ایک ایسے مقام پر پہونچ گئی جہاں چشمے کے کنارے کنارے دور تک پہاڑ تھے۔ اور جو یہاں آکر مثلث کی صورت تقسیم ہوگئے تھے۔ پہاڑ کا ایک بلند مگر مختصر ٹکڑا چشمے کے گھوم پر وقار آشکار تھا اور اس کے چاروں طرف بلند ر تناور درخت کھڑے ہوئے تھے۔ وہ یہاں پہونچکر ٹھٹکی اس نے دیکھا کہ ایک جوان مصور کسی شاہکار کی تکمیل میں صروف ہے۔ اتنا مصروف کہ اُسے مرنی کے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی۔ مرنی اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے لئی۔ تصویر پر ایک متحرک سایہ محسوس کرکے مصور نے نظر اٹھائی۔ مرنی نے سبد گل سے ایک گہرا سرخ ول نکالا۔ اور مصور کو نذر کر دیا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو" مرنی نے نہایت سادگی سے پوچھا۔ اور مصور نے بغیر لت جواب دیا میں "بازگشت" کی تصویر اپنے موقلم سے کھینچنا چاہتا ہوں۔

رنی۔ بازگشت؟

صور۔ ہاں اے حور صحرا وہ بازگشت جس کے امکان تخلیق و وجود پر ہماری آسمانی کتاب نے پیشین گوئی کی ہے۔

رنی۔ لیکن غیر مرئی اور خیالی تصویر کس طرح اتار سکو گے۔

صور۔ میں کوشش کر رہا ہوں، اور میرا تصور کبھی کبھی میرے خیال کا ہیولہ قائم کرکے میرے نظروں کے سامنے بھی لے آتا ہے۔

رنی۔ کیا اُسے میں دیکھ سکتی ہوں۔

صور۔ صرف کاغذ پر۔

رنی۔ کیا وہ تمہاری طرح اس فضا میں نظر نہیں آسکتی۔

صور۔ نہیں، اس لئے کہ تم مصور نہیں ہو۔ اور ہنوز اس کی تخلیق کا بھی یقین نہیں ہے

مرفی ۔ اچھا یہ ایک پھول اور قبول کرو ۔ اگر تم تیک فیلڈ میں میرے مکان پر کبھی آئے تو میں بھی تم سے اپنی تصویر کھچواؤں گی ۔ کیا تم کبھی آؤ گے ۔

مصور ۔ تمہارا نام کیا ہے ۔

مرفی ۔ مجھے اینل مرفی کہتے ہیں ۔ اچھا سلام !

مصور قلم در دست دیکھتا رہا اور مرفی اسی طرح لچکتی ہوئی اس کی نگاہوں سے غائب ہو گئی ۔

(۳)

چودھویں رات کا چاند سمندر میں طلائی قمقمے جلا رہا تھا ۔ سکون انگیز موجیں کرنوں کی گود میں کھیل رہی تھیں ، بھیگی ہوئی رات کی زلفیں تا کمر پہنچ چکی تھیں کہ سمندر کی پریاں چاندنی کی سیر کے لئے نکلیں ، اور اپنے نورانی جسموں سے شمعیں بناتی ہوئی ساحل پر آ بیٹھیں ۔ موجیں ان کے پاؤں چومتی تھیں ، اور چاند کی سنہری کرنیں ان سے ہم آغوش ہوئی جاتی تھیں ۔ ان کے لمبے اور کالے بال کمر سے بہت نیچے تک بکھرے ہوئے تھے چاند سے زیادہ شفاف عریاں جسم کالے بالوں میں کچھ عجیب طلسم بنا رہے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا چند جوان نئی راتیں اپنے اپنے چاند لے کر سمندر کے کنارے جمع ہو گئی ہیں ۔ گورے گورے جسموں سے چاندنی نکلی ہی پڑتی تھی ۔ سمندر ان اُجالوں سے ہمہ نور اور رنگیں ہی میں بنا ہوا تھا ۔ یہ سمندر کی کنواریاں آپس میں چھیڑیں کرتی ہوئی کبھی موجوں کے ساتھ سمندر میں چلی جاتی ہیں اور کبھی پھر ساحل پر آ جاتی تھیں ۔ چاند ، آسمان اور سمندر کے سوا ان نوری پیکروں کا دیکھنے والا کوئی اور نہ تھا ۔ ہوا کبھی کبھی ان کے اچھوتے جسموں کو چھو کر گدگدا جاتی تھی ، اور یہ ہوا کے ایک لطیف ترین لمس سے بے قرار ہو کر اس قدر ہنستی تھیں کہ موجوں کا پر سکون شور خاموش ہو جاتا تھا ۔ چاند کی کرنیں جب ان کے ہمہ نور جسموں کو ہم آغوش کرتی تھیں تو ہر چہرہ ایک حسین انفعال برسنے لگتا تھا ساحل کے نمناک خاک کا ذرہ ذرہ ان کے خرام لطیف سے کنول کے پھول کی طرح شگفتہ تھا اور جتنی جگہ پر یہ دوشیزگان بحر کھڑی ہوئی کھیل رہی تھیں اتنی جگہ چاندنی کے پھولوں سے بھری ہوئی نظر آتی تھی ۔

سمندر کی پریاں پانی کی معصوم موجوں سے ابھی کھیل رہی تھیں کہ ایک آواز آئی اور یہ فوراً سمندر کی چادر میں غائب ہو گئیں ۔ مرفی اپنے پیکر خاکی سے نوری شعاعیں چھینکتی ہوئی ، پھولوں کی ٹوکری ہلاتی ہوئی اور بال بکھرائے ہوئے ساحل پر آ پہونچی ۔ اس نے چاند کو اس قدر دست پہلی مرتبہ دیکھا تھا ، یہ اس کے شباب کی پہلی منور رات تھی ، جسے وہ سکون اور محویت کے عالم میں اپنی نظروں سے تو بہ شکن دیکھ رہی تھی ۔ اس نے ٹوکری

رکھدی اور استغراق کی موجیں اُس کے نازک پاؤں کے بوسے لے کر کئی مرتبہ چلی گئیں مگر اُسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ آخر میتھول نے اس کی محویت کو توڑا جو بڑی دیر سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اور کہا مرفی! رات ختم ہونے کو ہے اب گھر چلو۔ ایل تمہارے لئے پریشان ہوگا۔

مرفی۔ میتول تم یہاں کہاں؟

میتھول۔ اپنے مالک کی کنواری لڑکی کو میں تنہا کس طرح چھوڑ سکتا تھا۔ میں ہر وقت تمہارے ساتھ تھا اور ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گا۔

مرفی۔ آخر اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔

میتھول۔ صرف تمہاری نگرانی۔ دنیا حوادث کی کروٹیں بدل رہی ہے۔ تم ابھی نوجوان ہو تمہیں کیا خبر کہ تمہاری ہر ٹھوکر سے کتنے فتنے بیدار ہو کر تمہیں گھیرنا چاہتے ہیں۔

مرفی۔ پھر تم ان کا انتظام کیا کرو گے۔

میتھول۔ میں ہر ٹھوکر اپنے طاقتور جسم پر سنبھالونگا، اور ہر فتنے کو اپنے زبردست ہاتھوں سے پھر سلا دونگا۔

مرفی۔ مگر میں نے تمہیں اس تکلیف کے لئے مجبور تو نہیں کیا۔

میتھول۔ ہرگز نہیں، یہ ایک میرا فطری جذبہ ہے جو خدا نے تمہاری طرف سے میرے دل میں پیدا کر دیا ہے۔

مرفی۔ پھر اب تم کیا چاہتے ہو۔

میتھول۔ یہی کہ گھر چلو۔ اور اپنے ارادۂ سیر و تفریح کو صبح پر ملتوی کر دو۔

مرفی۔ میتھول، میں چاہتی ہوں کہ ان کرنوں میں جو سمندر میں غسل کر کے مجھ تک پہونچ رہی ہیں جذب ہو جاؤں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سمندر کی ان نغمہ آفریں موجوں کی گود میں سو جاؤں۔ تم مجھے اس فردوس نظارہ سے محروم کرنا کیوں چاہتے ہو۔

میتھول۔ صرف اس لئے کہ چاند کی کرنیں اور سمندر کی موجیں تم سے زیادہ تمہارے لئے بیتاب ہیں۔ اور میں ان کی خواہش کی تکمیل نہیں چاہتا۔

مرفی۔ دیکھو، میتول دیکھو، ادھر دیکھو، چاند کی کشتی خالی ہے۔ سمندر کی موجیں اُسے درہم برہم کر رہی ہیں، بس مجھے جانے دو میں اس میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کروں گی اور .... اور ....

مرفی نے یہ کہا اور میتھول کے گلے میں باہیں ڈالدیں مگر میتھول ایک زبردست اور غیر متاثر کریکٹر

کا جوان تھا اس کے جذبات میں جنبش تک نہ ہوئی - اور وہ مرنی کو گلے سے لگائے ہوئے جس قدر جلد ممکن ہو سکا ریک فیلڈ واپس آگیا -

(۴)

طلوعِ خورشید سے ایک گھنٹہ پہلے صبح صادق نے نور کی بانسری بجائی - وادیاں انگڑائیاں لے کر اُٹھیں، چشموں نے آنکھیں ملیں، پہاڑوں کی گھاس نے جماہی لی - اور دامن کوہ سے جبالہ جو اپنی جماعت میں بنت الجبال کہلاتی تھی خواب گاہ سے اُٹھکر پہاڑوں کو نوید صبح اور پیغام سحر دینے چلی ....

ہاں تو جبالہ وہ بنت الجبال پہاڑوں کو نوید صبح اور پیام سحر دینے چلی - وہ ابھی اپنی خواب گاہ سے تھوڑی ہی دور پہونچی تھی کہ اس کی ہم جلیس غیبی کنواریاں ہر طرف سے مسکراتی اور کھیلتی ہوئی نکل آئیں - سب نے اُسے سلام کیا اور ہنستی بولتی ایک طرف روانہ ہوگئیں - پہاڑ کے ایک سرے پر یہ حسین قافلہ ٹھہرا - آسمان تاروں سے صاف ہو چلا تھا - اور اب صرف اتنے تارے روشن باقی تھے جتنی یہ لڑکیاں تھیں - جبالہ کی جبین ناز سے صبح قریب طلوع تھی - اس کے پابوس بال چمکدار ہوتے جاتے تھے - اس کی رخسار کی سُرخیاں آفتاب کے لئے اُفق بنا رہی تھیں - اور وہ اپنی صحابیات کے ساتھ رسم صبح ادا کرنے پہاڑوں پر گھوم رہی تھی -

آخر اس نے اپنی نشیلی اور بدمست آنکھوں سے ایک بانسری بجائی، اس کی سہیلیاں رقص کرنے لگیں - اس کے ہونٹوں نے نغمے پیدا کئے - اور وہ بولی - عدنہ کیا یہ صحبتیں اسی طرح ہوتی رہیں گی، اور یوں آرزو پوری نہ ہوگی -

عدنہ - قسم ہے رب الجبال کی، اے جبالہ اگر تم حکم دو تو میں قوس کو اسی وقت اپنے ہمراہ لے آؤں، مگر خداوند جبال مرکاؤس کو اگر ذرا بھی اطلاع ہوگئی تو وہ ہماری جانوں کو عذاب میں گرفتار کر دے گا -

جبالہ - کیوں نعلین تمہاری کیا رائے ہے - اس نے اپنی ایک دوسری مصاحب سے پوچھا -

نعلین - خداوند پہاڑوں پر تمہاری حکومت ہے - قوس ایک ادنیٰ موکل معدنیات ہونے کی حیثیت سے تمہارا غلام ہے - مگر عدنہ کی طرح میں بھی خائف ہوں -

جبالہ - کیا تم میں سے کوئی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا - جبالہ نے سب کی طرف نگاہ ڈالی - ان

لڑکیوں میں سے چھوٹی لڑکی شرارہ تھی۔ چمک کر بولی، جبالہ تم روز نوش کا ذکر کرکے ہمارے مراسم سحری اور عبادت صبحگاہی میں بدمزگی پیدا کر دیتی ہو۔ میں آج ہی خداوند مرکادس کو اس کی اطلاع دیئے دیتی ہوں۔ اُس کا غضب یا تو تمہاری اس حسرت کو مٹا دیگا، یا ہمیں تمہاری اس مصاحبت سے آزاد کر دیگا۔

جبالہ نے کوہ شکن غصہ کی بے پناہیوں کو روکتے ہوئے جھنجلا کر کہا۔ شرارہ، کیا تو چاہتی ہے کہ تیرا یہ سوز اور تیری یہ چمک ہمیشہ کے لیے تجھ سے چھین لی جائے اور تجھے ایک ذرۂ تاریک بنا کر پہاڑوں میں سر ٹپکنے کے لیے آزاد کر دیا جائے۔

شرارہ۔ خداوندہ، تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو، مگر ....

جبالہ۔ بس میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ آج سے تمہاری آزادی موقوف، سیر و سیاحت بند، پتھر کے زندان میں ہمیشہ کے لیے قید ہو جاؤ، اور جب تک تم پر لوہے کی ضرب نہ پڑے پتھر سے باہر نہ آؤ۔

جبالہ نے اپنی پوری قوت و جبروت سے یہ فیصلہ کیا تھا۔ شرارہ دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑ میں سما گئی باقی لڑکیاں ڈر کر خاموش ہو گئیں اور جب سورج نے انہیں جھانکنا چاہا تو یہ بھی سب سایہ کی طرح غائب تھیں...... مگر کرنوں کے اُجالے میں جب پہاڑوں نے اپنے دامن چمکائے تو مریٰ متحیر کھڑی تھی۔ وہ پہاڑوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اُس کا چہرہ اُس کے جذبات کا آئینہ بنا ہوا تھا۔ اُسکی آنکھیں بہت زیادہ منور ہوئی جاتی تھیں۔ اور اس کا شباب اُس کے سینہ سے اُبلا پڑتا تھا۔ وہ خدا جانے کب سے یہاں کھڑی تھی۔ دن نکلا، دھوپ پھیلی۔ نوخیز شکاری بندوقیں لئے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں آموجود ہوئے۔ کوہی اور صحرائی جانور جو رات کی برودت کو زائل کرنے کے لئے دھوپ میں پڑ اور پاؤں کھولے بیٹھے تھے اُن پر بندوقیں برسنے لگیں۔ کسی کا بچہ دودھ پی رہا تھا مر گیا، کسی کی مادہ کلیلیں کر رہی تھی، ماری گئی کوئی پانی پیتا ہوا کوئی نغمے گاتا ہوا، کوئی اُڑتا ہوا، کوئی سوتا ہوا، اور انگڑائیوں لیتا ہوا شکار ہو گیا۔ ابھی دو چار بندوقیں چلی تھیں کہ ایک توانا اور تندرست شخص سنگِ آسمان کی طرح پہاڑ سے لڑھکتا ہوا آیا، اور شکاریوں کی بندوقیں چھین کر بولا۔ حریص انسانو، تمہیں شرم نہیں آتی کہ یہ بے زبان جانور جو نہ تمہیں ستاتے ہیں نہ تم سے اپنا رزق مانگتے ہیں نہ کبھی تمہارے سامنے آتے ہیں خدا کی زمین پر خدا کے حکم سے زندگی بسر کر رہے ہیں، تم صبح ہوتے ہی ان پر بجلی کی طرح آ پڑے اور شکار کرنا شروع کر دیا۔ اگر کوئی غیبی شکاری اسی طرح صبح ہوتے ہی تمہارے گھروں پر جا پڑے جبکہ تمہارے بچے کھیل رہے ہوں، تمہاری عورتیں مسکرا رہی ہوں تمہارے عزیز و اقارب اور بھائی اپنے امید افروز ارادوں کی تکمیل کے لیے تیار ہوں اور وہ غیبی شکاری تمہیں چھوڑ کر ان سب کا شکار کر لے تو تمہارا کیا حال ہو۔؟

خونی انسانو، تمہارے مُنہ سے خون لگا ہوا ہے۔ تم بکری، بھیڑ، بھینس، مرغ، کبوتر، مچھلی سب کچھ اپنی

خواہش کے مطابق گھر بیٹھے حاصل کر لیتے ہو۔ اور حاصل کر سکتے ہو، پھر کونسی بات تمہیں مجبور کرتی ہے کہ تم ان بے زبانوں کا خون کر کے اپنے نامۂ اعمال سیاہ کرو۔ صحرائی مخلوق کی یہ بربادی اور بے کسی تمہاری شامتِ اعمال کا باعث بنی ہوئی ہے۔ چلے جاؤ۔ اور خبردار اگر ان مقدس پہاڑوں کے دامنوں میں پھر کبھی قدم رکھا تو ایک ایک کی گردن پکڑ کر نیچے پھینک دونگا۔ شکاریوں پر اس عجیب شخص کی تقریر نے کافی اثر کیا، اور وہ سر جھکائے واپس چلے گئے ——————— یہ میتھول تھا۔

میتھول نے دیکھا کہ مرفی متحیر و حیران کھڑی ہوئی ہے گویا سنگتراش نے ایک مرمریں بت تراش کے پہاڑ کے دامن پر نصب کر دیا ہے۔ وہ سامنے آیا۔ پوچھا، مرفی، تم کیا سوچ رہی ہو۔

مرفی۔ آہ میتھول، تم نے میری دنیائے تصور کو درہم و برہم کر دیا۔ میں اس پہاڑ کی عظمت و بلندی سے اپنی خواہشوں کے مطابق ایک بت تراش رہی تھی، وہ ابھی مکمل نہ ہوا تھا کہ تمہاری آواز نے میری تخیلی ترتیب کو منتشر کر دیا۔ تمہیں میرے ساتھ رہنے کی ضد ہے تو رہو، لیکن خدا کے لئے میرے تصورات میں حارج ہونے کی کوشش نہ کرو۔

میتھول۔ تصورات! صرف خیال کی پستی و بلندی کا نام تصور ہے، خاموشی اسمیں رنگ بھرتی ہے اور تخیل حرکت دیتی ہے۔ تم تصور سے عمل کے میدان میں کیوں نہیں آجاتیں، کہ حیرت و تصور کی دشوار گذار وادیاں کنواری مرفی تمہارے پاؤں برداشت نہ کر سکیں گے۔

مرفی۔ نہیں میتھول، میں اپنے کنار شوق میں کسی کو کھینچنا چاہتی ہوں، مگر کھینچ نہیں سکتی۔ میری طبیعت خود بخود جذب و انجذاب کی کیفیتوں سے معمور ہوئی جاتی ہے۔ اور مجھے معلوم نہیں کہ میں کہاں اور کسیں جذب ہونا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری طبیعت کے اس نئے طلسم کی عقدہ کشائی کر سکتے ہو۔

میتھول۔ نہیں۔ لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ انجذاب پروانہ ایک شمع، اور جذب شمع ہزاروں پروانے اپنے گرد پیدا کر لیتا ہے۔ اور دونوں میں سے کسی کو تلاش اور جستجو کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مرفی۔ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ میں بھی انتظار کروں گی۔ لیکن کیا کروں طبیعت بہت بے چین ہے گھر میں جی نہیں لگتا۔ دل کوسوں اڑا جاتا ہے۔

میتھول۔ اچھا مرفی، اب دھوپ زیادہ پھیل گئی ہے۔ ان وادیوں میں جہاں دھوپ کی سختی سر بفلک پہاڑ کی تپش سے بہت زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے، زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔

مرفی۔ کیا ان کی تپش اندوزی مجھے جذب نہیں کر سکتی۔ لیکن ان پہاڑوں میں جذب کا مادہ نہیں ہے اچھے میتھول مجھے بتا کیوں نہیں دیتے۔

میتھول۔ مرفی، حرارت کو حرارت جذب نہیں کر سکتی تمہارا شباب اپنی گرمی اور حدت کے اعتبار سے ایک انجذاب شاداب کا تمنائی ہے، اور پہاڑوں کی خشک بلندیاں ان اثرات کو جذب نہیں کر سکتیں

مرفی۔ تو کیا میں سمندر اور دریاؤں سے پناہ مانگوں؟ کیا وہ میری پذیرائی کریں گے؟۔

میتھول۔ نہیں شباب کی تپش اندوزی شباب ہی کی نمی میں جذب ہو سکتی ہے۔

مرفی۔ مگر ایسا شباب! پیارے میتھول کیا تم جوان نہیں ہو؟

میتھول۔ مگر میں آتیل کا ایک وفادار خادم ہوں۔ تم اس کی امانت ہو، میرا فرض ہے کہ تمہاری نگرانی کروں اور جب تک تمہیں محبت کی منزل مقصود کا سیدھا راستہ نہ مل جائے تمہیں غلط راستوں سے بھٹکنے سے بچاؤں۔

مرفی۔ آہ، محبت، مقصود، اور غلطی۔ میتول چلو میں دیوانی نہ ہو جاؤں۔ مجھے اپنے اطاعت گذار جذبات میں پناہ دو۔

آخری دونوں لفظوں کے ساتھ مرفی کے نازک کلائیوں میں جنبش ہوئی اور وہ میتھول کی گردن میں حائل تھیں۔

(باقی آیندہ)

شہادت منصوری کا نظارہ

مجرم عشق کوئی دار پہ چڑھنے آیا — حسن بیتاب ہے ہوتا ہے غضب یہ کیسا
آسمان لرزہ براندام . زمیں ہلتی ہے — قتل پر کس کے یہ دنیا نے کمر باندھی ہے
گردشیں دینے لگا کون اسے حشر انگیز — الاماں - ہوتا ہے "پیمانۂ ہستی" لبریز
شور ظلمات میں ہے نور پہ دھاوا کردو — پھر سے دنیا کے اُجالے میں اندھیرا کردو
اک طرف پاس وفا دور زماں ایک طرف — حسن و عشق ایک طرف دونوں جہاں ایکطرف
آسماں والے اُدھر اور اِدھر اہل زمیں — اہل دل ایکطرف ایک طرف ظاہر بیں
صورتیں ایکطرف مادیات ایک طرف — ذات بحت ایک طرف اور صفات ایکطرف
عشق اور حسن کو ضد ہے کہ دوئی مٹ جائے — فکر اسما کو یہ کثرت میں نہ کچھ فرق آئے
متنازع ہوئے آپس میں غرض باطل و حق — کشمکش میں تھا اِدھر عاشق حسن مطلق،
حسن کہتا ہے اکرشمہ تو ذرا دکھلادے — عشق کا قول کہ اب جام شہادت پی لے
تھا خیالات میں اک حشر طلاطم برپا — ساتھ ہی سینہ میں جذبات کا طوفاں اٹھا
دار نے شکل الف اللہ کی جونہی دکھلائی — "نحن اقرب" کی صدا تار رسن سے آئی
حسن معشوق کا جلوہ نظر آیا سر دار — کہہ کے لبیک بڑھا عاشق جانباز اک بار
حوصلے عشق نے دو چند کئے اسکے فزوں — چل گیا حسن کا چلتا ہوا اسرار فسوں
نقش کثرت کو دیا جذبہ وحدت نے مٹا — اُٹھ گیا صاف نگاہوں سے دوئی کا پردا
راز نے جلوہ کیا دور حجابات ہوئے — شوق طرفین بڑھا دور حجابات ہوئے
آسماں نے یہ صدا دی کہ زمیں کو تھامو — آئی آواز معاً اسکو کہ خود ہی سنبھلو
اہل عالم کی نگاہوں میں سیاہی چھائی — وصل کا وقت ہے غیروں کو نہ دی دکھلائی
اسم ذات ایک رہا مٹ گئے اسمائے صفات — جوہر نور نجوم آیا بروئے ذرات
مل کے معشوق سے اک جان دو قالب جو ہوا — چڑھ گیا دار پہ خود شور "انا الحق" کرتا
مرگ منصور نے یہ داد جو دی وحدت کی — روح خالد نے صدا عالم ارواح سے دی

"برزمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود
بروائے واعظ خودبیں کہ ز چشم من و تو
رازِ ایں پردہ نہانست نہاں خواہد بود"

خالد (بنگالی)

زیب النسا کی قبر

زیب النسا کی قبر جو تھی خاک میں نہاں
صدیوں کے بعد اُسکا ملا گم شدہ نشاں

مشہور ہے جو تیس ہزاری کے نام سے
تھا گنج بے بہا اُسی میدان میں نہاں

مٹی میں مل رہا تھا دُرِ شاہوار حیف
اوجھل نظر سے خاک کے تودوں کے درمیاں

شاید پسِ فنا یہ تخلص کا تھا اثر
مخفی کی قبر بھی جو خفا میں رہی نہاں

اُگلا ہے خود بخود یہ دفینہ زمین نے
ممنون جستجو نہیں رودادِ بے کساں

تصویرِ دستبردِ حوادث ہے سر بسر
اُبھرا ہے فرشِ خاک پہ جو نقشِ رائگاں

گنبد ہے۔ مقبرہ ہے۔ نہ لوحِ مزار ہے
تعویذ قبر کا بھی ہے مٹتا ہوا نشاں

نے شمع ہے نہ چادرِ گل ہے نہ قبر پوش
مٹی کا ایک ڈھیر ہے عبرت کی داستاں

ویرانی لحد ہے مُجاورِ سرِ مزار
زائر ہجوم یاس۔ تباہی ہے پاسباں

ہے گرد سے اٹا ہوا انبار خاک کا
سبزہ تو کیا کہ شکلِ نمو بھی نہیں عیاں

اُڑتی ہے خاک اور برستی ہے تیرگی
چھایا ہوا ہے حسرت و اندوہ کا سماں

بادِ صبا چڑھاتی ہے چادر غبار کی
ہیں ذرہ ہائے ریگ بیاباں گہرفشاں

ہے اس کی خوابگہ یہ شبستانِ خاک اب — زیندہ جس کے دم سے تھے قصرِ فلک نشاں
دختِ ماہوشِ شہِ ہندوستاں کی تھی — تھا مصدرِ سخا و کرم جس کا آستاں
روشن چراغِ بزمِ سخن جس کے دم سے تھا — مشہور تھی جو شاعرۂ فیض ترجماں
ں جس کے حسن و عشق کے قصے زبان پہ — کافی ست ایں اشارۂ من بہرِ عاقلاں
ں کو پسِ فنا ہے یہ مٹیا محل نصیب — امن کو جس کے گردِ سرِ راہ تھی گراں
سچ ہے نہیں زمانے کو ایک وضع پر قرار — نیرنگِ روزگار۔ چنیں ہے گہے چناں
حق کہ بے ثبات ہیں اسبابِ ظاہری — سچ ہے کہ انقلاب کی تصویر ہے جہاں
ہے امتیازِ شاہ و گدا تا بہ زندگی — ہے زیرِ خاک پست بلندیِ عز و شاں

وہ آج غرقِ خون ہیں جو کل محو ناز تھے
وہ آج سرنگوں ہیں جو کل سرفراز تھے

برق (دہلوی)
بی۔ اے

لازوال شاعر

(اثر :- شوکت تھانوی)

شافعی کے لئے وہ صبح کسقدر دلچسپ اور جاذبِ نظر تھی جبکہ کشمیر کی فردوس آفرین فضا نے موسمِ بہار
 نکلتے ہوئے سورج کی درخشاں شعاعوں کو زعفران کے کھیت میں پریشان کر دیا تھا، اور چھوٹی چھوٹی خوشنما
اڑیوں کو جو سبز پالباس سبز سے آراستہ تھیں عالمِ سکوت میں مخمورِ رنگینی رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔

شاعر کے لئے ایک ایسا عالم، ایک ایسا منظر، ایک ایسی فضا، سیکڑوں حشر سامانیاں مہیا کر دیتی ہے۔ شافعی
بانشاعر جو عالمِ جوانی میں غارتگرِ شباب کی مکمل تصویر تھا، یہ مناظر اپنے لئے اور اپنے کو ان مناظر کے لئے وقف سمجھتا
تھا عالمِ وجد میں گنگناتا ہوا اور ہر نقشِ زرّین کو اپنی شراب بار آنکھوں میں جذب کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت وہ
شاعر نہ تھا بلکہ شعر تھا اور شعر بھی وہ شعر جو صرف ایکمرتبہ سماعت میں گونج کر، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دل میں جذب ہو جائے
اس کے شعر بار آنکھیں مناظرِ لطیف کو فطرت کی ایک نظم سمجھ کر پڑھ رہی تھیں اور وہ مغلوب اثر ہو کر جھوم جھوم
جاتا تھا۔ اُسی عالمِ جذب و سُکر میں اسکی نظریں چنار کے ایک درخت پر پڑیں اور اُس نے صاف دیکھ لیا کہ کچھ حروف
درخت کے تنے پر منقوش ہیں وہ قریب گیا قریب تر گیا اور اس نے صاف پڑھ لیا کہ کھدے ہوئے حروف کے
مجموعے سے ایک تابناک شعر بنتا ہے ؎

"سیکڑوں بہاریں آئیں اور خزاں بن گئیں۔ سیکڑوں حسین پیدا ہوئے مگر مٹ جانے کے لئے لیکن لازوال"
"شئے جس نے ان سب کو اہمیت دی محبت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور ہر بہار اور ہر حسن اسی"
"ایک عنوان کے تحت میں ہیں ——————"

اُس نے پڑھا اور اپنے دل میں رکھنے کی ایک چیز سمجھ کر نقش کر لیا۔ دیر تک عالمِ حیرانی میں ادھر اُدھر دیکھتا رہا کچھ سمجھ
میں نہ آیا آخر ایک فولادی ٹکڑے سے کندہ شعر کے نیچے دوسرا شعر لکھدیا۔

"محبت کے لازوال شعر کہنے والا ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے وہ بھی ہمیشہ سے زندہ ہے اور محبت کے وجود"
"تک زندہ رہیگا، اس فضائے خاموش میں محبت کا شعر سیکڑوں نغمے گا رہا ہے مگر سازِ خاموش کے بجائے"
"بولتی ہوئی بانسری درکار ہے ——————"

شعر لکھا اور اسی خیال میں مستغرق جدھر سے آیا تھا اسی طرف چلا گیا۔

(۲)

ٹھیک اس وقت جبکہ شام کی سرگین سیاہی فضاء عالم پر مستولی تھی۔ پرندے بسیرے کی فکر میں فلاء آسمانی میں پرواز کر رہے تھے اور سطح آب ان کے عکوس اپنے میں جذب کر رہی تھی تالابوں کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اپنی جنبش خفیف سے سیکڑوں بے معنی نقوش پانی پر بناتیں اور مٹا دیتی تھیں۔ تنویرہ کی حسین فطرت نے کل کی طرح آج بھی ان مناظر سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دی۔ وہ اٹھی اور اپنے رخساروں کے سرخ آئینے چمکاتی اپنے چمکدار گیسوؤں کو شاعرانہ انداز سے شانوں سے ہم آغوش کرتی ہوئی چلی اور سرخ سڑک پر اپنی ٹھوکروں سے سیکڑوں شفقتیں پیدا کر دیں بہار کی ملکہ بنی ہوئی وہاں پہونچی جہاں شب گذشتہ ایک نقش محبت ثبت کر آئی تھی۔

اس نے دیکھا اور حیرت سے دیکھا کہ اس گنجان جنت میں اس کے فردوس آفرین شعر نے اپنے جذب کامل سے ایک حسین شعر اپنا شریک سکوت بنا لیا ہے وہ اپنے ہلال فریب ہونٹوں سے مسکرائی اور ایک طوفان شباب برپا کر دیا اس نے دیکھا اور غور سے دیکھا کہ شعر کی سادگی معصوم معانی پیدا کر رہی ہے اس نے محسوس کیا کہ گویا اس کا جگایا ہوا جادو اسی پر پلٹ گیا ہے اور وہ بیچین تھی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ تباہ کن شعر کسی دماغ کا نتیجہ ہے وہ کون ساحر ہے جس کے جادو نے اس وقت ایک دم اس کی رنگینیوں کو فتح کر لیا ہے ——— وہ برابر انہی خیالات میں مستغرق رہی دفعتاً اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اس نے کہا:-

"بولتی ہوئی بانسری درکار ہے ——— یہ کیا؟"

"یعنی میں خود اپنا شعر یہاں پڑھوں؟ مگر کون سنے گا؟"

"کیا یہ مطلب ہے کہ خود انہیں کو پکڑ کر سناؤں؟ ہاں یہی ہے"

"مطلب ——— مگر میں اس شاعر کو کہاں سے پاؤں؟ نہیں"

"وہ ضرور آئیگا ——— اچھا تو میں یہ کروں ———"

یہ کہہ کر تنویرہ اٹھی اور درخت کے تنے سے اپنا شعر مٹا دیا اور مٹا کر شعر کی جگہ ایک عبارت لکھدی:-

"شعر کے جذب نے شعر کو جذب کر لیا، لازوال شعر زندہ ہے مگر"

"زندہ رہنے والے شاعر کی بانسری میں پڑھ اپنا شعر اور اس ترنم"

"سے کہ فضاء خاموش ساز اٹھالے میں سن رہی ہوں سنا"

"مجھ کو اے نہ فنا ہونے والے شاعر سُنا ———"

"——— "تنویرہ" ———"

عبارت لکھکر تنویرہ ایک قریب تر گنجان جھاڑی میں روپوشس ہوگئی جہاں اس کے تنفس کی گرمی خوشبو میں پرورش پانے لگی اور اس کی زلفوں کے ارتعاش میں سنہرا چاند اپنی آسودہ اور خواب آلود چاندنی پھیلانے لگا۔

(۳)

صبح کی سپیدی ابھی سورج کی سنہری شعاؤں سے بے نیاز تھی اور درختوں پر قسم قسم کے جانور نغموں کی وائے دل کش سے جھنیں بکھیر رہے تھے اور آنکھوں سے ایسی بارش ہورہی تھی گویا فرشتے تقدیس ملکوتی کو غسل دے رہے ہیں تنویرہ بیدار ہوچکی تھی اور منتظر تھی کہ ایک نغمہ روح کش اس کو نوید صبح دے نغمہ وہی نغمہ ہو جو اس کے دل و دماغ میں گونج کر روح نوازی کر رہا تھا۔

شافعی نے کل کا دن اور رات جس طرح بھی کاٹی ہو بہرحال آج صبح سے وہ گھر چھوڑ کر طلوع ہونے والے سورج کی ایک کرن شعاع سے اپنے شعر کا جواب طلب کر رہا تھا وہ بیتابانہ چیڑ کے درخت کے پاس پہونچا اور صرف اپنا شعر باقی دیکھ کر متعجب ہوا دوسرے شعر کی جگہ عبارت پڑھ کر چاروں طرف اس طرح نظر دوڑائی گویا وہ "تنویرہ" کو ڈھونڈ رہا ہے، اُس نے یہ آواز بلند کہا۔

"تنویرہ! تنویرہ!! اے شاعروں کی ملکہ تنویرہ!!!"

مگر آواز سب جنگل میں گونج کر وہی الفاظ اور وہی آواز پیدا کرتی اور رہجاتی تھی، تنویرہ نے سُنا اور خاموشی کے ساتھ شافعی کی ایک ایک حرکت دیکھتی رہی ——— شافعی نے پھر کہا ؎

نکل کر ایک زمانہ جبیں بہ سجدہ ہوا ✧ حجاب حسن کی توہین ہے حجاب نہ کر

"تنویرہ آ ——— اور سُن میں شعر پڑھتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ میری شعریت لرزاں سے متاثر ہوجائیگا ——— !تو نہیں آتی؟ ——— اچھا سُن میں تیری خیالی تصویر کو مخاطب کرکے شعر پڑھتا ہوں ———"

اُس نے شعر پڑھا اور کچھ ایسے انداز سے پڑھا کہ جنگل کی خاموش فضا کو مرقص کردیا "تنویرہ" بیتاب ہوگئی اور اضطراب کی کشمکش سے مغلوب ہو کر بجلی کیطرح شافعی کے سامنے جھک کر گری اور "لازوال" شاعر کہکر ہم آغوش ہوگئی۔ لب بہ لب سرخی بادل کی طرح چھاگئی اور موسیقی بجلی کی طرح تڑپ تڑپ کر رہگئی۔

روحِ بیداری

ہے ظلمت امروز میں روحِ حیات — کیا شبِ دوشینہ کے پیشِ نظر ہوں واقعات
ہے کچھ، جانتی تھی تجھ کو دنیا بت شکن — آج ذرّہ ذرہ تیرے دل کا ہے اک سومنات
ی خوابیدہ اب وہ بربطِ شیریں نوا — جس کے ہر اک تار کی لرزش سے تھی پیدا حیات
لئی وہ روشنی جو رہنما منزل کی تھی — "شاخِ آہو" پر تمناؤں کی ہے اب تو "برات"
ں لاحاصل نے ناکامِ تمنا کردیا — ہوگئی مصروفِ باطل تیرے دل کی واردات
ہی تھی ایک عالم پر مسلط خوابِ مرگ — تجھ سے چھینی جارہی تھیں جبکہ تیری حیات
ک اجزائے عالم ایک ہی رشتہ میں تھے — آج وہ شیرازہ ہے شکستہ ذات وصفات
ن اب بھی مرتعش ہیں تار نغموں کے لئے — منتظر نورِ سحر کی اب بھی ہے ظلمت کی رات
ہ ہستی ہے خواہاں اس فضا کا آج بھی — جس سے بیداری کی پیدا ہوں جہاں میں کیفیات
بھی دنیا زندگی کے واسطے تیار ہے — ہو مگر اسکے لئے پیدا نگاہ التفات

تو کہ اک خورشیدِ تاباں ہے زمانہ کے لئے
اٹھ! اور اپنے نور سے معمور کردے کائنات

قیصر (از بھوپال)

شوہر کے نام

(عطیہ جنابہ ہمشیرہ صاحبہ مطلب حسین صاحب عالی لکھنوی)

ئی دن ہوئے آپ کا خط پہونچا۔ میں نے کئی بار پڑھا لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب لکھوں۔ آپکا
نے سے دُنیا کی بڑی منتی ہوں اور دُنیا سے ڈرتی ہوں تو آپ کے خلاف مزاج ہوتا ہے۔ اسی
ہیں میں کئی دن گذر گئے۔ چند باتیں اس معاملے میں غور طلب ہیں پہلے اونکو گذارش کرتی

آپ کہتے ہیں کہ لڑکی کو پردے میں نہ بٹھایا جائے۔ پردے کے متعلق نئی روشنی کے لوگوں
ت سے اعتراض ہیں جن میں سے چند اعتراضات کا ذکر کرتی ہوں:-

۱۔ مُسلمانوں نے اپنی عورتوں کو پردے میں رکھ کر اُن پر ظلم کیا ہے۔

چ پوچھو تو مسلمان مردوں نے اپنی عورتوں کو پردے میں رکھ کر عورتوں سے زیادہ خود اپنے
لم کیا ہے۔ کیا وہ نہیں چاہتے کہ بجائے ایک بیوی کے وہ نوجوان حسین عورتوں کے جھرمٹ
ھ کر ان سے محظوظ ہوں مگر وہ اپنی قوم میں نیک نفسی قائم رکھنے کے لئے اُن کو پردے میں
راپنے اوپر جبر کرتے ہیں۔ پاک نفسی قائم رکھنے کے لئے پردہ سد سکندری کا کام دیتا ہے۔ کوئی
کتنا ہی نیک دل ہو مگر فطرت نے جو ایک جنس میں دوسرے کے لئے قوت جاذبہ پیدا کی ہے
کو کون روک سکتا ہے؟

عیسائی قوم میں بازاروں۔ کلب گھروں۔ گرجاؤں اور تھیٹروں میں جہاں مردوں اور عورتوں
تماع ہوتا ہے وہاں کتنے ہی ایک دوسرے کو گھورتے نظر آتے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کو
یں بہت لطف آتا ہے اور وہ دل ہی دل میں ان لوگوں کو گنا کرتی ہیں جو ان کی طرف
ن نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔
ہندوستانی اس بات میں اپنی ذلت سمجھتے ہیں اور ہے بھی ذلّت۔ کوئی غیرتمند اس
تا کو برداشت نہیں کر سکتا۔

۲- ہندوستانی بغیر دیکھے بھالے شادی کرتے ہیں۔ اور جبکہ ان میں پیشتر سے محبت نہیں ہے تو بعد کو اچھی طرح نباہ نہیں ہو سکتا۔

سطحی نظر سے یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا عمیق نظر سے دیکھو کوئی مرد یا عورت جس کی شادی اسی طریقہ سے ہوئی ہو وہ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ شادی سے قبل دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے غائبانہ محبت موجود تھی جب وہ ملے اور ایک نے دوسرے کی صحبت اٹھائی تو اس محبت کو اور بھی استحکام ہوا۔ یہ پردے ہی کی برکت ہے کہ یہاں ہر خوبصورت۔ بدصورت بے تمیز۔ باتمیز۔ بے شعور اور باشعور سب کی شادی ہو جاتی ہے اور پہلی غائبانہ محبت کی ابتدا کی بنا پر کامیاب اور خوش حال زندگی بسر کرتے ہیں۔ ناکامیابی کی جو مثالیں نظر آتی ہیں اس کی وجہ یہ نہیں۔ بلکہ جہالت اور نا عاقبت اندیشی ہے۔

اب دیکھو کہ بے پردگی کی وجہ سے یورپ وغیرہ ملکوں میں شادی ہونا کیسا دشوار ہے۔ اوّل اوّل نوجوان لڑکیاں بوجہ خود مختاری کے کسی کا پابند ہونا پسند نہیں کرتیں لیکن جب اپنی معاش پیدا کرنے کے لئے تمام دن محنت ومشقت کرنا پڑتی ہے تو اس کو انکا دل نہیں چاہتا (جیسا کہ کسی کا دل نہیں چاہتا) محنت سے عاجز و پریشان ہو کر وہ چاہتی ہیں کہ کوئی ایسا ذریعہ معاش ہو تا کہ بلا مشقت روزی بہم پہونچے اب وہ شادی کرنا چاہتی ہیں تو جس شخص کو وہ اپنے لئے انتخاب کرتی ہیں وہ شخص اس کو اپنے لائق نہیں سمجھتا۔ جو شخص اس عورت پر فریفتہ ہے اسکو یہ عورت حقیر سمجھتی ہے۔ صورت۔ صحت۔ دولت۔ عزت وغیرہ وغیرہ مانع ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جستجوئے شوہر اور تلاش زوجہ کی کشمکش میں اتنا زمانہ گذر جاتا ہے کہ شباب رخصت ہوتا ہے۔ کوئی غمخوار۔ اور رفیق نہ ہونے کی وجہ سے ان کے دل مغموم اور چہرے پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ مشقت و تفکرات میں مبتلا رہتے رہتے آخر کار ضعیف ہو جاتے ہیں۔ آخر عمر میں کوئی اولاد نہیں ہوتی کہ اس بُرے وقت میں ان کے کام آوے۔ وہ بصد غم و الم اپنی جان دیتی ہیں۔ کتنی ہی ضعیف العمر لیڈیوں کو میں نے اپنے کانوں سے یہ کہتے سنا ہے کہ "کاش ہماری بھی شادی ہو جاتی۔ کوئی ہماری بھی زندگی کی بہار دیکھنے والا ہوتا۔ ہم بھی کسی کی بیوی یا کسی کی ماں کہلاتے۔" اور اسی طرح مردوں کے قول کا آپ نے اعادہ کیا ہے۔ قدرت نے ہر انسان کے دل میں یہ آرزوئیں پیدا کی ہیں۔

۳۔ ہندوستانی اپنی عورتوں کی آواز کا بھی پردہ کرتے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ آواز ایک دلکش چیز ہے۔ کتنے ہی بدشکل گانے والے مرد اور عورتیں ہیں جن کی آواز دلکش کے اشتیاق میں خلقت امنڈ آتی ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک ضعیفہ نے آپ سے پردے کی آڑ سے کوئی بات چیت کی تھی تو بعد کو آپ نے مجھ سے کہا کہ ان کی آواز بڑی دلکش ہے۔"

کسی نابینا سے پوچھا گیا کہ "تم کو کبھی عشق ہوا ہے؟" اس نے کہا "میں بچپن سے اندھا ہوں" کبھی کسی کو دیکھا نہیں مگر ہاں ایک عورت کو بولتے سُنا ہے جس کی آواز اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ اس کے لئے بہت بے قرار ہو جاتا ہوں۔ کاش وہ عورت مجھے مل جاتی کہ وہی آواز مسلسل سُنتا۔"

ایک واعظ نے ایک مجمع میں بیواؤں کے عقد ثانی کے متعلق وعظ کہا۔ ایک عورت ایسی از خود رفتہ ہوئی کہ واعظ کے انکار کرنے کے باوجود اس نے زبردستی اسی سے نکاح کیا۔

پس ضروری ہے کہ آواز کا پردہ کیا جائے تاکہ آواز کے لحن اور طرز گفتگو سے کوئی متاثر نہ ہو سکے۔ آواز کا پردہ کرنے سے بھی پاک طینتی کا قیام مدنظر ہے۔ اس میں بھی بہ نسبت عورتوں کے مردوں نے اپنے اوپر زیادہ ظلم کیا ہے۔

۴۔ ہندوستانی اپنی عورتوں کے ناموں کا بھی پردہ کرتے ہیں کہ کوئی ان کے نام نہ سُنے بنت فلاں۔ ہمشیرہ فلاں۔ زوجہ فلاں۔ والدہ فلاں وغیرہ اشارات سے ذکر کرتے ہیں۔

ناموں کے پردہ کرنے کا یہ سبب ہے کہ ہندوستانی شرفا کی غیرت یہ نہیں گوارا کرتی کہ ہماری عورتوں کے نام مردوں کی زبان پر اسی طرح جاری ہوں جس طرح بازاری عورتوں کے نام باہر پکارے جاتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک احترام ہے جو مرد اپنی عورتوں کے لئے کرتے ہیں۔

انجمن آرا بیگم میری ایک سہیلی بہت آزاد پسند ہیں۔ اتفاق سے میں ایک مرتبہ ان کی مہمان تھی کہ ان کے نام ایک خط آیا۔ ہم لوگ بالاخانے کے ایک کمرے میں تھے وہاں سے دیکھا کہ پوسٹ مین ایک خط ہاتھ میں لئے لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ "انجمن آرا بیگم" کا مکان کون سا ہے؟ کسی نے کہا "ہم نہیں جانتے" کسی نے کہا کہ "شاید یہ محمد رضا صاحب کی صاحبزادی کا نام ہے" پوسٹ مین نے کہا کہ "یہ کوئی شریف زادی ہیں یا طوائف؟"

ناموں کے پردے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ کوئی اچھا اور دلچسپ نام سنکر کسی مرد کے دل میں اس
اشتیاق نہ پیدا ہو۔ جس سے پاک باطنی میں خلل آئے۔ مثلاً کسی شخص کی بیوی کا نام "جمال آرا بیگم" ہے۔ اس
سننے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ بیوی بہت حسین ہوگی۔

۵۔ کوئی شے جسقدر زیادہ پوشیدہ رکھی جاتی ہے اتنا ہی دوسروں کو اس کا اشتیاق زیادہ ہو
ہے اور اس طرح پردے میں رہنے سے عورتوں اور مردوں کے درمیان بدنفسی پیدا ہونے کا زیادہ موقع
غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اشتیاق قائم رہنے میں جو سرور ہے وہ اشتیاق ختم ہو جا
میں نہیں ہے۔ لیکن کوئی شے جب بالکل دیکھی سنی نہ ہو تو اشتیاق کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ اور جو شے مم
نہ ہو سکے اس کا اشتیاق نہ پیدا ہونا کتنا ضروری ہے۔ پردہ اس میں کسقدر مدد کرتا ہے۔

بے پردہ ممالک میں جہاں عورتوں اور مرد ہر جگہ برابر نظر آتے ہیں۔ اپنے روزانہ کام ملکر انجام دیتے
ہیں۔ ایک ساتھ کھیلتے۔ گاتے۔ بجاتے اور ناچتے ہیں وہاں اشتیاق کیسا! ہر شخص ضرورت سے زیادہ او
حد سے باہر آکر اپنے اشتیاق کی آگ بجھا سکتا ہے۔ ہاتھ پکڑ کر گلے ملکر ناچے۔ جتنی دفعہ دل چاہا موقع نکا
بوسہ بازی کی۔ عوام کا تو ذکر کیا۔ متبرک پادریوں اور ننوں کے درمیان۔ گرجاؤں۔ اور خانقاہوں
میں جو جو واقعات گذر جاتے ہیں ان کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ پادریوں اور دیگر عورتوں کے درمیان
ہر قسم کے تعلقات جائز ہیں۔ ننوں کے بچوں کو پادری گردن دبا کر مار ڈالیں تو کچھ گناہ نہیں۔ کسی ایسے
کام سے ان کی پارسائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں کہ آپ کی نوجوان بیٹی۔ غیر لوگوں سے شیک ہینڈ کرے۔ تنہائی میں بیٹھ
مردوں کے ساتھ باتیں کرے۔ محفل میں پیانو بجا بجا کر گیت گائے اور ناچے۔ واہ واہ کی تالیاں بجیں۔ کتنے ہی آ
اسکا منہ چومیں اور رخصت ہوں۔ آپسمیں تذکرے ہوں کہ "اس کے بال بہت خوبصورت ہیں" "آنکھیں تو بس
غضب کی ہیں" "آواز بڑی دلکش ہے" "ناچتے وقت تتلی معلوم ہوتی ہے"

بھلا ہندوستانی غیر تمند مردوں اور عورتوں میں ایسے مناظر دیکھنے کی تاب کہاں؟ ادنےٰ درجے کے جاہل او
کوڑھ مغز مسلمان میں بھی اتنی غیرت ضرور ہوتی ہے۔ خدا وہ دن نہ لائے کہ ہندوستانی مسلمان ایسی باتوں
کو تہذیب اور شائستگی میں شامل کرلیں! میں نے کئی خاندانوں میں بے پردگی کا رواج ہوتے دیکھا ہے لیکن وہ
چند دن کے کچھ ایسی باتیں نظر آئیں کہ پھر انہوں نے پردہ قائم کیا۔ اسوقت لوگوں کو بڑا مذاق ہاتھ آیا۔ مگر ا

شہیدِ تغافل

(از "بالم")

(بہ سلسلہ ماسبق)

(۷)

"غالباً یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ مرنے والے حامد کے نزع کی حالت میں آخری الفاظ کیا تھے اور اگر میں اس ذمہ داری کو جو میں نے اپنے سر لی ہے پورا نہ کروں تو حامد کی روح بے چین رہیگی حشر میں مجھ سے مواخذہ کرے گی اور مجھے شرمندہ کرے گی کہ میں نے اس کے پسماندوں کی خبر نہ لی وعدہ خلافی کی اور میں نے اس کے عنصر خاکی سے پرواز کرنے والی روح! آرام سے نکلنے والی روح!! اور مطمئن روح سے دغا کی دھوکا دیا لہٰذا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تم کو اس بات کا یقین دلادوں کہ میں تمہاری کفالت کا ذمہ دار ہوں اسلئے بہتر ہے کہ تم اپنے گھر واپس چلی جاؤ میں تمہاری ضروریات کو تازندگی پورا کرتا رہوں گا مگر یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ محض اپنے شوہر کے آقا کے ناخواندہ مہمان بن کر اس کے لطف و کرم کی امیدوار ہو کر ہمیشہ اسی کے ممنون احسان ہو کر بلکہ بار خاطر ہو کر اپنی زندگی بسر کرو! اس کے مقابلہ میں ایک فرزند کی بھی خدمات کسی طرح احسانات کی مد میں داخل نہیں ہوسکتیں، مجھے اپنا فرزند ہی تصور کرو!"

یہ تھی منظور کی آخری تقریر جو بہت کچھ ردوقدح کے بعد اس نے سلیمہ کی والدہ اصغری سے کی، کی اور ایسے مؤثر پیرایہ میں کی کہ سلیمہ کی مستقل مزاج ماں کا دل بھی متزلزل ہوگیا۔ ایک شریف نوجوان کے مواعید پر یقین، ایک سچے ہمدرد کے مخلصانہ مشورہ کی قدر، ایک مفلسی میں ساتھ دینے والے غمگسار کے ہمدردانہ الفاظ پر اعتماد نہ کرنا اصغری کے اختیارات سے باہر تھا رضامند ہوگئی اور آمادہ ہوگئی مگر پھر بھی سوچنے کے لئے ایک روز کی مہلت طلب کی۔

اصغری! جفاکش اور غریب اصغری نے بھلا یہ راحت آرام کاہے کو دیکھا تھا بلا محنت و مشقت وقت

بہ عمدہ سے عمدہ کھانا اچھے سے اچھا کپڑا اور کام بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھ کر خوش گپیاں کرنا یا ایک آدھ سوئی کا ٹانکا لگا دینا وہ لیس پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس نعمت کو اس راحت اور اس آرام کو ٹھکرا دے عذاب سے مبدل کر لے اور پھر خانہ داری کے جھگڑے کو مول لے، یہ اور اس قسم کے اور بہت سے موانعات تھے جس سے وہ الٰہی بخش کے سایۂ عاطفت سے علیحدہ ہو کر نوجوان منظور کی مرہون منت ہونا نہیں چاہتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اپنی نوجوان بیٹی کی موجودگی میں کسی نوجوان محسن کی ممنون احسان، ممنون احسان ہی نہیں، متہم متہم ہی نہیں مطعون خلایق ہونا نہیں پسند کرتی تھی۔

ماں بیٹی میں جو گفتگو ہوئی اس کا نتیجہ کچھ خوشگوار نہ نکلا دو متضاد طبائع کا شیر و شکر ہونا ایسا ہی تھا جیسا آب آتش کا ایک ہونا، اگر ایک اس بات پر بہ ضد تھی کہ ہلاکت آفرین عسرت میں جس کے زیر بار احسان رہے ہیں تباہ کن مفلسی میں جس کی دولت سے مستفیض ہوئے ہیں اب بھی اسی کے مرہون منت رہیں تو دوسری اس بات پر مصر تھی کہ شفق مہربان اور اخلاص و محبت سے پیش آنے والے آقا کے عطایا رسے بہرہ اندوز ہونا جس کے ہم مدت مدید سے ریزہ خوار رہے ہیں بمقابل ایک نوجوان ناتجربہ کار نوجوان کی فیاضی سے فائدہ اٹھانے کے کہیں بہتر کہیں انسب اور کہیں افضل ہے۔ مختصر یہ کہ برخورداری پر بزرگداشت غالب آئی، غالب آئی اور دو حرماں نصیب دلوں کی آرزوؤں کا خون کر گئی، خون کر گئی اور ہمیشہ کے لئے انکی کامیابی کی راہ میں سد سکندری حائل کر گئی۔

منظور کو اپنی تدبیر کی ناکامی پر جس قدر بھی صدمہ ہوا ہو گا وہ ظاہر ہے باوجود اس کے وہ خوش تھا تو صرف اس خیال سے کہ سلیمہ اس کو چاہتی تھی وہ زندہ تھا تو اس لئے کہ سلیمہ کی حیات بخش آنکھوں میں ابھی محبت کا اثر باقی تھا۔

سلیمہ نے اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی ماری تھی یہ مصیبت اسی کی آوردہ، یہ آفت اسی کی پیدا کی ہوئی، یہ تفرقہ انگیز ستم اسی کا مشورہ کا توڑا ہوا اور یہ فساد کا بیج اسی کا بویا ہوا تھا جو اب جڑ پکڑ گیا تھا اور کرتے دھرتے کچھ بن نہیں پڑتا تھا مگر محض اس خوش کن امید پر کہ گاہے ماہے ماماجی کے ذریعہ سے چوری چھپے ہی سہی اپنے منظور نظر منظور سے ملنے کا ملکر جلے پھپھولے پھوڑنے کا، جلے پھپھولے پھوڑ کر دل کی بھڑاس نکالنے کا، دل کی بھڑاس نکال کر جی ہلکا کرنے کا موقع مل جایا کرے گا۔

اس کے بعد سے یہ نوگرفتاران محبت، یہ بلا گردان الفت اور یہ پاکبازان عشق اکثر تنہائی میں ملتے اور نہ ختم ہونے والے گلہ شکوہ نہ تھمنے والی آنسوؤں کی جھڑی اور نہ رکنے والے جذبات کے ساتھ

علیحدہ ہوجایا کرتے تھے باوجود سخت احتیاط کے کوٹھی کی ایک شوخ لڑکی اس نہ چھپنے والے راز سے سلیمہ کی حرکات اور منظور کے اضطراب سے آگاہ ہوگئی مگر چالاک سلیمہ نے شبو کو جھٹ اپنی ہمراز بنالی جس سے راز عشق پردہ راز ہی میں رہا۔

ایک روز اس نوجوان رازدار لڑکی نے جسے بیگم صاحبہ شبو کہہ کر پکارتی تھیں سلیمہ سے کہا جیسی محبت منظور کو تم سے اور تمہیں منظور سے ہے اگر ایسی ہی مجھے اور مجھ سے کسی کو ہوتی تو کب سے میں اس کی اور وہ میرا ہوجاتا اور کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع بھی نہ ملتا مگر تم پر تعجب آتا ہے کہ باوجود اس شدت محبت کے اب تک ایک دوسرے کے نہیں ہوئے۔

—— ہوئے کیوں نہیں ہیں ہم آپس میں ایک جان اور دو قالب ہیں مگر کچھ ایسے ہی موانعات درپیش ہیں کہ ہم بظاہر ایک دوسرے سے غیر اور اجنبی ہیں۔

—— مگر اس طرح کب تک چوری چھپے سے آپس میں ملتے جلتے رہوگے اس دن کا بھی تو دھیان کرو کہ خدانخواستہ جب تمہاری اس چوری کی خبر کوٹھی میں عام ہوجائے گی۔ تمہاری والدہ، بیگم صاحبہ اور سرکار کو بھی ان خفیہ ملاقاتوں کا حال معلوم ہوجائے گا اس وقت تمہیں کیا کچھ نہ پچھتانا پڑے گا اور تم بیچارے منظور کا تو اس بدنامی سے برا حال ہوجائیگا بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ وہ اس ذلت سے جان نہ کھو بیٹھیں۔

—— تو اب تمہیں بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے میری تو مت گم ہوگئی ہے وہ تو شادی کرنے کو بھی تیار ہیں بہ شرطیکہ ہم یہاں سے علیحدہ ہوجائیں مگر اماں جان جب مانیں بھی وہ تو یہاں کا آرام دیکھ کر گھر جانے کا نام ہی نہیں لیتیں۔

—— اس صورت میں تم خود منظور کے عندیہ سے اپنی والدہ کو اگر وہ ناواقف ہے آگاہ کردو کسی اور ذریعہ سے ان کے کان تک یہ بات پہنچادو کہ تم بھی اس کو پسند کرتی ہو۔ ممکن نہیں کہ تمہاری اماں رضامند نہ ہوجائے وہ اپنے سر سے جوان لڑکی کا دبال اترتا دیکھ کر فوراً آمادہ ہوجائیں گی بھلا ایسا اچھا ٹھکانا اور پھر شریف گھرانے کا ایسا عزت دار اور نیک لڑکا کاہے کو کسی کو مل سکتا ہے میرے نزدیک تو تم اپنے تئیں خوش قسمت بلکہ قابل رشک ہو لہٰذا اگر میری بات مانو تو اماں کو درمیان رکھ کر آج ہی اس ذکر کو چھیڑ دو۔

سلیمہ کو شبو کی یہ رائے پسند آئی اور اس بات پر آمادہ ہوگئی کہ اول تو اور ذرائع سے اپنی اماں بان کو رضامند کرے اور اگر اس پر بھی وہ رضامند ہوئیں تو پھر میں علی الاعلان اپنی رضامندی کا اظہار دوں گی چاہے لوگ مجھے بے شرم و بے حیا ہی کیوں نہ کہدیں۔

سلیمہ نے وہ سب کچھ کیا جس کا عزم کر چکی تھی مگر بڑھیا اصغری کے کان پر جوں تک نہ رینگی وہ کچھ اور ی خواب دیکھ رہی تھی۔

(۸)

آج الٰہی بخش کی کوٹھی میں غیر معمولی چہل پہل نظر آرہی ہے کوٹھی کا ہر چھوٹا بڑا فرد خوشی سے جامہ میں ہیں سماتا ہر طرف صفائی اور آرائش ہو رہی ہے زیریں حصہ کا گول کمرہ بھی سجایا جا رہا ہے ملازمین اصیلیں مائیں اور خادمائیں رنگ برنگ کے لباس پہنے ہوئے ہیں گویا آج کا دن عید بن کر کوٹھی میں آیا ہے لٰہی بخش اور ان کی بیگم صاحبہ بھی آج اپنے لخت جگر رحیم بخش کے علیگڈھ کالج سے واپس آنے پر بے اندازہ رسند و بشاش ہیں یہی وجہ ہے کہ آج تمام ملازمین اپنے آقا کی مسرت میں حصہ لے رہے ہیں اور انعامات ملنے کی ید پر خوش ہیں۔

یوں تو کوٹھی کی تمام لڑکیاں زیورات و ملبوسات سے آراستہ تھیں ان میں شبو اگرچہ اپنی دل کش داؤں اور شوخی کے سبب سب سے زیادہ حسین معلوم ہوتی تھی مگر سلیمہ کے حسن پر غضب کا نکھار بلا کی دلفریبی اور یامت کی دلربائی نظر آرہی تھی سبز ریشمین ساٹن کا چست پاجامہ پنڈلیوں میں نہایت زیب دیتا تھا اس پر شربتی ململ کا ہلکے پیازی رنگ کا گھٹنوں سے اونچا اونچا کرتہ اس کے نقرئی جسم کو ایسا ہی ظاہر کر رہا تھا جیسا سفید لکہ ابر کے نیچے ماہتاب نظر آتا ہے اور ان سب پر غضب ڈھانے والا ہلکے گلابی رنگ کا دوپٹہ اس کو وہ کچھ بنائے ہوئے تھا جس پر ممکن نہیں کہ انسان کی نظر پڑے اور فریفتہ نہ ہو جائے فریفتہ ہی نہیں ہزار جان سے قربان نہ ہو جائے آخر رحیم بخش بھی انسان ہی تھا کوٹھی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی نظر جس پر پڑی وہ یہی ناظورہ ناز آفرین سلیمہ ہی تھی آنکھیں چار ہوتے ہی دل میں جذبہ محبت، محبت میں خلش۔ خلش میں لذت، لذت میں ایک مبہم امید بیتاب تمنا اور رنگین آرزو پیدا ہوگئی۔

ان لڑ جانے والی آنکھوں کو چار ہونے والی نگاہوں کو سب نے دیکھا مگر منظور نے نگاہوں کے برقی تصادم کو دل میں پیوست ہو جانے والی نظروں کو محبت کے برقی پیغاموں کو اور ایک دوسرے کے

دل سے محبت کے نکلتے ہوئے مخفی شعلوں کو بھی دیکھا! دیکھا اور رشک کی آنکھوں رقابت کی نگاہوں اور حاسدانہ نظروں سے دیکھا اور؟ اور اس پر ایک برقِ ہاتف گری دل آتش رشک سے بھُن گیا دماغ آتش فشاں پہاڑ کی طرح شعلہ فگن ہو گیا اور اس نظارہ کا جانگداز نظارہ کا اثر دل پر لے کر کلیجہ تھامے ہوئے گھر آیا۔ پہلی مرتبہ بھی جبکہ سلیمہ کے تیر نظر سے زخمی ہو کر گھر آیا تھا اس کے اضطراب کا یہی حال تھا لیکن وہ اضطراب لذت اندوز تھا اور یہ اضطراب جاں سوز تھا۔

منظور کے قدم پہلے جس ذوق و شوق کے ساتھ الٰہی بخش کی کوٹھی کی طرف بڑھتے تھے اور دل جس جلوہ گاہ میں اس کو ہر روز کشاں کشاں لے جاتا تھا اب وہ جلوہ گہ ناز آتشکدہ بنی ہوئی ہے اب وہ مقام جہاں سلیمہ سے گھنٹوں تخلیہ رہتا تھا اس کو اپنی آرزوؤں کا مرقد نظر آتا تھا اسلئے قدم کی تیزی سست دل کے ولولے مردہ اور وہ تمام ذوق شوق معدوم ہو گیا ہر روز کا جانا موقوف اور دیدار یار سے بھی محروم ہو گیا۔

منزل عشق میں سب سے کڑی راہ اگر ہجر و فراق ہے تو غالباً جذبہ رشک و رقابت اس کی انتہا ہے پختہ کاران جنون عشق اسی مقام پر پہنچکر عشق کامل کی سند حاصل کرتے ہیں اور بوالہوس اس خارزار میں آکر برباد ہو جاتے ہیں فنا ہو جاتے ہیں۔

سلیمہ نے منظور سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور ایسی اجنبی ہو گئی کہ گویا کبھی آنکھیں چار ہی نہیں ہوئی تھیں کبھی کوئی شناسائی ہی نہ تھی ایک مرتبہ منظور نے اتفاقیہ موقع پا کر کچھ کہنا چاہا تو سلیمہ نے نہایت بے رُخی سے کہا کہ "دیکھئے ہمیں اپنی عزتوں کا خیال رکھنا چاہئے کوٹھی بھر میں ہماری محبت کا چرچا عام ہو گیا ہے بہتر ہے کہ ہم غیر ہو جائیں قطعی قطع تعلق کر لیں تاکہ لوگوں کو ہماری طرف سے جو شبہ ہو گیا ہے رفع ہو جائے" اس سے منظور کے دُکھے ہوئے دل پر زخمی دل پر ایک اور ضرب کاری لگی لیکن کیا کر سکتا تھا دل مسوس کر رہ گیا۔ ماما سے التجا کی کہ تمہیں میری حالت زار پر کچھ رحم کرو میری پریشانیوں سے اس کو آگاہ کرو اور آمادہ کرو کہ وہ میری سچی محبت کی قدر کرے مگر ماما؟ گرگ باراں دیدہ ماما! ایک ہی علامہ تھی وہ چھوٹے سرکار کی نظروں کو محبت بھری نظروں کو دیکھ رہی تھی اس لئے اس نے بھی پہلو تہی کی اور سمجھایا "بہتر یہی ہے کہ اب آپ اس کا خیال ہمیشہ کے لئے اپنے دل سے دور کر دیں اب تو معاملہ ہی دگرگوں ہو گیا ہے تیر کمان سے اور موقع ہاتھ سے نکل گیا ہے میری مانو تو اب وہ آپ ایسے بھلے مانس کے قابل

ہی نہیں رہی" اس تقریر سے بجائے اس کے کہ وہ سلیمہ! بے وفا سلیمہ کے عشق سے باز آجاتا دست بردار ہوجاتا اور آتشِ رشک میں جلنے لگا مگر اشکوں نے اشکوں کی جھڑیوں نے اس آگ کو قدرے سرد کر دیا بعد ازیں وہ مایوس اپنے کلبۂ احزان میں آکر پڑ رہا۔

یہاں تو یہ حالت ہے اور وہاں میاں رحیم بخش سلیمہ پر محبت کے ڈورے ڈال رہے ہیں تحفہ تحائف سے نواز رہے ہیں خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں اور سلیمہ ہے کہ منظور کے عشق صادق پر رحیم بخش کے تو اور نوخیز حسن کو ترجیح دے رہی ہے اور ان کی محبت بھری نظروں کو اپنی برق پاش مسکراہٹ سے پذیرا کر رہی ہے بلکہ ان کی عریاں آرزوؤں کو دعوت دے رہی ہے۔

یہ تو نہیں ہو سکتا کہ منظور کے دل میں جذبہ انتقام پیدا ہی نہ ہوا ہو! ہوا ضرور تھا مگر اس کی رگوں شرافت کا خون تھا اس لئے وہ اس کے قسم قسم کے بُرے منصوبے اور طرح طرح کے بد ارادے پورے ہونے دیتا تھا یا پھر یہ وجہ ہو کہ اس کا کوئی رازدار نہ تھا اور نہ کوئی ایسا یار غار جو اس کو ایسے کاموں م دیتا بہر حال وہ رحیم بخش کا بال بھی بیکا نہ کر سکتا تھا ہاں اس کو حقارت کی نظر سے ضرور دیکھتا تھا اد سے اس کے دل میں نفرت کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی اگرچہ رحیم بخش بھی اس بات کو محسو کرتا تھا کہ مجھ سے منظور کی طبیعت میل نہیں کھاتی مگر وہ اس کی وجہ صرف یہی سمجھتا رہا کہ شاید منظور کو دفتر کی آمد و رفت ناگوار گذر رہی ہے یا وہ اپنے اس اقتدار و برتری کو جو برسوں سے اسے دفتر اسٹاف پر حاصل تھی اب میری آمد سے جاتی ہوئی دیکھ کر مجھ سے حسد کر رہا ہے اگر منظور پر آنجہ کی اسقدر مہربانی نہ ہوتی تو وہ بے تأمل منظور کے اس سلوک پر اس کو فرم سے علیحدہ کر دیتا مگر بحا موجودہ ایسا کرنا اس کے اختیار سے باہر تھا غرضیکہ دو حریف مقابل تھے۔ مگر ایک دوسرے نہ کر سکتے تھے۔

غزلیات

افتخار الشعرا برق دہلوی۔ بی۔ اے

فسانہ بن کے زمانہ میں جسکا نام رہا — خدا کی شان کہ وہ جم رہا نہ جام رہا
عجیب گوشۂ جنت نشاں سی منزلِ گور — کہ رہروانِ عدم کا یہیں مقام رہا
مٹی نہ بعدِ فنا بھی فسردگی میری — بجھا بجھا سا چراغِ لحد مدام رہا
سخی نہیں ہی وہ شہرت پرست بندہ ہی — کہ جس کو وقت سخاوت خیالِ نام رہا
فروغ شمع ہوا وجہ گرمیٔ محفل — تمام رات پتنگوں کا اژدحام رہا
ہلال عید ہی تصویر بے ثباتیٔ حسن — کہ ایک رات فروغِ مہِ تمام رہا
دیا پیام سفر نور صبح پیری نے — مسافرانہ یہاں رات بھر قیام رہا

ادھر بھی دیکھ لو جلوہ ثواب مفت ہی برق
حرم کدہ سے یہ بت خانہ چار گام رہا

(جناب مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی)

دُنیا کے انقلاب نے رسوا کیا مجھے ‏ — یا دل کے اضطراب نے رسوا کیا مجھے

گاہ اُن کے التفات نے مغرور کر دیا ‏ — گہ شوخیٔ جواب نے رسوا کیا مجھے

آنے سے اسکے ہوگئیں وہ چند خواہشیں ‏ — برسات کے سحاب نے رسوا کیا مجھے

داغِ جگر چمک کے مقابل میں آگیا ‏ — محشر کے آفتاب نے رسوا کیا مجھے

سنجیدگی کو زعم نے تضحیک مرض کی ‏ — اُنکے متیں خطاب نے رسوا کیا مجھے

وہموں نے گھیر گھیر کے دیوانہ کر دیا ‏ — یوں چہرہ کے نقاب نے رسوا کیا مجھے

وہ بدگمانیاں ہوئیں پیدا کہ الاماں ‏ — بے وجہ کے عتاب نے رسوا کیا مجھے

میں کہہ رہا ہوں حسن پہ کچھ قیدِ عمر کیا ‏ — غصہ میں وہ شباب نے رسوا کیا مجھے

دل سیرگاہ عام نہیں کیوں کھلے مگر ‏ — داغوں کے التہاب نے رسوا کیا مجھے

عمّانِ حسن میں نہیں دخلِ ہوائے شوق ‏ — کہدو کہ وہ حباب نے رسوا کیا مجھے

خالد حجاب ناز کی ہر کوئی انتہا

کہتے ہیں تیرے خواب نے رسوا کیا مجھے

(جناب سید عابد علی صاحب عابد بی۔ اے ال ال بی)

یہاں میں مضطرب ہوں کاہشِ اندوہ فرقت سے
وہاں نغمے نکلتے ہیں کسی کی بزم عشرت سے

یہاں سوزِ دروں سے میرے دل کا خون ہوتا ہے
وہاں دستِ نگاریں سُرخ ہیں مہندی کی رنگت سے

یہاں سینے میں میرے سانس بھی رک رک کے آتا ہے
وہاں آنا اُنھیں مشکل ہوا فرطِ نزاکت سے

یہاں پھولوں کو میں اپنے کلیجے سے لگاتا ہوں
وہاں رنگیں ہے محفل گیسوئے مشکیں کی نکہت سے

یہاں مجھ کو خمارِ عشق نے برباد کر ڈالا
وہاں ظاہر ہے مستی نرگسِ میگوں کی حالت سے

یہاں اک شمع کو میرا سیہ خانہ ترستا ہے
وہاں مہتاب بھی اک داغ ہے جوشِ لطافت سے

جناب محمد عبد الباسط صاحب باسط (بھوپالی)

شروعِ قصۂ غم ہو تجلیات جاناں سے،
فسانہ چھیڑیے دل کا اسی دلچسپ عنواں سے

تخیل کا مقدر لڑ گیا خوابِ پریشاں سے
مرے افسانہ کو زینت ہے اک شوریدہ عنواں سے

ہوئی تکمیلِ وحشت سبزۂ صحنِ گلستاں سے
جنوں انگڑائیاں لیتا اٹھا خوابِ پریشاں سے

شرابِ دید کے شایق خمار آلودہ رہتے ہیں
ذرا کچھ کام لو اپنی نگاہِ کیف ساماں سے

نہ وہ بلبل کے نغمے ہیں نہ وہ پھولوں میں نکہت ہے
مری بربادیاں پوچھے کوئی اہلِ گلستاں سے

ٹھہرائے آفتاب داغ روک اپنی تجلی کو
ابھی کچھ کام لینا ہے مجھے چاکِ گریباں سے

شہیدانِ محبت پر خدارا فاتحہ پڑھ لو
یوں ہی ہو کر چلے جاؤ گے کیا گورِ غریباں سے

کسی کی ظاہری اقرار سے دلبستگی کیوں ہو
میں کوسوں دور ہوں باسط فریبانِ مکاں سے

فطرت نگار محمد عباس اقدس حیدرآبادی

ٹپکتی جا رہی ہیں خون کی بوندیں جو مژگاں سے
گلستاں بن گیا دامن بہارِ زخمِ پنہاں سے

نکلنے کو بہت بیتاب نکلی قلبِ سوزاں سے
مری فریاد بھی ہمدوش تھی دودِ گریزاں سے

زباں خاموش، دل حیراں، غبارِ بیکسی رخ پر
تماشا بن کے میں اٹھا جو اٹھا بزمِ جاناں سے

تم اٹھے، شمع اٹھی اور گردِ بے کسی اٹھی
مگر عبرت لگی بیٹھی رہی گورِ غریباں سے

مرے اشکِ تمنا، آسمانِ غم کے تارے ہیں
بکھرتے ہیں جو دامن پر اٹھا لیتا ہوں مژگاں سے

یہ کیا تھا عشق کی بیتابیوں کا اک کرشمہ تھا
دلوں میں پڑ گئی ہلچل مذاقِ دردِ پنہاں سے

کسی کے حسنِ رنگیں کے تصور میں مری نظریں
لگیں سرگوشیاں کرنے سحر کے حسنِ عریاں سے

یہ کیا ہے قیدِ ہستی میں بھی میرا جی دھڑکتا ہے
مصیبت ہائے پیدا ہے مصیبت ہائے پنہاں سے

وہ رہ رہ کر بھڑک جانا کسی کی شمعِ تربت کا
وہ آنسو پونچھتے اٹھنا ترا گورِ غریباں سے

خدا جانے یہ کس شوریدہ سر کی یادگاریں ہیں
بہارِ گل نمایاں ہے در و دیوارِ زنداں سے

چلے گم کردہ منزل جس جگہ سے پھر وہیں آئے
ہمیں اے گردشِ قسمت نکلنے دے بیاباں سے

کہیں بیمارِ غم نے آخری کروٹ نہ بدلی ہو
دھواں اٹھ اٹھ کے رہ جاتا ہے کیوں شمعِ شبستاں سے

خدا جانے جبینِ شوق کو کیا ہو گیا اقدس
مچلتی ہے نہیں اٹھتی زمینِ کوئے جاناں سے

اطلاع :- چونکہ صفحہ ۱۵ پر غلطی سے محوی صاحب کا نام درج ہوگیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کی کوئی نظم اب تک مطبع میں موصول نہیں ہوئی۔

کاٹھیاواڑ کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ



مرتبہ

خوشتر (منگرولی)

ماہی

مطبوعہ مطبع آگرہ اخبار آگرہ

زبان

جلد ۳ || فہرست مضامین رسالہ زبان بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۸ سنہ عیسوی || نمبر ۳

جناب والا۔ تسلیم۔ میں اردو کی ایک کتاب فارسی جدید کے طریقہ پر مرتب کر رہا ہوں جس کا منشا صحیح اردو کو ملک میں پیش اور رائج کرنا ہے۔ چونکہ قدیم اردو جدید اردو سے ملکر ایک نئی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے اسلئے ضرورت ہے کہ صحیح اردو سے ملک کو باخبر کیا جائے۔ اس کے لئے آپ جیسے ماہرین فن کی مدد کی ضرورت ہے۔

چونکہ یہ ایک ملکی اور قومی خدمت ہے اسلئے حسب ذیل امور کی طرف متوجہ کرکے جلد سے جلد (فرصت کے وقت) جواب کا منتظر ہوں اور آپکی امکانی مدد چاہتا ہوں۔

(۱) کم سے کم دو بہترین نظم جو جناب نے کسی موضوع پر کہی ہوں اگر غیر مطبوعہ ہوں تو سبحان اللہ (۲) کم سے کم دو بہترین نثر جو جناب نے مفید مباحث پر تحریر فرمائی ہوں (۳) اپنے مختصر مگر تفصیلی حالات جو جناب دے سکیں مع تاریخ ولادت وغیرہ (۴) اپنا فوٹو (جو بلاک لینے کے بعد واپس کر دیا جائیگا) (۵) اُن بہترین حضرات کے اسماء جن سے آپ واقف ہوں اور مجھے اُن سے مدد مل سکے مرحمت فرما کر شکر گزار کریں۔

اگر آپ کوئی مفید مشورہ دے سکتے ہوں تو اسکے لئے مزید شکریہ قبول ہو۔

{ سڑک کلاں
ایٹہ۔ یو۔ پی }

احقر العباد
{ سید مقبول حسین بہزاد }

زبانِ خلق

علی گڑھ میگزین (جلد ۵ نمبر ۵)

"زبان" کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی رسالہ جناب خوشتر صاحب کی زیر ادارت منگرول سے نکلتا ہے جہاں اُردو ت کم پرچا ہے اور اس لحاظ سے خوشتر صاحب نے اُردو کی ایک بڑی خدمت اپنے ذمہ لی ہے۔ خدا کرے وہ اپنے ن میں کامیاب ہوں۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے مضامین مفید اور بلند ہوتے ہیں۔ ترتیب بھی خوب ہے۔ غرضکہ ہر لحاظ رسالہ دیکھنے کے قابل ہے۔ جو لوگ اُردو زبان کی توسیع و ترقی چاہتے ہیں وہ اس رسالہ کی طرف بھی خاص توجہ فرمائیں۔

ظل السلطان (بھوپال جلد ۱۱ نمبر ٦)

"زبان" یہ کس کو خیال تھا کہ ایک دن کاٹھیاواڑ کی خشک اور بنجر زمین سے علم و ادب کا ایک تر و تازہ پودا اُگا یا اِن یَدہ کی نظر نوازی کرے گا مگر خوشتر صاحب نے اردو زبان کے ساتھ اپنی حقیقی شیفتگی کو ثابت کر دکھایا۔ یہ رسالہ جناب شتر صاحب منگرولی کی ادارت میں منگرول (کاٹھیاواڑ) سے شائع ہو رہا ہے اور باوجودیکہ کتابت و طباعت کی مشکلات علمی مضامین کی فراہمی کی دشواریوں کے پہاڑ حائل ہیں مگر خوشتر صاحب کی کوہکنی اور تیشہ زنی نے ان موانعات پر کسی قدر ابو پالیا ہے۔ رسالہ زبان علمی اور ادبی مضامین اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے بہت اچھا رسالہ ہے اور اگر جناب دیر محترم کی یہی فرمادمشی رہی تو ہم ایک دن اس رسالہ کو اردو زبان کے بہترین اور ممتاز رسالوں کی صف میں دیکھنے کی مسرت حاصل کریں گے۔

کیف (اجمیر شریف)

"زبان" مانگرول جس کے ایڈیٹر خوشتر صاحب ہیں اپنے مارچ و اپریل نمبر میں بعض ایسے علمی مضامین کا حامل ہے جنھیں صرف "معارف" "اردو" یا "نگار" میں ہونا چاہئے تھا، علامہ عبدالعزیز صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی کا مضمون "اسلام کی بدنصیبی" جوان ترکی حکومت پر جس خوبصورتی سے روشنی ڈالتا ہے اس کا اندازہ صرف وہی دل کر سکتا ہے جسے سیاست اسلام سے نصیب دافر ملا ہو۔

"شعر جاہلیت کا انکار" "شہزادہ مراد بخش کی نظر بندی" "رسم الخط" "کاشتکاروں کی حکومت" یہ ایسے گرانقدر مضامین ہیں جنہیں پڑھ کر ہر ذی علم ناظر اپنے خزینہ دماغ میں محفوظ کرے گا۔

سید مطلب حسین صاحب بی۔ اے عالیؔ لکھنوی کا مضمون "منازل حیات" سہل صاف بیحد مفید اور بیحد بلند ہے ایسے قیمتی مضمون کا اضافہ اردو لٹریچر میں صرف زبان ہی کا کام تھا۔ سید عابد علی صاحب عابدؔ کا مضمون "انداز" (اسٹائل) اردو میں بالکل جدید نوعیت کا مضمون ہے ایسے مضامین لکھنا عابدؔ صاحب کا مخصوص حصہ ہے اور اس مضمون کو پیش کرنا "زبان" کا "خاص حصہ"

"علمی حیثیت" سے رسالہ زبان ہر طرح مفید اور قابل مطالعہ ہے لیکن ہنوز خوشتر صاحب کو "عشاق"[۵۱] نہیں ملے ہیں جو اپنے نفسیاتی فسانوں سے زبان میں جان ڈال سکیں۔ قوی امید ہے کہ آیندہ حصہ ادب نثر اور نظم میں جو کمی ہے پوری ہو جائیگی ادبی حصہ جسقدر اب ہے بجائے خود خوب ہے ہمارا مقصد یہ ہے کہ رسالہ کا علمی پایہ بلند ہے اسی جوڑ توڑ سے ادبی حصہ کو ترتیب دیا جائے۔ اور خصوصاً نظمیات[۵۲] میں جو کمی ہے اس کو پورا کر دیا جائے تو رسالہ کہیں سے کہیں پہنچ جائیگا۔ دبیز کاغذ۔ دیدہ زیب لکھائی چھپائی قیمت صرف چار روپیہ (للعہ) سالانہ۔ ہم اہل ذوق سے پُر زور سفارش کرتے ہیں کہ زبان کا مطالعہ کریں اور اس لئے بھی کہ "زبان" منگرول سے نکلتا ہے جہاں اردو غیر مانوس ہے اس کی ہمت افزائی کی ضرورت

---

۵۱ "زبان" یہ ایک بدیہی امر ہے کہ زبان کو ایک نفسیاتی فسانے لکھنے والے میسر نہیں آسکے بلکہ آج تک ایک فسانہ بھی ایسا شائع نہیں ہوا جس میں نفسیاتی آمیزش ہو البتہ "فلسفی دل" اس صنف میں داخل ہو سکتا ہے مگر وہ انگریزی سے اس بُری طرح ترجمہ کیا گیا ہے کہ اگر ہم نے خود دیکھا ہوتا تو ہرگز ہرگز درج زبان نہ کرتے مگر افسوس کہ ہم نے اپنی کم توجہی کے باعث اس فسانہ کو جس میں جا بجا زبان کی غلطیاں مترجم سے رہگئی ہیں درج کر کے ناظرین کے ذوق ادب کا خون کیا ہے جس کے لئے ہم خواستگار عفو ہیں۔

۵۲ نظموں میں بھی چند ایسی ہی نظمیں جو زبان کے معیار سے گری ہوئی ہیں درج زبان کر کے ہم نے اپنی "سخن فہمی" کا ثبوت دیا جس کے لئے اب عذر کرنا بدترین معصیت ہے اور بعید از وقت ہے۔

نکات

(از مُلّا رموزی)

"زبان" کا خاص نمبر شائع ہوگیا۔ ناظرین کا حوصلہ آزما انتظار ختم ہوگیا، عملۂ ادارت نے اس کی اشاعت سے فراغت پاکر فرصت کا سانس لے لیا، مضمون نگاروں کو "صفحۂ ادارت" کے عنوان سے اس طرح داد مل گئی کہ کسی کے مضمون کے لئے لکھدیا گیا، "انوکھا ہے"، کسی کے لئے "فلسفیانہ نظر سے"، کسی کے لئے شکریہ لکھا گیا، کسی سے کہا گیا "یہ آپ کی زبان نوازی ہے"، اور شعرا تو سب سے زیادہ نفع میں رہے جن کے لئے یوں کہا گیا کہ "سب کے اشعار اچھے ہیں کس کس کو داد دی جائے" صرف قبلہ استاذی علامہ محوی لکھنوی کو اپنی داد واپس نہ ملنے کا افسوس ہوا ہوگا، جو ایڈیٹر صاحب کے محض حُسن ظن کی بنا پر بغیر غزل ملے دیدی گئی تھی۔

غرض خاص نمبر ہر اعتبار سے "خاص" رہا جس کے لئے عملۂ ادارت خصوصاً مولانا خوشتر مستحق داد و ثنا ہیں، لیکن وہ جو کہا ہے کہ ع

ایک مجھی سے ہیں خفا سب کی خطا معاف ہے

سو اس خاص نمبر میں ہماری "دماغ سوزی" کی داد ایڈیٹر صاحب نے یوں دی کہ سب سے آخر میں لکھدیا کہ "اس مرتبہ نکات میں ہمارے دوست مُلّا رموزی صاحب نے بہت "پھیکا پکوان" پیش کیا ہے اور انکا سبب (خود ہی) تبلادیا کہ شاید اونچی دکان ہوجانا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اس حساب سے ہم مضمون نگار کاہے کو رہے قوم کے "خاصے پنساری"[۱] ہوگئے، اب اگر پنساری ہی ٹھیرے تو یہ تلاش کرنا باقی رہجاتا ہے کہ ہماری یہ "اونچی دکان" آخر کس "چاندنی چوک" میں واقع ہوئی ہے؟ یقیناً ہمارے پنساری ہونے کا علم تو ہر اُس خوش ذوق و خوش فہم انسان کو ہے جس نے ہمارے "بارہ مسالے کے چٹخارے دار نکات" کا ایک دفعہ بھی مزا چکھا ہے، البتہ "اونچی دکان" کا محلِ وقوع ایسی جگہ ہے جسے سنہ ۱۹۲۶ء

---

[۱] زبان۔ یہ کیوں اطلاع کر لئے نہیں؟

یں خود ایڈیٹر صاحب ۔زبان ۔ ملاحظہ فرماگئے ہیں اور یہاں کے خریداروں کی "چاٹ" کا بھی انہیں اندازہ ہوگیا ہے، اور اسی لئے خود ایڈیٹر صاحب ۔زبان بتائیں کہ ہماری اس دکان میں ۔اونچا پن ۔کس رُخ سے پیدا ہوسکتا ہے ؟ آہ ہماری دکان کی جن "بے رونقی" کو دیکھ کر ۱۹۲۶ء میں خود ایڈیٹر ۔زبان ۔ الامان ۔پکار اُٹھے ہوں وہی آج اسے اونچا ۔کہیں تو پھر شکایت کے لئے کسے تلاش کریں؟

عزیز از جان خوشتر!

اگر تمہیں خیال ہے کہ تمہارے دوست مُلّا رموزی کیلئے بمبئی کے آسودہ حال تاجروں نے کوئی ۔نوبل پرائز ۔ بخش دیا ہے تو تمہیں پہلے غور کرلینا چاہئے تھا کہ ہندوستان خصوصاً زبان اُردو کے سربلند ادیبوں کے لئے کوئی نوبل پرائز نہیں بن سکتا بلکہ یہ تو ملتا ہوگا کسی تھیٹر کے خوبرو اور خوش گلو ایکٹر کو یقین نہ ہو تو جا دیکھو بمبئی کے دولتمند مسلمانوں کی ایکٹر نوازی ۔اور ۔گھوڑا پروری، آپ کے اہل قلم تو اس روایتی طویلے میں رکھے جاتے ہیں جہاں ۔فکر معاش، حوصلہ شکنی، اور بے قدری، کی تمام بلائیں اُن کے سر پر ڈال دی جاتی ہیں، اور دور کیوں جاتے ہو خود اپنی ۔قدر افزائیوں کو دیکھ لو۔

اور جو تمہارا یہ خیال ہو کہ یہ جو دسمبر ۲۷ء میں افغانستان کے بادشاہ سلامت بمبئی سے گزرے تھے تو وائسرائے ہند نے بطریق ۔تحفہ ۔انہیں ضرور دو چار اچھے فلسفی ۔عمدہ ۔مورخ، اعلیٰ ایڈیٹر ۔اور اول درجہ کے مضمون نگار بھی پیش کئے تھے اور انہیں میں مُلّا رموزی صاف بھی شاہ افغانستان کے اسٹاف میں مقرر ہو کر چلے گئے ہوں گے اور اسی لئے اب وہ ۔پھیکے نکات لکھنے لگے تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ ایسا بھی نہ ہوا ۔اس کے مقابل اگر یہ خیال کرتے کہ ہو نہو مُلّا رموزی اپنی گل بار وگل ریز مضمون نگاری کے صلہ میں شہر لاہور کے ۔کوتوال صاحب ۔بنا دیئے گئے ہوں گے تو یہ کسی قدر قرین قیاس بھی ہوسکتا تھا کیونکہ آجکل کے ارباب کمال کچھ ایسی ہی بے جوڑ اور بے تُک صورت سے بسر کر رہے ہیں اور قدر و منزلت اور اقتدار و عزت کی کرسیوں پر وہ مراد آبادی اُگالدان رکھے نظر آتے ہیں جن کے اندر سوائے بلغم کے کچھ بھی نہیں۔

اب رہ گیا کوئی اس سے بھی اونچا خیال و مرتبہ جہاں آپ بفیض خواجہ حسن نظامی مدظلہ ہمیں پہونچا ہوا پا رہے ہیں تو اس کے سمجھنے کے لئے ہم بھی اپنے قادیانی بھائیوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ازراہ القا والہام ہمیں بتا دیں کہ ہم وہاں ہو نکر ۔بھیکا بکوان ۔کیوں فروخت کر رہے ہیں ؟ ہم تو ننھے میاں کی والدہ کے فیض سے جو کچھ سمجھے ہیں وہ لسانِ فطرت

عرفی شیرازی کے الفاظ میں یوں ہے کہ

"از پریشانیٔ دل سوختم و بے علاج"
"ہم بدریوزۂ دل ہائے پریشاں، رفتم"
"منم آں میوۂ ارزندہ و بستانِ کمال"
"کہ بدست و دہنِ ذائقہ ارزاں رفتم"

ان حالات کے بعد بالکل ہی صاف سُن لیجئے کہ سب کچھ ہیں گر دفتر کے منشی جی۔ جیسے پہلے تھے آج اور اب بھی ہیں، اور د خاص نمبر میں "ننھے میاں کی والدہ" اور "کلہاڑی" والا قصہ لکھا تھا وہ ہمارے اُن عقل سوز حالات کا سچا خاکہ تھا جن سے آپ اور ہمارے دوست یکساں واقف ہیں مگر ہماری امداد سے۔ بیچارے سب کے سب مجبور ہیں'

اب رہ گیا مضامین کا "پھیکا پن" سو اس کے لئے ہم نے۔زبان۔ کی ابتدائی اشاعتوں میں صاف لکھدیا تھا کہ۔نکات' عنوان صرف ہنسی مذاق ہی کے لئے خاص نہیں بلکہ اسمیں کام کی باتیں بھی ہوں گی اور اسی لئے اُن کا انداز بیان کبھی کبھی "م خشکی کا رنگ" بھی اختیار کر لیگا، مگر اس کو کیا کہیۓ کہ بعض لوگوں کا "معیار ظرافت" یہ ہے کہ اگر وہ خود ہنس پڑیں تو ظرافت حماقت، اگر آپ بتلائیے کہ ایک ظریف مضمون نگار مضمون شائع ہونے سے پہلے تمام ناظرین سے یہ کس طرح معلوم کرلے کہ یہ ظریف بھی ہے یا نہیں؟ آپ تو مضمون اپنے ناظرین کے لئے شائع کرتے ہیں لہٰذا اُس کی پسندیدگی کا معاملہ بھی اونہیں ذوق پر چھوڑ دیجئے اگر اُن میں لطافت ہے تو وہ کہیں ہنس پڑیں گے ورنہ از لی تام لوٹ بن کر آپ کا کر ہی کیا لیں گے'؟

یہ تو تھی ہماری اور حضرت خوشتر کی۔باہمی۔یا۔خانگی۔جس کے جواب[له] میں ممدوح بھی کچھ۔تنک۔یا۔بے تکُ۔فر اُن سے چُپ رہنے کی امید ہم تو ہم، ہماری آیندہ نسلوں کو بھی نہیں، البتہ اب ایک عام بات کہتے ہیں اور وعدہ یہ کر وہ جو ہم کسی پہلی اشاعت کے نکات میں لکھا تھا کہ حضرت خوشتر۔نپولین کا ٹھیاواڑ۔ہیں، سو آپ کے عزم و ثبات، حوصلے اور ہمہ انداز و اسی ایک امر سے کر لیجئے کہ۔زبان۔کی اشاعت میں، مالی مشکلات، نے آپ کو جس درجہ پریشان کیا، اور۔رجسٹرڈ نمبر پر ڈاک خانے کو جو سو دیا ادبی لگان ادا کرنا پڑا۔ اُن پر یہ مضمونی مشکلات کہ ہر مضمون نگار سے مضمون کی وصولیابی

له "زبان" آپ کی خفگی کا خیال ہے اگرچہ گنجائش بہت ہے۔

سلسلۂ دوستی قائم رکھنا خوشتر اور صرف خوشتر کا کام نہیں۔ تو کیا یہ خاص نمبر پولس کے اہتمام سے شائع ہو گیا؟ مگر آہ کہ صوبۂ کاٹھیاواڑ کے لوگوں میں خدا جانے کس۔ گھوڑ دوڑ، کا ذوق موجود ہے جواب تک اپنے صوبے کے اس جلیل القدر ادبی علمی، تاریخی، اور، غزلی۔ رسالہ کی امداد پر متوجہ نہیں ہوتے پر نہیں ہوتے، یہ غزل سے غزلی رسالہ۔ بنایا ہے غلط ہو تو دہی کاتب کی غلطی سمجھ لو،

وہ جو دسمبر ۲۷ء میں۔ جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور میں شرکت کے لئے جاتے جاتے دہلی کے اسٹیشن پر صندوق چوری چلے جانے کی وجہ سے ہم نے اپنی رفتار یا سفر کا رخ علی گڑھ کی طرف پھیر دیا تھا سو یہاں اخباری رشتہ کے دو بھائی ملے تھے جن کے نام ابو الاثر حفیظ جالندھری ایڈیٹر۔ مخزن لاہور۔ اور بدر الحسن جلالی، بی۔ اے چیف ایڈیٹر اخبار۔ مدینہ بجنور۔ ہیں، ان سے مل کر اخبار اور رسالے کی اشاعت کا اضافہ یا خریداروں کی کثرت کا ایک تجربہ حاصل ہوا ہے جو ایڈیٹر صاحب رسالہ۔ زبان کے فائدے کے لئے درج کرتے ہیں۔

کچھ نوٹ۔ کہیں سے۔ اور کسی طرح لیکر کاٹھیاواڑ کا سفر کر ڈالئے اور رسالہ زبان کے کوئی پانچ اوپر سو پرچے اپنے ہمراہ رکاب رکھئے اور کسی بڑے آدمی کے گھر پر ٹھہر جائیے اگر اس کے ہاں موٹر ہو تو زیادہ بہتر ہے ورنہ سائیکل ہی سہی، صبح جو کچھ مل جائے ناشتہ میں کھا۔ پی لیجئے۔ اما بعد رسالہ کے خریداروں کی فکر میں چل قدمی فرمائیے اور اگر مقامی پولیس یا کم از کم کچھ تھانیدار دوست ہو جائیں تو سمجھ لیجئے کہ مقصد حاصل ہے، صرف تحصیلداروں سے احتیاط رکھئے کیونکہ یہ ہوتے ہیں پانیر پسند، اور۔ ٹائمس خواں۔ اور جو پیسہ منظور نہ ہو تو سفر خرچ دے کر کسی سمت ہیں۔ جنرل مرچنٹ و کمیشن ایجنٹ بنا کر ارسال کر دیجئے، دیکھنا یہاں۔ جنرل مرچنٹ۔ کا لفظ صحیح ہے یا نہیں؟

صحافت اردو میں ابھی تک تو رسالوں کے خاص نمبروں کی گھوڑ دوڑ ہو رہی تھی اب پنجاب کے اخبارات اردو نے سنڈے ایڈیشن کا مرض پھیلایا ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ۔ اتوار کے دن جو عیسائی بھائیوں کا مقدس دن ہے یہ تمام اسلامی اخبارات اپنے اخباروں کو دونی ضخامت اور رنگین صفحات کے ساتھ شائع کرتے ہیں اور اسی کو سنڈے ایڈیشن کہتے ہیں اور یہ سنڈے ایڈیشن والے وہی پرجوش مسلمان ایڈیٹر ہیں جو آئے دن علی گڑھ والوں کو اسلئے برا کہتے ہیں کہ وہ "مسلم یونیورسٹی" میں بجائے جمعہ کے اسلامی تعطیل کے اتوار کی عیسوی تعطیل مناتے ہیں، کیوں صاحب یہ بجائے اتوار کے اگر تمام اسلامی اخبارات۔ فرائیڈے ایڈیشن۔ شائع کریں تو کیا

صفحۂ ادارت

گذشتہ دو نمبروں میں ہمنے معزز خریداران زبان سے استدعا کی تھی کہ اگر ہر خریدار دو دو تین تین خریدار بہم پہونچائے گا تو ہم زبان کو جاری رکھ سکیں گے ورنہ بند کردیا جائیگا۔ لیکن افسوس بجائے اس کے کہ ہماری درخواست پر توجہ کیجاتی، ہماری صحیح حالت پر اندازہ کرکے زبان کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا نہ تو کسی صاحب نے کوئی خریداری عنایت کیا اور نہ ہمارے ساتھ ہمدردی فرمائی بلکہ برعکس اس کے خود اپنی خریداری کے بار گراں سے سبکدوش ہو گئے۔ لہذا آج ہم بھی اپنی سعی ناشکور سے دل برداشتہ ہو کر بہ مجبوری اپنے فرائض سے دست بردار ہوتے ہیں ؎ تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی ؛

آہ! اس وقت کاش کوئی اتنا ہی کہدیتا ؎

جسکی کوشش کا کچھ نہوا انجام رحم اس بے ہنر پہ آتا ہے

غالباً صحافتی دنیا میں "زبان" پہلا رسالہ جو ایک سال کی لگاتار کوشش کے بعد بھی صرف ۳۴ خریدار پیدا کرسکا شاید یہ مثال دنیا کی کسی زبان کی صحافت میں ڈھونڈھے سے نہ ملے گی تاہم ہمنے اس محدود اشاعت (بعض نادہند مقامی خریداروں کا چندہ تو ابتک وصول بھی نہیں ہوا) پر رسالہ کو جاری رکھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ سال دوم کے آغاز پر بامید توسیع اشاعت ایک شاندار "خاص نمبر" بھی نکالا لیکن ہماری خدمات قابل پذیرائی نہ ہوئیں اور ملک نے زبان کا وجود غیر ضروری سمجھا کیونکہ جس وقت خاص نمبر کے وی۔ پی خریداران سابق پر گئے گئے صرف ۱/۴ خریداروں نے وصول کئے باقی سب نے شکریہ کے ساتھ واپس کردئیے، نیز مقامی خریداران کی تعداد بھی نصف سے زائد کم ہو گئی ان حالات میں مزید نقصانات کے برداشت کی تاب نہ لاکر ہم "زبان" کو بند کردینے پر مجبور ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا حالات سے ملک و ابنائے ملک کی بےحسی و بدذوقی کو الزام دینا ہمارے نزدیک کفر ہے ہم ان تمام نامساعد واقعات کی جو ابداری جو آئے دن پیش آتے رہے ہیں اپنے سر لیتے ہیں، ملک و ابنائے ملک کے احساس و ذوق کو ٹھیس لگانا ہمارا مقصد نہیں کہ زبان میں جو لٹریچر پیش کیا جاتا تھا وہ کچھ عوام اور اہل کاٹھیاواڑ کے ہی ذوق کو مد نظر رکھکر پیش نہیں کیا جاتا تھا لہذا ہم اپنی نااہلیت کا اعتراف کرتے ہوئے ضرور کہیں گے کہ ہمنے یا زبان نے ملک کی صحیح معنوں میں کوئی خدمت انجام نہیں دی اور یہی سبب ہماری ناکامی کا ہے۔ البتہ عامیانہ زبان میں مبتذل خیالات کی نشر و اشاعت کی ہوتی تو غالباً زبان کے مقبول ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ تھا لیکن اسکو کیا کیجے کہ ایسا کرنا نہ صرف ہمارے ذوق صحیح کے منافی بلکہ ملک کی بہبودی کے بھی سراسر خلاف تھا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ عوام ابھی اس کے لئے تیار نہیں (اہل کاٹھیاواڑ تو ابتک اردو ہی سے بیگانہ محض ہیں) لیکن ہم سے بھی تو یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم محسوسات عوام کے تابع ہو کر زبان

خیالات کی جولان گاہ بنا دیتے لہذا ؎

میری بربادیوں کا سب الزام
میری ذوقِ نظر پہ آتا ہے

سالِ رواں میں جن حضرات نے وی۔ پی وصول فرمائے ہیں اُن کی تعداد اس قدر کم ہے کہ ہمیں بتلاتے ہوئے بھی شرم معلوم ہوتی ہے بس یہ سمجھ لیجئے کہ یہ وہی حضرات ہیں جو خالص علمی ذوق رکھنے والے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو باتقضائے تعلقات دوستانہ "مروت" کا شکار رہا ہو۔ پھر کس طرح ہم زبان کو گویا کر سکتے تھے؟ کم ازکم ہماری طاقت سے تو باہر تھا اس لئے ع

بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا

اس مریض کی طرح جو بستر مرگ پر پڑا ہوا ہو حالت نزع ہو ساری امیدیں منقطع ہو گئی ہوں تمام دلولے سرد ہو گئے ہوں، تمام بلائیں نازل ہو چکی ہوں مرگ ناگہانی کا منتظر ہو ایک آخری سنبھالا لیتا ہے بعینہٖ زبان کی حالت ہے جو اپنا آخری سانس اپنا ملک کی گودمیں نہایت کرب وبےچینی سے توڑ رہا ہے ؎

دیتی ہے شکستگی دل کی، کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے (میرا)

چمنستان زبان کی آبیاری کرنے والے غالب مرحوم زبان کو صفحۂ ہستی سے یوں مٹتے ہوئے دیکھ کر اور ہمارے ساتھ اظہار ہمدردی فرماتے ہوئے بے مہریِ زمانہ کی یوں شکایت کرتے ہیں ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

تو خدائے سخن میر علیہ الرحمۃ ہمارے صفحۂ ہستی سے اُٹھ جانے پر اس طرح نوحہ گسار ہیں ؎

مانند حرف صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا
دل بھی میرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

لیکن زبان اردو کے محسن مومن مرحوم زبان کی جوانامرگی کا ماتم کرتے ہوئے یوں ہماری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرف غلط
لیک اُٹھے بھی تو ایک نقش بٹھا کے اُٹھے

موجودہ نمبر میں "عربوں کے علوم" والا سلسلہ مکمل اور دو فسانے "شہید تغافل" اور "پہاڑی لڑکی" زبان کے ساتھ ساتھ ختم ہوتے ہیں مگر افسوس کہ "علم اور اسلام" والے مضمون کے جواب (علامہ سید جمال الدین افغانی مرحوم) کے اصل مضمون کا ترجمہ کے لئے محبیّ قاضی احمد میاں صاحب اخترِ جونا گڑھی کو "سیاست" کے دست اس

نے "زبان" کے لئے قلم اٹھانے نہ دیا ورنہ یہ کمی بھی اس کے ساتھ پوری ہو جاتی۔

زبان کو کامیاب بنانے کے لئے ہم نے جو شاندار منصوبے باندھے وہ تمام خاک میں مل گئے اب اس جگہ اس کا ذکر بالکل فضول ہے۔ آہ

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

جن حضرات نے وی۔پی وصول فرما کر ہمیں مشکور فرمایا ہے اُن کی خدمت میں خاص نمبر اور موجودہ نمبر کی قیمت معہ منی آرڈر فیس وضع کر کے بقیہ نہایت شکریہ کے ساتھ واپس کرتے ہیں اور جدید خریداران کرام کی خدمت میں گذشتہ نو نمبر روانہ کر کے حساب بیباق کرتے ہیں امید کہ ہماری جسارت بہ نظر عفو دیکھی جائے گی۔

جن معاصرین نے زبان کا تبادلہ منظور فرما کر اپنے موقر رسائل و اخبارات سے ہمیں بہرہ یاب فرمایا ہے ان کے تہ دل سے شکر گزار ہیں۔ آئندہ تبادلہ کی غرض سے کوئی رسالہ یا اخبار نہ بھیجا جاوے۔

آجکل جہاں نئی نئی ملکی تحریکیں عمل میں لائی جا رہی ہیں وہاں چند نہایت کار آمد اور اہم علمی تحریکیں بھی عملی جامہ اختیار کر رہی ہیں کہ جسکو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ مستقبل قریب میں اردو زبان بھی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش نظر آئے گی۔ سب سے اہم تحریک "ہندوستانی اکاڈمی" کا وجود میں آنا اور لاہور میں شخص واحد کی کاوشوں سے اردو انسائیکلو پیڈیا کے تصور کا خاکہ تیار کرنا ہے۔ اسی طرح ہمارے لائق دوست جناب سید مقبول حسین صاحب بہزاد (ایٹہ۔یو۔پی) کا اردو کے مشہور انشا پرداز اور شعرائے نامور کا طرز جدید پر بالتصویر تذکرہ کی تدوین کا عزم نیز موقر معصر "سیاست" دہلی کے قابل ایڈیٹر جناب دیوان سنگھ صاحب مفتون جنہوں نے اردو صحافت کو فروغ دیکر مغربی صحافت کی سی آب و تاب بخشی ہے اپنے زیر اہتمام ہندوستان کی اردو اخباری برادری کے اراکین کی زندگی کے حالات کتابی صورت میں بالتصویر شائع کرنیکا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان ہر دو صاحبوں کی تجاویز یقیناً اردو ادبیات میں ایک بیش بہا خزانہ فراہم کر دیں گی ہم ان کی ہمت آفریں پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ان تجاویز کے متعلق جو مطبوعہ گشتی رقعہ ہمارے پاس آئے ہیں ہم انکو ذیل میں بجنسہٖ نقل کرتے ہوئے مستند اہل قلم و اہل اخبار و رسائل سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس پر توجہ فرما کر معزز مؤلفین کی مشکلات میں آسانی فرمائیں۔

خوشتر گرامی

مضمون "ایک قدیم دستاویز اور اہم تاریخی انکشاف" (مندرجہ زبان بابت مئی وجون) کے بعض حصص (خصوصاً فتح سنگروں کی بابت) پر سادات منگرول کو سخت اختلاف ہے جن کا ایک معترضانہ مضمون گذشتہ خاص نمبر کے انہی صفحات پر درج کر چکے ہیں ہمنے اپنے نوٹ میں اس وقت لکھا تھا کہ ان وقیع اعتراضات کا جواب مولینا ابوظفر صاحب ندوی مرحمت فرمائیں کہ معترضین کی تشفی ہوجائے چنانچہ ہماری اس استدعا پر مولینائے موصوف نے جواب عنایت فرمایا ہے جس کو ذیل میں درج کرتے ہیں اگرچہ معترضین کی تسکین خاطر اب بھی نہ ہوگی اور وہ اب بھی اس کا جواب لکھنے پر آمادہ ہوں گے لیکن اب ہم اس معاملہ کو طول دینا نہیں چاہتے لہٰذا آئندہ اس کے متعلق کوئی تحریر درج رسالہ نہ کریں گے۔

"ایڈیٹر"

کرمی! جناب ایڈیٹر صاحب سلام مسنون میں اپنے والد ماجد کے انتقال کے باعث وطن گیا ہوا تھا۔ واپسی پر "مدزبان" کا خاص نمبر مطالعہ کیا۔ جوابات حسب ذیل ہیں۔

(۱) نگر کوٹ اگر سندھ میں ہے تو برائے مہربانی کسی جغرافیہ کا حوالہ مع صفحہ و مطبع کے تحریر فرمائیں۔ علمی مباحث میں صرف اسقدر کہنا کافی نہیں ہوتا کہ "دیکھو جغرافیہ قدیم"

عفیف سراج نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ نے چھ ماہ تک نگر کوٹ کا محاصرہ کیا۔ اور اس عرصہ میں وہاں ایک دن قدرتی برف لوگ اس کے پاس لائے۔ جو اکثر وہاں گرتی رہتی ہے۔ مگر اس نے محمد تغلق کا ایک واقعہ یاد کرکے استعمال نہ کیا۔ برائے مہربانی مطلع فرمائیے کہ سندھ میں کونسا ایسا مقام ہے جہاں برف باری ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے محترم دوست کو "امرکوٹ" سے تشابہ ہوا ہے۔ امرکوٹ بلاشک سندھ میں ہے۔ لیکن نگر کوٹ ہرگز سندھ میں نہیں ہے۔ بلکہ دامن ہمالیہ میں صوبہ پنجاب کے ضلع کانگڑہ میں ہے۔ نگر کوٹ کا دوسرا نام "کوٹ کانگڑہ" یہی ہے (دیکھو امپیریل گزٹ آف انڈیا جلد ۱۴ ص ۲۹۷)

(ب) فوج اگر کنورپال کی تنبیہہ کے لئے نہیں گئی تھی۔ تو پھر آخر کسی دوسرے ملک پر بلاوجہ حملہ کیوں کیا گیا۔ کیا اشاعت اسلام بذریعہ تلوار کی گئی۔ یعنی جبراً لوگوں کو مار مار کر مسلمان بنانا مقصود تھا۔ یا فقط ملک گیری اور جہاں گیری کا خیال تھا۔

(۲-۳) "سرعسکر سید نارکن الدین رح تھے اور عزیز الدین ماتحت اور دوسرے سپاہی آپ کے کمک کے لئے تھے" یہ واقعہ اگر کسی علمی دلائل یا تاریخی معلومات کا نتیجہ ہے۔ تو برائے مہربانی ان تمام سنگی کتابت، ودیعات، و پروانجات شاہی، وکتب تواریخ وکتب طریقت کا حوالہ بقید صفحہ ومطبع ضرور تحریر فرمائیں۔ میں جناب کا بیحد شکر گذار ہونگا تاکہ میری معلومات میں جدید اضافہ ہو۔ اور اپنے زیر تالیف کتاب "تاریخ گجرات" میں اس سے مستفید ہوں۔

ان جو روایات ان کا ماخذ ہے۔ اور آپ کے معتقدات میں شامل ہے۔ تو اس کے تسلیم کر لینے میں مجھے کیا عذر ہے بغیر کسی
پائے ہوئے۔ آزادی رائے ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔ اور یقیناً دوسروں کی طرح اس سے آنجناب بھی فائدہ اٹھا

-

کرمی! خط کشیدہ الفاظ سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ "سیدنا قطب الاقطاب" کے اشارہ سے سیدنا سکندر رح
للور میں سکونت اختیار کرکے اشاعت اسلام کی۔ کیونکہ اس وقت اسجگہ کفر ہی کفر تھا چنانچہ جیسا حکم ہوا۔ ویسا انجام دیا"
نت اسلام میں مصروف رہے) یہ حکم ٹھیک اسی طرح تھا جس طرح سیدنا معین الدین چشتی رح کو اجمیر جاکر اقامت کا حکم ہوا
ں وقت کفرستان تھا۔ یا سیدنا محمود شاہ منگرولی (عراقی) کو اس سے قبل اسی دیار میں رہنے کا حکم ہوا تھا۔ خط کشیدہ
ے جنگی مناظر تو کہیں نظر نہیں آتے۔
۴-۵) کرمی! مجھے تو خود تسلیم ہے کہ اگرچہ تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ مگر مسجد کا کتبہ اس کا شاہد عادل ہے جیسا کہ
یں موجود ہے۔ پھر۔ مابہ النزاع کیا رہا؟
۶) "منگرول کے عوام" کی تعریف واقعی غیر ضروری ہے۔ مجھے لکھتے وقت یقیناً اس کا احساس نہ تھا کہ اس سے سادات
جذبات میں تموج پیدا ہوگا۔ میں اس غیر محتاط روش کے لئے متاسف ہوں۔ یہ اخلاقی بات تھی۔ باقی رہا نفس مسئلہ تو وہ
ہ سے کچھ متاثر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ نمبر ۳ میں تحریر کرچکا ہوں۔
۷) مجھے ڈولہی کی روائت پہنچی تھی اب میں اس کی تصحیح کرلونگا۔
۸) بحث طلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں نے ایسا کیا یا نہیں۔ اور نہ شریعت کے مسائل جائز اور ناجائز کا فتوی مد نظر ہے
یں ہے کہ ایسے بلند پایہ اکابرین دین کا عام طور پر طرز عمل کیا رہا ہے۔
ارق موسی، ابن قاسم، قتیبہ، محمد فاتح، صلاح الدین، الپ ارسلان، عالمگیر، جیسے سلاطین اور جنرلوں کے لئے اپنے اسلاف
سے مستفید ہونا، یقیناً ان کے لئے باعث فخر ہے۔ لیکن سیدنا بایزید بسطامی، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، ابوالحسن خرقانی، عبدالقادر
یاں جہان گشت، معین الدین سجزی (اجمیری) نظام الدین اولیاء (رحمہم اللہ) کے لئے بھی باعث فخر ہوگا؟ یہ ایک غور طلب
!-
رے نزدیک سیدنا سکندر رح تو خدا کے برگزیدہ لوگوں میں شامل ہیں۔ اگر آنجناب کو میری اس رائے سے اتفاق نہ ہو تو مجھے بھی اصرار
یکہ آزادی رائے میں ہر شخص مختار ہے۔
۹-۱۰) میں نے قاضی مرتضیٰ کی مثنوی دیکھکر یہ رائے قائم کی تھی کہ غالباً یہ سب سے آخری جنگ ہے جس کے بعد رہتے پھر کبھی

نگار پر قابض نہ ہوئے۔ اور واقعہ مندرجہ تاریخ سورٹھ اس سے قبل کا ہے۔ اور "صاحب البیت اَدری" کا خیال کرکے ایک سرسری
رائے قائم کر لی تھی۔ اب جناب کے توجہ دلانے سے میں اسکے متعلق خاص تحقیقات کر رہا ہوں۔

تاریخ سورٹھ کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس سے اتفاق نہیں۔ شاید ہندوؤں کی تاریخ پر آنجناب نے
نگاہ غائر نہیں ڈالی۔ اسی سے راجہ بھان اور چل تن کے قصہ کا تذکرہ فرما کر افسردہ خاطر نظر آتے ہیں۔

ہندوؤں کو تاریخ کا مذاق نہ تھا۔ اور اسی سبب سے تاریخی کتب ان کے یہاں تقریباً معدوم ہیں۔ بھاٹوں کی داستانیں، رشی
اور منی کے تذکرے، اور شعراء کی مثنویاں، تاریخی مواد کا بہترین سرمایہ ہے۔ اسلئے ایک تاریخ سورٹھ پر آپ کیا ماتم کر رہے ہیں۔ این ہمہ
خانہ آفتاب است۔ اس سبب سے مورخین مجبور ہیں۔ کہ اسی "خریطۂ فضولیات" کو پیش نظر رکھیں۔ اور جہاں جہاں سے غلطیاں صریح
اور کسی دلیل علمی یا انکشافی کے ذریعہ معلوم ہوتی جائیں۔ درست کرتے جائیں۔ ورنہ اُسی کو مسلمات سمجھیں۔

سومنات کے متعلق چاند کا ایک باپ کی متعدد لڑکیوں سے شادی کرنا، اور چھوٹی لڑکی سے ازدیاد محبت کے سبب باقی لڑکیوں
سے بے پروائی، باپ کی تنبیہہ پر بھی کان نہ دھرنا، اور آخرکار بد دعا دینے سے چاند کا برص کی بیماری میں مبتلا ہو جانا۔ ایک ایسا واقعہ ہے
کہ کوئی صاحب علم و عقل تمسخر آمیز تبسم کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ابوریحان بیرونی جو ابو علی سینا کا ہم پایہ سمجھا جاتا ہے۔ باوجود
محقق ہونے کے اپنی مشہور کتاب "کتاب الہند" میں اسی مدطومار زٹلیات" کو درج کرنے پر مجبور ہے۔ صاحب مرءہ احمدی اور سکندری
نے متعدد غلطیاں کی ہیں۔ فرشتہ اور بدایونی نے مختلف جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ سیر المتاخرین کے ابتدائی اوراق کو تاریخ کہنا،
بقول آپ کے "تاریخ کا منہ چڑانا ہے۔ مع ہٰذا۔ میری تو یہ جرأت نہیں ہوتی ہے کہ بعض واقعات غلط ہونے سے ان تمام تاریخوں کے
متعلق کہدوں کہ "این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ"

(مولینا) سید ابوظفر ندوی
(پروفیسر مہاودیالے) احمد آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

بابت ماہ مارچ ۱۹۲۸ء

مقالات

وجود باری عز اسمہٗ

(از مولینا محمد افتخار علی صاحب مُلّا عالم و فاضل)

لہٗ کل ذرات الوجود شواھدٌ علی انہ الباری الالٰہ المصوّرُ

آفتاب اور ماہتاب کا وجود اتنا بدیہی نہیں جتنا کہ خلاق عالم کا ثبوت روشن اور جلی ہے اسی وجہ سے انبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اصلی نصب العین صرف توحید کی دعوت رہی اور جن کو سرے سے اپنے خالق ہی میں شک تھا ان سے نہایت تعجب سے یہ خطاب فرمایا۔

قالت رسلھم افی اللہ شک فاطر السموات والارض	رسولوں نے کہا کہ کیا تم کو اللہ کے بارے میں بھی کسی قسم کا شبہ ہے جو کہ آسمان اور زمین کا بنانے والا ہے

غالباً کوئی بے حس اور کور چشم بھی ایسا نہ ملیگا کہ جو یہ جانتا ہو کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پردہ عدم میں مستور تھے اور عنقریب پھر ایسا ہی ایک زمانہ آنے والا ہے کہ ہم اسی پردہ میں مستور ہو جائیں گے۔ ہمارا وجود دو عدموں سے اس طرح گھرا ہوا ہے کہ جس طرح نور زمین شب گزشتہ اور شب آیندہ کی دو ظلمتوں میں محصور ہے، نور کی یہ آمد و رفت بہ آواز بلند کہہ رہی ہے کہ یہ نور، زمین کا خانہ زاد نہیں بلکہ مستعار اور عطاء غیر ہے۔ نور آفتاب اور حرارت آتش کی طرح اصلی نہیں۔ پس جس طرح نور زمین اور گرمی آب آفتاب اور آتش کا فیض ہے اسی طرح ہمارا مستعار وجود بھی ضرور کسی ایسی ذات کا فیض ہوگا کہ جس کا وجود اصلی اور خانہ زاد ہو۔

کیونکہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر فرع کی انتہا کسی اصل پر اور ہر مستعار کا اختتام کسی معطی پر ہونا چاہئے ورنہ اگر وہ اصل ہی معدوم ہو تو فرع کہاں سے وجود میں آئیگی اگر معطی ہی نہیں تو عطا کہاں سے آئی؟

اعداد کے سلسلہ کو دیکھ لیجئے کہ اوّل سے لیکر اسے غیر النہایۃ چلا گیا ہے مگر تمام سلسلہ کا انقطاع واحد پر ہو جاتا ہے کیونکہ اوّل اور ایک اصل ہے اور باقی اعداد اس کی فرع ہیں اعداد کا سلسلہ بدون اول کسی طرح چل ہی نہیں سکتا کیونکہ اعداد کے تمام مراتب اپنے وجود میں اول کے محتاج ہیں اور اول ان سب کے لئے اصل ہے۔

آفتاب کو دیکھئے کہ ہزاروں لاکھوں مکانات کو نور عطا کرتا ہے اس لئے عالم اسباب میں تمام روشنیوں کا سلسلہ آفتاب پر ختم ہے پس اسی طرح ہمارے وجود مستعار کا بھی سلسلہ اسی ذات پر منتہی اور مختتم ہونا چاہئے کہ جس کا وجود، اصلی، ذاتی اور خانہ زاد ہو اور وجود اسکی ذات کے لئے اسی طرح لازم ہو جیسے آفتاب کے لئے نور اور آتش کے لئے حرارت اور چار کے لئے زوجیت اور تین کے لئے فردیت۔ یہ ناممکن ہے کہ آفتاب ہو اور نور نہ ہو آتش ہو اور حرارت نہ ہو، چار ہوں اور زوجیت نہ ہو، تین ہوں اور فردیت نہ ہو اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ ذات خدا وندی ہو اور اس کے لئے وجود نہ ہو۔ اسی موجود اصلی کو اہل اسلام خدا اور واجب الوجود کہتے ہیں اور اس آیت میں اس دلیل کی طرف اشارہ ہے۔

كيف تكفرون بالله وكنتم امواتا فاحياكم ثم يميتكم	تم اللہ کا کیسے انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے موجود نہ تھے، پس خدا نے تمکو حیات عطا کی اور پھر تم کو فنا کر دیا

عربوں کے علوم

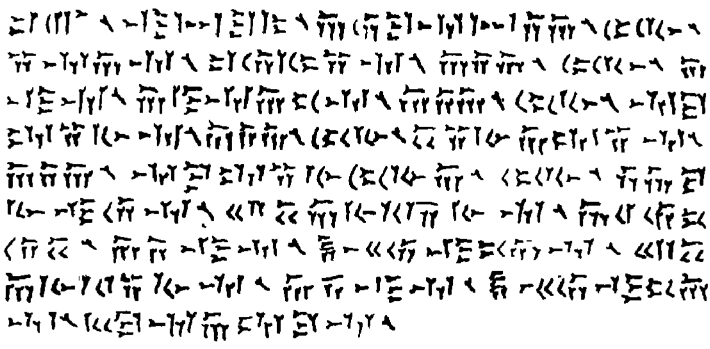
(بسلسلہ ماہ مئی و جون ۱۹۲۷ء)

(از جناب مظہر احمد صاحب ادہمی کلاونشی فاضل)

عربی خط کی تاریخ

حروف کا استعمال جزیرۃ العرب میں اتنے قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے کہ ان کی ابتدائی اور درمیانی تغیرات کا صحیح پتہ لگانا آسان کام نہیں۔ تاہم قدیم کتبوں اور حضرات سے اشیا کی مدد سے یہ عقیدہ بہت کچھ حل ہو جاتا ہے جہاں تک ہم معلوم کر سکے وہ یہ ہے کہ حکومت سومریوں میں کتابت کا اختراع ہوا حمورابیہ کا جو سامی الاصل تھے دور دورہ ہوا تو انھوں نے اسی طرز تحریر اور حروف کو اپنی مکاتبات میں رائج رکھا اور اسی میں اپنی تدوین کی چونکہ زمانہ تو کبھی ایک حالت پر رہا اور نہ رہتا ہے۔ سو یہ کیونکر ممکن تھا کہ یہ حروف ایک ہی انجمادی حالت پر رہتے۔ حمور اپنی ضرورت کے اعتبار سے چند ایسے حروف کا جو سومریوں کی کتابت میں نہ تھے اور اضافہ کیا۔ جس کی وجہ سے مطالب اور عبارا صفائی سے ادا ہونے لگے۔ سومریوں کے حروف تہجی مصر کے خط تمثال (ہیروگلف) سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے۔ چونکہ تحریر مسماری قا سومریوں سے چلی آتی تھی اس سے کتابت اور اظہار خیال میں بیحد طوالت ہوتی تھی اور تھوڑے سے مطلب کی ادائیگی کے لئے بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ اسلئے حمورابیوں نے وقتی ضرورت کے لحاظ سے اس میں نمایاں تبدیلی کی اور نگارسے کے حروف بنا بنا کر تھے تاآنکہ سومریوں کے حروف ابجدیہ نے اپنی شکل و صورت تبدیل کر کے نیا جامہ پہنا جس کا رواج شاہان ہخامنشی کے تھا اور اسی میں کل تحریریں لکھی جاتی تھیں ان کے آثار بے ستون۔ اصطخر۔ دست مرغاب وغیرہ کے کھنڈرات کے کتبوں میں مخ اور رنگوں میں موجود ہیں ان حروف کی تعداد موجودہ عہد میں ۴۳ ثابت ہوئی ہے۔

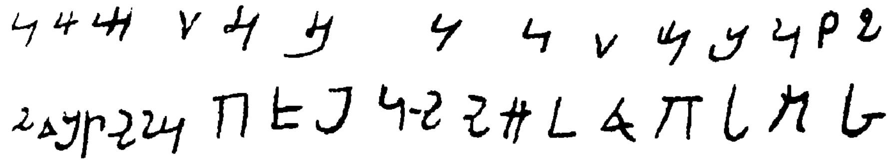
یہ سنت الٰہی ہے کہ انسانی مصنوعات میں ہمیشہ تغیر و تبدل اور اصلاح کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے چنانچہ سامیین پر تسلط ہوا تو ان کی سرکاری اور غیر سرکاری زبان لغتہ بابلیہ تھی۔ مگر کتابت میں حروف مسماری جن کو انہوں نے سومریوں سے سیکھ کرتے۔ یہی وہ حروف تہجی تھے جن کی تمام معلومہ دنیا پر حکومت تھی کیونکہ اہل عراق اور فارس وغیرہ اپنی تمام علوم انہی حروف میں مد تقریباً ایک ہزار برس تک انہی کا دنیا ئے تمدن پر تسلط رہا۔ اس پر عظمت خط کے آثار صفحہ عالم سے بالکل محو نہیں ہوئے ان کے آ پر کندہ میں آج بھی موجود ہیں۔ اگرچہ ان کی صورتیں اور نگارش گوناگوں ہیں مگر ان سب کا طرز تحریر اور شان خط ایک ہی ہے نمونہ چند سطریں کتبہ داریوش واقع اصطخر کتاب "تاریخ مصور خط"، تالیف نادلیس چاپ ٹینے سے پیش کرتے ہیں۔



کتبہ داریوش بخط میخی

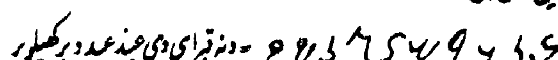
خامیخی کی ان چند سطروں کا ترجمہ ہے "آہورامزدا خدائے بزرگ ہے۔ اس نے اس زمین کو پیدا کیا ہے۔ اس نے آسمان پیدا کیا ہے۔ اس نے انسان اور خوشحالی کو پیدا کیا ہے۔ اس نے داریوش کو بادشاہ۔ اور بہت سے بادشاہوں میں یگانہ اور بہت سے حکمرانوں میں یگانہ حکمران کیا ہے"۔

اگرچہ حروف مسماری نے متمدن دنیا پر ایک ہزار برس تک بلا شرکت غیرے حکومت کی۔ لیکن یہ کیونکر ممکن تھا کہ قانون تغیران پر اثر نہ کرتا۔ لہٰذا جب تک دنیا پر بابلیوں کا اقتدار قائم رہا یہ حروف بھی برابر حکمرانی کرتے رہے۔ لیکن حکومت بابلیہ کے زوال کے ساتھ ہی ساتھ ان پر نظر پڑنے لگی۔ کیونکہ یہ تو بدیہی بات ہے کہ کسی حاکم قوم کی زبان حروف تہجی اور دوسرے اثرات اسی وقت تک قائم و زندہ ہیں جب تک وہ قوم زندہ اور برسر اقتدار ہے۔ جہاں اس قوم کی حکومت اثر اور اقتدار کا خاتمہ ہوا کہ اس کے تمام سیاسی علمی اور ادبی اثرات بھی زائل ہو جاتے ہیں وہی ادبیات جن کو لوگ فخر کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اب وہ تنقیدی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور وہ نقائص و کمزوریاں جنکو حکومت و دولت نے اپنے پردہ میں چھپا رکھا تھا بے نقاب ہو کر صاف نظر آتے ہیں چنانچہ اب خامساری کی جو حکومت کتابت پر تھی وہ کمزور پڑ گئی۔ چونکہ مہذب دنیا کی سیاست و تجارت پورے طور سے آرامیہ قوم کے قبضہ میں منتقل ہو گئی تو یہ حروف تہجی بھی جو فنیقین کی یادگار تھے اب قابل اصلاح و ترمیم نظر آنے لگے۔ اور ایک نئی صورت جو صدیوں کی اصلاح و تبدیل سے پیدا ہوئی تھی اس کے قائم مقام ہو گئی۔ اور چونکہ انسان طبعاً آسانی پسند ہے اسلئے وہ ان باتوں کو جس میں آرام و آسانی ہو زیادہ پسند کرتا ہے۔ کیونکہ جدید طرز تحریر میں نسبتاً سہولت تھی پس بوجہ سہولت تحریر بھی تمام متمدن دنیا کے حروف تہجی بن گئے یہاں تک کہ خود بابلیوں نے بھی اپنے حروف تہجی کو خیرباد کہہ کر اسی کا خیر مقدم کیا اور اپنی زبان کی خدمت انہی سے کرنا شروع کر دی۔



حروف آرامیہ

زمانہ جاہلیت کی کتابت عربوں کا جب متمدن دنیا سے میل جول ہوا اور انھوں نے دور دراز ملکوں میں تجارت کی تو تجارتی اور سیاسی ضروریات کے لحاظ سے اس کی ضرورت پڑی کہ اپنے ہر ایک معاملہ کا حساب و کتاب اور نظم قائم رکھیں اس لئے انھوں نے آرامیہ کو سیکھا اور سہولت کے سبب سے اس طرز تحریر کو اختیار کیا۔ چونکہ طبایع انسانی کو قدرت نے نچلا بیٹھنے والا نہیں پیدا کیا ہے اور قانون تغیر کے ماتحت ہر وقت کام کرتی رہتی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ اہل عرب کی ذہین طبیعتیں بے کار پڑی رہتیں چنانچہ انکی طبائع بھی حروف کی درستگی کی طرف مائل رہیں اس لئے چند صدیاں گزرنے کے بعد آرامیہ خط کی بہت سی شاخیں ہوگئیں اور نام بھی جدا جدا ہو گئے مثلاً تدمیری نبطی وغیرہ وغیرہ لیکن حروف و شان خط ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے عرب سالہا قبل مسیح تک نبطی تحریر آرامیہ ہی کا استعمال کرتے رہے چنانچہ عائذ بن کہیل کی قبر پر جو کتبہ لکھا ہوا ملا اس سے اس امر کی کافی شہادت ملتی ہے اس کتبہ کی پہلی اور دوسری سطر ناظرین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں درج ہیں۔

 = دنہ قبرای دی عید عید د برکھیلو بر

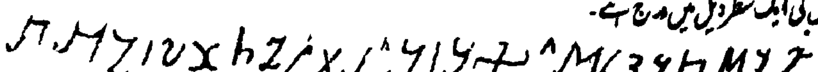
(فصیح عربی میں ترجمہ) = ہذا ہو القبر الذی بناہ عائذ بن کہیل بن

 الکی لنفسہ دیلہ ولود

دلں دی ینطق بیدہ

(فصیح عربی) القسی لنفسہ واولادہ واعقابہ دلمن یکون بیدہ

لیکن اس کے بعد پھر قانون تغیر نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنا اثر کیا جس کا پتہ مختلف کتبوں سے چلتا ہے کہ ان حروف نے پھر روپ بدلا اور ایک نئی صورت اختیار کرلی چنانچہ کھنڈرات رواق اعظم واقع تدمر پر جو نقوش کندہ ہیں انکی شکل بہت کچھ بدلی ہوئی ہے جس کی ایک سطر ذیل میں درج ہے۔



(ترجمہ) اعلمت سلیابت نبای بہرتا ورد قتا = بشال سسیات بنت ربای جلیلہ ونقیہ

یہ امر مسلم ہے کہ ہر جدید حکومت اپنے ساتھ بھلے یا بُرے اثرات ضرور لاتی ہے۔ پس جب سومریوں کی فرماں روائی ختم ہوئی اور زمام حکومت حمورابیہ خاندان کے ہاتھ میں آئی تو وہ اپنے ساتھ نئی باتیں اور اثرات لائے بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ الف یا جس پر تمدن اور زندگی کا مدار تھا اپنے ساتھ نہ لاتی چنانچہ ان حروف کی شکل و طرز تحریر میں تدریجی تغیر ہوتا رہا۔ اب لطف یہ ہوا کہ فنیقیہ ابجد سہل تھی اور مطالب کو بڑی سہولت کے ساتھ جمع کرلیتی تھی اس لئے عام رجحان اس کی طرف رہا۔ دریا کا بہاؤ اور عامہ مخلوق کے جذبات کسی کے اختیار میں نہیں یہی وجہ تھی کہ سب نے اسی کو اختیار کرلیا۔

جب عربوں نے بادیہ پیمائی سے نجات پائی اور یمن میں مقیم ہوکر متمدن زندگی بسر کرنا شروع کی تو انہوں نے بڑی بڑی عمارتوں یادگاروں کے ساتھ ساتھ خط کی عمارت بھی تیار کی مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ حرف جو حکومت بحکومت منتقل ہوتے آئے تھے اس دولت و حکومت کو نہ ملتے۔ چنانچہ یمن کے عربوں کے حصہ میں بھی جو قوم ہود سے تھے یہی ابجد بحیثیت ورثہ سلطنت منتقل ہوکر آئی۔ لیکن اب اسکی وہ حالت نہ تھی جس نے جو شکل چاہی بنالی بلکہ حروف نے معینہ شکل اختیار کرلی تھی اور ہر ایک حرف کا مستقل نام رکھا جا چکا تھا جسمیں ردو بدل کرنے کا حق کسی کو نہ تھا۔ اگرچہ ایک ایک حرف کئی کئی صورت سے لکھا جاتا تھا۔ مگر ان دو چار معینہ شکلوں کے سوا اور کسی طور سے لکھ دیا جاتا تو گویا وہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس حرف تہجی کا نام انہوں نے مسند رکھا اور اپنی زبان حمیری کو اسی میں مدون کیا جو تقریباً ۳۰۰ سنہ قبل مسیح تک اپنا ڈنکا بجاتی رہی۔ ابجد مسند کے حرف الگ الگ لکھے جاتے تھے۔

اہل یمن خط کے معاملہ میں بڑے سخت تھے عام لوگوں کو اپنے حروف تہجی کی تعلیم دینے سے گریز کرتے تھے امراء میں سے بھی خواص کے بچوں کو بہت ہی غور و تامل کے بعد تبلاتے۔ عرب کے دوسرے قبائل کے ساتھ اس معاملہ میں زبردست رازداری سے کام لیتے تھے اور کسی طرح اس کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اہل یمن کے سوا کسی اور کو اس کی ہوا بھی لگ سکے۔ مگر دوسرے قبائل بھی اس کی تاک میں تھے آخر جو ینده یابنده قبیلہ بنی طے کے چند آدمیوں نے کسی طور سے اس کو سیکھ لیا اور اس میں اپنی ضرورت کے مطابق تصرف کرکے اس کا نام خط جزم رکھا۔ پھر کسی ترکیب سے اہل انبار نے سیکھا۔ ان کے شاگرد اہل حیرہ بنے اور اس قبیلہ سے اہل حجاز نے حاصل کیا۔ ان تک جب کتابت پہنچی تو راز داری کا پردہ اٹھ گیا اور تمام عرب میں اس خط کا رواج ہوگیا۔

پھر بھی وقتاً فوقتاً خط میں تغیر و تبدل برابر ہوتا رہا حتیٰ کہ عرب کے مختلف حصص میں حروف کی شکلیں مختلف ہوگئیں۔ چنانچہ امرء القیس بن عمرو متوفی ۳۲۸ء کی قبر پر جو حروف کندہ ہیں وہ مسند نہیں بلکہ نبطی ہیں اور زبان بھی حمیری نہیں بلکہ لغت العربیہ شمالیہ یا لغت عدنان ہے اور ۳۲۸ء تک شمالی عرب میں یہی زبان رائج تھی امرء القیس کی قبر کے کتبہ کی پہلی سطر یوں ہے



تی نفس مرالقیس برعمرو ملک العرب کلہ ذو السر التاج = ہذا قبر مرالقیس بن عمرو ملک العرب کلھم الذی تقلد تاج

کم وبیش یہی حروف کل جزیرۃ العرب میں مستعمل تھے۔ انہی حروف نے بتدریج ترقی کرکے خط کوفی کی شکل اختیار کی جو اسلام سے ایک صدی قبل سے مامون عہد تک رائج رہا۔ اور مصحف پاک کی کتابت بھی خط کوفی میں ہوتی رہی یہاں تک کہ اب پھر حروف اور تحریر بارہ میں اختلاف ہوا۔ کیونکہ اس عرصہ میں اس خط نے بیس سے زائد صورتیں اختیار کر لی تھیں یہاں تک کہ ابن مقلہ نے ۳۲۵ھ میں خط نسخ کو اختراع کیا جو آجتک مستعمل ہے۔

ابتداء اسلام کی نثر

قبل از اسلام چونکہ عربوں میں حضریت اور مدنیت بالکل نہ تھی اس لئے اپنے علوم کو مدون کرنے کی معتاد نہ تھے ان کی نثر کے نمونے ایک دو کتبوں کے سوا اور کوئی ڈھونڈھے نہیں ملتے کہ خیالات کا نظم میں ظاہر کرنا عربوں کی خصوصیات میں سے ہے اور قدرت نے یہ ملکہ ان میں کچھ اس طرح ودیعت کیا تھا کہ بچہ کے منہ سے بھی جو لفظ نکلتے تھے وہ موزوں ہی اٹھتے تھے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ دنیا کی مختلف اقوام کی تواریخ علم ادب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر زبان میں اولیت کا سہرا نظم ہی کے سر رہا ہے۔ اور اس کے کہیں بعد نثر وجود میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ عہد جاہلیت کے قصائد تو بکثرت ملتے ہیں جس سے انکی تمدنی معاشرتی اور اخلاقی حالت پر کافی طور پر روشنی پڑ جاتی ہے۔ لیکن ان کے مقابلہ میں نثر کا کہیں پتہ نہیں لگتا میں بلاخوف تردید کہوں گا عربوں کی اولین نثر قرآن پاک ہے جس کی برکت سے عربوں کی نثر یک بیک بلاغت کے انتہائی معیار پر آگئی۔

(۱) قرآن مجید۔ قانون نشو ونما کا اثر جس طرح جملہ مخلوقات عالم پر پڑتا ہے اسی طرح انسان کی بات بات پر قانون ارتقا کا ہر وقت عمل ہوتا رہتا ہے۔ زبان اظہار خیالات اور زندگی کے جملہ کاروبار کا سب سے زبردست آلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب کا زبان پر سب سے زیادہ اور جلد اثر ہوتا ہے۔ خیالات اور جذبات دلی جس صفائی کے ساتھ نثر میں ادا کئے جا سکتے ہیں وہ بات نظم میں پیدا نہیں ہوتی انہی وجوہ نے ابتداء اسلام ہی میں قرآن مجید کی برکت سے عربوں کی نثر کو کمال کے درجہ پر پہنچا دیا۔ قاعدہ ہے کہ جتنی قومی وملکی ضروریات بڑھتی ہیں اسی قدر زبان میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ عربی نثر کے وجود استعمال کا میدان پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع ہو گیا۔ جب ملک متمدن ہو جاتا ہے تو ضروریات اسی نسبت سے زیادہ ہو جاتی ہیں اور اب ان کے لئے الفاظ اور طرز ادا کی ضرورت پیدا ہوتی ہے اسی احتیاج نے اسالیب زبان میں کیا بلحاظ عبارت اور کیا باعتبار الفاظ رونق وحسن پیدا کر[دیا] جس کا سب سے محرک قرآن ہوا۔ جس کے بیان نے ان کو نئی نئی اسالیب کی تعلیم دی۔

عربوں کے فتوحات کے ساتھ ساتھ ان کی مدنیت بھی ترقی کرتی گئی کیونکہ جب ایک غیر متمدن مگر فاتح قوم کسی دوسری متمدن قوم سے ملتی ہے تو اس کی بدویت زائل ہو کر علو ہمتی اور بلند خیالی پیدا ہو جاتی ہے۔ وسعت خیال کا لازمی طور سے زبان پر اثر پڑتا ہے۔ ان اثرات نے ان کے طبعی رجحان میں رقت طبائع میں نرمی پیدا کر کے انکی بدوی حالت کو تہذیب وشائستگی سے

بدل دیا۔ اور اب وہ الفاظ کے معانی اور ان کی تراکیب پر زیادہ غور و فکر کرنے لگے۔ پس وہ اسالیب جو زمانہ جاہلیت سے چلے آرہے تھے، کلام مجید کی نادر بلاغت کے سامنے نظر سے گر گئے۔ اور وہ اُن کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اس طرح قرآن پاک کے نادر اسالیب نے ان کو تمدن اور شائستگی کے اخلاق کا نمونہ بنا دیا۔

کلام الٰہی کے زبردست حسن بیان نے اہل عرب کو زبان کے اسالیب کے استقرار اور اس کو قواعد عامہ کے تحت میں لانے کی طرف مائل کر دیا۔ حیات عقلیہ کی ابتدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد امون سے ہوئی کیونکہ آپ نے قواعد علم نحو کو خود وضع کر کے اسود کو حکم دیا کہ علم نحو کی تکمیل کریں تاکہ اس علم کی وجہ سے ترکیب اسلوب زبان ایک حالت پر قائم رہے اور زبان میں تغیر نہ آسکے اگر علم نحو نہ ہوتا تو یقیناً جملوں کی ترکیب زمانہ کے ساتھ ساتھ بدل جاتیں۔ اسی بنا پر ابتدار اسلام سے لے کر دولت امویہ کے آخر تک قوم نے اپنی پوری کوشش و سعی سے کام لیا کہ ہر شخص صحیح بولے اور تکلم میں فرق نہ آئے تاکہ کلام اللہ اور حدیث نبوی صلعم کی تفہیم پر کوئی خراب اثر نہ پڑے۔

صرف یہی نہیں بلکہ قرآن مجید کی بدولت بہت سے علوم مدون ہوئے تاکہ کلام الٰہی کو اچھی طرح سمجھا اور اس سے احکام کا استخراج کیا جا سکے۔ قرآن ہی کی برکت ہے کہ عرب سے امیت رخصت ہوئی اور ان کی حیات عقلیہ درست ہوگئی۔ ابتدار اسلام میں قرآن ہی نے عرب کو علوم ادبیہ اور مذہب میں مشغول و مصروف کیا زبان عربی کے جملہ علوم و فنون اسی کی وجہ سے درجہ کمال پر پہنچے۔

(۲) **احادیث** - عربی نثر میں دوسرا درجہ احادیث نبوی کا ہے جو سنت نبویہ اور آیات قرآنیہ کے مجملات کی تفصیل کا مجموعہ ہیں۔ صحابائے کرام ان کو لفظاً بہ لفظاً حفظ کر لیا کرتے تھے اور انہی الفاظ کو جو رسول اکرم صلعم کی زبان معجز بیان سے ادا ہوتے تھے محفوظ رکھتے تھے۔ مگر وہ ان کو اس خوف سے لکھتے نہ تھے کہ کہیں قرآن پاک سے اختلاط نہ ہو جائے۔ لیکن جبکہ عمرو بن عبد العزیز مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے احادیث کو کتابی شکل میں جمع ہونے کی ضرورت کو محسوس کر کے ان کے مدون کرنے کا حکم دیا۔ عربی زبانیں قرآن مجید کے بعد بلاغت و انشار آیات بینات ہیں اور کوئی نثر احادیث کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ چنانچہ خلیفہ ابن عبد العزیز کے حکم سے محمد شہاب الزہری نے سنہ ۱۰۰ھ کی ابتدار میں احادیث کو کتابی صورت میں لانا شروع کیا اور امام مالک نے سب سے اول احادیث کو اپنی کتاب موطا میں جمع کیا۔ موطا امام مالک کے علاوہ احادیث کی چھ کتابیں بہت مشہور ہیں۔

(۱) بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) (۲) مسلم (متوفی ۲۶۱ھ) (۳) ابوداؤد (متوفی ۲۷۵ھ) (۴) ترمذی (متوفی ۲۰۹ھ)
(۵) نسائی (متوفی ۳۰۳ھ) (۶) دارقطنی (۳۸۵ھ)

(۳) **خلفائے کا مواعظ** - نثر میں تیسرا درجہ خلفار راشدین کی تقاریر کا ہے۔ رسول اکرم صلعم کے بعد خلفار راشدین نے دعوتِ حق، فلاح مخلوق اور اصلاح زبان میں سب سے زیادہ حصہ لیا اور مخلوق کو اپنے مواعظ سے راہ راست پر لا کر اُن کو

سے مخسوں میں انسان بنایا۔ ان کے خطب کا نمبر احادیث کے بعد ہے۔ چنانچہ ہم چند چند فقرات میں خلفاء راشدین کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ابابکر صدیقؓ ہجرت نبوی صلعم سے ۵۰ سال قبل پیدا ہوئے۔ یہ قبل اور بعد نبوت آنحضرت صلعم کے ساتھ رہے مردوں میں سب سے پہلے ایمان لائے۔ حطام دنیوی سے سب سے زیادہ پرہیز کرنیوالے اور زاہد تھے یہ ۱۱ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۱۳ھ میں وفات پائی آپ نہایت فصیح اللسان تھے آپ کا قول ہے۔ "صنائع المعروف تقی مصارع السوء"

(ب) حضرت عمرؓ بن الخطاب۔ ہجرت سے ۴۰ سال پہلے پیدا ہوئے حضرت ابابکر صدیقؓ کے بعد زہد اور اتقا میں دنیا بھر میں کوئی شخص آپ کا ہم مقابل نہ تھا۔ اور یہی ان کے بعد خلیفہ ہوئے۔ سب سے پہلے عدالت کی ترتیب کی اور کاغذات میں سنہ ہجری لکھنا شروع کیا آخر ذی الحجہ ۲۳ھ میں ابو لولؤہ نے شہید کیا۔ آپکے مواعظ در فصاحت اور جواہر بلاغت سے مزین ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے (۱) کتم سرہ کان الخیار فی یدہ (۲) ترک الحرکۃ غفلۃ۔

(ج) حضرت عثمانؓ بن عفان۔ آپکی پیدائش ہجرت سے ۵۴ سال پہلے واقع ہوئی اور ۲۳ھ میں مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے یہ آپ کی ذات بابرکت تھی جس نے کلام مجید کو کتابی شکل میں جمع کر دیا۔ آپ نہایت متقی صالح اور خدا ترس تھے آپ کے بلیغ خطبے اور مکاتیبات بکثرت موجود ہیں جو فصاحت میں نہایت بلند پایہ خیال کئے جاتے ہیں بسنہ ۳۵ھ میں مصحف پاک کی تلاوت کرتے ہوئے شہید کئے گئے۔

(د) امام الاولیا حضرت علیؓ ابن ابی طالب ہجرت سے آٹھ سال قبل آپ کی پیدائش ہے۔ نو عمروں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ ہی ہیں ۳۵ھ میں آپ کے دست مبارک پر بیعت لیگئی۔ علم و حکمت میں کامل دستگاہ تھی اور آپ فصیح ترین خطیب اور زبردست شاعر تھے۔ آپ کے کلام و خطب کے مجموعے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو آپکے علو مرتبہ اور فصاحت کی روشن دلائل ہیں۔ آپ کو عبدالرحمٰن بن ملجم نے غدراً شہید کیا آپ کا قول ہے "ادب المرء خیر من ذہبہ" اور "قیمۃ کل امرئ ما یحسنہ الناس اعداء ما جہلوا"

(۴) ابتداء اسلام ہی سے ملک و ملت کے سامنے قرآن و احادیث اور ان کے بعد خلفاء کے بہترین اسالیب موجود تھے اس لئے قوم نے اپنے طرز بیان کو اسی انداز پر وسعت دی اور اپنے خطبوں میں جدت طرازی اور نئی نئی اختراع کئے وہ اپنے خطابت میں کلام پاک اور احادیث کی روش پر چلتے۔ اور عبارتوں کو جواہر آیات سے مرصع کرتے بعض بعض نے اپنے خطبوں کو اس ڈھنگ سے ترتیب کرنے کی کوشش کی کہ ان کے خطبے تمام و کمال آیات قرآنی کا ہی مجموعہ ہوں کیونکہ ارہاب و ترہیب اور وعدہ وعیدین آیات قرآنی ایجاز کے درجہ پر ہیں اور یہ کہ انکا دل پر گہرا اثر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے اسپیکر باعتبار اصول بلاغت اپنی نظیر آپ ہی تھے۔

اس عہد امون میں حسن کلام۔ بندش الفاظ۔ صفائی اور اظہار مطالب کے اعتبار سے خطابت کا مرتبہ زمانہ جاہلیت سے کہیں زیادہ ترقی کر گیا۔ وہ برقی تاثر جو جاہلیت کے اشعار میں تھا وہ اس زمانہ میں تقریروں اور خطبوں کے حصہ میں آگیا کہ بزرگان ملت کو فنو

غزوات - اور دیگر مواقع پر عامہ خلائق کی طبائع گرمانے جوش اور تالیف قلوب کے لئے بروقت تقریر کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اس لئے تقاریر کی اہمیت کو عام لوگ بھی محسوس کرتے تھے قوم کے رہبر اور کمان دان افواج خطبات سے جنگ میں وہ کام لیتے تھے جو تلوار اور زبردست فوجی قوت اور جوش سے نہ نکلتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت اسلام میں خطیب کو وہی مرتبہ حاصل تھا جو زمانہ جاہلیت میں شاعر کا تھا۔

اگرچہ زمانہ کی رفتار اور حالات بالکل بدل چکے تھے اور ملک اور قوم میں حضریت اور مدنیت کے آثار کافی طور سے پیدا ہو گئے تھے مگر اس زمانہ میں بھی مقرروں اور خطیبوں کے عادات و خصائل وہی تھے جو شعراء جاہلیت کے تھے مقرر جب تقریر کرتا تو کھڑا ہو جاتا اور ساری حرکات و انداز وہی اختیار کرتا جو ایام جاہلیت میں ایک شاعر غدوۃ الحی میں اپنا قصیدہ سناتے ہوئے کرتا تھا کہ الفاظ و معانی اور اُن کے مواقع استعمال کا دلوں پر پورا اثر پیدا ہو۔

یہ مسلمہ امر ہے اس عہد کے بہترین اور افضل خطبا خلفاء راشدین ہیں جن کے خطبات کی آب و تاب آج تک وہی ہے اور جب تک عربی زبان موجود ہے باقی رہے گی۔

(۵) رسائل یعنی خطوط۔ رسول اکرم صلعم نے جنگ بدر کے بعد ہی آزاد قومی تعلیم کا سنگ بنیاد نصب فرمایا تھا اس وجہ سے کاتبوں کی بہتات ہو گئی۔ جس نے عرب میں کتابت کا ذوق پیدا کر دیا قوم نے اس انشا کے سے کام لیا کہ اس زمانہ کی تحریریں ایجاز کا درجہ رکھتی ہیں۔ گویا اس مبارک عہد کے انشا رنے آیندہ کے لئے قلم خشک کر دیئے۔ کہ ان کے خطوط مختصر اور سجع و تزئین الفاظ سے پاک تھے چھوٹی چھوٹی عبارتوں اور سادہ سادہ جملوں میں بڑے بڑے معانی و مطالب ادا کرتے تھے یہاں تک کہ بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ معنی لفظ سے مجرد ہیں۔

اس دور میں خط من فلاں الی فلاں سے شروع کرتے اور سب سے پہلے بسم اللہ لکھتے پھر سلام ہوتا تھا باوجود اس اختصار کے خیال، تہدید، وعید، استنہاض اور استعطاف کے مواقع پر عجیب عجیب تفنن سے کام لیتے تھے چنانچہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے مصر کے حاکم عمرو بن عاص کو جس وقت حجاز میں سخت قحط سالی تھی اس طور سے لکھا :-

من عبد اللہ عمر امیر المؤمنین الی عمرو بن العاص اما بعد فلعمری یا عمرو ما تبالی اذا ابت انت و من معک ان اھلک انا و من معی فیا غوثاہ - فیا غوثاہ -	من جانب بندہ خدا عمر امیر المومنین - بخدمت عمرو بن عاص بعد (حمد و صلوٰۃ کے) قسم ہے میری عمر کی اے عمرو جب تو اور تیرے ساتھی سوتے ہیں تو اسکی پرواہ نہیں کرتے کہ میں اور میرے ساتھی ہلاک ہو جائیں وائے برفریاد رس - وائے برفریاد رس۔

نظم

قبل ظہور اسلام شعر اپنے انتہائی کمال پر پہنچ گیا تھا۔ ملک میں چاروں طرف اس کا دور دورہ تھا قبائل کو آپس میں لڑانا، صلح کرانا، جوش دلانا یا نفرت پیدا کرنا یہ سب شعراء کے حصّہ میں تھا۔ شاعر ہونا انعام الٰہی تھا چنانچہ عربوں کو فصاحت اور طلاقت لسانی پر ایسا فخر اور ناز تھا کہ ساری خدائی کو اپنے مقابلہ میں گونگا خیال کرتے اور ایک حد تک وہ اپنے دعوے میں حق بجانب بھی تھے۔ کیونکہ الفاظ کی بہتات نے ادائے مطالب کے زبردست ذرائع پیدا کر دیئے تھے۔ اور وہ اپنے طرز بیان کو لاثانی و بے نظیر مانتے تھے۔ لیکن قرآن شریف کی فصاحت و بلاغت کے سامنے گردنیں خم ہو گئیں اور شعراء اپنی چوکڑی بھول گئے ملک پر ایسا سکوت طاری ہو گیا۔ یہ خاموشی ان کی آئندہ ترقی کے لئے برکت الٰہی ثابت ہوئی جس نے ان کی ترقی میں استحکام کے چار چاند لگا دیئے۔ اسالیب قرآنیہ کی تتبع نے ایسی بلاغت پیدا کر دی جو پہلے سے زیادہ دلوں کو جذب کرنے والی تھی۔

یہ اعتراض کہ قرآن نے دنیا میں آکر شعر و شاعری کا دروازہ مسدود کر دیا بالکل لغو و بے بنیاد ہے۔ اگر اس عہد مبارک کے واقعات کا مطالعہ تعصب اور فرنگی مآبی کی عینک اُتار کر غور سے کیا جائے تو اس قسم کے اعتراض پیدا نہ ہوں۔ مجھ سے میرے ایک تلون پسند دوست نے اسی نوعیت کا اعتراض کیا تھا۔ اس لئے یہ بیجا نہ ہوگا اگر میں نہایت مختصر تاریخی جواب پیش کروں۔

کعب بن زُہیرؓ نے فتح مکہ سے پہلے رسول اکرم صلعم اور مسلمان مرد و عورتوں کی بیحد ہجو کی تھی اور اسلام کے خلاف منافرت و جوش پھیلانے کی غرض سے بہت سے قصائد کہہ ڈالے تھے۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد باغیوں کی فہرست میں انکا نام بھی تھا۔ ان کے بھائی جریر پہلے ہی دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ دونوں بھائیوں میں مراسلت ہوئی آخر کار کعبؓ نے طے کیا کہ میں خود دربار رسالت میں حاضر ہوتا ہوں۔ اگر رسول اکرمؐ کو صحیح معنوں میں حلیم اور صاحب مروت پاؤں گا تو ایمان لاؤنگا ورنہ موت کو ترجیح دونگا۔

حسب قرار داد یہ دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور آنحضرت صلعم کا دست مبارک پکڑ کر کہا کہ اگر کعب اپنی حرکات پر اظہار ندامت کرکے معافی چاہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ رسول اکرمؐ نے فوراً ارشاد فرمایا کہ "سب معاف"، یہ سُنتے ہی کعبؓ نے کہا کہ میں ہی کعب ہوں اور اپنا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" فی البدیہ سُنانا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلعم اس کو نہایت اطمینان اور دلچسپی کے ساتھ سُنتے رہے یہاں تک کہ جب کعبؓ نے یہ شعر

ان الرسول لسیف یستضاء بہ مھند من سیوف اللہ مسلول	بیشک رسوؐل ایک ایسی تلوار ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے ہندی لوہے کی (یعنی مضبوط) اللہ کی ننگی تلوار ہیں۔

پڑھا تو رسوؐل اللہ نے اپنی چادر مبارک انکے کاندھے پر ڈال دی جس کو ان کی وفات کے بعد حضرت معاویہؓ نے بیس ہزار درہم ([illegible] روپیہ) میں خریدا۔ یہ وہی چادر ہے جو مسند نشینی کے وقت ہر خلیفہ کے شانہ کی عزت کو دوبالا کرتی رہی یہ دار نبوی تا تاری

حلے کے وقت ضائع ہوگئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ رسول اکرم صلعم نے اس شعر میں اصلاح بھی فرمائی حضرت کعبؓ نے رسول اللہ کو سیوف ہند سے تشبیہ دی تھی جس پر رسول اکرم نے فرمایا "سیوف کی بجائے نور اور سیوف الہند کے بجائے سیوف اللہ کہو"، چنانچہ شعر میں وہی الفاظ جو آنحضرت نے فرمائے تھے موجود ہیں

اگر اسلام نے عام طور سے شاعری کو حرام تبلایا ہوتا تو رسول اللہ صلعم اوّل تو اتنا طویل قصیدہ سنتے ہی کیوں؟ نہ یہ کہ دادِ مبارک مرحمت فرماتے ہوئے شعر میں ترمیم و اصلاح بھی فرماتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نے اُسی قسم کی شاعری کو جو مخرب اخلاق اور گندی ہو ممنوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ عرب کی یہ حالت تھی کہ نہایت ناپاک اشعار فخریہ پڑھا کرتے تھے اور اپنی بدچلنی کو فخریہ ظاہر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ امرالقیس جو ملک الشعراء ہے اپنی آوارگی کس فخر کے ساتھ تبلاتا ہے۔ [۵]

(۱) کدأبك من ام الحويرث قبلها — وجارتها ام الرباب بماسل

(۲) فمثلك حبلى قد طرقت ومرضع — فالهيتها من ذى تمائم محول

(۳) اذا ما بكى من خلفها انصرفت له — بشق وتحتى شقها لم يحول

قارئین کرام خود فیصلہ کرلیں کہ یہ شعر کس قدر فحش اور ذلیل ہیں۔ کوئی مہذب آدمی ایسی شاعری کو بہ نظر استحسان نہ دیکھے گا اور یہی اعتراض ہے جو ایشیائی شاعری پر آج عام طور سے ہو رہا ہے اسلام نے ایسے ہی شعر و شاعری کو مذموم و ممنوع قرار دیا ہے ورنہ حسانؓ بن ثابت خود دربار رسالت کے شاعر تھے۔

عہد جاہلیت اور اسلام میں چونکہ کچھ فرق نہ تھا اس لئے شاعری اپنے موضوع اور بندش الفاظ کے اعتبار سے ایک ہی حالت پر تھی اور اس کے عام رنگ میں کوئی بین اور صاف فرق پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ ملک و قوم کو شعر و شاعری کی طرف رغبت رہی تھی۔ یہ اصول کی بات ہے جب طبیعت کسی ایک کام میں منہمک ہوتی ہے تو دوسری طرف مائل نہیں ہوتی کیونکہ اس زمانہ میں قوم امور دینیہ وعظ و پند اور دعوت حق اور فتوحات میں مصروف تھی اس لئے شعر گوئی کا کسی کو دماغ اور وقت نہ تھا کہ یہ تو فرصت کے مشاغل ہیں۔ لیکن جب ملک و ملت کو ملک گیری اور دعوت حق سے ایک گونہ فرصت اور اطمینان ہوگیا تو انہوں نے وہی شعر و شاعری شروع کر دی۔ مگر ہمیں یہ ظاہر کئے بغیر نہ رہو نگا کہ اس عصر منیر کی شاعری جاہلیت سے باعتبار معنی، متانت، وسعت خیال اور حسن بیان میں کہیں زیادہ ممتاز درجہ حاصل کر کے اعلیٰ طبقہ میں شمار ہونے لگی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ قوم میں حضارت اور تمدن پیدا ہو جانے کی وجہ

[۵] اپنے ایک ساتھی کی زبان سے کہلواتا ہے تیری تو ہمیشہ یہی گت رہی ہے۔ پہلے ام حویرث اور اس کی پڑوسنوں کے تعلقات پر رویا پیٹا کرتا ہے اور یہ بار اٹھا لایا ہے۔ اپنی معشوقہ کو خطاب کرتا ہے۔ ذرا ناز نہ کرنا میں نے تو بہت حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو جن کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے اپنی طرف بایں طور مائل کر لیا کہ جب بچہ روتا تھا تو اس کو اس طرح تھپکتی تھی کہ اس کا آدھا دھڑ میرے نیچے ہوتا تھا اور آدھے کو پھیر سکتی تھی۔ ۱۲

سے اب شاعر کا وہ مرتبہ نہ رہا جو عہد جاہلیت میں اس کو حاصل تھا۔ اور قوم کی باگ بھی اب شاعر کے ہاتھ میں نہ رہی۔

اس مبارک عصر کے شعرا دو قسم کے ہیں۔ ایک مخضرمین جنہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے دیکھے دوسرے وہ جنہوں نے صرف اسلام ہی کے زمانے میں نشوونما پایا اور جاہلیت کا زمانہ نہیں دیکھا اس عہد کے مشہور شعرا کے نام ذیل میں درج کرکے ایک ایک دو دو شعر نمونتاً پیش کرتے ہیں۔

(۱) حسان بن ثابت جن کا نام ابو الولید الانصاری ہے۔ یہ عہد رسول اکرم صلعم میں دربار رسالت کے شاعر خاص تھے ان کے اشعار باوجود سادگی کے نہایت جامع و مانع ہیں۔ ۱۲۰ سال کی عمر پائی۔

(۱) ابلک لن تلقی من الناس معشراً	لوگوں میں ہرگز کوئی ایسا گروہ نہ ملے گا جو کہ عزت اور
اعز من الانصار عزاً و افضلا	فضل میں انصار سے برتر ہو۔
(ب) واصید نهاض الی السیف صارم	بڑا گردن بلند کن تیز تلوار کی طرف دوڑ کر گھسنے والا
اذاما دع الی الموت ارقلا	جب کوئی موت کیطرف دعوت دے تو دوڑ کر جانے والا

(۲) حطیئہ۔ انکا نام ابو ملیکہ بن اوس ہے۔ ۳۰ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

(۱) من یفعل الخیر لم یعدم جوائزه	جس نے نیکی کی اس کے بدلے معدوم نہیں ہوتے اور
لا یذہب العرف بین اللہ والناس	بھلائی اللہ اور مخلوق کے درمیان سے ضائع نہیں ہوتی
(ب) دع المکارم لا ترحل لبغیتها	مکارم کو ترک کر۔ اس کی خواہش کی طرف نہ چل
واقعد فانک انت الطاعم الکاسی	بلکہ بیٹھ رہ کیونکہ بے شک تو کپڑوں کی خوراک ہے

(۳) کعب بن زہیر۔ انکا پورا نام زہیر سلمی مزنی ہے ۲۲ھ میں دنیا سے کوچ کیا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

(۱) لو کنت اعجب من شئی لا عجبنی	اگر میں کسی بات پر تعجب کرتا ہوں تو وہ یہ ہے
سعی الفتی وهو مخبوء له القدر	جوان ایک کام میں سعی کرتا ہے حالانکہ مقدر ابھی پوشیدہ ہے
(ب) یسعی الفتی لامور لیس یدرکها	جوان ایک کام کے لئے کوشش کرتا ہے اور وہ اسکو نہیں پا سکتا
فالنفس واحدة والهم منتشر	جان ایک ہے اور فکریں کثرت سے ہیں۔

(۴) نابغہ جعدی متوفی ۶۵ھ ان کا نام ابو لیلے ہے زمانہ جاہلیت میں شعر کہا کرتے تھے۔ ۳۰ سال تک کوئی شعر نہیں کہا پھر شعر گوئی شروع کر دی ان کے شعر کا نمونہ یہ ہے۔

(۱) ولاخیر فی حلم اذا لم یکن له بوادر تحمی صفوه ان یکدرا	جبکہ علم کیوجہ سے اپنی صفائی مکدر ہونےسے نہ بچ سکے تو ایسے علم میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔
(ب) ولاخیر فی جهل اذا لم یکن له حلیم اذا ما اورد الامر اصدرا	جبکہ جہل سے ایسی بربادی ہو کہ کسی امر میں مبتلا ہو کر اس سے نہ بچ سکے تو ایسا جہل بڑا ہے۔

(۵) الخنسار۔ ان کا نام تماضر بنت عمرو بن الشرید ہے۔ ماہرین فن کا اتفاق ہے کہ ان سے پہلے اور انکے بعد کوئی ایسی عورت نہیں ہوئی ہے جس نے ان سے بہتر شعر کہے ہوں۔ نابغہ ذبیانی نے جو بازار عکاظ میں سرپنچ ہوتا تھا اعشی کے سوا سب پر فضیلت دی ہے جریر کا مقولہ ہے کہ خنسار نہ ہوتیں تو میں سب سے بہتر شاعر ہوتا۔ ۲۴ھ میں انتقال ہوا۔

(۱) ان الزمان ولیفنی له عجب ابقی لنا ذنبا واستوصل الراس	زمانہ! تعجب ہے کہ زمانہ کو فنا نہیں گناہ تو باقی رہ جاتا ہے۔ سر (ظالم) فنا ہو جاتا ہے۔
(ب) ان الجدید بین طول اختلافهما لا یفسدان ولکن یفسد الناس	دن اور رات اپنے طول اختلاف میں ہیں ان کو تو تغیر نہیں ہوتا۔ لیکن انسان فنا ہو جاتا ہے۔

(۶) عباس بن مرداس۔ نام ابو الهیثم ہے۔ یہ جنگ کے شدائد کا خوب خوب ذکر کرتے ہیں۔ ۱۲ھ میں دینار فانی سے رخصت ہوئے۔

(۱) دع ما تقدم فی عهد الشباب فقد ولی الشباب وشاب الشیب والذمم	زمانہ شباب میں جو کچھ مقدم ہو چکا اوسکو چھوڑ جوانی گئی۔ اور بڑھاپا جوان ہو گیا اور بال بکھر گئے

خیابانِ خلیل

(از لسان الملک صاحبزادہ متین اللہ خاں صاحب واثق ٹونکی)

مشاطہ را بگو کہ براسبابِ حسنِ یار
"چیزے فزوں کند" کہ تماشہ بما رسید

میرے محترم کرم فرما، امیر الانشا، دبیر الملک مصاحب خاص دربار ٹونک مولوی سید علی اصغر صاحب نے "خیابانِ خلیل" (مؤلفہ خود) کی ایک جلد بذریعہ ڈاک ارسال فرمائی جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں،

خیابانِ خلیل میں جو ضرب الامثال مخمس، مربع، مثلث، غزل، اور قطعات کے پیرایہ میں ہمیں نظر آتے ہیں، طرز کلام، اور مضامین کے عیوب سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ اشعار جن کے مضامین نہایت معمولی اور غیر دلچسپ ہیں بندگان عالی سے منسوب کرنا نازیبا ہے۔

بقول کرمی ناظم صاحب "حضور عالی راجپوتانہ کے احاطہ میں "ایک ذوالریاستین" فرمانروا ہیں، یعنی جس طرح محروسہ ریاست ٹونک حضور معلیٰ کے قلمرو میں داخل ہے اسی طرح اقلیم سخن کی حکمرانی بھی حضور پرنور کے زیرنگین ہے، شعر و سخن کے لطیف فن سے اعلیٰحضرت کی طبع نفس کو بالکل فطرتی مناسبت ہے، مذاق سخن نہایت صحیح، متین، سنجیدہ، اور اعلیٰ ہے الخ"

ہمارا بھی ذاتی تجربہ ہے، اور حضور انور کا کلام اکثر نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ کسی طرح باور نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کلام حضور انور دام اقبالہٗ کا ہے، ہم جانتے ہیں کہ کون سا "ملک الشعراء" اس پردہ میں اپنے پوچ اور پھر شاعری کی داد لے رہا ہے، اور انشا دانِ نغز گو ہمرتبہ داغ و حالی خواہ مخواہ ولا محالا "واہ واہ" کہتے ہیں حالانکہ ان کے دل سے کوئی پوچھے تو کہیں گے کہ ہم کلام کی داد نہیں دیتے لیکن جس نسبت عالی سے یہ کلام منسوب ہے اُن کو داد دیتے ہیں، یہاں اک خیال پیدا ہوتا ہے کہ "کیا اعلیٰحضرت خود شعر نہیں کہتے کوئی اور ان کے تخلص سے شعر کہدیتا ہے؟ اسکا جواب دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ایک شاعر جب بسلسلۂ شعر و سخن ملازم رہتا ہے تو اُس کا فرض منصبی یہ ہے کہ دربار کے موقعہ پر قصائد پیش کرتا رہے لیکن اپنا رسوخ بڑھانے کو وہ چند غزلیں بھی سرکاری تخلص سے کہہ کے پیش کر دیتا ہے جو بہ نظر قدر افزائی و مروت شاہانہ مسترد نہیں کیجاتیں،" اسی قسم کے سرکاری اشعار قابل تنقید نظر آتے ہیں اور یونہیں ہمیں تنقید کی ضرورت بھی محسوس ہوئی ہے، ورنہ کلام الملوک ملوک الکلام،

تقریب جو لائق و ادیب مؤلف نے لکھی ہے بالذات ایک قابلانہ مضمون نگاری ہے جس سے خیابان خیال کی مندرجہ ضرب الامثال میں ظاہری روح پیدا ہوگئی ہے اگر اس تقریب اور اُن عنوانات کو جو ہر ضرب المثل کے اوپر قائم کئے گئے ہیں تالیف سے نکال لیا جائے یا وہ

تازہ جو قابل ادیب نے چڑھایا ہے اُتار دیا جائے تو چند بے مغز و بے معنی الفاظ کا ذخیرہ رہ جاتا ہے، جس میں نہ مضمون آفرینی کی کوئی شان ہے نہ ندرت بیان،

امیر الانشاء نے اس میں شک نہیں کامل زور تحریر کھپایا ہے اور چند خرافات تک بندیوں کو اپنے زور قلم سے اُس میعار تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جو فن ادب سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اصل شے کا بدل دینا رنگ ساز کا کام نہیں، تعلی گر تانبے کو چاندی کی صورت میں کر سکتا ہے لیکن ماہیت نہیں بدل سکتا، سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ جب شاعرانہ نقطۂ نظر سے کوئی ضرب المثل پیش کی جائے تو بہترین الفاظ اور نادر الخیالی کے ساتھ کہ سامعین کا دل تڑپ جائے، بے موقعہ یا لچر الفاظ اور لغویت کے ساتھ شعر میں لانا مد خواہ مخواہ رگڑ ڈالنا ہرگز اس نتیجہ تک نہیں پہنچاتا جو دبیر الملک نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ضرب المثل صحیح موضوع پر وہی کہلائی جاسکتی ہے جس میں ضرورت سے ذرہ برابر تغیر نہ واقع ہوا ہو، اگر ضرورت شعری نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تو وہ ضرب المثل کے پایہ سے گر جاتی ہے ایک مصرع ہو جاتا ہے جس سے ضرب المثل کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔

استاد ذوق فرماتے ہیں "ڈالی کمند بام پہ، پہونچا کہاں رقیب "سچ ہے حرام زادہ کی رسّی دراز ہے"

مصرع ثانی مکمل ضرب المثل ہے اور اسقدر مناسب الفاظ اور دلچسپ معنی رکھنے والا دوسرا مصرع بہم پہنچایا ہے کہ خواہ مخواہ دل لطف لیتا ہے اور تڑپ جاتا ہے کمند کا ڈالنا، بام پہ پہونچنا، رسّی دراز پھر حرامزادہ کا لفظ نعمت پہ کہ کمند ڈال کے چڑھا چلا جارہا ہے کیسا پر لطف انداز ہے خصوصاً "کہاں" کے لفظ نے شعر میں جان ڈالدی ہے۔

علاوہ ازیں، بقول مولف، ضرب المثل سے جس نظم کا تعلق ہو، سامعین و ناظرین کو ثابت ہو کہ وہ اسی کے لئے وضع کی گئی تھی،" متذکرہ بالا شعر میں جو ضرب المثل موجود ہے وہ اسی کا مصداق ہے بخلاف اُن ضرب الامثال کے جو خیابان خلیل میں نظر آتی ہیں متعلقہ اشعار سے بالکل مناسبت ہی نہیں رکھتیں،

"صفحہ ۹ - ضرب المثل اول"

"جنگل میں مورناچا کس نے دیکھا"

اصل مروجہ ضرب المثل تو یہ ہے "جنگل میں مورناچا کسنے دیکھا" لیکن ضرورت شعری نے لفظ "بیکار" کا اضافہ کرایا، اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ضرب المثل ہے بلکہ یہ ایک شعر کا موزوں مصرع ہے جس سے ضرب المثل کا مفہوم اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے ؎

لہ مجھ سے کھچے ہوئے تھے، مجھسے تمہارا بیجا — بیٹھے تھے بن سنور کے، آئینہ سامنے تھا،
یوں دیکھتے تھے صورت، جس طرح کوئی شیدا — مجھکو ہوئی خبر جب کہلا کے میں نے بھیجا،
جنگل میں مورناچا "بیکار" کس نے دیکھا

شاعر نے جو الفاظ نظم کیے ہیں، اُن کی شرح کیجائے تو ضرب المثل ایک غیر مناسب اور بے محل طور سے ٹھوسم ٹھانس نظر آتی ہے، شاعر کہتا ہے "مجھ سے اُدھیں بیجا رنج تھا، بناؤ سنگار کئے" "اپنے گھر میں،" آئینہ کے سامنے بیٹھے تھے، اپنی صورت عاشقوں کی طرح پراشتیاق نگاہوں سے دیکھتے تھے، جب مجھے خبر ہوئی تو میں نے کہلا کے بھیجا، جنگل میں مورنا چا کس نے دیکھا،

مناسبت الفاظی جو ضرب المثل کے لئے نہایت ضروری چیز ہے اسمیں کہیں نہیں پائی جاتی، اگر یہ نہ تو محل استعمال ایسا ہونا چاہئے جس سے دل تڑپ جائے وہ بھی نہیں نہایت رکیک مضامین کا مرقع ہے جو نومشق نچے کہا کرتے ہیں،

اگر ہم ذرا نازک خیالی سے کام لیتے ہیں تو نہایت دلچسپ نکتہ چینی کرنیکا موقعہ پیدا ہوتاہے وہ یہ کہ دیکھنے والی ایک علیحدہ ہستی تھی، جو چیز دیکھی گئی یا دیکھنے کے قابل تھی وہ دوسری تھی، یعنی آرایش، اور وہ دونوں شاہد و مشہود موجود تھے خصوصاً جبکہ وہ خود اپنے پراشتیاقیہ نظریں ڈال رہے ہوں، پھر جنگل میں مورنا چا کس نے دیکھا کس طرح کہا جا سکتا ہے، ہاں اگر آئینہ بجائے سامنے کے پشت پر ہوتا یا وہ شاہدانہ شان نہ رکھتے ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ دیکھنے والا کون ہے،؟

یوں تو جن حضرات کے پاس خیابانِ خلیل ہے وہ دیکھ سکتے ہیں غور فرما سکتے ہیں کہ ضرب المثل اس خمسہ میں یا مقطع میں جہاں لائی گئی ہے نہایت پھیکے معمولی اور رذل مضامین کے ساتھ ٹھونسی گئی ہے لیکن اسی خمسہ کا چوتھا بند اور قابل ذکر ہے،

دل میں یہ اُنکے آئی کیا بات بیٹھے بیٹھے　　مجھ سے کہا کہ کل ہم دروازہ بند کرکے
گھر میں چلیں پھریںگے پورا بناؤ کرکے　　میں نے کہا کہ بہتر، لیکن فضول، ٹُلے

جنگل میں مورنا چا بیکار کس نے دیکھا

مجھے نا قدانہ نظر ڈالتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، معلوم ہوتاہے معشوق دیوانہ تھا بیٹھے بیٹھے رگِ وحشت پھڑکی اور وہ ارمان ظاہر کیا جو آجتک کسی عقل انسان نے نہ کیا ہوگا یعنی "کل ہم دروازہ بند کرکے ناچیں گے،" تو بھی جنون اور مخبوط الحواسی پہ یہ ارمان محمول ہوتا، پھر عاشق صاحب نے جواب میں جو چند جملے زبان سے ادا کئے ہیں وہ معشوق کے ارمان سے کسی طرح کم نہیں اُس کے جواب میں عاشق صاحب کہتے ہیں "بہتر لیکن فضول، سننے سے،" غریب دبیر الملک ان مضامین کو تو پٹنے سے رہے، ہاں یہ ممکن تھا کہ جہاں تقریب وغیرہ لکھنے کی تکلیف کی تھی وہاں ان ضرب الامثال کو مخمس مسدس غزل، قطعات وغیرہ کے پیرایہ میں خود ہی بیان بھی کر جاتے،

صفحہ ۱۱، ۲۰

"کیا چیز ہے یہ دنیا، میلا گھڑی پلک کا"

خیابانِ خلیل کے گیارہویں صفحہ پر جب ہماری نظر پڑتی ہے تو لامحالہ کہنا پڑتا ہے کہ متذکرہ بالا ضرب المثل نہیں ہے، تاہم شاہی فقیروں کی صدا ہے، تعجب ہے کہ لائق مؤلف نے بھی یہاں محض غلطی کی ہے، اور اسے ضرب المثل تسلیم کرتے ہوئے اس کے معنی پر تبصرہ

کیا ہے،

ناظرینِ کرام خود سمجھ سکتے ہیں کہ آیا یہ ضرب المثل ہے یا تانک شاہی فقرا کی بھیک مانگنے کی صدا! لہٰذا ہم اُن اشعار کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے جو زیادہ سے زیادہ ادبیاتِ تانک شاہی کے کام آسکتے ہیں، اور جن کا فن ادب صنائع بدائع معنی اور مناسبت وغیرہ کی بے کار قیود میں محدود ہیں، اون کو اس سے بحث نہیں معنی دار ہوں یا بے معنی منہ سے صدائے بالخیر نکلنی چاہئے جس کے اخیر الفاظ یہ ہوں،

"کیا چیز ہے یہ دُنیا میلا گھڑی پلک کا"

صفحہ ۱۳-۳

"بارہ کاٹے تلوار کا نام"

اصل الفاظ کو موزونیت کی ضرورت نے ایک مصرع بنانے پر مجبور کیا "سچ کہا ہے" بارہ کاٹے نام "ہو" تلوار کا، دوسرا مصرع جو شاعر نے چپاں کیا ہے وہ ایسے غیر مناسب الفاظ کا ذخیرہ ہے، جسے دوسرے مصرع سے کچھ بھی مناسبت نہیں، ہر دو مصرعوں کی آپسیں مناسبت تو درکنار خود اسی کی ترکیب میں اسقدر غیر مناسبت ہے کہ جس کا سر ہے نہ پیر ہے

کام سرمہ کا تھا شہرہ ہے ادائے یار کا ۔۔۔ سچ کہا ہے بارہ کاٹے نام ہو تلوار کا،

"سرمہ" سے اور "ادائے یار" سے واسطہ؟ دوسرے "فعل" فی بطنِ شاعر رہ گیا "کام سرمہ کا تھا" معلوم نہیں کیا کام؟ "ادائے یار" سے زیادہ مناسب لفظ "چشم یار" ہو سکتا تھا کہ "سرمہ" کے مناسب لفظ ہے وہ اس طرح "کام سرمہ نے کیا شہرہ ہے چشم یار کا" اب فعل کا اظہار بھی ہو گیا اور ایک مصرع میں مناسب الفاظ کا ذخیرہ بھی ہو گیا اگرچہ بحیثیت تشبیہ و مماثلت اب بھی اعلیٰ پایہ سے گرا ہوا ہے کیونکہ آج تک سرمہ کو بارہ اور چشم کو تلوار سے کسی نے تشبیہ نہیں دی، لہٰذا ضرب المثل نہایت بھدے پن سے استعمال کی گئی ہے،

نمبر ۲ ۔ خطِ ابرو نے لیا دل شہرت ابرو ہوئی ۔۔۔ سچ کہا ہے بارہ کاٹے نام ہو تلوار کا

حیران ہوں کہ یہ جدت طرازی فن سخن کا میدان وسیع کرنے والی ہے، یا اہمال کو بھی فن میں شامل کر کے لیا میٹ کر دینے والی،

"خطِ ابرو" اور "ابرو" دو متضاد و مغائر اشیا شاعر نے تسلیم کی ہیں حالانکہ مجھے ان میں کچھ بھی فرق نہیں معلوم ہوتا جو "خطِ ابرو ہے" وہی "ابرو" ہے جب دونوں ایک ہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے "ابرو نے دل لیا ابرو ہی کا نام" بات کیا ہوئی؟ اس مضمون کو یوں لا سکتے تھے،

عزم ہو خود قتل کا، اور تیغ ابرو کا قصور
سچ کہا ہے بارہ کاٹے نام ہو تلوار کا،

نمبر ۳ ۔ عمر گزرے تھے صبا نے مست گلچیں ہے کیوں؟ ۔۔۔ سچ کہا ہے بارہ کاٹے نام ہو تلوار کا،

لے سبحان اللہ بالکل اس کی مثال یہ ہے "مارون گھٹنہ پھوٹے خیرآباد" "سچ کہا ہے باڑہ کاٹے نام ہو تلوار کا"، معزز ناظرین خود بہ نظر انصاف دیکھیں کہ "صبا کا گل گرانا" اور "منت گلچیں کرنا" پھر استفہام "کیوں؟" ایک پہیلی ہے جس کے بعد کہدیا "سچ کہا ہے باڑہ الخ"

نمبر ۴ ـ ہوگئی حسن ادا سے شہرت تیغ ادا — سچ کہا ہے باڑہ کاٹے نام ہو تلوار کا،

حسن ادا اور تیغ ادا دونوں مترادف الفاظ ہیں حسن ادا ہی تیغ ادا ہے،

نمبر ۵ ـ اصل نوک تیر ہے مشہور ہے تیرا غلیل — سچ کہا ہے باڑ کاٹے نام ہو تلوار کا

مقطع میں بھی صریح غلطی موجود ہے، تیر عبارت ہے ناوک سے سوفار تک نوک سے پر تک، نوک اور تیر دو چیزیں نہیں ہیں، دوسرے یہ کہ تیر کاٹتا نہیں بلکہ گھس جاتا ہے، ضرب المثل اس اعتبار سے بھی موزوں نہیں ہے،

صفحہ ۱۴×۴

"رسی تمام جل گئی پہ بل نہیں گیا"

تنقید کے ابتدائی مضمون میں، میں بیان کر چکا ہوں کہ ضرب المثل میں ضرورت شعری سے ذرا بھی تبدیلی واقع ہو جائے تو وہ ضرب المثل نہیں رہتی بلکہ شاعر کا ایک موزوں مصرع ہو جاتا ہے، مفہوم میں خواہ تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو،

اصل ضرب المثل صرف اتنی ہے "رسی جل گئی بل نہ گیا"، "تمام" "پر" "نہ کے عوض "نہیں" "ضرورت شعر" کے پھندے ہیں، مذکورہ ضرب المثل سے جن اشعار کا تعلق ہے وہ ہدیہ ناظرین کرتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے مضحکہ خیز مضامین کو دبیت پہ محمول کرنا اور یہ کہنا کہ "زبان اردو پہ احسان کیا ہے" فن ادب کی سخت توہین کرنا ہے، اگر قانون اجازت دیتا تو ان الفاظ پر مؤلف پہ جو خاص میرے عنایت فرما ہیں توہین عزت کا مقدمہ چلایا جاتا

مصرع مندرجہ عنوان پہ جو مصرعے لگائے گئے ہیں، اگر "وہ کسی خاص معاملہ کا اظہار کرتے ہیں"، تو "صاحب معاملہ" ہی لطف لے سکتا ہے یا وہ شخص جو رازدار ہو لیکن جب دنیائے ادب کے روبرو انہیں پیش کیا جائے تو بجز اس کے کہ چند فرائشی قہقہہ لگائے جائیں، یا وقعت ثابت نہیں ہو سکتے جن میں یا تو بوڑھے معشوق کی انتہا سے زیادہ تضحیک کی ہے یا مکار دفوہی کہہ کے عامیانہ خیال کے ساتھ معشوق کی تذلیل ہے۔ ملاحظہ ہوں اشعار

زلفوں کا خم، جبیں کا ابھی تک بل نہیں گیا — رسی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا،

"مضحکہ خیز" غرہ شباب کا ہے، نہیں گرچہ اب شباب — "

صورت ہے وہ نہ عمر، مگر اینٹھ ہے وہی — "

گیسو سفید ہو گئے لیکن گیا نہ خم — رسی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا

ناگن کا پیچ و تاب ہے زلفِ سفید میں — ″

پھپھا ز کے نہا کے بھی چھوڑے نہ مکر و چھل — ″ — "تذلیل"

غصہ ہے اب بھی وہی وہی بدمزاجیاں — ″

بل جو سرشت میں ہو کہاں جائیں اے خلیل — ″

اس موزوں ضرب المثل کو یوں لکھ سکتے تھے، ؎

وہ میرے پیچ و تاب کہتے ہیں غیر سے — رسی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا

صفحہ ۱۵×۵

"قہر درویش بجانِ درویش"

یہ مصرعہ اسقدر مقبول عام ہوا ہے کہ اسے بمنزلہ ضرب المثل کے کہا جانے لگا ہے، شاعر نے صرف مصرع ثانی کے الفاظ و معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے بعض مصرعے بہم پہنچائے ہیں، اور بعض بالکل پہیلی ہیں،

۵۱ بے اثر آہ و فغانِ درویش — قہر درویش بجانِ درویش

۵۲ کھائے غم ہے یہی شانِ درویش — ″

۵۳ "ضبطِ غصہ" (ترکیب لی ہے) ہے نشانِ درویش — ″

ان ہر سہ اشعار میں صرف مصرع ثانی کے معنی کا لحاظ ہے، محل استعمال سے غرض نہیں کی گئی۔

۵۴ "گوش درویش فغانِ درویش — قہر درویش بجانِ درویش

محض بے معنی اور ناتمام جملہ ہے جس کی نثر کی جائے تو بجز سامع کے متبسم ہونے کے اور کچھ معنی پیدا نہیں ہوتے نثر یہ ہوگی، "درویش کا کان درویش کا رونا" ان الفاظ کو کہہ کے خموش ہو جائیے تو ہر شخص منتظر رہیگا کہ اعلیٰ حضرت آگے کیا فرماتے ہیں دوسرے مصرع سے چاہو کہ سلسلہ قائم ہو کر ناتمام جملہ کی خبر نکل آئے تو یہ بھی نہیں، "درویشی کا رونا درویش کا کان درویش کا غصہ اُسکی جان پر"

۵۵ دل ہدفِ تیر فغان درویش — قہر الخ

اس کی نثر یہ ہوگی" درویش کی فغاں کے تیر کا دل نشانہ" ربط ہے مصرع ثانی سے نہ بذات خود کچھ معنی،

۵۶ مہرِ درویش تقلبِ عالم — قہر درویش الخ

اسمیں شک نہیں کہ نمبر ۶ شعر میں مصرع اول ہر حیثیت سے اعلیٰ ہے اور محل استعمال کا لحاظ مندرجہ ذیل شعر میں رکھا گیا ہے

ضبط کرنا ہی پڑیگا دلِ زار   قہر درویش الخ

صفحہ ۱۷×۶

"پہلے خویش پیچھے درویش"

شاعر نے اس ضرب المثل میں بھی لفظ "ہے" "اور" "اور" کا اضافہ کرکے موزوں کرلیا ہے، بصورت خمسہ یہ ضرب المثل پیش ہے، دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جگہ مناسب مضمون یا مناسب الفاظ کا استعمال نہیں کیا ہے ایک ایک بند پہ تنقیدی نظر ڈالنا تو ہمارا کام تھا جس کا لب لباب ہم نے لکھدیا لیکن اس تنقید کو ناظرین کے روبرو پیش کرنا محض تضیع اوقات ہے، جن حضرات کے پاس خیابانِ خلیل ہے وہ خود غور فرماسکتے ہیں۔

صفحہ ۱۸×۷

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

یہ مصرع بھی کثرت استعمال سے خواہ مخواہ ضرب المثل تسلیم کرلیا جائے ورنہ دراصل ضرب المثل نہیں ہے، ضرب المثل "وہ الفاظ ہوتے ہیں جو قیود اوزان سے آزاد جو موقعہ او رمحل، وقت، کا لحاظ رکھ کے متکلم کے منہ سے نکلے ہوں اور زبان زد خلائق ہوگئے ہوں" برمحل اگر کسی صورت سے شاعر کے منہ سے چند الفاظ نکلے تو وہ مصرع بن گئے خواہ اسی مصرع کی طرح مقبولیت عامہ کی وجہ سے ضرب المثل کا کام دینے لگا ہو" مثلاً "برات عاشقاں برشاخ آہو"

اب اس مصرع کو جو خیابانِ خلیل میں بصورت خمسہ پیش کیا گیا ہے وہ فن ادب یا زبان اردو پہ احسان نہیں ہے، نوآموز شوقین بچے اکثر ایسے ہی مصرعوں پہ مصرعے بہم پہونچانے کی کوشش کیا کرتے ہیں چنانچہ ایک بچہ نے اسے خمسہ کیا ہے جو استاد مکرم کے عقیدت مندوں سے ہے وہ میرے خیال میں اس کہنہ مشق شاعر سے بہتر صورت میں کامیاب ہے، مقابلتاً ایک بند خیابانِ خلیل کا اور ایک اس کا پیش کرتا ہوں۔

خیابانِ خلیل،
گذشتہ کو کوئی بھی پاتا نہیں   زمانہ سے کچھ رشتہ ناتا نہیں
نہ جائے یہ جبتک تو جاتا نہیں   جو جائے تو صورت دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

ایک بچہ،
معلّم ہیں کچھ سکھاتا نہیں   کبھی وقت پر اپنے آتا نہیں
پڑھاتا نہیں کچھ لکھاتا نہیں   اسے کوئی ہمدم سمجھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

خیابانِ خلیل،
نہ پائی جو وہ صورت دلربا   کہا آئینہ کچھ ہے بگڑا ہوا

خدا جانے پھر کیا خیال آ گیا　　　بغیر اپنی صورت کو دیکھے کہا

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

کیا ناظرین اس مخمس کے معنی سمجھ سکتے ہیں؟ کیا ادب انہیں مضامین کا محتاج ہے،؟ اور کیا اسی کو پیرایہ بیان کی دل آویزی" کہتے ہیں؟ کیا یہی وہ اشعار ہیں جو لطیف جذبات کی دلچسپ کیفیت سے معمور ہیں؟ نثر ہی کر لیجئے،

"جب وہ دلربا صورت نہ پائی (مکروہ شکل نظر آئی) تو کہا آئینہ بگڑا ہوا ہے (آئینہ گویا ایک مشین ہے جس کے کل پرزے بگڑ گئے ہیں) پھر خدا جانے کیا خیال آیا کہ اپنی صورت بغیر دیکھے کہا "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

کوئی ربط ہی نہیں، کچھ خیال ہی نہیں، کچھ دلچسپی ہی نہیں، ....، کچھ معنی اور مطلب ہی نہیں، انہیں اشعار پہ واہ وا کے نعروں سے شہر گونج جاتا ہے اور ملک الشعراء پھول جاتے ہیں،

ایک بحر۔
بہت دن میں موقع تجھے ہے ملا　　　ہے تنہائی بالکل نہیں دوسرا
خبردار اے دل نہ ڈرنا ذرا　　　یہی وقت ہے کر بیاں مدعا

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اس کی بھی نثر ملاحظہ ہو کہتا ہے "بہت روز میں تجھے یہ موقعہ ملا ہے کہ وہ تنہائی میں اکیلے ملے ہیں خبردار اس موقع پہ ڈرنا نہیں یہی وقت ہے عرض مدعا کا گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں چوکا اور چوکا، (فیصلہ کا انحصار ناظرین کرام پہ ہے)"

خیابان خلیل،
جفاؤں سے کرتے نہیں اجتناب　　　نتیجہ ہے اس کا بہت ہی خراب
یہ عمر اور اس میں یہ غفلت کے خواب　　　نہیں ہے تمہیں قدر عہد شباب

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

"جفا سے پرہیز نہیں کرتے نتیجہ خراب ہوگا،" دو اوّل مصرعوں کا یہ منشا ہے، شاعر کا ایک خیال یہیں ختم ہو چکا اگرچہ خرابی نتیجہ بہ لاشئ نہ بہ کی دوسرا خیال شروع ہوا "یہ عمر اور یہ خواب غفلت" ان الفاظ سے تو پتہ چلتا ہے کہ بڑھاپا آ چکا کیونکہ زمانہ غفلت کا تو وہی شباب ہوتا ہے جسے وہ ہوشمندی کا کہہ رہا ہے، دوسرا مصرع نے خیال کو پلٹا معلوم ہوا شباب کا زمانہ ہے بڑھاپا نہیں ہے لیکن قدر شباب نہیں ہے اس کے بعد گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ٹیپ کا بند جڑ دیا،

ایک بحر،
مناسب نہیں غیر سے اجتناب　　　ہے بےفکر و مدہوش جوں محو خواب
یہی وقت بدلہ کا ہے اے شباب　　　نہ ہو جائے ہشیار خانہ خراب

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

ہم چاہتے تو ہمارے عقیدتمند نوعمر دوست کے الفاظ و ترکیب میں تغیر و تبدل کر دیتے لیکن بجنسہ اسی کے الفاظ پیش کرنے منظور ہیں تاکہ اس کے صحیح خیالات کی تصویر ناظرین کرام کے روبرو ہو اور ملک الشعراء سے تقابل میں داد ملے۔

خیابان خلیل، جھک اس کی طرف ہے جو ہشیار تو — بہت حرص میں ہے گرفتار تو
کھڑا ہوگا کل پیش دادار تو — نہ کھو ایک دم اپنا بیکار تو
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

(تعجب ہے کہ شباب کے طویل خمسہ میں ہمیں ہم قافیہ اشعار مل گئے)

ایک بچہ، ہے مانوس صیاد بیکار تو — نہ رہ اب قفس میں گرفتار تو
کھلا رہ گیا در خبردار تو — نہ تاخیر کر آج زنہار تو
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

ناظرین کے روبرو غالب یا حالی یا داغ و ذوق کا کلام پیش نہیں کیا جا رہا ہے جو معترض نگاہی سے دیکھا جا سکے یہ ایک نو آموز کا کلام ہے جسے چند ماہ شعر و سخن کی فکر میں گذرے ہیں،

خیابان خلیل، ہے غفلت کی عادت بری اے خلیل — نہ حد سے بڑھے خود کبھی اے خلیل
کرے قدر وقت آدمی اے خلیل — گذارے تو یوں زندگی اے خلیل
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

شاعر مصرع اول میں اپنا ایک مکمل خیال بیان کر کے سلسلۂ عبارت ختم کر دیتا ہے، ایک اصول بیان کیا گیا ہے کہ "انسان اپنی حیثیت سے نہ بڑھے"، دوسرے مصرع میں دوسرے خیال کی تکمیل کرتا ہے دوسرا اصول بیان کرتا ہے "غفلت کی عادت بری ہے" اس مصرع کا مضمون بھی ختم ہو گیا،

تیسرا اور چوتھا مربوط مصرعے ہیں جن سے مصرع اخیر کو بیشک تعلق ہے، خمسہ قطعہ مسدس وغیرہ میں تمام مصرع مربوط اور سلسلۂ عبارت کو قائم رکھنے والے ہونے چاہئیں اور یہ نہایت سخت عیب ہے اور ناسمجھی پہ دال کہ شاعر جس مصرع پہ مصرع پہونچا رہا ہے وہ غیر مربوط اور غیر مسلسل ہوں۔

ایک بچہ، کہ کیا چیز ہے زندگی اے شباب — ذرا غور کرنا کبھی اے شباب
نہ ضائع کرے آدمی اے شباب — بھلی ہو وہ یا ہو بری اے شباب
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

صفحہ ۹×۲۳

"ہر ہر کئے جا ہر گھڑی ہر کو جپے جو ہر کا ہوئے"

یہ ضرب المثل بقول مؤلف بہ تائید صاحب کلام اگر دُنیا کے روبرو پیش کر کے دریافت کیا جائے کہ یہ کونسی ضرب المثل ہے کس موقع اور محل پر بولی جاتی ہے تو لوگ سائل کو مبتلائے مالیخولیا سمجھیں گے کہ یہ کسی بھجن کا مصرع اور کہتا ہے ضرب المثل، بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا بحیثیت "مصرع بھی" جو مصرع اس پر پہنچائے گئے ہیں وہ اس قابل نہیں کہ ہم تنقید قائم کرنے میں اپنا بیش قیمت وقت ضائع کریں،

صفحہ ۱۱×۲۶

"سو سُنار کی اور ایک لوہار کی"

نمبر ۱

صورت بدلتی جاتی ہے اب خوئے یار کی — کچھ بات بن رہی ہے دلِ بیقرار کی

خفت اب ہو رہی ہے انہیں اپنی ہار کی — شوخی سے ہو برابری کیا اضطرار کی

سچ ہے کہ سو سُنار کی اور اک لوہار کی

سب سے پہلے تو میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ضرب المثل ایسی جگہ بولی جاتی ہے جہاں ایک شخص دوسرے پر متعدد زیادتیاں کر چکا ہو اور اس نے برداشت کرتے ہوئے جواب میں ایک ایسی زیادتی کی ہو جس نے تمام بدسلوکیوں یا زیادتیوں کی خاطر خواہ تلافی کر دی ہو، متذکرہ بالا نظم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اول مصرع میں شاعر نے انقلاب خوئے معشوق پر روشنی ڈالی ہے "دوسرے مصرع میں اظہار کیا ہے کہ "میرے دل کی قدر ہوتی جاتی ہے" تیسرے مصرع میں معشوق کی خفیف سی شرمندگی کا اظہار ہو رہا ہے "ہار" محض قافیہ پیمائی ہے ورنہ "لڑائی" میں کا نتیجہ ہار یا جیت ہو پہلے یا بعد کے مصرعوں سے تشریح نہیں ہوتی اور یا تک نہیں، چوتھے مصرع میں صرف اضطرار اور شوخی کی برابری پر روشنی ڈالی ہے، جس کے بعد ہی ضرب المثل کا پیوند لگا دیا گیا ہے، کہنا پڑتا ہے کہ نہ ہر چہار مصرع غیر مناسب غیر مربوط اور بجائے خود ہیں محل ضرب المثل نہیں بن سکتے۔

"وحشی ترا جو سوئے گلستاں کبھی گیا، اک آہ میں پپیہے کی پی کی گئی صدا فریاد کی تو سکتہ سا قمری کو ہو گیا، اک نالہ نغمہ ہائے عنادل لگے اڑا"

"سچ ہے کہ سو سُنار کی اور اک لوہار کی"

اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے گھر پر تھا، پپیہا، قمری، عنادل گلستاں میں، گلستاں سے شاعر کے گھر تک سلسلۂ ٹیلیفون قائم تھا جس سے وہ پپیہے کی پی کی صدا، اور عنادل کے نغموں کی دلخراش راگنی سن رہا تھا، شاعر کو ان دونوں صداؤں سے سخت اذیت پہنچ رہی تھی لہٰذا وہ بیتاب ہو کے اٹھا "سوئے گلستاں گیا" تاکہ ان اذیت دہ جانوروں سے بدلہ لے،

گلستاں پہونچ کے اک "آہ کی" اس آہ نے معاملہ درہم برہم کر دیا، "پی کی صدا گئی" "قمری غریب بے تقصیر ماری گئی" "سکتہ سا ہو گیا" "نغمہ ہائے عنادل کو بھی لے اڑی" وہی مثل ہوئی سو سُنار کی اور ایک لوہار کی،

معلوم نہیں ہوتا شاعر کو در انحالیکہ بعد عظیم تھا ان کی صداؤں سے کیا تکلیف پہنچ رہی تھی بلکہ ضرب المثل کا محل تو یہ کہتا ہو کہ پرندان خوش آواز جن سے عشاق کو خاص طور سے دلبستگی ہوتی ہو اسی عاشق کو (شاعر کو) قصداً تکلیف دے رہے تھے، حالانکہ پیرایہ کلام سے اس بات کا کوسوں پتہ نہیں چلتا، پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعر نے گھر ہی سے اک آہ کیونکی وہی ٹیلیفون کا رابطہ اس آہ کو ان پرندوں تک پہنچا دیتا، اس ضرب المثل کو اسطرح لکھتے ہیں "مخمس"

دشمن نے کیں ہزاروں ہماری برائیاں، گھر گھر کے دل سے زندہ کر مار ہا بیاں، اک بات اپنی ہاتھ لگی انکی ناگہاں، جڑتے ہی ساری ہو گئیاں ان برائیاں

سچ ہے کہ سو سنار کی اور اک لوہار کی

شاعر کا تخیل بلند پروازی میں محدود نہیں ہے دوسرا بند ملاحظہ ہو، ۵

دل میں تھے میری سیکڑوں ارمان لوٹے، بیچین کر رکھا تھا انہیں تیر شوق نے، مجبور ہو کے دیکھا جب اس نگاہ سے، جس کہ سارے ولولے کمبخت مٹ گئے

سچ ہے کہ سو سنار کی اور اک لوہار کی،

خاطر میں تم وفاؤں کو میری نہ لاتے تھے، ہر روز ایک حیلہ نیا تم اٹھاتے تھے، تم جذب شوق کو میرے جھوٹا بتاتے تھے، یہ آج کیسے آگئے تم تو نہ آتے تھے

سچ ہے کہ سو سنار کی اور ایک لوہار کی،

کرتا تھا روز انکی جفاؤں کا میں گلا، اور آجتک جتایا نہ تھا دل کا مدعا، بدقسمتی کہ آج وہ منہ سے نکل گیا، سنتے ہی مسکرا کے دیا طعنہ وفا

سچ ہے کہ سو سنار کی اور ایک لوہار کی،

اسیطرح متفرق مضامین کے سرسری طور سے صدہا شعر کہے جاسکتے ہیں جنہیں محل و موقعہ کا بہ حسن وجوہ خیال رکھا جاسکتا ہے، اپنی کمزوری البتہ ایسی فحش غلطی کہلا سکتی ہے

کرکے اسیر دام مصیبت میں خوب پھنسا، تیر ایا دل کو اپنے مگر کچھ نہ ہو سکا، آیا جو تیر آہ تو سنبھلا نہ پھر ذرا، صیاد سن کے گر پڑا نخچیر کی صدا،

سچ ہے کہ سو سنار اور اک لوہار کی،

میں نے اوپر کہیں بیان کیا ہو کہ متواتر حملوں یا زیادتیوں کے بعد جو فریق ثانی کیطرف سے جوابی حملہ فیصلہ کن دیا جائے وہ اس ضرب المثل کا موقعہ سمجھا ہوتا ہے، یہاں صرف صیاد کا ایک ہی اذیت دہ برتاؤ ہے "اسیر دام مصیبت کرنا"، جسکا جواب نخچیر کیطرف سے یہ ملا کہ "تیر آہ مار دیا جس سے صیاد گر پڑا" سو سنار کی تو نہ ہوئی اک لوہار کی ضرور ہو گئی،

التماس

ناظرین کرام، یہ وہ ضرب الامثال تھیں جو مولف نے اپنی تقریب میں درج کی ہیں، صفحہ ۲۹ سے اصل میں خیابان خلیل کی ابتدا اگر ہم ہر اک ضرب المثل پہ تفصیلی روشنی ڈالیں تو محض تضیع اوقات ہے تاہم تنقید بھی ضروری ہے اسوجہ سے یہ التزام کیا ہے کہ جو اعلیٰ درجہ کے اشعار یا ہر اک غزل و مخمس وغیرہ میں سے جو بہتر اشعار نظر آئے انہیں تنقید میں لے لیا ورنہ باقی نظر انداز کر دیے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زبان کا دورِ ثانی

"زبان" جس فنِ خیال اور بلندیٔ ارادہ کو لیکر جاری کیا گیا تھا اگر اہلِ ذوق اس سے بیگانہ وار نگاہیں نہ پھیر لیتے تو آج وہ بھی دنیائے ادب کا بہترین خدمت کرنے والا ہوتا،

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ گو "زبان" دیگر موجودہ رسائل کیطرح "رنگینیوں کا گوناگوں مظاہرہ" نہ بن سکا لیکن اس نے اپنے گذشتہ دور میں جو کچھ علمی و ادبی خدمات ملک کے سامنے پیش کیں وہ کسی طرح ملک کے بہترین رسائل کی خدمات سے کم نہ تھیں۔

ملک کی بیدردانہ بے توجہی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اہلِ ذوق اصحاب کے تغافل بیجا کا نوحہ کرتے ہوئے "زبان" کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دُنیائے ادب سے روپوش کردوں۔ جس کا اعلان میں نے گذشتہ اشاعت میں کر دیا تھا۔ جب باوجود میری کوشش اور جدوجہد کا اعتراف کرنے کے علمی و ادبی ذوق رکھنے والے میری مشکلات کیطرف سے اسقدر غفلت کرنے لگے تو میں نے بھی ضرورت نہ سمجھی کہ میں زبردستی ہر مہینہ ان کے سامنے "کاغذی جھولی" پھیلا کر "مالی و ادبی بھیک" مانگتا رہوں چنانچہ میں نے اپنی امیدوں کا خون کر کے "زبان" کے بند ہونے کا مجبوراً اعلان کر دیا۔ گو اس اعلان سے میرے دل کو سخت تکلیف ہوئی لیکن اس سے میرے حوصلوں اور ارادوں میں کوئی پستی نہیں آئی میری امنگیں اور تمنائیں اسی طرح مجھے بلندیوں کیطرف متوجہ کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ "مصائب اور مشکلات سے گھبرا کر اپنے مقاصد سے منہ موڑ لینا بزدلی ہے اور عظمتِ انسانی کی توہین"، چنانچہ میں نے ارادہ کر لیا کہ ایک دفعہ اور میں حتی الامکان کوشش کر دیکھوں اور دُنیائے ادب کو دکھا دوں کہ دوسرے رسائل جہاں بزعم خود کم سے کم قیمت میں بہترین رنگینیوں کو ملک کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، وہاں میں ان مصائب و مشکلات کے باوجود بہترین علمی و ادبی خدمات پیش کر سکتا ہوں ؎

مرے ہاتھوں میں طاقت ہے تو اک دن کھینچ لاؤنگا
مری کشتی کو پھینکے جائیں موجیں در ساحل سے

اہلِ ذوق میری جانب سے نگاہیں پھیرے جا رہیں میں بھی اپنی جدوجہد میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھونگا۔ آخر کب تک

ان کا یہ بیدردانہ طرز عمل قائم رہ سکتا ہے؟ میری یہ سعی بیکار نہیں گئی۔ میرے ارادوں کے استحکام نے اگرچہ تغافل کیشوں کو ہنوز مائل کرم نہیں کیا لیکن میرے مربیوں کو تو متوجہ کر ہی لیا اور مجھے پھر اپنی کامیابی کی تھوڑی سی جھلک نظر آنے لگی حضور **ولیعہد** صاحب بہادر دام اقبالہٗ (منگرول) اور مخدومہ و محترمہ **عالیہ بیگم** صاحبہ دام ظلہا نے میری کوششوں کو دیکھتے ہوئے "زبان" کی سرپرستی منظور فرمائی ہے حضور والا و موصوفہ محترمہ کی یہ نوازش امراء کیلئے بہترین درس اور حضور کی ادب نوازی کا ایک بین ثبوت ہے۔

اسکے علاوہ مکرمی **سید واصل میاں** صاحب اور محبی **محمد خاں** صاحب نے "زبان" کے قیام کیلئے زبردست مالی امداد دینے کا وعدہ فرمالیا ہے "زبان" کی آئندہ بہتی خدمات متذکرہ بالا سرپرستوں اور معاونوں کی کرم گستری کی ممنون احسان رہیگی۔

میں یہ خبر بھی انتہائی مسرت سے ناظرین "زبان" کو سنانا چاہتا ہوں کہ زبان کے اس انقلاب نے عملہ ادارت میں بھی ایک قابل قدر اضافہ کر دیا ہے۔

حضرت کیف مرادآبادی سے دنیائے ادب عرصہ سے متعارف ہے کیف صاحب ادب کی خدمت عرصے کر رہے ہیں اور ملک کے ممتاز رسائل آپکی خدمات کو پسندیدہ نگاہوں سے نوازتے رہتے ہیں۔

کیف صاحب "زبان" کو ہر طریقہ سے کامیاب بنانے کی کوشش کرینگے اور جو امیدیں اُنھوں نے مجھے دلائی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اب زبان کی حالت بہتر سے بہترین اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترین ہو جائیگی۔

میں امید کرتا ہوں کہ زبان کی تبدیلیوں کو دیکھ کر ادب نواز حضرات اس کی مالی اور ادبی امداد فرماتے رہیں گے اور میری مشکلات کو محسوس کرتے ہوئے ان کی کمی کے واسطے کوشاں ہوں گے اور مجھے اپنی کوششوں کیطرف سے مایوس نہ ہونے دیں گے۔

خوشتر (منگرولی)

زبان کے خریداروں کی خدمت میں چھ ماہ کی جبریہ تعطیل کے بعد موجودہ مارچ نمبر حاضر ہو رہا ہے۔ حساب درست کرنے کے لئے وہ خریداران کا جولائی کے ماہ سے سال شروع ہوتا ہے خاص نمبر کو جنوری و فروری ۱۹۳۶ء کا تصور فرمالیں تاکہ ان کی میعاد خریداری دسمبر ۱۹۳۶ء میں ختم ہو جائے۔

(مینیجر)

ادبیات

پہاڑی لڑکی

(از کاشف اکبر آبادی)

(۵)

جالہ کا کوہ وقار ارادہ قوس کو پہاڑ دلکی اُس خاموش چاندنی میں چھپا کر لے آیا جو اُسکی نور افشاں جسم سے چھنکی رہی تھی۔ اُس کے مرمرین جسم کی ضیا پاشی نے خوف و ہراس کی تاریکیوں کو برہم کر دیا۔ اُسکی ملکوتی ضد نے خداوند مرکادس کے پُر انتقام غضب کی پروانہ کی۔ اُن وادیوں کے جنکے دامن، دامن مریم کیطرح مقدس تھے، وہ اپنی تجلیوں کی قوت جاذبہ سے ایک کلیم پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اُس کے طورِ جمال نے اپنے تماشائی کو ایک لمحہ کے آٹھویں حصے میں ہم آغوش کر لیا۔ آدھی رات تھی، پہاڑ اپنے جبروت کے سائے وادیوں پر چمکا رہے تھے، چاند اُن کے اثرِ جلال سے دور چمک رہا تھا اور قوس کی آغوش جالہ کے مجسمۂ لطیف سے لعل تراش رہی تھی،

جالہ نے ایک سحر کن خاموشی اور اطمینان کے بعد اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو جبینِ صندلین سے آہستہ ہٹایا۔ دُکھتے ہوئے ہونٹوں کو تبسم کی لطافتوں سے تازہ کیا اور شگفتِ گل کیطرح نرم اور سُریلی آواز میں قوس کو مخاطب کر کے کہنے لگی، ان اطمینان کے چند لمحوں کا دیرپا انتقام، میرے قوس تمہارا نازک ترین دل کیونکر گوارا کر سکیگا۔

قوس۔ انتقام، کیسا انتقام، جالہ کیا تیری خداوندی میں دوسرے منتقم کا بھی گذر ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ مجھے پھر کہنے دے ہرگز نہیں پھر کیا تو انتقام لیگی؟۔

جالہ۔ نہیں۔ بلکہ مرکادس کی غضب آلودنگرانی نہیں چاہتی کہ میری تنہائیوں میں میری ہمجنس لڑکیوں کے علاوہ کوئی پرشباب رعنائی اور بھی شریک ہو سکے۔ وہ مجازی آزادی کو حقیقی مسرتوں سے لبریز دیکھنا نہیں چاہتا۔ اور چاہتا ہے کہ میں اسی حسرت و اندوہ میں گھر کر مر جاؤں۔

قوس۔ مرکادس، پہاڑوں کا جلیل القدر بادشاہ گو تیرا باپ اور میرا خداوند ہے۔ لیکن جالہ، قوس کی کمزور کمان تیری حفاظت کیلئے ہر وقت تیر بکنار ہے۔ اور میرے ترکش کا ہر زہریلا اور کوہ شکن تیر تیرے دشمنوں کی پیاس بجھانے کے لئے وقف ہے۔

جالہ۔ شکریہ۔ لیکن قوس وہ پھر میرا باپ ہے۔ میری اور تمہاری دونوں قوتیں ملکر بھی اُس کے جلال کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ مرکادس میرے جذبات کی ضد کا شکار ہو۔

قوس۔ تو پھر میں اُس کے انتقام کی ہر چنگاری آنکھیں بند کر کے اور سر جھکا کے اپنے دلمیں، جسم میں، اور اپنی ہستی میں جذب کر لینے کیلئے تیار ہوں

جالہ۔ تسلیم۔ لیکن جان نثار قوس تمہیں مصیبت میں دیکھنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ چودہ سال کی ناقابل برداشت انتظار کے بعد میں نے تمہیں اپنی قدرت سے صحرائے گلستان سے یہانتک کھینچا ہے۔ اب کسطرح ممکن ہے کہ میں تمہیں مرکادس کی آتش کدہ غضب میں جلنے جھلسنے کے لئے چھوڑ دوں۔

قوس۔ لیکن کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ اُس کا غضب صرف میرے ہی لئے ہوگا اور تم پر اس کی آنچ نہ آئے گی۔ اگر ایسا ہو تو میرے لئے ہر آگ فردوس، اور ہر تکلیف راحتِ وصال سے زیادہ سکون آفرین ہے ...... کیوں جبالہ کیا یہ ممکن ہے؟

جبالہ۔ کہکشاں کی تیرہ دش کنواریاں، اگر تمہارے یکایک غائب ہو جانے سے خائف ہیں تو یقیناً تمہاری حفاظت کے لئے تیار ہونگی اور تم اُن کے جھرمٹ میں پناہ لوگے۔ اسلئے میرا خیال یہ ہے کہ اُس کا غضب صرف میرے لئے ہوگا۔

قوس۔ کہکشاں کی کنواریاں اگر مجھے بچا سکیں، تو کیا جبالہ کا پیکر رنگیں اُن کی شب تاریک خشم ناکیوں میں محفوظ نہیں ہو سکتا۔

"نہیں ہو سکتا"، ایک جبال شکن آواز بغیر گونج رعد کی کڑک کی طرح سنائی دی اور ابھی یہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اُسکا سلسلہ ایک لمحہ کے بعد پھر ساعت پاش ہوا" اور آسمانی درندے، کہکشانی ابلیس کیا صحرائے کواکب کی کوئی چکدار ہرنی تیرے دام حرص میں گرفتار ہونے کے قابل نہ تھی، کہ تو شہاب کیطرح زمین پر ٹوٹا۔ اور آسمانِ مقدس کے گندے تارے، کیا کہکشاں کی کنواریوں میں کوئی باقی نہ رہا کہ تو نے ارض الجبال کی اچھوتی کو اپنی ناپاک کرنوں کی گرفت میں لے لیا۔ میں کوئی اظہار اور کوئی آواز سننا نہیں چاہتا اور اس سے پہلے کہ تو کہکشاں کی نوری فوجوں کو اپنی مدد کے لئے بلائے فیصلہ کئے دیتا ہوں کہ تو ارض ارض الجبال کا اسیر ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ کیلئے کوہ آتش فشاں بنا دیا جائے۔ اور تیرے مغرور سر سے ہمیشہ تیرے شباب کی آگ دھواں بنکر نکلتی رہے۔ میں پہچان میں ہوں مرکاؤس ارض الجبال کا تنہا حکمراں۔ اور تیرا سب سے پہلا اور بڑا دشم

آواز ایکدم بند ہو گئی۔ قوس کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جبالہ کچھ بولنا چاہتی تھی کہ قوس کے سر سے دھواں نکلا اور وہ ایک دھماکے کی آواز ساتھ ایک آتش فشاں پہاڑ بن کر جبالہ کے سامنے برپا ہو گیا

(٦)

"کیا تم اپنی مقصورہ تصویر بنانے میں کامیاب ہوا چ
مصور تم ریگ فیلڈ کیوں نہ آئے"

مرفی نے ایک مدھم طلب نگاہ سے ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا، جبکہ چشمہ اپنی پوری روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا، اور مصو بدستور "بازگشت" کی تصویروں کے خاکے بنا بنا کر مٹا رہا ت ایک پرسکون خاموشی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرند اپنے پروں سے ہوا کو منتشر کرکے ایک جلد مٹ جانے والی بر صدا پیدا کر دیتے تھے۔ اور یہی وہ وقت ہوتا تھا کہ مصور کی نگ قلم اور پردے سے ہٹ کر صحرا میں کسی طرف متوجہ ہو جاتی تھ تین طرف پہاڑ تھے کہ اگر کوئی ہنگامہ برپا ہوتا تو بھی گونج پیدا نہ ہوتی، کیونکہ مرفی تمام ہنگاموں کو اپنے جو بائے محبت دل میں جذب کر چکی تھی اور اس نے کوئی سکون شکن صدا اپ ماحول میں ایسی نہ چھوڑی تھی جو اُس کی خاموشی کو برہم کر سکے مصور اُس کی سُریلی آواز سے چونکا اور معروف کار آنکھوں مل کر بولا۔ نہیں اینل مرفی میں اپنی کوششوں میں ہنوز ناکا ہوں۔ میں قابل معافی ہوں کہ اس معروفیت کی وجہ سے حاضر ہو سکا، لیکن اب کسی دن آسمان پر ابر ہوگا اور بارش کا یقین ہو میں ریگ فیلڈ ضرور آؤں گا۔

مرفی۔ ایک لاحاصل کوشش میں تم اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔

مصور۔ اس لئے کہ ہر کوشش کا کچھ حاصل ضرور ہوتا ہے۔

مرفی۔ ہر کوشش کا۔ مگر میری کوشش بھی تمہاری کوشش کی طرح ہنوز لاحاصل ہے۔

مصور۔ تم کیا چاہتی ہو۔

مرفی۔ یہ مجھے خود معلوم نہیں۔ مگر میں کسی چیز کی تلاش میں ہوں اور وہ مجھے کہیں نہیں ملتی۔

مصور۔ بغیر تعین کسی چیز کی تلاش کیا معنی رکھتی ہے۔

مرفی۔ یہ تم اپنی موجودہ کوشش سے پوچھو۔

مصور۔ میری کوشش ایک نقش خیالی کے اسیر کرنے میں مصروف ہے۔

مرفی۔ لیکن وہ نقش خیال میں بھی اسیر نہیں ہے۔ اسلئے تم اُسی خیالی بھی نہیں کہہ سکتے

مصور۔ پھر وہ کیا ہے۔

مرفی۔ ایک نقش موہوم جو میرے مطلوب کی طرح موہوم ہے۔

مصور۔ تو کیا ہم دونوں ایک ہی راستے پر چل رہے ہیں۔

مرفی۔ اس کا جواب مستقبل دیگا۔

مصور۔ اے عقل کی زندہ پتلی، میں حیران ہوں کہ اپنے نقش موہوم سے زیادہ تجھے بعید الفہم پاتا ہوں۔

مرفی۔ ہر وہ چیز جو اپنی حقیقت میں گم ہے بعید الفہم ہے۔ میں اپنی حقیقت میں کھوئی ہوئی ہوں اسلئے تم مجھے بازگشت کیطرح جلد دریافت نہیں کر سکتے۔ اچھا خدا حافظ۔ جب ریک فیلڈ آؤ گے تو یہ معمہ حل ہو جائے گا۔

مرفی بغیر انتظار جواب مصور کو ایک پھول دیکر وحشی ہرنی کی طرح چوکڑی بھرتی ہوئی غائب ہو گئی۔ اور مصور نے قلم ہاتھ سے رکھدیا۔ اور ایک ایسے خیال میں کھینچنے لگا جو اُسکے لئے بالکل نیا اور وحشت ناک تھا۔

(۷)

مرکاوس نے لرزا دینے والی آواز میں کہا۔

تیرا کوئی عذر میرے غصہ کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتا۔ تو نے بنت الجبال ہو کر ارض جبال کی دوشیزہ کنواریوں کو بدنام کیا ہے جبالہ قسم ہے اپنے جبروت کی اگر تمام پہاڑ تیری سفارش کے سجدوں میں سر جھکا دیں۔ آسمان زمین پر جھک پڑے۔ اور زمین اپنے ہر ذرہ کو زبان سفارش بنا دے تو بھی میں تیرا قصور معاف نہ کرونگا۔

جبالہ۔ خداوند پہاڑوں کی حکومت خدائی نہیں ہے۔ آپ کو اُس سے بھی ڈرنا چاہیئے جس نے آپ کو یہ جلال اور یہ جبروت عطا کیا ہے۔

مرکاوس۔ اُس سے تو تجھے ڈرنا چاہیئے۔

جبالہ۔ کیوں۔

مرکاوس۔ اسکا جواب اپنے دامن چاک چاک سے لے۔

جبالہ۔ میرا دامن پاک ہے۔ میرا دل پاک ہے۔ اور میں پاک ہوں۔ اب تک صرف میرے ہونٹھ گنہگار ہیں۔ آپ انہیں جو سزا چاہیں دیں۔ میں غیرت پدری پر نثار ہونے کو تیار ہوں۔

مرکاوس۔ میں ایک گنہگار جزو کو کل کے ساتھ سزا دینا چاہتا ہوں۔ تو میری بیٹی نہیں ہے کسی شیطان کی بیٹی ہے۔ صحرائے کہکشاں کی کوئی ناپاک روح تیرے پردہ میں مجھے دھوکا دینے آئی

دینے آئی تھی۔ میں اُسے واپس بھیجنا چاہتا ہوں۔ تو بنت الجبال نہیں ہے ننگِ جبال ہے۔ بس میں زیادہ سننا نہیں چاہتا۔ تو قیامت تک قید جسم کے ساتھ پہاڑوں میں پوشیدہ رہیگی۔ اور تیرے ہونٹوں کی سزا یہ ہے کہ جب اِمن کوہ میں کوئی صدا پست یا بلند پیدا ہوگی تو تیرے ہونٹ بھی اس کا اعادہ کریں گے۔ تو اس مصیبت سے کبھی رہا نہ ہوگی کہ خالق جبال کی منشا میرے حکم میں پوشیدہ ہے۔ بس جا خدا حافظ۔

جبالہ ایک شعلۂ نور کی طرح گھٹی اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئی۔ یہ پہلا دن تھا کہ پہاڑوں میں گونج پیدا ہوئی اور جبالہ "صدا بازگشت" بنکر ہمیشہ کے لئے فضائے کوہی میں جذب ہوگئی۔ جب سے ابتک کوئی پہاڑ ایسا پیدا نہوا جس میں جبالہ کے قوس گیر ہونٹوں کی یادگار کا مزار نہ ہو اور جس میں اس کے ہونٹ سرگرم تکلم نہ ہوئے ہوں۔ "بنت الجبال" اب بھی بنت الجبال ہے۔ وہ پہاڑوں کی وادیوں میں اپنے قوس کیلئے گونج رہی ہے اور قوس اُسکی یاد میں اپنے سر سے آگ اچھال اچھال کر گدازِ محبت کو روشن کر رہا ہے۔ پہاڑ ابتک جبالہ کی گونج سے آباد ہیں۔ اور دُنیا ابتک قوس کی آتش بجانی سے لرز رہی ہے۔

(۸)

ٹھیک اُسوقت جبکہ "مرنی" اپنی منزلِ مقصود کی تلاش کے لئے ریک فیلڈ چھوڑنے والی تھی۔ مصور آپہونچا۔ مقتول نے اُسے دیکھا۔ بغور دیکھا۔ وہ مسکرا دیا۔ کیونکہ جب وہ کسی دوسرے نوجوان کو مرنی کا مشتاقِ ملاقات دیکھتا اور اُسے اپنی رعنائیوں اور توانائیوں کا حریف نہ پاتا۔ تو اُسکے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ آجاتی۔ اُسنے مصور کو بھی اُنہیں نگاہوں سے دیکھا اور خاموش ہوگیا۔ مرنی نے ایک مستانہ بے تکلفی سے پوچھا۔ صاحب، کیا آپ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگئے۔

مصور۔ ہاں کل پہلا دن تھا کہ مجھے کامیابی ہوئی۔ میں اپنی متواتر ناکامیوں سے مجنوں بنا ہوا تھا۔ جب میرا دماغ بالکل تھک گیا تو میں نے اپنا قلم پھینک دیا۔ اور میں چلّایا "آخر میں کب تک یوں ہی اسیر فریب رہوں!"

میں ذرا ٹھٹکا تو قریبی پہاڑ سے مجھے یہی آواز سنائی دی۔ میں متحیر ادہر گیا میں نے کہا "کون ہے" "یہ کون تھا" بجنسہ یہ آواز اور یہی الفاظ مجھے پھر سنائی دیئے۔ میں گھبرا رہا تھا۔ میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں عنقریب وحشی ہوجانے والا تھا کہ میں نے کچھ اور بلند آواز میں کہا "بس مذاق ہوچکا باہر آؤ، میں تم سے ملنا چاہتا ہوں" مگر میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب یہی الفاظ دُہرا کر میرے کانوں پر مار دیئے گئے۔ آخر میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ میں متفکر ہوکر بیٹھ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھ پر ایک خواب طاری ہوگیا اور میں نے دیکھا کہ ایک حور جمال دوشیزہ عالم کرب و اضطراب میں بےچین اور بیتاب ہے۔ اُس کے نرم اور گداز ہاتھ پہاڑوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ وہ خود کچھ نہیں بول سکتی لیکن جب اُس کے سامنے کوئی آواز بلند ہوتی ہے تو وہ اُسی کو دُہرا دیتی ہے۔

میں اس طلسمِ خواب کو کچھ زیادہ حل نہ کرسکا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ اور مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ "بازگشت" تھی۔ میرے دماغ میں اُسکی صورت مرتسم تھی۔ میرے خیال میں اُسکی حالت منقوش تھی۔ میں نے فوراً قلم اٹھایا اور جتنی جلد ممکن ہوسکا وہ تصویر خیال سے کاغذ پر

---

۵ ستمبر ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔

اناڑی۔ مرنی، دیکھو کیسی غلط صورت ہے!

مرنی۔ ہوگی میں نے بھی اپنی منزلِ مقصود ختم کرلی۔ کیا یہ سن کر تم خوش ہو؟

مصور۔ بیشک، لیکن وہ کہاں ہے جس کی تمہیں تلاش تھی۔

مرنی۔ وہ تم ہو۔ مرنی نے بڑے جوشِ محبت کے ساتھ یہ الفاظ کہے اور مصور کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔

(۹)

سائکی، اپنے سمن خانۂ ناز میں گھبرائی پھر رہی تھی۔ چاند مغرب کے قریب پہونچ چکا تھا۔ تارے واماندۂ نظارہ ہو چکے تھے۔ کہ اُسنے زہرہ کو آواز دی۔ طائرہ نے ایک انجم افشاں انگڑائی لی اور آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو سائکی پریشان ہے۔ اُس کے ہونٹوں کی ارغوانیت کچھ ہلکی ہوگئی ہے۔ اور اس کی آنکھوں کی شراب کچھ تلخ سی ہو چلی ہے۔ اس کے صندل آفرین اور مہتاب پرور جبینِ جمیل پر عرقِ فکر کے کچھ قطرے ثریا کا جھومر بنے ہوئے ہیں۔ طائرہ اُس سے زیادہ گھبرائی اور بے تابانہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے فوراً اپنا بربط سرہانے سے اُٹھالیا۔ وہ چاہتی تھی کہ نغموں کی صبوحیاں پلاکر اُس کے خمارِ اضطراب کی اصلاح کردے۔ مگر سائکی نے ہونٹوں کے اشارہ سے منع کیا۔ اور کیوپڈ کی خالی جگہ کو بغور دیکھنے لگی۔ طائرہ سمجھ گئی کہ سائکی کیوپڈ کے انتظار میں بے قرار ہے۔

وہ چاہتی تھی کہ ارضِ کہکشاں سے قوس کو اس کی تلاش کے لئے آواز دے۔ کہ ناگہاں کیوپڈ کمان بردوش فاتحانہ انداز سے نازل ہوا۔ اُس نے سائکی کو تبسم نگاہوں سے دیکھا۔ سر کو ہلکی سی جنبش دی اور کہا۔ سائکی میں گواہ ہوں کہ ابھی دنیا میں غیرت، رحم، اور محبت، تینوں چیزیں باقی ہیں۔

سائکی کے ہونٹھ گہرے ارغوانی ہوگئے۔ اُس کی آنکھیں کوثر فریب شراب برسانے لگیں۔ اُس کی مہتاب جمال جبینِ روشن چاند برسانے لگی۔ اُس نے ایک صبح نگار تبسم کیا۔ کیوپڈ کی کمان کو بوسہ دیا۔ اور اُس کے ہمہ رنگ اور ہمہ گداز ہونٹوں نے فضائے ملکوتی میں یہ الفاظ برسائے کہ

جب تک سائکی کے حُسن میں وقار اور کیوپڈ کے تیروں میں خلشِ کاری باقی ہے۔ انسانی دنیا میں غیرت، رحم، اور محبت ہمیشہ باقی رہیں گے اور دنیا ان فردوسی جذبات سے کبھی خالی نہ ہوگی

فقم قُم یا حبیبی

بھرا ہے دل میں شوقِ ہم کلامی مٹا دے میرے ساقی تشنہ کامی
پہن کر فخر سے تاجِ غلامی کھڑے ہیں دیر سے در پر سلامی

فقم قم یا حبیبی کم تنام

خدارا مرنے والوں کو جلا دے ردائے پاک چہرے سے ہٹا دے
تجلّیِ رخِ انور دکھا دے حواس و ہوش پر بجلی گرا دے

فقم قم یا حبیبی کم تنام

برائے خاطرِ احباب برخیز بہ تسکینِ دلِ بیتاب برخیز
ز خواب اے نرگسِ سیراب برخیز چو نرگس خواب چند از خواب برخیز

فقم قم یا حبیبی کم تنام

شبِ معراجِ محبوبِ خدا ہے جہاں میں نغمۂ صلِ علیٰ ہے
نیاز و ناز کا وقت آگیا ہے خدا خود پیار سے فرما رہا ہے

فقم قم یا حبیبی کم تنام

کہاں ہم اور کہاں انکا نظارا نہیں ہے اس قدر یارا ہمارا
جگانا اُن کو حصہ ہے تمہارا بلالؓ اک بار تم کہہ دو خدارا

فقم قم یا حبیبی کم تنام

آمجد (حیدرآباد)

دو آتشہ

(تمنائے موت)

جامِ غمِ اندوہ پئے جاتا ہوں — بادیدۂ تر ضبط کئے جاتا ہوں
کچھ ٹھوکریں کھانی ہیں ابھی قسمت میں — مرنے کی تمنا میں جئے جاتا ہوں

محمود اسرائیلی

(جواب از مظہری)

جامِ غمِ مخلوق پئے۔ اور پیو! — زخمِ دلِ اقوام سئے۔ اور سیو
گرتوں کو گرے ہوؤں قریبی ہو مدد — جس طرح سے بن پڑا جئے۔ اور جیو!

(دیگر)

ہر اک کو فکر ہو گی اپنے گھر کی — شاعر کے نصیبوں میں ہو دنیا بھر کی
مرنے کی تمنا اور ابھی سے محمود — کیا ساری مہم جہاں بھر کی سر کی

مظہری

(فروتنی)

تنکا ہوں قدم قدم پہ رہ جاتا ہوں — گرداب میں گھومتا ہوں بہ جاتا ہوں
چلنے کی نہ قدرت ہے نہ رکنے کی مجال — افتاد جو پڑتی ہے وہ سہ جاتا ہوں

(جواب مظہری)

تنکا بھی عجب اُبھار پر رہتا ہے — کس شان سے دریا پہ چڑھا بہتا ہے
گرداب کے ظلمات کی تہ تک جاکر — اُٹھتا ہے خوشی سے ہر کڑی سہتا ہے

(دیگر)

ہاں طالبِ طولِ زندگانی می باش — آمادہ مرگِ ناگہانی می باش
می داں بہ یقیں کہ وقت فرصت کم است — ہر لحظہ بہ کار و کامرانی می باش

مظہری

غزلیات

(از پروفیسر صاحب اکبر حیدری)

بے تکلف تجھے خدا کہنا　　میری سادہ دلی کا کیا کہنا
جانتا ہوں ضرورتیں اپنی　　مصلحت ہے تجھے خدا کہنا
رخصت اے خونِ دل خدا حافظ　　چشمِ خونبار سے دعا کہنا
آہ ناکامیوں کی خود رائی　　موت تک کو حیات زا کہنا
دور اندیشیاں محبت کی　　بے وفاؤں کو باوفا کہنا
انتہائے الم پرستی ہے (غیر فانی) درد کو درد کی دوا کہنا
شعر کہنا تو اکبر محزوں
درد آمیز درد زا کہنا

(خاکسار عبدالرحمٰن خوشتر منگرولی ایڈیٹر رسالہ ہذا)

ملی ایسی قسمتِ منقلب کہ بساطِ عیش اُلٹ گئی　　جو لگائی بازیِ عشق تو کبھی چت گئی کبھی پٹ گئی
شبِ آخری کا چراغ ہوں نہ بہار دیکھی وہ باغ ہوں　　میں وہ غم نصیب ایاغ ہوں جسے باد تند اُلٹ گئی
وہ کلی ہوں میں جو کھلی نہیں وہ ہوں شے جو کھو کے ملی نہیں　　وہ شباب ہوں جو گزر گیا وہ ہوں عمر رفتہ جو کٹ گئی
جو نہ پھلنے پھولنے پائی تھی جو نہ برگ و بار لائی تھی　　وہ ہی شاخِ نخلِ امید ہوں جو بہار آتے ہی کٹ گئی
وہ مرض ہوں جس کی دوا نہیں وہ ہوں سانحہ جسے سد انہیں　　وہ گہر ہوں جس میں ضیا نہیں وہ میں فند ہوں جو اچٹ گئی
غم و رنج رفتہ کا ذکر کیا جو تھا ہونے والا وہ ہو چکا　　جو گذر گئی وہ گذر گئی جو نپٹ گئی وہ نپٹ گئی
ہوا کوئی پورا نہ حوصلہ ہے شباب پیری نما مرا　　جو تھا جوش عشق فنا ہوا جو بڑی امنگ تھی گھٹ گئی
وہ ہوں آہ جنس بد و زبوں جو کسی کے کام نہ آسکوں　　وہ کسی کی عمر رواں ہوں میں بڑی جتنی اتنی ہی گھٹ گئی
نہیں دوست دشمن و یکدلی چلی خوشتر ایسی ہوا بری　　نہ وہ انس ہے نہ وفا رہی نہ دلوں سے ان کے کپٹ گئی

جلد ۳ نمبر ۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زبان

(منگرول (کاٹھیاواڑ) سے ہر ماہ کے آخری ہفتہ کو شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ چار روپیہ)

فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۲۸ء



زبان کی جوانامرگی کا ماتم کرہی چکے تھے کہ عین اس موقع پر ہمارے چند معزز کرم فرماؤں نے اس کے ساتھ مسیحانفسی فرماکر نئی زندگی عطافرمائی اور ادبی دنیا میں اپنے ناموں کو بھی بقائے دوام کا خلعت بخشا۔ ہم ان معاونین کے دلی شکر گزار ہیں انہوں نے اپنی مستقل طور پر معاونت کا وعدہ فرماکر ہمیں زبان کی اقتصادی حالت کی جانب سے بہت کچھ سبکبار کردیا ہے اس لئے زبان بھی انشاءاللہ (اگر اتفاقیہ امور درپیش نہ آئے) اب پابندئ وقت کے ساتھ ہر ماہ اشاعت پذیر ہوا کرے گا۔

گزشتہ نمبر میں ہم تبدیلی معیار کا اعلان کرچکے ہیں چنانچہ حسب وعدہ موجودہ نمبر طرز جدید پر مرتب کیا گیا ہے جو علمی وادبی جواہر پاروں کا بے مثل ونادر مجموعہ ہے جسکو قارئین زبان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ یہ رنگ خواص وعوام میں "رنگ قبول" کا درجہ حاصل کرے گا اور محنت ٹھکانے لگے گی ؎

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول
پھول جو میں نے چنے ہیں اُنکے دامن کے لئے

زبان پر عام طور پر یہ اعتراضات وارد ہوا کرتے تھے کہ "یہ معارف کا ہم رنگ ہے، اس کا معیار مولویانہ ہے۔ اسمیں خشک اور ٹھوس مضامین ہوا کرتے ہیں"، اور ہمیں یہ مشورہ دیا جاتا تھا کہ "زبان کی پالیسی بدل دینی چاہئے، اس میں تنوع پیدا کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ رنگ غیر مقبول ہے، اور اس "معصیت" کے لئے معارف کا وجود کافی ہے وغیرہ وغیرہ" جس کے یہ معنی ہیں کہ معارف کی پیروی کرنا (اگرچہ ہمیں یہ فخر بھی حاصل نہ ہوسکا) اور اسی کا سا اعلیٰ معیار اختیار کرنا اس لئے "معصیت" ہے کہ یہ رنگ عوام کی سمجھ سے بالاتر ہے اور ایک خاص حلقہ تک محدود ہے۔ ہم معترف ہیں کہ زبان میں ایسے مضامین ہوا کرتے تھے جو عوام میں "غیر مقبول وغیر دلچسپ" کہلائے جانے کے مستحق تھے۔ افسوس ابنائے ملک کا مذاق علمی اس قدر پست ہوگیا ہے کہ وہ کسی رسالہ کو بھی معارف کا ہم رنگ دیکھنا نہیں چاہتے۔ عامیانہ مذاق کو پسندیدگی

کی نظروں سے دیکھتے ہیں انہیں غیر مفید مضامین اور دلچسپ وحیا سوز افسانوں سے انس ہے اور ظاہری ٹیم ٹام زیادہ مرغوب ہے۔

اس سلسلہ میں کرمی حضرت راز چاندپوری ہمیں لکھتے ہیں کہ "فی زمانا ایسے اہل نظر بہت کم ہیں جو کسی جریدہ کی معنوی خوبیوں کی قدر کرسکیں۔ ظاہر پرستی کا دور دورہ ہے۔ کم قیمت اور ملمع شدہ رسائل نے کارآمد اور ٹھوس کام کرنے والے رسالوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وقت آئیگا کہ زمانے کی آنکھیں کھلیں گی اور اچھے برے کی تمیز ہوگی۔" لیکن ع

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اگر ہمارا زاویہ نگاہ "مالی مفاد" ہوتا تو ہم "آپ ہی کا رنگ اب کرتے ہیں ہم بھی اختیار" کہہ کر ہم بھی زبان کو عامیانہ مذاق کا رسالہ بنا دیتے لیکن چونکہ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے اسلئے ایسا کرنا ہمارے حیطہ امکان سے باہر ہے۔ مگر۔ ہاں۔ باقتضائے ضرورت اس میں ایک شاندار تنوع پیدا کرکے ہم اس کو موجودہ رسائل میں ایک امتیازی شان بخشنا ضرور چاہتے ہیں جس کے ثبوت میں موجودہ نمبر پیش کرتے ہیں اگرچہ اس میں بھی ہماری خواہش کے مطابق مضامین نہیں۔

محبی کیف صاحب جن کا ذکر گذشتہ نمبر میں کرچکے ہیں افسوس کہ بوجوہ چند زبان کے عملۂ ادارت میں شریک نہیں ہوسکتے لیکن زبان کے ساتھ ان کی ہمدردی وقلمی معاونت بدستور رہے گی چنانچہ اس نمبر میں بیشتر مضامین انہی کے فراہم کردہ ہیں اور حسن ترتیب میں بھی انکا ہاتھ ہے جس کے لئے ہم اپنے دوست کے مشکور ہیں۔

یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ کیف صاحب اپنی ادارت میں بھوپال یا بجنور سے عنقریب ایک علمی وادبی رسالہ کا اجرا کرنے والے ہیں۔ ان کے ذوق ادبی سے امید ہے کہ قلمروئے اردو میں انکا "سفیر" بہت جلد اقتدار حاصل کرے گا۔

خوشتر منگرولی

معاشیات علم ایجابی ہے یا معیاری

Idealistic Realistic

(جناب سید مہربان علی بی۔ اے (عثمانیہ) متعلم ایم۔ اے۔ ال ال بی مُسلم یونیورسٹی)

اس زمانہ میں جبکہ انسانی ذہنیت نے علوم و فنون کے میدان میں حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں اور نئے نئے ایجادات اور عجیب غریب انکشافات نے دنیا کو حیران کر دیا ہے جہاں فنون میں ترقیاں ہوئیں علوم کی وسعت میں بھی بے انتہا اضافے ہوئے ہمارے سامنے موجودہ علمی دنیا ایسے مسائل پیش کر رہی ہے جو اب سے پہلے عقل انسانی کے لئے بالکل چیستان تھے۔

علم معاشیات نے بھی اس دور میں بہت وسعت اور ہمہ گیری اختیار کر لی ہے اور روز بروز اس میں تازہ معلومات اور نئے نئے خیالات کا اضافہ ہوتا جاتا ہے لیکن میرا مقصد اس وقت صرف معاشیات کے ایک اصولی مسئلہ کا پیش کرنا ہے جس نے معاشین کے اختلاف آرا کی وجہ سے ایک خاص اہمیت اختیار کر لی ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ علم معاشیات کو ایجابی (Realistic) تصور کیا جائے یا معیاری (Idealistic)۔

اس کے متعلق بحث کرنے سے پہلے یہ امر پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ مصطلحین نے علوم کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے (۱) (Social sciences) علوم عمرانی (۲) (Natural sciences) علوم طبعی اول الذکر میں علم معاشیات، اخلاقیات، تاریخ و تمدن وغیرہ شامل ہیں اور ثانی الذکر میں علم طبیعات۔ اور علم کیمیا سے بحث کی جاتی ہے میں اس وقت عمرانیات یا (Social sciences) پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ علوم عمرانی میں سے ہر علم انسان کو ایک بڑی جماعت کا رکن یا فرد خیال کر کے اس کی زندگی کے کسی ایک پہلو سے بحث کرتا ہے اور چونکہ انہیں علوم میں معاشیات بھی شامل ہے اسلئے یہ انسان کے اس ایک پہلو سے بحث کرتا ہے کہ انسانی احتیاجات کیا کیا ہیں انکے پورا کرنیکے ذرائع کون کون سے ہیں یہ علم انسان کو اس حیثیت سے نظر ڈالتا ہے کہ زندگی کے کاروبار میں اسکی مصروفیت کا کیا حال ہے انسان اپنے آرائش و آرام کے مادی ضروریات کے بہم پہنچانے میں جو کچھ کوشش کرتا ہے اسکی معاشیات میں بحث کیجاتی ہے۔ اسمیں ایکطرف تو مسائل دولت پر غور کیا جاتا ہے اور دوسری طرف انسان کی حالت پر اس رو سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معاشین ایجابی اور معیاری کے تصفیہ کے بحث پر مختلف الرائے ہیں ایک ایجابی (Realistic) کہتا ہے دوسرا اسے معیاری (Idealistic) بتاتا ہے۔

ہر صورت ایجابی پرست گروہ اپنے قول کی تائید میں یہ دلائل پیش کرتا ہے کہ معاشیات کا کام یہ ہے کہ وہ دنیا کی

موجودہ حالت پر نظر ڈالے۔ معاش دنیاوی چہل پہل اور روزمرہ کے کاروبار میں معاشی ترقی کا اندازہ کرے۔ اور معاشیات کیا ہے۔ اس سے بحث کرتا ہے اور اس کے ذریعہ سے اس کا اندازہ لگاتا ہے کہ دنیا میں کیا کیا واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں لوگ کس طرح سے اپنی اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اقوام عالم کا کیا حال ہے۔ پس اس طریقہ سے معاشی مسائل میں جان پڑ جائیگی۔

اور اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکیگا کہ عوام کن کن مشاغل میں مصروف ہیں اور دولت کی تقسیم اور اس کو دوسرے اثرات کی وجہ سے عام انسانی زندگی کے شعبہ میں کیا کیا اختلاف اور کیا کیا تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ دوسرا اسکول اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ ہی بناتا ہے۔ اور وہ معاشیات کو علم معیاری تسلیم کرتا ہے اور اپنے قول کی تائید اور ثبوت میں یہ دلائل پیش کرتا ہے کہ جب انسان دنیا میں رہ کر یہ نہ بتا سکے کہ فلاں چیز ادنیٰ ہے۔ فلاں اعلیٰ۔ فلاں چیز ہماری سوسائٹی کے لئے مفید ہے اور فلاں مضر۔ فلاں چیز ہمارے تمدن میں عمدہ ہے اور فلاں خراب۔ تب تک ہم نہ تو دنیا میں ترقی کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے علم معاشیات میں علمی جھلک پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ جب تک ہم (what ought to be) "کیا ہونا چاہیے" کے ساتھ۔ جو ہمارا مسلک ہے۔ بحث نہ کریں گے۔ اس وقت تک آیندہ زمانہ کے متعلق کچھ رائے قائم نہ کر سکیں گے لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ جو خرابیاں ہمارے تمدن میں پیدا ہو گئی ہوں ان کو دور کریں۔ اپنی معاشی حالت کو درست کریں۔ اور موجودہ حالت سے باخبر رہ کر آیندہ واقعات اور حالات کے متعلق رائے قائم کر سکیں۔

پس اس طرح معاشین کے دو گروہ ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ لیکن تیسرا گروہ خیر الامور اوسطہا کا حامی ہے وہ کہتا ہے کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سے پہلے (what is) کی بحث کو پوری طرح سے سمجھ لیا جائے موجودہ حالت کا کافی مطالعہ کر کے ایک رائے قائم کی جائے اور جب انسان موجودہ حالات پر کافی عبور حاصل کر لے تو پھر اس کو اجازت ہے کہ وہ بطور استثنائی (incidentally) کے (what ought to be) "کیا ہونا چاہیے" کی بحث میں پڑے لیکن اگر ہم نے اس طریق سے کام نہ لیا۔ بلکہ (what is) "کیا ہے"، کو سمجھے بغیر "کیا کیا ہونا چاہیے" (what ought to be) کی بحث میں گرفتار ہو گئے تو ہم کو معاشی مسائل کے سمجھنے اور سلجھانے میں بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور ہماری مثال بعینہٖ ایسی ہی ہو گی جیسی کہ اس بیوقوف کی جس نے کہ پوری کی ہوس میں آدھی کو بھی کھو دیا۔

پس ان حالات کی بنا پر ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم (what is) "کیا ہے"، کی بحث کو خوب سمجھ لیں۔ بعد ازاں (what ought to be) "کیا ہونا چاہیے" کی بحث میں اپنے دماغ سے کام لیں۔ لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں کیا گیا تو ہماری علم معاشیات پند و نصائح کی کتاب بن جائے گی۔ اور معاشیات سے جو فائدہ ہم کو

پہنچنا چاہئے تھا وہ ہرگز نہ پہونچے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس علم میں علمی جھلک اور خالص علمیت کی روح باقی نہ رہیگی ....
الغرض مندرجہ بالا واقعات اس بات کی توضیح کرتے ہیں کہ ہماری روزانہ زندگی میں معاشیات سے مدد ملتی ہے۔ اور اصلاح تمدن میں اس سے بہت بڑی سہولت ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ہم معاشی مسائل پر غور و خوض کرنے کے بعد کسی بات کو اپنے تمدن کے لئے مضر خیال کرتے ہیں تو ہم اس کو تمدن میں سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہماری سعی یہ ہوتی ہو کہ ہمارا تمدن بری باتوں اور بری رسومات سے پاک ہو جائے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہم اپنے لئے وہی کریں گے جو ہمارے تمدن کے لئے مفید اور سودمند ہوگا۔

پس ان حقایق کے تحت ہم ہندوستان کی معاشی حالت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ کیا ہندو اور کیا مسلمان۔ غرض سب میں ہی تمدنی برائیاں موجود ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے ذات پات کے طریق کو لے لیجئے اس میں جہاں بہت سے فائدے ہیں وہیں بہت سے نقصانات بھی مضمر ہیں۔ معاشین کا عام اتفاق اس امر پر ہے کہ ذات پات کا طریق ہندوستان کے لئے نہایت مضر ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ معاشی جمود اور سیاسی غلامی کا منظر نظر آتا ہے ذات پات کے طریق کو چھوڑ کر ہندوستان کے اشتراکی خاندان کی مثال کو لے لیجئے۔ اس اشتراکی خاندان میں گو فائدے بھی موجود ہیں لیکن اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جب لوگوں کو بغیر کوشش کئے وجہ معاش مل جاتی ہے تو پھر ان کے دلوں میں کام کرنے کا ولولہ اور شوق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ایسی صورت میں بہت سے لوگ کاہل بن کر دوسروں کے سہارے پر زندگی بسر کرتے ہیں قوت بازو پر بھروسہ کرنے کی عادت۔ جس کے بغیر معاشی ترقی ناممکن ہے ان کے دلوں میں کمتر پیدا ہوتی ہے۔ اور معاشی آزادی جسکی پیدائش دولت میں سخت ضرورت ہے۔ بہت محدود ہو جاتی ہے۔ خاندان کا بار ہونہار لوگوں پر اس قدر پڑ جاتا ہے کہ وہ کسی بڑے کام میں جس میں خطرہ ہو۔ ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرتے۔ بہرحال یہ رواج بہت اچھا ہے کہ سب کمائیں اور سب مل کر کھائیں لیکن یہ اصول کہ تھوڑے کمائیں اور زیادہ اس سے فائدہ اٹھائیں ترقی معیشت کے لئے نہایت درجہ ضرررساں ہے اس کے علاوہ ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ بھی بہت زیادہ اہم ہے۔ یہاں کے لوگ جب سے ہندوستان کی صنعتوں کو زوال آیا۔ زیادہ تر زراعت پیشہ ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی قصباتی آبادی شہری آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ جس کا پیدائش دولت پر نہایت برا اثر پڑ رہا ہے۔ آبادی کے سوال کو قطع نظر کرکے یہاں کے اصل کی حالت اور اس کی درستی خود ایک اہم مسئلہ اور اصل کے علاوہ ہندوستان کے عام رسم و رواج کی وجہ سے جو یہاں کی زمینت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ اس کی خرابی کا دور کرنا بھی معاشین کے سامنے ہے۔ ان تمام حالات اور واقعات سے اس امر کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے کسی ملک کی موجودہ معاشی حالت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب اس حالت کا پورا

پورا اندازہ ہوجاتا ہے تو اُس کے نقائص کو دور کرنے کی کوشش کیجاتی ہے ۔ نہ یہ کہ نقائص معلوم کرنے سے پہلے کوئی صاحب کسی ملک کی معاشی حالت کے سدھارنے کا تہیہ کرلیں ۔ لہٰذا پہلا گروہ جو محض اس امر سے بحث کرتا ہے کہ کسی ملک کی موجودہ حالت کیا ہے ۔ ایک لحاظ سے غلطی پر ہے کیونکہ اُسکا منشا یہ ہے کہ کسی ملک کی موجودہ حالت معلوم کرکے اُسی حالت پر اکتفا کیا جائے اور اُس کی تمام خرابیوں کو دور نہ کیا جائے اس لحاظ سے یہ پہلے گروہ کی غلطی ہے ۔ اسی طرح دوسرے گروہ کا خیال بھی صحیح نہیں کہ معاشیات محض اس سے بحث کرتا ہے ([illegible]) کہ کیا ہونا چاہئے ۔ فرض کیجئے کہ عام طور پر تجارت آزاد ہر ملک کے لئے بہت مفید ہے ۔ لیکن مخصوص حالات میں ہر ملک کے اندر تجارت آزاد پر عمل پیرا ہونا ایک قسم کی سخت غلطی ہے ۔ چنانچہ اگر معاشیات کے اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے اور دوسرے گروہ کی اندھی تقلید کی جائے تو ہر ملک اپنے آپ کو تباہی اور ہلاکت میں ڈال لیگا ۔ جیسے کہ ہندوستان کی مثال سے ظاہر ہے ۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ موجودہ حالت کا اندازہ کرنا معاشین کا فرض ہے ۔ اور جب اُس کا پُورا پُورا اندازہ ہوجائے تو پھر اُس کی خرابیوں کو رفع کرنا ضروری ہے ۔ چنانچہ ہم نے اسی بحث کو صاف کرنے کے لئے مختلف مثالیں ناظرین کے سامنے پیش کی ہیں ۔ اور جب تک معاشین کا گروہ یہاں کے رسم و رواج ۔ ذات پات کا طریق ۔ اصل کا انتظام ۔ محنت کی رسد ۔ زمین کی خرابیوں پر کافی غور و خوض نہ کرلیگا ۔ اُس وقت تک دوسرے ممالک کی اندھی تقلید بجائے فائدہ کے اُلٹا نقصان پہونچائے گی ۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں معاشیات نہ محض ایجابی ([illegible]) علم ہے اور نہ محض معیاری ([illegible]) بلکہ یہ ایجابی اور معیاری دونوں کے بین بین ہے ۔

رُباعیاتِ امجد

(۱)

ظاہر میں اگرچہ تودۂ خاک ہوں میں
پر صدر نشین بزم افلاک ہوں میں
اک پاک وجود سے تعلق ہے مرا
کیونکر کہوں آپ کو کہ پاک ہوں میں

(۲)

ذرّے ذرّے کو مستقل پاتا ہوں ،
ہر عضو میں کیفیت دل پاتا ہوں
واجب سے ملی ہوئی ہے ممکن کی کڑی
ہر جزد کو کل سے متصل پاتا ہوں

امجد (حیدرآبادی)

نگینہ اور شاعر

پاؤں تلے اک آیا ٹوٹا ہوا نگینہ — دیکھا کہ بال آ کر شق ہو گیا ہے سینہ
مینے یہ اُس سے پوچھا از راہ دردمندی — اے میرے دل کے ٹکڑے، یہ پستی و بلندی!
اِک دن تو جلوہ آرا تھا حسن کے فلک پر — کرتے تھے رشک انجم تیری چمک دمک پر
اقبال بن کے چمکا تھا تاجِ قیصری میں — بڑھ کر تھا چشمِ خوباں سے تو فسونگری میں
تیرے ہر ایک پرتو میں جلوۂ قمر تھا، — مرغوبِ دل تھا اک دن تو زینتِ نظر تھا
اب خاکِ رہ میں تجھ کو آلودہ دیکھتا ہوں — اس حال میں بھی تجھ کو آسودہ دیکھتا ہوں

گفتار میری سُن کر کہنے لگا نگینہ — چلنے دے جیسے چلتا ہے عمر کا سفینہ
خالق کے دستِ قدرت میں ہے عنانِ ہستی — اقبال اپنے بس کا ذلت نہ اپنے بس کی
مجھ جیسا سنگریزہ کیا ہوتا قابلِ دید — معدن میں پڑ گئی تھی مجھ پر نگاہ خورشید
پرتو نے جس کے مجھ کو جوہر بنا دیا تھا — اس خاک کے فلک پر اختر بنا دیا تھا

اب آشنا میں اپنی ہستی سے ہو گیا ہوں
اور اوج کے منازل طے کر کے سو گیا ہوں

محمود اسرائیلی

زال اور رودابہ

(ادبی فسانہ) (ادب لطیف)

(از جناب حافظ امام الدین صاحب امام اکبر آبادی)

تاریک رات کے منہ پر قیر کا غازہ ہے۔ ستارے ایک ایک کرکے پردۂ ظلمت میں چھپے ہوئے ہیں۔ ماہِ نو لاجوردی رنگ ڈوبا ہوا ہے۔ تاریکی نے تمام صحراؤں میں سیاہ فرش بچھا دیا ہے، دریاؤں اور سمندروں میں قیر کی موجیں ہیبت ناک سانپوں کی منہ پھاڑ رہی ہیں، آسمان پر سکوت طاری ہے، زمین قیر گوں چادر اوڑھ کر سو رہی ہے اور کائنات کی تمام فضا پر سکون طاری

اس خاموشی کے عالم میں، اور اس اندھیری رات میں، رودابہ ہمہ تن انتظار بنی بیٹھی ہے۔ اس کے سامنے ایک فانو ہے، جس کی ہلکی روشنی، ریشمی گلابی پردوں سے چھن چھن کر پائیں باغ کے لہلہاتے ہوئے سبزہ پر پڑ رہی ہے اس کے ہاتھ کی پشت انگشت پر اس کا رخسار ہے۔ اور اس کی منتظر نگاہیں ساکن و بے حرکت ہیں۔ رودابہ نے ایک آہ کی اور اس ساتھ اپنے رخسار کو حرکت دی۔ انگلیوں کے نشانات اس کے حسین رخسار پر اس طرح نظر آنے لگے جس طرح کسی آئینہ پر دیاقوت کے ٹکڑے جڑ دیے جاتے ہیں۔

دفعۃً سکون میں حرکت خاموشی میں اضطراب، اور سکوت میں زلزلہ پیدا ہو گیا، اور اسی کے ساتھ رودابہ۔ دونوں ہاتھ دراز ہو گئے، اس لئے کہ زال بہادر و دلیر زال دست بستہ پائیں باغ میں اس کے روبرو کھڑا ہے چاہ کہ بالا خانہ پر چڑھ جائے، لیکن بابِ حریم نازکی بندی سے یہ مجبور کھڑا ہے۔

رودابہ نے زال پر ایک مسرت آگین نظر ڈالی، اور ایک ہی گردشِ چشم میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو برسوں میں نہیں جا سکتا تھا، اسی کے ساتھ رودابہ نے اپنی دراز چوٹی لٹکا دی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو پکڑ کر اوپر چڑھ آ کہ یہ تار کے لئے میں نے پرورش کئے تھے تاکہ دوست کے کام آئیں۔

زال نے جوشِ محبت میں چوٹی کو اس زور سے چوما کہ چومنے کی آواز رودابہ کے کانوں نے سن لی، دفعۃً رود ریعانِ شباب میں برق دوڑنے لگی، اور اسی کا نشوۂ چشم خونِ صد میخانہ بن گیا۔

بہر نوع چوٹی نے کمند کا کام کیا، لیکن زال نے بجائے اس کے کہ اس سے کمند کا کام لیتا، اپنے گلے سے لپیٹ بیٹھ گیا۔ ٹھیک اس طرح جس طرح سنہری ناگن کوئی لپیٹ لے۔

ہاں بیشک یہی ہیں وہ بال، اور یہی ہیں وہ گیسو، جن کی تمنائے حصول نے میری روح میں جذباتِ زندگی پ

جن کی طلب کے جوش نے بیرونی حملہ آوروں کو شکست دی۔ دُنیا جانتی ہے کہ روم و بربر، شام و حبش، اور عرب و ہندوستان سے ہمیشہ ان گیسوؤں نے خراج لیا ہے۔ توران جو انکا حریف مقابل تھا ہمیشہ ناکام رہا۔ افراسیاب کے چراغ ہوس کو انہیں کالوں نے بجھایا تھا (بالوں کو ہاتھ میں لیکر اور چومکر) اور ہاں ارجاسپ نے انہیں زلفوں کے حلقہ میں پھنسکر ایک کمزور نحیف پرندکی طرح دَم توڑا تھا (رودابہ کی طرف دیکھ کر) اے میری روح کی مسرت! آج اور اس وقت ایک غریب، ایک بھکاری، جس کا نام زال ہے اور جو مدت سے اس انتظار میں تھا کہ وہ کبھی تیرے در تک پہونچکر........

ابھی زال پُورا جملہ نہ کہنے پایا تھا کہ دفعتہً سیٹی کی آواز آئی، جس کا مطلب یہ تھا کہ پہرہ دار رودابہ کے محل کے گشت لگا رہے ہیں، رودابہ نے فوراً نیم خوف و نیم طیش کی حالت میں زال کو اوپر چڑھا لیا۔ خلوت کا تاریک گوشہ روشن ہو گیا، اور رودابہ کو محسوس ہونے لگا کہ گویا اس کے خون کے ریشہ ریشہ میں بجلیاں دوڑ رہی ہیں۔ اس کی سانسوں میں سرعت، اس کے دل میں غیر معمولی حرکت، اور اس کے بدن میں ایک سنسناہٹ پیدا ہونے لگی،

کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟ زال نے کہا اور ایک لمحہ کے لئے کمرہ کی فضا پر سکوت طاری ہو گیا،

"اس سے قبل کہ تم مجھ سے کچھ کہو، تمہیں یقین کرنا چاہیے کہ جو جستجو مجھے ملاقات سے قبل تھی وہ اب نہیں شاید"

"اس کی وجہ یہ ہو کہ اس وقت تم میرے پاس نہ تھیں اور اب میں تمہیں اور تمہاری ہر چیز کو اپنی ہی سمجھ رہا ہوں"

"اور اس لئے شاید اب وہ لذت باقی نہیں"

"مرد در حقیقت عورت کے جذبات سمجھنے سے کسقدر قاصر ہے۔ شاید تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے، اگر تمہیں"

"یہ معلوم ہو جاتا کہ دنیا کی تمام لذتیں، عالم کی تمام دلفریبیاں اور کائنات کی تمام دلکشیاں، اس مسرت آگین لمحہ"

"کے بالعوض کوئی مجھے دینا چاہے، تب بھی میں ٹھکرا دینے کے لئے آمادہ ہوں۔ میری یہ گھبراہٹ و"

"پریشانی اس لئے ہے کہ میں اس وقت اپنے تئیں ایک آتشین ماحول میں دیکھ رہی ہوں، نہ اس لئے کہ"

"کسی انسانی صورت سے خائف ہوں"

"کوئی شک نہیں کہ عورت کے محسوسات کا اندازہ کرنا نفوس بشری کی فہم سے مافوق ہے کیونکہ اس زمین"

"پر عورت ہی ایک ایسی چیز ہے، جس کا بھید آج تک کوئی نہ سمجھ سکا۔ لیکن جس کو وہ چاہے راز آشنا"

"بنا سکتی ہے۔ البتہ جس سے وہ نظر پھیر لے، کوئی شک نہیں کہ فطرت بھی اُس سے نگاہیں بدل لیتی ہے"

"کیونکہ عورت ایک محبت ہے اور محبت خدا۔ پس جس چیز پر اس کی نگاہ ہوتی ہے، اسی پر خدا کی نگاہ ہوتی"

"ہے لیکن اس وقت میں ایک ایسے دور سے گذر رہا ہوں، کہ میں الطاف و قہر کی نگاہ میں تمیز نہیں کر سکتا"

"اور ہر خواہش سے اپنے تئیں مستغنی رہا ہوں"

"زودابہ نے یہ محسوس کرکے کہ "باوجود اس کے کہ زآل عورت کی تعریف و توصیف میں ہمہ تن مصروف ہے، لیکن پھر بھی اسوقت اس کی تمنائیں سرکش ہیں، اس کی آرزوئیں خود سر ہیں، اور اس کی خواہشیں مغرور ہیں، زآل پر ایک برق پاش نگاہ ڈالی، جس سے زآل کی روح میں ارتعاش تھی، اور اس کے خون کے دورہ میں ایک برق نامعلوم دوڑنے لگی۔ ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی اسی کیساتھ اس کے دونوں ہاتھ حلقہ کی صورت بن گئے، اور اب یہ اپنے احتساب جذبات سے بھی بیخبر ہوگیا"

دفعتہً صبح کے سفید بازوؤں پر سورج کی کانپتی ہوئی کرنیں زرنگاری کا کام کرنے لگیں۔ اور برگہائے رنگیں سے شبنم کے قطرے کافور ہونے لگے۔ لیکن زآل کا نہ ختم ہونے والا خواب سنگین قیامت کا خواب تھا، جس کی شیریں لذت سے وہ جاں بر نہ ہو سکا۔

جذباتِ باسط

جلوۂ محویتِ نگار تو دیکھ — نقشِ سجدات بیقرار تو دیکھ
آ مرا سینۂ فگار تو دیکھ — اپنی نظروں کا اختیار تو دیکھ
تیرے وعدہ پہ اور مجھ کو یقیں، — دیکھ یہ حسنِ اعتبار تو دیکھ
دیکھ لبہائے تر کی سے گوئی، — موج بادہ کا انتشار تو دیکھ
میرے جذباتِ دل نہ پوچھ مگر — تو مرا شوقِ انتظار تو دیکھ
عشق کا نام موت رکھتا ہے — اس فسانہ کا اختصار تو دیکھ

اہلِ دنیا کا کیا گلہ باسط
اپنے آئینِ ناگوار تو دیکھ

باسط بسوانی

قفس

کیوں ہوئی نابود اہلِ بزم کی ساری ہوس
کس لئے لانے لگے مینوش لبِ حرف بس

کس لئے جاتا رہا اصنام کی آنکھوں سے رس
کیوں ہوئی مفقود اہلِ عشق سے حرصِ مگس

جان دیدینا حسینوں پر کہاں جاتا رہا
کس لئے پھولوں کی رنگت میں رہا اب کچھ نہ رس

قیدیانِ زلف کی کیوں بیڑیاں کٹنے لگیں
کس لئے خالی کئے جاتے ہیں اب کنجِ قفس

رہروِ راہِ محبت کس لئے ہیں دم بخود
سامعہ کرتا نہیں کیوں منتِ بانگِ جرس

سازِ ہستی کس لئے مرہونِ خاموشی ہوئے
کیوں ترنم ریز اب ہوتے نہیں تارِ نفس

کس لئے افلاک پر تاریکیاں چھانے لگیں
روشنی اب کس لئے کرتی نہیں انجم سے مس

ایک سناٹا سا کیوں ہے دہر پر چھایا ہوا
کس لئے خاموش ہیں اہلِ جہاں چوں خار و خس

؟

بات یہ ہے عالمِ فانی سے قدسی چل بسا
اے زباں خاموش رہ اللہ بس باقی ہوس

شہزادہ قدسی

رنگِ معرفت

(از تازہ افکار شاعر نامی مولانا تجمل چشتی قادری مدظلہ العالی)

کیوں چشم و دل میں اور کوئی خوبرو رہے — دونوں ترے مکان ہیں دونوں میں تو رہے

رونق فروز خانۂ دل گر نہ تو رہے — بستی یہ کیوں نہ پھر صفتِ دشت ہو رہے

بس ہے اُسی کے واسطے جائز نمازِ عشق — خونِ جگر سے اپنے جو کرتا وضو رہے

ارمان ہے بسر ہو مری عمر اس طرح — دل میں خیال لب پہ تری گفتگو رہے

پردے میں رہکے بھی ہے تو ایجان خودنما — کیونکر بھلا نہ ذکر ترا چارسو رہے

ہمنے ہی نذرِ تیغِ ادا سر کو کر دیا — میدان قتلگہ میں ہمیں سرخرو رہے

آنے نہ پائے دل میں کسی دم خیالِ غیر — اے دوست تو رہے کہ تری آرزو رہے

پیرِ مغاں نے ہمکو حق آگاہ کر دیا — خوشحال کرکے بیعتِ دستِ سبو رہے

ہے سخت امتحانِ محبت کا معرکہ — رکھے خدا تو آج مری آبرو رہے

منظور ہے تو یہ کہ نظر آئے روئے دوست — مقصود ہے تو یہ کہ وہی روبرو رہے

سجدے کا لطف آئے ادا ہو نمازِ عشق
موجود سامنے جو تجمل کے تو رہے

اسلامی علم اخلاق

یعنے

اخلاق جلالی پر ایک نظر

(از جناب مظہر احمد صاحب ادھمی منشی ملا)

(۱)

جبکہ مشرق و مغرب کے مابین رابطہ تعلق برائے نام ہی تھا اور باہمی تعلقات میں شگفتگی کا پتہ بھی نہ تھا بلکہ رقابت اور ہمچشمی کا بازار گرم تھا۔ اس وقت یہ ایک طبعی امر تھا کہ مشرق مغرب کے نظام درس و تدریس کو باوجود اُس حقارت و نفرت کے جو ایک دوسرے کے قلب میں موجزن تھی بغور دیکھے اور وہ وجدان جو ایسے موقع کے انتظار میں رہا کرتا ہے ایک دوسرے کو اپنی طرف غیر محسوس طور پر مائل کر رہا تھا۔ گو عمرانی ترقی میں ایک کے ذخیرہ علم سے دوسرا استفادہ کرتا رہا مگر ان میں سے ایک کے بھی دل و دماغ میں ایک لمحہ کے لئے بھی مرہون منت ہونے کا خیال نہیں گذرتا تھا۔ البتہ قومی تعصب دن بدن پیدا ہوتا گیا۔ اور کوتاہ نظری ایک کو دوسرے کا خیر مقدم کرنے سے باز رکھتی رہی۔ اور دونوں قوموں کی برافروختگی بڑھتی ہی گئی۔ جس کی شہادت یورپ کے عہد وسطےٰ کی تاریخ سے کافی طور سے ملتی ہے۔

کورانہ تقلیدی بغض و عداوت سے بجز غیر منصفانہ تشکیک کے کوئی مفید اور قومی تحریک پیدا نہیں ہوتی اور نہ وہ اس تدریجی استفادہ کو جو ایک قوم دوسری قوم سے کرتی ہے روک سکتی ہے بلکہ اس سے خود کو نشانہ الزام و نفرین بنکر ایک حد تک اپنے ہی ہاتھوں نقصان پہونچاتا ہے۔ یہ نقصان اُس سے کہیں زیادہ مضر و مہلک ہوتا ہے جو کہ متخاصمین ایک دوسرے کو پہنچا سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ ایک طویل عرصہ تک پاپائے تعصب کا شکار بنا رہا۔

مغرب کو مشرق اور خاص کر مسلمانوں پر ایک قسم کا تفوق ضرور ہے مگر وہ اس نوعیت کا ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک متبحر عالم پر اُس کے اُس اُستاد کو جس نے اس عالم کامل کو حروف تہجی سکھلائے تھے حاصل ہو۔ لیکن میں تو اس برتری کو بھی ایک حد تک مشکوک سمجھتا ہوں۔ کیونکہ جہاں سکندر جواہرات کے صندوق لاد کر لے جاتا ہے وہاں ایرانی علم و فضل کے خزانے

ہی ساتھ لیجاتا ہے۔ پس مشرق نے مغرب کو جو قرض دیا تھا اُس کو مع سود وصول کرنے کا مستحق تھا۔ جس میں سے ذرا اصل بھی تو پورا نہیں ملا۔

مجھے ڈر ہے کہ کہیں علم اخلاق کے شیدائی جن کے زیر مطالعہ جلالی و ناصری رہا کرتی ہیں، میری اس صاف گوئی پر اظہار ناراضگی فرماتے ہوئے یہ اعتراض نہ جڑ دیں کہ علم اخلاق مغربی متاع نہیں ہے بلکہ وہ مشرقی دولت ہے اور یہ کہ اس کے کٹے ہوئے نشانات یونان میں ملتے ہیں مگر میں جواباً یہ عرض کروں گا کہ اگر وہ تمام کتاب ٹھنڈے دل سے تحقیقی نظر کے ساتھ مطالعہ کریں تو پھر ان کو میرا ہم خیال بننا پڑے گا۔ گو اس سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمنے مغرب کے اُن ہاتھوں سے لیا جن سے اصنام کی بو آتی تھی مگر بہ نظر انصاف کہے گا کہ اس میں سے بھی اصنام کی بو آتی ہے اور یونانیت کا کہیں پتہ بھی ہے اور موجودہ علم اخلاق کیا جزوی اور کیا کلی اعتبار سے یونانی ہو سکتا ہے غالباً اس کا جواب نفی میں دینے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آئیگا۔ خاص کر جبکہ آنحضرت صلعم اپنے رسول بنائے جانے کی غرض و غایت صرف اخلاق نیک کی تکمیل ظاہر فرماتے ہوں ارشاد فرماتے ہیں بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔

یورپ کا یہ نظریہ مسلمہ ہے کہ ہر خوبی کو اپنی طرف اور برائی کو مشرق کی طرف نسبت کریں اور اس کا علاج ہی کیا ہو سکتا ہے کہ یورپ کی ہر صدا پر لبیک کہنے والے اس کو فوراً بلا دلیل یورپی تسلیم کر لیں لیکن ایک منصف نظر اس امر کا کافی طور سے اندازہ لگا سکتی ہے کہ اسلامی ضرورت نے اگر کچھ لیا بھی تو اس میں اور چار چاند لگا دیے مگر اس کا کیا کیا جا سکتا ہے کہ یورپ ہمیشہ مسلمانوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں غلطی پر رہا ہے اور ہمیشہ مسلمانوں پر بے بنیاد الزام عائد کئے ہیں۔ حالانکہ اُس کا دامن بھی اس قسم کے الزامات سے پاک نہیں مگر اُس کو اپنی آنکھ کا تارا نہ تو کبھی نظر آیا ہے اور نہ اُس کی امید کی جا سکتی ہے۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیں کہ مسلمانوں کا علم اخلاق جوں کا توں یونانی اور مغربی ہے۔ تب بھی اس رائے کو تبدیل کئے بغیر چارہ کار نہیں۔ چونکہ دنیا ہمیشہ اپنی رفتار میں ترقی کرتی رہی ہے۔ اور جو چیز کسی عہد میں ایجاد ہوتی ہے وہ وقتی ضرورت کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے اور وہ علم اخلاق جس کا کہ جلالی درس دے رہا ہے وہ ایک ترقی یافتہ قوم کے ضروریات و عادات اور اطوار کے بالکل مطابق ہے اور وہ خیالات جس کی کہ وہ تعلیم دے رہا ہے بالکل اسلامی ہیں ایسی صورت میں مغربی تفوق کا سوال باقی ہی نہیں رہتا۔

مسلمانوں کا یورپ و نیز مشرق کے دیگر اقوام کے ساتھ اس قدر جنگ و جدل رہا ہے کہ یورپ مسلمانوں کی ہر خوبی کو معترضانہ نظر سے دیکھتا اور روشن پہلو کو بھی تاریک کر کے دکھلاتا ہے جبکہ اپنی ہر ایک غلطی پر پردہ ڈالتا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آٹھویں صدی سے لیکر سولھویں صدی تک مسلمان یورپ کو انگلیوں پر نچاتے رہے ہیں، ترکی اور مصر کی سلطنتیں ان کے

فوجی مرکز تھے جس نے عیسائی دُنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس لئے یورپ مسلمانوں پر بربریت اور جہالت کا الزام عائد کرتا رہا ہے۔ مسلمان اُن کے اس حملہ کا جواب اپنی حکمت آمیز خاموشی کے ساتھ دیکر اُن کو غلط اور کم ثابت کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کو جا جو کچھ ملا اُس کو چاروں طرف سے سکوت کے ساتھ فراہم کرتے رہے۔ کیونکہ اس عہد میں یورپ کا تدریس لٹریچر ذلیل اور ہیچ میرز تھا۔ مسلمان نہایت خاموشی و متانت کے ساتھ دنیا کی مختلف اقوام کے علوم و فنون کو جمع کرتے اور معراج کمال پر پہونچا کر اپنی دماغی جسمانی اور اخلاقی ترقی کا آلہ بنانے میں منہمک رہے۔

مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ مظاہر علوم سے معرّا ہے لیکن اُن تغیرات پر ذرا نظر ڈالو جو انہوں نے آن کی آن میں کر دیئے اور اُن نتائج پر بھی ایک سرسری نظر دوڑاؤ جو انہوں نے اس یورپ کی مستعار ذات سے نکالے۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں پر کسی قسم کا الزام عائد کرنا ایک اخلاقی جرم ہے کیونکہ وہ علم اخلاق جسکو مسلمانوں نے پیش کیا ہے وہ یورپ سے مانگا ہوا نہیں ہے بلکہ اُن جودت طبع اور بلند اقبالی کا نتیجہ اور کامل مرقع ہے جس کی نظر عالم کی دوسری اقوام پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام میں علم اخلاق کا سنگ بنیاد قرآن نے رکھا ہے کیونکہ قرآن شریف میں ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

یہاں پر پاک کرنے سے مراد اخلاق رذیلہ سے پاک کرنا ہے اور نیز رسُول اکرم کا ارشاد ہے اسلام اخلاق نیک ہے ایمان کامل تر اُن کا جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ کمال ایمان حسن خلق ہے عبادت سے حسن خلق افضل ہے۔ یہ وہ تحریک ہے جس نے مسلمانوں کو علم اخلاق کی ترتیب پر مائل کیا۔

(۲)

سلطنت عثمانیہ اپنی زندگی کے ابتدائی مراتب طے کر رہی تھی کہ اُس کے بہادرانہ حملوں نے یورپ کو ہلا دیا لیکن قبل اس کے کہ وہ یورپ کے بہترین اور خوشنما صوبوں کو اپنے زیر نگین کرلے ایشیا کے وسط میں ایسی طاقت پیدا ہوگئی جس نے اس کی بڑھتی ہوئی ترقی کو روک ہی نہیں لیا بلکہ اُس کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ایشیا کی وسطی سلطنت میں امیر تیمور نے اپنی شجاعانہ کامیابیوں سے اُس شیرازہ کو جو سالہا سال سے منتشر ہو رہا تھا مجتمع کر دیا وہ یا اُس کے جانشین مثل مرزا بابر[۵] شاہ سیفر و مرزا ابوالقاسم و مرزا شاہ محمود و سلطان سعید گورگان و غیرہ وغیرہ ایشیا میں علم فرمانروائی بلند کر رہے تھے جن کے ایک ہاتھ میں اگر تلوار تھی تو دوسرے ہاتھ میں علم و عمل کا دفتر چا کچھ

۵؎ آثار عجم صفحہ ۳۰۹۔

حسن بیگ ابن امیر علی جوکہ آق قونیلو ترکوں میں سے تھا اور آذربائجان-عراقین-فارس-اور کرمان کی حکومت کی مسند پر پندرھویں صدی کے اخیری نصف حصہ میں جس کو کہ ایران کا زرین و ادبی دور کہنا چاہیئے متمکن تھا جس کا عہد حکومت اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ اس زمانہ کے بادشاہ صرف علم دوست ہی نہیں تھے بلکہ وہ خود علم و فنون کی باکمال ہستیوں میں شمار کئے جاتے تھے مثلاً الغ بیگ شاہ کابل صرف فرماں روا ہی نہ تھا بلکہ ایک زبردست منجم بھی تھا اور اس طرح امیر حسن[51] بیگ جوکہ سنہ ۸۸۲ھ میں عاقلانہ حکومت کے بعد اس دنیا سے چلتا ہوا ایک اچھا خاصہ شاعر اور مضمون نویس تھا، چنانچہ ذیل[52] کا شعر اُسی کے کلام کا نمونہ ہے ؎

جانا جفا برائے وفا میکشیم ما
ترک وفا مکن کہ جفا میکشیم ما

یہی وجہ تھی کہ اس کے دربار نے علم و فضل کی انتہائی سرپرستی کرکے میر محمد ہاشم[53] خواجہ رضی الدین احمد جامی، مولانا قطب الدین احمد آدم-اور مولانا کمال الدین حسین الواعظ جیسے کم از کم پچاس زبردست عالم و فاضل اپنے دربار میں جمع کئے جوکہ پاکیزگی خیال اظہار مطالبہ اور فصاحت بلاغت میں اپنی نظیر آپ تھے اور وہ فیاضی جو علم ادب کی سرپرستی میں برتی گئی اُس حد کو نہ پہونچتی تھی کہ جس کے نتائج آخر میں مضر اور مہلک ثابت ہوں جبکہ اس عہد کے اور گورگانی شہزادے اپنا اپنا شاہانہ اقتدار قائم رکھنے کے لئے آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ اور رعایا کو عاقلانہ علمی دلچسپیوں میں مصروف رکھنے کے بجائے ظاہری ٹیم ٹام میں منہمک کئے ہوئے تھے اسی وقت ایشیا کے جنوب و مغرب کی سرحد پر قدیم فلسفہ کے پیرو اپنا علم فلسفہ بلند کر رہے تھے جس نے خاص قابلیت اور اہمیت کے آدمی پیدا کئے انہی میں سے حسن بیگ بھی تھا جس کو کہ امیر تیمور نے بذات خاص صوبہ عراق کا حاکم مقرر کیا تھا جس نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے سنگین کوششیں نہ صرف نام ہی کے لئے کیں بلکہ بہت سے دوام پذیر اور علمی اور علمی یادگاریں قائم کیں۔

تخت جو کہ قرب و جوار کے متخاصمین فرمانرواؤں کے اثر سے ڈگمگا رہا تھا اس کو اپنی عمر کے آخری حصہ میں قائم و برقرار رکھنے کے لئے بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ باوجودیکہ یہ سلطنت چھوٹی سی تھی مگر اس کی روشن دماغی نے اپنی برتری اور علو مرتبت کا خراج ایشیا کے بڑے بڑے بادشاہوں سے وصول کیا[54]۔ کیونکہ اس کی عادت تھی کہ ایک ہی گورنر کو ایک ہی صوبہ میں عرصہ دراز تک نہیں رکھتا بلکہ ہمیشہ چار پانچ آدمیوں کو شریک حکومت کرکے ایک مجلس کی شکل قائم رکھتا تھا کم سے کم ایک کام میں دو آدمیوں کو ضرور شریک کر دیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے عہد حکومت

---

[51] آثار عجم صفحہ ۲۷۹
[52] تذکرہ آتشکدہ مجرہ اول
[53] روضۃ الصفا جلد ششم
[54] روضۃ الصفا حالات عمال و وزرا جلد ہفتم

میں ۱۴۸۰ء ھ میں فنا کو تبدیل کیا جس میں سب سے اول قطب الدین طاؤس سمنانی اور سب سے آخر خواجہ جلال الدین عطاء اللہ تھا۔ اُس کو اپنے دورِ حکومت کے ابتدا ہی میں تُرکمان بادشاہوں سے جنگ کرنا پڑی جس میں سے ایک کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ لیکن اُس کے ساتھ ساتھ اُس کو محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کے حملوں کا خوف ہر وقت لگا رہا لیکن اُس کی عاقلانہ طرزِ حکومت نے اس کا موقع ہی نہیں دیا اس میں شک نہیں کہ اگر اس کی زندگی وفا کرتی تو جلالی کے وہ الفاظ جو اُس کی مدح میں لکھے ہیں واقعہ کے مطابق ثابت ہوئے بغیر نہ رہتے۔

اس بادشاہ کی علمی سرپرستی اور قیاس بالمشابہ کی بنا پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ علمی و ادبی حیثیت سے یہ زمانہ زرین تھا۔ کیونکہ سیاسی اعتبار سے جو واقعات و حالات اُس زمانہ میں ساری و طاری تھے اُس نے اخلاق جلالی جیسی مبارک کتاب کو پیدا کیا۔ یہ ایک ایسی زبردست تالیف ہے جو اپنے مضمون کی اہمیت۔ آتش بیانی اور زبان کے اعتبار سے فصاحت و بلاغت میں نہایت بلند پایہ رکھتی ہے اور باوجود لٹریچری دلچسپیوں کے دربار میں ایک ہی تو ایسا نکلا جو اس کی ہمسری کرتا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ حیاتِ ابدی و سرمدی ہمیشہ قلم کے ہی حصہ میں رہی ہے اور فنا تلوار کے حصہ میں چنانچہ حسن بیگ کو ہمیشگی کی زندگی کا جام اخلاق جلالی نے ہی پلایا ہے جبکہ اُس کے ساتھ ہی ساتھ اُسکی زبردست فتوحات قبر میں جا سوئیں۔ سچ ہے ع

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعلم

گو کہ اس عہد نے کاشفی اور سہیلی جیسے آدمی پیدا کئے مگر اخلاقِ جلالی جہاں ایک طرف پاکیزگیٔ خیالات کی مخلوق کو تعلیم دیتی ہے تو وہ دوسری طرف مدبرینِ سلطنت کو قانونِ حکمت سکھلاتی ہے اور مدارس کا اخلاقی بازار اسی سے گرم ہو رہا ہے مگر کاشفی اور سہیلی کی فصیح تالیف مکتبوں کی زیبائش رہ گئی ہے۔

(۳)

وہ اشخاص جو کہ انسان کی تدریجی و جانکش ترقی سے باخبر ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ایک منفرد ہستی زمانہ کی اُس سے زیادہ مرہونِ منت ہے کہ زمانہ کسی منفرد ہستی کا وہ اُس تصنیف کی طرف جو اصلی و ابتدائی ہونے کا فخر نہیں رکھتی کچھ کم راغب ہونگے کہ کسی مؤلف و مصنف یا کسی زمانہ کا علم جس کو کہ ذاتی ایجاد کہا جا سکے۔ ایک ایسا سوال ہے جس کا کسی اور موقع پر ذکر کیا جائیگا فی الحال اس بات پر ہی غور کرنا کافی ہوگا کہ کم از کم موجودہ یورپ نے انسانی بہبودی و خوشی کے مسئلہ کو حل کرنے میں اسقدر جد و جہد کی ہے کہ گذشتہ دُنیا کی تاریخ نظیر نہیں لا سکتی۔

زندگی و احساس کے تغیرات متواترہ کے مستقل ترقی و تندہی نے زمانہ کے لئے بہت سے ایسے اصول پیدا کئے

ہیں جو انسانی زندگی کے لئے راہِ ہدایت ہوگئے ہیں پس ایسی صورت میں عام طور سے وہ مضامین جن کی طرف ہم اپیل
کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اُن میں سے ایک اخلاقِ جلالی بھی ہے۔ گو یہ تصنیف ایجادی و اختراعی نہیں ہے تاہم وہ
ل مضامین جس پر کہ اس میں بحث کی گئی ہے۔ اُن کے لئے یہ ایک بہترین و اہم ترین رسالہ ہے۔

علم اخلاق کا ترغیب و تعلیمات مذہبیہ سے نہایت ہی قریبی رشتہ ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی دنیا کے خیالات اپنی
رقی کے ابتدائی دَور میں ہے اسی کے طرف مائل ہوگئے تھے کیونکہ مفید علوم و فنون کی طرف لوگوں کو ترغیب و تحریص
دلائی اور اُن کا رواج دیا جاتا تھا۔ بشرطیکہ وہ انسانی تہذیب و اخلاق میں معاون و مددگار ہو سکیں۔ اس وقت جبکہ
ایک ایسے اصولِ معاشرت کو جس کے لئے قرآن و احادیث سے استشہار نہ کیا جاسکے، الحاد خیال کیا جاتا تھا۔
سلمانوں کی ذکاوت فلسفہ کے اس ملحدانہ معیار کو گھٹا دینے میں مصروف تھی۔ جو اس فرض و غایت سے بالکل ہی مختلف
ی جو اس سے سمجھے گئے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے ایک قسم کی باریک اصطلاحی تفریق نے پیدا ہو کر فلسفہ میں ایک
طم برپا کر کے ایک غیر محسوس طور سے اس کے عمل و فعل کو غیر مؤثر ہی نہیں کر دیا بلکہ اس سے بتدریج ایک اور سادہ صحیح
یقہ وجود میں آگیا جس کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس طریقۂ عمل اور مفروضات کا تیقن کر دے جو انفرادی و اجتماعی
رتوں میں مفید مطلب اور دلچسپ ثابت ہو سکے۔ چنانچہ علم اخلاق و فلسفہ کے بتدریجی ترقی کی شہادتوں سے اس امر کو
لیم کرنے میں چون و چرا کا موقع ہی نہیں رہتا ہے کہ اس طرز نے فلسفہ میں شعارِ اسلامی کو آہستہ آہستہ داخل کیا اور
طریقِ عمل کو دنیا کے ذہن نشین کر دیا۔ اور وہ اس میں کامیاب اس وجہ سے ثابت ہوئے کہ مسلمانوں نے زندگی کے لئے
ب اخلاق کو دو جداگانہ اصول قرار دیئے تاکہ ان دونوں میں تصادم واقع نہ ہو اور اس طور سے اپنے پیش رو بنزاں نائن
[illegible]) یونانیوں کے خیالات اور علم و عمل کو اختیار کرنے میں اور معیارِ عمل بنانے میں کوئی
ا پیش نہ آئی

بت پرست فلسفیوں کی تالیف اس قوم کی زندگی کا قانونِ عمل بن گیا جس نے کہ نصف عالم کو صرف اس غرض سے مسخر
اصنام پرستی کو مفقود کر دے نہ صرف ابو نصر اور ابو علی سینا جیسے مسلمہ اُستادوں نے ہی نہیں بلکہ مختلف صوبجات کے چھوٹے
ے کواکب علم و فضل نے بھی یونانی اُستادوں کے طریقے پر ایسے رسائل کی کوشش کی جو کہ اُن کے معاشرت کی ضروریات
ہی خصوصیات سے پوری طور سے موافق ہوں۔
سب سے کامیاب کوشش جس نے مختلف افراد کی سعی کو ایک مرکز پر جمع کر دیا ہو وہ یہی تالیف ہو سکتی ہے جو ہمارے

سامنے موجود ہے اس کتاب کو ابو علی مسکویہ کی کتاب الطہارت سے جو کہ دسویں صدی میں لکھی گئی ہے خاص طور پر اخذ کیا گیا ہے
جس میں افلاطون و ارسطا طالیس کے فلسفہ کا مغز و نچوڑ کو عملی پہلو سے دکھلایا گیا ہے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس میں شک و شبہ
نہیں رہتا ہے کہ مصنف یا وہ جس نے اس سے استفادہ کیا ہے وہ ادنیٰ ترین اصول سے لے کر اعلیٰ ترین تک سب سے
پوری طرح واقف تھا۔ دو صدی کے بعد اخلاق ناصری کے نام سے اس کا ترجمہ فارسی میں نصیر الدین طوسی نے کیا جس
اس نے ایک نہایت ہی اہم اضافہ جو پولیٹکل اور خانگی حالت کے متعلق کیا ہے۔ جس کو کہ اس نے پہلے ابو علی سینا سے
ابو نصر سے لیا۔ یہ دونوں یونانی فلسفۂ قدیم کے نہایت ہی ممتاز استاد تھے یہ اصلاح شدہ تالیف تین سو برس کے بعد
دماغی سعی کے اضافے کے ساتھ بعد نظر ثانی کرکے ایک ایسے مصنف ([illegible]) نے جس کے غیر مخصوص
آج نامعلوم ہیں اخلاق جلالی کے نام سے شائع کیا۔ پہلا نتائج محصلہ کے مقابلہ میں اصول سے زیادہ بحث کرتا ہے کہ
یہی بات اس کی ذاتی اعتقاد کی قوت و طاقت صاف طور پر مجتمع نظر آتی ہے اور وہ ان یقینیات پر جو دوسروں سے حاصل
ہوں بہت کم اعتماد کرتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ اطلاعات پر ایک باریک نظر رکھتا اور اپنی ذاتی مفاد کو قربان کرنے
میں بہت باخبر ہے۔ دوسرا نتائج پر جو کہ اصول سے حاصل ہوں پہنچنے کی جلدی میں اساسی اصول سے سہل انگار
ہوا قرا کے دل و دماغ کو ایسے پس و پیش میں ڈالدیتا ہے جس کا اس کے دماغ میں پتہ تک نہیں ہوتا۔ وہ ان اسرار سے
دوسرے کے دماغ کی رسائی بہ مشکل ہوتی ہے پورے طور سے باخبر نظر آتا ہے اور ان کو سرگرم فصاحت سے فرا
ہوا آگے بڑھا چلا جاتا ہے۔ جہاں دوسرا آزادی کے ساتھ چکر میں آجاتا ہے۔

جلالی کا پُر جوش اور آزاد طرز بیان اور مضمون کی بلند پروازی اور اس کو آسمان ترقی پر پہنچانا ایسی ایسی خصوصیات
جو جلالی کے محنت کی داد نہ صرف اُسکی قوم سے بلکہ دوسری اقوام سے بھی لئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ اور جوں جوں زمانہ ترقی کریگا اس کی قدر و
منزلت اور بھی زیادہ زیادہ ہوتی جائیگی۔ لیکن اس سے ذرا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو صداقت کی قدر و قیمت صرف
ذاتی خوبیوں کی وجہ سے سمجھتے ہیں وہ اس کی ہر حالت میں قدر کریں گے خواہ وہ کیسی ہی لباس میں کیوں نہ پیش کی جائے
نظر میں ناصری کی قدر و قیمت زیادہ ہوگی اور وہ اس کو دلچسپ نظروں سے دیکھیں گے۔ لیکن بعض طبائع ایسی ہیں
کہ جن کے لئے محرک اور مصلح اشیاء درکار ہوتی ہیں۔ اور جلالی ہمارے دل و دماغ میں گرمجوشی اور احساس پیدا
اور وہ گہری عزت و مرتبت جس کے ساتھ علوم کا احاطہ کرتی ہے اور وہ مسرت و جوش بیان جس سے کہ وہ یہ دہ کو دکھا
تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ روم کا مشہور مقرر سیسرو چمک رہا ہے۔ اور جب یہ اپنی زبان کھولتا ہے تو صرف ہر بات کا یقین ہی
ہے بلکہ ایسی بات سُناتا ہی جسکی "صدائے بازگشت سارے عالم میں پھیل چکی ہے"

(باقی)

راز بقا

تجھے گر جستجوئے مدعا ہے — تری ہستی کا میں مقصد بتا دوں
اگر تو سعی حاصل چاہتا ہے — تو میں وہ کوششیں بیحد بتا دوں

پڑا ہے آہ تو کن پستیوں میں — حقیقت سے بہت ہی دور ہے تو
سمجھ لے خوب ان سرمستیوں میں — اس آزادی پہ بھی محبوس ہے تو

فضاؤں کی جو یہ رنگینیاں ہیں — تو سمجھا ہے کہ ان میں ارتقا ہے
یہ سب آنکھوں کی کوتہ بینیاں ہیں — ترا مقصود ہی کچھ دوسرا ہے

تو کیوں ہوتا ہے مایوسی سے بیدل — تری ناکامیاں ہیں کامیابی
نہیں تجھ کو تمیز نیک باطل — ترے احساس کی ہے سب خرابی

ہے تو بے چینیوں سے کیوں پریشاں — فراوانیِ غم سے ہاؤ ہو، کیا،
یہ سب بن جائیں گی تسکیں کا ساماں — سکونِ قلب کی ہی جستجو، کیا،

تجھے کیوں خوف ہے کم وسعتی کا — ہے تری خاک کا ہر ذرہ ایمن
تجھے غم کیوں ہوا بے مائیگی کا — تری ہستی کا ہر دانہ ہے خرمن

تو بس ہستی کے مقصد کو سمجھ لے — غم فردا و دے سے فائدا کیا
تو اپنی سعی بے حد کو سمجھ لے — رضائے یار میں چون و چرا کیا

تو دل سے پردۂ غفلت اُٹھا کر — فلک سے دور دیکھ اپنی بلندی
تو کر احساس پیدا اپنے اندر — تری فطرت میں ہے رفعت پسندی

تو کر لے تکملہ سوزِ دروں کا، — یہی ہے راز تیری ارتقا کا
فنا کے راز سے آگاہ ہو جا — یہی اک رمز ہے تیری بقا کا

تو جبتک پستیوں ہی میں پڑا ہے — قدم روکے گی ہر تقصیر تیرا
ضیائے مہر مہ کیا دیکھتا ہے — ہے مقصد مرکز تنویر تیرا

نظر کو آشنائے راز کر لے — طلسم رنگ و بو کیا دیکھتا ہے
تو دل کو وقف سوز و ساز کر لے — یہی رازِ حصولِ مدعا ہے

جہاں کا راز ہے ہستی میں تیری — تنِ عالم کی گویا جان ہے تو،
ہے راز ارتقا پستی میں تیری — خبر بھی ہے تجھے "انسان" ہے تو

کیفؔ مرادآبادی

حکمت عملی

اخلاقیات

(جناب یسین محمد صاحب انجنیر اجینی)

دُنیا کی ترکیب اور انسان کی خلقت کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک و بد راستہ کا اختیار کرنا انسان کی مرضی اور انتخاب پر مُحوّل ہے۔ انسان دنیا میں اس طرح نہیں بھیجا گیا جیسے ایک سمندر میں کوئی تنکا پڑا ہوا ہو کہ پانی کی لہریں جہاں چاہیں اُسے بہالے جائیں بلکہ وہ دُنیا کے سمندر میں ایک ماہر تیراک کی طرح تیرتا ہے اور اپنی سعی سے جس طرف چاہتا ہے جاتا ہے، پانی کی لہریں اُس کی مزاحمت کرتی ہیں لیکن یہ بھی اُن کا مقابلہ کرتا ہے اور جدھر دل میں آتا ہے اپنا رُخ پھیر دیتا ہے۔

مبدء فیاض نے عقل و شعور اور جو قوتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں اُن کو اگر صحیح طور پر کام میں لائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو دنیا میں ایسی صدہا مثالیں موجود ہیں کہ جو لوگ پہلے جاہل، بدکار، اور بدسلیقہ تھے کسی سبب سے اپنی برائیوں سے مطلع ہو گئے اور تلافی مافات کی کوشش کی تو وہی عالم نیک کردار، اور ہنرمند بن گئے۔

انسان جب کسی فعل کا خوگر ہوتا ہے اور اس کے خلاف قانون جاری کر دیا جاتا ہے تو وہ اس سے پرہیز کرنے لگتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار ہے، عادت اور خواہش اُس پر قادر نہیں بلکہ اس کی محکوم ہیں بشرطیکہ وہ اُن کو قابو میں رکھنا چاہے، اگر کوئی شخص خود ہی اپنی باگ خصائل ذمیمہ کے ہاتھ میں دیدے تو یہ اُس کا اپنا قصور ہے بلکہ انسان جب کسی فعل بد کے ارتکاب کا عزم کرتا ہے تو اس کا کانشنس (ضمیر) اُسے ملامت کرتا، اس فعل بد سے روکتا؛ اور اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر بچنا اور احتراز کرنا اختیار میں نہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ طبیعت میں بھی افعال ذمیمہ سے بچنے کا فطری تقاضا ہوتا، طبیعت انسانی خود جانتی ہے کہ اس میں اجتناب و احتراز کی قوت ہے اگر انسان آنکھ بند کر کے کنوئیں میں گر پڑے تو اس کا ذمہ دار وہ آپ ہے۔

جن انسانوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے وہ اپنے اعمال و افعال کی جانچ کیا کرتے ہیں اور نیک و بد میں ہوتے رہتے ہیں اور اسی دھن میں لگے رہتے ہیں کہ نیکی اور صداقت سے متصف ہونا چاہئے اس سعی و کوشش میں لگے

ہوئے رہنے سے طبیعت کو ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی ہے، اکثر انسان اپنی تصویر کے صرف ایک ہی رُخ کو دیکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بین و خود پسند ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ دونوں رُخ دیکھیں تو علاوہ محاسن کے اپنے عیوب بھی اُن کو نظر آئیں اور اصل حقیقت آئینہ ہو جائے اس کے بعد انسان اپنے نفس کی اصلاح اور اپنے افعال کو منظم اور باقاعدہ کر سکے گا۔

وہ اہل بصیرت جو اپنے عیوب کی خود نگرانی اور دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں اپنے تئیں ایسے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں کہ دوسروں کو نکتہ چینی کی گنجائش ہی نہیں رہتی اور اپنے اعمال و افعال کی خود اصلاح کرتے رہتے ہیں اسی طرح انسان کو اپنے حال پر غور و فکر کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔

لیکن ابتدائی حالت میں یہ کیفیت ایسی کافی نہیں ہوتی کہ انسان اسی پر اکتفا کرے اور نہ اس سے اس قدر فائدہ پہنچتا ہے جتنا کہ پہنچنا چاہئے ابتداءً اپنے کسی فعل کی اصلاح کا خیال کرنے کے لئے بڑی اولوالعزمی اور بہت بڑی جرات کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس میں جسقدر انسان کو تکلیف ہوتی ہے اس کی بہ نسبت فائدہ بہت کم معلوم ہوتا ہے اگرچہ فائدہ ہوتا ضرور ہے مستقل مزاج آدمی جو قول کے سچے اور دُھن کے پکے ہوتے ہیں ان تکالیف سے شکستہ خاطر نہیں ہوتے نہ وہ ایسی ادھوری اصلاح پر قناعت کرتے ہیں بلکہ محاسبۂ نفس کی عادت کو زیادہ مستحکم اور زیادہ پائدار بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب تک اپنے نفس کی بالکل اصلاح و درستی نہیں کر لیتے کوشش کرنے سے باز نہیں آتے۔

فرض کیجئے کہ کسی ایسے شخص سے جو اپنے نفس کی اصلاح میں مصروف ہو کوئی لغزش ہو جائے اور ضمیر اس ناشائستہ حرکت پر اُسے ملامت کرے تو اُسے سخت صدمہ ہوگا اس موقع پر وہ اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لے گا کہ وہ پھر کبھی اس فعل کا مرتکب نہ ہوگا لیکن اپنے نفس کے امتحان کے لئے وہ ایسے موقع کا منتظر رہے گا کہ نفس شہوانی یا غضبی کی سرکشی کے باوجود اپنی طبیعت پر قابو رکھ سکے اور جب وہ اس قابل ہو جائیگا کہ قوائے شہوانی و غضبی کے حملوں کی پوری طرح مدافعت کر سکے اور طبیعت پر ان کا کوئی بُرا اثر نہ ہو سکے تب اس کی اصلاح کامل سمجھی جائے گی اس وقت انسان کی روحانی کیفیت کا درجہ نہایت ارفع و اعلیٰ ہو جاتا ہے اور پھر وہ نیک و بد میں امتیاز کر سکتا ہے اور تخیلات فاسدہ کا اس پر قابو نہیں چل سکتا۔

جب انسان میں روحانی طاقت کی نشو و نما ہونے لگتی ہے اور وہ خصائل حمیدہ کی عادت ڈالتا ہے اُسوقت ملکات ردیہ کا مقابلہ اور ان کے دور کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور فضائل کی تکمیل کے ساتھ ساتھ رذائل کی بیخ کنی بھی ہوتی جاتی ہے۔ بالآخر رذائل سے ایک نفرت سی ہونے لگتی ہے اور وہ متعجب ہوتا ہے کہ ابتک ایسے مذموم و بدترین خصائل کا اس پر کیونکر قابو رہا۔

جس قوت کے ذریعہ انسان کے افعال میں اتنا بڑا تغیر پیدا ہو گیا وہ حکمت عملی یا عقل فعال ہے جو انسان کو یہ سمجھاتی ہے کہ جو وسائل اور اسباب اُسے دنیا میں حاصل ہیں ان سے کوئی کام بطریق احسن کیونکر لیا جا سکتا ہے یہ قوت انسان کی دیگر تمام قوتوں کو مناسب درجہ پر اور اُن میں انتظام اور ترتیب قائم رکھتی ہے یہ قوت انسان کو بتاتی ہے کہ اس کا درجہ کیا ہے اور وہ دُنیا میں کیا کیا کر سکتا ہے، حکمت عملی انسان کو اپنے فرائض کی ادائیگی پر مجبور کرتی ہے (جو اس وقت درپیش ہوں) اور اسکی مدد سے انسان خیالی اور موہوم خوش آئند حالات کا انتظار نہیں کرتا نہ تأسف و حسرت کے عالم میں اپنے زور و قوت کو ضائع کرتا ہے بلکہ حالت موجودہ کو خوشگوار اور دل پسند بنانے کی کوشش کرتا ہے عقل فعال کسی خاص قوت کا نام نہیں ہے بلکہ انسان کی مختلف قوتوں کے ملکر کام کرنے کا نام ہے اس کا بڑا کام یہ ہے کہ وہ راست و غلط میں تمیز کرنا سکھاتی ہے اس صورت میں اس کو قوت تمیز بھی کہتے ہیں۔

راست و غلط دو ایسے لفظ ہیں جن کی صحیح حقیقت معلوم کرنے پر تمام اخلاق کی بنیاد قائم ہے اگر صحیح و غلط کی تمیز نہ ہوتی تو دیگر حیوانات کی طرح انسان خواہ کچھ ہی کرتا اس کے لئے جائز ہوتا اور دنیا میں حسن و قبح، بھلائی اور بُرائی نیک نامی و بدنامی، ایسے الفاظ ہوتے جن کے کوئی معنی نہ ہوتے لیکن قوت تمیز صحیح و غلط، جائز و ناجائز میں امتیاز کرنا سکھاتی ہے اور ایک کام کو اختیار کرنے اور دوسرے کو ترک کرنے کا حکم دیتی ہے، راست و غلط میں تمیز کرنا اور اخلاقی اصول پر کاربند ہونا خود انسان کا کام ہے۔

بعض اوقات طبیعت کا اقتضا مختلف رجحانات پیدا کر دیتا ہے لیکن جن کے دل نور حکمت سے معمور ہیں وہ تمام جذبات عقل کے تابع رکھتے ہیں اور عادت و خواہش کے محکوم نہیں ہوتے بلکہ اُن پر حکمرانی کرتے ہیں۔

انسان کی زندگی ایک مدرسہ ہے جس میں وہ روزانہ نئے نئے سبق اور تجربے حاصل کرتا ہے اس مدرسہ کے معلم گوناگون افکار، بڑے بڑے امتحانات، نئی نئی دقتیں طرح طرح کی تکالیف اور قسم قسم کے مشکلات ہیں جو پرہیز گاری، عزمیت نامہ، ہمت، قناعت، اور خدا پرستی سکھاتے ہیں۔

انسان کو اپنی نسبت نہ صرف یہ جاننا چاہئے کہ وہ کیا کر سکتا ہے بلکہ یہ بھی جاننا چاہئے کہ وہ کیا نہیں کر سکتا لیکن اس سبق کے حاصل کرنے کے لئے انسان کو دُنیا میں مختلف لوگوں سے ملنا اور مختلف قابلیتوں کے لوگوں کی صحبت سے فائدہ اُٹھانا لازم ہے بغیر سوسائٹی کے انسان کو اپنی قابلیت کا پُورا پُورا علم نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ اپنی استعداد کی جانچ میں غلطی کرکے خودبین و خودرائے ہو جاتا ہے، اعلیٰ سوسائٹی اس کی عقل کو روشن، رائے کو مستحکم اور نظر کو وسیع بناتی ہے، تمیز نیک و بد جو عملاً کوئی اچھا کام کرنا سکھاتی ہے ایسے ہی تجربات سے حاصل ہوتی ہے تجربہ کے علاوہ علم

راضی برضا

شکوہ نہ بیش و کم کا غم کا نہ کچھ گلہ ہے — جس چیز کے تھے قابل ملتا جو تھا ملا ہے
شانِ کرم سے قائم ہستی کا سلسلہ ہے — شکرِ کریم دل کے آئینہ کی جلا ہے

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے"

جو نعمتیں ملی ہیں وہ کم ہیں یا ہیں وافر — ہر حال میں ہے لازم تقدیر پر ہوں شاکر
رنگِ ظہورِ قدرت ہر ذرے سے ہے ظاہر — اول بھی تو ہے برحق مالک ہی تو ہی آخر

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے"

فیضِ عمیم تیرا دنیا میں چار سو ہے — تاروں میں نور تیرا پھولوں میں تیری بو ہے
سر بہرِ شکرِ نعمت خم تیرے روبرو ہے — پتلے ہیں ہم خطا کے بندہ نواز تو ہے

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے"

جس حال میں رکھے تو وا ہمیں ہے رہنا — پھولوں میں یا ہو تلنا یا درد و رنج سہنا
ہنجے ہے سر سے پا تک ملبوس صبر پہنا — دل میں یہی تمنا منہ سے یہی ہے کہنا

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے"

حاصل ہو سربلندی یا ہو نصیب پستی — دورِ طرب ہو یا عہد فاقہ مستی
رنجوری و الم ہو یا عیش و تندرستی — تسلیم اپنا شیوہ مسلک ہے حق پرستی

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہو"

سازِ حیات کیا ہے؟ سامان ہے یہ تیرا — جو اصل زندگی ہے عرفان ہے یہ تیرا
سرچشمۂ کرم تو فیضان ہے یہ تیرا — بخشی ہیں نعمتیں جو احسان ہے یہ تیرا

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہو"

خوانِ کرم پہ تیرے مہمان ہے زمانہ — ملتا ہے رزق بن کر قسمت کا دانہ دانہ
جود و سخا کا مخزن ہے تیرا آشیانہ — کیوں برقؔ کے ہو لب پر ہر دم نہ یہ ترانہ

"راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہو"

برقؔ دہلوی

اٹھارویں صدی کے فسانہ نگار

فنون

قیسی

قصہ کہانی کا سلسلہ تو ابتدا سے ہی چلا آتا ہے۔ نہ اس وقت کوئی مصور فطرت جادو نگار رقمطراز تھا نہ کوئی طوطیٔ شیریں بیان فسانہ گو فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے والا تھا۔ بلکہ لوگ غلط و صحیح قصص و حکایات دل بہلانے کو گڑھ لیا کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی میں فدوق فسانہ نگاری کو عروج ہوا۔ انگریز مصنفین نے طول حکایات و قصص کو ناول کے جامہ میں اہل دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ پہلی کتاب جو فسانوں کی ماں ہے (Robinson Crusoe) جو ۱۷۱۹ء میں شائع ہوئی۔ فسانہ نگاری کی بنیاد اسی سے قائم ہوئی ہے۔ اس کے مصنف کا نام ڈینیل ڈیفو تھا۔ جب اسکی عمر صرف ۹ سال کی تھی ایک اور شخص جیل کے اندر مختلف قسم کے فسانوں کا رنگ جما رہا تھا جس کی شہرت "روبن سن کروسو" کے مصنف سے بھی زیادہ ہوئی۔ اس شخص کا نام جان بنین تھا۔ اس سے قبل چند اور غیر معروف لوگ ہوئے ہیں مگر جان بنین سترہویں صدی کا پہلا مشہور فسانہ نگار رہا ہے۔

اس شخص کا کس قسم کا دماغ تھا؟ اس کا پتہ اس کی تصنیف (Pilgrims Progress) دیکھ کر چل سکتا ہے۔ زبان کی خوبی۔ خیالات کی پاکیزگی سے پر ہے۔ اس کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ اس کا مصنف صرف قلم پر ہی حاوی نہ تھا بلکہ ایک عالم بیدل۔ قانون فطرت کا پورا ماہر بھی تھا۔ اس کو پڑھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ زبردست تصنیف کسی کمہار کے لڑکے کے دماغ کا نچوڑ ہے۔ حقیقتاً وہ فطرتی جذبات پرست اور صحیح الدماغ واقع ہوا تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم تربیت بہت معمولی سی تھی۔ عالم شباب میں عام جوان لڑکوں کی طرح سہل انکار اوباش و آزاد طبع تھا مگر اس کی روح قطعی بے لوث تھی اس میں انسانی ہمدردی کے جذبات موجزن رہتے تھے۔

اس کا سن پیدائش ۱۶۲۸ء ہے، ۱۶ سال کی عمر کے بعد اپنے آبائی پیشہ کو ترک کر کے فوج میں لازم ہو گیا۔ اس نے ایک معمولی سی حیثیت کی لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی جو ۲ بچے چھوڑ کر راہی عدم ہو گئی۔ شادی کے قبل تک اس کی طبیعت میں اوباشی تھی مگر بیوی ایسی نیک ملی کہ اس نے اس کی فطرت کے پوشیدہ جوہر کو چمکا دیا۔ بیوی کے انتقال

کے بعد وہ متقی مذہب پرست بن گیا اور عرصہ تک تبلیغ و اشاعت میں سرگرمی سے مشغول رہا۔ مگر چارلس دوم کو اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی آخر ۱۶۶۰ء میں گرفتار کر کے اس کو قصبہ (Bedford) میں قید کر دیا گیا۔ ۱۲ سال تک قید رہا۔ وقت کی قدر کرنا اس عرصہ میں اچھی طرح سیکھ گیا تھا۔ چنانچہ اس عرصہ میں اس نے بہت سی مذہبی کتب لکھ ڈالیں۔

۱۶۷۲ء میں رہائی پانے کے بعد وہ ایک مستند پادری کی حیثیت سے (Bedford) کا پیشوا اعظم تصور کیا جانے لگا۔ رہائی پانے کے بعد اس کی قلم وزبان دونوں آزاد تھی اسی زمانہ میں اس نے اپنی مشہور تصنیف (Pilgrims Progress) کی تکمیل کی ۱۶۸۸ء میں آخر مر گیا۔ اس کی اس معرکتہ الآرا تصنیف کے تراجم ۸۰ مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

ڈینیل ڈیفو مصنف (Robinson Crusoe) کی ہستی یہ ثابت کر دینے کے لئے کافی ہے کہ گمنامی و عسرت کی زندگی بھی اہل عالم کی نظروں میں کارہائے نمایاں کے ذریعہ وقیع ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا باپ جیمس فو قوم سے قصاب تھا اس مشہور و معروف مصنف نے اپنے آبائی پیشہ کو کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے علم و فضل میں کلام نہیں لاطینی۔ یونانی۔ فرانسیسی۔ اسپینی اور اطالوی السنہ میں اس نے استعداد کامل حاصل کی۔ اسکا قصد پہلے کسی گرجا میں داخل ہونے کا تھا مگر اپنے تمام عزائم کی عنان دوسری جانب پھیر کر موزہ سازی شروع کر دی۔ اس وقت اسکی عمر ۲۴ سال کی تھی ہنوز تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا۔

اس نے ابتدا میں ہی اپنے قلم کو سیاست و قانون کتب سے مطلق مخوف نہیں ہونے دیا۔ نہایت آزاد بیانی سے سیاست و انصرام مملکت کے پہلوؤں پر تنقید و محاکمہ جاری رکھا۔ ایک بار اس کو کاہرۂ طبیں بھی دید یا گیا مگر پبلک فوراً پہنچی اور سلطنت کو اس کی رہائی کے لئے مجبور کیا۔ لیکن رہائی نہ مل سکی قید کر دیا گیا۔ وہاں وہ کب خاموش بیٹھنے والا تھا اس کے مضامین سے دقتی جرائد پر ہوتے تھے۔ مخالفین فرقہ پروٹیسٹنٹ اور حکومت کی خوب خبر لیتا تھا۔ اس کی موت ۲۴ اپریل ۱۷۳۱ء میں ہوئی ہے۔ موت کے ۴۰ سال قبل تک اس کی قلم مطلق خاموش و بیکار نہ رہی۔

فنانوں کو ناول کا رنگ دینے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس کی معروف تصنیف رابن سن کروسو ہمیشہ اس کے نام کو زندہ رکھے گی مرنے کے بعد اس کو بھی جان بنین کے قریب دفن کیا گیا جو ۴۰ سال بیشتر سے وہاں آسودہ خواب تھا۔

مطالعہ کتب و تصنیف کی مصروفیت نے کبھی اس کو حلقۂ تعارف کی وسعت کی فرصت نہیں دی انگلینڈ کا بچہ بچہ اس کی تصنیف کی قدر کرتا ہے مگر بہت سے لوگوں کو معلوم بھی نہیں کہ روبن سن کروسو کا مصنف تھا کون؟

جوناتھن سوِفٹ

۱۶۶۷ء ۳۰ نومبر کو پیدا ہوا تھا۔ عالی خاندان تھا۔ مگر باپ اس کی پیدائش کے قبل ہی فوت ہوچکا تھا۔ غریب ماں رہگئی تھی وہی اس کی ایام طفلی کی کفیل تھی اس کی ذکاوت و وجودت طبع کا یہ عالم تھا کہ ۵ سال کی عمر میں انجیل کی ہر آیت کا مطلب نہایت آسانی سے کرسکتا تھا۔

اس کی ماں کے متعلقین دولتمند تھے ۱۴ سال کی عمر میں اس کو ڈبلن یونیورسٹی میں بھیجدیا گیا اور اس کے بعد اکسفورڈ۔

۲۷ سال کی عمر میں وہ پادری بنگیا۔ ابتداء سے کچھ بد دماغ شخص واقع ہوا تھا مگر قطع نظر اس کے عیوب و نقائص کے اسکے محاسن کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا ۱۳ سال بعد اس کی عجیب و غریب تصنیف (Gulliver's Travel) شائع ہوئی جسنے سنجیدہ سے سنجیدہ شخص کو بھی ہنسا دیا۔ اس سے بیشتر دو کتابیں The Tales of Tub اور The Battle of Books اور لکھہ چکا تھا۔

اپنی تصنیف کے زمانے میں بدقسمتی سے کوئی حور محوش اس کی حیات کی افضل ترین کائنات (دل) پر قبضہ کر بیٹھی تھی بہت عرصہ تک سودائی بنا رہا۔ جذبات محبت نے طبیعت کو اور جلا بخشی۔ اشعر و سخن کے بھی خوب خوب دریا بہائے آخر ۱۷۴۵ء میں فوت ہوگیا۔

سموئیل رچرڈسن

یہ بھی ایک نہایت مفلس بڑھئی کا لڑکا تھا جو ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوا اس کے چھوٹے بڑے فسانہ کم و بیش سب مقبول ہوئے۔ گو اسکا نام لٹریچر کے خدمت گزاروں کی فہرست میں خاص طور پر قابل توجہ نہیں تاہم اس کے چھوٹے اور مختصر فسانوں کا طرز بیان بالکل اس کی جدت کا نتیجہ ہے۔ اس نے دوسرے فسانہ نگاروں کا رنگ نہیں اختیار کیا۔ اس کے طول طویل فسانوں کو پڑھنا ہم تو تضیع اوقات سمجھتے ہیں مگر اس زمانہ کے لوگوں کے وہ بالکل حسب مذاق تھے۔ اس کے ہر ناول کا پبلک بے صبری سے انتظار کیا کرتی تھی۔ اس کے ایک معروف فسانہ کی ہیروین (Belinda) کی شادی کا جہاں ذکر آیا ہے تو لوگوں نے اس قدر پسندیدگی و رغبت کا اظہار کیا کہ بعض مواقع پر اس ہیروین کا نام زبان سے ادا کرنے پر گرجہ کے گھنٹوں سے اسکی مفروضہ آمد کا خیر مقدم کیا جانے لگتا تھا۔

اس کا ایک فسانہ (Clarissa) ہے جس کے اختتام میں اس کے اسی سال صرف ہوئے دوسرا سر چارلس گرانڈیسن ہے۔ یہ کافی مقبول ہوچکے ہیں۔

اس کی تعلیم تربیت بھی بہت معمولی سی تھی۔ ۱۷ سال کی عمر میں ایک مطبع میں ملازم ہوگیا جہاں بمشکل کتب بینی

کا وقت نکال سکتا تھا۔ مالک مطبع سخت گیر شخص تھا اس کے سو جانے کے بعد اس غریب کو کہیں کتب بینی کا موقع نصیب ہوتا تھا۔ شب بھر مطالعہ میں مصروف رہا کرتا تھا۔ محنتی و دیانت دار انسان پندرہ سال کے بعد جانکاہی و دماغ سوزی کا انعام مل گیا۔ مالک مطبع نے اس کے مسحور کن اطوار سے خوش ہو کر اس سے اپنی لڑکی کو منسوب کر دیا اور کل مطبع کا مالک بنا دیا۔

لارنس ۲۴ نومبر ۱۷۱۳ء میں آئرلینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین انگلش تھے۔ ابتدائی تعلیم خاص طور پر قابل ذکر نہیں ہے۔ ھالی فاکس کے اسکول اور کیمبرج کی یونیورسٹی میں تعلیم پا کر ۱۷۳۸ء میں مستند پادری بن گیا۔ عرصہ دراز تک اس کے مشاغل زندگی مختلف رہے۔ چالیس سال کی عمر میں اس کی ۲ دو مشہور تصانیف شائع ہوئیں۔

"ٹوبیس اسمالیٹ" اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ کچھ عرصہ تک ڈمبرٹن کے سکول میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد گلاسگو کی یونیورسٹی میں پہنچ گیا۔ پندرہ سال کی عمر میں وہیں سرجن ہو گیا۔ مگر قسام ازل کی جانب سے ادبی دماغ لیکر پیدا ہوا تھا۔ ۱۸ سال کی عمر میں اپنا ایک تیار کردہ ڈراما لیکر لندن گیا لیکن اس وقت کسی نے اس کو نہیں خریدا۔

اس نے ایک متمول عورت سے کچھ عرصہ کے بعد شادی کر لی۔ مالی مشکلات سے ایک گونہ نجات مل جانے سے دماغ نے اپنے جوہر دکھانے شروع کئے۔ بہترین فسانے لکھنے شروع کر دیئے۔ اس شغف نے چند سال بعد اس کو ایک مشاق مضمون نگار بنا دیا۔ پھر تو وہ تخیل پرداز فسانہ گو کے قابل مدیر کے اعلیٰ مورخ اور کامیاب سیاح بن گیا۔ اس کے تین ناول بالکل فیلڈنگ کے طرز پر تھے۔ وہ تینوں ناول Peregrine pickle, Roderick Random اور Humphery Clinker ہیں۔

گولڈاسمتھ ایک تعلیم یافتہ نوجوان فسانہ نگار تھا۔ خیال کی بلندی۔ مبالغہ پر حقیقت کا رنگ چڑھانے میں اسکو کمال تھا۔ بہت عرصہ تک وہ (Oliver) اولیور وغیرہ میں گھومتا رہا۔ ادھر ادھر کی آوارہ گردی میں بجز تضیع اوقات کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ قماربازی کی لت اس کو کچھ ابتدا ہی سے تھی۔ مطالعہ قانون کے لئے بڑی جانکاہی سے کچھ اندوختہ رکھا تھا مگر وہ بھی اس کی اوباش طبیعت نے قماربازی کی بساط کے نذر کر دیا۔ جب ۲۲ سال کا تھا طب کے مطالعہ کے لئے اڈنبرگ گیا۔ مگر وہاں بھی کچھ تحصیل نہ کر سکا۔ ان دنوں میں نوجوانوں کو سیاحی سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کو بھی یہ شوق چرایا۔ اپنی بانسری سنبھالی اور خالی جیب وسیع یورپ کی سیاحی کے لئے چل کھڑا ہوا۔ عرصہ دراز تک مارا مارا پھرتا رہا۔

۱۷۵۶ء میں لندن میں عجیب ہیئت کذائی کے ساتھ پھر داخل ہوا۔ گریبان تار تار پیر میں جوتہ تک ندارد جیب

میں صرف چار فارذنگ (چار پیسے) تھے۔ بسر اوقات کے لئے اجرت پر لوگوں کے نوٹس وغیرہ لکھنے شروع کئے مگر تنگدستی نے دامن نہ چھوڑا انصاب تعلیم پر اسے چند مضامین لکھے جس سے چند لوگوں نے اس کی گمنام شخصیت کی جستجو کی آخر ایک شخص نے اس کو اپنے اخبار کا ایڈیٹر بنا لیا۔

اب وہ ایک مخلتی شخص کی مانند شب و روز اپنے ادائیگی قرض میں مصروف رہنے لگا۔ اگر سادہ لوحی کیساتھ ساتھ وہ ذرا عاقبت اندیش بھی ہوتا تو فلاکت میں گرفتار نہ رہا کرتا۔ اس کی کریہ ہیئت۔ پستہ قد۔ اور لکنت تقریر نفرت کی نظر سے بہیں دیکھی جاتی تھی۔ عوام کو اس سے انسیت تھی۔ مگر وہ خود اپنی بعض عادتوں سے بیزار تھا۔

اس کی مشہور تصانیف The Stoops to Conquer ایک کامل و مکمل ڈراما ہے۔

The Deserted Village اور The Vicar of Wakefield بہترین ناولوں میں سے ہیں۔

ایک بار ایک قرض خواہ عورت نے اس پر ڈگری دائر کر دی۔ ادائیگی کے لئے اس کے پاس کیا رکھا تھا۔ اس کے کسی دوست نے اس عریانی فسانہ The Vicar of Wakefield کے مسودہ کو تین سو ڈالر (۷۰ روپیہ کے قریب) میں فروخت کر کے اس کا قرضہ ادا کیا۔ ۱۷۷۴ء میں جب وہ مرا تو دس ہزار ڈالر کا مقروض تھا۔

ایسے مصنف کی زندگی اگر خوشحالی سے بسر ہوتی تو وہ جدائی ذہانت کا اچھا ثبوت دے سکتا تھا لیکن قانون قدرت ہمیشہ یہی رہا ہے کہ ہر مشہور و معروف شخص کی ابتدائی زندگی فلاکت و آلام میں بسر ہوتی ہے۔

(ترجمہ)

جذبات اثر

(از جناب ولایت حسین خانصاحب اثر رحمانی الاخلاقی رامپوری)

وقتِ وداعِ یار ہے رخصتِ جانِ زار ہے
خاتمۂ حیات ہے حالتِ احتضار ہے

بس ہی نہیں کسی پہ کچھ ہائے ہماری بےبسی
آپ پہ اختیار ہے دل پہ نہ اختیار ہے

عہدِ سرورِ انبساط خواب و خیال ہو گیا
عشق میں اب تو ہم مراونس و غمگسار ہے

دل میں جو اپنے آگ ہے سوزشِ داغ ہجر سے
نالہ بھی ہے شررفشاں آہ بھی شعلہ بار ہے

سنگِ ستم سے دل مرا سوچ سمجھ کے توڑیئے
اس میں متاعِ آرزو آپ کی یادگار ہے

برق ہو یا شرار ہو نکہتِ گل ہو یا صبا
جس کو جہاں میں دیکھئے مضطر و بیقرار ہے

کثرتِ غم سے اے اثر حال یہ اب ہوا مرا
رنج و ملال باعثِ راحتِ جانِ زار ہے

قطعہ
وصل و ہجر

اک شخص نے دریافت کیا حضرتِ واثق — سچ کہنا کسی پر کبھی آئی ہے طبیعت؟

بے چین رہے ہو کبھی فرقت میں کسی کی؟ — جھیلی ہے کبھی تم نے جفا کی بھی مصیبت؟

گھائل بھی ہوا ہے کبھی دل "تیرِ نظر" سے — معشوق کے بھی وصل کی آئی کبھی نوبت؟

چونکایا ہے غفلت سے کبھی "مرغِ سحر" نے — گذری ہے کبھی آپ پہ بھی "صبحِ قیامت"؟

گذرے ہیں اگر آپ پہ یہ دونوں زمانے — تو وصل میں آرام ہے یا ہجر میں راحت؟

بعضوں کا مقولہ ہے کہ ہے وصل مزیدار — اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ہے ہجر میں لذت

عشاق میں مدت سے یہ اک جھگڑا رہا ہے
اب فیصلہ کی بات بتا دیجیے، حضرت

اک آہ بھری میں نے کہا مخلصِ واثق — اللہ کسی کو بھی نہ دے صدمۂ الفت

حالانکہ بہت دن سے طبیعت نہیں آئی — بیمثل بھی آجائے نظر گر کوئی صورت

لیکن یہ بتاتا ہے مرا تجربہ مجھ کو — کچھ وصل میں ہے لطف نہ کچھ ہجر میں راحت

قابو ہے اگر دل پہ تو دونوں میں مزا ہے
بے قابو طبیعت ہے تو دونوں ہیں مصیبت

واثق ٹونکی

معاشرتی افسانہ — **احساسِ گناہ کی قیمت** — معاشرتی افسانہ

(جناب محمد صدیق صاحب مسلم مالیگانوی)

قدسیہ اپنے دو منزلہ مکان کے نشست کے کمرے میں بیٹھی ہوئی ڈوپٹے میں گوٹہ لگا رہی ہے۔ گردن جھکی ہوئی اور نگاہیں جمی ہوئی ہیں مگر آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور خیال اب سے پانچ سال پہلے کی اُس خوشگوار اور پُراطمینان زندگی و پیش نظر کئے ہوئے ہے۔ جبکہ اس کے والدین بقید حیات تھے۔ دنیاوی تفکرات سے قطعاً آزادی حاصل تھی اور شب و روز کے چوبیس گھنٹہ محبت کرنے والی ماں اور شفقت کرنے والے باپ کے زیر سایہ بسر ہوتے تھے اور میٹھی میٹھی باتیں سامعہ نواز رہتی تھیں.................. ٹن.....ٹن.....ٹن.....ٹن.....ٹن..... دیوارگیر کلاک نے چار بجانے گاہوں کے ساتھ گردن اوپر کو اُٹھی اور بے ساختہ منہ سے نکل گیا" اے لو چار بج گئے۔ آج تو سنیچر کا روز ہے نہیں دو بجے ہی کچہری سے آجانا چاہئے تھا۔ لیکن ابھی تک کچھ ٹھکانا نہیں"، اس نے بقیہ تہ کرکے رکھدیا چلمن سرکا کر دیکھا۔ کھڑکیوں میں جھانکا۔ بے اطمینانی کے ساتھ اندر باہر دو چار چکر لگائے۔ آخر لکھنے پڑھنے کی میز کے قریب آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور دل بہلانے کے لئے ایک زنانہ رسالہ اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ نظریں تو صفحے کی تحریر کو دماغ کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر کان کسی آہٹ کو پاکر مطلوب کی آمد کا خاموش اعلان کرنے کے لئے بیتاب تھے اس کشمکش میں کوئی پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ سیڑھی پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ دل نے کہا "اے لو وہ آگئے" قدم شنوائی کو آگے بڑھے۔ قدسیہ دو چار قدم چلی ہو گی کہ مسٹر شمعون چلمن ہٹا کر اندر داخل ہوئے دونوں طرف لبوں پر ایک معنی خیز تبسم دوڑ گیا اور نگاہیں متصل ہوکر دم زدن میں خدا جانے کیا کیا کہہ گئیں۔

قدسیہ نے بیگ، میاں کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا" خیر تو ہے! آج کہاں دیر ہوئی"

شمعون نے کوٹ اور ٹوپی کھونٹی کی نذر کی اور آرام کرسی پر دراز ہوکر اپنے خوبصورت گھنگھریالے انگریزی قطع کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا" کیا اتنی جلد فراموش کرگئیں اب تمہاری یادداشت کی بھی تعریف کرنی چاہئے۔

"ہاں تعریف کیوں نہ کروگے؟"

"موئے چنی لال ساہوکار نے جب سے مکان کا جھگڑا نکال کھڑا کیا ہے۔ مارے فکر کے میرے حواس بجا نہیں

رہتے حال کی باتیں تھوڑی دیر میں ذہن سے اُتر جاتی ہیں۔ اور گذشتہ غم پھر عود کر آتا ہے۔"
"فکر تو ضرور ہونی چاہئے اور خصوصیت کے ساتھ تم سے زیادہ مجھے مگر...... شمون نے سگرٹ کیس سے ایک سگرٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا...... اب فکر کیوں کرتی ہو۔ میں نے شب کو نہیں ذکر کیا تھا؟ کہ میرے دوست محمد اکرم نے امداد کرنے کا وعدہ کیا........

"خوب! دیکھو اب اچھی طرح یاد آیا اور یہ بھی تو آپ نے کہا تھا کہ میں کچہری سے وہیں جاؤں گا۔ تو کیا وہیں دیر ہوئی؟" قدسیہ نے ایک مستفسرانہ انداز میں کہا۔

"ہاں سیدھا وہیں سے آرہا ہوں"
"تو کہئے؟ انھوں نے اپنا وعدہ وفا کیا یا نہیں؟"
شمون نے اپنی شریک زندگی کو ذرا کھسیانا کرنے کی غرض سے کہا" مفصل طور سے سب کہے دیتا ہوں مگر اتنی عجلت کیوں ہے؟"
قدسیہ ذرا بگڑے ہوئے تیور سے بولی "یہی تو مجھے نہیں بھاتا۔ آپ کو ہمیشہ مذاق ہی کی سوجھتی ہے" اتنا کہہ کر قدسیہ غصے سے اندر جانے لگی۔

"اچھا! اچھا!! خفا نہ ہو میں کہتا ہوں بیگم صاحبہ آپ تو ذرا میں خفا ہو جاتی ہیں" مگر پہلے چائے تو پلوائیے!!!
قدسیہ زیر لب مسکرائی۔ اندر سے چائے کا سامان اور اسٹو (ولایتی چولھا) لے آئی۔ اُسے سلگا کر پانی چڑھا دیا اور قریب کے مونڈھے پر بیٹھ کر بولی؟ کہئے محمد اکرم نے کچھ دیا؟
"دیا اور بہت کچھ دیا۔ قدسیہ! اس دورِ قحط الرجال میں سچے دوست بہت کم ملتے ہیں۔ میرے اُس مخلص نے بے چون وچرا اور بغیر کسی شرط کے پندرہ سو کلدار گن دیئے۔ بیچارے کو فی الحال گنجایش نہ تھی مگر کوشش کر کے اُس نے اِدھر اُدھر سے یہ رقم فراہم کر لی۔ یہ پندرہ سو اور میرے نام کے جمع شدہ ایک ہزار روپیہ جو ابھی بنک سے لیتا آیا ہوں منجملہ ڈھائی ہزار کل لیجا کر اُس شیطان صفت ساہوکار کے حوالے کر آؤنگا اور باقاعدہ بھرپائے کرالوں گا۔ پھر تو یہ مکان بلا شرکت غیرے ہمارا ہے۔"
قدسیہ کی آنکھوں میں اشکِ مسرت بھر آئے۔ اور ایسا ہونا قانون فطرت کے موافق تھا کیونکہ مصیبت کے وقت تنکے کا سہارا بھی اپنی اوٹ میں ہیبت و خوشی کا پہاڑ رکھتا ہے۔
چائے تیار ہو چکی تھی قدسیہ نے ایک پیالی میاں کے سامنے پیش کی مسٹر شمون نے چائے پی اور معمول کے

مطابق لائبریری کی طرف چلے گئے، قدسیہ طعام شبینہ کے انتظام میں مصروف ہوگئی۔

(۲)

اطمینان سے زندگی بسر کرنے والا یہ پریمی جوڑا قصبہ ماہیم کے جس دومنزلہ مکان میں سکونت رکھتا تھا۔ اُسے قدسیہ کے والد سیٹھ عبدالرحیم نے تعمیر کرایا تھا۔ سیٹھ صاحب ایک کامیاب تاجر تھے قدرت کا قانون ہے کہ اکثر دولت اور اولاد اکٹھا نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان کے بھی خدا کے فضل سے دولت تو بہت کچھ تھی مگر اولاد صرف ایک ہی ہوئی اور وہ بھی قدسیہ۔ شمعون اُن کے ایک گہرے دوست کے لڑکے تھے۔ جنھیں عالم طفلی ہی میں والدین نے داغ جدائی دیا۔ والدین کے قضا کرجانے کے بعد چونکہ کسی رشتہ دار نے شمعون کی تربیت و پرورش کا بار اُٹھانا بہ خوشی قبول نہ کیا۔ اس لئے سیٹھ عبدالرحیم نے اپنی نیک سیرت بیوی سعیدہ کی صلاح سے اُسے اپنے گھر لاکر رکھا ایک حقیقی پسر کی طرح نازونعمت سے پالا اور اعلیٰ تعلیم دلائی۔ الغرض شمعون و قدسیہ نے اپنی طفلی کا خوشگوار زمانہ اسی مکان میں طے کیا اور عنفوانِ شباب میں سعیدہ کے اصرار سے ان دونوں کو شادی بیاہ کی روپہری زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ اُس کے بعد سے اب تک مکان اُن کے لئے ایک پُرسکون و معمور مسرت سکونت کا کام دیتا رہا جس مکان کا چپہ چپہ عالم طفلی و شباب کے کیف زا و خوش آہنگ تغیرات و واقعات کا محرم راز ہو۔ اُس سے اگر انہیں قلبی محبت ہوجائے اور اُس کے وہ بہشت ارضی سے تعبیر کریں، تو مقام حیرت و استعجاب نہیں۔

مگر دُنیا دار الانقلاب ہے جہاں دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا ہونا لازمی ہے اس دار المحن میں ہمیشہ یکساں نہیں کٹتی۔ سُکھ کے بعد دُکھ اور دُکھ کے بعد سُکھ کا کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ برابر جاری ہے ؎

خدا دیتا ہے جنکو عیش اُن کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

چنانچہ سیٹھ عبدالرحیم بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ اُن کے دورِ حیات کا آخری حصہ اُن کے تنزل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ پے درپے حوادثات پیش آنے شروع ہوئے۔ اُن کی موت سے ڈیڑھ سال پہلے ہی سعیدہ نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ جس سے اُن کے محبت کرنے والے دل پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔ اگرچہ وہ بظاہر اپنا چہرہ ہشاش بشاش بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے مگر دل، اندر سے روتا رہتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبارِ دُنیاوی سے اُنکا جی ہٹ گیا تجارت میں ناقابل برداشت گھاٹا آگیا ہر طرف سے کارخانہ بگڑنے لگا۔ یہاں تک کہ تجارت کا سلسلہ بند کردینا پڑا۔ غرض ان مجموعی غم و آلام نے مل کر اُن کی زندگی اجیرن کردی۔ آخر انہوں نے بھی ایک رات داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنی شریکِ زندگی کے پہلو میں ابدی آرام حاصل کیا۔ ان واقعات کو آج پانچ سال کا زمانہ

گزر گیا۔

والدین کے اس طرح یکایک یکے بعد دیگرے اٹھ جانے سے قدسیہ اور شمون کو جسقدر غم ہونا چاہئے تھا اُس سے زیادہ ہوا۔ اگرچہ یہ امر مسلمہ ہے کہ پُر شباب دلوں پر غم والم کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ چنانچہ جیسے جیسے دن گذرتے گئے اُن کا غم ہلکا ہوتا گیا اور کار و بار دنیاوی میں طبیعت لگتی گئی۔

اگرچہ سیٹھ عبدالرحیم نے مرتے وقت کچھ نہ چھوڑا تھا۔ تاہم ان دونوں میاں بیوی کی محبت بدستور رہی۔ شمون بمبئی کے ایک سرکاری آفس میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر کلرک کی جگہ کام کرتے تھے اور اسی رقم میں دونوں میاں بیوی اپنی محبت کی زندگی بڑے آرام و اطمینان سے بسر کر رہے تھے۔

آج سے چھ ماہ قبل بمبئی کے مشہور ساہوکار چنی لال کی طرف سے شمون کے نام ایک نوٹس آیا جس میں اطلاع دیگئی تھی کہ

"متوفی سیٹھ عبدالرحیم کے ذمہ ہمارے ڈیڑھ ہزار روپے نکلتے تھے۔ جس کے عوض اُنہوں نے اپنا دو منزلہ مکان"

"رہن رکھا تھا۔ ادائیگی کی میعاد آج سے چھ ماہ میں پوری ہو جائے گی لہٰذا معہ سود ڈھائی ہزار روپے ادا کرکے"

"بھرپائی کرا لیجئے ورنہ رہن نامہ کے مطابق مذکورہ مکان فروخت کرکے ہم اپنی رقم وصول کرلیں گے۔"

ساہوکار کے اس نوٹس نے شمون اور قدسیہ کے خرمنِ سکون و اطمینان پر برق شرر بار کا کام کیا۔ میاں بیوی ابھی تک اسی میں خوش تھے کہ ہمارے والدین نے ہمارے لئے کچھ نہیں چھوڑا تاہم یہی مکان ہمیں دولت کونین ہے۔ جس سے ہماری گذشتہ زندگی کی دل خوش کن داستانیں وابستہ ہیں لیکن ؏

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

انسان کارگاہِ زندگی میں سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے اوّل اوّل شمون کو مذکورہ نوٹس کا یقین نہ آیا۔ یا کم از کم انہوں نے یقین کرنا نہ چاہا۔ بنابریں وہ ایک روز ساہوکار کی کوٹھی پر گئے اور جملہ کاغذات و دستاویزات کو دیکھ کر حقیقت امر کا غمگین دل سے اعتراف کرنا پڑا۔ دورانِ ملاقات میں ساہوکار کی سخت گیری اور درندہ خو طبیعت کا پورا پورا تجربہ ہوگیا۔ نیز انداز بیان سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس ظالم نے مذکورہ رقم میں ایک کوڑی کی بھی رعایت نہ کرنے اور میعاد مقررہ پر مکان بیچ دینے کا تہیّہ کرلیا ہے۔

ڈھائی ہزار کی رقم خطیر فراہم کرنا اور وہ بھی چھ ماہ کی قلیل مدت میں، یہ امر ایک معتدل حیثیت کے آدمی کیلئے ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے۔ اس بلائے ناگہانی سے میاں بیوی دریائے فکر و غم میں غوطے کھانے لگے۔ بالخصوص قدسیہ تو اس خیال سے اور بھی زیادہ ملول رہتی بلکہ بعض اوقات رو دیتی کہ اُس کے والدین کی ایک

ا عدیادگاراُس کے ہاتھوں سے چھینی جارہی ہے۔ لیکن مسٹر شمون آخر مرد تھے اور مرد بھی کیسے مستقل مزاج، صاحب ہمت،
تدبیر اُنہوں نے سوچا کہ" اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے تو پیش آمدہ مصیبت ٹلنے کی نہیں۔ فی الحال
پچھ سو کی رقم میرے نام بنک میں جمع ہے۔ اُسے اس وقفے میں کسی نہ کسی طرح ایک ہزار تک پہنچایا جائے باقی پندرہ سو
سی دوست سے بطور قرض حاصل کرنے کی کوشش کی جائے" غرض اس دستور العمل کے مطابق اُنہوں نے اپنی جدوجہد
جاری کردی ع "ہر طلبگار کو محنت کا صلہ ملتا ہے"
سٹر شمون کی کوشش رائگاں نہ گئی۔ چھ ماہ کے اندر اندر اُنہوں نے اپنے دستور العمل کی تکمیل کردی سخت جانکاہی
کفایت شعاری سے جمع کئے ہوئے ایک ہزار روپئے اور بمبئی کے اپنے ایک عزیز دوست محمد اکرم سے پندرہ سو
روپئے بطور قرض لے کر آج وہ گھر آئے تھے۔ میاں بیوی کے بہجت و انبساط کی کوئی انتہا نہ تھی۔ چھ ماہ کے بعد آج
اُنہوں نے اطمینان و خوشی کا مُنہ دیکھا تھا۔ اور وہ یقین کرنے لگے تھے کہ اب یہ مکان بلا شبہ ہمارا ہے۔

(باقی آیندہ)

زبان

(از نتیجہ افکار سید الشعراء سید حسین میاں صاحب سید منگروری تلمیذ رشید حضرت شمشاد لکھنوی)

زباں دہن کو خدا نے جو دی بیان کے لئے — دہن کو بھی لب و دنداں ملے زباں کے لئے
سی ہیں نعمتیں دونو جہاں کی ہیں موجود — یہی زباں تجھے کافی ہے دوجہاں کے لئے
زبان والوں کو پاس زباں نہیں افسوس — جو بے زباں ہیں ترستے ہیں وہ زباں کے لئے
"زبان" کی قدر اگر ہم وطن نہیں کرتے — نکل ہی آئیں گے کچھ قدرداں زباں کے لئے
عزیز خاطر خوشتر جو تھی بہت دل کو — یہ چند شعر کہے پرچہ "زباں" کے لئے

ازل میں آہ سے میری شرر جو نکلے تھے
وہی ستارے بنے سید آسماں کے لئے

زبان: ہوئے نہ آہ وہ ممنون التفات نظر — کئے تھے پیش جگر پارے قدرداں کے لئے

حیاتِ حسرت

(سید الاحرار حضرت مولانا حسرت موہانی)

کیا کیا نہ ہجر میں ترے ناشاد کر چکے
اب یہ سمجھ کے چپ ہیں کہ وہ یاد کر چکے

رنگیں طرازیاں ہیں غضب اشک سرخ کی
جو دامنِ جنوں پہ ہم ایجاد کر چکے

پابند عیش ہو نہ سکے بندگانِ عشق
گو ختم قید غم کی وہ میعاد کر چکے

نادم ہیں اب کمال جب اُن سے بیان ہم
ساری غم فراق کی روداد کر چکے

کہتے ہیں اب وہ تیری گذارش ہے ناقبول
اکبار کر چکے جو ہم ارشاد کر چکے

نادم وہی تو آج ہیں کل بربنائے ناز
خاکِ شہیدِ عشق جو برباد کر چکے

حسرت وہ اب ہوئے بھی تو کیا مائلِ کرم
جب ختم ساری سختیٔ بیداد کر چکے

(مرسلہ)
(مولینا مسعود الرحمن صاحب ندوی)

دیوانِ فانی

ایک ہتائی نمبر

بہ روپیہ ۱۲؎

کیوں اہل حشر ہے کوئی نقاد سوز دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے
فانی

منشی محمد شوکت علیخاں صاحب فانی بدایونی۔ بی اے۔ ایل ایل بی علیگ کا دیوان جو اس زمانہ کے مشہور معروف استاد فن ہیں اور سوز گدازمیں خاص شہرت رکھتے ہیں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ مع تصویر مصنف چھپکر تیار ہوگیا ہے۔

غزل

(از جناب محمود الحسن صاحب صدیقی بی۔اے۔ علیگ)

سوزِ غم اور سازِ دل کو پہلے باہم کیجئے
جس طرح پر چاہئے محفل کو برہم کیجئے

سوزِ دل سے پھونک دیجے ساز و سامانِ حیات
دردِ دل سے پھر نیا پیدا اک عالم کیجئے

آیئے اور منتشر کر دیجیے دل کی کائنات
نغمۂ الفت کو سوزِ جاں سے باہم کیجئے

ذوقِ الفت ہو نہ جائے بدگمانی سے فزوں
مجھ سے جتنا ہو سکے اب حسنِ ظن کم کیجئے

زخم۔ دل میں ناوکِ مژگاں سے خود ہی ڈالئے
پھر نئے انداز سے خود فکر مرہم کیجئے

دل اگر چاہے الٹ دیجے بساطِ زندگی
اک نگاہِ ناز سے ہستی کو برہم کیجئے

جائیے اور شوق سے خونِ تمنا دیکھئے
اور پھر کچھ یاد کر کے چشم پُرنم کیجئے

بزمِ حسن و ناز میں ہو جائیے محوِ سرور
اور ستاروں کو رقیبِ سوزشِ غم کیجئے

بزمِ ہستی میں نہیں ملتا کوئی درد آشنا
کس سے گر کچھ کیجئے تو شکوۂ غم کیجئے

حُسنِ خیال

(تخیلات) (ادب لطیف)

(از جناب صادق الہ آبادی)

حریف نشاط کی دراز دستیوں نے گو، میری متاعِ حیات اور میرے سرمایۂ مسرت کو ضرور برباد کر دیا ہے، لیکن بڑی پرلطف اور ولولہ انگیز ہے، وہ بیخودی، وہ کیفیت، اور وہ محویت، جس نے اس یاس و قنوط کے عالم میں میرے افسردہ و مضمحل دل کو گرما رکھا ہے۔ میرا فرقت نصیب دل اس بیاضِ حُسن کی پرستش پر مجبور ہے خدا جانے اس کی سحر آفرین آنکھوں میں کیا جاذبیت ہے کہ اس کی دزدیدہ اور پوشیدہ نگاہوں کی تیرباری سے میرا حسرت نصیب دل محشرستانِ تمنا اور خیالستانِ آرزو بنجاتا ہے اور میں امید و بیم کی حوصلہ شکن صبر آزمایوں کی آماجگاہ بنجاتا ہوں،

اس کا جلوۂ بصیرت نواز اور حسنِ طلسم ساز عشاق کی تسکین خاطر کیلئے ادویہ مفرح سے کسی طرح کم نہیں ہوتا، میں اس کے دل آویز تصور کو دل میں لئے ہوئے اپنے خلوت کدہ میں پہنچکر، اس کی جنون زا تصویر فرطِ اضطراب میں اپنے سینہ سے لگا لیتا ہوں، اور عالم گمشدگی میں کہتا جاتا ہوں اے چمنستانِ حُسن کے گل سر جو تجھے بُرا کہتے ہیں محبت کی بے قدری اور حُسن کی توہین کرتے ہیں، جب میں یہ کہتا ہوں تو بادۂ محبت سے سرشار آنکھیں کھُل جاتی ہیں، اور میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ وہ شیرازۂ جمال ایک مرصع اسٹیج پر بیٹھی ہوئی اپنی ہم جلیس اور ہم پیشہ نازنینوں کے ساتھ الھڑپن سے ادہر اُدہر جھانک رہی ہے، برقی روشنی کا تابناک منظر جذباتِ محبت میں حشرِ التفات پیدا کرنے کے لئے کافی تھا، اس نے بھی محسوس کیا اور اچھی طرح محسوس کیا پھر کیا تھا محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑکنے لگیں پپیہے کی، پی کہاں، نے اس کے دلی جذبات کو اور مشتعل کر دیا اسکے بیگانۂ محبت دل سے مہک سی اُٹھی اور وہ کیفِ محبت سے سرشار ہوکر یوں گویا ہوئی گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں، اور خزاں رسیدہ باغوں کو مژدہ بہار سناتی ہیں کلیاں کھلتی ہیں۔ غنچے مسکراتے ہیں، مگر آہ میرے دل کی کلی ہنوز ناشگفتہ ہے، اس نے یہ جملہ ایک ایسی ادا کے ساتھ کہا جس کے سننے سے میرے مضطرب دل میں تسکین و طمانیت کی ایک جھلک پیدا ہوگئی، میں نے حسرت بھری نگاہوں سے اسکو دیکھا، اور اس کے خوبصورت چمپئی چہرے کو ایک محویت سے دیکھ کر مست و بیخبر ہوگیا، جب مجھ کو ہوش آیا تو وہ میرے سامنے نہ تھی، میرا دل دھڑکنے لگا، اضطرابِ قلب اور بیتابیٔ دل نے ایسا پریشان کر دیا کہ میں دُنیا و مافیہا سے بیخبر ہوگیا اور عالم خیال میں اسے اپنی آغوشِ محبت سے لیکر اس کے نظر نواز رخساروں کے بوسے لینے لگا، مگر آہ! وہاں کیا تھا؟ صرف حُسنِ ظن اور حُسنِ خیال" میں اُٹھا اور اس طرف کو جدہر وہ "جانِ آرزو" ایک محشر خرام کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی، یہ کہکر اپنے دل کی ٹھہرا

٭ ۱۳۴۳ھ میں ہوئی۔

نکالنے لگا،

اے برقِ طپاں! تجھے اپنی یادہ ریزاور حیا پرور آنکھوں کی قسم! دمِ رخصت ایک دزدیدہ اور غلط انداز نظر سے مجھے دیکھ کہ میری پرشوق اور حسرت آلود نگاہیں حدِ نظر تک تیرے دامنِ کرم سے وابستہ اور منت کش نظر آتی ہیں! مگر آہ! وہاں کچھ نہ تھا۔

(جناب حامد رضا خانصاحب تبسّم نظامی)

زندگی اک چیز ہے لیکن یہ مستحکم نہیں
ورنہ "میری عمر" عمرِ جاوداں سے کم نہیں

سوچتا ہوں، اب کہ وہ "میری تمنا کیا ہوئی
عالمِ امکاں میں جس کی وسعتیں کچھ کم نہیں

وہ جہاں کی نامرادی آدمی کے ساتھ ہے
سینکڑوں غم ہیں میسّر پھر بھی کوئی غم نہیں

مجھ کو عریاں "دیکھنے والا" بتا اب کیا کرے
"حسرتِ دیدار ہے آنکھو نہیں" لیکن دم نہیں

حُسن میری آرزو کو شوق سے رسوا کرے
اب مجھے رسوائیوں کا غم "بقدرِ غم نہیں"

صورت موہوم ہے "کیفیتِ آغازِ عشق"
پہلی باتیں یاد آتی ہیں "مگر پیہم نہیں"

پردۂ چشمِ تبسّم اور بھیرہ دامانِ حسن
ایک مدت سے "رہیں گریۂ پیہم نہیں"

میر نمبر

رسالہ نیرنگ رامپور کا ششماہی نمبر جو ۲۰ جولائی ۱۹۲۸ء کو شایع ہوگا میر نمبر کے نام سے نکلیگا جسمیں تمام تر مضامین مندرجۂ ذیل عنوانات پر ہونگے۔ اہل قلم ۱۵ مئی ۱۹۲۸ء تک اپنے مضامین دفتر نیرنگ میں بھیجدیں۔ بہترین مضمون پر ایک اشرفی پیش کیجائیگی۔

عنوانات

(۱) میر کے حالات زندگی (۲) تبصرہ کلام میر (۳) میر کی فارسی شاعری (۴) میر اور سودا کے قصاید کا موازنہ (۵) میر کی مثنویاں

(مینیجر نیرنگ رامپور)

جذباتِ کاشف

جناب محمد شفیع صاحب کاشف اکبر آبادی

رو دئے آج تو وہ بھی مرے افسانے پر
خوش ہوں جذباتِ طبیعت کے بدلجانے پر

اعتماد ایک ہوا تھی جو ہوئی چل کے خموش
اب یگانے پہ بھروسہ ہے نہ بیگانے پر

داغ سینے پہ کھلے صورتِ گلہائے چمن
چاک دامن سے بہار آگئی دیوانے پر

نہ کرو فکرِ سکوں، موت کی تکلیف نہ دو
کہ یہ ممکن ہے، مگر دل کے ٹھر جانے پر

ہوئی تجدیدِ قوانینِ جنون کی تکمیل
نازشیں کرتی ہیں وحشت تری دیوانے پر

کشتۂ سوزِ تجلی کی ہو پروا اسکو
ایک آنسو نہ گرا طور کے جل جانے پر

سو گئی بزمِ جہاں جب مری نوبت آئی
شمع بھی رہ گئی بجھ کر مرے افسانے پر

سازِ پُر نغمہ شکستہ ہو تو غم ہو کاشف
رنج کیوں ہے دلِ خاموش کے مرجھانے پر

غزلیات

اطہر۔ جناب ناظم الملک مولوی سید معشوق حسین صاحب ہاپوڑی منصف جے پور اسٹیٹ

تمہارا حسن اچھا ہے ہماری عاشقی اچھی
خود آرائی تمہیں زیبا ہے ہم کو بے خودی اچھی

نہ ان سے چھیڑ چھاڑ اچھی نہ ان سے دل لگی اچھی
حسینوں سے تو بس صاحب سلامت دور کی اچھی

اگر تھوڑی سی پی بھی لی تو اس سے کیا ہوا زاہد
ارے نادان نیت چاہیئے انسان کی اچھی

مرے نزدیک دشمن اور تم دونوں برابر ہو
تمہاری دوستی اچھی نہ اس کی دشمنی اچھی

یہی پینے پلانے کا زمانہ ہے یہی دن ہیں
بہار آتے ہی توبہ کی بھی اے زاہد کہی اچھی

فلک کہتا ہے میں بڑھکر ہوں وہ کہتے ہیں میں بڑھکر
مزہ ہے دو ستمگاروں میں باہم یہ چلی اچھی

مرے نزدیک شیخ و رند دونوں حد سے گزرے ہیں
نہ اتنا انکار اچھا نہ اتنی مے کشی اچھی

زباں پکڑی نہیں جاتی کسی کی کچھ کہے کوئی
سُنے جاؤ اگر واعظ کہے رندو بری اچھی

ہوئے اشک ندامت میرے باعث جوش رحمت کا
مآل اچھا ہوا ہے دل جس کا وہ شرمندگی اچھی

جو تم سے دور ہوں تو زندگی سے موت بہتر ہے
اگر تم پاس ہو تو موت سے ہے زندگی اچھی

بڑی چلتی رقم ہے وہ ستمگر حضرت، اطہر
ذرا دل کی خبر رکھنا نہیں یہ دل لگی اچھی

جناب سید شمس الحق صاحب خیال وکیل عدالت رامپور

جنونِ عشق میں کیونکر نہ ہوتی چاک دامانی
برنگ بو مری تقدیر میں لکھی تھی عریانی

جمالِ یار کے نظارہ سے چھائی یہ حیرانی
حقیقت کیسی میں نے اپنی صورت تک نہ پہچانی

تواضع میں غم الفت کی خوں اپنا کیا پانی
جزاک اللہ اے دل خوب ادا کی شرطِ مہمانی

مری محرومیٔ تقدیر کا بھی کچھ ٹھکانا ہے
کہ جمعیت کے بدلے دل کو ملتی ہے پریشانی

ملے ہیں دونوں اپنی دُھن کے پکے خوب گذرے گی
ہمیں ذوقِ جفا و جور انہیں شوقِ ستم رانی

کلیجہ شدتِ غم سے کہیں مُنہ کو نہ آجائے
گئی حد سے گزر اب دردِ الفت کی فراوانی

سُناؤں گا کبھی فرصت جو دی مجکو زمانہ نے
کہ ہے افسانۂ دردِ دلِ بیتاب طولانی

جنوں کا کچھ قصور اسمیں نہ وحشت کی خطا اسمیں
مری تقدیر میں گل کی طرح تھی چاک دامانی

یہ دونوں کس طرح ہوں جمع اہل۔ کوئی نسبت بھی
کہاں دعوائے الفت اور کہاں ذوقِ تن آسانی

جبیں سائی درِ جاناں پہ کی ہے عمر بھر ہم نے
عجب کیا ہے جو مثلِ ماہ چمکے داغِ پیشانی

اُمنڈ آیا ہے جوشِ غم سے دل اشک آنکھ میں آئے
دکھا اے دامنِ مژگاں بہارِ موجِ طوفانی

ملے گا خانہ بر انداز مجھ سا کون دُنیا میں
کرے گی یاد میرے بعد مجھ کو خانہ ویرانی

غمِ پنہاں میں کیا اے چشمِ تر آنسو بہاتی ہے
کہیں تیری بدولت ہو نہ جائے آبرو پانی

فقط دل کی بدولت زندگی کے پڑ گئے لالے
جسے ہم دوست سمجھے تھے وہ نکلا دشمنِ جانی

خیالؔ اک بھی نہیں پابندِ تخئیلِ قدیم اب تو
خدا رکھے ترے دم تک ہی یہ رنگِ غزل خوانی

افتخار الشعراء برقؔ دہلوی

جم گئے جو قطرۂ خوں خنجرِ فولاد پر
بن گئے مہرِ شہادت محضرِ بیداد پر

کیا قیامت اور ڈھانی ہے دلِ ناشاد پر
کیوں نگاہِ لطف ہے مجھ خوگرِ بیداد پر

او ستمگر شوق سے بیداد کر بیداد پر
مہرِ ضبطِ غم لگا دی ہے لبِ فریاد پر

میں ہوں اک فطرت شناسِ آسمانِ کج نہاد
تھام لیتا ہوں جگر شورِ مبارکباد پر

میری ناکامی پہ ہنستی ہے امیدِ دلفریب
میں بہاتا ہوں جو آنسو کوششِ برباد پر

بر سرِ رحم آگئے آخر بتانِ سنگدل
پتھروں کے دل پسیجے ہیں مری فریاد پر

روز گردش ہے نئی میری مٹانے کیلئے
تُل رہا ہے آسمانِ فتنہ گر بیداد پر

خاک و باد و آب و آتش کا ہے پیارا ظہور
ہے بنا دارِ فانی مجمعِ اضداد پر

بھر دیئے ہیں خاک کے پتلے میں کیا جوہر لطیف
نازِ صناعِ حقیقی کو ہے آدم زاد پر

در حقیقت برقؔ یہ ہے خطۂ جنت نظیر
شش جہت کو ناز ہے خاکِ جہاں آباد پر

تنقید و تبصرہ

(ماہوار رسائل، اخبارات، روداد جلسہ۔ رپورٹ ہائے انجمن اور ادبیات وغیرہ پر ریویو کیا جائیگا)

روح تنقید

یہ کتاب آج سے بہت پہلے ملک سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہے اور اس پر موقر معاصرین کے عرصہ ہوا ریویو بھی نکل چکے ہیں لہٰذا اب اس پر اتنی دیر کے بعد ہمارا ریویو کرنا کچھ تحصیل حاصل ہی سا ہے تاہم اظہار خیال ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب زور ایم۔ اے (جامعہ عثمانیہ مقیم لنڈن) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ زیر تنقید کتاب آپ ہی کی تالیف ہے جس میں یورپی نقادوں کے طریقہ تنقید اور اصول تنقید پر نہایت محنت و جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے۔ حصۂ اول مبادی تنقید سے متعلق ہے جو گیارہ ابواب پر مشتمل ہے خصوصاً ادب کی تعریف۔ تنقید کا مقصد۔ تنقید نگار کے فرائض۔ اصول تنقید۔ میرحسن اور ان کی مثنوی سحرالبیان وغیرہ مباحث نہایت مفید و کارآمد ہیں اور یہی کتاب کی اصل جان ہیں۔ دوسرا حصہ جو صفحہ ۵۷ کے بعد شروع ہوتا ہے اسمیں ارتقائے فن تنقید پر نہایت محققانہ بحث کی ہے اور اس میں یونان و روما کے مشہور و قدیم نقادان فن کے حالات و ارتقائے تنقید کا ذکر، پھر فرانس اور انگلستان کے نقادوں کے اصول تنقید کا بیان کرتے ہوئے مروجہ تنقید اور چند تنقیدی کارناموں پر کتاب ختم کی گئی ہے۔ غرض یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہمارے نقادوں کو شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

کتاب میں جہاں جہاں مصنفین و تصنیفات کے حوالے دیئے گئے ہیں ان کی فہرست دیکھتے ہوئے حیرت ہی نہیں ہوتی بلکہ مؤلف کے وسیع مطالعہ و معلومات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے نیز ان کی جگر کاوی و عرق ریزی کی داد دینی پڑتی ہے کہ مؤلف نے کئی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد یہ بیش بہا تحفہ ملک کے سامنے پیش کیا ہے آپ کا اردو پر یہ احسان عظیم ناقابل فراموش ہے۔ پاکٹ سائز۔ لکھائی چھپائی معمولی۔

پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی اسٹیشن روڈ حیدرآباد (دکن)

دنیائے افسانہ

یہ کتاب بھی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کے ایک ہونہار متعلم کا پہلا ادبی کارنامہ ہے اور یہ کتاب بھی روح تنقید کے نہج پر لکھی گئی ہے اور یہ بھی اپنے موضوع پر پہلی تالیف ہے جس کے

لئے ملک کو خصوصاً اردو داں پبلک کو جناب محمد عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے کا بیحد مشکور ہونا چاہئے کہ آپنے اس تالیف سے اردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ کیا۔

آج کل اردو میں جس سرعت کے ساتھ بے اصول افسانہ نگاری کا مذاق عام ہو رہا ہے اس کے لئے ضرورت تھی کہ فن افسانہ نگاری کے وہ تمام اصول وضوابط جو یورپ میں مسلمہ طور پر رائج ہیں منضبط کر کے اردو دنیا میں پیش کر دیئے جائیں تاکہ اس سے ہر فسانہ فنی حیثیت سے دیکھا جا سکے اور افسانہ نگار ان اصول کے ماتحت فسانے لکھ کر اہل مغرب کی طرح اس فن میں کمال حاصل کر سکیں اگرچہ افسانہ نگاری مشرقی فن ہے لیکن اس میں اب تک قدامت کی جھلک نظر آجایا کرتی ہے۔ رجال قصہ کی دور از کار باتیں اور محیر العقول واقعات یہ وہ عیوب ہیں جنکا غالب عنصر ہمارے فسانوں میں پایا جاتا ہے اور نفسیاتی تخیل سے تو قطعاً معرا ہوتے ہیں۔ نومشق مضمون نگاروں نے فسانوں کا لکھنا سب سے سہل سمجھ رکھا ہے حالانکہ یہ ایک مستقل فن ہے اور سب سے مشکل۔ لہٰذا ہر افسانہ نگار کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

کتاب زیر تنقید کے شروع میں قابل مؤلف کا ایک دیباچہ ہے جس میں اس فن پر اردو میں کسی کتاب کے نہونے کے متعلق بحث کرتے ہوئے چند ان مضامین کا حوالہ دیا ہے جو اس مبحث پر لکھے گئے ہیں جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ صفحہ ۷ سے کتاب شروع ہوتی ہے جو بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ افسانوں کی اہمیت فنون لطیفہ اور افسانہ۔ افسانوں کی پیدائش۔ حقیقت اور افسانہ۔ افسانوں کی قسمیں۔ اعلیٰ ناول کی خصوصیات۔ ناول نگاروں کے فرائض۔ مختصر قصے۔ مختصر قصوں کا فن۔ اردو زبان اور افسانے وغیرہ ابواب قابل مطالعہ ہیں انمیں سے کئی ابواب اس تالیف سے پہلے رسالوں میں چھپ چکے ہیں ہمیں قابل مؤلف سے توقع ہے کہ وہ بہت جلد اس کا دوسرا حصہ بھی لکھ کر اردو پر احسان فرمائیں گے۔ پاکٹ سائز۔ حجم ..... کتابت وطباعت معمولی قیمت ۱۲؍

پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی اسٹیشن روڈ حیدرآباد (دکن)

پس پردہ یہ جناب آغا حیدر صاحب دہلوی کے ان مضامین کے مجموعہ کا نام ہے جو وقتاً فوقتاً علیگڑھ میگزین اور دیگر رسائل میں نکلتے رہے ہیں۔ آغا صاحب کا نام دنیائے اردو میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ "نسوانی ادب" میں جو کچھ لکھتے ہیں بے لاگ لکھتے ہیں اور بیگمات دہلی کی زبان پر اسقدر قدرت حاصل ہے کہ اب کسی بیگم کو بھی ایسی قدرت باید وشاید ہی حاصل ہو۔

آجکل جہاں اردو کو علمی زبان بنانے میں انتہائی کوشش کیجاتی ہے وہاں ہماری زبان کی اصلی محافظ بیگمات کی زبان کی حفاظت بھی از بسکہ ضروری ہے۔ جو لوگ اردو کی موجودہ ترقی کو دیکھتے ہوئے اس کے سخت مخالف ہیں انہیں ا[illegible]

بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جس زبان میں نسوانی ادب مفقود ہوگا وہ زبان کبھی مکمل نہیں کہی جاسکتی اگرچہ آج قلعہ معلیٰ کی اردو بہت کم بلکہ قطعی نہیں بولی جاتی کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا اس صورت میں یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو سرے سے نیست و نابود ہی کر دیا جائے اور اگر ایسا کیا گیا تو ایک وقت آئیگا کہ لغات اردو سے انکی زبان کے الفاظ روزمرہ اور محاورات کو بھی خارج کر دینے پڑیں گے۔ کیونکہ لغات میں صرف انکے معنی ہی معنی رہجائیں گے اور کوئی انکا صحیح محل استعمال نہ جان سکے گا لہٰذا ملک کو اس نسوانی لٹریچر کی قدر کرنی چاہیے اور آغا صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ وہ ادب اردو میں اس صنف کو مکمل فرما رہے ہیں ساتھ ہی ہمیں آغا صاحب موصوف سے یہ توقع بھی رکھنی چاہیے کہ جہاں وہ دکھن زبان کی لغت مرتب فرما رہے ہیں وہاں وہ بیگمات دہلی کے روزمرہ اور محاورات کی بھی ایک جامع لغت تالیف فرما کر ادب اردو پر احسان فرمائیں گے۔

ملک کو مولوی عبد الباسط صاحب ایم۔ اے کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے نہایت قابلیت سے اس مجموعہ مضامین کو ترتیب دیکر نہایت عمدہ کاغذ اور نفیس لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع فرمایا ہے امید ہے کہ مولوی صاحب موصوف جناب آغا صاحب کے دیگر مضامین کو بھی یکجا کر کے جلد شائع فرمائیں گے۔

اس مجموعہ میں چھوٹے بڑے پندرہ مضامین ہیں جن میں "حامد دیوان اور مباحثہ" "محل سرا میں" اور "نائی کرامت" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ہم ناظرین زبان سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ پس پردہ کا ایک ایک نسخہ ضرور منگا کر بیگمات دہلی کی چٹخارہ اور لوچدار زبان کا لطف اٹھائیں۔

پاکٹ سائز ۱۰۴ صفحے قیمت صرف ۸؍ ملنے کا پتہ:۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ہلاک جستجو یہ چھوٹا سا فسانہ جناب محمد شفیع صاحب شفیع و کاشف اکبر آبادی ایڈیٹر "مسلمانوں کا اخبار" کا ادبی فسانہ ہے آپکا نام دنیائے ادب میں نیا نہیں ہے زبان میں آپ کے دو معرکۃ الآرا فسانے "شوالہ" اور "پہاڑی لڑکی" نکل چکے ہیں جو بیحد مقبول ہوئے ہیں زیر تنقید افسانہ نثر شاعری کا بہترین نمونہ ہے قصہ کا پلاٹ اسقدر دلچسپ ہے کہ ایک مرتبہ شروع کر کے پھر بغیر ختم کئے ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ناول اور ادب لطیف کے شائقین ضرور منگوا کر پڑھیں۔

مصنف کے نام کشمیری بازار آگرہ کے پتہ سے ۸؍ میں مل سکتی ہے۔

عبرت کدہ یہ چھوٹے چھوٹے آٹھ اخلاقی فسانوں کا مجموعہ ہے جس کے مصنف پروفیسر اکبر حیدری ایم۔ آر۔ اے۔ ایس ہیں جنکا نام ادبی حلقوں میں کافی سے زیادہ شہرت حاصل کر چکا ہے آپ ایک عرصہ تک رسالہ "اردوئے معلیٰ" دہلی کو ایڈٹ کرتے رہے ہیں۔ آپ کے دل میں قومی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر مضمون و نثر میں اس کا رنگ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے ان افسانوں میں قوم کی پستی کا عبرتناک انجام پیش کیا گیا ہے اور ہر

افسانے کے اختتام پر "عبرت" کے تحت اس کا ماحصل نہایت عبرت آمیز اور سبق آموز الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین قیمت ۱۲؍ جو کسی قدر زائد ہے۔

مرقع عبرت یا ایک عیاش کی ڈائری یہ افسانہ بھی پروفیسر صاحب موصوف ہی کا لکھا ہوا ہے شروع میں حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا مختصر سا مقدمہ ہے اسکے بعد مصنف نے تمہید و تعارف کے تحت میں مسلمانوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی جو کمی ہے اور اس سے آئے دن قوم جن لغویات میں مبتلا نظر آتی ہے اسکا نہایت مؤثر پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ فسانہ کے شکل ، عبرت کا جو فرضی کیرکٹر پیش کیا گیا ہے وہ درحقیقت ہماری زوال پذیر قوم کا سچا فوٹو ہے اس کا ہر باب اگرچہ مختصر ہے مگر اسقدر جامع ہے اور نتیجہ خیز ہے کہ ہزار ضخیم داستانوں پر بھاری ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسکو پڑھے ، سُنے ۔ اور سُنائے اور اس سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں عبرت حاصل کرے نیز ہمارے بیہودہ اور اخلاق سوز ناولس حضرات کو بھی اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے انہیں بھی ایسے ناول لکھ کر تباہی و گمراہی کے عمیق غار میں گرنے سے اپنے آپ کو اور قوم کو بھی بچائیں۔

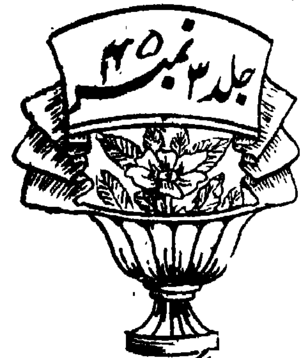
آجکل ہماری قوم کو ایسے اخلاقی فسانوں کی اس شدت سے ضرورت ہے کہ ہمارے خیال میں مشہور فسانہ نگاروں سے اس قسم کے افسانے اس کثرت سے لکھوائے جائیں اور اسقدر ارزاں فروخت کئے جائیں کہ عریاں اور مخرب اخلاق ناولوں کی اشاعت کا بازار بالکل سرد ہو جائے۔

پروفیسر موصوف ملک و قوم کے بجا طور پر شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ قوم کے انحطاط و زوال سے متاثر ہو کر بڑی سرگرمی کے ساتھ قوم کی فلاح و اصلاح میں حصہ لے رہے ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا قیمت ۸؍

کیفستان یہ ادب لطیف کے پرکیف مضامین کا مجموعہ بھی پروفیسر موصوف ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے اسمیں چھوٹے چھوٹے چودہ ادبی جواہر پارے ہیں اگرچہ ادب لطیف میں لکھے گئے ہیں مگر اسمیں مصنف نے اپنے طبعی رنگ کو اس عمدگی سے نباہا ہے کہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ ہم پروفیسر صاحب کو انکی اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں کہ وہ اس طرز تحریر میں بھی اپنے خاص مقصد کو عمدگی کے ساتھ ادا کر سکے ہیں۔ یہ بات ہر کسی کو میسر نہیں ع۔ ایں سعادت بزور بازو نیست ۔ پاکٹ سائز نفیس کتابت و طباعت قیمت صرف ۴؍۔

ہر سہ کتب مذکورہ کے ملنے کا پتہ :- دفتر اردوے معلیٰ ۔ شاہجہانی پریس ۔ دہلی

خوشتر منگرولی



بسم اللہ الرحمن الرحیم

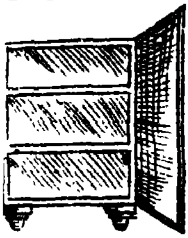


زبان

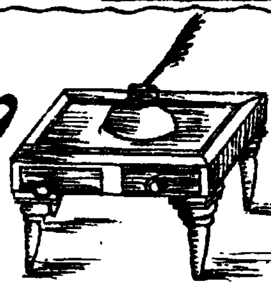
مئی ۱۹۲۸ء

منگرول (کاٹھیاواڑ) سے ہر ماہ کے آخری ہفتہ مین شایع ہوتا ہے

فہرست مضامین



صفحۂ ادارت



یہ نمبر بھی جدید مذاق کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے یعنی ہر مضمون کے بعد ایک نظم کا التزام کیا گیا ہے اور ہر مذاق فراہم کئے گئے ہیں چنانچہ تاریخی علمی ادبی مضامین سے آراستہ کرکے قارئین **زبان** کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

پہلا مضمون جناب مہربان علی صاحب بی، اے، کا ہے جس میں زوال اندلس کے اصل اسباب پر نہایت محققانہ رو[شنی] [ڈالی] گئی، اس قبیل کے تاریخی مضامین بہت کم نظر سے گذرتے ہیں۔ اگلے نمبر میں بھی آپکا معاشیات پر ایک مضمون نکل چکا ہے نوعیت کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہے، امید کہ اپنی علمی کاوشوں کے نتائج سے قارئین **زبان** کو آئندہ بھی بہرہ [مند] فرمایا کریں گے۔

زبان کے خصوصی مقالہ نگاروں میں سے قارئین جناب مظہر احمد صاحب ادہمی کے علمی کارناموں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ زبان میں آپکے جس قدر مضامین نکلے ہیں وہ پسندیدگی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے ہیں۔ آپکو ادق مسا[ئل] آسانی اور سہل زبان میں ادا کر دینے پر جو قدرت حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ "اسلامی علم اخلاق" اہل مغر[ب] [کے] اعتراضات کے جوابات جس عمدگی سے تحریر فرمائے ہیں وہ آپکے تبحر علمی پر دال ہیں۔ یہ مضمون اگرچہ صاحب مضمون کے [نزدیک] ہنوز تشنہ ہے تاہم اس قابل ہے کہ اسکا انگریزی میں ترجمہ کرکے یورپین معترضین کی نظروں سے بھی گذار دیا جائے۔ [اس] نمبر سے آپکے ایک طویل مضمون "مصر کا قدیم مذہب" کا سلسلہ شروع کیا جائیگا جو چار پانچ اشاعتوں پر ختم ہوگا۔ اگرچہ [ایک] رسالہ میں طویل اور مسلسل مضامین کا سلسلہ کسی قدر گراں گذرتا ہے لیکن وہ ایسے علمی جواہر پاروں اور معلومات سے [پُر] ہوتا ہے کہ ہم اسکو مسلسل شایع کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر مضمون نگار حضرات زبان کے حجم کا خیال [رکھ کر] مختصر مضامین ارسال فرمایا کریں۔

فسانوں میں اقبال احمد صاحب اقبال کا افسانہ "مہر موہوم" عوام کی دلچسپی کا بہت کم سامان رکھتا ہے مگر ا[س کا] رشیدہ، اور مظفر کا کرکٹر قابل تعریف ضرور ہے۔ عشرت رحمانی معاون مدیر رسالہ "نیرنگ" رامپور نے اپنے مزاحیہ [مضمون] میں "اخبار کے ایڈیٹر" کا کامیاب خاکہ کھینچا ہے جو نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ آئندہ نمبر آپکا بھی ایک طویل مضمون

مومن کی شاعری" پر مسلسل شایع ہوگا نیز واثق صاحب کا تنقیدی مضمون "خیابان خلیل" آیندہ نمبر سے بالاقساط درج ہوا کریگا

نظموں میں بھی کیف صاحب کی نظم "احساس پستی" پہاڑی کی تلہٹی میں موزوں ہوئی ہے جس کے رفعت خیال کی داد تو دنیا پست خیالی ہے "بت خانہ" اور "رازعاشقی" کے لئے ہم ابوالفاضل چاندپوری کے ممنون ہیں۔

ابوالمعانی بسمل بلگرامی مدیر آئینہ اپنے "بتخانہ" میں ایک جدید "بتکدہ" کی بنیاد ڈالکر اور اوسمیں ایک نئے مگر حسین "بت" کی تخلیق کرکے پھر اوسی سے ایک "بت حیلہ جو" کی پرستش کراکر ایک جدید مذہب کا سنگ بنیاد ڈالا ہے کیا صاحب بتخانہ "اصنام پرستوں" کے نزدیک "کافر" نہیں قرار پاسکتے؟

ہمیں اسکے باور کرنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے جبکہ ایک "آسمانی ہستی" "رازعاشقی" بتلارہی ہے

یعنی نیاز مندی عاشقی کی زندگی ہے

"کسواسطے روتا ہے تو" کے تسکین بخش کلمات اور اس کے پند و نصائح چاہے اوروں کو پسند نہ آئیں لیکن ہمیں تو یہ نصایح اس ممبر موعظمت پر جلوہ افروز ہونے والے شریعت پناہ کے واعظ و نصیحت سے کچھ بھلے ہی معلوم ہوتے ہیں جو ریائی زہد و تقویٰ ایک عالم کو مبتلائے فریب کئے ہوئے ہیں۔

مشاہیر کی غزلیات میں بعض اشعار تیر و نشتر کا حکم رکھتے ہیں۔

مارچ نمبر کے صفحہ ادارت میں ہماری بے بسی و مایوسی نے جن حضرات کو متاثر کیا ہے اسمیں مکرمی حکیم محمد یوسف حسن صاحب مدیر "نیرنگ خیال" لاہور نے ہمارے ساتھ سب سے زیادہ سچی ہمدردی اور سچے اخلاص کا ثبوت دیا ہے جس کیلئے ہم موصوف ہمعصر کے بیحد مشکور ہیں۔ ذیل میں ہم آپکے اس مکرمت نامہ کی نقل بجنسہ درج کرتے ہیں۔

"محترمی۔ السلام علیکم۔ آج کئی ماہ کے بعد زبان کا مارچ نمبر ملا صفحہ ادارت کے مطالعہ سے اس المناک حقیقت کا انکشاف ہوا جو دنیائے صحافت کے لئے ایک عبرت انگیز سبق ہے، کاٹھیاواڑ سے ایک اچھے رسالہ کا اس دیدہ زیبی سے شایع ہونا علمی و ادبی حلقوں میں غنیمت سمجھا جاتا ہے اس پر "دلدادگان اردو" کی سردمہریوں سے اگر وہ مٹ گیا ہے تو اس پر جسقدر بھی ماتم کریں کم ہے"

نیرنگ خیال کو ترقی دینے کے دوران میں مجھے سب ہی قسم کی تجارت کا موقعہ ملا، ان میں سب سے تلخ تجربہ وہ غلطیہ

مالی نقصان ہے جو بقدر ۸-۹ ہزار کے میں ۴ سال کے عرصہ میں اُٹھا چکا ہوں اور جس کی قربانی کے بعد نیرنگ خیال اپنی گذشتہ اشاعت کے بل پر آمد و خرچ کے پلڑے کو شاوی بنا رہا ہے مگر اس عظیم مالی نقصان کی تلافی کی مجھے کوئی صورت نظر نہیں آتی منگرول اور لاہور میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لاہور میں نیرنگ خیال کے تین چار سو پرچوں کی کھپت ہے مگر منگرول میں یہ ممکن نہیں۔ آپ کو سنگلاخ زمین کا رونا ہے میں کہتا ہوں کہ علیگڑھ کی سرسبز و شاداب زمین سے "سہیل" کا اجرا بھی اتنی معاون پیدا نہ کر سکا کہ سب اعلان وہ آرٹ کی تصاویر سے رسالہ کو مزین کر سکے۔ ایک سال کے تجربہ کے بعد انہیں رجعت قہقری اختیار کرنی پڑی نیرنگ خیال ۴½ اور پانچ مستقل اشاعت رکھنے پر بھی نالاں ہے کہ ہندی رسائل کی اشاعتوں کا مد مقابل نہ ہو سکا!! ابھی اسکی مالی حالت اتنی مضبوط نہیں کہ میں اسے خطرہ سے باہر سمجھ سکوں۔ ہندوستان میں جبتک مانگ کر اخبار اور رسالہ پڑھنے کا دستور لکھے پڑھے آدمیوں میں باقی ہے اور جبتک وہ روزمرہ کی ضروریات میں اخبارات و رسائل کا خریدنا شامل نہیں کرینگے۔ نیز جبتک ہندوستان کا محکمہ ڈاک اتنا منظم نہ ہو جائے کہ رسائل و اخبارات راستہ میں چوری نہ ہوا کریں اردو صحافت کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

زبان کے لئے سب سے ضروری مسئلہ تین سال تک اخراجات کی بہم رسانی ہے اگر کسی والئی ملک سے سو دو سو روپے ماہوار کی مستقل اعانت ملجائے اور یہ اعانت کم از کم تین سال تک جاری رہے تو ہو سکتا ہے کہ منگرول سے زبان اتنے خریدار پیدا کرے کہ آمد و خرچ برابر ہو جائے۔ آپ ہمت نہ ہارئے آپنے جسقدر بھی کام کیا ہے قابل تعریف ہے۔ زبان کے دوستانی کا جو مژدہ آپنے صفحہ ۲۹ پر درج کیا ہے اُسکے مطالعہ سے اُمید کی جھلک نظر آنے لگی ہے خدا کرے انشاءاللہ آپ کامیاب ہوں مجھے آپ کی جدوجہد کا احساس ہے اور میں زبان کی ہر ممکن امداد کے لئے تیار ہوں۔ نیرنگ خیال بھی امداد کے لئے حاضر ہے۔ مجھے آپسے دلی ہمدردی ہے اور میں اسکا عملی ثبوت دینے کو تیار ہوں انشاءاللہ جو کچھ بھی آپ امداد چاہیں گے میں اسکی بجاآوری میں مسرت محسوس کرونگا۔

منتظر

حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور"

آپ کی اس دلی ہمدردی و حوصلہ افزائی کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے کہ اس انانیت و خود غرضی کے زمانہ میں کون ایسی ہمدردی کا اظہار کر سکتا ہے، آپنے اپنے حوصلہ افزا کلمات سے مری مردہ تمناؤں میں جان ڈالدی۔ کیا زبان بھی نیرنگ خیال کی کسی خدمت سے سرفراز ہو سکتا ہے؟

خوشتر منگرولی

مقالات تاریخی

اندلس میں اسلامی سلطنت کے زوال کے اسباب

(از جناب مہربان علی صاحب بی۔اے متعلم ایم۔اے، ایل، ایل، بی۔ مسلم یونیورسٹی)

بنو اُمیہ نے اندلس میں تقریباً چار سو برس حکومت کی اور اُسکو قعر مذلت سے نکالکر بام ترقی پر پہونچا دیا لیکن افسوس ہر کمالِ را زوال۔ یہ عظیم الشان حکومت صفحۂ ہستی سے صرف غلط کی طرح مٹ گئی۔ کسی نے سچ کہا ہے، زندگی موت کیلئے ہے ریکی روشنی کیلئے۔ ترقی تنزلی کیلئے۔ پستی بلندی کے لئے۔ افسوس

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

مختصر یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے۔ ہر ذی روح ہستی زوال پذیر ہے، یہی قانون قدرت ہے جو ہمیشہ ہوتا رہا اور تا قیامت ہوتا رہیگا۔

اب ہم اپنی موضوع بحث کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور سلطنت اسلامی کے زوال کے اسباب کو ناظرین کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

قبائلی جنگیں

یہ امر مسلمہ ہے کہ بنی اُمیہ نے اندلس میں جو سلطنت قایم کی تھی اوس کے زوال کے اسباب میں سب سے پہلا قبائلی جنگوں کو سمجھا تا ہے، واقعہ یہ ہے کہ چند افراد کی اُلوالعزمی کیوجہ سے اندلس فتح ہوا تھا۔ جہاں ایک عمدہ حکومت اور وسیع سلطنت قایم ہو گئی۔ لیکن افسوس ہے کہ جب اسلامی حکومت نے اندلس میں ترقی کرنا شروع کیا تو قبائلی جھگڑوں نے اُسکو کمزور کر دینا چاہا۔ چنانچہ عبدالرحمن الداخل کی آمد سے قبل بجائے اسکے کہ مسلمان تمام اندلس پر چھا جاتے۔ وہ آپس کے قبائلی جھگڑوں میں مشغول ہو گئے اور سفیری و حمیری آپس میں ہی گتھم گتھا ہونے لگے ان عام فسادوں سے وہاں کے عیسائیوں نے فائدہ اُٹھانا چاہا لیکن عبدالرحمن الداخل کی یکایک آمد نے عیسائیوں کے بلند حوصلوں کو پست کر دیا۔ چنانچہ اس جلیل القدر اور دلیر بادشاہ نے اندلس کی سلطنت میں شیرانہ بندی کر کے اُسکی بگڑی ہوئی حالت کو درست کیا اور ۱۳۸ھ سے ۱۷۲ھ تک عنان حکومت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ چنانچہ اس ۳۴ سال کے عرصہ میں اوس نے نہ تو مصریوں اور حمیروں کو ایک دوسرے کے خلاف سر اُٹھانے کا موقع دیا اور نہ عیسائیوں کو سنبھلنے دیا

بلکہ اُن کو شکست پر شکست دی اس اولوالعزم بادشاہ کے انتقال کے بعد ہشام - الحکم - عبدالرحمن ثانی اور عبداللہ کا زمانہ گذرا
اس عرصہ مین عیسائیون سے جنگین ہوئین - لیکن عبداللہ کے زمانہ مین اُن قبائلی جنگون کا پھر آغاز ہوا - جو عبدالرحمن الداخل
کے زمانہ مین ختم ہو چکی تھین - پس ۱۷۲ھ تا ۲۷۲ھ سو برس کے عرصہ مین اندلس کی حالت اور عام نظم و نسق کی کیفیت
کچھ قابل اطمینان نہ رہی - عبدالرحمن ثانی کے زمانے مین عمر ابن حفصون کی مشہور بغاوت کا آغاز ہوا جو ایک عرصہ دراز تک جاری
رہی عبداللہ کا عہد حکومت قبائلی جنگون کیوجہ سے نہایت خراب رہا - اور عام بدنظمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنو اُمیہ کی ایک بڑی سلطنت
گھٹ گھٹا کر صرف قرطبہ کی چار دیواری تک محدود رہ گئی - ۲۷۸ھ مین عمر ابن حفصون سے جو جنگ ہوئی اور جو جنگ پولی
کے نام سے تاریخ اسلام مین مشہور ہے - اُس نے عبداللہ کی بگڑی ہوئی قسمت کو سنوار دیا - چنانچہ اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا
کہ عمر ابن حفصون کو کامل شکست نصیب ہوئی اور عبداللہ کی عظمت کا سکہ لوگون کے دلون پر بیٹھ گیا لیکن سلطنت کی
حالت پھر بھی نہ سنبھل سکی - ۳۰۰ھ مین عبداللہ نے انتقال کیا تو عنان حکومت اوسکے بیٹے عبدالرحمن (جو بعد مین
عبدالرحمان الناصر کے نام سے مشہور ہوا) کے ہاتھ مین آئی - اوس نے شروع ہی سے اندرون ملک کی حالت سنبھالی،
باغی طبقون کو تنبیہ کی - باغی عرب امراء کو زیر کیا - اور تمام ملک کو اپنے جھنڈے کے تلے لے آیا - اس عام انتظام کے
بعد شمالی عیسائیوں اور جنوبی فاطمیوں کی طرف رجوع ہوا - اِن دونوں طاقتوں کو وقتاً فوقتاً شکستین دیں - اور اگر سچ پوچھیے
تو عبدالرحمن الناصر کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اُس نے شمالی اور جنوبی طاقتون کے پنجہ سے اپنی سلطنت کو بچائے
رکھا لیکن اوسکو بھی اسقدر لڑائیاں لڑنی پڑین کہ اپنی سلطنت کو حقیقی معنون مین مضبوط اور مستحکم نہ بنا سکا - لہذا قبائلی
جھگڑے جو عبدالرحمن الداخل کے زمانہ مین بند ہو کر عبداللہ کے زمانہ مین پھر شروع ہو گئے تھے اور جنھون نے سلطنت کے
بہت سے حصوں مین طوفان بے تمیزی مچا رکھا تھا - عبدالرحمن الناصر کے زمانہ مین ختم ہوئے لیکن اس عرصہ دراز مین
رہ سلطنت اسلامی کو وہ کچھ نقصان پہونچا گئے کہ آخر وقت تک سلطنت کا سنبھلنا دشوار ہو گیا - بہرحال گذشتہ واقعات
سے سبق حاصل کر کے عبدالرحمن الناصر نے یہ خیال کیا کہ جبتک عرب اُمراء کا زور نہین توڑا جائیگا - اور جبتک قبائلی
جنگون کو بالکل فرو نہ کیا جائیگا اوسوقت تک کامل اطمینان حاصل نہین ہو سکتا - لہذا اُس نے سب سے پہلے قبائل جنگون کو
پست و نابود کیا - بعدازان عرب اُمراء کا زور توڑنا چاہا اور اس لحاظ سے حاجب یا وزیر اعظم کا عہدہ جسپر عرب اُمراء مین سے
کوئی بڑا امیر مقرر کر لیا جاتا تھا توڑ ڈالا - اسکے بعد اُن سے دوسرے بڑے عہدون پر عرب اُمراء کا تقرر نہ کیا - بلکہ بربری اور
صقالیہ کو (جو اسوقت یوروپ کے ممالک کے باشندے اپنا اپنے ملک سے بچون کو فروخت کرنیکے لئے اندلس بہت لاتے تھے
اور جو مملوک کہلاتے تھے بازارون مین بہت سے خرید کر کے اور انکی حالت کو سنوارا اور انکو عروج دیا اور ان لوگون کی بڑی بڑی

تنخواہیں مقرر کیں اور ان کا بڑے بڑے عہدوں پر تقرر کیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو بربر اور صقالیہ کو عروج حاصل ہوا اور دوسری طرف عرب قومیت کو زوال ہوا۔ جو حقیقت میں اسلامی سلطنت کے زوال کا ذمہ دار ہے۔ مختصر یہ ہے کہ عبدالرحمٰن الناصر نے خیال کیا تھا کہ نو پرورہ اور زرخرید غلام جاہ و حشمت پاکر بادشاہ وقت کے خلاف کبھی سر نہ اٹھائیں گے اور اُسکا یہ خیال بالکل درست تھا۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ زرخرید غلام الناصر کے بعد بھی اُسکے اولاد کے خلاف سر نہ اُٹھائیں گے چنانچہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم۔ پس الناصر کے زمانہ میں جب یہ غلام ایسے مالدار ہو گئے کہ اپنے لئے خود غلام خریدنے لگے تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان غلام اُمراء کی طاقت کیا ہوگی۔ اس عام مرفہ الحالی کا یہ نتیجہ ہوا کہ الناصر کی وفات کے بعد یہ غلام بھی بادشاہ وقت کے خلاف باغی ہو گئے۔ اور کیوں نہ ہوتے۔ الناصر نے تاریخ کی شہادتوں کی موجودگی کے باوجود ایک سیاسی غلطی کی تھی۔ حضرت عمر کے زمانے میں عرب قومیت کے عروج کی کس طرح کوشش کی گئی اور حضرت عمر کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ جبتک عرب قومیت عروج پر رہے گی اوسوقت تک عربوں کا زوال مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عرب قومیت کی عام طور سے حفاظت کیجاتی تھی لیکن جب بنو عباس کے زمانہ میں عرب قومیت کو زوال پذیر بنایا گیا اور ایرانیوں کو عروج دیا گیا تو کچھ عرصہ بعد بنو عباس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس تاریخی مثال کو نظر انداز کر کے ہم ہندوستان کی مثال کو لیتے ہیں۔ یہ ایک سیاسی نظریہ ہے جو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ہر قوم اپنا عروج اور اعزاز و افتخار قائم رکھنے کے لئے اپنے ہم قوم کی عزت کرتی ہے اور حکومت وقت کو سیاسی اغراض کی وجہ سے ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزوں کی جو جاہ و عزت ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بڑے بڑے انگریزوں کا تو کیا سوال ایک انگریز کانسٹبل کی جو قدر کے دلوں میں ہے وہ قدر شاید ایک بڑے سے بڑے ہندوستانی کی بھی اُنکے دلوں میں نہیں ہے حاصل کلام یہ ہے کہ وقت کو اپنی قوم کی عزت کا خیال رکھنا پڑتا ہے جس کو الناصر نے وقتی فائدہ کی وجہ سے نظر انداز کر دیا تھا اور آزمائی ہوئی بات کو دوبارہ آزمایا۔ آزمودہ را آزمودن جہل است۔ لہٰذا الناصر اور اسکے بعد المنصور کی حکمت عملی جس نے عرب قومیت کو زوال پذیر کیا۔ سلطنت اسلامی کے لئے گران بار ثابت ہوئی۔ اور آخر کار اس نے اسلامی سلطنت کے زوال کے اسباب میں ایک اور اضافہ کیا۔ اسی کے ساتھ الناصر اور ابی عامر منصور نے اپنے اپنے عہد میں قبائلی فساد کو مٹانے کے بعد ان نے طبقہ کے افراد کو ملا کر ایک قوم بنا دینا چاہا۔ لیکن حسن اتفاق سے انہی دو عہدوں میں عام امن کی وجہ سے تجارت نے ترقی کی۔ صنعت و حرفت کو فروغ حاصل ہوا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشی جدوجہد شروع ہو گئی۔ اس عام معاشی ترقی میں متوسط طبقہ خوب مالدار ہو کر سرمایہ دار بن گیا۔ اب نیچے کا طبقہ مزدوروں کا رہا۔ اور دوسرا اوپر کا طبقہ غلام اُمراء کا۔ ان تین طبقوں کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا۔ چنانچہ منصور (ابی عامر) کے زمانہ میں مزدوروں کا طبقہ اس بات کا شاکی تھا کہ اسلدار ہمکو مزدوریاں کم دیتے ہیں اور غلام اُمراء یہ چاہتے تھے کہ مزدور لوگ سرمایہ داروں سے جنگ کریں تاکہ سرمایہ داروں کا نقصان ہو۔ اس عام

کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب آپس میں جھگڑا چلا اُس زمانہ کی کیفیت وہی تھی جو آجکل یورپ کی ہے اور جس نے یورپ کے بڑے بڑے معاشین کو خوفزدہ بنا رکھا ہے۔ اسوقت مزدور اس پر تلے ہوتے ہیں کہ سرمایہ داروں کے طبقہ کے زور کو کم کیا جائے لیکن اصلاً اس بات پر متفق ہیں کہ مزدوروں کو حد سے زیادہ بڑھنے نہ دیں گے۔ مختصر یہ ہے کہ ابی عامر کے زمانے میں (جو ہشام ثانی کا وزیر اعظم تھا اور جس کے سامنے ہشام ثانی ایک طفل مکتب تھا) اِس قسم کی جنگ شروع ہوئی جسمیں یہ گل کھلا کہ صقالیہ اور بربریوں نے ایک طرف سرمایہ داروں کے خلاف اور دوسری طرف مزدوروں نے بھی سرمایہ داروں کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اس عام کشمکش کا نتیجہ ہشام ثالث کے زمانے میں یہ نکلا کہ حامدین سلطنت نے شاہ وقت کو ایک تاریک کوٹھری میں بند کر کے ما یحتاج زندگی حاصل کرنیکے لئے اپنی کمترین خدام ادب سے عاجزانہ التجا کرنے پر مجبور کر دیا۔

اِس قسم کی عبرت خیز نظارے اب قرطبہ میں نئے اور انوکھے نہ تھے بلکہ اکثر و بیشتر وقوع پذیر ہوتے رہتے ہر انقلاب اپنے ساتھ تازہ آفتیں لاتا۔ شورش پسند گروہ قرطبہ میں تعداد میں بڑھتا رہا۔ یہانتک کہ المنصور کے محل کو تاخت و تاراج کیا گیا اسمیں آگ لگا دی گئی چار دن تک مسلسل قتل عام کا بازار گرم رہا حتی کہ مدینۃ الزہرہ کی بھی باری آئی وہ مدینۃ الزہرہ جو خلیفہ اعظم کا مایۂ ناز محل تھا۔ دغا بازوں نے اُسپر قبضہ کر کے لوٹ لیا اور آگ لگا دی اُسوقت حالت یہ تھی کہ صقالیہ اور بربر نے ایک طوفان بے تمیزی مچا رکھا تھا اور اُنکے ساتھ مزدور بھی تھے۔ اسوجہ سے خلیفہ پر خلیفہ تخت نشین کیا جاتا۔ کبھی بنو اُمیہ کا اور کبھی بنو ھود کا۔ اور جب ان بادشاہوں سے تسلی نہوتی تو حکومت کا بار ٹاؤن کونسل (مجلس اُمراء قرطبہ) کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ مرکزی حکومت کا یہ رنگ دیکھکر صوبہ جات کے گورنر خود مختار ہو بیٹھے۔ غرض ہر شہر ہر قصبہ اور ہر ضلع خود مختار ہو بیٹھا مگر عام اسپین کے باشندے اِس طوائف الملوکی میں شریک نہوئے، وہ اپنی بیکسی پر متاسف اور خاموش تھے۔ سرداران بربر نے جنوبی اضلاع پر کل قبضہ کیا۔ صقالیہ نے مشرقی صوبے اپنے تحت میں لئے۔ باقی اضلاع پر گورنر اور بعض نو دولتیے خاندانوں نے اپنا قبضہ جمایا اور اسوقت قرطبہ اور سیوال نے جمہوری حکومتیں قایم کر دیں غرض گیارہویں صدی یا پانچویں ہجری کی شروع میں الناصر اور منصور کی حکمت عملیوں نے خوب خوب گل کھلائے اور عوام کو یہ اندازہ ہوگیا کہ عرب قومیت کا زوال اور عام لوگوں کو ملا کر ایک قوم بنانا اور بربر اور صقالیہ کو عروج دینے کا کیا نتیجہ ہوا۔ پس اِس عام بے چینی سے شمالی عیسائیوں نے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ یہ وہ عیسائی تھے جو مسلمانوں کی فتح کے وقت تعداد میں کل تین سو تھے اور جو انکی تلواروں سے بچکر غاروں میں جا چھپے تھے۔ اور شہد چاٹ چاٹ کر زندگی بسر کر رہے تھے لیکن مسلمانوں نے اِس طرف دھیان نہ دیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یہی قلیل تعداد ایسی بڑھ گئی کہ جس نے شمال میں ایجوریا۔ لیون اور کیسٹائل کی سلطنتیں قایم کر دیں اور جنکا وجود مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے اہم اسباب میں شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان عیسائی سلطنتوں نے مسلمانوں کی عام ابتری میں اضافہ کرنا چاہا۔ چنانچہ اندلس کے خود مختار شہزادوں کو مختلف

مقامات پر قابض تھے۔ ایک دوسرے سے لڑوادیا۔ اور آخرکار سبکو کمزور کرکے عیسائی سلطنت کیسٹائل نے (جو سب سے زیادہ طاقتور تھی) تمام مسلمان شہزادون کو اپنا مطیع بنایا۔ پس اس گری ہوئی حالت مین جو کہ مسلمان نہایت خراب وخستہ اور عیسائیون کے باجگذار بنگئے تھے، خدا نے مسلمانون کی مدد کی۔ اور یوسف ابن تاشفین کو افریقہ سے بھیجا جس نے زولاقہ کے مقام پر کیسٹائل کے بادشاہ کو شکست دی اور اندلس کی اسلامی سلطنت کو کچھ عرصہ کے لئے خاتمہ سے بچا لیا۔ اسکے بعد جب حالت خراب ہوئی تو عبدالمومن نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ مین لی اور خاندان المہدی کا بانی ہوکر حاکم سلطنت بنا اسکے بعد بنو نصیر کے قبضہ مین سلطنت آئی جسنے صرف غرناطہ پر حکومت کی۔ اسکے بعد یہ شہر بھی عیسائیوں نے چھین لیا۔ پس ایک طرف تو قبائلی جنگون نے اور دوسری طرف بربر اور صقالیہ کے عروج نے اسلامی سلطنت کے زوال کے اسباب مہیا کئے، اسکے علاوہ الناصر اور منصور کی قومی حکمت عملی نے اسلامی سلطنت کو صدمہ پہونچایا۔ علاوہ اسکے الناصر کے بعد اسقدر کمزور بادشاہ ہوئے کہ وہ گرتی ہوئی حالت کو قطعاً نہ سنبھال سکے اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ الناصر اور منصور کے زمانہ مین سلطنت اندلس کو افریقہ کی فاطمی سلطنت سے بھی بڑی جدوجہد کرنی پڑی جس کیوجہ سے اسلامی حکومت کی طاقت کمزور ہوتی گئی۔ اور سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ شروع مین شمال کے عیسائی آبادی کیطرف کبھی توجہ نہ کی گئی جس کیوجہ سے آخرکار عیسائیون کے مقابلہ مین مسلمانونکو شکست اٹھانی پڑی۔ پس یہی وہ اسباب ہین جو اسلامی سلطنت کے زوال کے ذمہ دار ٹھیرائے جاسکتے ہیں افسوس

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

جناب ولایت حسین خان صاحب اثر رامپوری

تیری صورت کا ہے اپنی شکل پر دھوکا مجھے
یہ کمالِ عشق والفت ہے کہ ہے سودا مجھے

مل گئے کیا آپ مجھکو مل گئی دنیا مجھے
اس سے بڑھکر اور دولت چاہئے اب کیا مجھے

پڑگیا ہے جب سے دردِ عشق کا چسکا مجھے
دیرہی ہے لطف کیا کیا خواہشِ ایذا مجھے

عالمِ وحشت بھی میرا ہے عجب حیرت فزا
ذرہ ذرہ مین نظر آتا ہے اک صحرا مجھے

شکر کیون کر ہو ادا بندہ نوازی کا تری
بحرِ الفت دل دیا ہے درد مین ڈوبا مجھے

مین سمجھتا ہون جو اس آغاز کا انجام ہے
دیرہا ہے کس لئے اے عشق تو دھوکا مجھے

اے اثر دنیا کی ہر شے مین فنا پوشیدہ ہے
عالم ایجاد آتا ہے نظر دھوکا نہ مجھے

نوائے راز

دل کو جلا رہا ہے سوزِ غمِ نہانی — گل ہو کے ہی رہیگی اب شمع زندگانی

جذبات دل کی آنکھین کرتی ہین جمانی — ملتی ہے مجھکو گویا یون دادِ بے زبانی

مانا ہر ایک شے ہے دنیا کی آنی جانی — لیکن یہ واقعہ ہے اک چیز ہے جوانی

مایوسیون نے صورت اُمید کی دکھائی — ناکامیون مین پنہان تھا رازِ کامرانی

ہان اک شعاعِ زرین اس تیرہ بخت دلپر — روشن ہی تجھسے دنیا اے شمعِ لامکانی

اب یادِ عہدِ ماضی دل کو ستا رہی ہے — آنکھون مین پھر رہی ہے تصویرِ کامرانی

اے محوِ عیش و عشرت، مصروفِ خوابِ راحت! — دیکھے ہین مین نے اکثر نیرنگِ آسمانی

اُمید پر ہے قایم دنیا یہ ہے مُسلّم — اللہ! اب کٹے گی کِس طرح زندگانی

آئے حکیم کوئی پھر شوق دید لیکر — خاموش مدتون سے ہی سازِ لنترانی

تو اور حُبّ دنیا، تو اور فکرِ عقبےٰ — معلوم ہو چکے بس اسرارِ لامکانی

اب شوقِ حق پرستی پیدا ہوا ہے دلمین — برباد ہو چکی ہے جب روحِ زندگانی

اے رازؔ اگر سلامت ہے ذوقِ شعر گوئی
ہو جائے گی مرتب روداد زندگانی

راز چاندپوری

اسلامی علم اخلاق اور اخلاق جلالی

بسلسلہ ماسبق

(۴)

اسلامی علم اخلاق مین علامہ جلالی کی بلیغ کتاب فارسی علم ادب کے ذرایع ومنبع کی تفصیل وتوضیح ہی نہین کرتی بلکہ یہ بھی کہ مشرق کا اوس پر کیا اثر رہا ہے، چنانچہ چند دنون سے بعض یورپین مؤلفین اور مصنفین کا جو اس سے بالکل بے خبر مین کہ ایشیائی اقوام کے تنزل کے اسباب کو مناسب اور نیک اندیش طرز پر کیونکر بیان کیا جائے یہ رویہ ہوگیا ہے کہ ایشیائی علوم کی اصولی غلطیون کو علت العلل قرار دین۔ یا دوسرے لفظون مین یون کہین کہ ادراک فہم کی کمی کو کرۂ مسکونہ کی نصف آبادی کے تنزل کا سبب قرار دین۔ حالانکہ یہ ایک زبردست غلطی ہے اور معترضین خود اس کے اسباب سے بے خبر ہین۔ بلکہ اس قسم کے غلط نتائج تو کچھ ان کے آزادانہ پیش بینی ہی کے مناسب معلوم ہوتے ہین جنکی عرض وغایت اسکے سوا اور کچھ نظر نہین آتی کہ وہ اس ڈھنگ سے ایشیاء کے علوم وفنون کو بیخ وبن سے اُکھاڑ کر اُن کی جگہ یورپی علم کا پودا نصب کر دین۔

علم اخلاق مین جلالی کی زبردست تالیف کو دیکھتے ہوئے اگر ہم اس قضیہ کا ذبہ کو جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے نظر انداز کر دین تو یہ غلطی بالکل ہی ناقابل ہوگی بلکہ ترقی کر کے یہ کہدینا بے جا نہوگا کہ نقص فہم وادراک کا الزام ایسے معترضین پر ہی عاید ہوتا ہے کہ ؎ آفتاب آمد دلیل آفتاب

آپ ٹھنڈے دل سے اِس امر کی طرف غور کیجئے کہ اسلامی علم اخلاق پر حضرت ملا جلال الدین دوانی کی کتاب مسمّی بہ ” لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق ،، پندرہوین صدی عیسوی کی تالیف ہے مگر مظاہر قدرت، علم اور اخلاق کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اور ان امور کو اس گرم جوشی کیساتھ بیان کرتی ہے کہ جبتک صفحۂ عالم پر احساس فرض ترغیب وتحریص باقی ہین اسکی چہل پہل بھی باقی رہیگی۔ اِس کا فیصلہ آسانی کیساتھ یون ہو سکتا ہے کہ اوسی زمانہ کی یوروپ کی اس پایہ کی کتاب جو اسی کے برابر فصیح وبلیغ مانی جاتی اور ہاتھون ہاتھ لیجاتی ہو۔ پھر ان دونون کا مقابلہ موازنہ کرو تب پتہ چل سکے گا کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہے اور یورپ کی اس تالیف کا کیا وزن باقی رہ جاتا ہے تب تم کو یورپ کے بیجا اعتراض کا راز منکشف ہو جائیگا۔

بات یہ ہے کہ نہ تو زمانہ کی رفتار ہمیشہ کسی قوم کیساتھ رہی ہے اور نہ رہیگی۔ جب زمانہ کسی قوم کے موافق نہین رہتا ہے تو معترضین اسی قسم کے الزام عائد کیا کرتے ہین کیونکہ جانتے ہین کہ سمت مخالف سے کوئی جواب دے ہی نہین سکتا بس جو چاہو اعتراض کرو۔ اور وہ قوم جس کے اسلاف پر اعتراض کی بوچھار ہوتی ہے وہ خود بھی اس قسم کے اعتراض و الزام کو صحیح تسلیم کر کے اپنے بزرگون کی سعی کو مشکوک نگاہون سے دیکھتے ہین۔ کیونکہ انہین حکومت و سلطنت باقی نہ رہنے کیوجہ سے اُن کے احساس مردہ ہوچکتے ہین اور ان مین بھلے اور برے کی امتیاز باقی نہین رہتی اصل یہ ہے کہ ایشیائی خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور آپس کے جنگ و جدل نے اِن کے بڑھتے ہوئے تمدن کو روک دیا اور یہ ایک طبعی امر تھا اسلئے کہ ہر ایک قوم سرداری اور برتری کی مدعی تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہین کہ مسلمان موردالزام قرار دئے جائین کیونکہ دنیا کی کل اقوام ماضیہ کی یہی حالت رہی ہے اور آج بھی باوجود دعوائے تہذیب و تمدن یورپی اقوام کو اپنی اپنی برتری کے لئے جنگ کرتی ہوئی دیکھ رہے ہین لیکن اس کشمکش کے باوجود مسلمانون کو جہان کہین موقع ملا ہے اور ذرا بھی چین سے بیٹھنا نصیب ہوا ہے وہان انکی روحانی اور مادی ترقی کے کافی آثار موجود ہین۔ مین یہ ضرور عرض کرونگا کہ یہ مقابلہ و موازنہ کی جنگ صرف چند تالیف تک ہی محدود نہین بلکہ زندگی کے ہر شعبہ مین عام ہے ہم اسکا فیصلہ اُن حضرات کی آرا پر جو مسلمانون کے اختراعات علمی سے اور تالیفات سے باخبر ہین چھوڑتے ہین کہ وہ خود ہی دیانت کے ساتھ فیصلہ کر دیکھین۔

یہ لطف تو دیکھئے کہ وہی پودا اگر اسلامی دنیا مین لگا ہو تو زہر ہلاہل ہے اور اگر یورپ مین ہو تو نوش۔ کیونکہ اس کتاب کا اُن زبردست تالیف سے موازنہ اور مقابلہ کرنے پر جنکی صفحہ گردانی کا مؤلف اقرار کرتا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی فلسفہ کا بہت بڑا حصہ یونان سے آیا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ مسلمانون نے پرانا اور بدبودار لباس اتار کر ایک موزون اور ستھرا لباس قطع کر کے پہنا دیا اور وہ اسی شاندار لباس مین وہ قرطبہ وغیرہ کی یونیورسٹیون سے ہوتا ہوا یورپ مین جا پہنچا۔ لوگ وہان جاکر آنکھین گھورنے کہ حسن کش ایسے ہی ہوتے ہین۔ اگر تھوڑی سی دیر کے لئے یہ تسلیم بھی کر لین کہ یورپ نے فلسفہ براہ راست یونان سے لیا ہے تب بھی تو یہ دونون بچے یونان کے ہی تو ہوئے مگر یہ سمجھ مین نہین آتا کہ مسلمانون کے لئے باعثِ ہلاکت اور یورپ کی ترقی کا سبب کیون اور کس لئے ہے،

مین بلاخوف تردید عرض کرونگا کہ "لکلّ امّۃ اجل" کے زبردست قانون سے نہ کوئی قوم بچی ہے اور نہ بچسکتی ہے ترقی کیساتھ تنزل لگا ہوا ہے، چنانچہ حسب قانون فطرت جب مخالف ہوائین چلنے لگین تو مسلمانون کی بڑھتی ہوئی ترقی رک گئی اور لازمی طور سے وہ اور بھی جگہ ٹھہرے رہ گئے جہان تھین چنانچہ گذشتہ دو سو برس سے یورپ برابر ترقی کے

قدم بڑھا رہا ہے جبکہ ایشیا نسبتاً ساکت ہی نہیں رہا ہے بلکہ ناقابل تلافی تنزل کر گیا ہے۔

یہ مسلم امر ہے کہ متقدمین کے علوم متاخرین کیلئے چراغ ہدایت ہوا کرتے ہیں اور ایک کے آثار سے دوسرا استفادہ کرتا ہے، چنانچہ مسلمانوں میں فلسفہ یونان سے بذریعہ ترجمہ آیا ہوگا اور پھر وہاں سے یورپ گیا۔ کیونکہ انسان کا طبعی خاصہ ہی کہ وہ بہتر کی طرف نظر دوڑایا کرتا ہے اور اگر ہم قیاس بالشابہ سے کام نہ لیں تو یورپ کیخاطر بادل ناخواستہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی اور یورپی فلسفہ میں اس قدر اشتراک ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کس کے آثار اور مٹے ہوئے نشانات سے کس نے استفادہ کیا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ صنم پرست قوم کا فلسفہ خدا پرست کے لئے ہادی ہو گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے صنم پرست کو خدا پرست بنا دیا۔ کیونکہ اصلی و طبعی ترقی وہی کہی جا سکتی ہے جو ارادی نہ ہو بلکہ غیر اختیاری طور سے ظہور پذیر ہوا اور یہ بھی لازمی ہے کہ جہاں دماغی تعلقات پیدا ہوں اور اُن کے اثرات منتقل ہوں وہاں رابطہ ماسبق کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ آسانی سے رواج پا سکیں۔ جب دو قوموں کے خصائل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونگے تو ایک دماغی نتائج دوسرے پر بہت جلد اثر کرینگے، یہی باتیں وہ ہیں جنکا یونانیوں اور عربوں کی ابتدائی قومی خصوصیات میں پتہ چلتا ہے۔ مثلاً احساس کی آزادانہ اور فیاضانہ اُفتاد۔ حکومت کا آبائی اور دوستانہ شکل میں بے قیام ہونا قومی آزادی اور خودمختاری کو باوجود بڑی بڑی مخالف طاقتوں کے قایم رکھنا تخیل کا موجود ہونا۔ صاحب روایات ہونا۔ قوائے مخفیہ کا اعتقاد۔ اجنہ کا اشرف المخلوقات میں داخل ہونے کو تسلیم کرنا۔ فرشتوں کا آسمان سے آکر خالق کو ہدایت کرنا اور تسلی دینا۔ بھانت بھانت کے پرندوں و چرندوں کے ذریعہ سے اخلاقی سبق سے زندگی کو پاک ستھرا بنانا وغیرہ،،

یہ ہیں وہ باتیں جو یونان و عرب کے اقوام میں مساوی طور سے پائی جاتی ہیں۔ کسی قوم کی ابتدائی عادات و خصائل کے لئے صرف نام اور مثالوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے تاکہ وہ دوسری قوم کے خصائل کے مہتم بن سکے۔ یہی وجہ تھی کہ عرب نے فلسفہ یونان کو اپنے اندر سرعت کے ساتھ جذب کر لیا۔

عرب کے نیم وحشیانہ اور غیر مہذب عادات و خصائل اور اُن میں اُصول و احساس کی جسقدر برائیاں اور نقائص تھے اُن کو سیدنا محمد الرسول اللہ صلعم نے آکر صاف و مجلا کر دیا۔ اور یہی اُصول جو بد اخلاقی کے محرک اور موجب تھے آپ کی ذات کی وجہ سے برکت و رحمت ہوگئے اور تمام اسلامی دنیا کا فرض ہو گیا کہ وہ اسی قانون پر جس کی آنحضرت صلعم نے تعلیم دی ہے عمل پیرا ہو۔ یہ اسوہ حسنہ فرقان حمید ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ اُنھوں نے چار دانگ عالم میں اپنا ڈنکا بجا کر چھوڑا اب یونانی علوم کا سوال کچھ یوں ہی سا رہ جاتا ہے کیونکہ مسلمانوں نے اُسے اُصول اور طریقہ عمل بنا لیا اور صرف

ابتدائی اُصول واجزاءِ ترکیبی کو کام میں لاکر معراج ترقی پر جا پہونچے اسی طرح اُن معاشرتی نظم ونسق کے نقطۂ خیال سے جن سے کہ تعلقات ماقبل ومابعد میں رشتہ پیدا ہوتا ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یونانیوں کے الوشین اسرار سے اسلامی صوفیت نے اُصول اور اجزاءِ ترکیبی حاصل کئے ہونگے کیونکہ اِن دونوں میں قریبی رشتہ وتعلق پایا جاتا ہے اور ہو بہو الوشین اسرار کی اُصول کی نقل نظر آتی ہے جس نے اِصطلاحات کی ایک ایسی زبردست پوشیدگی پیدا کردی ہے کہ یہ اسرار کی شین ہوگئی ہے۔ اور صوفیت کے کل پیرؤن کا مجموعہ الوشین اسرار کی طرح ایک دلچسپ معمہ بن گیا ہے۔

لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ اسکا ہر ایک جزو یونانی ہے بلکہ ان میں ایک قسم کا مشابہتی تعلق ضرور پایا جاتا ہے بلکہ یونانی اُصول کا اثر بذاتہ مفقود ہو چکا ہے ہاں صرف طریقۂ غور وفکر کا رشتہ باقی رہجاتا ہے اور یہ کوشش کہ اسلامی فلسفہ کو یونان میں جا ملائیں سعی لاحاصل ہوگی اور مسلمانوں کو انکے دماغی نتائج سے محروم کرنا۔ یہ کہ یونان ہی کیوں رہبر بنا۔ اسکی وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے کہ یورپ وایشیا کے وسط میں مخالف عناصر سے بالکل غیر جانبدارانہ رشتہ رکھتا تھا۔ اِس لئے اسکے علوم عالم کے دماغی وفاق کا ذریعہ بن گئے اور آج بھی اسکی اخلاقی تعلیم دوسرے ممالک واقوام میں زندہ نظر آتی ہے اسکے تمام علوم ایشیائی زبانوں اور کتابوں میں نقل ہوکر زندہ ہوئے اور وہیں نشو ونما پایا۔ ایشیا میں اسی وجہ سے یونانی علوم کا پتہ چلتا ہے اور اسی نے یوروپ کو بتلایا۔ کہ یونان کے پاس کیا کیا ذخائر موجود ہیں۔ خواہ آج یورپ کچھ ہی کیوں نہ کہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلامی دنیا اسکی طرف ہاتھ نہ بڑھاتی تو آج کوئی نام بھی نہ لیتا۔

ابتداً موجودہ دنیا کے ہاتھ میں جو رسائل آئے وہ یہی علم اخلاق ہے اوسکی بنیاد ایسی اتفاقی اور محدود اصول پر ہے کہ جسکی اہمیت پر بہت کچھ مباحثہ کیا جاسکتا ہے ہم تک انہی کے ذریعہ سے اُن مقاصد وآرام کی تلخیص کی رسائی ہوئی ہے جو نوع انسانی کے تیسرے عرصہ کی ترغیب وتحریص کے باعث تھے اور ان اجزاءِ تحلیلی کی صداقت کو ماننا ہی پڑتا ہے خاصکر اُن افراد کے لئے جو راستی کو قومی تراغیب کے مختلف شکلوں اور پہلوؤں سے مقابلہ وموازنہ کرکے دریافت کیا چاہتے ہیں اور وہ جو کہ مناظر شتی وازنہ مختلفہ کے انسانوں کے اطوار وعادات کی ترقی کے آثار سے دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو کہ مشرقی سیاسیات کے نظری قانون کے پتہ لگانے یا ماضی کے درس عظیم کو مستقبل کے ساتھ تطبیق کرنیکے معتاد ہیں۔ یہ ادریز مسلمان کا اپنے اصول، انکشاف، شوق اور مطمع نظر ایسے معانے ومقاصد ہیں

جس مین اساءِ تفہیم کی گنجائش ہی نہین کہ اس قسم کی تحریرات کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ انکی سیاسی شہادت کی قدر و قیمت سے اُن کے تفکر و تعقل اور نشو و نما کی اہمیت بالکل ہی جداگانہ اور مستقل ہے گو آج یورپ مسلمانون کے طریقہ تفکر و استدلال کو غلط تبلا رہا ہے۔ بالفرض اگر مسلمانون نے تفکر و استدلال مین غلطی کی بھی ہے تو وہ ناقابل التفات ہے اور اس غلطی کے اظہار سے بھی بہت سے گہرے مطالب حل ہو جاتے ہین کہ انسان کا صداقت کی طرف ترقی کرنا غلطی سے کہلا ہوا اور زبردست انکار ہے اس لئے کہ اسکی ہر ایک مسلمہ دلیل و مثال سے دوسرے کو امداد پہونچتی ہے ممکن ہے کہ بعض اوقات یورپ خود بھی اوس موازنہ زبردست مشابہت سے جو ممالک غیر کے رسم و رواج اور آرا وغیرہ مین اُن کی ذات مین پائی جاتی ہے وہ دریائے حیرت مین غرق ہو جائین اور یہ مشاکلت ترقی و علم کا ایک قیمتی و بہتر ذریعہ بنجاتی ہے جس سے اُن کے ذی امتیاز کو مزید تفوق حاصل ہو جاتا ہے اور اگرچہ وہ مفاد جو اس قسم کی تحقیق و تفتیش سے حاصل کئے جاسکتے ہین، دوسرے لوگون کے نظام تدریسی مین زیر بحث نظر آتے ہین جن کا بہت سا حصہ ایسی حقیقی و اصلی خوبی سے مملو ہوتا ہے جس کی کہ ہم کو پہلے سے خبر ہی نہین ہوتی، ایسی صورت مین صاحب فہم کا فرض ہے کہ وہ ایسے اُمور کہ اگر وہ صحیح ہون تو قبول کرنے مین کسی طرح کا نہ تو پس و پیش ہونا چاہیئے اور نہ اسمین کوئی مشکوری کا موقع اور یہ ایسا عام خراج ہے جسکو کہ سب ہی کو ادا کرنا چاہیئے کہ یہ وہ اُصول ہے جس سے باد ی طریقہ عمل قایم و برقرار رہتا ہے اسی کی وجہ سے اعلی ترین طبائع کو ادنےٰ ترین کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے گو یہ مفاد مقرر کے افعال کے سامنے بہت کم مایہ ہوتے ہین مگر اس طور سے مادہ اور طریقہ عمل دونون کے دونون جمع ہو جاتے ہین مناسب تو یہ ہے کہ اس قسم کی مباحث کو نظرانداز کر ہی دینا چاہیئے کیونکہ اس سے یہ اُمید نہین کیجاتی کہ باہمی تعلقات مین مزید شگفتگی پیدا ہو جائے گی اور مناقشہ مرتفع ہو سکے گا۔

ہم علم اخلاق کو زیادہ سے زیادہ اُن مؤلفین و مصنفین کی گم شدہ کتب کی تشریح و ضمیمہ تصور کرسکتے ہین جن کے ملحض ہونے کا اسمین اقرار کیا گیا ہے کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ یونانیون نے کسی مضمون کو بغیر ہاتھ لگائے ہوئے نہین چھوڑا ہے "ساری دنیا اُن کے سامنے تھی جسکو چاہتے تھے انتخاب کرتے" اور قبل اسکے کہ وہ ایک مضمون مکمل کرتے دوسرا اُن کو اپنی طرف مائل کرلیتا تھا اسکے بعد تیسرا علیٰ ہذالقیاس "تا آنکہ یہ دائرہ مکمل ہو گیا۔ اِن مضامین کے باہمی تعلق نے ان کو کچھ ایسی طور سے منہمک کیا تہا کہ وہ کسی ایک کو بھی مہذب و مرتب نہ کرسکے یہی وجہ ہے کہ انکے زبردست اجزا آج بھی دنیا سے خراج تحسین وصول کرتے ہین۔ چنانچہ ہمارے پاس اسی جامع و نادر کتب جن سے یونانیون کے علم اخلاق کا کچھ بھی پتہ چل سکے، وہ مسلمانون کی کتب اخلاق ہین۔ اور یہ اُن ہی کے مواد سے اسطرح جمع ہوتی ہین

کہ جسکا انکار ممکن نہین۔ پس مستقل تالیف وتصنیف موجود نہونے کی صورت مین ان اخلاقی کتب کا خیر مقدم کئے بغیر چارہ نہین کیونکہ اس سے عہد عتیق کے فہم وادراک ایک دہندلا سا عکس پڑتا ہے کیونکہ یہ یقینی امر ہے کہ اس قسم کی مکمل ومختصر کتابین یونانی فلسفہ کے دور ثانی مین بحال وبرقرار نہین۔ اور بعض کا گمان ہے کہ یہ اس کثرت سے موجو تہین کہ ازدیاد تعداد نے کسی ایک کی بہی شہرت کافی نہونے دی اور اس وجہ سے سب کے سب عدم توجہ وفنا کے نذر ہوگئین پس علم اخلاق پر جو اسلامی عہد کی تالیفات ہمارے سامنے ہین۔ وہ ایشیاء ویورپ دونون کے لئے قابل قدر مجموعہ ہین جسمین یونانی علم اخلاق سے صرف ایک پرفریب تشابہ ہی نہین ہے بلکہ ایک ایک کی ہو بہو نقل نظر آتی ہے کیونکہ جب زمانہ کی دست تعدی نے یونانی علوم وفنون کو بحر فنا مین ہمیشہ کے لئے غرق کردیا ہے تو یقینی طور سے وہ ملک جہان پر وہ صحیح طور سے روشنی مین لائی جاسکتی تہین۔ بمقابلہ مصر وشام اور ایشیائے کوچک کے وہ کون سے دوسرے مقامات ہوسکتے تھے اور کیا یہ ممالک مساوی طور سے یونانیون اور مسلمانون کی جائے آمد ورفت نہ تھے۔ اسکی تائید مین اخلاق جلالی کا لامع ہشتم خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہے کیونکہ سیسرو[۹۱] اور ہوریش[۹۲] سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسی مضمون پر چند مسلمہ درسیات موجود نہین۔

مسلمانون کے علم اخلاق مین جسقدر حصہ قدیم عنصر کا ہے اُسکا دریافت کرلینا کوئی مشکل کام نہیں کہ وہ ایک حد تک اپنی اصلی اور پاکیزہ حالت مین موجود ہے۔ مسلمانون مین یہ کچہ اصول ہوگیا تہا کہ فلسفیون کے ہر آنیوالی جماعت اپنے متقدمین کو اس درجہ عزت کی نظرون سے دیکہتے تھے اور قدماء کی عظمت ووقار کا اس درجہ خیال رکہتے تھے کہ اُسکو غلامی سے تعبیر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ بظاہر یہ وجہ سمجہ مین آتی ہے کہ یونانی فلسفہ کی خوبیون نے اُن کے دل مین گھر کرلیا تہا اور اوس کے اوصاف اُن پر منکشف ہوچکے تھے۔ ایسی صورت مین وہ جو کچہ بھی یونانیون کی عزت کرتے کم ہے گو آج ہم اُسکو پسندیدہ نگاہون سے نہ دیکہین اسلئے وہ جو اختراع کرتے اور کبہی وہ اُنہی علوم وفنون کے ضمیمہ کے طور پر تہین جو پہلے سے چلی آرہی تھے

[۹۱] سیسرو اسکا پورا نام میرکس ٹولیس سیسرو (Marcus Tullius Cicero) ہے یہ روما الکبرہ کا بہترین فصیح مقرر سمجہا جاتا ہے۔ یہ روم اسپر بہا آوردہ مدبر اور نہایت ہی روشن خیال مصنف ہے اور اس نے ایشیائے کوچک کا سفر کیا اور علم بلاغت کے بڑے بڑے اور پروفیسرون کی صحبت سے استفادہ کیا۔ ۱۰۶ قبل مسیح مین پیدا ہوا اور ۴۳ قبل مسیح مین اس دار فانی سے رخصت ہوا Chambers Encyclopedia Vol III p. 240

[۹۲] ہوریشس اسکا پورا نام (Quintus Horatius Flaccus Horace) کوئنٹس ہوریشیس فلکیس ہوریس ہے یہ لاطینی زبان کا شاعر ہے اسکا سلام سودا کی طرح ہجو سے داغدار ہے یہ جنوبی اٹلی مین وینیا کے قریب ۸ دسمبر ۶۵ قبل مسیح مین پیدا ہوا یہ ایپیکورس کے مطیعین مین سے تہا اور یہ کہا کرتا تہا کہ ایپیکورس کے براہین ودلائل اسٹاکس کی سختی اور ساز سے کے اخلاقی تعلیم کے مابین ہین۔ (Chap: Enc: Vol V. p. 676)

گرانکی صحت اور اصلاح کی طرف چندان توجہ نہ کی اور جو اختراعات انھون نے کئے وہ اصل کے اجزاء ہی معلوم ہوتے ہین
اور مایہ لا کچھ بھی نظر نہین آتا سگر یہ ضرور کہین گے کہ اس معتدل اور متوسط طریقہ عمل نے اسکی اہمیت مین کچھ
قدر کمی ہی نہین کی بلکہ اوسکو ایک حد تک ادق کردیا ہے۔ نیز تفہیم مضمون کے لئے جو امثلہ متقدمین سے چلی آرہی تہین
ان ہی کا اُلٹ پھیر کرتے رہے جس نے امثلہ کے دائرہ کو بھی معین اور محدود کردیا۔ اب خواہ اسکو ان کے فلسفہ کی خوبی
تصور کرین یا نقص مگر اس سبب سے مسلمانون کے فلسفہ مین اور اصل مین زمین آسمان کا فرق پیدا ہوگیا۔ اس حدت سے
فلسفہ کی بناوٹ مین زیادہ ترقی تو نہوسکی لیکن مطالب تک دماغ انسانی کی رسائی کے راستے وسیع ہوگئے جسکو
مسلم فلسفہ کا خصوصی امتیاز کہنا بیجا نہوگا۔

تقریباً ۲۰۰ سال قبل مسیح کے بعد بھی سے یونانیون کے مذاہب فلسفہ عقل اور مادہ کی بنا پر مختلف اور متعدد تھے
لیکن دو کا نمبر سب سے بڑا چڑھا نظر آتا ہے اور یہ ایک دوسرے کے ضد تھے گر یہ دونون افراط و تفریط سے خالی تھے
لیکن مسلمانون نے مادہ پر عقل کے تفوق کو کلیتہ ترک کئے بغیر اوس غلط تہذیب ترتیب کو جو عقل کے بارہ مین ہوسکتی
ہے یا ہونا چاہئے تھا اسکو اس خوبصورتی کے ساتھ انجام دیا کہ ایک کا دوسرے پر کوئی برا اثر نہین پڑا۔ شیر لاک
(Sherlock) کا مقولہ ہے کہ "کسی وجود مرکب کے لئے خوشی و انبساط صرف ایک ہی عنصر سے حاصل نہین
ہوسکتی" اسمین شک نہین کہ دلائل ترک نہایت نفیس ہین لیکن یہ رائے نہین قایم کیجاسکتی کہ وہ بزرگ جنھون نے
سب سے پہلے قانون صداقت کو مشتہر کیا۔ وہ قصداً مرتکب سہو ہوئے کیونکہ ایسی صورت مین مخالف مواد فراہم کرتے
عملی حالت اسکے اجتماع اور تجزیہ کی اجازت ہی کیون نہ دیتے لیکن وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے اہم و غامض جزو
یعنی مین منہمک تھے کہ دوسری طرف توجہ منعطف نہ کرسکے اور جس مواد کو انھون نے اپنے جانشینون کے لئے چھوڑا وہ
اس سے بتدریج ایسے نتائج پر پہونچے جو انسان کی صحیح دلچسپی کے خلاف تھے کیونکہ وہ قضایا جن پر اسکا سنگ بنیاد
رکھا گیا تھا فطرت انسانی کے بالکل خلاف تھے۔

پس منعۂ عالم پر جو ہستیان آباد ہین اگر اون کی زندگی کا مدار صرف مادہ پر تسلیم نہ بھی کرین تو اُن کے محسوسات
اور افعال مادہ ہی کیوجہ سے عمل مین آتے ہین مگر اُن کو نہایت سنجیدگی سے تبلایا گیا تھا کہ دنیا اور اسکے متعلقات چشم
اور اوسکی ضروریات کوئی چیز ہی نہ تھی اور ضمناً یہ تعلیم بھی دی تھی کہ یہ اونکا فرض تھا کہ سوسائٹی کی مدد کرنیکے بجائے
اوس سے جنگ کرین۔ اس ناقابل عمل معیار کی غلطی کو ابتدائی زمانہ مین ہی ایک ایسے آدمی نے جو خود اسی اخترع
سے متاثر تھا نبات خود معلوم کرلیا اِسی بنا پر ٹیولی (Tully) اپنے مکالمہ مین جسکا عنوان دوستی ہے اتفاقی طور

سی کہا جاتا ہے کہ اِستاکس (Stoics) یا (عدیم المبالات بہ موثرات) جو زینو (Zeno) کے متبعین ہین اور جنکو کہ اسنے یہ تعلیم دی تھی کہ انسان کو خواہشات نفسانی سے آزاد ہونیکی سخت کوشش کرنا اور رنج وراحت سے قطعی متاثر نہین ہونا چاہیئے اور خود کو بلا چون وچرا اوسی زبردست ہستی کے سپرد کر دینا چاہیئے جو تمام کائنات پر فرمان روا ہے اور اسی کو انسان کی اعلے ترین خوبی خیال کرتے ہوئے رنج وراحت موثر نہ ہونا چاہیئے۔ پس اگر یہ اپنے نظریہ کی باریک غلطی کا ادراک کرتے تو لکڑی کے کندے یا پتھر کی چٹان سے کچھ یون ہی سے بہتر ثابت ہوتے بلکہ غور کرنے پر ہر ایک کی سمجھ مین آسکتا ہے، سو ہر استعمال نیکی خود نیکی کا استحقار ہے خواہ ایسی کورس کو (Epicurus) جس نے یہ تعلیم کی تھی حقیقی نیکی اور بدی خوشی اور رنج ہین کوئی صورت ہی کیون پیش نہ آئی ہو اُسکے متبعین کم از کم ایک دوسرے افراط مین جا پھنسے اور اس سے بچے رہنے کی غرض سے جب ایک غلطی کا انکشاف کرتے تو اوس سے زیادہ کا شکار ہو جاتے اس قسم کی غلطیون اور دہوکون سے اگر کوئی فلسفہ آزاد اور مستثناد نظر آتا ہے تو وہ ارسطو کا ہی مذہب ہے جسکے اصول کو اختیار کرکے آسمان تکمیل پر پہونچانے مین مسلمانون نے انسانی تخیل کے نہایت قیمتی حاصل کی اصطلاح کرنے اور جمع کرنے اور ترتیب دینے مین اپنی پوری کوشش سے کام لیا۔ اس کے سوا فلسفہ کے کل مذاہب کو قطعاً ترک کر دیا۔ گو اسمین کچھ کم وقت پیش نہ آئی ہوگی یا اِس معرکۃ الآرا کام کی شہادت خود ایک ایسا واقعہ ہے جس نے دماغی تاریخ مین ایک دور جدید قائم کر دیا اور یہ علوم سلسلہ بہ سلسلہ منتقل ہوتے رہے تو اسمین شبہ نہین کہ یوروپ کے راہبوں کا متعصب و نفس پرست فرقہ اُن زبانوں کی کورانہ تعلیم مین جنکو کہ وہ مقدس خیال کرتے تھے ان علوم کو قطعی طور سے فنا کرکے چھوڑتے لیکن یہ قدرت کا فضل تھا کہ یہ علوم مسلمانون کے ہاتھو مین پہونچے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت تفتیش (Inquisition) کے سفاک اور گمراہ کن ہاتھون سے بہت سی تالیفین بچ گئین۔

لہ (Stoics) استاکس زینو کے متبعین مین جو ۳۰۸ قبل مسیح مین ہوا ہے اُسکا یہ عقیدہ تھا کہ تمام عالم پر ایک بڑی زبردست قوت حکمران ہے جسکے سامنے ہماری تمام قوتین بیکار ہین اور یہ کہ باعتبار جسم انسان وحیوان دونون برابر ہین مگر انسانون مین قوت عقلیہ ہے جسکی وجہ سے وہ دیوتا تک بن سکتا ہے۔ حیوانات مین بھی عقل ہے لیکن مدرک نہین (Encyclopaedia Brit.)

عہ (Epicurus) اپیکورس ایتھنز کے قریب قصبہ گارگس کا باشندہ ہے یہ ۳۴۲ قبل مسیح مین پیدا ہوا اِس نے یہ تعلیم کی تہی کہ سب سے بڑی خوبی سکون قلب ہے جو نیکی سے حاصل ہوتی ہے مگر اُسکے نزدیک نیکی عیش زندگی کا نام ہے اور بدی دنیاوی آلام ومصائب کا اسی وجہ سے اِسکے متبعین کو عرب فلسفی و شہوانی کے نام سے ملقب کرتے ہین۔
(Hyde's Hist: of Arabs - p. 379)

اور یورپ کی آزادی کا ذریعہ بن سکین چنانچہ مسلم فلسفہ اخلاق بہی انہین کا ایک صحیح نمونہ ہے اور اس سوال کو کسی اور موقع پر حل کرین گے۔

بہت سے مسلم فلاسفر مخالف ہونیکی صورت مین بہی اسکے مفسر اور خادم ہونے پر ہی قانع رہے صرف اسی آخر الذکر شکل مین بہت کچہ باقی ہے جس پر بہت کچہ گفتگو کیجا سکتی ہے اگر قدیم تالیف کے عنوان کا مخزن ہی تو یہی مسلم علم اخلاق ہے۔ اِس ثبوت کے لئے بہت سی مفید مثالین اُن صفحات مین ملسکتے ہین جہان ہیرکر (Herodotus) ہیروڈوٹس کے سادہ لفظی بیان کو کہین کہین معانی کے لباس پہنا دئے گئے ہیں جس سے (Xenophon) زینوفون کی اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ سیسرو کی ذہانت رائج سکون مین تسلیم کی گئی ہے جسکے متعلق آج بہی یہ تسلیم کیا گیا ہی کہ لاطینی فلسفہ کے وہان تک رسائی نہین ہوئی۔ خیر ہم کو اس سے سروکار نہین ہان اِس نظریہ کو میرے خیال مین تسلیم کئے بغیر چارہ کار نظر نہ آئیگا کہ اس سے مادہ کی اصلیت و حقیقت کی تشریح نہین ہوتی بلکہ اسکے باقاعدہ اور مہذب استعمال کے دریافت کے لئے علم و ادب کے وسیع رسائل درکار ہونگے۔ اور یہ اوس کا موقع بہی نہین کہ بیزن ٹائن (Byzantine) سلطنت کے مورخین کا باہمی مقابلہ کر کے بتایا جائے، کسی عہد کی بہترین تفسیر اور شرح وہ ہی ہوسکتی ہین جو اُسکے بعد کے عہد اور جانشین سلطنت نے کی ہو۔ اسطرح معلوم سے نامعلوم کیطرف صعود کرتے ہین اور موجودہ زمانہ سے گزشتہ کیطرف جلد جلد قدم اُٹھاتے ہین اور زمانہ مین جس قدر بعد ہوتا جاتا ہے اِسی قدر اسی نوعیت کے خصوصیات کا اندازہ لگانا اہم ہوتا جاتا ہے اور اگر کبہی ایسا زمانہ آجائے کہ تناقض بیانات مشرق و مغرب کے مورخین کے ایک جگہ نہایت دیانت کے ساتھ جمع ہون اور سیاسی امور بہی ہمارے سامنے ہون تو ضرور معاشرتی حالات کا صحیح پتہ لگے اور یہ لوگون کی

---

۵۱) (Herodotus) ہیروڈوٹس ایشیاء کوچک کے شہر ہانے کورنس کا باشندہ ہے یہ ۴۸۴ قبل مسیح مین پیدا ہوا تہا اپنے زمانہ کا بہترین مورخ مانا جاتا ہے ۴۶۴ قبل مسیح سے ۴۴۷ ق م تک اُس زمانہ کے سربرآوردہ ممالک مین سفر کرتا رہا۔

(Chamber Encyclopedia Vol: IX. p. 765)

۵۲) (Xenophon) زینی فون ۴۳۰ ق م مین پیدا ہوا۔ یہ یونانی مورخ اور فوج کا سپہ سالار تہا۔ یہ ابتداء عمر ہی سے سقراط کے اثر مین آگیا تہا اور اُسی کے مذاہب کا اس پر زیادہ اثر ہے، جب سائرس کو اُس کے بہائی نے شکست دیکر قتل کیا تو قوم نے فوجی کمان اسکے سپرد کی، یہ فوج لیکر ۳۴۶۵ میل ۲۱۵ دن مین پیدل چلا گیا۔

(Cham: Encyc: Vol. IX. p. 765).

عادات وخصائل اور تعلیم وغیرہ کے حالات جو اس طرح جمع ہون گے وہ واقعات ماضیہ کی سچی تصویر ہوگی جس سے وہ حقیقت جو اسلامی علوم اخلاق مین مضمر ہے، دنیا کے سامنے آجائے گی اور وہ رسائل جن مین اُن کے علوم اخلاق کی تعلیم کی گئی ہے ضرور کبھی نہ کبھی اُن ماہرین فن کو جو اصل کو عزت کی نگاہون سے دیکھتے اور اوس کی طرف رجوع کرنا پسند کرتے ہین اُن کو اسلامی علم اخلاق اپنی طرف مائل کرے گا۔

احساس پستی

"صبح صادق کے جلوے عالم کو پیام بیداری دیرہے تھے، مین پہاڑی کے دامن مین بیٹھا ہوا اپنی زندگی پر تنقید کر رہا تھا۔ ذیل کے اشعار کو جذبات دلی کی تصاویر سمجھئے جو مین اوسوقت صفحۂ کاغذ پر کھینچ سکا" کیف"

میرے جذبات مین کل تک تھی عظمت اور فراوانی ۔۔۔ کہاں لے آئی مجکو آج ارمانون کی طغیانی
میری فطرت کا یہ کمزور پہلو چھپ نہین سکتا ۔۔۔ میرے شیرازۂ ہستی مین مضمر ہے پریشانی

ارادون پر میری قدرت کو دیکھو اور پھر دیکھو ۔۔۔ کہ محتاج عمل ہے آج میرا شوق پنہانی
نگاہونکی میری قوت کو دیکھو اور پھر دیکھو ۔۔۔ کہ مجھ سے بھاگتی ہے آج ہر جلوہ کی تابانی

کھنچا جاتا ہون پستی کی جانب روک لے مجکو ۔۔۔ کہاں ہے آج وہ احساس عظمتہائے انسانی

کہان ہے آج وہ سر جس مین مرے سودائے خودداری ۔۔۔ جھکی جاتی ہے ہر نقش قدم پر میری پیشانی
کہاں ہین آج وہ دلمین مرے جذبات بیداری ۔۔۔ کہ غفلت کر رہی ہے میری آنکھونکی نگہبانی

معاذاللہ اپنی قوتوں کا صرف یہ دیکھون ۔۔۔ کہ حاصل دیکھکر اپنا مجھے خود ہے پشیمانی

نگاہ شوق اب سوئے بلندی کیوں نہیں اٹھتی ۔۔۔ مری آنکھوں نے کس سے سیکھلی آخر یہ حیرانی

میرے جذبات کی رفعت پسندی کیا ہوئی آخر　　کہاں سے آگئی دل میں مرے یہ پست سامانی

مین اپنی کوششوں کا یہ نتیجہ کس طرح دیکھوں　　نہ دیکھی جائیگی مجھسے بھرے گھر کی یہ ویرانی
میرا ہر ذرۂ دل وقف صد سیلاب بربادی　　میرے ہر دانۂ خرمن مین شعلون کی فراوانی

مین اس دنیائے غفلت آفرین مین رہ نہین سکتا　　کہ نادانی یہان دانائی ہے دانائی نادانی

چھپالے اے نمود صبح مجھکو اپنے پردون مین　　مجھے مرغوب ہے دل سے ترا منظر یہ نورانی
ترے جلوون مین گم ہوکر مین پھر مقصد کو ڈھونڈونگا　　اُبھر آئینگے شاید اس طرح جذبات پنہانی

ترے پرتو سے شاید روح کچھ بیدار ہوجائے
دلِ مدہوش شاید اس طرح ہشیار ہوجائے

کیف مرادآبادی

عشرت رحمانی رامپوری

کوئی کرے تو پہلے دستِ سوال پیدا　　اہلِ کرم کو ہوگا آخر خیال پیدا
انسانیت کرے تو صدق مقال پیدا　　کرے گی حق پرستی اکلِ حلال پیدا
ہمدرد ہو کسی کا درد آشنائیون مین　　یون اپنے زخم دل کا کر اندمال پیدا
ہر عجز و انکساری ہے باعثِ بلندی　　مہتاب بھی ہوا تھا مثلِ ہلال پیدا
زندانِ بیکسی سے کب تک نجات آخر　　ناکامیون مین یارب ہو اعتدال پیدا
انجام بین نگاہ ہو کچھ مد و جزر دیکھو　　اوجِ کمال سے ہے قعرِ زوال پیدا
ہے انتہائے اُلفت اظہار بدگمانی　　کرتا ہے رازِ پنہان اکثر ملال پیدا
بیدار کر صداقت پیدا خلوص نیت　　قسمت کریگی اکدن جاہ و جلال پیدا

مکر و ریا ہے عشرت در پردۂ تقدس
اِین عہدِ حاضرہ مین کیا خوش خصال پیدا



(اقبال احمد صاحب اقبال)

شاہدہ سے میری محبت کی نوعیت کچھ عجیب تھی۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ میں شاہدہ کو پہلی مرتبہ دیکھ کر متاعِ دل کھو بیٹھا۔ ہم دونوں قریبی عزیز تھے۔ وہ میری ہم عمر تھی۔ بچپن میں ہم دونوں ساتھ کھیلا کرتے تھے مجھے اس معصومانہ دور کی بعض باتیں یاد ہیں۔ کبھی کھیل میں شاہدہ مجھ سے بگڑ جاتی تو اس کو ہر طرح منانے کی کوشش کرتا وہ بڑی مشکلوں سے منتی لیکن جب اس کی خفگی دور ہو جاتی تو پھر وہی بے تکلفی اور محبت پیدا ہو جاتی تھی گھنٹوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ بچپن کے معصومانہ کھیلوں میں گذارتے تھے۔ اس زمانہ میں یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ یہ معصومانہ موانست رنگ لائے گی اور جیسے جیسے ہماری عمر کے سال گذرتے جائیں گے ہم محبت کی زنجیروں میں گرفتار ہوتے جائیں گے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شاہدہ ایک روز میری ہستی پر حکمراں ہوگی اور میری انس و محبت کا مرکز بن جائے گی دن گذرتے گئے اور ہم بچپن اور لڑکپن کی منزلوں سے گذر کر شباب کی پر کیف زندگی میں داخل ہوئے۔ یہ میری عمر کا اٹھارہواں اور شاہدہ کی عمر کا سولھواں سال تھا جب میں نے اپنی محبت کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا۔ فطرتاً ہم دونوں میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ شاہدہ چند سال پہلے کی طرح سادہ دل اور خالی الذہن نہیں تھی، اس میں وہ خودداری پیدا ہوگئی تھی جو کم و بیش قدرت کی طرف سے عورت کو ودیعت کی جاتی ہے۔ شاہدہ کا حسن شباب کے زمانہ میں اور نمایاں ہوگیا تھا۔ اس کا قد درمیانی تھا۔ اعضا نہایت متناسب کھلتا ہوا رنگ۔ اس کے کتابی چہرہ کا بے عیب اور دلکش بناؤ۔ اس کی شرمیلی سیاہ آنکھیں جن سے ذکاوت اور ذہانت ہویدا تھی۔ اس کے باریک آپس میں ملے ہوئے لب جو اس کے پراز جذبات قلب کو ظاہر کرتے تھے یہ سب ایسی باتیں تھیں جن سے متاثر ہوئے بغیر مشکل سے رہا جا سکتا تھا۔
لیکن میری محبت کا باعث اس کا حسن و جمال اور شباب کی رنگینیاں نہ تھیں مجھے اس کی روح کے ساتھ موانست تھی اور اس وقت سے بھی جب شاہدہ حسن و جمال کی تمام نیرنگیوں سے بے خبر تھی اس لیے میرے خیال میں کبھی کسی

قسم کا تغیر نہ پیدا ہوا اور جو معصومانہ محبت مجھے اسکے ساتھ شروع سے پیدا ہوئی تھی وہ قائم رہی۔ اتنا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ مین اسکے روز بروز قریب ہو رہا ہون اور ایک قسم کی جاذبیت شاہدہ مین پیدا ہوگئی ہے جو مجھے اپنی طرف زیادہ قوت اور زیادہ سرگرمی کے ساتھ کھینچ رہی ہے ایک عرصہ کے بعد مین نے اسکو عالم شباب مین دیکھا اسوقت اس کی شوخی اور بیباکی متانت اور سنجیدگی سے تبدیل ہوگئی تھی وہ آپس کی بے تکلفیاں خواب خیال تھین مین بھی اپنے تعلیمی شغلون مین مصروف رہنے کی وجہ سے اپنی محبت کی سرگرمی اور جوش و خروش کا پورا احساس نہین کرسکتا تھا لیکن فرصت کے زمانہ مین جب مجھے کئی ماہ کے لئے وطن آنے اور رہنے کا اتفاق ہوا اور اسی اثناء مین شاہدہ سے ملنے کے زیادہ موقع ملے تو وہ سوتے ہوتے جذبات پھر بیدار ہو گئے اور اپنے سینہ مین پھر ایک تلاطم سا محسوس کرنے لگا جسوقت مین اس تلاطم کا احساس کرتا تو میرے دل مین یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ مین زیادہ وقت شاہدہ کے پاس گذارون اور اُس سے ہنس بول کر کچھ اپنے دل کی آتش فشانی کو کم کرون۔ مجھے شاہدہ کی گفتگو بے حد پسند تھی اور میرا دل اتنا اوسکی گفتگو مین لگتا تھا کہ مین کئی کئی گھنٹے متواتر اس کے پاس بیٹھتا اور اوسکی باتین سنتا رہتا۔ یہ مشغلہ میرے لئے سب سے بڑی مسرت کا سبب تھا۔ اسی طرح مین شاہدہ سے متاثر ہوتا گیا اور میرا شوق رفتہ رفتہ ترقی کرنے لگا۔ مین نے ابھی تک اپنی محبت کا کوئی مقصد متعین نہین کیا تھا لیکن مین محسوس کر رہا تھا کہ باوجود اس بے لوثی اور بے غرضی کے میری محبت ایک خاص نوعیت رکھتی ہے، چاہے مین محسوس نہ کرتا ہون لیکن شاہدہ ضرور میری امیدون اور تمنا کا مرکز تھی ہماری باہمی گفتگو کا موضوع کوئی خاص نہ تھا۔ مین نے اپنی محبت کے جذبات کا اظہار اس پر نہین کیا کبھی کبھی مین چاہتا تھا کہ جو کچھ دل مین ہے وہ سب اِس سے کہہ ڈالون۔ اپنی شوریدہ سری اور بے چینیون کا اس پر اظہار کرون لیکن شاہدہ کا طرز عمل اسقدر خوددارانہ ہوتا تھا کہ مین نے اظہار محبت کی جراءت نہ کی۔ باتین کرتے کرتے شاہدہ کبھی آنکھ اٹھا کر مجھے دیکھتی تو مین اوسکی آنکھوں مین خاص قسم کے تاثرات محسوس کرتا تھا جس مین حیا۔ پاکبازی اور خودداری تھی۔ مجھپر جذبات کا ہجوم ہوتا گیا اور میرے اثرات ترقی کرتے گئے لیکن اس نے اپنے کسی طرز عمل سے یہ خیال کا موقع نہین دیا کہ اُسے میرے جذبات کا کچھ علم ہے۔ وہ نہایت بے پرواہی اور آزادی کے ساتھ مجھسے برتاؤ رکھتی مین تنہائی مین اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیا میرے احساسات کا اثر اسکے دل پر بھی کچھ ہے اور اسکو بھی میرا خیال ہے، میرے خیال مین محبت کے اندر یہ تلاش کہ آیا محبوب بھی محبت کے جذبات سے متاثر ہے ایک قدرتی جذبہ ہے۔ بہرحال یقینی تھا کہ شاہدہ میرے دل کی ہنگامہ خیزیون سے بالکل بیخبر تھی یا بے خبری کا اظہار کرتی تھی۔ کبھی مین کسی پیرایہ مین کوئی محبت کا افسانہ اسے سناتا تو مین دیکھتا تھا کہ وہ اُس مین ذرا بھی دلچسپی کا اظہار نہ کرتی تھی۔ وہ ان افسانون

ت کے ایثار اور قربانیوں کو سنکر اُنکا مضحکہ اُڑانے کے لئے یہ مصرعہ پڑھ دیا کرتی تھی۔ مصرع

کہتے ہین عشق جس کو خلل ہے دماغ کا

یری تمام توقعات پر پانی پھر جاتا تھا اور مین مایوس ہوکر یہ خیال کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا کہ میری محبت مین کوئی کشش
ا اور اسکا اس پر کچھ بھی اثر نہین ہے، کبھی مجھے اس خیال سے تشویش ہوجاتی تھی اور مین سوچتا کہ آخر اس محبت
نجام ہونیوالا ہے، محبت کے متعلق یہ خیال کہ اظہار اسکی لطافت کو ضایع کر دیتا ہے مجھے کبھی پسند نہین آیا۔ مین تو
ہتا تھا کہ اگر موقع ملے تو شاہدہ کے قدمون پر سر رکھدون اور اسکو اپنا افسانۂ محبت سناؤن مین تو یہی چاہتا تھا
ہ پر اپنے جذبات کا اظہار کرکے یہ معلوم کرلون کہ حقیقتاً وہ بھی ان جذبات سے متاثر ہے، اور اسکو بھی اس
احساس ہے جو رات دن مجھے بے چین رکھتی ہے، محبت کا معاوضہ محبت، مین سمجھتا ہون کہ یہ خواہش
فرین فطرت ہے لیکن باوجود اس اُصول پر پورا یقین اور اعتماد رکھتے ہوئے بھی مجھ مین اتنی ہمت نہ تھی کہ
س پیکر استغنا سے اپنا حال دل کہون۔

شاہدہ اب عمر کے اُس دور مین پہنچ گئی تھی جہان اوسکی شادی کا مسئلہ زیادہ دنون تک ملتوی نہین رہ سکتا تھا
علیم کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ ہمارے گھر کی مالی حالت بھی اسکی متقاضی نہ تھی کہ اپنی معاش حاصل کرنیکے
ہونے سے پہلے میری شادی کا سوال پیدا ہوتا میرے والدین کو ابھی اس مسئلہ کا کوئی خیال بھی نہین تھا
شاہدہ کے والدین اسکی شادی کے لئے بیتاب تھے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جہان لڑکی ذرا شعور کو پہنچی
کا وجود ماں باپ کے سر پر ایک بار گران ہوگیا۔ وہ بس اس فکر مین رہنے لگے کہ جلد سے جلد اسکے بار سے سبکدوش
س عجلت مین وہ عموماً موقع کے اچھے اور برے ہونیکا بھی خیال نہین کرتے اور اندھا دھند لڑکی کو کسی کے حوالہ کر دیتے ہین۔ شاہدہ کیلئے
ایک اوسط درجہ کا معمولی تعلیم یافتہ انسان منتخب کرلیا گیا جسکو شاہدہ کے مذاق اور خیال سے ذرا بھی مناسبت نہ تھی، شاہدہ کے
ین تو بھلا اس مناسبت کو کیا دیکھتے۔ ہندوستانی والدین عموماً اس کا کبھی خیال نہین کیا کرتے اور باتون کو وہ دیکھ
گے لیکن لڑکے اور لڑکی کے مذاق ترتیب اور اُفتاد مزاج پر کبھی بھی توجہ نہ کرینگے، مجھے شاہدہ کی منگنی کی اطلاع ہوئی
یانک ہوئی۔ اس خبر سے مجھے سخت صدمہ پہنچا اس لئے نہین کہ شاہدہ میرے لئے ایک بیگانہ چیز ہونیوالی ہے
ن اپنی محبت مین ناکامی کو دیکھ رہا ہون۔ محبت مین ناکامی کا کوئی سوال نہین محبت حقیقتاً خود آپ اپنی غرض ہے
شاہدہ سے جس قسم کی محبت تھی خواہ اسکی زندگی مین کتنی ہی تبدیلیان کیون نہ ہوجائین وہ اسی طرح قایم رہ سکتی
لیکن خیالی طور پر وہ بالکل میرے قریب تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح عزیز رہے گی، مین محبت اور

ازدواج کو ایک دوسرے کے منافی نہین سمجھتا۔ ازدواج محبت کا مقصد نہین لیکن محبت ازدواج کے بعد بھی قایم رہ سکتی ہے فنا نہین ہو جاتی۔ ازدواج ایک اشتراکی زندگی کا نام ہے اور اسکا تعلق فطرت انسانی سے ہے لیکن محبت تمامتر روح سے تعلق رکھتی ہے اور جس طرح روح اور جسم کو ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے اسی طرح محبت بھی ازدواجی زندگی مین اسی طرح قایم رہ سکتی ہے، شاہدہ کی منگنی ہو جانیکے بعد مین نے سمجھ لیا کہ مشیت الٰہی کو ہمارا اتحاد زندگی منظور نہین ہے اسلئے وہ فطری جذبات جو اس خبر کے سننے کے بعد میرے دل مین پیدا ہوئے مین نے انکو ضبط کیا اور اپنی قسمت پر قناعت کرنا اور حالات کی تبدیلیون کے بعد بھی اپنی محبت کو قایم رکھنا اپنا اصول قرار دیا لیکن ان واقعات کا اثر میری صحت پر نہایت برا پڑ رہا تھا جس کو میرے اعزا اور اقارب بھی محسوس کر رہے تھے لیکن اسکا سبب اصلی صرف مین جانتا تھا یا شاید اسکا تھوڑا بہت احساس کبھی شاہدہ کو بھی ہوا ہو۔ دنیا میری محبت سے قطعی بے خبر تھی۔ اپنی صحت کی خرابی کے باعث مجھے اپنا سلسلہ تعلیم ہی منقطع کر دینا پڑا اور جب مین وطن آیا تو معلوم ہوا کہ اس اثنا مین شاہدہ کے عقد کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی اور قریب ہی تقریب ہونیوالی ہے مین خود اس تقریب مین شریک رہا مین نے وہ تمام رسمین دیکھین جو قدامت پسند گھرانون مین ہوا کرتی ہین شاہدہ کو مین نے دلہن بنتے دیکھا۔ اسوقت وہ مصنوعات مین گھری ہوئی تھی۔ اسکو دیکھکر مجھے ایک گونہ افسوس ہوا مین تمام مصنوعی آرائشون کو شاہدہ کے لئے بالکل بے ضرورت سمجھتا تھا سادگی اس کا سب سے اچھا زیور تھی اسی مین وہ دلکش معلوم ہوتی تھی۔ بہرکیف تمام رسوم ادا ہو جانے کے بعد شاہدہ اپنی سسرال رخصت ہو گئی۔ اس تقریب کے اثنا مین مین نے اپنی کسی طرز عمل سے یہ ظاہر نہین کیا کہ یہ تقریب جو ایک شخص کی امیدون کی تعمیر کر رہی ہے میری خاموش تمناؤن کو برباد بھی کر رہی ہے، کسی کو یہ خیال و گمان بھی نہوگا کہ مین گو بظاہر اس تقریب مین ضرور شریک تھا لیکن میرے دل مین کس قسم کے تاثرات برپا تھے جسطرح انسان تکلیف اور مصیبتون کا عادی ہو جاتا ہے اسی طرح مین بھی اپنی محرومی پر صابر و شاکر ہو گیا لیکن محبت اسی طرح قائم تھی اسمین شمہ بھر بھی کمی نہین محسوس ہوتی تھی اب وہ تعین تقاصد سے بالکل مبرا تھی۔ ایک پرکیف خاموشی پرسکون خلش۔ ایک جان کو گھلانیوالی لیکن دل کو وجدانی کیفیتون سے لبریز کر دینے والی تپش، یہی میری محبت کی نوعیت تھی۔

شاہدہ سسرال سے واپس آ گئی۔ سسرال کے دور دراز ہونے کیوجہ سے اسکا میکے مین ایک عرصہ تک رہا اور اس اثنا مین مجھے اس سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوتا رہا۔ کچھ ملاقاتون کے بعد پھر یہ خیال میرے دلمین پیدا ہوا کہ اسکا اندازہ کرون کہ شاہدہ آیا حقیقتاً کبھی بھی میرے جذبات سے متاثر ہوئی؟ اب اسمین کوئی امر مانع نہین تھا۔ میری پاکبازی مین اسکو اشتباہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ میرے خلوص پر وہ مطمئن تھی اور اگر اس اطمینان کے بعد مین ا

پر اپنی محبت اور بے لوث محبت کا اظہار کرون تو یقیناً شاہدہ اس سے متوحش نہ ہوگی اور اظہار کے بعد اسکا جو جواب ہوگا وہ مجھے مطمئن کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ یقیناً مین نے اپنی محبت مین انتہائی ضبط و تحمل اور ایثار سے کام لیا۔ اگر شاہدہ مین اہلیت اور انسانیت ہے تو ضرور اسکا اعتراف کرے گی۔ میری تسکین خاطر کے لئے اتنا بہت کافی تھا۔

شاہدہ کے سسرال سے آنیکے بعد ایک روز مین نے ایک ریشمی رومال اوسکو ہدیہ دیا اور کہا "شاہدہ مین تمہاری شادی کے موقع پر اپنی طرف سے کوئی تحفہ پیش کرنا چاہتا تھا لیکن اسوقت اسکا کوئی موقع نہ تھا اسلئے اسکو اب تم قبول کرو اور اس خصوصیت کی یادگار مین جو مجھے تمہارے ساتھ ہمیشہ رہی ہے اسکو اپنے پاس محفوظ رکھو" شاہدہ نے کسی قدر شرمگین نگاہون کے ساتھ آسے لے لیا اور میرا شکریہ ادا کیا لیکن مین نے اسکے چہرہ کے رنگ مین ایک خفیف سی تبدیلی محسوس کی۔ اب شاہدہ مجھسے زیادہ آزادی اور بے تکلفی سے ملنے لگی تھی۔ لڑکیان شادی کے بعد عام طور پر اپنے قریبی عزیزون سے کسی قدر بے تکلف ہو جاتی ہین۔ شاہدہ بھی مجھسے بے تکلفی کے ساتھ ملنے لگی۔ اس بے تکلفی مین بھی مین نے اوس کی طرف سے کوئی بات ایسی نہین پائی جس سے مجھے اسکے تاثرات کا کچھ بھی علم ہوتا۔ یہ محض اپنے جذبۂ محبت کیوجہ سے مجھے خیال تھا ورنہ ظاہر تھا کہ شاہدہ اگر شادی سے پہلے کسی قدر متاثر بھی ہوگی تو شادی کے بعد اس اثر کو زائل ہو جانا چاہئے شاہدہ کو اب ایک دوسرے شخص سے محبت کرنا تھی اور پورے طورؔ اسکو اپنی محبت کا یقین دلانا تھا۔ یہ مرحلہ اس عورت کے لئے جو کسی خفیف اثر سے متاثر ہو بہت ہی سخت ہوتا ہے، اس سے گذرنیکے بعد اسکے سابقہ تاثرات یقیناً مٹ جاتے ہین۔ عورت جب کسی کو اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے تو اس سے محبت بھی.... کرتی ہے، شاہدہ کو اپنے شوہر سے یقیناً محبت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات تھی اور اسکا اندازہ کرنے مین مجھے کوئی دشواری نہین تھی۔ وہ اسکے حسن سلوک سے خوش تھی اور اس کا ذکر ہمیشہ مسرت اور بشاشی کے ساتھ کرتی تھی مین گو ضبط کا بہت کچھ عادی ہو چکا تھا لیکن پھر بھی مجکو اپنی قلبی کیفیتون پر پورا اعتماد نہین تھا۔ شاہدہ کے سامنے آکر مین خود رفتہ سا ہو جاتا میری قوت ارادی مضمحل ہو جاتی اور مین اس خیال سے متفکر ہو جاتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ مین ایسی حالت مین اس سے کچھ اظہار محبت کر بیٹھتا اور اس سے اوسکو غلط فہمیان پیدا ہو کر کچھ برے نتائج پیدا ہوتے۔ مین نے چاہا تھا کہ مین اس سے ملنا چھوڑ دون لیکن یہ بھی ممکن نہ تھا میری صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ یہان تک کہ خود شاہدہ کو بھی اس کا احساس ہونے لگا۔ ایک دن میری بہن کی موجودگی مین اُسنے مجھ سے پوچھا "آخر تمہاری کیا حالت ہوتی جاتی ہے۔ مین دیکھ رہی ہون کہ تمہاری صحت روز بروز بگڑتی جاتی ہے اور تم کچھ توجہ نہین کرتے۔ صحت زندگی مین سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ خدا کے لئے تم اپنی صحت کی طرف توجہ کرو" مین یہ سنکر خاموش ہوگیا میرے دل سے ایک دھوان سا اُٹھا میری آنکھین پرنم ہوگئین مین نے

کوئی جواب نہین دیا اور فوراً ہی وہان سے چلا آیا۔
دوسرے دن پھر شاہدہ نے وہی "تذکرہ چھیڑا اور پوچھنے لگی" مین دیکھتی ہون کہ آپ کچھہ کھوئے ہوئے سے رہتے ہین۔ اکثر
مین نے محسوس کیا کہ مین بہت سی باتین کر گئین اور آپ خدا معلوم کہان تھے، کیا مین دریافت کر سکتی ہون کہ اس کیفیت
حالی کا سبب کیا ہے شاہدہ کے اس سوال نے میرے دلمین ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ کیا شاہدہ میری محبت کا مضحکہ اڑا رہی ہے
وہ انتہائی ستم ظریف ہے یا وہ اس قدر خالی الذہن ہے کہ میری توجہات کو کسی اور طرف مائل سمجھکر میری رازدار بننا چاہتی
ہے میرے دلمین آیا کہ اب اپنی خاموشیون کو ختم کر دون لیکن پھر مین نے ضبط کیا اور کہا شاہدہ ایسی بات کیون پوچھتی ہو جسکے جواب
کے لئے تم تیار نہین ہو۔ میرا یہ فقرہ بہت مبہم تھا لیکن اس نے اپنی ذہانت سے شاید کچھہ سمجھا ہو مین نے اتنا اور کہا "اس قسم
کا سوال خدا کیلئے مجھسے پھر نہ کرنا ورنہ خدا معلوم کس قسم کا جواب میرے منہ سے نکلے اور تم پر اوسکا کیا اثر پڑے" شاہدہ کا طرز
اس دوران مین کچھہ عجیب طرح کا بیدردانہ اور تغافل سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مجھہ سے بے تکلفانہ ضرور ملتی تھی لیکن اسکے طرز
مین کسی قسم کا کوئی التفات نہین ظاہر ہوتا تھا اور مین اپنی محبت کے معاوضہ مین یقیناً غیر معمولی التفات کا متوقع تھا اور
توقع اپنی جگہ پر جائز اور درست تھی جبکہ یہی صرف میری محبت کا مقصد رہ گئی تھی۔ جب مین شاہدہ کی طرف سے بے اعتنائی
اور بے التفاتی محسوس کرتا تو میرے دل پر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔ میرے دل مین اسکی طرف سے بہت سے شکوے
بھرے ہوئے تھے لیکن مین ان کو کبھی زبان پر نہین لایا تھا۔ شاہدہ سے اس گفتگو کے بعد مین اسکے جواب کا انتظار
کئے بغیر چلا آیا اور گھنٹون اپنے کمرے مین پڑا ہوا یہ سوچتا رہا کہ آخر شاہدہ کے اس سوال کا کیا مطلب تھا۔ اور کیون وہ
سوال کے جواب پر مصر تھی۔ کیا وہ مجھے موقع دے رہی ہے کہ مین صاف لفظون مین محبت کا اظہار کر دون۔ اتنے مین ایک لڑکی
اوس نے آکر کہا شاہدہ نے مجھے بلایا ہے۔ مین نے وہان پہنچکر دیکھا کہ شاہدہ نہایت خاموشی سے اپنے کمرہ مین ایک طرف
ہوئی ہے۔ میرے قریب پہنچنے پر اوس نے مجھے ایک خط دیا اور کہا "اسکو فرصت مین دیکھئے اور اسکا جواب دیجئے"
خط کو لے لیا اور اضطرابی حالت کو چھپائے ہوئے واپس آگیا۔ انتہائی بے چینی کیساتھ مین نے اس خط کو کھولا تو یہ مضمون
"آپ متعجب ہونگے کہ مین یہ خط آپ کو کیون لکھہ رہی ہون۔ مین عرصہ سے آپ کے طرز عمل کو دیکھہ رہی ہون
اسمین کچھہ عجیب باتین محسوس کر رہی ہون۔ کئی بار مین نے چاہا کہ آپ کے اصلی خیالات کا کچھہ اندازہ کرون لیکن مصلحتاً
رُک گئی۔ اب مین سمجھتی ہون کہ دریافت حال مین کچھہ ہرج نہین ہے۔ آخر آپ اس قدر پریشان کیون رہتے ہین۔ اگر
اس قابل ہے کہ مین اوسکی رازداری کر سکون تو مجھے اسمین شریک کیجئے۔ مین یقین دلاتی ہون کہ مین اپنی پوری
کوشش آپ کی مقصد برآری مین صرف کرونگی آپ مجھپر پورا اعتماد کیجئے۔

خط پڑھنے کے بعد مین گھنٹہ بھر تک ایک عجیب سناٹے مین رہا اور سوچتا رہا کہ مین شاہدہ کو اس خط کا کیا جواب دون میرا یہ جواب میری محبت کی تاریخ مین ایک انقلاب کرنیوالا واقعہ ہوگا کیونکہ یہ پہلا موقع ہے کہ مین شاہدہ کو اپنی محبت کے متعلق کچھ لکھونگا لیکن پھر فوراً ہی دوسرا خیال میرے دماغ مین آیا کہ آخر مین کیون اسپر اپنی محبت کا اظہار کرون اور اگر ایسا کرون بھی تو اسکا مقصد ظاہر ہے کہ شاہدہ اب آزاد نہین۔ اسکی جائز محبتون کا مستحق ایک شخص موجود ہے اور وہی اسکی تمام توجہات کا مرکز ہونا چاہئے مین اس سے ضرور محبت کرتا ہون لیکن میری محبت کا یہ تقاضہ نہین ہونا چاہئے کہ مین اسکے اظہار سے اسکی زندگی مین ذرا سا بھی انتشار پیدا کردن۔ بے غرض اور بے لوث محبت جب میرا اصول ہے تو پھر اسکی ضرورت ہی کیا ہے کہ شاہدہ بھی اس سے واقف ہو اور اسکے جواب مین اپنی محبت التفات کا اظہار کرے مین نہین چاہتا کہ شاہدہ میرے لئے اپنی فطرت سے جنگ کرے وہ اپنے شوہر کی محبت پر مطمئن ہے اور اسکو مطمئن رہنا چاہئے اسلئے مین نے تہیہ کرلیا کہ مین اپنے خیال کی کمزوری سے مقابلہ کرونگا مین نے ایک پرچہ اسکے جواب مین لکھا۔

عزیزمن۔ میرے خیال کی پریشانیون کو پوچھکر کیا کرو گی۔ مین جس حالت مین ہون اچھا ہون اسی حالت مین مجھے رہنے دو۔ کوئی ایسا معاملہ نہین جسمین تم امداد کرسکو۔ خود تمہارے طرز عمل سے مجھے کچھ غلط فہمی ہوئی تھی میرا خیال تھا کہ تم نے میری مخلصانہ خصوصیت اور محبت کا صحیح اندازہ نہین کیا اور کسی غلط فہمی مین پڑ گئین۔ اور غالباً اسیوجہ سے تمہارا برتاؤ شادی کے بعد وہ نہین رہا جسکا مین متوقع تھا۔ شاہدہ مجھے تمہارے ساتھ ابتدا سے ایک خصوصیت رہی ہے خواہ تم اسکا اعتراف کرو یا نہ کرو۔ لیکن تمہارا دل ضرور اسکو محسوس کرتا ہوگا۔ شاہدہ یقین کرو کہ حاضر و غائب وہی خصوصیت مجھکو تمہارے ساتھ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مین یہ نہین چاہتا کہ تم بھی اس کے جواب مین کسی خصوصیت کا اظہار کرو۔ بلکہ صرف یہ چاہتا ہون کہ جو طریق عمل تمہارا ابتک رہا ہے وہی قایم رکھو اور میرے مخلصانہ اُنس کو ایک منٹ کے لئے بھی کسی دوسری نظر سے نہ دیکھو۔ تمہارے خیال مین جو یہ تبدیلی پیدا ہوئی ہے اس پر مین تمہین کچھ لزام نہین دیتا۔ شادی ہونیکے بعد لڑکیون کے خیال مین بہت تبدیلیان پیدا ہوجاتی ہین اور وہ معمولی باتون کو بھی اہمیت دینے لگتی ہین غالباً تم نے میرے برتاؤ کو بھی اسی نقطہ نگاہ سے دیکھا اور اسی لئے تم نے یہ خط لکھا۔ مین اِس سے زیادہ کچھ اور لکھنا نہین چاہتا۔ تمہارا مخلص۔ ظفر۔

یہ خط مین نے شاہدہ کے پاس بھجوا دیا اور کئی روز تک مین شاہدہ کے یہان نہین گیا اور نہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس خط کا اس پر کیا اثر ہوا۔ ایک دن پھر اسکا ایک پرچہ ملا جسمین یہ عبارت تھی۔

واہ آپ مجھے تو چاہتے ہین کہ مین اپنے برتاؤ مین تبدیلی کرون اور خود اپنے برتاؤ مین تبدیلی کررہے ہین

آخر آپنے آنا کیون چھوڑ دیا۔ کیا اس سے پہلے کوئی روز بھی ایسا گذرتا تھا جس مین آپ ہمارے یہان نہ آتے ہون، جب اخلاص ہے تو یہ فرق کیون۔ آپکے خلوص کا احساس کرتے ہوئے آپ کی منت پذیر۔ شاہدہ

اُسی روز شام کو مین شاہدہ سے ملنے گیا۔ وہ اپنے کمرے مین ایک طرف خاموش بیٹھی تہی۔ مین اُسکے قریب ہی تخت پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر مین اور وہ خاموش رہے۔ اسی اثناء مین مین بولنے کے لئے الفاظ کا متلاشی تھا۔ مین کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن دلمین ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہوتی تھی جو زبان بند کئے دیتی تہی۔ بالآخر شاہدہ نے خود ہی سکوت توڑا اور کہنے لگی "لوگون نے عورتون کو بالکل ہی بے حس سمجھ لیا" میرے دل کی حرکت اسی جملہ کو سنکر اور تیز ہوگئ اور مین انتظار کرنے لگا کہ دوسرا فقرہ شاہدہ کیا کہتی ہے مگر شاہدہ یہ کہکر خاموش ہی رہی۔ وہ میرے جوابکی منتظر تھی

"ان کی بے حسی مین کیا شک ہے" مین نے کہا، "یہ صرف سمجھ کی غلطی ہے۔ عورتین کبھی بے حس نہین ہوتیں صرف وہ اپنے احساس کے چھپانے پر قادر ہین اور مرد نہین۔ شاہدہ نے جواب دیا۔

"شاید ایسا ہو" مین نے کہا "لیکن انکا طرز عمل تو کچھ اور کہتا ہے" "عورتون کے طرز عمل سے ان کے احساسات کے متعلق کوئی رائے قایم کرنا نہ تجربہ کاری ہے۔ عورتون کا احساس اُن کے ظاہرا افعال سے کوئی تعلق نہیں رکھتا" شاہدہ نے کہا۔

"لیکن یہ تو ایک فریب ہے" مین نے کہا۔

شاہدہ کا رنگ متغیر ہوگیا "مہربانی کرکے اس فریب دہی کی غرض بھی بتائی جائے" "محض خودداری کا اظہار اور دوسرون کے احساسات کو پامال کرنا"

مین خدا معلوم کس عالم مین یہ کہہ گیا لیکن یکایک مجھکو یہ خیال آیا کہ مجھکو شاہدہ سے اس قسم کی باتین کرنے کوئی حق نہین۔ مین اس اخلاقی حدود سے بھی تجاوز کر رہا ہون۔ یہ خیال کرکے مین نے فیصلہ کر لیا کہ اس ملاقات کو جلد ختم کر دون ورنہ گفتگو مین طول ہوگا۔ اور خدا معلوم مین بے اختیاری مین کیا کہہ جاؤن گا میری آنکھون مین آنسو بھر آئے اور مین نے کہا "شاہدہ اس گفتگو کو ختم کرو اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے مجھے خیال نہ تھا کہ رفتہ رفتہ اتنا اہم پہلو اختیار کریگی۔ یہ مین ضرور کہونگا کہ جب تم کو میرے جذبات کا احساس تھا تو اسکا اظہار نہ کرنا چاہئے تھا تم کو نہین معلوم کہ اس تھوڑی سی مختصر گفتگو نے میری زندگی مین ایک انقلاب پیدا کر دیا مین نہین بتا سکتی کہ میرا آئندہ طرز عمل تمہارے ساتھ کیسا ہونا چاہئے۔ میرے دماغ مین خیالات کا ایک تلاطم برپا ہے۔ شاہدہ تم ہی بتاؤ کہ آخر مین کیا کرون۔

"مین آپکا مطلب بالکل نہ سمجھی۔ آخر ہمارے طرز عمل مین فرق کیون آئے آپ پہلے ہی مجھے لکھ چکے ہین کہ ہمارے

خلوص مین فرق نہ آنا چاہیئے۔" مین نے پہلے جو یہ لکھا تھا وہ اور جذبات خیالات کے ماتحت تھا۔ جب تک کہ مین اس نظریہ سے واقف نہ تھا کہ عورتون کے طرزِ عمل سے ان کے احساسات کے متعلق کوئی رائے قایم کرنا ناتجربہ کاری ہے" اب مین اور ہی عالم مین پہنچ گیا اس لئے مین اپنی گذشتہ تحریر کو واپس لیتا ہون اور اُمید ہے کہ تم مجھے معاف کروگی اگر مین یہ کہون کہ اب ہمارا ملنا ہمیشہ کیلئے نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے سوائے بُرے نتائج کے کوئی فائدہ نہوگا۔ میرا قلب جذبات سے متاثر ہوتا جائیگا۔ اگر تم بھی اس سے متاثر ہوکر مجھپر التفات کرنے پر مجبور ہوجاؤ تو اس سے تمہارے شوہر کی بڑی حق تلفی ہوگی اور مین اسکو گوارا نہین کرسکتا۔ مجھے اجازت دو کہ مین تم سے اسوقت ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجاؤن۔ شاید تم یہ خیال کرو کہ مجھے تم سے کوئی شکایت رہیگی۔ نہین یہ تو مقدرات ہین میری قسمت مین یہی تھا کہ مین اسطرح تم سے علحدہ رہنے پر مجبور ہوجاؤن تم پر مین کسی طرح کا الزام نہین دیسکتا۔ مین تمہارا بدستور بہی خواہ ہونگا اور اگر کبھی تم کو ایک سچے اور ہمدرد دوست کی ضرورت پڑے تو مجھکو خط لکھنے مین تامل نکرنا۔ مین ہر ممکن طریقہ سے تمہاری امداد کو تیار رہونگا لیکن ملنا اب نہین ہوسکتا موجودہ صورت مین ہمارے لئے اِس سے بہتر اور کوئی راستہ نہین ہے کہ ہم ملنا قطعاً ترک کردین۔

یہ کہکر مین اُن کو سلام کرکے وہان سے چلا آیا اور شاہدہ جسے یقیناً ملاقات کے اس انجام کی توقع نہ تھی خاموش کھڑی رہ گئی۔

اب مجھے شاہدہ سے ملے ہوئے کئی سال گذر گئے ہین۔ اُسکی ہستی میرے لئے خواب و خیال سے زیادہ اہمیت نہین رکھتی مین اب کبھی اسکے مکان کی طرف سے بھی نہین گذرتا کہ کہین جذبات سے مغلوب ہوکر اس سے ملنے پر مجبور نہ ہوجاؤن۔ اس عرصہ مین اس کا کوئی خط نہین آیا۔ اور نہ میرا یہ مطلب ہی تھا کہ ہم برابر خط و کتابت کرین۔

مجھے اور ذرایع سے اسکی خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے اور معلوم ہوا ہے کہ اسکی صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے اور اب اسکی سسرال اور میکہ والے اس سے متفکر ہین۔ مین ان خبرون کو سنتا ہون اور اس کا مطلب سمجھتا ہون لیکن سوائے صبر کے اور کیا ہوسکتا ہے "

بت خانہ

شب جو ظلمت پوش ہے　صبح در آغوش ہے　شمع بھی خاموش ہے
کل جہاں پُرنور ہے　حسن سے معمور ہے

اب ہے ہر شے دلکشا　منظر راحت فزا　شاہد فطرت نما
پُر رنگینی دلچسپیاں　ہے نظر مین کل جہاں

دیکھتا ہون سربسر　اب منقش بام و در　صنعت ذوق بشر
دید کے قابل مگر　اور سب کو چھوڑ کر

بس ہے مسجد کی جگہ　سرزمین بت کدہ　عاشقوں کی سجدہ گہ
بزم رسم عاشقی　رسم بزم عاشقی

شیخ سرگرم نیاز　ہے بصد سوز و گداز　پیش رب کارساز
لطف سے ہے ہمکنار　دید کا ہے خواستگار

اس طرف بت خانہ مین　کچھ طلائی مورتین　عشق کا جو درس دین
ہین پرستش کے لئے　دلفریب انداز سے

اس جگہ اک نازنین　دلربا ناز آفرین　ساری دنیا سے حسین
آئی پوجن کے لئے　اوسکا سب سامان کئے

آنکھ ہے تغیر حال　رُخ پہ ہے گرد ملال　غم کا چھپانا ہے محال
آرزو کا جوش ہے　دل تمنا کوش ہے

لیکن اس سے بے خبر　نازنین ہے سربسر　اوسمیں خود ہے جلوہ گر
پرتو نور خدا　شاہد رنگین ادا

اور اُسکا بت کدہ　آرزون سے ہے بھرا　خود ہے دل اُس دیوی کا
جس کی ہر اک آرزو　ہے بت صد حیلہ جو

مست صہبائے طلب کر رہی ہے روز و شب وہ پرستش جس کی اب
جستجو دل میں لئے آرزو دل میں لئے

(ابو المعانی) بسمل بلگرامی

نالظم الملک جناب مولوی سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی منصف حیدرآباد اسٹیٹ

مین صفحہ جہاں پہ عبث آفریدہ ہون
کلک قضا سے نقطۂ از خود چکیدہ ہون

مین فرط اضطراب سے از خود رمیدہ ہون
برق طپیدہ و شرر برجہیدہ ہون

ہر عیب سے بری ہون مجھے کوئی کچھ کہے
مین پاک مثل یوسف دامن دریدہ ہون

میری خوشی ہے رنج کا پہلو لئے ہوئے
مانند صبح عید گریبان دریدہ ہون

میرا وجود محض عدم ہے میرے لئے
مین ہون بھی کچھ تو اک رقم خط کشیدہ ہون

اس انجمن مین تاب نظارہ نہین مجھے
مین جلوہ گاہ طور مین ہوش پریدہ ہون

تھوڑی سی دیر کی ہے یہ میری شگفتگی
باغ جہاں مین مین گل شاخ بریدہ ہون

زاہد کو میکدہ مین کوئی پوچھتا نہین
پھر اُسپہ یہ غرور کہ مین برگزیدہ ہون

سب مجھسے بے خبر ہین میرا حال دیکھکر
گویا نوشتہ ورق آبدیدہ ہون

دشمن ہون دشمنون کا تو ہون دوستونکا دوست
تیغ کشیدہ اور کمان خمیدہ ہون

افتادگی نے عرش پہ پہونچا دیا مجھے
مین دیدۂ یتیم کا اشک چکیدہ ہون

دنیا مین مجھسے کوئی نہین گوش آشنا
مضمون تازہ و سخن ناشنیدہ ہون

بحر جہان مین مجھکو ڈبوئینگے میرے اشک
مثل حباب مین ہمہ تن آبدیدہ ہون

اطہر وہ آب شباب کی رنگینیان کہان
پیری سے مین خزان بناخن رسیدہ ہون

احساسِ گناہ کی قیمت

گذشتہ سے پیوستہ

(از جناب محمد صدیق صاحب مسلم مالی گانوی)

(معاشرتی فسانہ)

(۳)

کوئی آدھی رات گذر چکی ہوگی۔ ساری کائنات پر ایک سکون مطلق طاری تہا خلق خدا گہری نیند مین پڑی سو رہی تھی۔ یکایک کسی آہٹ سے قدسیہ کی آنکھ کھل گئی اُسے نیچے کے بڑے کمرے سے کسی چیز کے توڑنے کی آہستہ آہستہ آواز سنائی دیرہی تھی پہلے تو سمجھی کہ واہمہ ہے مگر جب رہ رہ کر وہی آواز آنے لگی تو اُسکے ہاتھون کے طوطے اُڑ گئے جسم مین کپکپی پڑگئی اور خون خشک ہو کر رہ گیا۔ آہستہ سے میان کو بیدار کیا اور کانون تک منہ لیجا کر کہا۔

"جلد اُٹھئے! معلوم ہوتا ہے نیچے چور گھس آئے ہین۔ اللہ تیری امان!! سب روپے نیچے کی آلماری ہی مین ہین۔ اتنا سننے کیساتھ ہی شمعون اُٹھ بیٹھے اور دبے پاؤن زینے سے اُتر کر نیچے پہنچے لیکن چور کو شاید اونکی آہٹ لگ گئی وہ ایک دریچے کی طرف بھاگا اور شمعون کو ایک دھندلی سی تصویر دریچے سے نیچے جاتی ہوئی معلوم ہوئی۔ "ارے حرامزادے ٹھہر!" کی خوفناک چیخ کے ساتھ وہ اُسکے پیچھے دوڑے مگر قسمت آج ادن سے پوری طرح برگشتہ تھی۔ دوڑنے مین کسی چیز سے ٹکرا کر بُری طرح گرے اور چور یہ جا وہ جا!!!

"اے اللہ! یہ کیا ہوگیا۔

اوّل ترچھی روشنی کمرے مین پڑی اور پھر لالٹین ہاتھون مین لئے ہوئے قدسیہ نظر آئی اوس نے میاں کو گھٹنے پکڑے کراہتے ہوئے دیکھکر دور ہی سے مذکورہ جملہ تھرتھراتی ہوئی آواز مین ادا کیا۔

"بدمعاش کو پکڑ ہی لیا تہا مگر مین اس چھوٹے ٹیبل سے ٹکرا کر گرا اور وہ نکل گیا۔ ہائے! ہائے اب کیا کرون گشت والے سپاہی کی آواز بھی تو سنائی نہین دیتی"

قدسیہ نے بڑھکر آلماری دیکھی تو وہ ٹوٹی ہوئی تہی اور روپے غائب تھے دماغ چکرا گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی اتنے مین

گشت والے پولس کی ملکار سنائی دی۔ شمعون گرتے پڑتے دروازے تک پہنچے اور اُسے اندر بلا یا۔ پولیس نے واقعات قلمبند کر لئے خوش قسمتی سے چوری گئے ہوئے روپے سو سو روپے کے نوٹ کی صورت میں تھے اور سب کے نمبر نوٹ بک میں شمعون نے درج کر لئے تھے۔ پولیس تو رخصت ہو گیا مگر قدسیہ کے حواس مجتمع نہیں ہوتے تھے۔ وہ اور ہی تھی اور اوسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ رہا تھا۔ شمعون نے اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر تسکین دیتے ہوئے کہا "اب رونے دھونے سے کیا حاصل جو قسمت میں بدا تھا وہ ہو کے رہا اور اگر قسمت پھر سیدھی ہوتی تو انشاءاللہ کل چور پکڑا جائیگا"

"اب وہ کل ہے کو ہاتھ آتا ہے اے میرے اللہ میں کیا کروں۔ ہم تباہ ہو گئے۔ برباد ہو گئے!!!

(۴)

صبح ہوتے ہوتے تمام بھیم بھو میں ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ شب میں چوروں نے اس چھوٹے سے قصبے پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ ایک ہی رات میں دو جگہ نقب زنی کا حادثہ ہوا۔ شمعون کی طرح چنی لعل سیٹھ ساہوکار کی کوٹھی پر بھی اُنھوں نے دھاوا مارا۔ رات بھر تو سیٹھ صاحب خوب گھوڑے بیچ کر سوئے۔ صبح کے نیچے آنے تک اُنکے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی لیکن جب نیچے کے کمرے میں صبح کو آئے اور حقیقت حال پر روشنی پڑی تو چلا چلا کر زمین و آسمان ایک کر دیا بلکہ عوام میں یہ مشہور ہو گیا کہ سیٹھ صاحب غم کے مارے پاگل ہو گئے۔ کشاں کشاں یہ خبر ہمارے پریمی جوڑے کو بھی لگی"

انسان پر خواہ کتنا ہی رنج و غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے مگر دنیا کا کاروبار بند نہیں ہوتا۔ ضروریات زندگی ہی کچھ ایسی ہوتی ہیں جو خواہ مخواہ انسان کو اپنے روزانہ مشاغل کی تکمیل کیطرف مائل کرتی رہتی ہیں۔ صبح ہوتے ہی قدسیہ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر چائے تیار کی اور جھاڑو لیکر مکان صاف کرنے لگی۔ ابھی دو چار ہی ہاتھ چلائے ہونگے کہ چھوٹی میز کے پاس اُسے کوئی چیز چمکتی نظر آئی۔ وہ ہیرے کی ایک انگوٹھی تھی۔ اُس نے حیرت و استعجاب سے انگوٹھی اُٹھا لی اور میاں کو آواز دی۔ شمعون پژمردہ و ملول بیٹھے ہوئے تھے۔ بیوی کی آواز پر دوڑتے آئے۔ بڑی حیرت سے انگوٹھی ہاتھ میں لی اور لگے پھرا پھرا کر دیکھنے۔ انگوٹھی بہت خوبصورت تھی اور اسمیں بڑے بڑے پانچ روشن نگینے جڑے ہوئے تھے جنکی آب و تاب سے آنکھیں خیرہ ہوتی جاتی نہیں۔ نگینوں کی درخشانی ہی اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ انگوٹھی گراں قیمت ہے کیا کچھ سمجھیں، شمعون نے کہا "معلوم ہوتا ہے، چور پہلے گھسا سیٹھ صاحب کی حویلی میں۔ وہاں کی لوٹ میں یہ چیز اُسکے ہاتھ آئی۔ پھر ہمارے مکان میں گھسا۔ پکڑے جانیکے خوف سے جب وہ دریچے میں سے بھاگا ہے تو پریشانی میں یہ انگوٹھی اوس سے گر گئی"

قدسیہ ذرا سوچ میں پڑ گئی۔ اُسکے چہرے پر اُسکے دلی کیفیات ظاہر ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے

ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

"میرے خیال مین ایک بات آتی ہے۔ موتے مارواڑی نے ہمارے ساتھ بڑی سختی وبے مروتی کا برتاؤ کیا اُس نے ہماری بھی ہتک کی اور والد مرحوم کی شان مین بھی گستاخانہ الفاظ کہے۔ اوسکی یہ انگوٹھی دیکر خدا نے انتقام لینے کا اچھا موقع دیاہے۔ اِس لئے اس انگوٹھی کو فروخت کر کے اُسکا قرضہ چکایا جائے،،

شمعون قدسیہ کی طرف ایک طویل خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے، قدسیہ نے پھر کہا "اب اسمین تاخیر کیون ہے نو کی گاڑی سے بمبئی جایئے اور محمد اکرم کی وساطت سے فروخت کرڈالئے۔ وقت بہت کم ہے جلدی کیجئے۔ لیکن دوپہر کی گاڑی سے واپس آجانا۔ مجھے سخت انتظار رہیگا۔ پھر شام کو موتے مارواڑی کی کفن کو روپے لیجاکر لگادینا،،

شمعون خموشی سے یہ سب سن رہے تھے اُن کے چہرے سے اُنکا دلی استحکام ٹپکا پڑتا تھا۔ آخر ان کی حالت متغیر ہونے لگی۔ اُنھون نے دانتون سے ہونٹ کو دبالیا۔ قدسیہ تو بول کر چپ ہوگئی اور میاں کا دلی منشا معلوم کرنیکے لئے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ آخر بڑی دیر کے بعد ایک گہری سانس لیکر شمعون نے کہا۔

"اچھا تو پھر ایسا ہی کرتا ہون۔ آسے بیچ ہی ڈالنا چاہیئے،، اتنا کہکر شمعون نے کوٹ پہنا۔ ٹوپی اوڑھی اور انگوٹھی حفاظت سے جیب مین ڈالکر گھر سے نکل پڑے۔ جبتک شمعون نظرون سے اوجھل ہوئے۔ قدسیہ بڑی بے چینی سے ٹکٹکی لگائے دیکھا کی مگر جب وہ نظرون سے چھپ گئے تو پھر ہاتھ مین جھاڑو لی اور مکان صاف کرنا شروع کیا۔

(۵)

کہنے کو تو صرف دل کے دو حرف ہین اُور بھی جلا ایک سے ایک۔ لیکن کیفیات و خصوصیات کی اوسمین ایک دنیا بستی ہے سب سے بڑا وصف اوس مین یہ ہے کہ جب کبھی انسان اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام کرتا ہے تو اندر سے یہ لعنت وملامت کرنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جلد یا بدیر انسان اپنے کئے پر دست تاسف ملتا اور افسوس کرتا ہے۔ یہی حالت قدسیہ کی بھی ہوئی۔ اُس نے جوش مین آکر اور دل کمزوری سے مغلوب ہوکر شمعون کو صلاح تو دیدی مگر ابھی جھاڑو لیکر دو تین ہی ہاتھ چلائے ہونگے کہ اسکا دل اندر سے بیٹھنے لگا۔ کسی نامعلوم خطرے کا اندیشہ محسوس ہونے لگا۔ صدمے سے دماغ کی رگین کھچنے لگین۔ وہ اپنے اوپر ملامت کرنے لگی کہ "ہائے! ہائے! قدسیہ تونے دنیاوی جاہ وحشمت پر اپنی سچائی کی بھینٹ چڑھادی۔ ہیرے کی چمک دمک نے تجھے کیسا اندھا کردیا کہ اپنے ساتھ اپنے عزیز شوہر کو بھی چاہ ضلالت مین گرانیکو تیار ہوگئی۔ تیری آنکھون پر کیسے پردے پڑ گئے کہ تو حق وناحق مین تمیز نہین کرسکتی۔ تجھے غیرون کا مال فروخت کرنے کا کونسا حق حاصل ہے۔ افسوس صد افسوس تیری ہی تحریک نے شمعون کو انگوٹھی فروخت کرنے پر آمادہ کیا تیری

ہی دلی کمزوریوں نے یہ روز بد دکھایا کہ شمعون چور اور اُچکے کے نام سے بدنام ہو، چور اور اُچکا، اِن الفاظ کا خیال آتے ہی قدسیہ پر ایک دیوانگی طاری ہوگئی اور اس نے جھپٹ کر کھونٹی سے چادر کھینچی۔ اسمین خود کو لپیٹا اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی۔ اسٹیشن وہان سے تقریباً ایک میل دور تھا اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہی ہو مگر شمعون کو بمبئی جانے سے روک لیا جائے ہائے قسمت!! ہائے قدسیہ ابھی اسٹیشن سے چند ہی قدم کے فاصلے پر ہوگی کہ سیٹی ہوئی اور انجن دھائین دھائین کرتا ہوا پلیٹ فارم سے چل کھڑا ہوا۔

(۶)

کسی شاعر کا مقولہ ہے کہ ع تدبیر کے پر جلتے ہین تقدیر کے آگے

اس مصرع کی حقیقت کو قدسیہ کل سے محسوس کر رہی تھی۔ وہ اسٹیشن سے واپس پھری مگر اندوہ و حرمان کا بوجھ سینے پر لئے ہوئے۔ وہ چلی مگر ناکامی کی زنجیر پاؤن کو روک رہی تھی۔ وہ ایک گہری فکر مین تھی اور اُسے اس فکر مین اندیشہ۔ اندیشہ مین تشویش۔ تشویش مین افسوس۔ افسوس مین غم۔ غم مین بدنامی۔ اور بدنامی مین تباہی صاف طور سے نظر آرہی تھی۔ اب اُسنے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ مین سچائی پر پوری طرح ثابت قدم رہونگی چاہے اسمین میرا سارا مال و اسباب ہی کیون نہ صرف ہوجائے، اگر خدانخواستہ انگوٹھی فروخت کر ڈالی گئی ہوگی تو اُن کے واپس آتے ہی مین پھر اُلٹے پاؤن اُنہین بمبئی روانہ کرونگی اور دام واپس کرکے انگوٹھی منگا لونگی۔

کہنے کو تو ایک میل کی مسافت کچھ بہت زیادہ نہین مگر اسکی اہمیت کا کچھ وہی لوگ اندازہ کرسکتے ہین جن پر کبھی ایسا حادثہ گذرا ہو۔ خدا خدا کرکے قدسیہ مکان کے قریب پہنچی۔ نظر دوڑائی تو دروازہ چوپٹ دکھائی دیا۔ دل اُچھل کر گلے مین آلگا "ہا اللہ! قسمت کیون میرے پیچھے اسطرح ہاتھ دھو کر پڑی ہے۔ چورون نے کہین پھر تو ہاتھ صاف نہین کیا۔ میری کیسی کمبختی کہ گھبراہٹ مین دروازہ بند کرنا بھول گئی"۔

اندر قدم رکھا تو حیرت و استعجاب نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ میان کو غور و فکر مین سر جھکائے کرسی پر پایا۔ بے تحاشہ دوڑ کر لپٹ گئی اور بھرائی ہوئی آواز مین کہنے لگی۔

"بڑی خیریت گذری کہ آپ بمبئی نہ گئے ورنہ مجھ کمبخت نے آپکو برباد ہی کر دیا تھا۔ آپکے جانے کے تھوڑی دیر ہی بعد مین بھی جھپٹ کر اسٹیشن پہنچی مگر گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ میری بھی کیسی عقل ماری گئی تھی جو مین نے آپکو یہ صلاح دی۔

بیوی کو تھپک کر شمعون نے تسکین آمیز لہجے مین کہا۔

"قدسیہ تم نے فوری جوش مین یہ صلاح دیدی مگر مجھے تمہاری طبیعت کے حقیقی رجحان کی خبر تھی اور مین نے یہ بھی سمجھ لیا تھا

ہ تم بعد مین ٹھنڈے دل سے غور کروگی تو ضرور اپنے کئے پر پچتاؤ گی - لہذا مین اسٹیشن پر نہ جاتے ہوئے سیدھا چنی لال کے مکان پر پہنچا "

" تو کیا انگوٹھی اوسی کی تھی " قدسیہ نے مستفسرانہ نگاہ ڈالکر کہا -

شمعون نے ذرا ہنستے ہوتے جواب دیا " ہان تھی تو اوسی کی مگر یہ ظالم ساہوکار بھی کیسے سنگدل ہوتے ہین - انگوٹھی دیکھتے ہی ہاتھ بڑھا کر مجھ سے لے لی اور شکریہ وغیرہ تو درکنار مجھے لگا دیکھنے مشکوک نگاہون سے - یہ ہے دنیا اور دنیا کا انصاف - نالائقون کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے " یہ کہتے کہتے شمعون کا چہرہ غصے سے قدرے تمتما اوٹھا اس پر قدسیہ کچھ بولنا ہی چاہتی تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی - قدسیہ اوٹ مین ہو گئی اور شمعون نے باہر آکر جو دیکھا تو سیٹھ چنی لال تھے ، بڑی آؤ بھگت سے اندر لا کر ایک کرسی پر جگہ دی - دوسری کرسی پر خود بیٹھے اور کہنے لگے

" کہئے سیٹھ صاحب کیسے تکلیف فرمائی -

" مین اپنے برتاؤ پر نادم ہون اور تم دونون سے معافی مانگنے آیا ہون " سیٹھ صاحب نے ذرا خجالت آمیز لہجے مین کہا

" صاحب ! آپ تو ناحق ہمین شرمندہ کر رہے ہین "

" نہین نہین ! تم دونون کے مراتب و حقوق سے آشنا ہو کر بھی مین نے آجتک سختی کا برتاؤ قایم رکھا - سیٹھ عبدالرحیم میرے دوست تھے اور دوست بھی کیسے محسن و مخلص - اِس لحاظ سے تم دونون میرے بچون کے برابر ہو لیکن میری آنکھون پر غفلت کے ایسے پردے پڑ گئے کہ مین نے اُن قدیم تعلقات کا کچھ بھی لحاظ نہ کیا - کیا کرون جب سے میری بیوی نے داغ مفارقت دیا ہے اُسوقت سے میری یہ حالت ہو گئی ہے ورنہ مین اتنا سنگدل نہ تھا " سیٹھ صاحب کی آنکھون مین آنسو ڈبڈبا آئے "

" لیکن ہم آپکے اس برتاؤ سے . . . .

سیٹھ صاحب نے بات کاٹ کر کہا " بچے یہ تیرا انکسار ہے خاکساری ہے - شرافت ہے - اس انگوٹھی کی کیا قیمت ہے - اسکا اندازہ تو نہین کر سکتا - ہیرون کی قیمت تو آٹھ دس ہزار سے زائد نہین لیکن ایک خاص لحاظ سے وہ میرے لئے انمول ہے جسکی حقیقت کو اسوقت واضح کر دینا مین ضروری سمجھتا ہون -

" میری بیوی خدا اُسے جنت نصیب کرے ہمیشہ تصویرین کھچوانیکے خلاف تھی - بارہا ایسا ہوا کہ فوٹوگرافر اپنا ساز و سامان لیکر آ گیا ہے مگر وہ سکے اپنی ضد پر قایم - مجبوراً اُسے واپس جانا پڑا لیکن اینشور جانے یکایک اوسکی طبیعت مین کسطرح انقلاب پیدا ہو گیا - ایکروز اُس نے خود ہی یہ ذکر چھیڑا کہ اگرچہ مین تصویرین کھنچوانے کی مخالف رہی ہون مگر اب میری

خواہش ہے کہ آپ اور مین ایک ساتھ بیٹھکر تصویر کھنچوائین ۔ مجھے یہ سنکر بہت مسرت ہوئی ۔ چنانچہ دوسرے ہی روز
یک مشہور مصور سے ہم نے تصویر کھنچوائی ۔ میری اہلیہ نے اُس تصویر کو ولایت بھجوا دیا تاکہ اوسکی نہایت ہی چھوٹی
پی بناکر انگوٹھی مین بٹھا دی جائے اور اُس پر لینس جڑ دیا جائے ۔ تھوڑے ہی دنونمین یہ انگوٹھی حسب مرضی تیار ہوکر
ئی ۔ میری اہلیہ نے تصویر کی جملہ کا بیان ضایع کردیں اور انگوٹھی میرے ہاتھونمین پہناتے ہوئے کہنے لگی کہ میری یہ
ن خواہش ہے کہ میرے بعد میری ایک ہی تصویر ہو اور وہ ہمیشہ آپکے پیش نظر رہے ۔

اتنا کہکر سیٹھ جی نے انگوٹھی شمعون کی طرف بڑھا دی ۔ شمعون نے دیکھا تو واقعی نگینون کے مقابل ایک بہت
ہی باریک لینس جڑا ہوا تھا اور اوسمین سیٹھ صاحب اور اُن کی اہلیہ کی تصویر نمایان طور سے نظر آرہی تھی ۔

سیٹھ صاحب نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا :- یہ انگوٹھی ہمیشہ میری اُنگلیونمین رہتی تھی لیکن کل غلطی
سے مین نے میز پر رکھدی اور بھول گیا پھر طرفہ یہ کہ کل ہی چورون کے ہاتھ لگ گئی ۔ مین آپ دونون کا بڑا احسانمند ہون
کی وساطت سے میری یہ عزیز و گران بہا چیز واپس مل گئی لیکن مین بڑا ہی بیوقوف ہون کہ آپکا احسان ماننے کے
سے مین سختی اور نفرت سے پیش آیا "

قدسیہ یہ گفتگو پردے کی آڑ مین کھڑی سن رہی تھی اُس نے کہا "سیٹھ صاحب آپ صرف انکا احسان مانئے
محبت نے تو حرص و ہوا کے جال مین پھنس کر کچھ اور ہی ارادہ کرلیا تھا" اتنا کہکر اُس نے تمام واقعہ مختصراً کہہ سنایا ۔

سیٹھ صاحب نے مسرت آمیز لہجے مین کہا ۔ بچی ! اسی سے تیرے شوہر کی اصلی شرافت ظاہر ہوتی ہے ۔ تیرے
ہر نے بیان کیا تھا کہ تیری ہی وجہ سے وہ حرص و ہوا کا شکار نہوا ۔

یہ سنکر قدسیہ کو اپنے شوہر کی اس انتہائی محبت کا احساس پیدا ہوا ۔ اوسکی آنکھون مین آنسو بھر آئے ۔ سیٹھ صاحب نے
کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم میرے روپے ادا کرنیکی فکر مین ہو ۔ اور اُسکا بھی مجھے احساس ہے کہ تم یہ روپے سخت
لات و مصائب کا مقابلہ کرکے فراہم کروگے کیونکہ تمہاری حیثیت و طاقت کا مجھے کافی علم ہے لہذا اب مین وہ روپے
ف کرتا ہون مسٹر شمعون ! آپ میرے ہمراہ کوٹھی پر چلکر رہن نامہ ابھی چاک کرا لیجئے ۔ اس مین ذرا بھی تاخیر نہو کیونکہ
آخر بنیا ہون میری نیت کب بدل جائیگی اسکا یقین نہین ۔

یہ سنکر قدسیہ اور شمعون کی آنکھون مین اشکِ مسرت بھر آئے ۔ شمعون نے احسانمندانہ انداز مین کہا ۔ سیٹھ صاحب
آپکے اس احسان ۔۔۔۔۔۔ چنی لال سیٹھ نے بات کاٹکر کہا "میرا احسان ماننے کی کوئی ضرورت نہین ۔ احسان تو اُس
کا مانئے جسکی ہدایت کی وجہ سے مین نے لالچ سے اور تم نے حرص سے نجات پائی ۔ میری دعا ہے کہ اشور تمہارے سنسار کی

کی نوکا کو اس جیوت مہاساگر مین منزل مقصود پر پہنچائے۔
چنانچہ مسٹر ٹھمون سیٹھ صاحب کیساتھ اُن کی کوٹھی پر گئے جہاں لعل سیٹھ نے مہربانی کر کے رہن نامہ پھاڑ کر دیا
تقدیر جب سیدھی ہو جاتی ہے تو تدبیر منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ دوسرے ہی روز تھانہ دار کی طرف سے اطلاع
ملی کہ چور نوٹ بھناتے ہوئے گرفتار ہوا ہے۔ چنانچہ چوری گئے ہوئے ڈھائی ہزار روپے بھی بلا دقت واپس مل گئے

(ماخوذ)

جمال تجلی

ازمولانا تجمل صاحب چشتی قادری مدظلہ

عشق جانان سے فقط دل ہی نہین ممتاز ہے
چشم مشتاق تجلی۔ گوش بآواز ہے

روز اول سے جو اپنے گوش زد آواز ہے
وہ صدائے روح پرور نغمۂ دمساز ہے

کیا مرا خورشید رو سرگرم کبر و ناز ہے
شعلہ افشان ہے ادا تو برق پاش انداز ہے

جلوہ وہ دیکھا ہے جس کو کر نہین سکتا بیان
اک خموشی میری گویا کاشف صد راز ہے

جرم تیرے ہین جو بیحد رحمت اوسکی بے شمار
باز آ عصیاں سے غافل باب رحمت باز ہے

جس کو ہے تجھسے تعلق مین ہون اُسکا ہم خیال
جو ہے تیرا چاہنے والا مرا ہم راز ہے

شوق آزادی قفس مین کر رہا ہے بے قرار
اُڑ نہین سکتا ہون لیکن حسرتِ پرواز ہے

لیلیٰ و مجنون کا افسانہ جو ہے مقبول دہر
حسن کا یہ اک کرشمہ عشق کا اعجاز ہے

جاں نثاری جسکی ہو تیری نگاہوں مین وقیع
واقعی وہ خوش مقدر عاشقِ جانباز ہے

ذکرِ ہجر و وصل ہے اک کار آمد فلسفہ
اسمین مرگ و زیست کا عاشق کے مضمر راز ہے

بڑھ رہی ہے عمر میری آرزوئے قتل مین
اے تجمل ربط شمشیر و دم دمساز ہے

فیصلہ

انصاف اندھا ہوسکتا ہے لیکن روپیہ گونگا نہیں ہے

(از جناب قاضی فصیح الدین احمد صاحب صدیقی متعلم بی۔ اے۔ عثمانیہ)

تھامس گارڈن منچسٹر کے سبت بڑے اور متمول سوداگر نے ایک مرتبہ نہایت خوفناک اور ظالمانہ قتل کیا۔ (مین نہین سمجھتا کہ کس قسم کا قتل عمدہ اور شریفانہ قتل خیال کیا جاتا ہے)

تھامس گارڈن اُسوقت گرفتار ہوا جبکہ اُسکے ہاتھ خون سے سرخ تھے۔ پولیس نے اُسکا بیان قبول نہ کیا (اگرچہ ہزار پونڈ کی بھینٹ چڑھائی گئی تھی) کہ اوس کے ہاتھون کی سُرخی سوائے گہرے سُرخ رنگ کے اور کچھ نہین تھ فوراً مقامی منصف کے اجلاس پر جو ایک دیرینہ تھا پیش کیا گیا۔ بغیر متاثر ہوئے منصف نے اسکا تمام قصہ سننے بعد اس کو قتل کا ملزم قرار دیکے مقدمہ عدالت العالیہ بھجوا دیا۔

اوسکا وکیل (جو اپنا محنتانہ پورا وصول کر چکا تھا) اس سے ملنے کے لئے حوالات کے تاریک کمرے مین گیا ج یہ زیر حراست تھا۔ تھامس گارڈن نے اس سے دریافت کیا کہ اوسکے بچنے کی کیا تدبیر ہوسکتی ہے تو وکیل نے ناامیدی سے سر ہلا

"تمہارے بچنے کی ترکیب"، وکیل نے آہ بھر کر کہا "اسقدر کمزور ہے کہ اگر ایک مکھی کا پیر اس کے برابر رکھدیا جائے یہ پیر ایک بلند اور عظیم الشان پہاڑ نظر آئیگا۔"

یہ سنکر تھامس گارڈن نے ہر ایک کو جو اس مقدمہ سے تعلق رکھتا تھا بُرا بھلا کہنا شروع کیا حتیٰ کہ مقتول کو اُس نے گالیان دین کہ وہ کسقدر جنونی تھا کہ بغیر تکلیف دئے تلوار سے سر جدا کرنیکے بعد بھی مرگیا اور پولیس اور مقامی منـ کو کہ انہون نے اُسکی بے گناہی پر یقین کرنے سے انکار کیا اور اپنے وکیل کو کہ وہ کیون پہلی ہی سماعت مین جرم سے بر کرنے مین ناکام رہا۔

"کیا مین نے پہلے ہی تمہارا محنتانہ ادا نہین کیا؟" ملزم نے پوچھا "تم اسی وجہ سے بے فکر ہو۔ مین بیوقوف جو تم کو پہلے ہی ادا کر دیا!"

"لیکن مسٹر گارڈن"، وکیل نے جواب دیا "اگر مقدمہ اسقدر کمزور اور خوفناک نہوتا تو مین کبھی محنتانہ پہلے سے وصو نہ کرتا۔ اگر تم کو سولی دیجائے تو مجھے کون محنتانہ ادا کریگا؟"

یہ سنکر تھامس گارڈن کا خون رگوں مین منجمد ہوگیا اور پیشانی پر پسینہ کے سرد قطرے نمودار ہوگئے۔ عالم دیوانگی مین وہ اپنے وکیل کی طرف لپکا۔

"کیا مین نے تم کو اسی لئے محنتانہ دیا ہے کہ تم مجھکو میری موت کی خبر سناؤ؟" ملزم نے جوش سے پوچھا "نکل جا! دور ہو۔ کتے مین خود اپنی وکالت آپ کرونگا"

افسردگی کیساتھ پھولون کی چادر بھجوانے کا وعدہ کرتے ہوئے وکیل روانہ ہوگیا

✣ ✣ ✣

حوالات کا محافظ جو اس گفتگو کو سُن چکا تھا دوپہر کے وقت اس دولتمند ملزم کا کھانا لیکر داخل ہوا اور تھامس گارڈن سے مخاطب ہوکر کہا "سنو آج صبح بازار مین مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر وان ونکل کی تمہارے مقدمہ مین جوری کے صدر ہونیکے اسلئے" تھامس گارڈن نے کہا "تم اُس آدمی کو کسی طرح میرے پاس لے آؤ مین تمکو ایک سَو پونڈ دونگا۔

"دوسو پونڈ ——— کیونکہ یہ بہت مشکل کام ہے"

تھامس گارڈن راضی ہوگیا۔ سہ پہر کے وقت حوالات کا محافظ مسٹر وان ونکل کو حوالات کے کمرے مین میلے کپڑے گٹھے کی صورت مین داخل کیا اور اوسکو ملزم سے بات کرنیکے لئے چھوڑ دیا"

تھامس گارڈن نے اپنے ملاقاتی کو کرہ مین ایکطرف لیجاکر پوچھا "کیا تم کل جوری کے صدر ہونیوالے ہو؟"

وان ونکل نے سر کو جھکاکر اثبات مین جواب دیا "یہ عظیم الشان ذمہ داری میری کمزور گردن پر رکھی گئی ہے۔" وان ونکل نے خاکسارانہ لہجہ مین کہا۔

"سنئے مسٹر وان ونکل" سوداگر نے کہا "اگر تم میری جگہہ ہوتے اور مین تمہاری اور تم مجھہ سے اپنی زندگی کی درخواست کرتے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ مین اُسکو سننے کیلئے اپنا بہرہ کان پیش کرتا؟"

"میرا بہرہ کان اب تمہاری طرف ہے" وان ونکل نے جوابدیا "لیکن یہہ کان بہت بڑی رقم کی آواز سکتا ہے" "کیا پانچسو پونڈ کی؟"

"اتنی رقم بہت کم آواز کرتی ہے"

"کیا ایک ہزار پونڈ کی؟"

"شاید مین انکی آواز کو سن سکون" وان ونکل نے کہا "لیکن یاد رکھو ہم بارہ آدمی ہین باقی گیارہ بھی الم سنتے ہین" "وہ بھی اتنی ہی آواز سنین گے" تھامس گارڈن نے جوابدیا "اب بھر سنئے تم اور تم ہین سے

مین ایک ایک ہزار پونڈ دونگا اگر تم میرے خلاف قتل کے جرم کی جرم کی بجائے مردم کشی کے جرم کا فیصلہ کرو"
وان ونکل نے ناک پر ہاتھ پھیرا۔

"مسٹر گارڈن تم وعدہ کرتے ہو" اس نے کہا "لیکن ہم کو کسطرح یقین ہو کہ تم اپنا وعدہ پورا کروگے۔ تم برا نہ مانو مین تم پر اعتبار کرتا ہوں اور بہت زیادہ لیکن دوسرے ــــ وہ کتے کسی پر اعتماد نہین کرتے وہ ضرور تمہارا تحریری معاہدہ طلب کرینگے"

"تب تو" گارڈن نے کہا "وہ تحریری لے سکتے ہین" فوراً قلم اور دوات لیکر اوس نے دستاویز لکھدی اور ایک آہ کے ساتھ مسٹر وان ونکل کے ہاتھ مین دیدیا۔

"یہ معاہدہ ہے" وان ونکل نے کہا "مین اپنا وعدہ پورا کرونگا اور تم بھی اپنا ضرور پورا کرنا"

❦ ❦ ❦

مقدمہ کی سماعت تمام دن ہوتی رہی اور روئداد تھامس گارڈن کے بالکل خلاف پائی گئی جو نہایت متفکرانہ اور پریشان نظروں سے جوری کے ارکان کو دیکھ رہا تھا جبکہ وہ کمرہ عدالت سے باہر فیصلہ پر غور کرنیکے لئے نکل رہے تھے۔

اُس کا دل کانپ اُٹھا جب وہ واپس ہوئے۔ کیا وہ اپنے وعدہ پر قایم رہین گے ؟۔

صدر جوری مسٹر وان ونکل فیصلہ سنانے کھڑا ہوا "جوری نے" اُس نے کہا "مجرم کو مردم کشی کا ملزم قرار دیا ہے۔ تھامس گارڈن خوشی سے اُچھل پڑا اور اُسکا دل بے انتہا خوش ہوگیا حتیٰ کہ اس خوشی کو دس سال قید کی سزا کا حکم بھی دبا نہ سکا قید موت سے بدرجہا بہتر ہے........ دس سال بہت جلد ختم ہو جاینگے۔

وہ نہایت بشاش تھا جب وان ونکل اُسکے پاس حوالات کے تاریک کمرے مین معاہدہ کی تکمیل کیلئے پہنچا اُسنے ہنستے ہوئے خزانچی کے نام حکم لکھا کہ ارکان جوری مین سے ہر ایک کو ایک ایک ہزار پونڈ کی رقم دیجائے۔ وان ونکل کو یکاغذ دیتے ہوئے گارڈن نے پوچھا

"مسٹر وان ونکل تم نے وعدہ پورا کرکے مجھپر بڑا احسان کیا ہے کہئے ارکان جوری کو قتل کے فیصلہ کی بجائے مردم کشی کا فیصلہ کرنیکے لئے راضی کرنے مین تمکو کچھ زیادہ تکلیف و دقت اُٹھانی پڑی"

"جی ہان بہت زیادہ" وان ونکل نے جوابدیا "لیکن مینے اُنکو یاد دلایا کہ ہمکو معاہدہ کی پوری پابندی کرنی چاہیے"

تھامس گارڈن نے مسکرا کر کہا "تم نے بہت خوب کہا لیکن تمکو یہ دقت کیون محسوس ہوئی"

"اسلئے" وان ونکل نے کہا "کہ وہ تمام کے تمام چاہتے تھے کہ تمکو بالکل بری کردین اور کسی قسم کا الزام ہی نہ لگائین"

رازِ عاشقی

نظرت میں حسن کی ہے　　اک شان نازِ پنہان
گلہائے ناز سے ہے　　یون حسن گل بدامان
جیسے کہ شاخ گل کی
پھولون سے لدرہی ہو

بے نازِ حسن گویا　　پژمردہ اِک کلی ہے
کھلنے سے قبل جو کہ　　افسردہ ہوچکی ہے
ہے رنگ اوس کے رخ پر
لیکن بہت ہی پھیکا

حرفِ نیاز ہونا　　ہے شانِ عشق رسوا
لازم ہے اوس کو ہردم　　ہرنازِ حسن اٹھانا
بے جا ہو یا بجا ہو
جائز ہو نا روا ہو

بے نازِ حسن اٹھائے　　یہہ حال عشق کا ہے
جیسی ہوس پرستی　　بے جا و نا روا ہے
شان نیازمندی
ہے روح عاشقی کی

جور و جفا کا شکوہ　　ظلم و ستم کا رونا
سوچو تو اپنے دل مین　　عاشق کو ہے یہ زیبا
کس منہ سے پھر شکایت
کرتے ہو تم کیسی کی

سمجھے جناب نیتر یہ راز عاشقی ہے
یعنی نیازمندی عاشق کی زندگی ہے

اب سے کسی حسین کا
شکوہ کبھی نہ کرنا
(مصطفےٰ حسین نیتر کانپوری)

قابلیت دماغی اور صحت جسمانی

جناب مرزا شکور بیگ صاحب متعلم عثمانیہ کالج

دنیا مین بعض کام ایسے ہین جو جسم کے پٹھون کی مدد سے انجام پاتے ہین۔ اور بعض ایسے ہین جنکو انجام دینے کے لئے ن دماغی قوتون سے کام لینا پڑتا ہے، یہ جاننے کے باوجود بھی ہم کام کی تفریق نہین کر سکتے اسلئے کہ دنیا کے کسی کام کو یے خواہ ادنےٰ ہو یا اعلےٰ انجام دینے کیلئے ہمین پٹھون اور دماغ دونون سے کام لینا پڑتا ہے، ہان یہ بات ضرور ہے کہ ن کامون مین ہمین دماغ سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے اور بعض مین جسم کے پٹھون کا یا جسمانی محنت کا نمایان حصہ رہتا ہے۔ ایک قلی کو دیکھئے جو اسٹیشن پر بوجھ اُٹھاتا رہتا ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکے پیشے کیلئے صرف جسمانی ت کی ضرورت ہے اور اسے دماغ سے کبھی کام لینا ہی نہین پڑتا لیکن اگر اسکا دماغ خراب ہوتا تو یہ کسطرح ممکن تھا ہ سامان کو بیجا کر اُسی جگہ رکھتا جس جگہ اُسکو رکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ دوسری طرف طبیب۔ وکیل جیسے لوگ ہین جو اپنا دماغ سے لیتے ہین مگر انھین بھی جسمانی پٹھون سے یقینی کام لینا ہوتا ہے البتہ نمایان حصہ دماغی محنت کا ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا تحریر سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ جسمانی پٹھے اور دماغی قوتین دونوں مل جلکر کسی کام کو پورا کرتے ہین عربی مین ایک ضرب المثل ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ عقل سلیم تندرست جسم مین پائی جاتی ہے۔ جہانتک ہمارے یز خیالات کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہین کہ اسکا منشا ہرگز یہ نہین کہ ہم دماغی قابلیت کی ترقی کو بالکل ہی نظر انداز کر دین صرف جسمانی صحت کی طرف اپنی کوشش لگا دین محض اس اُمید پر جیسا جیسا ہمارا جسم تندرست و قوی ہوتا جائیگا ی عقل بڑھتی جائیگی۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو آج دنیا کے بڑے بڑے طاقتور پہلوان مشہور عقلاء بھی ملنے جاتے۔

اف ظاہر ہے کہ ہر شخص کو خدائے تعالےٰ نے کچھ نہ کچھ دماغی قابلیت عطا فرمائی ہے اگر اسمین انسان کوشش کرکے قی کر جائے تو کر سکتا ہے لیکن اگر اس جانب توجہ نہ کرے اور صرف جسمانی صحت کی طرف لگا رہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

قدرت کی عطا کی ہوئی دماغی قابلیتیں بالکل مردہ ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ جس عضو کو قدرت نے جس کام کیلئے مقرر کیا ہے اگر اس سے وہ کام نہ لیا جائے تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے، چنانچہ اکثر ڈاکٹروں نے ایسے تجربے کئے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر نے ایک شخص کو آنکھوں پر پٹی باندہ کر ایک اندھیری کوٹھری میں بٹھا دیا۔ تھوڑے دنوں بعد جب اُسے نکالا گیا تو اوسکی بینائی میں فرق آنے لگ گیا تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے اس تجربہ سے یہ بات بیان کی کہ اور تھوڑے دنوں اگر اس شخص کو اسی طرح رکھا جاتا تو وہ بالکل ہی اندہا ہو جاتا۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ جب ہم دماغی قابلیتوں سے بھی کام نہ لیں اور انہیں ترقی دینے کی کوشش نہ کریں تو وہ قدرت کی عطا کی ہوئی دماغی قابلیتیں ناکارہ اور مردہ ہو جاتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ دماغی قابلیت کیلئے جسمانی صحت کی کس حد تک ضرورت ہے۔ کسی کا کیا اچھا قول ہے کہ جسمانی صحت کو نظر انداز کر کے صرف دماغی قابلیت بڑہاتے جانا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میں سونے کی اینٹوں کا بھرنا۔ جب ان اینٹوں کا وزن کشتی کی قوت برداشت سے بڑہ جائیگا تو نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ کشتی نہ صرف خود ڈوبے گی بلکہ اپنے ساتھ سونے کی اینٹوں کو بھی سمندر کی تہ میں لیجائیگی۔ ہمارا جسم کشتی ہے دماغی قابلیتیں سونے کی اینٹیں ہیں جب سونے کی اینٹوں کا وزن جسم کی کشتی کی قوت برداشت سے بڑہ جائیگا تو یہ کشتی بھی اپنے ساتھ ان دماغی قابلیتوں کو فنا کے سمندر کی تہ میں لیتی جائیگی۔

اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ دماغی قابلیت کیلئے جسمانی صحت کی ضرورت ہے بلکہ اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کس حد تک ضرورت ہے، اگر ہم کشتی کو مضبوط بنانا نہ چاہیں تو بہترین طریقہ یہی ہے کہ اینٹیں اتنی ہی بھری جائیں جتنی اوسکو ڈوبنے سے محفوظ رکھیں۔ اگر اینٹوں میں اضافہ کرنا مقصود ہو تو پہلے کشتی کی مضبوطی کی سخت ضرورت ہے بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ کشتی کی قوت برداشت اینٹوں کے وزن سے کچھ زیادہ ہی ہونی چاہئے

تاریخ کی ورق گردانی کیجائے تو ایسے لوگوں کی مثالیں بھی ملیں گی جنکی صحت جسمانی تو خراب تھی لیکن پھر بھی اپنی دماغی قابلیت سے ان لوگوں نے وہ کام کئے جنکی وجہ سے انکا نام ابتک صفحۂ ہستی سے نہ مٹ سکا۔ مذکورہ بالا جملہ کی صداقت میں کوئی کلام نہیں۔ اسوقت بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو بالکل نحیف ولاغر ہیں لیکن دماغی قابلیت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ آخر اسکی کیا وجہ ہے، اسکے متعلق ہم یہ عرض کریں گے کہ گھوڑے کی کمزوری کا اثر سوار پر بھی پڑتا ہے، مانا کہ آپ ایک اچھے شہسوار ہیں، فن شہسواری کے ماہر ہیں لیکن اگر آپ کو ایک کمزور یا مریل گھوڑا

دیدیا جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے شہسواری کے کرتب بحسن وخوبی دکھا سکیں اگر آپ نے کچھ کرتب دکھا بھی دیئے تو یقینی وہ ایسے نفیس کرتب نہونگے جیسے کہ اس صورت مین ہوتے جیسا کہ آپکا گھوڑا بھی قوی اور جاندار ہوتا پس جن لوگون نے باوجود اپنی جسمانی کمزوری کے ملک و قوم کی خدمت کی تو انکی مثال اوسی شہسوار کی سی ہوگی جسنے ایک کمزور گھوڑے پر شہسواری کے کرتب دکھائے، اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ دماغی قابلیت کے ساتھ اگر انکی جسمانی صحت بھی اچھی ہوتے تو یقینی وہ اور زیادہ ملک و قوم کی خدمت کرسکتے اور موجودہ شہرت سے کہین زیادہ شہرت حاصل کرتے۔

اگر کوئی شخص گھوڑ دوڑ مین اول آنا چاہے تو نہ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ پکا سوار ہو بلکہ لازم ہے کہ اس کا گھوڑا بھی قوی اور جاندار ہو۔ بلکہ بعض دفعہ یہ دیکھا گیا ہے کہ سوار تو ویسا پکا نہین ہوتا مگر اوس کے گھوڑے جاندار ہونیکی وجہ سے کامیابی کا سہرا اوسی کے سر رہتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اصلی چیز جسمانی صحت ہے مگر مشاہدہ بتلا رہا ہے کہ فی زمانہ جسمانی صحت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس کے نتائج صاف ظاہر ہین جن کے اظہار کی چندان ضرورت نہین کیسی عجیب بات ہے کہ ہر شخص کی نظر مین صرف علم کی عمارت کی بلندی اور وسعت پر لگی ہوئی ہین لیکن کوئی اس پر غور نہین کرتا کہ اتنی شاندار عمارت جو قایم کیجارہی ہے آیا اوس کے پایہ یا بنیاد مین ایسی صلاحیت بھی ہے کہ اسے سنبھال سکے۔ ہم نے جو اپنی تمام توجہ جسمانی صحت کو نظر انداز کر کے دماغی قابلیت کے بڑہانے مین مبذول کردی ہے تو سمجھ جائے کہ ہم علم کی عمارت بنیاد ریت پر جارہے ہین۔ ظاہر ہے کہ ایسی عمارت ہرگز دیرپا نہین ہوسکتی آخر نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ عمارت بھی گرے گی اور اوس پر جو کچھ روپیہ لگایا گیا وہ بھی خاک مین ملجائیگا۔

میری روح کا مستقبل

از حضرت کیف مرادآبادی

یری روح اس جسد خاکی مین بے چین ہے، وہ عالم بالا سے آزادی کے ترانے گاتی ہوئی آئی تھی لیکن یہان جسم مین آکر قید ہوگئی۔ اسکے یہان آنیکا سبب بھی اضطراب تھا اور اسکی موجودہ پریشانیون کا راز بھی اضطراب ہے، وہ مضطرب ہے اور بیطرح مضطرب   وہ بے چین ہے اور بہت بے چین۔

یری روح اسلئے مضطرب رہتی ہے کہ اُسے سکون کی تلاش ہے اور سکون بھی وہ سکون جو حصول مقصد کے بعد پیدا ہوتا ہے، سکون کی تلاش مین مختلف عالمون مین۔ مختلف دنیاؤن مین۔ مختلف جانون مین تبدیل ہیت کرکے جاتی ہے س عالم جسد جدید مین آنیکا سبب یہی تلاش تھی۔

ے اس عالم مین بھی مگر سکون میسر نہین ہوا اور اسلئے بے چین ہے، میرا جسم کبھی گلستانون مین جاتا ہے کبھی ویرانون مین ں پہاڑون کے دامنون مین اور کبھی دریاؤن کے کنارے پہ یعنی میری روح اس عالم کے گوشہ گوشہ مین سکون کی تلاش مین لے تی جاتی ہے۔ مگر سکون نہین ملتا۔

یری روح اکدن یہ یقین کرکے کہ اس عالم مین بھی اس کا مقصد حاصل نہین ہوا میرے جسم خاکی سے تڑپکر نکلجائیگی۔ تڑپکر جائیگی سکون کی تلاش مین۔ وہ اور زمین ڈھونڈیگی اور آسمان تلاش کریگی اور شکل بدلیگی ——— اپنے مقصد کو حاصل کرنیکے لئے،

میری روح کا مقصد کیا ہے۔ محبت کی تکمیل۔ وہ عالم بالا مین تھی تو اُسنے وہان کی فضا کے ذرہ ذرہ مین محبت کی روح ونکدی۔ وہ اس عالم مین آئی تو اُس نے یہان کی ہر شے مین محبت کے نغمے بھر دئے۔ بلبل کی صدا مین کوئل کی آواز پپیہے کی پی کہان قمری کی کوکو۔ پہاڑون کی ہوائین۔ دریاؤن کے شور۔ چاند کی کشش۔ سمندر کا مدوجزر۔ پھولون کی شگفتگی۔ سبزہ کا لہلہانا۔ سب محبت کے شعلے ہین جو ہر شے مین میری روح نے دوڑا دئے ہین لیکن آہ وہ خود بے چین تھی ور اُس نے سبکو بے چین کردیا۔ وہ جہان جاتی ہے، یہی تجلیان کونداتی چلی جاتی ہین۔

میری روح جب اس منزل مین اپنے مقصد کو نہ پاکر میرے جسم سے پرواز کرجائیگی تو یہ عالم محسوس کرے گا اسکے اندر سے کوئی چیز کھوگئی ہے کیونکہ جن عالمونکو وہ چھوڑتی چلی آئی ہے وہ بھی یہی محسوس کرتے ہین میری روح پھر عالم بالا کی طرف پرواز کرے گی۔ سکون کی تلاش مین اور پھر محبت کی چنگاریان ایک اور عالم کے درون

مین پیوست ہونگی "

میری روح کیا چاہتی ہے۔ محبت کی تکمیل۔ محبت حسن حقیقی کی۔ محبت اوسکی جس کو میری روح نے ایکبار اچانک دیکھا تھا اور پھر وہ اوسکی نگاہون سے پوشیدہ ہوگیا۔

میری روح کو جس حقیقی کی تلاش ہے وہ تمام امکانی عالمون کے ذرہ ذرہ کو اوس کی تلاش مین سرگردان دیکھنا چاہتا ہے۔

حسن حقیقی میری روح کی بے چینیان دیکھہ رہا ہے۔ میری روح سے پوشیدہ رہ کر وہ چاہتا ہے کہ میری روح اضطراب کی تکمیل کرے تاکہ اس مین حامل مقصد ہونے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

میری روح ایک دن اضطراب کی تکمیل کرے گی۔ پھر حسن حقیقی کی کشش تمام عالمون کو کھینچ کر ایک جگہ جمع کردے گی۔ تمام دنیائین اپنے محور کو چھوڑ کر ایک جگہ آجائین گی۔

میری روح بھی ایک نامعلوم کشش سے کھنچکر وہان آجائیگی۔ ہر چیز مضطر ہوگی اور ہر شے بیچین۔

میری روح آہستہ آہستہ بےخودی مین سن حقیقی سے قریب ہوتی چلی جائیگی۔ . . . . یکایک پردا آٹھے گا۔ بجلیان ہر طرف کوندنے لگین گی۔ اور ہر مادہ جلکر خاکستر ہوجائیگا۔ اُسوقت میری روح بالکل بیخبر ہوجائیگی حسن حقیقی اسے اپنے آغوش مین لے لیگا اور اسے ہمیشہ کیلئے سکون مل جائیگا۔

کسواسطے روتا ہے تو

یہ دن بہار زندگی کے ہین جوانی کا ہے سن — کسواسطے محزون ہی تو۔ روتا ہے کیون تو رات دن
تجھکو رولاتی ہے اگر بیمائیگی و مفلسی — یہ ناسپاسی چھوڑ تو دل مین کر اپنے منصفی
گل کی گرہ مین مال و زر کے نام کچھ بھی تو نہین — ہے شاد لیکن ہر گھڑی ہر وقت ہی خندہ جبین
بلبل کے پلے مال ہی کوئی نہ دولت ہے نہ دمن — فرط خوشی سے ہی مگر ہردم چمن مین نغمہ زن
کسواسطے محزون ہے تو کسواسطے روتا ہے تو — یون مفت اپنی جان کو نادان کیون کھوتا ہے تو
ظاہر مین ہے مرد تین فہمیدہ ہے سنجیدہ ہے — پھر کس لئے غمگین ہے تو کسواسطے رنجیدہ ہے
کیا اسلئے محزون ہے کیا اسلئے روتا ہے تو — مونس نہین تیرا کوئی ہمدم نہین تنہا ہے تو
سرسبز اور شاداب اک جنگل مین تنکا گھانس کا — بے غمگسار و یار ہے لیکن نہین پروا ذرا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد ۳ نمبر ۶ | ایڈیٹر خوشتر منگرولی

زبان

(منگرول (کاٹھیاواڑ) سے ہر انگریزی مہینے کے آخری ہفتہ کو شائع ہوتا ہے سالانہ چار روپیہ)

فہرست مضامین جون ۱۹۲۸ء

صفحہ ادارت

اگرچہ ہم زبان کا یہ تیسرا نمبر بھی جدید طریقہ تہذیب و ترتیب کے ساتھ ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں مگر ابتک ہمیں یہ معلوم ہو سکا کہ آیا ملک نے بھی اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا یا نہیں ؛ لہذا قارئین زبان سے استدعا کرتے ہیں کہ زبان کے معیار سابقہ و موجودہ کے متعلق اپنی بیش قیمت آراء سے جلد سرفراز فرما کر مشکور فرمائیں کہ ہم کوئی قطعی اور فیصلہ کن لائحہ عمل اختیار کر سکیں۔

اس نمبر کے مضامین میں "اودھ کے بادشاہ گر" تاریخی مضمون ہے جس میں جناب امداد علی خانصاحب زبیری نے اودھ کے کنبوہ وزراء کے کارنامے اور اُنکے بے نظیر تدبر و حسن نظام کا ذکر بڑی محنت و جانفشانی سے یکجا کر کے قلمبند فرمایا ہے امید ہے کہ آئندہ بھی موصوف اس قسم کے مضامین سے زبان کو نوازتے رہیں گے۔

دوسرا ادبی مضمون ہندوستان کے مشہور ادیب اور اپنے انوکھے طرز انشا کے مالک حضرت ساغر نظامی مدیر "پیمانہ" کا ہے جنہوں نے اپنے نقطہ نگاہ سے "محبت" کے متعلق جن انوکھے خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ اگرچہ اپنے خاص رنگ میں نہیں لکھے گئے تاہم اس قابل ضرور ہیں کہ وہ اردو ادبیات میں ممتاز درجہ حاصل کر سکیں۔ زبان میں آپ کا پہلا ہی مضمون "محبت" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے جو آپکی زبان کے ساتھ قلبی و قلمی محبت کا ثبوت ہے، ہم ان "محبت پاروں" کو شائع کر کے موصوف سے متوقع ہیں کہ آئندہ بھی ایسی ہی "محبت" کا ثبوت دینگے اور یہ محبت بقول خود "فریب خیال" نہ ثابت ہوگی نیز ہمیں حصول مضمون یا امتحان محبت کے لئے "کوشش" کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ محبت خود ایک کوشش ہے۔"

طبیعیات کے ماہر نیوٹن کے ارتقائی کارناموں کو محمد عبد النعیم صاحب صدیقی نے واضح طور پر سراہا ہے ہم اس مضمون کے لئے کرمی عبد القادر سروری ایم۔اے مدیر "مکتبہ" کے مشکور ہیں کہ انہوں نے ازراہ ہمدردی (اگرچہ خود کوئی مضمون نہیں دیسکے) زبان کے لئے مرحمت فرمایا۔

تنقیدی مضامین جو ذاتیات سے مبرا ہوتے ہیں قابل قدر ہوتے ہیں مگر افسوس کہ ہندوستان میں اس کا فقدان ہے

ایسے تنقیدی مضامین بہت کم نظر سے گذرتے ہیں جو بلا رو رعایت منصفانہ اور ناقدانہ نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہوں بلا اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ اس موضوع پر جب کبھی کسی اہل قلم نے قلم اٹھایا ہے کہیں نہ کہیں اپنے دلی بخارات کا علانیہ یا خفیہ طور پر ضرور اظہار کر دیا ہے، چنانچہ خیابان خلیل کی دوسری قسط میں بھی بعض بعض مقامات پر اس کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں یا اس مضمون کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن ہم اس "جنگی پالیسی" کو پسند نہیں کرتے امید کہ واثق صاحب آئندہ اقساط میں اس امر کا ضرور لحاظ رکھیں گے۔

"حکیم مومن کی شاعری" پر ایک طویل مقالہ ہمارے دوست عشرت رحمانی معاون مدیر نیرنگ" رامپور نے خاص نگار کے "مومن نمبر" کیلئے تحریر فرمایا تھا مگر وقت پر نہ بھیج سکنے کے باعث ہمیں عنایت فرمایا ہے۔ اس مضمون میں بعض خصوصیات ہیں جو "مومن نمبر" کے مندرجہ مضامین سے ایک امتیازی اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ باوجود "مومن نمبر" شائع ہو جانیکے اسکی دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا اور اسی لئے ہم اسکو باوجود طویل ہونیکے بالاقساط درج زبان کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

عشرت صاحب کا نام جس طرح ادبی حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح قارئین زبان کے لئے بھی کوئی نیا نہیں ہے۔ آئندہ ہر نمبر میں آپ کا کوئی نہ کوئی مضمون ہوا کریگا۔

افسانوں میں قیسی صاحب نے اپنے فسانہ "گنگا کی وادی میں" دیہاتی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہندوستان کی آنیوالی نصف صدی سے پیشتر کا نقشہ پیش کیا ہے۔ درحقیقت جب ہماری تہذیب اس "سطح عریاں" پر پہنچ جائیگی تو اس قسم کے واقعات کا رونما ہونا لابدی ہو جائیگا۔

دوسرا افسانہ "رقابت کی قیمت" جناب محشر عابدی کا ترجمہ ہے اس میں مصنف نے مغربی عورت کی محبت اور وفاداری کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ تخیل حقیقت میں مشرقی طرز معاشرت اور نسوانی وقار و محبت سے لیا ہے اور اس میں اس امر کے اظہار کی کوشش کی ہے کہ مغربی دنیا میں بھی ایسی شوہر پرست عورتیں موجود ہیں۔ بہرحال فسانہ دلچسپ و سبق آموز ہے۔

اس مرتبہ نظموں کا معیار بہت بلند ہے اور سب کی سب اچھی ہیں "جذبات عالیہ" علامہ سیماب اکبرآبادی کا نتیجۂ افکار ہے جس کے لئے ہم حضرت ساغر صاحب کے ممنون ہیں کہ آپ نے ہماری خواہش پر از معاصرانہ ہمدردی آپ کے کلام بلاغت نظام سے مشکور فرمایا۔ "شاعر کا نصب العین" خود حضرت ساغر صاحب کی

جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ یوں تو آپ کی ہر نظم اثر و جاذبیت سے لبریز ہوتی ہے مگر یہ نظم خاص طور پر کامیاب ہوئی
"میخانہ محبت" مکرمی حضرت راز چاندپوری کا عطیہ ہے جنہوں نے باوجود عدیم الفرصتی کے ہمارے ا
پرخاص زبان کے لیے فکر فرما کر روانہ فرمائی ہے۔ جس کے لئے ہم موصوف کے بیحد شکر گزار ہیں۔ آپ کے
نظم و نثر اردو کے چوٹی کے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور نہایت دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔
"دوستی" پر حضرت ذہین حیدرآبادی نے اپنے مخصوص رنگ میں اظہار خیال فرمایا ہے آپ نے اپنے
کے لئے اخلاقیات کا موضوع منتخب کرلیا ہے اور اس میں بڑی حد تک آپ کامیاب ہوئے ہیں۔

شکر ہے کہ روز بروز ہمدردان زبان میں موقر اہل قلم کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس مرتبہ جن حضرات نے ز
کے دور ثانی پر ہمیں مبارکباد دی، قلمی امانت کا وعدہ فرمایا اور ہماری حوصلہ افزائی فرما کر اپنے سچے خلوص اور ہ
ہمدردی کا ثبوت دیا ہے ہم ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مولانا مسعود الرحمن خاں صاحب ندوی (جن
ایک طویل مضمون "نپولین کے خطوط معاشقہ" موصول ہوگیا ہے) حضرت زینی اجمیری جنہوں نے ایک فسا
زبان کے لئے لکھا مگر..... کو دیدیا حضرت ساغر نظامی (جنہوں نے زبان کی قلمی خدمت کو اپنے فرائض
داخل کرلیا ہے)۔ حضرت راز چاندپوری (جنکے فسانہ کا منتظر ہوں) اور حضرت عشرت رحمانی (جو زبان کی
اشاعت قلمی امداد میں نہایت سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں) خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

خوشتر (منگرولی)

اودھ کے بادشاہ گر

(کنبوہ)

(از جناب امداد احمد خانصاحب نبیری)

شہنشاہ عالمگیر کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد جب زمام حکومت محمد شاہ بادشاہ کے ہاتھ میں آئی تو رنگ رلیوں نے حکومت کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔ ابھی بادشاہ نشہ بادہ نوشی میں چور ہی تھا کہ نادر شاہ کے فتنے نے سلطنت مغلیہ پر ایک ایسی ضرب کاری لگائی جس سے رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہی۔ سلطنت کی زوال پذیر حالت کو دیکھ کر امرا و دولت بھی جفائے روزگار و کجروئی فلک ناہنجار کی وجہ سے نبات النعش کی طرح متفرق ہو گئے۔ خوانین کنبوہ بھی جو شروع زمانہ سلطنت اسلامیہ سے حکومت کے کاروبار میں دخیل اور مہمات میں برابر کفیل رہنے کی وجہ سے دہلی کو اپنی جائے رہائش قرار دے چکے تھے۔ اس فتنۂ نادرگردی اور حکومت کی بد سے بدتر حالت کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور وہاں پر اپنی حالت کو مخدوش خیال کر کے اقصائے مشرق میں پھیل گئے۔ چنانچہ کچھ امروہہ، مرادآباد، بریلی اور کچھ بنارس اور بنگالہ چلے گئے۔ ان میں سے غلام حسین[1] خان۔ راجہ چیت سنگھ والئی بنارس کے مدارالمہام ہو گئے تھے ان کے ہی اخلاف میں سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں تھے۔ اول اول یہ دونوں سرکار انگریزی میں تحصیلدار تھے۔ وہاں سے علیحدگی اختیار کر کے بزمانہ نواب سعادت علی خاں لکھنو چلے آئے اور انکی قدردانی سے بہرہ اندوز ہوئے تھوڑی ہی مدت میں اپنے زور قلم، حسن تدبیر، اور کشود کاری کی وجہ سے وہ نام آوری حاصل کی کہ نواب غازی الدین حیدر بہادر کے امرا ر کبار کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ یہ دونوں اپنے وقت میں فارسی کے بڑے ادیب اور منشی مانے جاتے تھے۔

"صاحب[2] تاریخ اودھ" رقم طراز ہیں کہ "سبحان علی خاں کنبوہ۔ علامۂ عصر ہمہ صفت موصوف نثار بے نظیر عالی فکر اور خوش تدبیر تھا معتمد الدولہ اسکے بغیر مشورہ کوئی کام نہ کرتے تھے۔" اور "تاج الدین حسین خاں ذی عقل ارسطوئے عہد تھے۔ کنبوہوں کی قوم میں ایسا آدمی کم گزرا ہے۔" علاوہ ازیں "نوابان[3] اودھ کی جانشینی کے مسئلہ پر

---

[1] وسلسلۂ عالیہ مصنفہ حکیم عنایت حسین خاں مارہروی صفحہ ۱۸۵۔ [2] حصہ سوم ۹۰-۹۱ مصنفہ مولوی نجم الغنی صاحب رامپوری
[3] سوانحات سلاطین اودھ جلد اول صفحہ ۲۱۳ مصنفہ سید کمال الدین حیدر حسنی الحسینی۔

دونوں کی رائے کو بڑا دخل تھا اور اسی وجہ سے یہ لوگ "بادشاہ گر" کے لقب سے آجتک لکھنؤ میں یاد کئے جاتے ہیں۔"

جب ۹ اکتوبر ۱۸۱۹ء کو نواب غازی الدین حیدر نے بادشاہ کا لقب اختیار کر کے ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا تو اسوقت سبحان علی خان نے "سکۂ شاہی" گزرانا جس کے صلہ میں پانچ ہزار روپیہ انعام پایا اور وزراعظم کی نیابت" کا خلعت حاصل کیا۔ سکہ یہ ہے

سکہ زد بر سیم و زر از فضلِ ربِّ ذو المنن
غازی الدین حیدرِ عالی نسب شاہِ زمن

غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر بادشاہ کے عہد حکومت میں قلمدانِ وزارت نواب معتمد الدولہ آغا میر کے ہاتھ میں رہا۔ ان کے دورِ وزارت میں سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں کو بڑا عروج رہا۔ ہر قسم کی مشکلات کو وہ اپنے ناخنِ تدبیر سے اس خوش اسلوبی سے کھولتے کہ دوست اور دشمن محو حیرت ہو جاتے۔ جب چند در چند وجوہ سے نواب معتمد الدولہ نظر بند کئے گئے اور بادشاہ بیگم کا دل اُنکی طرف سے غبار آلودہ تھا۔ اور جس کے دور کرنیکے لئے تمام افسوں تک کا بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ اُس وقت سبحان علی خان نے اپنے تدبر اور اثر سے بادشاہ بیگم سے صفائی کی صورت پیدا کر کے انکو پھر نیابت سے سرفراز کرایا۔

سبحان علی خان نہ صرف اپنے ممدوح کے خیر سگال تھے بلکہ حکومت کے بھی بڑے خیر خواہ تھے۔ جب معتمد الدولہ کے اسراف نے سلطنت کے خزانہ کو کھوکھلا کر دیا اور حالت بد سے بدتر ہونے لگی تو سبحان علی خاں چپ نہ رہ سکے۔ ایک دن معتمد الدولہ کو آیندہ نتائج سے آگاہ کیا۔ اور عاقبت اندیشی کی باتیں سمجھائیں اور خزانہ کی حالت کو بہتر بنانیکے لئے مشورہ دیا۔ مگر اس دورِ طوائف الملوکی میں انکا نیک مشورہ بادِ ہوا ثابت ہو کر رہ گیا اور اسراف کی حالت بدستور قایم رہی۔

جب غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد نصیر الدین حیدر تخت حکومت پر متمکن ہوئے تو معتمد الدولہ پر الطافِ شاہانہ کی بوچھار ہونے لگی۔ سبحان علی خاں کو بھی "تحریراتِ صدر" کا یک قلم اختیار اور "دار الانشاء" کی افسری حاصل ہوئی اور پچاس ہزار روپیہ نقد مرحمت ہوا لیکن معتمد الدولہ پر یہ نوازشات ظاہراً تھیں۔ کیونکہ اندرونی سازشوں کی وجہ سے بادشاہ کا مزاج وزیر سے برہم تھا۔ سبحان علی خاں معتمد الدولہ سے کہا کرتے کہ "سبزۂ باغ خزاں رسیدہ ہے" آخر سازشیں کامیاب ہوئیں وزیر معتوب ہو کر صاحب ریزیڈنٹ کے توسل سے جان بچا کر کانپور جا رہے۔ نواب

اعتماد الدولہ میر فضل علیخان کو وزارت تفویض کی گئی اور معتمد الدولہ کے متعلقین اور متوسلین پر دست تظلم دراز کیا گیا۔ ان سب کے ساتھ سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں بھی نظر بند کیے گئے لیکن جب ان سے مواخذے کی نوبت پہنچی تو یہ "بے جرم اور سرکار شاہی کے خیر طلب ثابت ہوئے" اگرچہ انکے اقبال کا ستارہ گردش میں آچکا تھا۔ لیکن اس پر بھی انکی خداداد قابلیت کی وجہ سے اعتماد الدولہ ان سے برابر مشورہ لیا کرتے تھے اور انکے دربار میں انکی ایک ممتاز جگہ تھی۔ تاج الدین حسین خاں نے بھی اپنا دامن محاسبہ سے پاک کرکے اطاعت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ کے بعد اعتماد الدولہ کے انتقال پر نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں وزارت پر فائز ہوئے۔ تاج الدین حسین خاں انکے ہمراز بنکر رزیڈنسی کی سفارت پر معمور کئے گئے لیکن ابھی انکی وزارت کو پورے طور پر قایم ہوئے کچھ عرصہ بھی نہیں گذرا تھا کہ سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں کی سفارش سے معزول کئے گئے۔ کرنل جان لومنا حب سے جو نئے رزیڈنٹ ہوکر لکھنؤ آئے تھے تاج الدین حسین خاں سے بہت گہرے مراسم ہو گئے تھے جس کی وجہ سے حکیم مہدی علی خاں اور انکے اقربا کی گرماگرمی سرد پڑ گئی تھی۔

حکیم صاحب کے معزولی کے زمانہ میں خوانین کنبوہ کا عروج اپنے پورے نصف النہار پر تھا انکی صائب رائے پر کاروبار حکومت چل رہا تھا۔ انکے اشاروں پر وزرا کا عزل و نصب ہوجاتا تھا اور انکی تدبیروں کے آگے دوسرے امرائے دولت بازیچۂ اطفال بنے ہوئے تھے۔ ان حالات میں سبحان علی خان کا بادشاہ کو یہ مشورہ دینا کہ "میری قوم میں سے کسی شخص کو وزارت کا عہدہ عطا کیا جائے" کچھ مناسب نہ تھا لیکن یہ عزت روشن الدولہ کی قسمت میں لکھی جا چکی تھی۔ دوسروں کو کیونکر مل سکتی تھی۔ چنانچہ روشن الدولہ اس منصب سے سرفراز کئے گئے۔ سبحان علی خاں شریک مشورہ ہوئے۔ اور عہدۂ سفارت رزیڈنٹی تاج الدین حسین خان کے ہی تعلق میں رہا۔ "جب [۵] روشن الدولہ کو اختیارات ملے تو خوانین کنبوہ صغیر و کبیر محیط دائرۂ وزارت ہوئے۔ اور حضرات کنبوہ کا گھر معین خاص و عام ہوا۔ اور ان سب کے اخراجات۔ خیر و خیرات۔ رفیق پروری۔ اور نیکی مشہور انام ہوئی۔"

تاج الدین حسین خان کی رسم و راہ قدسیہ بیگم سے بہت زیادہ تھی۔ روشن الدولہ کو یہ امر ناگوار گذرتا تھا۔ آخرکار ان کا عتاب نازل ہوا۔ اور تاج الدین حسین خاں چار لاکھ روپیہ نقد لیکر کانپور چلے آئے اور اپنی املاک میں سکونت اختیار کی لیکن انکے تعلقات حکام رزیڈنسی اور خواتین محل سے اس قدر مستحکم رہے کہ حکومت کے رازہائے سربستہ کی ان کو سب سے پہلے خبر ہوجایا کرتی تھی۔ جو کچھ کونسل کلکتہ میں سلطنت اودھ کے متعلق احکامات صادر ہوتے یہ انکو فوراً معلوم

---

[۵] تاریخ اودھ صفحہ ۳۴۳ -

کے ذریعہ بادشاہ کے گوش گذار کرا دیا کرتے۔ ان خبروں کی وجہ سے روشن الدولہ کو بڑی پریشانی لاحق رہا کرتی تھی۔

۲۰/اکتوبر ۱۸۳۷ء کو بادشاہ نصیر الدین حیدر کا انتقال ہو گیا۔ فریدوں بخت تخت پر جلوہ افروز ہوئے فخر الدولہ ان کی مخالفت کر رہے تھے۔ دفعتہً احسان حسین خاں فرزند سبحان علی خاں کی آمد کی خبر سن کر دوسرے کمرے میں چھپ گئے اور انکے خوف سے انکے آگے آنیکی جرأت نہیں کی احسان حسین خاں نے سلطان زماں محمد علی شاہ کو نذر اور سلطنت کی مبارکباد دی محمد علی شاہ نے الطاف و عنایت کا اظہار کیا۔[۱]

تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ روشن الدولہ سے بگڑ گئے اور انکے لڑکے مرزا محمد حسن سے ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ روشن الدولہ موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگے جب سر سے اونچا پانی ہونے لگا تو احسان حسین خاں نے اپنی دانشمندی اور تدبیروں سے معاملہ کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھا دیا کہ روشن الدولہ انکے بڑے احسانمند ہو گئے جسکی وجہ سے وزیر کے رفقائے قدیم آتش رشک و حسد سے جلنے لگے لیکن احسان حسین خان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

اس وقت سلطنت اودھ گہری سازشوں کا آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ امرائے دولت ایک دوسرے کے عروج کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہر ممکن کوشش روشن الدولہ اور بادشاہ میں بگاڑ کرانیکے لئے کی جاتی تھی۔ حاسدوں کے دو ایک وار تو خالی گئے۔ مگر آخر میں وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے۔ بادشاہ اور وزیر میں سخت شکر رنجی ہو گئی۔ خوانین کنبوہ پر بھی عتاب نازل ہوا۔ کچھ لوگ قید ہوئے اور لاکھوں روپیوں کا حساب طلب کیا گیا۔ آخر کار خوانین کنبوہ سے سات لاکھ روپیہ لیکر داخل خزانہ کیا گیا۔ غرض حاسدوں کے حسد کشمیر لوپ کی چلن۔ بادشاہ کا عتاب اور رزیڈنٹ کی مصلحتوں نے ملکر سازشوں کا ایک طومار خوانین کنبوہ کے خلاف باندھ دیا اور انکو بادل ناخواستہ لکھنؤ چھوڑ کر کانپور چلا جانا پڑا۔ تاج الدین حسین پہلے ہی سے موجود تھے۔ روشن الدولہ بھی معزول ہوئے اور انکی جگہ منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نے دوبارہ وزارت کا خلعت حاصل کیا۔ کیونکہ یہ خوانین کنبوہ کے زخم خوردہ تھے اس لئے انہوں نے اب دل کھول کر ان سے بدلہ لیا۔

نواب روشن الدولہ سبحان علی خاں و خوانین کنبوہ کی جو ہر دانش نیک اندیشی تدبیر حسن کارگذاری اور صائب رائے پر ہمیشہ عمل پیرا رہے اور انکو سوائے انکی امداد کے اور کسی پر بھروسہ نہیں تھا۔ کیونکہ خوانین کنبوہ کی رائے اور قابلیت امور وزارت کے سرانجام دینے کے لئے مخصوص تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ انکو دیوانی و رسالت کے ہر دور میں باوجود گوناگوں سازشوں اور مخالفتوں کے ممتاز جگہ ملا کی۔[۲] انہوں نے درستی عمل حسن سعی اور کاموں کی انجام دہی میں یگانۂ آفاق ہو کر اور انصرام امور سلطنت اور انجام خدمات میں دیانتداری۔ جان نثاری اور خیر سگالی کو راہ دیکر وہ عروج حاصل کیا تھا کہ[۳] احسان حسین خاں

۱؎ سوانحات سلاطین اودھ۔ ۲؎ سوانحات سلاطین اودھ صفحہ ۳۲۶۔ ۳؎ تاریخ اودھ صفحہ ۹۱ - ۱۹۵۔

بن سبحان علی خاں اپنے جلسے میں علانیہ یہ بات کہا کرتے تھے کہ بڑے بڑے مشکل کام ہم باتوں میں حل کر دیتے ہیں۔ روشن الدولہ میں اتنی قابلیت کہاں تھی کہ وہ سلطنت کے کاموں کا بوجھ سنبھال سکتے۔ اس لئے کل بڑے بڑے کاموں میں سبحان علی خاں کا مشورہ کام کرتا تھا اور چھوٹے کاموں میں احسان حسین خاں کو مداخلت تھی۔"

تاج الدین حسین خاں درستی معاملات۔ رسا کاری اور جوہر قابلیت میں یکتائے روزگار تھے۔ حکام انگریزی سے بھی انکے تعلقات ایسے خوشگوار تھے کہ مشکل سے مشکل اور اہم سے اہم کاموں کو بحسن و خوبی۔ دولت کی بہبودی اور حکومت کی بہی خواہی کے مطابق اُن سے کرالیا کرتے تھے۔ جب ۴ر نومبر سنہ ۱۸۳۰ء کو منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں۔ مڈک صاحب۔ رزیڈنٹ کی خلاف مرضی خلعتِ وزارت سے سرفراز فرمائے گئے۔ تو رزیڈنٹ کے دل میں وزیر کی طرف سے کاوش پیدا ہو گئی۔ جب سنہ ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم بنٹینگ کانپور اور وہاں سے لکھنؤ آئے تو تاج الدین حسین خاں نے اپنے دوست ینگ لاٹن کے ذریعہ وزیر کے معاملات کی پیروی کی۔ اور جو کدورت گورنر جنرل کے دل میں وزیر کی طرف سے رزیڈنٹ کی ریشہ دوانیوں نے پیدا کر دی تھی وہ بالکل جاتی رہی جس کے صلہ میں تاج الدین حسین خاں عہدۂ سفارت رزیڈنسی پر مقرر کئے گئے۔

انکی ہوشمندی۔ تدبر اور جزرسی اس سے معلوم ہو سکتی ہے کہ کونسل کلکتہ میں جو باتیں سلطنت اودھ کیلئے پیش ہوتیں انکی خبر سب سے پہلے انکو ملجایا کرتی تھی اور یہ ان خبروں کو بادشاہ کے گوش گذار کرا دیا کرتے تھے چنانچہ سلطنت کی ابتری اور طوائف الملوکی سے متاثر ہو کر لارڈ ولیم بنٹینگ نے جب بادشاہ کو تحریر کیا کہ[۵] "اگر حالت اپنی ٹھیک نہ کی تو پیشوا اور نواب کرناٹک کی طرح پنشن مقرر کرکے سلطنت کا انتظام گورنمنٹ خود لیلے گی۔" تو اس کو سب سے پیشتر تاج الدین حسین خاں نے ہی عورات محل کے ذریعہ بادشاہ کے حضور میں گذرانا تھا۔

تاج الدین حسین خاں ہمیشہ امیر اور صاحب شوکت و احتشام رہے اور مدت العمر عظمت و اقتدار کے ساتھ بسر کی۔ علاقہ سلطان پور کی چکلہ داری کے زمانہ میں انکے اخراجات کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ عشرۂ محرم میں انکا لاکھوں روپیہ کا خرچ تھا۔ لکھنؤ اور کانپور میں بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔

لکھنؤ سے علیحدگی کے بعد نواب محمد سعید خاں والیٔ رامپور کے یہاں بھی کچھ زمانہ تک عزت و عظمت کے ساتھ رہے۔ پھر علیحدگی اختیار کرکے اپنے داماد مظفر حسین خاں ابن سبحان علی خاں کے پاس الہ آباد چلے گئے۔

سنہ ۱۲۵۱ھ میں ایک دفعہ پھر لکھنؤ آئے۔ سلطان عالم واجد علی شاہ عزت و افتخار کے ساتھ پیش آئے۔ آغا باقر کے

سے ۵ تاریخ اودھ صفحہ ۱۹۹۔

امام باڑہ میں جو مجلس انہوں نے منعقد کی تھی اُس میں بھی حضور عالم نے قدم رنجہ فرمایا اور شرف ملازمت کے ساتھ خلعت دوشالہ اور رومال بھی عطا کیا لیکن سازشوں کے جال کو دیکھ کر یہ واپس الہ آباد چلے گئے۔

انکی واپسی الہ آباد کے تھوڑے سے ہی عرصہ بعد اودھ پر سرکار انگریزی کا قبضہ ہوگیا۔ اور "حضور عالم نے تاج الدین حسین خاں اور انکے بھانجے احسان حسین خاں بن سبحان علی خاں کے لئے تجویز کی کہ یہ دونوں ایوانِ گورنری میں وکیل ہو کر کلکتہ جاویں" یہ معاملہ ابھی در پیش ہی تھا کہ سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے درمیان وکالت کی خدمت تاج الدین حسین کے بھانجے اور داماد مظفر حسین خاں ابن سبحان علی خاں کو سپرد ہوئی۔ انکے اور سیکرٹری کے درمیان بعض امور پر سخت اختلاف ہوگیا۔ انہوں نے جان نثاری اور خیر سگالی کی وجہ سے سختی کے ساتھ جوابات دینے میں ذرا باک نہیں کیا۔ اور جب کاربرآری ہوتے نہ دیکھی تو اپنی خدمات سے علیحدہ ہوگئے اور "اس طرح اس خاندان کا سلاطینِ اودھ کے دورِ آخر کے ساتھ ہمیشہ کے لئے رشتۂ ملازمت ختم ہوگیا"۔

کم و بیش نصف صدی تک سلطنت اودھ کے دورِ انحطاط میں سبحان علی خاں۔ تاج الدین حسین خاں اور انکے اعقاب نے جس پامردی۔ قابلیت۔ خوش سلیقگی۔ استقلال اور حُسن تدبیر سے خدمات انجام دی ہیں وہ زمانہ میں یادگار رہیں گی۔

محبت

(ساغر نظامی کے نقطۂ نگاہ سے)

محبت اُڑنے والے کو اُڑنے سے معذور اور معذور کو پر عنایت کر دیتی ہے۔

محبت سے دل وزنی ہو جاتا ہے۔ محبت دنیا کا سب سے بڑا بوجھ ہے۔

محبت کے لئے کوشش کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ محبت خود ایک کوشش ہے۔

محبت مقام کی محتاج نہیں۔

محبت قطعی ایک وہی شے ہے جو ہوتی ہے "کی" نہیں جاتی۔

محبت میں جب جرأت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ خطرناک ہو جاتی ہے۔

۵۴۔ سلاطین اودھ۔ ۵۵۔ سلاطین اودھ۔

محبت کی صحیح دوڑ اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب اس کے پیٹ میں شراب وحشت کے دو تین پیپے پہنچ جاتے ہیں سچ ہے محبت خود ایک وحشت ہے ایسی وحشت جو بعض موقعوں پر تعمیر اور بعض اوقات تخریب کا باعث ہو جاتی ہے۔

محبت میں خودداری کیسی، محبت میں اصول کیسا۔ محبت خود اک اصول ہے۔ محبت درسِ نیاز دیتی ہے۔ محبت انسان کو کوٹ پیٹ کر دنیا کے تمام آلام اور غموں کے مقابلے کرنیکے لئے تیار کر دیتی ہے محبت انسان کو انسان بنادیتی ہے انسان ہی نہیں بلکہ فرشتہ کیونکہ نیاز کا مکمل اور دوامی مجسمہ سے جانا بس فرشتہ سے جانا ہے۔

محبت رہ تسلیم و رضا کے مسافر کو صبر اور تسکین کے زاد سفر سے آزاد کر دیتی ہے اور محبت ہی تو ایک ایسی شئے عظیم ہے جو انسان کو خدا سے بہت قریب کر دیتی ہے۔

" اے محبت تو جس دل میں ہے اس دل میں
براہ راست خدا کی آمد و رفت ہے۔ "

محبت محض ایک جنون، جوشِ خون، اور فریب خیال سے زیادہ کوئی شئے نہیں ہے۔" ہندوستان میں اکثرین کے نزدیک یہ بات بُری اور شرمناک ہے کہ فلاں مرد فلاں عورت سے محبت کرتا ہے مگر حقیقتاً ہر شخص ایک عورت سے محبت کرتا ہے یا کم از کم وابستہ ہے۔ عجیب دلچسپ بات ہے کہ سوسائٹی اس کلیہ کی موجودگی میں محبت کرنے والے اور محبت کرنے والی کو گنہگار تصور کرتی ہے حالانکہ یہ ایک عطیۂ فطرت ہے۔

محبت کی دنیا خوشبودار ہے محبت کے دنیا میں گیت ہی گیت ہیں، بوسے ہی بوسے ہیں ہنسی ہی ہنسی ہے، بستی ہی بستی ہے، اور محبت کی دنیا کا قطرہ قطرہ ایک سچی راحت اور مست خوشی کے سمندروں سے بھرا پڑا ہے

محبت ایک دوامی جھولا ہے جو ضمیر کے باغ میں غیر فانی جذبات کے تازہ پھولوں کی رسّی سے بنتا ہے اور ہمیشہ جنبش میں رہتا ہے۔ کچھ رونا کچھ ہنسنا اور کچھ دنیا محبت کے فرائض میں داخل ہے۔

محبت جوانی کا میوہ ہے جو جوانی میں ضرور کھایا جاتا ہے۔

محبت ایک ٹھوکر ہے ایسی ٹھوکر جو ہر قدم پر ٹھوکریں کھلواتی ہے۔

محبت کسی سردی سے سرد نہیں ہوتی محبت کی گرمی کسی بارش سے ٹھنڈی نہیں ہوتی محبت ایک چراغ ہے جو ہوا کے جھونکوں بارش کے طوفانوں اور اسانزہ کی آندھیوں میں بھی برابر جلتا رہتا ہے۔ ایک مشعل ہے جو تاریکی میں راستہ دکھاتی ہے۔

عورت کو محبت میں ہمیشہ پہل کرتی ہے لیکن اظہار محبت میں کبھی تقدیم نہیں کرتی۔

عشرت اور لذت کامیاب محبت کے دو نام ہیں اور محبت دونوں چیزوں کا ایک نام

جس لڑکے اور جس لڑکی کو محبت سگے ملاتی ہے وہ دنیا میں بہترین لڑکا اور بہترین لڑکی ہوتی ہے

محبت کرنا عبادت ہے
محبت پہاڑ پر ہی نہیں اکثر آسمانوں پر لے جاتی ہے
محبت خدا کی ایک قوت ہے بظاہر نہایت معمولی اور بہ باطن موجودہ سلطنتوں کی فضائی بحری اور بری قوتوں سے بھی زیادہ قوی۔
محبت واقعی صادق ہوتی ہے تو جذباتِ نفسانی کبھی نہیں بھڑکتے بلکہ انسان میں اُس رقت کی وجہ سے جو سچی محبت میں یقیناً پیدا ہو جاتی ہے ایک برودت آجاتی ہے اور برودت میں نفسانی جذبات شعلہ زن ہو ہی نہیں سکتے۔
محبت دنیا کی سب سے بڑی آوارگی ہے۔
جذبات سے مغلوب ہونا حیوانیت ہے۔ اور جذبات پر حکومت کرنے کا نام محبت

جذباتِ عالیہ

(از رئیس الکلام حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی)

گوہرِ اشک کو خوں نابۂ حرماں دیکھا　　دلِ خوں گشتہ کو سیلابِ بداماں دیکھا
ایک قطرہ تھا جسے خالقِ طوفاں دیکھا

اس نے کیا صبح کے آثار میں پنہاں دیکھا؟　　اس نے کیا رنگِ مریضِ شبِ ہجراں دیکھا؟
شمع کو پچھلے پہر طشت میں لرزاں دیکھا

کی خلش تم نے فراموش مرے زخموں کی　　بنسی شورشِ خاموش مرے زخموں کی
تم نے دیکھا بھی تو اپنا ہی نمکداں دیکھا!

رشتۂ انس سے مربوط تھی انسانیت　　اس کے واسطے مشروط تھی انسانیت
دیدیا منصبِ الفت جسے انساں دیکھا

انہیں سازوں کو ہم زنِ محفل پایا　　نغمۂ عشق کو ہنگامہ گرِ دل پایا؛
حسن کی چھیڑ کو مضرابِ رگِ جاں دیکھا

اس قصیدے کی قلم بند نہ تشبیب ہوئی　　اک طرح قصۂ ہستی کی نہ ترتیب ہوئی
اسی افسانے کو محتاجِ عنواں دیکھا

آج تو بیخودیٔ شوق کی بن آئی ہے؛　　جو تماشا تھا وہ اب میرا تماشائی ہے
تو نے کچھ اور بھی اسے دیدۂ حیراں دیکھا

رنگِ امید سے تھا جب دلِ مضطر خالی　　شبِ غم جب نظر آتا تھا گھر خالی
میں نے چند آنسوؤں کو دولتِ داماں دیکھا

آپ کی مجلس پر جلوہ کے قابل بن جائے　　دلِ ویراں کو یہ ہے خبط کہ محفل بن جائے
آپ نے حوصلۂ بے سر و ساماں دیکھا؟

نہ ستا شوق کی نظروں کو زمانے کی طرح　　طور پر پھر نظر آجا نظر آنے کی طرح

یوں دکھا جلوہ کہ موسیٰ بھی کہیں ہاں دیکھا!

آئینہ تھیں نظر گلکدہ رس کی راتیں ؎ ؎ کتنی رنگین و مبارک تھیں قفس کی راتیں
آنکھ جب بند ہوئی خواب گلستاں دیکھا

شرط تھی پنجہ کشی دہر کی وسعت پہ مجھے ہوش آیا تو سنی آگئی وحشت پہ مجھے
اپنے ہاتھوں میں جب اپنا ہی گریباں دیکھا

کوئی نازاں مجھے جانا کوئی مجبورِ حجاب کوئی گریاں مجھے سمجھا کوئی آسودۂ خواب
سب نے آنکھوں پہ مرا گوشۂ داماں دیکھا

اور کیا کرتے نہ خاموش اگر رہتے ہم کس سے سیماب پریشانیٔ دل کہتے ہم
ہم نے اپنی ہی طرح سب کو پریشاں دیکھا

گنگا کی وادی میں

(از قیسی)

"دیکھو! دیکھو! اکروٹ نہ لو ذرا اوپر اور چت لیٹے رہو" عبید کو کسی قدر ناگوار معلوم ہوا یہ پہلا تحکمانہ لہجہ تھا جو اس نے تمام عمر میں آج سُنا۔ اسکی ضعیف قوت سامعہ نے اُسکو فریب دیا۔ اگر وہ اصلی حالت میں ہوتا تو اس دلکش آواز کے تحکمانہ لہجہ سے جس میں ہمدردی کا جُزو شامل تھا باوجود پراگندہ حواس ہونیکے متکلم کی جانب آنکھیں کھولکر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا۔

لہلہاتے ہوئے مرغزار کے قریب ہری ہری نرم گھانس پر ایک کسان لڑکی کسی بےحس پڑے ہوئے شخص کے سرہانے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تر رومال سے اسکی پیشانی کو بار بار سرد کر رہی ہے۔ اسکی یہ کوشش ایلوپیتھک ہومیوپیتھک کی زحمت وہ تدابیر سے بےنیاز ہے عشوہ طراز مسیحا کے اس علاج سے بیہوش شخص کی روح اس قدر مسرور تھی کہ اُس نے اپنے مطیع حواس خمسہ کو بیدار ہونیکا تقاضہ ہی نہیں کیا۔ آخر عبید ہوشیار ہوا۔ فوراً اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی مگر معالج کی تہدید نے اُس کو جلد اپنی موجودہ حالت پر توجہ دلا دی۔

اس زمانہ کے فیشن کے دلدادہ اور اصولِ تندرستی سے بےبہرہ نوجوانوں کے مقابلہ میں وہ قوی الاعضا اور

کے بُھلے کا جوان نظر آتا ہے۔ بلند پیشانی پر ایک خراش میں سے خون بہ رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بیوفا گھوڑے نے اپنے راکب کے ساتھ اتنی ہی بدسلوکی نہیں کی کہ اسکو گرا کر فرار ہوگیا بلکہ سُم سے اُسکی پیشانی کو بھی زخمی کر دیا تھا۔ پر فضا وادی کی تر و تازہ ہوا کی پلی ہوئی بھولی لڑکی نے پیشتر پر تکلف لباس میں کسی جوان رعنا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ حیرت و خوف سے اُسکے چہرہ کو دیکھ رہی تھی۔ عبید نے تکلیف کا احساس کر کے مُنہ بنایا۔ اپنے آس پاس خاموشی و اطمینان دلانیوالا منظر دیکھکر اُس ہستی کا شکریہ ادا کیا جس کا دستِ قدرت ہر حادثہ میں انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ ابھی شکریہ کے الفاظ نے زبان سے نکلکر دل کی منت پذیری کے جوش کو کم نہ کیا تھا کہ خائف لڑکی پر اُسکی نظر پڑی جس کے ہاتھ میں ابتک اسکا بھیگا ہوا رومال تھا۔ اُس نے اول اسکو دیہاتی لڑکی سمجھکر توجہ نہیں کی۔ مگر اپنا رومال اسکے ہاتھ میں دیکھ کر دفعتہً جیب میں ہاتھ ڈالا غصہ سے اسکی جانب دیکھا۔ کھڑا ہوا جھپٹا۔ قریب تھا کہ غریب لڑکی اسکے غضبناک تیور سے خائف ہو کر چیخ مار سکے کہ یکایک ٹھٹک گیا۔ غصہ کے آثار فوراً مٹ گئے۔ زود پشیمانی اسکی عادت میں داخل نہ تھی۔ مگر اس وقت وہ نادم تھا۔ معذرت کے لہجہ میں صرف اتنا کہہ سکا "میں سنے بدگمان ہونے میں بہت عجلت کی معاف کرنا۔"

بکیس لڑکی نے اس معذرت پر یقین نہ کر کے پھر استفسارانہ اُسکی جانب دیکھا مگر عبید اب پھر وہی ۲۲ سالہ خوشخو شریف طینت جوان تھا۔ اُس کا متین و سنجیدہ بُشرہ اب خائف کرنیوالا نہ تھا۔ اُس میں وہی قدرتی جاذبیت پیدا ہوگئی اُس نے ملکر کہا "مجھے گمان ہوا کہ تم نے بیہوشی میں میری جیبوں کی تلاشی لی۔ مگر مفید مطلب شے نہ پا کر صرف رومال اُڑانے پر اکتفا کی۔ کیونکہ دیہاتی لڑکیوں کو بھی کپڑے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ کیا تم مرا شکریہ قبول کر کے اپنی خوشنودی کا یقین نہیں دلاؤگی؟"

لڑکی "معاف کیجیے۔ اول تو آپ نے میرے متعلق رائے قایم کرنے ہی میں غلطی کی۔ میرے والد شہر کی لغویات سے متنفر ہو کر اس غیر آباد مگر پر فضا و دلکش خطہ میں آباد ہو جانے سے دیہاتی کسان کا لقب نہیں پا سکتے۔ آپ کے بیکار رومال میں نہ معلوم آپ کے نزدیک خوبیوں کا کس قدر گرانبار خزانہ ہے کہ اسکے منفعت رساں طریقہ استعمال سے بھی آپ کو بدظن ہونے کی زحمت کرنی پڑی۔"

بے پرواہ و بیکس عبید کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ اس نے غور سے اسکی جانب دیکھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ صورت ہی ایسی تھی کہ ہر نظر اسپر جاکر پھر کسی اور دلفریب نظارہ کی تمنا سے خالی ہو جاتی تھی۔ بلکہ اُسکے غیر متمدنانہ جذبہ نے اس پر گہرا اثر ڈالا جو الزام دہی نے اُس لڑکی میں پیدا کر دیا تھا۔ اُس نے قریب تر ہو کر ایک بار پھر لجاجت سے کہا "شکریہ ادنیٰ احسان کا ہو یا اعلیٰ کا ادا نہ کرنا سخت ناسپاسی ہے۔ میری درخواست ہے کہ وہ احکامی تدبیر جلد بتاؤ جو میری

افضل ترین قربانی کے بعد تمہاری جانب سے خفیف سی معافی کا ہی مجھ کو یقین دلا دے۔" غضب و غصہ کے دیوانگی کر دینے کے لئے عاجزی سے بہتر کوئی حربہ نہیں مگر یہاں غصہ تھا کس کو؟ اور فقط ایک خوشی دلانیوالی معمولی سی تحریک اسکے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد اس نے دریافت کیا آخر وہ شکریہ کس بات کا ہے؟"

عبید" تم نے میرے معطل حواس کو تازہ کیا۔ نہیں سر نہ ہلاؤ۔ بھیگا ہوا رومال اور میرے سر کے تر بال جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔

٢

نعیمہ" آج رات کا پروگرام کیا ہے؟"

بھگوتی" زہرہ سے پوچھو۔"

زہرہ" بھئی ہم تو آج نہیں جا سکیں گے۔ بھیا کی ختنہ ہوئی ہے۔ آج مکان پر میلاد ہے۔ نعیمہ تم آؤ گی؟"

نعیمہ" کون بے سرے راگیوں سے اپنے کان گنگ کرے۔ آج کا ڈرامہ کہیں چھوڑ دینے کے قابل ہے؟"

بھگوتی" اس ڈرامے نے تو آج پتاجی سے جھڑپ کرا دی۔ وہ بکتے جھکتے رہے میں یہ جا وہ جا۔"

نعیمہ" شام کو تم باغ میں نہیں آئیں؟ قیراں اور میں آدھ گھنٹہ تک انتظار کرتے رہے۔"

بھگوتی" کہہ تو رہی ہوں آج دن بھر دردِ سری کرتے گذرا۔ یہ لوگ کچھ اس قدر اپنی احمقانہ غیرت کے پابند ہیں کہ ہماری سیر و تفریح ان کیلئے باعثِ ننگ و عار ہے۔ بابو گنیش چند کے پاس ہارمونیم سیکھنے جاتی ہوں تو انکو کھٹکتا ہے۔ باغ میں جانا دو دیدوں نہیں بھاتا۔ فرید کبھی میرے پاس آتا ہے تو ان لوگوں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ مگر دیتے ہو تو مجھ سی ہوا ایک نہیں سُنتی۔"

زہرہ" میں تو مجبور ہوں۔ آج مکان پر ہی رہونگی۔"

نعیمہ" کل کوئی میلا بھی تو ہے۔ بولو چلو گی؟"

زہرہ" توبہ! تم تو آوارگی میں مردوں کے بھی کان کاٹنے لگیں۔ لو! اب میلہ کی سوجھی ہے۔"

نعیمہ" (ہنس کر) تمہاری کوڑھ مغزی پر رونا آتا ہے۔ برقع کی اوٹ میں تو تم عرس وغیرہ کے اژدہام میں گشت کرو پھر ذرا آزادی سے سیر کرنے میں کیا ہرج ہے۔ قیراں کے ساتھ ہر جگہ جانا میں پسند کرتی ہوں کیا تم نہیں جانتیں کہ اس مہلک رسم پردہ نے کس قدر تمہاری بہنوں کو دق و سل کا شکار بنا رکھا ہے۔ خوش نصیب ہیں خواتین ٹرکی و ایران کہ اپنے حقوق غاصب مردوں سے آخرے کر رہیں۔ تم ہی ایمان سے کہو اگر ہم مطلق العنان ہو جائیں تو کیا

جنس قوی و جنس لطیف کی تفریق قایم رہ سکتی ہے۔ کیا پھر بھی مردوں کو ہم صنف نازک کے اطلاق کا حق رہ سکتا ہے ہم تمام کام انکے دوش بدوش کر سکتے ہیں۔ انکی Daily life (روزانہ کی مصروفیت) کسی طرح ہماری مصروفیت سے زیادہ وسیع نہیں۔"

زہرہ "دیکھو صاحب اب تم صاف صاف کہنے پر مجبور کرتی ہو۔ میں تمہارے خیالات کی زیادہ مخالف نہیں۔ مگر کہونگی خدا لگتی۔ صرف فیشن ایبل عیش پسند اور مغرب پرست بن کر تم اس مقصد کی ہرگز تکمیل نہیں کر سکتیں جو اقوام یورپ کی گھٹی میں پڑا ہے۔ طرز جدید کی تعلیم کی دلدادہ اس لئے نہ بنو کہ وہ تمہارے وجود میں مغربیت پیدا کر کے تمہارے حال میں انقلاب عظیم پیدا کر دیگی۔ تھیٹر ہال میں یا بالنگ کلب (ناچ گھر) میں ناچنے سے سوسائٹی کے نام نہاد اصول کی پیروی کرنے سے تم انڈین لیڈی تو ضرور کہلائی جا سکتی ہو۔ مگر حقیقی فلاحیت نہیں پا سکتیں۔ ترکی و ایرانی خواتین کی آزادی میں پولیٹیکل غرض نہاں ہے مگر تم اپنی کہو حکومت تمہارے ہاتھ میں نہیں تمہاری بیجا حقوق طلبی و آزادی کی غایت کیا ہے (میری اس سے یہ مراد نہیں کہ عورت آزادی سے فطرتاً محروم ہے) میں تو تسلیم کرنیکے لئے تیار نہیں اگر تم اس کورانہ تقلید کو حصول سوراج کیلئے مفید آلۂ کار ثابت کرنیکی کوشش کرو۔"

جگوتی۔ (مسکرا کر) "یہ لیکچر تو آپ جا کر کسی چبوترے پر دیجئے۔ ہم کو تو جناب اپنی تمام مراسم موئے دماغ معلوم دیتے ہیں۔ ہندوستانی بیجا پابندیوں کا طلسم ہمارے ہاتھوں ٹوٹنا تھا۔ ایک مذہبی تفریق کا خوف ہے۔ چنانچہ دنیا کی مدبروں اور انجمنوں نے اسکی وقعت کچے دھاگے سے زیادہ نہیں رکھی وہ صرف دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوا۔ ہم کافی پابستہ زنجیرہ چکی ہیں۔ آؤ مذہبی جامہ اتار کر ایشیا کو بھی رشک یورپ بنا دیں۔"

یہ تھے تینوں اسکول کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے خیالات۔

< ۳ >

والد "نعیمہ! تم نے اپنی شناسا لڑکیوں کی فہرست تیار کر لی؟ انکو بھی مدعو کر دینا۔"
نعیمہ "خیر وہ تیار ہو جاسے گی مگر یہ تو بتایئے آپ نے میرا ڈائننگ ڈریس (کھانیکے وقت کا لباس) تیار کیا یا نہیں؟"
والد "ڈائننگ ڈریس؟ اس کا کیا ہوگا؟"
نعیمہ "میں کیا عام لباس میں کھانے کی میز پر بیٹھونگی؟"
والد "تیرا وہ اطلس کا پاجامہ۔ کامدار دوپٹہ کیا ہوا؟"
نعیمہ "کہیں دعوت میں ایسا لباس پہنا جا سکتا ہے۔ مجھے مجبوراً کسی سے عاریتاً لینا پڑیگا۔"

والد :- جہانتک ممکن ہو کھانا اپنی موجودگی میں تیار کراتا "

نعیمہ :- آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں کھانا پکواؤنگی یا مہمانوں کا استقبال کرونگی "

والد :- اسکے لئے میں کافی ہوں "

نعیمہ :- معاف کیجئے آپ کی ذات کفایت نہیں کرسکتی۔ یہ میرا بھی اخلاقی فرض ہے "

والد - مگر بہت سے غیر مرد بھی تو آئیں گے "

نعیمہ - آنے دیجئے۔ میں ایک غیر مہذب لیڈی کی طرح سب کا استقبال کرونگی "

والد - میری غیرت تقاضہ نہیں کرتی .... "

نعیمہ - (جلکر) جہنم میں گئی آپ کی غیرت۔ اچھی غیرت ہے کمبخت۔ اگر آپ لوگوں نے ہمارے اخلاقی فرائض کی ادائیگی میں مزاحمت کی تو ہم کو باقاعدہ گورنمنٹ سے اپیل کرنی پڑیگی ہم اسکے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کریں گے بڑے میاں نے اپنی سعادتمند قرۃ العین کی تقریر کو ضبط سے سُنا اور خون کے گھونٹ پیکر رہ گئے۔

عبید نعیمہ کا بڑا بھائی تھا جس قدر وہ فیشن کی دلدادہ اور مغرب پرست تھی اسی قدر وہ شریف طینت اور نیک دل تھا اس کی ہنوز شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ حسین تھی نوجوان تھی۔ اسکی پرستش میں صدہا نوجوان اپنی نجات سمجھتے تھے۔ سعید تو عرصہ سے اس پر دندان آز تیز کئے بیٹھا تھا کورٹشپ نہ سہی مگر وہ اسکی صحبت و ملاقات کو اس سے کم بھی نہ سمجھتی تھی خود فریب خود آرا، مطلق العنان ہو کر کیا اس کو ایک پرستار کی تمنا نہیں ہوسکتی تھی ؟"

عبید نہ تو کسی پر عاشق ہوا تھا نہ اُس نے ناکام نتیجہ کوشش میں تھا۔ سُنا کرتا تھا کہ محبت میں انسان از خود رفتہ ہو کر معلوم کیا بن جاتا ہے مگر اپنی ذات پر اس نے ابتک اسکا تجربہ نہیں کیا تھا۔ چند مدعیان محبت سے اسکو دوچار ہونے کا اتفاق ہوا مگر انکی محبت سراسر اغراض سے ملوث تھی۔ بھگوتی کے دل لبھانے والے انداز وہ دیکھ کر اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ اس کے تمام شناساؤں میں اُسکی امتیازی شان تھی مگر اس امر کا یقین کر لینے میں کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اس کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ یا یوں سمجھئے کہ اسکی سادہ طبیعت جذبات نسوانی کا اندازہ لگانے کی اہل نہ تھی۔

زہرہ سے وہ اس وجہ سے نفرت نہیں کرتا تھا کہ وہ نعیمہ کی آوارگی اور آزاد خیالی کی شریک تھی بلکہ اُسکی رفعت خیال میں نسوانی فطرت اس کو بہت پست نظر آتی تھی۔

عبید :- نعیمہ تمہ میرے پڑھنے کے وقت تو اپنی جگر دوز آواز نہ نکالا کرو " کیا اس موقع پر ہوتا تو عبید کو بڑی پرندامت نصیحت کرتا کہ نعیمہ کی آواز جگر دوز نہیں ہے بلکہ نشتر ہے۔

"آخر کیا بات ہے؟"

ہ۔ (ذرا دھیمی ہوکر) بھائی جان ایک ذراسی بات ہے میں مہمانوں کا استقبال کرنا چاہتی ہوں اور یہ مجھے روکتے ہیں
بڑا آپ اپنی بزرگانہ نصائح کو نعیمہ کے لئے ضائع نہ فرمایئے۔ اسکے لئے وہ تمام بیکار ثابت ہوئے "یہ بڑے میاں غصہ
رتے ہوئے چلے گئے۔
ر۔ نعیمہ! مجھے یہ ظاہر کرتے ہوئے دلی رنج ہے کہ تم نے شریلینیت قیراں پر اپنے دقیع نسوانی الطاف کا خاتمہ
، اسکو جا بجا تعلّی کی لینے کا موقع دیدیا۔ میں کیسے باور کرلوں کہ تم اپنی خاندانی خصوصیات بھی ضائع کرچکی ہو۔ کیا تم
ا لوگی کہ وہ اپنی یکطرفہ خود غرضانہ محبت کو عاشقانہ بناکر عوام میں ظاہر کرتا پھرے "
ر۔ (بیباکی سے) "آپ کا خیال ایک حد تک درست ہے۔ مگر میں آپ سے رفع شک کے لئے کہنے کی جرأت کرونگی
ی محبت کے دونوں پہلو روشن ہیں" یہ جواب اس آزاد خیال خاتون کے لئے کوئی تعجب خیز نہ تھا۔
ر۔ (روحانی اذیت محسوس کرکے) شاید میرے لئے دنیا میں اس سے زیادہ بدخبری کوئی نہیں ہوسکتی۔ تم سے کسی معاملہ
دسری کرنا تم کو اور اپنے ارادوں پر مستحکم کرتا ہے۔ آخر میں اپنے دلی رنج کو ضبط کرکے تمہارے انتخاب کی مبارکباد
ں "یہ کہکر اپنے کمرہ کا دروازہ بند کرلیا۔ نعیمہ چند سیکنڈ تک مبہوت کھڑی رہی۔ مسکرائی۔ دو قدم بڑھاے اور زینہ
ٹ کھٹ اترکر غائب ہوگئی۔

٤

عبید گھوڑے کی سواری کا بہت شایق تھا۔ کئی بار سخت چوٹیں کھا چکا تھا مگر اپنے شوق کو مجروح نہیں ہونے دیا۔
درع آفتاب بیدار ہوا ابنی اور بڈھے سنبھالی گھوڑے پر سوار ہوا اور گنگا کے کنارے کنارے روانہ ہوا۔ آفتاب نکلنے والا
ن کی سرخی کا عکس دہیمی دہیمی اٹھتی ہوئی لہروں پر پڑ رہا تھا۔ اس روز کے واقعہ کو وہ بالکل فراموش کرچکا تھا۔ مگر یہ
ہی کہ مچھلیاں پکڑنے کی وہ بہترین جگہ ہے جہاں وہ گرا تھا اور کسی نامعلوم مسیحا کی توجہ سے ہوش میں آیا تھا ایک غائبانہ
ے متاثر ہوکر ذرا گھوڑا تیز کردیا۔ ۱۰ میل طے کرچکا تھا آفتاب کی پہلی نورانی شعاع اسکے سرد چہرے پر پڑی۔ بہرے
یت کسی کے کشت آرزو کی طرح لہلہا رہے تھے۔ منزل مقصود آچکی تھی۔ مرکب پر سے اترکر حادثہ کی جگہ پر بلا قصد جا کھڑا
دل میں اس وقت اس حادثہ کی تکالیف کے خیالات جاگزیں تھے بلکہ کسی دہندلے سے تصور کی خوش آیند لہر
ہے گذرکر قلب اور پھر قلب سے شریان میں پہنچکر روح میں جذب ہورہی تھی مگر یہ ذہنی کشمکش دیرپا نہ تھی بنسی ڈھ
ہ گھوڑے کو تیر سے باندھ دیا اور مچھلیاں پکڑنے میں مشغول ہوگیا۔ پندرہ بیس منٹ میں ۲۰ مچھلیاں ہاتھ لگیں مگر

اب آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد بھی ڈور کو مطلق جنبش نہ ہوئی۔ دفعتہ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپ کی آواز آئی جو ہوکر دیکھنے لگا۔ چشم زدن میں اسکا خود کا گھوڑا امنہ میں ملائم ملائم گیہوں کی بالیں دبائے ہانپتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ ابھی گھوڑے کی سراسیگی اور سانس کی بے ترتیبی پر غور نہ کر پایا تھا کہ ایک اینٹ زور سے اسکے سر کو بچا کر ٹوپی پر پڑی۔ تعقب کرتا برا بھلا کہتا ہوا اینٹوں کی بوچھار کر رہا تھا۔ عبید کی نظر پڑ گئی۔ ذرا زور سے ہنس کر کہا "زخم سر اچھا کرنے کے بعد پھر زخمی کرنا آئین اخلاق سے بعید ہے"

"ہیں! یہ آپ ہیں، کہیں آپ کے دشمنوں کے چوٹ تو نہیں آئی؟" آنیوالے نے کہا۔

عبید۔ (مسکراکر) "دشمنوں کے چوٹ آجاتی تو پرواہ نہ تھی مگر آپ نے میرے رفیق کی آنکھ زخمی کردی یہ برا کیا" یہ وہی لڑکی

لڑکی۔ (معذرت کے لہجہ میں) "اف مجھے کیا خبر تھی کہ یہ آپ کا گھوڑا ہے؟ اور آپ بھی یہاں موجود ہیں۔ مجھے تو توقع نہ تھی کہ آپ پھر بھی کبھی یہاں آئیں گے۔ کیا آپ عفو تقصیر میں کشادہ دلی سے کام لیں گے؟

عبید "ضرور۔ مگر بدون شرط نہیں"

لڑکی "شرط؟ آخر کونسی شرط۔

عبید "پہلی ملاقات پر تم نے میرے گستاخانہ کلمات کو معاف کرنے میں بخل سے کام لیا تھا۔ پہلے مجھے معاف کردو"

لڑکی۔ (مسکراکر) "آپکے لئے عفو کر کی درخواست کرنا مجھے اور شکایت کا موقع دینا ہے یعنی آپ مجھ کو اس قدر تنگ دل سمجھتے ہیں کہ اتنی سی بات کا خیال میں نے ابتک اپنے دل سے نہیں نکالا"

عبید "مجھے مسرت ہے تم نے معاف کر دیا۔ میرے گھوڑے نے آپکی زراعت کا تو ضرور نقصان کر دیا ہوگا۔ کیا اسکی تلافی کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟"

لڑکی "کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا"

عبید "میری رائے میں یہ گھوڑا ہی اسکی تلافی کر سکتا ہے۔ یہ آپکے نذر ہے"

لڑکی "آپ کی سواری کا گھوڑا چھین نا تو ظلم ہے۔

عبید "اطمینان رکھئے میرے پاس اور گھوڑے موجود ہیں۔ دیکھئے خدارا منہ نہ بنایئے۔ اس نذرانہ کے مسترد ہونے سے مجھ کو بڑا قلق ہوگا"

لڑکی "توبہ آپ تو — مگر میں ابا میاں سے کیا کہونگی؟"

عبید "مجھے انکے پاس لیچلو میں انکو سمجھا دونگا" عبید لڑکی کے پیچھے پیچھے کھیت طے کر کے ایک خوش وضع

جھونپڑی میں پہنچا جہاں ضروریات کی تمام سادہ اشیاء موجود تھیں۔ اس لڑکی کا والد مغل خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنے دیگر رفقا کی طرح گداگری کو بسر اوقات کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس زرخیز گنگا کی وادی میں کاشتکاری کا سلسلہ شروع کر دیا تھا بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ قریبی اعزا میں صرف یہ لڑکی باقی تھی۔ عبید نے اپنی مختصری حکایت بیان کرنیکے بعد بڑے میاں کا گھوڑا قبول کرنے پر آمادہ کر ہی دیا۔ کچھ دیر تک وہاں بیٹھا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی کھیت کی مینڈ تک اسکے ساتھ آئی

"ایکی خوانِ نعمت کے مزے لینے والی زبان نانِ جویں کے ذائقہ سے کیا آشنا ہوگی آج ذرا چکھتے جایئے۔"

عبید "مجھے بیحد افسوس ہے اب میں نہیں رک سکتا۔ دھوپ تیز ہوتی جاتی ہے۔ پھر انشاء اللہ آؤنگا۔" اب سلسلۂ کلام ختم ہو چکا تھا۔ خاموشی کا دونوں پر غلبہ تھا آخر عبید پھر بولا "تمہیں اپنا نام بتانے میں تو کوئی عذر نہیں۔"

لڑکی "(دھیمی آواز میں) "نسیمہ۔"

عبید "شکریہ۔ میرا نام عبید ہے اگر تم اسکو یاد رکھنا پسند کرو۔"

لڑکی "میں ضرور اس نام کو یاد رکھونگی۔" اس کا جواب عبید کے سرور سے لبریز دل نے صرف اتنا دیا کہ اسکے لبوں پر ایسے تبسم کے آثار پیدا کر دیئے جو آج تک نہیں دیکھے گئے۔"

—— ۵ ——

عبید "نعیمہ میں تم کو دو اور مہمانوں کے استقبال کی تکلیف دونگا۔"

نعیمہ "بچشم۔"

عبید "مگر تم کو انکے لئے علیحدہ انتظام کرنا پڑیگا۔"

نعیمہ "آپ تو ہمارے شریکِ طعام ہونگے نہ؟"

عبید "نہیں ہم تینوں علیحدہ کھائیں گے۔"

عبید کے ہاں آج مہتم بالشان ضیافت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ صدر پھاٹک پر بیسیوں موٹر ٹمٹم وغیرہ کھڑی ہیں۔ ڈائننگ ہال (کمرۂ ضیافت) کی آرائش سے کسی کو شبہ کی گنجائش نہیں رہ سکتی کہ مشرقی رنگ پر مغربی وارنش چڑھا ہوا ہے۔ بلکہ مغربی رنگ کا حقیقی و بہترین نمونہ نعیمہ کا ترتیب دیا ہوا ڈائننگ ہال تھا۔

مہمانوں کے استقبال میں نعیمہ کا انہماک و عبید کی نگاہوں کا تجسس قابلِ دید تھا۔ نعیمہ خیر مقدم میں اپنے حقیقی جذبات سے کام لے رہی تھی جو تبسم کی شان میں اسکے لبوں سے نمایاں تھے۔ مگر عبید کسی کے نظر آجانیکی مسرت میں مصنوعی گرمجوشی سے نعیمہ کو اپنے فرض کی باحسن الوجوہ ادائیگی کا ثبوت دے رہا تھا۔ دفعتہً حقیقی مسرت کے آثار

اسکی متلاشی نظروں سے ظاہر ہونے لگے۔ اس نے دو شخصوں کو آتا دیکھا۔ ایک سالخوردہ شریف مرد تھا۔ دوسری کوئی سرو قد عورت تھی جس کی تجلیاتِ حسن چھن چھن کر بیش قیمت نقاب سے نکل رہی تھیں۔ سلسلۂ آداب ختم ہو چکا تھا۔ عبید نیمہ سے اجازت لیکر مع اپنے ہمرد مہمانوں کے اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں یہ دونوں مہمان کون تھے نسیمہ اور اسکا والد۔ کھانے سے فارغ ہو کر عبید نے نسیمہ سے دریافت کیا "تم بزم طرب میں شریک ہونا پسند کرو گی؟"

نسیمہ: "اس روحانی غذا سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر میں مجمع میں بیٹھنے کی عادی نہیں ہوں۔"

عبید: "میں مجمع سے علیحدہ ہال کے پردہ کے پاس اگر آپ کو بٹھا دوں پھر تو کوئی عذر نہیں۔"

نسیمہ: "ہاں پھر میں تیار ہوں۔" عبید نے دونوں کو لیجا کر ایک کنج خلوت میں بٹھا دیا اور خود گانا سننے ایک الماری سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مغنیہ کی دلکش آواز نے بڑے میاں کی مردہ طبیعت میں جوانی کی گذشتہ باتوں کو تازہ کر دیا۔ اسٹے اور عبید کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ بلکہ چند منٹ بعد اس سامعہ نواز آواز سے مجمع میں سب سے زیادہ جو مسرور تھا وہ نسیمہ کا باپ تھا۔ فرید کی نظر اسی گوشہ میں تھی جہاں نسیمہ بیٹھی ہوئی تھی چپکے سے اٹھا اور اسکو غور سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ نسیمہ کے نازک و معصوم دل کو خود بخود اذیت سی محسوس ہوئی جبکہ اس نے بھگوتی کو عبید کا ہاتھ مسکراتے ہوئے تھام کر باہر لیجاتی ہوئے دیکھا۔ اسکی دوشیزگی کی حیا نے اول تو اجازت نہیں دی مگر کسی جذبہ نے باہر نکلنے کے لئے آمادہ کیا۔ آہستہ سے اٹھی۔ دروازہ سے سر نکال کر جھانکا کوئی نظر نہ آیا۔ دس بج چکے تھے۔ دھندلی چاندنی میں اصطبل کے قریب بینچ پر کوئی سفید سی چیز نظر آئی۔ قیاس نے یقین دلایا کہ وہ عبید ہی ہے اور اسکے قریب ہی بھگوتی بھی بیٹھی ہوگی۔ مضطرب دل کے تقاضوں نے اس کو اتنا غور کرنے کا موقع بھی نہ دیا کہ اگر اس سے اس مداخلتِ بیجا کے متعلق سوال کیا جاتا تو کوئی وجہ نہیں بتا سکتی تھی۔

ہاں وہ عبید ہی تھا۔ مگر تنہا۔ تنہا! حرماں نصیبی و بیکسی کی تصویر بنا ہوا۔

بینچ پر بیحس پڑا ہوا تھا۔ چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ نصف جلا ہوا سگار اس بے اتفاقی کے جوش انتقام میں زمین پر پڑی ہوئی ٹوپی کو جلانے کی فکر میں تھا۔ نسیمہ نے پہلے ٹوپی کو بچایا۔ چند لمحہ خاموش اس منظر کو دیکھتی رہی کسی تکلیف دہ خیال نے سینے کے محدود احاطہ میں گنجائش نہ پا کر تنفس کی تیز روانی کے ساتھ نکل کر عبید کو چونکا دیا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ وحشت نصف لمحہ کے اختتام کے قبل سرور سے بدل گئی۔ اطمینان کا سانس لیا۔ نسیمہ پہلے تو اسکے ان تغیرات سے کچھ خائف ہوئی مگر جرات کر کے بولی "یہاں کیوں آ لیٹے۔ کیا طبیعت ناساز ہے؟"

عبید نے اونچی نظر کر کے اس کو دیکھا اور صرف سر ہلا دیا۔

نسیمہ۔ (مسکرا کر) "آپ کی وہ ساتھی کہاں ہیں؟"

عبید۔ "صاف دلی سے" وہ فریدہ کے ساتھ چلی گئی۔"

— ۶ —

نسیمہ۔ "پھر آپ یہاں تنہا کیوں لیٹے ہیں؟"
عبید کے لئے اس سوال کا جواب دینا مشکل تھا اس سے کہ کرر دریافت کیا "میں آپکی استغراق میں مخل ہوئی"
عبید "نسیمہ ——" اسکے حلق میں سرور سے پھندا پڑ گیا۔ نسیمہ سوسائٹی سے بے بہرہ تھی لیکن عبید کے جذبات سمجھنے کے لئے سادہ لوح نہ تھی۔ مگر اپنی فطری شان استغنا سے کام لیکر خاموش کھڑی رہی "نسیمہ! بیٹھ جاؤ میں سنجیدگی سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔" وہ بیٹھ گئی۔
عبید "ہر شے میں میرے لئے دلچسپی نہیں ہے۔ اکثر اوقات جاذب نظر اشیاء مجھے اپنی جانب متوجہ کر لینا چاہتی ہیں مگر میرا مذاق طبع اس قدر اٹل ہے کہ جس چیز کو میں اک بار کسی کمی کے لحاظ سے کمتر سمجھ چکا ہوں اسکو کسی عارضی خوبی سے قابل توجہ سمجھنے کا عادی نہیں۔ نسائیت ——"
نسیمہ (سنبھل کر اسکا قطع کلام کرتے ہوئے) "معاف کیجئے اگر آپ اس قدر خود ستائی سے کام نہ لیں تب بھی آپ کے صحیح کیریکٹر کی وقعت جو میرے دل میں ہے وہ آپ کے حال پر نظر ثانی کرنے کی زحمت سے مجھ کو بچانیکو کافی ہے۔"
عبید "خود ستائی کا لفظ تم نے میرے لئے استعمال کرنے میں بڑی بے رحمی سے کام لیا۔ صحیح عادات و اخلاق کا اظہار خود ستائی نہیں خیر —— کیا تم میرے جذبات کو کچھ چیز سمجھتی ہو؟ ایسی چیز جس کا تعلق تمہاری روح کی بسط و عرض سے ہو؟"
نسیمہ "مجھے مگر وہ .... جذبات بھی تو معلوم ہوں۔"
عبید "تمہیں نہیں معلوم؟ کیوں بناتی ہو؟"
نسیمہ۔ (نیچی نظر سے) "لو! مجھے کیا خبر"
عبید "آہ تمہیں نہیں معلوم؟ اچھا میری طرف دیکھو"
نسیمہ "یہ لو!" مگر آنکھیں اوپر نہیں اٹھیں نیچی حجابانہ نظروں نے صاف اعتراف کر لیا کہ وہ عبید کے جذبات سے کما حقہٗ واقف ہیں۔
عبید۔ (ملتجی لہجہ میں) "نسیمہ یہ استغنا مجھے مار ڈالیگا۔ صرف ایک لفظ۔ قبول یا مسترد!"
نسیمہ "دونوں نہیں" شرارت آمیز تبسم اسکے لبوں پر رقص کر رہا تھا۔

عبید:- تمہیں میری قسم۔"

نسیمہ۔ خیر لفظاً ولی سہی۔ مگر بلا والد کی رضامندی ہمارا اتصال اس دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ عبید میں تمہاری قدر کرتی تمہاری تمناؤں کا خاتمہ ہونے سے قبل میں اپنا خاتمہ کرنے کو تیار ہوں۔ مگر تم مجھ سے یہ توقع نہ رکھنا کہ والد کے احکام کی خلاف ورزی کر کے بھی تم کو اپنی سرگرمی محبت کا ثبوت دے سکوں گی۔"

عبید۔ (رنج و مسرت کی درمیانی حالت میں) "مگر وہ کیوں انکار کریں گے؟"

نسیمہ:- "یہ میں بھی نہیں کہتی۔ انتخاب میرا ہے رضامندی اُنکی ہے۔"

―――――― (۷) ――――――

قیراں:- "نعیمہ آج بغرض تفریح کہیں نہیں چلو گی؟"

نعیمہ:- "اب تو بہت تاریکی ہوگئی۔ مگر میں تمہاری خاطر شکنی نہیں کرنا چاہتی۔ اچھا چلو۔" جھٹپٹا وقت ہو چکا تھا دونوں سے دور دریا کے کنارے چلے گئے۔ نعیمہ نے ٹھٹک کر کہا:- "لو اب لوٹ چلیں تم خدا جانے کہاں چلے جا رہے ہو۔"

قیراں:- "اچھا ذرا آؤ یہاں دم لیلیں پھر لوٹ چلیں گے۔" دونوں ایک نشیب میں اُتر گئے جہاں گنجان جھاڑیاں تھیں درخت کی اُبھری ہوئی جڑ پر بیٹھ کر قیراں نے کہا "نعیمہ آخر کب تک انتظار کروں اب تو وعدہ وفا کرو۔"

نعیمہ۔ "میں نے تو کل ہی والد سے اپنی شادی کے متعلق ذکر کیا تھا مگر وہ ہر بار خاموش ہو جاتے ہیں۔ بھائی صاحب تو کہنا ہی بیہودہ ہے وہ تو تم سے نفرت کرتے ہیں۔"

قیراں:- "ابھی زمانہ نفرت کرتا ہے تو کرنے دو ہمیں شادی بیاہ کے انتظار کی ضرورت ہی کیا ہے۔" نعیمہ نے قدرے چیں بجبیں ہو کر قیراں کی جانب دیکھا۔

قیراں۔ (مسکرا کر) "تم جیسی آزاد خیال خاتون پھر یہ بیجا پابندیاں؟"

نعیمہ۔ (ترشروئی سے) "قیراں! میں تمہاری اس گفتار کی متحمل نہیں ہو سکتی۔"

قیراں۔ (اسی شرارت آمیز ہنسی سے) "اور میں ضبط کا متحمل نہیں ہو سکتا ع قوتِ ضبط ہے نہ تابِ شکیبائی ہے۔"

نعیمہ:- "کیا میرے بھائی کا خیال درست ہے۔ قیراں کیا تمہاری ہستی میری آیندہ زندگی کیلئے درسِ عبرت ہوگی۔"

قیراں:- "آیندہ زندگی کی تمنا کرنے کی اجازت اس شرط پر دے سکتا ہوں کہ تم اپنی ضد سے باز آؤ۔"

نعیمہ:- "شیطان! آہ میں اپنے غلط امتحان پر نادم ہوں ——"

قیراں:- "جواب تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا۔" ایک ہلکی سی حلق میں دبکر رہجانیوالی چیخ کی آواز آئی۔ کچھ سرسراہٹ

ایک دھماکے نے اس سین کا خاتمہ کر دیا۔ مگر فوراً دوسرا سین نظر آتا ہے۔ تاریک جھاڑی کی شاخیں زور سے ہلیں۔ دھماکہ ہم کی آواز آئی۔ ایک زور کا کھٹکا ہوا اور دردناک آواز کے ساتھ کوئی دور دھم سے جا گرا۔

نعیمہ عبید کے قدموں پہ پڑی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔ قیراں کا جسم خاک و خون میں آلودہ پڑا ہوا تھا اسکی ناپاک روح پرواز کر چکی تھی۔ عبید کے پیچھے نسیمہ خوف و ہراس سے اس سین کو دیکھ رہی تھی۔

عبید۔ اُٹھو نعیمہ! خدا کا شکر کرو کہ ملائک فریب نسیمہ کی ترغیب سے میں اس راہ سے مکان پر پہنچنے کیلئے روانہ ہوا ورنہ تمہارا نہ معلوم کیا حشر ہوتا۔ نعیمہ زار و قطار رو رہی تھی آخر نسیمہ نے تسکین دیکر اس کو اُٹھایا۔

✣ ✣ ✣ ✣

زہرہ۔ آخر ایسا بھی کیا پردہ تم نے اپنی حالت مریضوں کی سی بنالی۔

نعیمہ۔ یہ پردہ قصور نہیں ہے اس واقعہ کا خیال ابتک میرے ذہن سے نہیں نکلا ہے۔ اپنی بھاوج نسیمہ کے برتاؤ سے امید ہے جلد حالت درست ہو جائیگی۔" **فقط نعیمی**

آہنگِ اضطراب

هم جو نا واقفِ کیفِ مئے عرفاں ہوتے — ایک ہی جام میں بیگانۂ ایماں ہوتے
آنکھ والوں کو بصیرت جو میسر ہوتی — ایک اک ذرہ سے خود حسن نمایاں ہوتے
جلوہ جب عام ہے پھر قیدِ تعین کیسی — ورنہ ہم بھی کبھی آسودۂ ارماں ہوتے
لیکے آئے تھے ازل ہی سے متاعِ ہستی — کس طرح دہر میں ہم بے سر و ساماں ہوتے
ہم سمجھتے تھے جب اک مرحلۂ عشق اسے — کس لئے بزمِ تماشا سے گریزاں ہوتے
لذتیں دید کی مفقود تھیں اٹھتا جو حجاب — آج ہم کثرتِ انوار سے حیراں ہوتے
جلوۂ حسن کی تھی روح بھی اک جزوِ لطیف — ورنہ بیگانے کبھی صاحبِ عرفاں ہوتے
بخششِ عام نے دھوکے مجھے کیا کیا نہ دیئے — کاش الطاف بہ اندازۂ ایماں ہوتے

غرق تھیں جلوۂ رنگیں میں نگاہیں بسمل
کیسے نظارہ کنِ حسنِ گلستاں ہوتے

(ابوالمعانی) بسمل بلگرامی

شاعر کا نصب العین

از ساغر نظامی

یہ وہ نظم ہے جو ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو انٹرمیڈیٹ کالج علیگڑھ کے یونین ہال میں انجمن خیابانِ اردو کے سالانہ مشاعرہ کی تقریب پر حضرت ساغر نظامی مدیر پیمانہ نے اپنے پُرشوکت اور نغمہ آفریں لہجے میں پڑھ کر سنائی اور جو متفقہ طور پر اُنکے اُستادِ گرامی کی نظم کے بعد، اس موضوع پر بہترین نظم سمجھی گئی۔

(۱)

اے نقادِ بزمِ معنیٰ ممنوں ہوں تیری پرسش کا — تو قصہ پوچھنے آیا ہے شاعر کی ذہنی کوشش کا
میں شاعر ہوں وہی شاعر الہام مرا میخانہ ہے — ایک ہاتھ میں ہے ساقیٔ قلم اک چٹکی میں پیمانہ ہے
ساقیٔ قلم سرمستی سے پیمانہ بھر بھر دیتا ہے — پیمانہ جب بھر جاتا ہے صہبا باری کر دیتا ہے
صہبا کی لہر موجِ رنگیں اک شعرِ ناطق ہوتی ہے — میں سحر جگایا کرتا ہوں جب ساری دنیا سوتی ہے
میں خود ہی نوائے ملہم ہوں، محوِ شورِ دارین نہیں — وہ میرا شعر نہیں قطعاً جس میں رازِ کونین نہیں
یہ میرا نصب العین نہیں

شاعر کے نصب العین میں منشا قدرت کی تھراتی ہے
شاعر کے ذہنِ روشن پر کرنیں بن کر چھا جاتی ہے

(۲)

ہے عرش بداماں ذوقِ نظر میں کب محدودِ پستی ہوں — گو خاک کا پیکر ہوں لیکن ادراک کی روشن بستی ہوں
سب دھندلے نقشِ قدامت کے میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا — تھا جن پہ غلافِ تاریکی وہ سارے شیشے توڑ آیا
اب دل کی غم ناکی مجھ کو تسکینِ حسرت دیتی ہے — اب حسن کی رعنائی مجھ کو پیغامِ حقیقت دیتی ہے
اب جھوٹی سچی باتوں سے دل میرا نفرت کرتا ہے — اب اس پہ ہنسی آتی ہے مجھے جو لفظی آہیں بھرتا ہے
اب بے معنی فریاد نہیں اب مہمل شور و شین نہیں — یوں لکھنا مجھ بن صبر نہیں، یوں کہنا مجھ بن چین نہیں
یہ میرا نصب العین نہیں

بے صبر ہوں لیکن قلزم کے احساس میں اک قطرہ کی طرح
بے چین ہوں لیکن مرکز سے گھبرائے ہوئے شعلہ کی طرح

(۳)

نصب العین شاعر ہے جو نصب العینِ فطرت ہے
جو مقصد مابین انسان اور فی مابینِ فطرت ہے
خوابیدہ ہو جو قوم اُسے پیغامِ بیداری دینا
تاریک فسردہ ذروں کو احکامِ ضوباری دینا
جذبات کی مردہ روحوں کو زندہ کرنا انسانوں میں
تخئیل سے امرت رس لیکر قطرے ٹپکانا کانوں میں
پھولوں کے ریشوں میں کھو کر پھولوں کی فطرت پڑھ لینا
کانٹوں میں ہو کر جذب خلش کی ہر نوعیت پڑھ لینا
عرفاں کے موتی چن لینا اسرار کی ہر گہرائی سے
افکار کے سورج چمکانا انوار کی ہر پہنائی سے
یہ نصب العین شاعر ہے

میں نبض شناسِ شاعر ہوں، اس کی فطرت کا ماہر ہوں
یہ نصب العینِ شاعر ہے میں واقف ہوں میں شاعر ہوں

(۴)

نغمات سحر کے سن لینا رنگین افق کے چنگوں سے
تاریکیٔ شب کو پڑھ لینا خاموش شفق کے رنگوں سے
انسانوں میں پیدا کرنے وہ عنصر انسانیت کے
جو عظمت کے گہوارے ہوں آئینے روحانیت کے
تاروں کی عصمت میں چھپ کر تعلیم محبت کی دینا
بیداری کا مُتہ دہو دینا غفلت کی آنکھیں سی دینا
دنیا کو نفس پرستی کے غاروں سے اوپر لے آنا؛
ذروں کی دھندلی پستی کو تاروں کے اوپر لے آنا؛
مضرابِ عمل سے چھو لینا تحریک کے قائم تاروں کو
عبرت سے پانی کر دینا بدمستی کے انگاروں کو
یہ نصب العین شاعر ہے

قدرت اصلاحِ خلقت کی تکمیل پہ تنہا قادر ہے؛
باقی جتنی تخریبیں ہیں ان سب کا مصلح شاعر ہے

< ۵ >

دنیا کی ذہنیت پڑھ کر بن جانا درس نصابوں میں
ذہنوں کو مرتب کر دینا بن کر الفاظ کتابوں میں
آیندہ نسلوں کے مستقبل کو رنگِ عظمت دینا
جو پیدا ہونے والی ہیں ان روحوں کو قوت دینا

ترکیب عزم و جزم سے کچھ ہمت والے دل بنوانا
• ایوانِ حکومت کو دنیا ترتیب نئے آئینوں سے
دنیا کے حسنِ کہنہ سے تازہ جلوے پیدا کرنا

دنیا میں آنے والے طوفانوں کے ساحل بنوانا
اسرار اگلوا لینا گہرے سینوں کے گنجینوں سے
نغموں کو لَے سے بھر دینا لَے سے نغمے پیدا کرنا
یہ نصب العینِ شاعر ہے

تجدید تعلق رکھتی ہے ہر نصب العینِ شاعر سے
پھر کس کا نصب العین ہو بڑھ کر نصب العینِ شاعر سے

(۶)

حریت کے میدانوں میں اپنے رایت چمکاتا ہے
اصلاح کی قندیلیں لے کر جاتا ہے ظلمت گاہوں میں
جب قافلے اپنی غفلت سے چلتے ہیں راہِ باطل پر
گمراہوں کو منزل کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے
وہ تاروں کی آنکھیں بن کر کرتا ہے سیر اندھیروں کی

قومیت کے ایوانوں میں تنظیم کے نغمے گاتا ہے
تہذیب کی تمثیلیں بن کر پھرتا ہے جلوت گاہوں میں
وہ بانگِ جرس بن کر اکثر گونجا کرتا ہے منزل پر
وہ رہ گیر درماندہ کو اُٹھنے کی قوت دیتا ہے
سورج کی کرنوں میں چھپ کر سنتا ہے گونج سویروں کی
یہ نصب العین شاعر ہے

یہ نصب العین فقط کامل شاعر کے دل میں ملتا ہے
تکمیل مگر جب ہوتی ہے جب ذہن کا تارہ کھلتا ہے

وہ رمز شناسِ معنیٰ ہے فطرت کی طرف سے شاعر ہے (۷) یہ ہے سطحی تنقید مری جذبات نگارِ خاطر ہے

دولت کی ذہنیت پر چھا جاتا ہے حالی بن کر
اکبر کے لطائف میں چھپ کر اصلاح کی کوشش کرتا ہے
خیام و حافظ کی لے میں گاتا ہے ترانے مستی کے
اُلجھے ہوئے رازِ ہستی کو لفظوں سے سلجھا دیتا ہے

اقبال میں ظاہر ہوتا ہے اک فلسفہ عالی بن کر
شبلی کے تبحر میں دورِ رفتہ کی نمائش کرتا ہے
داغ و غالب بن کر انشا کرتا ہے مقصد ہستی کے
فطرت کے معموں کو اکثر باتوں میں سمجھا دیتا ہے
یہ نصب العین شاعر ہے

شاعر ہے وہی جو ہر شے میں فطرت کے ترانے گاتا ہو
سازِ دل کے ہر پردے میں اپنی آواز سناتا ہے

سب العین ہے قدرت کے عزم صد رنگی کا — ہر رنگ اُسکے آہنگ میں ہے فطرت کی ہم آہنگی کا
نصب ہے کامل، خود فطرت کا مقصود ہے وہ — ہر نصب العین میں پنہاں ہے ہر مقصد میں موجود ہے وہ
کا ہی نقش جادہ تقلید کے قابل عالم میں — الفاظ سے اُسکے سجتی ہے الہام کی محفل عالم میں
ے حکیم اعظم“ سے ہر وقت مخاطب رہتا ہے — ”طوطی بس آئینہ ہے“ جو سنتا ہے وہ کہتا ہے
یہ نصب العین شاعر ہے

جب نے کی نوا ذاتی ہی نہیں اُس کا نغمہ اور ہی کیا
جس پر فطرت خود قادر ہو پھر اس کا نصب العین ہی کیا

طبیعیات کے ارتقا میں نیوٹن کا کارنامہ

(جناب محمد عبد النعیم صاحب صدیقی)

یخ ماضی کے مطالعہ سے روشن ہوگا کہ ”فلسفۂ قدرت“ یعنی علم الطبیعیات کی ابتدا ترقی کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا
سو سال کے قلیل عرصہ میں ہم طبیعیات کو موجودہ آسمانِ عروج پر پاتے ہیں۔ تمام عالم تیرہ و تار تھا، انسانی
غ تعیش اور لہو و لعب کے نذر ہو چکے تھے۔ اعلیٰ خیالات اور علمی تحقیقات اور کد و کاوش مفقود ہو چکی تھی اور
نسانی جوہر بغیر کسی استعمال میں لانے اور بلا نگہداشت پڑے رہنے سے تخیل کی قابلیت میں بھی انحطاط کے
ہونے لگے تھے۔ اعلیٰ علمی تحقیقات تو ایک طرف رہی ادنیٰ معلومات تک، جو اُس زمانہ کے حوائج ضروریہ کیلئے
ے، حاصل نہ تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُنکے روزمرہ کی زندگی میں گوناگوں پیچیدگیاں پڑ گئی تھیں اور معمولی معاشی
نقدہ لاینحل نظر آنے لگے تھے۔

ب اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ایسی شخصیت ظہور پذیر ہو جو نہ صرف علمی تحقیقات عالیہ میں مصروف ہو بلکہ سا
انسانی دل و دماغ اور قوتِ تخیل کو تعیش اور عشق بازی کی لعنت سے بچالے اور لوگوں کو اسکے بیجا استعمال
ت آجائے۔ بالآخر ۱۶۴۲ء میں اولس تھروپ (Woolsthorp) لنکن شائر سے آفتاب سائنس

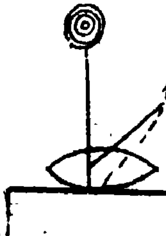
طلوع ہوتا ہے اور تمام علمی دنیا کو اپنی علمی تحقیقات سے منور کر دیتا ہے اور یہ ثابت کر دکھاتا ہے کہ اگر قدرت کی عطا کی قوت دماغی کی صحیح پرداخت کی جائے تو انسان اس قابل ہو سکتا ہے کہ وہ مشاہدات فطرت پر علمی استدلال کرکے اپنے اور اپنے ہم جنسوں کے لئے مفید اور کارآمد نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ نیز صحیفۂ قدرت کے مطالعہ کی قابلیت آجاتی ہے یہ زبردست ہستی جس نے انسان کے قلب میں برق کی سی تڑپ پیدا کر دی سوائے نیوٹن کے اور کون ہو سکتی تھی سر آئزک نیوٹن ہی کی بدولت آج دنیا کی مہذب اور شائستہ قوم "فلسفۂ قدرت" کے اہم انکشاف و علمی ایجادات کی راحت کی زندگی بسر کر رہی ہے اور نہایت ہی فخر و مباہات سے اپنے ہم جلیسوں میں اُس کا تذکرہ کر رہی ہے۔ اگرچہ اس وقت نیوٹن کے ہم عصروں نے اُسکی سعی اور محنت کو تحقیر کی نگاہوں سے دیکھا لیکن اُس کی وہی شب بیداریاں آج روز روشن کا جلوہ دکھا رہی ہیں اور یہی مشقت علم الطبیعیات کے اس قصر رفیع الشان کی بنیاد ہوئیں جس میں آج مہذب اور شائستہ قوم سکونت گزیں ہے۔ نیوٹن نے نہایت ہی صبر و استقلال سے ان تمام مشکلات کو جو اسکی ہمعصروں کی نکتہ چینی اور خوردہ گیری کی وجہ سے پیش آئیں برداشت کرکے علمی میدان کو صاف کیا اور بالخصوص طبیعیات کی داغ بیل ڈال دی اور فرہاد وار شیریں حکمت کی خاطر سنگلاخ پہاڑوں کو کھود کھود کر جوئے علم ہم تک پہنچائی۔ گو نیوٹن اس وقت موجود نہیں ہے لیکن علم و حکمت کا دریا بہہ رہا ہے اور بالخصوص طبیعیات کی افتادہ زمین سرسبز و شاداب نظر آرہی ہے۔

نیوٹن کی علمی تحقیقات کا آغاز نہایت دلچسپ طریقہ پر ہوا ہے ۱۶۶۵ء میں وہ اپنے وطن Wools thorpe کے کسی باغ میں تفریح طبع کی خاطر چہل قدمی کر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک ناشپاتی جو بالکل پک گئی تھی خود بخود ٹوٹ کر نیچے گر پڑی۔ چونکہ نظرتاً فطین ذکی الطبع واقع ہوا تھا اس لئے معاً اسکے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ تحقیق کیجئے کہ ناشپاتی نیچے کیوں گری؟ اوپر کیوں نہیں گئی؟ نہایت ہی تحقیق و تدقیق کے بعد اس نے یہ معلوم کیا کہ کوئی چیز زمین میں ایسی ہے جو اجسام کو مرکز زمین کی طرف کشش کرتی ہے۔ اس کا نام اس نے جاذبۂ ارض رکھا پھر Kepler کے تیسرے کلیہ کی مدد سے معکوس مربعوں کا کلیہ اخذ کیا اور چاند کی حرکت سے اپنے کلیہ کی تصدیق کرنا چاہا لیکن ۱۶۸۵ء تک نیوٹن اپنے تجربہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جب Picard کی دریافت کی ہوئی کرۂ فلکی نصف قطر کی قیمت نیوٹن کو ملی تو اس نے ایک کرہ اور اسکے متصل ذرہ کی باہمی قوت کشش کا حساب لگا کر اپنے کلیہ تجاذب کی صحت کو تسلیم کیا۔

اس کا کلیہ تجاذب یہ ہے "ہر مادی جسم دوسرے مادی جسم کو ایک خاص قوت سے کشش کرتا ہے جو متناسب

ہے اجسام کی کمیوں کے حاصل ضرب کے اور تناسب معکوس رکھتی مربع فصل کے ساتھ"
جولائی ۱۶۸۶ء میں نیوٹن کی ان تحقیقات کے نتائج شائع کئے گئے۔ پہلی کتاب کلیۃً تجاذب کے ڈائنمی اثرات پر
تھی۔ دوسری کتاب میں سکون سیّالات، ہیڈروڈائنیمکس اور نظریہ امواج پر بحث تھی۔ تیسری کتاب میں نظام شمسی
کشش یعنی جذب کا وجود ثابت کیا گیا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ تمام اجرام فلکی اسی کے تابع ہیں۔ نیوٹن
تحقیقات کو یہیں پر ختم نہیں کر دیا بلکہ اور آگے بڑھایا اور اپنی تحقیقات کو جاری رکھ کر ان معرکۃ الآرا نتائج پر پہنچا
الطبیعیات کی بنا قرار دیئے گئے۔ ان میں سے پہلا کلیہ یہ ہے۔ "ہر جسم سکون میں رہتا ہے یا ہموار رفتار کے
حرکت کرتا رہتا ہے تا وقتیکہ کوئی قوت اُسے اُسکے برخلاف کرنے پر مجبور نہ کرے"۔ روزمرہ کے مشاہدات اس
صداقت کے حامی ہیں۔ انکا دوسرا کلیہ یہ ہے "معیار حرکت کا تغیر قوت عاملہ کا متناسب ہوتا ہے اور اُسی
میں ظاہر ہوتا ہے جو کہ قوت کی سمت عمل ہو"۔ اس نے یہ بھی دریافت کیا "ہر مقام پر تمام مادی جسم اوپر سے
طرف مساوی اسراع سے گرتے ہیں"۔ ان دو کلیات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ کوئی قوت جو جسم پر
جائے وہ اُسکی کمیت اور اپنے پیدا کردہ اسراع کے حاصل ضرب پر موقوف ہے۔ انکا تیسرا کلیہ یہ ہے کہ
اور ردِ عمل ہمیشہ مساوی اور متضاد ہوتے ہیں۔

نیوٹن کے Optical Rehearches ۱۶۶۶ء سے شروع ہوئے ہیں۔ اس نے اسی سال سفید نور کو
اجزاء ترکیبی میں تحلیل کیا۔ دو سال بعد اس نے سب سے پہلی منعکس دوربین (Reflected Telescope)
اور اخبارات کے ذریعہ شاہی انجمن کے سامنے پیش کی۔ اسکی یہ تمام تحقیقات "Optics" کے نام سے
۱۷۰۴ء میں شائع ہوئیں۔ ۱۶۹۴ء سے ۱۶۹۵ء تک نیوٹن نظریۂ قمری "Lunar theory" کے مکمل کرنے
لگا، جس کے لئے Flamstead کے مشاہدات کی سخت ضرورت تھی۔ نیوٹن اور Flamstead
باہمی مناقشات کی وجہ سے اس اہم علمی تحقیق سے اس کو ہاتھ اُٹھانا پڑا۔ ایک اہم مشاہدہ Neuton's Ring
نام سے مشہور ہے۔ یہ مشاہدہ نیوٹن ہی نے کیا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ جب دو



کی سطحیں جنمیں سے ایک کسی قدر محدب اور دوسری مستوی ہو ایکدوسرے پر دبائیں تو
تماس کے اطراف کئی ہم مرکز رنگین دائرے نظر آتے ہیں۔ اگر ان شیشوں کو معمولی روشنی سے
کیا جائے تو رنگین دائروں کی تعداد سات ہوتی ہے جن میں سے بیرونی دائرہ کا رنگ سرخ
اندرونی دائرہ کا رنگ بنفشی ہوتا ہے۔ یہ شعاع نور کے علیحدہ علیحدہ مختلف فاصلے طے کرنے

رنجنی اور سادہ سطح سے منعکس ہونے اور بہ یک وقت آنکھ تک پہنچنے سے دکھائی دیتا ہے
بالآخر ۱۷۲۶ء میں یہ علمی آفتاب غروب ہو گیا یعنی Keningston میں ایسی زبردست ہستی ہم سے ہمیشہ
کے لئے جدا ہو گئی۔ اور Westminster Alloy میں سپرد خاک ہوئی۔ باوجود ان تمام انکشافات کے
اہل علمی یعنی سائنس اور بالخصوص طبیعیات کے زلفوں کیلئے نیوٹن جیسے محقق کے مزید علمی شانہ کی ضرورت تھی۔ فقط

میخانۂ محبت

کچھ اہلِ دل، اہلِ وفا — بادہ گسارانِ ولا
پاکیزہ باطن، بے ریا — آئینہ دارانِ رضا
تصویرِ صدقِ آرزو
بیٹھے ہوئے ہیں چارسو ——— ساقی کی بزم ناز میں

سینوں میں اُنکے ہیں رواں — جوشِ محبت بیگماں
چہروں سے اُنکے ہیں عیاں — کیفیتِ عشقِ نہاں
یعنی سراپا جوش ہیں
لیکن وہ یوں خاموش ہیں ——— گویا نہیں منہ میں زباں

اک آرزو دل میں لئے — بے فکر اپنے حال سے
ہیں منتظر بیٹھے ہوئے — ساقی کی چشم لطف کے
کچھ بھی اُنہیں پروا نہیں
اندیشۂ فردا نہیں ——— مستِ خمارِ دوش ہیں

اور ساقیٔ کمسن، حسیں — نازک ادا، ناز آفریں
آئینہ رو، زہرہ جبیں — غیرتِ دہِ ماہِ مبیں
باشان و شوکت کرّ و فر

محفل میں یوں ہے جلوہ گر ——— جیسے پرستانیں پری
اس کی نگاہِ سرگیں مخمور، پیاری اور حسیں
دیوانہ سازِ حور عیں باصد ادائے دلنشیں
گردش میں مثلِ جام ہے
یعنی صلائے عام ہے ——— بادہ پرستوں کے لئے

لیکن وہ ہے اہلِ نظر اہلِ نظر بھی باہُنر
سب کو پلاتا ہے، مگر پیمانۂ دل دیکھ کر
تاکہ کسی کم ظرف کو
حد سے فزوں نشہ نہ ہو ——— رسوا نہ ہو اُسکی نظر

جتنے بھی بادہ خوار ہیں بیخود ہیں یا ہشیار ہیں
مفلس ہیں یا زردار ہیں مومن ہیں یا کفار ہیں
سب کی ہے چشمِ حق نگر
ساقی کے روئے پاک پر ——— یعنی موحد ہیں وہ سب

(ابوالفاضل) راز چاندپوری

"جگر کے داغ"

ازل کے دن جو ہم لیکر اُٹھے تھے تیری محفل سے
وہ شعلے آجتک لپٹے ہوئے ہیں دامنِ دل سے

آگئی کیا کوئی حسرت دلِ سوزاں کے قریب
کچھ دھواں سا ابھی اُٹھا تھا گریباں کے قریب

ہو چکا تکملۂ صورت و معنائے بہار
تو بھی اب سامنے آ اے چمن آرائے بہار

نمودِ عجز کی یہ گرمیِ مزاج تو دیکھ
ہزار قطرے فنا کر کے اک حباب اُٹھا

بقدرِ ظرف مئے بندگی کو جوش رہا
کسی جبیں سے یہ ٹپکی کسی جبیں میں رہی
ہوس نے بھر دیئے اس درجہ خواہشات کے بت
ذرا سی بھی نہ جگہ کعبۂ یقیں میں رہی
سرِ نیاز نہ جب تک کسی کے در پہ جھکا
برابر ایک خلش سی مری جبیں میں رہی

ایک ذرّہ کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے

میری حیرت کی قسم رخ سے اٹھاؤ تو نقاب
میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہونگے

عشق جب مصروفِ اصلاحاتِ روح و تن تھا
عرصۂ عالم مرے اک گوشۂ دامن میں تھا
ہم نے تکمیلِ جنوں بھی جلوہ زارِ غم میں کی
دور کیوں جاتے کہ صحرا بھی اسی گلشن میں تھا

قیس و فرہاد ہوں یا سرمد و منصور جگر
ہم نے بے پایا نہ دیکھا کسی دیوانے کو

جگر مراد آبادی

خیابانِ خلیل

(از صاحبزادہ متین اللہ خانصاحب واثق ٹونکی)

(۲)

"چور کی ڈاڑھی میں تنکا"

(۱) نہ بولا، چور کی ڈاڑہی میں تنکا   کہے کیا، چور کی ڈاڑہی میں تنکا

ں مطلع میں کل کائنات چار الفاظ ہیں، "نہ" "بولا" "کہے" "کیا" ان چاروں لفظوں سے نہ کسی مضمون کا اظہار نہ
ی مفہوم کی طرف ایما، وہ مہمل مصرعے مطلع کی صورت میں رونما ہیں،

(۲)

"گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا"

رب المثل اُس جگہ مستعمل ہوتی ہے جہاں غیروں سے کوئی اچھے سلوک کرے اور اپنوں سے معمولی، مغایرت
یگانگت کا محلِ استعمال میں ضرور لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل خمسہ میں محل استعمال غلط ہے ؎

نالے کرے نہ کیونکر بلبل نہ کیوں ہو مضطر   کیا خار دے گیا ہے افسوس یہ ستمگر
چُن چُن کے لے گیا ہے دامن میں ہر گُل تر   پژمردہ پھول چھوڑے گلچیں نے شاخِ گل پر
"کیا خوب، گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا"

ہیں نے تر و تازہ پھول تو "خود" چُن لئے اور "پژمردہ بلبل کے لئے چھوڑ دیئے"۔ اول تو دیکھنے کی بات ہے کہ گلچیں نے
ے عمدہ چیز خود لی اور بری غیر کے لئے چھوڑی، یہ محل اس ضرب المثل کا نہیں ہو سکتا۔

دوسرے یہ کہ گلچیں اور بلبل میں مغایرانہ تعلق ہے نہ یگانگت کا، گل سے جس طرح خاص تعلق بلبل کو ہے اسی طرح
ہیں کو بھی ہے بلکہ بلبل سے زیادہ کہ لفظی مناسبت بھی رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ گھر
پیروں کو تیل کا ملیدا بلبل کے لئے صادق آتا ہے،

تیسرے یہ بات دریافت طلب ہے کہ شکوہ کے طور پر یہ الفاظ مُنہ سے نکلتے ہیں اب یہاں کون مخاطب ہے؟
بھیجا تھا ہم نے تجھ کو کیا اس لئے بتا تو   آئی ہے گشت کرتی دل میں ذرا سمجھ تو

"جا" سونگھتے نہیں ہم سمجھی ہے ہم کو کیا تو   لائی بچی کھچی کیوں گیسو کی بو صبا تو ؛
کیا خوب گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا

معلوم ہوتا ہے شاعر حضرت سلیمانؑ تھے، جن کے قبضہ میں ہوا تھی، انہوں نے بھیجا کہ بوئے گیسوئے معشوق لاؤ، گئی تو گشت کرتی ہوئی لوٹی، تمام خوشبو تقسیم کر آئی بچی کھچی لیکے گھر پہنچی اب عتاب ہوا خطاب ہوا، بھیجا تھا ہی تکلو کیا اسلئے بتا تو، یہ مسلّم کہ "صبا" کو شعرا یا عشاق نے پیامبر باندھا ہے لیکن کوئی منت کرتا ہے، کوئی ارمان کرتا ہے کہ کاش تو میرا پیام پہنچا دے، کوئی شکر کرتا ہے کہ تو نے بوئے زلف مجھ تک پہنچائی، حکومت، دھمکی، یا گھریلو تعلقات، رشتہ داری کا اظہار کوئی نہیں جتاتا، جب بات یہ نہیں تو محل استعمال بھی غلط ہے، علاوہ محل استعمال غلط ہونیکے، بندش نہایت نامعقول ہے، حشو و زوائد سے ہر مصرع لبریز ہے،

اشعار کا مضمون اس قدر بے تکا ہے جس نے پایۂ اعتبار سے اُنہیں گرا دیا ہے، یہ شان عشق نہیں ہے کہ بوئے زلف معشوق کو خواہ وہ کسی قدر ہو نظر حقارت سے دیکھتے ہوئے سونگھنے سے انکار کردے، عاشق کیلئے تو اسکی رمق ہی کافی ہے مشام دل وجان کو معطر کرنیوالی ہے،

پھر یہ الفاظ قابل غور ہیں "جا نہیں سونگھتے" وہ خوشبو جو ہوا کے ذریعہ ناک تک پہنچے اُسکے سونگھنے پہ اختیار نہیں ہوتا، "جا نہیں سونگھتے" کی ایک ہی رہی،

خوشبو ملی ہے اُسکی اس میں یہ ہم نے مانا ؛   اس بات سے مگر یہ کب ہے خیال اُس کا
گر میل تھا نہ دل میں گر صاف تھا تو یہ کیا   بٹنہ ملا ہوا کیوں یہ آج ہم کو بھیجا
کیا خوب گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا

سب سے پہلے تو معلوم ہونا چاہئے کہ ضرب المثل کا محل استعمال غلط ہے شاعر کا کہنا صرف اتنا ہے کہ "ہمیں ملا ہوا اُبٹنا بھیجا" حالانکہ محل استعمال یوں ہوتا کہ غیر کو اعلیٰ درجہ کا بے ملا ہوا اُبٹنہ بھیجا اور ہمیں ملا ہوا، گھر کے پیروں کو تیل کا ملیدا،

میں حیران ہوں یہ کس مذاق کا شاعر ہے، معشوق کے پہنے ہوئے ہار، معشوق کے جسم سے مس کی ہوئی چیز، دنیا کے عاشقوں کو مرغوب ہوتی ہے حتیٰ کہ معشوق کے پسینہ کی بو تک محبوب تسلیم کی گئی ہے۔ باوجود اس اعتراف کے کہ اُس اُبٹنہ میں اُنکی خوشبو ملی ہوئی ہے تاہم تیل کا ملیدہ ہے۔ شاعرانہ نقطۂ نظر سے خمسہ متذکرہ بالا کی ترکیب اور ربط و تسلسل ہماری سمجھ سے باہر ہے، مصرع دوم و سوم کی بندش ترکیب معنی اور ربط پہ ناظرین کرام خود غور فرمالیں۔

مقطع میں بھی "باسی ہاروں کو" جو دس ہزار تازہ ہاروں سے ہمارے نزدیک بہتر ہے تیل کا ملیدا بتاتے ہیں۔

محل استعمال تو قریب قریب ہر جگہ نظر انداز ہے، بجز مطلع کے کہ نہایت مناسبت رکھنے والے الفاظ ہیں اور محل استعمال بھی ٹھیک ہے،

"ضامن نہ ہونا باپ کا ہے ضامنی گھر باپ کا"

مذکورہ بالا الفاظ یا "مصرع" مجھے نہیں معلوم کہ دراصل ضرب المثل ہے یا بھاٹوں کی صدا، مطلع میں "باپ کا" ردیف ہے اور قافیہ علاوہ مصرع اول کے سب فارسی الفاظ ہیں جو نہایت ہی بدزیب معلوم ہوتے ہیں یعنی کھدر میں زربفت کے پیوند۔

صفحہ ۳۹ × ۱۱

"لاحول ولا قوت"

لاحول ولا قوت اسے کون ضرب المثل کہتا ہے، قرآن پاک کے چند الفاظ پاک ہیں جو زبان اردو کے محاورہ میں بھی بولے جانے لگے ہیں، ہم نے بھی اس میں طبع آزمائی کی ہے جو تنقیدی اشعار ہیں ؎

یہ ضرب مثل حضرت! لاحول ولا قوت — یہ بھی ہے کوئی جدت لاحول ولا قوت
کیوں ٹانگ اڑاتے ہو جب کہنا نہیں آتا — اچھی نہیں یہ حرکت لہ لاحول ولا قوت
ٹھہرا ہے بیڈھنگی "معشوق کی حضرت کے" — کرتے ہو یہ کیوں ذلت لاحول ولا قوت
بے شرم بتاتے ہو معشوق کو یہ کہہ کر — "کچھ شرم نہ کچھ غیرت" "لاحول ولا قوت"
جو چاہو کہو مہ سے مانے گا کہا کیسے — کرتے ہو عبث حجت لاحول ولا قوت
بیزار ہوا ہوں میں اس سمع خراشی سے — لاحول ولا قوت، لاحول ولا قوت
جو جام سفالیں ہے جمشید ہی بنے کیونکر — گو ایک سی ہو صورت، لاحول ولا قوت
سمجھائے انہیں واثق جو بات بری دیکھے
اتنی بھی نہیں جرأت لاحول ولا قوت،

کیا "لاحول ولا قوت" ردیف ہو جانے سے شاعر مجبور ہو گیا ہے کہ وہ ایسے ہی مضامین پیدا کرے جن سے معشوق کی ذلت ہویدا ہو اور بس۔

لہ زبان: بفتح اول و ثانی و ثالث از غیاث۔
لہ زبان: یہ آپ تنقید کر رہے ہیں یا اعلان جنگ۔

۱۲ × ۳۹

"مدعی سست گواہ چست"

ذی علم ناظرین سے پوشیدہ نہیں کہ اس ضرب المثل کا محل استعمال اُس جگہ ہوتا ہے جہاں صاحب معاملہ کو فکر ہو اغیر متعلق شخص تگ و دو کرے، شعر نمبر ۲ ملاحظہ ہو۔

دعوے دل کو دیکھکر، آہ و فغاں سے پوچھکر — اُس نے یہ فیصلہ کیا مدعی سست گواہ چست

شاعر کہتا ہے "معشوق کے روبرو دل نے محبت کا دعویٰ پیش کیا، آہ و فغاں شاہد تھے اُن سے دریافت ہوا" یہ صورت معاملہ مدعی سست گواہ چست کی نہیں ہوسکتی، ہاں جب مثل صادق آتی جب شاعر یوں کہتا "معشوق کے روبرو دل تو خموش ہے آہ و فغاں نے شور مچا رکھا ہے" اب یہ کہہ سکتے تھے مدعی سست گواہ چست،

اس خمسہ میں ضرب المثل بحیثیت ردیف کے واقع ہوئی ہے جو کہیں مناسب موقع پر نہیں نظر آتی، چند اشعار ناظرین کے غور کے لئے درج ہیں فرداً فرداً تنقید قایم کرنا فضول ہے۔

خط سے علاوہ حال کچھ کہہ دیا نامہ بر نے جب — سُن کے وہ شوخ بول اٹھا مدعی سُست گواہ چست

خط نہ لکھا جاتا اور نامہ بر خود گوشاں ہوتا تو مثل صادق آتی۔

مانگ کے دل وہ چپ ہوئی، سر ہے ادا کہ دو ابھی — کھلتا نہیں یہ مدعا مدعی سست گواہ چست

دل نہ مانگتے اور ادا ہی ادا سر ہوتی تو مثل صادق آجاتی۔

۱۳ × ۴۰

"ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

یہ ایک مصرع ہے، جو موقع پر بولا جانے لگا ہے، تاہم ضرب المثل نہیں کہا جا سکتا، میں نے اسپر یہ مصرع لگایا ہے "صورت و سیرت ہر اک کی ہے جدا" نہایت مناسب مصرع ہے جس سے محل استعمال بھی ظاہر ہوا ہے "رنگ و بو" "صورت و سیرت" سے کیسی زبردست مناسبت رکھتے ہیں بخلاف اُن مصرعوں کے جو خیابانِ خلیل میں ہمیں نظر آتے ہیں وہ نہایت بدمزہ اور پھیکے ہیں، علاوہ اس کے عیوب ظاہری سے بھی پاک نہیں ہیں۔

سے ۵ "ہے جدا نیش و خلش ہر خار میں" نیشِ عقرب تو سُنا ہے، لیکن نیشِ خار نہیں سُنا۔

"نغمہ سنجی بلبلِ دل کی یہ ہے" بلبلِ دل یہ ترکیب بھی نئی ہے۔

"شاخِ نخلِ دل کی شادابی نہ پوچھ" اول تو "نخلِ دل" کی ترکیب نئی۔ نخلِ آرزو البتہ سُنا ہے پھر اس پہ طرہ "نخل کی شاخ"

ہونے پہ سہاگہ۔

"قلبِ ہر بلبل جدا ہے اس لئے" "سبحان اللہ قلب عربی کا لفظ ہے اور اضافت ہے اردو کے لفظ "ہر" کے ساتھ قابلیت کی داد دیتا ہوں۔

صفحہ ۴۱ × ۱۴

"فکر ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست"

"یہ بھی ایک مصرع ہے" بار بار اس مسئلہ پہ بحث کرنا فضول ہے، ہم سر دست اور لغو اشعار کو نظر انداز کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار کی بابت صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جو شخص ہماری اس عبارت کے معنی سمجھا دیگا وہی ان اشعار کے معنی بھی بیان کرسکتا ہے، ہم بذاتِ خود دونوں کے معنی سمجھنے سے مجبور ہیں۔

اشعار:

فلسفہ میں بچھا کے دام اصول — فرع میں رکھ کے دانہائے عقول

مطمئن ہیں کئی فلوم وجہول — معنئ حد ذاتِ حق معقول

فکر ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

ہماری عبارت، تخیلات نیز بہی میں فطرتِ انسانی فی نفسہٖ منفرد عامہ ہے یا نہیں اگر ہے تو توجیہ کیجئے ورنہ تردید فرمائیے"

صفحہ ۴۲ × ۱۵

"کیا پہونس کا تاپنا کیا پردیسی کی پیت"

بند خمس نمبر ۲ خصوصاً داد طلب ہے۔ خصوصاً یہ فصیح اور دلچسپ الفاظ وبندش "یولانہ میں جاتے ہو" تمام خمسہ غیر دلچسپ، غیر مناسب، اور غیر مسلسل الفاظ کا مجموعہ ہے جس میں جبراً ضرب المثل کے الفاظ بھی ٹھونس دیئے گئے ہیں۔

صفحہ ۴۵ × ۱۷

عوض معاوضہ گلہ نہ دارد

اس ضرب المثل کا محل استعمال یہ ہوتا ہے جہاں ایک شخص دوسرے کو نقصان پہنچائے اور دوسرے کے ہاتھ بلا ارادہ شخص اول کو بھی نقصان پہنچ جائے۔ یہاں اکثر اشعار میں بدسلوکی کا معاوضہ رنج اور پشیمانی سے جو معشوق کو ہوئی ظاہر کرتے ہوئے اس ضرب المثل کا اطلاق کیا ہے جو ایک حد تک کمزور پہلو ہے۔

مطلع: گرد کے پھیر میں میرا دل، تو اپنا دل دو دیں۔ چہ خوش الخ

اس مصرع میں بھی دو فعل ہیں اور دو مقصد۔ علاوہ ازیں مضمون نہایت غلط ہے۔ اس شخص سے جو کسی کی لی ہوئی چیز واپس کرے یہ امید کہ وہ اپنی پسندیدہ شے دیدے۔ کہاں تک درست ہے جب وہ بگڑ کے مل واپس کر تو اپنا دل کیوں دیں گے وغیرہ وغیرہ۔

"جیسا دیس ویسا بھیس"

اس ضرب المثل کا محل استعمال مزید تشریح کا محتاج نہیں۔ جاہل سے جاہل بھی سمجھ سکتا ہے کہ "جیسا دیس ویسا بھیس" بولنا کہاں مناسب ہے اور کہاں نامناسب، اب خمسہ ملاحظہ ہو جس کا سر ہے نہ پیر۔

لہ ہو خاموش بن آزاد جیسا دیس ویسا بھیس — کہے جا شکوۂ بیداد . . . .
کیے گا کیا ستم ایجاد . . . . — گلی میں اُسکی ہو فریاد . . . .
خبردار اے دلِ ناشاد . . . .

ضرب المثل کھادی میں زربفت کا پیوند معلوم ہوتی ہے۔ چاروں مصرع نہ مربوط ہیں، نہ حسن تخیل کے مظہر، نہ کوئی دلچسپ مفہوم پیدا کرنیوالے، ایک مخبوط الحواس کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ معلوم ہوتے ہیں جس کے دماغ میں کوئی خاص معنی خیز مضمون نہ پیدا ہوتا ہو، یا چند جاہلوں کی تک بندیاں ہیں جو پل پر بیٹھ کے شاعروں کا مضحکہ اڑاتی ہیں

۲ے یہاں یہ وصف ہے بے جوڑ، کہ صیاد کی تعریف — اب اپنا منہ ادھر سے موڑ، کہ صیاد کی تعریف
چمن کی رشتہ داری توڑ، . . . . — قفس میں یادِ گل کو چھوڑ، . . . .
سمجھ اے بلبلِ ناشاد جیسا دیس ویسا بھیس

نمبر ۲ بھی اول سے کسی طرح کم نہیں ہے، ضرب المثل دیکھیے تو الگ۔ فی نفسہ اشعار پر غور کیجیے تو لغو خصوصاً مصرع اول جس کا مطلب کسی طرح بھی ظاہر نہیں ہوتا۔

۳ے یہ بہوت اب منہ پہ مل لے تو ہن لے جو گیا کپڑے — فغاں فریاد نالہ آہ اُٹھتے بیٹھتے دل سے
نہ خشکی ہونٹ کی جائے نہ آنسو بند ہوں تیرے — پہنچا بن کے تو مظلوم اے قاصد جو وہ پوچھے
تو کہنا اے ستم ایجاد جیسا دیس ویسا بھیس

بار بار یہ کہنا کہ ضرب المثل ذرا بھی دلچسپ پہلو لئے ہوئے نہیں ہے۔ سمع خراشی ہے کہیں بھی اس خمسہ میں محل او ٹھیک موقع اور مناسب مضمون کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے لہذا اب ہم وہ نقائص ظاہر کرتے ہیں جو شعر کی حیثیت سے پیدا ہیں۔

مصرع اول میں کیسا زبردست نقص ہے وہ یہ کہ شاعر کے فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک مظلوم کی حالت کا خاکہ کھینچ رہا ہے حالانکہ مصرع اول سے ایک جوگی کا لباس پہناتا ہے۔

مصرع ثانی میں جس قدر الفاظ جمع کئے ہیں وہ صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں جو "فعل" کے محتاج ہیں اور فعل ہے نہیں مثال فریاد نالہ آہ اٹھتے بیٹھتے دل سے "کرنا" فی بطن شاعر رہ گیا جس سے مصرع مہمل ہوگیا۔

مثلاً تیرا عاشق گیا جو دشت میں کل جوشِ وحشت سے — جو دیکھا اس کے حلیہ کو ڈرے چیتے ہرن چمکے
ادھر وہ تھے ادھر یہ تھا پریشاں کیا کہے کس سے — کہا یوں خارِ صحرا نے اڑا کر ٹکڑے دامن کے
تنِ عریاں مبارکباد ....

ناظرین کرام، ان اشعار سے ہر شخص مجھ پہ یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ تجھے کیا خبط تھا جو ان پہ تنقید کرنے بیٹھ گیا جبکہ اس درست نہ پیر مبتدی سے مبتدی شاعر بھی یہ لغویت نہ برتیگا جو ملک الشعراء نے برتی ہے اور خواہ مخواہ انکو اعلیٰ حضرت سے منسوب کرکے واہی ہے، بجز اسکے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ خواہ وہ کسی قدر لغویت ہو لیکن ہے ایک بڑے دعوی کے ساتھ اور یارانِ طریقت میں ناز کیا جاتا ہے کہ "یہ وہ اشعار ہیں جنہیں امیر الانشاء نے شائع کرنکی زحمت گوارا کی ہے"

مصرعہ میں تین مصرع مسلسل ہیں اگرچہ عیبوں سے بھرے ہوئے ہیں جنکی نثر یہ ہوسکتی ہے "جب تیرا عاشق جوشِ وحشت میں "کل جنگل گیا تو اس کے بھیانک حلیہ سے چیتے ڈرے اور ہرن چمکے، ادھر چیتے اور ہرن پریشان تھے ادھر کون بھوت آگیا) ادھر یہ پریشان تھا کہ کہاں آپھنسا" کیا کہے کسی سے" یہ الفاظ اگرچہ بے ضرورت ہیں تاہم باہم منسلک۔

چوتھے مصرع کی نثر یہ ہوگی" دامن کے ٹکڑے اڑا کر خارِ صحرا نے یوں کہا "ننگے بدن مبارکباد"

سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہئے کہ مسٹر اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ "چیتے اور ہرن" دونوں ایک جگہ کبھی جمع نہیں ہوتے، پہلے مصرع میں "خوبیٔ وحشت سے" غلط ہے بلکہ "جوشِ وحشت میں" ہونا چاہئے۔ پھر حلیہ سے جانورانِ صحرائی کا ڈرنا کیسا مضحکہ خیز خیال ہے۔ کیونکہ عاشق کا حلیہ اس قدر ڈراونا نہیں ہوجاتا کہ چیتے ڈریں اور ہرن چمکیں، ویسے چیتے کا ڈرنا اور ہرن کا چمکنا معمولی انسان سے بھی ہوتا ہے اگر معقول انسان بھی جنگل میں جائیگا تو چیتے ڈریں گے اور ہرن چمکیں گے، بھیانک حلیہ ہی پہ موقوف نہیں۔

پھر سب پہ طرہ کہ خارِ صحرا خواہ مخواہ ایچ پڑا دامن کے ٹکڑے کرکے بول اٹھا تنِ عریاں مبارکباد۔ غالباً شاعر صاحب کو یہ خیال نہیں رکھا کہ صرف دامن کی اگر دھجیاں اڑا دیجائیں تو تن عریاں نہیں ہوجائیگا پھر تن عریاں مبارکباد

کیا معنی ہو آگے ضرب المثل کیسا مزہ دے رہی ہے "جیسا دیس ویسا بھیس"۔

۵، نہ ہمدردی نہ دلسوزی نہ یہ پوچھا کہ ہو کیسے — نہ یہ پوچھا کہاں سے آئے بھیجا ہے تمہیں کس نے
پریشاں کیوں نہ ہوتا وہ نرالے طور جب دیکھے — جو اُنکے شہر میں قاصد گیا جس سو نا اُسنے

جفا کی دی مبارک باد ....

مضمون کی لغویت کے علاوہ جفا کی ہر شخص کو مبارکباد دینا خصوصاً ایسی حالت میں کہ کسی کو نہ یہ علم تھا کہ آنے والا کون ہے کیوں آتا ہے نہ کسی نے اس قسم کا سوال کیا نہایت سخت اہمال ہے، جفا کی مبارکباد قاصد کو دینا معنی کیا ہوئے شاعر صاحب ہی بیان فرما سکتے ہیں۔

۶، سراپا باغ ہی بنجاؤ تم یہ ہی مناسب ہے — گلے میں بد ہی، بیلا یا چنبیلی کی مناسب ہے
جو ہی کی گجرے اور چمپا کلی کیسی مناسب ہے — وہ سیر چمن پھولوں کا زیور ہی مناسب ہے

سمجھ اسے غیرت شمشاد ....

اس میں شک نہیں "باغ" تو لگا دیا کیونکہ بیلا چنبیلی جوہی چمپا شمشاد، سب آگئے لیکن چاہئے کہ کچھ معنی پیدا ہوں اور دلچسپ مضمون نکلے خیر صلا ہے۔

۱، معشوق پھولوں کا زیور پہنے تو کیا وہ فی نفسہ باغ بن گیا کیسے مان لیا جائے۔

۲، اول مصرع میں "یہ ہی" غیر فصیح ہے۔ اصل فصیح لفظ "یہی" ہے لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ "یہی" وزن میں آ نہیں سکتا اور ایک اعلیٰ مضمون نکلا جاتا ہے تو بیشک "یہ ہی" لے آنا جائز ہے یہاں کونسا وہ اعلیٰ مضمون ہے جس نے "یہ ہی" لکھنے پہ مجبور کیا۔

۳، مصرع اول میں معشوق کو لفظ "تم" سے مخاطب کیا ہے اور اخیر مصرع میں "سمجھ" کا لفظ مستعمل ہے جو "تو" کا اظہار کرتا ہے اور یہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے عیب مانا گیا ہے۔

۴، ضرب المثل کا محل تو کوسوں غائب ہے۔

۷، جلاکر اپنے دل کو، موم سے اس سنگ کو بدلا — بنایا سرخرو اس روسیہ کے ڈھنگ کو بدلا
کیا شفاف اسکو، اور اس کے رنگ کو بدلا — خلیل اس آتشِ سوزاں نے اسکے رنگ کو بدلا

کہ انگارہ بنا فولاد،

خمسہ کے معنی اور مطلب سخت تشریح طلب ہیں، الشبتو ہے، — (باقی ——— باقی)

دوستی

شانِ محبوبی ہے شانِ دوستی — دل لبھا لیتی ہے آنِ دوستی
دوستی کو کہئے جانِ زندگی — زندگی کو کہئے جانِ دوستی
بے نیازی دوستی کی ہے بہار — خود پسندی ہے خزانِ دوستی
دلدہی ہے دوستوں کی جانفزا — ہے مروت ارمغانِ دوستی
یاں نہیں ذرہ خصومت کا گذر — ہے شرافت پاسبانِ دوستی
دوستی سے دور ہے کوسوں نفاق — یہ نہیں شایانِ شانِ دوستی
ہونگے ہر اُمید میں وہ کامیاب — دیکھ لے جو امتحانِ دوستی
سینہ ہو جس شخص کا کینہ سے صاف — ہے اُسی کا دل مکانِ دوستی

شکر ہے واجب کہ تم ہو اے ذہیں
جبہ سائے آستانِ دوستی

ذہین (حیدرآبادی)

غزل

(از مولانا تجمل چشتی قادری)

دنیائے عشق کا یہ افسانہ مختصر ہے — نادیدنی تماشا۔ ناگفتنی خبر ہے
غفلت میں اک ذرا سی سو طرح کا ضرر ہے — ہشیار اے مسافر دنیا ٹھگوں کا گھر ہے
وہ دل ہے دل جو مضطر ہو عشق میں تمہارے — جو دیکھتا ہے تم کو اُسکی نظر نظر ہے
بھولے سے بھی لبوں پر آتا نہیں تبسم — قسمت میں اپنی شاید رونا ہی عمر بھر ہے
کیوں کر رہوں نہ محفوظ آفاتِ دہر سے میں — اے چشم مہر جاناں تجھ پر مری نظر ہے
خود شوق سے ہوں قرباں تیغ ادا پہ تیری — منظور مجھ کو مرنا مرنے سے پیشتر ہے
گھر میں نہیں تو باہر رہتا ہے کس جگہ تو — دل میں نہیں تو آخر تو جلوہ گر کدھر ہے

میں جن کی یاد میں ہوں بھولے ہوئے ہیں مجھ کو
مدت سے اسے تجمل نامہ نہ نامہ بر ہے

رقابت کی قیمت

از

(محشر عابدی)

— ۱ —

ولیم آسٹن ایک شریف خاندان کی نوجوان مایہ ناز ہستی تھی۔ اس میں انسانیت حسن اخلاق اور انکساری انتہائی مراتب کو پہنچ چکی تھی وہ ایک دولتمند باپ کا بیٹا تھا۔ گو اکثر واقعات انسان کی خواہش کے خلاف ظہور پذیر ہوتے ہیں اور زمانہ کا یہ رنگ ہے کہ وہ اپنی گردش متواتر سے ایک قریب آئی ہوئی شے کو دور کر دیتا ہے لیکن ولیم آسٹن کی حسین صورت اور خوش مزاجی نے اُسے بھی اپنا طرفدار بنا لیا تھا۔ وہ خوبصورت تھا خوبصورتی کی قدر کرتا تھا۔ خوبصورت بیوی کا خواہشمند تھا۔ اُسے خوبصورت بیوی بھی مل گئی تھی۔ وہ شیریں گفتار تھا اُسے ایسی ہی بیوی کی تمنا تھی اور قسمت سے بیوی بھی ویسی ہی ملی تھی۔ وہ نہ مغرور تھا نہ تمکنت پسند۔ اسکی بیوی متکبر تھی۔ وہ دولتمند تھا تو بیوی بھی مالدار تھی۔ غرض دونوں ایک دوسرے کی مثال اور ایک دوسرے کی تصویر تھے اور اسلئے ان دونوں میں محبت کا ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن ایسا نہ تھا اور نہ ہونا چاہئے تھا۔ عجوز قائن میں جہاں جملہ اوصاف عمدہ تھے وہاں اس میں جہالت کو زیادہ دخل تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھی مگر معمولی درجہ کی۔ کسی کالج کی گریجوایٹ نہ تھی۔ بلکہ ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔ شہر میں اسے رہنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اس لئے اکثر دقتیں پیش آتی تھیں۔ تاہم ولیم آسٹن اسکی جہالت اور ضد کو برداشت کرتا تھا۔ اور اُسے ہر بات نہایت نرمی سے سمجھاتا اور شہر کے ایٹی کیٹ (آداب صحبت) سے واقف کرتا رہتا تاکہ لوگوں کو اس پر نکتہ چینی اور عیب جوئی کا موقع نہ ملے۔ انکی زندگی امن و آسائش کا گہوارہ تھی اور اطمینان و راحت کا مخزن۔ لیکن زمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ ایسی پرسکون گھڑیاں زیادہ دیر تک نہیں قائم رہتیں چنانچہ انکی مسرور زندگی کو ایک طویل عرصہ گذر چکا تھا۔ مگر ہنوز انکا نخل آرزو ثمرور نہ ہوا تھا جس سے انکی آنکھیں روشن ہوتیں۔ اور دل زیادہ مسرور ہو جاتے۔

یہی وجہ تھی کہ آسٹن سخت مضطرب رہتا تھا وہ ایک لڑکے کا آرزومند تھا۔ اُسے تمنا تھی کہ میرے بعد میرے مال و متاع کا وارث پیدا ہو جائے۔ لیکن ایک طویل انتظار کے بعد بھی جب کوئی امید نہ نظر آئی۔ تو اسکے قلب حزیں میں دوسری شادی کی خواہش جاگزیں ہو گئی۔ اس نے اس ارادہ کو کسی پر ظاہر نہ کیا۔ اور وقت کا منتظر رہا۔

اکثر ڈانس، ناچ، تصویر، سینما، سرکس وغیرہ میں اُسے خوبصورت
اور خوش اخلاق خواتین سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اور وہ انکے ساتھ
انکے چھوٹے چھوٹے بچوں کو شاداں و فرحاں کھیلتا ہوا دیکھتا تو ایک
آہ سرد بھر کر کہتا "کاش میرا بھی ایسا ہی ایک بچہ ہوتا۔"

یہ تماشوں اور اس قسم کی دوسری تفریحوں میں زیادہ حصہ لیتا تھا
کہ اپنی پریشانی رفع کر سکے لیکن اس سے اسکی بےچینیوں میں اضافہ
ہوجاتا۔ وہ بہت سی ایسی لڑکیوں سے واقف تھا جن سے شادی
نہایت آسانی سے ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ ایک مشکل کام معلوم ہو رہا تھا
اور جوزفائن کو بغیر طلاق دیئے دوسری شادی بھی ناممکن تھی۔
اور بظاہر کوئی ایسا سبب بھی نہ تھا کہ جس سے وہ اُسے طلاق دیکے
اس لئے اب وہ بہانہ کی جستجو میں رہنے لگا۔

جوزفائن کی طرف سے اسکے دل میں نفرت سی ہو چلی تھی
اور اب اسکے ساتھ وہ پہلے سے محبت آمیز برتاؤ نہ رہے تھے۔
جوزفائن نے بھی اس کو محسوس کیا لیکن مجبور تھی۔ کیونکہ وہ خود بھی
اس اضطراب کا سبب سمجھ رہی تھی اور اس لئے شوہر سے کچھ
کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ مگر یہ نفرت اسٹن کے دل کے اندر ہی اندر
آگ کی طرح بھڑکتی جا رہی تھی۔

—.—.—‹ ۲ ›—.—.—

ایک رات جب وہ ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا اسکے دماغ میں وہ ردی
خیال پیدا ہو رہا تھا کہ وہ جوزفائن کو اسی حال میں چھوڑ کر کہیں باہر
چلا جائے۔ اور اسکی صورت نہ دیکھے لیکن فوراً ہی مال و جائداد کا
خیال دامنگیر ہو جاتا اور دوسری تدبیر سوچنے لگتا۔ شراب کا گلاس
برابر رکھا ہوا تھا۔ سگریٹ پی رہا تھا اور کسی گہرے خیال میں مستغرق تھا

دوسری مرتبہ ڈانس (ناچ) ختم ہوا لوگ ادھر اُدھر کرسیوں پر بیٹھنے لگے
پھر بھی وہ اپنی محویت سے بیدار نہ ہوا۔ اس اثنا میں ایک کمسن خاتون
جو کچھ حسین بھی تھی۔ آکر آسٹن کی قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی اور پوچھا۔

"میری وجہ سے آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی۔"

اسٹن نے چونکتے ہوئے مصنوعی تبسم سے جواب دیا نہیں آپ خوشی
سے تشریف رکھئے۔

اورما۔ آپ خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔۔۔ آپنے ناچ میں حصہ نہیں لیا؟

آسٹن پہلی ہی نظر میں اس پر فریفتہ ہو چکا تھا اسکی آنکھیں اورما کی
آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ گویا اس طرح اورما نے اُسے محبت کا
پیغام دیا تھا۔

آسٹن۔ نہیں کچھ نہیں میں یونہی بیٹھا ہوں۔

اورما:۔ آپ شرمائے ہیں؟ بتائیے سچ تو کوئی حرج نہیں۔

آسٹن:۔ (استفسارانہ لہجہ میں) ہیں۔ لیکن آپ اپنا تعارف کرا سکتی ہیں؟

اورما:۔ ہاں میں مسٹر ٹامسن کی بیٹی ہوں۔ جو پولیس انسپکٹر ہیں۔۔۔۔
میری شادی چارلس کین۔ الیکٹرک انجینیر کے بیٹے مسٹر رچرڈ کین سے
ہوئی تھی۔۔۔ لیکن میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔

آسٹن کو شادی کا حال سنکر کسی قدر افسوس ہوا۔ لیکن اورما کی باتوں
نے اُسے اس قدر مسحور کر لیا کہ اسے دنیا کی خبر نہ رہی۔

آسٹن:۔ آپ تنہا تشریف لائی ہیں۔

اورما:۔ جی ہاں اس وقت تو میں تنہا ہی ہوں اور اس لئے میں آپ
سے دریافت کیا تھا کہ آپ نے رقص میں ابھی شرکت نہیں کی؟

اسٹن:۔ نہیں۔ اب ارادہ ہے۔

ہوٹل کے ملازم نے شراب کا دوسرا گلاس میز پر لاکر رکھ دیا۔

آسٹن ابتک اودما کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ایسا حسن کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اودما نے شراب پیتے ہوئے آسٹن سے پوچھا "کیا آپ اپنا اسم گرامی بتا سکتے ہیں؟

آسٹن :۔ مجھے ولیم آسٹن کہتے ہیں۔ میں مائننگ انجینئر اور کان کھودنے کا ٹھیکہ دار ہوں۔

اودما :۔ مجھے آپ سے ملکر بڑی خوشی ہوئی۔ کیا آپ غیر ممالک میں بھی اس غرض سے تشریف لیجاتے ہیں۔

آسٹن :۔ ہاں۔ اب یورپ کے سفر کا ارادہ ہے۔

اودما :۔ یورپ میں کہاں؟

آسٹن :۔ جرمنی میں ایک ٹھیکہ میں نے لیا ہے۔

اودما :۔ کبتک روانگی کا قصد ہے؟

آسٹن :۔ دو ہفتہ کے اندر۔ کوئی خاص ضرورت ہے آپکو وہاں؟

اودما :۔ نہیں کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔ میں بھی یورپ کی سیر کو جانیوالی ہوں۔ اور شاید آپ کا ساتھ دے سکوں۔

آسٹن :۔ نہایت مسرت کی بات ہے۔

وہ اس امر سے بہت خوش ہوا۔ اسکے دل میں طرح طرح کی آرزوئیں پیدا ہو رہی تھیں۔ اس نے سمجھ لیا کہ جس موقع کا وہ منتظر تھا وہ آ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہو گئے۔ ڈانس (رقص) پھر شروع ہوا۔ دونوں نے اس میں شرکت کی اس کے بعد مختلف قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر ٹھنڈے ٹھنڈے شاد و مسرور اپنے گھر کا راستہ لیا۔

۳۴

کچھ روز گذر گئے اور اب دونوں میں کافی راہ و رسم پیدا ہو چکی تھی ایک صبح آسٹن اور جوزفائن ناشتہ کے لئے میز پر بیٹھے ہوئے تھے کہ آسٹن نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا "جوز۔ مجھے کوئلہ کی کان کھودنے کا جرمنی میں ایک بڑا بھاری ٹھیکہ ملا ہے اور اب میں یورپ جانیوالا ہوں۔

جوزفائن :۔ (مسرت آمیز لہجہ میں) بہت خوشی کی بات ہے لیکن کیا اکیلے جاؤگے؟

آسٹن :۔ نہیں۔ اودما ٹامسن۔ بھی یورپ جانیوالی ہیں اسلئے ان کا اور میرا ساتھ ہو جائیگا۔

جوزفائن :۔ (تعجب سے) اودما۔ رابرٹ ٹامسن انسپکٹر کی بیوی۔

آسٹن :۔ ہاں۔ تو کوئی حرج ہے؟

جوزفائن کو اودما کا حال معلوم تھا۔ کہ وہ ایک حسین عورت ہے۔ قابل اور تعلیم یافتہ ہے۔ اسکے علاوہ ایک بیوہ ہے۔ انہیں وجوہات سے اس نے اپنے شوہر سے کبھی اس سے ملاقات کا ذکر نہ کیا تھا کیونکہ وہ نام سے واقف تھی۔ اس نے ابتک اُسے دیکھا نہ تھا۔ اور ذکر کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ یہ خبر سنکر اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور وہ آزردہ ہو گئی۔

جوزفائن :۔ مجھے نہ لیچلوگے؟

آسٹن :۔ نہیں تمہارے جانیکی ابھی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

جوزفائن :۔ تو میں یہاں تنہا رہ کر کیا کرونگی؟

آسٹن :۔ کیوں۔ یہاں تمہاری ضرورت ہے۔ اگر طبیعت گھبرائے تو اپنی والدہ کے یہاں چلی جانا۔ ابھی میں تمہارے

متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جوزفائن نے پھر کوئی سوال نہ کیا اور چپ ہو کر چائے پینے لگی۔

اس اثنا میں اَدرما بھی مکان میں داخل ہوئی۔ اور بلا کسی دریافت کے اندر آگئی۔ آسٹن اور جوزفائن استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ جوزفائن اَدرما کو دیکھتے ہی پہچان گئی۔ گو اس نے کبھی دیکھا نہ تھا اور اَدرما اسکی بیوی سے ناواقف تھی۔ آسٹن نے اپنی بیوی سے تعارف کرایا۔ اور پھر تینوں میز پر بیٹھ گئے۔ دوران گفتگو میں جوزفائن نے پوچھا "اَدرما آپ یورپ کس غرض سے جا رہی ہیں؟"

اَدرما :۔ صرف تفریح کے لئے۔

اس جواب سے اُسے اور زیادہ خلش پیدا ہو گئی۔ اب اسکو بھی یہ خواہش ہوئی کہ وہ بھی کسی طرح آسٹن کے ساتھ جائے۔

جوزفائن :۔ کب تک ارادہ ہے؟

اَدرما :۔ جب مسٹر آسٹن چلیں۔

جوزفائن :۔ مسٹر آسٹن تو تنہا جا رہے ہیں۔

اَدرما :۔ آپ کو نہیں لیجاتے۔ کیوں؟

آسٹن :۔ اَدرما میں بالکل نئی جگہ جا رہا ہوں۔ اس حالت میں ان کو ہمراہ لیجانا مناسب نہیں سمجھتا۔

اَدرما :۔ ہاں اگر تکلیف کا خیال ہے تو بہتر ہے۔

جوزفائن کو اس جملے سے اور غصہ معلوم ہوا لیکن وہ خاموش رہی۔

آسٹن :۔ اَدرما پرسوں تک ہم کو روانہ ہو جانا چاہئے۔

اَدرما :۔ میرا بھی یہی ارادہ تھا لیکن آپ جوز کو کیوں نہیں لیجاتے یا پھر بلانے کا ارادہ ہے؟

آسٹن :۔ ہاں وہاں جانے کے بعد دیکھا جائیگا۔

اس اثنا میں جوزفائن کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کا دل سخت مضطر تھا اور اب اسکی بےچینی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اُسے آسٹن سے ایسی دلی محبت تھی۔ جیسے ایک وفادار بیوی کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے وہ اُسے چاہتی تھی اور اس لئے وہ اپنی محبت میں غیر کو حصہ لیتے ہوئے نہ دیکھ سکتی تھی۔ گو وہ جانتی تھی کہ آسٹن اب اس سے پہلے کی طرح محبت آمیز سلوک نہیں کرتا۔ تاہم اسے آسٹن کی اس بےپروائی کا خیال نہ تھا۔ اور وہ اس قسم کی ہر نفرت کو اپنی بدقسمتی سے تعبیر کرتی تھی۔ مگر شوہر کی جدائی کسی طرح نہ گوارا کر سکتی تھی۔ وہ صحن میں آکر ایک درخت کے پاس کھڑی ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اَدرما نے اُسے روتا ہوا دیکھ لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ میرا تنہا جانا مصیبت کا باعث ہوگا۔ اور اس طرح وہ جوزفائن کو رنجیدہ کر کے بلاوجہ اپنا دشمن بنا لیگی۔ اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا

آسٹن۔ میں تنہا اب تمہارے ساتھ نہ جاؤنگی۔ میں ابھی اپنی سیر کا پروگرام ملتوی رکھتی ہوں۔ جب تم جوزا کو بلاؤ گے اس وقت میں بھی چلی آؤنگی

اس جواب سے آسٹن کو تعجب ہوا۔ اسنے میں اَدرما جوزفائن کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ جوز میری تم رو رہی ہو۔ اچھا میں بھی نہ جاؤنگی۔ تم اپنا دل مت کڑھاؤ۔

جوزفائن :۔ نہیں تم جاؤ اَدرما۔ جاؤ میری وجہ سے کیوں اپنا عیش منغص کرتی ہو۔

یہ جملہ اَدرما کو بہت ناگوار گذرا لیکن وہ بہت حیادار عورت تھی۔

تیولل مصیبت کو تاڑ گئی۔ اور آسٹن کے ہمراہ جانیسے انکار کر دیا۔ آسٹن کو جوزفائن کی اس حرکت سے غصہ معلوم ہوا۔ اور آدرما کی باتیں بھی ناگوار گذریں۔ لیکن آدرما نے اسکے کان میں کچھ کہہ کر سمجھا دیا۔ وہ خاموش ہو گیا اور دوسرے ہی دن تنہا وہاں سے جرمنی روانہ ہو گیا۔

(۴)

کچھ عرصہ کے بعد آسٹن کا تار آیا کہ تم دونوں چلی آؤ۔ ان دونوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی اور روانہ ہو گئیں۔ جرمنی پہنچکر اس گاؤں کا ٹکٹ لیا جس کا پتہ آسٹن نے لکھا تھا۔ اور ریل پر سوار ہو گئیں۔ راستہ میں جوزفائن کے دل میں طرح طرح کی تمناؤں اور آرزوؤں کے سمندر موجزن ہو رہے تھے۔ اور وہ اپنے شوہر سے ملنے کی خواہش میں بیحد مسرور اور بیقرار تھی۔ آخر مقام مقصود پر پہنچکر ایک ہوٹل میں وارد ہوئیں جس کا پتہ تار پر تحریر تھا۔ وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ آسٹن اب ایک ہوٹل میں نہیں رہتا بلکہ اس نے کان ہی پر مکان بنالیا ہے اور وہیں رہتا ہے۔ اس خبر سے جوزفائن کو بہت صدمہ ہوا اُس نے حسب ذیل خط لکھکر آدرما کو دیا کہ وہ پڑھکر اسے ڈاک میں ڈال دے۔

پیارے اسٹن۔

جوز تمہاری یاد میں بہت بیچین تھی۔ اتنے دن سخت مصیبت سے کاٹے اور اب وہ تم کو دیکھنے کے لئے بیقرار ہے۔ میرے اسٹن تم اچھے ہوگے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ تم کو اچھا رکھے۔ امید ہے کہ تم اگر ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لیجاؤگے۔ وہاں مکان کرایہ کا تو نہ ہوگا۔ تم نے خود ہی خرید لیا ہوگا۔ میں اچھی ہوں اور آدرما بھی۔ تمہارے جواب کا بیتابی سے انتظار ہے۔ تمہاری جوز

آدرما کی ظاہرا ہمدردی نے جوزفائن کو اپنا دوست بنالیا تھا۔ جوزفائن کو پہلا خیال جا اور ما کے متعلق تھا جاتا رہا اور وہ سمجھنے لگی تھی کہ آدرما صرف محبت کیلئے آئی ہے۔ اُسے اسکے شوہر سے کوئی خاص غرض نہیں۔ لیکن اس کی ناتجربہ کاری اور دہقانیت نے اُسے آدرما کی چالاکیوں اور دغابازیوں سے غافل رکھا تھا۔ اس ہمدردی کے پردہ میں وہ جوزفائن کیساتھ نہایت ناجائز سلوک کرنا چاہتی تھی اور اپنی مکاری سے اسکی طرفدار بنی ہوئی تھی۔ تاکہ جوزفائن کا کوئی راز اس سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ اب جوزفائن کو آدرما سے کوئی پردہ نہ تھا اسی لئے اسے خط بھی اُسے پڑھنے کیلئے دیدیا۔ اب آدرما کو ایک اور موقع ہاتھ آگیا۔ اس نے خط پڑھا۔ کچھ دیر سوچتی رہی۔ اور پھر یکایک قلم دوات اٹھا کر خود دوسرا خط تحریر کرنے لگی۔ اور اس صفائی سے لکھا کہ جوزفائن اور اسکے خط میں کوئی امتیاز نہ باقی رہا۔ اور یہ مشکل سے کہا جا سکتا تھا کہ کونسی تحریر جوزفائن کی ہے اور ما کا خط حسب ذیل تھا:۔

میرے آسٹن۔

تم اچھے ہوگے۔ مجھے تمہاری عدم موجودگی میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی تم کو بھی شاید کوئی تکلیف نہ ہوئی ہو۔ اور ما کی وجہ سے میرا دل بہت بہل گیا اور اس وجہ سے تمہاری یاد زیادہ نہ ستاتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم میں تمہارے پاس کبتک پہنچونگی۔ مگر میرے لئے ایک گاؤں ضرور خرید رکھنا۔ اور ابتک تم نے کتنا روپیہ جمع کیا ہے۔ مکان تو دو تین ضرور خرید لئے ہونگے۔ اور میں اپنے لئے اچھا مکان چاہتی ہوں جس میں فرنیچر بھی قیمتی اور اچھا ہو۔ میری عادت سے تم واقف ہو۔ اس لئے یقین ہے کوئی شکایت کا موقع نہ دوگے۔ میں اچھی ہوں اور آدرما بھی۔ تم ہم لوگوں کو خود ہی آکر لے جاؤ تو بہت اچھا ہو۔ جواب کا انتظار ہے

جوز

(باقی آئندہ)

مصنف انڈکس (حصہ نثر)